

فكرات الفقه

عبد الرحمن السبكي

ترجمه و تكملة از حسين بن عباس

عبد الرحمن السبكي

شهرت در علم فقه و حديث

کِتَابُ الْفَقْه

علی المذاہب الاربعہ

جزء پنجم

شرعی حدود

تالیف: عبدالرحمن الجزیری

ترجمہ: منور احسن عباسی

علماء اکیڈمی

شعبہ مطبوعات محکمہ اوقاف پنجاب

۲۰۱۳ء

جملہ حقوق محفوظ

ISBN NO. 978-969-28-0300-7

محمد حسن رضوی

ناشر

ڈائریکٹر جنرل مذہبی امور و اوقاف، پنجاب، لاہور

عبدالحمید چودھری

نگران طباعت

ڈپٹی ڈائریکٹر۔ علماء اکیڈمی اوقاف پنجاب، لاہور

دسمبر 2012ء (طباعت جدید)

اشاعت ششم

ایک ہزار

تعداد

آغا امیر حسین

طابع

کلاسیک۔ 42 شاہراہ قائد اعظم، لاہور

(i) شعبہ مطبوعات علماء اکیڈمی اوقاف، بادشاہی مسجد لاہور

ملنے کا پتہ

فون: 042-37657115

(ii) سیل پوائنٹ۔ مطبوعات اوقاف دربار حضرت داتا گنج بخشؒ، لاہور

فون: 042-37113464

مقدمہ طبع جدید ہشتم

مہ حسن رضوی

ڈائریکٹر جنرل مذہبی امور

داوقاف پنجاب

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد الانبياء

والمرسلين وعلى اله واصحابه اجمعين.

دین اسلام کے احکام کو سمجھنے کے لیے قرآن و سنت کے بعد فقہ کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ فقہ دراصل ان مضبوط دلائل کا نام ہے جن کی روشنی میں قرآن و سنت کے مطابق انسانی زندگی میں درپیش مسائل کے حل اور احکام دین کو سمجھنے کا کام کیا جاتا ہے اور ان انسانی زندگی کے مسائل کا حل فقہ کے دلائل کے ذریعے قرآن و سنت کی روشنی میں اخذ کیا جاسکتا ہے۔ فقہ ایک ایسا علم ہے جس کے تحت انسانی زندگی کے شعبہ ہائے جات میں روزمرہ پیش آمدہ مسائل و اعمال بیان کئے جاتے ہیں۔ ارکان اسلام نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور مسلمانوں کے دیگر روزمرہ کے معاملات جیسا کہ نکاح و طلاق، خرید و فروخت، حلال و حرام، مزارعت و مساقات اور مضاربیت، کرایہ داری و عاریت، ہدیہ و میراث، شرکت و بٹائی، چور، ڈکیتی، شراب خوری و حرام کاری، حدود و تعزیرات وغیرہ تمام عبادات و انسانی معاملات کی شرعی تفصیلات اس علم کے تحت آتی ہیں۔ اسلام ایک مکمل دستور حیات اور جامع نظام حیات ہے اس لئے اس کے زیر اثر فقہ کے علم کو بھی نہایت وسعت و عظمت حاصل ہے اور انسانی زندگی کا کوئی بھی عملی پہلو اس علم کے احاطے سے باہر نہیں رہ سکتا۔

بلاشبہ شعبہ ہائے زندگی میں اختلاف انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ اس لئے ان فقہی مسائل کے بارے میں حضور ﷺ کے بعد بعض علمی اختلافات سامنے آئے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے علمی اختلافات کے بعض اسباب جو کہ دور تک اثر انداز ہوئے ان کا ذکر زندگی گزارنے کے لیے اس دور میں اشد ضروری ہے۔

نبی کریم ﷺ کے فرمانِ ذی شان کا ہر صحابی کے علم میں نہ ہونا۔ مختلف اوقات میں حضور ﷺ کے اقوال و اعمال کا مختلف ہونا، حضور ﷺ کے فرمان، اقوال و اعمال کی پیروی سنت ہے یا واجب یا کیا ہے؟، اس میں اختلاف، حضور ﷺ کے قول و فعل کو پورے طریقے سے نہ سمجھ سکتا، تحصیل علم کی صلاحیت کا مختلف ہونا، پھر مسائل کے اخذ کرنے کے طریق کار کا مختلف ہونا، کسی نے صرف نقل کو ضروری سمجھا اور کسی نے عقل کی رو سے مسئلہ کے حل کو جائز مانا، کسی حکم کی علت کو سمجھنے میں اختلاف، سہو و نسیان اور حفظ و یادداشت کا اختلاف۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد اس قسم کے اسباب کے علاوہ دوسرے بھی بہت سے ایسے اسباب رونما ہوئے جن کی بناء پر فقہی مسائل میں علمی اختلاف بڑھتا گیا جن میں ہر قول کسی نہ کسی دلیل پر مبنی ہے اور شرعی اصول و حدود کے مطابق ہے، اسی لئے اس اختلاف کو کبھی بھی ناپسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا بلکہ بنظر تحسین دیکھا گیا کہ بسا اوقات اسی علمی اختلاف اقوال کی بدولت انسان کسی بڑی مشکل اور الجھن سے نجات پالیتا ہے۔

فقہی مسائل میں امت مسلمہ کے درمیان اختلاف کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ امت میں فقہی مذاہب بھی کثیر مقدار میں پیدا ہو گئے، اگرچہ تمام کے تمام زیادہ مدت باقی نہ رہ سکے۔ البتہ ایسے مذاہب جو باقی رہے، خوب پھلے پھولے اور پھیلے، وہ پورے طور پر جمع بھی گئے اور مشہور بھی ہوئے، حسب ذیل ہیں: حنفی، مالکی، حنبلی، شافعی، ظاہری، اثنا عشری۔ ظاہر یہ مذاہب کے علاوہ اہل السنۃ والجماعۃ کے باقی چاروں مذاہب حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی قرآن و حدیث و اجماع کے ساتھ ساتھ قیاس سے بھی استدلال پر متفق ہیں اگرچہ بے شمار مسائل کے حق میں طریق استدلال اور نتائج میں اختلاف رکھتے ہیں۔ اس لیے امت کا بڑا حصہ ہر عہد میں انہیں چاروں مذاہب کا پابند رہا ہے۔

ٹیٹس نظر "کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ" مصر کے مشہور جلیل القدر عالم و فقیہ شیخ عبدالرحمن الجزیری کی مایہ ناز تصنیف ہے۔ جسے ممالک اسلامیہ کے علمی و فقہی حلقوں میں بے حد پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ مصنف موصوف نے اپنی اس ضخیم کتاب میں جملہ مسائل فقہ از قسم عبادات، معاملات، شخصی قوانین اور حدود و تعزیرات مذکورہ مذاہب اربعہ کی روشنی میں بڑی شرح و وسط سے بیان کیے ہیں۔ علامہ موصوف نے اس کتاب کی ترتیب میں جس نہج کو اختیار کیا ہے اس کی اہم نکات درج ذیل ہیں:

- 1- ہر مسئلہ کو ایک خاص عنوان کے تحت درج کیا ہے تاکہ قاری مطلوبہ مسئلہ کو فہرست مضامین کی مدد سے با آسانی معلوم کر لے۔
 - 2- متن میں وہ مسائل دیئے گئے ہیں جن پر حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کا اتفاق ہے یا پھر کم از کم دو مذاہب کا اتفاق ہے۔ بقیہ مذاہب کی تفصیل حاشیہ میں دے دی گئی ہے۔
 - 3- جن مسائل میں حنفیہ، مالکیہ، حنابلہ کا مسلک الگ الگ ہے۔ ان کا ذکر حاشیہ میں کر دیا گیا ہے۔
 - 4- ہر مسئلہ میں آئمہ اربعہ کے دلائل کو قرآن و سنت کی رو سے اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا نقطہ نظر واضح ہو جائے۔
 - 5- جملہ مسائل کی وضاحت اور صراحت میں بھرپور کوشش کی گئی ہے، تاکہ جو شخص اس کتاب کا مطالعہ کرے وہ با آسانی اپنی مطلوبہ معلومات حاصل کر سکے۔
 - 6- جن مسائل کے متعلق کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کوئی نص نہیں بالہ ان کے متعلق تمام مسالک کی بنیاد اجتہاد پر ہے ان کا ذکر بھی حاشیہ میں کر دیا گیا ہے۔
 - 7- اس لیے مسائل جن میں آئمہ اربعہ کا اجماع، یا کم از کم دو آئمہ کا اتفاق ہو تو ان کا ذکر متن ہی میں کیا گیا ہے۔
 - 7- پوری کتاب میں ممکن حد تک احکام شریعہ کی حکمت و مصلحت کو بیان کیا گیا ہے۔
 - 8- اس پوری کتاب میں جہاں تک ہو سکا ہر جگہ احکام شریعہ کی حکمت کو بیان کر دیا گیا ہے۔
- الغرض اس کتاب کے قارئین جہاں اپنا مسلک اور اس کا مآخذ معلوم کریں گے وہاں انہیں

دوسرے مسائل اور ان کے مآخذ و دلائل کا بھی علم ہوگا۔

اس کتاب کا اردو ترجمہ مولانا منظور احسن عباسی نے پوری دیانت، محنت اور مہارت سے کیا ہے اور پوری کوشش کی ہے کہ عبارت عام فہم ہو۔ جہاں کہیں اصل متن میں اس قدر ایجاز تھا کہ اس کا محض ترجمہ کر دینے سے زیر بحث مسئلہ کی وضاحت نہ ہو سکی وہاں تو ضیح مقصد کی خاطر بعض عبارات کا اضافہ خطوط و حدائی کر دیا گیا ہے۔

کتاب الفقہ علی مذاہب الاربعہ: اپنی پانچوں جلدوں کے ساتھ اسلامی احکام و مسائل کی ایسی جامع اور مستند کتاب ہے جس کا ہر گھر، دفتر، لائبریری اور علماء، فقہاء، مفتیان، قانون کے طلباء اور وکلاء کے پاس ہونا انتہائی ضروری ہے تاکہ روزمرہ پیش آمدہ مسائل کا حل تلاش کرنے میں اس فقہی انسائیکلو پیڈیا سے رجوع کیا جاسکے۔ علمی، دینی اور قانونی حلقوں میں یہ عظیم کام بے حد پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔

اہل علم اور دانش اور دینی و تدریسی حلقوں کے مسلسل تقاضوں کی بناء پر اس کتاب کے کئی ایڈیشن طبع کئے جا چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب 1999 میں کمپیوٹر کمپوزنگ کی شکل میں عوام الناس کے سامنے آئی جس کا سراہا جانا ایک فطری امر تھا۔ سال 2006ء میں نئے ایڈیشن کی طباعت کے مرحلے پر پروف ریڈنگ اور رموز و اوقاف کی درستگی کو یقینی بنایا گیا۔

زیر نظر آٹھویں ایڈیشن کی اشاعت پر ہم، طارق محمود پاشا، سیکرٹری / چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف و مذہبی امور، پنجاب کے تہہ دل سے ممنون اور شکر گزار ہیں جن کی بدولت ہم اس ضخیم اور عظیم کتاب کی پانچ جلدوں کو شائع کر کے قارئین کرام کی ضرورت کو پورا کرنے کے قابل ہوئے ہیں۔

زیر نظر ایڈیشن کمپیوٹر ائزڈ کمپوزنگ سے مزین کتابت، اعلیٰ طباعت، خوبصورت سرورق، عمدہ کاغذ اور بہترین جلد بندی کے ساتھ پیش خدمت ہے جو یقیناً قارئین و محققین اور ریسرچ سکالرز کے لئے انتہائی مفید ہوگا۔

اللہ تعالیٰ قارئین کرام کو اس سے بھرپور استفادہ کی توفیق اور ہمت عطا فرمائے! آمین۔

ربیع الاول ۱۴۳۴ھ بمطابق جنوری 2013ء

دیباچہ کتاب

(از مترجم)

الحمد لله رب العالمين، والصلوة والسلام على محمد خاتم النبیین ورحمة للعالمين. اما بعد واضح ہو کہ زیر نظر کتاب علامہ عبدالرحمن الجزیری المغفور التوفی ۱۳۶۰ھ بمطابق ۱۹۴۱ء کی تالیف انیف، الفقہ علی المذاهب الاربعہ کی پانچویں جلد کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کی پہلی جلد کا ترجمہ پہلی بار ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔ دوسری بار ۱۹۷۷ء میں طبع ہوا۔ اس دوران اس کی دوسری، تیسری اور چوتھی جلدیں بھی ترجمہ ہو کر اشاعت پذیر ہوئیں اور ملک و بیرون ملک بالخصوص دیار عرب میں بہت مقبول ہوئیں۔ یہ امر نیاز مند مترجم کے عجبی اور کم سواد ہونے کے پیش نظر صد گونہ اطمینان و مسرت کا باعث اور شکر الہی کا موجب ہوا بالخصوص اس لیے کہ اس اہم اور پر مشقت کام کا ایک تراسی سال کے ضعیف انسان سے انجام پانا توفیق الہی کے بغیر سخت دشوار تھا۔

پہلی جلد کے دیباچہ میں نیاز مند مترجم نے اس اندیشہ کا اظہار کیا تھا کہ مسائل فقہ کے اس دائرۃ المعارف کا حصہ حدود و تعزیرات معرض تحریر میں نہیں آیا۔ لیکن اس کتاب کے مقدمہ ناشر سے یہ انکشاف ہوا کہ کتاب الفقہ کا حصہ پنجم اگرچہ ہمہ جہتی حیثیت سے علامہ مؤلف کی زندگی میں مکمل نہیں ہوا تھا لیکن مطالب کتاب کا تقریباً مکمل مواد ان کے پسماندگان سے دستیاب ہو گیا جسے کلیہ ازہر (مصر) کے ایک عالم متبحر عالم، الشیخ علی حسن العریض نے باضافہ حواشی و تشریحات واجبہ مرتب فرمایا اور مکتبہ تجارت کبرے (قاہرہ) نے طبع فرمایا اور ادارۃ دار الفکر (بیروت) نے شائع کیا۔

ہر چند کہ اس حصہ پنجم کی ترتیب و تخیل کے باب میں فاضل مرتب نے وہی سنج اختیار فرمانے کی کوشش کی ہے جو سابقہ حصوں میں علامہ الجزیری مرحوم کے پیش نظر تھا، تاہم دونوں اصحاب کے سنج ترتیب و

تشریح میں مکمل ہم آہنگی کا تصور مشکل ہے۔ علامہ الجزیری کے پیش نظر زیادہ تر احکام شریعہ و مسائل فقہ کی توضیح و تشریح تھی لیکن علامہ عریض نے اس کے ساتھ احکام شریعت کی افادی حیثیت کو نمایاں کرنے کی طرف زیادہ توجہ مبذول فرمائی ہے۔ جس کی وجہ سے تفصیل مطالب میں ادبی عنصر بھی شامل ہو گیا ہے۔ جس کے باعث اس حصہ کی عبارت سابقہ حصص کی عبارت سے کسی قدر مشکل ہو گئی ہے چنانچہ بعض جگہ اطناب مفید ہونے کے باوجود تفہیم مسائل کے لیے غیر ضروری معلوم ہوا اور کہیں کہیں اختصار کے باعث فہم مطالب میں دشواری بھی پیش آئی۔ متن و حاشیہ ذیلی میں وجہ امتیاز واضح نہیں ہے۔ مجموعی طور پر حواشی کا حجم متن کتاب کے حجم سے دگنا ہے۔ بالخصوص ٹکٹ آخر میں بعض حواشی کی عبارت متن سے گڈمڈ ہو گئی ہے۔ اس عاجز کے نزدیک اس حاشیہ کو شامل متن کرنا، ناگزیر معلوم ہوا۔

اس حصہ میں طباعت کی غلطیاں سابقہ حصص کے مقابلہ میں بہت کم ہیں۔ تاہم بہتر ہوتا کہ اس پوری کتاب کا استدراک شائع کیا جائے اور متن و حواشی کی ترتیب از سرنو کی جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسائل فقہ کے باب میں اس کتاب کو 'دائرة المعارف' کی حیثیت حاصل ہے۔ تاہم ہنوز بعض فقہی مسائل کے اضافے کی گنجائش ہے مثلاً حقوق و فرائض (مسائل وراثت) اور دوسرے مسائل متعلقہ سیاسیات و خراجات و دیگر تمدنی، معاشی، معاشرتی اور اخلاقیات وغیرہ جن کا ذکر کتاب و سنت و اسلامی ذخیرہ علوم میں اجمالاً و تفصیلاً منتشر موجود ہے امید ہے کہ

ع "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند"

بالآخر نیازمند مترجم قارئین کتاب سے ملتجی ہے کہ اس ترجمہ میں، جہاں کہیں سہو، فروگزاشت یا خطا ملاحظہ فرمائیں اس کی اصلاح بطور خود کر لیں اور نیازمند کے حق میں کوتاہیوں کی معافی اور مغفرت و نجات آخرت کے لیے دعا فرمائیں۔

نیازمند مترجم

منظور احسن عباسی

۱۱۲۔ ڈی۔ ماڈل ٹاؤن، لاہور

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱۔	حدود (تعزیرات اسلامی) کا بیان	۲۷
۲۔	”کلمات ابتدائیہ“	۲۸
۳۔	حدیث کے معنے	۲۹
۴۔	حدود شرعیہ اور ایسی ہی دوسری سزاؤں کا بیان	۳۰
۵۔	مقتوبات شرعیہ کا بیان	۳۱
۶۔	سزا کی پہلی قسم	۳۲
۷۔	سزا کی دوسری قسم	۳۳
۸۔	سزا کی تیسری قسم	۳۴
	پہلا باب۔ سزا کی پہلی قسم شراب نوشی کی حد (شرعی سزا)	۱۲
۹۔	اشروبات (مشروبات) کا بیان	۱۳
۱۰۔	شراب کی حد (شرعی سزا)	۱۷
۱۱۔	نبیذ (شیرے) کے متعلق شرعی حکم	۱۸
۱۲۔	وہ شیرہ جس میں شدت (تندی) نہ آئی ہو	۲۶
۱۳۔	پکائے ہوئے عصیرہ (افشرہ یا شیرہ) کا بیان	۲۷
۱۴۔	شراب سے سرکہ بنالینے کا بیان	۲۹
۱۵۔	شراب کی تلچھٹ کا بیان	۳۰
۱۶۔	شراب کی خرید و فروخت کا بیان	۳۰
۱۷۔	شراب کے متعلق احکامات	۳۱
۱۸۔	شراب کی بومحسوس کرنے کا بیان	۳۱
۱۹۔	شراب پینے کا اعتراف کرنے کا بیان	۳۲
۲۰۔	مخمور انسان پر کس جالت میں حد لگائی جائے	۳۳
۲۱۔	نشہ باز کے اقرار جرم کا بیان	۳۳
۲۲۔	بار بار ارتکاب شراب نوشی کا بیان	۳۴
۲۳۔	حد جاری کرنے کا بیان	۳۵
۲۴۔	شراب پینے والے کو ضرب ”حد“ لگانے کی کیفیت	۳۵
۲۵۔	ناگزیر حالات میں شراب استعمال کرنے کا بیان	۳۸
۲۶۔	شرابی پر لعنت بھیجنا فعل مکروہ ہے	۳۹
۲۷۔	شراب لعنت ہے	۳۹
۲۸۔	بیر (Beer) بھنگ اور خواب آور اشیاء کے استعمال کا بیان	۳۹
۲۹۔	منشیات کی تجارت کا بیان	۳۹
۳۰۔	بھنگ کی کاشت کرنے کا بیان	۳۹
۳۱۔	منشیات کی تجارت سے حاصل شدہ نفع کا بیان	۳۹
۳۲۔	بیر کے استعمال کی خرابیاں	۳۹
۳۳۔	حرمت شراب کی آیات قرآنی	۵۲
۳۴۔	جنگ کی حالت میں حد (شرعی سزا) کے نافذ کرنے کا بیان	۵۳
	دوسرا باب۔ ان حدوں کے بیان میں جن کے نفاذ پر سب کا اتفاق ہے ”حد زنا اور اس کے معنے“	۵۵
۳۶۔	ان حدود کو شرعی حکم قرار دیئے جانے کی حکمت	۵۶
۳۷۔	زنا (بدکاری) کی حد	۵۶
۳۸۔	زنا کے نقصانات	۵۹
۳۹۔	عورت کا ستر	۶۱
۴۰۔	عورت کی آواز کا بیان	۶۳
۴۰۔	گمانے کا بیان	۶۳
۴۱۔	بدکاری شرافت نسبی کو بیکار بنا دیتی ہے	۶۳
۴۲۔	”محسن“ کی تعریف (یعنی شادی شدہ ہونے کا مطلب)	۶۶
۴۳۔	محسن (شادی شدہ) زانی کی سزا کا بیان	۶۸
۴۴۔	محسن (شادی شدہ) پر نفاذ حد کا بیان	۶۸
۴۵۔	سنگسار کرنے کا طریقہ	۶۹
۴۶۔	ذی عقل شخص کا جنون زدہ کے ساتھ ملوث ہونے کا بیان	۷۰
۴۷۔	غیر شادی شدہ (مرتکب زنا) کی شرعی سزا کا بیان	۷۰
۴۸۔	غیر شادہ شدہ (مرتکب زنا) کو کوڑوں کی سزا	۷۰
۴۹۔	سزائے درہ زنی کی کیفیت	۷۱
۵۰۔	مریض کو درہ لگانے کا بیان	۷۲

- ۵۱۔ حالت نفاس اور حمل میں نفاذ حد کا بیان ۷۲۔ گواہوں میں سے کسی ایک گواہ کے منحرف ہو جانے
- ۵۲۔ دزدہ زنی اور سنگساری دونوں سزاؤں کا اکٹھا نفاذ کرنا ۷۳۔ کا بیان ۹۱
- ۵۳۔ دزدہ زنی کے ساتھ جلا وطنی کی سزا کا بیان ۷۴۔ پانچ گواہوں کی شہادت کا بیان ۹۲
- ۵۴۔ بیوی کی آبروریزی کرنے والے کو قتل کر دینے کا بیان ۷۵۔ پانچ میں سے دو گواہوں کا اپنے بیان سے پھر جانا ۹۲
- ۵۵۔ جرم زنا کے متعلق مروجہ قوانین ۷۷۔ صالحیت گواہوں کی تصدیق کرنے والوں کا انحراف ۹۲
- ۵۶۔ مروجہ قانون اور اسلامی قانون کا موازنہ ۷۷۔ سزائے سنگساری کا حکم ہو جانے کے بعد مجرم کے قتل کیے جان کا بیان ۹۳
- ۵۷۔ مال اور آبرو ۷۸۔ عورت کو اس کی اصلاح کے لیے مارنے کا بیان ۹۴
- ۵۸۔ عورت کو اس کی اصلاح کے لیے مارنے کا بیان ۷۹۔ زنا کے گواہوں کا شرمگاہوں کو دیکھنا ۹۴
- ۵۹۔ 'حد' کے بارے میں معتدلیوں اور خارجیوں کی رائے ۸۰۔ گواہوں کی تعداد کا چار سے کم ہونا ۹۵
- ۶۰۔ ثبوت زنا کے لیے گواہی کا بیان ۸۲۔ ارتکاب زنا کا اقبال کر لینے کا بیان ۹۶
- ۶۱۔ گواہوں کا ایک ہی جگہ اور ایک ہی وقت میں گزرنے کا بیان ۸۲۔ چار بار اقبال جرم کرنے کا بیان ۹۶
- ۶۲۔ وقوعہ جرم کی جگہ کے بارے میں گواہوں کے بیان میں اختلاف ۸۳۔ کئی مجلسوں میں اقبال جرم کرنے کا بیان ۹۷
- ۶۳۔ وقوعہ جرم کے علاقہ کے بارے میں گواہوں کا اختلاف ۸۳۔ اقبال مجرم سے جرح (چھان بین) کرنے کا بیان ۹۹
- ۶۴۔ گناہ کی مجرم کے باکرہ ثابت ہونے کا بیان ۸۴۔ غیر معلومہ عورت سے ملوث ہونے کا بیان ۹۹
- ۶۵۔ گواہی میں تاخیر ہونے کا بیان ۸۴۔ عورت کا اقبال جرم کرنا ۱۰۰
- ۶۶۔ جبری ارتکاب کے بارے میں گواہوں کے بیان میں اختلاف ۸۴۔ گونگے مرد یا گونگی عورت کے ساتھ ملوث ہونے کا بیان ۹۳
- ۶۷۔ خاوند کا بیوی کے خلاف گواہی دینے کا بیان ۸۵۔ گونگے کے اقرار جرم کا بیان ۹۴
- ۶۸۔ گواہ پر جرح کا بیان ۸۵۔ اقبال جرم کے بعد پھر جانے کا بیان ۹۵
- ۶۹۔ نابینا کی گواہی کا بیان ۸۶۔ اجنبی عورت کو بیوی تصور کر لینا ۹۷
- ۷۰۔ مجرم کا شادی شدہ ہونے سے انکار کرنا ۸۶۔ غلط فہمی کی ایک اور صورت ۹۸
- ۷۱۔ گواہ بننے کی اہلیت سے خارج ہو جانے کا بیان ۸۶۔ غیر عورت سے زفاف ہو جانے کا بیان ۹۹
- ۷۲۔ سنگساری میں پہلے گواہوں کا پتھر مارنا ۸۶۔ بے شوہر عورت کے حمل ہو جانے کا بیان ۱۰۰
- ۷۳۔ گواہوں کے اپنے بیان سے پھر جانے کا بیان ۸۷۔ شادی شدہ مرد کا غیر شادی شدہ عورت سے ملوث ہونے کا بیان ۱۰۱
- ۷۴۔ شاہدوں کا ناقابل اعتماد ثابت ہونا ۸۸۔ سلطان یا (صاحب اقدار) کا کسی کو زنا پر مجبور کرنا ۱۰۲
- ۷۵۔ بددوران۔ مجرم کی موت واقع ہو جانے کا بیان ۸۸۔ زنا بالجبر کا بیان ۱۰۳
- ۷۶۔ نفاذ حد کے فیصلہ میں حاکم سے غلطی ہونے کا بیان ۸۹۔ بدکاری کے معاوضہ کا بیان ۱۰۴
- ۷۷۔ گواہوں کا اپنے بیان سے پھر جانا ۹۰۔ کنوارے اور شادی شدہ ہونے کی حالت میں ارتکاب ۱۰۵
- ۷۸۔ جاننا چاہیے کہ ۹۰۔ گناہ کرنا ۱۱۳
- ۷۹۔ شہادت گزر جانے کی گواہی کا بیان ۹۰۔ عدت کے دوران عقد کر لینے کا بیان ۱۰۶
- ۸۰۔ چار بیویوں کے ہوتے پانچویں سے عقد کرنے کا بیان ۱۰۷

۱۰۸۔ محارم (جن سے نکاح حرام ہے) سے نکاح کر لینے کا بیان	۱۱۳۔ ۱۳۶۔ بن دیکھے الزام پر لعان کرنے کا مسئلہ
۱۰۹۔ محارم سے بدکاری کرنے کا بیان	۱۱۴۔ ۱۳۷۔ بدورانِ عدت بدکاری کا ارتکاب
۱۱۰۔ آقا (مالک یحییٰ) کا اپنی شادی شدہ لونڈی سے مباشرت کرنا	۱۱۵۔ ۱۳۸۔ عقد کے بعد ہی طلاق یافتہ عورت کے ہاں بچہ پیدا ہونے کا بیان
۱۱۱۔ مرتکب زنا کا عورت کے حال سے ناواقف ہونے کا بیان	۱۱۶۔ ۱۳۹۔ نکاح کے بعد خاوند کے مفقود الخبر ہو جانے کا بیان
۱۱۲۔ بیوی کی مملوکہ لونڈی سے بدکاری کا بیان	۱۱۷۔ ۱۴۰۔ خارجیوں کی رائے
۱۱۳۔ غیر مسلم حربی کی بدکاری کا بیان	۱۱۸۔ ۱۴۱۔ معتزلیوں کی رائے
۱۱۴۔ مجاہد کا مرتکب زنا ہو جانا	۱۱۹۔ ۱۴۲۔ انسانی خصائل ذمہ کو ختم کرنے میں شریعت اسلامیہ کا کردار
۱۱۵۔ مشرکین اہل کتاب کا مرتکب زنا ہونا	۱۲۰۔ ۱۴۳۔ غلام پر حد کا نفاذ
۱۱۶۔ حرمت زنا سے لاعلمی کا اظہار کرنا	۱۲۱۔ ۱۴۴۔ کیا آقا کو اپنے مملوک (لونڈی، غلام) پر حد نافذ کرنے کا حق ہے؟
۱۱۷۔ حرکت غیر فطری کے مرتکب ہونے کا بیان	۱۲۲۔ ۱۴۵۔ ذمی پر نفاذ حد کا بیان
۱۱۸۔ میاں بیوی میں جھگڑا کر دینے کا بیان	۱۲۳۔ ۱۴۶۔ یہودی پر نفاذ حد کا بیان
۱۱۹۔ ثبوت جرم کے بارے میں شریعت کی سختی کا بیان	۱۲۴۔ ۱۴۷۔ مسلمانوں کا اپنے ناموس کی پاسداری کرنے کا بیان
۱۲۰۔ لعان (بریت کی قسم کھانے) کا بیان	۱۲۵۔ ۱۴۸۔ ضروری تصریحات
۱۲۱۔ ملت اسلام میں سب سے پہلا لعان	۱۲۶۔ ۱۴۹۔ مرتکب زنا کا پردہ ڈھکنے کا بیان
۱۲۲۔ لعان کی تعریف	۱۲۷۔ ۱۵۰۔ مسلمان کا اپنے گناہ کو چھپانا
۱۲۳۔ لعان سے انکار کرنے کا بیان	۱۲۸۔ ۱۵۱۔ نفاذ حدود (یعنی شرعی سزاؤں کا نافذ کرنا) گناہ کا کفارہ ہے
۱۲۴۔ صلاحیت لعان کا بیان	۱۲۹۔ ۱۵۲۔ حرمت مصاہرہ کا بیان
۱۲۵۔ لعان سے میاں بیوی کے درمیان علیحدگی کا بیان	۱۳۰۔ ۱۵۳۔ ناجائز لڑکی کے متعلق احکام
۱۲۶۔ لعان کے بعد پھر میاں بیوی کا باہم ملنا	۱۳۱۔ ۱۵۴۔ بدکاری کی خرابیوں کا بیان
۱۲۷۔ الفاظ لعان کا بیان	۱۳۲۔ ۱۵۵۔ منکث کا بیان
۱۲۸۔ حمل کے بارے میں لعان کرنے کا بیان	۱۳۳۔ ۱۵۶۔ زنا کار عورت کیساتھ نکاح کا بیان
۱۲۹۔ گوئگے کے بارے میں حکم شرعی	۱۳۴۔ ۱۵۷۔ بیوی یا خاوند کے ارتکاب بدکاری کا بیان
۱۳۰۔ لعان کرنے والوں کی اولاد کا بیان	۱۳۵۔ ۱۵۸۔ نکاح متعہ کا بیان
۱۳۱۔ لعان کے بعد مہر کے مطالبہ کا بیان	۱۳۶۔ ۱۵۹۔ لواطت (یعنی مرد کے ساتھ بد فعلی) کی سزا کا بیان
۱۳۲۔ اولاد کے رنگ کا باپ کے رنگ سے نہ ملنا	۱۳۷۔ ۱۶۰۔ سزائے لواطت کے متعلق صحابہ کی رائے
۱۳۳۔ تہمت لگانے کے بعد طلاق دے دینے کے متعلق مسائل	۱۳۸۔ ۱۶۱۔ لواطت مستوجب لعنت الہی ہے
۱۳۴۔ ولادت کے بعد بچے (کا باپ ہونے) سے انکار	۱۳۹۔ ۱۶۲۔ لواطت سے حرمت مصاہرہ عائد ہونے کا بیان
۱۳۵۔ بیوی کو کسی خاص شخص کے ساتھ بدنام کرنے کا بیان	۱۴۰۔ ۱۶۳۔ بیویوں کے ساتھ غیر فطری مباشرت کرنے کا بیان
	۱۴۱۔ ۱۶۴۔ جانور کے ساتھ بد فعلی کرنے کا بیان

۲۲۲	کرنے والے کا بیان	۱۸۲	۱۶۵۔ جس جانور سے بد فعلی کی جائے اس کی بابت حکم
۲۲۲	۱۹۶۔ مال مسروقہ کے تبدیل ہو جانے کا بیان	۱۸۳	۱۶۶۔ ایسے جانور کے ذبیحہ کا بیان جس سے بد فعلی کی گئی ہو
۲۲۲	۱۹۷۔ ایسی اشیاء جن کو مال تصور نہیں کیا جاتا	۱۸۳	۱۶۷۔ ہاتھ کی رگڑ سے اخراج مادہ تولید یا جلق لگانے کا بیان
۲۲۳	۱۹۸۔ مال مسروقہ پر سارق کے دعویٰ ملکیت کا بیان	۱۸۵	۱۶۸۔ حد سرقہ کا بیان
۲۲۴	۱۹۹۔ مال غنیمت یا بیت المال سے چوری کرنے کا بیان	۱۸۹	۱۶۹۔ چوری کیا ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟
۲۲۵	۲۰۰۔ خیمے کی چوری کا بیان	۱۹۰	۱۷۰۔ مال مسروقہ کا نصاب (یعنی کم سے کم مقدار)
۲۲۵	۲۰۱۔ کعبہ مکرمہ سے چوری کرنے کا بیان	۱۹۲	۱۷۱۔ کتنا ہاتھ کاٹا جائے گا؟
۲۲۶	۲۰۲۔ مسجد میں چوری کرنے کا بیان	۱۹۷	۱۷۲۔ معاملات (یا عمرانی قوانین) اسلامی کا بیان
۲۲۶	۲۰۳۔ جیب کترے یا کیسہ بر کا بیان	۱۹۷	۱۷۳۔ چوری ثابت ہونے کا بیان
۲۲۷	۲۰۴۔ قطار میں سے جانور کی چوری کا بیان	۱۹۸	۱۷۴۔ دوسرے جرائم کے مقابلہ میں چوری کی شدت کا بیان
۲۲۸	۲۰۵۔ قرابت داروں کی چوری کا بیان	۱۹۹	۱۷۵۔ گواہی گزارنے کا بیان
۲۳۰	۲۰۶۔ شوہر یا بیوی کے مال کی چوری کا بیان	۲۰۱	۱۷۶۔ گواہوں کی غلط بیانی کا بیان
۲۳۲	۲۰۷۔ سزائے قطع کا دعویٰ کرنے کا بیان	۲۰۲	۱۷۷۔ حداد (سزا دینے والے جلاذ) کی غلطی کا بیان
۲۳۲	۲۰۸۔ جرم سرقہ میں شریک ہونے کا بیان	۲۰۳	۱۷۸۔ مال مسروقہ کی چوری ہو جانے کا بیان
۲۳۳	۲۰۹۔ چوروں کے ایک گروہ کا گھر میں داخل ہونا	۲۰۴	۱۷۹۔ حرز (حفاظت) سے کیا مراد ہے؟
۲۳۴	۲۱۰۔ دروازہ توڑنے یا نقب زنی کا بیان	۲۰۶	۱۸۰۔ ہوشلوں اور ہوشلوں میں چوری کرنے کا بیان
۲۳۷	۲۱۱۔ کم عمر آزاد (غیر مملوک) لڑکوں کو چرانے کا بیان	۲۰۷	۱۸۱۔ دکان کی چوری کا بیان
۲۳۹	۲۱۲۔ مہمان کے چوری کرنے کا بیان	۲۰۸	۱۸۲۔ جلد خراب ہو جانے والی اشیاء کا بیان
	۲۱۳۔ تاجروں کی دکان، عمومی عمارات اور مشترکہ مقامات سے چوری کرنے کا بیان	۲۱۱	۱۸۳۔ درخت میں لگی ہوئی کھجوروں کی چوری کا بیان
۲۴۰	۲۱۴۔ کشتی میں سے چوری کرنے کا بیان	۲۱۱	۱۸۴۔ حرام مشروبات کی چوری کا بیان
۲۴۱	۲۱۵۔ مقرض کے مال کی چوری کرنے کا بیان	۲۱۲	۱۸۵۔ قرآن مجید اور علمی کتابوں کی چوری کا بیان
۲۴۱	۲۱۶۔ واپس کیے ہوئے مال مسروقہ کو چرانے کا بیان	۲۱۳	۱۸۶۔ کفن چور کا بیان
۲۴۲	۲۱۷۔ سزا کے ساتھ ادائیگی قرض کا بیان		۱۸۷۔ مسلمان کا مستأمن (غیر مسلم پناہ گیر) کے ہاں چوری کرنا
۲۴۳	۲۱۸۔ گھر کے اندر (اجنبی شخص کے) داخل ہونے کا بیان	۲۱۶	۱۸۸۔ مستأمن یا معاہدہ کے چوری کرنے کا بیان
۲۴۵	۲۱۹۔ سزائے قطع پر عمل درآمد ہونے سے پہلے سارق کا	۲۱۶	۱۸۹۔ ذمی کا مال چوری ہونے کا بیان
	مال مسروقہ پر ملکیت حاصل ہو جانے کا بیان	۲۱۷	۱۹۰۔ آلات لہو و لعب کی چوری کا بیان
۲۴۵	۲۲۰۔ سزائے قطع سے پہلے مال مسروقہ کی مالیت کم ہو جانے کا بیان		۱۹۱۔ سرقہ کے علاوہ (اسی طرح کے) دوسرے جرائم کا بیان
۲۴۶	۲۲۱۔ دین سے بیگانہ اشخاص کے اعتراضوں کا بیان	۲۱۹	۱۹۲۔ احکام متعلقہ مال کی خلاف ورزی کا بیان
۲۴۷	۲۲۲۔ سارق کی توبہ کا بیان	۲۱۹	۱۹۳۔ غنکس (دھوکے سے مال ہتھیا لینے والے) کا بیان
۲۴۹	۲۲۳۔ قذف کی حد (یعنی سزائے شریعی) کی تعریف	۲۲۰	۱۹۴۔ امانت دار کا مال امانت سے انکاری ہو جانے کا بیان
۲۵۳			۱۹۵۔ فدااری کرنے یا لوٹنے والے اور امانت میں خیانت

۲۵۲۔ غلام کا آقا کے خلاف اور بیٹے کا باپ کے خلاف دعویٰ کرنے کا بیان	۲۵۳۔ سزائے قذف کے قانون شرعی ہونے کی مصلحت
۲۵۳۔ تمام مذاہب اس بات پر متفق ہیں کہ کسی پر بہتان لگانا اس کی عزت پر ہاتھ ڈالنا ہے۔	۲۵۶۔ قذف (الزام) کے مباح ہونے کی صورت
۲۵۴۔ سزائے قذف کے بارے میں نادانوں کے اعتراض کا بیان	۲۵۶۔ اسلامی احکام سرقہ کے بارے میں بعض بے دینوں کے اعتراض کا بیان
۲۵۴۔ قاذف کو معافی دینے کا بیان	۲۵۷۔ دوسرے محرکات جرائم کے سد باب کا بیان
۲۵۵۔ کسی کو اس کے چچا یا ماموں سے منسوب کرنے کا بیان	۲۵۸۔ بد اعمالیوں کے حق میں بھی شریعت اسلامیہ باعث رحمت ہے۔
۲۵۶۔ غیر مسلم یا غلام کی شہادت کا بیان	۲۵۹۔ جرم سرقہ کے مستوجب قطع ہونے کے لیے مقدار مال متعین کرنے کی حکمت
۲۵۷۔ بدنام کرنے کا بیان	۲۶۰۔ قذف (بہتان) کی سزا کا بیان
۲۵۸۔ بیوی پر کسی خاص شخص کے ساتھ ملوث ہونے کا بیان	۲۶۰۔ قذف کی شرعی تعریف
۲۵۹۔ اولاد سے انکار کرنے کا بیان	۲۶۳۔ الفاظ تہمت کا بیان
۲۶۰۔ خاوند کا اپنی بیوی کے حمل سے انکار کرنے کا بیان	۲۶۳۔ بہتان لگانے والے کی گواہی کے ناقابل تسلیم ہونے کا بیان
۲۶۱۔ انکار حمل کرنے کے لیے وقت کی قید	۲۶۵۔ مقدوف کی ماں کا غیر مسلم یا لونڈی ہونا
۲۶۲۔ لعان کے بعد عورت پر تہمت لگانے کا بیان	۲۶۵۔ سزائے قذف پر عمل درآمد ہونے سے پہلے قاذف کی گواہی کا بیان
۲۶۳۔ نفاذ حد کا بیان	۲۶۶۔ آزاد شخص پر غلام کے تہمت لگانے کا بیان
۲۶۴۔ سزا کے بارے میں مجرم کی حالت کو ملحوظ رکھنے کا بیان	۲۶۷۔ کسی ملکی کو فارسی کہنے کا بیان
۲۶۵۔ مختلف جرائم کی سزائوں میں ترتیب کا بیان	۲۶۸۔ جرم تہمت کے اقرار کرنے کا بیان
۲۶۶۔ توبہ نصوح کا بیان	۲۶۸۔ ثبوت الزام کے لیے شہادت پیش کرنے کا بیان
۲۶۷۔ قاذف کی توبہ قبول ہونے کا بیان	۲۶۸۔ الزام زنا کی گواہی کا بیان
۲۶۸۔ جرم قذف سے توبہ کرنے کا طریقہ	۲۷۰۔ گواہوں کی تعداد چار سے کم ہونے کا بیان
۲۶۹۔ سزا کی دوسری قسم قصاص کا بیان	۲۷۰۔ گواہوں کے فاسق ہونے کا بیان
۲۷۰۔ قصاص کی تعریف	۲۷۱۔ تہمت لگانے میں مبالغہ سے کام لینے کا بیان
۲۷۱۔ قصاص کا ثبوت	۲۷۲۔ بار بار اتہام لگانے کا بیان
۲۷۲۔ قصاص نافذ کرنے والے حاکم یا جاز کا بیان	۲۷۲۔ کسی جماعت پر تہمت لگانے کا بیان
۲۷۳۔ بادشاہ (یا صاحب اقتدار) کو بھی قصاص کا پابند ہوگا	۲۷۵۔ نابالغ (لڑکے) یا جنون زدہ کا اپنی بیوی پر تہمت لگانا
۲۷۴۔ شریعت اسلامیہ کے نزدیک اپنی خون کی اہمیت	۲۷۵۔ گونگے کا کسی کو تہمت لگانا
۲۷۵۔ قاتل کی توبہ کا بیان	۲۷۵۔ کافر (غیر مسلم) کے بہتان لگانے کا بیان
۲۷۶۔ قتل عمد کے کفار سے کیا بیان	۲۷۹۔ کسی مجوسی کے مسلمان ہو جانے کے بعد اس پر تہمت لگائی جانے کا بیان
۲۷۷۔ قتل ناحق کی سزا کا بیان	۲۷۹۔ مقتوف کے وفات پا جانے کا بیان
۲۷۸۔ قصاص کے معاف کرنے کا بیان	۲۷۹۔ وفات یافتہ پر تہمت لگانے کا بیان
۲۷۹۔ اسلامی احکام کی خوبیوں کا بیان	

۳۰۵۔ اس حالت کا بیان جبکہ ایک شخص نے کسی کو پکڑ رکھا اور	۳۲۱۔ قاتل پر مقتول کے ورثاء کی بالادستی کا بیان
۳۷۳۔ دوسرے نے اسے قتل کر دیا	۳۲۱۔ جرم قتل کے بارے میں سلطان (حکومت) کے اختیارات
۳۷۴۔ قتل خطا (یا قتل غیر عمد) میں دیت کی معافی کا بیان	۳۲۲۔ کا بیان
۳۷۵۔ قصاص جان کے طریقہ کا بیان	۳۲۵۔ قاتل کے وفات پا جانے کا بیان
۳۸۰۔ ارتکاب قتل کے بعد حرمین میں پناہ لینے کا بیان	۳۲۵۔ مطالبہ خون کے حقداروں میں معافی کے بارے میں
۳۸۲۔ ایسا قتل عمد جس میں قصاص عائد نہیں ہوتا	۳۲۵۔ اختلاف کا بیان
۳۱۰۔ زخم لگنے کے بعد مجروح کی سماجی حیثیت بدل جانے	۳۲۷۔ مقتول کا مرنے سے پہلے اپنے خون کو معاف کر دینا
۳۸۹۔ کا بیان	۳۳۲۔ قتل عمد میں، مال کے عوض مصالحت کرنے کا بیان
۳۹۲۔ دوہرے جرائم کے ارتکاب کا بیان	۳۲۷۔ خون کے وارثوں میں سے کسی فرد واحد کے معاف
۳۱۲۔ کیا مرد کے ہاتھ کاٹنے کے جرم مانے کو عورت اپنا حق مہر	۳۳۳۔ کرنے کا بیان
۴۰۱۔ قرار دے سکتی ہے؟	۳۳۴۔ قصاص سے موت واقع ہو جانے کا بیان
۴۰۳۔ احکام متعلقہ نفاذ قصاص کا بیان	۳۳۵۔ چھوٹے بچے کی وجہ سے قصاص میں تاخیر
۳۱۴۔ ان امور کا بیان جن سے جرم مستوجب قصاص ثابت	۳۳۶۔ صغیر سن بیٹے کے قتل کا قصاص لینے کا بیان
۴۰۵۔ ہوتا ہے	۳۳۶۔ بیٹے کو قتل کرنے کا بیان
۴۱۳۔ گواہوں کی شہادت کا بیان	۳۳۷۔ قتل عمد کے مشابہ قتل کا بیان
۴۱۵۔ اعضائے انسانی کو نقصان پہنچانے کا بیان	۳۳۷۔ بھاری چیز سے ہلاک کرنے، ڈبوں یا جلا دینے
۴۲۶۔ کان کے دونوں اعضائے ظاہر کے کاٹ دینے کا بیان	۳۴۰۔ کا بیان
۴۲۶۔ کان کی آنکھ پھوڑ دینے کا بیان	۳۴۶۔ زخم کے اثر سے موت واقع ہو جانے کا بیان
۴۲۶۔ سر، ڈاڑھی اور ابرو کے بال کاٹ دینے کا بیان	۳۴۷۔ کافر کو قتل کرنے کا بیان
۴۲۸۔ دونوں ہاتھوں اور دونوں پیروں کی دیت کا بیان	۳۵۱۔ غلام کے قتل پر آزاد کو سزائے قتل کا بیان
۴۲۹۔ آنکھ کی پلک اور برہنوں کے متعلقہ جرائم کا بیان	۳۵۲۔ عورت کے قصاص میں مرد کو قتل کیے جانے کا بیان
۴۲۹۔ انگلی وغیرہ کاٹ دینے کا بیان	۳۵۲۔ قتل سے ادنیٰ جرائم میں مرد اور عورت کے درمیان
۴۳۳۔ جان کے علاوہ دوسرے نقصانات کے قصاص کا بیان	۳۵۳۔ نفاذ قصاص کا بیان
۳۲۴۔ لٹے کا سالم ہاتھ والے کے ہاتھ کاٹنے (اور اسی کے	۳۵۴۔ قتل کیے جانے پر مجبور کیے جانے کا بیان
۴۳۶۔ مثل جرائم) کا بیان	۳۵۹۔ تادیب کے لیے مارنے کا بیان
۴۳۸۔ مجرم کے ناکارہ یا مقطوع ہاتھ کا بیان	۳۶۰۔ مستوجب حد کا غیر مستوجب حد کے ساتھ قتل میں
۴۳۸۔ ایک مجرم کے متعدد جرموں کا سزاوار ہونے کا بیان	۳۶۰۔ شریک ہونے کا بیان
۳۲۷۔ ایسے جرائم کا بیان جن میں سزا کے لیے حکومت کی تجویز	۳۶۱۔ ایک شخص کے قتل کی پاداش میں متعدد اشخاص کو سزائے
۴۴۰۔ درکار ہے	۳۶۳۔ قتل کا بیان
۴۴۶۔ اگلیوں اور ہتھیلی کے تاوان کا بیان	۳۶۷۔ متعدد اشخاص کے قاتل کا بیان
۴۴۷۔ اقسام جراحات کا بیان	۳۶۹۔ دو آدمیوں کا مل کر ایک شخص کا ہاتھ کاٹنا
۴۴۸۔ زخم، 'موضع' کی تفصیل	۳۷۱۔ ایک شخص کا دو شخصوں پر زیادتی کرنا
۴۴۸۔ جراحت موضع کا محل وقوع	

۳۳۲۔ زخموں کی بقیہ اقسام	۴۴۹	۳۶۱۔ رہزنی میں عورت کی شمولیت کا بیان	۵۲۱
۳۳۳۔ قصاص لینے میں تاخیر کرنے کا بیان	۴۵۳	۳۶۲۔ رہزنیوں کی میت پر نماز جنازہ پڑھنے کا بیان	۵۲۱
۳۳۴۔ حاملہ عورت کے قصاص میں التوا کا بیان	۴۵۴	۳۶۳۔ توبہ کر لینے والے کی شہادت کا بیان	۵۲۱
۳۳۵۔ مجرم سے قصاص جراحت لینے کے بعد مجروح کے وفات پا جانے کا بیان		۳۶۴۔ قتل غیر واجب القصاص کا بیان	۵۲۲
۳۳۶۔ دیت کا بیان	۴۵۶	۳۶۵۔ متعدد جرائم کے ارتکاب کا بیان بجز محاربہ کے	۵۲۲
۳۳۷۔ جرم خطا کی دیت	۴۵۷	۳۶۶۔ امامت (حکومت) کی شرطوں کا بیان	۵۲۳
۳۳۸۔ دیت کی اقسام	۴۵۹	۳۶۷۔ امام سے سرکشی کرنے کا بیان	۵۲۵
۳۳۹۔ عورت اور عیسائی یا یہودی کی دیت کا بیان	۴۶۰	۳۶۸۔ باغی اشخاص کے قید کرنے اور ان کے مال کے متعلق مسائل	۵۲۹
۳۴۰۔ پیٹ کے بچے کے ساتھ جرم کا بیان	۴۶۱	۳۶۹۔ مرتد کا بیان، مرتد کے متعلق مسائل اور مرتد کی تعریف	۵۳۱
۳۴۱۔ حاکم کی تفصیل اور بتا خیر ادائیگی تاوان کا بیان	۴۶۲	۳۷۰۔ مرتد کے توبہ کرنے کا بیان	۵۳۳
۳۴۲۔ قسامہ (ارتکاب جرم کے بارے میں قسم کھانے کا بیان		۳۷۱۔ مرتدہ (اسلام سے پھر جانے والی عورت) کا بیان	۵۳۵
۳۴۳۔ کفارہ قتل کا بیان	۴۸۲	۳۷۲۔ مرتد کی املاک کا بیان	۵۳۷
۳۴۴۔ سزا کی تیسری قسم	۴۹۶	۳۷۳۔ زندیق (یا منافق) کا بیان	۵۳۹
تغزیرات (سزاؤں) کا بیان		۳۷۴۔ مرتد کے دارالحرب میں چلے جانے کا بیان	۵۴۱
۳۴۵۔ تغزیر کی تعریف	۵۰۰	۳۷۵۔ مرتد کے تصرفات (انجام دادہ معاملات) کا بیان	۵۴۶
۳۴۶۔ تغزیر کے بارے میں شرعی ہدایات	۵۰۰	۳۷۶۔ نابالغ (بچے) یا جنون زدہ کے مرتد ہو جانے کا بیان	۵۴۷
۳۴۷۔ باپ کا بیٹے کو تادیباً سزا دینا	۵۰۱	۳۷۷۔ بچے کے بالغ ہو کر مرتد ہو جانے کا بیان	۵۴۹
۳۴۸۔ حاکم کا سزا کے طور پر مارنا	۵۰۱	۳۷۸۔ نشہ کی حالت میں مرتد ہو جانے یا اسلام لانے کا بیان	۵۵۰
۳۴۹۔ بعض شبہات کا ازالہ	۵۰۲	۳۷۹۔ ارتداد کے اقرار یا شہادت کا بیان	۵۵۱
۳۵۰۔ سزائے تادیب دینے کا طریقہ	۵۰۳	۳۸۰۔ مرتد کے توبہ کرنے کا بیان	۵۵۲
۳۵۱۔ اسلامی شریعت کی جزورسی کا بیان	۵۰۵	۳۸۱۔ مرتد کے متعلق احکامات	۵۵۳
۳۵۲۔ ایک سوال اور اس کا جواب	۵۰۶	۳۸۲۔ مرتد ہو جانے کا نتیجہ	۵۵۴
۳۵۳۔ ثبوت تغزیرات کی دلیل کا بیان	۵۰۷	۳۸۳۔ گناہ کبیرہ کا بیان	۵۵۵
۳۵۴۔ بعض وضاحتیں	۵۰۷	۳۸۴۔ اس حدیث کے معنی	۵۵۵
۳۵۵۔ اسلام کا معاشرتی نظام	۵۰۹	۳۸۵۔ دوسرے سوال کا جواب	۵۶۱
۳۵۶۔ قوانین شرعیہ کے اصول کا بیان	۵۱۰	۳۸۶۔ آٹھواں گناہ کبیرہ جھوٹی گواہی کا بیان	۵۶۱
۳۵۷۔ باغیوں اور سرکشوں کا بیان	۵۱۱	۳۸۷۔ نوواں گناہ کبیرہ دیدہ و دانستہ جھوٹی قسم کھانے کا بیان	۵۶۳
۳۵۸۔ رہزنیوں کے متعلق احکامات کا بیان	۵۱۲	۳۸۸۔ دسواں گناہ کبیرہ زنا کا بیان	۵۶۴
۳۵۹۔ ڈاکوؤں کے جتھے کا بیان	۵۱۵	۳۸۹۔ گیارہواں گناہ کبیرہ شراب نوشی کا بیان	۵۶۷
۳۶۰۔ ڈاکوؤں کا کسی شخص کو زخمی کر دینے کا بیان	۵۱۷	۳۹۰۔ بارہواں اور تیرہواں گناہ کبیرہ، نمیمہ (چغلی) اور پیشاب سے نہ بچنے کا بیان	۵۶۹
	۵۱۸	۳۹۱۔ چودھواں گناہ کبیرہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہونے	

۵۷۲	مالی اعانت نہ کرنا	۵۷۰	کا بیان
۵۷۳	۳۹۵۔ اٹھا رھواں گناہ کبیرہ والدین کی نافرمانی کرنا	۵۷۱	۳۹۲۔ پندرھواں گناہ کبیرہ مکر الہی (عذاب ناگہانی) سے بے خوف ہونا
۵۷۵	۳۹۶۔ انیسواں گناہ کبیرہ غلول (مال غنیمت کے چھپا لینے)	۵۷۱	۳۹۳۔ سوٹھواں گناہ کبیرہ حرم کے ممنوعہ علاقہ میں امر ممنوع کو حلال کر لینا
۵۷۹	کا بیان	۵۷۱	۳۹۴۔ سترھواں گناہ کبیرہ ابن السبیل (غریب الوطن) کی
۵۸۰	۳۹۷۔ بیسواں گناہ کبیرہ عمد نماز ترک کرنا		
	۳۹۸۔ گناہ کبیرہ، جادو کا بیان		

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حدود (تعزیرات اسلامی) کا بیان

کلمات ابتدائیہ

(اُمّ المؤمنین) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ قبیلہ بنی مخزوم کی ایک عورت کے متعلق جس نے چوری کی تھی قبیلہ قریش کے لوگوں کو سخت فکر لاحق تھا (کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا) لہذا اہل قریش نے باہم مشورہ کیا کہ اس بارے میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض معروض کیا جائے سب کے مشورہ سے قرار پایا کہ اسامہ بن زید کے سوا جس کو حضور بہت چاہتے ہیں اور کوئی شخص اس کی جرات نہیں کر سکتا۔ لیکن (اسامہ کے عرض کرنے پر) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”یا اسامہ اتشفع فی حد من حدود اللہ“ (یعنی اے اسامہ اللہ کی عقر کر دہ سزاؤں کے معاملہ میں تم میرے سامنے سفارش لے کر آئے ہو؟) اس کے بعد آپ کھڑے ہو گئے اور خطاب فرمایا کہ ”انما اهلك الدين من قبلكم انهم كانوا اذا سرق فيهم الشريف تركوه و اذا سرق فيهم الضعيف اقاموا عليه الحد و ايم الله تو ان فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت يدها“ (متفق علیہ) (یعنی لوگو تم سے پہلے لوگوں کو اس بات نے تباہ کیا کہ جب ان میں سے کوئی معزز آدمی چوری کا مرتکب ہوتا تو اس سے درگزر کرتے تھے اور اگر کوئی معمولی شخص چوری کرتا تو اسے سزا دیتے تھے۔ پھر آپ نے اللہ کی قسم کھا کر کہا کہ اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔^(۱) بخاری، مسلم اور دیگر اصحاب نے اس کی روایت کی ہے۔

۱۔ صحیح مسلم کی روایت میں لفظ یا اسامہ (یعنی اے اسامہ) آیا ہے اور بخاری کی روایت میں لفظ ”فلسلون“ آیا ہے (یعنی چہرہ مبارک پر برہمی کے آثار نظر آنے لگے) اور پھر آپ نے فرمایا تھا کہ ”آیا تم اللہ کی مقرر کردہ سزا کے معاملہ میں مجھ سے سفارش کرنا چاہتے ہو؟ حضرت اسامہ کہتے ہیں کہ انہوں نے جب“ آنحضرت ﷺ کے انکار اور برہمی مزاج کو دیکھا تو التجا کی کہ اے اللہ کے رسول میرے لیے معافی کی دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ میری اس خطا سے درگزر فرمائے یعنی میری مغفرت کے لیے دعا فرما دیجئے۔ اسامہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد آنحضرت نے اس عورت کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا اور ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ بخاری کی روایت میں اتنا اور زیادہ ہے کہ اس کے بعد اس عورت نے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی اور پھر

اس کی شادی بھی ہوگئی۔ یہ عورت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آتی جاتی تھی اور وہ اس کی حاجت مندی کو نبی ﷺ سے بیان کر دیا کرتی تھیں۔ چوری کرنے والی عورت کا نام فاطمہ بنت اسود بن عبد اللہ تھا۔ یہ واقعہ یوم فتح مکہ کو پیش آیا تھا۔

حدیث میں باضی میں جن لوگوں کے ہلاک ہونے کا ذکر ہے ان سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔ اس کی تصریح امام بخاری نے ایک اور روایت میں کی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل میں کوئی معزز آدمی اگر چوری کرتا تو اس کی اہمیت اور عزت کے پیش نظر اس کے جرم کو نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بیچارہ داری و ورخی اور شرعی سزا سے درگزر کرنے کے باعث انہیں ہلاک کر دیا۔ اگر کوئی فرد مایہ آدمی مال و جاہ سے محروم ہوتا اور کسی اونچے خاندان کا فرد نہ ہونے کے باعث اس کی کہیں سے حمایت نہ ہوتی تو اسے سزا دے دی جاتی تھی۔ اور (حدیث میں) لفظ 'ایم اللہ' کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے عزم کو پختہ ظاہر فرمانے کے لیے اللہ کی قسم کھائی کیونکہ یہ موقع اس کا متقاضی تھا۔ اس قسم کا تعلق پختہ ارادہ سے ہے محض قسم نہیں ہے جس کی اہمیت کو صرف خواص جانتے ہیں کہ "اگر فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت محمد ﷺ چوری کر لے تو" معاذ اللہ (یعنی فاطمہ رضی اللہ عنہا اور چوری اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا مگر پھر بھی تاکید کے لیے فرمایا۔) (صحیح)

متوفی دلیل لفاہن فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے۔ مجرم خواہ مرد ہو یا عورت۔ نیز اس حدیث سے مطالبہ قسم کے بغیر قسم کھانے کا جواز بھی ثابت ہوتا ہے۔ اگر کسی اہم امر کے لیے قسم کھائی جائے تو یہ فعل مستحب ہے جیسا کہ حدیث کے مفہوم سے ظاہر ہے اس حدیث سے حدود (اسلامی سزاؤں) کے معاملہ میں سفارش کرنے کی ممانعت بھی نکلتی ہے اور جب معاملہ حاکم شرع کے سامنے پیش ہو جائے تو سفارش کے ممنوع ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ البتہ پیشی سے پہلے بیشتر علماء کے نزدیک سفارش جائز ہے بشرطیکہ وہ شخص جس کے لیے سفارش کی جائے وہ شریک اور اذیت رساں نہ ہو۔ ایسا شخص ہو تو اس کے لیے سفارش منع ہے۔ اگر کوئی ایسی خطا ہو جس کی شرعی سزا مقرر نہیں ہے اس کے بارے میں بشرائط سابقہ سفارش کرنا جائز ہے۔ اگرچہ معاملہ حاکم شرع کے سامنے پیش ہو۔ کیونکہ یہ کوئی اہم معاملہ نہیں ہے۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ کے احکام اور تعزیرات کا تعلق ہے اس میں معزز اور غیر معزز دونوں برابر ہیں اور دین کے خلاف کسی قرابت داری یا کنبہ داری کا لحاظ نہیں ہوتا۔

قرآن حکیم کی اس آیت میں یہی حکم ہے۔ "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلِلسَّيِّئَةِ وَاللَّيِّئِينَ وَالْغَافِلِينَ أُولَئِكَ هُمُ الرَّاغِبُونَ إِلَىٰ عَذَابِ اللَّهِ وَلَهُمْ فِيهِ يَمْكِنُونَ" (النساء: ۱۳۵) (یعنی اے ایمان والو! انصاف پر کاربند رہو اور حق جان کر گواہی دو خواہ یہ تمہارے یا تمہارے والدین یا قرابت داروں کے خلاف ہو۔ نہ مال دار کا خیال کرو نہ محتاج کا اللہ تم سے بہتر ان کا خیر خواہ ہے۔ انصاف کے معاملہ میں خود غرضی کو دخل مت دو۔ اگر تم نے گڑبڑ کی یا انصاف سے ہٹ گئے تو یاد رہے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہے)۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے احکام الہی کی

بجا آوری اور تعزیرات شرعیہ کے نفاذ وغیرہ میں عدل و انصاف سے کام لینے اور اس میں جہد بلیغ کی سخت تاکید فرمائی ہے۔ خواہ یہ سزا مالدار کو دی جائے یا محتاج کو اپنے کو یا غیر کو۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کی پاس داری کا خیال غنی اور محتاج سب کے خیال پر مقدم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے احکام الہی کی بجا آوری میں خواہش نفس کی پیروی بے انصافی، خود غرضی کی بناء پر ترک انصاف یا قرابت داری کا لحاظ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اور دنیا کی آفت و مصیبت کی ہلاکت میں پڑنے اور آخرت میں دردناک عذاب سے ڈرایا ہے۔ آیت 'فان الله بما تعملون خبير' کا یہی مطلب ہے کہ ظلم کرنے اور طریق عدل سے ہٹ جانے کی پاداش میں اللہ تعالیٰ انسان کو عذاب دے گا۔ ظالموں اور ستمگروں کو اللہ کی جانب سے یہ ایک تنبیہ ہے۔

آغاز اسلام میں مسلمانوں کا خیال یہ تھا کہ حاکم کے سامنے شفاعت کرنا اس غرض سے مفید ہوگا کہ عورت اور اس کے خاندان کو عار سے اور دست بردستی کا عیب لگنے سے بچایا جاسکے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس حکم کو بڑی اہمیت دی ہے۔ آپ چاہتے تھے کہ مسلمانوں بلکہ پوری انسانیت پر یہ ثابت ہو جائے کہ اسلام تعزیرات الہیہ کے نفاذ میں اعلیٰ و ادنیٰ اور امیر و فقیر میں کوئی امتیاز نہیں کرتا بلکہ قانون اسلامی کی رو سے سب برابر ہیں کہ سب آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے ہیں 'ان اکرمکم عند الله اتقاکم' (یعنی اللہ کے نزدیک تم میں سے جو زیادہ متقی ہے وہی سب سے زیادہ باعزت ہے) یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ (اسامہؓ کے عرض کرنے پر) اس وقت کھڑے ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد وہ جامع خطبہ ارشاد فرمایا۔ جو عدل کے بنیادی اصول اور انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے والا ہے۔ پھر مسلمانوں کے سامنے وہ زبردست قسم کھائی تاکہ آئندہ کسی متنفس کو یہ شک نہ رہے کہ اس میں کوئی امر ایسا ہو سکتا ہے جو امام کو اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ سزا نافذ کرنے سے باز رکھ سکے۔ خواہ اس کا نفاذ کتنے ہی معزز شریف اور اللہ کے نزدیک مقرب انسان کے خلاف ہو۔ ساتھ ہی حضورؐ نے اپنی بیٹی سیدہ فاطمہؓ زہرا رضی اللہ عنہا کی مثال دی جن کی محبت آنحضرت ﷺ کے دل میں تمام انسانوں میں سب سے زیادہ تھی اور تمام امت محمدیہ میں سب سے زیادہ با شرف تھیں اور یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اسامہؓ کی وہ درخواست سنی جو اسلامی تعزیر کے نفاذ میں مداخلت کی غرض سے تھی تو آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا جس سے سخت ناراضگی کا اظہار ہوتا تھا۔ چنانچہ اس پر آپ نے اسامہؓ کی تنبیہ فرمائی اور کہا کہ اے اسامہؓ کیا تم اللہ کی مقرر کردہ سزا کے خلاف سفارش کرنے آئے ہو۔

واضح ہو کہ حضورؐ کے دل میں حضرت اسامہؓ کی محبت حضورؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کے بعد سب سے زیادہ تھی۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ 'احب الناس الی اسامہ ما خلا فاطمہ ولا غیرہا' (یعنی مجھے تمام لوگوں میں فاطمہؓ کو چھوڑ کر اور کسی سے اتنی محبت نہیں ہے جتنی اسامہؓ سے ہے)۔ ہشام بن عروہ نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ 'ان اسامہ بن زید لاحب الناس الی، او من احب الناس الی، وانا ارجو ان یکون من صالحہم فاستوصوا بہ خیرا' (یعنی بلاشبہ اسامہ بن زید مجھے سب لوگوں سے زیادہ محبوب ہیں یا یہ فرمایا کہ میرے محبوب ترین افراد میں سے ہیں اور مجھے توقع ہے کہ وہ نیک لوگوں میں سے ہیں پس تم ان کی خیر خواہی میں لگے رہو)۔

ان کی قدر اور محبت حضورؐ کے دل میں یہاں تک تھی کہ آپ نے ان کی وجہ سے بدوران حج عرفات سے روانگی

اس حدیث کے متعلق حسب ذیل چند امور تشریح طلب ہیں:

(۱) اس حدیث کے معنی۔

(۲) حدود شرعیہ (شرعی سزاؤں) کی تفصیل اس کی متعلقہ باتیں اور اس کے شرعی حکم ہونے کی

حکمت۔

(۳) اگر (تعزیرات کے باب میں) کوئی حکم شرع اسلام میں نہ ہو تو کیا ہونا چاہئے۔

حدیث کے معنی

حدیث مندرجہ بالا کے معنی ظاہر ہیں کہ: عالی خاندان کی ایک عورت تھی جس کا نام فاطمہ تھا۔ زندگی بھر میں ایک بار اس سے ایک بری حرکت سرزد ہو گئی: اس نے کوئی چیز چرائی جس کی پاداش میں اس پر ہاتھ کاٹے جانے کی شرعی سزا لگو ہوئی قبیلہ قریش کے لوگ سخت مشکل میں پڑ گئے کیونکہ وہ ایک باعزت

میں تاخیر کر دی۔ چنانچہ ہشام بن عروہ نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ جب نبی ﷺ نے اسامہؓ کے انتظار میں عرفہ سے روانگی میں تاخیر کر دی تو ایک حبشی غلام افسس آیا اور اس نے کہا کہ ہمیں تو اس شخص (اسامہؓ) کی وجہ سے رکنا پڑا۔ اس (گستاخی) کی بناء پر اہل یمن کافر ہو گئے تھے۔ یزید بن ہارون کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مرتد ہوئے تھے۔

اسامہ بن زید کی جو توفیر آنحضرت ﷺ کے نزدیک تھی اس سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ اصحاب نبی کریم آگاہ تھے۔ چنانچہ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لوگوں کے وظائف مقرر فرمائے تو حضرت اسامہؓ کا وظیفہ پانچ ہزار مقرر فرمایا اور ابن عمرؓ کا وظیفہ دو ہزار مقرر ہوا اس پر حضرت ابن عمر نے اعتراض کیا کہ آپ نے اسامہؓ کو مجھ پر فوقیت دی۔ حالانکہ جو کچھ میں ہوں وہ نہیں۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ آنحضرت ﷺ اسامہؓ کو تمہارے باپ سے زیادہ چاہتے تھے۔

(دیکھنا چاہئے) کہ رسول اللہ ﷺ کے دل میں اسامہؓ بن زید کی یہ قدر تھی اس کے باوجود حضور نے ان کی سفارش کو رد فرمادیا اور قبول نہ کیا بلکہ ناراض ہوئے اور ان کی خفگی کے آثار اسی طرح چہرہ مبارک سے ظاہر ہوئے جیسا کہ احکام الہی کے خلاف کوئی بات ہوتی تھی تو ہوتا تھا۔ سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہ نے یہ خیال کیا کہ ان سے جو سفارش کرنے کی خطا سرزد ہوئی ہے اس کی پاداش میں وہ عذاب الہی کے مستوجب ہو گئے ہیں لہذا انہوں نے نبی ﷺ کے حضور گڑگڑا کر التجا کی کہ حضور اس گناہ کی جو ان سے سرزد ہو گیا ہے اللہ کی جناب میں مغفرت کی دعا مانگیں کہ اللہ ان کی خطا کو معاف فرمائے اور ان پر رحم کرے۔ جیسا کہ دوسری روایات میں مذکور ہے۔

حدیث کے ان تمام دلائل و شواہد سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو حکم الہی کے لاگو کیے جانے اور مجرم کو خواہ اس کا درجہ اس کی قوم میں کتنا ہی اونچا ہو شرعی سزا کے نفاذ میں کس قدر اصرار تھا اور کوئی طاقت انہیں شرعی سزا کے عملدرآمد سے باز نہ رکھ سکتی تھی۔ خواہ مجرم معزز ہو یا نہ ہو۔ بڑا ہوا یا چھوٹا ہو وہ اس میں کوئی امتیاز یا استثناء روا نہ رکھتے تھے کیونکہ تعزیرات الہیہ کو نافذ کر کے ہی معاشرہ کی برائی کو دور کیا

گھرانے کی خاتون تھی۔ ادھر یہ بھی سب کو معلوم تھا کہ آنحضرت ﷺ شرعی سزا کے نافذ کرنے میں بہت سخت تھے اور اس کو نافذ فرما کر ہی رہتے تھے خواہ مجرم کوئی عظیم شخصیت ہو یا معمولی آدمی۔ مالدار ہو یا محتاج، سب کے ساتھ یکساں سلوک ہوتا تھا۔ غرض لوگ حیران تھے کہ کیا کیا جائے؟ تاہم انہوں نے خیال کیا کہ اسامہ بن زید ہی اس عورت کے بارے میں آنحضرت ﷺ کے حضور سفارش کر سکتے ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ اسامہ کو ان کے باپ (زید) کی طرح بہت چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کا لقب (وصفی نام) حب بن حب (یعنی محبوب کا بیٹا محبوب) تھا۔ غرض اسامہ نے لوگوں کی بات مان لی اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کہ چوری کرنے والی عورت کے لیے معافی کی درخواست کی رسول اللہ ﷺ نے ان کے سفارش کرنے کو ناپسند فرمایا چنانچہ ارشاد ہوا کہ ”اتشفع فی حد من حدود اللہ تعالیٰ“ (یعنی تم اللہ کی مقرر کردہ تعزیر کے خلاف سفارش کر رہے ہو؟) مطلب یہ ہے کہ تمہیں تو ایسی جرات نہ کرنی چاہیے تھی۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسامہ بن زید جانتے تھے کہ مجرم کی پیشی جب حاکم کے سامنے ہو جائے تو اس کے بعد حدود اللہ کے خلاف سفارش کرنا درست نہیں ہے اس وجہ سے حضورؐ نے (سفارش کو) ناپسند فرمایا۔ اگر وہ اس حکم سے بے خبر تھے تو حضورؐ نے ان کو اس طرح بتا دیا۔ غالباً فاطمہ مخزومیہ کے بارے میں اسامہ کا خیال یہ تھا کہ وہ عورت عادی مجرم نہ تھی بلکہ یہ ایک لغزش تھی (جو اس سے سرزد ہو گئی) اور آئندہ وہ ایسا نہ کرے گی۔ یہی سبب تھا کہ وہ سفارش پر آمادہ ہو گئے اور فی الواقع وہ مخزومی عورت ہاتھ کاٹے جانے کی شرعی سزا پانے کے بعد ایک نیک خصلت، توبہ کرنے والی اور صابرہ خاتون بن گئی اور اس کے بعد پھر اس سے کوئی ناشائستہ حرکت سرزد نہیں ہوئی۔

جاسکتا اور قوم کو ہلاکت و بربادی سے بچایا جاسکتا ہے۔ اسی میں قوم کی خوش بختی، وقار اور اس کی بقا ہے اور یہی قومی استحکام و پابرجائی نیز افراد ملت کے درمیان عدل و انصاف قائم کرنے کا موجب ہے۔

یہیں سے تعزیرات شرعیہ کے معاملہ میں سفارش کرنے کی ممانعت نکلتی ہے۔

چنانچہ امام بخاری نے اسی خیال سے یہ باب باندھا ہے جس کا عنوان ہے ”کراہیۃ الشفاعۃ فی الحد اذا رفع الی السلطان“ (یعنی سزا کا معاملہ جب حکمران کے پیش ہو جائے تو تعزیر شرعی کے معاملہ میں سفارش کرنا مکروہ ہے)۔

حدیث مذکورہ کی بعض روایتوں سے اسی خیال کی تائید ہوتی ہے کہ حضورؐ نے اسامہ سے فرمایا کہ تم (اس معاملہ

واضح ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے اسامہ بن زید سے اظہار ناپسندیدگی ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ لوگوں کو اکٹھا کر کے ان سے خطاب فرمایا اور آگاہ کیا کہ اگر بڑے آدمیوں سے نرمی برتی جائے اور کمزوروں پر سختی روا رکھی جائے تو قوم کو سوائے تباہی و بربادی کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ بعض سابقہ قومیں اسی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔ رسول اللہ ﷺ نے قسم کھا کر اس عزم کا اظہار فرمایا کہ وہ اللہ کی مقرر کردہ تعزیر کو خود اپنی بیٹی پر نافذ کرنے میں تاثر نہیں کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضور کا ارشاد برحق ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو آسمانی (خدائی) قانون اور انصاف و ضوابط (کے تمام تقاضے) باطل ہو کر رہ جائیں۔ قوی و ضعیف دونوں پر قانون کو یکساں لاگو نہ کیا جائے تو زبردست کے چنگل سے کوئی کمزور آدمی نہ بچ سکے۔ اور ضعیف آدمی چہرہ دستی کا شکار ہو کر رہ جائے لیکن جو زبردست ہے اس کا کچھ نہ ہو۔ پھر اگر بالفرض کمزور قوی ہو جائے تو اسے حق ہوگا کہ وہ اپنا انتقام لے اور خود سزا سے بچ کر، دوسروں پر جبر کرے لیکن اس کا کچھ نہ بگڑے۔ اسی طرح ہوتا رہے تو یہ طوائف الملوکی جو تمام عمرانی تقاضوں کے منافی ہے نتیجہ قوم کی تباہی و بربادی کا موجب ہو جائے گی۔

(میں) سفارش کیوں کرتے ہو؟ ”لا تشفع فی حد فان الحدود اذا انتهت الی فلیست بمتروكة“ (یعنی حد شرعی کے معاملہ میں سفارش نہ کرو۔ جب سزا کا معاملہ میرے سامنے پیش ہو گیا تو اب اس کو یوں ہی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا)۔

ابوداؤد نے عمر بن شعیب کی حدیث سے جو ان کے والد نے ان کے دادا سے مرفوعاً روایت کی ہے اخراج فرمایا ہے کہ ”تعافوا الحدود فیما بینکم“ فما بلغنی من حد فقد وجب“ (یعنی تم آپس میں سزاؤں کو معاف کر سکتے ہو لیکن جب کوئی معاملہ جرم میرے سامنے پیش کر دیا جائے تو اب اس کی سزا واجب ہو جائے گی)۔ حاکم نے اس روایت کو صحیح بتایا ہے۔

ابوداؤد اور حاکم نے اس کا اخراج فرمایا ہے اور حدیث ابن عمر کی بناء پر اس کو صحیح بتایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے۔

حضور کا ارشاد ہے کہ ”من حالت شفاعتہ دون حد من حدود اللہ فقد ضاد اللہ فی امرہ“ (یعنی اگر کسی شخص کی سفارش اللہ کی مقرر کردہ حدود (تعزیرات) میں سے کسی تعزیر میں حائل ہو جائے تو وہ شخص اللہ کے حکم کی مخالفت کا مرتکب ہے)۔

طبرانی نے عروہ بن زبیر سے اخراج کیا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے چوری کی اور حضرت زبیر سے ملا انہوں نے اس چور کی سفارش کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد، یہ معاملہ امام (حاکم شرع) کے سامنے پیش ہوا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ جب معاملہ امام کے سامنے پیش ہو جائے تو اب سفارش کرنے والے پر اور جس کی سفارش کی جائے دونوں پر لعنت

حدیث مذکورہ کا مطلب یہ ہے کہ کسی حاکم کے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ اللہ کی مقرر کردہ حدود کے بارے میں جس کی تفصیل آگے آرہی ہے، سفارش قبول کرے۔ اسی طرح کسی شخص کے لیے یہ روا نہیں ہے کہ حاکم شرع کے سامنے استغاثہ پیش ہو جانے کے بعد اس معاملہ میں کوئی سفارش کرے۔ اس میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ البتہ حاکم کے سامنے معاملہ پیش ہونے سے پہلے سفارش اور معافی بھی درست ہے۔ بشرطیکہ وہ مجرم جو مستوجب سزا ہے بدنام مجرم نہ ہو۔ اگر وہ عوام کو ایذا دینے کا عادی ہے یا ایسے شر پسندوں میں سے ہے۔ جنہیں معاف کرنا مصلحت نہیں ہے تو ایسے شخص کا معاملہ حاکم کے سامنے پیش کیا جانا واجب ہے تاکہ اسے ایسی شرعی سزا دی جائے۔ جس سے پھر اسے ارتکاب جرم کی جرأت نہ ہو۔ ہاں اگر ایک شخص نے کسی کی چوری کر لی لیکن وہ عادی چور نہیں اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے حق میں سفارش کرنے سے کوئی خرابی نہ ہوگی تو اس کے لیے سفارش کی جاسکتی ہے اور مدعی کو بھی یہ حق ہے کہ اسے معاف کر دے بصورت دیگر معاف کر دینا روا نہیں ہے۔ چنانچہ اس بارے میں کئی حدیثیں آئی ہیں منجملہ ان

ہے۔ لہذا امام (حاکم مجاز) کے لیے جائز نہیں ہے کہ (سفارش کی بناء پر) شرعی سزا کو معاف کر دے اور اگر معاملہ حاکم کے سامنے پیش ہو جائے تو سفارش کرنا حائز نہ ہوگا۔

اس کی تائید وہ روایت کرتی ہے جس کو احمد اور چاروں فقہاء نے صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ سے اخراج فرمایا ہے اور ابن جارد اور حاکم نے اس کو صحیح بتایا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جب اس شخص کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا جس نے حضرت صفوان کی چادر چرائی تھی اور اس کی سفارش کی گئی تو حضورؐ نے فرمایا ”ہلاکان ذلک قبل ان تسأنی بہ“ (یعنی یہ بات پہلے ہونی چاہیے تھی، اس معاملہ کو رفع دفع کرنے کا موقع میرے سامنے پیش ہونے سے پہلے تھا)۔

فقہاء کہتے ہیں کہ حکام اور صاحب اختیار کے پاس بہتری کے لیے سفارش کرنا سنت ہے بشرطیکہ شرعی تعزیر کا معاملہ نہ ہو یا ایسی بات نہ ہو جس کا ترک کرنا (صاحب اختیار کو) جائز نہیں ہے مثلاً کسی یتیم کے سرپرست یا وقف کے مہتمم سے یہ سفارش کی جائے کہ وہ اپنے بعض اختیار کو جو بطور مہتمم اسے حاصل ہیں، کام میں نہ لائے۔ ایسی سفارش شرعاً حرام ہے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ سفارش حسنہ (یعنی وہ سفارش جو بھلائی کے لیے کی جائے) جائز ہے بشرطیکہ ہنوز معاملہ حاکم کے سامنے پیش نہ ہوا ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”من یشفع شفاعۃ حسنۃ یکن لہ نصیب منها“ (یعنی جو بہتری کے لیے سفارش کرے گا اس بہتری میں سفارش کرنے والا بھی حصہ دار ہو جائے گا)۔ حضرت ابو موسیٰ سے ایک روایت صحیحین میں مروی ہے کہ ”ان النبی ﷺ کان اذا اتاہ طالب حاجۃ اقبل علی جلسائہ وقال : اضعوا تو جروا ویقضی اللہ علی لسان نبیہ ما شاء“۔ (یعنی آنحضرت ﷺ کے پاس جب کوئی حاجت مند آتا تو آپ حاضرین مجلس سے فرماتے کہ اس کی سفارش کر دو ثواب ہوگا اور اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبان پر وہی بات لاتا ہے جو وہ پسند

کے دارقطنی کی یہ روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”اشفعوا مالہم یصل الی الوالی، فاذا وصل الی الوالی فعفا فلا عفا اللہ عنہ“ (یعنی جب تک (مجرم کا) معاملہ حاکم کے سامنے پیش نہ ہو۔ تم سفارش کر سکتے ہو لیکن اگر معاملہ عدالت میں پیش ہو جائے اور حاکم مجرم کو معاف کر دے تو اللہ اس حاکم کو معاف نہیں کرے گا۔ واضح ہو کہ یہ حکم حدود، (اللہ کی مقرر کردہ سزاؤں) کے بارے میں ہے۔ رہا قصاص (یا انتقام) کا معاملہ سو اس میں سفارش جائز ہے۔ کیونکہ یہ حقوق العباد (بندوں کے مطالبہ) کا معاملہ ہے۔ اس میں بہر حال معافی کا حق ہے۔

رہے تعزیری معاملات (یعنی اور جرائم کی سزائیں) سو اس بارے میں فقہاء کا کہنا ہے کہ اس میں سفارش کی جاسکتی ہے۔ لیکن بظاہر عقل یہ کہتی ہے کہ مجرموں کی اصلاح اور معاشرہ کا نظم و ضبط سزا کے جاری کرنے پر موقوف ہے۔ لہذا اس معاملہ میں سفارش کرنا حلال نہیں ہے۔ اسی طرح حاکم کو روایا نہیں ہے کہ اس سزا کو معاف کر دے۔ اس کے علاوہ اور حالات میں معاف کر دینا درست ہے اور سفارش جائز ہے کیونکہ فرماتا ہے)۔

لفظ حدود کے معنی:

حد کے لغوی معنی روکنے کے ہیں۔ اسی سے حداد، بنا ہے جس کے معنی دربان کے ہیں جو لوگوں کو گھر میں داخل ہونے سے روکتا ہے۔ اسی طرح لفظ حدود العقار، کے معنی ہیں (جانداد کی حد بندی) وہ امور جو غیر کی جانداد کے شامل ہونے سے مانع ہوں اسی طرح بولنے میں آتا ہے کہ ”احداث المعتدة“ یعنی عدت گزارنے والی عورت نے اپنے نفس کو لذت اندوزی اور تنعم سے باز رکھا۔ جیسا کہ بالعموم ہوتا ہے۔ نیز حد کے معنی جامع و مانع لفظ کے بھی ہیں۔ یعنی ایسا لفظ جو اپنے پورے مفہوم پر حاوی ہو اور اس مفہوم کے علاوہ کسی اور مفہوم کی گنجائش نہ ہو۔

حدود شرعیہ کا مقصد ممنوعات اور اسباب ممنوعات پر قدغن عائد کرنا ہے۔ فقہی اصطلاح میں حد وہ مقررہ سزا ہے جس کا لاگو کرنا بطور حق اللہ (یا حکم الہی کے) واجب ہے اور جیسا کہ بتایا گیا اس کے مفہوم میں اس کے لغوی معنی شامل ہیں۔ مذہب اسلام کی مقرر کردہ یہ سزائیں قرآن حکیم کی آیات سے ثابت ہیں۔ ان آیات میں مثلاً وہ آیتیں ہیں جو بدکاری، چوری، بے گناہ عورتوں پر تہمت لگانے، لڑنے بھڑنے اور دوسرے امور حرمت شراب وغیرہ کے بارے میں ہیں۔ اسی طرح حدود کا ثبوت ان احادیث سے بھی ہوتا ہے۔ جو سزا کے بارے میں آئی ہیں یا آنحضرت ﷺ کے عمل سے ثابت ہیں مثلاً وہ حدیثیں جن میں ’ماغر‘ ’عابدیہ‘ ’عسیف‘ یا نعمان کا ذکر ہے۔ نیز وہ احادیث جن میں رسول اللہ ﷺ یا صحابہ رضوان اللہ علیہم کے سزا نافذ کرنے کا ذکر ہے۔ یا پھر وہ سزائیں جن کے نفاذ پر امت کا اجماع ہے۔ مثلاً وہ سزائیں جن کی توثیق و تائید عقل سلیم کرتی ہو۔ کیونکہ انسانی طبائع اور نفسانی خواہشات، شہوانی تقاضوں کو پورا کرنے اور لذت اندوزی کی طلب میں لگی رہتی ہیں اور اپنی مطلوب و محبوب شے کو حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ مثلاً شراب

شریعت اسلامیہ جلب مصلحت اور دفع مفاسد پر مبنی ہے۔ حاکم کو چاہیے کہ (معافی کے معاملہ) کا فیصلہ دیکھ بھال کر کے کرے کہ مصلحت کیا ہے اور خرابی کا سد باب کس طرح ہو سکتا ہے۔

حدود شرعیہ اور ایسی ہی دوسری سزاؤں کا بیان

لفظ ”حد“ کے لغوی معنی روکنے کے ہیں اور اس لفظ کا اطلاق ایسی سزا پر ہوتا ہے جو شارع علیہ السلام نے مرتکب جرم کے لیے تجویز فرمائی۔ اس کے لاگو کیے جانے کی غرض یہ ہے کہ مجرم آئندہ جرم کا ارتکاب نہ کرے اور جو لوگ ارتکاب جرم کا ارادہ کرتے ہوں ان کو بھی ارتکاب جرم سے باز رکھنے کا موجب ہو۔ اس لفظ کا اطلاق ”گناہ“ پر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”تلك حدود الله فلا تقربوها“ (یعنی یہ امور وہ ہیں جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔ لہذا ان کے پاس بھی نہ پھٹکو) نیز یہ لفظ ان امور کے لیے بھی آیا ہے۔ جن کی حد اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمادی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے ”ومن يتعد حدود الله فقد ظلم نفسه“ (یعنی جس نے اللہ کی مقرر کردہ حد سے تجاوز کیا اس نے اپنے اوپر ظلم کیا)۔

عقوبات شرعیہ کا بیان

ذیل میں ”حدود شرعیہ“ کا بیان شرعی اور اس جیسی دوسری سزاؤں کے مفہوم میں کیا جاتا ہے: مثلاً قصاص (یعنی ایذا ہی کی پاداش میں سزا) اور دوسری شرعی سزائیں۔ واضح ہو کہ شریعت اسلامیہ میں سزاؤں کی تین قسمیں ہیں:

سزا کی پہلی قسم

سزا کی پہلی قسم کا نام ”الحدود“ ہے فقہاء نے ”حد“ کی تعریف یوں کی ہے کہ ”حدود وہ سزائیں ہیں جنہیں نافذ کرنے کا حکم اللہ نے (بطور ایک فریضہ کے) دیا ہے اور جنہیں معاف کرنے کا اختیار کسی کو نہیں ہے۔“

نوشی، بدکاری، قتل، قطع اعضاء، استحصال مال غیر، گالی گلوچ اور چہرہ دستی خاص کر وہ جو زبردست اشخاص کمزوروں پر یا بڑے آدمی چھوٹوں پر روا رکھتے ہیں۔ شریعت اسلامیہ نے یہ تعزیری احکام اس لیے رکھے ہیں کہ برائیوں کی بیخ کنی اس طرح کر دی جائے کہ یہ پھیل نہ سکیں اور ان (جرائم) کے مرتکبوں کو ایسی سزا دی جائے کہ دنیا میں امن و امان کی سبیل نکل آئے۔ اگر یہ سزائیں جاری نہ کی گئیں تو اہل جہان امن و سلامتی کے راستے سے دور ہو جائیں گے۔ جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ دنیا فساد سے پر ہو جائے گی۔

ایسے جرائم جن پر حد (اللہ کی مقرر کردہ سزا) عائد ہوتی ہے ان کی حسب ذیل اقسام ہیں^(۱)
اول زنا (بدکاری)۔

دوسرے سرقہ (چوری)۔

تیسرے قذف (تہمت یا الزام تراشی)۔

چوتھے شراب نوشی جس کے لیے حد شرعی ہونے میں اختلاف ہے۔

وہ سزا جو زمین میں فساد کرنے والے پر عائد ہوتی ہے (یعنی ڈاکہ وغیرہ کی سزا) وہ بھی

چوری، قصاص اور دوسری تعزیرات سے خارج نہیں ہے۔

سزا کی دوسری قسم

سزا کی 'دوسری قسم' 'قصاص' ہے۔ قصاص یہ ہے کہ مجرم کے ساتھ اسی طرح کا سلوک کیا جائے جیسا کہ اس کا جرم ہے۔ قصاص کے (لغوی) معنی یکسانیت کے ہیں چنانچہ (جب کوئی شخص کسی واقعہ کو جوں کا توں بیان کر دے تو کہتے ہیں) "قَصَّ الحديث" (یعنی فلاں شخص نے فلاں واقعہ کو اسی طرح بیان کر دیا جیسا کہ وقوع پذیر ہوا تھا)۔

واضح ہو کہ قصاص کو حد نہیں کہا جاتا کیونکہ یہ (سزا) حقوق العباد میں سے ہے اور (مدعی) کو حق اور اختیار ہے کہ اسے معاف کر دے جیسا کہ آگے مذکور ہے۔

(۱) شافعیہ کہتے ہیں کہ ایسے جرائم جن پر حد عائد ہوتی ہے، ان کی سات صورتیں ہیں:

اول: جراحات (یعنی زخم لگانا)۔ اس میں جان اور اعضائے انسانی کا قصاص اور خون بہا وغیرہ داخل ہیں۔

دوم: بغاوت (حکومت سے سرتابی)۔

سوم: ارتداد (دین اسلام سے پھر جانا)۔

چہارم: زنا (بدکاری)۔

پنجم: قذف (تہمت لگانا)۔

ششم: چوری۔

ہفتم: ناجائز شراب نوشی۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ حدود (یعنی شرعی سزائیں) صرف وہ ہیں جو قرآن سے ثابت ہیں۔ ایسی سزائیں پانچ ہیں۔

اول: زنا کی سزا جو قرآن حکیم کی اس آیت سے ثابت ہے:

"الزانية والزانی فاجلدوا کل واحد منهما مائة جلدة ولا تأخذکم بهما رافة فی دین اللہ

سزا کی تیسری قسم

سزا کی تیسری قسم ”تعزیر“ ہے۔ اس سے مراد ایسے جرم کی سزا ہے جس پر نہ حد (قرآنی سزا) عائد ہوتی ہو اور نہ اس کا کفارہ (شرعی تلافی) عائد ہوتا ہے جیسا کہ آئندہ بیان کیا جائے گا۔ واضح ہو کہ تین حدیں وہ ہیں جن پر فقہاء کا اتفاق ہے:

اول: حد زنا (بدکاری کی سزا) بعض اصحاب کہتے ہیں کہ رجم (سنگ ساری) اس کی سزا نہیں ہے۔

دوم: حد قذف (تہمت یا جھوٹا الزام لگانے کی سزا)۔

سوم: حد سرقت (چوری کی سزا)۔

ان کنتم تؤمنون بالله والیوم الآخر“ (النور: ۲)

(یعنی بدکاری کرنے والا مرد ہو یا عورت دونوں کو سو سوتا زیا نے لگاؤ اور اس قانون الہی کے نفاذ میں ان پر رحم نہ کرو۔ درآنحالیکہ خدا اور یوم آخرت پر تمہارا ایمان ہے)۔

دوم: چوری کی سزا یہ سزا اللہ کے اس ارشاد سے ثابت ہے:

”والسارق والسارقة فاقطعوا ايديهما جزاء بما كسبا نكالا من الله، والله عزيز حكيم“ (المائدہ: ۳۸) (یعنی چوری کرنے والا مرد ہو یا عورت دونوں کے ہاتھ ان کی کرتوت کی پاداش میں کاٹ دو۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ سزا ہے۔ وہی عزت اور حکمت والا ہے)۔

سوم: شراب پینے کی سزا (جس کا حرام ہونا) اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ثابت ہے:

”انما الخمر والميسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه لعلکم تفلحون“ (یعنی شراب، جو اور بتوں کے تھان اور پانسہ ڈالنا گندی باتیں اور شیطانی کام ہیں۔ شیطان سے بچو اسی میں تمہاری بہتری ہے)۔

چہارم: راہزنی کی سزا جو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ثابت ہے: انما جزاء الذین یحاربون الله ورسوله ویسعون فی الارض فسادا ان یقتلوا ویصلبوا او تقطع ایديهم وارجلهم من خلاف او ینفوا من الارض، ذلک لهم خزی فی الدنیا ولهم فی الآخرة عذاب عظیم“ (المائدہ: ۳۳) (یعنی جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے برسر جنگ ہیں اور اس میں فساد پھیلانے پر تلے ہوئے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے یا سولی دی جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ دیے جائیں)۔ (یعنی دایاں ہاتھ اور بائیں پاؤں یا بالعکس) یا پھر انہیں جلا وطن کر دیا جائے۔ ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں سخت عذاب ہے)۔

پنجم: تہمت (یعنی جھوٹا الزام لگانے کی سزا) یہ بھی اس ارشاد باری سے ثابت ہے: والذین یرمون

پہلا باب

شراب نوشی کی حد (شرعی سزا)

جمہور ائمہ فقہاء و علماء شراب پینے کی سزا کو حد خیال کرتے ہیں۔ بعض اصحاب اسے (حد نہیں بلکہ) تعزیر کہتے ہیں۔ سزا کی مقدار کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ (ائمہ ثلاثہ) مالکیہ، حنفیہ اور حنابلہ اس کی سزا اسی (۸۰) دڑے قرار دیتے ہیں کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی تعداد اتنی ہی بتائی ہے۔ اور صحابہ رضوان اللہ علیہم نے اس سے اتفاق فرمایا ہے۔ شافعیہ کہتے ہیں کہ (شراب نوشی کی سزا) چالیس دڑے ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ سے (یہی سزا) مروی ہے۔ چنانچہ مسلم نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ شراب پینے کے مجرم کو کھجور کی کھچی اور جوتی سے چالیس ضربیں لگاتے تھے۔ ایک سے زیادہ مرتبہ شراب پینے کی بھی یہی سزا ہے۔

سیدنا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو کیا وہ بطور تعزیر (سزا) کے تھا۔ (بطور حد شرعی کے نہ تھا)۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے دیکھا کہ بعض علاقوں میں شراب نوشی پھیلی ہوئی ہے لہذا انھوں نے اس سے باز رکھنے کے لیے زیادہ سختی برتی تاکہ شرابیوں کی تنبیہ ہو۔

المحصنات ثم لم ياتوا بأربعة شهداء فاجلدوهم ثمانين جلدة ولا تقبلوا لهم شهادة ابداً، وأولئك هم الفاسقون“ (النور: ۴) (یعنی جو لوگ بے گناہ عورتوں پر الزام لگاتے ہیں اور (اپنے الزام کے ثبوت میں) چار گواہ پیش نہیں کرتے تو ایسے لوگوں کو اسی (۸۰) دڑے لگاؤ اور کبھی ان کی گواہی کو تسلیم نہ کرو۔ یہ لوگ گنہگار ہیں)۔

فقہاء کہتے ہیں کہ قصاص (انتقامی سزا) کو حد نہیں کہا جاتا کیونکہ اس سزا کا تعلق بندوں کے حقوق سے ہے۔ اسی طرح دوسری عام سزاؤں کو بھی حد نہیں کہا جاسکتا کیونکہ وہ سزائیں (اللہ کی) مقرر کردہ نہیں ہیں۔

جادو کرنے کی سزا کو بھی بعض لوگوں نے حدود میں شمار کیا ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ جنایات (یعنی جرائم کی آٹھ صورتیں ہیں):

۱: ائتلاف جان یا اس سے کم درجہ کا جرم۔

۲: بغاوت (حکومت سے سرکشی)۔

۳: ارتداد (دین اسلام سے پھر جانا) اور اس کے متعلقہ امور۔

۴: زنا (بدکاری)۔

۵: تہمت (الزام تراشی)۔

پس (حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے) جو زیادہ سزا دی ہے وہ حد میں داخل نہیں ہے بلکہ وہ تعزیر ہے اور امام (حاکم شرع) کو ایسا کرنے کا حق ہے۔

آلات ضرب کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔

بعض اصحاب فرماتے ہیں کہ عہد نبوی ﷺ میں (سزا کے لیے) کجھور کی کچھی، جوتی، کپڑے اور ہاتھ سے ضرب لگائی جاتی تھی۔ پس ان آلات سے تجاوز کرنا درست نہیں ہے۔ لیکن جمہور کی رائے یہ ہے کہ ان آلات سے ضرب لگانا اسی طرح درست ہے جیسے دڑے سے ضرب لگانا۔ بعض اصحاب کی رائے ہے کہ دڑے لگانا درست نہیں ہے بجز اس صورت کے جب کہ شراب پینے والا ایسا سرکش اور بدکردار ہو کہ ہاتھ یا کچھی سے ضرب مارنے کا اس پر کچھ اثر نہ ہو۔ بہر حال شراب نوشی کی سزا کے بارے میں اختلاف ہے۔

۶: چوری۔

۷: مار پیٹ اور اس کے متعلقہ امور۔

۸: شراب نوشی اور ایسے جرائم جن کے ارتکاب پر تادان یا جرمانہ عائد ہوتا ہے۔

اشروبات (مشروبات) کا بیان

لفظ 'اشربہ' شراب کی جمع ہے جس کے معنی ہیں مشروب (پینے کی شے) اور شروب اس کو کہتے ہیں جو بہت پینے والا اور دائم الخمر ہو۔ شراب کا پینا گناہ کبیرہ ہے بلکہ ام الکبائر ہے (یعنی یہ ایک گناہ سے بہت سے گناہوں کا موجب ہو جاتا ہے) جیسا کہ سیدنا حضرت عمر بن خطاب اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہما نے فرمایا۔ شراب سنہ دو ہجری میں غزوہ احد کے بعد حرام ہوئی تھی۔ بقول مفسرین اس کے حرام ہونے کی بنیاد چار آیتیں ہیں۔ مکہ معظمہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔ "وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا وَرِزْقًا حَسَنًا" یعنی لوگو تم کجھور اور انگور سے منشی اشیاء اور اچھی روزی حاصل کرتے ہو۔ پس مسلمان شراب پیتے تھے اور یہ انہیں حلال تھی۔ اس کے بعد سیدنا عمر بن الخطاب، معاذ بن جبل اور صحابہ میں سے ایک جماعت نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ شراب کے بارے میں آپ کا کیا حکم ہے؟ اس سے عقل جاتی رہتی ہے اور زیان مال بھی ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ "يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ" (یعنی اے پیغمبر تم سے شراب اور جوئے کے بارے میں حکم دریافت کرتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ اس کا پینا گناہ کبیرہ ہے اور کچھ لوگوں کو فائدے ہیں)۔ (اس آیت کے نازل ہونے کے بعد) کچھ لوگ شراب پیتے رہے اور کچھ لوگوں نے چھوڑ دیا پھر ایک موقع ایسا آیا کہ عبدالرحمن بن عوف نے کچھ لوگوں کی دعوت کی۔ لوگ اس مجمع میں شرابیں پی پی کر مست ہو گئے اور جب نماز کو کھڑے ہوئے تو آیت "قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ (لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ کی بجائے) "أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ پڑھ گئے (یعنی اے کافرو ہم اس کی پرستش نہیں کرتے جس کی تم کرتے ہو کی بجائے یہ کہا کہ ہم اس کی پرستش کرتے ہیں جس کی تم کرتے ہو) تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا

ما تقولون، یعنی مسلمانو! نشہ میں ہو تو نماز کے قریب مت جاؤ جب تک کہ تمہیں اتنا معلوم نہ ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ اس کے بعد پینے والے اشخاص بہت کم ہو گئے۔ پھر یہ ہوا کہ حضرت عثمان بن مالک نے انصار کی ایک جماعت کو دعوت دی لوگوں نے شراہیں پیں اور نشہ کے عالم میں آپس میں جھگڑ پڑے اور مار پیٹ کرنے لگے اس وقت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دعا فرمائی کہ یا اللہ شراب کے بارے میں ہمارے لیے اطمینان بخش حکم نازل فرما تب آیت انما الخمر والمیسر، سے لے کر الفاظ فہل انتم منتہون تک نازل ہوئی۔ (ان آخری الفاظ کے معنی ہیں) کیا اب تم لوگ شراب نوشی سے باز آتے ہو؟ اس پر حضرت عمر نے کہا انتہینا یا رب (یعنی خداوند اہم نے شراب نوشی چھوڑ دی)۔ اس طرح (بتدریج) شراب نوشی کے حرام ہونے کا حکم نازل فرمائے جانے میں یہ حکمت تھی کہ اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ لوگ شراب کے دھتے ہیں اور اس سے بہت فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ اگر یک لخت اس کی ممانعت کر دی گئی تو یہ انہیں بہت ناگوار ہوگا لہذا حکمت یہی تھی کہ اس کی ممانعت بتدریج آسان طریقے سے کی جائے۔

بعض علماء نے بیان فرمایا ہے کہ سورہ بقرہ کی آیت سے شراب کا حرام ہونا تین طرح سے ثابت ہوتا ہے: ایک تو یہ کہ اس آیت سے ثابت ہے کہ شراب (کا پینا) اثم (گناہ) ہے اور گناہ کا ارتکاب حرام ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

”قل انما حرم ربی الفواحش ما ظہر منها وما بطن والاثم والبغی بغير الحق“ (یعنی اے پیغمبر یہ بتا دو کہ میرے رب نے کھلی اور چھپی ہر طرح کی برائیوں کو اور گناہ اور ناحق بغاوت کرنے کو حرام قرار دیا ہے)۔ پس ان دونوں آیتوں کو ملا کر دیکھنے سے شراب کا حرام ہونا ثابت ہوا۔ دوسرے یہ کہ لفظ اثم سے مراد عذاب ہے اور جو امر موجب عذاب ہو وہ گناہ ہے۔ اور امر عذاب ہو یا گناہ اسے حرام ہی کہا جائے گا۔

تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”واثمہما اکبر من نفعہما“ (یعنی ان باتوں میں گناہ بہت زیادہ بہ نسبت فائدے کے) اس سے واضح ہے کہ آیت میں (شراب و قمار کی بابت) گناہ اور عذاب کی زیادتی بتائی گئی ہے لہذا وہ حرام ہوئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شراب نوشی میں بہت زیادہ گناہ ہے اور سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ اس سے پورا انسانی معاشرہ خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ اسی لیے شارع نے اسے حرام قرار دیا اور اس کے حرام ہونے کی سختی سے تائید فرمائی ہے۔ اس بارے میں متعدد احکام اہل عرب کی اصلاح حال کے لیے نازل ہوئے۔ کیونکہ اہل عرب دائم الخمر رہتے اور اسے وہ اپنی ہوشیاری اور چالاکی کا نشان شمار کرتے تھے۔ اسی لیے آیت تحریم خمر: ”انما الخمر والمیسر والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوا لعلکم تفلحون“ نازل ہوئی۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خمر (شراب) کو رجس یعنی گندگی قرار دیا ہے جس سے عقل سلیم نفرت کرتی ہے۔ ”رجس“ کا لفظ نہایت بری اور خراب شے کے لیے آتا ہے۔ میسر وہ جو اے جو بیچہ کے گوشت پر (پانسہ ڈال کر) کھیلا جاتا تھا۔ انصاب بتوں کے تھان جہاں ان کی عبادت کی جاتی (یا قربانی دی جاتی) تھی۔ ازلام وہ تیر ہیں جن پر نشان خیر یا شر (یعنی اچھا یا برا) لگا دیا جاتا تھا (یہ بھی جوئے کا ایک طریقہ تھا کہ جس

کے نام اچھا تیر لکھتا وہ جیت جاتا اور دوسرا ہار جاتا تھا)۔ اللہ تعالیٰ نے شراب کا ذکر میسر، انصاب اور ازلام کے ساتھ کیا ہے۔ یہ تمام امور بت پرستانہ یا مشرکانہ اعمال سے تعلق رکھتے ہیں۔ گویا اللہ کے نزدیک شراب بھی ایسی ہی بری چیز ہے۔ ان چاروں امور کے بارے میں اللہ نے دو باتیں بتائی ہیں ایک تو یہ کہ یہ ”رجس“ ہیں جن میں تمام گندی باتیں شامل ہیں۔ دوسرا یہ کہ ان کو شیطان کا فعل فرمایا۔ اس سے ان کی پوری پوری برائی ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ شیطان کافر ہونے کے باعث نجس اور خبیث ہے۔ جیسا کہ آیت ”انما المشركون نجس“ میں ارشاد ہے (کہ مشرک نجس ہیں) اور ظاہر ہے کہ خبیث سے خباثت ہی ظاہر ہوگی۔

ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ”مدمن الخمر کعابد وثن“ (یعنی دائم الخمر ایسا ہے جیسے بت کا پجاری)۔ ارشاد نبوی ہے کہ ”من شرب الخمر خرج نور الايمان من جوفه“ (یعنی شراب پینے والے کے باطن سے ایمان کا نور جاتا رہتا ہے) نیز اللہ تعالیٰ نے شراب اور اس جیسی دوسری اشیاء کے استعمال کو شیطانی اعمال سے تعبیر فرمایا ہے۔ کیونکہ اس سے برائیاں اور خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور اس کے ارتکاب میں بڑی بڑی معصیتیں اور مصیبتیں ہیں۔ کسی فعل کا عمل شیطانی قرار پانا اس کے نہایت مذموم ہونے کی دلیل ہے چنانچہ کتاب اللہ میں ہے ”فوکزه موسى فقصی علیہ قال هذا من عمل الشيطان“ (یعنی اس قبلی کو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تھپڑ مارا اور وہ مر گیا تو آپ نے کہا کہ یہ شیطانی فعل سرزد ہو گیا)۔ رسول اللہ ﷺ نے شراب کو برائیوں کی جڑ قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد نبوی ہے ”الخمر ام الخبائث“ (یعنی شراب برائیوں کی ماں ہے اس سے برائیاں پیدا ہوتی ہے)۔ اور طبرانی نے کبیر میں عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ”الخمر ام الفواحش واکبر الکبائر، ومن شرب الخمر ترک الصلوة ووقع علی امه وعمته“ شراب برائیوں کی ماں اور سب سے بڑا گناہ کبیرہ ہے۔ شراب پینے والا تارک نماز ہوتا ہے اور اپنی ماں اور پھوپھی سے بدکاری کرنے والا ہے)۔

اللہ تعالیٰ نے شراب کی ممانعت کے لیے لفظ اجتنب، استعمال فرمایا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے فاجتنبوا یعنی اس سے بچو یہ لفظ (شراب کو ممنوع قرار دینے کے مفہوم میں) لفظ حرام بولنے یا ترک کا حکم دینے سے زیادہ مؤثر ہے۔ کیونکہ اس لفظ (بچو) کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اس فعل کے ارتکاب سے بہت دور رہے۔ یعنی اس میں بڑا نقصان اور قباحیت ہے لہذا انسان اس کے پاس بھی نہ پھٹکے اور خود کو اس (کی مضرت) سے بچائے۔ ان الفاظ سے ان غلط کاروں کو عبرت حاصل کرنی چاہیے جو کہتے ہیں کہ شراب کی ممانعت قرآن میں نہیں ہے۔ اس میں یہ صراحت نہیں ہے کہ یہ حرام ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم نے واضح ترین عبارت میں اس کو حرام قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے پرہیز کرنے اور بچنے کے لیے فرمایا ہے۔ تاکہ اس سے انسان کو دنیا و آخرت دونوں جہان کی فلاح و فرخی حاصل ہو۔ ارشاد ”لعلکم تفلحون“ کا یہی مقصد ہے اور اس میں یہ ارشاد ہے کہ اس کا استعمال انسان کو تباہی و نا مرادی دین و دنیا دونوں کی خرابی اور زیان صحت و عقل و مال سے دو چار کر دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے شراب کے ممنوع ہونے کا حکم دے کر ان چار گناہ تباہیوں سے بچایا ہے اور شراب و قمار میں دو سب سے بڑے نقصانوں کا ذکر بھی فرمایا ہے۔ ایک دنیوی نقصان ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ”انما یرید

الشيطان ان يوقع بينكم العداوة والبغضاء في الخمر والميسر“ (یعنی شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے میں لگا کر تم میں باہم بغض و عداوت ڈال دے)۔ چنانچہ دیکھو کہ شراب بالعموم لوگ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر اس لئے پیتے ہیں کہ باہم میل جول ہو اور باہمی گفتگو اور غپ شب سے حظ اٹھائیں اور آپس میں الفت و محبت زیادہ ہو لیکن بسا اوقات نتیجہ اس کے برعکس ہوتا ہے کیونکہ شراب عقل کو زائل کر دیتی ہے اور جب عقل پر پردہ پڑ جائے تو خود پسندی اور غصہ غالب آ جاتا ہے۔ عقل کا تحفظ جاتا رہتا ہے اور اہل مجلس میں باہم نزاع و عداوت اور پھر مار پیٹ، خونی زبانی اور گالی گلوچ کی نوبت آ جاتی ہے۔ جس کے باعث افراد معاشرہ میں باہم بغض اور دشمنی پھوٹ پڑتی ہے۔

اسی طرح قمار بازی انسان کو فقیری اور محتاجی سے دوچار کر دیتی ہے کہ مال کا خاتمہ ہو جانے کے بعد جواری اپنے وجود اور بیوی بچوں تک کو داؤ پر لگا دیتا ہے اور ان ہی کا بدترین دشمن ہو جاتا ہے جو اس کی شادمانی اور مسرت کا موجب تھے۔

اس سے عیاں ہے کہ شراب اور جوئے ہی عناد و فساد اور معاشرتی تعلقات کو بگاڑنے کے سب سے بڑے اسباب ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بغض و عناد کے باعث ہی تمام فتنہ و فساد اور معاشرہ کی خرابی ظہور پذیر ہوتی ہے۔
 رہیں دوسری قسم کی خرابیاں جن کا تعلق دین سے ہے۔ ان کی طرف اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں اشارہ ہے ”وَيَصِدْكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ“ (یعنی اس میں مبتلا ہو کر انسان اللہ سے غافل اور نماز سے محروم ہو جاتا ہے)۔ حالانکہ یہ امور دین کی روح اور اسلام کے ستون ہیں۔ شراب کا اللہ کی یاد سے غافل کر دینا تو ظاہر ہے کہ شراب انسان کو مادی عیش و عشرت اور لذت اندوزی میں ڈال دیتی ہے اور جب انسان لذت نفسانی میں منہمک ہو تو اللہ تعالیٰ سے غافل اور خدائے بزرگ و برتر کی طاعت گزاری سے ہٹ جاتا ہے۔

یہی حال جوئے کا ہے جب انسان لہو و لعب میں پڑ جاتا ہے تو اس کے سوا کسی اور بات کا اسے خیال نہیں رہتا۔ قمار بازی اللہ کے ذکر سے مانع ہوتی، نماز سے باز رکھتی اور طاعت الہی سے غافل کر دیتی ہے۔
 اللہ تعالیٰ نے شراب نوشی، قمار بازی کے دین و دنیا کے ان مفاسد کو بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔ ”فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ“ (یعنی کیا اب تو تم باز آتے ہو؟) اگرچہ یہ کلام بظاہر بصورت استفہام ہے۔ لیکن اس سے مقصد دراصل منع فرمانا ہی ہے (ممانعت کے لیے)۔ یہ مجازی نہج عبارت بہت خوب ہے۔ کیونکہ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے ان افعال کی مذمت فرمائی اور بندوں کے حق میں اسے مضرت رساں بیان کیا اور پھر پوچھا کہ کیا تم باز آ جاؤ گے؟ تو اب مخاطب کے لیے اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ وہ ان (برائیوں) سے باز آ جانے کا عزم کرے۔ گویا اس آیت میں یہ ارشاد ہے کہ آیا اس فعل کی برائی معلوم ہو جانے پر بھی تم اسے اختیار کیے رہو گے۔ غرض اللہ تعالیٰ کا ارشاد ”فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ“ واضح طور پر اس کی ممانعت کا حکم ہے۔ جس سے واجب ہو جاتا ہے کہ مکلف انسان (جو اسلام کا پابند ہے) اس برائی سے باز آ جائے اور تسلیم کر لے کہ اس سے باز رہنا واجب ہے اور اسی طرح اس کی زندگی محفوظ رہ سکتی ہے۔

جاننا چاہیے کہ اس آیت سے شراب کے حرام ہونے کا حکم کئی طرح سے نکلتا ہے۔ ایک یہ کہ اس آیت کا آغاز کلمہ ”الما“ سے ہوتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ چاروں برائیاں محض اعمال شیطانی ہیں اور اس کے سوا نہیں۔

دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے شراب اور جوئے کو بتوں کی عبادت کے ساتھ ملا دیا ہے یہاں تک کہ شراب نوشی اس جیسی برائی ہوگئی۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ ”شارب الخمر كعابد الوثن“ (یعنی شراب پینے والا ایسا ہی ہے جیسے بت کو پوجنے والا)۔

تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے اجتناب (پرہیز) کرنے کا حکم دیا ہے اور حکم پر عمل کرنا واجب ہے۔ چوتھے یہ کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”لعلکم تفلحون“ (یعنی اس سے بچو تا کہ تمہاری بہتری ہو)۔ پس درآنحالیکہ اس کے ترک کرنے میں بہتری ہے تو اس کے مرتکب ہونے میں برائی ہی برائی ہے۔ پانچویں یہ کہ اس کے ارتکاب میں دین و دنیا دونوں جہاں کی تباہی بتائی گئی ہے۔ یعنی لوگوں میں باہم بغض و عداوت اور یاد الہی اور نماز سے غفلت۔

چھٹے اللہ تعالیٰ کا ارشاد کہ ”فهل انتم منتہون؟“ (یعنی کیا اب تم باز آتے ہو؟) کسی بات سے منع کرنے کا یہ سب سے زیادہ مؤثر طریقہ ہے۔ اس طرح ارشاد فرمانا گویا یہ کہنا ہے کہ اس میں جو برائی اور خرابی ہے وہ بتادی گئی تو کیا ان مکروہات کے باوجود بھی تم اس سے باز نہ آؤ گے اور اسی طرح کیے جاؤ گے جیسا کہ اس نصیحت سے پہلے کرتے تھے؟ ساتویں یہ کہ اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ”واطيعوا اللہ واطيعوا الرسول واحذروا“ (یعنی خدا اور رسول کا حکم مانو اور ڈرو) ظاہر ہے کہ یہاں اللہ و رسول کے ان احکام کی بجا آوری کا ذکر ہے جو اوپر مذکور ہوئے یعنی شراب اور جوا اور اذرا حذر و آجو فرمایا اس کے معنی یہ ہیں کہ ان (گناہوں) کے ارتکاب سے خدا کا خوف کرو۔

آٹھویں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانافان تولیتہم فاعلموا انما علی رسولنا البلاغ المبین“ (یعنی اگر اس حکم سے روگردانی کی تو نتیجہ کے تم ذمہ دار ہو ہمارے رسول کا کام تو تمہیں ہمارا یہ حکم پہنچا دینا تھا)۔ یہ الفاظ (حرمت شراب کی) مخالفت کرنے والوں کے لیے تازیانہ عبرت اور اللہ کے حکم سے منہ موڑنے والوں کے لیے سخت تہدید ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر تم اس حکم سے روگردان ہوئے تو یاد رکھو کہ اب ذمہ داری تم پر آ پڑی ہے۔ رسول اللہ نے اپنا فرض ادا کر دیا اور تمہیں (نافرمائی کے انجام سے) آگاہ کر کے وہ بری الذمہ ہیں۔ اس کے بعد اب تمہیں اپنے فرض سے ہٹنے اور حکم نہ ماننے کا عذاب دینا اللہ کے ہاتھ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس بارے میں یہ سخت تنبیہ ہے اور مندرجہ بالا دلائل ہشت گانہ حرمت شراب کے قطعی اور واضح ثبوت ہیں۔

شراب کی حد (شرعی سزا)

آئمہ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ شراب پینے کی حد (شرعی سزا) بشرطیکہ کسی کو جبرانہ پلائی گئی ہو وہی ہے جو متن میں مذکور ہے۔ اس کی مقدار تھوڑی ہو یا بہت (دونوں صورتوں میں ایک ہی حکم ہے)۔

اس پر بھی (سب کا) اتفاق ہے کہ اس سزا کا نفاذ دو معتبر گواہوں کی شہادت یا شرابی کے اقرار کر لینے پر ہوگا۔ اس بارے میں محض عورتوں کی شہادت نہیں مانی جائے گی اور نہ شراب نوشی کی حد لاگو کرنے کے لیے عورتوں اور مردوں کی مشترکہ شہادت تسلیم کی جائے گی کیونکہ اس میں رد و بدل کا اندیشہ اور غلط بیانی یا بھول چوک کا الزام عائد ہو سکتا ہے اور

شہادت میں نقص رہ جائے گا۔ حالانکہ اس میں ذمہ داری کے فریضہ سے سبکدوش ہونا بنیادی چیز ہے۔
چاروں ائمہ فقہ اس پر بھی متفق ہیں کہ شرابی کے اقرار کرنے پر حد لاگو ہو جائے گی خواہ یہ اقرار صرف ایک بار کیا جائے۔
حنفیہ میں سے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ (نفاذ حد کے لیے) شرابی کا دوبار اقرار کرنا ضروری ہے کہ وہ شخص کہے کہ میں نے شراب یا نشہ آور چیز پی ہے اور اگر قسم کو رد کر دیا جائے تو حد لاگو نہ ہوگی۔

مخمور (حالت نشہ) میں ہونے کی تعریف کے بارے میں اختلاف ہے:
حنفیہ کہتے ہیں کہ مخمور (سر مست) وہ شخص ہے جو بات کو نہ سمجھے خواہ وہ تھوڑی بات ہو یا بہت یا آسمان وزمین یا مردوزن میں امتیاز نہ کر سکے اور امتیاز کرنے کی صلاحیت سے قطعاً محروم ہو جائے اور گولوگوں کو پہچان سکے لیکن امتیازی خصوصیات کو نہ سمجھ سکے۔

مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ اور حنفیہ میں سے صاحبین کہتے ہیں کہ اس شخص کو مخمور (یا بد مست) تصور کیا جائے گا جو (نشہ میں بکواس) کرنے لگے اگر اس کی گفتگو میں گڑبڑ ہو اور اچھے برے میں تمیز نہ رہے تو عام طور پر اسے مخمور کہا جائے گا۔
چاروں ائمہ فقہاء اس بات پر بھی متفق ہیں کہ شراب ناپاک شے ہے اور اس کی خرید و فروخت مسلمانوں پر حرام ہے اور اسے 'مال' کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص کسی مسلمان کا ظرف شراب توڑ دے تو اسے ادائیگی تاوان کی سزا نہیں دی جائے گی کیونکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ "ان الذی حرم شربہا حرم بیعہا واکل ثمنہا" (یعنی جس شے کا پینا حرام ہے اس کی خرید و فروخت کرنا اور اس کی قیمت کو کام میں لانا بھی حرام ہے)۔ غرض اس کو مال کی حیثیت حاصل نہیں ہے، لہذا نہ اس کو مہر میں دیا جاسکتا ہے اور نہ اجرت میں اور انگور کا شیرہ اگر خمیر ہو جائے، ابلنے لگے اور جھاگ دینے لگے تو وہ شراب بن جاتا ہے چاروں ائمہ کے نزدیک بالاتفاق وہ حرام ہے۔

نبیذ (شیرے) کے متعلق شرعی حکم

نبیذ (شیرہ) کو پینے کے حکم بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔
حنفیہ کہتے ہیں کہ خمر (شراب) کے علاوہ تمام قسم کے شیرے استعمال کرنے پر حد کا نفاذ صرف اس صورت میں ہوگا جب کہ وہ نشہ آور ہو جائے۔ پس کھجور یا کشمش کے شیرہ میں اگر ابال آجائے اور اس میں تندہ پیدا ہو جائے تو وہ حرام ہو جائے گا۔ خواہ اس کی مقدار تھوڑی ہو یا بہت۔ تاہم اسے نبیذ ہی کہا جائے گا۔ نہ کہ خمر (شراب) تاہم اگر وہ نشہ آور ہو جائے تو اس کے پینے پر حد نافذ ہوگی اور وہ نجاست مغلظہ قرار پائے گا، چنانچہ یہ قطعی دلیل سے ثابت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے انگور کی بیل اور کھجور کے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ الخمر من ہاتین الشجرتین، یعنی شراب ان دو درختوں (کے پھل) سے حاصل ہوتی ہے۔ تاہم اگر ان کے (شیرہ کو) جوش دیا جائے یا بھٹی میں پکایا جائے لیکن گمان غالب یہ ہو کہ ان میں نشہ یا سرور نہیں ہے تو وہ حلال ہے ہاں اگر بہت زیادہ ابال آجائے تو اس کا پینا حرام ہوگا۔
گندم، زیتون، چاول، جو، مکئی، کا شیرہ اور شہد خواہ نچوڑا ہوا ہو یا ابالا ہوا حنفیہ کے نزدیک حلال ہے۔ نشہ آور ہو تو حرام ہے اور اگر نشہ زیادہ ہو تو پینے والے پر حد عائد ہوگی۔ یہی حکم ہر قسم کے دودھ کا ہے درآنحالیکہ اس میں تندہ پیدا ہو جائے۔

مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ ہر مشروب جسے زیادہ مقدار میں پینے سے نشہ ہو جائے اسے کم مقدار میں پینا بھی حرام ہے اور اسے خمر (شراب) کہا جائے گا اور پینے والے کو حد ماری جائے گی۔ یہ مشروب خواہ انگور کا ہو یا کھجور، گندم، جو، زیتون، مکئی یا چاول کا ہو یا شیرہ خرما یا ایسی ہی کسی اور شے کا رس ہو اور پکایا ہو یا نہ ہو کیونکہ لفظ خمر کے لغوی معنی عقل پر پردہ ڈالنے والی شے کے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”کل مسکر خمر“ (یعنی تمام نشہ آور اشیاء خمر یا عقل پر پردہ ڈالنے والی اشیاء ہیں)۔

لغت کی رو سے خمر (شراب) کے حقیقی معنی ہیں انگور کا وہ رس جو نشہ آور ہو جائے اور شرع کی رو سے ان حقیقی معنوں میں شراب کے علاوہ اور اشیاء کا شیرہ بھی داخل ہے جب کہ اس میں نشہ کی تندی پیدا ہو جائے۔

صحیحین (بخاری و مسلم) میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ”نزل تحريم الخمر وهي خمسة: من العنب، والتمر، والعسل، والحنطة، والشعير، والخمر ما خامر العقل“ (یعنی شراب کے حرام ہونے کا حکم نازل ہوا اور شراب پانچ چیزوں سے بنتی تھی۔ یعنی انگور، کھجور، شہد، گندم اور جو سے اور خمر اس کو کہتے ہیں جو عقل کو چھپا دے)۔ یہ روایت تین طرح سے حرمت شراب کی دلیل ہے۔

ایک یہ کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب شراب حرام ہوئی تو ان ایام میں گندم، جو، انگور، اور کھجور سے بنائی جاتی تھی اور وہ لوگ ان تمام چیزوں سے بنی ہوئی شراب کو خمر کہتے تھے۔

دوسرے یہ کہ ان کے الفاظ ہیں کہ ”حرمت الخمر يوم حرمت“ (یعنی شراب اسی دن سے حرام ہوئی جس روز حرام ہونے کا حکم نازل ہوا) اور اس وقت یہ شراب ان پانچ اشیاء سے بنائی جاتی تھی۔ اس سے یہ صراحت ہو گئی کہ شراب جو حرام کی گئی اس میں یہ پانچوں اقسام کی شراب داخل ہے۔

تیسرے یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس میں ہر ایسے مشروب کو شامل کیا جو عقل کو زائل کرنے والا ہو اور اس میں شک نہیں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فن لغت کے عالم تھے اور ان کا فرمانا ہے کہ خمر ہر ایسی شے کا نام ہے جس کے استعمال سے عقل میں فورا آجائے۔

اسی طرح (حرمت خمر کے بارے میں) اس حدیث سے بھی استدلال کیا گیا ہے جو ابوداؤد نے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”ان من العنب خمرأوان من التمر خمرأوان من العسل خمرأوان من الشعير خمرأ“ (یعنی شراب انگور، کھجور، شہد، گندم اور جو سے بنتی ہے)۔

اس حدیث سے (حرمت خمر پر استدلال کی دو وجہیں ہیں):

ایک تو یہ کہ حدیث میں یہ صراحت موجود ہے کہ ان تمام اشیاء کی بنی ہوئی شراب خمر ہے لہذا یہ تمام شرابیں اس آیت کے تحت آتی ہیں جس میں شراب کو حرام فرمایا گیا ہے۔

دوسرے یہ کہ شارع علیہ السلام کے پیش نظر لغات کی تشریح نہیں ہے لہذا اس تفصیل سے یہ جتنا مقصود ہے کہ شراب کے حرام ہونے کا جو حکم ہے وہ ان تمام قسموں پر عائد ہوتا ہے کیوں کہ یہ تمام شراب کی قسمیں ہیں۔

خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شراب کے ذکر میں ان پانچ مخصوص اشیاء کا جو ذکر آ گیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں

ہے کہ محض ان ہی اشیاء کی شراب ہوتی ہے بلکہ یہ مقصد ہے کہ اس زمانے میں صرف ان ہی چیزوں سے شراب بنتی تھی پس جو شے بھی ایسی ہوگی مثلاً لکھی یا از خود بہنے والے رس یا شیرہ درخت کی بنی ہوئی شراب وہ بھی مذکورہ پانچوں اقسام کی شراب کے حکم میں داخل ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے حدیث میں چھ اشیاء کے (کمی و بیشی کے ساتھ) تبادلہ کو سود فرمایا گیا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کے علاوہ اور کسی شے میں سود نہیں ہے۔

حرمت خمر کی تیسری دلیل، ابو داؤد نے حضرت نافع بن عمر سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”کل مسکر خمر و کل مسکر حرام“ (یعنی ہر نشہ آور شے خمر ہے اور ہر نشہ آور شے حرام ہے)۔

امام خطابی فرماتے ہیں کہ حضور کے ارشاد ”کل مسکر خمر“ سے دو باتیں معلوم ہوئیں یعنی ہر ایسے مشروب کا نام خمر ہے جو نشہ آور ہو۔ اس ارشاد کا مقصد یہ ہے کہ قرآن حکیم کی آیت جس سے خمر کا حرام ہونا ثابت ہے۔ لوگ نہیں جانتے تھے کہ خمر کس کو کہتے ہیں اس حدیث سے تشریح ہوگئی کہ خمر نشہ آور مشروب کو کہتے ہیں یا پھر اس حدیث کے یہ معنی ہیں کہ ہر نشہ آور شے شراب کی طرح حرام ہے۔

حرمت خمر کی چوتھی دلیل، ابو داؤد کی روایت ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ سے ”بتع“ کی بابت پوچھا گیا تو ارشاد ہوا کہ ”کل شراب اسکر فہو حرام“ (یعنی ہر مشروب جو نشہ آور ہو حرام ہے)۔

واضح ہو کہ ”بتع“ اس شراب کو کہتے ہیں جو غسل (یا شیرہ) سے بنائی جاتی ہے۔ اس حدیث سے وہ تمام تاویلین باطل ہو جاتی ہیں۔ جو ہر قسم کے نبیذ (یعنی شیرہ یا عصارہ) کو حلال بتانے والے کرتے ہیں اور وہ خیال بھی غلط ہو جاتا ہے کہ تھوڑی مقدار میں شراب روا ہے۔ کیوں کہ رسول ﷺ سے بتع (ایک خاص قسم کا مشروب) کی بابت دریافت کیا گیا تو آپ نے اس کے جواب میں ہر قسم کے (نشہ آور) شیرہ کو حرام فرمایا ہے۔ اس میں کم ہو یا زیادہ ہر مقدار شامل ہے اگر یہاں خمر کی اقسام اور مقدار کی تفصیل لازمی ہوتی تو حضور اس کو بیان فرما دیتے اور یونہی نہ چھوڑ دیتے۔

حرمت شراب کی پانچوں دلیل وہ روایت ہے جو ابو داؤد نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام“ (یعنی جو شے زیادہ مقدار میں نشہ آور ہے وہ کم مقدار میں بھی حرام ہے) احمد ابن ماجہ اور دارقطنی نے اس حدیث کا ابن عمر سے مروی ہونا صحیح بتایا ہے اور اس طرح احمد اور نسائی نے اس کو حضرت عمر سے روایت کیا ہے۔

حرمت شراب کی چھٹی دلیل وہ ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے قاسم نے روایت کی ہے وہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ”کل مسکر حرام۔ وما اسکر منه الفرق، فمل الکف، منه حرام“ (بروایت احمد) (یعنی ہر نشہ آور شے حرام ہے اگر ایک ”فرق“ کی مقدار میں اس کے پینے سے نشہ ہوتا ہو تو وہ شے چلو بھر بھی حرام ہے) فرق ایک پیانہ ہے جس میں سولہ رطل (یعنی کوئی آٹھ سیر) شراب آتی ہے۔ امام احمد کی روایت میں ”مل الکف منه حرام“ کی بجائے ”فالاولیۃ منه حرام“ ہے (یعنی بمقدار پون چھٹا تک کے بھی حرام ہے)۔ واضح ہو کہ حدیث میں ”مل الکف“ (چلو بھر) یا ”الاولیۃ“ (جو پون چھٹا تک وزن کے برابر ہوتا ہے) بطور

مثال آیا ہے۔ ورنہ اس کا ایک قطرہ بھی حرام ہے۔ کیوں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”حرمت الخمر قليلها وكثيرها والسكر من كل شراب“ اسے نسائی نے بیان کیا ہے (یعنی شراب تھوڑی ہو یا بہت حرام ہے نیز ہرنشہ آور مشروب حرام ہے)۔

حرمت خمر کی ساتویں دلیل وہ روایت ہے جو ابو داؤد نے شہر بن حوشب سے اور انہوں نے حضرت ام سلمیٰ سے روایت کی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ ”ہر مسکر (نشہ آور) اور مفترشے سے منع فرمایا ہے“۔ مفتر سے مراد ہر وہ مشروب ہے جس سے جسم میں فتور (خرابی) اور اعضاء میں خمول (افسردگی) آجائے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ یہ حکم تمام ایسے مشروبات کو شامل ہے جو نشہ آور یا اعضاء جسم کو افسردہ کرنے والے ہوں یک اور حدیث نسائی اور دارقطنی میں سعید بن وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ”نبی ﷺ نے تھوڑی مقدار میں بھی اس شے کو ممنوع فرمایا ہے جو زیادہ مقدار میں نشہ آور ہو“۔

ایک اور حدیث حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص آنحضرت ﷺ کے پاس آیا جو نشہ آور شیرہ پی کر نشہ میں تھا۔ آپ نے اسے تازیانے لگائے یعنی اس پر حد نافذ فرمائی۔ یہ بھی اس امر کی واضح دلیل ہے کہ شیرہ خراما اگر نشہ آور ہو جائے تو اس کا حکم بھی وہی ہے جو انگور سے بنی ہوئی شراب کا۔

ایک وہ حدیث ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کی ہے۔ ”الخمر من هاتين الشجرتين النخلة والعنب“ یعنی شراب ان دو درختوں یعنی کھجور اور انگور سے بنتی ہے۔ اور ایک حدیث وہ ہے جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ”ان الخمر حرمت والخمر يومئذ البسر والتمر“ متفق علیہ (شراب حرام ہوئی اور ان دونوں شراب خشک اور تر کھجور سے بنتی تھی)۔

ایک اور حدیث وہ ہے جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان رجلاً من جیشان . وجیشان من اليمن . سأل النبي ﷺ عن شراب يشربونه بارضهم من النخلة يقال له المزرق فقال : أمسكر هو ؟ قال نعم . فقال : كل مسكر حرام . ان على الله عهدا لمن يشرب المسكر ان يسقيه من طينة الخبال قالوا يا رسول الله وما طينة الخبال ؟ قال : عرق اهل النار ، او عصارة اهل النار“ رواہ احمد و مسلم و نسائی (یعنی ایک شخص نے جو یمن کے علاقہ جیشان ان کا تھا نبی ﷺ سے ایک مشروب کے بارے میں، جو کئی سے بنتا ہے اور اسے مزر (نبیذہ) کہتے ہیں، دریافت کیا۔ آپ نے پوچھا کہ یہ نشہ آور ہوتا ہے۔ اس شخص نے کہا۔ ہاں! ارشاد ہوا کہ ہرنشہ آور شے حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہے کہ جو شخص نشہ آور شراب پیے اسے طینۃ الخبال پلایا جائے گا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ یا حضرت، طینۃ الخبال، کیا ہے؟ فرمایا کہ یہ دوزخیوں کا پینے والا (کا پیپ ہے)۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ ہرنشہ والا مشروب حرام ہے خواہ وہ انگور کے شیرہ سے نہ بنا ہو۔ کیونکہ حضور کا ارشاد صرف یہ ہے کہ ”کل مسکر حرام“ (یعنی ہرنشہ آور شے حرام ہے) اس میں مشروب کی اقسام اور اس کی تعریف نہیں بتائی گئی (لہذا تمام نشہ آور اشیاء حرام ہیں)۔ غرض ان تمام حدیثوں سے جن کا ذکر ہوا اور ان کے علاوہ دوسری حدیثوں سے جن کا ذکر نہیں آیا یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہرنشہ آور شے حرام ہے۔

دوسری قسم کے وہ دلائل ہیں جو اہل لغت کے کلام سے استنباط کئے گئے کہ ہرنشہ آور شے حرام ہے خواہ وہ انگور

کے شیرے سے بنی ہو یا کسی اور شیرے سے۔ اہل لغت کہتے ہیں کہ خمر وہ ہے جس سے عقل زائل ہو جائے یعنی اس پر پردہ پڑ جائے یا اس میں فتور آجائے کہ اپنی حالت پر نہ رہے عقل (خیر و شر میں) امتیاز کرنے کا ذریعہ ہے۔ پس جو چیز کہ اس (قوت امتیاز) پر پردہ ڈال دے وہ حرام ہے کیونکہ جب عقل پر پردہ پڑ جائے تو بندہ ان فرائض کے خیال سے غافل ہو جاتا ہے جن کی ادائیگی کا حکم اللہ نے دیا ہے۔ دراصل عقل وہ جوہر ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو تمام مخلوق پر شرف بخشا ہے اور جس کی وجہ سے وہ زمینی اشیاء پر قابو پاتا اور ان سے فائدہ اٹھاتا اور صنعت و حرفت وغیرہ میں کمال حاصل کرتا ہے۔ سمجھ بوجھ کی یہی صلاحیت ہے جس سے انسان صحیح اور غلط، حلال اور حرام اور خیر و شر میں امتیاز کر سکتا ہے اور یہی علم و معرفت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی صلاحیت کی قدر و قیمت کی وجہ سے شراب کو حرام فرمایا کیونکہ شراب اس پر پردہ ڈال دیتی ہے اور اس میں فتور پیدا کر دیتی ہے۔

ابن الانباری فرماتے ہیں کہ شراب کو خمر اس لیے کہتے ہیں کہ وہ عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے یعنی عقل میں فتور آ جاتا ہے۔ اے مسکر (دروازہ بند کرنے والا) اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ عقل کے دروازے کو بند کر دیتی ہے اور نور بصیرت کو اعضائے انسانی تک پہنچنے سے روک دیتی اور باز رکھتی ہے۔

امام راغب نے اپنی تالیف مفردات القرآن میں بتایا ہے کہ (شراب کو) 'خمر' اس لیے کہتے ہیں کہ وہ عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے یعنی اسے چھپا دیتی ہے۔

بعض اصحاب نے ہرنشہ آور شے کو خمر سے تعبیر فرمایا ہے۔ بعض صرف انگور کی شراب کو خمر کہتے ہیں اور بعض خمر اس کو کہتے ہیں جو بغیر پکائے ہوئے (خمیر اٹھا کر) بنائی جائے لیکن ترجیح اس خیال کو ہے کہ ہر ایسی شے جس سے عقل زائل ہو جائے 'خمر' ہے اہل لغت کے علاوہ دوسرے اصحاب کا جن میں دینوری اور جوہری شامل ہیں، یہی قول ہے۔

حنفیہ میں سے صاحب ہدایہ کہتے ہیں کہ خمر انگور کے اس شیرے کو کہتے ہیں جس میں تندہ پیدا ہو جائے۔ اہل لغت اور اہل علم میں اس کے یہی معنی مشہور ہیں نیز وہ کہتے ہیں کہ ہرنشہ آور شے کا نام 'خمر' ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "کل مسکر خمر" (یعنی ہرنشہ آور شے خمر ہے) اور اسے خمر کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ ہرنشہ آور شے کی یہی خاصیت ہے۔ اور حنفیہ کے خیال کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ اہل لغت نے 'خمر' کے مفہوم کو صرف انگوری شراب پر منطبق کیا ہے چنانچہ اس لفظ کا استعمال ان ہی معنوں میں مشہور ہے اور یہ بھی ہے کہ خمر (انگوری شراب) کا حرام ہونا تو ایک قطعی حکم ہے اور شراب انگور کے علاوہ کوئی اور شے جو انگور سے بنی ہو اس کا حرام ہونا گمان غالب کی بناء پر ہے۔ نیز صاحب ہدایہ کہتے ہیں کہ خمر کا نام خمر اس لیے ہے کہ اس کا خمیر اٹھایا جاتا ہے اس لیے نہیں کہ وہ عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ امر انگوری شراب کے لیے لفظ خمر کو مخصوص کر دینے کے منافی نہیں ہے جیسا کہ لفظ خمر کو اس کے روشن ہونے کی بناء پر 'خمر' کہا جاتا ہے لیکن یہ لفظ شراب کے معنوں میں مخصوص ہے۔

کتاب فتح میں ہدایہ کی پہلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ خود اہل سنت سے یہ قول منقول ہے کہ انگور کے علاوہ کسی اور شے سے بنی ہوئی شراب کو بھی خمر کہتے ہیں۔

خطابی کہتے ہیں کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اہل عرب انگوری شراب کے سوا اور کسی شراب سے واقف نہ تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ صحابہ میں سے جن اصحاب نے انگوری شراب کے سوا اور شرابوں کو بھی خمر کہا ہے وہ نصحاء عرب

میں سے تھے۔ اگر یہ کہنا درست نہ ہوتا تو وہ کبھی نہ کہتے، کلام الہی میں ہے کہ ”اعصر خمرًا“ (یعنی زندان یوسف میں ایک قیدی نے اپنا خواب بیان کیا تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ”میں نچوڑ کر شراب بنا رہا ہوں“) یہ اس امر کی دلیل ہے کہ شراب نچوڑ کر بنائی جاتی ہے نبیذ (شیرے) کو شراب نہیں کہتے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ شراب کا بننا نچوڑنے ہی پر موقوف نہیں ہے۔ بلکہ اہل مدینہ اور تمام اہل عرب اور محدثین کا کہنا یہ ہے کہ ”کل مسکو خمر“ (یعنی ہرنشہ آور شے خمر ہے) اور اس کا بھی وہی حکم ہے جو انگوری شراب کا ہے چنانچہ اسے حلال قرار دینے والا کافر ہے۔ اسے نجس مانا گیا ہے اور مسلمان کے لیے اس کی کوئی قیمت نہیں ہے پس اس کی خرید و فروخت اور اس سے فائدہ حاصل کرنا حلال نہیں ہے۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ حضرت انس وغیرہ (صحابہ) سے جو حدیثیں کثرت کے ساتھ مروی ہیں وہ کوئیوں کے اس خیال کی تردید کرتی ہیں کہ ”خمر صرف انگور کی شراب ہے“ اس کے علاوہ کسی اور شراب کو خمر نہیں کہتے۔ ان کا یہ قول لغت عرب، صحیح احادیث اور فصحاء صحابہ کے خلاف ہے۔ کیونکہ جب تحریم خمر (یعنی شراب کو حرام کرنے والی) آیت نازل ہوئی تو سب نے اس خیال سے کہ ”خمر کے حرام ہونے کا حکم آگیا ہے۔ ہرنشہ آور شے کو حرام قرار دے دیا اور انگور کی شراب اور دوسری شے کی شراب میں کوئی فرق نہیں سمجھا بلکہ سب کو یکساں خیال کر کے ہر قسم کی شراب کو حرام قرار دے دیا۔ اس میں انہیں کوئی پس و پیش یا دشواری نہ رہی۔ وہ ہر قسم کی شراب جو انگور کی نہ تھی سب کو تلف کرنے پر تل گئے یہ تمام اصحاب اہل زبان تھے اور قرآن حکیم ان ہی کی بولی میں نازل ہوا۔ اگر اس کے سمجھنے میں انہیں تردد ہوتا تو جب تک حکم حرمت کی وضاحت نہ ہوتی اور تفصیل معلوم نہ ہو جاتی دوسری تمام اقسام کی شرابوں کو لٹھ ہا دینے میں تامل کرتے۔ کیونکہ اس طرح ضائع کرنے میں بہر حال مال کا تلف ہونا واضح تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انہوں نے شراب کے حرام ہونے کے حکم کو (اچھی طرح) سمجھ لیا تھا۔ مزید براں اس باب میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تقریر اس کی تائید کرتی ہے، جس پر ایک صحابی نے بھی اعتراض نہیں کیا۔

واضح ہو کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، سیدنا عمر بن الخطاب، حضرت سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن عمر، ابو موسیٰ اشعری، ابو ہریرہ، ابن عباس اور سیدہ عائشہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی اس حکم کو تمام قسم کی شرابوں پر عائد کیا ہے۔ پھر تابعین: امام ابن المسیب، عروہ، حسن بصری، سعید بن جبیر اور دوسرے اصحاب نے بھی اس حکم کو عام قرار دیا ہے اور حضرات مالک، اوزاعی، ثوری، ابن المبارک، شافعی، احمد، اسحاق اور عام محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول بھی یہی ہے۔

کتاب ’فتح‘ میں بتایا گیا ہے کہ ان دونوں اقوال میں مطابقت اس طرح ممکن ہے کہ جن اصحاب نے لفظ ’خمر‘ کا اطلاق انگور کی شراب کے علاوہ اور شرابوں پر بھی کیا ہے ان کے پیش نظر ’حقیقت شرعیہ‘ (یعنی از روئے شرع حقیقی مفہوم) تھا اور جنہوں نے اس سے انکار کیا ہے ان کے پیش نظر ’حقیقت لغویہ‘ (یعنی از روئے لغت حقیقی مفہوم) تھا۔ ابن عبد البر کا کہنا یہ ہے کہ حکم (شرعی) کا تعلق شرعی مفہوم سے ہوتا ہے لغوی مفہوم سے نہیں ہوتا۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ قرآن حکیم میں جس خمر (شراب) کے حرام ہونے کا حکم ہے وہ تر پھل سے بنی ہوئی شراب ہے ایسی صورت میں ضروری ہوگا کہ جو لوگ ’خمر‘ کے حقیقی معنی آب انگور لیتے ہیں اور دوسری شرابوں کو مجازی معنوں میں لیتے ہیں وہ ایک ہی لفظ کا اطلاق حقیقی اور مجازی دونوں معنوں میں کرتے ہیں۔ چنانچہ صحابہؓ کو جب ’خمر‘ کے حرام ہونے کا

علم ہوا تو انھوں نے وہ سب بہا دیا جس پر لفظ 'خمر' کا (جس کے حرام ہونے کا حکم ہوا) اطلاق ہوتا تھا۔ خواہ حقیقی معنوں میں اطلاق ہوتا ہو یا مجازی معنوں میں۔ یہ امر دوسری قسم کی شراب کو جائز نہیں کرتا، لہذا صحیح یہی ہے کہ ہر قسم کی شراب 'خمر' ہے اور اس سے الگ نہیں ہے۔

امام فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں آیت تحریم خمر کے ضمن میں فرمایا ہے کہ "اگر انصاف سے کام لیا جائے اور ہٹ دھرمی نہ کی جائے تو معلوم ہوگا کہ آیت تحریم اس مفہوم میں بالکل واضح ہے کہ ہر نشہ آور شے حرام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جہاں یہ فرمایا ہے کہ "انما يريد الشيطان ان يوقع بينكم العداو والبغضاء في الخمر والميسر، ويصدكم عن ذكر الله وعن الصلوة" (یعنی شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تم میں باہم بغض و عناد ڈال دے۔ اللہ کے ذکر سے ہٹا دے اور ادائے نماز سے باز رکھے) اس کے بعد ہی یہ ارشاد ہے کہ "فهل انتم منتهون" (یعنی کیا اب تو تم اس سے باز آتے ہو؟) اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ شراب میں ایسی ایسی خرابیاں ہیں لہذا یہ ممنوع ہے اور معمولی عقل بھی اس بات کو تسلیم کرے گی کہ یہ تمام خرابیاں شراب کے نشہ سے پیدا ہوتی ہیں پس ارشاد باری "فهل انتم منتهون" سے قطعی طور پر یہ مفہوم نکلتا ہے کہ شراب سے نشہ ہوتا ہے (جوان خرابیوں کا موجب ہے) اور جب یہ ثابت ہو گیا تو یقینی طور پر اس سے لازم آیا کہ ہر نشہ آور شے حرام ہے۔ اس قدر سمجھ لینے کے بعد بھی اگر کوئی شخص اپنے قول پر اصرار کرے تو اس مخالفت کا کوئی علاج نہیں ہے۔

حنفیہ کا خیال یہ ہے کہ شیرہ گندم کا ہو یا زیتون، چاول، جو، مکی اور غسل وغیرہ کا، حلال ہے۔ خواہ نچوڑا ہوا ہو یا پکایا ہوا۔ اگر اس کے پینے سے نشہ نہ ہو تو پینے والے کو حد نہ ماری جائے۔ تا آنکہ پینے والا مخمور نہ ہو جائے اور ایسے مشروب کو حلال جاننے والا 'خمر' کو حلال کہنے والے کی طرح کافر قرار نہیں دیا جائے گا۔

اس بارے میں حنفیہ کے دلائل حسب ذیل ہیں:

ایک دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے "ومن ثمرات النخيل والاعناب تتخذون منه سكرًا وورقًا حسنًا" (یعنی کھجور کے درختوں کے پھل اور انگور سے تم لوگ نشہ آور مشروب اور اچھا رزق حاصل کرتے ہو)۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر یہ احسان بتایا کہ وہ خرما اور انگور سے نشہ آور مشروب حاصل کرتے ہیں۔ حنفیہ بھی یہی کہتے ہیں کہ اس میں نشہ بھی ہے اور اچھی خوراک بھی پس لازم ہے کہ اس میں کوئی چیز مباح ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی کا تصور اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ اس کا استعمال روا ہو۔

دوسری دلیل وہ روایت ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حجۃ الوداع والے سال میں سقایہ (پنسال) پر تشریف لائے پھر وہاں ٹیک لگا کر بیٹھے اور فرمایا استقونی (یعنی مجھے پانی پلاؤ) حضرت عباس نے عرض کیا کہ آیا حضور نبیز (شیرہ) جو گھر میں نکالا جاتا ہے پینا پسند فرمائیں گے؟ ارشاد ہوا لاؤ جو لوگوں کو پلاتے ہو۔ چنانچہ وہ نبیز (شیرہ یارس) ایک پیالہ میں لے کر آئے۔ آپ نے اسے سونگھا اور چہرے سے ناراضگی کا اظہار فرمایا اور واپس کر دیا۔ حضرت عباس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آیا آپ نے اہل مکہ کو اس کے پینے سے منع فرمایا ہے۔ آنحضرت نے فرمایا اسے پیالہ میں انڈیلو۔ پس پیالہ میں نکال کر پیش کیا گیا۔ حضور نے زمزم کا پانی طلب فرمایا اور اس میں ملا کر اسے پی لیا اور ارشاد فرمایا کہ ان مشروبات میں اگر جوش (یا ابال) آجائے تو پانی ملا کر اس کا ابال دور کر لیا کرو۔

اس حدیث سے یوں استدلال کیا گیا ہے کہ اس میں پانی کی آمیزش اس لیے کی گئی تھی کہ اس میں زیادہ تبدیلی آگئی تھی اور اس کی تندگی کو توڑنے کے لیے پانی کی ملاوٹ کی گئی۔ اور حضور کا اسے نوش فرمانا اس کے حلال ہونے کی واضح دلیل ہے۔

تیسری دلیل صحابہ رضوان اللہ علیہم کے آثار ہیں۔ اور یہ کہ جس شے کو خمر کہا جاتا ہے اور اس کا پینا حرام ہے وہ انگور یا کھجور کے شیرے سے بنی ہوئی ہوتی ہے جبکہ اس میں ابال آجائے، تندگی پیدا ہو جائے اور جھاگ پھینکنے لگے یہ بدلائل قرآن و حدیث و اجماع امت و تواتر قطعاً حرام ہے۔ رہا ان درختوں کے علاوہ اور قسم کی شراب۔ سو جو شخص اس کو حلال جانے اسے فاسق قرار دیا جائے گا باقی تمام نشہ آور اشیاء کا حرام ہونا حدیث اور قیاس کی بناء پر ہے۔

ان تمام اقوال میں سے اس قول کو ترجیح حاصل ہے کہ ایسا مشروب جو زیادہ مقدار میں نشہ آور ہو اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔ اس کو خمر کہا جائے گا اور پینے والے پر حد (سزائے شرعی) نافذ ہوگی۔ ہر قسم کی شراب اس حکم میں آتی ہے خواہ انگور، کھجور، کشمش، گندم، جو، زیتون، مکئی، چاول کی بنی ہوئی ہو یا کسی اور شے کی اور تازہ ہو یا پکائی ہوئی۔ مشروب کے طور پر استعمال ہوتی ہو یا کسی اور طرح۔ منجملہ ہویا رقیق۔ پینے والے نے اسے حرام سمجھا ہو یا مباح سمجھ کر پیا ہو (بہر حال وہ مستوجب سزا ہے) کیونکہ اس کے مباح ہونے کی دلیل کمزور ہے اور اکثر علماء کے نزدیک (اس کے حلال ہونے کا قول) قابل انحراف ہے، خاص کر اس زمانے میں جبکہ لوگوں کی طبیعت میں بگاڑ ہے اور دین کے ضوابط میں خلل ہے اور طرح طرح کے شہوانی، نشہ آور مشروبات کی کثرت ہے لوگوں نے ان کے اچھے اچھے نام رکھ لیے ہیں مثلاً بیر، بوظہ، القات، تنکہ اور عرق وغیرہ۔ عہد حاضر میں لوگوں نے اسے حلال بنا لیا ہے۔ حالانکہ وہ حرام ہیں کیونکہ زیادہ مقدار میں پینے سے نشہ ہو جاتا ہے اور عقل زائل ہو جاتی ہے رسول اللہ ﷺ نے آخری زمانہ کی بابت جو پیشگوئی فرمائی وہ سچ ہو رہی ہے۔

حضرت ابو مالک اشعری سے مروی ہے کہ انھوں نے آنحضرت ﷺ سے سنا کہ حضور نے فرمایا ”لیشربن الناس من امتی الخمر، ویسمونها بغیر اسمها“ احمد و ابوداؤد (یعنی میری امت کے کچھ لوگ شراب پییں گے اور اسے شراب کے علاوہ کسی اور نام سے یاد کریں گے)۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”لتستحلن طائفة من امتی الخمر باسم یسمونها ایاه“ (یعنی میری امت میں سے ایک جماعت شراب کو حلال کر لے گی وہ ہوگی شراب لیکن اس کا نام شراب کے علاوہ کچھ اور رکھ لیا جائے گا۔ امام احمد و ابن ماجہ نے اسے روایت کیا ہے۔) انھوں نے تستحل کی جگہ پر تشریب روایت کیا (یعنی ”حلال کرے گی“ کی جگہ ”پے گی“ روایت کیا۔

ابی امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”دن رات نہیں گزریں گے“ (ایک زمانہ آئے گا) کہ میری امت کا ایک گروہ شراب پیے گا اور وہ اس کا دوسرا نام رکھ لے گا۔ اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

ابن حیریز نے کسی صحابی سے روایت کی ہے کہ حضور نے فرمایا کہ ”ی شرب الناس من امتی الخمر، ویسمونها بغیر اسمها“ (یعنی میری امت میں سے کچھ لوگ شراب پییں گے اور اس کا نام شراب کے علاوہ کچھ اور رکھ لیں گے) اسے نسائی نے روایت کیا ہے۔

یہ حدیثیں اور ان کے علاوہ اور حدیثیں ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے بارے میں قطعی دلائل ہیں کیونکہ ان میں ایسی باتوں کی خبر دی گئی ہے جو بعد میں پیش آنے والی تھیں۔ اور آپ تو اپنی طرف سے کچھ نہیں فرماتے تھے (بلکہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہوتا تھا) چنانچہ حضور نے مختلف قسم کے مشروبات کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا تھا وہ سب کچھ اس زمانہ میں ظہور پذیر ہو رہا ہے۔

وہ شیرہ جس میں شدت (تندی) نہ آئی ہو

ایسے عصر (نچڑے ہوئے رس) کے بارے میں جو تین دن کا ہو جائے لیکن ہنوز تازہ ہو اور اس میں ابال یا تندی نہ ہو اور جھاگ نہ آئی ہو علماء کا اختلاف ہے۔

حنفیہ، مالکیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر وہ شیرہ تین دن یا اس سے کم عرصہ کا ہو اور اس میں ابال اور تندی پیدا نہ ہو اور جھاگ نہ لایا ہو تو وہ 'خمر' نہیں ہے۔ اس کا پینا حلال ہے کیونکہ اس میں نشہ نہیں ہوتا۔ اس کی دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی وہ روایت ہے جس میں وہ فرماتی ہیں کہ "کاننبد لرسول اللہ ﷺ فی سقاء یوکی اعلاہ، ولہ عزلاء، نبذہ غدوۃ فیشر بہ عشیاء، ونبذہ عشیاء فیشر بہ غدوۃ" بروایت امام احمد و مسلم و ابوداؤد و دمام ترمذی رحمہم اللہ (یعنی رسول اللہ ﷺ کے لیے ایک سقاء۔ مشکیزہ یا ظرف آب میں ہم نبذ یا افشرہ بناتی تھیں اور اس کا دھانہ ڈوری سے باندھ دیتی تھیں اس کے نچلے حصہ میں ایک سوارخ تھا۔ یہ نبذ (یا افشرہ) صبح کو تیار ہوتا اور آپ اسے رات کو پیتے تھے اور رات کو افشرہ تیار ہوتا اسے اگلی صبح کو تناول فرماتے)۔

ایک اور حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ "کان رسول اللہ ﷺ یسبذ لہ اول اللیل، فیشر بہ اذا اصبح یومہ ذلک، واللیلۃ الی تجی، والغد، واللیلۃ الاخری، والغد الی العصر، فاذا بقی شیء سقاہ الخدم، أو امر فصب" بروایت امام احمد و مسلم رحمہما اللہ (یعنی رسول اللہ ﷺ کے لیے سرشام نبذ یعنی افشرہ بنایا جاتا تھا آپ اسے اگلی صبح کو پیتے پھر اگلی رات کو اور اس سے اگلی صبح کو اور پھر دوسری رات کو اور اس سے اگلے روز عصر کے وقت تک۔ اس کے بعد اگر کچھ بچ جاتا تو اسے خادم پی لیتے یا پھینک دینے کا حکم فرماتے تھے)۔

ایک اور روایت میں ہے کہ "کان یسبذ لہ الزبیب فیشر بہ النیوم والغد، وبعد الغد الی مساء الثالث، ثم یأمر بہ، فیسقی الخادم، أو یہراق" امام احمد، مسلم و ابوداؤد (یعنی آنحضرت ﷺ کے لیے کشمش کو بھگو دیا جاتا تھا، آپ اس کو اس روز اور اس کے اگلے روز اور اگلے سے اگلے روز یعنی تیسرے دن کی شام تک پیتے تھے پھر جو بچتا وہ خادم پی لیتا یا پھر اسے لٹھا دینے کا حکم دیتے تھے) اور یہ جو خادم کے پینے کا ذکر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت تک اس میں نشہ نہیں ہوتا تھا۔ ورنہ یہ تو جائز نہیں ہے کہ خادم کو نشہ آور مشروب پلایا جائے۔ جبکہ خود آپ کو پینا جائز نہ تھا۔ بلکہ تیسرے دن عصر کے بعد اس کو پھینک دینا واجب ہے۔ کیونکہ تین دن کے بعد اس کی خاصیت بدل جاتی ہے اور مشروب نشہ آور ہو جاتا ہے۔ لہذا اس کا پینا حرام ہے اور وہ نجس ہوتا ہے اس لیے پھینک دیا جاتا ہے۔

ابن ابی شیبہ اور نسائی نے بطریق سعید بن المسیب و شعبی اخراج فرمایا ہے کہ عصر (یعنی افترده) کو اس وقت تم پی سکتے ہو جب تک کہ اس میں ابال نہ آئے۔ حسن بصری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عصر (افترده) کو اس وقت تک پی سکتے ہو جب تک کہ اس میں تغیر نہ پیدا ہو جائے۔ بیشتر بزرگان سلف کا یہ قول ہے کہ تین دن سے پہلے اسے پیا جاسکتا ہے بشرطیکہ اس میں تغیر نہ آیا ہو یعنی (بگڑا نہ ہو)۔ لیکن جب اس میں تغیر پیدا ہو جائے تو اس کا پینا حرام ہے اس کی علامت یہ ہے کہ اس میں غلیان پیدا ہو (یعنی ابال آنے لگے)۔ اس کی کیفیت عصر (افترده) کی اقسام کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے اور مقامی خطہ کو بھی اس میں دخل ہے۔ اگر وہ گرم علاقہ ہے تو اس میں یہ خرابی جلد ہی اثر انداز ہوگی۔ لیکن اگر وہ ٹھنڈے علاقہ میں ہے یا سردی کا موسم ہے تو وہ جلد خراب نہ ہوگا۔ غرض اس کے استعمال کا جواز اس پر موقوف ہے کہ اس میں غلیان (ابال) نہ پیدا ہوا ہو۔ اگر ابال شروع ہو جائے تو حرام ہے۔

حنا بلہ کہتے ہیں کہ اگر افترده بنے تین دن ہو گئے ہیں تو اسے 'خمر' قرار دیا جائے گا اس کا پینا حرام ہے اور اسے ضائع کر دینا واجب ہے۔ اگرچہ اس میں ابال نہ آیا ہو اور تندی نہ پیدا ہوئی ہو یا جھاگ نہ آنے لگے ہوں۔ کیونکہ اسے 'خمر' اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں خمر (ابال) آنے تک اسے پڑا رہنے دیتے ہیں یہاں تک کہ اس کی بو میں تبدیلی آجاتی ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ "علمت ان رسول اللہ ﷺ کان یصوم، فتحننت فطرہ بنیید صنعته فی دباء، ثم اتیتہ بہ، فاذا هو ینش، فقال اضرب بهذا الحائط، فان هذا شراب من لایؤمن باللہ والیوم الآخر" ابو داؤد و النسائی (یعنی مجھے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ روزہ رکھ رہے تھے میں نے ایک ظرف کدو میں نبیز (افترده) تیار کیا اور ان کے افطار کا منتظر رہا۔ پھر اسے لے کر حضور کی خدمت میں آیا تو دیکھا کہ اس میں ابال آنے لگا ہے۔ آپ نے فرمایا اسے دیوار پر اٹھیل دو اس مشروب کو وہ پیے جسے خدا اور آخرت پر ایمان نہ ہو)۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے عصر (افترده) کے بارے میں مروی ہے "اشربہ مالم یاخذہ شیطانہ" (یعنی اسے اس وقت تک پی سکتے ہو جب تک اس پر شیطان کا غلبہ نہ ہو)۔ دریافت کیا گیا کہ شیطان کا غلبہ کب ہوتا ہے فرمایا فی ثلث (یعنی تین دن میں) احمد وغیرہ نے اس روایت کیا ہے۔

امام شوکانی نے نیل "الافطار" میں بتایا ہے کہ (روایت بالا میں) فتحننت فطرہ، کے معنی یہ ہیں کہ میں حضور کے وقت افطار کا منتظر رہا اور صنعته فی دباء کے معنی ظرف کدو میں تیار کرنے کے ہیں اور لفظ ینش بفتح الیاء و کسر النون کے معنی غلی (یعنی ابلنے) کے ہیں چنانچہ جب شراب میں ابال آجائے تو کہتے ہیں "نشبت الخمر یا تنش نشیلاً اذا غلت" (یعنی شراب ابلنے لگی یا اس میں ابال آگیا) غرض 'نبیز' کا پینا اس وقت تک روا ہے۔ جب تک اس میں شیرینی ہے اور اس کے ذائقہ میں فرق نہیں آیا۔ لیکن اگر موسم گرما میں نبیز تند ہو جائے اور اس کے ذائقہ میں تبدیلی آنے لگے تو جملہ اصحاب کی رائے میں اس کا پینا حرام ہے۔

پکائے ہوئے عصر (افترده یا شیرہ) کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر عصر کو اس قدر جوش دیا جائے کہ ایک تہائی حصہ کم ہو جائے تو اسے 'طلاء' کہتے ہیں۔ اگر آدھا رہ جائے تو اسے 'منصف' کہتے ہیں اگر معمولی سا جوش دیا جائے تو اسے 'باق' کہتے ہیں۔ اب اگر اس میں ابال

آجائے تندی یا شدت پیدا ہو جائے اور جھاگ دینے لگے تو یہ سب حرام ہیں۔ کیونکہ اس صورت میں یہ لذت انگیز اور طرب آگین مشروب مانع ہو جائے گا، فاسقوں کا شیوہ ہے کہ وہ اکٹھے ہو کر اسے پیتے ہیں۔ اس کا پینا (شرعاً) حرام ہے تا کہ اس میں جو خرابی ہوتی ہے اس سے بچا جاسکے۔ البتہ اگر شیرہ کو اس قدر پکایا جائے کہ دو تہائی شیرہ سوخت ہو جائے تو وہ حلال ہے اگرچہ اس میں تندی آجائے بشرطیکہ نیت پر ہیزگاری کی ہو مستی و بخودی کے لیے ہو تو حرام ہے یہ حکم اس روایت کی بناء پر ہے جس کا نسائی نے بطریق عبد اللہ ابن یزید ^{خطمی} اخراج کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر نے یہ لکھا تھا کہ ”اطبخوا شرابکم حتی یذهب نصیب الشیطان اثین، ولکم واحد“ (یعنی تم اپنی شراب کو اس قدر پکاؤ کہ شیطان کے دو حصے جو ہیں وہ ختم ہو جائیں اور ایک حصہ باقی رہے)۔ حافظ نے کتاب فتح میں اس روایت کو صحیح بتایا ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں بطریق محمود بن لبید الانصاری اخراج فرمایا ہے کہ حضرت عمر جب شام میں آئے تو شام کے باشندوں نے وہاں کے وبائی امراض اور خرابی، آب و ہوا کی شکایت کی اور کہنے لگے کہ جب تک یہ (ابالہوا مشروب) استعمال نہ کیا جائے صحت مند نہیں رہتے۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ شہد پیا کرو۔ انھوں نے کہا کہ شہد سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ وہاں کے باشندوں میں سے کسی نے کہا کہ آیا آپ اس مشروب کو ایسا بنا سکتے ہیں کہ نشہ آور نہ رہے۔ آپ نے فرمایا ہاں پھر انھوں نے (کہنے کے مطابق) اسے پکایا یہاں تک کہ صرف ایک تہائی رہ گیا، پھر اسے لے کر وہ حضرت عمر کے پاس آئے۔ آپ نے اپنی انگلیاں اس میں بار بار ڈال کر نکالیں جو اس میں لس جاتی تھیں۔ تب آپ نے فرمایا کہ یہ طلاء (قوام) طلاء شتر (یا قطران) کی مانند ہے (جو بالعموم اونٹ پر ملا جاتا ہے) اور فرمایا کہ اب اس کو پی سکتے ہو اور کہا ”اللہم انسی لا احل لہم شیناً حرمتہ علیہم“ (یعنی اے اللہ میں نے ایسی شے کو حلال نہیں کیا جسے تو نے ان پر حرام فرمایا ہے) اور بطریق سعید بن المسیب سے ایک روایت ہے کہ حضرت عمر نے ایسی شراب کو حلال فرمایا ہے جسے پکا کر دو تہائی جلا دیا جائے اور ایک تہائی باقی رہے۔

کتاب فتح میں مذکور ہے کہ حضرت عمر کے اس حکم کے متعلق جس جس کے پاس ذکر آیا سب نے حضرت عمر سے اتفاق کیا۔ مثلاً ابو موسیٰ اور ابوالدرداء جن سے نسائی نے اخراج فرمایا۔ نیز امام علی کرم اللہ وجہہ ابو امامہ اور خالد بن ولید جن سے ابن ابی شیبہ وغیرہ نے اخراج کیا۔ تابعین میں سے ابن المسیب، حسن اور عکرمہ نے اور فقہاء میں سے امام ثوری، لیث اور مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ نے فرمایا کہ پکایا ہوا شیرہ اگر نشہ آور ہو جائے تو اس کا پینا منع ہے۔ خواہ قلیل مقدار میں ہو یا زیادہ مقدار میں اور خواہ ابال آیا ہو یا نہ آیا ہو کیونکہ بہت ممکن ہے کہ ابال آکر اس میں نشہ پیدا ہو گیا ہو لیکن بعد میں اس کا ابال بیٹھ گیا ہو۔ پس ان سب کے نزدیک اس کو استعمال میں لانے کی شرط یہ ہے کہ وہ نشہ آور نہ ہو۔

امام مالک نے باسناد صحیح اخراج فرمایا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ”انسی وجدت من فلان ریح شراب، فزعم انه شرب الطلاء وانی سائل عما شرب، فان کان یسکر جلدتہ فجلدہ عمر الحدتاماً“ (یعنی فلاں شخص سے مجھے شراب کی بو آئی۔ آپ نے گمان کیا کہ اس شخص نے طلاء (مشروب جو شانہ یا نشہ آور شیرہ) پی رکھا ہے۔ میں اس سے پوچھنے والا ہوں کہ کیا پیا ہے اگر وہ نشہ آور ہے، تو میں اس پر درے لگاؤں گا۔ چنانچہ حضرت عمر نے اسے پورے درے مارے)۔ بظاہر اس عبارت میں کچھ رہ گیا ہے۔ اصل عبارت یوں ہے ”فسال عنہ فوجدہ یسکر فجلدہ“ (یعنی حضرت عمر نے اس کی بابت دریافت کیا تو اسے نشہ آور پایا تب اسے حد

ماری (تازیانہ کی سزا دی)۔ سعید بن منصور نے حضرت عمر سے اسی طرح اخراج فرمایا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے خیال کی تردید ہے جنہوں نے یہ سمجھا کہ حضرت عمر بن الخطاب نے پکائی ہوئی شراب کو جائز قرار دیا ہے جبکہ اسے اتنا پکایا جائے کہ دو تہائی جل جائے۔ ابواللیث سمرقندی کہتے ہیں کہ پکایا ہوا افشرہ اگر نشہ آور ہو جائے تو اس کا پینا 'خمر' کے پینے سے بڑا گناہ ہے کیونکہ خمر (شراب) پینے والا جب شراب پیتا ہے تو اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے اور پکے ہوئے نشہ آور مشروب کا پینے والا اسے حلال جان کر پیتا ہے۔ اس بات پر اجماع (سب کا اتفاق) ہے کہ شراب خواہ تھوڑی ہو یا بہت حرام ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ "کل مسکر حرام" (یعنی ہر نشہ آور شے حرام ہے) اور حرام شے کو حلال سمجھنا کفر ہے۔

شافعیہ، مالکیہ اور ہادیہ کہتے ہیں کہ ہر نشہ آور شے کا پینا حرام ہے خواہ وہ عصیر (نچوڑا ہوا شیرہ) ہو یا نبذ (رس) اس کا استعمال مطلقاً ناجائز ہے خواہ اتنی تھوڑی مقدار ہو کہ نشہ نہ لائے۔ (لیکن حرام اسی صورت میں ہوگا) کہ اس میں نشہ لانے کی صلاحیت ہو۔

شراب سے سرکہ بنالینے کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ خمر (شراب) کو سرکہ بنالینا حلال ہے، خواہ شراب خود سرکہ بن جائے یا اسے سرکہ بنالیا جائے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد کہ "نعم الا دم الخل مطلق" ہے (یعنی سرکہ بہت اچھا سالن یا لاون ہے) (یعنی یہ تفصیل نہیں ہے کہ وہ خمر سے بنا ہوا کسی اور طرح سے) پھر یہ بھی ارشاد ہے کہ "خیر خلکم خل خمر کم" (یعنی اچھا سرکہ وہ ہے جو خمر سے بنایا جائے) اور اس لیے بھی کہ شراب کے سرکہ بن جانے سے اس میں جو برائی ہے وہ جاتی رہتی ہے اور اس کی خاصیت اچھی ہو جاتی ہے

کیونکہ سرکہ قاطع صفراء ہے۔ (یعنی صفراء کو چھانٹ دیتا ہے) اور اس میں غذائیت کے علاوہ اور بھی خوبیاں ہیں اگر (شراب کی) وہ خرابیاں دور ہو جائیں جو اس کے حرام ہونے کا موجب ہیں تو وہ اسی طرح حلال ہو جائے گی جیسے سرکہ بذات خود حلال ہے اور جس برتن کی شراب سرکہ بن جائے وہ برتن بھی پاک ہو جائے گا۔ کیونکہ سرکہ بن جانے کے بعد شراب کا ہر جزو سرکہ بن جاتا ہے رہا برتن کا وہ حصہ جو سرکہ سے خالی ہے، کہا جاتا ہے کہ وہ بھی ساتھ کے ساتھ پاک متصور ہو گا۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر شراب کا سرکہ بنانے کے لیے اسے دھوپ سے ہٹا کر سایہ میں رکھ دیا جائے یا (سرکہ بنانے کے لیے) ایسا ہی کوئی اور طریقہ اختیار کیا جائے تو وہ بھی اس کے حلال اور پاک ہو جانے کی ایک صورت ہوگی۔

مالکیہ سے اس بارے میں تین روایتیں منقول ہیں اور ان میں صحیح ترین روایت یہ ہے کہ (شراب سے) سرکہ بنانا حرام ہے۔ اگر اس کا سرکہ بنالیا جائے تو وہ سرکہ پاک متصور ہوگا تاہم ایسا کرنا گناہ ہے کیونکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ سے شراب کو سرکہ بنائے جانے کی بابت استفسار کیا گیا تو آپ نے فرمایا "لا" (یعنی ایسا نہ کرو) احمد، ابو مسلم ابوداؤد اور ترمذی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ابوطلمحہ نے آنحضرت ﷺ سے ان قیموں کا ذکر کیا جنہیں ورشہ میں شراب ملی تھی آپ نے حکم دیا کہ اس شراب کو بہادو۔ عرض کیا

گیا کہ آیا اس کا سرکہ نہ بنالیا جائے ارشاد ہوا ”لا“ (یعنی نہیں) احمد اور ابو داؤد اس حدیث کے راوی ہیں۔ اس میں عوام کے لیے ایک رہنمائی ہے کہ شراب سے سرکہ بنانا جائز نہیں ہے اور سرکہ بنانے سے کہ اس میں کچھ ڈال کر بنایا جائے، پاک نہ ہوگا۔

شراب کی تلچھٹ کا بیان

شراب کی تلچھٹ کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ تلچھٹ ظرف شراب کی تہ میں جمی ہوئی شے ہے، جسے درد کہتے ہیں شافعیہ کہتے ہیں کہ ”خمر“ کی تلچھٹ پینا حرام ہے اور جو پیے اسے حد (ضرب تازیانہ) ماری جائے۔ یہی حکم دوسری نشہ آور چیزوں کا ہے اور ایسی شے کے پینے پر حد نہ ہوگی جس میں مل کر شراب ختم ہوگئی ہو۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ شراب میں گندھے ہوئے آٹے کی روٹی کھائی جائے۔ اس طرح شراب آگ میں جل جاتی ہے البتہ روٹی نجس رہ جاتی ہے۔ اسی طرح شراب آمیز معجون کے کھانے پر بھی حد نہیں ہے کیونکہ شراب کو اس میں مار دیا جاتا ہے۔ نیز اس گوشت کے کھانے پر حد نہیں ہے جو شراب میں پکایا جائے۔ بخلاف اس صورت کے جب کہ اس گوشت کا شور با بنالیا جائے یا گوشت کو شراب میں ڈبو کر یا اس کا ٹرید بنا کر (یعنی اس میں بھگو کر) کھایا جائے۔ ان صورتوں میں حد (سزائے شرعی) نافذ کی جائے گی کیونکہ اس میں شراب اپنی اصل حیثیت باقی رکھتی ہے اگر شراب کا حقنہ دیا جائے کہ کسی مانع شے کے ساتھ (بذریعہ ایہہ) اسے جوف شکم میں پہنچا دیا جائے تو اس پر حد عائد نہ ہوگی البتہ ناک سے سڑک کر پیٹ میں داخل کی جائے تو حد نافذ ہوگی کیونکہ اس سے شراب کا نشہ ہو جاتا ہے اور اس طرح پیٹ میں کچھ داخل کرنے سے روزہ بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ اندریں باب ایک قول ضعیف یہ بھی ہے کہ شراب کے حقنہ سے یا سڑکنے سے حد جاری نہ ہوگی کیونکہ حد (سزائے شرعی) کا مقصد مرتکب کی تنبیہ ہے اور اس عمل پر تنبیہ کی حاجت نہیں ہے کیونکہ اس فعل میں نقصانی خواہش کو دخل نہیں ہوتا۔ تاہم بلیغینی کا کہنا یہ ہے کہ شراب کو ناک سے سڑکنے پر حد ماری جائے گی۔ حقنہ (ایہہ) کرنے پر حد نہیں ہے۔ کیونکہ شراب کو سڑکنے سے سرور ہو سکتا ہے حقنہ سے نہیں ہوتا۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ شراب کی تلچھٹ کو پینا یا اسے کام میں لانا مکروہ ہے کیونکہ وہ بھی شراب کے اجزاء میں سے ہے۔ لیکن اس کے پینے والے کو جب تک کہ نشہ نہ ہو حد نہیں ماری جائے گی کیونکہ تلچھٹ بہت گھٹیا شے ہے۔ طبع سلیم اسے پسند نہیں کرتی اور تھوڑی سی ہوتی ہے زیادہ نہیں کھی جاتی۔ پس وہ شراب سے جدا گانہ شے ہے اسے شراب نہیں کہا جاسکتا۔

شراب کی خرید و فروخت کا بیان

تمام علماء اس پر متفق ہیں کہ قطعی دلائل کی بناء پر شراب کا حرام ہونا ثابت ہے اسے حلال سمجھنے والا کافر ہے۔ اس کے حرام ہونے پر پوری امت کا اجماع اور یہ بدلائل متواترہ ثابت ہے۔ مسلمان کے نزدیک وہ بے قدر شے ہے۔ لہذا خرید و فروخت جائز نہیں ہے۔ اس کو غصب کرنے والے یا تلف کرنے والے پر کوئی تاوان نہیں ہے۔ کیونکہ ایسا ہونا اس کے قابل قدر ہونے کا ثبوت ہے۔

آنحضرت ﷺ کا ارشاد کہ ان الذی حرم شربها وحرم بیعها، واکل ثمنها (یعنی جو شے حرام ہے اس کی خرید و فروخت حرام ہے اور اس کی قیمت کو استعمال میں لانا بھی حرام ہے) اور اس کے نجس ہونے کے باعث اس سے فائدہ اٹھانا حرام ہے اور اس لیے بھی کہ اس سے استفادہ کرنا اس سے قریب ہونا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا 'فاجتنبوه' (یعنی اس سے دور رہو)۔

شراب کے متعلق احکامات

شراب پینے والے کو حد ماری جائے خواہ اسے نشہ نہ ہوا ہوتا کہ برائی کی بناء ہی جاتی رہے جیسے غیر عورت کے ساتھ خلط ملط اور یوس و کنار بھی حرام ہے کیونکہ اس سے بدکاری تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ حاکم کی روایت میں آیا ہے کہ "من شرب الخمر فاجلدوه" (یعنی جو شراب پیے اسے دڑے لگاؤ)۔ یہ حکم (شراب کے علاوہ) دوسری نشہ آور اشیاء کے لیے نہیں ہے۔ اگر بالفرض کسی کو شراب کا نشہ نہیں ہوتا اور صرف دوران خون ہوتا ہے تب بھی بوجہ نجس ہونے کے نہ کہ بوجہ نشہ آور ہونے کے حرام ہے لہذا (اس حرام کے استعمال کرنے پر) حد ماری جائے گی۔

اگر کسی کے گھر میں شراب ہو اور وہاں کچھ لوگ مجلس شراب میں شامل ہونے والوں کی طرح بیٹھے ہوں لیکن انھیں پیتے ہوئے نہ دیکھا گیا ہو نہ ان سے شراب کی بو آتی ہو اور نہ انھوں نے پینے کا اعتراف کیا ہو۔ تو حاکم شرع ایسے اشخاص کو اس بناء پر سزا دے گا کہ انھوں نے ایک امر ممنوع کا ارتکاب کیا ہے اور ناپسندیدہ اشخاص کے شریک مجلس ہوئے۔ اسی طرح اگر کچھ لوگ خانہ خمار (Box) میں جہاں شراب ملی ہے پائے جائیں اور حاکم شرع انھیں دیکھے تو انھیں اس سے باز رکھنے کے لیے سزا دے۔ اگر کسی شخص کے پاس ظرف شراب (بوتل وغیرہ) پایا جائے یا اس نے گھر میں رکھ چھوڑا ہو تو اسے بھی سزا ملے گی کیونکہ اس نے امر ممنوع کا ارتکاب کیا۔

شراب کی بو محسوس کرنے کا بیان

اگر کسی شخص نے ارادۂ بلا جبر کے شراب پی اور اس حالت میں گرفتار ہوا کہ اس (کے منہ) سے شراب کی بو آتی یا ایسا شخص حاکم کے پاس لایا جائے جو نبیذ وغیرہ عام نشہ آور اشیاء میں سے کوئی شے پی کر مدہوش ہو رہا ہے اور دو اشخاص نے اس کے پینے کی گواہی دی تو اس پر حد نافذ ہوگی۔ اور اگر کوئی شخص گرفتار ہوا جب کہ اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی لیکن حاکم کے پاس لائے جانے تک، فاصلہ دور ہونے کے باعث وہ بو جاتی رہی، تب بھی اسے حد ماری جائے گی۔ ہاں اگر حاکم تک پہنچنے کا فاصلہ قریب تھا (اور بو جاتی رہی) تو اس حالت میں (اس کے مستوجب سزائے حد ہونے کے متعلق) علماء کا اختلاف ہے: حنفیہ کہتے ہیں کہ اس پر حد نافذ نہ کی جائے کیونکہ جب تک شراب کی بو کے ساتھ گواہ بھی نہ ہو تو وہ شخص مستوجب حد نہیں ہے۔

حنفیہ میں سے امام محمد اور مالکیہ و شافعیہ اور بموجب ایک روایت کے حنابلہ بھی یہ کہتے ہیں کہ شہادت موجود ہو تو حد ماری جائے گی، خواہ شراب کی بو اس شخص سے نہ آتی ہو۔ ان کے نزدیک حد نافذ کرنے کے لیے شراب کی بو آنا یا شرابی کا اقرار کرنا شرط نہیں ہے۔ کیونکہ (ثبوت جرم کے لیے) بو کا آنا ضروری نہیں ہے (شہادت کافی ہے)۔

اگر کسی سے شراب کی بو آ رہی ہو لیکن وہ شراب پینے کا اعتراف نہ کرے اور گواہ بھی کوئی نہیں ہے تو ایسی حالت میں (نفاذ حد کے بارے میں) علماء کا اختلاف ہے۔

حنفیہ، شافعیہ، جمہور اہل عراق اور بصرہ کے علماء کہتے ہیں کہ محض شراب کی بو محسوس ہونے کی بناء پر حد جاری نہ کی جائے کیونکہ شراب پینے کا جرم اس سے ثابت نہیں ہوتا۔ شراب کی سی بو اور شے سے بھی آ سکتی ہے لہذا کوئی حکم بو آنے یا نہ

آنے کی بناء پر نہیں دیا جاسکتا۔ بلکہ یہ شبہ کی بات ہے اور شبہ ہو تو حد ساقط ہو جاتی ہے۔ مالکیہ، حنابلہ اور جمہور اہل حجاز کہتے ہیں کہ (شراب کی) بو آنے پر حد نافذ ہوگی بشرطیکہ دو معتبر گواہ حاکم کے روبرو اس کی شہادت دیں کیونکہ شراب کی بو تحریر یا آواز کی شہادت کی مانند ہے۔ اور (منہ سے) بو کا آنا شراب پینے کے ثبوت میں سب سے قوی شہادت ہے۔ ماہرین کو بو کے تعین میں شبہ نہیں ہو سکتا۔ اس حکم کا ثبوت صحیحین کی اس روایت سے ہوتا ہے جو ابن مسعود سے مروی ہے۔ ”انہ قرأ سورہ یوسف فقال رجل: ماہکذا انزلت، فقال عبد اللہ: واللہ لقد قرأتھا علی رسول اللہ ﷺ فقال: احسنت، فبینا ہو یکلمہ، اذ وجد منہ رائحة الخمر فقال: اتشرب الخمر، وتکذب بالکتاب؟ فضر به الحد“ (یعنی انھوں نے سورہ یوسف کو پڑھا۔ ایک شخص نے کہا کہ یہ سورت اس طرح نازل نہیں ہوئی، (عبداللہ ابن مسعود) نے کہا کہ بخدا میں نے یہ سورت رسول اللہ ﷺ کے سامنے پڑھی۔ آپ نے تحسین فرمائی۔ لیکن وہ شخص جس وقت بول رہا تھا اس (کے منہ) سے بوئے شراب آرہی تھی۔ اس پر انھوں نے کہا کہ تو نے تو شراب پی رکھی ہے اور کلام اللہ کو جھٹلاتا ہے۔ اس کے بعد اس شخص کو حد مار گئی۔ یہ روایت اس امر کی دلیل ہے کہ حضرت ابن مسعود نے شراب کی بو آنے کی بناء پر اس شخص پر حد کا نفاذ فرمایا: اس کے لیے نہ کوئی شہادت پیش ہوئی اور نہ اس شخص نے اقرار کیا۔

دارقطنی نے سائب بن یزید سے اور انھوں نے عمر بن الخطاب سے سند صحیح اخراج فرمایا ہے کہ انھوں نے ایک شخص کو جس سے شراب کی بو آرہی تھی حد ماری۔

شراب پینے کا اعتراف کرنے کا بیان

اگر کسی شخص نے شراب پینے کا اعتراف کیا لیکن اس سے شراب کی بو نہیں آرہی۔ اس شخص کے (مستوجب حد ہونے کے بارے میں) علماء کا اختلاف ہے۔

مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ اور حنفیہ میں سے امام محمد کہتے ہیں کہ شراب پینے کا اعتراف کرنے والے کو حد ماری جائے۔ کیونکہ انسان اپنے اوپر بلا وجہ الزام عائد نہیں کرتا۔ چنانچہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ بد فعلی کا اعتراف کر لینے سے جرم باطل نہیں ہو جاتا۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ شراب پینے کا اعتراف کرنے والے کے منہ سے اگر اس وقت بو نہ آتی ہو تو اسے حد نہ ماری جائے۔ کیونکہ شراب پینے کی حد جو صحابہ رضوان اللہ علیہم کے اجماع سے ثابت ہے اور یہ اجماع محض ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی رائے پر ہوا ہے۔ انھوں نے نفاذ حد کے لیے شراب کی بو کا پایا جانا شرط (لازم) قرار دیا ہے۔ چنانچہ ابی ماجہ حنفی سے روایت ہے ”جاء رجل بابن اخ له سکران الی عبد اللہ بن مسعود فقال عبد اللہ بن مسعود: ثور وہ، ومزموہ، واستنکھوہ ففعلوا، فردہ الی السجن، ثم عاد بہ من الغد، ودعا بسوط، ثم امر بہ فلدقت لمرته بین حجرین، حتی صارت درة، ثم قال للجلاد اجلد ورجع یدک، واعط کل عضو حقہ“ (یعنی ایک شخص اپنے بھتیجے کو نشہ کی حالت میں عبداللہ بن مسعود کے پاس لایا۔ عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ اس سے بات چیت کرو۔ ہلاؤ جلاؤ اور سونگھ کر دیکھو چنانچہ اس کی تعمیل کی گئی۔ پھر اسے قید میں ڈال دیا اور اگلی صبح کو طلب فرمایا اور

ایک چھتری منگوائی پھر ان کے حکم سے اس کی گانٹھوں کو دو بیٹوں کے درمیان رکھ کر پکلا گیا۔ جب درہ تیار ہو گیا تو جلا کو حکم دیا کہ اسے دڑے لگاؤ اور ہاتھ بدل بدل کر اس کے ہر عضو کو کما حقہ سزا دو) اس حدیث سے ثابت ہوا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے اسے ہلانے جلانے اور بات چیت سے شراب کی بو محسوس کی تب حد نافذ فرمائی حدیث میں الفاظ ثرثرہ او مزمرہ جو آئے ہیں اس کے معنی ہلانے جلانے اور جھنجھوڑنے کے ہیں تاکہ شراب کی بد بو نمایاں طور پر ظاہر ہو جائے۔ (ہلانے جلانے سے معدہ میں جنبش ہوتی ہے اور بد بو خفیف بھی ہو تو تیز ہو جاتی ہے)۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کا مسلک یہی تھا لہذا شہادت کی بناء پر نفاذ حد کا حکم نہیں دیا جائے گا تاکہ اس کے ساتھ شراب کی بو بھی نہ ہو۔ تاکہ ارتکاب جرم میں شبہ باقی نہ رہے۔

مخمور انسان پر کس حالت میں حد لگائی جائے

ائمہ فقہ اس بات پر متفق ہیں کہ جب تک شراب پینے والے کا نشہ نہ اتر جائے اور وہ ہوش میں نہ آجائے اسے حد نہ ماری جائے۔ تاکہ وہ ضرب کی اذیت محسوس کرے۔ اس کو تنبیہ ہو اور (آئندہ) اس حرکت سے باز رہے۔ اگر انسان کی عقل بر جانہ ہو اور بے خودی کا غلبہ ہو تو نشہ کے باعث تکلیف کم محسوس ہوتی ہے۔

نشہ باز کے اقرار جرم کا بیان

ائمہ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر مخمور انسان بے خودی اور نشہ کے عالم میں شراب پینے کا اقرار کرے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی عائد کردہ خالص حدود نافذ نہ ہوں گی۔ مثلاً بد فعلی کی حد یا شراب نوشی یا چوری کی حد جب کہ نشہ کی حالت میں وہ ان جرائم کا اقرار کرے البتہ اگر مسروقہ مال کا اقرار کرے تو (اس حال میں بھی) اس کے تاوان کی ادائیگی کا ذمہ دار ہو گا۔ کیونکہ اس کا تعلق بندوں کے حق سے ہے جو اس پر عائد ہوتا ہے۔ حالت نشہ میں اقرار کا ذکر اس لیے ہے کہ اگر (اقرار سے نہیں بلکہ) شہادت سے بدکاری کا ثبوت ہو جائے تو حد ماری جائے گی لیکن نشہ اترنے کے بعد اسی طرح اگر نشہ کی حالت میں چوری کی اور اس کی شہادت موجود ہو تب بھی حد واجب ہوگی اور جب نشہ دور ہو جائے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کے حقوق (یعنی خدا کی مقرر کردہ سزاؤں) کے بارے میں مدہوش انسان کا اقرار تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ ہوش میں آنے کے بعد وہ اس سے رجوع کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مدہوش انسان اقرار یا انکار کسی بات پر قائم اور ایک حالت میں نہیں رہتا۔

علماء کا کہنا یہ ہے کہ اگر نشہ کی مدہوشی میں کوئی شخص اپنے اوپر کسی بندے کا حق واجب ہونے کا اقرار کرے تو اس کا تاوان اس سے تاویباً لیا جائے گا کیونکہ اس نے یہ مصیبت خود اپنے اوپر عائد کی ہے پس اگر کسی نے نشہ کی حالت میں ایک مسلمان مرد یا عورت پر تہمت لگائی تو اسے قید میں ڈال دیا جائے گا اور جب وہ ہوش میں آئے تو اس پر تہمت لگانے کی حد نافذ کی جائے گی پھر اسے ضربات حد کی تکلیف دور ہونے تک بدستور قید میں رکھا جائے گا۔ اس کے بعد دوبارہ شراب پینے کی حد ماری جائے گی۔

واضح ہو کہ نشہ میں آنے سے انسان مرتد نہیں ہوتا اور نہ بیوی سے علیحدگی ہوتی ہے کیونکہ کفر کا تعلق عقیدہ یا توہین سے ہے پس توہین کی غرض سے (دین) کا مذاق اڑانے والے پر کفر عائد ہوتا ہے گو اس کا عقیدہ وہ نہ ہو جو وہ کر رہا ہے لیکن

نشہ کی حالت میں مدہوش انسانوں کا کوئی عقیدہ نہیں ہوتا اور نہ توہین پیش نظر ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں سمجھ ہی نہیں ہوتی اور عقیدہ یا اس کی توہین سمجھ بوجھ کا کام ہے۔ یہی وجہ ہے علماء نشہ کی حالت میں کلمہ کفر بکنے والے کو کافر قرار نہیں دیتے۔ کیونکہ (اس حالت میں) وہ مرفوع القلم (یا غیر ذمہ دار) متصور ہوتا ہے۔

بار بار ارتکاب شراب نوشی کا بیان

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے۔ ”من شرب الخمر فاجلدوه، ثم ان شرب فاجلدوه۔ الی ان قال۔ فان عاد الرابعة فاقتلوه“ (یعنی حضور نے فرمایا کہ شراب پینے والے کو درے لگاؤ اور دوبارہ پیے تو پھر درے لگاؤ۔ یہاں تک کہ اگر چوتھی بار بھی ایسا کرے تو اسے قتل کر دو) اس حدیث کونسانی کے سوا تمام ارباب سنن نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے اخراج فرمایا ہے اور اس حدیث یعنی من شرب الخمر فاجلدوه، الخ کونسانی نے سنن اکبریٰ میں محمد بن اسحق سے۔ انھوں نے محمد بن المکند ر سے اور انھوں حضرت جابر سے مرفوعاً اخراج فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس ایک ایسا شخص لایا گیا جس نے چوتھی بار شراب پی حضور نے اسے بھی دڑے لگائے۔ قتل نہیں کیا اصحاب سنن کا کہنا یہ ہے کہ قتل کا حکم منسوخ ہوا۔ چنانچہ روایت میں ان الفاظ کا اضافہ کر دیا کہ مسلمانوں کی رائے میں (شراب پینے کی) حد مقرر ہوگئی ہے اور قتل کا حکم جاتا رہا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے شراب پینے والے کے بارے میں فرمایا کہ ”اذا شرب فاجلدوه، ثم اذا شرب فاجلدوه ثم اذا شرب الثالثة فاجلدوه، ثم اذا شرب الرابعة فاضربوا عنقه“ (یعنی اگر کوئی شراب پیے تو اسے دڑے لگاؤ اور پھر پیے تو دڑے لگاؤ اور تیسری بار پیے تو دڑے لگاؤ پھر اگر چوتھی بار پیے تو اس کی گردن مار دو) یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے الفاظ ہیں۔ اور چاروں اصحاب رحمہم اللہ کے۔

شراب پینے والے کے بارے میں جو روایات ہیں ان میں اختلاف ہے۔ کہ آیا چوتھی بار کوئی پیے تو اسے قتل کیا جائے یا پانچویں بار پینے پر قتل کیا جائے؟

ابوداؤد نے ابان القصار کی روایت سے یہ اخراج فرمایا ہے اور یکے بعد دیگرے تین بار دڑے لگائے جانے کا ذکر کیا اور پھر کہا کہ ”فان شربوا فاقتلوهم“ (یعنی اس کے بعد پھر پیئیں تو انہیں قتل کر دو) چنانچہ بظاہر یہ بھی اسی طرف گئے ہیں اور ابن حزم اسی خیال پر قائم رہے اور اس کا ثبوت انھوں نے احادیث رسول اللہ ﷺ سے دیا ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ حکم قتل کے منسوخ ہو جانے پر اجماع نہیں ہے۔ تاہم جمہور علماء کا خیال یہی ہے کہ چوتھی بار شراب پینے پر قتل کیے جانے کا حکم منسوخ ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے عہد حیات میں ایک بار بھی اس پر عمل نہیں فرمایا۔ اور نہ صحابہ رضوان اللہ علیہم نے کبھی اس پر عمل کیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس حکم کے منسوخ ہو جانے پر اجماع ہے۔

امام ترمذی نے زہری کی روایت سے اخراج کیا ہے جنہوں نے قبیصہ بن نو'یب سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ”من شرب الخمر فاجلدوه الی ان قال ثم اذا شرب فی الرابعة فاقتلوه“ (یعنی جو شراب پیے تو اسے دڑے لگاتے رہو یہاں تک کہ فرمایا اگر چوتھی بار بھی شراب پیے تو اسے قتل کر دو) اس کے بعد راوی کہتے ہیں کہ ایک شخص کو جس نے شراب پی رکھی تھی پیش کیا گیا اسے درے لگے پھر اس نے شراب پی پھر درے لگے۔ اسکے بعد پھر اس نے شراب پی پھر درے لگے اور چوتھی بار بھی جب اس نے شراب پی تو اسے درے ہی

مارے گئے۔ پس قتل کا حکم نہ رہا اور درے کی اجازت ہو گئی۔ یعنی در آنحالیکہ رسول اللہ ﷺ نے چوتھی بار شراب پینے پر بھی درے ہی کی سزا پر اکتفا کیا تو یہ شارع کا قتل سے درگزر کرنے کی اجازت دینا اور سابق الذکر حکم کی جو نافذ نہیں کیا گیا تفسیح کرنا ہے۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ یہ صورت حال (یعنی تفسیح حکم قتل) ایسی بات ہے جس میں اہل علم کو اختلاف نہیں ہے اس بناء پر ترمذی اور جابر بن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ ”فراى المسلمون ان الحد قد وضع، وان القتل قد ارفع“ (یعنی مسلمانوں نے اس سے یہ رائے قائم کی کہ حکم حد برقرار رہا اور قتل کا حکم ہٹا لیا گیا)۔ واللہ اعلم۔

ابن رسلان کہتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ شراب پینے والے پر حد جاری کرنا واجب ہے۔ شراب خواہ تھوڑی سی (پی) ہو یا بہت یا محض ایک قطرہ پی ہو۔ اور اس امر پر بھی اتفاق ہے کہ شراب پینے والے کو (اس کی پاداش میں) قتل نہیں کیا جائے گا۔ خواہ وہ بار بار اس جرم کا ارتکاب کرے۔

حد جاری کرنے کا طریقہ

علماء کہتے ہیں کہ شراب پینے کی سزائے شرعی بدکاری کی سزا سے ہلکی ہوگی کیونکہ بدکاری کی سزا تو قرآن حکیم سے ثابت ہے اور شراب پینے کی سزا سنت (حدیث) سے ثابت ہے۔ علاوہ اس کے بدکاری کا ارتکاب دوسرے پر ظلم ہے اور شراب پینا اپنے اوپر ظلم ہے اور بدکاری کا گناہ باعتبار نقصان دہ ہونے کے شراب پینے سے زیادہ بڑا اور زیادہ ضرر رساں ہے۔ لیکن شراب نوشی کی سزا تہمت لگانے کی سزا سے زیادہ سخت ہے کیونکہ وہ شراب نوشی کا مجرم یقینی طور پر مرتکب جرم ہوتا ہے لیکن تہمت لگانے کے جرم میں اس الزام کے سچ یا جھوٹ ہونے کا امکان ہے۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ شراب کے مرتکب کو سزائے تازیانہ کپڑے اتار کر دی جائے یا بغیر کپڑے اتارے۔

چاروں اماموں کا قول یہ ہے کہ شراب کی سزائے تازیانہ کے وقت مجرم کے تمام کپڑے بجز اس کے جو ستر ڈھانکنے کے لیے ہوں، اتار دیے جائیں۔ جیسا کہ دوسری حدوں کے نفاذ میں ہوتا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ جرم کیا ہوتا ہے اور اس کی تکلیف محسوس ہو اور اجرائے حد کا مقصد پورا ہو کہ آئندہ ارتکاب جرم سے باز رہے۔

امام محمد بن حسن کہتے ہیں کہ شراب پینے کی سزا تہمت کی سزا کی طرح لباس پہنے ہوئے دی جائے اور پوچھتین، روئی دار یا کھال کے سوا اور کوئی کپڑا نہ اتارا جائے۔ کیونکہ شراب نوشی کی سزا بھی تہمت تراشی کی سزا کی مانند ہے جیسا کہ امام علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ہے کہ انسان شراب پی کر اول فول بکنا ہے یہی اول فول الزام تراشی ہے اور اللہ کی کتاب (قرآن) میں جھوٹا الزام لگانے کی سزا ۱۱۱ (۸۰) دڑے ہیں۔

شراب پینے والے کو ضرب ”حد“ لگانے کی کیفیت

شافعیہ کہتے ہیں کہ ضرب یہ ہے کہ کھجور کی کچھی، جوتوں یا کپڑے کے پلوؤں سے مارا جائے۔ کچھی اور جوتے کی سزا اکٹھی دی جاسکتی ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ کچھی، جوتے، کپڑے کے پلو یا ہاتھ سے مارا جائے اور جائز ہے کہ تازیانے مارے جائیں۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ”ان النبی ﷺ ضرب فی الخمر بالجريد والنعال، وجلد ابو بکر اربعین“ متفق علیہ (یعنی رسول اللہ ﷺ نے شراب پینے کی سزا کچھی اور جوتوں کی مار سے دی اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے چالیس ضربیں ماریں)۔

عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے "ان النبی اتی بنعیمان او بابن نعیمان وهو سکران، فشق علیہ، وامر من فی البیت ان یضربوه فضربوه بالجرید والنعال وکنت ممن ضربه" بخاری (یعنی رسول اللہ ﷺ کے سامنے نعیمان یا ابن نعیمان کو پیش کیا گیا اور وہ نشہ میں تھے حضور کو سخت ناگوار گزرا اور گھر میں موجود کسی شخص کو حکم دیا کہ ان کو (سزا کے طور پر) مارا جائے۔ پس انھیں کچھی اور جوتے سے مارا گیا۔ راوی کا کہنا ہے کہ میں بھی ان کو سزا دینے والوں میں تھا)۔

حضرت سائب بن یزید سے مروی ہے "کنانؤتی بالشارب فی عہد رسول اللہ ﷺ وفی امرۃ ابی بکر وصدراً من امرۃ عمر، فنقوم الیہ، نضربه بایدینا، ونعالنا، وار دیتنا، حتی کان صدراً من امرۃ عمر فجعل فیہا اربعین حتی عتوا فیہا وتشقوا، جلد ثمانین" رواہ احمد و البخاری واللفظ لہ، (یعنی عہد نبوی، عہد خلافت ابو بکر اور ابتدائے عہد عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہمارے پاس شراب پینے والے کو لایا جاتا تو اسے ہم اپنے ہاتھوں جوتوں اور چادر سے مارتے تھے۔ عہد خلافت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آغاز تک تو چالیس ضربیں ماری جاتی تھیں۔ جب لوگ اس (جرم کے ارتکاب) میں حد سے زیادہ بڑھ گئے اور بہت زیادہ پینے لگے تو اسی (۸۰) ضربیں لگائیں جانے لگیں) بروایت احمد و بخاری یہ الفاظ راوی کے ہیں۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ "اتی رسول اللہ ﷺ برجل قد شرب فقال: اضربوه فقال ابو ہریرۃ: فمنا الضارب بیدہ، والضارب بنعلہ، والضارب بثوبہ، فلما انصرف قال بعض القوم اخراک اللہ قال: لا تقولوا ہکذا، لا تعینوا علیہ الشیطان" بروایت احمد و بخاری و ابو داؤد (یعنی آنحضرت ﷺ کے پاس ایک شخص کو لایا گیا اس نے شراب پی رکھی تھی۔ حضور نے حکم دیا کہ اسے سزائے ضرب دو۔ حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ ہم ضرب لگانے والوں میں ہاتھ سے مارنے والے بھی تھے اور اپنی جوتی اور کپڑے سے مارنے والے بھی۔ پھر جب وہ شخص واپس جانے لگا تو کسی نے کہا کہ خدا تجھے ذلیل کرے۔ اس پر حضور نے فرمایا ایسا نہ کہو۔ اس پر شیطان کو مسلط نہ کرو)۔

واضح ہو کہ 'جرید' سے مراد کھجور کی کچھی ہے اور کپڑے (کے پلو) سے مراد یہ ہے کہ اسے بٹ لیا جائے تاکہ مار کھانے والے کو دکھ پہنچے۔

حنفیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ اگرچہ کپڑے، جوتی اور کچھی سے ضرب لگانا سنت ہے۔ مگر تازیانہ (کوڑے) سے ضرب لگانا اچھا ہے، جیسا کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم نے کیا اور اس پر کسی کو اعتراض نہ تھا (در اصل) تازیانہ کی ضرب ہی سے حد ماری جانے کا مقصد یعنی آئندہ کے لیے باز رکھنے کا مقصد پورا ہوتا ہے۔

بعض متاخرین کہتے ہیں کہ تازیانہ مارنے کی سزا سر پھرے شرایبوں کے لیے مخصوص ہے اور کپڑے کے کوڑے اور جوتے مارنے کی سزا کمزوروں کے لیے ہے۔ علاوہ ازیں مرتکب جرم جس سزا کے لائق ہو وہی سزا دی جائے۔

ابن الصلاح کہتے ہیں کہ سوط (وہ کوڑا) ہے جو اونٹ کی سرین کی کھال سے بنایا جاتا ہے اور اسے سوط (ملاوٹ) اس لیے کہتے ہیں کہ یہ گوشت کو خون سے ملا دیتا ہے۔

شراب پینے کی سزا میں ضربات کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے۔

حنفیہ، مالکیہ، حنبلیہ اور ایک قول کے مطابق شافعیہ بھی شراب پینے والے کی سزا اسی (۸۰) ضربات بتاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ صحابہ رضوان اللہ علیہم کی متفقہ رائے کی بناء پر ہے۔ سیدنا حضرت عمر بن الخطاب نے جب اس تعداد کے بارے میں مشورہ کیا تو سب نے اس سے اتفاق فرمایا اور کسی نے انکار نہ کیا۔

ابوداؤد اور نسائی نے اخراج فرمایا ہے کہ ”ان خالد بن ولید کتب الی عمر: ان الناس قد انهمکوا فی الخمر، وتحاقروا العقوبة. قال: و عنده مهاجرون والانصار، فسألهم فاجمعوا علی ان يضرب ثمانین“ (یعنی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر کی خدمت میں مراسلہ بھیجا کہ لوگ شراب بہت پینے لگے ہیں اور (موجودہ) سزا کو معمولی خیال کرتے ہیں۔ اس وقت وہاں مهاجرین اور انصار موجود تھے۔ حضرت عمر نے اس کی بابت مشورہ کیا تو سب نے اس امر پر اتفاق کیا کہ اسی (۸۰) کوڑوں کی سزا دی جائے۔

شافعیہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ شراب پینے کی سزا چالیس ضربیں ہیں کیونکہ نبی ﷺ سے اتنی ہی سزا مروی ہے اور یہی سزا عہد خلافت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ میں بھی جاری رہی۔ اگر ان احادیث کو جو اس بارے میں آئی ہیں اور ان سب کے باہمی اختلاف کو یکجائی طور پر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ زیادہ احتیاط اسی میں ہے کہ چالیس درے لگائے ہیں۔ اس سے زیادہ نہیں۔ رہا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو اسی (۸۰) کوڑوں کی سزا دی وہ بطور تعزیر کے ہے بطور حد (شرعی سزا) کے نہیں ہے۔ غرض جہاں تک حد کا تعلق ہے وہ تو چالیس ضربات ہیں البتہ حاکم کو اجازت ہے کہ وہ اسی (۸۰) کوڑوں تک مار سکتا ہے۔

حد مارنے کے لیے مردوں کو کہا جائے کوڑے لگانا عورت کی شان کے خلاف ہے۔ محنت کو بھی اس باب میں عورت ہی قرار دیا جائے گا۔ اگر سزایاب کوئی ذی وجاہت شخص ہے تو اسے علیحدگی میں سزا دینا اچھا ہے۔ تاکہ اس کی رسوائی نہ ہو۔ ہاں اگر مرتکب عوام الناس میں سے ہے تو اسے برسر عام سزا دی جائے۔ لیکن مسجدوں میں سزا نہ دی جائے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”لا تقام الحد فی المساجد“ ترمذی و حاکم اور ابن ماجہ نے بھی اسی طرح اخراج فرمایا ہے۔ یعنی مسجدوں میں سزائیں نہ دی جائیں کہ مبادا مسجد خون سے ناپاک یا غلاظت کے خارج ہونے سے نجس ہو جائے اور سزا اس طرح دی جائے کہ سزایاب ارتکاب حرم سے کنارہ کش ہو جائے، ڈر جائے اور عبرتناک سزا بھگتے۔

سزا کا وقفہ وقفہ کے ساتھ دنوں اور مختلف اوقات میں دیا جانا جائز نہیں ہے۔ تاکہ سزایابی کا جو مقصد ہے وہ پورا ہو۔ بخلاف اس کے اگر کسی نے یہ قسم کھائی کہ میں فلاں شخص کو سو کوڑے باروں گا تو مختلف اوقات اور دنوں میں وقفہ وقفہ سے کوڑے مارے تو قسم پوری ہو جائے گی۔ کیونکہ اس صورت میں قسم کے پورا ہونے کا انحصار ضرب کی تعداد پورا کرنے پر ہے لیکن سزائے شرعی کا مقصد جرم سے کنارہ کشی اور عبرت حاصل کرنا ہے۔ لہذا وقفہ وقفہ سے ضرب نہیں لگائی جائے گی اور چوٹ جسم کے مختلف حصوں پر لگائی جائے۔ ایک ہی جگہ پر ضرب لگانا جائز نہیں ہے۔ یہی نبی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے جلاد کو حکم دیا کہ چہرہ اور اعضائے مخصوص کو چھوڑ کر بدن کے تمام حصوں کو قرار واقعی سزا دی

جائے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ بدن کے مختلف حصوں پر ضرب لگانا واجب ہے۔ کیونکہ ایک ہی جگہ پر مکرر ضرب لگانا المناک بھی ہے اور بعض اوقات موجب ہلاکت ہو سکتا ہے اور ایسی جگہ پر بھی نہ مارنا چاہیے جو فوری ہلاکت کا سبب ہو جائے مثلاً دل پر یا جان کی رگ پر یا عضو مخصوص پر مارنا اور چہرہ پر بھی نہ مارا جائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”اذا ضرب احدکم فلیتق الوجه“ (یعنی جب تم سزا کے طور پر مارو تو چہرہ کو چھوڑ دو) کیونکہ تمام حسن چہرہ ہی میں ہوتا ہے۔ صورت کو بگاڑ دینا، بری بات ہے اور چہرہ کی طرح سر کو بھی عظمت حاصل اس پر بھی چوٹ نہ ماری جائے۔ بعض اصحاب کہتے ہیں کہ سر پر مارنا جائز ہے۔ ابن شیبہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ”انہ قال للجلاد: اضرب الراس، فان الشیطان فی الراس“ (یعنی سر پر مار۔ شیطان سر میں سمایا ہوتا ہے)۔ جلاد کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اتنا ہاتھ اٹھا کر مارے کہ بغل کی جلد نظر آ جائے اور بہت قریب سے مارنا بھی جائز نہیں ہے۔ بلکہ بہتر یہی ہے کہ اوسط درجہ کی چوٹ لگائی جائے۔ سزایاب کو باندھ کر ڈال دینا بھی جائز نہیں ہے اسے کھلا چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ اپنی تکلیف کو ہلکا کر سکے۔ اسے باندھا اور گھسیٹا بھی نہ جائے اور (مجرم کو) کھڑا کر کے مارنا چاہیے۔ سزا کے وقت عورت کے لباس کو اس کے جسم پر باندھ دیا جائے اور پوشتین یا روئی دار کپڑے کے سوا اس کا لباس نہ اتارا جائے اور حجاب کے پیش نظر اسے بٹھا کر مارا جائے۔

ناگزیر حالات میں شراب استعمال کرنے کا بیان

حقیقہ کہتے ہیں کہ مجبوری کی حالت میں یا پیاس کی شدت میں جب کہ اور کوئی شے دستیاب نہ ہو شراب پی لینا جائز ہے۔ شراب کو دوا کے طور پر استعمال کرنا درست نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ نے دوا کے طور پر شراب استعمال کرنے سے منع فرمایا ہے۔ حضور کا ارشاد ہے ”انہا لیست بدواء ولکن داء“ (یعنی شراب دوا نہیں بلکہ مرض ہے) نیز فرمایا ”ان اللہ لم یجعل شفاء کم فیما حرم علیکم“ (یعنی اللہ نے جو شے حرام فرمائی اس میں تمہارے لیے شفا نہیں رکھی ہے) البتہ اگر پیاس کی شدت ہو۔ یا اچانک اچھو ہو جائے (یا گلا گھٹ جائے) اور پانی دستیاب نہ ہو (اور شراب موجود ہو) تو اسے پی کر جان بچا لینا مسلمان کے لیے ضروری ہے مثلاً پیاس کے مارے جان جاتی ہو کہ ایک لقمہ ووق میدان میں ہو یا سمندر یا دریائے شور میں کشتی پر سوار اور شراب کے سوا کوئی ایسی شے دستیاب نہیں ہے جس سے زندگی کو تلف ہونے سے بچایا جاسکے تو ایسی صورت میں اتنی شراب پی لینا جائز ہے جس سے جان بچ سکے۔ اللہ تعالیٰ نے مجبوری کی حالت میں مردار، خون اور سورتک کا گوشت کھالینے کی اجازت دی ہے۔ اسی طرح شراب بھی جو حرام ہے، ناگزیر صورت میں روا ہے۔ جب اور پینے کی مجبوری نہ ہو یعنی جان جانے کا ڈر نہ رہے تو وہ حرام ہو جائے گی۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے ”ان اللہ انزل الداء والدواء، وجعل لكل داء دواء، فتداؤوا ولا تداءوا بحرام“ احمد و مسلم نے اسے روایت کیا ہے۔ (یعنی اللہ تعالیٰ نے مرض بھی نازل فرمایا اور دوا بھی اور ہر مرض کے لیے دوا بنائی۔ پس لوگو! اپنا علاج کیا کرو لیکن علاج کے لیے حرام شے کا استعمال نہ کرو)۔

مالکیہ اور حنابلہ اور ایک روایت کے مطابق شافعیہ بھی کہتے ہیں کہ غذا کا پھندا حلق میں پڑ جائے (یعنی اچھو ہو

جائے) اور جان کا اندیشہ ہو (اور سردست شراب دستیاب ہو) تو اسے پی کر جان بچا لینا واجب ہے اور اگر کسی مریض کا شراب کے سوا اور کوئی علاج نہ ہو تو علاج کے طور پر اسے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ کوئی مسلمان، عادل اور معتمد علیہ طبیب یا جو معالجہ کا ماہر ہو تجویز کرے۔ جیسا کہ (ناگزیر حالات میں) نجس جانور کا گوشت یا آدمی کا پیشاب بطور دوا کے استعمال کرنا روا ہے۔

شافعیہ سے ایک دوسری روایت یہ ہے کہ مکلف شخص کے لیے دوا کے طور پر یا تشنگی کے عالم میں شراب پینا حرام ہے چنانچہ دوا کے طور پر شراب پینے کی بابت آنحضرت ﷺ سے پوچھا گیا تو فرمایا کہ ”انہ لیس بدواء و لکنہ داء“ (یعنی شراب دوا نہیں بلکہ مرض ہے)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے شراب کو حرام فرمایا تو شراب کا فائدہ اس سے چھین لیا چنانچہ ارشاد نبوی ہے۔ ”ان الله لما حرم الخمر سلبها المنافع“ (یعنی جب اللہ نے خمر کو حرام کیا تو اس کے فوائد اس سے چھین لیے) اور اس لیے بھی (دوا کے طور پر اس کا استعمال ممنوع ہے) کہ شراب کا حرام ہونا تو امر قطعی ہے لیکن شفا یاب ہونا امر ظنی ہے امر ظنی کو قطعی پر فوقیت نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ حکم اسی صورت میں ہے جبکہ جان جانے کی نوبت نہ پہنچ جائے۔ ہاں اگر جان جانے کا ڈر ہو تو دوا کے طور پر شراب کا استعمال جائز ہے۔ رہا پیاس کی شدت میں شراب کا پینا تو اس سے تشنگی دور نہیں ہوتی بلکہ بڑھ جاتی ہے کیونکہ اس کی خاصیت گرم و خشک ہے جیسا کہ ماہرین طب کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شراب پینے والا ٹھنڈے پانی کے لیے بیقرار ہوتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پینے کے علاوہ کسی اور طرح سے اس کا استعمال روا ہے۔ اور بھوک دور کرنے کے لیے شراب کا پینا بھی ایسا ہی ہے جیسے پیاس مٹانے کے لیے پینا۔

(جان بچانے کے لیے پینے کی) ایک صورت یہ ہے کہ کسی کو ٹھنڈ لگ جائے اور (سردی کی شدت سے) جان جانے کا اندیشہ ہو اور ایک گھونٹ یا ایک پیالی شراب کے سوا اور کوئی چیز ایسی نہ ہو کہ (اس کے استعمال سے) جان بچ سکے۔ اسی طرح اگر کسی کا دل بیٹھنے لگے اور جان بر آئے اور کسی قدر شراب پینے کے سوا اور کوئی تدبیر نہ بننے کی نہ ہو (تب بھی اس کا استعمال روا ہے)۔

شرابی پر لعنت بھیجنا فعل مکروہ ہے

صحیح بخاری میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عہد نبوی ﷺ میں ایک شخص جس کا نام عبداللہ تھا اور لوگوں نے اس کا نام حمار (گدھا) رکھ چھوڑا تھا۔ رسول اللہ ﷺ اس پر خندہ فرما دیتے تھے۔ ایک بار حضور نے شراب پینے کی پاداش میں اسے سزائے تازیانہ دی تھی ایک روز حضور کے پاس آیا اور شراب پینے کا اعتراف کر لیا اس پر درے لگائے گئے حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا ”اللهم العنه، ما اکثر ما يؤتى به“ (یعنی خدایا اس پر لعنت ہو کتنا بڑا گنہگار ہے)۔ آنحضرت ﷺ نے اس پر ارشاد فرمایا ”لا تلعنوه، فوالله ما علمت الا انه يحب الله ورسوله“ (یعنی لوگو! اس پر لعنت نہ بھیجو۔ بخدا مجھے تو وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرنے والا ہی معلوم ہوتا ہے)۔ ایک اور روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں ”ولكن قولوا: اللهم اغفر له، اللهم ارحمه“ (یعنی لعنت کی بجائے یوں کہو کہ اے اللہ اس کی مغفرت فرما اور اے اللہ اس پر رحم فرما)۔ غرض آنحضرت ﷺ نے ایسے شخص پر جو شراب پینے کا

اعتراف کرے (اور سزا پائے) لعنت کرنے سے منع فرمایا ہے اور ایسا کرنے والے کو مستوجب سزا قرار دیا ہے۔ وہ شخص اپنے گناہ کی سزا پا کر عذاب سے بری ہو گیا اس لیے اس پر لعنت کرنے سے منع فرمایا، کہ مبادا گنہگار شخص کے دل میں یہ خیال آئے کہ جس شخص پر آنحضرت ﷺ کے روبرو لعنت بھیجی گئی اور آپ نے منع نہیں فرمایا تو گویا اس کا گناہ قائم رہ گیا اس کا اثر گنہگار کے دل پر برا پڑے گا۔ علماء نے یہ بھی کہا ہے کہ اس گناہ کے مرتکب کو ذلیل نہیں کرنا چاہیے۔ اور اس پر لعنت کرنے کی بجائے اس کام پر جو اس سے سرزد ہوا عمومی لعنت کرنی چاہیے۔ تاکہ لوگوں کی تنبیہ اور اس سے کنارہ کشی کا موجب ہو اور گنہگار کے سامنے توبہ اور مغفرت کا دروازہ کھل جائے اب اس کا توبہ کرنا اللہ کے نزدیک طاعت گزاری میں شمار ہوگا اور گناہ سے پاک ہونے کا موجب بن جائے گا۔

روایت ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے شام کا ایک شخص جدا ہو گیا۔ یہ شخص نہایت جوان مرد تھا۔ لوگوں سے معلوم ہوا کہ وہ پینے پلانے کا عادی ہے۔ یعنی شراب پیتا ہے اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے منشی کو حکم دیا کہ اس شخص کے نام عمر کی طرف سے ایک خط بدیں مضمون لکھوا:

”سلام علیک، وانا احمد الیک اللہ الذی لا الہ الا هو، بسم اللہ الرحمن الرحیم: حم تنزیل الكتاب من اللہ العزیز العلیم غافر الذنب وقابل التوب، شدید العقاب. ذی الطول، لا الہ الا هو الیہ المصیر، ثم ختم الكتاب، وقال لرسوله: لا تدفعہ الیہ حتی تجدہ صاحباً، ثم امر من عنده بالدعاء له بالتوبة“ (یعنی سلام علیک کے بعد معلوم ہو کہ میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی حمد سنارہا ہوں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ حم یہ خدائے بزرگ و برتر کی نازل کردہ (فرمودہ) کتاب ہے۔ وہ خدا گناہ معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔ اس کا عذاب سخت ہے اور وہ صاحب کرم ہے۔ صرف وہی معبود ہے اور سب کی بازگشت اسی کی جانب ہے۔ یہ خط ختم کرنے کے بعد آپ نے نامہ بر کو حکم دیا کہ جب تک وہ نشہ سے ہوش میں نہ آجائے یہ خط اسے نہ دینا۔ پھر فرمایا کہ خط دے کر اس کے حق میں توفیق توبہ کی دعا کرتے رہنا)۔ جب یہ خط اس شخص کے پاس پہنچا تو وہ شخص خط پڑھتا جاتا اور یہ کہتا رہا، کہ میرے اللہ نے مجھے معاف کر دینے کا وعدہ کیا ہے اور عذاب سے بچا لیا ہے۔ بار بار یہی کہتا رہا یہاں تک کہ اشکبار ہو گیا اور پھر گناہ سے باز آ گیا اور خوب باز آیا توبہ کی اور خوب توبہ کی۔ یہ خبر جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پہنچی تو آپ نے فرمایا ”ہکذا فاصنعوا، اذا رایتم احاکم قد ذل زلة فسد دوه، ووقفوه وادعوا له اللہ ان یتوب علیہ، ولا تکنوا اعوانا للشیاطین علیہ“ (یعنی یہ دیکھا تم نے؟ اب تم لوگ بھی ایسا کرو اگر دیکھو کہ تمہارے بھائی سے کوئی لغزش سرزد ہو گئی ہے تو اب اسے روکو اور سمجھاؤ اور اس کے حق میں دعا کرو کہ اللہ اس کی توبہ قبول کر لے۔ غرض اس کے خلاف شیطان کی اعانت نہ کرو)۔

حقیقت یہ ہے کہ غلط کاروں اور گنہگاروں کے حق میں، امیر المؤمنین سیدنا حضرت عمرؓ بن الخطاب کی یہ بھی ایک دانشمندانہ حکمت عملی تھی۔

شراب لعنت ہے

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ شراب ایک لعنتی شے ہے۔ بلکہ حضور نے ہر ایسے شخص پر جسے تھوڑی بہت بھی شراب سے نسبت ہے لعنت بھیجی ہے۔

لعنت کے معنی اللہ کی رحمت اور اس کی خوشنودی سے دور ہو جانے کے ہیں اور یہ انتہائی بدبختی اور نامرادی ہے۔ صحیح ابن ماجہ اور ترمذی میں حضرت انس بن مالک سے مروی ہے ”لعن رسول اللہ ﷺ فی الخمر عشرة: عاصرها، ومعتصرها، وشاربها، وحاملها، والمحمولة اليه، وساقها، وبائعها، واكل ثمنها، والمشتري لها، والمشتري له“ (یعنی رسول اللہ ﷺ نے شراب کے سلسلہ میں دس پر لعنت بھیجی ہے نچوڑنے والا، اس کا کاروبار کرنے والا، اس کی قیمت کھانے والا، وہ مرد جس کے لیے خریدا جائے اور وہ عورت جس کے لیے خریدا جائے)۔ نیز آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے ”اتسانی جبرئیل فقال: يا محمد ان الله لعن الخمر، وعاصرها، ومعتصرها، وشاربها، والمحمولة اليه، وبائعها، ومبتاعها، وساقها، ومسقاها“ (یعنی جبرئیل میرے پاس آئے اور انھوں نے کہا کہ اے محمد اللہ تعالیٰ شراب پر، اس کے نچوڑنے والے پر، نچوڑنے والی شے پر، پینے والے پر، اس پر جس کے لیے لائی جائے، بیچنے والے پر، خریدنے والے پر، پلانے والے پر اور جہاں پر پلائی جائے ان سب پر لعنت بھیجتا ہے) یہ حدیث حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ اسے احمد نے صحیح اسناد کے ساتھ اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور حاکم نے روایت کی ہے۔ نیز ابوداؤد اور ابن ماجہ نے اسی حدیث کے ہم معنی حدیث ابن عمر سے روایت کی ہے۔ اس روایت میں حضرت جبرئیل کا ذکر نہیں ہے۔

علماء کا کہنا ہے کہ اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے اس مسلمان پر لعنت بھیجنے سے منع فرمایا ہے جو اپنے شراب پینے کا اقرار کر لے حالانکہ ایسے شخص کو مستوجب حد قرار دیا ہے۔ تاہم انھوں نے اس امر کی اجازت دی ہے کہ دائم الخمر پر جو شراب سے توبہ نہ کرے اور اسی حالت پر قائم رہے، لعنت کی جاسکتی ہے۔ خواہ یہ لعنت ایسے تمام اشخاص پر بھیجی جائے یا خصوصیت کے ساتھ اس شخص پر جو حد سے بڑھ جائے اور اپنی بری خصلت پر جمار ہے۔ علماء نے اس پر لعنت کرنے کی اجازت اس لیے دی ہے کہ لوگوں کی مذمت کے ڈر سے اس بری بات کو چھوڑ دے اور اپنے نفس پر ملامت کرے۔ ہلاکت سے بچے، اپنے گناہ سے توبہ کرے اور اس کی خواہش دل سے نکال دے۔ ایسے شخص پر لعنت کرنا اور اس کو ذلیل کرنا جائز نہیں ہے جو دائم الخمر نہ ہو۔ درآنحالیکہ اسے حد لگائی جا چکی ہو کیونکہ سزائے شرعی اس کے گناہ کا کفارہ ہو گئی ہے۔

بیر (Beer)، بھنگ اور خواب آور اشیاء کے استعمال کا بیان

بعض اشخاص جو گناہ میں آلودہ ہیں یہ خیال کرتے ہیں کہ (Beer) حلال ہے کیونکہ یہ جو کے پانی سے تیار کی جاتی ہے اس طرح بلج (گدرائے ہوئے خرما) کا تیار کیا ہوا شیرہ اور جو کی روٹی کا اٹھایا ہوا خمیر (بوظہ) اور دوسری مضرت رساں بوٹیاں مثلاً قات، حشیش (بھنگ) اور فگہ (زہریلی بوٹی) ان اشیاء اور ایسی ہی دوسری خواب آور اشیاء کی بابت بھی ان اشخاص کا گمان ہے کہ یہ حلال ہیں۔ کیونکہ عہد رسالت ﷺ میں یہ اشیاء موجود نہ تھیں اور نہ ان کے حرام ہونے کی

بابت کوئی صراحت موجود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام علماء اس امر پر متفق اللفظ ہیں کہ یہ تمام خواب آور مشروبات بھنگ اور افیون وغیرہ حرام ہیں۔ اس کے متعلق استاد معظم مفتی دیار مصر کا فتویٰ مصری رسالہ ”الازہر“ کی اشاعت ماہ شعبان ۱۳۶۰ھ میں شائع ہو چکا ہے۔ بغرض افادہ عام اس کا خلاصہ ذیل میں درج ہے تاکہ لوگ اس سے مستفید ہوں اور جس کے دل میں ان اشیاء کے حرام ہونے میں شبہ ہے وہ دور ہو جائے۔

اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ان اشیاء کا استعمال حرام ہے۔ کیونکہ اس میں بڑا نقصان اور بہ کثرت خرابیاں ہیں۔ عقل زائل ہونے اور جسم کی ہلاکت کے علاوہ اس میں اور بھی بڑی بڑی مضرتیں اور خرابیاں ہیں اور یہ تو ممکن ہی نہیں کہ شریعت اس کے ارتکاب کی اس لیے اجازت دے دے کہ اس کی برائیاں حرام ہونے کی برائی سے کم ہیں۔ چنانچہ بعض علماء کہتے ہیں کہ جو شخص بھنگ کے حلال ہونے کا قائل ہے وہ بے دین اور بدعتی ہے۔ اس کا حرام ہونا علانیہ طور پر ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ ان اشیاء کو اگر زیادہ مقدار میں استعمال کیا جائے تو عقل زائل ہو جاتی اور اس پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ اس سے جو سرور ہوتا اور لذت حاصل ہوتی ہے انسان اس کے ارتکاب پر دلیر ہو جاتا ہے اور اس کا عادی ہو جاتا ہے یہ اشیاء ان میں داخل ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں حرام فرمایا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ان کو بھی نشہ آور اور خمار آور اشیاء میں شامل فرمایا ہے۔

اس کے متعلق شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اپنی کتاب ”السیاسة الشرعية“ میں جو ارشاد فرمایا ہے اس کا اقتباس درج ذیل ہے:

”بھنگ حرام ہے اور اس کے پینے والے کو اسی طرح حد ماری جائے جس طرح شراب پینے والے کو۔ بھنگ شراب سے زیادہ بری چیز ہے۔ کیونکہ یہ عقل پر پردہ ڈالنے کے علاوہ طبیعت پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ انسان میں نامردی اور کمینگی وغیرہ عیوب پیدا ہو جاتے ہیں۔ نیز اللہ کی یاد اور نماز بے محروم کر دیتی ہے یہ شے لفظ اور معنی دونوں اعتبار سے خمر ہے اور نشہ آور ہے جسے اللہ اور اس کے رسول نے حرام فرمایا ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے دو مشروبات کے بارے میں، جو ہم یمن میں تیار کیا کرتے تھے شرعی حکم دریافت کیا۔ ایک کا نام ’بتع‘ ہے جو شہد کے شیرے سے بنایا جاتا ہے اور اس میں نشہ ہوتا ہے دوسرے کا نام ’مزر‘ ہے جو کئی یا جو کے شیرے سے بنتا ہے اور اس میں تندہی (نشہ کی) پیدا ہو جاتی ہے۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ کو حق تعالیٰ نے کامل موجد بیانی عطا فرمائی ہے آپ نے یہ (موجز) ارشاد فرمایا کہ ”کل مسکر حرام“ (یعنی ہر نشہ آور شے حرام ہے) بروایت بخاری مسلم۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”ان من الحنطة خمراً، ومن الشعير خمراً، ومن الزبيب خمراً، ومن التمر خمراً، ومن العسل خمراً، وانا الہی کل مسکر“۔ بروایت ابوداؤد وغیرہ (یعنی گندم سے بھی شراب بنتی ہے، جو سے بھی، کشمش سے بھی، کھجور سے بھی اور شہد سے بھی اور میں ہر نشہ آور شے سے منع کرتا ہوں)۔ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”کل

مسکر خمر و کل مسکر حرام“ (یعنی ہرنشہ آور خمر ہے اور ہرنشہ آور حرام ہے) ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں ”کل مسکر خمر و کل خمر حرام“ (یعنی ہرنشہ آور شے حرام ہے اور ہر خمر حرام ہے)۔ یہ دونوں روایتیں مسلم میں ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”کل مسکر حرام، وما اسکر الفرق منه فملاء الکف منه حرام“ (یعنی ہرنشہ آور شے حرام ہے۔ اور جو شے ”فرق“ (مٹکا) بھر حرام ہو وہ ہتھیلی کے برابر بھی حرام ہے) فرق ایک پیانہ ہے جس میں سولہ رطل (تقریباً آٹھ سیر) کی گنجائش ہوتی ہے۔ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے، حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جو شے حرام ہے وہ زیادہ مقدار میں ہو یا کم میں بہر حال حرام ہے۔ محدثین نے اس سلسلہ میں متعدد طریقوں سے روایتیں بیان کی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام“ (یعنی جو شے زیادہ مقدار میں حرام ہے وہ کم مقدار میں بھی حرام ہے)۔ حافظان حدیث نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے مکی سے تیار کیے ہوئے ایک مشروب کی بابت حکم پوچھا۔ یہ مشروب ان کے علاقہ میں لوگ پیا کرتے تھے اور اس کا نام ’مزر تھا۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ آیا وہ مشروب نشہ آور ہوتا ہے؟ اس شخص نے کہا ’جی ہاں‘۔ ارشاد ہوا کہ ”کل مسکر حرام، ان علی اللہ عہدا لمن يشرب المسکر ان يسقيه من طينة الخبال“ (یعنی ہرنشہ آور شے حرام ہے اور اللہ کی مرضی یہ ہے کہ جو شخص نشہ آور شے پیے گا۔ اسے طینۃ الخبال پلایا جائے گا۔ اس شخص نے کہا حضور طینۃ الخبال، کیا ہوتا ہے فرمایا ”عرق اهل النار، او عصارة اهل النار“ (یعنی دوزخیوں کا پسینہ یا فرمایا دوزخیوں کے جسم سے نچڑی ہوئی شے) اس کے راوی مسلم ہیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”کل مخمر و کل مسکر حرام“ (یعنی ہر خمر آور اور ہرنشہ آور شے حرام ہے) بروایت ابو داؤد۔ تحر وہ شے ہے جو عقل پر پردہ ڈال دے۔ اس مفہوم کی بہت سی حدیثیں ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ نے تمام ایسی اشیاء کو جو عقل کو زائل کرنے اور نشہ لانے والی ہیں یک جائی طور پر بیان فرما دیا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ اشیاء مختلف قسم کی ہوں۔ کھانے کی چیز ہو یا پینے کی۔ کیونکہ شراب کو اس میں کوئی شے ڈبو ڈبو کر کھاتے ہیں یعنی اسے لا دن بنا لیا جاتا ہے۔ اسی طرح بھنگ کھاتے بھی ہیں اور اس کو پیتے بھی ہیں اور یہ ہر طرح حرام ہے۔ چونکہ یہ عہد نبوی کے بعد کی شے ہے اس لیے ائمہ نے آنحضرت ﷺ کے ارشاد ”کل مسکر“ کی عمومیت میں اسے بھی داخل کیے جانے سے منع نہیں فرمایا۔ اور ہرنشہ آور شے جو عہد نبوی کے بعد کی ہے وہ سب قرآن وحدیث کے مجموعی احکامات میں داخل ہے۔

امام تیمیہ نے بھنگ کے متعلق ایک سے زیادہ مرتبہ اپنے فتاویٰ میں ذکر فرمایا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:

یہ لعنتی گھاس (بھنگ) اور اسے استعمال کرنے اور حلال جاننے والے، اللہ کے اس کے رسول کے اور ایمان داروں کے غضب کے مستوجب ہیں اور اللہ کے عذاب میں ڈال دیے جائیں گے۔ اس سے انسان کے مذہب، عقل، اس کے وجود اور اس کی طبیعت کو ضرر پہنچتا ہے اور مزاج فاسد ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اکثر لوگ اس کے استعمال سے پاگل ہو

گئے اور اس کے کھانے سے ذلت و کمینگی وغیرہ پیدا ہوتی ہے۔ اس میں شراب نوشی کی خرابیوں کے علاوہ اور بھی ایسے مفسد ہیں جو شراب میں بھی نہیں ہیں۔ پس بھنگ بدرجہ اولیٰ حرام ہے اور تمام مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ بھنگ کا نشہ حرام ہے جو شخص اسے حلال کہے اور یہ گمان کرے کہ یہ حلال ہے اسے توبہ کرنے کو کہا جائے اگر توبہ کر لے تو فبہا ورنہ اسے مرتد کی طرح قتل کر دیا جائے اس کی نماز جنازہ نہ پڑھی جائے اور مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ ہونے دیا جائے۔

واضح ہو کہ تھوڑی مقدار میں بھی اس کا پینا حرام ہے اس کے حرام ہونے کا ثبوت بھی وہی ہے جو تمام نشہ آور اشیاء کے حرام ہونے کا ہے۔ امام ابن تیمیہ کے شاگرد امام محقق، ابن قیم بھی اس مسئلہ میں اپنے استاد کے متبع ہیں اور انھوں نے اپنی کتاب 'زاد المعاد' میں جو کچھ فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ لفظ 'خمر' میں تمام نشہ آور اشیاء داخل ہیں خواہ وہ رقیق (یا مائع) ہوں یا ٹھوس ہوں۔ شیرہ نکال کر تیار کی جائیں یا پکا کر۔ اس میں وہ شے داخل ہے جو فسق و فجور کی سبیل ہے۔ ان کی مراد اس سے 'بھنگ' ہے اس کو بھی 'خمر' (نشہ آور) سمجھا جائے گا۔ آنحضرت ﷺ کی واضح تصریح کے بموجب جس کی اسناد پر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا اور نہ اس کی عبارت میں کوئی اجمال ہے۔ حضور کا یہ فرمودہ تسلیم شدہ ہے کہ "کل مسکر حرام" (یعنی ہر نشہ آور شے حرام ہے) اور صحابہ رضوان اللہ علیہم جو ارشادات نبوی اور ان کے مطالب کو تمام امت میں سب سے زیادہ جانتے تھے ان کی مسلمہ رائے یہ ہے کہ 'خمر' سے مراد ہر ایسی شے ہے جو عقل پر پردہ ڈال دے۔ اگر آنحضرت ﷺ کے ارشاد کمال مسکر میں تمام اقسام کی منشیات کو شامل نہ سمجھا جائے۔ پھر بھی قیاس صحیح کا صریح تقاضا یہ ہے کہ جس شے کی جڑ اور شاخ یکساں ہے اس کو حکم میں مساوی سمجھا جائے۔ پس اشیاء منشیات میں باہم فرق کرنا ایک دوسرے کی مماثل اشیاء میں باہم فرق کرنا ہے۔

کتاب "سبل السلام" (شرح بلوغ المرام) کے مؤلف کہتے ہیں کہ جو شے بھی نشہ آور ہو وہ حرام ہے خواہ اسے بھنگ کی طرح نہ پیا جاتا ہو۔

حافظ ابن حجر سے منقول ہے کہ یہ کوئی نہیں کہتا کہ بھنگ میں نشہ نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ عقل زائل کر دیتی ہے اور نشہ آور ہے۔ اس سے بھی وہی کیف اور سرور ہوتا ہے جو شراب سے ہوتا ہے۔

ابن بیطار نے اطباء کی یہ رائے نقل کی ہے کہ مصری بھنگ ایک درہم کے برابر بھی استعمال کی جائے تو اس سے سخت نشہ ہوتا ہے اور اس کا ضرر بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ بعض علماء نے اس میں دینی اور دنیوی ایک سو بیس برائیاں گنائی ہیں۔ اور یہی برائیاں افیم میں بھی ہیں بلکہ افیم میں ان کے علاوہ بھی اور خرابیاں ہیں۔

اس کے متعلق شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد ابن قیم وغیرہ دوسرے علماء نے جو کچھ کہا ہے وہ سب درست ہے جس کے لیے اطمینان بخش دلائل موجود ہیں۔ اور یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ قرآن و حدیث میں جن اشیاء کے حرام ہونے کی تصریح ہے بھنگ ان میں شامل ہے اور افیم بھی اس کے تحت آتی ہے بلکہ بقول علماء افیم میں اس سے زیادہ برائی ہے۔ اور اس کی مضرت بھنگ سے زیادہ ہے۔ چنانچہ اس میں اس قسم کا نشہ بھی ہے جو اس سے پہلے معلوم نہ تھا۔ مثلاً اس میں شراب کے نقصانات اور خرابیاں تو ہیں ہی کہ اس سے عقل زائل ہو جاتی اور اس پر پردہ پڑ جاتا ہے اس کے ساتھ وہ

خرابی بھی ہے جو بھنگ میں ہے اور اس کے علاوہ بھی اس سے زیادہ نقصان دہ برائی افیم میں ہے۔ اس کی خرابیاں ظاہر اور معلوم ہیں۔ اور یہ ممکن نہیں کہ شریعت اسلامیہ ایسی مضرت رساں شے کو رواج دے دے۔ اگر کوئی اسے حلال کہے تو اللہ تعالیٰ پر افترا ہے یا پھر اس کا قول جہالت پر مبنی ہے۔

یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ بعض علمائے حنفیہ اس شخص کو زندیق اور بدعتی کہتے ہیں جو بھنگ کو حلال بتائے۔ لہذا نوپید منشیات کو جو اس سے بھی زیادہ ضرر رساں اور زیادہ بری ہیں اگر کوئی حلال کہے تو وہ بدرجہ اولیٰ زندیق اور بدعتی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ شریعت اسلامیہ ان منشیات کو رواج دے جو ملت اسلامیہ کے لیے زیادہ نقصان دہ ہیں۔ ان کا نقصان انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ اس میں مال کا بھی زیاں ہے اور جسمانی و اخلاقی ضرر بھی۔ حالانکہ شریعت اسلامیہ کی بنیادی خصوصیت اصلی یا ترجیحی مصالح کا حصول اور فساد و ضرر کا دور کرنا ہے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ جو تمام امور سے واقف اور حکیم ہے انگور کی شراب کو حرام نہ فرمائے خواہ وہ زیادہ مقدار میں ہو یا کم میں۔ یہ بہر حال نقصان دہ ہے یہ اگر تھوڑی ہو تو اور زیادہ مطلوب ہوتی ہے یعنی تھوڑی مقدار میں استعمال کرنا زیادہ مقدار میں استعمال کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ پس یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ ایسی نشہ آور شے کو مباح کر دے جس میں یہ خرابی ہو بلکہ اس کے علاوہ اس سے زیادہ انسان کے وجود۔ اس کی عقل و دین اور اس کے اخلاق اور مزاج کے حق میں ضرر رساں ہے اس کے روا ہونے کی بات وہی شخص کرے گا جو مذہب اسلام سے بے خبر یا زندیق اور بدعتی ہو۔ جیسا کہ سابقاً ذکر ہوا۔ غرض ان تمام منشیات کا حرام ہونا اجماع امت سے ثابت ہے۔ خواہ اس کا استعمال کسی طرح بھی کیا جائے۔ یعنی اس کا کھانا، پینا، سونگھنا یا حقن کرنا سب حرام ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کام دشمنان اسلام کا ہے جو بھنگ وغیرہ منشیات کے استعمال کو پھیلاتے ہیں تاکہ ملت اسلامیہ کا حوصلہ پست ہو جائے ان کی شان و شوکت کو برباد یا جائے ان کا مال اور مردانگی ختم ہو جائے۔ مسلمان مردوں کی عقل میں فتور آ جائے اور ترقی یافتہ اقوام کے مقابلہ میں پسماندہ ہو کر رہ جائیں۔ اغیار ان پر غالب آ جائیں اور دشمنان دین ان کا ملک برباد کر کے اپنے علاقوں کو آباد کریں۔ چنانچہ یہودی جو بھنگ اور افیون کو بلاد عربیہ میں پھیلا رہے ہیں اس کی غرض بھی یہی ہے کہ ان بستیوں کو ویران کر دیا جائے۔

اس موضوع پر گفتگو کو اس لیے طول دیا گیا ہے کہ بھنگ، بیر، دسکی اور فٹکی وغیرہ مشروبات کے بارے میں کثرت سے سوال کیے جا رہے ہیں اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ منشیات کا استعمال نئی پود میں کثرت سے پھیلتا جا رہا ہے۔ جس کے باعث ان کی صحت خراب، خاندان برباد اور مال ضائع ہو رہا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ حکومت کو ان اشیاء کا ناجائز کاروبار کرنے والوں اور بھنگ پینے والوں کے خلاف سخت اقدامات کرنے پر زور کثیر صرف کرنا پڑتا ہے۔ اگر ان فضول مصارف خطیر کو جو حکومت کو اس کے سد باب کی غرض سے کرنے پڑتے ہیں، مفید طریقوں سے صنعتوں، مشترکہ مفاد کے کاموں میں لگایا جائے تو اس سے قوم کی فلاح ہو اور عظیم فائدہ حاصل ہو اگر لوگ احکام شرعیہ کو سمجھیں۔ اس پر کان دھریں اور اس کے مطابق عمل کریں اور منشیات اور خواب آور اشیاء کے استعمال سے پرہیز کریں تو یقیناً اس سے قوم کے وقار، اس کی قوت، عزت، فوقیت، عظمت اور سلطنت کا تحفظ ہو سکتا ہے۔ کاش تمام اسلامی حکومتیں متحدہ طور پر اس کے خلاف سخت قوانین اور حتمی پابندی عائد کریں تاکہ بہت سے اشخاص جو اپنی صحت و دولت کو منشیات میں تباہ کر رہے ہیں اس سے باز

آجائیں۔ خواہ اس حکم کی رو سے ناجائز کاروبار کرنے والوں اور منشیات کے بڑے بڑے تاجروں کو موت ہی کے گھاٹ کیوں نہ اتارنا پڑے۔

منشیات کی تجارت کا بیان

(بدقسمتی سے) بعض مسلمان منشیات: شراب، بھنگ، افیون اور کوکین وغیرہ کی تجارت کرتے ہیں کیونکہ ان اشیاء کی تجارت میں آسانی کے ساتھ بہت زیادہ منافع حاصل ہوتا ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں یہ لوگ بڑے مالدار بن جاتے ہیں۔

شریعت اسلامیہ نے اس طرح کے منافع اور ایسے لوگوں کے ذریعہ معاش کو حرام قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی بکثرت احادیث میں منشیات کے کاروبار کو حرام فرمایا گیا ہے۔ منجملہ ان روایات کے بخاری و مسلم میں حضرت عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے ”ان اللہ حرم بیع الخمر والمیتة، والخنزیر والاصنام“ (یعنی اللہ تعالیٰ نے شراب، مردار، سوز اور بتوں کی تجارت کو حرام قرار دیا ہے) اور متعدد احادیث میں آیا ہے کہ جس چیز سے فائدہ اٹھانا اللہ نے حرام فرمایا ہے اس کی خرید و فروخت اور اس کی قیمت کو کام میں لانا بھی حرام ہے کیونکہ اس طرح کرنے سے ان (مضر اشیاء) کی برائیاں پھیلتی ہیں اور نقصانات افراد ملت میں راہ پا جاتے ہیں اور کاروبار کرنے والا شخص بھی ملت کی تباہی و بربادی کا آلہ کار بن جاتا ہے۔ بلکہ ایسا شخص جان کو ہلاک کرنے والا اور مال کو ضائع کرنے والا ہے۔ لہذا اگرچہ لوگ اسے تجارت خیال کریں لیکن دراصل یہ زندگی کی تجارت ہے جس سے جوانی نباہ، اخلاق برباد اور قوم ہلاک ہوتی ہے پس اس میں کوئی شک نہیں کہ منشیات کی تجارت حرام ہے اور گناہ کی اعانت ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو (اللہ کی) معصیت اور نافرمانی میں اعانت کرنے سے منع فرمایا ہے ”تعاونوا علی البر والتقویٰ، ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان“ (یعنی نیکی اور پرہیزگاری میں باہم تعاون کرو اور گناہ و نافرمانی میں باہم تعاون نہ کرو)۔ پس ان (منشیات) کی تجارت کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں، کیونکہ اس کا حرام ہونا قرآن کریم سے ثابت ہے۔ جمہور علماء کہتے ہیں کہ مسلمان کے نزدیک منشیات کی کوئی قیمت نہیں ہے لہذا اس کی خرید و فروخت جائز نہیں ہے اور ایسی شے پر ناجائز قبضہ کرنے یا تلف کر دینے والے پر کوئی تاوان نہ ہوگا۔ کیونکہ (اس کا تاوان دلانا) اس کے قابل قدر ہونے کی دلیل ہے۔ حالانکہ وہ حرام ہے اور اس لیے بے قدر ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے ”ان الذی حرم شربہا، حرم بیعہا، واکل ثمنہا“ (یعنی جس کا پینا حرام ہے اس کا فروخت کرنا اور اس کی قیمت اپنے کام میں لانا بھی حرام ہے)۔

بھنگ کی کاشت کرنے کا بیان

تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بھنگ اور پوست کی کاشت اس غرض سے کرنا حرام ہے کہ اس سے نشہ آور مادہ نکال کر استعمال کیا جائے گا یا اس کی تجارت کی جائے گی۔ اس کی کاشت کئی وجہوں سے حرام ہے:

ایک وجہ تو وہ روایت ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ان من حبس العنب ایام القطاف حتی یبیعہ ممن یتخذہ خمراً فقد تقحم النار“ (یعنی جس نے انگور اتارنے کے دنوں میں روک رکھا تا کہ اس کے ہاتھ فروخت کرے جو اس سے شراب بنائے، تو وہ شخص اوندھا ہو کر جہنم میں پڑا) اس حدیث سے، بطور دلالت النص کے یعنی مفہوم عبارت کی بناء پر، ثابت ہوتا ہے کہ اس غرض سے انگور کی کاشت حرام ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ منشیات کی کاشت کرنا، اس کے استعمال اور اس کی تجارت میں اعانت کرنا ہے اور گناہ کی اعانت بھی گناہ ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اس غرض سے منشیات کی کاشت کرنا، کاشت کار کا اس کے استعمال اور اس کی تجارت پر راضی ہونا ہے۔ اور گناہ پر راضی ہونا بھی گناہ ہے۔ کیونکہ ناپسندیدہ شے کو دل سے برا سمجھنا یعنی برا جان کر اس سے نفرت کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ بلکہ صحیح مسلم میں رسول اللہ کا یہ ارشاد آیا ہے ”ان من لم ینکر المنکر بقلبه بالمعنی الذی بینا۔ لیس عنده من الايمان حبة خردل“ (یعنی جو شخص ناپسندیدہ بات سے نفرت نہ کرے جس طرح کہ بتایا گیا۔ اس میں رائی برابر بھی ایمان نہیں ہے) اور اس میں حاکم کے حکم کی مخالفت بھی ہے جس نے اس (کے سد باب) کی بابت قانون بنائے۔ حالانکہ تمام مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ حاکم کے حکم کی اطاعت واجب ہے بشرطیکہ اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی نہ ہو۔

منشیات کی تجارت سے حاصل شدہ نفع کا بیان

یہ بتایا جا چکا ہے کہ منشیات کی تجارت حرام ہے پس اس میں مال کی جو قیمت حاصل ہو وہ بھی حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ”لا تأکلوا اموالکم بینکم بالباطل“ (یعنی لوگو! ناجائز طور پر حاصل کیا ہوا مال نہ کھاؤ) یعنی ایسے مال کو کام میں نہیں لانا چاہیے۔ (جو ناجائز طور پر حاصل کیا گیا ہو اور ناجائز اشیاء کا باہمی تبادلہ بھی منع ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں:

ایک صورت یہ ہے کہ دوسرے کے مال پر زبردستی قبضہ کر لیا جائے یعنی چھین کر یا چوری، ڈاکہ، بددیانتی اور فریب دہی یا ایسے ہی کسی اور طریقہ سے مال حاصل کیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ حصول مال کا طریقہ شرعاً ممنوع ہو۔ مثلاً جو اور غیر شرعی طریقہ مثلاً حرام معاہدہ سے حاصل کیا ہو مال جیسے سودی معاملہ میں ہوتا ہے یا ایسی شے کے فروخت کرنے سے حاصل شدہ مال جس سے فائدہ حاصل کرنا حرام ہے۔ یہ تمام صورتیں چوری کے مال کی طرح یکساں حرام ہیں اگرچہ یہ معاملہ مالک کی مرضی سے ہوا ہو اور رسول اللہ ﷺ کی حدیث میں بھی آیا ہے کہ جس شے سے فائدہ اٹھانا حرام ہے اس کی قیمت بھی حرام ہے۔ چنانچہ ارشاد نبوی ہے ”ان الله اذا حرم شیئاً حرم ثمنه“ (یعنی اللہ تعالیٰ نے جس شے کا استعمال میں لانا حرام قرار دیا ہے اس کی قیمت بھی حرام ہے)۔ یہ حدیث ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے۔

کتاب زاد المعاد میں جمہور فقہاء کا یہ قول مذکور ہے کہ اگر انگور کو ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کیا جائے جو اس کی شراب تیار کرتا ہے۔ تو اس کی قیمت حرام ہے۔ ہاں کوئی کھانے کے لیے خریدے تو حرام نہیں ہے۔ اسی طرح اس شخص کے ہاتھ اسلحہ کا فروخت کرنا حرام ہے۔ جو مسلمانوں سے برسر جنگ ہے۔ اس کی قیمت بھی حرام ہے۔ ہاں اس کے ہاتھ

فروخت کیا جائے جو اللہ کے راستے میں جہاد کر رہا ہے تو اس اسلحہ کی قیمت پاکیزہ روزی ہے۔ اسی طرح ریشمی کپڑے کا ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کرنا حرام ہے جسے اس کا پہننا حرام ہے اور اس کی قیمت بھی حرام ہے۔ بخلاف اس صورت کے جبکہ ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کیا جائے جسے ریشم کا پہننا حلال ہے جبکہ صورت حال یہ ہے کہ اگر ایسی شے فروخت کی جائے جسے کام میں لانا حلال ہے لیکن خریدار اسے ایسے کام میں لائے جو جمہور فقہاء کے نزدیک حقیقت میں گناہ ہے تو اس کی قیمت حرام ہوگی جس کی دلیل وغیرہ اوپر آچکی ہے، تو ایسی شے جس کا استعمال سرے سے حلال ہی نہیں ہے تو یہ بدرجہ اولیٰ حرام ہوگی، جیسے منشیات کی قیمت۔

واضح ہو کہ منشیات کی قیمت اگر حرام ہے تو یہ مال ناپاک ہوا اور اسے نیک کاموں مثلاً خیرات، تعمیر مسجد یا حج بیت اللہ میں صرف کرنا مقبول نہ ہوگا۔ یعنی ان امور پر خرچ کرنے والے کو ثواب نہ ہوگا۔ مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”ان الله طيب لا يقبل الا طيباً“ (یعنی اللہ پاک ہے اور صرف پاکیزہ شے کو پسند فرماتا ہے) نیز مسلمانوں کے لیے بھی وہی حکم ہے جو پیغمبروں کے لیے ہے۔ یا ایہا الرسل کلو امن الطيبات واعملوا صالحاً“ (یعنی اے پیغمبرو پاکیزہ خوراک کھاؤ اور نیک عمل کرو) نیز اللہ فرماتا ہے ”یا ایہا الذین امنوا کلو امن طيبات ما رزقنا کم واشکروا لله ان کنتم اياه تعبدون“ (یعنی اے ایمان والو اگر تم صرف اللہ کے بندے ہو تو پاک رزق کھاؤ جو ہم نے تمہیں دیا ہے اور اللہ کا شکر کرو)۔ اس کے بعد (اسی کتاب میں) بتایا گیا کہ ایک شخص حج کے لیے دور دراز کا سفر کرتا ہے۔ بال چٹ جاتے ہیں اور گرد سے اٹا ہوا ہوتا ہے پھر ہاتھ اٹھا کر یارب یارب پکار رہا ہے۔ لیکن اس کا کھانا، پینا لباس اور ذریعہ معاش حرام ہے تو اس کی دعا کیسے قبول ہو سکتی ہے؟

ایک اور حدیث احمد نے اپنی (کتاب) مسند میں حضرت ابن مسعود سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”والذی نفسی بیدہ لا یکسب عبد مالا من حرام فینفق منه، فیکسب له فیہ، ولا یتصدق فیقبل منه، ولا یتزکک خلف ظہرہ، الا کما زادہ فی النار، ان الله لا یمحو السیئی بالسیئی ولكن یمحو السیئی بالحسن، ان الخبیث لا یمحو الخبیث“ (یعنی اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی شخص حرام مال کمائے اور اس کو خرچ کرے تو اس میں برکت ہو اور صدقہ دے تو قبول ہو یا پیچھے چھوڑ کر جائے یہ سب اس کی آتش دوزخ کو زیادہ کرے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ برائی کو برائی سے دور نہیں کرتا۔ البتہ نیکی سے برائی دور ہوتی ہے اور ایک بری بات دوسری بری بات کو نہیں مٹاتی)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”من کسب مالا حراماً فتصدق به لم یکن له اجر، وکان اصرہ۔ یعنی ائمہ و عقوبتہ۔ علیہ“ (یعنی حرام کی کمائی خیرات کرنے میں کوئی ثواب نہیں بلکہ وہ کمائی اس پر ایک بوجھ ہو جائے گی۔ یعنی گناہ اور عذاب)۔

قاسم بن خمیرہ کے مراسیل (مجموع احادیث مرسلہ) میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”من اصاب مالا من مائیم، فوصل به رحمہ او تصدق به او انفقہ فی سبیل اللہ، جمع ذلک جمیعاً، ثم قذف به فی نار جہنم۔“ (یعنی گناہ کمائے ہوئے مال کو اگر صلہ رحمی یا حسن سلوک میں خرچ کیا یا صدقہ میں دیا یا اللہ کے راستہ میں لگایا وہ

سب مال جمع کیا جائے گا اور اس آگ میں جھونک دیا جائے گا اور اس شخص کے ساتھ جہنم میں پھینک دیا جائے گا) نیز آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”انہ اذا خرج الحاج بالنفقة الخبيثة فوضع رجله في الغرز. ای الركاب. وقال: لبيك، ناداه ملك من السماء: لالبيك، ولا سعديك، وحجك مردود عليك“ (یعنی اگر کوئی شخص ناپاک کمائی لے کر (حج کو) نکلے اور سواری کے رکاب میں پاؤں ڈالے اور کہے ”لبیک“ تو اس کے جواب میں آسمان سے ایک فرشتہ آواز دے گا ”لا لبيك لاسعديك“ (یعنی نہ تیری لبیک قبول ہے اور نہ تیرے لیے خوشخبری ہے اور تیرا حج نامقبول ہے)۔

یہ تمام حدیثیں جو ایک دوسرے کی تائید کرتی ہے کہ حرام مال کا صدقہ یا حج یا کوئی اور کارِ ثواب قبول نہیں ہوتا۔ بناء بریں علمائے حنفیہ نے یہ بتا دیا ہے کہ حج کے لیے حرام مال خرچ کرنا بھی حرام ہے۔

اب ان تمام امور بالا کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ بھنگ، افیون، کھلیات وغیرہ مسکرات جو نشہ آور اور غافل کر دینے والی اشیاء ہیں سب حرام ہیں۔

۲۔ ایسی اشیاء کی تجارت اور اسے نفع آور پیشہ میں لگانا حرام ہے۔

۳۔ اس کا کاروبار چلانا، اس کی تجارت کو فروغ دینے میں تاجروں کا ساتھ دینا اور اس میں شامل ہونا حرام ہے۔

۴۔ ایسی شے کی کاشت بھی حرام ہے جس سے نشہ آور مادہ نکال کر استعمال کیا جائے یا اس کی تجارت کی جائے۔

۵۔ ایسی اشیاء کے کاروبار سے جو فائدہ حاصل ہو وہ حرام اور ناپاک ہے۔ کارِ ثواب میں اسے لگانا قبول نہ ہوگا۔

ان تمام موضوعات پر طویل تشریح اور اس کے متعلق دلائل اوپر آچکے ہیں۔ اس تفصیل سے غرض یہ ہے کہ امر حق

کو بیان کر دیا جائے اور صحیح بات کو کھول کر بتا دیا جائے تاکہ وہ شبہات دور ہو جائیں۔ جن کی بناء پر نادانوں نے ان

منشیات کے حلال ہونے کا فتویٰ لگایا اور معلوم ہو جائے کہ ان منشیات کو حلال کہنا خطا کاروں کے اباطیل میں سے ہے اور

ان لوگوں کا قول ہے جو خود گمراہ ہیں اور دوسروں کو گمراہ کر رہے ہیں، یہاں تک کہ اس زمانے میں منشیات کا استعمال عام

ہے۔ تمام قومیں اور مختلف طبقات کے لوگ اس میں مبتلا ہیں۔ عجب نہیں کہ ملت اسلامیہ تک اس کا اثر پہنچ جائے اور اسلام

کی عزت و شرف کو زیاں پہنچے۔ واللہ ولی التوفیق۔

بیر کے استعمال کی خرابیاں

جامعہ لاما (کنیڈا) کے پرنسپل جو ماہرین امراض قلب کے مؤثر عالمی منعقدہ لندن کے صدر ہیں یہ اعلان فرمایا

ہے کہ ان کی تحقیقات کے نتیجے میں اڑتالیس مردوں اور دو عورتوں کو ”بری بری“ کے عارضہ میں مبتلا پایا گیا بعد میں معلوم ہوا

کہ وہ دل کے ایک عارضہ میں مبتلا ہیں جس کا سبب ایک خاص قسم کے بیر کا استعمال ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ مریض

روزانہ ۱۱ لیٹر (کم و بیش ۱۲ سیر) بیر زہر مار کیا (پیا) کرتے تھے۔ اس مرض کے پیدا ہونے کا سبب وہ تیزابی

مادہ (Sulphate) ہے جو اس خاص قسم کی بیر کے نشہ آور مادہ سے پیدا ہوتا ہے اور تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ اس سے

دل بڑا ہو جاتا ہے اور اس کے ڈھکنے موٹے ہو جاتے ہیں۔

امام محمد رشید رضا نے اپنی تفسیر میں سورہ مائدہ کی آیت متعلقہ، خمر کی طویل تشریح کی ہے اور بعد میں بتایا ہے کہ

”یہاں پر خمر کی ماہیت کے بیان کرنے میں اس لیے طوالت سے کام لیا گیا ہے کہ حدیث کی پیشگوئی کے مطابق لوگوں نے شراب کا نام بدل کر اس کو حلال کر لیا ہے اور نزول قرآن حکیم کے بعد مختلف اقسام کی شرابیں تیار کی گئیں جو بقول اطباء انسان کی صحت اور عقل دونوں کے لیے انگوری شراب سے زیادہ ضرر رساں ہیں۔ ان شرابوں کے باعث باہمی بغض و عداوت میں زیادتی اور ذکر الہی اور نماز میں رکاوٹ پڑ رہی ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ انگور کی شراب کے سوا اور کوئی شراب حرام مطلق نہیں ہے۔ دوسری شرابیں صرف اس صورت میں حرام ہیں جبکہ نشہ ہو جائے۔ چنانچہ اس ہلاکت آفریں زہر کا استعمال قلیل مقدار میں جاری ہے۔ حالانکہ تھوڑی پی کر مزید کی طلب ہوتی ہے اور نتیجہً انسان دائم الخمر ہو جاتا ہے جس کا انجام ہلاکت ہوتا ہے۔ ان کا یہ نقطہ نظر فساد عظیم کا موجب ہے اور خیریت اسی میں ہے کہ اس خیال کو باطل اور مستند بین و متاخرین کے قول کو فوقیت دی جائے تاکہ بے شمار برائیوں کے اس ذریعہ کا سد باب کیا جاسکے۔

واضح ہو کہ یہ بغض و عداوت کے واقعات، قتل و غارت جبر و ستم معصیت و بے حیائی، ارتکاب جرائم کی جرأت، بدکاری، خاندانی اور قبائلی اسرار کا افشا اور مخفی رازوں کا اظہار اور حکومت اور وطن سے غداری، جس کا چرچا جا بجا اور ہر وقت لوگ کرتے رہتے ہیں۔ یہ سب منشیات کے استعمال کا نتیجہ ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ (دشمن کا) کوئی جاسوس اعلیٰ افسروں اور بڑے بڑے سیاست دانوں کے عشرت کدوں میں چھپ رہتا ہے تاکہ فوجی رازوں اور علاقائی حکمت عملیوں کا سراغ لگائیں۔ نتیجہً ہوتا ہے کہ کسی سردار کی ایک گھونٹ شراب ساری قوم کو ختم کر دیتی ہے۔ پورے کا پورا قبیلہ تباہ ہو جاتا ہے اور زبردست فوج بھی شکست کھا جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دین اسلام نے شراب کو سخت حرام قرار دیا ہے اس کا ذکر کتاب اللہ میں تین جگہ آیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی شدت سے ممانعت فرمائی ہے۔ حضور کا ارشاد ہے ”مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ فِي الدُّنْيَا، ثُمَّ لَمْ يَتُبْ مِنْهَا، حَرَمَهَا فِي الْآخِرَةِ“ بروایت بخاری و اصحاب سنن (یعنی جس نے دینا میں شراب پی اور اس سے توبہ نہ کی تو (اللہ) نے آخرت کی شراب اس پر حرام کر دی)۔ امام مسلم نے اس کے اخیر میں الفاظ ”فَلَمْ يَسْقَهَا“ کا اضافہ فرمایا ہے اور مطلب یہ ہے کہ ”ایسے شخص پر اللہ نے جنت حرام کر دی ہے کہ جنت میں جائے اور شراب طہور پیے“ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے معنی یہ ہے کہ ایسے شخص کو جنت میں شراب طہور نہ ملے گی اگرچہ مسلمان مرا ہو اور جنت میں گیا ہو کیونکہ اس کے پینے میں اس نے جلد بازی سے کام لیا۔ لہذا اس سے محروم رہنے کی سزا اسے دی گئی۔ یہ اور بات ہے کہ اللہ اسے معاف کر دے۔

احمر، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”لَا يَزْنِي الزَّانِي حِينَ يَزْنِي وَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَا يَسْرِقُ السَّارِقُ حِينَ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَا يَشْرِبُ الْخَمْرَ حِينَ يَشْرِبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ“ (یعنی بدکاری کے وقت بدکار کا ایمان نہیں رہتا اور چوری کے وقت چور مؤمن نہیں رہتا اور شرابی شراب پینے کے وقت ایمان سے خارج ہو جاتا ہے)۔ کہا جاتا ہے کہ اس حدیث میں ایمان کی نفی سے مطلب ایمان کامل کی نفی ہے۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کا مفہوم ممانعت ہے۔ اور یوں بھی کہتے ہیں کہ ان گناہوں کے مرتکب جب ارتکاب کرتے ہیں تو ان کا ایمان نہیں رہتا ہے۔ جب یہ گناہ کر چکے ہیں تو پھر ایمان واپس آ جاتا ہے اگر گناہ کرتے وقت موت آ جائے تو مرتکب خارج از ایمان ہو کر مرتا ہے۔

عہد حاضر کے تمام مہذب اہل علم اور موجودہ ترقی پذیر شہروں میں جہاں سے اخبارات و رسائل شائع ہوتے رہتے ہیں وہاں کے بیشتر اشخاص یہ جانتے ہیں کہ شراب کا استعمال جسم، عقل، دولت، صحت عامہ اور اصول معاشرہ کے لیے سخت ضرر رساں ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اتنا کچھ جاننے کے باوجود لوگ اس سے توبہ کرنے اور ترک کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ حد یہ ہے کہ ان کے ڈاکٹر جو اس کے نقصانات کو سب سے زیادہ جانتے ہیں شراب کے رسیا اور دائم الخمر ہیں۔ حالانکہ انھیں علم ہے کہ منشیات کے استعمال سے عوارض و امراض پیدا ہوتے ہیں اور نشہ پینے والوں کے پاگل ہو جانے تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ ان کی جوانی، پاکدامنی اور گھر بار تک برباد ہو جاتا ہے لیکن حوصلہ کی کمی، دوست احباب کی ہمنوائی کا ذوق، مستی اور بے خودی کا مزہ اور دوستوں کی صحبت کا لطف۔ یہ سب باتیں انھیں شراب کا شائق بنادیتی ہیں اور شراب خوری میں مبتلا ہو کر عتاب رب العالمین کے مستوجب ہو جاتے ہیں۔

علماء نے شراب نوشی میں جو برائیاں بتائی ہیں ان کو مختصر اذیل میں درج کیا جاتا ہے:

- ۱۔ شراب پینے کے وقت شرابی کا تمام ایمان سلب ہو جاتا ہے۔
- ۲۔ اللہ کی نافرمانی کے باعث اس پر اللہ کی لعنت پڑتی ہے اور اس کی رحمت سے محروم ہو جاتا ہے۔
- ۳۔ شرابی کی ہمت پست ہو جاتی ہے۔ رزق تنگ ہو جاتا ہے۔ قحط اور تباہی پھیلتی ہے۔ شکلیں مسخ ہو جاتی ہیں اور نامردی بھی لاحق ہو جاتی ہے۔

- ۴۔ شراب نوشی کا ارتکاب وہی کرتا ہے جو بدکار اور گناہگار ہو اور جسے خدا و آخرت پر ایمان نہ ہو۔
- ۵۔ شراب انسان کو ہر قسم کے گناہوں میں مبتلا کر دیتی ہے کیونکہ یہ تمام برائیوں کی ماں ہے۔
- ۶۔ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ شراب پینے والے کو عذاب میں ڈال دے گا۔ اور وہ گندگی پلائی جائے گی جو بدکاری کے نتیجہ میں شرمگاہوں سے خارج ہوتی ہے۔ العیاذ باللہ (خدا کی پناہ)۔
- ۷۔ اللہ تعالیٰ شرابی کو جنت سے اس طرح محروم کر دے گا کہ اس کی بوتل انھیں نہ پہنچے گی۔
- ۸۔ شرابی کو وہی عذاب ہوگا جو بتوں اور مورتیوں کے پجاری کو ہوگا۔
- ۹۔ شرابی حشر کے روز سخت تشنگی اور پیاس کے عالم میں قبر سے اٹھے گا۔
- ۱۰۔ شراب پینے کے بعد چالیس دن تک نہ شرابی کی عبادت قبول ہوتی ہے اور نہ اس کی دعا قبول ہوتی ہے۔
- ۱۱۔ شراب پینے والا توہین، تذلیل اور تحقیر کا مستوجب ہو جاتا ہے چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے ”لا تسلموا علی شربة الخمر“ (یعنی شراب پینے والے کو سلام نہ کرو)۔

- ۱۲۔ شراب خور پر اللہ کا عتاب نازل ہوتا ہے اور اگر اسی حالت میں مر جائے تو اللہ کی رحمت اور جزائے خیر سے محروم رہ جائے گا۔

- ۱۳۔ شرابی اگر نشہ کی حالت میں مر جائے تو اللہ تعالیٰ اسے حالت سکر میں پڑے رہنے کا عذاب دے گا اور وہ اپنے دوسرے کاموں میں بھی یہی تلخی محسوس کرے گا اور ایمان سے بے بہرہ ہو کر مرے گا۔

- ۱۴۔ شراب پینے والے کے لیے نار جہنم میں ایک چشمہ نکالا جائے گا، جس سے پیپ، کچھ اور طرح طرح کی

اذیت ناک چیزیں ابلیس کی یعنی اس میں سے کچھ لہو اور پیپ برآمد ہوگا۔

۱۵۔ شراب پینے والا محتاج، تلف کار اور نیکی سے محروم ہو کر رہ جاتا ہے گویا دنیا کو پا کر اس نے تلف کر دیا۔

۱۶۔ شراب نوشی منجملہ ان خصائل کے ہے جو تباہ کن، ضرر رساں، دولت سے محروم کرنے والے، عقل مار دینے والے اور ملت کو ہلاک کرنے والے ہیں۔

۱۷۔ شراب مضر صحت ہے انسان کو اطمینان سے محروم اور بد بختی، تباہی بربادی سے دوچار کر دیتی ہے۔

۱۸۔ شراب کی مضرت شرابی کی اولاد اور اس کی نسل تک پہنچتی ہے اور بچے مریض پیدا ہوتے ہیں۔

۱۹۔ اللہ تعالیٰ شرابی کی نہ فیاضی قبول کرتا ہے نہ انصاف پسندی نہ فرض (کی بجا آوری) قبول ہے نہ نفل (کی ادائیگی)۔

۲۰۔ جو شخص نشہ کی حالت میں دنیا سے جاتا ہے وہ نشہ ہی کی حالت میں دفن ہوتا ہے اور نشہ کی حالت میں اٹھایا جائے گا پھر نشہ ہی کی حالت میں اسے واصل جہنم کیا جائے گا اور پھر ایک پہاڑ پر لایا جائے گا جس کا نام 'سکران' ہے اس میں ایک چشمہ ہے جس سے پیپ اور کچھ لہو بہہ رہا ہے۔ اور جب تک زمین و آسمان ہیں شراب نوشوں کا کھانا پینا یہی ہوگا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔ (ملخصاً ماخوذ از شرح الترهیب والترغیب)

”حرمت شراب کی آیات قرآنی“

”يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ، وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا“
(البقرة: ۲۱۹)

(یعنی لوگ حکم شراب و قمار کی بابت سوال کرتے ہیں تو اے نبی انھیں بتا دو کہ یہ گناہ کبیرہ ہیں اور لوگ ان سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں لیکن ان میں فائدہ اتنا نہیں ہے جتنا بڑا گناہ ہے)۔

۲۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تَفْلَحُونَ“
(المائدہ: ۹۰)

(یعنی اے مسلمانوں شراب، جوا، دیوتاؤں کے تھان اور پانے کے تیر یہ سب گندے اعمال شیطانی میں سے ہیں۔ تم ان سے کنارہ کش رہو۔ اسی میں تمہاری بہتری ہے)۔

۳۔ وَلَا تَقُواْ بَآيِدِكُمْ إِلَى الْهَلَاكَةِ، وَاحْسِنُواْ إِلَى اللَّهِ يَحِبَّ الْمُحْسِنِينَ“ (البقرة: ۱۹۵)

(یعنی خود اپنے ہاتھوں تباہی میں نہ پڑو۔ اچھے کام کرو۔ اللہ اچھے کام کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)۔

۴۔ وَلَا تَبْدُلُواْ الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ“
(النساء: ۲)

(یعنی اچھی چیز کو چھوڑ کر بری چیز اختیار نہ کرو)۔

(البقرة: ۱۷۲)

۵۔ ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُواْ مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ“

(یعنی مسلمانو پا کیزہ رزق کھاؤ جو ہم نے تمہیں عطا کیا ہے)

(المائدہ: ۸۸)

۶۔ ”وَكُلُواْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلالاً طَيِّباً“

(یعنی پاک روزی کھاؤ جو اللہ نے تمہیں دی ہے)۔

۷۔ ”لا تقاتلوا انفسکم ان اللہ کان بکم رحیماً“ (النساء: ۲۹)

(یعنی اللہ تعالیٰ ازراہ کرم تمہیں حکم دیتا ہے کہ اپنی جان کو ہلاک نہ کرو)۔

۸۔ ”یا ایہا الرسل کلو ا من الطیبات واعملوا صالحاً انی بما تعملون علیم“ (المؤمنون: ۵۱)

(یعنی اے رسولو پاک چیزیں کھاؤ اور اعمال نیک بجاؤ رہو۔ یا رہے کہ ہم تمہارے افعال سے واقف ہیں)۔

۹۔ ”یا ایہا الذین امنوا لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکا م حتی تعلموا ماتقولون“ (النساء: ۴۳)

(یعنی اے مسلمانو نشہ میں ہو تو نماز کے پاس نہ جاؤ اس وقت تک کہ تمہیں یہ ہوش آجائے کہ تم کیا کہہ رہے ہو)۔

جنگ کی حالت میں حد (شرعی سزا) کے نافذ کرنے کا بیان۔

ائمہ فقہ کا اس پر اتفاق ہے کہ حالت جنگ میں حد نافذ نہیں کی جائے گی اور نہ دارالحرب (دشمن کے علاقہ) میں۔ ہر چند کہ پولیس کے سپاہی، لشکر اور افسروں کو شریعت اسلامیہ کا یہ حکم ہے کہ حال میں اللہ تعالیٰ اور شارع حکیم علیہ السلام کے احکام کی اطاعت کریں اور اپنے آپ کو پرہیزگاری سے آراستہ رکھیں تاکہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے دشمنوں پر فتح یاب فرمائے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے۔ ”ولینصرن اللہ من ینصرہ ان اللہ لقوی عزیز“ (یعنی جو خدا کا حامی ہوگا اللہ تعالیٰ بالیقین اسے فتیاب کرے گا، اللہ زبردست قوت والا ہے) نیز ارشاد باری تعالیٰ ”ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم“ (یعنی اگر تم اللہ کے حامی رہے تو اللہ تمہیں فتح یاب کرنے کا اور تم کو ثابت قدم رکھے گا)۔ بناء بریں حکام اور افسران فوج لشکریوں اور پولیس کے سپاہیوں کو میدان کارزار میں بھی نماز کی پابندی کا حکم دیتے تھے اور گناہوں اور نافرمانیوں کے ارتکاب سے دور رہنے کا بھی اور اللہ تعالیٰ انہیں اپنے دشمنوں پر فتح یاب فرماتا تھا۔ ”وما النصر الا من عند اللہ“ (یعنی اللہ کے سوا اور کہاں سے مدد مل سکتی ہے) یہ بات ثابت ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے جنگ فارس میں حضرت سعد بن وقاص کے پاس بمقام قادیسیہ ایک مکتوب ارسال فرمایا جس میں حضرت سعد اور ان کے لشکر کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ ”میں تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو ہر حالت میں اللہ سے ڈرنے کا حکم دیتا ہوں۔ یاد رہے کہ خدا کا خوف دشمن کے لیے سب سے بڑی تیاری اور سب سے زیادہ کارگر حکمت عملی ہے۔ نیز تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو حکم دیتا ہوں کہ دشمن سے زیادہ گناہوں سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرو۔ کیونکہ لشکریوں کا گناہ دشمن سے زیادہ خطرناک ہے۔ یاد رکھو کہ مسلمانوں کی فتح یا بی ایمان باللہ اور طاعت الہی پر منحصر ہے اور نتیجہ ہے دشمنوں کی معصیت کا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو ہم کبھی ان پر غالب نہ ہو سکتے۔“

ان ہدایات کے باوجود ایسا ہوا کہ مجاہدین اسلام میں سے ایک شخص سے ایسا گناہ سرزد ہو گیا جس پر حد کا نفاذ لازم ہو گیا۔ لیکن دارالحرب میں اسے حد نہیں ماری گئی جیسا کہ کارروائی سے ثابت ہے جو سعد بن وقاص نے ابن مجن ثقفی کے ساتھ روا رکھی۔ یہ صاحب عہد جاہلیت اور عہد اسلام کے زبردست بہادروں میں سے تھے۔ بڑے رعب داب کے آدمی تھے ایک اچھے اور طبع زاد شاعر بھی تھے لیکن شراب کے رسیا تھے۔ اس کا چھوڑنا ان کے لئے ممکن نہ تھا شراب پینے کی

سزا اور لوگوں کی مذمت بھی انہیں اس برائی سے باز نہ رکھ سکی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے متعدد بار انہیں شراب پینے پر سزا دی اور بالآخر ایک دریائی جزیرہ میں انہیں جلاوطن کر دیا۔ ایک شخص کو ان کی دیکھ بھال کے لیے ساتھ بھیج دیا تھا۔ لیکن وہ وہاں سے بھاگ کر حضرت سعد بن وقاص کے پاس قادیسیہ میں آ گئے اور جنگ میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے حارس کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا جسے حضرت عمرؓ نے ان کی نگرانی کے لیے ان کے ساتھ بھیجا تھا۔ حارس نے ابن مجنن کے اس ارادہ کو بھانپ لیا اور بھاگ کر حضرت عمرؓ کے پاس آ گئے اور صورت حال سے انہیں آگاہ کیا۔ سیدنا عمرؓ نے سعد بن ابی وقاص کو حکم بھیجا کہ ابن مجنن کو گرفتار کر لیا جائے چنانچہ انہیں قید میں ڈال دیا گیا پھر جب (پادری) ناطف قادیسیہ میں آیا اور گھسان کی جنگ ہونے لگی تو ابو مجنن نے حضرت سعد بن وقاص کی بیگم سے التجا کی کہ ”مجھے قید و بند سے رہا کر کے سعد کا گھوڑا میرے حوالے کیجئے۔ اگر میں جنگ سے بچ کر واپس آ گیا تو وعدہ کرتا ہوں کہ پھر بدستور قید و بند میں پڑ جاؤں۔ اگر شہید ہو گیا تو اس پر کوئی باز پرس نہ ہوگی۔ بیگم سعد نے (ان کی باتوں سے متاثر ہو کر) انہیں آزاد کر دیا اور گھوڑا بھی دے دیا۔ ابو مجنن جنگ قادیسیہ میں شریک ہوئے اور خوب داد شجاعت دی پھر قید میں آ گئے۔ ان ہی کے ہاتھوں قادیسیہ کی جنگ میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی اور سعد بن وقاص نے انہیں سزا نہیں دی۔

واضح ہو کہ دوران جنگ یا دار الحرب میں حد نافذ نہ کی جائے تو بعد میں حاکم اپنی ذاتی رائے پر جو مناسب سمجھے سزا دے سکتا ہے۔ لیکن سیدنا سعد بن وقاص نے یہ فیصلہ کیا کہ ابو مجنن نے اپنی جان راہ خدا میں لڑادی اور شجاعت کے وہ جو ہر دکھائے کہ جو باید و شاید اس لیے نہ انہیں شراب پینے کی حد ماری جائے اور نہ بعد میں کوئی اور سزا دی جائے۔ کیونکہ گناہ سے پاک کرنے والی بات اس سے بڑھ کر نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ مجاہد اگر میدان جنگ میں کام آئے تو اسے جنت میں جگہ ملے گی اور اگر واپس آ جائے تو وہ تنخواہ اور مال غنیمت میں سے اپنا حصہ پائے گا۔

ابو مجنن پر اس معافی کا بہت اثر ہوا اور انہوں نے صدق دل سے ایسی توبہ کی کہ ہمیشہ کے لیے شراب کا پینا ترک کر دیا۔ اور وہ مسلمان جو راسخ العقیدہ ہو اس کا عزم ایسا ہی پختہ ہوتا ہے اور گناہوں میں ملوث ہونے کے بعد ان سے کنارہ کش ہو جاتا ہے بشرطیکہ اسے اپنے گناہوں کے انجام کا خوف ہو اور اپنے پروردگار کی طرف مائل ہو جائے۔

آنحضرت ﷺ سے مروی ہے کہ حضور نے دشمن کے علاقہ میں سزائے شرعی کے نافذ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اس روایت کو ابن ابی شیبہ رضی اللہ عنہ نے اخراج فرمایا ہے۔

دوسرا باب

ان حدوں کے بیان میں جن کے نفاذ پر سب کا اتفاق ہے

’حد زنا اور اس کے معنی

از روئے لغت حد کے معنی روکنے (باز رکھنے) کے ہیں۔ چنانچہ دربان کو ’حد‘ اڑ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ (غیر شخص کو) گھر میں آنے سے روکتا ہے۔

کتاب نہایہ (شرح ہدایہ) میں ہے کہ لفظ حد کا اطلاق گناہ پر بھی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ’تلك حدود الله فلا تقربوها‘ (یعنی اللہ نے ان امور کو گناہ قرار دیا ہے۔ لہذا ان کے پاس نہ پھٹکو)۔ اس لفظ کا اطلاق ان سزاؤں پر ہوتا ہے جو صاحب شریعت نے گناہ کی پاداش میں مقرر فرمائی ہیں۔ چنانچہ بولنے میں یوں آتا ہے ’اقمْتُ علیہ الحد‘ (یعنی میں نے فلاں شخص پر حد جاری کی)۔ ’حد‘ کے بنیادی معنی رکاوٹ اور دو چیزوں کے درمیان علیحدگی کے ہیں مصباح میں ہے کہ (حد کے مفہوم میں) شرع کی مقرر کردہ سزائیں شامل ہیں کیونکہ یہ سزائیں گناہ کے ارتکاب میں رکاوٹ ہیں۔ شریعت میں ’حد‘ اس سزا کو کہتے ہیں جو بطور مطالبہ حق مقرر کی جائے جیسا کہ قرآن شریف میں ہے ’ومن يتعد حدود الله فقد ظلم نفسه‘ (یعنی جس نے اللہ کے حکم یا اس کی مقرر کردہ حد سے تجاوز کیا۔ اس نے خود اپنے اوپر ظلم کیا یعنی مستوجب عذاب ہو گیا) نیز ارشاد ہے۔ ’والحافظون لحدود الله‘ (یعنی اہل ایمان اللہ کی مقرر کردہ حدود کی پاسداری کرتے ہیں)۔

(نفاذ حد کا) ثمرہ، معاشرہ کی خرابی کو دور کرنا، جان کو ہلاک ہونے سے اور عزت و آبرو کو برباد ہونے سے بچانا، نسل کو گڈمڈ ہو جانے اور مال کو ضائع ہونے سے محفوظ رکھنا اور ذلت و رسوائی سے نجات پانا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ’لا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحها‘ (یعنی دنیا کے بنے بنائے حالات میں بگاڑ نہ پیدا کرو)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین پر کسی طرح کا فساد نہ پھیلاؤ۔ اس فساد میں یہ تمام باتیں داخل ہیں: منشیات کے استعمال سے عقل کا زائل کرنا، جانوں کو قتل کرنا، اعضاء کا کاٹنا، اغلام و زنا سے نسلوں کو خراب کرنا، تہمت لگانا، پرائے مال پر ناجائز قبضہ جمانا، چوری کرنا، کاروبار میں فریب سے کام لینا، دین میں کفر و بدعت کو داخل کرنا، دنیا کی اصلاح (فساد سے بچانے) کا تعلق ان پانچ باتوں سے ہے۔ (۱) جان، (۲) عقل، (۳) عزت، (۴) دین، (۵) مال۔

نفاذ حد سے فائدہ یہ ہے کہ دنیا سے برائی کے اسباب کا خاتمہ ہو جائے چنانچہ زنا کی سزا لاگو ہونے سے نسل ضائع ہونے بلکہ ختم ہونے سے بچ جاتی ہے کیونکہ اس سے نسل مشتبہ ہو جاتی ہے، اس لیے شارع نے اس کو بہتر سمجھا ہے کہ زنا کے مرتکب کو عوام کے سامنے ’حد‘ ماری جائے یا سنگسار کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ’ولیشہد عذابہما طائفة من المؤمنین‘ (النور: ۲) (یعنی مرتکبین بدکاری کو جب سزا دی جائے تو چاہیے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت اس کا مشاہدہ کرے)۔

دوسرے مستوجب سزا گناہ ایسے ہیں جن کی خرابی کو عقل تسلیم کرتی ہے اور ہر شخص کی طبیعت مانتی ہے کہ شراب

سے عقل زائل ہو جاتی ہے، تہمت سے آبرو میں بٹ لگتا ہے اور چوری، غیر کے مال کو ہتھیا لینا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اقوام سابقہ میں سے کسی میں دوسرے کا مال یا آبرو لینا جائز نہیں رہا اور بدکاری کے ارتکاب اور مستی کی اجازت نہیں دی گئی۔ چونکہ دنیائے انسانیت میں یہ برائیاں عام ہیں اور انسان کو ان سے جو خطرات درپیش ہوتے ہیں وہ بہت زیادہ ہیں اس لیے ان کا سدباب کرنے کے لیے جو سزائیں رکھی گئی ہیں وہ خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حقوق (یعنی احکام الہی) میں سے ہیں ان کے نافذ کرنے ہی سے ہمیشہ معاشرہ کو فائدہ پہنچتا رہے گا۔

ان حدود کو شرعی حکم قرار دیے جانے کی حکمت

ان سزاؤں کو شرعی حکم اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ جو امور خدا کے بندوں کیلئے ضرر رساں ہیں ان کا سدباب کیا جائے مثلاً عصمت دری، نسل کی بربادی بے آبروئی، ضیاع مال، اتلاف جان اور بد امنی۔ یہ شرعی سزائیں معاشرے کے ان تمام بڑے بڑے اخلاقی عارضوں اور نفس سرکش کے امراض کی شفا بخش دوا اور ان سے چھٹکارا دلانے والا علاج ہے جو معاشرہ کے لیے تباہ کن اس کے جسد کو گھن لگانے والے، اس کے اعضاء کو کچل دینے والے اور بالآخر واصل جہنم کرنے والے ہیں۔

انما الامم الاخلاق ما بقیت

فان هم و ذہبت اخلاقهم ذہبوا

(مطلب یہ ہے کہ اقوام کے وجود کی بقا اخلاق کے ساتھ ہے۔ اخلاق گیا تو قومیں بھی گئیں)۔

اسلام (راہ راست) سے انحراف پر نظر رکھتا ہے، کیونکہ اخلاق سے گرنا فطری خوبی سے (جس پر اسے پیدا کیا گیا ہے) ہٹ جانا اور فطرت سے بغاوت ہے۔ اسلام (بذات خود) فطری صلاحیت سے منہ موڑ لینے والوں کا علاج کرتا ہے اور جب علاج کارگر نہ ہو اور اصلاحی اقدامات سودمند نہ ہوں تو اسلام جرائم سے روکنے میں سختی سے کام لیتا ہے اور شدید احکامات نافذ کرتا ہے تاکہ برائی کا وجود تمام معاشرے ہی کو ختم نہ کر دے۔ غرض اسلام خود سری کے خلاف برسر جنگ ہے اور اس کے سدباب کی خاطر شرعی سزائیں شدت گناہ کے پیش نظر رکھی گئی ہیں تاکہ جمعیت انسانی کو نقصان و فساد سے محفوظ رکھا جائے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی عضو انسان ہلاکت آفریں مرض میں مبتلا ہو جائے اور اس کا علاج نہ ہو سکے تو اس عضو کو کاٹ دینا ضروری ہو جاتا ہے تاکہ پورے جسم کو بچایا جاسکے۔

زنا (بدکاری) کی حد

زنا سے مراد ایک مکلف انسان کا (یعنی جس پر احکام شرعیہ عائد ہوتے ہیں) کسی مشتبہ عورت (یعنی جو خواہش نفسانی کی محرک ہو سکتی ہے) کے ساتھ فعل گناہ کا مرتکب ہونا ہے۔ درآنحالیکہ وہ شخص اس عورت پر ایسا کوئی حق نہ رکھتا ہو۔ اور یہ حرکت اس نے غلط فہمی سے یا شبہ میں پڑ کر نہ کی ہو۔ اس فعل سے اس عورت کے ساتھ نسب اور دودھ کا وہی رشتہ قائم ہو جاتا ہے جو باقاعدہ بیوی بنا لینے سے ہوتا۔ بد فعلی کا جرم انسانی جرائم میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ جرم ہے، جو شرافت، اخلاق اور انسانی فضل و شرف کے منافی اور معاشرہ کی بنیاد کو منہدم کرنے، خاندان کو تباہ کرنے، نسل کو مٹانے،

زوجیت کے رشتہ کو منقطع کرنے اور اولاد کی خرابی تربیت بلکہ بچے کو ضائع کرنے یعنی فی الواقع اسے قتل کرنے کے مترادف ہے۔ اس طرح جو ناجائز اولاد پیدا ہوگی ان کا کوئی مربی نہیں ہوتا اور ماں بے وسیلہ ہونے کے باعث بذات خود بچے کی تربیت اور اس کے حالات کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی۔ لہذا اس کا انجام بہت برا ہوتا ہے اور اس کا وجود (جسد) معاشرہ کا ایک ناکارہ عضو بن کر رہ جاتا ہے۔ اس حرکت سے باہمی بغض و عناد بڑھتا اور بدی و جرائم کی کثرت ہو جاتی ہے کیونکہ وہ بچہ قابل نفرت اور ناپسندیدہ گناہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ غرض بد فعلی کا جرم زندگی کے جملہ معاملات میں سب سے زیادہ خطرناک جرم ہے بلکہ اگر نظام حیات کی پائنداری اور اس کی دائمی خوش بختیوں اور خوشگوار یوں اور اس کے ربط و ضبط (کی اہمیت) کے پیش نظر دیکھا جائے تو یہ حرکت نہایت ہی اذیت ناک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شارع حکیم علیہ السلام نے اس (جرم کی) سزا کو انتہائی اہمیت دی ہے۔ تاکہ انسان کی عمرانی زندگی ممنوعات سے پاک ہو اور اسے ان مصیبتوں اور خطرات سے بچایا جاسکے جو خاندان کی تباہی کا باعث ہیں، چنانچہ جو لوگ اپنی شرمگاہوں کو (آلودگی معصیت سے) بچا کر نہیں رکھتے ان کے مستوجب عذاب ہونے کا ذکر فرمایا ہے اور اس کی خوب وضاحت کر دی ہے اور اس کے مرتکبوں پر شدید ترین اور اذیت ناک ترین سزا عائد فرمائی ہے اور حکم دیا ہے کہ ان پر نہ رحم کیا جائے اور نہ ہی ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا جائے۔ اور حکم ہے کہ مسلمانوں کی جماعت ان کی سزا کو دیکھے ”لشہد عذابہما طائفة من المؤمنین“ (النور: ۲) (یعنی مسلمانوں کی جماعت کو چاہیے کہ ان کی سزا کا مشاہدہ کرے) ساتھ ہی ایسی پیش بندیاں بیان فرمائی ہیں جن کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے تاکہ شرمگاہوں اور اعضائے معصیت کو بچایا جاسکے اور انسان محتاط رہ سکے چنانچہ حکم یہ ہے کہ غیر عورتوں کے سامنے نظر کو جھکا کر رکھا جائے کیونکہ نظر ہی دعوت گناہ دیتی ہے پھر مردوں کو حکم ہے کہ اپنی عورتوں کو غیر مردوں کے سامنے آنے سے منع کریں اور بے پردگی نہ ہونے دیں۔ عورتوں کو یہ ہدایت ہے کہ وہ اپنے جسم کو شرم و حیا کے ساتھ چھپا کر رکھیں اور ایسے مقامات سے دور رہیں جہاں تہمت کا اندیشہ اور بد انجامی کا خطرہ ہو۔ انھیں چاہیے کہ غیر مردوں کے ساتھ خلط ملط ہونے سے بچیں تاکہ حرام کی مرتکب نہ ہوں اور انھیں یہ میل جول اور فیاضانہ سلوک معصیت میں مبتلا نہ کر دے اور حد کی مستوجب ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”قرن فی بیوتکُن ولا تبرجن تبرج الجاہلیۃ الاولیٰ“ (یعنی عورتوں کو چاہیے کہ اپنے گھروں میں رہیں اور عہد سابقہ کی جاہلیت کی طرح اپنا سنگھار دکھاتی نہ پھریں) اللہ تعالیٰ کا یہ خطاب امہات المؤمنین (ازواج نبی ﷺ) سے تھا جو نیک نفس اور صابر خواتین تھیں۔ انھوں نے درس گاہ نبوت میں تعلیم پائی اور سب سے بڑے دارالعلوم اسلامیہ کی تربیت یافتہ تھیں۔ بارگاہ نبوت میں آداب سیکھے اور رسول اللہ ﷺ سے اخلاق حاصل کیا۔ یہ خواتین بغیر کسی شرعی ضرورت کے گھر سے باہر نہیں جاتی تھیں مثلاً حج یا عمرہ ادا کرنا ہو یا ماں باپ کی زیارت کرنی ہو یا اقرباء سے ملنا جلنا ہو یا بیمار پرسی پیش نظر ہو یا ایسی ہی کوئی اور بات ہو۔ پھر بھی جب وہ باہر جاتی تھیں تو اپنی زیب و زینت کو ظاہر نہ ہونے دیتی تھیں اور نہ اپنے حسن و جمال کا کوئی اظہار ہونے دیتی تھیں اور نہ بھڑک دار کپڑے پہن کر نکلتی تھیں۔ دیکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جب ایسی خواتین کو یہ حکم دیا جو ان صفات کی مالک تھیں تو دوسری عورتوں کا باہر نکلنا اور مردوں کے سامنے بازاروں میں چلنا پھرنا اور بھی اندیشہ کی بات ہے۔ درآنحالیکہ ان میں ایسی عورتیں بھی ہیں جن کے دل مریض ہیں۔ گناہ، بدی اور فسق و فجور میں پڑی ہوئی ہیں اور خوف

وخشيت الله سے خالی ہیں۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ان المرأة عورة فاذا خرجت من بيتها اشرفها الشيطان وان اقرب ما تكون من رحمة ربها وهي في عقر بيتها“ (یعنی عورت ایسی چیز ہے جسے چھپانا واجب ہے۔ جب وہ گھر سے نکلتی ہے تو شیطان اس کی پذیرائی کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت جب تک اپنے گھر کے اندر ہے اپنے پروردگار کی رحمت سے زیادہ قریب ہے)۔ فقہاء اس بارے میں متفق اللفظ ہیں کہ بعض اوقات عورت کا اس حال میں گھر سے نکلنا گناہ کبیرہ ہو جاتا ہے جب کہ اس سے خرابی پیدا ہو۔ مثلاً کوئی عورت عطر لگا کر اور بناؤ سنگھار کر کے بے پردہ سفر کو نکلے اور غیر مردوں کے سامنے اپنے حسن و جمال کی نمائش کرے، جیسا کہ اس زمانہ میں ہو رہا ہے اور جس سے فتنہ پیدا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں گھر سے باہر نکلنا حرام ہے۔ اگر فتنہ کا اندیشہ ہو لیکن (خوش قسمتی سے) کوئی فتنہ پیدا نہ ہو تو اسے گناہ کبیرہ کی مرتکب نہیں سمجھا جائے گا۔

فقہاء کہتے ہیں کہ کسی مجبوری سے عورت کا (گھر سے) باہر نکلنا جائز ہے۔ لیکن اس کی چند شرطیں ہیں جن میں سب سے زیادہ ضروری شرط ’محرم‘ (یعنی ایسا شخص جس سے نکاح نہیں ہو سکتا) کا ساتھ ہونا ہے۔ اس کے ساتھ ہی پاس حیا ہو۔ عطر لگا ہوا نہ ہو، بناؤ سنگھار نہ کر رکھا ہو اور حسن چھپا رکھا ہو اور مردوں سے ہٹ کر چلے تاکہ فتنہ نہ پیدا ہو اور بیباک اشخاص سے دور رہے، اور چاہیے کہ سابقہ عہد جاہلیت والی نمود و نمائش نہ ہو۔ اس سے مراد وہ کیفیت ہے جو اسلام سے پہلے تھی، یعنی عورتوں کا ناز و انداز کے ساتھ اپنے حسن و شباب کی نمائش کرتے ہوئے اٹھلا کر چلنا اور گردن، سینہ، بال، گدی، پیٹھ، ہاتھ اور پنڈلی کو جس قدر چھپانا چاہیے اسے نگار رکھنا۔ اور ایسی باتیں جو ایک مسلمان کی غیرت کے منافی ہیں۔ اس زمانے میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کا ناز و انداز سے باہر نکلنا، شوخیاں کرنا، نیم برہنہ لباس پہننا، بالوں کو کھلا اور پیٹھ کا نگار رکھنا، بے حیائی اور بے پردگی کا مظاہرہ کرنا، بیباکی اور آزادی کی برائیوں میں آج کی عورتیں، اسلام سے پہلے عہد جاہلیت کی عورتوں سے بڑھ گئی ہیں۔

اس معصیت کی ذمہ داری اول تو خود ان عورتوں پر عائد ہوتی ہے۔ پھر اس کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جو ان کے نگران حال (سرپرست) ہیں ان میں ان کے خاوند، باپ، دادا اور بھائی بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان عورتوں پر اور ان لوگوں پر جو عورتوں کے اس طرز عمل پر راضی ہیں لعنت کرتا ہے اور ان مردوں پر بھی لعنت ہے جو انہیں اس حال میں دیکھتے اور ان کا ساتھ دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد برحق ہے ”صنفان من اهل النار لم ارهما، قوم معهم سياط كأذناب البقر يضربون بها الناس، ونساء كاسيات عاريات، مميلات مائلات، رواسهن كأسنمة البخت المائلة، لا يدخلن الجنة، ولا يجدن ريحها، وإن ريحها لتوجد من مسيرة كذا وكذا۔“ (یعنی دو قسم کے اہل جہنم ایسے ہیں جنہیں میں نے نہیں دیکھا ہے) (یعنی میرے دور کے بعد پیدا ہونگے)۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جن کے بیل کی دم جیسے کوڑے ہیں اور وہ لوگوں کو اس سے مارتے پھرتے ہیں۔ اور (دوسری قسم میں) وہ عورتیں جو لباس میں بھی تنگی ہیں، پیار کرنے اور پیار چاہنے والیاں ہیں، ان کے سر پالتو اونٹ کے کوہان کی مانند ہیں۔ یہ عورتیں جنت میں نہیں جائیں گی اور نہ جنت کی خوشبو پائیں گی حالانکہ وہ اتنے اتنے فاصلہ سے

سو گھسی جاسکتی ہے)

یہ حدیث بھی نبوت آنحضرت ﷺ کی ایک دلیل ہے کیونکہ اس میں رسول اللہ ﷺ نے مستقبل کے حالات سے آگاہ فرمایا ہے اور ایک ایسی حالت بتائی ہے جو حضور کے عہد حیات کے تیرہ سو نوے سال بعد پیش آنے والی تھی۔ واضح ہو کہ شریعت کی مقرر کردہ، حدود، (سزاؤں) میں سے بد فعلی کی حد سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے کیونکہ یہ سزا ایک بہت بڑے ایسے نفسانی مرض کا علاج ہے، جس کا انسانی طبائع پر بہت گہرا اثر ہے اور طبیعت پر اس کا غلبہ ہوتا ہے۔ یہ مرض خواہش نفسانی کا جوش ہے جو عقل پر قابو پالیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نوع بشر میں یہ زبردست قوت اس لیے پیدا فرمائی ہے کہ دنیا آباد ہو اور نوع انسان باقی رہے۔ لیکن ایسا ہوتا ہے کہ یہ قوت اپنی حد سے تجاوز کر جاتی ہے۔ اس لیے شریعت نے اس کے لیے ایک پابندی رکھ دی ہے تاکہ یہ سرکش نہ ہونے پائے اور اسے صحیح طریقہ سے کام میں لایا جائے۔

زنا کے نقصانات

واضح ہو کہ 'زنا' کا فعل شنیع بے شمار خرابیوں اور ناخوشگوار نتائج کا حامل ہے۔ اس میں ہر قسم کی اخلاقی، روحانی، جسمانی، عمرانی اور خاندانی مضرتیں ہیں۔ یہ ایک جرم تمام جرائم پر بھاری ہے۔ اس کا مرتکب نازاں و فرحان اپنے اوپر اللہ کا غضب سمیٹتا ہے اور خود کو اس کے عتاب و عقاب اور عذاب کا مستوجب بنا لیتا ہے بلکہ اپنے ایمان کو معرض خطر میں ڈال لیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے "لا یزنی الزانی حین یزنی و هو مؤمن" (یعنی کوئی بدکار ایسا نہیں جس کا ایمان بدکاری کے وقت سلامت رہتا ہو)۔

اس فعل شنیع کے ارتکاب سے (مرد کے علاوہ) عورت کو جو ضرر پہنچتا ہے۔ اس میں بے عزتی، کمینہ پن، بے حیائی، معاشرہ کی رسوائی اور سب سے بڑے گناہ کا ارتکاب ہے۔ اس میں جو خوشی اور تفریح یا نفس پرستی ہوتی ہے وہ بہت حقیر اور تھوڑی دیر کے لیے ہے۔ لیکن اس سے خاندانی شرافت کو جو بے لگتا ہے اور بے قصور رشتہ داروں کو جن میں مرد و عورت شامل ہیں جو شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ پھر اس بدکاری کے نتیجہ میں جو اولاد پیدا ہوتی ہے اسے ناکردہ گناہ کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ اکثر اوقات اس بچے کو ہلاک کر دیا جاتا ہے اگر وہ زندہ بچ بھی رہا تو عمر بھر کے لیے اسے دھتکار، مذمت، اور عار کا سامنا ہے۔ سب اسے حقیر اور قابل نفرت سمجھیں گے یہاں تک کہ وہ ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دے گا۔ اور جس کا نسب ہی ثابت نہیں وہ عملی حیثیت سے مردہ ہی کے برابر ہے۔

ایسی عورت کا اگر شوہر ہے تو وہ بھی ناحق اس کی لپیٹ میں آجائے گا۔ بے آبرو ہو جائے گا، اس کی عزت و وقار خاک میں مل جائے گا اور اپنے ساتھیوں، پڑوسیوں اور جان پہچان والوں میں بے وقعت ہو جائے گا۔ اور یہ شرمندگی تمام عمر بلکہ مرنے کے بعد بھی اسے لاحق رہے گی۔ اسی طرح اس عورت کی اولاد لڑے لڑکیوں کو بھی اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا اور یہ ناکردہ گناہ گاری مارے جانے یا جان دے دینے کے برابر ہے۔ یہ قابل نفرت گناہ نہ بھلایا جاسکتا ہے اور نہ چھپایا جاسکتا ہے کیونکہ عیب کے کام کی بوسب کے دماغ میں پہنچ جاتی اور طوفانی ہوا کی طرح پھیل جاتی ہے کہا جاتا ہے کہ برائی کے پر ہوتے ہیں اور وہ اڑتی ہے۔ اس گناہ کی قباحیت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ عورت ایسے ناجائز بچے کو اپنی دوسری

اولاد یا اپنے خاوند کے کنبہ میں شامل کر دے اور ایک اجنبی کو زبردستی ان کے مال و معیشت میں بغیر کس حق کے ان کا شریک اور ان کی شرافت، وراثت اور دوسری خصوصیات میں ان کا ہمسر بنادے۔ اس سے جو مادی مضرت ہوگی اس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔

پھر اس برے فعل سے جو نقصان صحت کو پہنچتا ہے مثلاً امراض آتشک، سوزاک وغیرہ کا لاحق ہو جانا جن کا ذکر اطباء نے بدکاری کے نقصانات کے سلسلہ میں کیا ہے اور جس پر مستقل کتابیں تالیف ہوئی ہیں۔ اگر اس پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ شریعت نے اس بارے میں جو شدید احکام نافذ فرمائے ہیں اس میں کیا حکمت ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ جب کوئی شخص ایک بار اس برائی میں ملوث ہو جاتا ہے تو پھر وہ اسی میں مبتلا رہتا ہے اور اس کا چسکا لگنے کے بعد چھوڑنا مشکل ہو جاتا ہے وہ جا بجا اس کا ارتکاب کرتا ہے جس کے باعث یہ برائی پھیلتی جاتی ہے اور اس کی مضرت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور معاشرہ میں یہ گناہ وبا کی طرح پھیل جاتا ہے۔

مندرجہ بالا حالات کے پیش نظر، اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ اس گناہ کے مرتکبوں کو یہ سخت حکم دیا گیا کہ اگر مرتکب زنا غیر شادی شدہ ہے تو اسے سو کوڑے مارے جائیں اور اسے اس کے ہمسروں اور پڑوسیوں کے سامنے رسوا کیا جائے تاکہ سب کی نظروں میں وہ حقیر ہو جائے اس کی تو قیران کی نگاہوں سے گر جائے۔ لوگ اس سے کنارہ کشی اختیار کریں اور اس کی صحبت سے دور رہیں۔ کیونکہ ایسا شخص اپنی بد طبیعتی، زیوں فطرتی اور بد کرداری کے باعث ملنے جلنے والوں کے حق میں سخت خطرناک ہوتا ہے اور یہ تو صرف دنیا کی سزا ہے اگر اس نے توبہ نہ کی تو عذاب آخرت اس سے کہیں زیادہ سخت اور دیر پا ہے۔

زنا کا مرتکب اگر شادی شدہ شخص ہو تو اس کی سزا سنگساری ہے۔ ان سزاؤں کے معنی یہ ہیں کہ یہ بدکار مرد اور عورت مقام (انسانیت) سے نیچے گر گئے ہیں اور انسانیت کے مرتبہ فضل و کمال سے ہٹ کر پتھر کے زمرہ میں آگئے ہیں، یہ اشخاص تادیب و تنبیہ کو نہیں سمجھتے۔ تا آنکہ انھیں سخت المناک سزائے ضرب نہ دی جائے یا بری طرح موت سے ہمکنار نہ کر دیا جائے، کیونکہ ایسے اشخاص کو ڈرانے دھمکانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ انھیں ٹھیک کرنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ بجز اس کے انھیں ہولناک سزا دی جائے۔ اسی لیے شارع حکیم نے حکم دیا ہے کہ دُڑہ زنی یا سنگساری کی سزا مسلمانوں کی ایک جماعت کے روبرو دی جائے تاکہ ان کو مکمل اور عبرت آمیز مذلت حاصل ہو اور آئندہ جب بھی ان کا نفس اس گناہ میں آلودہ ہونے کا تقاضا کرے تو اس گناہ کے انجام اور حشر کے پیش نظر اس سے باز رہیں۔

شارع حکیم نے زنا کی یہ (سخت) سزا اس لیے رکھی ہے کہ معاشرہ اس گناہ سے پاک رہے اور اس طرح نافذ کرنے کی غرض یہ ہے کہ مجرم سے زیادہ دوسروں کو عبرت ہو۔ ایک بندہ جب اس گناہ کی عارضی لذت کا مقابلہ اس سخت سزا اور اس رسوائی، ہندامت اور لوگوں کی ملامت سے کرے گا جو مجرم کو اپنی زندگی میں لوگوں کے سامنے یا مرنے کے بعد ہوتی ہے تو اس گناہ میں پڑنے سے باز رہے گا اور بتقاضائے عقل اس سے دور رہنے اور اس سے کنارہ کشی کو ترجیح دے گا تاکہ اس جان اور اس کی عزت و بزرگی باقی رہے۔

شریعت اسلامیہ نے معاشرہ کو اس گناہ سے محفوظ رکھنے کے بارے میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لیا ہے تاکہ

سب لوگ امن و عافیت سے رہیں۔ معاشرہ میں پھوٹ اور ملت میں انفرادی و اجتماعی عناد پھیلانے والا کوئی جرم بدکاری جیسا نہیں ہے شارع نے اہل ایمان کو جہاں اس کے پاس پھٹکنے سے منع فرمایا ہے، وہاں ایسی باتوں سے بھی روکا جو اس کے اسباب اور اس کا پیش خیمہ ہیں۔ تاکہ انسان اس کے لپیٹ میں آجانے سے بچے۔ (یہ احتیاط ایسی ہی ہے) جیسے بلدیہ کا انجینئر خطرناک جگہوں مثلاً جمع الکھربا (برقی خزانہ یا "Accumulator") بارودی سرنگوں (Mines) کا علاقہ یا مخازن المفرقات (یعنی دھماکہ خیز اشیاء Blasts کے ذخیرہ) کے پاس جانے سے روکتا ہے کہ بے خبری میں ناگہانی خطرہ سے دوچار نہ ہونا پڑ جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَلَا تَقْرَبُوا الزَّانَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا" (یعنی زنا کے قریب نہ جاؤ یہ سخت گناہ کی بات اور براراستہ ہے) مطلب یہ ہے کہ زنا کے علاوہ اس کے اسباب محرکہ سے بھی خواہ سبب قریب ہو یا بعید دور رہنے کا حکم اور پاس پھٹکنے سے ممانعت اس لیے ہے کہ اس کے قریب جانے والے کو گناہ دعوت دیتا ہے۔ "انہ کان فاحشہ" اس لیے فرمایا کہ اس کی برائی ظاہر ہے۔ کیونکہ یہ حد سے تجاوز کرتا ہے اور ساء سبیل کا مطلب یہ ہے کہ اس کے لئے جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے وہ برا طریقہ ہے کیونکہ یہ شرمگاہ کا ناجائز استعمال ہے جس سے نسل برباد ہوتی ہے، فتنہ برپا ہوتا اور معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ اللہ تعالیٰ نے اس گناہ کو شرک اور قتل کے بعد رکھا ہے۔ ارشاد باری ہے۔ "وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ، وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ إِثْمًا يِضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيَخْلُدُ فِيهِ مُهَانًا" (یعنی دیندار لوگ کسی کو اللہ کا شریک نہیں بناتے اور جسے قتل کرنا اللہ نے حرام کیا ہے اسے ناحق قتل نہیں کر دیتے، وہ زنا نہیں کرتے اور جو شخص ایسا کرتا ہے وہ معصیت میں مبتلا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن انھیں دہرا عذاب دے گا اور وہ ذلت کے ساتھ ہمیشہ کے لیے اس میں پڑے رہیں گے)۔ رسول اللہ ﷺ نے اس گناہ کی بعض مضرتوں اور برائیوں کا ذکر اس طرح فرمایا ہے: "إِسْكَامُ وَالزَّانَا فَن فِيهِ سِتْ خِصَالٌ، ثَلَاثٌ فِي الدُّنْيَا وَثَلَاثٌ فِي الْآخِرَةِ، فَمَا الَّتِي فِي الدُّنْيَا، فَذَهَابُ الْبَهَاءِ، وَدَوَامُ الْفَقْرِ وَقَصْرُ الْعُمُرِ، وَأَمَّا الَّتِي فِي الْآخِرَةِ: فَسُخْطُ اللَّهِ تَعَالَى، وَسُوءُ الْحِسَابِ وَالْخُلُودُ فِي النَّارِ" بروایت ابو حذیفہ بن الیمان (یعنی خبردار زنا سے دور رہو اس کی چھ خاصیتیں ہیں۔ تین خاصیتیں دنیا سے تعلق رکھتی ہیں اور تین کا تعلق آخرت سے ہے۔ دنیا میں تو یہ ہوتا ہے کہ قدر جاتی رہتی ہے محتاجی ڈیرہ ڈال لیتی ہے اور عمر گھٹ جاتی ہے۔ اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کا غضب، محاسبہ اعمال میں سختی اور دائمی جہنم)۔

نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "إِذَا زَنَى الْعَبْدُ خَرَجَ مِنْهُ الْإِيمَانُ، فَكَانَ عَلَى رَأْسِهِ كَالظِّلِّ، فَإِذَا انْقَطَعَ رَجَعَ إِلَيْهِ" (یعنی جب بندہ یہ گناہ کرتا ہوتا ہے تو اس سے ایمان سلب ہو جاتا ہے اور اس کے سر پر چھتری کی طرح رہ جاتا ہے اس کے بعد ایمان پھر آ جاتا ہے) اس حدیث کے علاوہ بدکاری اور اس کے محرکات سے منع کرنے کے بارے میں اور بہت سی حدیثیں ہیں۔

عورت کا ستر

اس بارے میں کہ عورت کو غیر مردوں کے سامنے اپنے اعضائے جسم میں سے کس قدر کھولنے کی اجازت اور کس قدر ڈھکنے کا حکم ہے، علماء کا اختلاف ہے کیونکہ اس ارشاد باری کے مفہوم میں، ان کی رائیں مختلف ہیں۔ "قُلْ

للمؤمنات یغضضن من ابصارهن ویحفظن فروجهن، ولا یبدین زینتهن الا ما ظہر منها“ (یعنی اے پیغمبر مسلمان عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی آنکھوں کو نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کو (گناہ سے) بچائیں اور اپنی زینت کو بجز اس کے جو ظاہر ہے (یعنی جس کو چھپایا نہیں جاسکتا) ظاہر نہ کریں)۔ اس آیت میں ”غض بصر“ کے معنی نامحرم پر (جس سے عقد ہو سکتا ہے) نظر کرنے سے باز رہنا اور حفظ فروج کے معنی ہیں خاوند کے سوا غیر کو شرمگاہ کے دیکھنے۔ چھونے اور مباشرت سے روکنا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ”والذین ہم لفروجہم حافظون۔ الاعلیٰ ازواجہم او ما ملکت ایمانہم فانہم غیر ملومین“ (یعنی وہ لوگ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، البتہ اپنی بیویوں اور مملوکہ لونڈیوں سے نہیں کرتے، اس پر وہ مذمت کے مستحق نہیں ہیں) الفاظ ”لا یبدین زینتہن“ سے مراد وہ چیزیں ہیں جن سے خوبصورتی ہوتی ہے۔ الا ما ظہر منها“ (یعنی وہ حسن جواز خود ظاہر اور ظاہر کرنے سے نمایاں نہ ہوا ہو)۔ مختلف مسالک کی رو سے عورتوں کے قابل ستر حصہ کی تعیین میں اختلاف ہے۔

شافعیہ کے دواقوال میں سے ایک کی رو سے اور حنابلہ کا قول یہ ہے کہ آزاد خاتون کا تمام بدن عورت (قابل ستر) ہے اور اعضائے جسم میں سے کسی حصہ کا کھولنا درست نہیں ہے بجز اس صورت کے جب کہ ایسا کرنا ضروری ہو جائے۔ مثلاً حکیم کے سامنے بغرض علاج یا شادی کے خواہشمند کے سامنے یا قاضی کے سامنے گواہی کے لیے یا خرید و فروخت کا معاملہ کرتے وقت۔ ان اصحاب نے اس حکم سے چہرے اور ہاتھوں کو مستثنیٰ رکھا ہے کیونکہ ان کا کھولنا ضروری ہو جاتا ہے۔ پاؤں کا کھولنا چونکہ لازمی امر نہیں ہے لہذا اس کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا اس کا چھپانا ضروری ہے یا نہیں؟ اس بارے میں دورائیں ہیں لیکن صحیح رائے یہی ہے کہ یہ بھی واجب الستر ہے۔

حنفیہ اور شافعیہ کے دوسرے قول اور مالکیہ کے قول مفتی بہ کے بموجب چہرے اور ہاتھ کے سوا عورت کا بدن ’ستر‘ ہے پس راہ میں چلتے وقت اور غیر مردوں کے سامنے چہرے اور ہاتھوں کا کھلا رکھنا روا ہے، لیکن انھوں نے اس کے لیے فتنہ کے اندیشہ سے محفوظ رہنے کی شرط رکھی ہے۔ تاہم اگر چہرہ اور ہاتھ حسین ہونے اور زیوروں سے آراستہ ہونے کے باعث موجب فتنہ ہوں تو ان کو چھپانا بھی واجب ہے اور ان کو بھی دوسرے اعضائے کی طرح ستر میں شمار کیا جائے گا۔ یہ سب کچھ فتنے کے سد باب، اس کی بنی، اخلاق، آبرو اور خاندان کے تحفظ کی غرض سے ہے۔ حقیقت یہ کہ نگاہ خواہش نفسانی کی ہر کارہ، گناہ کی پیغام رساں معصیت کے لیے ہیجان آور اور دلوں کے لیے ایک تیر ہے اور بسا اوقات نگاہ، درخت خباثت کا بیج بن جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ توراۃ میں یہ درج ہے کہ نگاہ دل میں خواہش نفسانی کی کاشت کرتی ہے اور بیشتر خواہشات نفسانی دیر پا غم کو جنم دیتی ہیں۔

حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ وہ اور حضرت میمونہؓ حضورؐ کی خدمت میں بیٹھی تھیں کہ حضرت ابن ام مکتومؓ اندر آئے حضورؐ نے فرمایا ان سے پردہ کر وہ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا ”یا رسول اللہ کیا یہ نابینا نہیں ہیں؟ یہ تو ہم کو دیکھ نہیں سکتے۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ”العمیاء وان انما الستما ببصر الہ؟“ (یعنی وہ تو خیر اندھے ہیں، کیا تم انھیں نہیں دیکھتیں؟)

عورت کی آواز کا بیان

عورت کی آواز کے بارے میں بھی علماء میں اختلاف ہے، بعض اصحاب کہتے ہیں کہ آواز 'ستر' نہیں ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کی خواتین مردوں سے واقعات بیان کیا کرتی تھیں۔ بعض اصحاب کہتے ہیں کہ عورت کی آواز 'ستر' (واجب الاختاف) ہے اور گفتگو میں آواز کو اتنا اونچا کرنا منع ہے کہ غیر مرد اسے سن سکیں، کیونکہ بعض اوقات عورت کی آواز اس کی جھانجھن کی آواز سے زیادہ فتنہ انگیز ہوتی ہے۔ خدا فرماتا ہے "لا یضربن بارجلھن لیعلم ما یحفلن من زینتھن" (یعنی عورتیں زمین پر اس طرح پاؤں نہ ماریں کہ ان کے مخفی زیور کی آواز سنائی دے) پس جب کہ اللہ تعالیٰ نے جھانجھن کی آواز سننے سے منع فرمایا ہے کہ اس سے عورت کے سنگھار کا علم ہوتا ہے تو آواز کا سنانا تو بدرجہ اولیٰ حرام ہوگا۔ اس لئے فقہاء نے عورت کے اذان دینے کو مکروہ بتایا ہے۔ کیونکہ اس میں آواز کو اونچا کرنا ہوتا ہے۔ عورت کو ایسا کرنے کی ممانعت ہے۔ لہذا عورت کا اونچی آواز سے گانا کہ غیر مرد اسے سن رہے ہوں حرام ہے، خواہ یہ گانا ساز کے ساتھ ہو یا بغیر ساز کے اور یہ گانا زیادہ حرام ہوگا جب کہ ایسے گانے گائے جائیں جن سے خواہش نفسانی کی تحریک ہوتی ہو۔ مثلاً عشق و محبت کی باتیں ہوں یا نسوانی خصوصیات کا ذکر ہو یا گناہ کی ترغیب ہوتی ہو۔

گانے کا بیان

گانا گانے اور اس کے سننے کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے:

حنفیہ کہتے ہیں کہ گانا مرد بھی گاتا ہے اور عورت بھی۔ اگر عورت گائے اور دھیمی آواز سے اس طرح گائے کہ غیر مرد نہ سنیں تو اس کی ممانعت نہیں ہے۔ اگر اونچی آواز سے گانا ہو اور اجنبی مرد اسے سنیں تو وہ حرام ہے، بالخصوص اس صورت میں جب کہ وہ گانے خواہشات نفسانی میں ہیجان اور فتنہ پیدا کرنے والے ہوں۔ مثلاً گانے میں شراب کی تعریف، عورتوں کی صفت اور عشق و محبت کی طرف راغب کرنے والے گیت ہوں وغیرہ۔

رہا مرد کا گانا، سوا گریہ گانا دل کی پریشانی دور کرنے یا لشکر کو حوصلہ دلانے یا کسی مہم اور جہاد پر ابھارنے کے لیے ہو تو جائز۔ لیکن (مرد کا گانا بھی) اگر مضامین عشق و محبت پر مشتمل ہو اور اس سے اجنبی عورت کے فتنہ میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو تو حرام ہوگا جیسا کہ ریڈیو، سینما، تھیٹر اور ڈرامہ کے نگار خانوں میں منعقد ہونے والی محافل نشاط میں ہوتا ہے۔

خوشی کی تقریروں میں بھی مرد کا گانا ان ہی شرائط پر حلال ہے کہ ساز کے بغیر ہو۔ ہیجان انگیز و فتنہ خیز نہ ہو اور جلسہ ممنوعات سے خالی ہو اور اس میں مرد اور عورتیں خلط ملط نہ ہوں اور اس میں کسی فعل ممنوع کی شمولیت نہ ہو۔ اگر یہ شرائط ملحوظ نہ ہوں تو گانا حرام ہوگا۔ جیسے گویوں اور موسیقاروں کے وہ گانے جو نشر کیے جاتے ہیں۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ عورتوں کا گانا اور اس کا سنانا حرام ہے۔ ہاں اگر مردوں کا گانا فوج کی حوصلہ افزائی کے لیے یا صحراؤں میں اونٹ کو مادہ سفر رکھنے کے لیے ہو اور ساز و آلات طرب کے بغیر ہو تو جائز ہے۔

امام مالک رضی اللہ عنہ سے، مدینے والوں کے گانے کی بابت سوال کیا گیا کہ کہاں تک اجازت ہے؟ تو انھوں

نے فرمایا کہ ہمارے سامنے بدکار لوگ جو کچھ کرتے ہیں اس کے متعلق حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”الغناء ينبت النفاق في القلب كما ينبت الماء البقل“ (یعنی موسیقی دل میں نفاق کی نشوونما اس طرح کرتی ہے جیسے پانی سبزے کو اگاتا ہے)۔

حضرت یزید بن الولید فرماتے ہیں کہ ”اے بنی امیہ خبردار موسیقی سے دور رہنا۔ اس سے شرم جاتی رہتی ہے خواہشات نفسانی بڑھتی ہیں اور مروت ختم ہو جاتی ہے یہ شراب کی قائم مقام ہے اور نشہ کا سا کام کرتی ہے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ ساز و سرور کے ساتھ بے حیائی کے گانے، عورت اور مرد دونوں کے حرام ہیں اور اس کا سننا بھی حرام ہے۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ گانا ایک مکروہ مشغلہ ہے اور فضول کی مانند ہے۔ جو شخص اس میں زیادہ منہمک ہو جائے وہ احمق ہے اور اس کی گواہی کو تسلیم نہ کیا جائے۔

حنابلہ کہتے ہیں کہ گانا سن کر خواہشات نفسانی کا ہیجان ہوتا ہے۔ اس میں مردوں عورتوں کا اجتماع وقار اور خود داری کے منافی ہے جو بہر حال حرام ہے۔ خواہ گانا مرد کا ہو یا عورت کا۔ ایسے گانوں کا سننا بھی حرام ہے کیونکہ جب کوئی شخص شراب کی یا سینے، رخسار اور پستان کی تعریف یا شوق وصال کے تذکرے سنے گا تو بری خواہش پیدا ہوگی اور شیطان اس کے دل میں پھونک لگائے گا۔ برے برے خیالات آئیں گے اور جنسی خواہشات مشتعل ہوں گی۔ بری بات کا سامان مہیا ہو جائے گا اور فتنہ بیدار ہو جائے گا۔ اعضاء لذت گناہ کی جانب راغب ہوں گے۔ اس طرح شیاطین کا غلبہ ہوگا اور عقل جو اس کے خلاف اور حق پرست ہے ناکارہ ہو کر رہ جائے گی اور نتیجہ بالآخر فعل حرام کا ارتکاب ہوگا اور جس فعل کا نتیجہ حرام ہو وہ فعل بھی حرام ہے۔ پس اس کا حرام ہونا ایسا ہی ہے جیسے بری خواہش کے ساتھ اجنبی عورت کو دیکھنا یا اسے ہاتھ لگانا یا اس کے ساتھ تخلیہ کرنا حرام ہے (کہ اس سے بھی نوبت فعل حرام کے ارتکاب تک پہنچ جاتی ہے)۔

بدکاری شرافت نسبی کو بیکار بنا دیتی ہے

واضح ہو کہ شریعت اسلامیہ نے جہاں حد زنا کا حکم دیا ہے وہاں اس امر کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے کہ اس کو مسلمانوں کی ایک جماعت کے روبرو نافذ کیا جائے۔

قرآن حکیم کی بہت سی آیتوں میں اس گناہ کا ذکر آیا ہے۔ اس کے اسباب و محرکات سے دابستہ ہونے اور اس کے پاس پھٹکنے سے منع فرمایا گیا اور اس فعل بد کی طرف راغب کرنے والے تمام امور کو حرام قرار دیا ہے چنانچہ (زن و مرد کا) باہم اکٹھا ہونا اور ناج گانا وغیرہ گناہ عظیم اور سب سے بڑی معصیت ہے۔ اسے شرک باللہ اور قتل ناحق کے برابر رکھا گیا ہے۔ قرآن کریم میں آیا ہے کہ یہ فعل قیامت کے دن دگنے عذاب اور دائمی جہنم کا موجب ہے۔ اس کا نتیجہ ذلت و خواری ہے۔ اس کے مرتکب کو مذلت و رسوائی سے دو چار ہونا پڑتا ہے اور انسان کو بدترین راستے پر ڈال دیتا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا ”ہانہ یخلع الایمان من قلب الزانی والزانیۃ کما یخلع الرجل قمیصہ من عنقہ“ (یعنی بدکار مرد اور بدکار عورت کے دل سے ایمان اس طرح نکل جاتا ہے جیسے کوئی شخص اپنی گردن سے کرتا اتار دے) شریعت نے شادی

شدہ بدکار کو پتھر اڑ کر کے مار ڈالنے کی سزا دی ہے جو شرعی سزاؤں میں سب سے زیادہ بری اور ہولناک سزا ہے۔

الغرض اسلام ان تمام باتوں کے علاوہ شرف انسانیت کو داغدار اور تباہ ہونے سے بچانے اور محفوظ رکھنے کے لیے ہر ممکن طریقے کو کام میں لانا چاہتا ہے کیونکہ شرافت کی بحالی خاندان کے اطمینان کا موجب ہوتی ہے اور اس سے نیک اور پائدار نسل، ذی شرف اور صاحب فضل افراد، بہادر اور قوی خاندان بنتے ہیں اور انسانیت کے فروغ اور اس کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ادنیٰ نسل اور انتشار یافتہ کنبہ سے شرفا کی قوم اور اچھا خاندان معرض وجود میں نہیں آ سکتا۔ صالح معاشرہ کی عمارت اس صورت میں اٹھائی جاسکتی ہے جب کہ اسے مستحکم اور پائدار اینٹوں سے تیار کیا جائے۔ ایسا معاشرہ جس میں بدکاری عام ہو اور علانیہ معصیت اور بری باتیں پائی جاتی ہوں وہ معاشرہ مادی اور اخلاقی حیثیت سے بہت جلد بربادی سے دوچار ہو جائے گا اور قدرتی طور پر ان میں ایسی تباہی پھیلے گی جیسے گھاس پھوس میں آگ پھیلتی ہے اور اس میں ناگوار خصلتیں اس طرح گھر کر لیں گی جیسے لکڑی میں دیمک کرتی ہے۔ پھر اہل معاشرہ ایک تباہ شدہ جماعت کے ایسے افراد بن کر رہ جائیں گے جن میں نہ باہمی تعاون ہو گا نہ یگانگت و محبت۔ باہمی میل جول ختم ہو جائے گا کیونکہ وہ قرابت داری کی وابستگی اور برادرانہ خونی رشتہ سے محروم ہیں۔ نتیجہً ان میں نفرت، عداوت اور مخالفت جڑ پکڑ لے گی۔ معاشرہ کا رعب داب جاتا رہے گا اور اس کی بزرگی خاک میں مل جائے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے ”لا تزال امتی بخیر ما لم یفش فیہم ولد الزنا، فاذا فشا فیہم ولد الزنا اوشک ان یعمہم اللہ بعقابہ“ (یعنی میری امت کی خیریت اسی وقت تک ہے کہ اس میں ناجائز اولاد نہیں پھیلتی اگر ایسے بچوں کی کثرت ہو جائے تو بہت جلد ان سب پر اللہ تعالیٰ کا عذاب پڑے گا)۔ پس بدکاری ان اسباب میں سے ہے جو قوموں کے ستونوں کو ہلا دیتی اور بنیاد شرف کو ڈھا دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ اپنے حسب و نسب پر ناز فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے آباء و اجداد کو اس عیب سے محفوظ رکھا۔ حضور نے ارشاد فرمایا ہے کہ ”ولدت من نکاح، ولم اولد من سفاح“ (یعنی میں رشتہ ازدواج سے پیدا ہوا ہوں گناہ سے نہیں)۔

ناجائز اولاد سے نہ کبھی وطن کو فیض پہنچ سکتا ہے نہ اس کے خاندان کو۔

حضرت خنساء رضی اللہ عنہا اپنے چاروں فرزندوں کو جو جنگ قادسیہ میں شریک جہاد تھے، ثابت قدمی، بہادری اور حملہ کی تلقین کرتی ہوئی فرماتی ہیں ”ای بنی انکم اسلمتم طائعین، وهاجرتم مختارین، والذی لا الہ الا هو انکم لبئس رجل واحد، کما انکم بنو امراة واحدة، ما خنت اباکم ولا فضحت خالکم ولا هجنت حسبکم ولا غیرت نسبکم“ (یعنی میرے بیٹو تم نے اپنی خوشی سے اسلام قبول کیا اور اپنے ارادہ سے ہجرت کی میں اس ذات کی قسم کھاتی ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ تم ایک ہی باپ کے بیٹے ہو اور ایک ہی ماں کی اولاد ہو جس نے تمہارے باپ کی چوری نہیں کی۔ نہ تمہارے ماموں کو رسوا کیا اور نہ تمہارے خاندن کو بیٹہ لگایا اور نہ تمہاری نسل کو

تبدیل کیا ہے)۔ حضرت خنساءؓ نے اس امر کی اہمیت کے پیش نظر محاربہ کے وقت یہ بیان فرمایا کہ وہ چاروں بیٹے ایک پاک خاتون کے لطن اور پاک نسل سے ہیں اور شریف خاندان کے فرزند اور پاکدامن اور بے داغ ماں باپ کی اولاد ہیں۔
”محسن“ کی تعریف (یعنی شادی شدہ ہونے کا مطلب)

ائمہ فقہ کا اس پر اتفاق ہے کہ (مسائل حد میں) شادی شدہ ہونے کا مصداق وہ ہے جس میں یہ پانچ شرطیں پائی جائیں۔

۱۔ آزاد ہونا (غلام نہ ہونا)

۲۔ بالغ ہونا

۳۔ عقل کا برجا ہونا (جنون زدہ نہ ہو)

۴۔ اسی طرح کی پاکدامن عورت کے ساتھ اس کی شادی ہوئی ہو۔

۵۔ اور یہ کہ اپنی بیوی کے ساتھ بطریق مباح اس نے مباشرت کر لی ہو اور دونوں پاک باز ہوں۔

پس غلام (برودہ مملوک) کو یا نابالغ (لڑکے) یا جنون زدہ کو اور اسے جس کی شادی جائز طریقے سے نہ ہوئی (اس کی تصریح پہلے ہو چکی ہے) بدکاری کی سزا (حد زنا) نہیں دی جائے گی۔ نیز اگر کسی شخص نے اپنی بیوی سے غیر فطری طور پر مباشرت کی یا مملوکہ (لونڈی) سے مباشرت کی تو وہ شخص ’شادی شدہ‘ کی تعریف میں نہیں آئے گا۔ اسی طرح اگر نکاح فاسد (نکاح نادرست) تھا۔ مثلاً ولی کی عدم موجودگی میں یا گواہوں کے بغیر شادی کر لی اور اسی بناء پر مباشرت بھی ہوگی تو اسے محسن (شادی شدہ) قرار نہیں دیا جائے گا۔ نیز کسی غلام (مملوک) نے بیوی سے مباشرت کی اور بعد میں آزاد ہو گیا یا نابالغی کی حالت میں مباشرت کی اور بعد میں بالغ ہو گیا یا جنون زدہ تھا اور (مباشرت کے بعد) کسی وقت جنون جاتا رہا تو وہ بھی محسن شمار نہ ہوگا۔

اس میں باقاعدہ نکاح ہونے اور مباشرت صحیحہ کی جو شرط ہے وہ اس لیے ہے کہ ایسا شخص ہی چونکہ (صحیح طور پر) اپنی جنسی خواہش کو پورا کر لیتا ہے لہذا وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ فعل حرام کے ارتکاب سے رک جائے اور اس میں کامل طور پر مباشرت کا اعتبار اس لیے کیا گیا ہے کہ مباشرت کی تکمیل اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ یہ مناسب حالات میں ہوئی ہو یعنی باقاعدہ نکاح ہوا ہو۔ لہذا نفاذ حد کے لیے ضروری ہے کہ زنا کے مرتکب نے کامل طور پر مباشرت کر کے ’شادی شدہ‘ ہونے کی حیثیت حاصل کر لی ہو۔ پس ایسے مرتکب زنا کو سنگسار نہ کیا جائے گا جس پر محسن کامل (یعنی باقاعدہ شادی شدہ ہونے) کی تعریف صادق نہیں آتی بلکہ اس نے ناقص حالت میں مباشرت کی ہے اور کامل حالت میں مرتکب زنا ہوا۔ (مثلاً کوئی نابالغ اپنی بیوی سے مباشرت کرنے تو چونکہ وہ محسن کی تعریف میں نہیں آتا اس لیے اگر بالغ ہو کر مرتکب زنا ہو تو اسے سنگسار نہیں کیا جائے گا)۔ اس سزا کا مستوجب ہونے کے لئے ضروری ہے کہ دونوں حیثیتوں سے کامل ہو (یعنی پورے طور پر محسن ہو اور پورے طور پر ارتکاب جرم کیا ہو)۔

واضح ہو کہ مرتکب کو شادی شدہ قرار دیے جانے کے لیے مسلمان ہونے کے شرط کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔

حنفیہ اور مالکیہ کہتے ہیں 'محسن' قرار پانے کے لیے مسلمان ہونا شرط ہے۔ کیونکہ محسن ہونا ایک نیک خصلت ہے اور یہ فضیلت (نیکی) بغیر مسلمان ہوئے نہیں ہو سکتی۔ نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے "من اشرك بالله فليس بمحسن" (یعنی جو مشرک ہو وہ محسن نہیں قرار پاسکتا) اور اس لیے بھی کہ حد کا نفاذ گناہ سے پاک کر دیتا ہے اور شرک کو تو جہنم کی آگ ہی پاک کر سکتی ہے العیاذ باللہ۔

شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ مسلمان ہونا "محسن" قرار دیے جانے کے لیے شرط نہیں ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایک زانی یہودی مرد اور ایک زانیہ یہودی عورت کا معاملہ پیش ہوا حضور نے دونوں کو سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ اسے حضرت مالک نے 'نافع' سے اور انھوں نے ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔

واضح ہو کہ اس امر میں فقہاء کا اتفاق ہے کہ جس عورت سے زنا کیا گیا ہو اسے بھی محسن قرار دیے جانے کے لیے وہی شرائط ہیں جو مرد کے لیے ہیں۔ البتہ اس صورت میں جب کہ فریقین میں سے ایک میں 'محسن' ہونے کی تمام شرائط موجود ہوں اور دوسرے فریق میں نہ ہوں تو (اس کے فیصلہ کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے) حنفیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں دونوں میں سے کسی کو بھی "محسن" قرار نہ دیا جائے گا۔ لہذا کسی کو سنگسار نہ کیا جائے۔ شافعیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ فریقین میں سے جس میں 'محسن' ہونے کی تمام شرطیں پائی جائیں اسے سنگسار کیا جائے اور جو یہ شرط پوری نہ کرتا ہو اسے سنگسار نہیں کیا جائے گا۔ پس اگر ایسے دو اشخاص نے بدکاری کی تو جو 'محسن' نہیں ہے اسے توڑے مارے جائیں اور جو 'محسن' ہے اسے سنگسار کیا جائے۔ اس کا ثبوت وہ روایت ہے جسے محدثین نے ابو ہریرہ اور زید بن خالد جہنی سے اخراج فرمایا ہے۔ یہ دونوں اصحاب کہتے ہیں ایک اعرابی نبی ﷺ کی خدمت میں آیا اور اس نے کہا کہ یا رسول اللہ آپ کو قسم ہے کہ آپ میرا معاملہ کتاب اللہ کے مطابق طے کر دیں۔ فریق ثانی نے جو اس شخص سے زیادہ قانون دان تھا کہ "ہاں حضور ہمارا فیصلہ کتاب اللہ کی رو سے کر دیجئے اور مجھے عرض کرنے کی اجازت دیجئے" آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہو اس نے کہا کہ میرا بیٹا، اس شخص کے ہاں کام کرتا تھا۔ اس نے اس کی بیوی کے ساتھ بد فعلی کی۔ مجھے بتایا گیا کہ میرے بیٹے کو سنگسار کیا جائے گا" اس پر میں نے ایک سو بکری اور ایک جاریہ اسے بطور تاوان دیا پھر میں نے واقف کاروں سے اس بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ میرے بیٹے کو ایک سوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی کی سزا ہونی چاہیے اور اس شخص کی بیوی کو سنگسار کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "والذی نفسی بیدہ لا قضین بینکما بکتاب اللہ، اما الولیۃ والغنم فرد علیک، وعلی ابنک جلد مائۃ و تغریب عام واغدیٰ انیس۔ تصغیر انیس۔ الی امرأۃ هذا فان اعترفت فارجمها فغدا علیها انیس فاعترفت

محسن (شادی شدہ) زانی کی سزا کا بیان

واضح ہو کہ از روئے شرع زنا کی سزا، شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کے لیے جدا جدا ہے۔ اول الذکر کی سزا زیادہ سخت ہے۔ کیونکہ وہ شخص کما حقہ جانتا ہے کہ بیوی بنانے کے کیا معنی ہیں اور آبرو پر ڈاکہ ڈالنا کس قدر سنگین جرم ہے۔ لہذا اس کی سزا موت ہے^(۱)

فامر النبی ﷺ بھا فرجمت“ (یعنی میں اس ذات کی قسم کھاتا ہوں جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ میں تمہارا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کروں گا۔ وہ لڑکی اور بکریاں تو تمہیں واپس مل جائیں گی البتہ تمہارے بیٹے کو سوڈڑے اور ایک سال کے لئے جلا وطنی کی سزا ہوگی اور اے انیس (یہ لفظ انس کی تصغیر ہے) کل اس شخص کی بیوی کے پاس جاؤ اگر وہ اس جرم کا اقبال کرے تو اسے سنگسار کر دو چنانچہ انیس، اگلے روز اس عورت کے پاس گئے۔ اس نے اقرار جرم کر لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے سنگسار کیے جانے کا حکم دیا اور وہ سنگسار کر دی گئی۔

محسن (شادی شدہ) پر نفاذ حد کا بیان

۱۔ ائمہ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ جس شخص میں شادی شدہ ہونے کی تمام شرطیں پائی جائیں اور وہ ایسی عورت سے بد فعلی کرے جس میں شادی شدہ ہونے کی تمام شرطیں ہوں کہ وہ عورت آزاد، بالغ، عاقل اور باقاعدہ نکاح کے بعد مباشرت شدہ اور مسلمان ہو تو یہ دونوں بدکاری کے مجرم اور محسن ہیں لہذا دونوں کو سنگسار کیا جانا واجب ہے۔ یہاں تک کہ وہ مرجائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ”الشیخ والشیخۃ اذا زنيا فارجموہما البتۃ نکالا من اللہ متفق علیہ“ (یعنی بڑی عمر کا مرد اور بڑی عمر کی عورت اگر زنا کریں تو بہر حال لازم ہے کہ عذاب الہی کے طور پر ان کو سنگسار کیا جائے)۔ نبی ﷺ نے فرمایا ”لا یحل دم امری مسلم الا باحدی ثلاث: الثیب الزانی والنفس بالنفس، والتارک لدینہ المفارق للجماعۃ“ (یعنی کسی مسلمان کا خون حلال نہیں بجز ان تین صورتوں کے: کوئی شادی شدہ شخص بدکاری کرے یا جان کے بدلے اس کی جان لی جائے یا اپنے دین (اسلام) کو چھوڑ کر ملت سے الگ ہو جائے)۔ یہ حدیث صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت ابو ہریرہؓ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

آنحضرت ﷺ کی ایک اور حدیث ہے جس میں ارشاد ہے: ”ان الرجم حق فی کتاب اللہ علی من زنا اذا احصن من الرجال والنساء اذا قامت البینۃ، او کان الحمل، او الاعتراف“ متفق علیہ (یعنی سنگساری کی سزا اس شخص کے لیے کتاب اللہ کی رو سے فرض الہی ہے جس نے شادی شدہ ہونے کے باوجود بدکاری کی ہو۔ اس میں خواہ کوئی مرد ہو یا عورت۔ بشرطیکہ گواہوں سے یہ جرم ثابت ہو جائے یا حمل ہو گیا ہو یا مجرم اپنے جرم کا اقرار کر لے)۔ آنحضرت ﷺ نے ماعز اور غامدیہ وغیرہ کو سنگساری کی سزا دی اور خلفائے راشدین نے بالاتفاق اس سزا کو جاری فرمایا اور کسی فرد واحد کو اس سے انکار نہ تھا۔ پس رجم (سنگساری کی سزا) حدیث متواترہ اور رسول اللہ ﷺ کے عمل

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس جرم کی پاداش میں جو سزا رکھی گئی ہے وہ عین مناسب ہے، کیونکہ آبروریزی کا یہ مذموم طریقہ، قتل کر دینے کے برابر ہے بلکہ بسا اوقات غیرت مند انسان عزت کی خاطر بدکاری کو گوارا کرنے کی بجائے ارتکاب قتل کو ترجیح دیتا ہے۔ خواہ وہ قتل جائز ہو یا ناجائز۔^(۱)

سے ثابت ہے اور بقول ان اصحاب کے کتاب اللہ سے بھی ثابت ہے جو کہتے ہیں کہ سنگساری والی حدیث قرآن حکیم کی ایک آیت تھی جو قرآن سے منسوخ ہو گئی لیکن اس کا حکم باقی رکھا گیا۔

سنگسار کرنے کا طریقہ

۱۔ واضح ہو کہ جب بدکار مرد یا عورت کو سنگسار کرنا واجب ہو جائے خواہ اقرار جرم سے یا گواہوں کی شہادت اور ثبوت بہم پہنچ جانے سے ہو تو مجرم کو اوسط درجہ کے پتھروں سے مارا جائے۔ ہلکی کنکریوں سے نہیں تاکہ اسے زیادہ اذیت نہ ہو اور دھاردار پتھروں سے بھی یکدم ہلاک نہ کر دینا چاہیے تاکہ اس سزا کا جو مقصد عبرتناک ہوا ہے وہ فوت نہ ہو بلکہ مٹھی کے بھر پور پتھروں سے مارا جائے لیکن چہرہ پر مارنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے چہرہ پر مارنے سے اور دوسم کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (دوسم گرم لوہے سے داغ دینے کو کہتے ہیں)۔ آنحضرت ﷺ نے جب ”غامدیہ“ کو سنگسار کرنے کا حکم دیا تو پہلے خود چنے کے برابر کنکریاں لے کر اسے ماریں اور پھر لوگوں کو فرمایا ”ارموھا واتقوا الوجه“ (یعنی اسے سنگسار کرو لیکن چہرے کو بچا کر)۔

مجرم اگر مرد ہے تو ”حد مارنے کے وقت اسے باندھنا نہ جائے اور نہ قید کیا جائے نہ اسے گڑھا کھود کر اس میں رکھا جائے۔ ہاں عورت کے لیے جائز ہے کہ سینے تک گڑھا کھود کر اس میں رکھا جائے اور پھر سنگسار کیا جائے تاکہ اس کی بے پردگی نہ ہو اور چاہیے کہ سنگساری کے وقت اس کے لباس کو اس کے جسم پر لپیٹ دیا جائے تاکہ اس کا جسم نظر نہ آئے کیونکہ عورت پردہ کی شے ہے اور سزایاب ہونے کے وقت بھی اس کا بے پردہ ہونا حرام ہے۔ عہد نبوی میں صحابہ رضی اللہ عنہم اسی طریقہ پر عمل کیا کرتے تھے۔

فقہاء اس پر متفق ہیں کہ بدکاری کے مجرم پر سخت گرمی ہو یا سخت سردی حد نافذ کی جائے اور مریض ہو تب بھی سنگسار کیا جائے۔ کیونکہ بہر حال اسے موت درپیش ہے لہذا اس کی صحت کا انتظار نہ کیا جائے۔ ہاں سزائے تازیانہ کے لیے (مریض مجرم کے) صحتیاب ہونے کا انتظار کرنا چاہیے۔

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ مجرم عورت اگر حاملہ ہو تو اس کا بچے کی پیدائش اور دودھ پلانے کی مدت تک انتظار کیا جائے کہ وہ بچہ کھانے پینے کے قابل ہو جائے۔ آنحضرت ﷺ نے ”غامدیہ“ کی سزا میں ایسا ہی کیا تھا۔ یہ اس لیے بھی ہے کہ حاملہ مجرمہ کو سنگسار کرنا اس کے پیٹ کے بچے کو بے قصور اور ناحق قتل کرنا ہے۔

علماء اس بات پر بھی متفق ہیں کہ اگر مجرم نفاذ حد کے دوران مر جائے تو اسے نہلایا جائے کفن دیا جائے، اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے اور مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ آنحضرت ﷺ نے سزا کے درمیان مرجانے والے کے ساتھ اسی طرح عمل فرمایا۔

غیر شادی شدہ (مرتکب زنا) کی شرعی سزا کا بیان

واضح ہو کہ غیر شادی شدہ (مرتکب زنا) کے لیے (سنگساری کی بجائے) محض سوڈرے کی سزا مقرر کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ بیوی کے بارے میں شادی کی غیر تمندی سے بے بہرہ ہوتا ہے لہذا سزا میں تخفیف کا مستحق ہے۔^(۱)

ذی عقل شخص کا جنون زدہ کے ساتھ ملوث ہونے کا بیان

اگر مسلمان، عاقل و بالغ عورت کسی مجنون مرد کے ساتھ ملوث ہو جائے اور وہ مجنون اس کے ساتھ برا فعل کر لے یا عاقل و بالغ مرد کسی دیوانی عورت سے خراب ہو تو اس کی سزا (حد) کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ جس شخص کی عقل بر جا ہے اس پر (ارتکاب جرم کی صورت میں) 'حد نافذ' کی جائے اور جو پاگل ہے اس کی سزا ساقط ہو جائے گی کیونکہ وہ غیر مکلف ہے (یعنی جنون زدہ پر احکام شرعیہ عائد نہیں ہوتے) اور احکام کا نفاذ بہر حال عقل والے پر ہی ہوتا ہے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر عاقل و بالغ انسان نابالغ یا سمجھ لڑکی سے یا کسی پاگل عورت سے جو عقل نہ رکھتی ہو برا فعل کرے تو اس پر حد نافذ ہوگی۔ لیکن یہ حکم صرف مردوں کے لیے خاص ہے۔ لہذا اگر عاقل و بالغ عورت کسی نابالغ لڑکے کے ساتھ گناہ میں آلودہ ہو جائے یا وہ اپنا نفس کسی پاگل شخص کے حوالے کر دے (اور وہ بدکاری کے مرتکب ہو جائیں) تو دونوں میں سے کسی پر بھی سزائے شرعی لاگو نہ ہوگی کیونکہ مرد پر تو حد اس صورت میں نافذ ہوتی ہے جب کہ مرتکب اسے جرم سمجھتا ہو۔ اور عورت پر حد (جرم کی سزا) اس صورت میں نافذ ہوگی جب کہ وہ اپنے نفس پر دوسرے کو اختیار دے کر قطعی حرام فعل کا ارتکاب کرنے کے جرم میں ماخوذ ہو اور یہ صورت نابالغ لڑکے کے ارتکاب پر عائد نہیں ہوتی کیونکہ وہ غیر مکلف ہے (جس پر احکام شرعیہ عائد ہی نہیں ہوتے) لہذا نابالغ (بچہ) کا اس کے ساتھ ملوث ہونا قطعی طور پر گناہ نہ ہوا۔ لہذا عورت پر نفاذ حد واجب نہ رہا۔ البتہ عاقل بالغ مرد چونکہ حرام کو اچھی طرح جانتا ہے لہذا اس پر حد لاگو ہوگی۔

امام ابو یوسف، امام محمد اور امام زفر فرماتے ہیں کہ اگر کوئی عاقل و بالغ عورت ایک دیوانہ شخص کو یا نابالغ لڑکے کو اپنے نفس پر قابو پانے کا موقع دے اور اس کے ساتھ بد فعلی کی مرتکب ہو جائے تو اس پر حد کا نفاذ واجب ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ عاقل اور مکلف ہے (یعنی اس پر احکام شرعیہ عائد ہوتے ہیں) اور اس کے افعال کی بابت اس سے باز پرس ہوگی۔ اسی قول کو ترجیح دی گئی ہے۔

غیر شادی شدہ (مرتکب زنا) کو کوڑوں کی سزا

(۱) فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر گناہ کے مرتکب، کنوارے، آزاد، عاقل و بالغ مسلمان ہوں تو ہر ایک کو سو سو ڈڑے کی سزا دی جائے یہ حکم کتاب اللہ سے ثابت ہے "الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منهما مائة جلدة ولا تأخذکم بہما رافۃ فی دین اللہ ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الآخر لیشہد عذابہما طائفة من

المؤمنین“ (یعنی بدکار مرد اور بدکار عورت دونوں کو سو سو درے کی مار دو۔ اور اگر اللہ اور آخرت پر ایمان ہے تو اس قانون الہی کی بجا آوری میں ان سے نرمی کا برتاؤ نہ کرو اور چاہیے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت اس سزا کا مشاہدہ کرے)۔ مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیت غیر شادی شدہ کے لیے مخصوص ہے احادیث میں شادی شدہ مرتکب کے لئے سنگساری کا حکم ہے۔

سزائے دُڑہ زنی کی کیفیت

فقہاء کہتے ہیں کہ عام سزاؤں کی ضربات بہ نسبت سزائے بدکاری کی ضربات کے زیادہ سخت ہیں اور بدکاری کی سزا شراب پینے کی سزا سے زیادہ سخت ہوگی۔ دُڑہ زنی نہ تو نئے تازیانے سے ہونی چاہیے کہ تکلیف (حد مناسب سے) زیادہ نہ ہو اور نہ پرانے تازیانے کو تر کر کے مارا جائے، تاکہ چوٹ المناک نہ ہو جائے۔ بلکہ اوسط درجہ کے درے سے مارنا چاہیے جو چمڑے کا بنا ہوا ہو۔

کہتے ہیں کہ سزایاب کو گھسیٹنا اور باندھنا بھی نہیں چاہیے اور جلا دو چاہیے کہ ضربات میں سختی سے کام نہ لے۔ سزا پانے والے کے تمام کپڑے نہ اتارے جائیں بلکہ اس کے بدن پر کرتارہنے دیا جائے کہ وہ اپنا ستر ڈھانک لے۔ ہاں فر اور پوستین کا لباس اتار دیا جائے اور جسم کے مختلف حصوں پر ضربات لگائی جائیں تاکہ جسم کا ہر عضو مار کا مزہ چکھ لے۔ کیونکہ گناہ کی لذت بھی اس کے تمام اعضاء نے اٹھائی ہے۔ یہ حکم اس لیے بھی ہے کہ ایک ہی جگہ پر ضربات لگانے سے بسا اوقات جان جاتی رہتی ہے، حالانکہ وہ شخص موت کا سزاوار نہیں ہے۔ لہذا جسم کے مختلف حصوں پر مارنا چاہیے تاکہ سزایاب کی جان نہ جاتی رہے۔ جس سے آنحضرت ﷺ نے منع فرمایا ہے ”لا یحل دم امرئ مسلم الا باحدى ثلاث، زنا بعد احصان، وارتداد بعد اسلام، وقتل نفس بغیر نفس“ (یعنی کسی مسلمان کا خون ان تین صورتوں کے علاوہ حلال نہیں شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کرنا، مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہو جانا، ناحق قتل کرنا) یہ حدیث ترمذی نے سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ جان لیوا ضرب سے پرہیز کرنا چاہیے۔ مثلاً شہ رگ کے گڑھے یا شرمگاہ پر ضرب لگانا۔ اور چہرہ پر بھی نہ مارنا چاہیے کیونکہ وہ حسن کا مرکز ہے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”اذا ضرب احدکم فلیتق الوجه“ (یعنی کسی کو مارو تو چہرے کو بچا کر مارو) اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے جلا دو کو سزا دیتے وقت حکم دیا تھا ”ایاک ان تضرب الراس والفرج“ (یعنی خبردار سر اور شرمگاہ پر نہ مارنا)۔

بعض اصحاب کہتے ہیں کہ سر پر مارنا جائز ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے جلا دو کو حکم دیا تھا ”دق الراس فان فیہ شیطان“ (یعنی سر پر مار کیونکہ اس میں شیطان سما یا ہوا ہے)۔

واضح ہو کہ دُڑہ زنی کی سزا مرد کو کھڑا کر کے دینی چاہیے اور عورت کو بٹھا کر پردہ کے ساتھ مارنا چاہیے۔ اس کے کپڑے نہ اتارے جائیں کیونکہ عورت پردہ کی چیز ہے اور اس کے ستر کا بے پردہ ہونا حرام ہے۔ البتہ ستر والا لباس (روئی وغیرہ بھرا ہوا) اور پوستین اتار دینے چاہئیں۔ تاکہ اس کی جلد کو اذیت پہنچے اور سزا دینے کا جو مقصد ہے وہ پورا ہو، یعنی وہ تکلیف محسوس کرے۔ گناہ چھوڑ دے اور (ہمیشہ کے لیے) باز آجائے۔ عورت کو بٹھا کر سزا دینے کا حکم اس بناء پر ہے کہ

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا مرد کو کھڑا کر کے اور عورت کو بٹھا کر سزائے ضرب دی جائے۔ یہ اس لئے بھی کہ مرد کی حالت اعلان و ظہور کی متقاضی ہے تاکہ اسے دیکھ کر عبرت حاصل کی جائے اور عورت کے حال کا تقاضا یہ ہے کہ اسے چھپایا جائے اور پردہ میں رکھا جائے۔

مریض کو ڈرے لگانے کا بیان

اگر سزایاب شخص سخت نحیف و ناتوان ہو یا کسی شدید مرض میں مبتلا ہو اور آرام ہونے کی توقع نہ ہو۔ مثلاً سل یا جذام (کوڑھ) کا مریض ہے یا سرطان وغیرہ کا خطرناک اور ہلاکت انجام مرض لاحق ہے اور درہ زنی کا سزاوار مجرم ہے تو اسے درخت خرما کے 'مکتال' سے سزا دی جائے۔ مکتال درخت کی شاخدار چھڑ کو کہتے ہیں۔ اس میں پچاس سے سو شاخیں ہوتی ہیں۔ اگر وہ چھڑ سو شاخ والی ہے تو صرف ایک بار اس سے مارا جائے اور پچاس شاخیں ہوں تو دو بار اس طرح ضرب لگائیں کہ اس چھڑ کی تمام شاخیں اس کے پورے بدن پر لگیں۔ یا مجرم کو مروڑی دیے ہوئے کپڑے سے مارا جائے۔ یا پھر جوتی سے پیٹا جائے۔ جیسا کہ عہد نبوی ﷺ میں ہوا۔ بخاری اور ابوداؤد رحمہما اللہ نے ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے شراب پی رکھی تھی۔ حضور نے حکم دیا کہ اسے مارو (حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ) ہم میں سے کسی نے ہاتھ سے، کسی نے جوتے سے اور کسی نے کپڑے سے اسے مارا پھر جب وہ (پٹ پٹا کر) جانے لگا تو حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ "خدا تجھے رسوا کرے" حضور نے فرمایا "لا تقولوا ہکذا، لا تعینوا علیہ الشیطان" (یعنی ایسا مت کہو شیطان کی اس پر مدد نہ کرو)۔

غرض اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی شے سے جو تکلیف رساں ہو حد مارنا جائز ہے۔ پس شدید مریض کی سزا میں اس حدیث سے رہنمائی حاصل ہو سکتی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مریض مجرم کو سہولت حاصل ہو۔ مجرم صحت مند ہو تو ان چیزوں کا استعمال جائز نہیں ہے۔ کیونکہ سزا دینے کا مقصد مجرم کو تکلیف پہنچانا ہے تاکہ آئندہ کے لیے گناہ میں پڑنے سے باز رہے۔ اس لیے مجرم کو چمڑے کے کوڑے سے مارنا مقرر ہوا۔

فقہاء کا اس بارے اتفاق ہے کہ زناء کے مجرم کو سخت گرمی یا شدید سردی میں کوڑے کی سزا دینا جائز نہیں ہے بلکہ فضا کے معتدل ہو جانے تک انتظار کرنا واجب ہے، ائمہ فقہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر غیر شادی شدہ مجرم ایسے مرض میں مبتلا ہو جس سے آرام پا جانے کی امید ہو اسے سردست حد نہ لگائی جائے بلکہ صحت یاب ہونے تک سزا کو التواء میں رکھا جائے تاکہ مرض کی حالت میں چوٹ کھانے سے ہلاک نہ ہو جائے۔

حالت نفاس اور حمل میں نفاذ حد کا بیان

فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ حالت حمل میں مجرمہ کو حد نہ ماری جائے بلکہ اسے ملتوی رکھا جائے یہاں تک کہ بچہ پیدا ہو جائے تاکہ مبادا وہ بچہ اور عورت درہ کی چوٹ ولادت کی تکلیف اور مرض نفاس کے یک جا ہو جانے کے باعث ہلاک ہو جائیں۔

امام علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا "ایہا الناس اقیموا

علی ارقائکم الحد، من احصن منهم ومن لم یحصن فان امة لرسول اللہ ﷺ زنت فامرني ان اجلد
ها فاذا هي حديشة عهد بالنفاس فخشيت ان جلدها قتلها، فذكرت ذلك للنبي ﷺ فقال :
احسنت“ (یعنی لو گوا اپنے مملوک لونڈی غلام کو) جو مرتکب جرم ہوں) حد مارو خواہ وہ شادی شدہ ہوں یا شادی شدہ نہ ہوں
چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے ایک کنیز کو جس نے بدکاری کی تھی حد مارنے کا حکم دیا۔ اتفاق سے وہ عورت اس وقت حالت
نفاس میں تھی۔ میں نفاذ حد سے ڈر گیا (حد مارنے سے باز رہا) کہ اگر حد ماری تو وہ مر جائے گی۔ پھر اس بات کا ذکر میں
نے نبی ﷺ سے کیا تو فرمایا کہ تم نے اچھا کیا۔

بخاری کے سوا پانچوں محدثین نے، عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ”قبیلہ جہینہ“ کی ایک
عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی، اسے ناجائز حمل تھا اس نے کہا کہ یا رسول اللہ میں ’حد‘ کی سزاوار ہوں، مجھ پر حد نافذ
فرمائیے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کے سر پرست کو طلب فرمایا اور حکم دیا کہ اس عورت کو اچھی طرح رکھو اور جب بچے سے
فراغت ہو جائے تو اسے میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ اس شخص نے ایسا ہی کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ اس کے کپڑوں
میں جا بجا ٹانگے لگا دو (تاکہ کپڑا بدن سے ہٹ نہ جائے) اس کے بعد سنگسار کیے جانے کا حکم دیا اور وہ سنگسار کر دی گئی اس
کے بعد آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی۔ حضرت عمر نے اس وقت کہا کہ یا رسول اللہ آپ اس عورت کی نماز جنازہ پڑھیں
گے؟ اس نے تو بدکاری کا ارتکاب کیا ہے۔ فرمایا کہ اس نے تو ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اس کی توبہ کو ستر اہل مدینہ میں تقسیم کر دیا
جائے تو (یہ ایک توبہ) سب کی مغفرت کے لیے کافی ہوگی۔ اس نے اللہ کی خاطر اپنی جان قربان کر دی کیا تو نے اس سے
بہتر توبہ کہیں پائی ہے؟

اس حدیث سے یہ نتیجہ نکلا کہ حد کا نفاذ غلام اور لونڈی پر بھی ہوتا ہے خواہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ۔ اسی
طرح حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ نفاس والی عورت کی سزا اس وقت تک التوا میں ڈالی جاسکتی ہے کہ وہ صحتیاب
ہو جائے۔ ایام نفاس ختم ہو جائیں اور بچے کو دودھ پلا چکے یہاں تک کہ وہ بچہ ماں کے دودھ سے بے نیاز ہو جائے۔ یہ
احکام پیٹ کے بچہ پر رحم کے پیش نظر ہیں اور منجملہ ان سہولتوں کے ہیں جو دین اسلام (کے احکام) میں پیش نظر ہوتی ہیں۔
دُرّہ زنی اور سنگساری دونوں سزاؤں کا اکٹھا نافذ کرنا

مالکیہ، شافعیہ اور حنفیہ کہتے ہیں کہ دونوں سزاؤں یعنی دُرّہ زنی اور سنگساری کو (شادی شدہ مجرم کے حق میں)
اکٹھا کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ سنگساری کی سزا درہ زنی کی سزا کو منسوخ کر دیتی ہے۔ چھوٹی سزا خود ہی بڑی سزا میں مدغم ہو
گئی۔ اس سے یہ فائدہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ مجرم گناہ کرنا چھوڑ دے گا یا اس سے باز آ جائے گا۔ کیونکہ (سنگساری کے بعد)
مجرم زندہ ہی نہیں رہے گا۔

حنابلہ کہتے ہیں کہ شادی شدہ مرتکب زنا کو ایک روز دُرّہ لگائے جائیں اور اگلے روز رجم کر دیا جائے۔ جیسا
کہ آنحضرت ﷺ سے مروی ہے کہ حضور نے ایک شخص کو جمعرات کے دن دُرّہ لگائے اور جمعہ کے دن سنگسار کرایا۔ لیکن
ترجیح اسی قول کو حاصل ہے جس پر جمہور کا عمل ہے آنحضرت ﷺ نے ماعز اور قبیلہ جہینہ کی ایک عورت کو (صرف) سنگسار
کیا (درے نہیں مارے) اور کسی ایک صحابی سے بھی یہ ثابت نہیں ہے کہ انھوں نے سنگسار کرنے سے پہلے کسی کو درہ مارنے
کی سزا دی ہو۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سنت سے یہ ثابت ہے کہ درہ زنی کی سزا کنوارے کے لیے اور شادی شدہ کی سزا سنگساری ہے (درہ زنی کی سزا شادی شدہ مرتکب زنا پر عائد نہ ہوگی) ان کے نزدیک تمام آئمہ نے سنگساری کے ساتھ دُرہ زنی کی سزا نہیں دی۔

دُرہ زنی کے ساتھ جلا وطنی کی سزا کا بیان

دونوں سزاؤں کے جمع کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے:

مالکیہ کہتے ہیں کہ کنوارا آدمی مرتکب زنا ہو تو واجب ہے کہ پہلے اسے درہ زنی کی سزا دی جائے اور پھر اسے وطن سے دور مسافت قصر کے فاصلہ پر سال بھر کے لیے جلا وطن کر دیا جائے۔ کیونکہ وہ بدکاری کے عیب میں ملوث ہو چکا ہے۔ یہ (جلا وطنی) اس کے ساتھ مہربانی ہے، کیونکہ جہاں اس نے اس گناہ کا ارتکاب کیا ہے وہاں کے اہل شہر اور اس کے پڑوسی جب اسے دیکھیں گے تو اسے اذیت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا اور مسجدوں اور تقریبات میں اس کی تحقیر ہوگی اور ذلیل کرنے والے گنہگار ہوں گے۔ لہذا اس کا جلا وطن ہونا خود اس کے لیے اور عوام کے لیے بہتر ہے۔

رہا عورت کا معاملہ جو بدکاری کی مرتکب ہوئی اسے شہر سے باہر نہیں نکالنا چاہیے تاکہ برائی کی شہرت نہ ہو اور خرابی نہ پھیلے۔ اور اس لیے بھی کہ عورت پردہ کی چیز ہے اور اسے جلا وطن کرنا اس (کی نسوانیت) کو ختم کر دینے کے برابر ہے۔ پھر شارع نے عورت کو بغیر محرم کے سفر کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ایسی عورت کے لیے واجب یہ ہے کہ وہ اپنے گھر کے اندر ہی بیٹھی رہے اور مجمع سے دور یعنی خانہ نشین رہے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ درہ زنی اور جلا وطنی دونوں سزاؤں کا جمع کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ سورہ نور کی آیت میں جلا وطنی کا ذکر نہیں ہے لہذا ایسا کرنا قرآن حکیم پر اضافہ ہے۔ جلا وطنی خبر واحد کے ساتھ ثابت ہے لہذا شرعی تعزیر کے طور پر اسے عمل میں نہیں لایا جائے گا اور اسے سزا کا حصہ قرار نہیں دیا جائے گا۔ بلکہ اسے عام سزا کے طور پر امام کی رائے پر منحصر رکھا جائے گا۔ اگر حاکم کی رائے میں جلا وطنی مفید ہو تو اسے جلا وطن کر دیا جائے۔ اگر اس میں فائدہ نظر نہ آئے تو وطن سے نہ نکالے۔

اندریں باب امام ابو حنیفہ کا یہ نظریہ مشہور ہے کہ ”کفی بالنفسی فتنۃ“ (یعنی جلا وطنی فتنہ انگیزی کے لیے کافی ہے) یعنی صحابہؓ نے جو اس پر عمل کیا وہ انہوں نے اپنی امتیازی رائے کے پیش نظر کیا (کسی شرعی حکم کے تحت نہیں کیا)۔ شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر آزاد، عاقل اور کنوارے اس جرم کے مرتکب ہوں تو ان دونوں کو حد ماری جائے اور (ان کو وطن سے دور) اتنے فاصلہ پر جلا وطن کر دیا جائے جہاں نماز قصر واجب ہو جاتی ہے تاکہ دونوں کو اپنے متعلقین اور وطن سے دور رہنے کی پریشانی لاحق رہے اور وہ آئندہ جرم کرنے سے باز رہیں۔ حضرت ابوبکر، حضرت عمر بن الخطاب، حضرت عثمان بن عفان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے یہی فیصلہ کیا ہے یہاں تک کہ ان میں سے بعض اصحاب نے فرمایا ہے کہ اس مسئلہ میں اجماع ہے۔ کیونکہ حضرت عمر نے شام کی جانب، حضرت عثمان نے مصر کی طرف اور حضرت علی نے بصرہ کی سمت جلا وطن کیا۔ اور رسول اللہ ﷺ سے مروی کہ ”البکر بالبکر جلد مائة وتغريب عام“ (یعنی کنوارا مرد کنواری عورت سے ملوث ہو تو اس کی سزا سو درے اور ایک سال کے لیے جلا وطنی ہے) نیز عسیف کے بارے

بیوی کی آبروریزی کرنے والے کو قتل کر دینے کا بیان

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ بدکاری کی پاداش میں ایک دوسرے کو قتل کر دیتے ہیں۔ اس صورت میں تمام شریعتوں کا قانون یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ کسی مرد کو بد فعلی کرتا ہو ادیکھ لے اور اسے قتل کر دے تو قصاص کے مطالبہ کا حق جاتا رہے گا۔ کیونکہ اس جرم کا مرتکب واجب القتل ہو جاتا ہے۔ (۱)

میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے ”علی ابنک جلد مائة و تغریب عام“ (یعنی تیرے بیٹے کو سو ڈڑے اور ایک سال کے لیے جلا وطنی کی سزا ہے)۔

جلا وطنی کی سزا میں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں تاہم یہ ملحوظ رہے کہ مجرمہ عورت کے ساتھ اس کا کوئی محرم (قریبی رشتہ دار جس سے نکاح حرام ہو) اس کے ساتھ رہے اور جلا وطنی کے دوران اس کے خرچ پر اس کی دیکھ بھال کرے۔

(۱) اس صورت میں جبکہ ایک شخص کسی مرد کو اپنی بیوی کے ساتھ ملوث پائے اور اس کا ارتکاب جرم پایہ ثبوت کو پہنچ جائے اور خاوند اسے قتل کر دے تو آیا اس کی پاداش میں قاتل کو سزائے موت دی جائے یا نہیں؟ اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔

جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ اگر ایک شخص کسی مرد کو اپنی بیوی کے ساتھ مرتکب گناہ پائے تو اس کو قتل کر دینا صحیح نہیں ہے۔ بلکہ اس جرم فاحش کی تحقیق کی جائے۔ بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ”ان سعد بن عبادۃ رضی اللہ عنہ قال : یا رسول اللہ ارایت ان وجدت مع امراتی رجلاً امہلہ حتی آتی باربعة شہداء ؟ فقال رسول اللہ ﷺ نعم“ (یعنی سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے جناب رسالت مآب سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آیا اس بارے میں آپ کی یہ رائے ہے کہ اگر میں کس شخص کو اپنی بیوی کے ساتھ ملوث پاؤں تو اسے چھوڑ دوں جب تک کہ چار گواہ اس (گناہ کے) ثبوت میں نہ پیش کر سکیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہاں) پس اگر کسی نے قتل کر دیا تو اس کے عوض قصاص (جان کا بدلہ جان) ہے بجز اس صورت ہے کہ جبکہ ارتکاب زنا کی شہادت موجود ہو۔ اور مرتکب شادی شدہ تھا۔ یا اس نے (موت سے پہلے) اقبال جرم کر لیا ہو۔ اب اگر اس شخص نے ان دونوں کو یا ان میں سے ایک کو قتل کر دیا اور (ارتکاب جرم) کا ثبوت نہ ہو یا ارتکاب زنا کے گواہ نہ ہوئے اور مجرم نے اقبال جرم بھی نہیں کیا تو تاوان۔ تلافی مافات، قصاص یا خون بہا کا مطالبہ ہوگا۔ کیونکہ ممکن ہے کہ اس شخص نے اس مرد کو کسی بہانے سے بلوایا ہو اور کسی کام کے لیے گھر کے اندر لے گیا اور دل میں کینہ ہو اس لیے اسے قتل کر دیا پھر جھوٹ موٹ یہ کہہ دیا کہ میں نے اس کو اپنی بیوی کی آبروریزی کرتے دیکھا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ وہ شخص کسی نامعلوم وجہ سے اپنی بیوی سے چھٹکارا پانے کے لیے قتل کر دے اور پھر اس پر یہ جھوٹا الزام لگا دے کہ اس نے ایک آدمی کو اس کے ساتھ برا فعل کرتے دیکھا (اس لیے قتل کر دیا)۔ (ایسے ہی امکانات کے پیش نظر) شریعت اسلام نے ناحق جان کو تلف ہونے سے بچانے کے لیے اس بارے میں

یہ احتیاط رکھی ہے کہ قاتل کو اپنے الزامات کے ثبوت میں گواہوں کا پیش کرنا ضروری ہے۔ اگر گواہی سے یہ الزام ثابت ہو جائے تو پھر اس کو قتل کی سزا سے بری الذمہ قرار دیا جائے گا۔

متقدمین میں سے بعض اصحاب کی رائے یہ ہے کہ (ایسی صورت میں) اس شخص کو قتل تو ہرگز نہ کیا جائے البتہ اسے اس اقدام کی سزا دی جائے وہ بھی صرف اس صورت میں کہ اس کے الزام کی سچائی کے نشانات ظاہر ہوں۔ مثلاً انصاف پسند طبیب (ارتکاب جرم کی) صداقت کا انکشاف کرے یا بیوی کی بدکرداری کا ثبوت پہلے سے موجود ہو یا مقتول کی بدکرداری مشہور ہو وغیرہ۔

حنابلہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر قاتل ایسے دو گواہ پیش کر دے جن سے ثابت ہو کہ اس نے واقعی (اس کی بیوی کے ساتھ) بدکاری کی پاداش میں اسے قتل کیا ہے اور وہ شادی شدہ تھا تو قاتل پر کوئی الزام نہ رہے گا۔

ہادویہ کہتے ہیں اگر کوئی شخص ایک مرد کو اپنی بیوی لونڈی یا اولاد کے ساتھ ارتکاب گناہ کرتے ہوئے دیکھ لے اور وہ اسے قتل کر دے تو اس پر کوئی الزام نہیں ہے لیکن اگر ارتکاب جرم کے بعد اسے معلوم ہوا تو (قاتل کو) الزام کا ثبوت پیش کرنا ہوگا یا پھر اس پر قصاص (یعنی جان کا بدلہ جان) عائد ہوگا بشرطیکہ مقتول کنوارا ہو۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی عورت کے ساتھ کسی مرد کو ملوث دیکھے اور ان دونوں کو یا ان میں سے کسی ایک کو قتل کر دے اور اس کا کہنا یہ ہو کہ دونوں شادی شدہ تھے اور ایسے فعل کا ارتکاب کیا ہے جو مستوجب قتل ہے۔ لیکن اس جرم کے ارتکاب کا ثبوت نہ پیش کر سکے تو جسے بھی قتل کیا ہے اس کا قصاص عائد ہوگا۔ ہاں اگر مدعیان خون، خون بہا لیتا چاہیں یا معاف کر دیں تو انھیں اختیار ہے۔

اگر قاتل اولیائے مقتول میں سے کسی کی بابت یہ بیان دے کہ یہ لوگ جانتے تھے کہ اس مرد نے عورت کے ساتھ ایسی حرکت کی ہے جس پر وہ حد (سزائے شرعی) کا سزاوار ہے یا اس سے آگاہ تھے کہ اس مقتولہ عورت نے خود ہی اس مرد کو گناہ پر راغب کیا تو لازم ہوگا کہ جس کے خلاف یہ دعویٰ کیا گیا ہے وہ حلف اٹھائے کہ اسے اس بات کا علم نہیں تھا۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے ایک مرد کو اپنے بیٹے کے ساتھ بد فعلی کرتے ہوئے یا اپنی لونڈی سے آلودہ ہوتے ہوئے دیکھا (اور اسے قتل کر دیا) تو اس کا حکم بھی پہلی صورت سے مختلف نہیں ہے۔ یعنی قتل کا الزام اور وجوب قصاص اس کے ذمہ سے ساقط نہ ہوگا۔ تا آنکہ وہ اپنے الزامات کا ثبوت مہیا نہ کرے۔

اگر ایک شخص نے کسی مرد کو اپنی بیوی کے ساتھ فعل مستوجب حد کا مرتکب ہوتے ہوئے پایا اور دونوں کو قتل کر دیا۔ ان میں مرد تو شادی شدہ تھا لیکن عورت پر شادی شدہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا کہ وہ مسلمان نہ تھی یا گواہوں کی موجودگی کے بغیر شادی ہوئی تھی تو اس شخص پر مرد کے قتل کرنے کی کوئی پاداش نہ ہوگی البتہ عورت کے قتل کا قصاص عائد ہوگا۔ (اس کے برعکس) اگر مرد غیر شادی شدہ اور عورت شادی شدہ تھی تو مرد کے قتل کا قصاص عائد ہوگا اور عورت کے قتل کی کوئی پاداش نہ ہوگی لیکن یہ سب اسی صورت میں ہے جبکہ ارتکاب جرم کا ثبوت مہیا ہو۔ ابن مسیب سے مروی ہے کہ ایک شخص نے جو شام کا باشندہ تھا کسی مرد کو اپنی بیوی کے ساتھ ملوث دیکھا۔ اس شخص نے دونوں کو قتل کر دیا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ابو موسیٰ اشعری کے پاس خط لکھا کہ وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے دریافت فرما کر مطلع کریں کہ اس بارے میں کیا حکم

ہے؟ چنانچہ انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”انا ابو الحسن ان لم یات باربعة شهداء فلیعط برمتہ“ (یعنی میں حسن کا باپ ہوں میرا کہنا یہ ہے کہ اگر وہ شخص (ارتکاب جرم) کے چار گواہ نہ پیش کر سکے تو اسے اپنے کیفر کردار کو پہنچا دو) یعنی قتل کر دو۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے (ایسی صورت میں) مقتول کا خون ہدر کر دیا (قصاص یا دیت نہ لی) اور فرمایا یہ اللہ کا مارا ہوا ہے اور اللہ کو کبھی ایذا نہیں دی جاسکتی۔ یہ حکم (حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے) اس لیے دیا کہ اس مقتول کا جرم ثابت ہو گیا تھا اور شادی شدہ تھا یا یہ سبب ہے کہ مقتول کے والی نے یہ اقبال کر لیا تھا کہ فی الواقع مجرم نے ایسے فعل کا ارتکاب کیا جس پر قتل واجب ہو گیا تھا۔ تاہم انھوں نے فرمایا ہے کہ اگر وہ شخص قتل کرنے میں مشہور ہے تو اسے قتل کی پاداش میں قتل کیا جائے۔ ہاں اگر قاتل مشہور نہیں (اور یہ اس کا پہلا اقدام ہے) تو اسے چھوڑ دو قتل نہ کرو۔

واضح ہو کہ تمام شرائع سابقہ کا اس پر اجماع ہے کہ زنا فعل حرام ہے۔ جیسا کہ آسمانی کتابوں سے ثابت ہے۔

جرم زنا کے متعلق مروجہ قوانین

واضح ہو کہ زنا کے جرم سنگین کے بارے میں جو قوانین بنائے گئے ہیں ان کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ وہ قوانین جن کی رو سے ارتکاب زنا کی مطلق کوئی سزا نہیں ہے۔ بلکہ یہ فعل روا ہے جیسا کہ انگریزی حکومتوں

میں ہے۔

۲۔ وہ قانون جس کی رو سے خاوند اور بیوی کو یکساں سزا جرم زنا کی دی جاتی ہے۔ ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا جیسا کہ جرمنی کا قانون ہے۔

۳۔ وہ قانون جس کی رو سے یہ جرم مستوجب سزا ہے لیکن خاوند اور بیوی کی سزاؤں میں فرق ہے جیسا کہ فرانسیسی حکومت میں ہے۔ اسی طرح کا قانون عرب کی موجودہ جمہوری حکومتوں میں رائج ہے۔

مروجہ قانون اور اسلامی قانون کا موازنہ

واضح ہو کہ دین اسلام کی رو سے مرد اور عورت کا ہر گونہ جنسی اتصال حرام ہے۔ اس طرح مرد کی مرد کے ساتھ جنسی آلودگی بھی حرام ہے۔ خواہ وہ مرد شادی شدہ ہو یا شادی شدہ نہ ہو۔ لیکن (نیکی بدی کی) تمیز رکھتا ہو۔ عاقل و بالغ ہو اور گناہ پر مجبور نہ کیا گیا ہو۔ اس کے لیے جگہ کی کوئی قید نہیں ہے۔ اس کے مقابلہ میں انسان کے بنائے ہوئے قانون کی رو سے بد فعلی کو گناہ (جرم) تصور نہیں کیا جاتا۔ جب تک کہ دونوں مجرم یا ان میں سے کوئی ایک شادی شدہ نہ ہو۔ اس فعل کو جرم قرار دیے جانے کی چند شرائط اور مخصوص حالات ہیں جن کی تفصیل قانون میں کر دی گئی ہے۔

مرد کو اس جرم کا مرتکب صرف اس صورت میں قرار دیا جائے گا جبکہ ارتکاب جرم وہاں پر کیا جہاں وہ شادی شدہ مرد کی حیثیت سے رہتا ہے۔ اگر یہ جرم مرد کسی اور مقام پر کرے تو اسے مجرم قرار نہیں دیا جائے گا اور سزا نہ ملے گی۔ لیکن عورت کسی جگہ بھی یہ گناہ کرے وہ مجرم ہے بشرطیکہ وہ کسی شخص کی زوجیت میں ہو۔

مروجہ وضعی قانون کی رو سے خاوند اور بیوی کے جرائم کا باہمی فرق تفصیل ذیل سے واضح ہے۔

۱۔ بیوی خواہ کسی جگہ بھی برے فعل کی مرتکب ہو وہ مجرم ہے لیکن خاوند جرم کا مرتکب اسی صورت میں سمجھا جائے گا جبکہ وہ اپنے گھر میں اس جرم کا ارتکاب کرے ملاحظہ ہو دفعہ ۲۷۴ تا ۲۷۷ قانون متعلقہ۔

۲۔ عورت اگر اس جرم میں ماخوذ ہو تو اسے زیادہ سے زیادہ دو سال قید کی سزا دی جائے گی لیکن مرد کو چھ مہینے کی سزا ہوگی۔

۳۔ عورت کو یہ اختیار نہیں ہے کہ خاوند کے خلاف آخری فیصلہ ہو جانے کے بعد اسے معاف کر دے۔ ہاں آخری فیصلہ سے پہلے معاف کر سکتی ہے لیکن مرد بہر حال بیوی کے خلاف آخری حکم ہو جانے کے بعد بھی معاف کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس طرح وہ گویا اپنے مطالبہ سے دست بردار ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو دفعہ ۲۷۴۔

۴۔ جب کوئی شخص بدکاری کے جرم میں پکڑا جائے اور اس کی بیوی اسے معاف کر دے تو قانونی طور پر اس کی سزا ہلکی کر دی جائے گی۔ لیکن بیوی ایسی صورت میں سزا کی تخفیف کا فائدہ نہیں اٹھا سکتی ہے۔

۵۔ اگر احیاناً کسی شخص نے اپنی بیوی کو بدکاری کا مرتکب ہوتے دیکھ لیا اور اسے اور اس مرد کو جو ملوث تھا دونوں کو قتل کر دیا تو اسے جرم قتل زیر ۲۳۴ تا ۲۳۶ کی مقررہ سزائوں کی بجائے ایک مناسب مدت کے لیے سزائے قید دی جائے گی۔ مصر کی عدالتوں میں جرم عہد شکنی کے متعلق جو قانون جاری ہے اس کے تحت ان حالات میں قتل کر دینا جرم کے ارتکاب اور نافرمانی کے درمیانی حیثیت کا ایک عمل ہے لہذا اس کی کوئی شرعی سزا نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی کوئی تصریح کتاب و سنت میں موجود نہیں ہے۔

مال اور آبرو

فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ جب کوئی شخص کسی کے مال پر قبضہ کرنے یا قتل کرنے کے لیے حملہ کرے خواہ یہ حملہ شہر میں ہو جہاں کسی سے فریاد کی جاسکتی ہو یا جنگل میں جہاں کوئی مدگار نہ ہو یا وہ شخص شہر یا جنگل میں کسی کی عزت کے درپے ہو تو اسے اختیار ہے کہ جس نے یہ مذموم ارادہ کیا اسے زخمی کر دے اور مسلمانوں یا لشکر کو آواز دے۔ اس کے بعد اگر وہ شخص (برے ارادے سے) رک جائے اور باز آ جائے اور اسے چھوڑ کر وہاں سے چلا جائے تو اسے قتل کر دینے کا حق نہ رہے گا لیکن اگر وہ شخص اس کی التجا پر کان نہ دھرے اور زبردستی اس کا مال چھیننا چاہے اور اسے یا اس کے خاندان میں سے کسی کو قتل کرنے پر تلا ہو، یا اس کی خواتین میں سے بیوی، بیٹی، بہن، ماں یا خاندان کی خاتون یا خادمہ، لونڈی یا بچے کو اٹھانے کا ارادہ کرے۔ یا وہ کوئی چور ہو جو گھر کے باہر کے محافظ کتے (یا نگہبان) کو مار ڈالے تاکہ برے ارادے سے گھر کی عورتوں تک پہنچ جائے یا اغوا کرنا چاہے تو (ایسی صورت میں) بزرگ خاندان پر لازم ہوگا کہ جہاں تک ہو سکے پوری قوت اور ہتھیاروں سے، حفاظتی اقدامات کرے۔ اگر ہاتھ، لاشی یا ہتھیار وغیرہ استعمال کرنے کے سوا اور کوئی طریقہ بچاؤ کا نہ ہو اور جب کوئی چارہ کار نہ رہے تو ایسی حالت میں اسے حملہ کر دینے کا حق ہے لیکن پہلے ہی ہلے میں قتل کر دینے کا ارادہ نہ ہو بلکہ ایسی جگہ پر ضرب لگائے جس سے وہ شخص مرنے جائے۔ اگر جان مال یا عزت کی حفاظت کے لیے اس شخص نے حملہ کر دیا اور وہ زیادتی کرنے والا شخص مر گیا تو اس پر نہ تاوان ہے، نہ قصاص، نہ خون بہا، نہ کفارہ، نہ قیامت کے دن گناہ، نہ حاکم کی طرف سے کوئی سزا، بلکہ وہ خون رانگاں جائے گا اور اگر مدافعت کرنے والے کو ظالم چور اپنے ہاتھ سے ہلاک کر دے تو اس

نے شہادت پائی اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے کا ثواب ملے گا۔

ترمذی وغیرہ نے سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”من قتل دون ماله فهو شهيد، ومن قتل دون دمه فهو شهيد، ومن قتل دون دينه فهو شهيد، ومن قتل دون اهله فهو شهيد“ (یعنی جو شخص اپنے مال کے پیچھے قتل ہوا وہ شہید ہے اور جو اپنے خون کے پیچھے قتل ہوا وہ شہید اور جو شخص اپنے دین کے پیچھے قتل ہوا وہ شہید ہے اور جو اپنے بال بچوں کے پیچھے قتل ہوا وہ شہید ہے)۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔

مسلم نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص رسول ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہا ”یا رسول اللہ ارایت ان جاء رجل يريد اخذ مالي، قال: لا تعطه مالك، قال ارایت قاتلنی؟ قال: قاتله قال: ارایت ان قتلنی؟ قال: فانت شهيد، قال: ارایت ان قتلته؟ قال: هو فی النار“ (یعنی اے رسول اللہ اگر کوئی میرا مال چھیننا چاہے تو کیا کرنا چاہیے فرمایا اپنا مال اسے مت لینے دو اس نے کہا اگر وہ لڑنے لگے فرمایا تم بھی اس سے لڑو۔ اس نے کہا اگر مجھے قتل کر دے فرمایا تم شہادت کا درجہ پاؤ گے۔ اس نے کہا اگر میں اسے قتل کر دوں فرمایا وہ جہنم واصل ہوا)۔ اس حدیث پر ہر اس شخص کو قیاس کیا جاسکتا ہے جو اپنی جان، اپنی آبرو اور اپنے دین کے تحفظ میں جان لڑا دے۔ جیسا کہ سابقہ الذکر حدیث شریف میں ہے۔

عورت کو اس کی اصلاح کے لیے مارنے کا بیان

فقہائے اسلام اس پر متفق اللفظ ہیں کہ عورت اگر خاوند سے عناد رکھے یا مخالفت پر تل جائے یا فعل مذموم کا ارتکاب کرے تو اسے مارنا جائز ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”وللاتی تخافون نشوزهن فعظوهن، واهجروهن فی المضاجع، واضربوهن“ (یعنی جن عورتوں سے تمہیں عناد رکھنے کا اندیشہ ہو تو انہیں سمجھاؤ پھر بستر پر تنہا پڑی رہنے دو پھر انہیں مارو)۔ یعنی ایسی مار جس سے تکلیف تو ہو لیکن ضرب شدید نہ ہو کہ کوئی عضو شکستہ ہو جائے اور نہ ایسی ضرب ہو کہ خون نکل آئے آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے ”استوصوا بالنساء خیراً، فانھن عوان عندکم لستم تملکون منھن شیئاً غیر ذلک الا ان یاتین بفاحشة مبينة، فان فعلن فاهجروهن فی المضاجع، واضربوهن ضرباً غیر مبرح، فان اطعنکم فلا تبغوا علیھن سیلاً، الا ان لکم علی نساءکم حقاً، ولنساءکم علیکم حقاً، فحقکم علیھن ان لا یوطئن فرشکم من تکرھون، ولا ییاذن فی بیوتکم لمن تکرھون، الا وحقھن علیکم ان تحسنوا الیھن، کسوتھن وطعامھن“ (یعنی لوگوں عورتوں سے حسن سلوک کرنے کی تلقین کیا کرو۔ عورتیں تمہارے پاس تمہارے معاون کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ تم ان کی کسی شے کے مالک نہیں ہو البتہ اگر وہ کھلی معصیت کی مرتکب ہوں اور ایسا فعل ان سے سرزد ہو تو انہیں اپنے بستر پر پڑا رہنے دو، (یعنی فرائض زوجیت سے باز رہو) اور انہیں مار بھی سکتے ہو لیکن ضرب شدید نہ ہو۔ اب اگر وہ مان جائیں تو ان پر ظلم کے بہانے مت ڈھونڈو۔ یاد رکھو کہ جہاں تمہارا حق عورتوں پر ہے وہاں تمہاری عورتوں کا حق بھی تم پر ہے۔ تمہارا حق ان پر یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر پر اسے نہ آنے دیں جسے تم ناپسند کرتے ہو اور نہ تمہارے گھروں میں اسے داخل ہونے دیں جس کا داخل ہونا تمہیں ناگوار ہو

حد کے بارے میں معتزلیوں اور خارجیوں کی رائے

واضح ہو کہ اس حد (سنگساری) کے بارے میں بعض معتزلیوں اور خارجیوں کے علاوہ کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سنگساری کی سزا ابتدائے عہد اسلام میں رائج تھی۔ پھر جب آیت ”الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منهما مائة جلدة“ (یعنی بدکاری کرنے والے مرد اور بدکاری کرنے والی عورت دونوں میں سے ہر ایک کو سو دڑے مارو)۔ نازل ہوئی، تو اب وہ صرف درہ زنی کے سزاوار ہیں خواہ شادی شدہ ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن ان کی یہ دلیل اسی صورت میں کافی ہوتی جبکہ یہ ثابت ہو جاتا کہ اس آیت کے نازل ہو جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے کسی کو سنگسار نہیں کیا۔ لیکن جمہور کا کہنا یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بھی سنگساری کی سزا دی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک سنگساری کے موقع پر اباہریرہؓ موجود تھے جو سنہ ۷ ہجری سے پہلے ایمان نہیں لائے تھے، حالانکہ سور نور سنہ ۵ یا سنہ ۶ میں نازل ہوئی۔ پھر یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد خلفائے راشدین نے سنگساری کی سزا دی اور انھوں نے صراحت فرمائی دی ہے کہ رجم حد (شرعی سزا) ہے۔

ان اصحاب کا کہنا یہ بھی ہے کہ سنت کتاب اللہ کے احکام کو منسوخ نہیں کر سکتی۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث مشہور سے کتاب اللہ کے کسی حکم (عام) کو خاص کیا جاسکتا ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس مسئلہ میں سنت نے قرآن حکیم کے حکم (عام) کو غیر شادی شدہ کے لیے مخصوص کر دیا۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس اختلاف کا کوئی بڑا عملی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔^(۱)

پھر ان کا حق تم پر یہ بھی ہے کہ ان کے ساتھ حسن سلوک سے کام لو اور انھیں لباس و خوراک مہیا کرو۔ اس حدیث کو ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”لایسأل الرجل فیم ضرب امراته“ (یعنی کوئی شخص اپنی عورت کو مارے تو اس سے باز پرس نہ ہوگی)۔

۱۔ کتاب البحر میں بتایا گیا ہے کہ سنگساری کی سزا واجب نہیں ہے، ابن العربی نے بتایا ہے کہ یہ قول خارجیوں کا ہے اور بعض معتزلی مثلاً نظام اور ان کے ساتھی بھی یہی کہتے ہیں۔ لیکن ان کے پاس اس کے سوا اور کوئی دلیل نہیں ہے کہ اس کا ذکر قرآن میں نہیں ہے لیکن یہ دلیل صحیح نہیں ہے کیونکہ سنگساری کی سزا سنت متواترہ سے ثابت ہے جس پر سب کا اجماع ہے نیز اہل سنت والجماعت کے نزدیک حدیث عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رو سے اس کا ثبوت نص قرآنی سے بھی ہوتا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ ”کان مما نزل علی رسول اللہ ﷺ آية الرجم، فقرأناها، وحفظناها،

ووعیناھا، ورجم رسول اللہ ﷺ ورجمنا بعدہ“ (یعنی سنگساری والی آیت رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی۔ ہم نے اسے پڑھا، یاد کیا اور تسلیم کیا اور اس کے مطابق رسول اللہ نے سنگساری کی سزا دی اور بعد میں ہم نے بھی سنگساری کی سزا دی۔) اس کی تلاوت منسوخ ہو جانے سے سنگساری کے حکم کا منسوخ ہو جانا ضروری نہیں ہے۔ جیسا کہ ابو داؤد نے جنہوں نے ابن عباسؓ سے اور احمد اور طبرانی نے کبیر میں ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے جنہوں نے سہل سے اور انہوں نے اپنی خالہ عجماء سے اس روایت کا اخراج فرمایا ہے کہ قرآن میں نازل شدہ احکام کے منجملہ یہ بھی ہے ”الشیخ والشیخۃ اذا زنیَا فَاَرْجُمُوهُمَا الْبَتَّةَ بِمَا قُضِيَ مِنَ اللَّذَّةِ“ (یعنی عمر رسیدہ مرد اور عمر رسیدہ عورت اگر بدکاری کریں تو لازمی طور پر ان دونوں کو لذت اندوزی کی پاداش میں سنگسار کر دو)۔ اور ابو ہریرہ اور زید بن خالد رضی اللہ عنہما سے روایت ہے یہ دونوں اصحاب کہتے ہیں کہ ایک اعرابی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور اس نے کہا کہ یا رسول اللہ آپ کو قسم ہے کہ آپ میرا معاملہ کتاب اللہ کے مطابق طے کریں۔ فریق ثانی نے جو اس شخص سے زیادہ دانشمند تھا، کہا کہ ہاں حضور ہمارا فیصلہ کتاب اللہ کی رو سے کر دیجئے اور مجھے عرض کرنے کی اجازت دیجئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہو! اس نے کہا ”میرا بیٹا اس شخص کے ہاں کام کرتا تھا۔ اس نے اس کی بیوی کے ساتھ بد فعلی کی مجھے بتایا گیا کہ میرے بیٹے کو سنگسار کیا جائے گا اس پر میں نے ایک سو بکری اور ایک جا رہ بطور تاوان اسے دے دیا۔ پھر میں نے اہل علم سے اس بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ میرے بیٹے کو سو دڑے اور ایک سال جلا وطنی کی سزا ہوگی اور اس شخص کی بیوی کو سنگسار کیا جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”میں اس ذات کی قسم کھاتا ہوں جس کے دست قدرت میں میری جان ہے کہ میں تمہارا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کروں گا۔ وہ لڑکی اور بکریاں واپس ہوں گی اور تمہارے بیٹے کو سو دڑے اور ایک سال کے لیے جلا وطنی کی سزا ہوگی۔ اور اے انیس۔ ایک شخص کا نام جو مسلمان ہو گیا تھا۔ کل اس شخص کی بیوی کے پاس جاؤ اگر وہ اس جرم کا اقرار کرے تو اسے سنگسار کر دو۔ انیس اگلے روز اس عورت کے پاس گئے اس نے اقبال جرم کر لیا۔ حضور نے سنگساری کا حکم دیا اور وہ سنگسار کر دی گئی۔ ایک جماعت نے یہ حدیث روایت کی ہے۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”خذوا عنی خذوا عنی، قد جعل اللہ لہن سبیلاً، البکر بالبکر جلد مائة وتغريب عام، والشیب بالشیب جلد مائة والرجم“ (یعنی مجھ سے سنو، مجھ سے سنو اللہ نے ان کے بارے میں طرز عمل اختیار کرنے کی سبیل بتادی ہے: کنوارہ مرد کنواری عورت سے ملوث ہو تو اس کی سزا سو دڑے اور ایک سال کی جلا وطنی ہے اور شادی شدہ مرد شادی شدہ عورت سے ملوث ہو تو سو دڑے اور سنگساری) یہ روایت بخاری اور نسائی کے سوا سب نے بیان کی ہے۔

حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ ”ان رجلاً زنی بامرأة فامر به النبی ﷺ فجلد الحد، ثم اخبر الہ محصن فامر به فرجم“ رواہ ابو داؤد (یعنی ایک شخص نے کسی عورت سے بدکاری کی، حضور نے اسے دڑے مارے جانے کی سزا کا حکم دیا لہذا اسے دڑے لگائے گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ شخص شادی شدہ ہے تب اسے سنگسار کیا گیا)۔ اور جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ ”ان رسول اللہ ﷺ رجم ما عزن مالک“ (یعنی رسول اللہ ﷺ نے ما عزن مالک کو سنگسار کیا)۔ اسے احمد نے روایت کیا ہے اور امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے کہ شادی شدہ شخص بدکاری کرے تو اسے سنگسار کیا جانا واجب ہے۔

ثبوت زنا کے لیے گواہی کا بیان

واضح ہو کہ زنا کی سزا اسی وقت دی جاسکتی ہے جب کہ وہ اقبال جرم کر لے۔ اگر وہ بدکار شخص اقبال جرم نہ کرے تو اس کا ثبوت گواہوں کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتا جنہوں نے پچشم خود اسے فعل بد کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھا ہو لیکن ایسا ہونا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔^(۱)

۱۔ تمام فقہاء اس پر متفق اللفظ ہیں کہ ارتکاب زنا کا ثبوت گواہی سے یا اقبال جرم سے ہوتا ہے نیز یہ کہ دوسرے دعوؤں کے خلاف اس مذموم جرم کو ثابت کرنے کے لیے چار گواہ درکار ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”واللّٰتی یاتین الفاحشۃ من نسائکم فامتنھن علیہن اربعۃ منکم“ (یعنی اگر مسلمان عورتوں میں کوئی اس گناہ عظیم کا مرتکب ہو تو اس کے ثبوت کے لیے چار مسلمانوں کی گواہی درکار ہے) اسی طرح آنحضرت ﷺ نے زنا کا الزام لگانے والے کو حکم دیا ہے ”انت باربعۃ یشہدون علی صدق مقالک۔ والا فحد فی ظہرک“ (یعنی ایسے چار آدمی لاؤ جو تمہارے بیان کی صداقت پر گواہی دیں، بصورت دیگر تمہاری پیٹھ پر دڑے لگائے جائیں گے)۔ اس بات پر امت کا اجماع ہے اور ائمہ فقہاء اس پر متفق ہیں کہ وہ گواہ انصاف پسند اور مرد ہوں اور سزایاب نہ ہوں اور اس شہادت (کے قابل تسلیم ہونے کی) شرط یہ ہے کہ گواہ مرد کی شرمگاہ کو عورت کی شرمگاہ میں پچشم خود دیکھنا بیان کرے۔ اور اس کو واضح الفاظ میں بتائیں۔ اشاروں سے بتانا کافی نہیں ہے۔ (اس طرح کے) چار گواہوں کی شرط لگانے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کا پردہ فاش نہ ہو اللہ تعالیٰ یہی چاہتا ہے۔ کسی شے کے ثابت کرنے کی شرائط جتنی زیادہ (سخت) ہوں گی اتنا ہی اس کے ثبوت کا امکان کم ہوگا اور شریعت یہی چاہتی ہے۔

اس بارے میں کہ شہادتیں (ایک ہی مقام پر گزریں) مختلف مقامات پر نہ ہوں اختلاف ہے: حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ شہادت گزارنے کے لیے یہ شرط ہے کہ ثبوت جرم کے لیے تمام شہادتیں ایک ہی جگہ پر ہوں۔ ورنہ یہ گواہوں کا جرم متصور ہوگا اور تہمت لگانے کے جرم میں سزا پائیں گے۔ یہ حکم اس لیے ہے کہ شریعت اسلامیہ چاہتی ہے کہ (نفاذ سزا کے لیے) پورا پورا ثبوت جرم مہیا ہو۔ مختلف مقامات پر شہادت گزارنے میں ایک شبہ کا امکان ہے جو بدکاری کی چشم دید شہادت سے مانع ہے اور جب شبہ لاحق ہو جائے تو سزا موقوف ہو جاتی ہے۔ شافعیہ کہتے ہیں کہ مختلف مقامات پر شہادت گزارنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مختلف جگہوں پر گواہوں کی شہادت ہو تو اسے تسلیم کیا جائے گا۔ یہ حکم اس لیے ہے کہ حاکم شرع جب دیکھے کہ مطلوبہ گواہیاں پوری ہو گئیں تو مسلمانوں کی دینی اور دنیوی مصلحت اسی میں ہے کہ انہیں گناہ سے پاک کرنے کی جلد از جلد کوشش کرے۔

گواہیوں کا ایک ہی جگہ اور ایک ہی وقت میں گزارنے کا بیان

فقہاء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ صحت شہادت کی یہ شرط ہے کہ چاروں گواہوں کی شہادت ایک ہی جگہ اور ایک ہی وقت میں ہو:

حنفیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ چاروں شہادتیں ایک ہی جگہ پر لی جائیں اس کے لیے یہ قید بھی ہے کہ چاروں گواہ ایک ہی وقت میں اکٹھے حاضر ہوں اگر متفرق طور پر آئے اور ایک جگہ پر جمع ہو گئے تو ان کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی اور تہمت لگانے کے جرم میں سزا پائیں گے۔ چاروں گواہوں کے اکٹھے نہ ہونے کے باعث ان کی گواہی مشتبہ ہو جائے گی۔ کیونکہ پہلا گواہ (اکیلا) جب گواہی دے گا تو چونکہ هنوز چار گواہ پیش نہیں ہوئے تو (جرم ثابت نہ ہوا) اور اس کی شہادت تہمت ہو جائے گی لہذا اس پر سزا عائد ہوگی۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ (صحیح شہادت کے لیے) یہ شرط نہیں ہے کہ چاروں گواہ ایک جگہ اور ایک وقت میں موجود ہوں۔ بلکہ جرم زنا کی گواہی جس وقت بھی پوری ہو جائے اگرچہ یکے بعد دیگرے متفرق طور پر دی گئی ہو اسے تسلیم کیا جائے گا۔ اور اس کی بناء پر مجرموں پر حد نافذ ہوگی۔ کیونکہ چاروں گواہ امر شہادت میں باہم مشترک ہیں خواہ انہوں نے یک جائی طور پر گواہی دی ہو یا متفرق طور پر۔ اگر متفرق طور پر گواہی پوری گزر گئی تو شریعت کا حکم پورا ہو گیا کیونکہ تمام فیصلے جس طرح گواہوں کی یک جائی شہادت پر ہوا کرتے ہیں۔ اسی طرح متفرق شہادت پر بھی ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ زیادہ بہتر ہے، کیونکہ اگر شہادت دینے والے متفرق طور پر آئیں تو ان پر ملی بھگت کا الزام نہیں لگ سکتا۔ پھر یہ کہ شہادت کے لیے ایسی کوئی شرط نہیں ہے کہ تمام گواہ یکجا ہو کر گواہی دیں۔

حنابلہ کہتے ہیں کہ تمام گواہوں کا ایک جگہ جمع ہو کر ایک ساتھ گواہی دینا شرط ہے۔ اگر وہ سب ایک جگہ پر جمع ہوئے اور گواہی دی تب ہی ان کی گواہی کی سماعت ہوگی۔ اگرچہ ادائے شہادت سے پہلے وہ متفرق طور پر (گواہی کے لیے) آئے ہوں کیونکہ شبہ کا امکان صرف اس حال میں ہے جبکہ گواہی مختلف مقامات میں لی جائے۔

وقوعہ جرم کی جگہ کے بارے میں گواہوں کے بیان میں اختلاف

اس بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ آیا گواہوں کے بیانات کا وقوعہ جرم کی جگہ کے تعین میں مختلف نہ ہونا شرط ہے؟ مثلاً گواہوں میں سے دو نے بیان کیا کہ جرم زنا کا ارتکاب مکان کے فلاں حصہ میں ہوا اور باقی دو گواہوں نے اسی مکان کے ایک دوسرے حصہ میں ارتکاب ہونا بتایا۔

حنفیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اس اختلاف سے ادائے شہادت میں کوئی نقص نہ ہوگا بلکہ (اتنے سے اختلاف کو نظر انداز کر کے) گواہی کو تسلیم کر لیا جائے گا اور سزا دے دی جائے گی۔

مالکیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ اس بارے میں یہ شہادت قبول نہیں کی جائے گی اور حد نافذ نہ ہوگی۔ کیونکہ مقام وقوعہ کے تعین کے بارے میں گواہوں کے بیانات مختلف ہونے سے شہادت مشتبہ اور سزا موقوف ہو جائے گی۔ پس (ثبوت جرم کے لیے) یہ شرط ہے کہ چاروں گواہ یک وقت گواہی کے لیے پیش ہوں اور سب ایک ہی جگہ پر ایک ہی جرم زنا کے متعلق ایک ہی طرح سے مرتکب ہونے کی گواہی دیں تب ہی شہادت کمال ہوگی۔

وقوعہ جرم کے علاقہ کے بارے میں گواہوں کا اختلاف

مثلاً اگر دو گواہوں نے بیان کیا کہ فلاں شخص نے کوفہ میں ارتکاب جرم کیا اور باقی دو گواہوں نے کہا کہ بصرہ میں یہ جرم سرزد ہوا تو یہ شہادت قبول نہیں کی جائے گی اور اس پر اجماع ہے کہ مجرموں کو سزا نہیں دی جائے گی بلکہ تہمت

لگانے کے الزام میں گواہوں کو حد قذف ماری جائے گی۔

گناہ کی مجرمہ کے باکرہ ثابت ہونے کا بیان

اگر چار معتبر اشخاص گواہی دے دیں کہ فلاں شخص اس عورت کے ساتھ مرتکب گناہ ہوا۔ لیکن بعد میں ثابت ہوا کہ عورت باکرہ ہے تو ان کی گواہی رد کر دی جائے گی اور اس پر اجماع ہے کہ اس گواہی کو تسلیم نہیں کیا جائے گا اور شبہہ کی بناء پر عورت کو بھی حد سے بری کر دیا جائے گا اور کوئی سزا نہ دی جائے گی۔ کیونکہ عورت کا باکرہ ثابت ہونا اس امر کا ثبوت ہے کہ گناہ کا ارتکاب نہیں ہوا۔

گواہی میں تاخیر ہونے کا بیان

اگر قابل سزا جرم کے گواہ دیر سے حاضر ہوئے تو بدیں سبب کہ وہ حاکم شرع سے فاصلہ پر ہوں انھیں شہادت سے منع نہیں کیا جائے گا۔ تاہم اس بارے میں فقہاء کی مختلف رائیں ہیں۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ ایسی حالت میں جبکہ گواہی دینے میں دیر کر دی جائے تو گواہی کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ ادائے شہادت میں ڈھیل دینے سے شبہہ پیدا ہوتا ہے۔ حنفیہ کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ شہادت میں دیر ہو جائے تو خالص اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود (سزائیں) باطل ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ گواہ کے پیش نظر دو باتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے میں کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ ان دو باتوں میں سے ایک تو فرض شہادت کا ادا کرنا ہے اور دوسری بات ایک مسلمان کا پردہ ڈھکنا ہے۔ گواہی میں توقف یا تاویل کرنا پردہ ڈھکنے کے خیال سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد پھر گواہی دینے کا سبب کوئی عداوت یا کینہ ہی ہو سکتا ہے جس نے گواہی دینے پر اسے آمادہ کیا اور ابھارا۔ اسی سے گواہ پر الزام لگایا جاسکتا ہے۔ ہاں اگر اس توقف کا سبب کوئی معذوری ہو تو اور بات ہے۔ لیکن بغیر کسی (معقول) سبب کے گواہی میں ڈھیل کرنا گناہ ہے پس ایسی شہادت کو رد کر دیا جائے گا جب کہ امر مانع شہادت کا یقین ہو۔

مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ زنا، تہمت اور شراب نوشی کی سزاؤں کے بارے میں، شہادت کی سماعت وقوع جرم کو طویل عرصہ گزرنے کے بعد بھی ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ سزا کا نفاذ شہادت گزرنے کے بعد تو قطعی درست ہے اور سزا کا باطل ہو جانا ثابت نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ ہو سکتا ہے کہ گواہ اس وقت شہادت دینے سے معذور ہو جب کہ جرم کا ارتکاب ہوا۔ بایں طور کہ اس جرم کا فتنہ باقی رہے اور اس وقت تک فرو نہ ہو جب تک کہ مجرم کو سزا نہ مل جائے اندریں صورت گواہ ادائے شہادت میں تاخیر کرنے میں معذور ہیں۔

جبری ارتکاب کے بارے میں گواہوں کے بیان میں اختلاف

اگر ارتکاب زنا کے بارے میں دو گواہ یہ بیان دیں کہ اسے گناہ پر مجبور کیا گیا تھا اور باقی دو گواہ کہیں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس شخص نے بخوشی خود ارتکاب جرم کیا ہے۔ اس مسئلہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔

آئمہ اربعہ کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں مجرموں کو کوئی سزا نہ ہوگی اور گواہوں کی شہادت رد کر دی جائے گی کیوں کہ (گواہوں کے اختلاف بیانات کی بناء پر) وقوع جرم مشتبہ ہو گیا اور سزا ساقط ہو گئی۔ لیکن صاحبین رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ ایسی صورت میں صرف مرد کو حد ماری جائے گی کیوں کہ چار گواہیاں گزر گئیں اور سب اس پر متفق ہیں کہ جرم زنا کا

ارتکاب ہوا۔ اختلاف اس میں ہوا کہ آیا ارتکاب جرم پر مجرم کو مجبور کیا گیا تھا یا نہیں؟ پس مرد پر تو حد نافذ ہوگی، رہی عورت سوا سے سزا نہیں ملے گی کیوں کہ (دو) گواہوں کے بیان سے ثابت ہے کہ وہ مجبور تھی اور اس پر سب متفق ہیں کہ جس کے ساتھ زنا بالجبر کیا جائے، وہ سزا کی مستوجب نہیں۔ اس صورت میں بدکاری کرنے والے مرد پر عورت کا مہر واجب ہو جائے گا اور اگر وہ حاملہ ہوگئی ہو تو وہ اولاد بھی اسی شخص کی متصور ہوگی۔

خاوند کا بیوی کے خلاف گواہی دینے کا بیان

سوال یہ ہے کہ آیا ارتکاب زنا کے گواہوں میں عورت کے خلاف خاوند کی شہادت مانی جائے گی؟ مالکیہ کہتے ہیں کہ بیوی کے خلاف خاوند ارتکاب زنا کی شہادت دے سکتا ہے۔ کیوں کہ (گناہ کی) اس حرکت مذموم سے خاوند کی بے عزتی ہوتی ہے خاص کر اس صورت میں جب کہ وہ صاحب اولاد ہو۔ لہذا گواہی دینے پر اسے مہتمم نہیں کیا جاسکتا۔ پس اس کی گواہی تسلیم کی جائے گی اور بیوی کو سزائے شرعی دی جائے گی۔

حنفیہ، شافعیہ، اور حنابلہ کہتے ہیں کہ ارتکاب زنا کے بارے میں دوسرے گواہوں میں شامل ہو کر خاوند کا (بیوی کے خلاف) گواہی دینا جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کی گواہی (غالباً فریق ثانی ہونے کے باعث) قابل الزام ہے۔ لہذا اس کی گواہی تسلیم نہیں کی جائے گی۔

گواہ پر جرح کا بیان

جب چاروں گواہ ارتکاب زنا کی گواہی دینے کے لیے حاکم کے سامنے پیش ہوں تو حاکم ان سے سوال کرے گا کہ زنا کیا ہے؟ کیسے ہوتا ہے؟ پھر یہ کہ یہ زنا کہاں پر ہوا؟ کس وقت ہوا؟ کس کے ساتھ ہوا؟ اور کس طرح ہوا؟ اب اگر سب گواہوں کے بیانات میں اتفاق ہو اور وضاحت کے ساتھ کہیں کہ ہم نے مرد کے عضو مخصوص کو عورت کی شرمگاہ میں اس طرح دیکھا جیسے سرمہ دانی میں سلائی یعنی مجملہ بیان کرنا کافی نہیں ہے، اس کے بعد حاکم شرع پر واجب ہو جائے گا کہ بدفعی کے مرتکبوں پر حد جاری کرے (تفصیلی بیان اس لیے ضروری ہے کہ) بہت ممکن ہے کہ اس شخص نے عورت کو صرف ہاتھ لگایا ہو یا یہ گناہ دار الحراب میں ہوا ہو یا نابالغی کی حالت میں ہو یا کوئی پرانا واقعہ ہو (یہ باتیں واجب الحد نہیں ہیں)۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ شہادت اس صورت میں درست ہوگی جب کہ اس گناہ کی تمام کیفیت سب نے ایک جیسی بتائی ہو۔ مثلاً لیٹ کر ہوا یا کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر۔ وہ شخص عورت کے اوپر تھا یا نیچے تھا اور فلاں وقت ہوا اور ضروری ہے کہ گواہی لینے سے پہلے تمام گواہوں کو جدا جدا کر دیا جائے اور گواہ فردا فردا ان تمام باتوں کو بیان کریں اور ایک ہی وقت میں پچشم خود دیکھنا بیان کریں۔ مختلف اوقات کی باتیں نہ ہوں۔ اور یہ ضروری ہے کہ وہ عضو مخصوص کا شرمگاہ میں اس طرح داخل ہونا بیان کریں جیسے سرمہ دانی میں سلائی۔ یہ بیان اس لئے ضروری ہے کہ گواہی کے معاملہ میں سختی سے کام لیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو اس گناہ کو چھپایا جائے۔ اب اگر کسی گواہ کی شہادت میں خلا پایا گیا یا ایک کا بیان دوسرے گواہوں کے مطابق نہ ہو تو وہ گواہی رد کر دی جائے گی اور گواہ کو تہمت لگانے کے الزام میں سزا دی جائے گی۔

نا بینا کی گواہی کا بیان

مالکیہ کہتے ہیں کہ نابینا معتبر مسلمان کی گواہی صرف سماعی امور میں تسلیم کی جائے گی۔ خواہ اس کا بیان بینائی جانے سے پہلے کا ہو یا بعد کا۔ نابینا شخص سنی ہوئی باتوں کو یاد رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسی طرح وہ حس کر کے بھی گواہی دے سکتا ہے۔ مثلاً اس نے مرتکبین گناہ کو ہاتھ سے ٹٹولا ہو (نیاز مند مترجم کے نزدیک یہ تمام امور ناممکن مفروضات ہیں اور غیر ضروری اطناب ہے)۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ زنا کے بارے میں نابینا کی گواہی تسلیم نہیں کی جائے گی کیوں کہ نابینا شخص سرے سے مرد اور عورت میں امتیاز ہی نہیں کر سکتا (تو شہادت کیسے دے سکتا ہے) جب کہ نفاذ حدود کے بارے میں یہ ضروری ہے کہ جرم کی تحقیق کی جائے اور ارتکاب کا یقین حاصل ہو۔

حنابلہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی نابینا، بینائی سے محروم ہونے کے پہلے کسی وقوعہ کی شہادت دے کہ اس نے ارتکاب جرم اس وقت دیکھا جبکہ اس کی بینائی قائم تھی اور اس کے بعد بینائی سے محروم ہو گیا تو اس کی گواہی تسلیم کی جائے گی لیکن نابینا ہو جانے کے بعد کی گواہی نہیں مانی جائے گی۔

مجرم کا شادی شدہ ہونے سے انکار کرنا

اگر چار گواہوں نے کسی کے خلاف ارتکاب زنا کی گواہی دی، پھر اس شخص نے شادی شدہ ہونے سے انکار کیا، حالانکہ اس کی بیوی اور اولاد موجود ہیں تو اس کی بات نہیں مانی جائے گی اور اسے سنگسار کر دیا جائے گا کیوں کہ بیوی اور اولاد موجود ہونے کی صورت میں اس کی کذب بیانی ظاہر ہے۔

اگر چار اشخاص نے کسی کے خلاف کے ارتکاب زنا کی شہادت دی اور اس شخص نے شادی شدہ ہونے سے انکار کیا لیکن دو آدمیوں نے گواہی دی کہ اس نے ایک عورت سے شادی کی ہے اور باقاعدہ نکاح کر کے اسے اپنی زوجیت میں لے چکا ہے تو اسے شادی شدہ قرار دے کر سنگسار کیا جائے گا۔

گواہ بننے کی اہلیت سے خارج ہو جانے کا بیان

علماء کا اس پر اجماع ہے کہ اگر گواہ میں ایسی تبدیلی آجائے جو اسے گواہ بننے کی اہلیت سے خارج کر دے تو اس کی گواہی باطل ہو جائے گی۔ مثلاً وہ شخص مرتد ہو جائے (نعوذ باللہ) یا بینائی جاتی رہے یا گونگا ہو جائے یا فاسق ہو جائے یا تہمت لگانے کے جرم میں سزا یا ب ہو جائے۔ اسی طرح کسی گواہ کی موت یا مجرموں میں سے کسی کی موت واقع ہو جائے تو شرعی سزا موقوف ہو جائے گی۔

سنگساری میں پہلے گواہوں کا پتھر مارنا

حنفیہ کہتے ہیں کہ زنا کے مجرم کو سنگسار کرنے کا حکم ہو تو واجب ہے کہ سب سے پہلے گواہ اسے پتھر مارے۔ امام وقت اس پر انھیں مجبور کرے اس کے بعد خود امام یا اس کا نائب اور پھر عام لوگ سنگسار کریں۔ نفاذ حد زنا کے لیے یہ امر بطور شرط لازم کے ہے یہاں تک کہ اگر گواہ مجرم کو سنگسار کرنے سے انکار کریں تو مستوجب سزا کی سزا ساقط ہو جائے گی۔ تاہم گواہ پر حد قذف بھی عائد نہ ہوگی کیونکہ ان پتھر مارنے سے باز رہنا صریحاً گواہی سے پھر جانے کا ثبوت نہیں ہے ہاں نفاذ حد کو روک دینے کے لیے ایک شبہ ضرور ہے کیونکہ گواہ کا مجرم کو سنگسار کرنے سے انکار کرنا اپنے بیان سے رجوع کرنے کی

دلیل ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ پہلے تو گواہ ادائے شہادت میں تامل کرے لیکن جب گواہی پر عملدرآمد کا وقت آئے تو یہ کام اسے بہت سخت معلوم ہو اس کا دل کڑھے اور اپنی گواہی سے پھر جائے۔ جس سے ملزم کی سزا روک دی جائے۔ پس (گواہ کو سنگساری کا) حکم دینے کا مقصد یہ ہے کہ جرم کی مزید توثیق ہو جائے اور موجب سزائش ہو۔

حدیث ابی بکرہ میں مروی ہے کہ رسول ﷺ نے ایک عورت کو سنگساری کا حکم دیا اور سب سے پہلے آپ ہی نے چنے کے برابر کنکریوں سے اسے مارا پھر فرمایا کہ اسے سنگسار کرو لیکن چہرہ بچا کر مارنا اور عامرا نشعھی سے مروی ہے کہ شراحہ کا ایک خاوند تھا جو شام میں جا کر مفقودالخبر ہو گیا۔ یہ عورت حاملہ ہو گئی اس کا متولی اسے لے کر حضرت علی کی خدمت میں آیا کہ اس نے بدکاری کی ہے اور اقبال جرم کر لیا ہے۔ لہذا جمعرات کے روز سو درے مارے گئے اور جمعہ کو سنگسار کر دیا گیا۔ اس کے لیے ناف تک گہرا گڑھا کھودا گیا تھا راوی کہتے ہیں کہ میں وہاں موجود تھا۔ (اس وقت) حضرت علی نے فرمایا تھا کہ سنگساری کرنا رسول ﷺ کی مقرر فرمودہ سنت ہے اگر کسی نے اس جرم کے ارتکاب کی گواہی دی ہوتی تو وہی گواہ سب سے پہلے پتھر مارتا۔ یہ عمل اس گواہ کی گواہی کے تابع ہے لیکن اس عورت نے خود ہی اقبال جرم کیا ہے۔ لہذا میں ہی سب سے پہلے پتھر ماروں گا۔ پھر اور لوگوں نے بھی پتھر مارے۔ راوی کہتے ہیں کہ میں ان لوگوں میں شامل تھا۔ اور بخدا میں بھی اس کے ہلاک کرنے میں شریک ہوں۔

علمائے حنفیہ میں سے ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجرم زنا کی سنگساری کے لیے گواہوں کا سب سے پہلے پتھر مارنا امر مستحب ہے۔ شہادت کی تکمیل کے لیے نہیں ہے، لہذا اگر گواہ سنگساری سے انکار کر دے یا وفات پا جائے تو امام (حاکم وقت) حد نافذ کرے گا، مجرم کو رہا نہ کیا جائے گا۔ کیونکہ اس کا جرم گواہی سے ثابت ہو چکا ہے اور اس کا نفاذ واجب ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ (سزائے سنگساری میں) پتھر مارنے کی ابتدا، امام وقت یا اس کا نائب کرے گا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ گواہ اس کا آغاز کریں اور نہ مجرم کے لیے لازم ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو پتھر مارے۔ کیونکہ واجب القتل فعل کے مرتکب کا خود اپنے آپ کو ہلاک کرنا درست نہیں ہے بلکہ یہ کام امام (حاکم وقت) کا ہے۔

حنابلہ کہتے ہیں کہ امام وقت کا سنگساری کے وقت موجود ہونا یا نہ ہونا دونوں طرح جائز ہے۔ یہی حال گواہوں کا بھی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے "ما عز" کو سنگساری کیے جانے کا حکم دیا لیکن سنگساری کے وقت موجود نہ تھے۔

گواہوں کے اپنے بیان سے پھر جانے کا بیان

اگر چار اشخاص نے ایک مرد کے بارے میں کسی عورت سے ارتکاب گناہ کی گواہی دی اور ان کے علاوہ چار دوسرے اشخاص نے کسی اور عورت کے ساتھ اس کے ارتکاب زنا کی گواہی دی اور اس مرد کو سنگسار کر دیا گیا۔ پھر دونوں طرح کے گواہ اپنے اپنے بیان سے پھر گئے تو وہ تمام گواہ اجتماعی طور پر اس شخص کا خون بہا ادا کرنے کے ذمہ دار ہوں گے۔ اس پر سب کا اتفاق ہے اور امام ابو یوسف کے نزدیک ان سب کو تہمت لگانے کے جرم میں سزا دی جائے گی۔

امام محمد بن الحسن کہتے ہیں کہ گواہ خون بہا کے تو ذمہ دار ہوں گے لیکن ان پر حد قذف نافذ نہ ہوگی۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی گواہ مجرم کو سزا ملنے کے بعد اپنی گواہی سے انحراف کرے تو صرف اس پر حد قذف عائد ہوگی۔ اور چوتھائی خون بہا کی ادائیگی کا ذمہ دار ہوگا۔ اگر سزا ملنے سے پہلے کوئی ایک گواہ اپنے بیان سے پھر جائے تو ان

سب کو سزائے قذف ملے گی۔ کیونکہ گواہوں کی تعداد چار سے کم ہو گئی (لہذا جرم ثابت نہ ہوا اور سب تہمت کے مجرم ہوئے)۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی گواہ اپنے بیان سے پھر جائے تو وہ واجب القتل ہے کیونکہ وہ ملزم کے ناحق قتل کیے جانے کا ذمہ دار ہے۔

شاہدوں کا ناقابل اعتماد ثابت ہونا

اگر قاضی (یعنی عدلیہ) کسی کو ذرہ زنی کی سزا کا حکم دے اور سزایابی کے دوران وہ شخص مرجائے یا زخمی ہو جائے۔ پھر یہ ثابت ہوا کہ گواہی دینے والے حق گو نہیں ہیں بلکہ دروغ باف ہیں یا یہ معلوم ہوا کہ گواہ فاسق ہے یا مسلمان نہیں ہے یا غلام ہے یا تہمت لگانے کے جرم میں سزا پا چکا ہے۔ یا نابینا ہے تو ایسے گواہوں کو سزا دی جائے گی۔ اس پر تمام علماء متفق ہیں۔ (اور جن باتوں میں اختلاف ہے وہ یہ ہیں)۔

امام ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ قاضی نے جب فیصلہ کر دیا اس کے بعد اس پر کوئی ذمہ داری نہیں نہ گواہوں سے باز پرس ہے نہ بیت المال (سرکاری خزانہ) پر کوئی بار ہوگا۔

صاحبین کہتے ہیں کہ تادان یا دیت کی ادائیگی بیت المال کے ذمہ ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر گواہ کا فاسق ہونا (نفاذ سزا کے بعد) ثابت ہو تو قاضی (عدلیہ) پر اس کی کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوگی، لیکن اگر گواہ مملوک غلام یا غیر مسلم ثابت ہو تو قاضی کو ذمہ دار قرار دیا جائے گا کہ وہ اس سزایافتہ کے گزارے کے لیے تادان ادا کرے کیونکہ اس نے گواہوں کے معتبر ہونے کی تفتیش میں کوتاہی کی۔

شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ (ایسی صورت میں) درہ زنی کی ضرب کا جو جسم پر اثر ہوا ہے اس کی تلافی یا جو زخم ہوا ہے اس کا تادان قاضی کے ذمہ ہے تاہم علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ مجرم کو سنگساری کی سزا ملنے کے بعد اگر گواہ کی نااہلیت ثابت ہوئی جیسا کہ اوپر ذکر ہوا تو اس کا تادان بیت المال کے ذمہ ہوگا اور گواہوں کو تہمت لگانے کی سزا ملے گی۔

بدوران سزا مجرم کی موت واقع ہو جانے کا بیان

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر درہ زنی یا جراحت کے باعث مجرم کی موت واقع ہو جائے۔ لیکن حاکم یہ سمجھتا تھا کہ مجرم یہ سزا جھیل لے گا تو حاکم پر نہ تادان عائد ہوگا نہ اسے گنہگار قرار دیا جائے گا اگر مجرم کے بچ جانے میں اسے شبہ تھا تو اس کی جان یا وجود پر جو حالت گزری حاکم اس کا ذمہ دار ہوگا اور اس کا تادان یا معاوضہ ایک گواہ کے برابر ادا کرے گا۔ لیکن اگر مجرم کے سلامت نہ رہنے کا گمان غالب ہو تو (حاکم پر) قصاص عائد ہوگا۔ مجرم کے سلامت رہنے کا گمان غالب ہونا یا نہ ہونا اس کا مشکوک ہونا، حاکم کے اقبال کر لینے پر اور صورت حالات پر منحصر ہے۔

یہ تمام احکام ان خطاؤں کی سزا کے بارے میں ہیں۔ جن پر حدود (شرعی سزائیں) عائد نہیں ہوتیں۔ ایسے جرائم جن پر حد عائد ہوتی ہے مثلاً کنوارے شخص کا ارتکاب زنا یا شراب نوشی یا تہمت تراشی پر درہ زنی کے دوران کوئی مرجائے تو حاکم پر کوئی ذمہ داری نہیں بشرطیکہ عام دستور کے مطابق ضرب لگائی گئی ہو توڑ پھوڑ والی ضرب نہ ہو۔ چنانچہ مروی

ہے کہ سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو کسی عورت کے متعلق نازیبا حرکت کی اطلاع ملی آپ نے ایک شخص کو اس کے پاس بھیجا وہ عورت اس قدر خائف ہوئی کہ اس کا حمل ساقط ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے ضائع شدہ حمل کے متعلق حضرت علیؓ سے مشورہ لیا حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اس بچے کا خون بہا لازم ہو گیا جو حمل کرنے سے ضائع ہوا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ ان کی قوم کی طرف سے اس کی ادائیگی کا بندوبست کیا جائے چنانچہ ایسا کر دیا گیا۔

(اس روایت کے پیش نظر) صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی رائے یہ ہے کہ گواہ پر بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے تاہم وہ اپنی ذمہ داری کے بل پر کسی کی جان نہیں لے سکتا، تا آنکہ وہ شخص مستوجب حد نہ ہو۔ اگر کسی کی جان کا نقصان ہوا تو حاکم اس کے تاوان کا ذمہ دار ہوگا لیکن گناہ سے بری متصور ہوگا۔ کیونکہ اسے ایسے جرائم کے ارتکاب پر بھی سزا دینے کا حکم ہے جس کے لئے اللہ کی مقرر کردہ حد (سزا) نہیں ہے۔ اور سزا ایسی ہونی چاہیے کہ سزا کی ضربات تکلیف دہ تو ہوں لیکن زخمی کرنے والی اور مہلک نہ ہوں۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ (سزا سے کوئی نقصان ہو تو) گواہوں پر کوئی تاوان عائد نہ ہوگا کیونکہ گواہی کی بناء پر جو سزا دی جائے اس سزا کا غیر مہلک ہونا واجب ہے۔ اسی طرح قاضی پر بھی کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوگی کیونکہ قاضی نے مہلک ضرب لگانے کا حکم نہیں دیا۔ اس کا ذمہ دار جلد ہے تاہم اس پر بھی بقول صحیح تاوان عائد نہ ہوگا۔ کیونکہ ہلاک کرنے کے ارادہ سے اس نے حد نہیں ماری اور جب ارادہ نہ ہو تو مطلقاً کوئی تاوان عائد نہ ہوگا۔

نفاذ حد کے فیصلہ میں حاکم سے غلطی ہونے بیان

اگر حد یا قصاص کے نفاذ کا فیصلہ کرنے میں حاکم سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہو تو اس کے بارے میں علماء کی رائیں مختلف ہیں:

حنفیہ کہتے ہیں کہ حاکم کی فردگزاشت کا تاوان یا خون بہا مسلمانوں کے بیت المال سے ادا ہوگا۔ قاضی کے ذمہ کوئی تاوان نہ ہوگا۔ کیونکہ اس نے اپنی دانست میں صحیح فیصلہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں غلطی ہو سکتی ہے لہذا وہ بے قصور ہے۔ روایت ہے کہ امام علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ کوئی مجرم حد شرعی کے دوران مرجائے تو مجھے اس کا خیال نہیں کیونکہ اس کا مرنا برحق ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص شراب پینے کی سزا کے دوران مرجائے تو یہ ایسا واقعہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کے بعد پیش آیا۔ پس اگر بدوران سزا وہ مرجائے تو اس کا خون بہا بیت المال سے ادا کیا جائے یا فرمایا کہ حاکم وقت ادا کرے۔ اس بارے میں راوی کو شک ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ کی مقرر کردہ سزا ملنے کے دوران کوئی وفات پا جائے تو اس کا خون رائگاں ہے اور کسی پر اس کا خون بہا نہیں ہے۔

شافعیہ اور حنابلہ کی اس بارے میں دورائیں بتائی جاتی ہیں: ایک تو یہ ہے کہ ایسی حالت میں تاوان بیت المال سے ادا کیا جائے اور قاضی پر کوئی الزام عائد نہ ہوگا۔ دوسری رائے یہ بتائی گئی ہے کہ اس کا تاوان قاضی اور اس کے متعلقین پر ہوگا۔ کیونکہ قاضی کی یہ ذمہ داری تھی کہ سزا اس طرح دی جائے کہ جان تلف ہونے سے بچ جائے مثلاً چوری کی پاداش میں ہاتھ کاٹنا ہو تو یہ ضروری ہے کہ جہاں سے کاٹنا ہے اس سے تجاوز نہ کرے اور تیار کیے ہوئے تیل وغیرہ میں ڈبو کر خون

بند کرے اور (حد میں) ایسی چوٹ نہ مارے جس سے مجرم کی جان جاتی رہے۔ اس لیے حاکم پر تاوان عائد ہوتا ہے۔ کیونکہ مجرم کی موت حاکم کے طریق سزا ہی سے واقع ہوئی لہذا حاکم موت کا ایک ذریعہ بن گیا جیسے ایک شخص نے شکار مارنا چاہا لیکن کوئی شخص اس کا نشانہ بن گیا۔ اس صورت میں تاوان عائد ہوگا کیونکہ نشانہ کا خطا ہونا بھی شکاری ہی کی غلطی ہے۔

گواہوں کا اپنے بیان سے پھر جانا

اگر چار اشخاص نے کسی کے ارتکاب زنا کی گواہی دی اور دو اشخاص نے مجرم کے شادی شدہ ہونے کی گواہی دی جس کی بناء پر حاکم نے سنگساری کی سزا نافذ کر دی اس کے بعد تمام گواہوں نے اپنے بیان سے رجوع کر لیا یعنی ارتکاب زنا کے گواہ اور اس کے شادی شدہ ہونے کے گواہ اپنے بیان سے پھر گئے۔ ایسی صورت میں:

حنفیہ کہتے ہیں کہ صرف زنا کے گواہوں پر خون بہا اور شادی کے گواہوں پر کوئی تاوان نہیں ہے۔
شافعیہ کہتے ہیں کہ مقدار تاوان میں سے دو تہائی کی ادائیگی زنا کے گواہ کریں اور ایک تہائی کے ذمہ دار شادی کے گواہ ہوں گے۔

حنابلہ کہتے ہیں کہ خون بہا کے ذمہ دار دونوں طرح کے گواہ نصفانصف ہوں گے یعنی آدھا تاوان زنا کے چاروں گواہ اور آدھا تاوان شادی کے دو گواہ ادا کریں، کیونکہ سزا ان سب کی مجموعی گواہی کی بناء پر دی گئی اگر صرف زنا کے گواہ شہادت دیتے اور شادی کے گواہ نہ ہوتے تو مجرم کو صرف دُڑہ زنی کی سزا ہوتی (سنگسار نہ کیا جاتا) پس جس بناء پر مجرم کی جان ناحق جانے کا ظلم ہوا وہ شادی کے گواہوں کی شہادت تھی (لہذا دونوں برابر کے ذمہ دار ہیں)۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ اس بارے میں دو رائے ہیں اور زیادہ قوی رائے یہ ہے کہ تاوان صرف زنا کے گواہوں پر ڈالا جائے جیسا کہ حنفیہ کہتے ہیں۔ دوسری رائے یہ ہے کہ تاوان دونوں طرح کے گواہوں پر نصفانصف عائد کیا جائے۔

جاننا چاہیے کہ

تمام علماء اس پر متفق اللفظ ہیں کہ 'حد' (سزائے شرعی) کا نفاذ کرنا حاکم کے سوا اور کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم 'اجلدوا' (یعنی درے مارو) میں امام وقت کو خطاب ہے۔ اس پر تمام امت کا اتفاق ہے۔ اسی غرض سے کسی کو امام مقرر کر لینا واجب ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے نفاذ حد کا حکم دیا۔ سب کے نزدیک امام (حاکم شرع) کے سوا اور کوئی شخص حد قائم کرنے کا مجاز نہیں ہے اور اس امر واجب کی ادائیگی کی تکمیل بغیر امام کے نہیں ہو سکتی اور چونکہ مکلف انسان کو اس کا مقدور ہے اس لیے امام کا مقرر کرنا واجب ہے۔ امام نہ ہو تو کسی اور شخص کو حدود (شرعی سزائوں) کے لاگو کرنے کا حق نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ لوگ صالح اصحاب میں سے کسی کو فیصلہ کے لیے متعین کر لیں جو فیصلہ کیا کرے۔

شہادت گزر جانے کی گواہی کا بیان

حنفیہ، مالکیہ، حنابلہ اور شافعیہ کی ایک رائے کے بموجب اگر چار اشخاص یہ گواہی دیں کہ فلاں شخص کے خلاف ارتکاب زنا کی چار شہادتیں گزر چکی ہیں تو ان شہادتوں کی بناء پر حد نافذ نہیں کی جائیگی کیونکہ اس کے ثبوت میں دو مرحلوں

میں شبہات واقع ہونے کے باعث شبہ زیادہ ہو جاتا ہے ایک مرحلہ اصل شاہدوں کا دوسروں کو حامل شہادت بنانا اور پھر ان دوسروں کا نقل کرنا ہر چند کہ شریعت کی رو سے گواہی گزرنے کی تصدیق کے لیے گواہی پر بالعموم اعتبار کیا جاتا ہے اور مالی معاملات میں اس کی بناء پر فیصلہ ہوتا ہے لیکن یہ فیصلہ کمزور ہوتا ہے اور فی الجملہ اس پر اعتبار کیے جانے سے یہ ضروری نہیں ہو جاتا کہ ہر معاملہ میں اس پر اعتبار کیا جائے یہ ایسا ہی ہے جیسے عورتوں کی شہادت پر اعتبار کرنا۔ کیونکہ مالی معاملات میں تو ان کی شہادت قابل اعتبار اور درست ہے۔ لیکن نفاذ حد کا معاملہ ہو تو معتبر نہیں ہے اور اس لیے بھی کہ اس میں شبہ زیادہ ہے۔ اس کے باوجود عورتوں کی گواہی قابل اعتبار ہے لیکن حدود (شرعی سزاؤں) کے بارے میں نہیں اس کا سبب یہ ہے کہ نفاذ حد کے بارے میں جلدی کرنے سے احتیاط کرنا چاہیے۔ اور احتیاط اس میں ہے کہ ان صورتوں میں شہادتوں کو رد کر دیا جائے کیونکہ یہ گواہیاں اصل گواہوں کی بجائے ہیں اور جب اصل گواہوں کے بدلہ گواہی پیش ہو تو ثبوت مدعا میں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ لیکن اس گواہی کے باطل کر دینے میں احتیاط کی حاجت نہیں ہے۔

شافعیہ کی دوسری رائے یہ ہے کہ شہادت گزر جانے کے ثبوت میں گواہی پیش ہو تو اسے قبول کیا جائے اور اس کی بناء پر حد نافذ کی جائے بشرطیکہ گواہی کی شرائط پوری ہوتی ہوں۔

گواہوں میں سے کسی ایک گواہ کے منحرف ہو جانے کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر گواہوں میں سے کوئی گواہ (مقدمہ کا) فیصلہ ہو جانے کے بعد لیکن (مجرم کو) سزا ملنے سے پہلے اپنے بیان سے پھر جائے تو تمام گواہوں کو جرم اتہام کی پاداش میں سزا دی جائے کیونکہ حکم (فیصلہ) پر عملدرآمد بھی فیصلہ کا حصہ ہے۔ لہذا فیصلہ پر عملدرآمد سے پہلے کسی گواہ کا منحرف ہو جانا فیصلہ سے پہلے منحرف ہو جانا ہے اور حکم پر عملدرآمد (یعنی نفاذ حد) کو فیصلہ کا ایک حصہ قرار دے جانے کا ثبوت یہ ہے کہ اگر گواہی کے باطل ہونے کا کوئی ثبوت مل جائے یا ملزم کا شادی شدہ ہونا تسلیم نہ کیا جائے۔ یا قاضی (یا حاکم عدلیہ) کو برطرف کر دیا جائے تو حد قذف وغیرہ موقوف کر دی جاتی ہے۔

اگر گواہوں میں سے کوئی گواہ فیصلہ ہونے سے پہلے اپنے بیان سے انحراف کرے تو تمام گواہوں کو جرم قذف کی سزا دی جائے گی کیونکہ ان کا بیان بذات خود تہمت لگانا ہے۔ (شہادت نہیں ہے) شہادت تو اس صورت میں ہوتی جب کہ اس کی بناء پر فیصلہ ہوتا۔ گواہوں کا بیان چونکہ فیصلہ سے مربوط نہیں ہے کیونکہ ان کا اپنے بیان سے پھر جانا مانع فیصلہ ہے لہذا وہ بیان (گواہی نہ رہا بلکہ) الزام تراشی ہو گیا اور گواہ حد قذف کے سزاوار ہوئے۔

اگر چار گواہوں میں سے ایک گواہ، گواہی دینے سے انکار کر دے تو ان تین گواہوں کو تہمت لگانے کی سزا دی جائیگی اور چوتھے گواہ (جس نے گواہی دینے سے انکار کیا) کو سزا نہیں دی جائے گی۔ ان تین گواہوں کو سزا ملنے کا سبب یہ نہیں ہے کہ چوتھے نے گواہی نہیں دی بلکہ اس سبب سے ہے کہ انھوں نے یہ بیان دیا کہ فلاں شخص نے زنا کیا (اور وہ زنا ثابت نہ ہوا) پس اس بارے میں چوتھے گواہ کے خاموش رہنے کو نہیں دیکھا جائے گا یعنی ہر ایک کو اپنے جرم کی پاداش میں پکڑا جائے گا۔ دوسرے کے قصور پر اس گواہ سے کوئی مواخذہ نہیں ہے کیونکہ تہمت لگانے کا جرم ان تینوں نے کیا (جنھوں نے گواہی دی)۔

پانچ گواہوں کی شہادت کا بیان

حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر گواہوں کی تعداد پانچ ہو اور ان میں سے کوئی گواہ مجرم کے سنگسار ہو جانے کے بعد اپنے بیان سے پھر جائے تو اس شخص کو نہ کوئی سزا دی جائے گی اور نہ اس پر تاوان عائد ہوگا، کیونکہ پانچویں گواہ کے رجوع کے بعد بھی شہادت کا حق یعنی چار اشخاص کا گواہی دینا پورا ہو گیا۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اس (پانچویں گواہ) پر تاوان کا پانچواں حصہ عائد ہوگا۔

پانچ میں سے دو گواہوں کا اپنے بیان سے پھر جانا

حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر پانچ گواہوں نے جرم زنا کی شہادت دی ہو اور مجرم کو سنگسار کر دیا جائے اس کے بعد ان پانچ گواہوں میں سے دو گواہ اپنی گواہی سے پھر گئے تو ان تمام گواہوں کو قذف کے جرم میں سزا دی جائے گی اور یہ دونوں (پھر جانے والے) گواہ تاوان واجب کا چوتھا حصہ رجم شدہ کے ورثاء کو ادا کریں گے۔ قذف کی سزا تو اس لئے کہ ان تمام گواہوں کی گواہی (اب گواہی نہ رہی بلکہ) تہمت قرار پائی، کیونکہ دو آدمیوں کے اپنے بیان سے پھر جانے کے باعث جرم ثابت نہ ہوا اور تاوان اس لیے کہ تین چوتھائی حق تاوان جو ان گواہوں کے ذمہ لگایا گیا اس کے بعد اتنا ہی باقی رہا۔ اور تاوان کی اس مقدار کا اعتبار کیا جائے گا جو بقیہ گواہوں پر عائد کرنے سے باقی رہے۔ رجوع کرنے والوں کے رجوع کو نہ دیکھا جائے گا۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر اپنے بیان سے پھرنے والے گواہ یہ تسلیم کریں کہ ان سے گواہی دینے میں غلطی ہوئی تو وہ اپنے حصہ کا صرف تاوان ادا کریں گے اس کے دو طریقے ہیں ایک تو یہ کہ وہ تاوان کے دوئس (یعنی ۲/۵) ادا کریں۔ اور دوسرا یہ کہ کل تاوان کا ایک چوتھائی ادا کریں جیسا کہ ائمہ ثلاثہ کہتے ہیں۔ لیکن اگر دونوں گواہ کہتے ہیں کہ ہم نے جان بوجھ کر جھوٹی گواہی دی تھی اور اب اس سے پھر گئے ہیں تو انھیں بطور قصاص قتل کر دیا جائے گا۔

صلاحیت گواہوں کی تصدیق کرنے والوں کا انحراف

اس امر پر ائمہ کا اتفاق ہے کہ اگر چار اشخاص نے کسی شخص کے خلاف ارتکاب زنا کی گواہی دی تو ان چاروں کی صلاحیت کی تصدیق کے لیے گواہ یوں کہیں گے کہ یہ لوگ آزاد، مسلمان اور عدول (حق پسند) ہیں۔ اگر انھوں نے صرف یہ کہا تھا کہ یہ حق پسند ہیں لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ غلام (مملوک) تھے تو ان کی صلاحیت (یا باصطلاح حال نیک چلنی) کی شہادت دینے والوں پر کوئی الزام نہیں ہے اگر بطریق بالا گواہوں کی صلاحیت کی شہادت دی گئی اور (گواہان جرم کی شہادت پر) مجرم کو سنگسار کر دیا گیا اس کے بعد پتہ چلا کہ گواہ کافر تھا یا غلام تھا لیکن صلاحیت کے گواہ بدستور یہی کہتے رہے کہ وہ آزاد اور مسلمان تھے تو ان (صلاحیت کے) گواہوں پر بالاتفاق کوئی الزام نہیں ہے۔ اگر وہ کہیں کہ ہمیں اس بارے میں غلط فہمی ہو گئی تھی تب بھی اصل گواہوں کا کفر ظاہر ہو جانے پر کوئی ذمہ داری (صلاحیت کے گواہوں پر) عائد نہ ہو گی کیونکہ ایسا ممکن ہے کہ کوئی گواہ اس کی (صلاحیت کی) گواہی گزرنے کے بعد کافر ہو گیا ہو۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر گواہوں کی صلاحیت کی شہادت دینے والے کہیں کہ ہم نے جان بوجھ کر یہ کہا تھا کہ یہ گواہ

آزاد یا مسلمان ہیں۔ حالانکہ ہمیں معلوم تھا کہ نہ وہ آزاد (غیر مملوک) ہیں نہ مسلمان ہیں تو یہ لوگ مستوجب تاوان قرار پائیں گے اور انھیں تاوان دینا ہوگا۔ صاحبین کو اس سے اختلاف ہے وہ کہتے ہیں کہ تاوان بیت المال (سرکار خزانے) سے ادا کیا جائے۔

مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ صورت مذکورہ میں صالحیت کے گواہوں پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوگی اور تاوان بیت المال سے ادا کیا جائے گا ان پر تاوان لگایا گیا تو ظلم ہوگا، کیونکہ تاوان اس صورت میں عائد ہوتا ہے جبکہ کوئی شخص (امر موجب تاوان میں) شریک ہو یا اس امر کا موجب بنا۔ کیونکہ مجرم کے ہلاک ہونے کا سبب ارتکاب زنا ہے جس کا ثبوت ان (صالحیت کے) گواہوں سے نہیں ہوا انھوں نے گواہوں کے صالح ہونے کی تصدیق کی تھی اس کی مثال ایسی ہے جیسے احسان (شادی شدہ ہونے) کی گواہی، کہ سنگسار ہونے کے بعد اگر معلوم ہو کہ مجرم شادی شدہ نہیں تھا تو شادی کے گواہ پر کوئی الزام نہیں ہے کیونکہ شادی شدہ ہونے کی گواہی سے ارتکاب زنا ثابت نہیں ہوتا جو اس کے سزا یاب ہونے کا موجب ہے۔ اسی طرح صالحیت کے گواہ پر بھی کوئی الزام عائد نہ ہوگا۔

امام ابو حنیفہ کے نزدیک ایسے گواہوں پر تاوان واجب ہونے کی دلیل یہ ہے، کہ جن گواہوں کی شہادت پر حاکم کے لیے سنگساری کا حکم دینا واجب ہو جاتا ہے، ان گواہوں کے صالح ہونے کا ثبوت ضروری ہے، پس صالحیت کی گواہی مجرم کی ہلاکت کے لیے علت علت ہے لہذا حکم (سنگساری) کو اس علت علت کی طرف منسوب کرنا بھی اصل علت (سبب) سے منسوب کرنے کی مانند ہے۔ جیسا کہ بتایا گیا بخلاف احسان (شادی شدہ ہونے) کی شہادت کے کہ یہ گواہی کہ (فلاں شخص شادی شدہ ہے) سنگساری کی موجب نہیں ہے اور نہ اس کی شدت کی موجب ہے بلکہ سزا کا موجب ارتکاب زنا ہے اور سزا میں سختی اس کے شادی شدہ ہونے کی وجہ سے نہیں ہے کیونکہ شادی اللہ کی نعمت ہے اور اس سزا کا سبب اللہ کی اس نعمت کا کفران ہے۔ اور یہ گواہی علامت ہے مجرم کے شدت سزا کا مستوجب ہو جانے کی اور سزا کا سبب شکر کی بجائے کفران نعمت ہے۔

حنفیہ یہ بھی کہتے ہیں کہ صالحیت کی تصدیق کو شہادت سے جدا نہیں کیا جاسکتا (یعنی یہ بھی شہادت ہے) اور اس شہادت کا مجلس قضا (عدالت) میں گزارنا ضروری نہیں ہے۔ نیز امام ابو حنیفہ اور ابو یوسف کے نزدیک اس کے لیے گواہوں کی تعداد مقرر نہیں ہے۔ لیکن امام محمد فرماتے ہیں کہ تمام معاملات میں ثبوت کے لیے دو گواہ ضروری ہیں تاہم ارتکاب زنا کے ثبوت کو چار گواہوں کی شرط ہے اور شادی کے ثبوت کو ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی جائز ہے پھر یہ کہ گواہوں پر حد قذف نافذ نہیں ہوتی کیونکہ انھوں نے جو الزام لگایا اس کا تعلق مجرم کے عہد حیات سے تھا اور وہ وفات پا چکا ہے اور قذف کی سزا کا حق درشہ میں نہیں آتا۔ لیکن اگر کوئی گواہ (بحیثیت مرد آزاد گواہی دے) اور بعد میں (جبکہ مجرم کو سزا دی جا چکے) وہ شخص غلام (مملوک) ثابت ہو اور گواہی سے پھر جائے تو بالاتفاق وہ مستوجب سزا ہوگا۔

سزائے سنگساری کا حکم ہو جانے کے بعد مجرم کے قتل کیے جانے کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر چار اشخاص نے کسی شخص کے خلاف ارتکاب زنا کی گواہی دی اور قاضی (حاکم) نے اسے سنگسار کیے جانے کا حکم دے دیا اس کے بعد کسی شخص نے مجرم کو گواہی کے بعد لیکن گواہوں کی چھان بین سے پہلے بالارادہ یا

غلطی سے قتل کیا تو قصداً قتل کرنے والے سے قصاص لیا جائے گا اور اگر غلطی سے قتل ہوا ہے تو اس کے مستحق رشتہ داروں کو خون بہا دلویا جائے گا۔ یہی حکم اس صورت میں ہے جبکہ گواہوں کی صالحیت ثابت ہونے کے بعد لیکن سزائے سنگساری کا حکم صادر ہونے سے پہلے کسی نے مجرم کو قتل کر دیا۔ لیکن اگر حاکم نے سنگساری کا حکم دے دیا اس کے بعد کسی نے مجرم کو ارادۂ یا غلطی سے قتل کر دیا تو قاتل کے ذمہ کچھ لازم نہ ہوگا۔ اگر فیصلہ کے بعد قصداً قتل کیا پھر ثابت ہوا کہ گواہ غلام (مملوک) یا کافر تھے یا تہمت کے جرم میں سزا پا چکے ہیں تو قاتل پر قصاص واجب ہوگا۔ کیونکہ اس نے ایسے شخص کے قتل عمد کا ارتکاب کیا جس کی سزائے موت معاف ہو گئی تھی اور اس صورت میں جبکہ یہ معلوم ہو گیا کہ گواہی دینے والے (آزاد نہیں بلکہ) غلام تھے لہذا فیصلہ صحیح نہیں ہوا اور مجرم کا خون روا نہیں ہے پھر بھی اسے قتل کیا گیا اور اس طرح کہ حکم نہ تھا یعنی حکم سنگسار کرنے کا تھا لیکن اس کی گردن کاٹی گئی۔ لہذا قاضی کے حکم کے مطابق عمل نہ ہوا کہ یہ سمجھا جاتا کہ قتل کے حکم کی تعمیل اس شخص کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔ پس بہر حال وہی قصور وار گردانا جائے گا 'استحسان' کی رو سے کہ صورت بالا میں قاتل پر تاوان عائد ہوگا (قصاص نہ ہوگا) کیونکہ قاضی کا حکم رجم ظاہری ثبوت پر نافذ ہوا ہے لیکن اگر مجرم کو قتل کرنے کے وقت قاضی کا فیصلہ صحیح تھا تو اس سے (سنگساری کی بجائے) قتل کے روا ہونے کا شبہ نکلتا ہے۔ اس لیے کہ اگر ظاہر اور باطن دونوں لحاظ سے حکم نافذ کیا جائے تو حقیقی طور پر قتل کا روا ہونا ثابت ہوتا لیکن اگر ایک لحاظ سے تعمیل حکم ہو اور دوسرے لحاظ سے نہ ہو (یعنی قتل تو کر دیا جائے لیکن سنگسار نہ کیا جائے) تو یہ شبہ اقدام عمل ہوا۔ برخلاف اس صورت کے جبکہ فیصلہ صادر ہونے سے پہلے مجرم کو قتل کر دیا جائے۔ کیونکہ محض گواہی کا گزر جانا جرم کا ثبوت نہیں ہے (تا آنکہ حاکم کا فیصلہ صادر نہ ہو) لہذا اس صورت میں قاتل پر قصاص عائد ہوگا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص بدیں گمان کسی کو قتل کر دے کہ وہ شخص برسر جنگ (دشمن) ہے، جبکہ اس میں ایسی علامتیں پائی جاتی ہوں اور بعد میں پتہ چلے کہ وہ (دشمن نہیں) مسلمان تھا، تو قاتل کے مال میں سے اس کا خون بہا واجب الادا ہوگا۔ کیونکہ اس نے قتل عمد کیا ہے اور اس کے رشتہ دار عمد ارتکاب قتل میں دیت نہیں دیتے۔ خون بہا کی یہ ادائیگی تین سال میں کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ یہ تاوان قتل کی پاداش میں عائد ہوتا ہے اور جو تاوان جیسے خون بہا قتل کی سزا میں عائد ہو اس کی ادائیگی (فوری طور پر واجب نہیں ہے بلکہ) تاخیر سے ہو سکتی ہے اس کے خلاف جو مطالبہ باہمی تصفیہ سے واجب ہو جیسے قود (یعنی وہ تاوان جو مقتول کے ورثا قبول کر لیں)، وہ فوری طور پر واجب الادا ہے۔ کیونکہ یہ مطالبہ باہمی تصفیہ کی بناء پر واجب الادا ہوا ہے، قتل کی پاداش میں عائد نہیں ہوا۔

اگر مجرم (زنی محسن) کو قاتل نے سنگسار کر کے ہلاک کر دیا اور بعد میں معلوم ہوا کہ اس جرم کے گواہ غلام (ہونے کے باعث نا اہل) تھے تو قاتل پر تاوان عائد نہ ہوگا بلکہ بیت المال سے اس کا خون بہا ادا کیا جائے گا۔ کیونکہ قاتل نے قاضی کے حکم کی پوری تعمیل کر دی ہے۔

زنا کے گواہوں کا شرمگاہوں کو دیکھنا

چاروں اماموں کا اس پر اتفاق ہے کہ چار گواہوں نے ارتکاب زنا کی گواہی کسی کے خلاف دی اور انہوں نے کہا کہ میں نے دونوں کی شرمگاہوں کو اچھی طرح دیکھا ہے کیونکہ تفتیش کے وقت اثبات جرم پر قادر ہونے کے لیے یہ امر ضروری تھا تو ان کی گواہی قبول کی جائے گی۔ ناگزیر حالات میں ستر کا بار بار دیکھنا گناہ نہیں ہے۔ جیسے دائی، دوا، ختنہ کرنے

ارتکاب زنا کا اقبال کر لینے کا بیان

عہد نبی ﷺ اور عہد خلفائے راشدین کی ایسی احادیث کا جن کا تعلق سنگساری سے ہے، بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت اس گناہ کا مرتکب خود حاضر خدمت ہو کر اس بات کا اعتراف کرتا تھا کہ اس نے اس فعل بد کا ارتکاب کیا ہے۔ تاہم اس بارے میں بڑی رد و کد نہیں کی جاتی تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ لوگ اس کی سزا کا جاری ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔ لہذا اس سزا کا نفاذ

والا، معالج اور انیمہ دینے والے کا دیکھنا یا بکارت کا امتحان اور یا واپسی کی شرط پر لیے ہوئے مملوک کے عیب کا پتہ لگانا ہو وغیرہ اور بہتر یہ ہے کہ عورت کے ایسے معاملات کو عورت ہی انجام دے۔ اگرچہ ضروری حصے سے زائد حصہ ڈھکنا واجب نہیں ہے۔ اگر گواہ نے لذت اندوزی کے لیے ستروں پر نظر ڈالی ہو تو ایسے شخص کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔

گواہوں کی تعداد کا چار سے کم ہونا

واضح ہو کہ اگر ارتکاب زنا کے گواہوں کی تعداد چار سے کم ہو تو یہ جرم ثابت نہ ہو گا اور نہ مجرم پر حد نافذ ہو گی۔ گواہوں پر حد قذف نافذ ہونے کے بارے میں اختلاف ہے بعض اصحاب کہتے ہیں کہ گواہوں کو سزا دینا واجب نہیں ہے کیونکہ وہ گواہ کی حیثیت سے آتے ہیں (مجرم کی حیثیت سے نہیں) اور اس لئے بھی کہ اگر ان پر تشدد روا رکھا جائے تو ارتکاب زنا کی شہادت کا دورازہ ہی بند ہو جائے گا۔ ہر گواہ کو یہ خطرہ ہوگا کہ مبادا ان کا ساتھی (گواہ) دوسرے ساتھی (گواہ) کے موافق بیان نہ دے تو اسے سزا بھگتنی پڑے گی۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر گواہ چار سے کم گواہی دیں تو ان پر حد قذف واجب ہو جائے گی کیونکہ ایک گواہ نے جب (ارتکاب زنا) کی گواہی دی تو گویا اس شخص پر تہمت لگائی اور (اپنی تصدیق میں) چار گواہ پیش نہ کر سکا تو اس پر حد قذف واجب ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”والذین یرمون المحصنات ثم لم یاتوا بأربعة شہداء فاجلدوہم ثمانین جلدة“ (یعنی جو لوگ بے قصور عورتوں پر الزام تھوپیں اور چار گواہ پیش نہ کر سکیں تو انہیں اسی درے مارو) اور حضرت مغیرہ بن شعبہ سے روایت ہے کہ چار اشخاص نے ان کے خلاف حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے سامنے، ارتکاب زنا کی شہادت دی گواہوں میں ابو بکرہ نافع اور نفیع تھے اور چوتھا گواہ زیاد تھا ”رایت استاتنبو ونفسا یعلو ورجلاھا علی عاتقہ کاذنی حمار ولا ادری مارواء ذلک، فجلد عمر الثلاثة ولم یسأل هل معہم شاہد آخر، لانه تبین انه کان نائما مع زوجتہ“ (یعنی میں نے دیکھا کہ ایک عورت کا سرین اٹھا ہوا تھا اور ایک شخص اس کے اوپر تھا عورت کے دونوں پاؤں اس شخص کے مونڈ ہوں پر اس طرح تھے جیسے گدھے کے دوکان، اس کے آگے مجھے معلوم نہیں)۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تینوں گواہوں کو درے لگائے اور یہ دریافت نہیں فرمایا کہ آیا ان

صرف اسی صورت میں ہوتا تھا جب کوئی یہ ٹھان ہی لیتا تھا کہ اپنی جان کو اس گناہ عظیم کی بد انجامی سے پاک کرے اور دوسرے کی آبروریزی کے گناہ سے نجات پائے۔^(۱)

کے ساتھ کوئی اور گواہ بھی ہے؟ کیونکہ انھیں یہ معلوم ہوا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ سو یا ہوا تھا غیر کے ساتھ نہ تھا۔

(۱) چاروں اماموں کا اس پر اتفاق ہے کہ اقبال جرم کر لینے سے ارتکاب ثابت ہو جاتا ہے خواہ مرد اقبال کرے یا عورت۔ مرتکب شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ اور آزاد ہو یا مملوک (غلام یا لونڈی) لیکن یہ شرط ہے کہ اقبال کرنے والا عاقل بالغ اور باشعور ہو اور اسے اقرار کر لینے پر مجبور نہ کیا گیا ہو۔

چار بار اقبال جرم کرنے کا بیان

حنفیہ، حنابلہ اور ابن ابی لیلے کہتے ہیں کہ (ثبوت کے لیے) اقرار جرم کی تعداد کو ملحوظ رکھنا شرط ہے۔ عاقل اور بالغ انسان اگر اپنے جرم کا چار بار یکے بعد دیگرے اقرار نہ کرے تو اقبال جرم تسلیم نہ کیا جائے۔ حدود شرعیہ پر عملدرآمد کے لیے (اقبال جرم کے لیے) توثیق و تاکید ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ دنیا کو فنا کرنے کی بہ نسبت اسے باقی رکھنا زیادہ پسند فرماتا ہے چنانچہ اس ارشاد میں اسی کی طرف اشارہ ہے ”ان جنحوہا للسلم فاجنح لہا وتوکل علی اللہ“ (یعنی لوگ اگر امن و سلامتی کی طرف جھک جائیں تو تم بھی جھک جاؤ اور خدا پر بھروسہ کرو) یعنی اگر دشمن امن چاہے اور جنگ کا خیال چھوڑ دے تو تم بھی جنگ کرنے سے باز آ جاؤ نیز اللہ کا ارشاد ہے ”ومن احبھا فکانما احیا الناس جمیعاً“ (یعنی جس نے ایک جان بچائی اس نے گویا تمام انسانوں کی جان بچائی)۔ ایسا کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ جان کا تلف کرنا گناہ کبیرہ ہے اور جب تک کہ اس سے بچنے کے تمام وسائل کی چھان بین اچھی طرح نہ کر لی جائے اتلاف جان کا اقدام نہ کرنا چاہیے۔

چار بار اقرار کرانے کا سبب یہ بھی ہے کہ فقہاء نے اقرار جرم کو گواہی کے برابر رکھا ہے۔ چونکہ عام معاملات کے خلاف ثبوت زنا کے لیے گواہوں کی تعداد چار رکھی گئی ہے اسی طرح اقبالی مجرم کا چار بار اقبال جرم واجب ہے۔ کیونکہ ہر اقرار کا ایک گواہ کے برابر تصور کیا گیا ہے۔

چار بار اقرار کا ذکر ماعز وغیرہ کی حدیثوں میں آیا ہے۔

مالکیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ اقبالی مجرم پر سزائے حد عائد ہونے کے لئے ایک بار ہی اقرار کرنا کافی ہے۔ اس میں کسی تعداد کی شرط نہیں ہے۔ دوسرے جرائم: قتل، سرقت اور شراب نوشی وغیرہ میں بھی اسی طرح ہوتا ہے۔ داؤد، حسن بصری، طبری اور اہل تحقیق علمائے فقہ کی ایک جماعت کا بھی یہی کہنا ہے اور ان کی دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت ابو ہریرہ اور زید بن خالد رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ”عسیف دالی حدیث میں یہ فرمایا ”واغسل یا انیس علی امراة ہذا، فان اعترفت فارجمھا“ (یعنی اے انیس کل اس عورت کے پاس جا اگر وہ ارتکاب جرم کا اعتراف کرے تو اسے سنگسار کر دینا) چنانچہ انیس اگلے روز اس کے پاس گئے اس نے اقرار جرم کر لیا اور نبی ﷺ کے حکم دینے پر اسے سنگسار کر دیا گیا۔ یہاں پر اس عورت کے اقبال جرم کرنے کی تعداد مذکور نہیں ہے۔ علاوہ اس کے اگر کوئی شخص اپنے

خلاف ایسے جرم کا اقرار کرتا ہے جس سے سزائے حد یا رجم عائد ہوتی ہے تو یہ اقرار ہی اس کی صداقت کا ثبوت ہے۔ لہذا بار بار اس اقرار کو دہرانے کی حاجت نہیں ہے۔ ایک ہی بار مجرم کا اعتراف جرم کر لینا ثبوت جرم کے لیے کافی ہے اور اس گناہ کا اعتراف وہی کرے گا جس کا یقین خالص اور ایمان صادق ہو۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں۔ اگر کوئی شخص خود اپنے خلاف گواہی دے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ عذاب آخرت پر کامل الایمان اور صادق الیقین ہے اور خود اپنے اوپر حد جاری کرنے (یعنی سزایاب ہونے) کا مطالبہ محض روز قیامت کے عذاب سے ڈر کر کیا ہے۔ لہذا اس کا اقبال جرم اگرچہ اس نے ایک ہی بار کیا ہو محض روز قیامت کے عذاب سے ڈر کر کیا ہے اور اس کا اقرار تسلیم کر لیا جائے گا۔ پس اس کے لئے بار بار اعتراف کرنے یا کوئی تعداد مقرر کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ اور آنحضرت ﷺ ماعز کے اعتراف جرم کو بار بار جو رد فرمایا اس کا سبب یہ تھا کہ حضور کو اس کے اعتراف کے بارے میں شک تھا اسی لیے فرمایا ”ابک جنون“ (یعنی تو پاگل تو نہیں ہے؟) اور اسی وجہ سے اس کے گھر والوں سے بھی اس کی بابت دریافت فرمایا تھا۔

کئی مجلسوں میں اقبال جرم کرنے کا بیان

وہ اصحاب جو اقبال جرم کے لیے تعداد کا مقرر کرنا شرط قرار دیتے ہیں ان کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا اقرار جرم چار مختلف جگہوں پر ہونا چاہیے؟

حنابلہ اور ابن لیلیٰ کہتے ہیں کہ چار بار اقبال جرم (ثبوت کے لیے) کافی ہے خواہ ایک ہی مجلس میں ہو۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ مجرم کو اقبال جرم چار بار اور چار مختلف جگہوں پر کرنا چاہیے۔ ان کی دلیل صحیح مسلم کی وہی روایت ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ماعز ابن مالک نے نبی ﷺ کے پاس آکر اعتراف جرم کیا، حضور نے اسے رد کر دیا پھر وہ دوسری بار آئے اور آپ نے پھر رد فرمایا اور اس کے اہل قبیلہ کے پاس آدمی بھیج کر دریافت فرمایا کہ آیا اس شخص کی عقل میں کوئی فتور تو نہیں ہے؟ انہوں نے بتایا کہ ہم تو اسے کامل العقل اور صالح افراد میں سے سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد تیسری بار ماعز آئے اور آپ نے انہیں واپس ان کے قبیلے میں بھیج کر مزید دریافت فرمایا، لوگوں نے کہا کہ نہ ان کو کوئی مرض ہے اور نہ اس کی عقل خراب ہے۔ غرض جب چار بار تحقیق ہو چکی تو اس کے لیے گڑھا کھودا گیا اور اس میں اس کو سنگسار کر دیا گیا۔

ایک روایت وہ ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ”ماعز اسلمی“ رسول اللہ ﷺ کے پاس چار بار آئے اور اپنے بارے میں بیان کیا کہ انہوں نے فلاں عورت کے ساتھ حرام کاری کی ہے۔ ہر بار حضور نے ان کی طرف سے منہ موڑ لیا اور پانچویں بار جب پھر انہوں نے یہی کہا تو آپ نے فرمایا کیا تم نے اس سے زیادتی کی؟ انہوں نے کہا جی ہاں۔ فرمایا کیا اس قدر کہ تمہارا عضو اس کے عضو میں غائب ہو گیا۔ انہوں نے کہا جی ہاں فرمایا اس طرح جیسے سلائی سرمہ دانی میں یاری کنویں میں؟ انہوں نے کہا جی ہاں۔ پھر سوال کیا تم جانتے ہو زنا کیا ہے؟ انہوں نے کہا جی ہاں میں نے اس کے ساتھ وہی فعل حرام کیا جو خاوند بیوی کے ساتھ بطور فعل حلال کرتا ہے۔ پھر حضور نے فرمایا کہ اب اس کا اقرار کرنے سے تمہارا کیا مقصد ہے انہوں نے کہا میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اس گناہ سے پاک کر دیں۔ تب حضور نے رجم کا حکم دیا اور انہیں سنگسار کر دیا گیا۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے دو صحابیوں کو باہم یوں باتیں کرتے ہوئے سنا۔ ایک نے اپنے ساتھی سے کہا کہ ”ذرا اس شخص کو دیکھنا کہ اللہ نے اس کا پردہ ڈھکا لیکن اس کے نفس نے اس کا پیچھا اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک کہ کتے کی طرح اس پر پھراؤ نہیں کیا گیا۔“ آنحضرت ﷺ نے یہ سنا اور خاموش رہے۔ گھڑی بھر چلنے کے بعد ایک

مردار گدھے کے پاس سے گزر رہا تھا پھولا ہوا چیت پڑا ہوا تھا۔ آپ نے آواز دی کہ فلا نے فلا نے کہاں ہو؟ ان دونوں نے کہا، یا رسول اللہ ہم یہ رہے فرمایا اس مردار گدھے کا گوشت کھاؤ۔ دونوں نے کہا، یا رسول اللہ بھلا اسے کون کھائے گا؟ فرمایا ابھی ابھی جو بے حرمتی اپنے بھائی کی تم نے کی ہے، وہ اس کا گوشت کھانے سے زیادہ گندی بات ہے۔ میں اس ذات کی قسم کھاتا ہوں جس کے دست قدرت میں میری جان ہے کہ اس وقت وہ جنت کی نہروں میں غوطے لگا رہے ہیں۔

اس حدیث سے اقبالی مجرم کا کئی جہت سے آنا اور بار بار رد ہو جانے سے متعدد دفعہ اقرار کرنا واضح ہے اور اسی کی تائید ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ارتکاب گناہ کا ایک بار اقرار کرنا ثبوت کے لئے کافی خیال نہیں فرماتے تھے بلکہ کئی بار اقرار کراتے تھے۔ تاکہ اس امر کا پورا وثوق ہو جائے کہ اقبالی مجرم سچ کہہ رہا ہے اور حد جاری کرنے پر مصر ہے۔ بخاری نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ مسجد میں تھے کہ ایک شخص آیا اور اس نے پکار کر کہا یا رسول میں نے بدکاری کی ہے۔ حضور نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا، وہ شخص اس طرف سے جدھر پہلے حضور کا چہرہ تھا دوسرے رخ سے آیا اور پھر کہا کہ یا رسول اللہ میں نے بدکاری کی آپ نے اس طرف سے منہ موڑ لیا وہ شخص پھر ادھر سے مڑ کر آیا اور جب چار بار اس نے اپنے خلاف بیان دیا تو نبی ﷺ نے اسے بلایا اور فرمایا 'ایک جنون' (یعنی کیا تو پاگل ہے؟) اس نے کہا 'لا رسول اللہ' (یعنی نہیں تو، یا رسول اللہ) پھر سوال فرمایا 'احصنت' (یعنی کیا تو شادی شدہ ہے؟) اس نے کہا 'نعم یا رسول اللہ' (یعنی ہاں اے رسول اللہ) تب آپ نے حکم دیا کہ اسے لے جاؤ اور سنگسار کر دو۔ یہ حدیث چار بار اقبال جرم کرنے کے بارے میں واضح ہے۔ یہ موقع اس لیے دیا جاتا ہے کہ ممکن ہے وہ شخص اپنا گناہ چھپانے کے لیے اپنے اقرار سے پھر جائے۔

مسند امام احمد میں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کی موجودگی میں ماعز سے کہا تھا کہ اگر تم نے چوتھی بار بھی اقبال جرم کیا تو تمہیں سنگسار کر دیا جائے گا۔

ایک اور حدیث ابو داؤد اور نسائی نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابی بیان کرتے ہیں کہ عائد یہ اور ماعز بن مالک اگر اقرار گناہ کے بعد اپنے بیان سے پھرنا چاہتے تو ان سے چوتھی بار اقرار کے بعد مزید اقرار کا مطالبہ نہ کیا جاتا۔

شافعیہ اور مالکیہ کی دلیل کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ بعض روایات میں صرف ایک بار، دو بار یا تین بار اقرار کا جو ذکر ہے (یعنی چار بار کا ذکر نہیں ہے) تو یہ راوی حدیث کی کوتاہی ہے۔ اگر کسی نے یہ کوتاہی کی تو یہ کوتاہی یاد رکھنے والوں کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔

'عسیف' والی حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ 'فان اعترفت فارجمها' (یعنی اگر وہ عورت اعتراف کرے تو اسے سنگسار کر دو) اس میں اعتراف سے مراد وہ اعتراف ہے جس سے حد زنا عائد ہوتی ہے، اس واسطے کہ حضور کے صحابہ کو معلوم تھا کہ اقرار (مستوجب حد) کس کو کہتے ہیں؟ خاص کر ایسے صحابی جن کو آنحضرت ﷺ کے ساتھ قرب خصوصی حاصل تھا وہ جانتے تھے کہ چار بار اقرار کرنے پر ہی (حد) عائد ہوتی ہے۔ حضرت انیس رضی اللہ عنہ ایسے ہی صحابیوں میں سے تھے۔

اقبالی مجرم سے جرح (چھان بین) کرنے کا بیان

اگر کوئی مرتکب زنا چار بار ارتکاب گناہ کا اقرار کر لے تو پھر قاضی (حاکم شرع) اس سے پوچھے گا زنا کیا ہے اور اس نے کس طرح ارتکاب کیا۔ کس جگہ کیا اور کس کے ساتھ کیا جب وہ ان تمام باتوں کو بیان کر دے اور اس کی صراحت ہو جائے تو سزائے زنا کا نفاذ واجب ہو جائے گا۔ کیوں کہ اس کے تمام ثبوت مہیا ہو چکے۔ اس جرح میں وقت کی بابت سوال شرط نہیں ہے جیسا کہ گواہوں کی شہادت میں ضروری ہوتا ہے۔ کیوں کہ وقوعہ کو زیادہ عرصہ گزر جائے تو یہ شہادت کے تسلیم کرنے میں مانع ہوتا ہے لیکن اقرار جرم کے لیے مانع نہیں ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ (اقبالی مجرم سے) وقت کی بابت بھی سوال کر لیا جائے تو جائز ہے کیوں کہ اس امر کا احتمال ہے کہ ارتکاب گناہ کے وقت وہ نابالغ رہا ہو یا اسلام لانے سے پہلے اس نے ارتکاب کیا ہو۔

غیر معلومہ عورت سے ملوث ہونے کا بیان

اگر کوئی شخص چار بار یہ اعتراف کرے کہ وہ ایک ایسی عورت سے ملوث ہوا ہے جس سے وہ واقف نہیں ہے، تب بھی وہ مستوجب سزا ہے اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔

اسی طرح اگر کوئی اقرار کرے کہ اس نے فلاں عورت سے بدکاری کی لیکن وہ عورت اس شہر میں جہاں یہ شخص رہتا ہے موجود نہ ہو اس پر بھی حد نافذ ہوگی جیسا کہ عسیف والی حدیث سے ظاہر ہے کہ عسیف نے جب آنحضرت ﷺ کے سامنے اقرار کر لیا تو اس پر حد نافذ فرمائی اور اس کے بعد عورت کے پاس آدمی کو بھیجا۔ کیوں کہ عسیف نے ارتکاب زنا کا اعتراف کر لیا اور ایسی کوئی بات نہیں بتائی جس سے اس فعل کا 'زنا' نہ ہونا معلوم ہوتا یا ایسا کوئی شبہ بھی نہ تھا جس سے سزا روک دی جاتی۔ اس کے برعکس ارتکاب زنا کا اقرار کرنے ہی میں یہ بات داخل ہے کہ اس عورت پر ان کو کوئی حق نہ تھا کیوں کہ اگر کوئی حق ہوتا تو وہ اس کا اظہار کرتے یا کوئی امر شبہ، ارتکاب جرم پیدا کرنے والا ہوتا تو وہ اس کا ذکر کرتے۔ انسان اپنی بیوی یا اپنی (مملوکہ) لونڈی سے ناواقف نہیں ہوتا۔

مرتبین میں سے ایک کے اقبال جرم کو دوسرے کا اقبال جرم تصور نہیں کیا جائے گا۔ اگر ایک شخص نے یہ اقرار کیا کہ اس نے فلاں عورت کے ساتھ بد فعلی کی ہے اور اس عورت نے اس شخص کے قول کو جھوٹ بتایا اور کہا کہ میں اس کو جانتی ہی نہیں اور اس صورت میں علماء کی رائیں مختلف ہیں۔

امام ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ (اس صورت میں) نہ اس مرد پر حد نافذ ہوگی نہ اس عورت پر کیونکہ عورت کے انکار سے (اثبات جرم میں) شبہ پیدا ہو گیا۔ جو مانع سزائے زنا ہے۔ البتہ دروغ بیانی کی سزا (اسی کوڑے) مرد کو دی جائے گی۔ لیکن اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ (عورت کے انکار سے) مرد کا اقرار باطل نہیں ہوگا۔

مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ اور صاحبین کہتے ہیں کہ صرف مرد پر حد جاری ہوگی۔ محض مرد کے اقرار کرنے سے اس عورت کا ارتکاب کرنا ثابت نہ ہوگا جس سے اس نے بد فعلی کی۔ اور اس شخص پر تہمت کی سزا بھی عائد نہ ہوگی۔

امام احمد نے اپنی صحیح میں اور ابو داؤد نے ہل ابن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول

ﷺ کے پاس آکر ایک عورت کے ساتھ ارتکاب زنا کا اقرار کیا۔ اس عورت کا نام بھی اس نے بتایا۔ حضورؐ نے اس عورت کو طلب فرما کر اس سے پوچھا تو اس نے انکار کیا۔ اس پر مرد کو سزائے زنا دی گئی اور عورت کو چھوڑ دیا گیا۔ اور اسے سزا نہیں دی گئی۔ ابو داؤد اور نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے ”ان رجلاً من بکربن لیث اتی النبی ﷺ فساقر اربع مرأت انه زنی بامرہ“ (یعنی قبیلہ بکر بن لیث کا ایک شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا اور اس نے چار بار اقرار کیا کہ اس نے ایک عورت سے بد فعلی کی ہے) اور چونکہ وہ کنوارا تھا اسے سو درے لگائے گئے، پھر اس شخص سے عورت کے مرتکب ہونے کی بابت ثبوت مانگا گیا تو عورت نے کہا کہ یا رسول اللہ یہ شخص جھوٹ بولتا ہے۔ چنانچہ تہمت لگانے کی سزا میں اس شخص کو اسی (۸۰) دُرے لگائے گئے۔

یہ مسائل دین اسلام میں سہولت، رواداری، حقیقت حال کی چھان بین اور (تا بمقدور) سزائے بچانے کے لیے ہیں۔ بعض اصحاب کہتے ہیں کہ (صورت مذکورہ میں) تہمت لگانے اور بدکاری کرنے دونوں جرموں کی سزائیں دی جائیں تاکہ خدا اور بندہ دونوں کا حق ادا ہو۔

عورت کا اقبال جرم کرنا

اگر عورت حاکم کے سامنے چار بار اپنی بدکاری کا اقرار کرے اور نام لے کر بتائے کہ میں فلاں شخص کے ساتھ ملوث ہوئی ہوں۔ لیکن وہ مرد اسے جھوٹا بتائے اور کہے کہ میں نے اس سے بد فعلی نہیں کی نہ میں اسے جانتا ہوں تو (ایسی صورت میں) امام ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ نہ عورت پر حد نافذ ہوگی اور نہ مرد پر۔ مرد پر تو اس لیے حد عائد نہ ہوگی کہ وہ انکاری ہے اور عورت پر اس لیے حد عائد نہ ہوگی کہ (مرد کے انکار سے) اس کے اقرار میں شبہ پیدا ہو گیا چونکہ ’زنا‘ دونوں کا مشترک ایک ہی فعل ہے اس لیے اگر اس کے ارتکاب میں شبہ پیدا ہو تو دونوں پر اثر انداز ہوگا۔

مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ اور صاحبین کہتے ہیں کہ اقبال زنا کرنے والی عورت پر حد لاگو ہوگی کیونکہ اقرار ارتکاب جرم کا ثبوت ہے اور ایک شخص کا جرم ثابت نہ ہونے سے اقبالی مجرم کے اقبال جرم کر لینے میں ارتکاب کے بارے میں شبہ کی گنجائش نہیں رہی۔ یہ مسئلہ ایسا ہی ہے جیسے وہ شخص جس کا نام عورت لے رہی ہے شہر میں موجود نہ ہو۔ اس قول کو ترجیح حاصل ہے۔

گو نگے مرد یا گونگی عورت کے ساتھ مرتکب ہونے کا بیان

اگر ایک شخص یہ کہے کہ اس نے ایک گونگی عورت کے ساتھ جو بول نہیں سکتی برا فعل کیا ہے یا عورت کہے کہ میں گو نگے کے ساتھ ملوث ہوئی ہیں (تو اس صورت میں)

امام ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ ان میں سے کسی پر بھی سزائے زنا عائد نہ ہوگی کیونکہ ایک طرف جو شبہ پیدا ہوا ہے وہ دوسری طرف بھی اثر انداز ہوگا۔

ائمہ ثلاثہ اور صاحبین کہتے ہیں کہ (فریقین میں سے) جس نے اقرار کیا اس پر حد عائد ہوگی، گو نگے یا گونگی پر نہ ہوگی۔ کیونکہ مکمل اقرار کر لینے پر حد ثابت ہو گئی اور دوسرے پر نہیں ہوئی اس لیے کہ اقرار نہیں کیا۔

گو نگے کے اقرار جرم کا بیان

ائمہ فقہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر گونگا شخص لکھ کر یا اشارے سے ارتکاب زنا کا اقرار کرے تو اس پر حد عائد نہ ہوگی گو وہ اشارہ ایسا ہو جو سمجھ میں آجائے۔ کیونکہ صریحاً اقرار جرم نہ ہونے کے باعث (وقوع جرم میں) شبہ ہو جاتا ہے جو بدکار کو سزا سے بچا دیتا ہے۔

اسی طرح اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ گو نگے کے خلاف زنا کی گواہی کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ ممکن تھا کہ وہ اپنے خلاف گواہی کو مشتبہ قرار دیتا یہ حکم اندھے پر عائد نہیں ہوتا۔ پس علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر نابینا شخص ارتکاب زنا کا اقرار کرے تو اس کو درست مانا جائے گا۔ اس پر حد نافذ ہوگی اور اس کے خلاف گواہی دینا درست اور قابل تسلیم ہوگا۔

اقبال جرم کے بعد پھر جانے کا بیان

ارتکاب زنا کا اقرار کرنے کے بعد پھر جانے کے مسئلہ میں ائمہ کا اختلاف ہے:

حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر ارتکاب زنا کا اقبالی، اپنے بیان سے پھر جائے تو اسے تسلیم کیا جائے گا اور اس پر حد نافذ نہ ہوگی اور سزا سے بری ہو جائے گا، خواہ کچھ جرم اس پر عائد ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو، کیونکہ آنحضرت ﷺ نے ماعز وغیرہ کے اقرار کو بار بار رد فرمایا تا کہ شاید اپنے اقرار سے پھر جائے اور اس کے گناہ پر پردہ پڑا رہے کہ یہی بہتر ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ غامدیہ نے جب اپنے گناہ کا اقرار کیا تو آنحضرت ﷺ نے اس سے کہا کہ ممکن ہے کہ اس شخص نے تجھے پیار کیا ہو یا ایسی دیسی کوئی اور بات کی ہو (یعنی مباشرت نہ کی ہو اور تم اسی فعل کو زنا تصور کر رہی ہو) اس ارشاد نبوی میں یہ اشارہ ہے کہ اگر وہ باوجود اقرار کے رجوع کر لیتی تو اسے تسلیم فرما لیتے۔

نیز آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے ”ادروا الحدود بالشبهات“ (یعنی مشتبہ حالات میں شرعی سزائیں نہ دو) اور اقبالی مجرم کا اپنے بیان سے پھر جانا بھی ارتکاب جرم میں شبہ کا موجب ہے۔

اس مسئلہ میں ابن ابی لیلیٰ اور عثمان البنی نے حنفیہ سے اختلاف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اقبال کر لینے والا رجوع کرے تو اسے تسلیم نہیں کیا جائے گا اور اس پر حد زنا جاری کر دی جائے گی۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر اقبال کرنے والا کسی شبہ کے پیش آ جانے کی بناء پر رجوع کرے تو اسے مان لیا جائے اور حد نافذ نہ کی جائے، لیکن اگر کوئی شبہ کی بات پیش نہیں آئی اور اقبالی اپنے بیان سے پھر گیا تو اسے تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ ان کا ایک قول یہ بھی ہے کہ اسے تسلیم کر لیا جائے گا اور یہی قول قابل ترجیح ہے۔

پانچوں فقہاء نے بالفاظ ترمذی یہ حدیث روایت کی ہے:

”جاء ماعز رضی اللہ عنہ الی النبی ﷺ فقال: انه قد زنی فاعرض عنه، ثم جاء من شقه الآخر، فقال انه زنی فاعرض عنه، ثم جاء من شقه الآخر، فقال انه قد زنی فامر به فی الرابعة فاخرج الی الحرة فرجم بالحجارة، فلما وجد مس الحجارة فریشتد، فلقیه رجل معه لحی جمل فضر به به، وضر به الناس حتی مات، فذکروا ذلک للنبی ﷺ فقال هلا ترکتموه“ (یعنی ماعز رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ انھوں نے زنا کیا۔ حضور نے منہ موڑ لیا، وہ دوسری طرف سے آئے اور کہا

ارتکابِ زنا میں شبہات پیدا کرنے کا بیان

اگر کوئی شخص ایک عورت کے ساتھ جس کا خاوند نہیں ہے۔ ملوث دیکھا جائے تو اس شخص کے لئے یہ گنجائش ہے کہ وہ کہہ دے کہ میں نے اس عورت سے شادی کر لی ہے بعض مسالک کی رو سے اس کا یہ بیان (ارتکابِ جرم میں) شبہ پیدا کرتا ہے اس لیے اس شخص کو سزا سے بری کر دیا جائے گا۔^(۱)

کہ انھوں نے زنا کیا، حضورؐ نے منہ موڑ لیا وہ پھر دوسری طرف سے آئے اور پھر کہا کہ انھوں نے زنا کیا ہے اس کے بعد جب چوتھی بار بھی اسی طرح وہ سامنے آئے تب انھیں ایک پتھریلی زمین پر لا کر سنگسار کیا گیا۔ جب پتھر انھیں لگے تو وہ وہاں سے بھاگ نکلے۔ ایک شخص سے مڈ بھڑ ہو گئی جس کے ہاتھ میں اونٹ کا جبر تھا اسی سے اس نے انھیں مارا پھر اور لوگوں نے بھی مارا یہاں تک کہ مر گئے۔ پھر جب لوگوں نے اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا تو فرمایا تم نے اسے چھوڑ دیا ہوتا۔

ایک اور روایت ہے کہ حضورؐ نے ماعز سے فرمایا تھا کہ ”ممکن ہے تم نے اس کا محض بوسہ لیا ہو یا اسے بھینچا ہو، یا گھورا ہو (یعنی زنا تک نوبت نہ پہنچی ہو) اس پر ماعز رضی اللہ عنہ نے کہا جی نہیں (یعنی مجھ سے تو بدکاری ہی سرزد ہوئی ہے) پھر فرمایا کہ تم شادی شدہ ہو؟ انھوں نے کہا جی ہاں غرض رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد نے انھیں اپنے اقرار سے پھر جانے اور اس فعل کو چھپا لینے کا موقع دیا، لیکن وہ اپنی بات سے نہ پھرے یہاں تک کہ حضور ﷺ نے تنگ آ کر فرمایا ”تو تم نے اس عورت کے ساتھ زیادتی کی؟ انھوں نے کہا جی ہاں۔ تب آپ نے سنگسار کیے جانے کا حکم دے دیا۔

ان سے اور دوسری روایات سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اقبالِ زنا کرنے والا اگر اپنے اقرار سے پھر جائے تو اسے قبول کر لینا چاہیے، اور اس رجوع کو گناہ سے توبہ کرنا تصور کیا جائے گا اور اس پر حد نافذ نہ ہوگی۔ کیونکہ مذہب اسلام میں گناہ کو چھپانا واجب ہے اور گناہ کو مشہور کرنا فعل مکروہ ہے۔

(۱) شبہ کی تعریف: شبہ کہتے ہیں ایسی بات کو جو یقینی نہ ہو بلکہ یقینی جیسی ہو۔ (شبہ کے بارے میں) بعض امور ایسے ہیں جن میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے کہ آیا یہ شبہ ایسا ہے جس کی بناء پر سزا کو نافذ نہ کیا جائے یا ایسا نہیں ہے؟ اور آیا پوچھ گچھ سے ایسا شبہ پیدا ہوا ہے جو ملزم کو سزائے جرم سے بچا سکے۔ اور معلوم ہو جائے کہ اس شخص نے کیا سمجھ کر ارتکابِ زنا کیا؟ آیا اس نے گناہ کا ادارہ کرنے میں غلطی کی ہے یا نہیں؟ آیا ارتکابِ خطا کے وقت اس نے اس فعل کا اقدام حلال سمجھ کر کیا یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ اس رد و کد اور پوچھ گچھ کا مقصد یہ ہے کہ اس گناہ کے الزام سے جو ایک شخص پر لگا ہے اسے بری قرار دیا جائے۔ یہ پوچھ گچھ صریحاً اقرارِ گناہ کے بعد ہوگی۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے ”ادروا الحدود بالشبہات“ (یعنی شبہات میں پڑ کر سزائیں نہ دو)۔

حنفیہ کے نزدیک شبہ کی دو قسمیں ہیں ایک شبہ عملی (یعنی نفس فعل میں شبہ) اس کے واقع ہونے کے آٹھ مواقع ہیں: ۱۔ کوئی شخص اپنے باپ، ماں، دادا، دادی یا پردادا وغیرہ کی (مملوکہ) لونڈی کے ساتھ اس شبہ میں مباشرت کر لے کہ وہ اس لونڈی کا مالک ہے (حالانکہ وہ مالک نہیں ہے)۔

۲۔ اپنی بیوی کی مملوکہ (لونڈی) سے اس شبہ میں کہ بیوی کا مال خاوند کا مال ہے مباشرت کر لے (حالانکہ خاوند

بیوی کے مال کا مالک نہیں ہے۔

۳۔ اپنی بیوی سے جسے تین طلاق دے دی ہو بدوران عدت مباشرت کرے (حالانکہ یہ جائز نہیں ہے) کیونکہ مطلقہ عورت پر خاوند کو کسی طرح کا اختیار نہیں رہتا اس صورت میں کوئی قطعی (یا قانونی) شبہ نہیں بلکہ محض کہنے کی بات ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”فان طلقها فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجاً غیرہ“ (یعنی اگر خاوند بیوی کو طلاق دے دے تو وہ آئندہ اس پر حلال نہ ہوگی جب تک کہ وہ کسی اور خاوند سے نکاح نہ کر لے اور اس لیے بھی کہ تین طلاق کے بعد بیوی کے حرام ہو جانے پر تمام امت کا اجماع ہے۔ تاہم اگر مرتکب یہ کہتا ہے کہ میں نے اس بیوی کو حلال تصور کر کے اس سے مباشرت کی تھی تو اس پر حد عائد نہ کی جائے گی، کیونکہ یہاں شبہ کی گنجائش اس لحاظ سے ہے کہ بیوی پر جو ملکیت (نکاح) خاوند کی ہوتی ہے بوجہ اس کے کہ اس کی اولاد سے اس کا نسب باقی ہے۔ اس ملکیت (نکاح) کا اثر باقی ہے۔ یعنی اس عورت سے اگر دو سال کے اندر کوئی اولاد ہو جائے وہ اس کے خاوند ہی کی اولاد قرار پائے گی پھر خاوند اپنی مطلقہ بیوی کو (بدوران عدت) گھر کے باہر جانے سے روک سکتا ہے اور اس کے نان نفقہ کا ذمہ دار ہے۔ بدوران عدت اس کی بہن سے نکاح نہیں کر سکتا (اگر وہ چوتھی بیوی ہے تو) کوئی اور شادی (تا انقضائے عدت) نہیں کر سکتا۔ پس ممکن ہے کہ ان امور میں سے کسی امر کے پیش نظر اس شخص نے مباشرت کو حلال تصور کر لیا ہو۔ لہذا اس شبہ کو سزا سے بچنے کا عذر تصور کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ اس بیوی سے مباشرت کر لی جائے جسے مال لے کر طلاق دی گئی ہو (حالانکہ بالا اجماع وہ عورت حرام ہوگئی ہے)۔

۵۔ اس بیوی سے مباشرت کر لے جس نے خاوند سے خلع کر لیا ہو (یعنی اپنا پیچھا چھڑا لیا ہو) اور وہ مہر جو اس نے خاوند سے لیا تھا واپس کر دیا ہو۔ (یہ بھی حرام ہے لیکن) اس میں شبہ کی گنجائش یوں ہے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ خلع فسخ نکاح ہے یا طلاق بائنہ۔

۶۔ اپنی ام ولد (وہ لونڈی جس سے اولاد ہوگئی ہو) کے ساتھ آزاد کر دینے کے بعد بدوران عدت اس شبہ میں مباشرت کر لی کہ وہ اب تک اس کا مالک ہے اور اس کی اولاد کا نسب اس کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔

۷۔ غلام اپنے آقا کی لونڈی سے مباشرت کر لے بدیں خیال کہ غلام اور آقا میں ایک دوسرے کے مال سے باہم استفادہ کی گنجائش ہے۔ اور غلام اسی بناء پر یہ سمجھ لے کہ آقا کی لونڈی سے بھی وہ استفادہ کر سکتا ہے تو یہ بھی شبہ کی بنا ہے۔

۸۔ رہن رکھنے والا مرہونہ لونڈی سے مباشرت کرے (حالانکہ یہ ناجائز ہے)

کیونکہ رہن کا معاملہ کرنے سے رہن شدہ شے پر مرہن کو حق تمتع کسی طرح حاصل نہیں ہوتا۔ لہذا اجرت کے معاملہ پر قیاس کر کے یہاں کوئی شبہ پیدا نہیں ہوتا کیونکہ معاملہ اجارہ میں بھی متعہ کا اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ پس رہن کی صورت میں کوئی قانونی شبہ لونڈی کو حلال کرنے والے کے لئے نہیں ہو سکتا ہے۔ بناء بریں اس شخص پر حد کا نفاذ واجب ہے خواہ وہ شبہ کا اظہار کرے یا نہ کرے جس طرح اس لونڈی کو حلال نہیں سمجھا جاسکتا جسے اجرت پر کسی نے رکھا ہو۔ تاہم اگر (فی الواقع) اس شخص کو حلال ہونے کا اشتباہ ہو تو اس پر حد نافذ کرنا واجب نہیں ہے جبکہ وہ کہے کہ میں نے اس کو حلال سمجھا تھا کہ کیونکہ یہاں اس شبہ کی گنجائش ہے کہ کسی مال کا کس حیثیت سے مالک ہونا مالک متعہ ہونے کا سبب ہو سکتا ہے

اگر چہ رہن شدہ شے میں نہیں ہو سکتا اور مال کے معاملہ میں ہو سکتا ہے تو اب شبہ کی صورت یہ ہوگی کہ اس قدر اختیار حاصل ہونے سے تمتع کا اختیار حاصل ہوگا یا نہیں؟ بخلاف اس صورت کے جبکہ اجرت پر (لوٹڈی کو) رکھا جائے کہ اس میں فائدہ حاصل کرنے کا حق تو حاصل ہے۔ لیکن حق تمتع کے حاصل ہونے کا سبب کسی حال میں متصور نہیں ہے۔ غرض یہ شبہ ایسا ہے جہاں شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ لہذا اس شخص پر حد واجب ہوگی خواہ اس نے حلال سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو۔

ان تمام مواقع میں اور اسی جیسے دوسرے مواقع میں اگر وہ شخص کہے کہ میں نے یہ فعل کیا تو ہے لیکن اپنی دانست میں یہ تصور کیا تھا کہ یہ حلال ہے حرام نہیں ہے اگر مجھے اس کا حرام ہونا معلوم ہوتا تو ہرگز یہ کام نہ کرتا تو مرتکب زنا پر حد نافذ نہ ہوگی۔ لیکن اگر وہ شخص کہتا ہے کہ میں نے یہ کام کیا اور میں جانتا تھا کہ یہ فعل حرام ہے اور یہ (عورت) مجھ پر حلال نہیں تو اس پر حد کا لاگو کرنا واجب ہے۔ تاہم اگر دونوں میں سے ایک بھی یہ کہے کہ میں نے اس فعل کو حلال گمان کیا تھا اور دوسرا یہ نہیں ہے کہتا تب بھی ان میں سے کسی پر حد عائد کرنا واجب نہیں ہے، تا آنکہ وہ دونوں ایک ساتھ یہ اقرار نہ کریں کہ انھوں نے اس فعل کو حرام جانتے ہوئے اس کا ارتکاب کیا۔ کیونکہ اگر ایک کی جانب سے شبہ ثابت کیا جائے تو لامحالہ دوسرا بھی اس سے متاثر ہوگا (کیونکہ مشترکہ عمل اگر مشتبہ ہو تو فریقین کو اس کا فائدہ یکساں پہنچے گا)۔

حنفیوں کے نزدیک شبہ کی دوسری قسم کا تعلق محل اشتباہ سے ہے (یعنی جس کے ساتھ ارتکاب ہوا اس کی حیثیت حلت اور حرمت کے باب میں مشتبہ تھی اس شبہ کے پیدا ہونے کے چھ مواقع ہیں:

۱۔ کسی نے اپنے بیٹے، پوتے پڑپوتے وغیرہ کی (مملوکہ) لوٹڈی سے مباشرت کی گو (اس کا مالک) بیٹا زندہ ہو (تو یہ محل اشتباہ ہے) کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص سے جس نے اپنے باپ کی شکایت کی تھی یہ فرمایا ”انست و مالک لابیک“ (یعنی تجھ پر اور تیرے باپ پر، تیرے باپ کا حق ہے) اور اس لئے بھی کہ اس لوٹڈی سے جو اولاد ہو گی اس کا نسب رشتہ اس کے مالک، مالک کے والد اور دادا کے ساتھ (جس سے بھی اولاد ہو) قائم ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اس کا مالک زندہ ہو۔

۲۔ کسی نے اپنی بیوی کو (صریحہ نہیں بلکہ) کنایہ طلاق بائندہ دے دی مثلاً اس سے کہا کہ تو خلیعہ (یعنی آزاد یا بے قید) ہے، یا یوں کہا کہ تیرا انجام تیرے اپنے اختیار میں ہے۔ اور بیوی اس اختیار کو کام میں لائی (یعنی قید از دواج سے آزادی کا اختیار پا کر آزاد ہو گئی) یا ایسی ہی کوئی اور بات ہوئی (جس سے کنایہ طلاق پڑ جاتی ہے) اور پھر اسی بیوی سے بدوران عدت مباشرت کر لی (تو یہ بھی محل اشتباہ ہے) کیونکہ کنایہ طلاق کے بارے میں صحابہ رضوان اللہ علیہم میں اختلاف ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا رجحان اس طرف ہے کہ کنایہ کی طلاق رجعی ہے۔ (یعنی بغیر تجدید نکاح کے رجوع کیا جاسکتا ہے)۔ یہی مسلک ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ہے اور مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ حضرت ثوری نے منصور سے اور ابراہیم نے علقمہ اور اسود سے یہ حدیث بیان کی۔ حضرت ابن مسعود کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ میرا اپنی بیوی کیساتھ نزاع ہو گیا ہے۔ بیوی نے کہا کہ تمہیں مجھ پر جو اختیار ہے اگر اس اختیار کی مالک میں ہوتی تو تم دیکھتے کہ میں کیا کرتی؟ پھر اس شخص نے بتایا کہ میں نے وہ اختیار تجھے دے دیا۔ بیوی نے کہا کہ میں اپنے آپ کو (تمہاری طرف سے تین طلاق دیتی ہوں۔ ابن مسعود نے فرمایا کہ میری رائے میں وہ ایک ہی طلاق ہے اور تمہیں رجوع کا حق ہے پھر (ابن مسعود کہتے ہیں

کہ) ہم نے اس کی بابت امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا، انھوں نے کہا کہ تم نے اس شخص کو کیا جواب دیا؟ انھوں نے کہا کہ میں نے کہا کہ میری رائے میں یہ ایک طلاق (رجعی) ہے اور وہ شخص اپنی بیوی کا حقدار ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ”میری بھی یہی رائے ہے۔“ ایک اور روایت میں اتنا اور بھی ہے کہ ”ولو رایت غیر ذلک لم تصب“ (یعنی اگر اس کے علاوہ تمہاری کچھ اور رائے ہوتی تو درست نہ ہوتی)۔

ابن ابی شیبہ نے اپنی کتاب مصنف میں ان دونوں اصحاب سے تخریج فرمایا ہے کہ دونوں نے الفاظ بریہ اور خلیہ (یعنی بے تعلق یا آزاد) کے استعمال کرنے کو ایک طلاق قرار دیا ہے جس میں خاوند کو رجوع کا حق ہوتا ہے۔ لیکن امام علی کرم اللہ وجہہ کے نزدیک الفاظ خلیہ اور بریہ کے استعمال سے تین طلاقیں پڑ جاتی ہیں جیسا کہ حضرت علی سے ابن شیبہ نے اخراج فرمایا ہے۔

۳۔ مرہونہ لونڈی سے مرتہن کا مباشرت کرنا ایک روایت کی رو سے محل اشتباہ ہے کیونکہ رہن بھی ملکیت کا ایک ذریعہ ہے چنانچہ رہن وفات پا جائے تو مرتہن کا رہن شدہ پر پورا پورا حق اسی وقت سے ہو جاتا ہے جب سے کہ اسے رہن رکھا گیا۔ ایسی صورت میں مرتہن کے شے مرہونہ کا مالک بننے کا سبب تو سر دست موجود ہوتا ہے لیکن حقیقی طور پر مالکانہ حقوق اس وقت حاصل ہوتے ہیں جب رہن وفات پا جائے۔

۴۔ دو اشخاص کی مشترکہ ملکیت میں آئی ہوئی لونڈی سے کسی کا مباشرت کرنا (موجب اشتباہ ہے) کیونکہ اس شخص نے ایک ایسی عورت سے مباشرت کی جس کی ملکیت کا معاملہ ہوا ہے۔ یعنی کسی لونڈی کا خرید لینا ملک متعہ کا موجب ہوتا ہے۔ لہذا اس فعل کے جرم ہونے میں شبہ واقع ہوا جو مانع حد ہے۔

۵۔ کسی شخص نے اپنی فروخت کی ہوئی لونڈی سے اس کی سپردگی سے پہلے مباشرت کر لی (تو یہ بھی محل اشتباہ ہے)۔

۶۔ اسی طرح اس لونڈی سے مباشرت بھی (محل اشتباہ) ہے جسے اس کے مالک نے اپنی بیوی کا مہر قرار دیا ہو لیکن ہنوز اسے بیوی کے حوالے نہ کیا ہو۔

ان دونوں صورتوں میں چونکہ لونڈی پر اس خریدار کا یا منکوحہ بیوی کا حق قائم ہی نہ ہوا تھا اس کا موجودہ مالک بوجہ قابض اور مالک ہونے کے اس کے ساتھ مباشرت کا اختیار رکھتا تھا۔ اس کا قابض ہونا بر جا ہے اور ملکیت جو ختم ہونے والی ہے وہ ناپائیدار امر ہے (یعنی پورے طور پر زائل نہیں ہوئی) لہذا حقیقی طور پر مالک ہونے کے بارے میں، یہ صورت حال از روئے شرع موجب اشتباہ جرم ہے پس ان تمام مذکورہ صورتوں میں مباشرت کرنے والے پر حد عائد نہ ہو گی۔ اگرچہ ارتکاب کرنے والا یہ کہے کہ میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ مجھ پر حرام ہے کیونکہ ایسے اشخاص پر حد عائد نہ ہونے کا سبب شبہ ہے جو اس فعل کی حکمی حیثیت میں موجود ہے۔ یعنی اس کے حرام ہونے کی جو دلیل ہے وہ اس فعل کے حلال ہونے والی دلیل کے پیش نظر مشتبہ ہے، یقینی نہیں ہے۔ حالانکہ زنا ایک فعل ممنوع ہے جو محض گمان بلکہ قوی شبہ کی بناء پر ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ (ثبوت جرم کے لیے) ضروری ہے کہ قرار واقعی اس کی تحقیق کی جائے اور بغیر کسی شک و شبہ کے وہ ثابت

ہو جائے۔ نیز رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو اس بارے میں وثوق حاصل کرنے کی ہدایت فرمائی ہے، تاکہ بے قصور کسی کی جان کو ناحق ہلاک نہ کیا جائے۔ چنانچہ حضور نے فرمایا ”ادروا الحدود بالشبہات“ (یعنی شبہات دریافت کر کے سزائیں روک دو) یہ حدیث متفق علیہ ہے اور امت نے اسے اختیار کر لیا ہے۔

ابن ابی شیبہ نے ابراہیم نخعی کی سند سے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”لان اعطی الحدود بالشبہات احب الی من ان اقیمہا بالشبہات“ (یعنی شبہات کی بناء پر سزاؤں سے بری کر دینا میرے نزدیک شبہات کی بناء پر سزا دینے سے زیادہ محبوب فعل ہے) حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلامی احکام کے اجراء میں بہت زیادہ سخت گیر تھے۔

معاذ بن جبل، عبد اللہ بن مسعود اور عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہم سے تخریج ہے کہ ان اصحاب کا کہنا ہے ”اذا اشتبه علیک الحد فادراہ“ (یعنی جب جرم مستوجب حد کے بارے میں تجھے شبہ ہو تو سزا نہ دے) اور صحیح بخاری میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد مروی ہے ”من اجترا علی ما یشک فیہ من الاثم، او شک ان یواقع ما استبان، والمعاصی حمی اللہ تعالیٰ من یرتع حول الحمی یوشک ان یقع فیہ“ (یعنی جو شخص ایسے فعل کی جرأت کرتا ہے جس کے گناہ ہونے میں شک ہو وہ جلد ہی غیر مشتبہ گناہ میں پڑ جاتا ہے۔ گناہ کو اللہ نے ایک چراگاہ کی مانند بتایا ہے کہ اس کے ارد گرد چرنے والا جلد ہی اس کے اندر چلا جاتا ہے)۔ مطلب یہ ہے کہ جس فعل کے حلال یا حرام ہونے کا علم نہ ہو احتیاط اسی میں ہے کہ اس سے بچا جائے۔ اور جس فعل کا واجب ہونا یا نہ ہونا معلوم نہ ہو اسے واجب نہ بنالے اور جس فعل کے بارے میں یہ معلوم نہ ہو کہ یہ مستوجب سزا ہے یا نہیں (اسکی سزا دینے سے پہلے) تحقیق کر لینا واجب ہے۔ یہ تحقیق جرم ثابت ہونے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی ہو سکتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ سے اقرار زنا کے بعد بھی یہ جرح فرمائی تھی ”لعلک قبلت لعلک لمست، لعلک غمزت“ (یعنی ممکن ہے تم نے محض اس کا بوسہ لیا ہو یا ہاتھ لگایا ہو یا بھینچا ہو) یہ تمام باتیں اس لئے تھیں کہ شاید وہ اس اقرار کے بعد جو حضور کے سامنے اس نے کیا تھا۔ اب بھی یہ کہہ دے کہ جی ہاں میں نے یہی کچھ کیا تھا اس سے زیادہ نہیں۔ مزید برآں حضور نے اس کے اہل خانہ سے دریافت فرمایا کہ آیا اس کی عقل بر جا ہے یا اسے جنون ہے؟ پھر حضور نے اس عمل کی کیفیت کے بارے میں بھی سوال کیا اور یہاں تک کہا کہ ”انکسھا؟“ (یعنی کیا تو نے اس کے ساتھ فعل جماع کر لیا)۔ انھوں نے کہا، جی ہاں جیسے سرمہ دانی میں سلائی۔ ان سوالات سے بجز اس کے اور کوئی مقصد نہ تھا کہ اگر وہ ان باتوں میں سے کسی کا اقرار کر لیتا تو اصل جرم سے بری ہو جاتا۔ (دوسرے معاملات میں) اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے، چنانچہ جب ایک شخص نے حضور کے رو برو قرض دار ہونے کا اقرار کیا تو آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ ممکن ہے وہ مال تمہارے پاس امانت رہا ہو اور ضائع ہو گیا وغیرہ۔

(نفاذ حد کا معاملہ اس سے مختلف ہے چنانچہ) حضور نے اس چور سے جو آپ کے پاس لایا گیا یہ فرمایا کہ کیا تم نے چوری کی ہے۔ میں تو اس کی بابت خیال نہیں کرتا کہ اس نے چوری کی ہو۔ اور غابہ یہ سے جبکہ اس نے بدکاری کا

اعتراف کیا اور وہ حاملہ تھی حضور کا سوال فرمانا ایسا ہی تھا۔ اور بارگاہ نبوت سے اسے چلے جانے اور وقت ولادت تک التوائے سزا کا بھی یہی مقصد تھا کہ ممکن ہے کہ اتنے عرصے کے بعد وہ اپنے اعتراف جرم سے پھر جائے اور اپنے اوپر حد نافذ کرنے کے مطالبہ سے باز رہے۔

ایسی ہی وہ تمام روایتیں ہیں جو ترک حد (سزائے شرعی) کے بارے میں صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مروی ہیں مثلاً:

روایت ہے کہ ایک مملوکہ (لوٹڈی) شراحہ نے جو بدکاری کے نتیجہ میں حاملہ ہو گئی تھی امام علی کرم اللہ وجہہ کے سامنے اقبال جرم کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ایسا تو نہیں؟ کہ وہ شخص تجھے سوتا پا کر تجھ پر آ پڑا ہو۔ یا جبراً تجھ سے یہ حرکت کی ہو۔ یا ممکن ہے کہ تیرے آقا نے اس شخص کے ساتھ تیری شادی کر دی ہو اور تو اسے چھپا رہی ہے۔

اسی طرح ایک عورت کسی چرواہے کے پاس آئی اور اس سے دودھ مانگا، اس نے نہ دیا، یہاں تک کہ اس عورت نے اپنا وجود اس چرواہے کے حوالہ کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (اس گناہ کی پاداش میں) اس عورت پر حد نافذ نہیں فرمائی بلکہ فرمایا کہ چرواہے نے دودھ کی شکل میں اس کا مہر دے دیا لہذا اب اس فعل کے جرم ہونے میں شبہ ہو گیا اور اس عورت کو سزا نہیں دی گئی۔

رسول اللہ ﷺ کا یہ طریق کار نہ تھا کہ ظنی امور پر مواخذہ فرمانے لگیں جب تک کہ ارتکاب جرم کا پورا یقین نہیں ہو جاتا تھا، حد نافذ نہیں فرماتے تھے۔ حضرت ابن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عجلان اور اس کی بیوی سے لعان (حلف بریت جرم موکد بہ لعنت) لیا۔ شداد بن الہاد کہتے ہیں کہ عجلان کی بیوی وہ عورت ہے جس کی بابت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر بغیر گواہی کے ثبوت کیس میں کسی کو سنگساری کی سزا دیتا تو اس عورت کو دیتا۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا۔ نہیں (یعنی یہ وہ عورت نہیں ہے) وہ عورت تو مسلمانوں میں اعلانیہ بدکاری پھیلاتی تھی۔ تاہم اس کا جرم زنا نہ تو شہادت سے ثابت ہوا اور نہ اس کے اقرار سے۔ لہذا گناہ پھیلانے کی بناء پر اس کی حد نہیں ماری گئی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”لو كنت راجماً احداً بغير بينة رجمت قلانة، فقد ظهر منها الرية في منطقها، وهيتها، ومن يدخل عليها“ (یعنی اگر میں کسی کو ثبوت شہادت کے بغیر سنگسار کرتا تو قلانی عورت کو کرتا، کہ گفتگو حالات کے بیان اور اس کے پاس آنے والے کے بارے اس کا دھوکہ (جھوٹ) ظاہر ہو گیا ہے۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور جو یہ کہتے ہیں کہ لعان کرنے سے کوئی شخص انکار کرے تو اس پر حد عائد نہ ہوگی، وہ اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد ”لو كنت راجماً احداً بغير بينة لرجمتها“ (یعنی بغیر ثبوت لیے اگر کسی کو میں سنگسار کرتا تو اس عورت کو کرتا) اس امر کی واضح اور صریح دلیل ہے کہ الزامات کی بناء پر حد نافذ نہ کی جائے گی، کیونکہ ایسے شخص کا سزائے شرعی پانا جو مستوجب حد نہ ہو سخت ضرر رساں اور اس شخص کے لیے اور اس کے کنبہ والوں کے لیے

باعث ننگ و عار ہے اور عقل اور شرع دونوں لحاظ سے قابل مذمت ہے لہذا حد کا نفاذ جائز نہیں ہے تا آنکہ پر از حکمت شریعت، حدود اور قصاص کے بارے میں جرم کا پورا یقین کر لینے کے بعد تمام شکوک و شبہات کے بغیر اس کی اجازت نہ دے اور حاکم کو (وقوع جرم کا) پورا یقین نہ ہو جائے۔ محض گمان یا قیاس نفاذ حد اور جان سے مارنے کے لیے وجہ جواز نہیں ہے۔ تہمت لگانے اور شبہ پیدا کرنے میں خطا اور غلطی فیصلہ کا گمان ہے اس طرح کسی مسلمان کو ایذا دینا، اسے نقصان اور دکھ پہنچانا، بدنام کرنا اور عزت بگاڑنا روا نہیں ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ادروا الحدود عن المسلمین ما استطعتم، فان كان له مخرج فخلوا سبيله، فان الامام ان يخطي في العفو خير من ان يخطي في العقوبة“ (یعنی جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کو سزاؤں سے بچاؤ۔ کوئی سبیل بھی بچنے کی ہو تو اسے اختیار کرو۔ اگر حاکم وقت غلطی سے معاف کر دے تو وہ اس سے بہتر ہے کہ غلطی سے سزا دے دے)۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ”ادروا الحدود بالشبهات، وادفعوا القتل عن المسلمین ما استطعتم“ (یعنی شبہوں کی بناء پر سزاؤں سے درگزر کرو اور جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کی جان بچاؤ)۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی بابت مروی ہے کہ انھوں نے شام کے علاقہ میں ایک شخص (جو مرتکب گناہ تھا) کے اس عذر کو قبول کیا کہ اسے زنا کے حرام ہونے کا علم نہ تھا۔ یعنی اس شبہ کی بناء پر جسے ہر شخص اپنی بریت کا ذریعہ بنا سکتا ہے۔ حد نافذ نہیں فرمائی نیز ان کی اور سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی بابت مروی ہے کہ انھوں نے ایک عجمیہ عورت کا یہ عذر جرم زنا (سے بریت) کے بارے میں قبول فرمایا جس نے کہا کہ مجھے یہ معلوم ہی نہ تھا کہ زنا حرام ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب ہلال بن امیہ اور ان کی بیوی کے درمیان ’لعان‘ کرایا (لعان کے مسائل آگے آرہے ہیں) کیونکہ اول الذکر نے اپنی بیوی پر شریک بن سماء کے ساتھ ملوث ہونے کی تہمت لگائی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ’اللہم بین‘ (یعنی خداوند حقیقت حال ظاہر فرمادے)۔

حضرت انس فرماتے ہیں کہ اس عورت کے ایک بچہ پیدا ہوا جو اس شخص سے مشابہ تھا جس پر الزام لگایا گیا تھا، لیکن اس (مشابہت) کی بناء پر رسول اللہ ﷺ نے ’حد نافذ نہیں فرمائی‘ کیونکہ (گواہوں سے) ثبوت جرم نہیں ہوا اور نہ اس عورت نے اعتراف کیا اور حمل کا ہو جانا نفاذ حد کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ چنانچہ اسے سزائے زنا نہیں دی اور فرمایا ”لو لا الایمان لکان لی ولہا شان“ (یعنی ایمان یا لعان کا حکم نہ ہوتا تو مجھے اس عورت کے معاملہ میں دخل کی گنجائش ہوتی) پس اس حمل سے پیدا ہونے والے بچے کا نسب اس شخص سے نہیں جوڑا گیا جس پر تہمت لگائی تھی۔

چونکہ یہ ایسا اہم جرم ہے جو جان کی ہلاکت تک پہنچا دیتا ہے۔ لہذا اس کے ثبوت کے لیے شہادت یا اقرار جرم ضروری ہے۔ چاروں اماموں کا اس پر اتفاق ہے کہ اس جرم کے اقدام میں شبہات کے پیدا ہونے سے سزا تو موقوف ہو جائے گی لیکن شبہات کی تفصیل میں اختلاف ہے۔

اجنبی عورت کو بیوی تصور کر لینا

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے اپنے بستر پر کسی عورت کو پایا اور یہ گمان کیا کہ یہ میری بیوی ہے اور اس سے ہم بستر ہو گیا پھر بعد میں پتہ چلا کہ وہ کوئی اجنبی عورت ہے تو اس شخص پر حد جاری ہوگی کیونکہ اس میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ شخص اس عورت سے بات چیت کر کے، اس کی نقل و حرکت کو دیکھ کر، اس کو ہاتھ لگا کر اور مس کر کے یہ تو معلوم ہی کر سکتا تھا کہ وہ اس کی بیوی ہے؟ لہذا یہ کوئی شبہ نہیں کہ حد سے بچا سکے۔ تاہم اگر وہ قسم کھا کر کہے کہ اس شخص نے اسے اپنی بیوی سمجھا تھا تو اس کی قسم کو تسلیم کر لیا جائے گا۔

اسی طرح اگر نابینا شخص اپنی بیوی کو بستر پر بلائے اور کوئی عورت اس کے جواب میں آجائے اور یہ نہ بتائے کہ فلاں عورت ہوں۔ پھر وہ شخص اس سے مباشرت کر لے اور بعد میں معلوم ہو کہ وہ اجنبی عورت تھی تو اس نابینا شخص پر حد نافذ ہوگی اور اسے شبہ تصور نہ کیا جائے گا کیونکہ نابینا شخص اور ظن سے کام کرنے والا ہوشیار اور نہایت تجربہ کار ہوتا ہے اور وہ اپنی بیوی اور پرانی عورت کا امتیاز بخوبی کر سکتا ہے۔

حنفی علماء اس خرابی کا سد باب کرنا چاہتے ہیں تا کہ معاشرہ میں برائی پھیلنے کا ذریعہ باقی نہ رہے۔ ان کا یہ حکم امت مسلمہ کی بہتری کے پیش نظر ہے تا کہ مفسدہ پردازوں کو یہ جرأت نہ ہو کہ قصداً ایسی حرکتوں کا ارتکاب کریں اور یہ سمجھتے رہیں کہ ان پر حد نافذ نہ ہوگی کیونکہ یہ ارتکاب شبہ میں کیا گیا ہے۔ لیکن محض اس لئے کہ کوئی عورت اس کے بستر پر گئی ہے اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ اس کے لیے حلال ہے اور جو کچھ اس نے کیا ہے وہ گمان پر مبنی ہے۔

مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ ان دونوں حالتوں میں مرتکب پر حد نافذ نہ ہوگی۔ کیونکہ اس میں شبہ کا وجود ہے اور ایک حد تک ایسا عذر پایا جاتا ہے کہ اس مباشرت کو روا سمجھا جاسکے۔ کیونکہ اس شخص نے عورت کو اپنے بستر پر پایا اور یہ کہ اس نے اپنی بیوی کو بلایا جس کا جواب غیر عورت نے دیا۔ پھر یہ کہ اس شخص نے یہ خیال کیا کہ یہی وہ عورت ہے جس کے ساتھ زفاف (یعنی پہلی بار شب ب سری) ہونا ہے ان تمام باتوں سے اس فعل کے حلال سمجھے جانے کا گمان ہو سکتا ہے۔

غلط فہمی کی ایک اور صورت

حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے اپنی لونڈی سے ملنے کے لیے وقت اور جگہ کا تعین کیا۔ لیکن اتفاق سے اس کی بجائے کوئی اور لونڈی عین وقت مقررہ پر اسی جگہ آگئی اور اس شخص نے یہ سمجھ کر کہ یہ اس کی لونڈی ہے جس سے وقت مقرر ہوا تھا مباشرت کر لی۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کوئی اور عورت ہے تو ان دونوں میں سے کسی پر حد عائد نہ ہوگی اور اس فعل کا ارتکاب شبہ کی بناء پر سمجھا جائے گا کیونکہ وہ عورت عین بروقت اور اسی جگہ پر آئی جہاں آنے کے لیے لونڈی سے وعدہ کیا گیا تھا۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں اس عورت پر حد نافذ ہوگی کیونکہ اسے سب کچھ معلوم تھا پھر بھی اس نے اس جرم کا ارتکاب کیا۔ (ایسی صورت میں) یہی حکم مرد کے بارے میں ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے کسی لونڈی سے وعدہ کیا کہ میں فلاں جگہ میدان میں تیرے پاس آؤں گا۔ ایک اور لونڈی کو یہ بات معلوم ہوگئی اور وہ (عین

وقت مقررہ پر وہاں پہنچ گئی۔ اس شخص نے بایں گماں کہ یہ وہی ہے جس سے وعدہ ہوا تھا، اس سے مباشرت کر لی۔ بعد میں اس غلط فہمی کا علم ہوا تو وہ شخص حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں آیا، آپ نے کہا کہ حضرت علی بن ابوطالب کے پاس جاؤ پس اس نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے دریافت کیا، انھوں نے فرمایا کہ میری رائے میں تجھے کھلے میدان میں درے لگائے جائیں اور تو ایک غلام آزاد کر اور اس عورت کو بدکاری کی پاداش میں سزا دی جائے۔

غیر عورت سے زفاف ہو جانے کا بیان

چاروں امام اس پر متفق ہیں کہ اگر ایک شخص کے پاس پہلی رات کو زفاف کے لیے کوئی عورت لائی جائے جو اس کی بیوی نہ ہو اور عورتیں کہیں کہ یہ تیری بیوی ہے اور وہ شخص اس سے مباشرت کرے پھر بعد میں معلوم ہو کہ وہ اس کی بیوی نہیں ہے اسے دھوکے میں رکھا گیا ہے تو اس پر حد نافذ نہ کی جائے گی کیونکہ یہ جرم شبہ ہے۔ البتہ اس شخص پر مہر لازم ہو جائے گا اور مزوفہ عورت (جس کے ساتھ ہم بستری ہوئی) کو عدت گزارنا ہوگی اور جو اولاد اس سے پیدا ہو وہ اس شخص کی اولاد قرار پائے گی اور جن عورتوں نے اس کے بارے میں دروغ بیانی کی تھی ان پر تہمت کی حد بھی نافذ نہ ہوگی۔ اس مسئلہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہی حکم دیا ہے کیونکہ کوئی شخص پہلی بار دیکھ کر اپنی بیوی کو نہیں پہچان سکتا جب تک کہ عورتیں نہ بتائیں۔ لہذا اس معاملہ میں ان عورتوں کا بتانا اس عورت کے حلال ہونے کا ثبوت ہے اور ان کے کہنے ہی سے اس شخص کا حق اس عورت پر ہوا۔ اس لیے کہ معاملات میں فرد واحد کی گواہی قابل قبول ہے اور اس کے بموجب عمل کیا جائے گا۔

بے شوہر عورت کے حمل ہو جانے کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی آزاد عورت کو جس کا خاوند نہ ہو یا کوئی لونڈی ہو جس کا نہ کوئی خاوند ہو اور نہ اس کا آقا ہو حمل ہو جائے تو اس کی بابت اس سے پوچھا جائے اگر وہ عورت کہے کہ مجھے بدکاری پر مجبور کیا گیا۔ یا (کسی اور کے) شبہ میں میرے ساتھ مباشرت ہو گئی تو اس کا یہ عذر مان لیا جائے گا اور اس پر حد نافذ نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ صورت حال بھی ایسی ہی ہے جیسے کوئی اقرار زنا کرنے کے بعد یہ بیان دے کہ یہ فعل جبراً اس کے ساتھ کیا گیا۔ اس کی بابت حنفیہ کی دلیل، مسماۃ شراحہ والی حدیث ہے کہ (اس کے اقرار زنا پر) حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس سے کہا کہ ”ممکن ہے تیرے ساتھ جبر کیا گیا ہو لیکن عورت نے کہا کہ نہیں (مجھ پر جبر نہیں کیا گیا) پھر فرمایا کہ ”شاید تیرے سوتے میں کسی نے آکر تیرے ساتھ یہ زیادتی کی ہو۔ یہ تنقیح اس لیے ہے کہ شریعت اسلامیہ میں سزاؤں کی تشہیر کو ناپسند کیا گیا ہے۔

روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کسی نے بیان کیا کہ ایک عورت نے بیان کیا کہ اسے بڑی غفلت کی نیند آتی ہے (اسی حالت) میں ایک شخص نے اس کے ساتھ زبردستی بجا حرکت کی اور اس کے بعد اسے چھوڑ کر چلا گیا وہ یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ شخص کون تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس پر حد نافذ نہیں فرمائی اور اس بیان کو اس کے ارتکاب جرم میں شبہ قرار دے کر اس کا عذر قبول کر لیا۔

مسلمانوں کے درمیان اس میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جس کے ساتھ زنا بالجبر کیا جائے وہ مستوجب سزا نہیں ہے۔ البتہ وجوب مہر کے بارے میں اختلاف ہے۔ اور بنائے اختلاف یہ ہے کہ آیا ”مہر“ عوض، بضع، (معاوضہ) ہے

یا 'نحلہ' (عطیہ) ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ مہر معاوضہ (حق مباشرت) ہے ان کے کے نزدیک (اس مباشرت کے عوض) مہر لازم الا دوا ہوگا خواہ مباشرت حلال ہو یا حرام ہو، اور جو لوگ کہتے ہیں کہ مہر "عطیہ" ہے۔ ان کے نزدیک مہر کی ادائیگی صرف شوہروں کے لئے مخصوص ہے اور ان پر واجب الا داء ہے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ (نا جائز حمل کے بارے میں) ان کے دوا قوال ہیں اور دونوں میں سے زیادہ قوی یہ ہے کہ زنا بالجبر کی صورت میں عورت پر حد نافذ نہ ہوگی اگرچہ وہ اپنی مجبوری کے ثبوت میں ایسے واقعات نہ بیان کر سکے جو اس کے دعوے کی تصدیق کرتے ہوں اور نہ اس شخص کی بیوی ہونے کے ثبوت میں گواہ لاسکے کیونکہ نفاذ حد گواہوں کی گواہی یا اقرار جرم کے بغیر نہیں ہو سکتا اور اس صورت میں ان دونوں میں سے کوئی بات موجود نہیں ہے (یعنی نہ جرم کے گواہ ہیں اور نہ عورت کو اقرار ہے لہذا ارتکاب جرم میں شبہ ہے) اور شبہات پیش آنے پر سزا ساقط ہو جاتی ہے غرض محض حمل ہو جانے سے نفاذ حد واجب نہ رہے گا۔ اس کے لیے اقرار جرم یا گواہی زنا ضروری ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر وہ عورت اپنے قبیلہ میں رہتی ہے اور غیر مقامی یا باہر سے آئی ہوئی نہیں ہے تو اس پر حد زنا نافذ ہوگی اور اس کا عذر قبول نہیں کیا جائے گا۔ تا آنکہ اس کے بیان کی سچائی واضح نہ ہو جائے۔ بایں طور کہ وہ اپنی مجبوری کی علامات بتائے یا ایسے گواہ پیش کرے جن سے معلوم ہو سکے کہ اس شخص کے ساتھ اس کی شادی ہو چکی ہے یا ایسی کوئی اور بات بیان کرے جس سے اس کے بیان کی سچائی ظاہر ہو۔ کیونکہ حمل ہو جانے سے وہ عورت مستوجب حد ہو جائے گی اور بغیر ثبوت کے اس الزام سے بری نہیں ہو سکتی۔ ہاں اگر وہ عورت غیر مقامی ہے تو اس کی بات "شبہ کی بناء پر" مان لی جائے گی اور وثوق کے ساتھ اسے مستوجب حد قرار نہیں دیا جائے گا۔

شادی شدہ مرد کا غیر شادی شدہ عورت سے ملوث ہونے کا بیان

اگر ایک شادی شدہ اور آزاد شخص کنواری عورت یا (کسی کی) لونڈی سے یا جبراً کسی عورت سے بدکاری کرے تو ان تمام صورتوں میں بالاتفاق علماء شادی شدہ مرد کو سنگسار کیا جائے۔ کیونکہ (ارتکاب جرم میں) کوئی شبہ ایسا نہیں ہے جو حد کو ساقط کر دے۔ کنواری عورت کو سو درے لونڈی کو پچاس درے کی سزا دی جائے اور مجبور عورت کو کوئی سزا نہ ملے گی۔

سلطان (یا صاحب اقتدار) کا کسی کو زنا پر مجبور کرنا

اگر بادشاہ کسی کو زنا کرنے پر مجبور کرے یہاں تک کہ وہ کسی عورت سے ملوث ہو جائے تو اس مرتکب زنا پر حد نافذ نہ ہوگی کیونکہ اس کام پر مجبور کرنے والا سبب یعنی تلوار موجود ہے۔ اسی طرح اگر عورت کو سلطان مجبور کرے تو بالاتفاق اس عورت پر حد نافذ نہ ہوگی۔ ہاں اگر سلطان کے علاوہ کسی اور شخص نے زنا پر مجبور کیا تو اس صورت میں حکم کے بارے میں اختلاف ہے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ ایسے شخص پر حد جاری کی جائے گی کیونکہ اس فعل کے ارتکاب کا تصور ہی نہیں ہو سکتا جب تک عضو مخصوص میں استادگی پیدا نہ ہو اگر یہ کیفیت پیدا ہو تو وہ مرد کی خواہش اور رضا مندی کا ثبوت ہوگا۔ (لہذا جبر متصور نہ ہوگا)۔

شافعیہ، مالکیہ، حنابلہ اور صاحبین (امام محمد و امام ابو یوسف رحمہما اللہ) کہتے ہیں کہ سلطان کے علاوہ کسی کے مجبور کرنے پر بھی مرتکب زنا پر حد عائد ہوگی۔

زنا بالجبر کا بیان

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی مرد عورت کے ساتھ جبراً بدکاری کا مرتکب ہو تو اس مرد پر حد نافذ ہوگی۔ عورت پر حد نافذ نہ ہوگی۔ کیونکہ اسے مجبور کیا گیا تھا۔ اور اس سے بچنا اس کے اختیار میں نہ تھا۔ وہ عورت مہر مثل کی حقدار ہوگی خواہ وہ آزاد ہو یا لونڈی (مملوکہ) اگر وہ حاملہ ہو جائے تو پیدا ہونے والے بچے کا نسب اس شخص سے جوڑا جائے گا اور عورت کو عدت گزارنا ہوگی۔

اگر وہ عورت مملوکہ (لونڈی) ہے اس کی قیمت ہنوز پوری ادا نہ ہوئی ہو تو وہ شخص مہر کے علاوہ بقایا قیمت بھی مہر کے ساتھ ادا کرے گا اور آزاد عورت کو اگر کوئی زیاں (جسمانی یا مالی) پہنچا ہے تو اس کی دیت (تاوان) ادا کرنا ہوگا۔ اور مرد کے ذمہ ادا نہ ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اور اگر اس زیادتی کے باعث عورت مر جائے تو اس مرد کو آزاد عورت کا خون بہا اور لونڈی ہو تو اس کی قیمت اور مہر ادا کرنا ہوگا۔

بدکاری کے معاوضہ کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے ایک عورت کے ساتھ بدکاری کا معاوضہ طے کیا اور عورت نے منظور کر لیا اور مرد نے اس سے مباشرت کی تو اس کی پاداش میں کسی پر حد زنا عائد نہ ہوگی۔ البتہ حاکم وقت جو سزا مناسب سمجھے وہ دے سکتا ہے۔ یہ دونوں قیامت کے روز بدکاری کے گنہگار قرار دیے جائیں گے۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک عورت نے جنگل میں کسی چرواہے سے کہا کہ وہ اسے پینے کے لیے دودھ دے دے۔ چرواہے نے کہا کہ جب تک تو اپنے وجود کو میرے حوالے نہیں کرتی میں دودھ نہ دوں گا۔ عورت نے اپنی ضرورت اور طلب خوراک کے پیش نظر اس کی بات مان لی۔ چرواہے نے اس سے مباشرت کی۔ پھر یہ معاملہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے پیش ہوا آپ نے ان دونوں پر حد نافذ نہیں فرمائی اور کہا کہ وہ دودھ ہی اس کا مہر ہو گیا۔ اور اس دودھ کو معاوضہ (یا اجرت) قرار دیا کیونکہ اجرت حصول منفعت کا اختیار حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہے اور عورت کی اندام نہانی سے مباشرت بھی ایک منفعت ہے لہذا ارتکاب جرم میں دونوں کے حق میں شبہ کی گنجائش ہے (ظاہر ہے کہ شک کا فائدہ مجرم کو ملتا ہے) واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں مہر کو اجرت سے تعبیر فرمایا ہے ”فَاتَوْهُنَّ أَجُورَهُنَّ“ (یعنی بیویوں کو ان کی طے شدہ اجرت یا مہر ادا کر دو) پس یہ واقعہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ ”مہر رک کذا“ (یعنی میں تیرا مہر اس قدر مقرر کرتا ہوں) تو یہ صورت نکاح فاسد کی ہے۔

اس مہر کی وصولیابی خواہ عورت (آزاد) کا ولی کرے یا لونڈی کا آقا یا خود عورت اور وہ عورت آزاد ہو یا لونڈی جو کسی کی منکوحہ نہ ہو۔

یاد رہے کہ معاوضہ پر سودا کر لینے کے بعد مباشرت کرنا جرم زنا کو مشتبہ بنا دیتا ہے جس سے حد (سزائے شرعی)

سے بچا جاسکتا ہے تاہم ایسا کرنا (بہر حال) فعل حرام ہے۔

صاحبین (امام محمد و امام ابو یوسف رحمہما اللہ) کہتے ہیں کہ (صورت مذکرہ میں) 'حد' کا نفاذ کرنا واجب ہے کیونکہ عورت کو اندام نہانی کی اجرت دے کر کوئی شخص مباشرت کا حقدار نہیں ہو سکتا۔ لہذا اجرت دی ہو یا نہ دی ہو ایک ہی بات ہے اس سے جرم زنا میں شک پیدا نہیں ہوتا جو حد کو باطل کر دے پس اس شخص کا یہ کام غیر مشروط متصور ہوگا (صاحبین کی) یہ رائے قابل ترجیح ہے اور مسلک حنفیہ میں اس پر عمل درآمد ہے۔

مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اس صورت مذکورہ میں دونوں پر حد نفاذ ہوگی اور اجرت دینے سے اس فعل کے جرم ہونے میں کوئی شبہ نہیں پیدا ہوتا جو نفاذ حد سے روک دے۔ اجرت مقرر کرنے سے عورت کا جسم شرعاً اور عرفاً مرد پر مباح نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص ایک عورت کو کھانا وغیرہ پکانے کے لیے اجرت پر (ملازم) رکھے اور اس کے ساتھ بدکاری کر لے تو اس شخص کو بدکاری کی سزا دی جائے گا۔ کسی عالم کو اس سے اختلاف نہیں ہے۔

کنوار اپنے اور شادی شدہ ہونے کی حالت میں ارتکاب گناہ کرنا

حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ اور ایک روایت کے مطابق حنابلہ بھی کہتے ہیں کہ ایک شخص نے جبکہ کنوار تھا بدکاری کی اور ہنوز اس کی سزا نہ ملی تھی کہ اس نے شادی کی اور پھر بدکاری کی تو اس شخص کو درہ زنی اور سنگساری دونوں سزائیں نہیں دی جائیں گی۔ بلکہ اسے محض سنگسار کیا جائے گا۔ کیونکہ جب اس کا قتل کیا جانا یا سنگسار کیا جانا واجب ہو چکا ہے تو درہ زنی سے کیا فائدہ؟ درہ زنی سے آئندہ کی اصلاح جو مقصود تھی وہ مقصد تو اب رہا ہی نہیں۔

عدت کے دوران عقد کر لینے کا بیان

مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے ایسی عورت سے عقد نکاح کیا جو اپنے پہلے خاوند کی عدت میں ہے اور اس شخص نے اس عورت سے مباشرت کر لی تو اس پر سزائے زنا عائد ہوگی۔ یعنی اگر وہ کنوارا ہے تو اسے سو درے لگائے جائیں گے۔ اگر شادی شدہ ہے تو اسے سنگسار کیا جائے گا۔ لیکن اس کو مشتبہ عقد قرار نہ دیا جائے گا کہ دونوں کو سزائے زنا سے بری کر دیا جائے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ ان پر حد (سزائے شرعی) نفاذ کرنا واجب نہیں ہے، البتہ انھیں سزا دی جائے گی کیونکہ اس عقد کے درست ہونے میں شبہ ہے اور جہاں شبہ ہو ملزموں کو سزا نہیں دی جاتی۔ نفاذ حدود کا انحصار شہادتوں پر ہے۔

چار بیویوں کے ہوتے پانچویں سے عقد کرنے کا بیان

مالکیہ کہتے ہیں کہ ایک شخص کی چار بیویاں ہیں اور پانچویں سے اس نے عقد کیا اور جانتا تھا کہ پانچویں سے شادی کرنا حرام ہے تو اس پر حد زنا نفاذ کی جائے گی لیکن اگر یہ معلوم نہ تھا کہ یہ حرام ہے اور عقد نکاح ہو گیا تو وہ مستوجب حد نہ ہوگا اور اس فعل کے حرام ہونے سے ناواقفیت کا جرم مشتبہ ہو جائیگا اور نفاذ حد کو موقوف کر دیا جائے گا۔ اور خارجیوں کے اس قول پر اعتبار نہیں کیا جائے گا جو کہتے ہیں کہ نو عورتوں تک (بیک وقت) بیویوں کا رکھنا جائز ہے اور اس کے لیے وہ نبی صلی اللہ علی وسلم کی دلیل پیش کرتے ہیں کہ حضور کی بیک وقت آٹھ بیویاں تھیں اور یہ حضور کے لیے مخصوص اجازت نہ

تھی۔ آپ ہمارے رہنما ہیں ہم ان کی پیروی کر سکتے ہیں۔ نیز وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی ثبوت لاتے ہیں کہ ”فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ و ثلاث و رباع“ (یعنی تم اپنی حسب پسند دودو، تین تین اور چار چار عورتوں سے نکاح کر سکتے ہو)۔ لیکن ان کا یہ خیال غلط ہے۔ چار بیویوں سے زیادہ رکھنا حضور کی خصوصیات میں سے تھا۔ آیت میں جو حرف ’و‘ (عطف بمعنی ’اور‘) آیا ہے اس کا مطلب ’او‘ (حرف تردید بمعنی ’یا‘) ہے یعنی ان سب کو نکاح میں جمع کرنے کا حکم نہیں ہے بلکہ ان (دو، تین یا چار) میں سے کسی تعداد کو اختیار کرنے کی اجازت ہے۔ چنانچہ ایک روایت یہ کہ ایک شخص مسلمان ہوا اس کی دس بیویاں تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ وہ چار کو رکھ لے باقیوں کو چھوڑ دے۔

محارم (جن سے نکاح حرام ہے) سے نکاح کر لینے کا بیان

مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ اور حنفیہ میں سے، ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ایسی عورت سے عقد نکاح کرے جس کے ساتھ نکاح کرنا حرام ہے خواہ وہ پیدائشی رشتہ سے حرام ہو جیسے ماں، بہن یا نسبی اور دودھ کے رشتہ سے حرام ہو، پھر اسی عقد کی بناء پر اس کے ساتھ مباشرت کرے اور جانتا ہو کہ یہ فعل حرام ہے تو اس پر نفاذ حد واجب ہے، کیونکہ اس عقد سے وہ عورت (جو ہمیشہ کے لئے حرام ہے) حلال نہیں ہو سکتی پھر خود اس شخص کے نزدیک بھی اس فعل کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ تاہم اس کے نتیجہ میں جو بچہ پیدا ہو جائے وہ اسی شخص کی طرف منسوب ہوگا۔

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ ایسے شخص پر ’حد‘ کا نفاذ واجب نہیں ہے اگرچہ وہ یہ کہتا ہو کہ میں جانتا تھا کہ یہ فعل حرام ہے۔ تاہم اس فعل سے اس شخص پر ادائیگی مہر واجب ہوگی اور پیدا ہونے والے بچہ کا نسب اس سے وابستہ کیا جائے گا۔ اور اسے تمام سزاؤں میں سب سے بڑی سزا دی جائے گی لیکن یہ سزا ایسی نوعیت کی ہوگی شرع کی مقرر کردہ سزا نہ ہوگی۔ بشرطیکہ جان بوجھ کر اس شخص نے اس جرم کا ارتکاب کیا ہو، لیکن اگر وہ (اس فعل کے) شرعی حکم سے ناواقف تھا اور یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ فعل حرام ہے تو اسے نہ شرعی حد ماری جائے گی اور نہ تنبیہ سزا دی جائے گی۔

اس مسئلہ میں قابل ترجیح قول وہ ہے جو جمہور ملت کا ہے۔

واضح ہو کہ یہ اختلاف مہر اس صورت میں ہے جہاں دودھ یا رشتہ ازدواج سے حرام ہونے والی عورت کے ساتھ ملوث ہونے کا معاملہ ہو۔ اور اختلاف اس بات میں ہے کہ آیا اس فعل کے ارتکاب میں شبہ تسلیم کیا جائے یا نہیں؟ سو جمہور فقہاء کے نزدیک تو اس فعل کے جرم ہونے میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے لیکن امام ابو حنیفہ، سفیان ثوری اور امام زفر کے نزدیک یہ عقد شبہ کا ہے اور اس کے جرم ہونے میں شک ہے۔ شک کی گنجائش کا انحصار اس سوال پر ہے کہ آیا یہ عقد اپنی جگہ پر درست تھا یا نہیں؟ جمہور کہتے ہیں کہ یہ عقد بجائے خود درست نہیں ہے کیونکہ جن کے درمیان عقد ہوا ہے ان میں باہم عقد ہو ہی نہیں سکتا جس سے عورت مرد پر حلال ہو جاتی ہے۔ یہ عورتیں بہر حال اس مرد پر حرام ہیں، لہذا گو بظاہر یہ عقد ہے لیکن نافذ العمل نہیں ہو سکتا کیونکہ اپنے محل میں واقع نہیں ہوا (یعنی جن میں باہم عقد ہو سکتا تھا ان میں نہیں ہوا) یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک مرد کسی مرد سے عقد ازدواج کرے۔

اس مسئلہ میں تینوں اماموں اور صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد) کے قول پر فتوے ہے۔ علماء کا کہنا ہے کہ یہ

عقد مشکوک متصور نہ ہوگا بلکہ یہ (قطعاً طور پر) گناہ اور جرم مستوجب سزائے زنا ہے۔

محارم سے بدکاری کرنے کا بیان

اگر کسی شخص نے اپنے محرم سے (جس کے ساتھ نکاح حرام ہے) بدکاری کی، خواہ اس کے ساتھ مباشرت از دو اجبی رشتہ کی بناء پر حرام ہو یا دودھ کے رشتہ کی بنا پر۔ حضرت جابر بن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کی گردن ماردی جائے اور اس جرم کی پاداش میں اس کا تمام مال (بجق حکومت) ضبط کر کے بیت المال (خزانہ حکومت) میں داخل کر دیا جائے تاکہ اسے قرار واقعی سزائے ملے اور دوسروں کے لیے موجب عبرت ہو کہ اتنے بڑے گناہ کی جرأت نہ کریں۔

امام احمد اور اسحاق سے مروی ہے کہ جو شخص اپنے باپ کی بیوی سے ملوث ہو، اس کی سزا قتل ہے خواہ وہ شادی شدہ ہو یا کنوارا۔ چنانچہ حضرت براء رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے ماموں کو ہاتھ میں ایک رات (علم یا نیزہ) اٹھائے ہوئے دیکھا۔ میں نے کہا، کہاں کا ارادہ فرمایا؟ انہوں نے کہا ”بعثنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی رجل نکح امرأة ابیه، ان اضرب عنقه، و آخذ ماله“ ابوداؤد و ترمذی (یعنی مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے کہ فلاں شخص کی، جس نے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کر لیا ہے، گردن اڑا دوں اور اس کا مال ضبط کر لوں)۔ محدثین کا کہنا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔

ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس حدیث کو روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”من وقع علی ذات محرم منه، فاقتلوه“ (یعنی جو شخص اپنے محرم سے ملوث ہوا سے قتل کر دو) کیونکہ وہ شخص اللہ کی حرام کردہ شے کو حلال کرنے کا مجرم ہے۔ چونکہ یہ عمل اسلام سے مرتد ہو جانا ہے لہذا ایسے شخص کا قتل کیا جانا حلال ہے اور اس کا مال تمام مسلمانوں کے مشترک خزانہ میں داخل کر لیا جائے اور ایسا ہونا کفر کا لازمی نتیجہ ہے۔

واضح ہو کہ یہ حدیث ہر ایسے نکاح پر منطبق ہے جو محرم سے کیا جائے اور ہر ایسے شخص کو شامل ہے جو محرم عورت سے بدکاری کرے۔ تمام علماء اس پر متفق ہیں کہ جو شخص محرم عورت سے جس کے ساتھ ہمیشہ کے لیے نکاح حرام ہے شادی کرے اسے قتل کر دیا جائے کیونکہ اس شخص نے فطرت انسانی سے بغاوت کی اور حیوانیت کے درجہ پر اتر آیا۔ آدمیت سے خارج ہو گیا، اپنی برتری کھو بیٹھا اور شرافت و شعور سے بیگانہ ہو گیا لہذا اس مذموم فعل کی پاداش میں جس سے ہر صحیح العقل انسان متنفر ہے، مستوجب قتل ہے۔

معاویہ بن قرہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے (یعنی معاویہ کے) دادا کو یہ حکم دے کر روانہ کیا کہ وہ اس شخص کو جس نے اپنے بیٹے کی بیوی سے شادی کر لی تھی قتل کر دیں اور اس کے مال سے خمس (پانچواں حصہ) ضبط کر لیں۔ یہ واقعہ اس امر کا ثبوت ہے کہ اس شخص نے اس فعل کو حلال کر لیا اور بدیں سبب وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔ اس نے ایسی عورت سے مباشرت کی جس پر اسے کوئی حق نہ تھا اور نہ حق کا شبہ ہو سکتا تھا۔ وہ عورت اس پر حرام تھی اور اس کے حرام ہونے پر سب کا اتفاق ہے اور اس فعل کا مرتکب مستوجب حد ہے اور چونکہ وہ اس فعل کے حرام ہونے سے واقف تھا لہذا اس پر حد کا نفاذ کیا جانا واجب ہے۔

آقا (مالک یمین) کا اپنی شادی شدہ لونڈی سے مباشرت کرنا

حنفیہ، مالکیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر آقا اپنی لونڈی سے جس کی شادی کسی اور سے ہوئی ہے مباشرت کرے تو اس پر حد واجب نہ ہوگی۔ کیونکہ یہاں سابقہ ملکیت کے باقی رہنے کا شبہ وہ کر سکتا ہے۔ اس شک کی بنا پر حد ساقط ہو جائے گی۔

حنابلہ کہتے ہیں کہ اس پر سزائے حد کا عائد کرنا واجب ہوگا اور اس کا یہ عذر (کہ اس نے مالک ہونے کے شعبے میں مباشرت کی) قبول نہیں کیا جائے گا۔ یہاں اس شک کی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ اسی نے شادی کی اور شادی کے بعد وہ اپنے حق سے دست بردار ہو گیا اور وہ لونڈی کسی اور کے تصرف میں چلی گئی اور قطعی طور پر وہ اس شخص کے لیے حرام ہو گئی اور اس کی ملکیت سے باہر ہو گئی تو شک وارد ہونے کا امکان نہ رہا اور اس شخص پر بالاتفاق حرام ہو گئی اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

مرتکب زنا کا عورت کے حال سے ناواقف ہونے کا بیان

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ایک اجنبی عورت کے ساتھ تخلیہ کرتے ہوئے پکڑا جائے اور یہ کہے کہ اس نے اس عورت سے نکاح کر لیا ہے یا یہ کہ اسے معلوم نہ تھا کہ اس کا کوئی خاوند ہے یا وہ عدت کے دن کاٹ رہی ہے اور نہ اسے یہ علم ہے کہ وہ عورت اس کی رشتہ دار محرم یا اس کی دودھ شریک بہن ہے یا اس کی ساس ہے۔ تو اس بارے میں اس سے حلف لیا جائے گا۔ اگر وہ حلف اٹھالے تو اس کی سزائے حد ساقط ہو جائے گی اور حد نافذ نہ ہوگی۔ البتہ مہر ادا کرنا ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی (خطا کرنے والی) عورت یہ کہے کہ وہ اس سے ناواقف ہے کہ اس کا کوئی خاوند ہے یا یہ کہ وہ عدت میں ہے تو اس سے حلف لیا جائے گا اور حلف کے بعد اس کا بیان تسلیم کر لیا جائے گا اور حد ساقط ہو جائے گی لیکن اگر حلف اٹھانے سے انکار کرے تو اس پر حد جاری ہوگی۔

اگر (مرتکب) مرد کہے کہ مجھے معلوم تھا کہ اس عورت کا خاوند ہے یا یہ کہے کہ میں جانتا تھا کہ یہ عدت کے دن گذار رہی ہے یا یہ کہ وہ عورت اس کی محرمات میں سے ہے اور اسے اعتراف ہو کہ وہ اس پر حرام ہے۔ ان تمام صورتوں میں اس پر حد واجب ہوگی اور مہر لازم ہوگا۔ اگر عورت اقرار کرے کہ وہ جانتی تھی کہ اس کی شادی ہو چکی ہے اور وہ اپنے خاوند کے قبضہ میں ہے یا یہ کہ وہ عدت میں ہے وغیرہ تو اس پر حد زنا لاگو ہوگی کیونکہ اب اس کے جرم ہونے میں کوئی شک نہ رہا۔ مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے اپنی عدت گزارنے والی بیوی سے، عدت گزارنے کے بعد مباشرت کی یا کسی اور خاوند کی عدت گزارنے والی عورت سے مباشرت کی تو اس پر حد نافذ ہوگی۔

اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کی موجودگی میں سالی سے شادی کر لی تو وہ مستوجب سزا ہے۔ ہاں اگر وہ کہے کہ مجھے اس کی بابت شرع کا حکم معلوم نہ تھا تو ناواقف ہونے کا یہ عذر تسلیم کر لیا جائے گا۔ اگر کسی شخص کو ایسی عورت سے بدکاری پر مجبور کیا گیا جو اس پر راضی تھی۔ لیکن اس کا کوئی خاوند یا مالک نہیں ہے ایسے شخص پر حد نافذ کرنے کی بابت اختلاف ہے۔ مشہور قول یہی ہے کہ اسے سزائے حد دی جائے گی لیکن اگر اس عورت کا خاوند یا مالک ہے تو اس کا حق ملحوظ رکھتے ہوئے اس

بیوی کی مملوکہ لونڈی سے بدکاری

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص کو اس کی بیوی نے اپنی لونڈی سے مباشرت کی اجازت دے دی اور اس نے مباشرت کر لی۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ میں نے حلال سمجھ کر یہ کام کیا تھا تو اس کی یہ بات تسلیم کر لی جائے گی۔ جرم مشتبہ ہو جائے گا اور حد ساقط ہو جائے گی کیونکہ یہاں اس شبہ کا امکان ہے کہ بیوی کے مال پر خاوند کا حق ہوتا ہے خاص کر اس صورت میں جب کہ منکوحہ بیوی نے اسے اپنے مال میں تصرف کی اجازت دے دی ہو۔ گویا اس نے خاوند کو حق ملکیت دے دیا۔ لیکن اگر خاوند کہتا ہے کہ میں جانتا تھا کہ اس سے مباشرت حرام ہے تو اس پر حد لاگو ہوگی۔ کیونکہ اب (جرم کے ارتکاب میں) ایسا کوئی شبہ نہیں رہا جو سزا کو ساقط کر دے۔

مالکیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں حد نافذ ہوگی۔ اگر وہ شخص کنوارا ہے تو درہ زنی کی سزا پائے گا ورنہ سنگسار کیا جائے گا کیونکہ اس شخص نے ایسی عورت کے ساتھ مباشرت کی جس پر اسے نہ تو پورا حق حاصل تھا نہ وہ اس کی ملکیت میں شریک تھا اور نہ یہ شبہ تھا کہ وہ اس کی منکوحہ ہے۔ لہذا وہ مستوجب حد ہے۔

حنابلہ کہتے ہیں کہ اس شخص کو (بہر حال) سو درے مارے جائیں گے، اگرچہ وہ شادی شدہ ہو۔ شبہ کا فائدہ صرف اس قدر ہوگا کہ اسے سنگسار نہیں کیا جائے گا اور شک کے پیش نظر اس کی سزا میں تخفیف کر دی جائے گی۔ تاہم حد کلی طور پر ساقط نہ ہوگی جیسا کہ احناف کہتے ہیں۔ کیونکہ محدثین سے بسند حسن روایت ہے کہ ایک شخص اپنی بیوی کی لونڈی سے ملوث ہو گیا۔ یہ معاملہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش ہوا جو کوفہ کے حاکم (گورنر) تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں تمہارا فیصلہ رسول اللہ کے ارشاد کے مطابق کروں گا کہ ”ان کانت احلتھا لک جلد تک مائة، وان لم تکن احلتھا لک رجعتک“ (یعنی اگر بیوی نے اسے تیرے لیے حلال کر دیا تھا تو تجھے سو دروں کی سزا ہوگی اور اگر اس نے حلال نہیں کیا تھا تو تجھے سنگسار کیا جائے گا)۔

غیر مسلم حربی کی بدکاری کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی غیر مسلم حربی (جو برسر جنگ ہے) کسی ذمیہ عورت سے (یعنی ایسی غیر مسلم عورت سے جو مسلمانوں کی پناہ میں ہو) بدکاری کرے۔ اور اگر ایک شخص کو کسی مطاوعہ عورت سے (جو اس گناہ پر راضی ہو) بدکاری پر مجبور کیا گیا ہو تو وہ ذمیہ اور مطاوعہ (راضی ہونے والی عورت) مستوجب حد ہے اور اس حربی (برسر جنگ دشمن) اور جبر کے تحت ارتکاب زنا کرنے والے پر حد نافذ نہ ہوگی، کیوں کہ حدیث میں ہے ”رفع عن امتی الخطا والنسیان، وما استکرہوا علیہ“ (یعنی حضور کا ارشاد ہے کہ میری امت سے بھول چوک میں یا جبر کے تحت کوئی گناہ سرزد ہو تو اس پر گرفت نہ ہوگی)۔

اور اگر حربی (دشمن) دارالاسلام (اسلامی حکومت کے علاقہ) میں آکر مسلمان ہو جائے اور بدکاری کرے اور یہ کہے کہ میرا گمان یہ تھا کہ بدکاری حلال ہے، تو اس کی اس بات کی طرف کوئی توجہ نہ دی جائے گی اور اس پر حد نافذ کی جائے گی

گی، اگرچہ یہ حرکت اس سے پہلے ہی روز جب کہ وہ اسلامی علاقہ میں آیا سرزد ہوئی ہو۔ کیونکہ 'زنا' ہر دین و مذہب میں حرام ہے۔

مجاہد کا مرتکب زنا ہو جانا

کوئی مسلمان فوجی (مجاہد) بدوران جہاد غنیمت میں ہاتھ لگی ہوئی کسی لونڈی کے ساتھ تقسیم غنیمت سے پہلے ہی مباشرت کر لے تو اس پر حد نافذ نہ کی جائے کیونکہ اس کا جرم مشتبہ ہے بدیں جہت کہ علاقہ جنگ میں (ارتکاب جرم پر) حد نافذ نہیں ہوتی اور نہ بدوران جنگ حد عائد ہوتی ہے تا آنکہ وہ شخص دشمن سے نہ مل جائے۔ وہ مسئلہ اس صورت میں ہے جب کہ دشمن کو شکست ہو جائے اور مال غنیمت میں اس کا شریک ہونا مسلم ہو۔ اور اس کی مقدار زیادہ ہو اور لشکریوں کی تعداد کم ہو۔

مشرکین اہل کتاب کا مرتکب زنا ہونا

اگر دو شادی شدہ مشرکوں نے بدکاری کی اور ان کی بدکاری گواہوں کی شہادت یا مجرموں کے اقرار سے ثابت ہو جائے تو اس بارے میں فقہاء کی رائیں مختلف ہیں:

حنفیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ ان میں سے کسی کو سنگسار نہیں کیا جائے گا کیونکہ مشرکوں میں 'احصان' (پاکبازی) کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ سنگساری کی بجائے اور سزا دی جائے گی۔

شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر اہل کتاب اس بارے میں مسلمانوں سے فیصلہ کے طالب ہوں اور وہ اس بات کو ماننے پر آمادہ ہوں کہ مسلمانوں کی عدالت میں جو معاملہ پیش کیا جائے گا اسے وہ تسلیم کر لیں گے۔ اور پھر جب (اسلامی نقطہ نظر سے) ان کا جرم زنا ثابت ہو جائے تو ان پر حد جاری کی جائے گی۔ یعنی اگر وہ شادی شدہ ہیں تو انہیں سنگسار کیا جائے گا اور کنوارے ہیں تو سوڈے مارے جائیں گے اور انہیں ایک سال کے لیے اٹنے دور فاصلہ پر جلا وطن کیا جائے گا جس پر نماز کا قصر کرنا لازم ہوتا ہے چنانچہ حضرت نافع نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے، مدینہ منورہ میں، ایک یہودی مرد اور یہودیہ عورت کو، جو زنا کے مرتکب ہوئے تھے اور پھر حضور سے فیصلہ کے طالب ہوئے تھے، سنگسار کئے جانے کا حکم دیا ہے "و اذا حکمت فاحکم بینہم بالقسط" (یعنی اہل کتاب کے درمیان منصفانہ فیصلہ کرو) اور یہ کہ "وان احکم بینہم بما انزل اللہ" (یعنی ان کے معاملہ میں اللہ کی فرستادہ وحی کے مطابق فیصلہ کرو) اس کا یہی مطلب ہے۔ پس یہودیوں کے درمیان امور دنیا میں سے کسی امر کی بابت وہی فیصلہ کیا جائے گا جو مسلمانوں کے درمیان ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ کا حکم اس کے تمام بندوں کے لیے یکساں اور غیر متبدل ہے۔

حرمت زنا سے لاعلمی کا اظہار کرنا

حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ زنا کی شرعی سزا پر عمل درآمد کے لیے یہ شرط ہے کہ مرتکب یہ جانتا ہو کہ یہ فعل حرام ہے۔ پس اگر وہ شخص جس کے خلاف ارتکاب جرم کی گواہی گزر چکی ہے، نفاذ حد کے وقت یہ کہے کہ وہ نہیں جانتا تھا کہ 'زنا' فعل حرام ہے اور وہ اس کے بارے میں حکم شرع سے ناواقف تھا اور اس پر حلف اٹھالے تو اس کی بات تسلیم کر لی

جائے گی اور اس پر حد نافذ نہ ہوگی۔ کیونکہ (اس کے قسم کھالینے پر) اس کے ارتکاب جرم میں شک پیدا ہو جائے گا۔ جس کے باعث حد ساقط ہو جائے گی۔

روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اقراری مرتکب سے یہ استفسار فرمایا تھا ”فهل تدری ما الزنا؟“ (یعنی تم جانتے ہو کہ زنا کیا ہے؟)

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص مستوجب حد قرار دیے جانے کے بعد یہ کہتا ہے کہ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ شرعاً یہ فعل حرام ہے۔ میں اس حکم سے ناواقف ہوں اور یہ نیا نیا اسلام میں داخل ہوا ہے یا ایسے صحرائی علاقہ میں پرورش پائی ہے جو علمائے دین (کے اثر) سے دور واقع ہے تو اس پر حد عائد نہ ہوگی۔ کیونکہ اس امر کا امکان ہے کہ وہ سچ کہہ رہا ہو۔ اس شک کی بناء پر حد کا نفاذ ساقط ہو جائے گا۔ لیکن اگر ایسی صورت نہ ہو بلکہ اسے مسلمان ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہو کہ اس عرصہ میں اسے ان مسائل کا جاننا اور سیکھنا ممکن تھا یا ایسے صحرائی علاقہ میں رہائش پذیر تھا۔ جو اہل علم کے قریب ہو اور اسے مقامی اشخاص کے ساتھ ربط و ضبط اور ان کی باتیں سننے سنانے کا موقع ملتا رہا ہے تو اس پر حد نافذ ہوگی اور لاعلمی کا بہانہ تسلیم نہ کیا جائے گا۔ کیونکہ فیصلہ کرنے والے حاکم کے سامنے زنا کا اقرار کرنے یا گواہوں کی شہادت سے جرم ثابت ہو جانے کے بعد اس کا یہ بیان دینا اس کے جھوٹ ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔

حرکت غیر فطری کے مرتکب ہونے کا بیان

ائمہ فقہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص غیر عورت سے، اندام نہانی کے علاوہ کسی اور طرح سے حرکت جماعی کرے مثلاً آگے یا پیچھے کے منافذ کے علاوہ پیٹ وغیرہ کی تہوں (یا بغلیوں) میں تو وہ مستوجب حد نہیں ہے لیکن سزا کے قابل ہے کیونکہ بہر حال اس نے ایسا مذموم فعل کیا ہے جو شرعاً حرام ہے۔ امام علی کرم اللہ وجہہ نے حکم دیا ہے کہ جو شخص غیر عورت کے ساتھ تخلیہ کرتا ہوا پایا جائے گو ملوث نہ ہوا ہو اسے بھی سو کوڑے بطور سرزنش کے مارے جائیں کیونکہ یہ بھی بدکاری میں پڑ جانے کا ذریعہ ہے۔

مردہ عورت سے بد فعلی کے مرتکب پر حد زنا، تو نافذ نہ ہوگی البتہ امام وقت جو سزا بھی چاہے سرزنش کے طور پر دے سکتا ہے۔ کیونکہ فطرت انسانی ایسے مذموم افعال سے گھن کھاتی ہے۔ چونکہ اس میں زنا کی پوری کیفیت نہیں ہوتی اس لیے حد شرعی نافذ نہ ہوگی۔

میاں بیوی میں جھگڑا کرادینے کا بیان

واضح ہو کہ میاں بیوی کے درمیان فساد ڈالنے کی کوشش کرنا دین اسلام میں حرام اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑے بڑے گناہوں میں سب سے بڑا گناہ ہے اگر کسی نے میاں بیوی کے درمیان ایسا فساد ڈلوایا کہ ان میں طلاق ہو گئی تو اس (فعل بد) کی پاداش کے بارے میں علماء کی مختلف رائیں ہیں۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ جس شخص نے کسی کی بیوی کو فساد پر اکسایا کہ بعد میں اس کے ساتھ شادی کر لے تو اس عورت کو ہمیشہ کے لیے اس پر حرام قرار دے دیا جائے گا تا کہ اسے اپنے (مذموم) ارادے میں زک پہنچے اور مقصد

ثبوت جرم کے بارے میں شریعت کی سختی کا بیان

ممکن ہے کہ یہاں پر یہ کہا جائے کہ (ثبوت جرم زنا کے لیے) شریعت کے اس تشدد سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہے، کیونکہ جرم زنا کا ثبوت چار اشخاص کی شہادت پر موقوف ہے اور چونکہ گواہوں کو یہ علم ہوتا ہے کہ اگر چاروں میں سے کسی نے بھی ادائے شہادت میں کوتاہی کی تو ان سب کو تہمت لگانے کی 'حد' یعنی اسی (۸۰) کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔ لہذا وہ گواہی دینے کی جرأت ہی نہ کریں گے پھر یہ بھی ہے کہ اگر خاوند اپنی بیوی کے ساتھ کسی اجنبی شخص کو دیکھے اور اسی حالت میں دونوں کو چھوڑ کر گواہوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہو اور جب تک گواہ آئیں وہ مرد اپنا مطلب پورا کر چکا ہو اور خاوند کا حق دعوے ختم ہو جائے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس مذموم جرم اور قابل نفرت گناہ کا ضرر محض مرتکب مرد اور مرتکبہ عورت تک محدود نہیں ہے بلکہ پورا خاندان اس سے متاثر ہوتا ہے بے خبر اور بے گناہ کی عزت میں بٹہ لگ جاتا۔ انہیں ذلت و رسوائی سے دو چار ہونا پڑتا ہے اور سب کی نگاہوں سے ان کا مرتبہ گر جاتا ہے۔ پس اہل خاندان کی بزرگی اور سب کی آبرو بچانے کے لیے شریعت اسلامیہ نے اس جرم کو ثابت کرنے میں سختی سے کام لیا ہے تاکہ لوگ بے دھڑک ایک دوسرے پر تہمت تراشی کی جرأت نہ کریں۔

اگر اس گناہ کا مرتکب شادی شدہ ہے تو فی الحال اسلام نے اس کے اس فعل کو خود اس کے لیے سخت اذیت کا موجب بنادیا ہے۔ اسے بتادیا گیا ہے کہ یہ کس قدر قابل مذمت فعل ہے۔ پھر سب کو یہ معلوم ہے کہ یہ فعل قتل کے برابر ہے۔ اس کے ارتکاب پر ان ایمانداروں کو سخت تنبیہ حاصل ہوتی ہے جو اللہ کے غضب اور اس کی گرفت سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے بندوں کی غیرت کے مقابلہ میں اپنی بے غیرتی کا موازنہ کرتے ہیں۔ چنانچہ صاحب ایمان جب قرآن حکیم میں اللہ کے اس ارشاد کو پڑھتا ہے "وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعْنَهُ وَاعْدَلَهُ عَذَابًا عَظِيمًا" (جرم) پورا نہ ہو۔

امام احمد نے سند صحیح حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مَنْ خَبَسَ عَلَى امْرَأَةٍ زَوْجَتَهُ أَوْ مَمْلُوكًا فَلَيْسَ مِنَّا" (یعنی جس نے ایک شخص کے خلاف اس کی بیوی یا لونڈی کو بھڑکایا وہ ہم میں سے یا امت محمدیہ میں سے نہیں ہے) حدیث میں لفظ "خبس" جو آیا ہے اس کے معنی مکر و فریب یا بگاڑ ڈالنے کے ہیں۔

حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ میاں بیوی کے درمیان جھگڑا کرانے سے وہ عورت اس شخص پر حرام نہیں ہو

(یعنی جو شخص عداً کسی ایماندار کو قتل کرتا ہے اس کی سزا دوزخ ہے جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا عتاب اور اس کی لعنت ہے اور اس کے لیے عذاب سخت کا فیصلہ ہو چکا ہے) ادھر اسے یہ علم ہے کہ فعل زنا کی سزا (حد) سزائے قتل کے مساوی ہے اب اگر وہ یہاں زنا کی سزا سے بچ جاتا ہے تو اسے اس گناہ کی باز پرس کا سامنا ہوگا۔ اسی خیال سے بعض اصحاب نے جو حقیقی معنوں میں صاحب ایمان تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے جرم زنا کا جو مستوجب قتل تھا اعتراف کیا تا کہ اس دنیا کی سزا جھیل کر عذاب آخرت سے نجات پائیں۔^(۱)

لعان (بریت کی قسم کھانے) کا بیان

واضح ہو کہ اس معاملہ میں شریعت اسلامیہ نے خاوند کے حق کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ ایک معقول حد تک اس کا تعین فرما دیا ہے، جس سے ایک طرف تو خاوند کو غیظ و غضب کی اذیت سے نجات ہوگی اور دوسری طرف بیوی کا کردار مشکوک ہو جائے گا اور اس کا خاندان اس کے شر کی اذیت سے بچ جائے گا۔

جاتی۔ اس شخص کا اس عورت سے شادی کر لینا تو حلال ہے لیکن یہ شخص نہایت گنہگار اور اس کا یہ فعل بدترین معصیت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک روز قیامت میں بڑے سے بڑا گنہگار متصور ہوگا۔

طبرانی کی کتاب صغیر و اوسط میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”من افسد امرأة علی زوجها فلیس منا“ (یعنی جو شخص کسی کی بیوی کو اس کے خاوند کے خلاف فساد میں ڈالے وہ ہم میں سے نہیں ہے) یعنی ہماری راہ سے ہٹا ہوا اور ہماری شریعت سے باہر ہے۔ کیونکہ اس نے ایسے مذموم فعل کا ارتکاب کیا جسے اسلام روا نہیں رکھتا۔

۱۔ ابو داؤد، نسائی اور عبد الرزاق نے اپنی ’مصنف‘ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اخراج فرمایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے خلاف بیان دیا کہ انہوں نے ایک عورت سے حرام کاری کی اور یہ اقرار انہوں نے چار بار کیا اور ہر بار حضور ان سے منہ موڑ لیتے تھے اور پانچویں بار جب وہ سامنے آئے تو آپ نے فرمایا کہ فی الواقعہ، تم نے اسے دبوچ لیا۔ انہوں نے کہا ’جی ہاں‘ پھر فرمایا کیا اس طرح جیسے سلائی سرمہ دانی میں یاری کنوئیں میں؟ انہوں نے کہا ’جی ہاں‘ استفسار فرمایا کہ جانتے ہو زنا کس طرح ہوتا ہے؟ انہوں نے کہا ’جی ہاں‘! میں نے اس عورت کے ساتھ وہی کام بطور فعل حرام کیا جو مرد اپنی بیوی کے ساتھ بطور فعل حلال کرتا ہے۔ پھر سوال فرمایا کہ اس بیان سے تمہارا کیا مقصد ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ حضور مجھے (عذاب آخرت) سے پاک فرمادیں۔ تب آپ کے حکم پر انہیں سنگسار کر دیا گیا۔ اسی طرح حضور کی خدمت میں ’ما عزن مالک‘ حاضر ہوئے اور انہوں نے ارتکاب زنا کا اقرار کیا۔

(ایک اور عورت) غامدیہ نے بھی آکر اعتراف زنا کیا۔

یہ تمام واقعات اس امر کا ثبوت ہیں کہ ان گنہگاروں کو اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس کے عذاب کا ڈر تھا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی غیر شخص ایک بے گناہ عورت یا بے گناہ مرد پر تہمت لگاتا ہے اور اس کے ثبوت میں چار گواہ پیش نہیں کر سکتا تب تو اس کی سزا یہ ہے کہ اس اتہام تراشی کی پاداش میں اسے اسی (۸۰) کوڑے لگائے جائیں۔ لیکن خاوند اگر یہ کہے کہ اس کی بیوی نے بدکاری کی ہے تو شریعت اسلامیہ اس کو اپنا الزام ثابت کرنے کا ذمہ دار اس طرح نہیں ٹھہراتی جیسا کہ اجنبی شخص کو ٹھہراتی ہے۔ کیونکہ کسی ذی عقل خاوند کو اپنی بیوی پر تہمت لگانے اور یونہی بدکاری کا الزام عائد کر دینے سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اس بے عزتی سے نجات پانے کے لیے اپنی بیوی کو چھوڑ دے۔ تاہم اس کے بیٹے بیٹیوں پر یہ داغ باقی رہے گا۔ اور اگر بیٹے بیٹیاں نہ ہوں تب بھی لوگوں کے درمیان کبھی نہ کبھی اس کی بے عزتی کا اندیشہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے غیروں کی الزام تراشی اور اس کے الزام لگانے کو یکساں قرار نہیں دیا، چنانچہ اگر خاوند بیوی پر تہمت لگائے تو شریعت نے اس کے (ثبوت) کے لئے (گواہی کی بجائے) ”لعان“ رکھا ہے۔ لعان یہ ہے کہ خاوند قاضی (حاکم شرع) کے سامنے یوں کہے کہ میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں اپنی بیوی پر الزام لگانے میں سچا ہوں۔ چار بار اسی طرح کہنے کے بعد یوں کہے کہ اگر اس میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر اللہ کی لعنت ہو۔ اس طرح عورت بھی کہے کہ میں خدا کو گواہ کر کے کہتی ہوں کہ یہ شخص مجھ پر ”زنا“ کی تہمت لگانے میں جھوٹا ہے وہ بھی چار بار اسی طرح کہنے کے بعد کہے کہ اگر یہ شخص سچا ہو تو مجھ پر خدا کی لعنت پڑے۔ (۱)

۱۔ فقہاء کہتے ہیں کہ ’لعان‘ (لعنت پر مشتمل قسم بریت کھانے) سے پہلے امام کے لیے طریق سنت یہ ہے کہ وہ کھڑے ہو کر ایک تقریر کرے جس میں انہیں کذب بیانی سے ڈرنے اور اس گناہ سے بچنے کے لیے نصیحت کرے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا، جب کہ ہلال بن امیہ نے اپنی بیوی پر شریک بن سحاح سے ملوث ہونے کی تہمت لگائی تھی۔ اس وقت حضور نے آیات قرآنی کی تلاوت فرمائی۔ انہیں نصیحت کی اور عذاب الہی کا ذکر فرمایا اور بتایا کہ دنیا کی سزا آخرت کے عذاب سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ تب اس شخص نے کہا تھا کہ میں اس ذات کی قسم کھاتا ہوں جس نے حضور کو نبی برحق بنا کر بھیجا ہے کہ میں نے اس عورت پر جھوٹا الزام نہیں لگایا پھر حضور نے اس عورت کو طلب فرمایا اور اسے بھی نصیحت فرمائی اور (انجام) کا خوف دلایا اور بتایا کہ دنیا کا عذاب جھیل لینا، آخرت کے عذاب سے بہت آسان ہے، اس پر اس عورت نے کہا کہ میں اس ذات کی قسم کھاتی ہوں، جس نے حضور کو نبی برحق بنا کر بھیجا ہے کہ یہ شخص جھوٹ کہتا ہے میں نے ایسی حرکت نہیں کی۔ پھر دونوں نے ایک دوسرے پر الفاظ لعنت دہرائے۔ ملت اسلامیہ میں حکم لعان پر عمل کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔

ائمہ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ ’لعان‘ میں پہلے مرد سے قسم لی جائے جیسا کہ امام مہدی نے ’کتاب البحر‘ میں بیان فرمایا ہے۔ لیکن اس (تقدیم مرد کے واجب ہونے) میں اختلاف ہے۔

شافعیہ اور مالکیہ میں سے اشہب نیز حنابلہ کہتے ہیں کہ 'لعان' کا حلف پہلے مرد سے لینا واجب ہے۔ عورت کا پہلے 'لعان' کرنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ تہمت لگانے والا مرد ہے۔ اسی نے حاکم کے سامنے یہ معاملہ پیش کیا اور لعان کا مطالبہ کیا۔ پس وہی مدعی ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے لعان والی آیت میں پہلے خاوند کا اس کے بعد بیوی کا ذکر فرمایا ہے "والذین یرمون ازواجہم، ولم یکن لہم شہد آء الا انفسہم، فشہادۃ احدہم اربع شہادات باللہ انہ لمن الصادقین۔ والخامسة ان لعنت اللہ علیہ ان کان من الکاذبین" (النور: ۷، ۸) (یعنی جو لوگ اپنی بیویوں پر زنا کا عیب لگاتے ہیں اور ان کے سوا اس کا کوئی گواہ نہیں ہے۔ تو ان میں ہر مرد کی گواہی یہ ہے کہ وہ بار بار اللہ کو گواہ کر کے قسم کھائے کہ وہ اپنے بیان میں سچا اور پانچویں بار کہے کہ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس پر اللہ کی لعنت یا پھٹکار ہے) پھر یہ بھی ہے کہ شرع میں لعان کا مقصد یہ ہے کہ جس نے اپنی بیوی پر یہ عیب لگایا ہے وہ تہمت لگانے کی سزا سے بچ جائے (ورنہ گواہ پیش نہ کر سکنے کی صورت میں سزائے قذف کا مستوجب ہوتا) چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہلال ابن امیہ سے فرمایا تھا کہ "البینۃ والا حد فی ظہرک" (یعنی اس الزام کا گواہ لا ورنہ تیری پیٹھ پر ڈرے لگیں گے) پس (چونکہ 'لعان' گواہی کی بجائے ہوتا ہے۔ لہذا مرد ہی کو پہلے لعان کے لیے کہا جائے گا) اگر عورت سے حلف لعان پہلے لیا جائے تو گواہ وہ ایک ایسے جرم کا دفعیہ ہے جس کا وجود ہی نہیں ہے۔

حنفیہ، مالکیہ اور ابن القاسم کہتے ہیں کہ 'لعان' کی قسم کا پہلے مرد سے لیا جانا سنت ہے لیکن یہ واجب نہیں ہے۔ لہذا اگر لعان کی قسم پہلے عورت سے لی گئی تب بھی 'لعان' ہو جائے گا جیسے پہلے مرد سے قسم لینے میں ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنی آیات لعان کو عطف کے ساتھ ذکر فرمایا ہے اور عطف میں ترتیب مقصود نہیں ہوتی (یعنی تقدیم و تاخیر کا مفہوم نہیں نکلتا)۔

لعان کا طریقہ یہ ہے کہ امام پہلے خاوند سے لعان کرائے وہ چار بار اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ میں تجھ پر زنا کا الزام لگانے میں سچا ہوں اور پانچویں بار کہے کہ اگر میں نے تجھ پر جو الزام لگایا ہے اس میں جھوٹ تو مجھ پر اللہ کی لعنت ہو۔ اگر تہمت زنا کے ساتھ بچے (کا باپ ہونے) سے انکاری ہو تو یوں کہے گا کہ جو الزام میں نے تجھ پر بدکاری کا اور بچے سے انکار کر کے لگایا ہے اگر اس میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر لعنت ہو۔ اگر صرف بچے (کا باپ ہونے) سے انکاری ہو تو صرف یوں کہے گا کہ تیرے بچے (کا باپ ہونے) سے جو میں نے انکار کیا ہے۔ اگر اس میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر لعنت ہو۔ کیونکہ اس حلف کا مقصد بچے (کا باپ ہونے) سے انکار ہے۔ اس کے بعد پھر عورت چار بار اسی طرح قسم کھائے اور ہر بار یوں کہے کہ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ یہ شخص جو مجھ پر بدکاری کا عیب لگاتا یا بچے (کا باپ ہونے) سے انکاری ہے جھوٹا ہے اور پانچویں بار یوں کہے کہ اگر یہ شخص مجھ پر زنا کی تہمت لگانے یا بچے (کا باپ ہونے) سے انکار کرنے میں سچا ہے تو مجھ پر خدا کا غضب نازل ہو۔

ملت اسلام میں سب سے پہلا لعان

جمہور ملت کی رائے میں ہلال بن امیہ کا واقعہ دین اسلام میں لعان کے شرعی حکم نازل ہونے کا سبب ہے۔

کیونکہ ملت اسلامیہ میں وہی سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے 'لعان' کیا۔

ماوردی کا کہنا ہے کہ ہلال بن امیہ کا واقعہ، عویر عجلانی اور ان کی بیوی خولہ بنت عاصم سے پہلے کا ہے۔ علامہ

خطیب، نووی اور ان کے پیرو حافظ بھی یہ کہتے ہیں کہ یہاں اس امر کا احتمال ہے کہ پہلے ہلال نے، رسول اللہ صلی علی وسلم

سے اس کی بابت دریافت کیا پھر عویمر عجلانی نے بھی اس کی بابت دریافت کیا تو ان دونوں کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ اور ابن صباغ نے 'کتاب شامل' میں بتایا ہے کہ یہ آیات کریمہ ہلال بن امیہ کے واقعہ کے متعلق نازل ہوئیں۔ رہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد جو حضور نے 'عویمر' سے فرمایا "ان الله انزل فيك وفي صاحبك قرآناً" (یعنی اللہ نے تمہارے اور تمہاری بیوی کے بارے میں آیات قرآنی نازل فرمادی ہیں)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آیت قرآنی جو ہلال بن امیہ کے واقعہ کے متعلق نازل ہوئی تھی وہ (تم) سب انسانوں کے لیے عام ہے۔

اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ لعان کے متعلق نازل ہونے والی آیت کب نازل ہوئی؟ علامہ طبری، ابو حاتم اور ابن حبان کی قطعی رائے یہ ہے کہ یہ آیتیں سنہ نو ہجری ماہ شعبان میں نازل ہوئیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ آیت اس سال نازل ہوئی جس سال حضور نے وفات پائی۔ کیونکہ صحیح بخاری میں سہل بن سعد سے مروی ہے کہ وہ اس واقعہ کے وقت موجود تھے اور اس وقت ان کی عمر پندرہ سال تھی۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ واقعہ سنہ دس ہجری کا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سنہ ۱۱ ہجری میں ہوئی اور ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "فرق رسول الله صلى الله عليه وسلم بين اخوى بنى عجلان وقال: الله يعلم ان احدكما كاذب فهل منكما من تائب ثلاثاً" متفق علیہ۔ (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو عجلانیوں میں بیوی میں تفریق کرا دی اور فرمایا کہ خدا بلاشبہ جانتا ہے کہ تم میں سے کوئی ایک جھوٹا ہے تو کیا تم میں سے کوئی توبہ کرنے والا ہے؟ یہ بات آپ نے تین بار فرمائی میں تفریق کرا دی اور فرمایا کہ اب خدا ہی جانتا ہے کہ تم دونوں میں کون جھوٹا ہے؟ تو کیا اب تم میں سے کوئی ایسا ہے جو تین بار توبہ کر لے)۔

اس حدیث میں لفظ اخوی (دو بھائیوں) سے مراد، میاں بیوی ہیں۔ ابن مندہ نے، کتاب الصحابہ میں فرمایا ہے کہ اس مرد کا نام، قبیلہ بنی بکر کا عویمر تھا اور عورت کا نام 'خولہ بنت قیس' تھا اور ابن مردویہ نے بتایا ہے کہ وہ عورت میرے بھائی 'عاصم' کی بیٹی تھی۔

لعان کی تعریف

لفظ 'لعان' کے لغوی معنی 'ابعاد' (یعنی دور کر دینے کے ہیں) چنانچہ کہا جاتا ہے کہ 'لعنه الله' یعنی اسے اللہ نے اپنی رحمت سے دور کر دیا۔ یہ لفظ افعال لاعن (ماضی) یلاعن (مضارع) از باب مفاعله کا مصدر ہے۔ اصطلاح شریعت میں یہ لفظ مخصوص ہے کسی خاص سبب اور مخصوص طریقہ سے میاں بیوی کے درمیان باہم لعنت کرنے کا۔ لعان دین اسلام کا ایک مخصوص عمل ہے جو مرد کے حق میں تہمت تراشی کی سزا کی مانند ہے کہ اگر خاوند کو جھوٹا مان لیا جائے تو اس کی حیثیت اس شخص کی مانند ہوگی جس پر حد لاگو ہو چکی ہے۔ حتیٰ کہ لعان کرنے کے بعد اس شخص کی گواہی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ناقابل قبول ہوگی اور بیوی کے حق میں 'لعان' سزائے زنا کی مانند ہے چنانچہ شہادۃ علی الشہادۃ سے قاضی کی تحریر سے اور عورتوں کی گواہی ویسے ہی ثابت نہ ہوگا کہ حد زنا ثابت نہیں ہوتی۔ بالکل اسی طرح جیسے حدود کے بارے میں ہوتا ہے۔ اس عورت کا حاضر ہونا ضروری ہے کیونکہ یہ اس کے حق کا معاملہ ہے جیسا کہ سزائے تہمت کی صورت میں ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ 'لعان' پر عمل درآمد دین اسلام کا دستور العمل اور احکام شرعیہ میں سے ایک حکم نیز امت محمدیہ کی خصوصیات میں سے ہے اور تہمت لگانا مستوجب حد فعل ہے۔ یہ تہمت خواہ کسی غیر پر لگائی جائے یا اپنی بیوی پر اللہ تعالیٰ کا

ارشاد ہے ”والذین یرمون المحصنات ثم لم یاتوا بأربعة شہداء فاجلدوہم ثمانین جلدۃ، ولا تقبلوا لہم شہادۃ ابداء، واولئک ہم الفاسقون“ (النور: ۴) (یعنی جو لوگ بے قصور عورتوں پر عیب تھوپتے ہیں اور اس کے ثبوت میں چار گواہ پیش نہیں کر سکتے انہیں اسی (۸۰) دڑے لگاؤ اور پھر کبھی ان کی گواہی کو قبول نہ کرو کیونکہ وہ لوگ فاسقوں کے زمرہ میں ہیں)۔

بعد میں بیوی کا معاملہ پیش آیا تو اس حکم کی بجائے لعان کا حکم نازل ہوا ”والذین یرمون ازواجہم ولم یکن لہم شہداء الا انفسہم فشہادۃ احدہم اربع شہادات باللہ انہ لمن الصادقین۔ والخامسة ان لعنت اللہ علیہ ان کان من الکاذبین۔ ویدرؤا عنہا العذاب ان تشہد اربع شہادات باللہ انہ لمن الکاذبین۔ والخامسة ان غضب اللہ علیہا ان کان من الصادقین۔“ (النور: آیات ۶ تا ۹) (یعنی جو لوگ اپنی بیویوں پر عیب تھوپتے ہیں اور اس کا کوئی گواہ خود ان کے سوا نہیں ہوتا تو ان میں سے ہر ایک کی گواہی یہ ہے کہ وہ چار بار اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ وہ سچا ہے اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر میں جھوٹ کہوں تو اللہ کی مجھ پر لعنت ہو۔ اسی طرح بیوی کی سزا ساقط ہو جائے گی بشرطیکہ وہ چار بار اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ اس کا خاوند جھوٹ کہتا ہے اور پانچویں بار کہے کہ اگر وہ (اس کا خاوند) سچا ہے تو مجھ پر اللہ کا عذاب نازل ہو)۔

اس آیت کے نازل ہونے کا سبب جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ جب آیت ”والذین یرمون المحصنات ثم لم یاتوا بأربعة شہداء“ نازل ہوئی تو عاصم بن عدی الانصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ اگر ہم میں سے کوئی شخص اپنے گھر میں آئے اور کسی شخص کو اپنی بیوی کے پیٹ پر چڑھا ہوا پائے اور چار گواہوں کو دکھانے کے لیے انہیں لانے چلا جائے تو واپس آنے تک وہ شخص مطلب برآری کر کے چلا جائے گا۔ اگر وہ اس شخص کو قتل کرتا تو اس کی پاداش میں اسے بھی قتل کر دیا جاتا اور اگر وہ بیان کرے کہ میں نے فلاں شخص کو اس شخص کے ساتھ پایا (اگر گواہ نہ پیش کر سکے) تو اسے حد قذف ماری جائے گی اگر خاموش رہتا ہے تو غصہ میں گھٹتا رہے گا پس باری تعالیٰ یہ مشکل حل فرمادے! (اب ہوا یہ کہ) ان ہی عاصم کا ایک چچا زاد بھائی تھا جس کا نام عویمیر تھا اور اس کی ایک بیوی تھی جسے خولہ بنت قیس کہتے تھے۔ یہی عویمیر عاصم کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ میں نے ”شریک بن سحاء“ کو اپنی بیوی کے پیٹ پر چڑھے ہوئے دیکھا ہے۔ عاصم یہ سن کر مڑے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر کہا کہ یا رسول اللہ علیہ وسلم میں تو اپنے گھر والوں کے ہاتھوں بڑی مصیبت میں پڑ گیا ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”ما ذاک؟“ (یعنی یہ تو بتاؤ بات کیا ہے؟) انہوں نے کہا میرے چچا زاد بھائی عویمیر نے مجھے بتایا ہے کہ اس نے شریک بن سحاء کو اپنی بیوی کے پیٹ پر چڑھا ہوا دیکھا ہے واضح ہو کہ عویمیر، خولہ اور شریک یہ سب عاصم کے چچا کی اولاد ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو طلب فرمایا اور عویمیر سے کہا کہ تم کو اپنی بیوی اور اپنی چچا زاد بہن پر الزام لگاتے ہوئے اللہ سے ڈرنا چاہیے۔ اس پر تہمت نہ لگاؤ۔ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے ”شریک“ کو اپنی بیوی کے پیٹ پر چڑھے ہوئے دیکھا۔ میں نے کوئی چار ماہ سے اس کے ساتھ قربت نہیں کی اور وہ کسی غیر مرد کا حمل ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ علیہ وسلم نے اس عورت سے کہا کہ اللہ سے ڈرو اور صرف وہی بات بیان کرو جو تجھ سے سرزد ہوئی اس نے کہا ”یا رسول اللہ عویمیر ایک غیر متداند انسان ہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ شریک مجھے گھور رہا تھا اور میرے ساتھ

باتیں کر رہا تھا۔ اس کی بات پر عویر کو غیرت آگئی۔ اس کے بعد ہی اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اسی اثناء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا۔ اذان دی گئی۔ جماعت کھڑی ہوئی اور عصر کی نماز ہوئی، پھر آپ نے عویر سے کہا کہ کھڑے ہو جاؤ اور اب کہو کہ میں اللہ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ خولہ بدکار ہے اور میں سچا ہوں پھر دوسری بار کی قسم کے لیے فرمایا کہ اللہ کی قسم کھا کر کہو کہ میں نے شریک کو اس عورت کے پیٹ پر چڑھا ہوا دیکھا اور میں اس قول میں سچا ہوں اس کے بعد تیسری بار قسم کے لیے فرمایا کہ یہ کہو کہ اس کے پیٹ میں کسی غیر شخص کا حمل ہے اور میں اس بیان میں سچا ہوں پھر چوتھی بار کے لیے کہا کہ یوں کہو کہ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ عورت بدکار ہے اور یہ کہ میں چار ماہ سے اس کے پاس نہیں گیا اور میں اس بیان میں سچا ہوں۔ پھر پانچویں بار کی قسم کے لیے فرمایا کہ یوں کہو کہ عویر (یعنی وہ خود) جو کہتا ہے اگر جھوٹ ہو تو اللہ کی اس پر لعنت ہو۔ پھر حضور نے عویر سے کہا کہ تم بیٹھ جاؤ اور خولہ کو فرمایا کہ کھڑی ہو جاؤ کھڑی ہو گئی اور اس نے اللہ کی قسم کھا کر کہا کہ میں نے بدکاری نہیں کی اور میرا خاوند عویر جھوٹ کہہ رہا ہیں۔ دوسری بار پھر اس نے کہا کہ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ انہوں نے۔ شریک کو میرے پیٹ پر نہیں دیکھا، یہ جھوٹ بولتے ہیں۔ تیسری بار پھر اس نے کہا کہ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں ان ہی سے حاملہ ہوئی ہوں، یہ جھوٹ بولتے ہیں۔ پھر چوتھی بار اس نے کہا کہ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ انہوں نے ہرگز مجھے کسی بڑے گناہ میں مبتلا نہیں دیکھا، اگر عویر سچے ہوں تو خولہ پر اللہ کا غضب پڑے۔ اس (طرح لعان) کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں میں علیحدگی کرادی۔

جاننا چاہیے کہ جب ایک شخص اپنی بیوی پر زنا کا عیب لگائے اور وہ عورت بے قصور ہو تو اس شخص پر تہمت کی شرعی سزا واجب ہوگی اور اگر وہ عورت کنواری ہو تو اس شخص پر سزائے سرزنش لازم ہے۔ جیسا کہ اجنبی عورت پر الزام لگانے کی صورت میں ہوتا ہے۔ بہر دو صورت ان سزاؤں کے موجب میں کوئی اختلاف نہیں ہے البتہ سزا سے نجات پانے کے موجبات میں اختلاف ہے، چنانچہ اگر کسی اجنبی نے تہمت لگائی تو جب تک کہ وہ شخص جس پر تہمت لگائی گئی ہے اس الزام کا اقرار نہ کرے۔ یا ارتکاب جرم زنا کے گواہ نہ گزریں سزائے تہمت ساقط نہ ہوگی۔ لیکن اگر کسی شخص نے اپنی بیوی پر تہمت لگائی تو اس شخص کی سزا بھی ان دونوں باتوں سے ساقط ہو جائے گی یا پھر لعان سے ساقط ہوگی لیکن لعان صرف بیوی پر الزام کی صورت میں ہوتا ہے اجنبی عورت پر الزام کی سزا لعان سے ساقط نہیں ہوتی اس کے دو سبب ہیں:

ایک سبب یہ ہے کہ اجنبی عورت سے کسی کو بدکاری کرتے ہوئے دیکھ کر آدمی اس پر خاموش رہتا ہے اور کچھ نہیں کہتا، اس لیے کہ اس میں دیکھنے والے پر کوئی عیب نہیں لگتا۔ لیکن بیوی کی بدکاری کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اس میں اسے اپنی بے عزتی اور خرابی نسل کا اندیشہ ہوتا ہے اور گواہی پیش کرنا تقریباً محال ہوتا ہے اس لیے شریعت اسلامیہ نے لعان کی یہ صورت مقرر فرمائی۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ اکثر حالات میں، میاں خود نہیں چاہتا کہ جب تک اصلیت نہ ہو بیوی پر تہمت لگے۔ پس اس کا الزام لگانا ہی اس امر کی دلیل ہے کہ وہ سچا ہے۔ لیکن چونکہ حال کا بیان کر دینا (ارتکاب جرم کا پورا ثبوت نہیں ہوتا لہذا مکمل شہادت کے لیے اس کے ساتھ قسم کا اضافہ کر دیا گیا جیسے عورت کی شہادت چونکہ کمزور ہوتی ہے اس کو قوی کرنے کے لیے عورت گواہ ہو تو گواہوں کی تعداد زیادہ کر دی گئی ہے۔ اسی لیے اگر (کسی معاملہ کا) ایک ہی گواہ ہو تو بقول اکثر فقہاء اس کی شہادت کو قوی کرنے کے لیے حلف کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔

لعان سے انکار کرنے کا بیان

شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی پر عیب لگائے تو وہ شخص مستوجب حد (قذف) ہو جاتا ہے لیکن لعان کر لے تو سزا سے بچ جائے گا۔ جیسے اجنبی عورت پر الزام لگانے والا مستوجب حد ہوتا ہے لیکن اگر وہ (اپنے الزام کے ثبوت میں) گواہی پیش کر دے تو اس سے بچ جاتا ہے۔ پس اگر خاوند لعان سے گریز کرے تو اس پر تہمت لگانے کی حد (شرعی سزا) لاگو ہوگی چنانچہ ہلال بن امیہ نے جب اپنی بیوی پر عیب زنا لگایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا تھا کہ ”اما البینة و اما اقامة الحد علیک“ (یعنی یا تو گواہ پیش کرو یا پھر تم پر حد قذف نافذ کی جائے گی) اسی طرح اگر خاوند لعان کرے اور بیوی لعان سے گریز کرے تو وہ حد زنا کی مستوجب ہے؟ اور اگر وہ خاوند کے اقرار کی تصدیق کرے تب بھی اس پر حد زنا واجب ہوگی، کیونکہ ان اصحاب کے نزدیک ایک بار بھی اقرار کرنے سے مجرم زنا پر حد لاگو ہو جاتی ہے۔ قرآن حکیم میں یہ مذکور ہے کہ اجنبی عورت پر تہمت لگانا اس امر کا مقتضی ہے کہ گواہ پیش کرے ورنہ تہمت لگانے والے کو دُور زنی کی سزا دی جائے گی۔ اسی طرح بیوی پر تہمت لگانے والے پر واجب ہے کہ یا تو لعان کرے ورنہ تہمت لگانے کی پاداش میں سزائے دُورہ پائے گا اور (عورت کے بارے میں) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”ویدرأ عنہا العذاب“ یعنی اس عورت سے عذاب ساقط ہو جائے گا۔ عذاب کے لفظ سے حد کا ثبوت نکلتا ہے کہ اگر وہ عورت لعان نہ کرے تو اسے حد ماری جائے گی اور لعان کر لے تو حد زنا ساقط ہو جائے گی۔ آیت میں اس حد کو لفظ عذاب سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ اور عورت لعان میں گویا یہ کہتی ہے کہ اگر یہ شخص (خاوند) سچا ہے تو مجھے سزائے زنا دو لیکن اگر وہ جھوٹا ہے تو مجھے رہا کر دو اور قید مجھے نہیں ہو سکتی۔ میرے لیے قید کا حکم نہ کتاب اللہ میں ہے نہ سنت میں نہ اجماع امت میں اور نہ قیاس کی رو سے۔ اسی طرح وہ خاوند جس نے بیوی پر تہمت لگائی اور گواہ نہ پیش کر سکا اور نہ خود ہی شہادت دے سکا کہ سزائے تہمت سے بچ جاتا لہذا وہ مستوجب سزا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے والذین یرمون المحصنات ثم لم یاتو اباربعة شہداء فاجلدوہم“ (یعنی جو لوگ گھریار والی عورتوں کو عیب لگاتے ہیں اور اپنے الزام کے ثبوت میں چار گواہ پیش نہیں کر سکتے تو انہیں سزائے تازیانہ دو) اس جرم کی سزا جس طرح مردوں کے حق میں ثابت ہے اسی طرح عورتوں کے حق میں بھی ثابت ہے کوئی شخص ان دونوں میں فرق کا قائل نہیں ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ’خولہ‘ کو جب اس کے خاوند نے اس پر زنا کی تہمت لگائی تھی یہ کہا تھا ”فالرجم اہون علیک من غضب اللہ تعالیٰ“ (یعنی سنگسار ہو جانا ہے تیرے لیے غضب الہی سے زیادہ آسان ہے)۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر خاوند لعان سے گریز کرے تو اسے جب تک کہ لعان نہ کرے، قید میں رکھا جائے۔ کیونکہ از روئے قرآن لعان اس پر واجب ہے اور وہ کر سکتا ہے یا پھر وہ خود اپنی تکذیب کرے اور تہمت لگانے کی سزا ’بھگتے‘ کیونکہ اگر وہ خود اپنے لگائے ہوئے الزام سے پھر گیا تو لعان کا موقع ختم ہو گیا اور جب لعان ساقط ہو گیا تو اس پر سزائے قذف واجب ہوگئی کیونکہ سزائے تہمت کا موجب موجود ہے۔ لعان سے سزا ساقط ہو جاتی ہے اور لعان ساقط ہو جائے تو سزائے قذف واجب ہوگئی کیونکہ اس معاملہ میں بنیادی شے یہی ہے۔ واضح ہو کہ جب مرد لعان کر لے تو قرآن کی رو سے عورت

پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ بھی لعان کرے۔ اگر وہ لعان کرنے یا اقرار جرم سے انکار کرے تو اس وقت تک قید میں رہے گی جب تک کہ خاوند کے مقابلہ میں وہ بھی لعان نہ کرے۔ اگر خاوند کی تصدیق کرے تو لعان کی حاجت نہ رہے گی لیکن اس عورت پر حد زنا عائد نہ ہوگی کیونکہ نفاذ حد کی شرط یہ ہے کہ مرتکب زنا گواہوں (کی تعداد) کے مطابق چار بار ارتکاب جرم کا اقرار کرے اور عورت نے لعان سے گریز کے سوا اور کچھ نہیں کیا اور لعان سے انکار نہ تو ارتکاب جرم کی شہادت ہے اور نہ عورت کا اقبال جرم ہے۔ پس لازم ہوا کہ وہ عورت سنگساری کی مستوجب نہ قرار دی جائے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ”لا یحل دم امریء الا باحدی ثلاث“ (یعنی ان تین صورتوں کے سوا جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، یعنی قتل نفس، ارتداد اور زنا، محسن، کسی شخص کا خون روا نہیں ہے) اور جبکہ ایسی عورت کا شادی شدہ ہونے پر بھی سنگسار کیا جانا واجب نہیں ہے تو غیر شادی شدہ کو سزائے تازیانہ (بدرجہ اولیٰ) واجب نہیں ہے نیز اس لیے بھی کہ (لعان سے) انکار کرنا واضح طور پر (جرم زنا کا) اقرار نہیں ہوتا لہذا اس پر حد کا عائد کرنا جائز نہیں ہے جس طرح ایسے لفظ (میں اقبال جرم) سے حد عائد کرنا نہیں ہے جس کے مفہوم میں فعل زنا اور غیر فعل زنا کا احتمال ہو۔

صلاحیت لعان کا بیان

شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ جو شخص حلف اٹھانے کی صلاحیت رکھتا ہے وہ لعان بھی کر سکتا ہے۔ لہذا فریقین آزاد ہوں یا غلام (مملوک) ہوں یا گنہگار ہوں یا ذمی ہوں یا سزایافتہ ہوں یا دونوں میں سے ایک غلام (مملوک) ہو یا خاوند مسلمان اور عورت ذمیہ ہو تو لعان ہو سکتا ہے۔

اس بارے میں تینوں ائمہ کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے ”والذین یرمون ازواجہم.....“ (یعنی جو لوگ اپنی بیویوں پر عیب لگاتے ہیں.....) یہ حکم (بلا امتیاز) سب کو شامل ہے اور اس سے خصوصیت کا مفہوم نہیں نکلتا نیز قیاس بھی تو دو طرح سے اس کی تائید کرتا ہے:

ایک یہ کہ لعان کا مقصد بے عزتی سے اور غیر کی اولاد کو اپنی طرف منسوب کرنے سے بچنا ہے اور جس طرح بے داغ شخص یا نیک آدمی کو اس کی ضرورت ہے اسی طرح سزایافتہ (یا بدنام) بھی اسے ضروری سمجھتا ہے لہذا وہ بھی لعان کر سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس امر پر اجماع ہے کہ بدکار یا ناپسندیدہ شخص اگر چہ گواہ بننے کا اہل نہیں ہے لیکن اس کا لعان کرنا جائز ہے۔ پس ان دونوں کے علاوہ دوسرے زمرہ کے اشخاص کا بھی یہی حکم ہے اور سب میں مشترک سبب گناہ زنا کی بے عزتی سے بچنا ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر خاوند شہادت کا نا اہل ہو مثلاً غلام یا تہمت کے جرم میں سزایافتہ ہو یا کافر ہو اس کا لعان کرنا درست نہیں ہے یہی حکم اس عورت کا ہے جس پر (خاوند کے سوا) کوئی اجنبی شخص تہمت لگائے تو مستوجب حد قذف نہیں ہوتا، مثلاً یہ کہ وہ عورت مملوکہ (لونڈی) ہو یا ذمیہ ہو (یعنی غیر مسلم عورت جو مسلمانوں کی پناہ میں ہو) یا جو تہمت کے جرم میں سزا پا چکی ہو یا نابالغ یا جنون زدہ یا بدکار ہو۔ ایسی عورت پر تہمت لگانے والا نہ مستوجب حد ہے اور نہ لعان کر سکتا ہے کیونکہ مانع لعان کا موجب وہ عورت ہے۔ یہ صورت گویا ایسی ہے کہ اس عورت نے اپنے اوپر لگائے گئے الزام کی تصدیق کر دی۔ تاہم حاکم کو لازم ہے کہ وہ خاوند کو (بطور سرزنش) سزا دے۔ کیونکہ اس نے عورت پر عیب لگایا۔ لیکن اس بناء پر حد (سزائے شرعی) واجب نہیں ہے اور سرزنش اس لیے واجب ہے کہ برائی کی بیخ کنی ہو اور عزتیں محفوظ رہیں۔

اگر خاوند گواہی کا اہل نہ ہو جیسا کہ بتایا گیا اور وہ اپنی بیوی پر عیب لگائے تو وہ نفاذ حد کا مستوجب ہوگا۔ کیونکہ (شہادت کی) عدم صلاحیت کے باعث وہ لعان تو کر سکتا نہیں (کہ حد سے بچ جاتا) لہذا اصل موجب حد باقی رہا۔ اگر دونوں ہی شہادت کے نااہل ہوں کہ دونوں جرم تہمت میں سزا پا چکے ہوں تو خاوند پر حد نافذ ہوگی کیونکہ۔ 'لعان' جو مانع حد تھا، اس کی صلاحیت اس میں نہیں ہے (لہذا مستوجب حد ہوگا)۔

اس بارے میں احناف کی دلیل وہ حدیث ہے جو عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے کہ "اربع من النساء ليس بينهن وبين ازواجهن ملاءنة: اليهودية والنصرانية تحت المسلم، والحررة تحت المملوك، والمملوكة تحت الحر۔" (یعنی ایسی عورتیں جن کے خاوندوں کے ساتھ 'لعان' نہیں ہو سکتا، یہ ہیں: یہودی یا نصرانی عورت جو کسی مسلمان کے پاس ہو اور آزاد عورت جو کسی غلام کے پاس ہو یا کوئی لونڈی جو آزاد کے پاس ہو)۔ پھر یہ بھی ہے کہ جو شخص کسی غیر عورت پر یا خود اپنی بیوی پر تہمت لگائے اس پر نفاذ حد واجب ہوا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد "والذين يرمون المحصنات" کا مفہوم ہے۔ لیکن یہ حکم خاوند کے حق میں منسوخ ہو گیا اور اجنبی کے لیے بحال رہا۔ اس حکم کی بجائے (خاوند کو) لعان کرنے کا حکم آیا اب چونکہ خاوند کے حق میں لعان کی وہی حیثیت ہے جو غیر عورتوں پر تہمت لگانے پر حد (سزائے شرعی) کی ہے۔ لہذا جس پر حد عائد نہ ہوگی اس پر لعان بھی عائد نہ ہوگا اگرچہ (عورت پر) عیب لگانے والا کوئی اور شخص (خاوند کے علاوہ) ہو۔

ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ لعان بھی شہادت ہے لہذا واجب ہے کہ وہی لعان کر سکے جو شہادت کا اہل ہو۔ اور احناف لعان کو جو شہادت قرار دیتے ہیں اس کی دو وجہ ہیں۔ ایک وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "ولم يكن لهم شهداء الا انفسهم فشهادة احدهم اربع شهادات بالله....." (یعنی اگر الزام لگانے والے اپنے سوا کسی اور کی شہادت نہ پیش کر سکیں تو ان میں سے ہر ایک کی شہادت یہ ہے کہ چار بار اللہ کی قسم کھائیں.....) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے 'لعان' کو شہادت سے تعبیر فرمایا ہے۔ اسی طرح جیسے اللہ کا ارشاد "واستشهدوا شہیدین من رجالکم" (یعنی تم اپنے مردوں میں سے دو کو گواہ بناؤ) اور "فاستشهدوا علیہن اربعة منکم" (یعنی تم میں سے چار اشخاص ان عورتوں کے خلاف گواہی دیں)۔

دوسرے یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب میاں بیوی کے درمیان لعان کا حکم دیا تو 'لعان' کے لیے شہادت کا لفظ استعمال فرمایا۔ اور محض یمین کے لفظ پر اکتفا نہیں فرمایا۔ پس جبکہ یہ ثابت ہوا کہ لعان بھی شہادت ہے تو لازم ہے کہ تہمت کے جرم میں سزا پانیا لے کا لعان بھی (شہادت کی طرح) تسلیم نہ کیا جائے کیونکہ (ایسے سزا یاب شخص کے بارے میں) اللہ تعالیٰ کا حکم ہے لا تقبلوا لهم شهادة ابدًا (یعنی ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو)۔ اور جبکہ سزا یافتہ شخص کا شہادت کا نااہل ہونا ثابت ہو گیا تو اسی طرح غلام اور کافر کی شہادت بھی ممنوع ثابت ہوئی۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس امر پر اجماع ہے کہ یہ دونوں (غلام اور کافر) شہادت کے اہل نہیں ہیں اور ان میں فرق کرنے کا کوئی قائل نہیں ہے۔

شافعیہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ 'لعان' شہادت نہیں ہے بلکہ یہ قسم ہے کیونکہ کسی شخص کا اپنے بارے میں گواہی دینا جائز نہیں ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اگر لعان کرنا شہادت ہوتا، جیسا کہ احناف کہتے ہیں تو ضروری تھا کہ

’لعان‘ سے میاں بیوی کے درمیان علیحدگی کا بیان

واضح ہو کہ لعان ہو جانے پر عورت ہمیشہ کے لیے خاوند (کی زوجیت) سے الگ ہو جاتی ہے، اس عورت کو طلاق ہو جاتی ہے، اور جو لعان میں جھوٹی قسم کھاتا ہے درحقیقت اس پر خدا کا غضب اور اس کی پھٹکار پڑتی ہے۔^(۱)

عورت لعان میں آٹھ بار قسم کھائے کیونکہ (شہادت کے بارے میں) مردوں کی نصف تعداد کے برابر ہے۔ نیز یہ کہ نابینا اور بدکار شخص کا لعان کرنا بالاجماع درست ہے لیکن ان کی گواہی جائز نہیں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ممکن ہے بدکار مرد اور بدکار عورت توبہ کر لیں۔ تو اسی طرح غلام کا آزاد ہو جانا بھی ممکن ہے لہذا اس کی شہادت کو جائز ماننا چاہیے۔ امام شافعیؒ نے اس خیال کی تائید فرمائی ہے کیونکہ غلام اگر آزاد ہو جائے تو معاں کی گواہی قابل قبول ہو جائے گی۔ پھر انہوں نے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر یہ زور دیا ہے کہ اگر ذمیوں کی شہادت ایک دوسرے کے حق میں قابل تسلیم ہے تو لازم ہے کہ ذمی اور ذمیہ کے درمیان لعان بھی جائز ہو۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ مستوجب سزا کے اعتبار سے حد کی مقدار مختلف ہوگی۔ یعنی خاوند اگر لعان سے انکار کرے تو مملوک ہونے کی صورت میں اسے آدھی سزا دی جائے گی اور اگر خاوند لعان کرے لیکن بیوی لعان سے گریز کرے تو اس عورت کی حد اس کے شادی شدہ ہونے، کنواری ہونے، آزاد ہونے یا مملوکہ (لونڈی) ہونے کے اعتبار سے مختلف نوعیت کی ہوگی۔

شافعیہ کے قول کے مطابق لعان میں پانچ باتیں لاگو ہوتی ہیں: حد کا ساقط ہو جانا، اولاد سے بے تعلقی، میاں بیوی میں تفریق، ہمیشہ کے لیے ان کا ایک دوسرے پر حرام ہونا اور دونوں پر حد کا واجب ہونا، ان تمام امور کے لیے بیوی کا لعان کرنا ضروری نہیں ہے اور نہ حاکم شرع کے حکم کی ضرورت ہے۔ حاکم کا حکم ان امور کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تو ہو سکتا ہے۔ باہمی تفریق کے لیے حکم حاکم کی ضرورت نہیں کیونکہ دونوں میں علیحدگی اس وقت ہو جاتی ہے جب خاوند اپنی شہادت اور قسم پوری کر لے۔ اس کے بعد دونوں میں علیحدگی حاکم کے حکم پر منحصر نہ رہے گی۔ پس لعان گویا طلاق بائن ہے جیسا کہ نافع اور نافع ابن عمر سے ایک جماعت نے روایت کیا ہے ”ان رجلاً لا عن بامرأته، وانتفی من ولدھا ففرق النبی بینھما والحق الولد بالمراة“ (یعنی ایک شخص نے اپنی بیوی کے ساتھ لعان کیا۔ اور اس سے پیدا ہونے والے بچے کا باپ ہونے سے انکار کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں علیحدگی کر دی اور بچہ عورت کے حوالے کر دیا)۔

۱۔ لعان سے میاں بیوی کے درمیان علیحدگی ہو جانے کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔

حنفیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ خاوند کے لعان کر لینے کے بعد وہ عورت اس وقت تک زوجیت سے خارج نہیں ہوتی جب تک کہ حاکم علیحدگی کا حکم نہ دے۔ اس حکم کے صادر ہونے سے پہلے ان میں علیحدگی نہیں ہوتی۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ (لعان میں) شہادت اور لعنت کے بعد اس کا حق زوجیت بیوی پر سے ختم ہو جاتا ہے اور پھر کبھی اس پر حلال نہیں ہو سکتی خواہ بیوی نے ہنوز لعان کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”ویدرأو عنھا العذاب ان

تشہد اربع شہادات باللہ انہ لمن الکاذبین‘ (یعنی اگر چار بار اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ اس کا خاوند جھوٹ بولتا ہے تو اس کی سزا مل جائے گی) اس سے ثابت ہوا کہ عورت کے لعان کرنے کا اس کے سوا اور کوئی اثر نہیں ہے کہ بیوی کی سزا ساقط ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ لعان سے لاگو ہونے والی تمام باتیں خاوند کے لعان سے لاگو ہوتی ہیں اور خاوند ہی کے لعان سے بچے سے انکار متصور ہے۔ یعنی بچے کی نسبت خاوند سے جوڑنے کے بارے میں خاوند کے قول ہی پر اعتبار کیا جائے گا نہ کہ عورت کے قول پر۔ چنانچہ عورت گوا اپنے لعان میں اس بچہ کو خاوند ہی کا بتاتی ہے لیکن اس کو نہیں مانا جاتا۔ اور خاوند کے انکار کو معتبر قرار دیا جاتا ہے عورت کا کہنا کہ یہ اس کے خاوند کی اولاد ہے تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ ہاں اگر خاوند اپنے بیان (یعنی بیوی پر الزام زنا) کی خود ہی تکذیب کر دے تو وہ بچہ اسی کا مانا جائے گا اور جب تک کہ وہ اپنے لعان (والے بیان) پر اڑا رہے گا کہ بچہ اس کا نہیں ہے تو بیوی سے علیحدگی واجب ہوگی کیونکہ اگر علیحدگی نہ کی جائے (یعنی زوجیت کو برقرار رکھا جائے) تو بچے کی نسبت کو باپ سے منقطع نہیں کیا جاسکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ”الولد للفراش“ (یعنی اولاد بستر والے خاوند کی ہے) پس جب تک کہ اس کی زوجیت باقی ہے یہ بچہ اس کی اولاد مانی جائے گی۔

مالکیہ، لیث اور زفر کہتے ہیں کہ جب میاں بیوی دونوں لعان سے فارغ ہو جائیں تو قدرتی طور پر دونوں میں علیحدگی ہو جائے گی اگرچہ حاکم نے ہنوز ان میں حکماً علیحدگی نہ کرائی ہو۔

حنفیہ نے اپنے مسلک کے ثبوت میں سہل بن سعد کی اس روایت سے استدلال کیا ہے جو بنو عجلان کے واقعہ کے متعلق ہے کہ لعان کرنے والوں میں یہ طریق کار جاری ہے کہ ان دونوں میں علیحدگی کرادی جائے کہ وہ پھر کبھی نہ مل سکیں۔ اسی طرح وہ روایت جو عویمیر کے بارے میں ہے کہ جب عویمیر اور اس کی بیوی لعان سے فارغ ہوئے تو عویمیر نے کہا کہ ”کذبت علیہا یا رسول اللہ ان امسکتھا، ہی طالق ثلاثاً“ (یعنی اے رسول اللہ اگر میں اس عورت کو رکھ لوں تو گویا میں نے اس میں جھوٹا الزام لگایا۔ پس میں اسے تین طلاق دیتا ہوں)۔ ان حدیثوں سے مسلک حنفیہ کا استدلال کئی طرح سے کیا گیا ہے:

ایک یہ کہ اگر محض لعان سے علیحدگی ہو جاتی تو ’عویمیر‘ کا یہ کہنا بے معنی ہوتا کہ ”کذبت علیہا ان امسکتھا“ (یعنی اگر اسے اپنی بیوی بنا کر رکھ لوں تو گویا میں نے اس پر جھوٹی تہمت لگائی تھی) کیونکہ (علیحدگی کے بعد) اسے رکھنا ممکن ہی نہیں رہتا۔

دوسرے اس طرح کہ اس روایت میں بتایا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں۔ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نافذ قرار دیا۔ اور طلاق کا نافذ فرمانا اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ لعان کی وجہ سے علیحدگی نہ ہوئی ہو (یعنی زوجیت ختم نہ ہوئی ہو)۔

تیسرے وہ قول جو سہل بن سعد نے اس روایت کے بارے میں فرمایا ہے کہ ”مضت السنة فی المتلاعنین ان یفرق بینہما ولا یجتمعان ابداً“ (یعنی لعان کرنے والوں کے بارے میں یہ طریق کار جاری ہے کہ ان دونوں میں علیحدگی کر دی جائے اور پھر وہ کبھی نہ مل سکیں گے) نیز حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ”المتلاعنان اذ تفرقا لا یجتمعان ابداً“ (یعنی جب دو لعان کرنے والوں (میاں بیوی) میں علیحدگی ہو جائے تو وہ پھر کبھی نہ مل سکیں گے)۔

ابو بکر رازی فرماتے ہیں کہ امام شافعی کا قول مفہوم آیت کے منافی ہے۔ اس واسطے کہ اگر خاوند کے لعان سے میاں بیوی میں علحدگی ہوگئی (تو اب وہ عورت بیوی نہ رہی) تو اب اگر (خاوند کے بعد) وہ عورت لعان کرے تو (یہ بیوی کا لعان کرنا نہ ہوگا) بلکہ اجنبی عورت کا لعان ہوگا جو منشاء آیت کے منافی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صرف میاں بیوی پر لعان واجب کیا ہے (اجنبی عورت پر واجب نہیں ہے) پھر یہ بھی ہے کہ لعان ایک شہادت ہے اور حاکم کے سامنے ہی ہو تو نافذ العمل ہوتا ہے (ورنہ نہیں ہوتا) پس واجب ہے کہ جب تک حاکم فیصلہ نہ کرے علیحدگی متصور نہ ہو۔ جس طرح وہ بات جس کے لیے شہادت دی گئی ہے ثابت نہ ہوگی جب تک کہ حاکم (بر بنائے شہادت) فیصلہ نہ کر دے نیز لعان ایک حق ہے جو عورت کو اپنے بارے میں حاصل ہے جیسا کہ مدعی کو گواہ پیش کرنے کا حق ہے۔ پس در آنحال یہ مدعی نے جس شے کا دعویٰ کیا ہے اس کا حقد اسی وقت ہوتا ہے، جب کہ حاکم (اس کے حق میں) فیصلہ کر دے، تو اس طرح لازم ہے کہ عورت کے حق کو بھی (تا صدور فیصلہ حاکم) برقرار رکھا جائے۔ علاوہ اس کے لعان میں ایسی کوئی بات نہیں ہوتی جس سے معلوم ہو کہ عورت خاوند پر حرام ہوگئی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ثابت ہو سکتا ہے کہ اس عورت نے بدکاری کا ارتکاب کیا۔ لیکن اگر بدکاری کا ثبوت گواہوں سے ہو جائے یا عورت خود اقبال جرم کر لے تب بھی وہ خاوند پر حرام نہ ہو جائے گی۔ یہی صورت لعان کی بھی ہے کہ اس میں عورت کے حرام ہو جانے کا کوئی ثبوت نہیں ہے تو لازم ہے کہ (نفس) لعان کو علیحدگی کا موجب نہ تصور کیا جائے بلکہ یہ علحدگی یا تو خاوند کی طرف سے ہوگی (کہ وہ طلاق دے دے) یا پھر حاکم اپنے حکم سے علیحدگی کرادے۔

مالکیہ کی دلیل اپنے مسلک کے بارے میں یہ ہے کہ اگر لعان کے بعد میاں بیوی اپنا نکاح باقی رکھنا چاہیں تو اس کی اجازت نہ ہوگی۔ بلکہ ان میں حکماً علیحدگی کرادی جائے گی۔ اس سے ثابت ہوا کہ اگر حاکم ان میں تفریق نہ کرائے تب بھی علیحدگی واجب ہے۔

لعان کے بعد پھر میاں بیوی کا باہم ملنا

شافعیہ، مالکیہ، حنابلہ، ابو یوسف اور ثوری کہتے ہیں کہ لعان کرنے والے علیحدگی کے بعد پھر کبھی نہیں مل سکتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور مسعود رضی اللہ عنہ، بھی یہی فرماتے ہیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ حضور نے لعان کرنے والے سے لعان کے بعد فرمایا کہ: ”لا سبیل لک علیہا“ (یعنی اب اس عورت سے تیرا تعلق کسی طرح نہیں ہو سکتا) اور یہ نہیں فرمایا کہ جب تک تو اپنے بیان کردہ الزام کو جھوٹ نہ بتائے۔ اگر لعان کرنے والا خود اپنی تکذیب کر کے اس حرمت کو ختم کر سکتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رجوع کی سبیل بیان فرما دیتے جیسا کہ تین طلاق (مغلظہ) پانے والی عورت کے بارے میں ہے ”فان طلقها فلا تحل لہ من بعد حتی تنکح زوجاً غیرہ“ (یعنی اگر خاوند بیوی کو طلاق مغلظہ دے دے تو اب وہ عورت اس پر حلال نہ ہوگی جب تک کہ وہ کسی اور شخص کی زوجیت میں نہ آجائے اور پھر اس سے علیحدگی ہو) پھر یہ بھی ہے کہ لعان، فسخ زوجیت کو کہتے ہیں، لہذا اس عورت کا حرام ہونا دائم ہوگا۔ جیسے دودھ پینے (میں شراکت) کی وجہ سے حرمت عائد ہوتی ہے اور حدیث میں ہے ”المتلاعنان اذا تفرقا لا یجتمعان ابدًا“ (یعنی لعان کرنے والے جب الگ ہو جائیں تو اب وہ کبھی نہیں مل سکتے) نیز امام علی اور حضرت عمر بن الخطاب اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ”لا یجتمع المتلاعنان ابدًا“ (یعنی دو

لعان کرنے والے پھر کبھی نہ مل سکیں گے) اور زہری نے عجلانی کے واقعہ کے بارے میں، اہل بن سعد سے روایت کیا ہے ”مضت السنة انهما اذا تلاقا فرقا بينهما، ثم لا يجتمعان ابداً“ (یعنی ماضی میں یہ طریق کار رہا ہے کہ جب لعان کرنے والوں میں علیحدگی ہو جائے تو پھر وہ کبھی نہیں مل سکتے) یہ تمام روایتیں اس کی دلیل ہیں کہ لعان کرنے والے کی بیوی ہمیشہ کے لیے اس پر حرام ہو جائے گی۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے (بیان میں) جھوٹ بولنے کا اقبال کر لے اور (تہمت تراشی کے الزام میں) اسے شرعی سزا مل جائے تو نکاح کی حرمت ختم ہو جائے گی اور اسے جائز ہوگا کہ اس عورت سے پھر نکاح کر لے۔ غرض اس بیوی کا حرام ہونا (دائمی نہیں بلکہ) ایک مقررہ عرصہ تک کے لیے ہے۔ اس مسلک کے بارے میں حنفیہ کی دلیل یہ (آیت قرآن) ہے ”واحل لکم ما ودا ذلکم“ (یعنی محرمات مذکورہ کے علاوہ تمام عورتیں تم پر حلال ہیں) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”فانکحوا ما طاب لکم من النساء“ (یعنی تم اس عورت سے نکاح کر سکتے ہو جسے تم پسند کرو) پس لعان چونکہ طلاق ثلاثہ ہے (لہذا مطلقہ ثلاثہ کی طرح) وہ عورت (متلاعنہ بھی) ہمیشہ کے لیے حرام نہیں ہو جاتی۔

الفاظ لعان کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ الفاظ لعان کے بیشتر حصہ کا استعمال مکمل الفاظ کے بولنے کے برابر ہے۔ شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر دونوں میں سے کوئی شخص لعان کے بعض الفاظ استعمال کر لے تو وہ لعان نہ ہوگا۔ لعان کے بعض کلمات استعمال کرنے سے سزا ساقط نہ ہوگی جب تک کہ لعان کے وہ تمام مکمل الفاظ نہ ادا کیے جائیں جو قرآن میں آئے ہیں۔

فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ ’لعان‘ کی حیثیت شہادت جیسی ہے۔ لہذا حاکم شرع کی موجودگی کے بغیر لعان نہ ہوگا۔ لعان میں شرط یہ ہے کہ وہ شوہر کی طرف سے ہو، خواہ شوہر نے بیوی سے ہم بستری کی ہو یا نہ کی ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ (شوہر) بالغ، عاقل اور مسلمان ہو۔ فقہاء یہ بھی کہتے ہیں کہ لعان کے وقت حق پسند (یا صالح) مردوں کی ایک جماعت کا موجود ہونا شرط ہے۔ کیونکہ اس امر کا احتمال ہے کہ خاوند اپنے بیان سے یا عورت اپنے اقرار سے منحرف ہو جائے۔ لعان کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ وہ عورت باقاعدہ نکاح کر کے، نکاح فاسد کی بناء پر نہیں، اپنے خاوند کے قبضہ میں ہو یا اس کی عدت میں ہو۔ گونگے کا لعان کرنا بھی درست ہے بشرطیکہ وہ اچھی طرح لکھ سکتا ہو۔ اور شہادت سے پہلے پانچ بار تحریر کر چکا ہو۔ شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ ’لعان‘ قسم ہے۔

حنفیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ لعان حلفیہ شہادت ہے جو مؤکد بہ لعنت و غضب الہی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”فشهادة احدہم اربع شہادات باللہ“ میں ہے (یعنی فریقین لعان میں سے ہر ایک اللہ کی قسم کھا کر چار بار شہادت دے)۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے ارشاد میں شہادت کا لفظ ہے ”فجاء ہلال فشہد ثم جاء فشہد“ بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما (یعنی ہلال آئے اور انہوں نے شہادت دی پھر عورت یا ان کی بیوی آئی اور اس نے شہادت دی)۔ نیز یہ بھی کہا جاتا ہے کہ لعان شہادت ہے جس میں قسم شامل ہے۔

حمل کے بارے میں لعان کرنے کا بیان

شافعیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ حمل کی بناء پر لعان کرنا وضع حمل سے پہلے بھی درست ہے۔ (وضع حمل کی شرط نہیں ہے)۔ اسی طرح بچے سے بریت کے لیے بھی لعان ہو سکتا ہے (گوہنوز پیدا نہ ہوا ہو) لیکن اس کے لیے مالکیہ نے یہ شرط لگائی ہے کہ اس سے پہلے تین بار یا با اختلاف بعض ایک بار وہ عورت ماہواری سے گزر چکی ہو (یعنی حمل سے خالی رہی ہو)۔ فقہاء نے حدیث مذکور کو حمل کے بارے میں لعان کرنے کی دلیل قرار دیا ہے علاوہ اس کے حمل کے دوران 'لعان' لاگو ہوتا ہے اور حمل کا پایا جانا لعان کے قوی ہونے کا قرینہ ہے۔ حمل کا ہو جانا ہی شبہ کا موجب ہوتا ہے۔ پس حمل کی بناء پر لعان کرنا درست ہے۔ تاکہ خاوند کو اس سے جو کوفت ہے وہ جلد از جلد دور ہو جائے۔

حنفیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ ولادت سے پہلے (حمل کی بناء پر) لعان کرنا اور ولادت سے پہلے بچے (کے حلالی ہونے) سے انکاری ہونا درست نہیں ہے۔ کیونکہ حمل کی بابت یقین نہیں کہ وہ حمل ہی ہو ممکن ہے وہ ریح (باد یا ہوا) ہو۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ اولاد کو تسلیم کر لینے کے بعد اس سے انکار کرنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ اگر اقرار کے بعد اس سے پھر جانا (اولاد کے حق میں) درست ہو تو ہر قسم کے اقرار میں ہو سکتا ہے۔ اس طرح تو کوئی حق ثابت نہیں ہو سکتا، اور دوسری صورت (یعنی پیدائش کے بعد مولود سے انکار کرنا) بالاجماع باطل (ناقابل تسلیم) ہے۔

نیز مروی ہے کہ ایک شخص نے اس بچہ کا جو حمل میں تھا اقرار کیا اور پیدا ہونے کے بعد اس (کا باپ ہونے) سے انکار کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے سزائے تازیانہ دی اور وہ بچہ اس شخص کا قرار دے دیا۔

فقہاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ جس عورت کا نکاح لعان کے باعث فسخ کر دیا گیا ہو وہ بدوران عدت نان نفقہ اور مکان کی مستحق نہیں ہے کیونکہ بیوی کو نان نفقہ کا حق طلاق کی عدت کے دوران ہوتا ہے۔ فسخ نکاح کی عدت میں نہیں ہوتا۔ مکان کے بارے میں بھی یہی حکم ہے اور جو اصحاب کہتے ہیں کہ لعان بھی طلاق ہے جیسے امام ابو حنیفہؒ وہ کہتے ہیں کہ نان نفقہ اور مکان خاوند پر واجب ہے۔

گونگے کے بارے میں حکم شرعی

حنفیہ کہتے ہیں کہ گونگے کا تہمت لگانے یا لعان کرنے کو درست نہیں مانا جائے گا کیونکہ اس کا بیان مشکوک ہوتا ہے جس سے سزائے شرعی ساقط ہو جاتی ہے۔

مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ گونگے کا تہمت لگانا اور لعان کرنا صحیح مانا جاسکتا ہے بشرطیکہ اس کا اشارہ قابل فہم ہو جس سے اس کا مقصد واضح ہو جائے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ یا پھر اچھی طرح لکھنا جانتا ہو۔ ایسی صورت میں وہ سزائے تہمت کا مستوجب ہو سکتا ہے کیونکہ جو شخص لکھ سکتا ہے یا اس طرح اشارہ کر کے عیب کو بتا سکتا ہے جسے لوگ سمجھ سکیں تو اسے یہ معلوم ہوگا کہ اس نے شادی شدہ عورت پر تہمت لگائی اور اس پر عیب تھوپا۔ لہذا اس کے اشارے کو بیان کرنا تصور کیا جائے گا اور اس کے ساتھ ہی معاملہ کیا جائے گا جو گویائی رکھنے والے کے ساتھ ہوتا ہے۔

لعان کرنے والوں کی اولاد کا بیان

فقہاء کہتے ہیں کہ لعان کرنے والوں کی اولاد ماں کی طرف منسوب ہوگی۔ چنانچہ وہ اپنی ماں کی وارث ہوگی اور اگر پہلے وہ وفات پائے تو ماں اس کی وارث ہوگی۔ کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ اس عورت پر اس شخص کے ساتھ بدکاری کا الزام لگائے جس کے بارے میں خاوند نے اس پر تہمت لگائی تھی، اگر کسی شخص نے اس پر زنا کی تہمت لگائی تو وہ شخص مستوجب حد ہوگا۔ کیونکہ اس کے خاوند نے جو الزام لگایا تھا اس کی سچائی ثابت نہیں ہوئی۔ لہذا اس عورت کو بے قصور تصور کیا جائے گا اور (شریعت کی رو سے) بنیادی بات یہ ہے کہ انسان کو بے گناہ تصور کیا جائے محض لعان سے اس عورت کو بے گناہی کی صفت سے عاری نہیں کہا جاسکتا اور جب تک یقین نہ ہو جائے کسی کی آبرو میں بے نہیں لگایا جاسکتا۔ اسی طرح کسی شخص کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ لعان کرنے والوں کے بچے کو ناجائز اولاد ہونے کا طعنہ دے اگر کوئی اسے ناجائز اولاد کہے تو اسے اتنی (۸۰) کوڑوں کی سزا دی جائے۔ اس بچے کی قرابت داری وہی متصور ہوگی جو ماں کی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما مے مروی ہے کہ ”وقضى انه ليس عليه قوت ولا سکنی من اجل انهما يفترقان بغير طلاق ولا متوفى عنهما“ (یعنی آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ خاوند کے ذمہ نہ اس عورت کی خوراک ہے نہ مکان، کیونکہ ان کے درمیان طلاق کے بغیر علیحدگی کرادی گئی۔ اور خاوند فوت بھی نہیں ہوا) اور انھوں نے فرمایا ”الحق الولد بالمرأة“ (یعنی اس بچے کو ماں کی طرف منسوب کیا جائے گا)۔ ایک اور روایت میں ہے ”فكان الولد ينسب الى امه“ (یعنی لڑکے کی نسبت ماں کی طرف کی جاتی تھی) مطلب یہ ہے کہ اسے صرف ماں کی اولاد کہا جائے گا اور باپ سے منسوب نہ کیا جائے گا اور نہ وہ ایک دوسرے وارث قرار پائیں گے اور اس کا خاندان وہی متصور ہوگا جو اس کی ماں کا ہے اور مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے لعان والی حدیث میں فرمایا ”ومن رماها به جلد ثمانین جلدہ“ (یعنی جو شخص اس بات پر عورت کو عیب لگائے اسے اسی دُڑوں کی سزا دی جائے) ایک اور روایت میں ہے ”وقضى ان لا يدعى ولدھا لاب، ولا یرمی ولدھا، ومن رماھا او رمی ولدھا فعليه الحد“ (یعنی حضور نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اس عورت کے لڑکے کو باپ کے نام سے نہ پکارا جائے اور نہ اس پر عیب لگایا جائے جس شخص نے اس بچے پر یا اس عورت پر تہمت لگائی وہ شخص مستوجب حد ہوگا)۔

لعان کے بعد مہر کے مطالبہ کا بیان

فقہاء کہتے ہیں کہ جب لعان کی تکمیل ہو جائے تو بیوی کا عقد فسخ ہو جائے گا اور وہ عورت طے شدہ مہر کی مستحق ہوگی، کیونکہ خاوند لعان سے پہلے اس کے ساتھ جنسی تمتع حاصل کر چکا ہے۔ چنانچہ روایت میں آیا ہے کہ ہلال بن امیہ نے اپنی بیوی کے ساتھ لعان کر لیا تو کہا ”یا رسول اللہ مالی؟“ (یعنی یا رسول اللہ میرے مال کا کیا بنے گا؟) ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ مہر جو وہ ادا کر چکے ہیں اس کی واپسی کا مطالبہ کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں یہ جواب دیا ”لا سیل لک علیھا“ (یعنی اب اس سے تیرا کوئی مطالبہ نہیں ہے) کیونکہ وہ اس مہر کی حقدار ہو چکی ہے۔ پھر حضور نے وضاحت سے بیان فرمایا کہ اگر وہ اپنے بیان میں سچا تھا یا جھوٹا بہر حال عورت مہر کی مستحق ہے۔ کیونکہ اگر (یعنی بیوی پر الزام لگانے میں) سچا ہے تب بھی عورت وہ بات پوری کر چکی ہے جو اسے مہر کا حقدار بناتی ہے اور اگر جھوٹا مانا جائے تب بھی یہی صورت حال ہے اور مزید برآں جو عیب لگانا تھا اس شخص نے اس پر لگایا ہے۔ اگر عورت مباشرت شدہ ہے تو متفقہ طور پر سب کی یہی

رائے ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے لعان کرنے والوں سے فرمایا ”للمتلا عنین حسابکما علی اللہ، احد کما کاذب لا سبیل لک علیہا قال یا رسول اللہ مالی؟ قال لا مال لک ان کنت صدقت علیہا فهو بما استحللت من فرجہا، وان کنت کذبت علیہا فذلک ابعد لک منها“ (یعنی تمہارا معاملہ اب خدا کے ساتھ ہے۔ کوئی نہ کوئی تو تم میں سے جھوٹا ہے۔ مگر اب اس عورت کے ساتھ تمہارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ سوال کیا یا رسول اللہ میرے مال (یعنی مال مہر) کا کیا ہوگا؟ فرمایا اب تمہیں اس مال پر کوئی حق نہیں ہے۔ اگر تم نے جو الزام لگایا تھا اس میں سچے ہو تب بھی وہ مال معاوضہ ہے اس کا جو تم نے اس کے اندام کو اپنے اوپر حلال بنالیا تھا اور اگر تم جھوٹ بولے ہو تب تو وہ مال اور بھی تم سے دور ہو گیا)۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ اگر اس عورت کے ساتھ خاوند نے مباشرت نہیں کی تھی تو اس بارے میں بھی جمہور کا خیال یہی ہے کہ وہ نصف مہر کی مستحق ہے جیسا کہ ان بیویوں کا حق ہوتا ہے جنہیں مباشرت سے پہلے طلاق مل گئی ہو۔ حماد اور حکم کہتے ہیں کہ وہ عورت بھی پورے مہر کی مستحق ہے لیکن زہری اور مالک کہتے ہیں کہ اسے کچھ نہ ملے گا۔

اولاد کے رنگ کا باپ کے رنگ سے نہ ملنا

حنفیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ محض رنگ کے مختلف ہونے کی بناء پر باپ کا اولاد سے انکار کرنا جائز نہیں ہے۔ شافعیہ کہتے ہیں کہ انکار صرف اس صورت میں جائز نہیں ہے جب کہ ایسا کوئی قرینہ موجود نہ ہو کہ رنگ کا اختلاف الزام زنا موجب قرار دیا جاسکے۔ چنانچہ اگر عورت پر بدکاری کا اتہام ہو اور اس سے پیدا ہونے والے بچے کا رنگ اس شخص سے ملتا ہو جس کے ساتھ الزام لگایا گیا ہے تو اس صورت میں صحیح یہی ہے کہ خاوند بچے سے انکار کر سکتا ہے۔ حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر کسی بچے کا رنگ باپ کے رنگ سے مختلف ہو اور اس عورت کی بدکاری کا قرینہ موجود ہے تو بچے سے بے تکلف انکار کرنا جائز ہے، لیکن اگر ایسا کوئی قرینہ نہ ہو تو انکار کرنا جائز نہیں ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قبیلہ بنی فزارہ کا ایک شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا اور اس نے کہا کہ میری بیوی نے سیاہ فام بچہ جنا ہے اور وہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ اس بچے کو اپنی اولاد (قرار دینے) سے انکار کر دے۔ نبی ﷺ نے دریافت فرمایا ”هل لک من اہل“ (یعنی تیرا کوئی اونٹ ہے؟) اس نے کہا ”نعم“ (جی ہاں) فرمایا ”فما لونہا“ (اس کا رنگ کیا ہے؟) اس نے کہا ”حمر“ (یعنی سرخ) فرمایا ”هل فیہا ورق؟“ (کیا اس میں خاکی یا سرخی رنگ ہے؟) اس نے کہا ”ان فیہا لورقاء“ (یعنی جی ہاں خاستری رنگ تو ہے) فرمایا ”فسانی اتساھا ذلک“ (کہ یہ رنگ اس میں کہاں سے آیا) اس نے کہا ”عسی ان یکون نزعة عرق“ (یعنی ممکن ہے یہ رنگ کسی نسلی اثرات کا نتیجہ ہو) فرمایا ”فہذا عسی ان یکون نزعة عرق“ (یعنی یہاں بھی ممکن ہے کہ یہ کسی نسلی رجحان کا نتیجہ ہو) غرض حضور نے بچے سے انکار کرنے کی اجازت نہیں دی۔ بہت سے لوگوں نے اس روایت کو بیان کیا ہے۔

ابوداؤد کی روایت میں یہ الفاظ ہیں ”ان امراتی ولدت غلاما اسود وانی انکرہ“ (یعنی میری بیوی نے ایک سیاہ فام بچہ جنا ہے۔ میں اس (کا باپ ہونے) سے انکار کرتا ہوں۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ کہتی ہیں کہ ”ان رسول اللہ ﷺ دخل علی تبرق اساریر

وجہہ، فقال: الم تری ان مجزراً نظر آنفاً الی زید بن حارثہ واسامۃ ابن زید فقال ان هذه الاقدام بعضها من بعض“ رواہ الجماعة (یعنی رسول اللہ ﷺ آئے ان کا چہرہ (خوشی سے) دمک رہا تھا آپ نے فرمایا تم نے دیکھا ابھی ایک مجزر (قیافہ شناس) نے زید ابن حارثہ اور ان کے بیٹے اسامہ کو دیکھا اور کہا کہ ان کے پیر ایک دوسرے کا حصہ معلوم ہوتے ہیں) اس حدیث کو ایک جماعت نے بیان کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ لوگ زید بن حارثہ اور ان کے بیٹے اسامہ کے بارے میں چہ میگوئیاں کرتے تھے، کیونکہ زید کا رنگ سفید تھا اور اسامہ سیاہ فام تھے۔ اس بارے میں لوگ ایسی باتیں کرتے تھے جو رسول اللہ ﷺ کو ناگوار گزرتی تھیں۔ پھر جب حضورؐ نے اس مدحی کی یہ بات سنی تو خوش ہوئے اور غم دور ہوا کہ سیدنا زید پر جو تہمت تھی وہ دور ہوگئی۔ اور ان کے ساتھ اسامہؓ کے نسب کی صداقت ثابت ہوگئی اور یہی امر برحق تھا۔ رسول اللہ ﷺ امر حق کے سوا کسی بات پر مسرت کا اظہار نہیں فرماتے تھے۔ اسامہؓ کا نسب تو شرعی طور پر ان کے باپ کے ساتھ ثابت تھا لیکن رنگ کے اختلاف کے باعث جو باتیں بنائی جاتی تھیں، مدحی کے قول نے ان سب کی باتوں کو بے اصل بنا دیا۔

تہمت لگانے کے بعد طلاق دے دینے کے متعلق مسائل

حنفیہ کہتے ہیں کہ جب ایک شخص اپنی بیوی کو، جس پر اس نے تہمت لگائی ہے، طلاق دے دے، تو اب ان کے درمیان لعان کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس تہمت کی کوئی سزا نہیں ہے۔ لیکن اگر بیوی کو کسی نے پہلے طلاق دے دی اور پھر اسے کہا اے زنا کرنے والی عورت! تو ایسا شخص مستوجب حد ہے۔ کیونکہ اس شخص نے ایک عورت پر اس وقت عیب لگایا جب کہ وہ اجنبی تھی (یعنی اس کی بیوی نہیں رہی تھی)۔ ہاں اگر یوں کہا ہوتا کہ اے بدکار (یا زانیہ) عورت تجھے طلاق ہے تو اب اس پر نہ لعان ہے اور نہ سزائے تہمت ہے کیونکہ اس شخص نے صورت لعان پائی جانے کے بعد تین طلاق دے دی اور جب وہ عورت زوجیت سے خارج ہوگئی تو گویا لعان کے بعد علیحدگی ہوئی لہذا حد ساقط ہوگئی۔

اگر کسی شخص نے اپنی چار بیویوں پر تہمت لگائی تو ان میں سے ہر ایک کے ساتھ لعان ہوگا۔ لیکن اگر چار غیر عورتوں پر تہمت لگائی تو ایک حد (سزائے قذف) کا مستوجب ہوگا۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ ثانی الذکر مسئلہ میں (سزا کا مقصد جو سرنش ہوتا ہے وہ ایک بار حد لگنے سے پورا ہو گیا۔ لیکن پہلی صورت میں لعان کا مقصد ہر عورت کو اس تہمت سے بری کرنا ہے جو اس پر لگائی گئی نیز اس کے نکاح کو فسخ کرنا ہے اور یہ امر ایک ساتھ کرنے سے پورا نہیں ہو سکتا ہے۔) لہذا ہر ایک سے الگ الگ لعان ہوگا۔

اگر کسی شخص نے بیوی سے کہا کہ تجھے جو حمل ہے وہ میرا نہیں ہے۔ تو اس سے لعان عائد نہ ہوگا کیونکہ ہنوز حمل ہونے ہی کا یقین نہیں ہے (ممکن ہے کہ وہ کوئی عارضہ ہو) لہذا اسے تہمت قرار نہیں دیا جائے گا۔

اگر کسی شخص نے اپنی آزاد بیوی (جو لونڈی نہ ہو) کے بچے کا باپ ہونے سے انکار کیا اور بیوی نے اس کو مان لیا تو نہ حد ہے نہ لعان ہے وہ بچہ ان دونوں ہی کا قرار دیا جائے گا اور ان کے انکار کو تسلیم نہیں کیا جائے گا کیونکہ باپ کے ساتھ بچے کے نسب کا قائم ہونا بچہ کا حق ہے اور ماں کی یہ حق نہیں ہے کہ وہ بچے کو اس حق سے محروم کر دے لہذا محض اس کی تصدیق سے بچے کو نسب سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا اور نہ اس کی تصدیق کو حد یا لعان کا موجب بنایا جاسکتا ہے کیونکہ بصورت موجودہ وہ عورت لعان کے (قرآنی) الفاظ کہ ”میں اللہ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ یہ شخص جھوٹا ہے“ نہیں کہہ سکتی کیونکہ وہ کہہ چکی کہ یہ

سچ کہتا ہے۔ اور جب لعان ممکن نہیں تو نسب کی نفی بھی ممکن نہیں۔

اگر کسی شخص نے اتہام لگانے کے بعد بیوی کو طلاق رجعی دے دی تو لعان واجب ہوگا، کیونکہ (طلاق رجعی میں) زوجیت باقی رہتی ہے اور اگر کسی نے طلاق بائن کے بعد (یعنی ایسی طلاق کے بعد جس سے نکاح ختم ہو جاتا ہے) پھر اس عورت سے شادی کر لی تو اب نہ (سابقہ تہمت کی بناء پر) لعان ہو سکتا ہے اور نہ حد عائد ہوتی ہے۔

ولادت کے بعد بچے (کا باپ ہونے) سے انکار

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر خاوند بچہ ہونے کے بعد ہی اس (کا باپ ہونے) سے انکار کر دے تو وہ تسلیم کیا جائے گا۔ لیکن اگر ولادت کو طویل عرصہ گزر گیا اور اب انکار کیا تو یہ انکار نہ ہوگا۔ کیونکہ اس نے بچے کی مبارکباد قبول کی۔ ولادت کے اخراجات برداشت کیے اور دوستوں کے تحفے قبول کیے اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد ایک عرصہ بھی گزر گیا اور بیوی کو اس نے بدستور رکھ چھوڑا ہے، تو اس کا یہ فعل واضح طور پر بچے کے تسلیم کر لینے کا اقرار ہے۔ اس کے بعد انکار درست نہیں ہے۔

قبیصہ بن ذؤیب سے مروی ہے کہ ”قضى عمر بن الخطاب في رجل انكر ولد امرأته وهو في بطنها، ثم اعترف به وهو في بطنها حتى اذا ولد انكره، فامر به عمر فجلد ثمانين جلدة لفريقته عليها، ثم الحق به ولدها“ (یعنی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ تھا جبکہ ایک شخص نے اپنی بیوی کے پیٹ کے بچے سے پہلے تو انکار کیا پھر ہنوز وہ پیدا نہ ہوا تھا کہ اس (کے باپ ہونے) کا اقرار کر لیا، تاہم جب وہ پیدا ہو گیا تو انکار کر دیا۔ حضرت عمر نے بیوی پر طوفان باندھنے کی پاداش میں اسے اسی (۸۰) دڑوں کی سزا کا حکم دیا جس پر عمل کیا گیا پھر وہ بچہ اس شخص کا قرار پایا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں آیا ہے کہ ”ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا عن بین ہلال ابن امیہ وامرأته و فرق بینہما و قضی ان لا یدعی ولدہا لاب، ولا یرمی ولدہا من رماھا اور می ولدہا فعلیہ الحد“ بروایت احمد (یعنی آنحضرت ﷺ نے ہلال بن امیہ اور اس کی بیوی کے درمیان لعان کرایا اور ان دونوں میں علیحدگی کر دی اور حکم دیا کہ اس بچے کو کسی باپ کی طرف منسوب نہ کیا جائے اور نہ اس کے اس بچے کو عیب لگایا جائے۔ اگر کسی نے اس عورت پر یا اس کے بچے پر عیب لگایا تو وہ مستوجب حد ہوگا)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وہی لڑکا بعد میں مصر کے ایک صوبہ کا حاکم (گورنر) مقرر ہوا، اسے کسی کا بیٹا نہیں کہا جاتا تھا۔

اگر خاوند کہیں دور دراز علاقہ میں چلا گیا ہو اور سفر سے واپس آنے پر معلوم ہوا کہ اس کی بیوی کے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے تو گویا وہ اسی وقت پیدا ہوا جب خاوند کو علم ہوا۔ اب اگر اس کی پیدائش کا علم ہوتے ہی اس (کا باپ ہونے) سے انکار کر دے تو یہ انکار قابل تسلیم ہوگا لیکن اگر اس کا علم ہونے کے طویل عرصہ بعد انکار ہو تو یہ انکار قابل تسلیم نہ ہوگا کیونکہ اس کے طویل عرصہ تک خاموش رہنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس پر راضی ہے (یعنی اس نے بچہ کو تسلیم کر لیا)۔

فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ ولادت سے پہلے حمل کے نسب سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ

ولادت سے پہلے ہی اس بچے کو اولاد کی حیثیت دے دی گئی حالانکہ بچہ جب تک پیٹ میں ہے اسے اولاد کی حیثیت نہیں دی جاسکتی۔ مثلاً حق وراثت اور امور متعلقہ وصیت کا حق اس وقت تک پیٹ کے بچے کو حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ پیدا نہ ہو جائے۔ (یہ نہیں ہو سکتا تو بچہ کونسل سے خارج بھی نہیں کیا جاسکتا)۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی عورت نے ایک ہی حمل سے دو بچے جنے اور خاوند نے پہلے (پیدا ہونے والے) بچے کو اپنا مانا اور دوسرے سے انکار کیا تو دونوں بچوں کا نسب تو اس شخص سے مانا جائے گا لیکن (انکار جو کیا ہے اس لیے) لعان کرایا جائے گا اگر خاوند نے اس کے برعکس کیا کہ پہلے بچے سے انکار کیا اور دوسرے کو اپنا مانا، تب بھی دونوں کا نسب اس شخص سے مانا جائے گا لیکن (انکار کی پاداش میں) مستوجب حد ہوگا (دونوں بچوں کا) نسب تو اس شخص کے ساتھ اس لیے تسلیم کیا جائے گا کہ دونوں بچے قدرتی طور پر جڑواں ایک ہی نطفہ سے پیدا ہوئے تو اگر ایک کا نسب تسلیم کر لیا گیا تو دوسرے کا ثابت ہونا بھی ناگزیر ٹھہرا۔ اور در آنحالیکہ اس شخص نے دوسرے بچے سے انکار کیا تو اس نے اپنے کسی پہلے بیان کی تکذیب نہیں کی لہذا اب وہ لعان کرے گا اور اس نے پہلے بچے سے انکار کیا اور دوسرے کا اعتراف کرتا ہے تو اس اعتراف سے اپنے پہلے بیان کی تکذیب کرتا ہے۔ لہذا مستوجب حد ہے۔

بیوی کو کسی خاص شخص کے ساتھ بدنام کرنے کا بیان

حنفیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص اپنی بیوی پر کسی خاص آدمی کے ساتھ ملوث ہونے کی تہمت لگائے اور کہے کہ تو نے فلاں شخص کے ساتھ بدکاری کی تو بیوی پر اس اتہام کے بارے میں لعان کرے گا۔ اور اس شخص پر تہمت لگانے کی پاداش میں مستوجب حد ہوگا، بشرطیکہ وہ حد کا مطالبہ کرے۔ اس لعان سے حد قذف ساقط نہ ہوگی۔

اس بارے میں شافعیہ کے اقوال میں سے اس قول کو ترجیح حاصل ہے کہ (ان دونوں الزاموں کے عوض) اس شخص پر ایک حد لاگو ہوگی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ دونوں الزامات میں سے ہر ایک کی پاداش میں اس پر حد لازم ہے۔ لیکن اگر لعان میں اس تہمت کا ذکر آیا ہے تو حد ساقط ہو جائے گی۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہلال بن امیہ نے اپنی بیوی پر، شریک بن سحاء کے ساتھ ملوث ہونے کی تہمت لگائی۔ وہ براء بن مالک کے ماں شریک بھائی تھے اور ملت اسلامیہ میں وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے لعان کیا۔ بیوی کے ساتھ لعان کرنے کے بعد آنحضرت ﷺ نے فرمایا، ”ابصروہا فان جاء ت به ابیض سبطاً، فضی العینین فهو لہلال بن امیہ، وان جاء ت به اکحل، جعداً، حمش الساقین، فهو لشریک بن سحاء“ (یعنی اب دیکھنا اگر اس عورت کے بچہ کا رنگ سفید، بال سیدھے اور آنکھیں پھیلی ہوئی ہیں تو وہ ہلال بن امیہ کا ہے اور اگر وہ سیاہ چشم گھونگھریا لے بال اور پتلی پنڈلیوں والا ہے تو وہ شریک بن سحاء کا ہے) پھر یہ معلوم ہوا کہ اس بچے کی آنکھیں سیاہ، بال گھونگھریا لے اور پنڈلیاں پتلی ہیں۔ (بروایت احمد، مسلم و نسائی اس حدیث میں لفظ ”سبط“ کے معنی سیدھے بال والے اور فضی العینین کے معنی خراب آنکھوں والے کے ہیں اور ”اکحل“ وہ ہے جس کی آنکھ سیاہ ہو اور جعد کے معنی سیدھے بال کے برعکس یا چھوٹے بال کے ہیں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ جس شخص کی بابت انہوں نے اطلاع دی تھی وہ زرد رنگ، چھوٹے اور گھونگھریالے بال والا ہے اور وہ شخص جس کی بابت ان کا بیان تھا کہ اپنی گھر والی کے پاس اسے دیکھا۔ وہ بھری پنڈلیوں والا، گندم گوں اور فرہ جسم ہے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اللہم بین“ (یعنی یا اللہ حقیقت حال کھول دے) چنانچہ اس عورت سے جو بچہ پیدا ہوا وہ اس شخص سے مشابہ تھا جس کا ذکر اس کے خاوند نے کیا تھا کہ انہوں نے اسے اپنی بیوی کے ساتھ دیکھا ہے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے ان میں لعان کرادیا۔

بن دیکھے الزام پر لعان کرنے کا مسئلہ

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی نے اپنی بیوی کو زانیہ کہا اور اس کا ثبوت بہم نہ پہنچا سکا تو وہ شخص مستوجب حد ہے۔ ایسے شخص کو لعان کے لیے نہ کہا جائے گا جس نے ارتکاب جرم خود نہ دیکھا ہو۔ مالکیہ کے نزدیک لعان کی شرط یہ ہے کہ اس شخص سے ”سُبرائی کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہو۔“

حنفیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ خاوند کو حق ہے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ لعان کرے اگرچہ لعان میں چشم دید بُرائی کا الزام نہ لگایا ہو۔ کیونکہ ان کے نزدیک لعان کے لیے دیکھنا شرط نہیں ہے۔

بدوران عدت بدکاری کا ارتکاب

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو طلاق بائنہ دے دی (جس کے بعد زوجیت کا تعلق ختم ہو جاتا ہے) پھر اس نے اپنی بیوی کو ایام عدت میں ملوث ہوتے پایا تو اسے حق ہے کہ اس کے ساتھ لعان کرے اگر طلاق کے بعد عورت کا حمل ظاہر ہو اور خاوند کہے کہ میں ایام کے آنے تک اس سے بے تعلق رہا ہوں تب بھی لعان کا حق ہے۔ شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر عورت کو حمل ہو یا بچہ پیدا ہو جائے تب ہی خاوند لعان کر سکتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو اسے لعان کا حق نہیں ہے۔

حنفیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ (جس نے طلاق دے دی ہے) اسے لعان کا حق ہی نہیں ہے کیونکہ طلاق کے بعد عورت بیوی نہ رہی بلکہ اجنبی ہو گئی (اور اجنبی عورت سے لعان نہیں ہوتا)۔

عقد کے بعد ہی طلاق یافتہ عورت کے ہاں بچہ پیدا ہونے کا بیان

مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے کسی عورت سے عقد نکاح کیا اور عقد کے معا بعد کہ هنوز مباشرت کا موقع نہ ملا تھا، طلاق دے دی اور عقد کے بعد چھ ماہ میں بچہ پیدا ہو گیا تو وہ بچہ اس شخص کا قرار نہیں پاسکتا۔ جیسا کہ اس صورت میں ہوتا ہے جب کہ عقد کے چھ ماہ کے اندر بچہ پیدا ہو جائے۔ کیونکہ یہ بات یقینی ہے کہ وہ عقد سے پہلے کی حاملہ تھی۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ وہ بچہ اسی کا قرار دیا جائے گا بشرطیکہ اس کا عقد حاکم شرع کے سامنے ہوا ہو اور عقد کے بعد ہی اسے طلاق ہو گئی ہو اور چھ ماہ سے کم میں پیدا نہ ہوا ہو اور نہ چھ ماہ سے زیادہ میں۔ یہ بچہ اسی شخص کا مانا جائے گا کیونکہ وہ عقد کے بعد اور طلاق سے پہلے کا ہے۔

نکاح کے بعد خاوند کے مفقود الخبر ہو جانے کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے کسی عورت سے شادی کی اور اس کے بعد دو سال تک مفقود الخبر رہا پھر اس کے وفات پا جانے کی خبر آگئی۔ بیوی نے عدت گزاری اس کے بعد شادی کر لی اور دوسرے خاوند سے اولاد پیدا ہوئی پھر پہلا خاوند واپس آ گیا تو اس دوران پیدا ہونے والے بچے پہلے خاوند کی طرف منسوب ہوں گے انھیں دوسرے کی اولاد قرار نہیں دیا جائے گا دوسرے خاوند سے طلاق ہو جائے گی اور پھر پہلے خاوند کی بیوی ہو جائے گی۔ اس بارے میں حنفیہ کی دلیل، رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے ”الولد للفراش، وللعاهر الحجر“ (یعنی بچہ صاحب فراش کا ہے اور بدکار کا کچھ نہیں)۔ اس حدیث کو ایک جماعت نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور بخاری کی روایت میں ”الولد لصاحب الفراش“ آیا ہے (یعنی بچہ صاحب فراش کا ہے) چونکہ عورت عقد کے بعد خاوند کا ”فراش“ ہو جاتی ہے۔ لہذا جو اس فراش کا مالک ہے لڑکا اسی کا ہوگا۔ کیونکہ احکام کا ماخذ صاحب شریعت کی تصریح ہے۔

واضح ہو کہ لفظ ”فراش“ کے معنوں میں علماء کا اختلاف ہے:

شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ لفظ ”فراش“ حدیث میں عورت کا نام ہے۔ اور عورت کو اس کی حالت افتراش (یعنی پچھاڑی جانے) کی بناء پر ”فراش“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور قاموس میں ہے کہ ”فراش“ کے معنی ”خاوند کی بیوی“ کے ہیں۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اسی سے ”فرش مرفوعة“ نکلا ہے۔ (جس کے معنی شاندار یا بلند بالا بیویاں ہیں) اور اس کے معنی جاریہ (لونڈی) کے بھی ہیں جسے مرد نیچے ڈالتا ہے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ حدیث میں ”فراش“ کا لفظ خاوند کے لیے ہے چنانچہ ابن الاعرابی نے اس معنی کے ثبوت میں جریر کے اس قول کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ ”باتت تعانقه، و بات فراشها“ (یعنی وہ عورت اس شخص کے ساتھ شب باس ہوئی اور اس کے خاوند نے بھی رات گزاری) اور الفاظ حدیث ”للعاهر الحجر“ میں عاہر کے معنی زنا کرنے والے کے ہیں چنانچہ بولتے ہیں ”عہر“ یعنی اس نے بدکاری کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے مفہوم میں رات کا وقت داخل ہے (یعنی رات کے وقت بدکاری کرنا ”عہر“ ہے) اور ”لہ الحجر“ میں حجر کے معنی ”خیبت“ (یعنی نامرادی) کے ہیں۔ یعنی اس شخص کا اس اولاد پر کوئی حق نہیں ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں لفظ ”حجر“ کے معنی یہ ہیں کہ اگر بدکاری کرنے والا شادی شدہ ہے تو اسے سنگسار کیا جائے۔

ایک جماعت نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے: وہ کہتی ہیں ”اختصم سعد بن ابی وقاص وعبداللہ بن زمعہ الی رسول اللہ ﷺ، فقال سعد: یا رسول اللہ ابن اخی عتبہ بن ابی وقاص، عہد الی انہ ابنہ، انظر الی شبہہ وقال عبداللہ بن زمعہ: ہذا اخی یا رسول اللہ ولد علی فراش ابی، فنظر رسول اللہ ﷺ الی شبہہ، فرای شبہا بینا بعتبہ، فقال: ہولک یا عبداللہ بن زمعہ، الولد للفراش، وللعاهر الحجر، واحتج بی منہ یا سودہ بنت زمعہ قال، فلم یری سودہ قط“ (یعنی سعد بن ابی وقاص اور عبداللہ بن زمعہ نے اپنا باہمی نزاع رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا: سعد نے کہا، یا رسول اللہ میرے بھتیجے عتبہ بن ابی وقاص نے قسم کھا کر مجھے کہا ہے کہ ”میں ابو وقاص کا بیٹا ہوں۔ ان

کے ساتھ مشابہت آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ عبد اللہ بن زمعہ نے کہا کہ: یا رسول اللہ یہ تو میرا بھائی ہے میرے باپ کی بیوی سے پیدا ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی صورت کو ملاحظہ فرمایا اور دیکھا کہ عتبہ کو ان سے یعنی عبد اللہ بن زمعہ سے، واضح مشابہت ہے، تب فرمایا کہ اے بندے عبد اللہ بن زمعہ یہ تیرا ہی بھائی ہے۔ اولاد خداوند کی ہے اور بدکاری کرنے والے کا کوئی حق نہیں ہے: بہر حال اے سودہ بنت زمعہ تو ان سے پردہ کر: اس کے بعد انھوں نے کبھی سودہ کو نہیں دیکھا۔ واضح ہو کہ یہ سودہ وہی ہیں جو ام المؤمنین (یعنی ازواج رسول اللہ ﷺ میں سے) ہیں واضح ہو کہ حنفیہ صرف عقد نکاح ہو جانے کی بناء پر نسب قائم کر دیتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ نسب ثابت کرنے کے لیے محض گمان کافی ہے۔ بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے ایک عورت سے شادی کی جو مغرب میں ہے اور خود مشرق میں ہے اور شادی کے بعد چھ ماہ کے عرصہ میں بچہ پیدا ہو تو اس بچہ کو اسی کی طرف منسوب کیا جائے گا۔ اور محض عقد کی بناء پر اس بچے کے ہو جانے سے انکار کرنے کی مخالفت کی ہے اور امکان مباشرت کا تسلیم کرنا لازمی قرار دیا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ فرائض زوجیت کو ثابت کرنے کے لیے صرف نکاح کا ہو جانا کافی ہے۔ لیکن ابن تیمیہ کا خیال یہ ہے کہ (ثبوت نسب کے لیے) ضروری ہے کہ حقیقی معنوں میں مباشرت کا ہونا معلوم ہو۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ محض امکان مباشرت کی بناء پر شریعت (بچہ کا) نسب ایسے شخص کے ساتھ جوڑے دے جس نے نہ تو اپنی بیوی کے ساتھ زفاف کیا ہو نہ مباشرت کی ہو اور نہ دونوں اکٹھے ہوئے ہوں؟

حنفیہ کا جواب یہ ہے کہ حقیقی طور پر مباشرت کا معلوم ہونا دشوار ہے اگر (صحت نسب کا) انحصار اسی پر رکھا جائے تو بہت سے نسلی رشتے باطل ہو جائیں گے شریعت نے (نسب کے بارے میں) بڑی احتیاط سے کام لیا ہے اور (ثبوت نسب کے لیے) محض امکان مباشرت کو پیش نظر رکھنا ہی احتیاط کی مناسب صورت ہے۔

شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ صورت مذکورہ بالا میں اس اولاد کو عورت کے دوسرے خاوند کی طرف منسوب کیا جائے۔ کیونکہ یہ امر ثابت شدہ ہے کہ اس شخص نے اس عورت سے شادی کی اور مباشرت ہوئی اور عورت اس کی زوجیت میں رہی۔ یہی رائے قرین عقل ہے اور بہر حال اثبات نسب کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ بچہ نکاح صحیح کے بعد گو بقول ائمہ ثلاثہ نکاح فاسد ہی ہوا ہو اور مباشرت کا موقع مل چکنے کے بعد حمل کی کم سے کم مدت چھ ماہ گزرنے پر پیدا ہوا ہو۔ احناف کے نزدیک یہ ہے کہ عقد نکاح کے بعد اتنی مدت گزر چکی ہو خواہ دونوں اکٹھے نہ رہے ہوں۔ ابن تیمیہ کے نزدیک یہ ہے کہ گو حقیقی طور پر ان کا مباشرت کرنا معلوم نہ ہو۔ (وقت کی اس قید پر) سب کا اتفاق ہے۔ پس اگر اس عرصہ سے پہلے بچہ پیدا ہو گیا تو قطعی طور پر وہ بچہ عقد سے پہلے کا ہے لہذا اسے کسی شخص کی طرف سے منسوب نہیں کیا جاسکتا اور یہ سب کہتے ہیں کہ کسی بچے کو ایک سے زیادہ اشخاص کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔

خارجیوں کی رائے

خوارج کہتے ہیں کہ زنا کرنا اور تہمت لگانا کفر ہے۔ اہل سنت اس خیال کی تردید میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پیش کرتے ہیں ”والسین یومون ازواجہم ولم یکن شہداء الا انفسہم.....“ (یعنی جو لوگ اپنی بیویوں پر عیب لگاتے ہیں اور اپنے سوا اس کی کوئی گواہی پیش نہیں کر سکتے.....) اس آیت سے اہل سنت کے خیال کی تائید دو طرح سے ہوتی ہے:

انسانی خصائل ذمہ کو ختم کرنے میں شریعت اسلامیہ کا کردار

شریعت اسلامیہ نے انسان کی بری خصلتوں کو ختم کرنے اور بد اخلاقیوں کا سد باب کرنے کی طرف پوری توجہ مبذول فرمائی ہے۔ کیونکہ اقوام کی پائیداری اور خوشی بختی اسی میں ہے۔

ایک یہ کہ عیب لگانے والا اگر سچا ہے تو عورت کو مرتکب زنا قرار دیا جائے گا اور اگر جھوٹ بولا ہے تو وہ قاذف (یعنی تہمت لگانے والا) ٹھہرے گا۔ اب خوارج کے قول کے مطابق دونوں میں سے ایک پر کفر عائد ہوگا اور وہ 'مرتد' (دین اسلام سے پھر جانے والا) ہوگا۔ ایسی صورت میں دونوں کے درمیان علیحدگی لازم ہوگی۔ اور لعان قطعاً نہ ہوگا اور یہ علیحدگی جو ارتداد کی بناء پر ہوگی اس میں باہمی وراثت کو دخل نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ اگر لعنت کرنے سے بقول خوارج کفر ثابت ہو گیا تو لازم ہوگا کہ انھیں قتل کیا جائے دُڑہ زنی یا سنگساری کی سزا نہیں دی جائے گی کیونکہ مرتد ہونے کی سزا بدکاری کی سزا سے بالکل مختلف ہے۔

اہل سنت کہتے ہیں کہ اس آیت سے ان لوگوں کا قول باطل ثابت ہوتا ہے جو کہتے ہیں کہ 'زنا' سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص بیوی پر زنا کا عیب لگاتا ہے تو اس صورت میں واجب ہے کہ وہ نکاح کے فاسد ہو جانے کا اعتراف کرے اور صورت حال ایسی ہے جیسے کوئی شخص بیوی کو دودھ شریک بہن یا کافرہ قرار دے۔ ایسا ہو تو عیب لگانے کے ساتھ ہی 'لعان' کے بغیر ہی ان دونوں میں علیحدگی واجب ہو جائے گی اور اس خیال کی غلطی بالا جماع مسلم ہے۔

معتزلیوں کی رائے

معتزلہ کہتے ہیں کہ آیت لعان سے ثابت ہے کہ تہمت لگانے والا اگر جھوٹا ہے تو مستوجب لعنت الہی اور فاسق ہے اسی طرح بدکاری کرنے والا مرد اور عورت دونوں خدا کے غضب اور عذاب الہی کے مستحق ہیں ورنہ اپنے اوپر لعنت کرنا درست نہ ہوگا بلکہ یہ ایسا ہی فعل (ناموزوں) ہوگا جیسے کوئی شخص بچوں یا جنون زدہ پر لعنت الہی کا طالب ہے جو جائز نہیں ہے۔ پس وہ عذاب کے مستحق ہوئے اور عذاب بھی ثواب کی طرح دائمی شے ہے۔ اور چونکہ دونوں باتیں (یعنی عذاب و ثواب) جمع نہیں ہو سکتیں لہذا ان کے (کارہائے) ثواب رائیگاں گئے اور اگر وہ توبہ نہ کریں تو جنت میں نہ جائیں گے کیونکہ امت کا اس امر پر اجماع ہے کہ مکلف انسانوں میں سے (یعنی جن پر شرعی احکامات لاگو ہوتے ہیں) صرف اہل طاعت ہی جنت میں داخل ہوں گے اور نتیجہً بدکار لوگ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

ائمہ فقہ کہتے ہیں کہ یہ بات تسلیم نہیں کی جاسکتی کہ جو شخص اپنے گناہوں کے باعث مستوجب غضب الہی ہے وہی اپنے ایمان کے باعث رضائے الہی کا مستحق بھی ہے۔ پھر اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے تو یہ بات نہیں مانی جاسکتی کہ جنت میں صرف ثواب کے حقدار داخل ہوں گے۔ یہ بات اجماع کے خلاف ہے۔

شریعت اسلامیہ چاہتی ہے کہ نبی نوع انسان کا مقام عز و شرف قائم رہے۔ چنانچہ ہمیشہ ائمہ امت نے اس امر کو مد نظر رکھا ہے کہ اسلامی معاشرہ عیب سے پاک ہو غیرت کا پاس رکھا جائے اور گناہ پھیلنے نہ پائیں۔ ایسا نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ بہت جلد بے رحم (ظالم) کو قوم پر مسلط کر دیتا ہے^(۱)

بعض کہتے ہیں کہ لعان کرنے والی کو پانچویں بار اللہ تعالیٰ کے غضب کے ساتھ قسم کھانا اس لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ گناہ کی جزا اور حرص و طمع کی منبع وہی ہے اور اسی لیے آیت قرآن میں زانیہ کا ذکر پہلے آیا ہے۔

۱۔ پر از حکمت شرع اسلام نے بدکاری سے منع کیا اور ناجائز نکاح سے نفرت دلائی ہے اور اسے ایک ایسا گناہ قرار دیا ہے جو انسان کے اعمال نیک کو بھی تلف کر دیتا ہے۔ اور اس کا مرتکب مستوجب جہنم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”لَا تَنْكِحُوا آبَاءَكُمْ أَوْ أَبْنَاءَكُمْ أَوْ إِخْوَانَكُمْ أَوْ إِخْوَاتَكُمْ أَوْ مَا بَيْنَ ذَلِكَ“ (النساء: ۲۲) (یعنی لوگو جن عورتوں سے تمہارے باپ دادا نے نکاح کیا ہو تم ان سے نکاح نہ کرنا۔ اس سے پہلے جو ہوا سو ہو چکا۔ وہ سخت گناہ اور ناپسندیدہ حرکت تھی اور برا طریقہ تھا)۔ پھر (خدا پرست لوگوں کے حق میں) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ، وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ الْبَالِغِينَ، وَلَا يَزْنُونَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ إِثْمًا، يِضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَيَخْلُدُ فِيهِ مُهَانًا“ (یعنی وہ لوگ اللہ کے ساتھ کسی اور خدا کو بھی نہیں پکارتے اور ایسے شخص کو قتل نہیں کرتے جس کا قتل اللہ نے حرام کیا ہے اور زنا کے مرتکب نہیں ہوتے اور جو بھی یہ کرتا ہے وہ معصیت سے دوچار ہوا، قیامت کے روز اسے دگنے عذاب کا سامنا ہوگا اور وہ ذلت کے دیر پا عذاب میں پڑا رہے گا)۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے زنا کو شرک اور قتل ناحق کے ساتھ ملایا جو اللہ کی حرام کردہ بدترین معصیتیں اور بڑے سے بڑے گناہ ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے زنا کتنا بڑا گناہ ہے اور تمام معصیتوں اور گناہوں میں یہ سب سے زیادہ ہے کیونکہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہے کہ جو شخص اس کا ارتکاب کرتا ہے وہ بہت بڑا گناہ کرتا ہے اور اس کی پاداش میں اتنے طویل عرصہ تک ذلت و حقارت کے ساتھ جہنم میں رہے گا کہ گویا یہ دائمی عذاب ہوگا اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّي الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطُنَ“ (الاعراف: ۳۳) (یعنی یہ بتا دو کہ میرے پروردگار نے تمام بڑے گناہوں کو خواہ ان کا علانیہ ارتکاب کیا جائے یا چھپ کر، حرام فرمایا ہے)۔ نیز ارشاد فرمایا ”الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، وَلِيَشْهَدَ عَذَابُهُمَا طَائِفَةٌ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ“ (النور: ۲۴) (یعنی زنا کار مرد اور زنا کار عورت دونوں میں سے ہر ایک کو سوتازیا نے مارو اور اگر تم کو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان ہے تو اس دینی حکم کی بجا آوری میں نرمی سے کام نہ لینا اور چاہیے کہ سزا ملنے کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت اس کا مشاہدہ کرے۔ جو بدکار انسان ہے وہی بدکار یا مشرک عورت سے شادی کرے گا اسی طرح بدکار عورت سے ایک بدکار یا مشرک آدمی ہی نکاح کرے گا اور ایسا کرنا اہل ایمان کو حرام ہے)۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”لَا يَحِلُّ دَمُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ يَشْهَدَانِ إِلَّا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَإِنِّي رَسُولُ اللَّهِ الْبَاحِدَى ثَلَاثًا، الثَّيْبُ الزَّانِي، وَالنَّفْسُ بِالنَّفْسِ وَالتَّارِكُ

لہٰذا، المفارق للجماعة“ بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی۔ (یعنی کوئی بھی مسلمان جو اس بات کا اقرار کرے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور میں اللہ کا رسول ہوں اس کا خون ان تین حالتوں کے سوا حلال نہیں ہے۔ شادی شدہ زنا کار، ناحق قتل کرنے والا اور اپنے دین (اسلام) کو ترک کر کے امت مسلمہ سے الگ ہو جانے والا)۔

عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا ”یا بغایا العرب یا بغایا العرب ان اخوف ما اخاف علیکم الزنا، الشهوة الخفية“ رواہ الطبرانی (یعنی اے عرب کی بدکار عورتو! اے عرب کی بدکار عورتو! مجھے تمہاری طرف سے سب سے زیادہ اندیشہ بدکاری اور مخفی شہوت رانی کا ہے)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اذا زنی الرجل خرج منه الايمان، فكان علیہ كالظلة فاذا اقلع رجع الیہ الايمان“ بالفاظ ابوداؤد (یعنی جب کوئی شخص بدکاری کرتا ہوتا ہے تو اس وقت ایمان اس سے خارج ہو جاتا ہے اور اس کے سر پر کھڑا رہتا ہے جیسے سایمان پھر جب وہ اس فعل سے الگ ہو جاتا ہے تب ایمان واپس آ جاتا ہے)۔

بیہقی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ان الايمان سربال يسربله الله من يشاء، فاذا زنی العبد نزع منه سربال الايمان، فان تاب رد علیہ“ (یعنی یقیناً ایمان لباس ہے اللہ جسے چاہتا ہے پہناتا ہے، جب بندہ زنا کرتا ہے تو اس سے ایمان کا لباس اتر جاتا ہے۔ پس اگر توبہ کرے تو لوٹ آتا ہے)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ثلاثة لا يكلمهم الله يوم القيامة، ولا يزکیهم، ولا ينظر الیہم، ولہم عذاب الیم، شیخ زان، وملك كذاب، وعائل مستكبر“ (بروایت مسلم و نسائی)۔ (یعنی تین قسم کے لوگ ایسے ہیں کہ قیامت کے روز اللہ نہ ان سے کلام کرے گا نہ وہ (عیب سے) پاک ہوں گے اور نہ ان کی طرف نظر (کرم) فرمائے گا، بلکہ ان پر المناک عذاب ہوگا۔ ان میں سے ایک وہ عمر رسیدہ شخص ہے جو زنا کا مرتکب ہو اور وہ بادشاہ جو جھوٹ بولے اور عاقل (محتاج) جو تکبر پسند ہو)۔ اور الاوساط میں بروایت طبرانی یہ الفاظ ہیں ”لا ينظر الله يوم القيامة الى الشيخ الزاني، ولا العجوز الزانية“ (یعنی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ عمر رسیدہ بدکار مرد اور عمر رسیدہ بدکار عورت کی طرف نظر کرم نہ فرمائے گا)۔

بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان السموات السبع، والارضین السبع ليلعن الشيخ الزاني، وان فروج الزناة لينوذی اهل النار لتن ریحها“ بروایت بزار۔ (یعنی بلاشبہ ساتوں آسمان اور ساتوں زمین عمر رسیدہ زانی پر لعنت کناں ہیں، اور بدکار عورتوں کی شرمگاہ سے ایسی عفونت نکلے گی جس کی اذیت اہل جہنم بھی محسوس کریں گے)۔

غلام پر حد کا نفاذ

چاروں ائمہ فقہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر غلام یا لونڈی بدکاری کریں تو انہیں پوری سزا نہیں دی جائے گی۔ سزا بچاس دڑے ہے۔ یہ مرد ہوں یا عورت سب کی سزا یکساں ہے اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ انہیں سنگسار نہیں کیا جائے گا، اگرچہ مرتکب شادی شدہ ہوں۔ انہیں بہر حال دڑہ زنی کی سزا دی جائے گی۔ کیونکہ فقہاء نے سزائے سنگساری کے لیے آزاد اور شادی شدہ ہونیکے شرط رکھی ہے پس مملوک اگرچہ شادی شدہ ہو وہ محسن (محفوظ) تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے

ثبوت میں فقہاء اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پیش فرماتے ہیں ”فاذا احصن فان اتین بفاحشة فعليهن نصف ما على المحصنات من العذاب“ (یعنی اگر لونڈیاں شادی شدہ ہوں اور اس گناہ عظیم کی مرتکب ہوں تو انھیں شادی شدہ عورتوں سے نصف سزا دی جائے) اور سنگساری ایسی سزا ہے جسے آدھا نہیں کیا جاسکتا (یعنی جس سزا کو آدھا کیا جانا ممکن ہے وہی سزا آدھی کر دی جائے گی)۔

شافعیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر غلام بدکاری کا ارتکاب کرے تو اسے پچاس درے مارے جائیں اور نصف سال کے لیے جلاوطن کر دیا جائے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ حضور نے فرمایا ”اذا زنت امة احدکم فتبین زناها، فلیجلدها الحد، ولا یشر علیہا ای لا یوبخها ثم ان زنت فلیجلدها الحد، ولا یشر علیہا، ثم ان زنت الثالثة فلیبعها، ولوبجل من شعر“ محدثین خمسہ بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ۔ (یعنی اگر تمھاری کوئی لونڈی (مملوکہ) بدکاری کی مرتکب ہو اور اس کا جرم ثابت ہو جائے تو حد ماری جائے اور زجر و توبیخ سے کام نہ لیا جائے اگر وہ پھر بدکاری کرے تو پھر اسے حد ماری جائے اور زجر و توبیخ سے کام نہ لیا جائے اگر تیسری بار بھی وہی حرکت کرے تو اسے فروخت کر دو خواہ بالوں کی ایک رسی ہی کی عوض کیوں نہ ہو)۔

مسند عبد بن احمد میں امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں جا کر حضرت سودا کی لونڈی کو جس نے ارتکاب زنا کیا تھا درہ زنی کی سزا دوں حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ مجھے معلوم ہوا کہ وہ عورت حالت اورار میں ہے۔ میں نے حضور سے یہ بات بتائی۔ ارشاد فرمایا کہ جب وہ اورار سے فارغ ہو تو اسے پچاس دڑے لگاؤ۔

حضرت عبد اللہ بن عیاش بن ابی ربیعة مخزومی سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ ”امرني عمر بن الخطاب في فتية من قريش فجلدنا ولائد من ولائد الامارة خمسين خمسين في الزنا“ رواه امام مالك في كتابه الموطا۔ (یعنی حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے قریش کی ایک لونڈی سے ملوث ہونے کی پاداش میں سزا کا حکم دیا۔ چنانچہ حکومت کے ملازم لڑکوں نے ہمیں پچاس پچاس دڑے مارے) اس حدیث کو امام مالک نے اپنی کتاب موطا میں روایت کیا ہے۔ پس بندوں میں سے اگر مرد زنا کرے تو اسے سو دڑے مارے جائیں اور لونڈی پر اگر ارتکاب زنا کا الزام ثابت ہو جائے تو اسے پچاس دڑے مارے جائیں۔

ائمہ اربعہ نے، غیر شادی شدہ لونڈی پر حد لاگو ہونے کے بارے میں حضرت ابو ہریرہ اور زید بن خالد الجہنی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی روایت کردہ اس حدیث سے استدلال فرمایا ہے ”ان النبی ﷺ سئل عن الامة زنت، ولم تحصن فقال: ان زنت فاجلدوها، ثم ان زنت فاجلدوها، ثم ان زنت فاجلدوها ثم بیعوها ولوبضفیر ای بوجل مغفور قال ابن شهاب: لا ادري ابعد الثالثة او الرابعة“ متفق علیہ (یعنی نبی ﷺ سے غیر شادی شدہ بدکاری کرنے والی لونڈی کی بابت دریافت کیا گیا تو ارشاد فرمایا کہ اگر وہ بدکاری کرے تو اسے دڑے مارو، اگر پھر کرے تو پھر مارو اگر پھر مرتکب ہو تو دڑے مارو اور اسے فروخت کر دو خواہ ایک بٹے ہوئے بال یعنی بال کی بیٹی ہوئی رسی..... کے عوض ہو۔ ابن شہاب کہتے ہیں کہ مجھے یاد نہیں کہ اسے دفع کرنے کا حکم تین بار یا چار بار کے بعد دیا)۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔

حضرت ابن عباس، مجاہد اور سعید بن جبیر فرماتے ہیں کہ غلام اور لونڈی اگر شادی شدہ نہ ہوں تو ان پر حد لاگو نہ

ہوگا۔ البتہ حاکم جو سزا مناسب سمجھے، وہ دے سکتا ہے۔ اگر وہ شادی شدہ ہوں تو دونوں کی سزائیکساں پچاس درے ہیں۔ اس میں اختلاف رائے کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد 'فاذا احصن' میں احصان کی جو شرط ہے اس لفظ کا مفہوم ہر ایک نے الگ الگ سمجھا ہے۔ چنانچہ جن اصحاب نے 'احصان' کے مفہوم میں نکاح اور اسلام دونوں کو شامل سمجھا ہے۔ بایں دلیل کہ اس حکم میں مسلمان کو خطاب ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ جو شادی شدہ نہ ہو اسے دُڑہ زنی کی سزا نہیں دی جائے گی اور جنہوں نے لفظ احصان کا مفہوم صرف 'اسلام' سمجھا انہوں نے اس کو حکم عام قرار دیا۔ جو شادی شدہ اور غیر شادی شدہ دونوں پر عائد ہوتا ہے اور یہی خیال قابل ترجیح ہے۔

حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ غلام اور لونڈی اگر مرتکب بدکاری ہوں تو انہیں جلاوطنی کی سزا نہ دی جائے کیونکہ معاشرہ میں 'غلام' کو ادنیٰ حیثیت کا فرد تصور کیا جاتا ہے اور (ایسی باتوں سے) عام طور پر اس کی رسوائی اتنی نہیں ہوتی جتنی آزاد شخص کی ہوتی ہے وجاہت کا انحصار نسبی شرافت اور خاندان پر ہے اور غلام اس سے بے بہرہ ہے۔

شافعیہ کے اقوال میں سے صحیح ترین قول یہ مانا گیا ہے کہ غلام اور لونڈی کا بدکاری کرنا اگر ثابت ہو جائے تو انہیں نصف سال کے لیے جلاوطن کر دیا جائے۔ کیونکہ بیشتر احکام تعزیری میں انہیں آزاد شخص کے مقابلہ میں نصف سزاملتی ہے۔

کیا آقا کو اپنے مملوک (لونڈی/غلام) پر حد نافذ کرنے کا حق ہے؟

شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ آقا کو حق ہے کہ وہ اپنے غلام یا لونڈی پر حد لاگو کرے۔ بشرطیکہ جرم (گواہوں سے) ثابت ہو گیا ہو یا آقا کے سامنے اس نے اقرار جرم کر لیا ہو۔ اندرین باب زنا، قذف (تہمت) اور شراب نوشی وغیرہ جملہ جرائم کی سزا عائد کرنے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ غلام آقا کی ملکیت شمار کیا جاتا ہے اور (نفاذ سزا کی صورت میں) اس کا اپنا ہی نقصان ہے کہ ان سے کوئی خدمت نہ لے سکے گا۔ لہذا یہ اللہ کے واسطے اپنے فائدے سے دست کش ہوتا ہے۔

حنابلہ کہتے ہیں اور مالکیہ کا بھی ایک قول یہی ہے کہ آقا کو سزا دینے کا حق ہے۔ لیکن چوری کی سزا اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔ آقا کو جائز نہیں ہے کہ حاکم وقت یا اس کے نائب کا حکم حاصل کئے بغیر چوری کی سزا میں ہاتھ کاٹ دے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ آقا کو یہ حق نہیں ہے کہ مستوجب حد ہونے کے کسی جرم میں وہ (اپنے غلام یا لونڈی) پر حد نافذ کر سکے۔ کیونکہ حدوں کا لاگو کرنا، بنیادی طور پر حاکم مجاز کے فرائض منصبی اور اس کی خصوصیات میں سے ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ شریعت نے حدود کے لاگو کرنے کا اختیار حاکم اعلیٰ یا اس کے نائب کو دیا ہے۔ کسی اور صاحب اقتدار کو جو سزا دینے پر قادر ہو یہ اختیار نہیں ہے تاکہ زمین میں فساد برپا نہ ہو اور معاشرہ میں طوائف الملوکی نہ پھیل جائے۔ محض اس لیے کہ رعایا کے افراد اپنے آپ کو ان لوگوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتے جو جاہلانہ بے جا حمایت کی بناء پر ایک دوسرے پر اپنے غیظ و غضب کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس طرح اسلام اور شریعت کے ساتھ تعاون نہیں ہو سکتا۔ اس کے برخلاف حاکم اعلیٰ کو بیشتر حالات میں اپنے اختیار کے بل پر ایک کو فائدہ پہنچانے اور دوسرے کو اس کے حق سے محروم کرنے سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ پھر یہ بھی ہے کہ حاکم ہی کو اپنے احکام کے نافذ کرانے کا حق ہے دوسرے کو اس کا اختیار نہیں ہے۔ چنانچہ اگر امام

وقت کسی شخص کو جرم کی پاداش میں خود قتل کر دے، خواہ اس میں زیادتی سرزد ہوئی ہو قانوناً مجرم کے رشتہ داروں کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اس کے عوض امام کو قتل کر دیں کیونکہ حاکم کو قانون کی حمایت حاصل ہے اور فوج و انتظامیہ (پولیس) کی طاقت اس کے ہاتھ میں ہے۔

ذمی پر نفاذ حد کا بیان

شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر ذمی (غیر مسلم جو اسلامی حکومت کی پناہ میں ہو) زنا کرے تو اس پر بھی مسلمانوں کی طرح حد لاگو ہوگی۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ اس پر حد لاگو نہ ہوگی کیونکہ وہ غیر محسن ہے (یعنی دین کی پناہ میں نہیں ہے) یہ برتری صرف مسلم کو حاصل ہے۔

یہودی پر نفاذ حد کا بیان

شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ یہودیوں پر بھی اسی طرح حد لاگو ہوگی جس طرح عیسائیوں اور ذمیوں پر اور پناہ گیروں پر عائد ہوتی ہے کیونکہ شریعت کے فروعی احکامات ان سب پر عائد ہوتے ہیں۔ خاص کر اس صورت میں جب کہ ان کا دعویٰ اسلامی حکام کے سامنے پیش ہو اور اس لیے بھی کہ اگر ان پر حد نافذ کر دی جائے تو قیامت کے دن ان کے عذاب میں تخفیف ہو جائے گی پھر یہ بھی ہے کہ سنت کی رو سے ثابت ہے کہ مدینہ کے یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے اپنا معاملہ پیش کیا اور حضور نے یہودی مرد اور یہودی عورت پر حد زنا کے نافذ کئے جانے کا حکم صادر فرمایا۔ چنانچہ عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے ”ان اليهود اتوا النبی ﷺ برجل وامرأة منهم قد زنيا. فقال: ماتجدون فی کتابکم؟ قالوا تسخیم وجوههما..... ای تسود ویخزیان قال کذبتم: ان فیہا الرجم فاتوا بالتوراة فاتلوها ان کنتم صادقین. فجاءوا بالتوراة، وجاءوا بقاری لهم فقراء حتی اذا انتھی الی موضع منها وضع یدہ علیہ، فقیل لہ: ارفع یدک فرفع یدہ فاذا ہی تلوح فقال، اوقالوا: یا محمد ان فیہا الرجم ولكننا کنا لتکاتم بیننا فامر بہما رسول اللہ ﷺ فرجما، قال: فلقد رایته ینخبا علیہا ویقیہا الحجارة بنفسہ ومعنی ینخبا ینحنی“ (یعنی یہودی اپنوں میں سے ایک مرد اور ایک عورت کو جو زنا کے مرتکب ہوئے تھے لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے۔ آپ نے فرمایا ”بھلا تمہاری کتاب (تورات) میں اس کی بابت کیا حکم ہے؟ انھوں نے کہا کہ ان کے چہروں کی تخیم کی جائے گی یعنی منہ کالا کیا جائے گا اور سرزنش کی جائے۔ حضور نے فرمایا، تم نے غلط بتایا ہے کیونکہ اس میں سنگساری کا حکم ہے“ اگر سچے ہو تو تورات لاؤ اور اسے پڑھ کر دیکھو۔ چنانچہ وہ لوگ تورات کو اور ایک پڑھنے والے کو لائے۔ اس شخص نے تورات کو پڑھا اور جب ایک مقام پر پہنچا (جہاں سزائے زنا کا حکم درج تھا) اس نے اپنا ہاتھ اس جگہ رکھ دیا۔ اور جب کہا گیا کہ ہاتھ ہٹاؤ تو اس نے ہاتھ ہٹایا جو کچھ ہاتھ کے نیچے اس نے چھپا رکھا تھا وہ کھل گیا۔ تب اس نے یا ان سب نے کہا ”یا محمد“ اس میں واقعی سنگسار کرنے کا حکم ہے لیکن ہم ایک دوسرے سے یہ حکم چھپاتے تھے۔ آخر رسول اللہ ﷺ کے حکم سے انھیں سنگسار کیا گیا۔ راوی کہتے

ہیں کہ میں نے اس مرد کو دیکھا کہ وہ عورت پر جھک کر اسے چھپا رہا تھا اور اسے پتھروں سے بچا رہا تھا۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ”رجم رسول اللہ ﷺ رجلاً من اسلم ورجلاً من اليهود وامراً“ (یعنی رسول اللہ ﷺ نے اسلم کے ایک شخص کو اور ایک یہودی مرد اور ایک یہودی عورت کو سنگسار کیا) اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ”مر علی النبی ﷺ یہودی محمّم مجلود فدعاهم فقال: اھکذا تجدون حد الزنا فی کتابکم؟ قالو: نعم، فدعا رجلاً من علمائهم فقال: انشدک باللہ الذی انزل التوراة علی موسیٰ اھکذا تجدون حد الزنا فی کتابکم؟ قال: لا ولولا انک نشدتنی بهذا لم اخبرک بحد الرجم، ولكن کثر فی اشرافنا، وکنا اذا اخذنا الشریف ترکناه، واذا اخذنا الضعیف اقمنا علیہ الحد، فقلنا، تعالوا فلنجتمع علی شیء نقیمہ علی الشریف والوضیع، فجعلنا التحمیم والجلد مکان الرجم. فقال النبی ﷺ اللّٰھم انی اول من احیا امرک اذا اماتوہ فامر بہ فرجم فانزل اللہ عزوجل ”یا ایہا الرسول لا یحزنک الذین یسارعون فی الکفر من الذین قالوا آمنا بافواھم الی قولہ: ان اوتیم هذا فخذوہ“ (یعنی رسول اللہ ﷺ نے دو چار ہوئے جس پر سیاہی ملی ہوئی تھی اور اسے سرزنش کی گئی تھی۔ آپ نے یہودیوں کو بلایا اور دریافت فرمایا کہ کیا تمہاری کتاب (تورات) میں زنا کی یہی سزا ہے؟ انھوں نے کہا جی ہاں، آپ نے ان کے ایک عالم کو طلب فرمایا اور اس سے کہا کہ میں تمہیں اس معبود کا حلف دلاتا ہوں جس نے موسیٰ پر تورات نازل فرمائی۔ سچ بتانا کہ کیا تمہاری کتاب میں زنا کی سزا یہی ہے۔ اس شخص نے کہا جی نہیں اگر آپ ہمیں ایسی سخت قسم نہ دلاتے تو ہم سزائے سنگساری کا جو حکم ہے آپ کو ہرگز نہ بتاتے۔ ہمارے شرفاء میں زنا بکثرت ہونے لگا سو اگر ہم کسی شریف آدمی کو اس میں پکڑ لیتے تو اسے چھوڑ دیتے تھے اور اگر کمزور آدمی پکڑا جاتا تو اس پر حد نافذ کر دیتے تھے۔ پھر ہم سب نے مل کر یہ کہا کہ ایک ایسی سزا مقرر کر لیں جو ہر ادنیٰ و اعلیٰ پر لاگو کی جاسکے تو ہم نے سنگسار کرنے کی بجائے منہ کالا کر کے درے لگانے کی سزا مقرر کر لی۔ تب آنحضرت ﷺ نے فرمایا اے اللہ میں پہلا شخص ہوں جو تیرے اس حکم کو جسے ان لوگوں نے ختم کر دیا تھا پھر سے زندہ کر رہا ہوں۔ چنانچہ آپ نے سنگساری کا حکم دیا اور اس پر عمل درآمد ہوا۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی جس کا مطلب یہ ہے کہ ”اے پیغمبر ان لوگوں کی اس حرکت پر غمزدہ نہ ہو جو کفر کی باتوں میں پیش دستی کرتے ہیں۔ یہ لوگ منہ سے تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے لیکن دل ان کے بے ایمان ہیں، ان میں وہ یہودی ہیں جو جھوٹی باتیں سنتے ہیں اور دوسروں کے کہنے میں آ جاتے ہیں حالانکہ جو باتیں وہ کہتے ہیں ان کا تم سے کوئی تعلق نہیں، بات کو جا بجا سے الٹ پلٹ کر بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنے آدمیوں سے کہتے ہیں کہ پیغمبر کے پاس جاؤ۔ اگر یہی یہود جیسی باتیں وہ کہیں تو مان جاؤ اور اگر کچھ اور کہیں تو اس کو چھوڑ دو۔“

مطلب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ محمد (ﷺ) کے پاس جاؤ اگر وہ (سزائے زنا کے بارے میں) منہ کالا کرنے اور کوڑے مارنے کو کہیں تو مان لو، اور اگر وہ سنگسار کرنے کو کہیں تو چھوڑ دو تب یہ آیت نازل ہوئی ”من لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ہم الکافرون“ (یعنی جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ فرمان کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ کافر ہیں) پھر ارشاد باری تعالیٰ ہے ”ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ہم الظالمون“ (یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ فرمان

کے مطابق فیصلہ نہ دیں وہ ظالم ہیں) نیز ارشاد باری ہے ”من لم يحكم بما انزل الله فاولئك هم الفاسقون“ (یعنی جو لوگ اللہ کے نازل فرمودہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ دیں وہ گنہگار ہیں)۔ یہ آیت تمام منکران خدا کے لیے ہے، اسے احمد، مسلم اور ابوداؤد نے روایت کیا۔ ان احادیث سے ثابت ہے کہ ”ذمی“ کو بھی وہی شرعی سزا دی جائے گی جو مسلمانوں کو دی جاتی ہے۔

حنفیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ یہودی، عیسائی، ذمی اور پناہ گیر پر حد لاگو نہ ہوگی۔ ان اصحاب کے نزدیک ”محسن“ قرار دیئے جانے کے لیے مسلمان ہونا شرط ہے۔ پس غیر مسلم چونکہ ”محسن“ نہیں ہے لہذا اسے سنگسار نہیں کیا جائے گا۔ البتہ اسے درہ زنی کی سزا دی جائے گی۔ پھر یہ ہے کہ سنگساری کی سزا گناہ سے پاک کرنے کے لیے ہوتی ہے اور ذمی یا غیر مسلم کو گناہ سے پاک نہیں کیا جاسکتا بلکہ وہ کبھی پاک نہیں ہو سکتا۔ سوا اس کے کہ اسے نار جہنم میں جلایا جائے۔ پھر یہ کہ شریعت کے فروعی احکام غیر مسلم پر عائد نہیں ہوتے۔ سب سے پہلے انھیں دین کے ابتدائی بنیادی امور کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ نیز حضرت ابن عمرؓ سے یہ حدیث مرفوعاً و موقوفاً مروی ہے۔ ”من اشرك بالله فليس بمحسن“ (یعنی جو مشرک ہے وہ ”محسن“ نہیں ہے) دارقطنی وغیرہ کے نزدیک اس حدیث کو ”موقوف“ قرار دینا قابل ترجیح ہے۔ اسحاق بن راہویہ نے اپنے مسند میں دو طرح سے اس کا استخراج فرمایا ہے۔

واضح ہو کہ حنفیہ اور مالکیہ نے ان احادیث کی بابت جن سے غیر مسلم کو سنگسار کرنے کی اجازت پائی جاتی ہے، یہ موقف اختیار فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل کتاب کو سنگسار کئے جانے کا حکم جو دیا تھا وہ خود ان کی کتاب تورات کی بناء پر تھا۔ اسلام کی بناء پر نہ تھا اور یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ میں آنے کے ابتدائی اوقات میں پیش آیا تھا۔ اس وقت خود آنحضرت ﷺ کو بھی تورات کے احکام پر چلنے کا حکم تھا۔ بعد میں یہ حکم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے منسوخ ہو گیا۔ ”واللاتي يا تين الفاحشة من نسائكم.....“ (یعنی تم مسلمانوں کی عورتیں جب بڑے گناہ کی مرتکب ہوں تو.....) غرض سزا کا حکم جو اس آیت شریفہ میں آیا ہے وہ پہلا حکم تھا جو صرف مسلمان عورتوں کے متعلق ہے۔

امام شوکانی کہتے ہیں کہ یہ جواب ہٹ دھرمی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اپنے فعل کو احادیث متعلقہ کے مقابلہ میں رکھنا عجیب بات ہے۔ آنحضرت ﷺ کے تشریف آوری مدینہ کے ابتدائی دور میں یہ ارشاد فرمانا اسے حکم شریعت قرار دینے کے منافی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی شریعت میں رکھا اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی توثیق فرمادی۔ سابقہ شریعتوں کے ایسے تمام احکامات جو احکام اسلامی سے ہم آہنگ ہیں اور جنہیں باطل کرنے کا کوئی حکم ہماری شریعت میں نہیں آیا۔ ان احکامات کو برقرار رکھنے کا اس کے سوا کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ بہر حال ان کے درمیان وحی الہی کے مطابق فیصلہ فرمانے پر مامور تھے اور اہل کتاب کی اپنی خواہش کے مطابق انہیں فیصلہ کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں اس کی تصریح موجود ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ وہ لوگ (اس بارے میں) آنحضرت ﷺ کا حکم دریافت کرنے کو آئے تھے۔ اس شریعت کے احکام پوچھنے نہیں آئے تھے۔ پس آپؐ نے انہیں اپنی شریعت کے مطابق حکم دیا اور ساتھ ہی یہ بتا دیا کہ یہ حکم جس طرح اسلام میں ہے اسی طرح ان کی شریعت میں بھی ثابت ہے۔ پس یہ نہیں کہا جاسکتا کہ حضورؐ نے اپنی شریعت کے مخالف ہونے کے باوجود ان کی شرع کے مطابق فیصلہ دیا کیونکہ یہ جائز نہیں

ہے کہ وہ حکم جو حضور دین وہ حکم حضور کے نزدیک منسوخ ہو۔ آپ کا مقصد صرف یہ تھا کہ یہودیوں پر اتمام حجت ہو جائے۔

مسلمانوں کا اپنے ناموس کی پاسداری کرنے کا بیان

درحقیقت اسلام آغاز ہی سے بدکاری کا دشمن رہا ہے اور اس نے لوگوں کو عفت، پاکدامنی اور پاس ناموس کی تلقین فرمائی ہے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے۔ ”عفو اتعف نساً وکم“ (یعنی تم نیک چلن رہو، تو تمہاری عورتیں بھی پاک دامن رہیں گی) نیز آپ نے ایسی عورتوں سے شادی کرنے کی ترغیب دی ہے۔ جو خود کو سنبھال کر رکھیں۔ نیک طینت پاک دامن اور گناہ سے بچنے والی ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”فالصالحات قانتات حافظات للغیب بما حفظ الله“ (یعنی نیک عورتیں اطاعت گزار ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق جن امور کے تحفظ کا حکم ہے (خاوند کی) نظروں سے اوجھل ہو کر بھی اس کی حفاظت کرتی ہیں)۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”ومن لم يستطع منکم طولا ان ینکح المحصنات المؤمنات“ (یعنی جس شخص کو پاک دامن معزز مسلمان عورتوں سے شادی کا مقدور نہ ہو.....) نیز آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے ”خیر النساء الودود الولود التي اذا نظرت اليها سرتک و اذا امرتها اطاعتک و اذا غبت عنها حفظتک فی مالک و عرضها“ (یعنی بہترین عورت وہ ہے جو محبت کرنے والی اور اولاد پیدا کرنے والی ہو اور ایسی ہو کہ جب تم اسے دیکھو تو وہ تمہیں مسرت بخش دے اور جب کسی بات کو کہو تو اسے بجالائے اور تمہارے پیچھے بھی تمہارے مال اور اپنی عزت کو بچا کر رکھے)۔

واضح ہو کہ جس وقت حادثہ افاک (یعنی حضرت عائشہ پر الزام تراشی کا واقعہ) پیش آیا اور لوگوں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر جھوٹا الزام لگایا، حالانکہ وہ پاک اور بے گناہ تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان کی بے گناہی بیان فرمائی۔ اور سورہ نور کی پندرہ آیتوں میں ان پر لگائے گئے جھوٹے الزام کی تردید فرمائی تاکہ ان کے خلاف الزامات دھل جائیں اور ناپسندیدہ گناہوں کے جھوٹے الزام سے ان کا بری ہونا اہل دنیا پر ثابت ہو جائے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی متعدد آیات میں سیدہ مریم مادر عیسیٰ علیہ السلام کو بدکاری کی تہمت سے بری فرمایا ”ومریم ابنة عمران التي احصنت فرجها“ (یعنی عمران کی بیٹی مریم وہ ہے جس نے اپنے وجود کو آلودگی گناہ سے محفوظ رکھا)۔ اور فرمایا ”والتي احصنت فرجها فنمخنا فيه من روحنا“ (یعنی مریم وہ خاتون ہے جس نے اپنی شرمگاہ کو گناہ سے بچایا اور ہم نے اس میں اپنی جانب سے روح پھونک دی) نیز ارشاد ہے ”یا مریم ان الله اصطفاک وطهرک واصطفاک علی نساء العالمین“ (یعنی اے مریم بلاشبہ اللہ نے تجھے برگزیدگی عطا فرمائی اور پاک دامن رکھا اور تمام جہان کی عورتوں پر تجھے امتیاز بخشا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو اس الزام سے بری فرمایا جو بنی اسرائیل نے ان پر لگایا تھا۔ ”فبراه الله مما قالوا وکان عند الله وجیهاً“ (اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے الزام سے کہ ان کو فتق کی بیماری ہے بری فرمایا اور وہ اللہ کے نزدیک ذی وجاہت تھے)۔ یہاں تک کہ وہ قوم کی نگاہوں میں بے داغ ہو جائیں اور ان کا شرف باقی رہے۔

واضح ہو کہ آنحضرت ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ ایک مرد اپنی بیوی یا اہل خانہ میں سے کسی میں کوئی ناخوشگوار بات دیکھے یا ان کا رویہ مشکوک پائے تو وہ خاموش رہے۔ برائی کو دیکھ کر خاموشی اختیار کر لینا بدترین خصلت ہے۔

اس سے دنیا میں مرد کا وقار ضائع ہو جاتا ہے اور آخرت میں سخت عذاب کا سامنا ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے ”لایدخل الجنة دیوث“ (یعنی دیوث آدمی جنت میں داخل نہ ہوگا)۔ دیوث وہ شخص ہے جو اپنے ناموس کے بارے میں اپنی عزت اور اپنے وقار کو خیر باد کہہ چکا ہو اور اسے اس کی پروا نہ رہی ہو کہ اس کے گھر میں کون غیر مرد آتا جاتا ہے اسے اپنی بیوی اور بیٹیوں کے رویے پر شرم نہیں آتی بلکہ اپنی رسوائی پر خاموش رہتا ہے اور اس گھٹیا پن کو برداشت کر کے اپنے کنبہ میں اس برائی کو جاری رہنے دیتا ہے۔ قیامت کے روز ایسا شخص اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ قابل نفرت ہوگا اور جب تک اس میں یہ مرض (سخت عیب) باقی ہے اس کی طاعت و عبادت اور اس کے نیک کام جو اللہ کی خوشنودی کے لیے انجام دے گا، کچھ کام نہ آئیں گے۔

احمد سے بالفاظ نسائی و حاکم مروی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کی اسناد صحیح ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ثلاثة قد حرم الله عليهم الجنة: مدمن الخمر، والعاق لوالديه، والديوث الذي يقرفى اهله النخبث“ (یعنی تین قسم کے لوگ ایسے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے جنت حرام کر دی ہے: دائم الخمر، والدین کا نافرمان اور دیوث جو اپنے گھر والوں میں خباثت جاری رکھنے کی اجازت دے دے)۔

طبرانی سے بسند صحیح مروی ہے کہ حافظ منذری نے فرمایا کہ میں اس روایت کی صحت میں کوئی اعتراض نہیں پاتا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ثلاثة لا يدخلون الجنة ابداً: الديوث والرجلة من النساء ومدمن الخمر“ (یعنی تین اشخاص ایسے ہیں جو کبھی جنت میں نہیں جائیں گے۔ دیوث، مردوں کا روپ دھارنے والی عورت اور دائم الخمر)۔ لوگوں نے عرض کیا ”یا رسول اللہ ﷺ مدمن الخمر (یعنی دائم الخمر) کا مطلب تو ہم جانتے ہیں۔ لیکن دیوث کیا ہے؟“ فرمایا ”الذي لا يسأل بمن يدخل على اهله“ (یعنی دیوث وہ ہے جو اس بات کی پروا نہ کرے کہ کون اس کے اہل خانہ کے پاس آتا ہے؟) پھر عرض کیا گیا کہ الرجل من النساء سے کیا مراد ہے؟ فرمایا ”التي تشبه بالرجال“ (یعنی وہ عورت جو مردوں سے مشابہت اختیار کرے)۔

یہ تمام باتیں اور ان کے علاوہ اور بھی خرابیاں جن کا ذکر طوالت کے باعث اور لوگوں کی اکتاہٹ کے اندیشے سے نظر انداز کر دیا گیا، اس امر کا ثبوت ہیں کہ بدکاری کا ارتکاب تمام برائیوں میں سب سے برا اور سب سے بڑا جرم ہے۔ جس کا خراب اثر افراد، جماعت اور خاندان پر پڑتا ہے۔ اور مال کے ضیاع، بے ہودگی کے انتشار اور قتل کا موجب ہو جاتا ہے۔ اس سے معاشرہ میں فساد اور مسلمانوں کی صفوں میں بغض و عداوت پھوٹ پڑتی ہے۔ ان کی صلاحیتیں تلف ہو جاتی ہیں۔ کاروبار میں زیاں ہوتا ہے اور انسانی شرف اس کی بزرگی اور حوصلہ مندی کی بجائے ذلت، حقارت، کم حوصلگی اور پست ہمتی جنم لیتی ہے اور انسان پامردی کی لذت سے نا آشنا ہو کر رہ جاتا ہے۔ غرض کہا جاسکتا ہے کہ زنا کاری تمام خرابیوں کی جڑ اور برائیوں کا سرچشمہ ہے جس سے معاشرہ تباہ اور اس کی بنیاد متزلزل ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں کیا عجب ہے اگر شریعت اسلامیہ نے اس برائی کی بیخ کنی کی طرف خاص توجہ مبذول فرمائی اور (نہ صرف زنا بلکہ) اس کے جملہ محرکات کو بھی حرام قرار دیا۔ مثلاً بد نظری، غیر عورتوں کو ہاتھ لگانا، ان کی آواز (گانا وغیرہ) سننا یا ان کے ساتھ تجلیہ کرنا وغیرہ تاکہ انسان کو اس گناہ میں مبتلا ہونے (اور اس کے برے نتائج سے) بچایا جاسکے۔

اسی طرح یہ بھی عجیب بات نہیں کہ شریعت اسلامیہ نے اس کی سزا بھی ایسی رکھی ہے کہ اس کا سد باب کر سکے۔ یعنی کنوارے کو سو درے لگانا اور شادی شدہ کو پتھر مار کر ہلاک کرنا۔ پھر ان کے ساتھ نرمی اور مہربانی کا برتاؤ کرنے سے منع فرمایا۔ نیز لعان کا حکم دیا، تہمت تراشی کو حرام قرار دیا۔ اور جھوٹا الزام لگانے والے کی سزا اسی درے تجویز فرمائی تاکہ لوگوں کی آبرو بچے اور معاشرہ میں امن، سلامتی، خوشی، بخشتی اور اطمینان کا دور دورہ ہو۔

یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیے کہ زمین کی تخلیق اور حضرت آدم علیہ السلام کے اس میں آباد ہونے کے بعد قتل کا سب سے پہلا جرم جو ہوا اس کا موجب بھی یہی جنسی خواہش اور عورت کا وجود تھا۔ قابیل اور ہابیل (فرزند ان آدم) کے قصے کی بناء یہی ہے۔

ضروری تصریحات

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے ”لا تاسخدا کم بہما رافۃ فی دین اللہ“ (یعنی احکام الہی کے نفاذ میں ان مجرموں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ نہ کرنا)۔ اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں مفسرین کہتے ہیں کہ بہت ممکن ہے اس سے مراد یہ ہو کہ مبادا لوگ ایسے شخص کے ساتھ نرمی کر کے حد (سزائے زنا) کو ختم کرنے یا اس میں تخفیف کا ارادہ کریں۔ مقصد یہ ہے کہ احکام الہی کو ختم نہ کیا جائے اور شفقت و نرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس حکم پر عمل درآمد ترک نہ کیا جائے۔ مجاہد، عکرمہ اور سعید بن جبیر نے اس حکم سے یہ توجیہ فرمائی ہے،

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس حکم کا مقصد یہ ہے کہ نرمی کو پیش نظر رکھتے ہوئے درہ زنی کو ہلکا نہ کیا جائے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ ممکن ہے اس حکم میں دونوں مقاصد پیش نظر ہوں۔ (یعنی نہ سزا کی مقدار کم کی جائے اور نہ اس کے نفاذ میں نرمی سے کام لیا جائے)۔ بظاہر اول الذکر توجیہ بہتر ہے کیونکہ آیت میں صرف درہ زنی کا حکم دیا گیا ہے، اس کی کیفیت نہیں بتائی گئی۔ لہذا واجب ہے کہ بعد کی آیت کا مفہوم اسی کے متعلق ہو۔ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ پر نظر رکھنا کافی ہے، کہ حضور نے فرمایا ”لو سرق فاطمہ بنت محمد لقطعت یدھا“ (یعنی اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ کاٹا جاتا، مطلب یہ ہے کہ اس پر بھی رحم نہ کیا جاتا)۔ پھر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اپنے ارشاد میں ”فی دین اللہ“ کہہ کہ اس امر کی تنبیہ فرمائی ہے کہ جب شرعاً کسی امر کو واجب قرار دے دیا جائے تو منشا حکم کے خلاف اس میں نرمی برتنا درست نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ”ان کنتم تو منون باللہ والیوم الآخر“ (یعنی اگر تم کو اللہ اور آخرت پر ایمان ہے تو اس حکم کی پوری پوری تعمیل کرو)۔ انسان کو جوش دلانے اور احکام دینی کے معاملہ میں شدت پسند ہونے کی غرض سے ہے۔ علامہ جبائی فرماتے ہیں کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ اگر تم میں ایمان ہے تو نفاذ حد سے پہلو تہی نہ کرو۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ واجبات الہیہ کی بجا آوری ایمان کا ایک جزو ہے یہ مرحلہ کے نظریہ کے خلاف ہے (کہ وہ ادائے فریضہ کو ایمان کا جزو قرار نہیں دیتے) ان کے خیال کی تردید اس طرح ہوتی ہے کہ (نفاذ حد میں) نرمی سے کام لینا اسی حالت میں ممکن ہے جب انسان یہ خیال کرے کہ سزا کا نہ دینا بہتر ہے، جیسا کہ بعض نادانوں کا خیال ہے۔ حالانکہ یہ تصور بجائے خود دین سے

انکار کرنا ہے اور اس غلط تصور کے باعث انسان دین سے خارج ہو جاتا ہے۔ حدیث میں ہے ”یؤتی بوال نقص من الحد سوطاً، فيقال له: لم فعلت ذالك؟ فيقول: رحمة لعبادك، فيقال له انت ارحم بهم مني، فيؤمر به الى النار، وينتهي بمن زاد سوطاً، فيقال له لم فعلت ذالك؟ فيقول: لينتهوا عن معاصيك، فيقول انت احكم بهم مني، فيؤمر به الى النار“ (یعنی قیامت کے روز وہ حاکم اللہ کے سامنے لایا جائے گا جس نے حد کی تعداد سے ضرب کم ماری تو اس سے سوال ہوگا کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ وہ کہے گا کہ ”تیرے بندوں پر رحم کھا کر۔ تب اللہ کہے گا کہ تو میرے بندوں پر مجھ سے زیادہ مہربان ہے؟ پھر اسے دوزخ میں لے جانے کا حکم ہوگا۔ اسی طرح اس شخص کو بلایا جائے گا جس نے (حد کی تعداد سے) ایک درہ زیادہ مارا تھا۔ اس سے پوچھا جائے گا کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ وہ کہے گا اس لیے کہ تیری نافرمانی سے باز رہیں۔ ارشاد ہوگا کہ تو ان کا فیصلہ مجھ سے بہتر کرنے والا ہے۔ پھر اسے بھی دوزخ میں بھیج دیا جائے گا۔)

مرتکب زنا کا پردہ ڈھکنے کا بیان

تمام علماء اس پر متفق اللفظ ہیں کہ جس جرم کی اطلاع حاکم کو نہ دی گئی ہو اس کی پاداش میں حد (سزائے شرعی) عائد نہیں ہوتی۔ اور وہ جرم جس کی اطلاع تو حاکم کو دی گئی ہو لیکن مجرم کے اقرار یا گواہوں کی شہادت سے وہ جرم پایہ ثبوت کو نہیں پہنچا تو اس پر بھی حد عائد نہ ہوگی۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”لو كنت راجماً احداً بغير بينة رجمت فلانة، فقد ظهر منها الريبة في منطقتها وهيتها ومن يدخل عليها“ (یعنی اگر میں بغیر ثبوت (شہادت یا اقرار کے) کسی کو سنگسار کرتا تو فلاں عورت کو کرتا۔ کیونکہ اس کی گفتگو، وضع قطع اور اس شخص کے بارے میں جو اس کے پاس آتا جاتا تھا اس کا جھوٹ ظاہر ہو گیا ہے۔ اس حدیث کے راوی ابن ماجہ ہیں اور الفاظ ”ظهر منه الريبة“ کے معنی یہ ہیں کہ وہ بری بری باتیں کرتی ہے لیکن اس کا ثبوت شہادت یا اس کے اقرار سے ملتا۔ ہلال بن امیہ کے واقعہ میں بھی یہ ہوا کہ جب انھوں نے اپنی بیوی کے ساتھ لعان کر لیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”ان اتت به على الصفة الفلانية فهو لشريك بن سمحاء، وان اتت به على الصفة الفلانية فهو لزوجه هلال بن امية“ (یعنی اس عورت کا جو بچہ پیدا ہوا اگر اس میں فلاں بات ہو تو وہ بچہ شریک بن سمحاء کا ہے اور اگر اس میں فلاں بات ہو تو وہ اس کے خاوند ہلال بن امیہ کا ہے) پھر جب اس عورت نے مکروہ صورت والا بچہ جنا تو حضور نے فرمایا ”لولا الايمان لكان لى، ولها شان“ (یعنی اگر قسمیں یا لعان نہ ہوا ہوتا تو میں اس کے بارے میں کچھ فیصلہ کر سکتا)۔

ائمہ فقہ اس بات پر متفق اللفظ ہیں کہ اگر کوئی شخص حاکم کے سامنے اپنے مستوجب حد ہونے کا اقرار کرے لیکن تفصیل (جرم) نہ بتائے تو اس جرم کی تفصیل و توضیح کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا اور اس پر حد لاگو نہ ہوگی درآنحالیکہ جرم ثابت اور متعین نہ ہوا ہو۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ”كنت عند النبي ﷺ فبجائه رجل فقال: يا رسول الله اني اصببت حدا فاقمه علي، فلم يسألني، وقال: حضرت الصلوة، فصلى مع النبي صلى الله عليه وسلم، فلما قضى النبي صلى الله عليه وسلم قام اليه الرجل، فقال: يا رسول الله اني

اصبت حياء فاقم في كتاب الله قال: اليس قد صليت معنا؟ قال: نعم، قال فان الله قد غفر لك ذنبك، اوحدك“ (یعنی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت حاضر تھا کہ ایک شخص حضور کے پاس آیا اور کہنے لگا یا رسول اللہ میں ”حد“ کا سزاوار ہو گیا ہوں آپ مجھ پر حد لاگو فرمائیے حضور نے پھر اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اتنے میں نماز کھڑی ہو گئی اور اس شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز ادا کی پھر جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو وہ شخص آپ کے سامنے کھڑا ہوا اور کہنے لگا یا رسول اللہ میں حد کا سزاوار ہوں کتاب اللہ کے مطابق مجھ پر حد لاگو فرمائیے، فرمایا تم نے ہمارے ساتھ نماز تو پڑھی ہے؟ اس نے کہا ”جی ہاں“ فرمایا پس اللہ تعالیٰ نے تمہارا گناہ معاف کر دیا یا فرمایا کہ تمہاری سزا معاف فرمادی) امام نووی نے اپنی شرح مسلم میں بتایا ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص سے کوئی گناہ قابل تعزیر سرزد ہوا اور بظاہر وہ گناہ صغیرہ تھا۔ نماز اس کا کفارہ ہو گئی۔ اگر وہ گناہ مستوجب حد ہوتا تو نماز پڑھنے سے حد ساقط نہ ہوتی، علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ وہ گناہ جو مستوجب حد ہوں، نماز پڑھنے سے ان کی حدیں ساقط نہیں ہوتیں۔ قاضی عیاض نے بعض ائمہ فقہاء کا یہ قول بیان کیا ہے حدیث مذکور میں ”حد“ کا لفظ معنی مشہور ہی میں آیا ہے، لیکن اس شخص پر حد نافذ نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ اس شخص نے گناہ مستوجب حد کی تفصیل نہیں بتائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی بابت دریافت نہ فرمایا تا کہ اس کے گناہ پر پردہ پڑا رہے بلکہ مستحب یہ ہے کہ اس شخص کو اس کی تلقین کی جائے کیونکہ اسلام نے آبرومندی کے تحفظ کا حکم دیا ہے تاکہ معاشرہ میں برائی کا چرچا نہ ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ”من ستر عورة مسلم، ستر الله عورته يوم القيامة“ (یعنی جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرتا ہے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بھی اس کی پردہ پوشی فرماتا ہے)۔ نیز ارشاد ہے ”من راي عورة فسترها كان كمن احياء مودودة“ (یعنی جس نے کسی کی بری بات کو دیکھ کر اس پر پردہ ڈال دیا وہ شخص ایسا ہے جیسے کسی نے زندہ دفن کی ہوئی بچی کو زندہ کر دیا)۔ اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ معاذ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور ان کے سامنے اپنی بدکاری کا اعتراف کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چار بار ان کی بات سے اعراض فرمایا کہ بہت ممکن ہے وہ اپنے اقرار جرم سے پھر جائیں اور اپنی خطا پر پردہ ڈال دیں اور آئندہ اس کا رخ نہ کریں۔

سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ مجھے معلوم ہوا کہ ایک شخص جسے ہزال کہتے تھے اور تازہ اسلام لایا تھا۔ ایک شخص کی بدکاری کی شکایت کرنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا ہے۔ اس وقت تک حد قذف (یعنی تہمت لگانے کی سزا) کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ حضور نے اس شخص سے کہا، ”یا ہزال لو سترته بردائك كان خيرا لك“ (یعنی اے ہزال! اگر تو اسے اپنی چادر سے ڈھک لیتا تو اچھا ہوتا) چادر میں ڈھک رکھنے سے مراد اس گناہ کا چرچا کرنے سے باز رہنا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے ”من ستر مسلماً ستره الله في الدنيا والآخرة“ (یعنی جو شخص کسی مسلمان کا عیب چھپاتا ہے اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی پردہ پوشی فرماتا ہے)۔

حاکم اور بیہوشی نے اپنی کتب صحاح میں اخراج فرمایا ہے کہ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ منورہ سے چل کر عقبہ بن عامر -- حاکم مصر -- کے پاس آئے۔ عقبہ باہر آکر ان سے بغلگیر ہوئے اور دریافت کیا کہ اے ابویوب کیسے آنا ہوا؟ انہوں نے کہا کہ میں نے مسلمان کا گناہ چھپا دینے کی بابت ایک حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے، اب میرے اور آپ کے سوا کوئی ایسا نہیں رہا جس نے یہ حدیث حضورؐ سے سنی ہو حضرت عقبہ نے کہا کہ ہاں! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا من ستر مئوماً فی الدنیا علی عورة سترہ اللہ یوم القیامة (یعنی جو شخص دنیا میں کسی مسلمان کے عیب کو چھپا دے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کے گناہ پر پردہ ڈال دے گا)۔ حضرت ابویوب نے فرمایا آپ نے سچ کہا اس کے بعد مدینہ واپس آ گئے۔

واضح ہو کہ اگر کسی شخص نے اپنی آنکھ سے کسی کا ارتکاب جرم دیکھا ہے تو اسے اختیار ہے کہ وہ رضائے الہی کے لئے اور اللہ کے احکام تعزیری اور اس کی منع کی ہوئی باتوں کے احترام کی غرض سے اس جرم کی گواہی دے جیسا کہ حدیث میں وارد ہے کہ "لحد یقام فی الارض خیر لاهل الارض من ان یمطروا اربعین صباحاً" (یعنی زمین پر حد کا نافذ کرنا اہل زمین کے لیے چالیس دن صبح کو باران رحمت نازل کرنے سے زیادہ بہتر ہے) یا پھر وہ شخص چاہے تو بدیں خیال کہ اس کے مسلمان بھائی کے گناہ پر پردہ پڑا رہے اور گناہ کا چرچا نہ ہو اس کی بابت شہادت دینے سے باز رہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "من ستر علی اخیه المسلم ستر اللہ علیہ فی الآخرة" (یعنی جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے گناہ کو چھپا دے اللہ تعالیٰ آخرت میں اس کی پردہ پوشی کرے گا) اور اس خیال سے بھی کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کے بندوں کا عیب ظاہر نہ ہو۔ وہ برائی کے چرچے اور مسلمانوں کی رسوائی کو ناپسند فرماتا ہے بلکہ وہ ایسی باتوں کو پھیلانے، اس کا چرچا کرنے، اس کا ذکر کرنے اور اسے شہرت دینے کے رجحان کو قابل نفرت قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشة فی الذین آمنوا، لہم عذاب الیم فی الدنیا والآخرة" (یعنی جو لوگ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں گناہ کا چرچا ہو، ان کے لیے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے)۔

مسلمان کا اپنے گناہ کو چھپانا

واضح ہو کہ اسلام نے ہر مسلمان پر واجب کیا ہے کہ جب اس سے اس طرح کے کسی گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہو جائے تو آئندہ کے لیے اس سے قطعی طور پر باز آجائے اور اللہ کی جانب میں اس سے توبہ کرے، اپنے اس جرم پر پردہ ڈالے، لوگوں کے سامنے اس کا ذکر کر کے اپنے آپ کو ذلیل نہ کرے اور علانیہ اپنے گناہ کا اظہار نہ کرے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے "ایہا الناس قد آن لکم ان تنتھوا عن حدود اللہ، من اصاب شیئاً من ہذہ القاذورات فلیستر بستر اللہ، فانہ من یدلنا صفحتہ نقم علیہ کتاب اللہ تعالیٰ" (یعنی لوگو! تمہارے ساتھ یہ مہربانی کی جاتی ہے کہ اگر تم ان گندی باتوں میں سے کسی سے دوچار ہو جاؤ تو چاہیے کہ اس پر اللہ کا پردہ ڈال رکھو۔ اگر وہ گناہ کھل کر سامنے آیا تو کتاب اللہ کا جو حکم ہے وہ اس پر نافذ ہو جائے گا)۔ یہ حکم اس لیے ہے کہ (گناہ کر کے) اس کا چرچا کرنا، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر فخر کرنا اور اس کے احکام کی توہین ہے اور معاشرہ میں خرابی اور بگاڑ اور افراد قوم میں بے حیائی پھیلانے کا موجب ہے۔ خطا کار میں اتنی غیرت تو باقی رہنی چاہیے کہ وہ اپنے عیب کو دوسروں سے بیان کرنے سے ہچکچائے اور اپنے ساتھیوں کے درمیان اپنے گناہ کا ذکر کرنے سے شرمائے اور اللہ سے حیا کرنے کا برقع اتار کر نہ پھینک دے۔ اگر انسان خدا اور بندوں کے سامنے بے شرمی

اختیار کر لے تو یہ خود اس کے اور عوام الناس کے لیے خطرناک حرکت ہوگی کیونکہ (شرم و حیا) کی عزیز ترین متاع حیات سے وہ محروم ہو جائے گا۔ گناہ کا چرچا کرنا، پھیلانا دوسروں کو بدی پراکسانا اور پھر اس میں مبتلا کر دینا ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی مریض کسی تندرست کے ساتھ خلط ملط رکھے تو بلاشبہ تندرست بھی اس سے متاثر ہو کر مرض میں مبتلا ہو جائیگا۔ یہی وجہ ہے کہ شارع ذی حکمت نے انسان کو یہ ترغیب دی ہے اور رسول برحق نے بتا دیا ہے کہ جب کسی مسلمان سے کوئی معصیت سرزد ہو جائے تو اسے بیان کرنے سے پرہیز کرے اسے چھپانے کی کوشش کرے۔ اللہ تعالیٰ سے بخشش کا طالب ہو اور کسی سے اپنے کیے کا ذکر نہ کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ ”من اتى من هذه القاذورات (المنكرات) فليست بستر الله عز وجل“ (یعنی جو ان گندی باتوں (ممنوعات الہیہ) میں سے کسی کا مرتکب ہو جائے تو چاہیے کہ منشاء الہی کے مطابق اس کو چھپا دے)۔ شرع اسلام نے گناہ کا چرچا کرنے والوں کی سخت مذمت کی ہے اور انہیں اللہ تعالیٰ کی مغفرت، عفو اور رحمت سے محروم قرار دیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ”کل امتی معافی الا المجاہرین، وان من المجاہرة ان يعمل العبد عملاً باللیل ثم یصبح و قدستره اللہ تعالیٰ فیقول: یا فلان عملت البارح کذا و کذا، و قد بات یستره اللہ عز وجل، و یصبح یکشف ستر اللہ علیہ عنہ“ (یعنی میری تمام قوم کو معاف کیا جاسکتا ہے بجز ان کے جو اپنے گناہ کا اعلان کرتے ہیں اور اعلان کرنے کی صورت یہ ہے کہ ایک بندے سے رات کو کوئی برا فعل سرزد ہو جائے اور پھر صبح ہو جائے۔ تمام رات اللہ تعالیٰ اس کے کیے پر پردہ ڈال رکھے لیکن صبح کو وہ خود کہے کہ اے فلا نے میں نے کل رات یہ کچھ کیا۔ حالانکہ رات گزر چکی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کے کرتوت پر پردہ ڈال رکھا تھا لیکن صبح کو اللہ نے جو پردہ اس پر ڈالا تھا وہ خود اس نے ہٹا دیا اور (اپنا عیب) دوسرے کو بتا دیا)۔ جو لوگ غیرت مند ہیں اور جنہیں اللہ کا خیال ہے وہ (آئندہ کے لیے) گناہوں سے باز آ جاتے ہیں اپنے سابقہ گناہ کو چھپائے رہتے ہیں اور لوگوں کے سامنے کوئی ذکر نہیں کرتے اور جو خطا ان سے سرزد ہوئی ہے اس پر شرمسار ہوتے ہیں۔ امام احمد سے روایت ہے کہ ”ان اللہ یدنی المشوم فیضع علیہ کنفہ و سترہ من الناس و یقرره بذنوبہ فیقول اتعرف ذنب کذا، اتعرف ذنب کذا؟ فیقول نعم ای رب، حتی اذا قرره بذنوبہ و رأى فی نفسه انه قد هلك قال: فانی سترتها علیک فی الدنیا، و انا اغفرها لک الیوم“ (اللہ تعالیٰ مومن کو اپنے قریب کرے گا اس پر اپنی پناہ کا پردہ ڈالے گا اور لوگوں سے چھپا کر اس سے گناہوں کا اقرار کرائے گا۔ فرمائے گا فلاں گناہ پہنچانتے ہو، فلاں گناہ پہنچانتے ہو۔ تو وہ ساتھ ساتھ اقرار کرتا جائے گا، جب وہ تمام گناہوں کا اقرار کر لے گا اور یہ یقین کر لے گا کہ وہ تو برباد ہو گیا کہ اچانک خدا ذوالجلال فرمائے گا کہ میں نے تمہارے گناہ دنیا میں چھپائے تھے تو آج میں تمہارے یہ گناہ معاف کرتا ہوں)

نفاذ حدود (یعنی شرعی سزاؤں کا نفاذ کرنا) گناہ کا کفارہ ہے

علماء اس بات پر متفق اللفظ ہیں کہ شرعی سزائیں گناہوں (جرائم) کا کفارہ ہیں کیونکہ ان سزاؤں پر عملدرآمد کرنے سے ظالموں کا جبر کم ہوتا ہے اہل شر و فساد کو عبرت ہوتی ہے اور معاشرہ تباہی و بربادی اور ہلاکت و فساد و زیاں کاری سے بچ جاتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اذا استحللت

امتی خمساً فعليهم الدمار : اذا ظهر التلاعن، و شربوا الخمر، و لبسوا الحرير، و اتخذوا القيان، و اكتفى الرجال بالرجال، و النساء بالنساء“ (یعنی جب میری امت ان پانچ باتوں کو حلال کر لے تو اس پر تباہی نازل ہو جائے گی: ایک دوسرے پر لعنت (یا باہمی گالم گلوچ) کرنا، شراب پینا، ریشمی لباس پہننا، بناؤ سنگھار میں لگ جانا اور مردوں کا مردوں کے ساتھ اور عورتوں کا عورتوں کے ساتھ ملوث ہونا) یہ حدیث ترمذی اور بیہقی نے روایت کی ہے۔ اب جو لوگ ان برائیوں میں مبتلا ہوں ان پر حد لاگو کرنے سے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا اور عذاب آخرت سے رستگاری ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ایک گناہ کی پاداش میں دنیا اور آخرت دونوں جہان کے عذابوں کو جمع نہیں فرماتا چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ حضور نے (ایک عورت) غامدیہ کے بارے میں جس سے گناہ زنا سرزد ہو گیا تھا، اس پر وہ شرمسار ہوئی اور حضور کے سامنے اپنے گناہ کا اعتراف کیا اور اس پر حد لاگو کی گئی یہ فرمایا تھا ”لقد تابت توبة لو قسمت على سبعين من اهل مدينة لو سعتهم و هل وجدت افضل من انها جادت بنفسها لله تعالى“ (یعنی غامدیہ نے جس طرح توبہ کی ہے اگر وہ توبہ ستر (۷۰) اہل مدینہ پر تقسیم کی جائے تو ان کی نجات کے لئے کافی ہے۔ کیا اس سے بہتر کوئی بات ہو سکتی ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے اپنی جان دے دی)۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ وسلم نے ماعز بن مالک اسلمی کے بارے میں جنھوں نے ارتکاب زنا کا اقرار کیا اور اپنے گناہ پر نادم ہو کر سنگسار ہونا گوارا کر لیا تھا، قسم کھا کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا گناہ معاف فرمایا اور جنت میں داخل کیا اور ان کی صدق دل کی توبہ قبول ہوئی، اور یہ سزا ان کے گناہ کا کفارہ ہو گئی۔ چنانچہ رسول اللہ علیہ وسلم نے ایک اعتراض کرنے والے کو یہ جواب دیا کہ ”والذي نفسي بيده انه الآن لفي انهار الجنة ينغمس فيها“ (یعنی اس ذات کی قسم ہے جس کے دست قدرت میں میری جان ہے کہ وہ (ماعز) اس وقت جنت کی نہروں میں غوطے لگا رہے ہیں)۔

عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ ”كنا مع النبي صلى الله عليه وسلم في مجلس فقال: يا يعونى على ان لا تشركوا بالله شيئاً، ولا تزنوا، ولا تسرقوا، ولا تقتلوا النفس التي حرم الله الا بالحق، فمن و في منكم فاجره على الله، و من اصاب شيئاً من ذلك، فعوقب به في الدنيا فهو كفارة له، و من اصاب شيئاً من ذلك فستره الله عليه، فامر به الى الله ان شاء عفا عنه، و ان شاء عذبه“ (یعنی میں کچھ لوگوں کی جمعیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگ میرے ہاتھ پر بیعت کرو کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو گے، زنا کے مرتکب نہ ہو گے، چوری نہ کرو گے اور کسی کو ناحق قتل نہ کرو گے، جو لوگ تم میں سے ان باتوں کو پورا کریں گے وہ اللہ تعالیٰ سے اجر پائیں گے۔ اگر ان میں سے کوئی گناہ کسی سے سرزد ہو جائے اور اس کی سزا اسے دنیا میں مل جائے تو وہ سزا اس کے گناہ کا کفارہ ہو جائے گی۔ اور جو شخص ان میں سے کسی گناہ سے دوچار ہو جائے اور اللہ اس پر پردہ ڈال دے (یعنی کسی کو اس کی خبر نہ ہو) تو اس کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ اللہ چاہے تو اس سے درگزر فرمائے اور چاہے تو عذاب دے) ایک دوسری روایت میں ان الفاظ کا اضافہ ہے کہ ”فبايعناه على ذلك“ (یعنی ہم نے مندرجہ بالا باتوں پر بیعت کر لی) اس حدیث کو ابوداؤد کے سوا باقی پانچوں محدثین نے روایت کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ ”فعوقب به فی الدنیا فهو کفارة له“ (یعنی اگر ان کے گناہوں کی سزا دنیا میں دے دی جائے تو وہ کفارہ گناہ ہو جائے گی) اس امر کی کھلی دلیل ہے کہ حدود شرعیہ گناہوں کا کفارہ ہیں ان کا مقصد محض سرزنش ہی نہیں بلکہ تلافی مافات بھی ہے۔

ترمذی کی ایک روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”و من اصاب من ذلک شیئاً فعوقب به فی الدنیا فاللہ اکرم من ان یثنی العقوبة علی عبده فی الآخرة“ (یعنی اگر ان میں سے کوئی بات کسی سے سرزد ہو جائے اور دنیا میں اس کی سزا اُسے مل جائے تو اللہ تعالیٰ کی کرم فرمائی اس سے بالاتر ہے کہ آخرت میں دوبارہ اپنے بندے کو عذاب دے)۔ امام شافعی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ حدود کے بارے میں کوئی اور حدیث، اس سے زیادہ واضح میں نے نہیں سنی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ حضور نے فرمایا ”وما یدریک لعل الحدود نزلت کفارة للذنوب“ (یعنی تمہیں کیا معلوم؟ بہت ممکن ہے کہ حدود کے احکام کا نزول گناہوں کے کفارے کے لئے ہوا ہو) یہ حدیث بھی حدیث سابقہ کے مشابہ ہے اور مفہوم کے اعتبار سے اس کی تائید کرتی ہے۔ غرض حدود شرعیہ کا نفاذ نفوس انسانی کو جرم و خطا سے پاک کرتا اور معاشرہ کو بربادی اور تباہی سے بچاتا ہے۔ جملہ علمائے سلف کی یہی رائے ہے اور ائمہ فقہاء بعد رحمہم اللہ تعالیٰ کی بھی یہی رائے ہے۔ بعض اصحاب کی رائے یہ ہے کہ یہ سزائیں صرف سرزنش کی غرض سے ہیں قیامت کے دن عذاب ہوگا، لیکن قابل ترجیح وہی خیال ہے جو اوپر بتایا گیا اور اللہ تعالیٰ کے کرم اور فیض ربانی کے شایاں بھی یہی ہے اور اس کے حبیب مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی ارشاد فرمایا ہے۔

حرمت مصاہرہ کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ حرمت مصاہرہ (یعنی جنسی تعلق کی بناء پر جو حرمت عائد ہو جاتی ہے) حسب ذیل صورتوں میں عائد ہوتی ہے۔

(۱) باقاعدہ عقد ازدواج سے۔

(۲) مباشرت حلال سے۔

(۳) نکاح فاسد سے یا شبہ میں مباشرت ہو جانے سے۔

(۴) جنسی خواہش (یا شہوت کے ساتھ) مرد و زن کا ایک دوسرے کو مس کرنے سے۔

(۵) عورت کے اندام نہانی کو شہوت کے ساتھ دیکھنے سے۔ اس کے علاوہ کسی اور عضو کو یا عورت کے بالوں کو

دیکھنے سے حرمت مصاہرہ عائد نہ ہوگی خواہ شہوت سے دیکھا ہو۔

(۶) زنا کرنے، ہاتھ لگانے یا نکاح کے بغیر شہوت کے ساتھ دیکھنے سے۔ وہ تمام عورتیں مرد پر حرام ہو جاتی ہیں

جو باقاعدہ بیوی بن جانے سے حرام ہوتی ہیں۔ شہوت سے مراد یہ ہے کہ دل میں جنسی خواہش کا ہیجان ہو۔ اس کیفیت کا ثبوت اس شخص کے اقرار ہی سے ہو سکتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شہوت وہ ہے جس کے ساتھ عضو مخصوص میں استادگی اور حرکت ہو۔ اس حکم کا ثبوت اس روایت سے ہوتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ حضور نے فرمایا ”من

نظر الی فرج امرأه لم تحل امها و لا بنتها“ (یعنی اگر کوئی مرد ایک عورت کی شرمگاہ کو دیکھے تو پھر اس عورت کی ماں اور بیٹی اس پر حرام ہو جائے گی یعنی ان کے ساتھ رشتہ ازدواج نہیں ہو سکتا)۔ ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں ”حرمت علیہ امها و بنتها“ (یعنی اس عورت کی ماں اور بیٹی اس پر حرام ہو جائیں گی) نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ”ملعون ملعون من نظر الی فرج امرأه و ابنتها“ (یعنی جو شخص کسی عورت کے اندام نہانی کو اور پھر اس کی بیٹی کے اندام نہانی کو دیکھے وہ ملعون ہے ملعون ہے)۔ غرض جس مرد نے کسی غیر عورت کے ساتھ بدکاری کی یا (بیوی کے) شبہ میں مباشرت کر لی تو اس کی اصول و فروع (یعنی اوپری اور نیچے کی نسل کی عورتیں) سب اس پر حرام ہو جائیں گی نیز اس عورت پر بھی اس گناہ میں ملوث ہونے والے کی اوپری اور نیچے کی نسل کے مرد حرام ہو جائیں گے۔ یہی حکم طرفین میں سے کسی ایک کا شہوت کے ساتھ دوسرے کو ہاتھ لگانے کا بھی ہے۔ اور دیکھنے کے بارے میں اندام نہانی کے داخلی حصہ کو دیکھنا معتبر مانا گیا ہے۔ اوپر حصہ کے دیکھنے سے یہ حکم عائد نہ ہوگا اس حکم کی بناء اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے ”لا تنكحوا ما نکح آباؤکم من النساء“ (یعنی جس عورت کے ساتھ تمہارے باپ نے نکاح کیا تم اس سے نکاح نہ کرو) یہاں پر نکاح سے مباشرت مراد لینا زیادہ بہتر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ”من نظر الی فرج امرأه بشهوة، او لمسها بشهوة حرمت علیہ امها و ابنتها، و حرمت علی ابنه و ابیه“ (یعنی جس نے کسی عورت کی شرمگاہ کو شہوت کے ساتھ دیکھا یا اسے شہوت کے ساتھ چھوا تو اس عورت کی ماں اور بیٹی اس پر حرام ہو جائیں گی۔ اسی طرح وہ عورت بھی اس مرد کے بیٹے اور باپ پر حرام ہو جائے گی) حرام مادہ ہائے تولید بالکل اسی طرح محترم ہوں گے جس طرح حلال مادہ ہائے تولید محترم ہوتے ہیں۔

مالکیہ مباشرت حرام کے متعلق کہتے ہیں کہ اس باب میں تین اقوال ہی: ایک قول ضعیف یہ ہے کہ اس سے حرمت متعدی نہیں ہوتی، جیسا کہ شافعیہ کہتے ہیں، دوسرے یہ کہ حرمت متعدی ہوتی ہے جیسا کہ حنفیہ کا مسلک ہے اور امام مالک نے بھی اسی خیال کی طرف رجوع فرمایا تھا جیسا کہ مؤطا میں ہے۔ امام موصوف جب تک زندہ رہے اسی کے مطابق فتوے دیتے رہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس میں صرف کراہت ہے لیکن یہ قول ضعیف ہے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ کسی کی بیٹی سے مباشرت کر لینے والے پر اس کی ماں حرام نہیں ہوتی اسی طرح اگر کسی کی ماں سے مباشرت کی تو اس کی بیٹی حرام نہ ہوگی اور وہ لڑکی جو حرام نطفہ سے پیدا ہوئی وہ اس پر حرام نہیں ہوتی جس کے نطفہ سے پیدا ہوئی اور نہ اس کے اصول و فروع یعنی اوپر یا نیچے کی نسل والوں پر وہ حرام ہوگی۔ خواہ اس عورت کے ساتھ رضا مندی سے مباشرت ہوئی یا جبراً کی گئی ہو اور خواہ مرد کو معلوم ہو کہ وہ عورت اسی کے نطفہ سے ہے یا معلوم نہ ہو۔ پس بہر حال اس کی حیثیت ایک اجنبی عورت کی سی ہے۔ مادہ تولید سے حرمت عائد نہیں ہوتی البتہ زنا کرنے والے شخص کو چاہیے کہ محض احتیاط کے پیش نظر اس سے شادی نہ کرے اور اس امر کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ نکاح حلال سے شریف النسب اور صالح اولاد پیدا ہو۔

حنابلہ کہتے ہیں کہ مباشرت حلال ہو یا حرام، ہر دو صورت میں حرمت مصاہرہ ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ جس شخص نے کسی عورت کے ساتھ بدکاری کی تو وہ عورت اس کے حقیقی اور سوتیلے باپ پر حرام ہو جائے گی اور اس شخص پر اس عورت کی ماں اور اس کی بیٹی حرام ہو جائیں گی۔ اس طرح اگر کسی نے اپنی بیوی کی ماں (یعنی اپنی ساس) سے بدکاری کی تو اس کی

بیٹی، (یعنی اس کی بیوی) اس پر حرام ہو جائے گی اور دونوں میں علیحدگی واجب ہوگی۔ اسی طرح اگر اپنی بیوی کی بیٹی سے بدکاری کر لی تو اس کی ماں جو اس کی بیوی ہے اس پر حرام ہو جائے گی (اسی طرح جیسے باقاعدہ شادی کے بعد ہوا کرتا ہے)۔ ایک شخص کی بدکاری کے نتیجہ میں جو لڑکی پیدا ہوئی ہو، اس لڑکی سے اس شخص کا نکاح کرنا حنا بلہ کے نزدیک بھی اسی طرح حرام ہے جس طرح حنفیہ کے نزدیک حرام ہے۔

روایت ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اس نے عہد جاہلیت میں (یعنی مسلمان ہونے سے پہلے) ایک عورت کے ساتھ بدکاری کی تھی تو کیا اب اس عورت کی بیٹی سے شادی کر سکتا ہے؟ فرمایا ”لا اری ذلک ولا یصلح لک ان تنکح امرأة تطلع علی ابنتها علی ما اطلعت علیہ منها“ (یعنی میں تو یہ رائے نہیں دیتا اور یہ تیرے لئے بھی اچھا نہیں ہے کہ تو ایک عورت سے نکاح کر کے اس کا پردہ فاش کرے اسی طرح جیسا کہ تو نے اس کی ماں کا پردہ فاش کیا)۔ غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی عورت سے شادی حرام فرمائی ہے اور اس باب میں یہ ایک واضح حکم ہے۔

نا جائز لڑکی کے متعلق احکام

علا کہتے ہیں کہ بدکاری کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی، مرتکب زنا شخص کے لئے اجنبی متصور ہوگی، لہذا اگر وہ شخص مرجائے تو لڑکی اس کی وارث نہ ہوگی اور نہ اسے اس شخص کی اولاد میں تصور کیا جائے گا پس اس شخص پر اس لڑکی کا خرچہ برج بھی واجب نہیں ہے اور نہ یہ جائز ہے کہ اس کے ساتھ تنہائی میں رہے نیز وہ شخص اس لڑکی کا ولی (نگران حال) بھی قرار نہ دیا جائے گا اگر وہ لڑکی پہلے مرجائے اور مال چھوڑ جائے تو وہ شخص بھی اس کا وارث نہ ہوگا۔ غرض نا جائز لڑکی احکام میراث اور حرمت میں ایک اجنبی عورت ہے لیکن رشتہ ازدواج اور حرمت مصاہرہ کے احکام میں وہ اس کی قرابت دار متصور ہوگی (جیسے حلال کی اولاد ہوتی ہے) چنانچہ اس کے ساتھ شادی جائز نہیں اور نہ مصاہرت ہو سکتی ہے (یعنی اس کا داماد یا خسر بھی نہیں بن سکتا) اور اس کی نسل سے اوپر کی ہویا نیچے کی شادی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح وہ لڑکی بھی اسی شخص کی اوپر یا نیچے کی نسل سے شادی نہیں کر سکتی۔ اس بارے میں یہی قول قابل ترجیح ہے۔ قطع نظر اس کے کہ یہ یقین کے ساتھ ثابت ہو کہ وہ لڑکی اسی شخص کے نطفہ سے ہے یا اس بارے میں شک ہو۔ لیکن یہ ہوا ہو کہ اس شخص نے اس کی ماں کے ساتھ بدکاری کی اور اس کے ساتھ رابطہ کے دوران ہی وہ حمل ہو گیا تھا۔ پس بہر حال اس خیال کو ترجیح دی جائے گی کہ وہ لڑکی اس شخص کے نطفہ سے ہے۔

بدکاری کی خرابیوں کا بیان

واضح ہو کہ علماء نے آیات و احادیث کو ملاحظہ کرنے کے بعد ان خرابیوں کو مختصر بیان فرمایا ہے جو زنا کے بارے میں آئی ہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں:

اول یہ کہ ارتکاب زنا کے وقت مرتکب کے دل سے ایمان کا نور زائل ہو جاتا ہے اسے توبہ کی توفیق نہیں ہوتی تو اسی حال میں (یعنی نور ایمان سے بے بہرہ) مرجاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ جرم زنا قتل اور چوری وغیرہ جرائم سے زیادہ بڑا گناہ ہے۔ چنانچہ شادی شدہ شخص بدکاری کرے تو

اس کا قتل روا قرار دیا گیا ہے۔

تیسرے یہ کہ ارتکاب زنا خوف اور پریشانی کی تمہید ہے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ عادی بدکاری کی دعا قبول نہیں فرماتا۔ چوتھے یہ کہ قیامت کے روز اس کے چہرے کو نار جہنم سے جھلسایا جائے گا۔

پانچویں یہ کہ اللہ تعالیٰ زنا کار انسان کو آتش دوزخ کی دہکتی ہوئی بھٹی بکے درمیان میں پھینک دے گا۔ جہاں کی تپش سے اس کا جسم پگھل جائے گا اور بدن جھلس کر رہ جائے گا۔ اور جہنم میں اس کی پوایسی ہوگی جیسے غسل خانوں میں بہتی ہوئی غلاظت کی ہوتی ہے یہاں تک کہ اہل جہنم کو بھی اس سے اذیت ہوگی۔

ساتویں یہ کہ مرتکب زنا کا نام نیک اور پاکیزہ خصال لوگوں کی فہرست سے نکال دیا جائے گا اور صاحب ایمان نیک اشخاص کے دائرے سے باہر کر دیا جائے گا۔

آٹھویں یہ کہ قیامت کے روز اللہ عز و جل زنا کاروں کو اپنی خوشنودی اور مہربانی کی نظر سے محروم رکھے گا بلکہ انہیں بنظر عتاب دیکھے گا۔

نویں یہ کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو جو بدکاری کو روا رکھتا اور اس کا عادی ہے کبھی توبہ نہ کی، جنت کی خوشبو تک سے محروم رکھے گا۔

دسویں یہ کہ زنا کاری سے بدکاری پھیلتی ہے۔ اس کے نتیجے میں ناجائز اور نامراد نسل وجود میں آتی ہے جو معاشرہ کی ذلت و بربادی و ہلاکت کا باعث ہو جاتی ہے۔

گیارہویں یہ کہ جس بستی میں بھی زنا کاری پھیل جائے اللہ تعالیٰ نے اسے تباہ و ہلاک و برباد ہو جانے سے ڈرایا ہے جیسا کہ قوم لوط کا حال ہوا ہے۔

بارہویں یہ کہ زنا دنیا و آخرت دونوں جگہ ذلت و رسوائی کا سبب ہے۔

تیرہویں یہ کہ جو شخص خدا سے ڈر کر ارتکاب زنا سے دور رہے گا۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس پر اپنا سایہ رحمت ڈالے گا۔ اس کے گناہ معاف فرما کر اسے بخش دے گا اور خوف سے نجات دے گا۔

چودھویں یہ کہ جو شخص گناہ کبیرہ زنا سے دور رہے اس کے رزق میں فراوانی اور اسے نیکیوں کی توفیق ہوتی ہے اور اس کی صورت سے رعب، وجاہت اور نور نمایاں ہوتا ہے، واللہ اعلم۔

منحث کا بیان

منحث وہ ہے جو عورتوں کی طرح نازنخرے سے بات کرے۔ یا اپنے لباس اور بناؤ سنگھار میں عورتوں کی مشابہت اختیار کرے جیسا کہ عہد حاضر میں بعض نوجوان کرتے ہیں کہ بال بڑھا لیتے ہیں اور زلفیں لٹکا لیتے ہیں نیز عورتوں کے زیورات اور ان کے بعض مخصوص کپڑے پہنتے ہیں اور (عورتوں کی طرح) گفتگو میں باریک آواز سے کام لیتے ہیں۔ علماء اس بارے میں متفق اللفظ ہیں کہ منحث کو بطور سزا کے مسلمانوں کی بستی سے دور علاقہ میں قصر صلوٰۃ کی مسافت پر جلاوطن کر دینا واجب ہے، تاکہ وہ اس اذیت کا احساس کرے جو اس کیلئے اپنے کنبے اور ساتھیوں سے دور ہو جانے کی وجہ سے موجب وحشت و مایوسی ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ تین قسم کے اشخاص کے علاوہ کسی اور کو جلاوطن نہیں کیا جائے گا: وہ کنوارا جو مرتکب زنا ہو، منحث (مہجرا) اور محارب (دشمن یا آمادہ فساد)۔

اگر مخنث کے ساتھ بد فعلی کی جاتی ہو تو ایسے مخنث کو سنگسار کر کے مار دیا جائے کیونکہ جو اس فعل بد کا مجرم ہو اسے جلاوطن کر دینا مفید نہ ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرد مخنثوں اور مردانہ وضع اختیار کرنے والی عورتوں پر لعنت کی ہے اور فرمایا ہے کہ انہیں اپنے گھروں سے نکال دو۔ چنانچہ فلاں شخص کو نکالا گیا اور فلاں شخص کو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے نکال دیا۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔

(روایت ہے کہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک مخنث پیش ہوا جس کے ہاتھوں پیروں میں مہندی کا رنگ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ما بال هذا“ (یعنی یہ کیا ڈھنگ ہے؟) لوگوں نے بتایا کہ یا رسول اللہ اس نے عورتوں کی مشابہت اختیار کی ہے۔ حضور نے اسے ”بقیج“ کی طرف جلاوطن کر دینے کا حکم دیا۔ لوگوں نے عرض کیا ”یا رسول اللہ ہم اسے قتل نہ کر دیں؟“ فرمایا ”انسی نہیت عن قتل المصلین“ (یعنی ہمیں نمازیوں کے قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے)۔ ابوداؤد

علماء کہتے ہیں کہ مخنث نظر آئے تو امام (حاکم اسلام) کے لئے جائز ہے کہ اسے سزا دے تاکہ اسے اس گناہ میں آلودہ ہونے سے روکا اور باز رکھا جاسکے۔ نیز جائز ہے کہ اسے کسی دوسرے شہر میں ایک مسافرت کے فاصلہ پر جلاوطن کر دیا جائے بشرطیکہ لوگوں کی گواہی یا اس کے اعتراف سے اس کا بد فعلی میں مرتکب ہونا پایہ ثبوت کو نہ پہنچا ہو۔ جس طرح کہ حدیث شریف سے ثابت ہے۔

روایت ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ میں نے عرب کے بعض نواحی علاقوں میں ایسے مرد کو دیکھا جس کے ساتھ عورتوں کی طرح نکاح کیا جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو جمع فرمایا، اور اس بارے میں ان سے مشورہ کیا۔ سیدنا حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ نے سب سے زیادہ سخت رائے دی۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ ایک ایسا گناہ ہے جس کا ارتکاب بجز ایک قوم کے کسی نے نہیں کیا۔ اس قوم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ کیا وہ آپ سب کو معلوم ہے۔ پس میری رائے تو یہ ہے کہ اس شخص کو آگ میں جلا دیا جائے۔ چنانچہ تمام صحابہ اس پر متفق ہو گئے اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اسے آگ میں جلا دیا جائے لیکن یہ سنگسار کر کے ہلاک کرنے اور حد نافذ کرنے کے بعد ہو۔ کیونکہ کسی جاندار مخلوق کو آگ میں جلانا جائز نہیں ہے۔ اللہ کے سوا اور کسی کو حق نہیں ہے کہ آگ کا عذاب دے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بے زبان جانوروں کو بھی آگ سے جلا کر عذاب دینا حرام فرمایا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک کام پر بھیجا اور قریش کے دو اشخاص کا نام لے کر فرمایا کہ فلاں فلاں اشخاص اگر مل جائیں تو انہیں آگ میں جلا دو۔ پھر جب ہم جانے لگے تو حضور نے ارشاد فرمایا ”انسی کنت امرتکم ان تحرقوا فلاناً و فلاناً و ان النار لا یعذب بها الا اللہ، فان وجدتموہما فاقتلوہما“ (یعنی میں نے تمہیں حکم دیا تھا کہ فلاں فلاں شخص کو آگ میں جلا دو۔ لیکن آگ میں جلانے کا عذاب اللہ ہی کا کام ہے۔ پس اگر وہ اشخاص تمہیں مل جائیں تو (آگ میں جلانے کی بجائے قتل کر دینا)۔ بروایت بخاری۔

زنا کار عورت کے ساتھ نکاح کا بیان

حنفیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی عورت سے ملوث ہو جائے تو بعد میں اس شخص کو جائز ہے کہ اس عورت کے ساتھ باقاعدہ نکاح کرے کیونکہ بدکاری کے مادہ تولید کا احترام ملحوظ رکھنا ضروری نہیں ہے۔ روایت ہے کہ عہد خلافت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ میں ایک شخص نے کسی عورت کے ساتھ گناہ کر لیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں کو سو سو دروں کی سزا دی کیونکہ وہ دونوں کنوارے تھے۔ بعد ازاں ان کا نکاح آپس میں کر دیا اور سال کے لئے دونوں جلاوطن کئے گئے۔ اسی طرح کی ایک روایت حضرت عمر، ابن مسعود اور جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔ اس مسئلہ کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس میں ابتدا گناہ سے ہے اور انجام نکاح پر ہے۔ نکاح ایک فعل مباح ہے۔ گناہ کرنے سے فعل مباح حرام نہیں ہو جاتا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے ایک شخص کے احاطے سے کوئی پھل چرا لیا ہو۔ پھر باغ کے مالک کے پاس آیا اور وہی پھل اس سے خرید لیا تو چوری جو اس نے کی وہ تو فعل حرام تھا، لیکن یہ خریداری امر حلال ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے ایک عورت سے بدکاری کر لی ہے تو اب اس عورت سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔ تا وقتیکہ اس عورت کو اپنے فاسد مادہ تولید سے پاک نہ کر لے (یعنی اسے ماہواری نہ آجائے یا حمل ساقط نہ ہو جائے) کیونکہ نکاح ایک قابل احترام عمل ہے اور اس کا احترام یہ ہے کہ مادہ گناہ کے ساتھ مادہ حلال کو خلط ملط نہ کیا جائے تاکہ گندہ مادہ تولید قابل احترام مادہ تولید کے ساتھ نہ مل جائے۔ یہ حکم اس لئے بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”الزانی لا ینکح الا زانیۃ او مشرکۃ“ (یعنی بدکار آدمی ہی بدکار عورت یا مشرکہ عورت سے نکاح کرتا ہے) پھر اللہ کا ارشاد ہے ”وحرّم ذلک علی المؤمنین“ (یعنی ایسا نکاح کرنا مسلمانوں پر حرام ہے)۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے کسی عورت کے ساتھ برا کام کیا پھر اس سے نکاح کر لیا تو وہ دونوں ہمیشہ کے لئے بدکاری میں مبتلا رہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”واحلّ لکم ما وراء ذلک ان تبتغوا باموالکم محصنین غیر مسافحین“ (یعنی تمہارے لئے حلال کر دیا گیا ہے کہ اس عورت کے سوا کسی اور کو مال مہر کے عوض حاصل کر سکتے ہو کہ اسے بیوی بنا کر اپنی حفاظت میں رکھو بدکاری کے لئے نہیں) پس اس آیت میں جو بدکار نہیں ہے ان کے نکاح کو روا اور ان کے علاوہ اوروں کے نکاح کو باطل قرار دیا ہے۔

فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر عقد نکاح کر لیا ہو لیکن اس عورت سے اس وقت تک مباشرت نہ کی ہو کہ وہ عورت اس کے مادہ حرام سے پاک ہو جائے تو یہ نکاح جائز ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ان سے ایک شخص کی بابت دریافت کیا گیا جس نے ایک عورت کے ساتھ گناہ کیا اور بعد میں اسی سے شادی کر لی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس فعل پر کراہت (ناپسندیدگی) کا اظہار فرمایا۔

بیوی یا خاوند کے ارتکاب بدکاری کا بیان

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”الزانی لا ینکح الا زانیۃ او مشرکۃ والزانیۃ لا ینکحہا الا زان او مشرک“ (یعنی بدکار شخص بدکار عورت یا مشرک عورت سے نکاح کرتا ہے اور جو عورت بدکار ہو اس کے ساتھ بدکار یا مشرک مرد ہی نکاح کرتا ہے) علماء کی ایک جماعت نے اس آیت سے حسب ذیل مسائل اخذ فرمائے ہیں۔

اگر کسی مرد نے بدکاری کر لی تو اس کی بیوی سے اس کا نکاح فاسد ہو جائے گا اور اگر بیوی نے بدکاری کی تو اس کے خاوند سے اس کا نکاح فاسد ہو جائے گا اور خاوند پر لازم ہوگا کہ وہ اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کر لے۔

بعض اصحاب کہتے ہیں کہ اس سے نکاح فاسد نہیں ہوتا کسی کے ارتکاب زنا سے نکاح تو فسخ نہ ہوگا۔ البتہ اگر بیوی نے برا کام کر لیا ہے تو اس کے خاوند کو حکم دیا جائے گا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ اگر اس کے بعد بھی وہ اسے بیوی بنائے رکھے تو گنہگار ہوگا۔

ایسی عورت سے جس کی بدکاری مشہور ہو کسی شخص کا شادی کرنا جائز نہیں ہے اور کسی عورت کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ ایسے شخص سے شادی کرے جو علانیہ بدکاری کرنے میں مشہور ہو۔ ہاں اگر صدق دل سے توبہ کریں تو خیر۔

علماء کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص زنا وغیرہ بدکرداریوں میں مشہور ہو اور اسلامی احکام کی بے حرمتی کرتا ہو اور اسلام پسند کنبہ میں شادی کر کے ان لوگوں کو غلط فہمی میں ڈالے رکھے۔ پھر بعد میں اس کے کرتوت سب کو معلوم ہو جائیں تو ان لوگوں کو اختیار ہے، چاہیں تو اس رشتہ کو قائم رکھیں یا علیحدگی اختیار کر لیں۔ اس شخص کا یہ عیب ایسے عیبوں میں شمار کیا جائے گا۔ جس کی بناء پر نکاح فسخ کیا جاسکتا ہے۔ علماء اس کی تائید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پیش فرماتے ہیں ”لا ینکح الزانی المجلود الا مثله“ (یعنی وہ شخص جو جرم زنا کی پاداش میں تازیانے کی سزا پا چکا ہو، اپنی ہی جیسی عورت کے سوا اور کسی سے نکاح نہ کرے) اگر کوئی شخص بدکردار مشہور نہ ہو تو اس صورت میں زوجین کے درمیان علیحدگی درست نہیں ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ بیوی کی بدکاری سے نکاح نہیں ٹوٹتا۔ اسی طرح اگر خاوند بدکاری کرے تو نکاح فاسد نہ ہوگا۔

بعض اصحاب کہتے ہیں کہ منسوخ ہے۔ چنانچہ روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ”ان امراتی لا ترد لا مس“ (یعنی میری بیوی کو کوئی بھی شخص ہاتھ لگائے تو وہ اسے نہیں روکتی) ارشاد فرمایا ”طلقها“ (یعنی اسے طلاق دے دے)۔ اس نے کہا ”مجھے تو اس سے محبت ہے“ فرمایا ”امسکھا“ (یعنی اسے رکھ چھوڑ)۔

نکاح متعہ کا بیان

کتب امامیہ میں بتایا گیا ہے کہ متعہ وہ نکاح ہے جو کچھ عرصہ کے لئے کیا جائے۔ یہ عرصہ معلوم ہو یا نامعلوم ہو۔ بہر حال اس کی زیادہ سے زیادہ مدت پینتالیس روز ہے۔ یہ نکاح مقررہ مدت گزر جانے پر از خود ختم ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ اس عورت کو ایام ماہواری نہ آتے ہوں (یا بند ہو گئے ہوں)۔ اگر ایام آتے ہوں تو دوبار ایام ماہواری آنے کے بعد (نکاح متعہ) ختم ہو جائے گا۔ متعہ کے متعلقہ امور حسب ذیل ہیں:

نکاح متعہ میں کوئی مہر نہ ٹھہرا ہو تو کچھ واجب الاداء نہ ہوگا۔ نہ بیوی کا نفقہ خاوند کے ذمہ ہوگا اور نہ وہ وراثت کی حقدار ہوگی۔ استبراء کے سوا جس کا ذکر کیا گیا اور کوئی عدت نہیں ہے۔ اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی اولاد، اس شخص کی

نسل سے متصور نہ ہوگی بشرطیکہ اس کی شرط نہ لگا دی گئی ہو۔ ہاں متعہ سے نسبت مصاہرہ (ازدواجی رشتہ) کے احکام عائد ہوں گے۔

علماء اس پر متفق ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدائے اسلام میں ناگزیر حالات کے تحت اس کی اجازت دی تھی۔ بعد میں منع فرمادیا اور وہ ممانعت ہمیشہ کے لئے تھی۔ چنانچہ اجازت منسوخ ہوگئی تمام مسلمانان متقدمین و متاخرین کی یہی رائے ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ متعہ کا حرام ہونا اور اس کا رد ہونا دو بار ہوا۔ متعہ معرکہ خیبر سے پہلے روا تھا پھر حرام کر دیا گیا۔ اس کے بعد سال فتح یا معرکہ اوطاس والے سال میں اسے حلال کیا گیا، اس کے بعد ہمیشہ کے لئے حرام کر دیا گیا۔ اکثر علماء کا خیال یہی ہے کہ اس کے بعد متعہ حرام ہو گیا۔

سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ ”رخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عام اوطاس فی المتعۃ ثلاثۃ ایام ثم نہی عنہا“ (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعہ اوطاس والے سال میں تین دن کے لئے متعہ کی اجازت دی تھی اس کے بعد ممانعت فرمادی)۔

مسلم کی روایت میں ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ”نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن المتعۃ عام خیبر“ (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معرکہ خیبر والے سال میں متعہ سے ممانعت فرمادی تھی)۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔

امام بخاری فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے کہ یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ ابن ماجہ نے صحیح اسناد کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اخراج فرمایا ہے کہ حضرت مدوح نے خطبہ دیا اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مواقع پر متعہ کی اجازت دی بعد میں اسے حرام فرمایا ”بخدا مجھے کوئی ایسا شخص معلوم نہیں جس نے متعہ کیا ہو۔ جس نے بھی متعہ کیا میں نے اسے سنگسار کر دیا۔ ابن عمر فرماتے ہیں کہ ”نہانا عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و ما کنا مسافحین“ (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس سے منع فرمایا اور ہم بدکار نہیں رہے)۔

صنعانی فرماتے ہیں کہ یہ کہنا کہ اس کا مباح ہونا امر قطعی ہے اور اس کا منسوخ ہو جانا امر ظنی ہے، درست نہیں ہے کیونکہ جن اصحاب نے اس کے روا ہونے والی روایت بیان فرمائی ہے ان ہی نے ان کا منسوخ ہونا بیان کیا ہے۔ پس یا تو دونوں باتوں کو قطعی تصور کیا جائے یا دونوں کو ظنی مانا جائے۔

نہایۃ المجتہد میں آیا ہے کہ اس کے حرام ہونے کا حکم تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔

لواطت (یعنی مرد کے ساتھ بد فعلی) کی سزا کا بیان

واضح ہو کہ لواطت (یعنی مرد کا مرد کے ساتھ بد فعلی کرنا) ایک ایسا جرم ہے جو انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ یہ حرکت انسانیت سے کھلی عداوت اور اللہ تعالیٰ کے مقرر فرمودہ فطری وظائف کے منافی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بھی اسی طرح گناہ کبیرہ قرار دیا ہے جس طرح زنا ہے۔ ارشاد باری ہے ”اِنَّ اَنتَ اَوَّلَ الْفَاحِشَةِ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِنَ الْعَالَمِينَ“ (یعنی تم ایسی بے شرمی کے مرتکب ہونا چاہتے ہو جس کا ارتکاب اس سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا؟) پس جو شخص اس فعل بد کا مرتکب ہو اس (کی سزا) کے بارے میں ائمہ فقہ کی مختلف رائیں ہیں۔

منجملہ ان فقہاء کے کچھ وہ ہیں جنہوں نے فرمایا کہ اگر شادی شدہ شخص اس کا مرتکب ہو تو وہی سزا دی جائے جو زنا کی ہے۔ یعنی اسے ہلاک کر دیا جائے۔ لیکن جس کے ساتھ بد فعلی کی گئی ہے اسے کنوارے (مرتکب زنا) کی طرح درہ زنی کی سزا دی جائے کیونکہ اس شخص کو محسن (شادی شدہ یا محفوظ) قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بعض اصحاب کہتے ہیں کہ لوطی (بد فعلی کرنے والے) کو جو سزا دی جاتی ہے وہ سزا حد (شریعت کی مقرر کردہ) نہیں ہے بلکہ سرزنش کے طور پر ہے۔ لہذا قاضی کو اختیار ہے کہ وہ اپنی رائے کے مطابق اسے قید کر دے یا اس جرم کی پاداش میں تنبیہاً اسے تازیانے کی سزا دے اگر اس سے دوبارہ ایسی حرکت سرزد ہو اور باز نہ آئے تو اسے سزائے موت دی جائے۔^(۱)

۱۔ ائمہ رضوان اللہ علیہم کا اس پر اتفاق ہے کہ شرعاً لواطت فعل حرام ہے اور بے حیائی کا کام ہے۔ بلکہ جرم زنا سے بڑا اور کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑا گناہ ہے۔ اس کے حرام ہونے کے بارے میں احادیث متواترہ آئی ہیں اور اس کے مرتکب پر لعنت آئی ہے۔ ثبوت جرم کے لئے گواہوں کی تعداد کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔

مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ جرم لواطت کے ثبوت کو بھی ثبوت زنا کی طرح شہادت درکار ہے۔ لہذا چار معتبر اشخاص، جن میں کوئی عورت نہ ہو، کی گواہی کے بغیر یہ جرم ثابت نہ ہوگا، ان گواہوں کو سرمہ دانی میں سلائی کی طرح چشم دید گواہی دینی ہوگی۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ لواطت کے بارے میں شہادت دینا زنا کی شہادت سے مختلف ہے کیونکہ مرد کے ساتھ بد فعلی کا گناہ زنا کے گناہ سے ہلکا ہے اور اس جرم کی حیثیت اس جرم کی حیثیت سے کم ہے۔ اس گناہ سے نہ نسل میں گڈ بڑھتی ہے اور نہ عزت پر حرف آتا ہے۔ لہذا اس کا ثبوت صرف دو گواہوں کی شہادت سے ہو سکتا ہے۔ ایسی کوئی دلیل نہیں ہے جو اس

فعل کو زنا کے برابر قرار دے۔ کتاب و سنت میں بھی ایسی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ لہذا اس کو ثابت کرنے کے لئے وہی بنیادی حکم عائد ہوگا جو دوسرے جرائم اور گواہوں کے متعلق ہے۔

ائمہ فقہ کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا اس جرم کے ارتکاب پر کوئی حد (شرعی سزا) مقرر ہے یا سرزنش کے طور پر سزا واجب ہے؟

مالکیہ حنابلہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ اس کے ارتکاب پر حد کا نفاذ واجب ہے۔ لیکن اسے 'زنا' یعنی ناجائز طور پر ایک کے عضو مخصوص کو دوسرے کی شرمگاہ میں داخل کرنے پر قیاس کرنے کے بارے میں اختلاف ہے۔

مالکیہ، حنابلہ اور ایک روایت کی رو سے شافعیہ بھی کہتے ہیں کہ لواطت کی حد (یا سزائے شرعی) یہ ہے کہ لواطت کرنے اور کرانے والے دونوں کو سنگسار کر کے ہلاک کر دیا جائے، خواہ وہ شادی شدہ ہوں یا کنوارے ہوں۔ اس بارے میں محسن ہونے اور اس کی متعلقہ شرائط کو جن کا ذکر شرائط زنا کے سلسلہ میں ہو چکا ہے، شمار میں نہیں لایا جائے گا یا (اگر سنگسار نہیں تو) پھر انہیں تلوار سے قتل کر دیا جائے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ لواطت بھی زنا ہی کی ایک قسم ہے کیونکہ یہ بھی شہوت کے ساتھ لذت اندوز ہونے کے لئے ایک شخص کا اپنے عضو مخصوص کو دوسرے کے عضو مخصوص میں داخل کرنا ہے۔ پس لواطت (یعنی مرد کے ساتھ بد فعلی) کرنے والے اور کرانے والے دونوں ان موجبات (حرمت و تعذیب) کے تحت آتے ہیں جن کا ذکر شادی شدہ اور غیر شادی شدہ زنا کاروں کے سلسلہ میں آچکا ہے۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "اقتلوا الفاعل و المفعول بہ" (یعنی کرنے اور کرانے والے دونوں کو قتل کر دو) اور "اقتلوا الاعلیٰ و الاسفل" (یعنی اوپر والے کو بھی قتل کر دو اور نیچے والے کو بھی) اور اس روایت کی بنا پر جسے بیہقی نے سعید بن جبیر اور مجاہد سے اخراج فرمایا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ان سے جب کنوارے شخص کے بارے میں جو لواطت کا مرتکب پایا جائے، حکم دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا 'یوجم' (یعنی اسے سنگسار کر دیا جائے) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی یہی ہے کہ "اقتلوا الفاعل و المفعول بہ احصنا ام لم یحصنا" (یعنی ایسا کرنے والے کو اور جس کے ساتھ کیا جائے اسے بھی قتل کر دو شادی شدہ ہوں یا نہ ہوں)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حماد بن ابراہیم نخعی سے روایت کرتے ہیں۔ ان کا فرمانا ہے کہ یہ ٹھیک ہوتا کہ دو مرتبہ سنگسار کیا جاسکتا ہے تو میں لواطت کرنے والے کو کرتا، اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اذا اتى الرجل الرجل ففهم زانیان، و اذا اتت المرأة المرأة ففهما زانیان" (یعنی اگر ایک مرد دوسرے کے ساتھ ملوث ہو تو وہ دونوں زنا کار ہیں اور ایک عورت دوسری عورت کے ساتھ ملوث ہو تو وہ دونوں زانیہ ہیں)۔

ان اصحاب کا کہنا یہ ہے کہ یہ فعل 'زنا' ہے اور اس پر حد نافذ کرنے کا حکم صریح موجود ہے۔ لفظی اعتبار سے 'زنا' گناہ فاحشہ ہے اور قرآن میں صراحت اسے 'فاحشہ' فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ قوم لوط (جو اس کی مرتکب تھی) کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اتاتون الفاحشۃ ما سبقکم بہا من احد من العالمین" (یعنی کیا تم لوگ ایسی حرکت فاحشہ کرنی چاہتے ہو جو اس سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کی؟) معنوی اعتبار سے 'زنا' نام ہے ایک فعل کا جس کا مطلب عضو مخصوص کو

دوسرے عضو مخصوص میں داخل کرنا ہے اور جس کے ممنوع ہونے میں کوئی شبہ نہیں اس کا مقصد لذت اندوزی اور اخراج مادہ تولید ہے۔ یہی کیفیت لواطت میں بھی پائی جاتی ہے۔ قبل اور دبر (یعنی شرمگاہ پیشین و پسین) دونوں کا ڈھکنا شرعاً واجب ہے اور نماز کے اندر اور باہر واجب الستر ہے۔ ان میں سے کسی پر نظر ڈالنا حرام ہے۔ یہ دونوں ہی اعضاء شہوت (بری خواہش) کو ابھارنے والے ہیں اور انہیں ہاتھ لگانے، دیکھنے اور مباشرت سے فطرۃً حفظ نفس حاصل ہوتا ہے یہاں تک کہ جو شخص شرع سے بیگانہ ہے وہ بھی دونوں افعال (زنا و لواطت) میں امتیاز نہیں کر سکتا۔

پچھلے سال اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ انگلستان کے دارالامرا نے ایک قانون منظور کیا ہے جس کی رو سے ایک مرد کی شادی دوسرے مرد کے ساتھ جائز قرار دی گئی ہے اور جس مرد کے ساتھ شادی ہوا سے وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے جو بیوی کی ہے۔ چنانچہ ایسا عقد جو گر جائیں انجام پایا اس کی کیفیت نشر کی گئی۔ یہ بھی قدرت کا ایک کرشمہ اور اخلاقی پستی کی حد ہے، العیاذ باللہ۔

واضح ہو کہ محل معصیت (یعنی اعضاء گناہ) کی گرمی و نرمی ہی شہوت انگیز ہوتی ہے بایں اعتبار قبل و دبر (یعنی آگے اور پیچھے کے اعضاء گناہ) میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ چنانچہ دونوں میں سے کسی میں بھی محض ادخال عضو سے، غسل واجب ہو جاتا ہے۔ پس اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس سے لواطت کے حرام ہونے کی تائید ہوتی ہے کیونکہ کسی شے کا بر محل ہونا اس کی ملکیت حاصل ہونے کے اعتبار سے ہوتا ہے چنانچہ قبل (اندام نہانی سے استفادہ اس کا مالک ہونے کی حیثیت سے ہوتا ہے اور دبر (یعنی مقعد) کے مالک ہونے کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا اس فعل بد کا حرام ہونا قطعی اور مسلم ہے۔ کیونکہ یہاں کسی حال میں ملکیت کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح حقیقی معنوں میں مادہ تولید کا اتلاف اس فعل بد میں زیادہ واضح ہے بہ نسبت اندام نہانی کے کیونکہ یہی صورت اولاد پیدا کرنے کی ہے اور اس کی بابت گمان ہو سکتا ہے کہ یہ فعل زراعت کی مانند ہے۔ اگرچہ زنا کرنے والے کا یہ ارادہ نہ ہو۔ لیکن فعل لواطت میں اس کا وہم بھی نہیں ہو سکتا۔ لہذا اس میں مادہ تولید کا اتلاف 'مسلم' ہے۔ پس حد کا یہ حکم (حکم حد زنا) پر قیاس کرنے کی بناء پر نہیں ہے۔ اور حد کا نفاذ قیاس کی بناء پر ہوتا بھی نہیں ہے بلکہ 'حد' حکم صریح کی بناء پر ہوتی ہے۔ رہا محل معصیت کا مختلف ہونا سو وہ ایسا ہی ہے جیسے مرتکب کے نام کا مختلف ہونا (کہ ایک کو زانی اور دوسرے کو لوطی کہتے ہیں)۔

ایک اور روایت کی رو سے شافعیہ کہتے ہیں کہ لواطت کی سزا بھی وہی ہے جو زنا کی ہے۔ پس اس میں شادی شدہ ہونے (یا نہ ہونے) کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ سعید بن مسیب، عطاء بن ابی رباح، حسن بصری، قتادہ، نخعی، ثوری، اوزاعی، ابوطالب اور امام یحییٰ رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے۔ یہ اصحاب کہتے ہیں کہ اس بد فعلی کا مرتکب کنوارا ہو تو اسے درہ زنی اور جلا وطنی کی سزا دی جائے اور شادی شدہ ہو تو سنگسار کر کے ہلاک کر دیا جائے۔ کیونکہ یہ بھی زنا ہی کی ایک قسم ہے۔

خفیہ کہتے ہیں کہ جرم لواطت کے لئے کوئی 'حد' (شریعت کی مقرر کردہ سزا) نہیں ہے۔ لیکن حاکم اسلام پر واجب ہے کہ وہ اپنی رائے کے مطابق سزا دے۔ تاکہ مجرم کو تنبیہ ہو۔ اگر اس فعل کو دوبارہ کرے اور اپنی حرکت سے باز نہ آئے تو سزا کے طور پر، حد کے طور پر نہیں اسے تلوار سے قتل کر دیا جائے۔ اس بارے میں کوئی صراحت شرعی نہیں ہے۔ امام شوکانی نے اپنی کتاب 'تعلیق' میں اسی رائے کا اظہار فرمایا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مسلک میں ان دلائل کے خلاف کوئی بات

نہیں ہے جو سزائے لواطت کے بارے میں مذکور ہوئے اور جو بالعموم 'زنا' کے بارے میں آیات و احادیث متواترہ سے اخذ کیے گئے ہیں۔

حنفیہ میں سے ابو یوسف اور امام محمد نے، امام اعظم کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ لواطت بھی 'شہوت رانی' ہے اور بعض اصحاب کے نزدیک اس میں اور عورت کے ساتھ شہوت رانی میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہاں بھی پورے طور پر شہوت انگیزی کا سامان ہے۔ بناء بریں ایسے اشخاص پر حد زنا کا نافذ کرنا واجب ہے۔ لہذا کنوارے کو ذرہ زنی کی سزا دی جائے اور شادی شدہ میں اگر مخصن ہونے کی تمام شرائط موجود ہوں تو اسے سنگسار کیا جائے۔ یہ حکم اس لئے بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قوم لوط کو بدیں جہت کہ وہ اس بد کرداری کی مرتکب تھی 'مفسدین' سے تعبیر فرمایا ہے اور مفسد (فسادی) کی سزا قتل اور دردناک عذاب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "قال رب انصرنی علی القوم المفسدین" (العنکبوت: ۳۰) (یعنی پیغمبر نے کہا کہ پروردگار مجھے اس فساد انگیز قوم پر غلبہ عطا فرما)۔

صاحبین کہتے ہیں کہ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انھیں زندہ نہ چھوڑا جائے۔ البتہ ان کی سزاؤں کی سختی کے بارے میں اختلاف ہے۔ لہذا ہم نے اس کی بابت ایسے قول کو اختیار کر لیا ہے جس پر سب کا اتفاق ہے۔ انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول کو ترجیح دی کہ اس کے مرتکبوں کو حد ماری جائے۔

سزائے لواطت کے متعلق صحابہ کی رائیں

رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں سزائے لواطت دیئے جانے کے متعلق تو سب کو اتفاق ہے لیکن کیا سزا ہو؟ اس میں اختلاف ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حد کے طور پر مرتکبوں کو تلوار سے قتل کر دیا جائے پھر ان کی تذلیل کے لئے دونوں کو جلا دیا جائے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور اکثر صحابہ رضوان اللہ علیہم کی یہی رائے ہے۔ حافظ منذری کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر، حضرت علی، حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہم اور ہشام بن عبدالملک نے لواطت کے مرتکب کو آگ میں جلایا ہے لیکن تلوار سے قتل کرنے یا سنگسار کرنے کے بعد۔

حقیقت یہ ہے کہ اس جرم کا مرتکب اور اس مذموم اور ذلیل حرکت میں ملوث ہونے والا عبرت ناک سزا کا مستحق ہے اور اسے ایسی سخت اذیت پہنچائی جائے کہ سرکش بدکاروں کی نفسانی خواہشات کا خاتمہ کر دے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسا شخص جس نے اس قوم کی سی بے حیائی اختیار کر لی جس کی بابت فرمایا گیا ہے کہ اس سے پہلے دنیا میں کبھی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوئی، اس امر کا مستحق ہے کہ اس کو وہی سزا دی جائے، جو شدت اور اذیت میں اسی قوم کے عذاب کے برابر ہو جن کی بستیوں کو اللہ تعالیٰ نے زمین میں دھنسا دیا، ان کی اونچی عمارتوں کو خاک میں ملا دیا۔ ان کے اوپر کھنگر کی بارش ہوئی اور اس عذاب میں کنوارے، بیاہنے، چھوٹے بڑے اور عورت مرد سب ہی کی بیخ کنی کر دی گئی، تاکہ انھیں اس گناہ عظیم کی سزا دی جائے۔ قرآن نے ایسے لوگوں کو ظالم (ظلم کرنے والا) قرار دیا ہے۔ انھوں نے اپنی اس بد کرداری سے خود اپنی جانوں پر اور پورے عالم انسانیت پر ظلم کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیر میں فرمایا ہے "فلما جاء امرنا جعلنا عاليها سافلها، وامطرنا عليها حجارة من سجيل منضود، مسومة عند ربك وما هي من الظالمين ببعيد" (ہود: ۸۲، ۸۳) (یعنی جب ہمارا حکم عذاب نازل ہوا، ہم نے اس بستی

کے اوپر کو نیچا کر دیا (یعنی الٹا دیا) ان پر کھنگر برسائے جو تہہ برتہ تھے اور اس پر اللہ تعالیٰ نے نشان لگا رکھے تھے کہ جن کے نام کے ہیں انہی پر پڑیں اور عذاب ظالموں سے دور نہیں ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ لواطت کے مجرموں کو اونچی جگہ مثلاً سر بلند پہاڑ یا اونچی عمارت سے سر کے بل دھکا دے دیا جائے اور یا ان کے اوپر دیوار گرا دی جائے اور پتھر برسائے جائیں کہ دونوں مرجائیں جیسا کہ قوم لوط کے ساتھ ہوا۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ انھیں ایسی متعفن جگہ میں قید کر دیا جائے جہاں کی عفونت سے وہ مرجائیں۔

ان سب میں قابل ترجیح رائے یہ ہے کہ انھیں سنگسار کر دیا جائے، خواہ وہ کنوارے ہوں یا شادی شدہ۔ اللہ تعالیٰ نے امم سابقہ کی شریعت میں بھی سنگساری کی سزا رکھی تھی۔ قوم لوط کے بارے میں ارشاد باری ہے ”لنرسل علیہم حجارة من طین“ (یعنی تاکہ ہم اس قوم پر کھنگر برسائیں)

قرآن کریم میں ان لوگوں کو دین اور تعلیمات صاحب شریعت کے دائرہ سے خارج فرمایا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”بل انتم قوم مسرفون“ (یعنی تم لوگ حدود شریعت سے تجاوز کرنے والے ہو)۔ نیز فرمایا ”انا منزلون علی اهل هذه القرية رجلا من السماء بما كانوا یفسقون“ (العنکبوت: ۳۳) (یعنی ہم اس بستی والوں کی بدکاریوں کی پاداش میں آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں)

رسول اللہ ﷺ نے لواطت کے مرتکب پر لعنت کی ہے اور ایسے شخص کی بابت بتایا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دھتکارا ہوا ہے۔ نسائی نے اپنی صحاح میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”لعن اللہ من عمل عمل قوم لوط“ (یعنی اللہ تعالیٰ کی اس پر لعنت ہے جو قوم لوط کے عمل کا مرتکب ہوا)۔ لعن اللہ کے معنی اللہ کی رحمت سے دور کئے جانے کے ہیں۔ اور تمام بڑے بڑے گناہوں میں سے یہ فعل مذموم قوموں کی معاشرتی تعمیر کو گرا دینے والا ہے جس سے قوم کے نوجوانوں اور عورتوں میں برائیاں پھیلتی ہیں۔ اسی وجہ سے اس کی سزا دوسرے جرائم کی سزاؤں سے زیادہ سخت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ما نقض قوم العهد الا كان القتل بینہم، ولا ظهرت الفاحشة فی قوم الا سلط اللہ علیہم الموت“ (یعنی جب کوئی قوم عہد کو توڑتی ہے تو ان میں خونریزی ہونے لگتی ہے اور جب کسی قوم میں علانیہ بدکاری ہو تو اس پر مردنی چھا جاتی ہے)۔

ترمذی نے بسند صحیح بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”اخوف ما اخافہ علی امتی عمل قوم لوط“ (یعنی مجھے اپنی امت میں جس بات کا سب سے زیادہ خوف ہے وہ قوم لوط کا عمل ہے)۔ یہ حدیث ابن ماجہ اور ترمذی نے روایت کی ہے اور اسے ”حسن غریب“ بتایا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اذا استحل من امی خمساً فلیہم الدمار: اذا ظهر التلاعن، و شربوا الخمر، و لبسوا الحریر، و اتخذوا القیان، و اکتفی الرجال بالرجال والنساء بالنساء“ (یعنی میری امت جب ان پانچ باتوں کو اپنے اوپر حلال کر لے تو جان لو کہ ان پر تباہی آگئی: یعنی جب وہ ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں، شرابیں پیئیں، ولیشی

لباس پہنیں اور بناؤ سنگھار میں لگ جائیں، مرد عورتوں کو چھوڑ کر مردوں پر اکتفا کریں اور عورتیں مردوں سے قطع نظر کر کے عورتوں پر اکتفا کریں۔ اس حدیث کو بیہوشی نے اپنی صحیح میں بیان کیا ہے۔

واضح ہو کہ یہی حد اس شخص پر بھی عائد ہوتی ہے جو اجنبی عورت کے ساتھ دبر (پیچھے کی راہ سے) بد فعلی کرے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ حضور نے فرمایا ”الذی عمل عمل قوم لوط فارجموا الاعلیٰ والا سفلیٰ، وارجموہما جمیعاً“ (یعنی جو شخص قوم لوط کے فعل کا مرتکب ہو تو اوپر اور نیچے والے دونوں کو ایک ساتھ سنگسار کر دو)۔

اللہ تعالیٰ نے قوم لوط کے بارے میں بیان فرمایا ہے کہ وہ لوگ انسانی فطری تقاضے سے کنارہ کش ہو گئے۔ اس فعل کے ارتکاب میں جنسی عمل کی وہ مصلحت قطعاً ملحوظ نہیں رہتی جو عاقل انسان اور بے زبان حیوان کو ہوتی ہے ان لوگوں کی غرض محض شہوت رانی اور لذت اندوزی ہے۔ ان کی حالت جانوروں سے بھی گری ہوئی ہے یہ ان سے زیادہ بد راہ ہیں۔ کیونکہ جانور بھی اپنی خواہش نفسانی پوری کرنے کے لیے مادہ کی طلب کرتا ہے۔ تاکہ ہر جانور اپنی نوع کا تحفظ حاصل کرے اس لحاظ سے انھیں انسان پر فوقیت حاصل ہے۔ پھر جب مادہ حاملہ ہو جاتی ہے تو نر اس سے مقارنت نہیں کرتا۔ اور نہ کوئی نر بھی نر سے جفتی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے بد کرداروں کو ”مُسْرِف“ یعنی حد سے تجاوز کرنے والا، مجرم، ظالم اور بد اعمالی کا عادی فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشادات ملاحظہ ہوں:

”اتاتون الذکران من العلمین. وتذرون ما خلق لکم ربکم من ازواجکم، بل انتم قوم عدون (الشعراء: ۱۶۵، ۱۶۶)

”قال رب انصرنی علی القوم المفسدین. ولما جاءت رسلنا ابرہیم بالبشری، قالوا انا مہلکوا اہل هذه القرية ان اہلہا كانوا ظالمین“ (العنکبوت: ۳۰، ۳۱)۔

انا منزلون علی اہل هذه القرية رجزاً من السماء بما كانوا یفسقون“ (العنکبوت: ۳۲)۔
ولوطاً اذ قال لقومہ اتباتون الفاحشة ما سبقکم بها من احد من العلمین. انکم لتاتون الرجال شہوة من دون النساء، بل انتم قوم مسرفون. وما کان جواب قومہ الا ان قالوا اخرجہم من قریتکم انہم اناس یتطہرون فانجینہ واهلہ الا امرآتہ کانت من الغابریں. وامطرنا علیہم مطراً، فانظر کیف کان عاقبة المجرمین“ (الاعراف: ۸۰ تا ۸۴)۔

(یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آیاتم اس جہان میں مردوں کے ساتھ ملوث ہونا چاہتے ہو اور اپنی بیویوں کو جنسیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے پیدا کیا ہے چھوڑ بیٹھے ہو۔ بات یہ ہے کہ تم لوگ حد سے بڑھ گئے ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ پیغمبر نے فریاد کی کہ اے پروردگار اس بدکار قوم پر مجھے غلبہ عطا فرما۔ پھر وہ فرماتا ہے کہ پھر جب ہمارے فرستادہ فرشتے ابراہیم کو بشارت دینے آئے تو انہوں نے یہ بتایا کہ ہم اس بستی کو تباہ کرنے والے ہیں۔ کیونکہ یہاں کے لوگ ظالم ہیں۔

نیز فرمایا کہ ہم اس بستی کے رہنے والوں پر، ان کی بدکاری کی پاداش میں آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں۔

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لوط نے اپنی قوم سے کہا کہ تم لوگ وہ گناہ عظیم کرتے ہو کہ دنیا میں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ یعنی عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے ہو۔ تم لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہو۔ ان کی قوم نے اس کا جواب دیا تو یہ کہ لوگو! لوط کے کنبہ والوں کو اس بستی سے نکال دو۔ یہ لوگ تو اس سے پاک رہنا چاہتے ہیں۔ پس ہم لوط اور اس کے کنبہ کو عذاب سے بچا کر لے آئے البتہ اس کی بیوی (نہ آئی) پیچھے رہ گئی۔ ہم نے ان لوگوں پر پتھر کی بارش برسائی تو دیکھو کوان مجرموں کا کیا حشر ہوا؟)

غرض اس جرم کے مرتکبوں کا انجام ان کی تباہی کے سوا نہیں ہے۔ اس مذموم گناہ کا مرتکب، ارتکاب کرنے کی پاداش میں سخت ترین عذاب کا سزاوار ہے۔

طبرانی نے اپنی کتاب صحیح میں رسول اللہ ﷺ سے یہ روایت کیا ہے کہ حضور نے ارشاد فرمایا ”اذا ظلم اهل الذمة، كانت الدولة دولة العدو، واذا كثر الزنا، كثر السباء واذا كثر اللواط رفع الله يده عن الخلق فلا يبالي في اي واد هلكوا“ بروایت جابر بن عبد اللہ الانصاری رضی اللہ عنہ۔ (یعنی اگر ذمیوں پر ظلم ہو تو وہ حکومت دشمن کی حکومت ہو جاتی ہے اور جب زنا کی کثرت ہو تو قیدیوں کی کثرت ہوگی اور اگر لواطت کی کثرت ہو تو اللہ تعالیٰ لوگوں سے دستکش اور ان کی طرف سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ خواہ کسی بھی آفت ناگہانی میں ہلاک ہو جائیں)۔ یہ حدیث جابر بن عبد اللہ الانصاری رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے۔

الغرض لواطت ان اسباب میں سے ہے جن سے قومیں برباد ہوتیں۔ قبائل ہلاک ہو جاتے ہیں اور اس کے مرتکب اللہ کی عنایت اور اعانت سے محروم ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ فعل لوگوں کو نفس پرستی کی دعوت دیتا ہے۔ لوگ شہوت رانی میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور اللہ کی مدد، اس کی حمایت اور نصرت و کامرانی سے محروم ہو جاتے ہیں۔

ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”لا ينظر الله عز وجل الى رجل اتى رجلاً او امرأة في دبرها“ بروایت نسائی۔ (یعنی اللہ اس شخص پر نظر کرم نہیں فرمائے گا جو مرد کے ساتھ ملوث ہو یا عورت کے ساتھ دبر (پیچھے کی راہ سے) بدفعی کرے)۔ اور طبرانی نے اپنی کتاب الاوسط میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ثلاثة لا تقبل لهم شهادة ان لا اله الا الله: الراكب والمركوب، والراكبة والمركوبة، والامام الجائر“ (یعنی تین قسم کے اشخاص ایسے ہیں کہ ان کے اس کہنے پر بھی اعتبار نہیں کیا جائے گا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ یعنی وہ مرد جو لواطت کرنے اور کرانے کے مرتکب ہوں اور وہ عورت جو کسی عورت سے ملوث ہو اور وہ شخص جو گناہوں کی رہنمائی کرے)۔

لواطت مستوجب لعنت الہی ہے

حقیقت یہ ہے کہ فعل لواطت اللہ تعالیٰ کی پھٹکار اور اس کے غضب کا نیز فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت کا مستوجب ہے کیونکہ یہ ایک ایسی ناشدنی حرکت ہے جو عقل سلیم اور مذاق صحیح کے منافی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس فعل کے مرتکب نے شرم اور انسانیت کا جامہ اتار کر رکھ دیا ہے اور باوقار انسان کی تمام خوبیوں سے عاری ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ ایسے اشخاص جانوروں کی خصائل فطری سے بھی عاری ہیں، ان کی عادات حیوانات غیر ناطق سے بھی زیادہ مذموم، فتنہ اور قابل نفرت ہیں بلکہ کنکر پتھر سے بھی زیادہ گری ہوئی ہیں۔ اس سے بڑا عیب اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس حرکت سے کتے، گدھے اور سؤر بھی پرہیز کرتے ہیں۔ اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کا صدور ان سے ہو جو ان سب سے برتر، صاحب قدرت اور با عظمت ہوں ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی اس کا مرتکب ہو تو اس سے زیادہ اپنے مقام سے گرا ہوا، اپنی شان سے ہٹا ہوا اور ایک گندے مردار جانور سے زیادہ ذلت و رسوائی کے قابل ہے۔ غرض معاشرہ میں لواطت کرنے والے سے تو قاتل، چور یا زنا کار بھی بہتر ہیں۔ وہ شخص تو اللہ کا باغی ہے۔ اس میں ایمان کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ وہ رحمت الہی سے دور، راندہ درگاہ الہی اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے جو سب سے بری جگہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے اسلام نے اس جرم سے بچنے کے لئے بے ریش لڑکوں پر نظر ڈالنے سے منع فرمایا ہے بالخصوص اس صورت میں جبکہ وہ خوش شکل ہوں۔ بعض اصحاب نے کہا کہ ان کو شہوت کی نگاہ سے دیکھنا منع ہے کیونکہ یہی نفسانی خواہشات کی تحریک اور بدکاری کا سبب بن جاتا ہے اور چھپی ہوئی شہوت کو ابھارتا ہے۔

حسن بن ذکوان رحمہ اللہ کا ارشاد ہے کہ دولت مندوں کے لڑکوں کے ساتھ میل جول مت رکھو کیونکہ ان کی شکلیں بالعموم عورتوں کی سی ہوتی ہیں اور وہ عورتوں سے زیادہ فتنہ برپا کرتے ہیں۔

نجیب بن سدی کہا کرتے تھے کہ کوئی شخص بے ریش لڑکوں کے ساتھ گھر میں اکیلا نہ رہے۔

ابن ہبل سے یہ قول مروی ہے کہ اس امت میں ایک قوم پیدا ہوگی جنہیں لوطی (لوٹے باز) کہا جائے گا۔ یہ تین قسم کے ہیں: نظارہ بازی کرنے والے، ہاتھ سے ہاتھ ملانے والے اور وہ جو بد فعلی کے مرتکب ہوں۔

حضرت مجاہد سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ اگر اس عمل (یعنی عمل قوم لوط) کا مرتکب، آسمان سے نازل ہونے والے تمام قطرہ ہاء باران سے اور زمین کی تہ میں جو پانی ہے اس سے غسل کرے تب بھی وہ نجس ہی رہے گا تا آنکہ وہ اپنے اس فعل بد سے توبہ نہ کرے۔

ایک شخص امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ کی مجلس میں آیا۔ ان کے ہمراہ ایک اچھی شکل و صورت والا لڑکا تھا۔ امام موصوف نے دریافت فرمایا کہ یہ تمہارا کیا لگتا ہے؟ اس شخص نے کہا ”یہ میرا بھانجا ہے۔“ فرمایا ”آئندہ اسے لے کر یہاں نہ آنا اور نہ اسے لے کر راستہ پر چلا کرو، تاکہ جو شخص تمہیں اور اس لڑکے کو نہیں جانتا تم سے بدگمانی نہ کرے۔“

ایک بار حضرت سفیان ثوری عوامی حمام (غسل خانہ) میں داخل ہوئے ان کے ساتھ ایک قبول صورت لڑکا بھی ننگے بدن داخل ہوا تو آپ نے چلا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور فرمایا ”اسے میرے پاس سے لے جاؤ، اسے لے جاؤ۔ میں ہر عورت کے ساتھ ایک شیطان اور ہر نوعمر بے ریش لڑکے کے ساتھ کئی شیطان دیکھتا ہوں۔“

واضح ہو کہ یہ تمام خرابیاں اس مذموم فعل میں پائی جاتی ہیں جو تمام عورتوں اور مردوں کے لیے بلکہ جملہ افراد

معاشرہ اور پوری انسانیت کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہیں۔ ہم اس سے محفوظ رہنے اور بچنے کی دعا کرتے ہیں، انہ سمیع الدعاء۔

لواطت سے حرمت مصاہرہ عائد ہونے کا بیان

حنفیہ، شافعیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ لواطت کے ارتکاب سے، حرمت مصاہرہ یعنی کہ وہ حرمت جواز و واج سے پیدا ہوتی ہے (عائد نہ ہوگی)۔

حنابلہ کہتے ہیں کہ لواطت کے ارتکاب سے حرمت مصاہرہ اسی طرح عائد ہو جاتی ہے جس طرح زنا سے عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر کسی شخص نے ایسے لڑکے سے بد فعلی کی جو اس قابل تھا یا کسی مرد سے بد فعلی کی تو یہ دونوں اشخاص بنص صریح ایک دوسرے کی ماں اور بیٹی پر حرام ہو جائیں گے کیونکہ یہ بھی شہوت انگیز حصہ بدن میں ایسی ہی مباشرت ہے جیسی کہ عورت کے ساتھ مباشرت، بطور سرزش کے دونوں پر حرمت مصاہرہ عائد ہوگی۔

اقدام لواطت میں جو خرابیاں علماء نے بیان کی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

اول یہ کہ یہ حرکت انسانی فطرت سلیمہ کے منافی ہے۔ طبیعت سلیم اس کو بے حیائی کا کام اور زنا سے بدتر فعل خیال کرتی ہے کیونکہ اس گناہ کا ارتکاب گندی جگہ سے ہوتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اس سے جوانوں کی قوت مردی کا ضیاع ہوتا ہے کیونکہ اس کا اقدام بسہولت ممکن ہے۔

تیسرے یہ کہ اس سے مردوں میں علت ابنہ (یعنی بد فعلی کرانے کا مرض) پیدا ہو جاتا ہے جو موجب ذلت ہے اور جب کسی کا نفس اتنا ذلیل ہو جائے تو وہ سر بلند نہیں ہو سکتا۔

چوتھے یہ کہ ایسے اشخاص کی عورتوں میں برائی راہ پاجاتی ہے کیونکہ ان کے خاوندوں کو لواطت کا چسکا لگ جاتا ہے۔ اور وہ اپنی عورتوں سے بے تعلق ہو جاتے ہیں اور بیوی کی پاسداری کا جو فرض ان پر عائد ہوتا ہے اس کی بجائے آدری اور ان کے نفسانی تقاضوں کی تسکین میں کوتاہی کرنے لگتے ہیں۔ نتیجہ ان کی بیویاں بھی بے اعتنائی کے باعث خاوندوں سے بیزار ہو جاتی ہیں۔

پانچویں یہ کہ اس گناہ کبیرہ کے پھیل جانے سے نسل گھٹتی جاتی ہے کیونکہ اس فعل کے مرتکب مرد شادی کرنے اور عورتوں سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔

چھٹے یہ کہ ایسے مرد اپنی عورتوں کے ساتھ غیر فطری مباشرت کی طرف راغب ہو جاتے ہیں اور یہ امر برائی کی انتہا ہے۔ ساتویں یہ کہ جو شخص اس شرمناک فعل کا عادی ہو مشقت زنی اختیار کرنے کی طرف راغب ہو جاتا ہے اور جانوروں کے ساتھ شہوت رانی کرتا ہے۔ یہ دونوں حرکتیں نہایت بری ہیں جو وجود انسانی کے لئے ضرر رساں، اخلاق کو تباہ کرنے والی اور صحت کو برباد کرنے والی ہیں اور ہر مذہب و ملت میں زنا اور لواطت کی طرح حرام ہیں کیونکہ یہ باتیں موجب ہلاکت اور سخت مضرت رساں ہیں۔

آٹھویں یہ کہ اس سے ازدواجی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ کنبہ اور قبیلہ سے علیحدگی ہو جاتی ہے اور باہمی بغض و عداوت کا بیج بویا جاتا ہے۔

نویں یہ کہ یہ خصلت جوانوں کو شادی کرنے اور خاندانی ذمہ داریوں سے منہ موڑ لینے پر آمادہ کرتی ہیں۔ یہ وہ

خرابیاں ہیں جن سے معاشرتی تقاضوں کی بنیادیں گر پڑتی ہیں کیونکہ زوجین کی پاسداری و تحفظ کا انحصار ازدواجی زندگی (کے مقام) پر ہی منحصر ہے۔

دسویں یہ کہ ایسی حرکت کرنے والا (فاعل) زبری (آتشک) اور سیلان (جریان) کے امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے اور کرانے والا (مفعول) بھی ضرر سے دوچار ہوتا ہے اور ایسی مکروہ باتوں میں پڑ جاتا ہے جس کا مداوا اختیار سے باہر ہے۔ اس گناہ کبیرہ کے عام نقصانات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کی خرابیوں کا شمار اس کا پھیلاؤ اور اس کا اثر فرد اور جماعت پر پڑتا ہے ان سب باتوں کا بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ حرکت (نازیبا)، وقار شکن، نامرادی کا موجب، رسوائی کا باعث، کمینگی کا سبب اور عزت و شرافت کے منہی و باؤں اور امراض خبیثہ کو جنم دینے والی اور سل اور صفراء کی بیماریوں کا ذریعہ ہے۔ اس سے اللہ کی رحمت (بندوں پر سے) اٹھ جاتی ہے اور اس کا عتاب نازل ہوتا ہے۔ فاعل و مفعول دونوں لعنت و عذاب الہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ لواطت کرنے والے کی طبیعت میں پستی آ جاتی ہے اور چہروں سے شرم دھل جاتی ہے۔ دونوں مجرموں کی گواہی تسلیم نہیں کی جاتی اور دنیا و آخرت دونوں جگہ عذاب کے مستوجب ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے منہث کو شہر بدر کرنے کا حکم دیا ہے کہ معاشرہ میں خرابی راہ نہ پائے۔ شریعت اسلامیہ نے اس فعل کو سختی سے منع فرمایا ہے اور اس کے لئے عبرتناک سزا مقرر فرمائی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی بکثرت احادیث میں اس گناہ سے نفرت دلائی گئی ہے اور اس کی بد انجامی سے خوف دلایا گیا ہے اور اس کے عظیم خطرات اور ذلت کے پیش آنے سے آگاہ کر دیا گیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”لعن اللہ سبعة من خلقه من فوق سبع سمواته، وردد اللعنة على كل واحد منهم ثلاثا، ولعن كل واحد منهم لعنة تكفيه، قال: ملعون من عمل عمل قوم لوط، ملعون من عمل عمل قوم لوط ملعون من عمل عمل قوم لوط، ملعون من ذبح لغير الله، ملعون من اتى شيئا من البهائم، ملعون من عقى والديه ملعون من جمع بين امرأة وابنتها، ملعون من غير حدود الارض، ملعون من ادعى الى غير مواليه“ (یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے آسمان ہفتم سے اپنی مخلوق میں سے سات قسم کے اشخاص پر لعنت فرمائی ہے اور ان میں سے ہر ایک پر یکے بعد دیگرے تین بار لعنت فرمائی ہے اور ہر ایک پر ایسی لعنت بھیجی کہ جو اس کیلئے کافی ہو۔ حضور نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس نے قوم لوط والی حرکت کی وہ لعنتی ہے جس نے قوم لوط والی حرکت کی وہ لعنتی ہے۔ جس نے قوم لوط والی حرکت کی وہ لعنتی ہے۔ اور وہ شخص ملعون ہے جس نے اللہ کے سوا کسی اور کے نام (جانور) ذبح کیا۔ وہ شخص ملعون ہے جس نے جانوروں کے ساتھ کوئی بد فعلی کی۔ وہ شخص ملعون ہے جسے ماں باپ نے عاق (محروم الحق) کر دیا۔ وہ شخص ملعون ہے جس نے ماں بیٹی دونوں کو اپنی زوجیت میں جمع کیا۔ وہ شخص ملعون ہے جس نے زمین کی حدود میں تبدیلی کی۔ وہ شخص ملعون ہے جس نے دوسروں کے (مملوک) غلام کی ملکیت کا دعویٰ کیا۔

بیویوں کے ساتھ غیر فطری مباشرت کرنے کا بیان

تمام علمائے اسلام اس امر پر متفق اللفظ ہیں کہ جس شخص نے اپنی بیوی یا لونڈی کے ساتھ اندام نہانی سے ہٹ کر پیچھے کی راہ سے مباشرت کی اس پر حد عائد نہ ہوگی کہ اس مذموم فعل کا مرتکب گنہگار اور مستوجب عذاب آخرت ہے

کیونکہ اس شخص نے ایسے فعل کا ارتکاب کیا ہے جو شرعاً ممنوع اور ناقابل درگزر ہے۔ بلکہ اس کی سزا میں نرمی کرنا اور بچانے کی کوشش کرنا بھی منع ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی متعدد احادیث میں عورتوں کے ساتھ غیر فطری بد فعلی کے ارتکاب کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ حضرت خذیمہ بن ثابت، ابو ہریرہ اور علی بن طلق رضی اللہ عنہم روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”لاتاتوا النساء فی ادبارھن“ (یعنی عورتوں کے ساتھ پیچھے کی راہ سے مجامعت مت کرو)۔

عمر بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”ہی اللوطۃ الصغری“ (یعنی عورتوں کے ساتھ غیر فطری عمل بھی ایک چھوٹی قسم کی لواطت ہے)۔

حماد بن سلمہ نے حکیم بن الاثرم سے انھوں نے ابی تمیم سے اور انھوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”من اتی حائضاً، او امرأة فی دبرھا، او کاهناً فصدقه، فقد کفر بما نزل علی محمد“ بروایت ترمذی و ابام احمد۔ (یعنی جس شخص نے کسی عورت سے بدوران حیض یا غیر فطری طور پر مباشرت کی یا کسی نجومی کے پاس آیا اور اس کی بات کی تصدیق کی، اس نے محمد ﷺ پر نازل ہونے والی وحی سے انکار کیا)۔ قرآن حکیم نے مباشرت کے لئے اندام نہانی کو مخصوص فرمایا ہے کیونکہ (قرآن میں لفظ حرث یعنی کھیتی کا لفظ آیا ہے اور) حرث (کھیتی) کا اطلاق اسی پر ہوتا ہے کہ یہیں سے اولاد پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اور مقام کو (مباشرت کے لئے) حرام کر دیا ہے۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہودیوں نے مسلمانوں سے کہا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کے ساتھ اندام نہانی میں مباشرت کی لیکن پیچھے کی طرف سے کی، اس کی وجہ سے بھینگا لڑکا پیدا ہوا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ”نسائوکم حرث لکم، فاتوا حرثکم انی شتم، وقد موالا نفسکم واتقوا اللہ واعلموا انکم مملقوہ، وبشر المثومین“ (البقرہ: ۲۲۳) (یعنی لوگو تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں۔ اپنی کھیتی کو جس حال میں چاہو استعمال کر سکتے ہو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ جان رکھو کہ تمہیں اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے۔ اور ایمانداروں کی خوش انجامی کی بشارت دے دو) اس آیت کے نازل ہونے پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”مقبلة ومدبرة ماکان فی المخرج“ (یعنی مباشرت صحیحہ آگے کی طرف سے ہو یا پیچھے کی طرف سے اس سے اولاد پر کچھ اثر نہیں پڑتا)۔

مختلف طریقوں سے بکثرت احادیث ایسی آئی ہیں۔ چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”استحيوا ان اللہ لا یستحی من الحق، لا یحل لکم ان تاتوا النساء فی حشوشھن“ (یعنی لوگو باز آ جاؤ۔ اللہ اظہار حق میں تامل نہیں کرتا۔ عورتوں کے ساتھ غلاظت کی جگہ پر مباشرت کرنا تم پر حلال نہیں ہے)۔

امام احمد نے خذیمہ بن ثابت سے روایت کیا ہے ”ان رسول اللہ ﷺ نہی ان یاتی الرجل امراته فی دبرھا“ (یعنی رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ اپنی بیوی کے ساتھ سرین کی طرف سے مباشرت کرے) یہی روایت ایک دوسرے طریقے سے یوں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”استحيوا ان اللہ لا یستحی من الحق، لاتاتوا النساء فی اعجازھن“ (یعنی لوگو باز آ جاؤ حق بات کے بیان کرنے میں اللہ کو کوئی تامل نہیں ہے کہ عورتوں

کے ساتھ براہ مقعد مجامعت نہ کرو) نسائی اور ابن ماجہ نے بطریق خزیمہ اسے روایت کیا ہے اور ترمذی و نسائی نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”لَا يَنْظُرُ اللَّهُ إِلَى رَجُلٍ أَتَى رَجُلًا، أَوْ امْرَأَةً فَمَسَى الدَّبْرَ“ (یعنی اللہ اس شخص پر رحمت کی نظر نہ ڈالے گا جو کسی مرد کے یا عورت کے ساتھ سرین کی طرف سے بد فعلی کرے)۔ ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

عبد کہتے ہیں کہ ہمیں عبدالرزاق نے بتایا کہ معمر ابن طاؤس نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابن عباسؓ سے عورت کے ساتھ اس غیر فطری عمل (کے جواز) کی بابت دریافت کیا تو آپ نے فرمایا ”نَسَائِي عَنْ الْكَفْرِ“ (یعنی یہ سوال تو کفر کی بابت سوال کرنا ہے کہ آیا یہ جائز ہے؟) اس حدیث کی اسناد صحیح ہیں۔ نسائی نے بھی اس حدیث کو بطریق ابن المبارک معمر سے اسی طرح بیان کیا ہے اور عبد نے بھی اپنی تفسیر میں بتایا ہے کہ ابراہیم نے حاکم سے اور انھوں نے اپنے باپ سے انھوں نے عکرمہ سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ میں اپنی گھر والی کے ساتھ پیچھے کی راہ سے مجامعت کیا کرتا تھا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سنا کہ ”نَسَائِي لَكُمْ حَرْثٌ لَكُمْ فَاتُوا حَرْثَكُمْ أَيْ شِئْتُمْ“ (یعنی عورتیں تمہاری کھیتی ہیں۔ تم اپنی کھیتی کو جس طرح چاہو استعمال کر سکتے ہو) تو میں نے خیال کیا کہ یہ حرکت حلال ہے۔ اس پر حضرت عباسؓ نے فرمایا: اے وکیع! اللہ کا ارشاد ہے ”فَاتُوا حَرْثَكُمْ أَيْ شِئْتُمْ“ (یعنی اپنی کھیتی کو جس طرح چاہو استعمال کر سکتے ہو۔ کھڑے ہو کر، بیٹھ کر، سامنے سے یا پیچھے سے لیکن آگے کی راہ سے اس کے آگے نہ بڑھو)۔

امام احمد سے روایت ہے کہ عبدالصمد نے انھیں بتایا کہ ان کو ہمام نے قتادہ سے اور انھوں نے عمرو بن شعیب سے انھوں نے اپنے باپ سے اور انھوں نے ان کے دادا سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بیوی کے ساتھ پیچھے کی راہ سے مجامعت کرنا بھی ایک چھوٹی قسم کی لواطت ہے)۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”سَبْعَةٌ لَا يَنْظُرُ اللَّهُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يَزْكِيهِمْ، وَيَقُولُ: ادْخُلُوا النَّارَ مَعَ الدَّاخِلِينَ: الْفَاعِلُ وَالْمَفْعُولُ بِهِ وَالنَّاكِحُ يَدُهُ، وَالنَّاكِحُ الْبَهِيمَةُ، وَالنَّاكِحُ الْمَرْأَةُ فِي دَبْرِهَا، وَجَامِعُ بَيْنَ امْرَأَةٍ وَابْنَتِهَا وَالزَّانِي بِحَلِيلَةِ جَارِهِ وَمَوْذِي جَارِهِ حَتَّى يَلْعَنَهُ“ (یعنی سات اشخاص ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز نہ ان کی طرف توجہ فرمائے گا اور نہ انھیں پاک کرے گا بلکہ ان سے کہے گا کہ جہنم میں جانے والوں کے ساتھ تم بھی جہنم میں جاؤ۔ وہ اشخاص یہ ہیں۔ لواطت کرنے والا اور کرانے والا، ہاتھ سے جلق لگانے والا، جانور سے مجامعت کرنے والا، عورت کے ساتھ پیچھے کی راہ سے بد فعلی کرنے والا، ماں اور بیٹی کو اپنی زوجیت میں لانے والا، پڑوسی کی عورت سے بدکاری کرنے والا، پڑوسی کو ایذا دینے والا۔ یہاں تک کہ وہ اسے لعنت کرے۔

امام احمد سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ عبدالرزاق نے ہم سے حدیث بیان کی انھوں نے بتایا کہ معمر نے سہیل بن ابی صالح سے انھوں نے حارث بن مخلد سے اور انھوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”إِنَّ الْمَذِيَّ يَأْتِي امْرَأَتَهُ فِي دَبْرِهَا لَا يَنْظُرُ اللَّهُ إِلَيْهِ“ (یعنی جو شخص اپنی بیوی کے ساتھ پچھلی راہ سے مجامعت

کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر نظر رحمت نہ فرمائے گا۔

نسائی نے ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”ملعون من اتى امرأته في دبرها“ (یعنی اپنی عورت کے ساتھ لواطت کرنے والا ملعون ہے)۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ ”ملعون من اتى النساء في ادبارهن“ (یعنی وہ شخص لعنتی ہے جو عورتوں کے ساتھ لواطت کرتا ہے)۔

نسائی کہتے ہیں کہ اسحاق بن منصور نے ہم سے حدیث بیان کی عبدالرحمن بن مہدی بن سفیان ثوری، نے لیث بن ابی سلیم سے اور انھوں نے مجاہد سے اور انھوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ”اتيان الرجال النساء في ادبارهن كفر“ (یعنی مردوں کا عورتوں سے لواطت کرنا کفر ہے) پھر یہی روایت بندار سے ہے جنھوں نے عبدالرحمن سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ”من اتى امرأة في دبرها وتلك كفر“ (یعنی اگر کسی شخص نے عورت کے ساتھ پیچھے کی راہ سے مجامعت (لواطت) کی تو یہ کفر ہوا)۔ اسی طرح کی ایک روایت نسائی نے بطریق ثوری لیث سے کی ہے اور انھوں نے مجاہد سے اور انھوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”من اتى شيئاً من الرجال والنساء في ادبارهن فقد كفر“ (یعنی جس نے کسی مرد یا عورت کے ساتھ پچھلی راہ سے کچھ کیا تو وہ کفر ہے)۔ اس حدیث میں کفر سے مراد اللہ تعالیٰ کی حلال فرمودہ نعمت یعنی عورت کا انکار ہے۔

ابن مسعود نے نبی ﷺ سے روایت کیا ہے کہ حضور نے فرمایا ”محاش النساء حرام“ (یعنی عورتوں کے ساتھ لواطت حرام ہے)۔

ثوری نے صلت بن بہرام سے روایت کی جنھوں نے ابی المعتمر سے اور انھوں نے ابی جویریہ سے کہ انھوں نے بتایا کہ ایک شخص نے حضرت علیؓ سے عورتوں سے لواطت کرنے کے بارے میں دریافت کیا، انھوں نے فرمایا: ”سفلت سفل اللہ بک الم تسمع قول اللہ عز وجل اتاتون الفاحشة ما سبقكم بها من احد من العلمین“ (یعنی کیسا گھٹیا سوال ہے۔ ارے کہنے کیا تو نے اللہ عز وجل کا ارشاد نہیں سنا کہ لوگو! کیا تم ایسا گناہ عظیم کرو گے جو تم سے پہلے اہل جہان میں سے کسی نے کبھی نہیں کیا)۔

’امام ابن کثیر‘ نے اپنی تفسیر میں بتایا ہے کہ اس فعل کے حرام ہونے کے بارے میں حضرات ابن عباس، ابن مسعود، ابو درداء، ابو ہریرہ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اقوال اور بیان ہو چکے ہیں اور حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بلاشبہ یہ ثابت ہے کہ انھوں نے اس کو حرام فرمایا ہے۔ چنانچہ روایت ہے کہ اس بارے میں ان سے سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ ”کہیں مسلمان بھی ایسی حرکت کر سکتا ہے“ اور بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص نے حضرت انسؓ سے دریافت کیا کہ عورتوں کے ساتھ لواطت کرنے کے بارے میں آپ کا خیال ہے؟ آپ نے فرمایا ”ما انتم الا قوم عرب، هل يكون الحرث الاموضع الزرع لاتعدوا الفرج۔ قال: يا ابا عبد اللہ انهم يقولون انک تقول ذلك، قال يكذبون علی، يكذبون علی“ (یعنی تم تو قوم عرب ہو، کیا حرث یا زراعت کھیت کے سوا ہو سکتی ہے؟ پس اندام نہانی سے ہرگز تجاوز نہ کرو۔ اس پر اس شخص نے کہا کہ اے ابو عبد اللہ لوگ تو کہتے ہیں کہ آپ اسے روا کہتے ہیں۔ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ یہ مجھ پر دروغ بانی ہے، مجھ پر بہتان ہے۔ یہی حکم حضرت امام مالک سے ثابت ہے۔

غرض تمام ائمہ فقہ اس پر متفق اللفظ ہیں حنفیہ، شافعیہ، حنابلہ اور مالکیہ میں سے کسی کو اس کے بارے میں اختلاف نہیں ہے اور سب اس فعل کے حرام اور مذموم ہونے کے قائل ہیں اور بیوی یا لونڈی وغیرہ کے ساتھ بھی کسی صورت اس فعل کو جائز قرار نہیں دیتے۔ سعید بن مسیب، ابی سلمہ، عکرمہ، طاؤس، عطاء، سعید بن جبیر، عروہ بن زبیر، مجاہد بن جبر اور حسن بصری وغیرہ تمام اسلاف نے اس فعل کی شدید ترین مذمت فرمائی ہے۔ بعض اصحاب نے اس کے ارتکاب کو کفر قرار دیا ہے یہی جمہور علماء کا مسلک ہے۔

مجملہ ان دلائل کے جو اس فعل کے ناجائز ہونے کا ثبوت ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ”وقدموا لانفسکم“ ہے (یعنی لوگو اپنے انجام کا فکر قبل از وقت کر لو) اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی فرمانبرداری کرو اور جن باتوں سے تمہیں روکا گیا ہے انہیں ترک کر دو۔ پھر اس کی تائید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”واتقوا اللہ واعلموا انکم ملقوہ“ (یعنی اپنی عورتوں کے ساتھ مباشرت میں اللہ کی نافرمانی) سے ڈرو اور اسی جگہ سے مجامعت کرو جو حرث (کھیتی) کی مصداق ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ جگہ اندام نہانی ہی ہو سکتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ تمہارے تمام افعال کا محاسبہ کرے گا۔ جس میں یہ فعل مذموم بھی ہے۔ ساتھ ہی اللہ کا یہ ارشاد وبشر المومنین (یعنی ایمان داروں کو بشارت دے دو) جو آیا ہے اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتے ہیں یعنی جس امر سے منع کیا گیا ہے اسے نہیں کرتے۔

اب اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ”والذین لفرو جہم حافظون الاعلیٰ ازواجہم او مملکت ایمانہم فانہم غیر ملومین“ (یعنی جو لوگ اپنی شرمگاہوں کو اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے سوا ہر طرح سے بچاتے ہیں۔ ان کو برا نہیں کہا جاسکتا) اس حکم کا تو یہ تقاضا ہے کہ عورتوں کے ساتھ لواطت بھی جائز ہو کیونکہ اس آیت میں بغیر کسی استثناء کے سب باتوں کو رد قرار دیا گیا ہے اور کسی ایک جگہ کو مجامعت کے لئے مخصوص نہیں کیا گیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے ”فاتوہن من حیث امرکم اللہ“ (یعنی عورتوں سے مجامعت وہیں سے کرو جہاں سے کرنے کا حکم اللہ نے دیا ہے) اس کے بعد ارشاد ہے ”فاتوا حرثکم انسی شنتم“ (یعنی جس طرح بھی چاہو اپنی کھیتی کو استعمال کرو) اس طرح حصر کے ساتھ ارشاد فرما کر اس جگہ کی وضاحت فرما دی ہے جہاں شرعاً مباشرت کا حکم ہے۔ یعنی اولاد پیدا ہونے کی جگہ (جس کو کھیتی سے تعبیر فرمایا ہے) لہذا یہی جگہ مباشرت کے لئے خاص ہو گئی۔ اس کے علاوہ اجازت نہیں ہے اور یہیں سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”الاعلیٰ ازواجہم او مملکت ایمانہم“ (یعنی ان کی بیویاں اور مملوکہ لونڈیاں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں) کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے یعنی جس طرح حائضہ عورت سے مباشرت کی ممانعت اللہ کے ارشاد ”الاعلیٰ ازواجہم“ سے نکلتی ہے۔ اسی طرح وہ آیت جو سورہ بقرہ میں آئی ہے وہ بھی اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ مباشرت جائز اور مخصوص ہے صرف اندام نہانی تک، کسی اور جگہ کی اجازت نہیں ہے کیونکہ حرث (یعنی کھیتی) جس کی صراحت آیہ کریمہ ”فاتوا حرثکم“ میں ہے اس کا مصدق یہی ہو سکتا ہے اس لئے کہ بچے کی ولادت یہیں سے ہوتی ہے۔

ابوبکر الرازی الجصاص اپنی کتاب احکام القرآن میں بسلسلہ لواطت بازنان، بتایا ہے کہ ہمارے بزرگ اس فعل کو حرام قرار دیتے تھے اور نہایت سختی کے ساتھ اس سے منع فرماتے تھے۔ علی بن طلق رحمہ اللہ سے منقول ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ”لاتاتوا النساء فی استاہن، فان اللہ لا یستحی من الحق“ (یعنی عورتوں کے ساتھ سرین کے راستے سے مجامعت نہ کرو اللہ تعالیٰ حق بات کا حکم دینے میں تامل نہیں فرماتا)

بروایت احمد و ترمذی وہ کہتے ہیں کہ یہ روایت 'حسن' ہے۔

تفصیل بالا سے واضح ہے کہ عورتوں سے لواطت کرنا 'برا فعل' اور قابل مذمت جرم ہے اور کبھی شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی اور نہ کوئی عاقل انسان اسے پسند کرتا ہے۔ اس میں بے حد و بے شمار خرابیاں ہیں۔ بسا اوقات فرد اور خاندان پر اس کا برا اثر دوسرے ممنوعہ گناہوں سے زیادہ پڑتا ہے۔ ایسے ذلیل لوگوں کو خدا سے ڈرنا چاہیے جو اپنی بیویوں سے پیچھے کی راہ سے مباشرت کر کے عمل قوم لوط کے مرتکب ہوتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ یہ فعل اسلام میں جائز ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے التجا کرتے ہیں کہ وہ اس قسم کی لغزشوں سے بچائے اور محفوظ رکھے۔

جانور کے ساتھ بد فعلی کرنے کا بیان

جانوروں کے ساتھ بد فعلی کرنے والے کی سزا میں چاروں ائمہ فقہاء میں اختلاف ہے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اس گناہ عظیم کے لئے کوئی حد (شریعت کی مقرر کردہ سزا) نہیں ہے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے اور نہ یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس گناہ کے مرتکب پر حد عائد کی ہو۔ البتہ حاکم شرع پر یہ واجب ہے کہ وہ اپنی رائے کے مطابق جو سزا چاہے دے دے، قید کر دے یا تازیانہ لگائے یا سرزنش وغیرہ جس سے اسے تنبیہ ہو اور (آئندہ) ارتکاب سے باز رہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ اس فعل کی سزا بھی وہی ہے جو 'زنا' کی ہے۔ یعنی کنوارا ہو تو اسے درے لگائے جائیں اور شادی شدہ ہو تو سنگسار کر دیا جائے کیونکہ یہ بھی ممنوعہ عضو میں جو انسانی 'قبل' و 'دبر' کی طرح شہوت انگیز ہے، ارتکاب بد فعلی کا نام ہے لہذا اس پر بھی زنا کی طرح نفاذ حد واجب ہے۔

شافعیہ کی اس بارے میں تین رائیں ہیں جن میں سے قوی تر قول یہ ہے کہ ایسے شخص پر حد عائد کی جائے۔ جیسا کہ مالکیہ کہتے ہیں، تو اس کا حکم زنا کی طرح ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ایسے شخص کو کنوارا ہو یا شادی شدہ قتل کر دیا جائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے "من وقع علی بہیمۃ فاقتلوہ و اقتلوا البہیمۃ" (یعنی جو شخص جانور سے بد فعلی کرے اسے اور جانور کو بھی قتل کر دو) اس حدیث کو امام احمد، ابو داؤد اور ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور ابن ماجہ نے بھی یہ حدیث اپنی کتاب 'سنن' میں حدیث ابراہیم بن اسماعیل سے روایت کی ہے جنہوں نے داؤد بن الحصین سے انہوں نے عکرمہ سے اور انہوں نے ابن عباس سے اس طرح روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "من وقع علی ذات محرم فاقتلوہ، ومن وقع علی بہیمۃ فاقتلوہ، و اقتلوا البہیمۃ" (یعنی جو شخص اپنی محرم کے ساتھ (جس سے نکاح حرام ہے) بد فعلی کرے یا جانور سے کرے تو اسے اور اس جانور کو قتل کر دو)۔

تیسرا قول یہ ہے کہ اسے (بطور سرزنش) سزا دی جائے۔ اس کے لئے 'حد' (شرع کی مقرر کردہ سزا) نہیں ہے جیسا کہ امام ابو حنیفہ کی رائے ہے۔

حنابلہ کہتے ہیں کہ ایسے شخص پر حد کا نفاذ کرنا واجب ہے اور (تین) حد کے بارے میں ان کی دو رائیں ہیں۔ ایک یہ کہ اسے 'لواطت' کے مرتکب کی طرح 'حد' ماری جائے۔ دوسرے یہ کہ اسے سرزنش کے طور پر سزا دی جائے۔ حنابلہ

کے نزدیک یہی قول قابل ترجیح ہے جو حنفیہ کے قول کے مطابق ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس گناہ کے متعلق جو احکام ہیں ان کا انحصار لوگوں کے دینی حالات پر ہو۔ یعنی (یہ دیکھا جائے کہ) مرتکب پورے طور پر پرہیزگار ہے یا (احکام دین کی بجا آوری میں) کوتاہی کرتا ہے جو ان ہے۔ یا پکی عمر کا ہے۔ پس اگر ادنیٰ طبقہ کے شخص یا کسی نو جوان سے یہ فعل سرزد ہو تو اسے ہلکی سزا دی جائے اگر باعزت اور پختہ عمر کا کوئی شخص یہ فعل کرے تو اس پر حد نافذ کی جائے یا قتل کی بڑی سزا دی جائے۔ یہاں یہ اصول مد نظر ہے کہ جو شخص ذی رتبہ ہوتا ہے اس کا چھوٹا سا قصور بھی بڑا متصور ہوتا ہے۔ لہذا اسے جرم کی زیادہ سزا دی جائے گی کیونکہ بعض اچھے لوگوں کا نیک کام بھی مقررین بارگاہ کا جرم متصور ہوتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اربعة یصبحون فی غضب اللہ ویمسون فی سخط اللہ، قلت: من ہم یا رسول اللہ؟ قال المتشبهون من الرجال بالنساء، والمتشبهات من النساء بالرجال، والذي یأتی البہیمۃ، والذي یأتی الرجال“ بروایت طبرانی۔ (یعنی چار اشخاص ایسے ہیں جو صبح و شام اللہ کے غضب اور عذاب میں مبتلا رہیں گے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ کون ہیں؟ فرمایا وہ مرد جو عورتوں کی مشابہت اختیار کریں اور وہ عورتیں جو مردوں کی مشابہت اختیار کریں اور وہ شخص جو جانور سے بدفعی کرے اور وہ شخص جو مردوں کے ساتھ بدفعی کرے)۔

جس جانور سے بدفعی کی جائے اس کی بابت حکم

مالکیہ کہتے ہیں کہ اس جانور کو ہلاک کر دینا واجب نہیں ہے، خواہ اس کا گوشت حلال ہو یا نہ ہو۔ کیونکہ اندریں باب شریعت میں کوئی صریح حکم نہیں آیا اور وہ روایت جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے جس میں اس جانور کو مار دینے کا حکم ہے وہ ضعیف روایت ہے، اس پر عمل نہ ہوگا۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر وہ جانور، مرتکب گناہ کی ملکیت ہے تب تو اسے مار دینا واجب ہے۔ یہ حکم اس لئے ہے کہ مبادا لوگ اس جانور کو چلتا پھرتا دیکھ کر اس گناہ کا چرچا کریں اور کہیں کہ یہ وہی جانور ہے جس کے ساتھ فلاں شخص نے بدفعی کی۔ اس طرح لوگ غیبت (پیٹھ پیچھے برا کہنے) کے گنہگار ہو جائیں گے اور وہ شخص لوگوں میں گر جائے گا اور بہت ممکن ہے کہ وہ شخص اس گناہ سے توبہ کر چکا ہو۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اس جانور کو دیکھ کر اس بدکار شخص کو پھر اس گناہ کی تحریک ہو۔ لہذا زیادہ احتیاط اسی میں ہے کہ اس جانور کو ہلاک کر دیا جائے۔ نیز بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت لی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”مسلعون من وقع علی بہیمۃ“ (یعنی جو شخص جانور سے بدفعی کرے وہ ملعون ہے)۔ اور دوسری روایت میں ارشاد ہے ”اقتلوہ واقتلوہا معہ، لا یقال ہذہ التی فعل بہا کذا وکذا“ (یعنی اس شخص کو قتل کر دو اور ساتھ ہی اس جانور کو بھی مبادا لوگ کہیں کہ یہی وہ جانور ہے جس کے ساتھ ایسی ویسی بات کی گئی ہے)۔ بیہقی کا رجحان اس حدیث کے صحیح ہونے کی طرف ہے کیونکہ اسی روایت کو ابو یوسف نے بسند عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بیان فرمایا ہے کہ ”انہ اتی برجل وقع علی بہیمۃ فعمزہ بالضرب، وأمر بالبہیمۃ فذبحت، واحرققت بالنار“ (یعنی ایک شخص کو جس نے کسی جانور سے بدفعی کی تھی آپ کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ نے اس سزائے ضرب دی

اور اس جانور کو بموجب حکم ذبح کر کے جلادیا گیا) اس کو ہلاک اس لیے کیا گیا کہ مبادا اس سے کوئی مسخ شدہ بد شکل بچہ پیدا ہو جائے۔ ایسے جانور کا گوشت بھی ذبح کرنے کے باوجود نہ کھانا چاہیے کیونکہ وہ جانور اس حرکت کے بعد نجس ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک چرواہا ایک جانور لے کر آیا جس سے ایک مسوخ الخلقیت بچہ پیدا ہوا۔ لیکن اگر اس جانور کا مالک کوئی اور شخص ہے تو اس کا ذبح کرنا واجب نہیں ہے۔

شافعیہ سے اس بارے میں دو اقوال مروی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اگر وہ جانور حلال ہے تو ذبح کر دیا جائے، ورنہ نہ کیا جائے کیونکہ جانور کو ہلاک کرنا بے فائدہ مال کو ضائع کرنا ہے، جس کی ممانعت آئی ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ جانور کو تو بالکل ناپید کر دیا جائے، خواہ وہ حلال ہو یا نہ ہو، تاکہ اس فعل کا چرچا نہ ہو اور بری بات پر پردہ پڑا رہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی خطاؤں پر پردہ ڈالنے کا حکم دیا ہے۔ اگر کسی مسلمانوں کی برائی پر پردہ ڈال دیا جائے تو اللہ تعالیٰ بھی دنیا و آخرت میں اس کے کیسے پر پردہ ڈال دے گا۔

حنابلہ کہتے ہیں کہ اس جانور کو ذبح کر دیا جائے خواہ وہ مرتکب گناہ کی ملکیت ہو یا نہ ہو اور خواہ وہ جانور حلال ہو یا نہ ہو۔ اگر وہ جانور کسی اور شخص کا ہے تو اس کا تاوان مجرم کے ذمہ ہوگا کیونکہ وہی اس جانور کے تلف کیے جانے کا موجب ہوا اور (قاعدہ یہ ہے کہ) جب کوئی شخص کسی کی کوئی چیز ضائع کر دے تو سزا کے طور پر اس شے کی قیمت اسے ادا کرنا ہوگی۔ اس حکم سے جانور کے مالک اور مرتکب گناہ دونوں کی رسوائی نہ ہوگی، ورنہ جب بھی لوگ اس جانور کو دیکھیں گے اس فعل مذموم کا ذکر کریں گے۔

ایسے جانور کے ذبیحہ کا بیان جس سے بد فعلی کی گئی ہو

جس جانور سے بد فعلی کی گئی ہو اس کا گوشت کھانے کی بابت ائمہ فقہاء میں اختلاف ہے۔

حنفیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر وہ جانور ایسا ہے جس کا گوشت حلال ہے تو اسے (مار کر) آگ میں جلادیا جائے، اس کا کھانا جائز نہیں ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ ذبح کرنے کے بعد اس کا گوشت خود مرتکب گناہ کو اور دوسروں کو بھی جائز ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ایسی شرعی دلیل موجود نہیں ہے جس سے اس کا کھانا حرام ثابت ہو۔ لہذا حکم کی بنیادی حیثیت برقرار رہے گی یعنی وہ جائز ہے۔

شافعیہ کی اس بارے میں دو رائیں ہیں ایک یہ کہ اس کا کھانا مجرم کو اور دوسروں کو بھی جائز ہے۔ یہ رائے مالکیہ رحمہم اللہ کی رائے کے مطابق ہے۔ دوسری روایت میں یہ ہے کہ وہ اس شخص پر اور دوسروں پر بھی حرام ہے جیسا کہ حنفیہ اور حنابلہ کہتے ہیں اور مرتکب بد فعلی پر لازم ہوگا کہ جانور کے مالک کو اس کی قیمت ادا کرے۔ یہ حکم بطور جرمانہ اور ملزم کے اس فعل کی سزا ہے جو فعل شرعاً اور عقلاً قابل مذمت ہے۔

ہاتھ کی رگڑ سے اخراج مادہ تولید یا جلق لگانے کا بیان

جس شخص نے اپنے ہاتھ سے شہوت رانی کی یا کسی عورت نے دوسری عورت کے ساتھ شہوت رانی کی

جسے 'سحاق' کہتے ہیں، اس پر حد عائد نہ ہوگی۔ تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے، کیونکہ گویہ فعل حرام ہے لیکن لذت اندوزی کے اعتبار سے ناقص ہے۔ اس گناہ کے مرتکب کو امام (حاکم شرع) اپنی رائے کے مطابق جو سزا چاہے دے سکتا ہے تاکہ اس شخص کو اس مذموم فعل سے باز رکھا جائے۔ ہاتھ کی حرکت سے مادہ تولید کا خارج کرنا گناہ کبیرہ اور سخت معصیت ہے۔ شارع نے اس سے منع فرمایا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اس سے پرہیز کرنے کا حکم دیا ہے کیونکہ اس عمل سے جسمانی اور معاشرتی امراض پیدا ہوتے ہیں اور احادیث میں آیا ہے کہ اگر اس گناہ سے توبہ کیے بغیر مر جائے تو قیامت کے روز وہ اس حال میں پیش ہوگا اس کے ہاتھ حاملہ ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے ”والذین لفرو جہم حافظون الا علی ازواجہم او مملکت ایمانہم، فانہم غیر ملومین“ (یعنی وہ لوگ بیوی اور مملوکہ لونڈیوں کے سوا سب سے اپنی شرمگاہوں کو بچاتے ہیں) اس آیت میں بیویوں اور مملوکہ لونڈیوں کے سوا سب سے شرمگاہوں کو بچانے کا ذکر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بیویوں اور لونڈیوں کے سوا کسی اور طرح سے اعضائے مخصوصہ کو استعمال میں لانا حرام ہے۔ پھر اس میں یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ صرف بیویوں اور لونڈیوں سے مباشرت کرنا انسانی خصلت ہے، نہ کہ جانوروں کی۔ اس کے آگے یہ تاکید فرمادی ”فمن ابتغی وراء ذلک فاولئک ہم العادون“ (یعنی جو لوگ اس کے سوا کوئی اور صورت اختیار کریں تو وہ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں)۔ پس ثابت ہوا کہ عضو مخصوصہ کا استعمال بیوی یا مملوکہ لونڈی کے سوا اور کسی طرح سے مادہ تولید کے اخراج کے لئے حلال نہیں ہے کیونکہ یہ قانون فطرت سے تجاوز کرنا ہے۔ اس آیت سے ہاتھوں کے ذریعہ شہوت رانی کا حرام ہونا ثابت ہوا، کیونکہ ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنا اور فطرت انسانی کے دائرے سے نکل جانے والوں کا طریقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”ولیس تعفف الذین لا یجدون نکاحاً یغنیہم اللہ من فضلہ“ (یعنی جو لوگ نکاح نہ کر سکیں انھیں چاہیے کہ اپنے نفس کو روک رکھیں اللہ تعالیٰ انھیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا) مطلب یہ ہے کہ انھیں چاہیے کہ اپنے نفس کو روک رکھیں اور اس کی سرکشی کو لگام دے رکھیں تاکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے انھیں بے نیازی عطا فرمائے اور نکاح کی سبیل آسان بنادے۔ غرض یہ فعل بری عادت ہے اور کتاب و سنت کی رو سے حرام ہے۔ اگرچہ یہ گناہ زنا سے کم ہے کیونکہ اس سے ابتری اور نسل کی خرابی وغیرہ وہ برائیاں پیدا نہیں ہوتیں جو ارتکاب زنا سے ہوتی ہے۔

مالکیہ جلق (یا زلق) کے حرام ہونے کی دلیل میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد پیش کرتے ہیں ”یا معشر الشباب من استطاع منکم البائة فلیتزوج، فانہ اغض للبصر واحصن للفرج، ومن لم یستطع فعلیہ بالصوم، فانہ لہ وجاء“ (یعنی اے جو انوتم میں سے جو شخص شادی کی استطاعت رکھتا ہے اسے چاہیے کہ شادی کر لے۔ آنکھیں نیچی رکھنے اور شرمگاہ کی حفاظت کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہے۔ اگر شادی کا مقدور نہ ہو تو چاہیے کہ روزے رکھے اس طرح نفس کو دبایا جاسکتا ہے) بروایت ابن مسعود رضی اللہ عنہما۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر ہاتھ سے شہوت رانی شرعاً روا ہوتی تو رسول اللہ ﷺ اس کی ہدایت فرماتے۔ کیونکہ یہ فعل روزہ رکھنے کے مقابلہ میں زیادہ آسان ہے۔ اس کا ذکر نہ فرمانا (بجائے خود) اس کے حرام ہونے کی دلیل ہے۔ صاحب کتاب 'سبل السلام' فرماتے ہیں کہ بعض حنابلہ اور بعض علماء حنفیہ نے جلق لگانے کے فعل کو اس صورت میں مباح قرار دیا ہے جبکہ انسان کو زنا کی معصیت میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ لیکن یہ ایک ضعیف حجوز ہے اس کی طرف

حد سرقہ کا بیان

حد سرقہ (چوری کی سزائے شرعی) کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں اس طرح فرمایا ہے۔
 ”وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا جِزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ
 حَكِيْمٌ“ (چور خواہ عورت ہو یا مرد، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے
 عبرتناک سزا۔ اللہ غالب اور حکمت والا ہے)۔ (المائدہ: ۳۷)۔^(۱)

توجہ نہیں کرنی چاہئے۔

۱۔ چوری کی حد ان سزاؤں میں سے ہے جو قرآن و حدیث اور اجماع امت سے ثابت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے
 اس جرم کی سزا آیت بالا میں بیان فرمائی ہے۔ اس میں حکم ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ غلام
 ہو یا آزاد۔ مسلمان یا ہو یا غیر مسلم۔ اس کو یہ سزا اس لئے ہے کہ (دوسروں کے) مال کو محفوظ رکھا اور بچایا جاسکے۔ (چور کا)
 ہاتھ کاٹنے کی سزا اسلام سے پہلے عہد جاہلیت کا بھی دستور العمل تھا۔ اسلام کے آنے کے بعد اسے برقرار رکھا گیا لیکن چند
 عام شرائط کا اضافہ کر دیا گیا۔ جس طرح کہ ’قسامہ‘ (حصہ داری) اور ’دیت‘ (تاوان) دستور شریعہ اسلامیہ نے اسی طرح
 برقرار رکھا ہے جیسا کہ دور جاہلیت میں تھا اور جو اضافہ کیا گیا اس میں انسان کی بہتری کے تقاضوں کو پورے طور پر ملحوظ رکھا گیا۔
 کہا جاتا کہ سب سے پہلے جس کا ہاتھ کاٹا گیا وہ ایک قریشی مرد تھا جسے دو یک کہتے تھے۔ یہ شخص قبیلہ بنی علیج بن عمرو بن
 خزاعہ کا آزاد کردہ غلام تھا۔ اس نے کعبہ شریف کے خزانہ میں چوری کی تھی جس کی پاداش میں اس کا ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ کیا گیا۔

اسلام آجانے کے بعد سب سے پہلا چوری کرنے والا رسول اللہ ﷺ نے جس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا وہ مردوں
 میں سے خیار بن عدی بن نوفل بن عبد مناف تھا اور عورتوں میں سے قبیلہ بنی مخزوم کی ایک عورت مسماة مرة بنت سفیان بن
 عبد الاسد تھی اور سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس شخص کا بایاں ہاتھ کاٹا تھا جس نے حضرت ابو بکر صدیق کی بیوی اسماء
 بنت عمیس کا ہار چرایا تھا۔ اس کا داہنا ہاتھ پہلے کٹا ہوا تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس کا بایاں ہاتھ کاٹ دیا اور
 سیدنا عمر بن الخطاب نے ابن سمرہ کا ہاتھ کاٹا جو عبد الرحمن بن سمرہ کا بھائی تھا۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے چوری کرنے والے پر لعنت کی ہے جو اپنے نہایت قیمتی ہاتھ کو معمولی سی بے حقیقت چیز کی
 خاطر تلف کر دیتا ہے۔ بعض اصحاب نے یہاں یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہوا کہ صرف تین درہم (کا مال) چوری
 کرنے کی پاداش میں ہاتھ کاٹ دیا جائے جس کے تاوان کی مقدار پانچ سو (۵۰۰) دینار (اشرفی) ہے۔ اس کا جواب یہ
 ہے کہ ہاتھ وہی گراں قدر ہے جو امانت دار ہو اور جب ہاتھ خائن (یا بدیانت) ہو گیا تو وہ کم قدر ہو گیا۔ علاوہ اس کے علماء کا
 کہنا ہے کہ یہ حکم ہماری روشن شریعت کی مخفی مصلحتوں پر مبنی ہے کہ شارع نے سزا (یا معاوضہ) کی صورت میں ہاتھ کی قیمت
 پانچ سو (۵۰۰) دینار رکھی ہے تاکہ ہاتھ کی قدر تسلیم کی جائے اور اس کو نقصان پہنچانے کا جرم نہ کیا جائے۔ لیکن چوری
 کرنے کے بعد جبکہ ہاتھ نے امانت میں خیانت کی تو اسے ایک چوتھائی دینار کے برابر تصور کیا جانا مناسب ہے کہ صرف
 اس قدر مقدار کی چوری کرنے پر اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے تاکہ لوگوں کو چوری کرنے کی جرأت نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے سارق

کا ہاتھ کاٹنے کی جو سزا رکھی ہے اس کا سبب ”جزاء بما کسبا نکالاً من اللہ“ (یعنی ہاتھ کاٹنے کی عبرت تاک سزا اس کے اپنے ہاتھوں کے کرتوت کا نتیجہ ہے کہ دوسروں کا مال چرایا لہذا مناسب یہی ہے کہ جس نے اس فعل کے ارتکاب میں مدد کی اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ ”نکالاً من اللہ“ کا مطلب یہ ہے کہ یہ عبرت تاک سزا اللہ تعالیٰ نے ان ہاتھوں کے اپنے کرتوت کی پاداش میں رکھی ہے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔ چنانچہ ہاتھ کاٹ جانے کے باعث وہ شخص تمام عمر ذلیل رہتا ہے، اسے ذلت و رسوائی حاصل ہوتی ہے اور معاشرہ میں اس کی قدر گر جاتی ہے، غرض چوری کے سد باب اور لوگوں کے مال و جان اور آبرو کی حفاظت کے لئے یہ سب سے زیادہ موزوں سزا ہے۔

اس آیت کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ چوری کرنے والا مرد ہو یا عورت دونوں کا ہاتھ کاٹ دینا واجب ہے۔ پس اگر کسی مرد نے آزاد شخص کی چوری کی ہو یا غلام کی، اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ اگر عورت ایسا کرے تو اس کا ہاتھ بھی کاٹا جائے کیونکہ یہ دونوں گناہ ان دونوں ہی نے کیے ہیں لہذا اللہ نے دونوں کو سزا کا حکم دیا اور آیت میں ’واللہ عزیز‘ جو ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو اللہ پر کئی غالب آسکتا ہے اور نہ اسے کوئی نچا دکھا سکتا ہے وہ ’حکیم‘ ہے یعنی اس کے ہر فعل اور ہر ارشاد میں حکمت ہے چنانچہ اس کی مقرر فرمودہ سزائیں اور تعزیرات شرعیہ عین حکمت و مصلحت کے مطابق ہیں جس کے باعث معاشرہ مفاسد سے پاک اور امن و عافیت سے بہرہ ور ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے چوری کی سزا کا ذکر اپنی کتاب عزیز میں فرمایا ہے اور اس کی صراحت و وضاحت اسی طرح فرمائی ہے جیسے سزائے زنا کی کیونکہ ان دونوں جرائم کی سزائوں کو معاشرہ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان سزائوں کے بارے میں مرد اور عورت دونوں کا ذکر کرنے کی غرض وضاحت حکم تھی۔ باقی احکام شرعی کا ذکر بالعموم مشترکہ طور پر آیا ہے۔ مردوں کے متعلق مخصوص احکام مثلاً امامت (حکومت) اور جنگ (جہاد) کے علاوہ جملہ احکامات مشترکہ مرد و زن کیلئے تغلیباً مذکور کی ضمیر استعمال فرمائی ہے۔ لیکن یہاں ایسا نہیں ہے تاکہ کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ چونکہ (چوری اور زنا کی سزائوں کے لئے) مذکور ہی کی ضمیر استعمال کی گئی ہے۔ لہذا ’حد‘ صرف مردوں پر عائد ہوگی عورتوں پر نہ ہوگی۔

واضح ہو کہ اس آیت میں ’سارق‘ کا لفظ ’سارقہ‘ سے پہلے آیا ہے اس کے برعکس زنا والی آیت میں ’زانیہ‘ کا ذکر ’زانی‘ سے پہلے آیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مال کی حرص مردوں میں عورت سے زیادہ ہوتی ہے اور اکثر مرد ہی چوری کرتے ہیں اس لئے چوری میں مرتکبین میں پہلے چوری کرنے والے کا ذکر کیا اور عورتوں میں حظ نفس سے متمتع ہونے کی خواہش زیادہ ہوتی ہے۔ پس خواہش نفس میں زیادہ ملوث ہونے کے باعث جرم زنا کے سلسلہ میں ان کا ذکر پہلے آیا۔ اگرچہ عورتوں میں شرم کا عنصر بھی ساتھ کے ساتھ ہوتا ہے لیکن جب وہ بدکاری (بے حیائی) پر اتر آتی ہیں تو ان کی حیا یک قلم مفقود ہو جاتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ عورت کا برے کام میں مبتلا ہونا (بہ نسبت مردوں کے) زیادہ شرم کی بات ہے۔ اور حمل ہو جائے تو (عورت کے لئے) سخت ضرر رساں ہوتا ہے۔ درحقیقت عورتوں کو ہی زیادہ باحیثیت ہونا چاہیے کیونکہ ان کا اصل مقام گھر کے اندر پردہ میں رہنا ہے اور مکان ان کا محافظ ہوتا ہے۔ اس کی اہمیت اور تاکید کے پیش نظر (مرد سے) پہلے عورت کا ذکر آیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا مقرر فرمائی ہے، کیونکہ ہاتھ ہی سے مال چرایا جاتا ہے اور وہی انسان کو مستوجب سزا بنادیتا ہے۔ لیکن زنا کی سزا عضو مخصوص کاٹ دینا نہیں ہے۔ حالانکہ ارتکاب گناہ کا آلہ یہی ہے اور یہ عورت

سے ملوث ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ چور کے پاس کٹے ہوئے ہاتھ کی مانند ایک اور ہاتھ ہے۔ اگر ایک ہاتھ سے محروم ہو جاتا ہے تو دوسرے ہاتھ سے اپنا کام چلا لیتا ہے۔ لیکن زنا کار کے پاس عضو مخصوص جیسا دوسرا عضو نہیں ہے، وہ اس کے تلف ہو جانے پر دوسرے سے کام نہیں لے سکتا جو اس مقصد کو پورا کر سکے۔ علاوہ اس کے عضو مخصوص کے کاٹے جانے سے اس کی نسل ہی منقطع ہو جاتی ہے۔ ہاتھ کے کاٹنے سے نسل کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ غرض معاشرہ کے لئے اس (کے اتلاف میں) سب سے زیادہ خطرہ ہے۔

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ”فاقطعوا“ کا لفظ آیا ہے (یعنی قطع کر دو) قطع کے معنی دور کرنے اور جدا کر دینے کے ہیں اور قطع ید (یعنی ہاتھ کاٹنے کی سزا) اس وقت تک واجب نہیں ہے جب تک کہ چوری کرنے والے، چوری کے مال اور جائے وقوعہ یا چوری کرنے کی جگہ کے بارے میں حسب ذیل شرائط پوری نہ ہوں۔

چوری کرنے والے کے مستوجب سزا ہونے میں ان پانچ باتوں کو ملحوظ رکھنا ہوگا:

(۱) بالغ ہونا: پس اگر کوئی نابالغ بچہ چوری کر لے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ کیونکہ وہ شرعی نقطہ نظر سے غیر مکلف ہے (یعنی احکام شریعت کی بجا آوری کا پابند نہیں ہے)۔

(۲) عاقل ہونا: پس جنون زدہ کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، تا آنکہ اسے مرض جنون سے افاقہ نہ ہو جائے۔

(۳) یہ کہ مال مسروقہ پر کوئی حق ملکیت نہ ہو۔ چنانچہ اگر باپ نے اپنے بیٹے کا مال چرایا تو اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہوگی، اسی طرح بیٹا اگر باپ کا مال چرائے تو اس کا ہاتھ بھی نہیں کاٹا جائے گا۔

(۴) یہ کہ چرانے والے کو اس مال پر حق ولایت (دیکھ بھال کا اختیار) نہ ہو۔ چنانچہ غلام اگر اپنے آقا کے مال میں چوری کرے تو اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے اسی طرح آقا بھی اگر اپنے غلام کے مال میں سے لے لے تو بہر حال اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے کیونکہ غلام اور اس کا مال آقا کا مال ہے۔ غلام کا مال لے لینا اپنا ہی مال لے لینا ہے۔ لہذا چوری کی سزا نہیں دی جائے گی۔

(۵) یہ کہ وہ شخص دشمن ملک میں برسر جنگ نہ ہو۔ اور یہ کہ اس نے قصد چوری کی ہو چوری کرنے پر مجبور نہ کیا گیا ہو۔ چنانچہ وہ مجاہد جو مال غنیمت میں سے چوری کر لے اس پر حد عائد نہ ہوگی۔ روایت ہے کہ ایک غلام نے خمس کے مال میں سے چوری کی۔ اس کا معاملہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش ہوا۔ آپ نے اسے (سزائے سرقہ) ہاتھ کاٹنے سے بری فرمایا۔ آپ کا ارشاد ہے ”مال اللہ سرق بعضہ بعضا“ (یعنی دونوں اللہ کا مال ہیں ایک نے دوسرے کی چوری کی تو کیا ہوا؟) جہاد کے میدان میں بھی حدود (شرعی سزائوں) کا نفاذ نہیں ہوتا۔

مستوجب حد چوری کا مال وہ ہے جس میں یہ چار شرطیں ہوں:

(۱) نصاب (مقدار مال سرقہ مستوجب حد)، اس سے مراد مال کی وہ مقدار ہے جس سے کم کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جائے گی۔

(۲) مال سے مراد وہ شے ہے جسے مال تسلیم کیا گیا ہو یعنی وہ شے جو ملکیت میں آنے والی ہو اور اس کی خرید و فروخت حلال ہو۔ لہذا شراب، سوہ اور آلات لہو و لعب کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

(۳) یہ کہ مال مسروقہ پر چرانے والے کا نہ کوئی حق ہو نہ حق کا شبہ (یا امکان) ہو مثلاً مال مرہونہ یا کرایہ پر لی ہوئی

شے چرائی گئی (تو وہ چوری ہے کیونکہ یقینی طور پر وہ اس کا مالک نہیں ہے) لیکن اگر کسی نے مال غنیمت میں سے یا بیت المال سے چوری کی تو وہ چوری نہیں ہے کیونکہ اس میں علی الترتیب ملکیت کا شبہ امکان یا کسی قدر حق ملکیت ہے اور امام علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص ان کے سامنے لایا گیا جس نے مال خمس میں سے ایک خود چرایا تھا آپ نے اس کا ہاتھ کاٹ دینے کی رائے نہیں دی اور فرمایا کہ اس مال میں اس کا حصہ ہے (یعنی اس خود کے مالک ہونے کا امکان تھا)۔

(۴) یہ کہ مال مسروقہ ایسی شے ہو جس کے چرائے جانے کی تصدیق ہو سکے مثلاً صغیر غلام یا گونگا بالغ انسان۔ پس جس شیئی کو سرقت تسلیم نہ کیا جاسکے مثلاً بولنے کی صلاحیت رکھنے والا غلام چوری ہو تو اس جرم کی سزا میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

رہ گئی وہ شرط جو مقام واردات (یا چوری کی جگہ) سے تعلق رکھتی ہے وہ صرف ایک ہے یعنی حرز (یا حفاظت) پس جس شے کا کوئی محافظ ہے وہی اس کا 'حرز' ہے۔ چنانچہ مکان، فرودگاہیں اور دوکانیں ان اشیاء کی حرز (یا محافظ) ہیں جو ان میں موجود ہیں اور ہر شے جس کا کوئی بھی محافظ ہے وہی اس کا 'حرز' ہے خواہ ان اشیاء کا مالک موجود ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح بیت المال (سرکاری خزانہ) مسلمانوں کی جمعیت کے حق میں حرز (محافظ) اور اس مال میں چور کو کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اگرچہ اس مال میں ایسی شے موجود ہو جو امام اس شخص کو دے سکتا ہے۔ لیکن دراصل ہر مسلمان کا حق عطیہ کے ساتھ متعین ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ امام (حاکم اسلام) کو یہ حق ہے کہ وہ تمام کا تمام مال (عوام کی بہتری کے لئے) کسی بھی مصرف میں لگا دے اور لوگوں میں تقسیم نہ کرے۔ یا اس مال کو کسی ایک شہر میں صرف کرے اور دوسرے میں نہ کرے یا کسی خاص جماعت کو نہ دے اور دوسری جماعت کو دے دے۔ پس درآنحالیکہ چوری کرنے والا ایسے مال کی چوری کرتا ہے جس میں ہنوز اسے کوئی حق حاصل نہیں ہے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے۔

واضح ہو کہ جانور جس کی پیٹھ پر مال لدا ہوا ہے۔ وہی جانور اس مال کا حرز (یا محافظ) متصور ہوگا۔ دوکانوں کے آس پاس کی جگہ بھی جس میں فروخت کا مال رکھا گیا ہو وہ جگہ بھی حرز ہے۔ گو وہ جگہ دوکان نہیں ہے اور گو وہاں پر مالک موجود نہ ہو اور چوری رات کے وقت کی جائے یا دن کے وقت۔

اسی طرح بازار میں بھیڑ بکریوں کے رکھنے کی جگہ بھی 'حرز' ہے۔ خواہ جانور رسی سے بندھے ہوئے ہوں یا نہ ہوں۔ مویشی اپنے اپنے تھان پر بھی حرز (حفاظت) کے اندر متصور ہوں گے خواہ ان کے مالک وہاں موجود ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن اگر کوئی جانور مسجد کے دروازے پر یا بازار میں ہوا سے حفاظت (یا حرز) کے تحت تصور نہیں کیا جائے گا۔ تا آنکہ اس کا محافظ موجود نہ ہو۔ تاہم اگر اس کے قرب و جوار میں جانور کوری سے باندھ دیا ہو یا وہ جگہ ہی ایسی تھی جہاں جانور کو باندھا جاتا ہے تو وہی جگہ 'حرز' متصور ہوگی۔

کشتی اس مال اور سامان کی حرز (محافظ) ہے جو اس کے اندر ہے خواہ اسے کھلا چھوڑ دیا گیا ہو یا باندھ رکھا ہو۔ پس اگر پوری کشتی چرائی جائے تو وہ بار بار جانور کی چوری کی مانند ہے۔ لیکن اگر کشتی کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہو تو وہ حرز کے اندر (یا محفوظ) مال متصور نہ ہوگی۔ ہاں اگر کشتی کے مالک نے کسی جگہ پر باندھ کر لنگر انداز کر دیا ہو تو یہی اس کے لئے حرز ہے۔ اسی طرح اگر کشتی کے ساتھ کوئی شخص موجود ہے تو خواہ وہ کسی مقام پر ہو محفوظ متصور ہوگی۔ اسی طرح وہ جانور جو مسجد کے

دروازہ پر ہو اور کوئی اس شخص کے ساتھ ہو تو وہ شخص اس کا حرز ہے۔ اگر کشتی پر سفر کرنے والے بدوران سفر کسی جگہ پر اتر گئے اور کشتی کو باندھ دیا تو یہ حرز ہے۔ خواہ کشتی کا مالک وہاں موجود ہو یا نہ ہو۔

اگر ایک گھر میں چند اشخاص قیام پذیر ہوں مثلاً ہوٹل جہاں ہر شخص اپنے اپنے کمروں میں ٹھہرتا ہے یا طالب علموں کی اقامت گاہیں (ہوٹل) کہ ہر طالب علم جدا جدا حجروں میں رہتا ہے اگر ایسے شخص کی اقامت گاہ سے کوئی شخص چوری کرے اور مال مسروقہ کو لے کر محن میں آ گیا ہو تو اسے چور قرار دیا جائے گا اور اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اگرچہ وہ ہنوز اس مال کو اپنے گھر نہ لے گیا ہو اور نہ احاطہ سے باہر گیا ہو۔ لیکن اگر کسی نے کمرے کے بیرونی حصے سے کوئی چیز اٹھالی جس کی مالیت نصاب (مال سرقہ کی مقدار) کے برابر ہے تو اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا۔ اگرچہ وہ اس مال کو اپنے گھر میں لے آیا ہو۔ یا گھر کے دروازے سے باہر لے گیا ہو۔ کیونکہ گھر کی حدود سے باہر کی جگہ ہر شخص کے واسطے خرید و فروخت کے لئے کھلی ہے۔ تاہم اگر وہ مال مسروقہ مویشی ہے جسے رسی سے باندھ رکھا ہو یا یاکیسل کو قفل لگا ہوا ہو یا اسی قسم کا کوئی اور مال ہو، تو ایسی صورت میں اس شخص کا ہاتھ کاٹ دیا جائیگا۔

چوری کیا ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟

چوری میں تین امور کا پایا جانا ضروری ہے: چوری کرنے والا۔ چوری کا مال اور چوری کا عمل۔ ان تینوں امور کے لازمی اجزاء کا ذکر اوپر آچکا ہے (اب ہر ایک کی تفصیل ملاحظہ ہو)۔

چوری یہ ہے کہ ایک عاقل و بالغ شخص، مقررہ مقدار کا مال یا اس مقدار کی 'ہم بہا' کوئی سے جسے (حرز کے اندر) یا بچا کر رکھا گیا ہو چھپ کر (بے خبری میں) اٹھالے جائے۔ بشرطیکہ وہ شخص نہ تو اس مال کا مالک ہو اور نہ کسی طرح بھی اس کے مالک ہونے کا شبہ کیا جاسکے۔ اور نہ وہ مال اس کی سپردگی میں دیا گیا ہو۔ نیز یہ کہ چوری کرنے والے کو چرانے پر مجبور نہ کیا گیا ہو خواہ وہ شخص مسلمان ہو یا ذمی (اسلامی ملک کی غیر مسلم رعایا) یا مرتد مرد ہو یا عورت۔ آزاد ہو یا غلام (مملوک) چور میں جب یہ تمام باتیں پائی جائیں تو اس پر حد (سزائے شرعی) کا نفاذ لازمی ہوگا۔ یعنی اس کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا جائیگا۔ بشرطیکہ وہ ہاتھ سالم ہو۔ اگر وہ ہاتھ کٹا ہوا یا شل (ناکارہ) ہے تو اس کا بائیں ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اس پر جملہ علمائے امت کا اتفاق ہے اور کسی کو بھی اس سے اختلاف نہیں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہر شخص مال کا خواہش مند ہوتا ہے۔ انسان کی طبیعت اس کی جانب راغب ہوتی ہے۔ خاص کر اس وقت جبکہ وہ شے ضروری ہو اور انسان اس کا حاجت مند ہو۔ ادھر نوع بشر میں ایسے اشخاص ہیں جو نہ عقل کی بات مانتے ہیں نہ ان میں شرم ہوتی ہے نہ دیانت داری کا خیال ہوتا ہے اور نہ مروت و ایمان داری کی پروا کرتے ہیں۔ اب اگر ہاتھ کاٹنے یا دار پر چڑھائے جانے کی سزا کے ذریعہ ان پر شرعی پابندی عائد نہ کی جائے تو یہ لوگ پرایا مال علانیہ، زبردستی یا چھپ چھپا کر حاصل کرنے کی کوشش کریں گے اور اس میں جو خرابی ہے وہ ظاہر ہے۔ شریعت اسلامیہ نے علانیہ یا چھپ چھپا کر ہر قسم کی چھوٹی بڑی چوری کا سد باب کرنے کے لئے سخت پابندی لگا دی ہے۔ جس کا مقصد بندگان خدا کی بھلائی ہے۔

ہاتھ کاٹنے کی سزا غلام اور آزاد دونوں کے لئے یکساں ہے کیونکہ سزا کا یہ حکم عام ہے (کسی کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا) اور اس لئے بھی کہ (دوسری سزاؤں کی طرح) اس سزا کو آدھا نہیں کیا جاسکتا۔ پس غلام کو بھی وہی پوری سزا ملے گی جو

آزاد کے لئے ہے تاکہ لوگوں کا مال محفوظ رہے۔

مال مسروقہ کا نصاب (یعنی کم سے کم مقدار)

حنفیہ کہتے ہیں کہ چوری (مستوجب حد) وہ قرار دی جائے گی جس کی کم سے کم مقدار خالص دھات (سونے) کا ایک دینار (یا اشرفی) ہے یا دس درہم کا سکہ ہے یا ان میں سے کسی ایک (یعنی اشرفی یا دس درہم) کی مالیت کی شے ہے۔ اس میں ایک قول ضعیف یہ بھی ہے کہ اگر چوری درہم کی نہ ہو تو اس مالیت کی کوئی بھی شے ہو تو اسے چور قرار دیا جائے گا۔ خواہ اتنی مالیت کا سونا ہو (یعنی اس سے کم مالیت کا سونا چرایا جائے تو اسے حد کا موجب قرار نہ دیا جائے گا) اس بارے میں ان اصحاب کی دلیل وہ روایت ہے جو حضرت ابن عباس اور ابن ام ایمن رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ یہ دونوں اصحاب کہتے ہیں کہ عہد نبوی میں آنحضرت ﷺ نے مجن (ذرہ یا ڈھال) چرانے والے کو ہاتھ کاٹنے کی سزا دی تھی۔ اس ذرہ کی قیمت دس درہم تھی نیز عمرو بن شعیب نے اپنے باپ سے انھوں نے اس کے دادا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”لا تقطع ید السارق فی دون ثمن المجن“ (یعنی ایک مجن سے کم مالیت کی شے چرانے پر ہاتھ نہ کاٹا جائے) اور وہ کہتے ہیں کہ مجن (ذرہ یا ڈھال) کی قیمت دس درہم تھی۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ ابن عباس اور عبداللہ بن عمرو نے مجن کی قیمت متعین کرنے میں حضرت ابن عمر کی رائے سے اختلاف کیا ہے۔ پس احتیاط اس میں ہے کہ اس بارے میں زیادہ مقدار کو اختیار کیا جائے کیونکہ شبہ کی صورت میں سزا ساقط ہو جاتی ہے کم قیمت کے تعین سے عدم صدور جرم کے شبہ کا امکان ہے۔ پس جو مقدار زیادہ ہو اسی کا تعین بہتر ہے۔ اسی طرح معمولی مال کو درگزر کر کے معاف کر دینا اور عضو (ہاتھ) اہمیت کو مد نظر رکھنا ممکن ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ مال سرقہ (واجب الحد) کی مقدار خالص دھات (چاندی) کے ڈھلے ہوئے تین درہم ہیں پس اگر اس قدر رقم یا اس مقدار کی یا اس سے زیادہ مالیت کی کوئی چیز چوری کی جائے۔ خواہ وہ سامان خانہ ہو یا جانور ہو تو حد جاری کی جائے گی۔ یعنی چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ مالکیہ اس کی دلیل میں وہ روایت پیش کرتے ہیں جو نافع نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تین درہم کے ایک مجن (یعنی ذرہ یا ڈھال) کی چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا دی تھی۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم نے اخراج فرمائی ہے۔ اور امام مالک فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے لیموؤں کی چوری پر جن کی قیمت تین درہم تھی ہاتھ کاٹنے کی سزا دی۔ وہ کہتے ہیں کہ اس بارے میں جتنی روایات میں نے سنی ہیں میرے نزدیک یہ روایت سب سے زیادہ قابل تسلیم ہے نیز یہ روایت سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس کو مالک نے عبداللہ بن ابی بکر سے انھوں نے اپنے باپ سے اور انھوں نے عروہ بنت عبدالرحمن سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے سیدنا عثمان کے عہد میں لیموؤں کی چوری کی۔ آپ نے حکم دیا کہ ان کی قیمت لگائی جائے ان کی قیمت تین درہم لگائی گئی۔ جبکہ بارہ درہم کا ایک دینار ہوتا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس شخص کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ مالکیہ کہتے ہیں کہ مشہور یہ ہے کہ اسی پر عمل درآمد ہے اور اس سے کسی نے انکار نہیں کیا اور ایسی صورت میں اسی پر اجماع سکوتی کیا جائے گا۔ (یعنی خاموشی کو تائید تصور کیا جائے گا)۔ مالکیہ کہتے ہیں کہ یہ روایت اس امر کا ثبوت ہے کہ پھلوں کی

چوری پر بھی ہاتھ کاٹنا جائز ہے اور مال سرقہ کی واجب الحد مقدار تین درہم جو مقرر کی گئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مال مسروقہ اتنی مالیت کا نہ ہو گو وہ ایک چوتھائی دینار کی مالیت رکھتا ہو تو ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جائیگی۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ سرقہ واجب الحد میں مال مسروقہ کی مقدار ایک چوتھائی دینار ہے یا پھر اسی مالیت کے یا اس سے زیادہ کے درہم ہوں یا قیمتی اشیاء یا سامان خانہ۔ یعنی ان کے نزدیک اشیاء مسروقہ کی مالیت کا معیار دینار ہے۔ اسی بناء پر وہ دو درہموں کی مالیت کا تعین کرتے ہیں۔ چنانچہ تین درہم اگر ایک چوتھائی دینار کے برابر نہ ہوں تو ان کے چرانے پر ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جائے گی۔ وہ اپنے مسلک کی دلیل میں وہ روایت پیش کرتے ہیں جسے شیخین، بخاری و مسلم نے بطریق زہری، عمرہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اخرج فرمایا ہے۔ ان کا کہنا ہے ”لا تقطع يد السارق الا في ربع دينار فصاعدا“ (یعنی چوری کرنے والے کا ہاتھ کاٹنے کی سزا اس صورت میں دی جائے گی جبکہ مال مسروقہ کی مالیت ایک چوتھائی دینار یا اس سے زیادہ ہو) یہ روایت متفق علیہ ہے۔ اور مسلم کی ایک روایت بطریق ابو بکر بن محمد بن عمرو بن حزم اور عمرہ سے ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”لا تقطع يد السارق الا في ربع دينار فصاعدا“ (یعنی چوری کرنے والے کا ہاتھ نہ کاٹا جائے تا آنکہ مال مسروقہ کی مالیت ایک چوتھائی دینار نہ ہو)۔ شافعیہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس بارے میں قطعی ہے اور مال مسروقہ (واجب الحد) کی مالیت صرف ایک چوتھائی دینار نہ کہ کچھ اور تسلیم کیے جانے کے بارے میں واضح ہے۔ نیز وہ کہتے ہیں کہ مجن (مسروقہ) کی قیمت والی حدیث جس میں تین درہم اس کی مالیت بتائی گئی ہے وہ اس کے خلاف نہیں ہے کیونکہ اس وقت دینار بارہ درہم کا ہوتا تھا اور تین درہم ایک دینار کی چوتھائی ہے۔ لہذا دونوں روایتوں میں اس لحاظ سے فرق نہ رہا۔ یہی مسلک حضرت عمر بن الخطاب و عثمان بن عفان اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز، لیث بن سعد، اوزاعی، اسحق بن راہویہ اور ابو ثور رحمہم اللہ علیہم اجمعین بھی اس مسلک کے قائل تھے۔ غرض شافعیہ کا کہنا ہے کہ مختلف آراء میں سے قابل ترجیح رائے یہی ہے کہ اس مجن (زرہ یا ڈھال) کی قیمت تین درہم تھی جیسا کہ ابن عمر کی (مروی) حدیث میں آیا ہے اور جس پر جملہ محدثین کا اتفاق ہے، باقی وہ احادیث جو اس کے خلاف ہیں وہ صحت میں اس روایت کے ہم پلہ نہیں ہیں۔

ابن العربی فرماتے ہیں کہ حضرت سفیان ثوری جو ایک جلیل القدر محدث ہیں، ان کی رائے یہ ہے کہ جب تک مال مسروقہ دس درہم کا نہ ہو چوری کرنے والے کو ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ دی جائے جیسا کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔ کیونکہ انسان کے ہاتھ کا قابل قدر ہونا سب کے نزدیک مسلم ہے اور اس کا تلف کرنا روا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس پر تمام علماء کا اتفاق نہ ہو جائے اور تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ دس درہم کی چوری ہی مستوجب حد ہے۔ لہذا اس قول کو اختیار کیا جائے۔ تا آنکہ اس کی بجائے کسی اور فیصلہ پر اتفاق نہ ہو۔

حنابلہ کہتے ہیں کہ شرعی اعتبار سے (مال مسروقہ واجب الحد کی) مقدار ایک چوتھائی دینار یا تین درہم ہے پس حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کردہ احادیث کی بناء پر جس شخص نے اتنی رقم یا اس کے مساوی مالیت کی چیز چوری کی اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ امام احمد کی روایت میں جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے یہ الفاظ آئے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اقطعوا في ربع دينار، ولا تقطعوا فيما هو ادنى من

جو بھی چوری کرے، خواہ مرد ہو یا عورت اس کا دایاں ہاتھ کاٹ دو^(۱)

ذکر“ (یعنی ایک چوتھائی دینار کی چوری ہو تو ہاتھ کاٹنے کی سزا دو اور اس سے کم میں نہ کاٹو) اور ان دنوں ایک چوتھائی دینار تین درہم کا اور ایک دینار بارہ درہم کا ہوتا تھا۔ نسائی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں ”لا تقطع يد السارق فيما دون ثمن المعجن، قيل لعائشة رضي الله عنها وما هو ثمن المعجن؟ قالت ربع دينار“ (یعنی چور کو ہاتھ کاٹنے کی سزا ایک مجن سے کم مالیت کی چوری میں نہ دی جائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا گیا کہ اس کی کیا قیمت ہوتی ہے فرمایا ایک چوتھائی دینار) ان تمام نصوص سے ثابت ہے کہ دس درہم کی کوئی شرط نہیں ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

کتنا ہاتھ کاٹا جائے گا؟

۱۔ ائمہ فقہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا اس پر اتفاق ہے کہ جب چوری کرنے پر حد سرقہ (یعنی ہاتھ کاٹنے کی سزا) واجب ہو جائے اور یہ جرم اس سے پہلی بار سرزد ہوا ہو جس پر یہ سزا دی جانی ہے اور اس کے اعضاء صحیح سالم ہوں تو سب سے پہلے اس کا دایاں ہاتھ کلائی کے جوڑ سے کاٹ دیا جائے۔ پھر اہلتے ہوئے تیل سے اس کا خون بند کیا جائے۔ اس حکم کا سبب یہ ہے کہ چوری ہاتھ ہی سے کی جاتی ہے جو کلائی اور پہنچے پر قائم ہے اسی طرح جیسے انسان کے جسم پر یہ اعضاء قائم ہیں۔ اور سزا اسی عضو کو دی جائے جس سے جرم سرزد ہوا ہو اس کے لئے سب سے پہلے دائیں ہاتھ ہی سے کام لیا جاتا ہے اور گو بعض اشخاص میں اس کے خلاف ہوتا ہے، تاہم بیشتر صورتوں میں اسی سے کام لیا جاتا ہے۔ نیز رسول اللہ ﷺ نے مخزومیہ اور دوسرے چوری کرنے والوں پر حد کے نفاذ میں یہی عمل فرمایا ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے آیت سرقہ کو ”فاقطعوا ايما لهما“ پڑھا ہے (یعنی چوری کرنے والے مرد یا عورت کا دایاں ہاتھ کاٹ دو) اس سے مفہوم آیت کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ یہاں دایاں ہاتھ ہی کاٹنے کا حکم ہے۔ بہر حال اس حکم پر تمام امت کا اتفاق ہے۔ اگر کوئی شخص دوسری بار چوری کرے اور ہاتھ کاٹنے کی سزا پا چکا ہو تو اس کا بائیں پاؤں ٹخنے سے کاٹ دیا جائے اور خون کو روکنے کے لئے اس جگہ کو آگ سے یا اہلتے ہوئے تیل سے داغ دیا جائے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اور تمام صحابہ نے اس پر عمل کیا۔ چنانچہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ”زند“ کے ایک شخص کو چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹنے کی سزا دی اور فرمایا ”فاقطعوه واحسموه“ (یعنی اس کا ہاتھ کاٹ دو اور داغ دے کر اس کے زخم کا علاج کرو) یہ حکم اس لئے کہ اگر عضو بریدہ کا علاج نہ کیا گیا تو وہ شخص مرجائے گا کیونکہ کسی اور طریقہ سے خون کو بند نہیں کیا جاسکتا۔ اس سزا کا مقصد سزائش ہے۔ ہلاک کرنا نہیں ہے۔ اسی لئے حکم ہے کہ گرمی کی شدت یا سخت سردی کے دنوں میں ہاتھ نہ کاٹا جائے کیونکہ اس سے چوری کرنے والے کو (غیر ضروری) ایذا ہوگی۔

علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ اگر چوری کرنے والا تیسری بار چوری کرے تو آیا اسے عضو کاٹنے کی سزا دی جائے یا نہیں؟

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹ دیا گیا ہو اور دوسری بار جرم کا ارتکاب کرے اور اس کا بائیں پاؤں بھی کاٹ دیا گیا ہو تو تیسری بار ارتکاب جرم پر اسے کوئی سزا نہ دی جائے گی بلکہ وہ مال مسروقہ کا صرف تاوان ادا کرے گا۔ البتہ اسے قید کر دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ چوری کرنے سے توبہ کر لے۔ دراصل جرم سرقہ کی سزا کی غرض

سرزنش ہے ہلاک کرنا مد نظر نہیں ہوتا۔ تاہم شرعی سزائیں گناہ کبیرہ سے باز رکھنے کی غرض سے دی جاتی ہیں، قیمتی جان کو تلف کرنے کے لئے نہیں ہوتیں۔ پس ہر ایسی سزا جو جان کو بالکل ہلاک کر دینے یا ایک لحاظ سے ہلاکت کا موجب ہو وہ شرع کی رو سے حد نہیں ہے۔ اب اگر اس طرح عضو کو کاٹ دیا جائے کہ کلیۃً انسان ناکارہ ہو جائے تو یہ بھی ایک لحاظ سے ہلاک کرنا ہے اور اسے حکم شرع نہیں کہیں گے۔ لہذا اگر تیسری بار چوری کرنے والے کا بایاں ہاتھ کاٹ دیں اور چوتھی بار چوری کرنے پر دایاں پاؤں بھی کاٹ دیا جائے تو وہ شخص گرفت کرنے اور چلنے سے کلیتہً محروم ہو جائے گا اور یہ شرعی سزا نہ ہوگی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس ارشاد میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ مجھے اس میں خدا کا خوف آتا ہے کہ میں مجرم کا کوئی ہاتھ باقی نہ رہنے دوں کہ وہ کھاسکے یا طہارت کر سکے اور نہ پاؤں باقی رکھوں کہ وہ چل سکے۔ تمام صحابہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس قول کو بطور دلیل پیش کیا ہے اور اس پر تمام جماعت کا اجماع ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ان کے سامنے ایک ایسے شخص کو پیش کیا گیا جس کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں چوری کی پادش میں کاٹ دیا گیا تھا اس کا نام 'سدوم' تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارادہ کیا کہ اسے 'قطع' کی سزا دی جائے لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کی (سابقہ) سزا ایک ہاتھ اور ایک پیر کا کاٹنا جانا کافی ہے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اس کی سابقہ سزاؤں کو کافی سمجھا اور مزید قطع عضو کی سزا نہیں دی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ فتویٰ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اپنے ارادے سے باز رہنا ایسی بات ہے جس سے کسی نے انکار نہیں کیا۔ اور کسی کا اس سے اختلاف نہ کرنا اجماع صحابہ کی دلیل ہے۔ یا پھر یہ سمجھا جائے کہ ان اصحاب کو شرع کا یہی حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہوا تھا۔

واضح ہو کہ یہ حکم قصاص کے حکم سے اختلاف رکھتا ہے کیونکہ قصاص میں حقوق العباد کا معاملہ ہے جس میں ایک بندہ کا حق ادا کیا جاتا ہے (یعنی یہ ایک شخص کی جان کے عوض جان کا معاملہ ہے)۔ علاوہ اس کے (چوری کا) ایسا جرم نادر وقوع ہے۔ ایسا ہونا شاذ و نادر ہی ممکن ہے کہ ایک شخص چوری کی پاداش میں اپنے ہاتھ پاؤں کٹوا کر پھر بھی چوری کا ارتکاب کرے۔ سزائیں ایسے جرائم کی (مقرر) ہوتی ہیں جن کے ارتکاب کا امکان غالب ہو۔

رہی وہ حدیث جس میں چور کے چاروں اعضاء کاٹے جانے کا ذکر ہے اس کی صحت کے بارے میں طحاوی کو اعتراض ہے۔ پھر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگر یہ حدیث صحیح ہوتی تو صحابہ کرام علی رضی اللہ عنہ کے کہنے پر احتجاج فرماتے اور آپ یقیناً اپنے قول سے رجوع فرمالیتے۔ اب در آنحالیکہ صحابہ نے اس دلیل کو جان کر بھی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ارشاد کو ترجیح دی اور کوئی اعتراض نہیں کیا تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ حدیث صحیح نہیں ہے۔

اگر چوری کرنے والے کا ہاتھ ہی سرے سے نہ ہو یا کٹا ہوا ہو تو اس کا بایاں پاؤں ٹخنے سے کاٹ دیا جائے اگر بایاں پاؤں بھی کٹا ہوا ہو تو اب اسے قطع عضو کی سزا نہ دی جائے کیونکہ یہ اس کی (جزوی) ہلاکت کا موجب ہوگا جیسا کہ اوپر بتایا گیا۔ ایسے شخص کو مال مسروقہ کا تاوان ادا کرنا ہوگا اور جب تک کہ وہ توبہ نہ کرے اسے قید میں رکھا جائے گا۔

اگر چوری کرنے والے کا بایاں ہاتھ کٹا ہوا یا شل ہو یا انگوٹھا اور ساتھ کی دو انگلیاں یا ایک روایت کے بموجب تین انگلیاں کٹی ہوئی ہوں یا اس کا دایاں پاؤں کٹا ہوا یا شل ہو کہ چل نہ سکتا ہو تو اس کا نہ دایاں ہاتھ کاٹا جائے اور نہ بایاں

پاؤں کاٹا جائے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اگر صورت حال یہ ہو کہ دایاں ہاتھ کاٹنے کے بعد وہ بائیں ہاتھ سے کام نہ لے سکے یا اس کا دایاں پاؤں کسی حادثہ کے باعث پہلے ہی ناکارہ ہو تو اسے قطع عضو کی سزا نہ دی جائے کیونکہ ایسا کرنے سے کام لینے کی صلاحیت کلیتہً مفقود ہو جائے گی اور گرفت کرنے یا چلنے کی قوت کا بالکل خاتمہ ہو جائے گا۔ دراصل ہاتھ کی صلاحیت کا انحصار انگوٹھے پر ہے۔ اس کے نہ ہونے یا شل ہو جانے سے پورا ہاتھ ناکارہ ہو جاتا ہے۔ اگر انگوٹھے کے سوا صرف ایک انگلی کٹی ہوئی ہو یا ناکارہ ہو تو ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جائے گی کیونکہ صرف ایک انگلی کے نہ ہونے سے پکڑنے کی قوت میں زیادہ خرابی نہیں ہوتی۔ بخلاف اس کے دو انگلیوں کا نہ ہونا نقصان دہ ہے کیونکہ پکڑنے کے بارے میں یہ انگلیاں انگوٹھے کی مانند ہیں۔ اگر دایاں ہاتھ ایک لحاظ سے شل ہو یا انگلیوں میں خرابی ہو تو ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جائے گی۔

مالکیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص پہلی بار چوری کرے تو اس کا دایاں ہاتھ پینچے سے کاٹ دیا جائے پھر اسے آگ سے یا کھولتے ہوئے تیل سے داغ دیا جائے پھر اگر دوسری بار چوری کرے تو اس کا بائیں پاؤں ٹخنے سے کاٹ دیا جائے اور آگ سے داغ دیں اگر تیسری بار چوری کرے تو اس کا بائیں ہاتھ پینچے سے کاٹا جائے اور آگ سے داغا جائے پھر جب وہ چوتھی بار چوری کرے تو اس کا دایاں پاؤں بھی ٹخنے سے کاٹ دیا جائے اور آگ سے داغا جائے۔ پھر جب وہ پانچویں بار چوری کرے تو اسے قید میں رکھا جائے اور سرزنش کی جائے اور چوری کرنے والے ہر چور کو ایسی سزا دی جائے کہ وہ چوری سے باز آجائے۔ اور اگر ارتکاب جرم میں شبہ لاحق ہو جانے کے باعث چور کو سزا نہ دی جاسکے تب بھی حاکم اسلام کو چاہیے کہ اس کو ایسی سزا جو مناسب خیال کرے دے تاکہ وہ شخص ارتکاب جرم سے باز رہے۔

(سزا میں ہاتھ) کاٹنے کا طریقہ یہ ہے کہ مجرم کو باندھ کر بٹھا دیا جائے۔ پھر اس کے ہاتھ میں پٹی باندھ کر اس طرح آگے کو کھینچا جائے کہ ہاتھ کا جوڑ دکھائی دینے لگے۔ پھر اسے ایک تیز دھار آلے سے کاٹ دیا جائے پھر اسے (خون بند کرنے کے لئے) داغا جائے اگر اس سے زیادہ نرم طریقہ کاٹنے کا ممکن ہو تو اسی طرح کاٹا جائے کیونکہ اس (سزا) کا مقصد حد شرعی کا جاری کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حاملہ عورت کو نہ قطع عضو کی سزا دی جائے گی اور نہ قتل سے کم درجہ کی اور کوئی سزا دی جائے گی اسی طرح اگر کوئی مجرم دائم المرض ہے یا بیمار ہے یا سخت سردی یا شدید گرمی کے دن ہیں تو حد نافذ نہ کی جائے اور ایسی بات سے پرہیز کیا جائے جو ہلاکت کا سبب ہو سکتی ہے اور ایسے حالات میں جن کی موجودگی میں ان کے دور ہونے تک کے لئے نفاذ حد کو التوا میں ڈالا جاسکتا ہے مثلاً ایک یہ ہے کہ چوری کی پاداش میں کسی کا ہاتھ کاٹا گیا ہو اور ہنوز اس کے زخم کو آرام نہ ہوا ہو کہ وہ پھر چوری کا ارتکاب کرے تو اسے عضو کاٹنے کی سزا اس وقت تک نہ دی جائے گی جب تک کہ اسے آرام نہ ہو جائے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص سزائے تازیانہ کے بعد ابھی زخم اچھا نہ ہوا ہو کہ جرم مستوجب حد کا ارتکاب کرے تو اس کی سزا آرام پانے تک ملتوی کر دی جائے۔ یہی حکم مجرم (مستوجب سزا) کو لاحق ہونے والے ہر قسم کے زخم یا مرض کا ہے۔

یہ اصحاب (مالکیہ و شافعیہ) تیسری اور چوتھی بار ارتکاب سرقہ میں ہاتھ اور پاؤں کاٹنے کی سزا کی دلیل میں یہ روایت پیش کرتے ہیں جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ کہ ”ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اتی بعبء نسرق‘ فقطع یدہ الیمنی ثم اتی بہ فی الثالیہ فقطع رجلہ ثم اتی بہ فی الثالثة‘ فقطع یدہ الیسری ثم

اتی بہ فی الرابعة فقطع رجله الیمنی“ (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک غلام لایا گیا جس نے چوری کی تھی اس کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ اس نے دوبارہ چوری کی تو اس کا پاؤں کاٹ دیا گیا۔ پھر اس نے تیسری بار چوری کی تو اس کا بائیں ہاتھ کاٹ دیا گیا اور جب چوتھی بار چوری کی تو اس کا دایاں پاؤں بھی کاٹ دیا گیا)۔

دارقطنی نے حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اخراج فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چوری کرنے والے کے بارے میں ارشاد فرمایا ”ان سرق فاقطعوا یدہ ثم ان سرق فاقطعوا رجلہ ثم ان سرق فاقطعوا یدہ ثم ان سرق فاقطعوا رجلہ“ (یعنی اگر چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ اگر پھر چوری کرے تو اس کا پاؤں کاٹ دو)۔

امام شافعی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ہمیں مالک بن عبد الرحمن بن قاسم نے اور انہیں ان کے باپ نے بتایا کہ یمن کا ایک دست و پا بریدہ شخص حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آیا اور ان سے شکایت کی کہ یمن کے حاکم نے اس کے ساتھ ظلم کیا۔ وہ شخص رات کو نماز پڑھتا تھا اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اس سے کہتے تھے کہ تیری رات تو چوری کرنے والے کی رات جیسی نہیں ہے۔ پھر ایسا ہوا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیوی اسماء بنت عمیس کا ایک زیور گم ہو گیا۔ وہ شخص لوگوں کے ساتھ پھرتا رہا اور کہتا تھا کہ خداوند اس نیک گھرانے میں جس نے راتوں رات ڈاکہ ڈالا اس کا فیصلہ اب تیرے ہاتھ ہے۔ پھر لوگوں نے وہ زیور ایک رنگریز کے پاس سے دستیاب کیا اور یہ گمان کیا گیا کہ اس زیور کو وہی دست و پا بریدہ شخص اس کے پاس لایا تھا۔ آخر اس شخص نے ارتکاب سرقہ کا اقرار کر لیا۔ یا اپنے خلاف شہادت دی۔ تب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے حکم سے اس کا بائیں ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بخدا اس شخص کا اپنے حق میں بددعا کرنا چوری سے زیادہ شدید امر ثابت ہوا۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم اسی پر عمل کرتے ہیں۔ یعنی اگر چوری کرنے والا پہلی بار چوری کرے تو اس کا دایاں ہاتھ ہتھیلی کے جوڑ سے کاٹ دیا جائے اور پھر اسے آگ سے داغا جائے۔ اگر دوسری بار چوری کرے تو اس کا بائیں پاؤں کاٹ دیا جائے اور آگ سے داغ دیا جائے۔ اگر تیسری بار چوری کرے تو اس کا بائیں ہاتھ ہتھیلی کے جوڑ سے کاٹ دیا جائے اور آگ سے داغا جائے اور چوتھی بار چوری کرے تو اس کا دایاں پاؤں بھی جوڑ سے کاٹ دیا جائے اور آگ سے داغا جائے اور پانچویں بار چوری کرے تو اسے قید کر دیا جائے اور سزائش کی جائے۔ ابن منذر کہتے ہیں کہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے کہ انہوں نے ہاتھ کے بعد دوسرا ہاتھ اور پاؤں کے بعد دوسرا پاؤں کاٹ دیا۔

حنفیہ نے تیسری بار چوری کرنے پر سزا نہ دی جانے اور قید و تعزیر کے واجب ہونے اور جلاوطن کیے جانے کے ثبوت میں حضرت علی بن ابی طالب کی اس روایت کو پیش کیا ہے جسے بیہقی نے روایت کیا ہے کہ ایک شخص جس کا پاؤں کاٹ دیا گیا تھا جب تیسری بار (ارتکاب جرم پر) حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پاس لایا گیا کہ اس کا (دایاں) پاؤں کاٹا جائے تو آپ نے فرمایا کہ ”بای شی یتمسح و بای شیء یا کل؟“ (یعنی وہ کس طرح پکڑے گا اور کس طرح کھا سکے گا؟) اور فرمایا کہ ”اقطع رجلہ علی ای شیئی یمشی؟“ (یعنی اگر اس کا پاؤں کاٹا گیا تو وہ کس کے سہارے چلے

گا) مجھے تو خدائے عزوجل سے خوف آتا ہے۔ پھر آپ نے اسے سزائے ضرب دی اور قید میں ڈال دیا۔ یہ انسانیت کے احترام اور مال کے مقابلہ میں انسان کے زیادہ قابل احترام ہونے کی بناء پر تھا۔

مالکیہ اور شافعیہ اس دلیل کا یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ ایک رائے ہے جس کو نص (صراحت حدیث کے مقابلہ میں نہیں رکھا جاسکتا۔ اگر اس روایت کو ضعیف بھی قرار دیا جائے (جو قطع اعضائے اربعہ کے بارے میں ہے) جیسا کہ حنفیہ کہتے ہیں تب بھی دوسری روایتیں جو اس بارے میں آئی ہیں اس کی تائید کرتی ہیں۔ پس اگر سزائے سرقہ میں نہیں بلکہ کسی اور وجہ سے واجب القطع عضو مفقود ہو جائے مثلاً دایاں ہاتھ مثل ہو تو بایاں ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اسی طرح دایاں پاؤں بھی کاٹا جائے گا۔

حنابلہ کی اس بارے میں دو روایتیں ہیں ایک روایت کے مطابق تیسری بار ارتکاب جرم کی صورت میں چوری کرنے والے کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ جیسا کہ حنفیہ کا مسلک ہے۔ یہ مسلک مومن کا احترام کرنے کے پیش نظر ہے اور یہ بھی ہے کہ مسلمان کا مرتبہ مال سے بڑھ کر ہے۔ (یعنی مال کے عوض مسلمان کو ازکار فتنہ نہیں بنایا جاسکتا) نیز اس میں اللہ کے بندوں کے لئے احکام شریعت کی بجا آوری زیادہ سہل ہے۔

حنابلہ کی دوسری روایت یہ ہے کہ تیسری بار چوری کی سزا میں مجرم کا بایاں ہاتھ کاٹا جائے اور چوتھی بار چوری کرے تو دایاں پاؤں بھی کاٹ دیا جائے یہ رائے مالکیہ اور شافعیہ کے مسلک کے مطابق ہے۔ ان اصحاب کے نزدیک (ایسے مفسدوں کے مقابلہ میں) مال کی قدر زیادہ ہے۔ وہ اصحاب اللہ کی زمین میں فساد پھیلانے والے چوروں اور دین سے سرکشی کرنے والوں کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ پانچویں بار ارتکاب جرم کرنے والے کو قتل کر دیا جائے تاکہ لوگوں کو عبرت حاصل ہو۔ اس کو قید یا جلاوطن نہ کیا جائے۔ انہوں نے اپنے مسلک کی تائید میں نسائی کی حدیث کو پیش کیا ہے جو حارث بن حاطب سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک چور کو لایا گیا۔ آپ نے حکم دیا 'اقتلوه' (یعنی اسے قتل کر دو لوگوں نے کہا یا رسول اللہ اس نے چوری کی ہے ارشاد ہوا 'اقتلوه' (یعنی اسے قتل کر دو) لیکن لوگوں نے کہا یا رسول اللہ اس نے تو چوری کی ہے تب ارشاد ہوا 'اقتطعوا یدہ' (یعنی اس کا ہاتھ کاٹ دو)۔ راوی حدیث کہتے ہیں کہ اس شخص نے پھر چوری کی تو اس کا پاؤں کاٹ دیا گیا۔ اسی شخص نے پھر عہد ابو بکر رضی اللہ عنہ میں چوریاں کیں یہاں تک کہ اس کے دونوں پاؤں کاٹ دیئے گئے۔ لیکن جب اس شخص نے پانچویں بار چوری کی تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ (اس شخص کی اس عادت کا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ علم تھا چنانچہ آپ نے پہلے ہی فرمایا تھا کہ 'اقتلوه' اسے قتل کر دو۔ اس کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو قریشی جوانوں کے حوالے کر دیا کہ اسے قتل کر دیں۔ ان جوانوں میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بھی تھے انہیں حکم چلانا پسند تھا۔ چنانچہ انہوں نے جوانوں سے کہا کہ لوگوں نے مجھے تم پر سردار بنایا ہے۔ انہوں نے بھی عبداللہ بن زبیر کو حاکم مان لیا۔ چنانچہ پہلے وہ اس پر ضرب لگاتے پھر سب مارتے یہاں تک کہ اسے مار ڈالا۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچویں بار چوری کرنے والے ایک شخص کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ حضرت جابر کہتے ہیں کہ ہم نے اس شخص کو قید سے نکالا اور قتل کیا پھر اسے گھسیٹ کر لے گئے اور ایک کنوئیں میں پھینک دیا اور اس پر پتھر اوڑھ دیا۔

معاملات (یا عمرانی قوانین) اسلامی کا بیان

واضح ہو کہ شریعت اسلامیہ نے باہمی معاملات کی انجام دہی کے قوانین کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے چنانچہ خرید و فروخت، رہن، اجرت، شراکت اور شفعہ کے متعلق قوانین مرتب ہیں۔ اسی طرح مالیاتی (اقتصادی) امور تجارت، زراعت اور صنعت و حرفت کے متعلق بھی قوانین موجود ہیں۔ ایسا کوئی شعبہ عمرانیات نہیں جس کے بارے میں بنی نوع انسان کی فلاح پر مبنی نظام (دستور العمل) اسلام میں موجود نہ ہو۔ اسلامی نظام (عمرانی) میں انسان کی خوشحالی تنازعات کے تصفیے، باہمی شفقت و نگہداشت اور (اہل اختیار کی) چیرہ دستی سے تحفظ ملحوظ رکھا گیا ہے پھر مجتہدین اسلام نے قرآنی نصوص (تصریحات) اور احادیث صحیحہ سے وہ تمام امور اخذ فرمائے ہیں جو فلاح انسانی کے حامل اور مختلف عہد میں پیش آنے والے حالات کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوں۔ اس طرح مسلمانوں کو تفقہ (دینی بصیرت) کی ایک عظیم ترین دولت ہاتھ آگئی جس کی بنیاد پر معاشرہ کے لئے بہترین سود مند قوانین مرتب ہوئے جو تمام عمرانی تقاضوں کو پورا کرتے اور تمام قبائل و اقوام اسلامیہ کی حقیقی خوش بختی کا موجب ہیں۔ اسلام نے مالی امور میں قانون شکنی کے جرائم کی سزا کا تعین حاکم شرع کے اپنے استصواب پر چھوڑ دیا ہے (دوسرے اخلاقی یا فوجداری جرائم کی طرح) ان کی سزائیں متعین نہیں کیں۔ تاکہ وہ ہر طرف و زمان کے تقاضوں کے پیش نظر جو سزا چاہیے نافذ کرے۔ اسے تعزیری امور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ غرض شریعت اسلامیہ نے حاکم کو اس امر کا مجاز بنایا ہے کہ وہ احکام شرعیہ کے خلاف ارتکاب یا اقدام کرنے والے کو زمان و مکان کے تقاضوں کے مطابق اور ان برائیوں اور خرابیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے جو قوانین شریعت کی مخالفت سے پیدا ہوئی ہیں، تعزیری قوانین وضع کرے۔ سرقہ کا جرم اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس کی سزا شریعت نے مقرر کر دی ہے۔ اس کی تفصیل اوپر آچکی ہے۔ (۱)

چوری ثابت ہونے کا بیان

۱۔ چاروں ائمہ فقہ کا اس امر پر اتفاق ہے کہ چوری کا جرم دوسرے معاملات مال کی طرح دو معتبر اور حق پسند گواہوں کی شہادت سے ہوتا ہے یا پھر آزاد شخص (جو غلام نہ ہو) کے اعتراف سے جرم سرقہ ثابت ہو جاتا ہے۔ اس پر بھی سب کا اتفاق ہے۔

حنفی مالکیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر بالغ اور عاقل شخص ایک بار بھی اس جرم کا اقرار کر لے تو وہ مستوجب

دوسرے جرائم کے مقابلہ میں چوری کی شدت کا بیان

کہا جاسکتا ہے کہ شریعت اسلامیہ نے معاشرہ کو نقصان پہنچانے والے جرائم کے مقابلہ میں چوری (کے سد باب) کو سب سے زیادہ اہمیت کیوں دی ہے۔ غاصب، اچکے اور خائن کو نظر انداز کر دیا گیا

حد ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ صورت تہمت (الزام تراشی) کی نہیں ہو سکتی لہذا دوسرے حقوق کی طرح ایک بار بھی اقرار کر لینے سے جرم ثابت ہو جاتا ہے اور دوسری بار اعتراف کرنے کی حاجت نہیں ہے جیسا کہ قصاص اور تہمت لگانے کی شرعی سزاؤں میں ہوتا ہے اور شہادت میں دو کی قید نص (حکم صریح) کی بناء پر ہے۔ لہذا اقرار کو اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا وہاں (شہادت دینے والوں کی ایک سے زیادہ تعداد رکھنے میں) یہ مصلحت ہے کہ اس میں الزام دروغ بیانی کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ اقرار جرم کی یہ کیفیت نہیں ہے کیونکہ اقراری مجرم پر یہ الزام نہیں لگ سکتا کہ وہ خود اپنے خلاف جھوٹ بول رہا ہے اور زنا کے معاملہ میں زیادہ گواہوں کی جو شرط ہے وہ قیاس (عام طریق شہادت) کے خلاف ہے۔ اس میں نص (صراحت حکم) پر انحصار کیا جائے گا۔ علاوہ اس کے یہ بھی ہے کہ اگر (اقراری مجرم) پہلی بار اقرار میں سچا ہے تو دوسری بار اقرار سے فائدہ نہیں کیونکہ (اس کے قول کی) سچائی میں اس سے کچھ اضافہ نہ ہوگا۔ اور اگر اس نے پہلی بار جھوٹ بولا تو دوسری بار اقرار کرنے سے سچا قرار نہیں دیا جاسکتا۔ پس بار بار اقرار لینا بے فائدہ ہے۔

حنابلہ اور حنفیہ میں سے ابو یوسف رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جرم کا ثبوت مجرم کے دوبار اقرار کرنے سے ہوگا ایک بار اقرار سے وہ مستوجب حد نہ ہوگا۔ انہوں نے اپنے مسلک کی دلیل میں اس روایت کو پیش کیا ہے جو ابی امیہ مخزومی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک چور کو پیش کیا گیا جس نے چوری کا اقرار کر لیا تھا لیکن مال سرقہ اس سے برآمد نہیں ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا ”ما اخلک سرقت“ (یعنی مجھے امید نہیں کہ تو نے چوری کی ہے) اس نے کہا ”یا رسول اللہ! میں نے چوری کی ہے“ اس شخص نے دو تین بار اسی طرح کہا تب آپ کے حکم سے اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ پھر جب وہ حضور کے سامنے لایا گیا تو آپ نے فرمایا ”استغفر اللہ وتب الیہ“ (یعنی اللہ سے اپنے گناہ کی مغفرت مانگ اور توبہ کر لے) اس شخص نے کہا میں اللہ سے مغفرت کا طالب ہوں اور اس گناہ سے توبہ کرتا ہوں۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار کہا ”اللهم تب علیہ“ (یعنی اے اللہ اس شخص کی توبہ قبول فرما لے)۔ اس روایت کو احمد نسائی اور ابوداؤد نے اخراج فرمایا ہے۔ اس کے الفاظ ابوداؤد کے بیان کردہ ہیں۔ اس کے بیان کرنے والے معتبر اصحاب ہیں۔

حاکم شروع پر واجب ہے کہ وہ (اقراری مجرم کو) احتیاطاً اپنے بیان سے پھر جانے پر آمادہ کرے۔ تاکہ (نوعیت جرم سے) پورے طور پر واقفیت حاصل ہو جائے چنانچہ روایت ہے کہ حضور ﷺ کے سامنے ایک چور کو پیش کیا گیا۔ آپ نے فرمایا ”اسرقت؟ ما اخلالہ سرق“ (یعنی کیا تو نے واقعی چوری کی ہے؟ میں نے تو خیال نہیں کیا تھا کہ اس نے چوری کی۔)

اگر جرم کا اقرار کرنے والا ارتکاب جرم سے مکر جائے تو سزائے قطع ید کے جرم میں اس کے انکار کو تسلیم کر لیا جائے گا کیونکہ یہ خالصۃً حقوق اللہ کا معاملہ ہے۔ لہذا اس کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ لیکن مالی معاملات میں (اقرار کے بعد) انکار کرنا درست نہیں ہے کیونکہ مال کا مالک اس کی تکذیب کرتا ہے۔

ان اصحاب (یعنی حنابلہ اور ابو یوسف رحمہ اللہ علیہما) نے اقرار کے صحیح ہونے کی یہ شرط لگائی ہے کہ وہ شخص مختلف مجالس میں اقرار کرے (بیک وقت دو بار اقرار معتبر نہیں ہے) کیونکہ یہ (اقرار کرنا۔ ثبوت جرم کے) دو دلائل میں سے ایک دلیل ہے (دوسری دلیل شہادت ہے) لہذا اس میں شہادت (گواہی) کے اصول کو مد نظر رکھا جائے اور طحاوی رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے باسناد صحیح روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے ان کے سامنے چوری کا اعتراف دو بار کیا آپ نے فرمایا کہ (تیرا دو بار اعتراف ایسا ہے کہ گویا) تو نے اپنے خلاف دو گواہ پیش کر دیئے۔ چنانچہ آپ کے حکم سے اس کا ہاتھ کاٹ کر اس کے گلے میں لٹکا دیا گیا۔

یہاں پر اقرار جرم کو شہادت سے ملانے کا مقصد تعداد میں یکسانیت ہے جس پر حد عائد کی جائے گی۔ اس میں اقرار کی تعداد کو گواہوں کی تعداد کے برابر رکھا جائے گا۔ اس کی مثال 'حد زنا' میں ملتی ہے کہ اس میں بھی اقرار کرنے کی تعداد کو گواہوں کی تعداد کے برابر رکھا گیا ہے۔

اگر چوری کرنے والے کے خلاف ایک مرد اور دو عورتیں گواہی دیں تو مال مسروقہ یا اس کی قیمت کا واپس کرنا واجب ہو جائے گا لیکن سزائے قطع واجب نہ ہوگی کیونکہ حدود (شرعی سزاؤں) کے بارے میں عورت کی گواہی تسلیم نہیں کی جاتی۔

گواہی گزارنے کا طریقہ

فقہاء کہتے ہیں کہ حاکم شرع کو چاہیے کہ چوری کے گواہوں سے سرقہ کی کیفیت دریافت کرے یعنی کس طرح اس نے چوری کی۔ ممکن ہے کہ وہ چوری ایسی ہو جس میں سزائے قطع واجب نہیں ہوتی۔ مثلاً کسی نے دیوار میں نقب لگائی اور اپنا ہاتھ اس کے اندر ڈال کر مال نکال لیا تو تین ائمہ فقہ کے نزدیک اس شخص کو ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جائے گی۔ یہی حکم اس صورت میں ہے جبکہ چور نے مال مسروقہ کی مقررہ مقدار سے کم مال نکالا اور لوٹ کر آیا پھر کچھ اور نکال لیا یا نکالا ہوا مال اپنے کسی ساتھی کو جو دروازے پر تھا دے دیا۔

گواہوں سے یہ بھی پوچھا جائے گا کہ سرقہ یا چوری کس کو کہتے ہیں؟ کیونکہ لغت کی رو سے 'چھپ کر کسی کی بات کو سننا یا نماز کے رکن کی تکمیل میں کوتاہی کرنا بھی سرقہ یا چوری ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اسواء السرقة الذی یسرق صلوٰتہ" (یعنی بدترین چوری نماز کی چوری ہے) اسی طرح گواہوں سے پوچھا جائے گا کہ چوری کب ہوئی؟ کیونکہ اس امر کا امکان ہے کہ چوری کا کوئی سابقہ واقعہ ان کے ذہن میں ہو۔ اگر چوری کے کسی پہلے وقوعے کی گواہی گزرے تو چرانے والے پر تاوان عائد ہوگا۔ سزائے قطع عائد نہ ہوگی۔ نیز سرقہ کی جائے واردات کی بابت بھی پوچھا جائے گا کیونکہ ممکن ہے کہ چور نے دارالحرب میں کسی مسلمان کی چوری کی ہو یہ صورت مجرم کے اقرار سے ثابت ہونے والی چوری سے مختلف ہے۔ اقرار جرم کرنے والے سے وقت کی بابت پوچھ گچھ نہیں کی جائے گی کیونکہ اگر (زیر تفتیش چوری

کے علاوہ) پہلے کوئی چوری کی ہو تو اس کا اعتراف جرم باطل نہ ہو جائے گا۔ اسی طرح اقرار سرقہ کرنے والے سے جائے سرقہ 'حرز' (تحفظ) وغیرہ کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ بعض اصحاب کہتے ہیں اقراری چور سے مال مسروقہ کی نوعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا کیونکہ ہر قسم کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا واجب نہیں ہے مثلاً کھجور کی چوری یا مجبوری کی چوری یا یہ احتمال کہ مال مسروقہ کی مالیت نصاب واجب الحد سے کم ہو۔ نیز اقراری چور سے یہ بھی دریافت کیا جائے گا کہ اس نے کس کی چوری کی ہے؟ کیونکہ بعض لوگوں کا مال چرانے سے سزائے قطع واجب نہیں ہوتی۔ مثلاً قریبی رشتہ دار کا اپنے محرم کی چوری کرنا، غلام کا آقا کی چوری کرنا، خاوند کا اپنی بیوی کی چوری کرنا اور باپ کا اپنے بیٹے کا مال چرا لینا۔ یا پھر اس گمان سے چوری کر لینا کہ مال مسروقہ اس کے لئے بہہ شدہ مال ہے یا وہ اس مال کا مالک ہے۔ ان صورتوں میں سزائے قطع عائد نہ ہوگی۔

بعض اصحاب کہتے ہیں کہ چور نے جس کی چوری کی ہے اس کی بابت دریافت کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ شخص مجلس (عدالت استغاثہ) میں موجود ہے اور اسی نے چور کے خلاف دعویٰ کیا ہے اور اسے سزا دلانی چاہتا ہے اور اسی طرح چوری کے گواہ بھی (جو گواہی دیتے ہیں) کہ اس شخص نے انکے ہاں چوری کی تو اب یہ پوچھ گچھ بے کار ہے کہ کس کی چوری ہوئی؟ اور جب مدعی موجود ہے تو یہ بھی غیر ضروری ہے کہ یہ دریافت کیا جائے کہ چور نے کس نیت سے چوری کی؟ اور مدعی کے لئے یہ لازم نہیں ہے کہ وہ بتائے کہ اس شخص نے میرا مال چرایا اور میں اس مال کا مالک ہوں البتہ تفتیش کی غرض سے احتیاطاً یہ پوچھ گچھ ہو سکتی ہے اور خواہ لوگوں کا بیان کچھ ہی ہو چوری کرنے والے کی 'حد' سزائے شرعی ساقط نہ ہوگی۔ اگر قاضی جانتا ہے کہ گواہ حق پسند ہیں تو ہاتھ کاٹنے کی سزا دے دی جائے گی۔ ان کا حال معلوم نہ ہو تو جس کے خلاف سرقہ کی شہادت دی گئی ہے۔ اسے قید میں رکھا جائے گا جب تک کہ معتبر گواہ دستیاب نہ ہوں کیونکہ چوری کے الزام کی ضمانت پر بھروسہ نہیں ہو سکتا اور کوئی شخص 'حد' بھگتنے کا ضامن نہیں ہو سکتا۔

اگر معتبر گواہ موجود ہوں اور جس کی چوری ہوئی ہے وہ حاضر نہ ہو تو جب تک وہ نہ آئے مجرم کو ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جائے گی کیونکہ اس امر کا احتمال ہے کہ مالک نے وہ مال اسے عطا کر دیا ہو یا اسے معاف کر دیا ہو۔ اگر وہ شخص موجود ہو جس کی چوری ہوئی ہے اور گواہ موجود نہ ہوں تب بھی سزائے قطع نہ دی جائے گی جب تک کہ دونوں موجود نہ ہوں کیونکہ ممکن ہے کہ دونوں گواہ اپنے بیان سے پھر جائیں یا دونوں میں سے ایک پھر جائے۔ اسی طرح موت واقع ہو جانے کا امکان بھی ہے۔ تمام حدود (شرعی سزائوں) کا یہی حکم ہے، بجز سزائے سنگساری کے۔

اگر کوئی شخص چوری میں بدنام شخص کو اپنے گھر میں دیکھ لے حالانکہ وہ چوری کے لئے نہیں بلکہ کسی اور کام سے آیا اور چوری نہیں کی تو مالک مکان کو اسے قتل کرنے کا حق نہیں ہے البتہ وہ اسے پکڑ سکتا ہے اور حاکم کو اختیار ہے کہ وہ اسے قید میں ڈال دے یہاں تک کہ وہ توبہ کر لے۔ کیونکہ بہر حال اس پر فساد پھیلانے کا الزام ہے اور تہمت سے نجات پانے کے لئے قید کر دینا جائز ہے۔

گواہوں کی غلط بیانی کا بیان

حنفیہ مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر گواہوں نے چور کے خلاف ادائے شہادت میں غلطی کی اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ انہوں نے غلطی سے بیان دیا ہے۔ مثلاً کسی اور شخص نے یہ اقرار کر لیا کہ دراصل یہ چوری میں نے کی تھی۔ یا دوسرے گواہوں نے شہادت دی کہ چوری کسی اور نے کی تھی اور گواہوں نے بھی اپنی غلطی کا اعتراف کیا تو امام (حاکم شرع) پر واجب ہے کہ گواہوں کو ان کی غلط بیانی پر سزا کے طور پر دست بردار ہونے کے ہاتھ کی دیت (تاوان) کا مقروض قرار دے۔ لیکن اگر گواہ کہیں کہ ہم نے اس شخص کو زیر کرنے کے لئے قصد اغلط بیانی کی تھی تو اس صورت میں کٹے ہوئے ہاتھ کا تاوان ادا کرنا واجب قرار دیا جائے گا لیکن اس کی اجازت نہیں ہے کہ ایک ہاتھ کے عوض ان دونوں گواہوں کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں کیونکہ ایسا کرنا جبر و ظلم ہوگا۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر دو اشخاص نے کسی کے خلاف گواہی دی کہ اس نے مال محفوظ کی چوری کی ہے اور وہ مال نصاب سرقہ کے برابر ہے۔ لہذا اس چور کا ہاتھ کاٹ دیا گیا بعد میں گواہوں کی دروغ بیانی ثابت ہوئی تو حاکم شرع ان دونوں سے اقرار کرائے گا اگر وہ کہیں کہ انہوں نے اس شخص کے خلاف غلط گواہی دی ہے تو امام ان دونوں کو کٹے ہوئے ہاتھ کی دیت (یا تاوان) ادا کرنے کا ذمہ دار گردانے گا۔ اگر گواہ کہیں کہ ہم نے قصد اس کے خلاف جھوٹی گواہی دی ہے تو قصاص میں ان دونوں کے ہاتھ کاٹے جائیں۔ یہ حکم سب سے زیادہ قیاس (قاعدہ) کے مطابق ہے کیونکہ جس طرح یہ جائز ہے کہ ایک شخص کو قتل کرنے کی پاداش میں دو (مشرکہ) قتل کے مجرموں کو قتل کیا جائے اسی طرح ایک ہاتھ کے بدلے دو ہاتھ کاٹے جائیں۔ ہاتھ کی اہمیت جان سے کم ہے۔ زیادہ اگر جائز ہے تو کم کیوں نہ جائز ہو؟ اس کی دلیل میں وہ روایت پیش کی جاتی ہے جو شعمی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ دو اشخاص نے امام علی رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک شخص کے خلاف گواہی دی کہ اس نے چوری کی ہے۔ امام موصوف نے چوری کرنے والے کا ہاتھ کاٹ دیا پھر وہ دونوں گواہ ایک اور شخص کو لائے اور کہنے لگے کہ دراصل چوری اس شخص نے کی تھی اور ہم نے پہلے شخص کے خلاف چوری کی گواہی دینے میں غلطی کی ہے۔ آپ نے دوسرے شخص کے متعلق ان کی گواہی کو تسلیم نہ فرمایا اور انہیں پہلے شخص کے ہاتھ کے بدلے ادائیگی تاوان کا ذمہ دار قرار دیا۔ ساتھ ہی فرمایا کہ ”اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ تم نے دانستہ کذب بیانی سے کام لیا ہے تو میں تم دونوں کے ہاتھ کٹوا دیتا“ اس باب میں یہ حکم واضح ہے۔

اگر ایک شخص اور دو عورتیں کسی کے خلاف چوری کی گواہی دیں تو چوری کرنے والا تاوان ادا کرنے کا ذمہ دار ہوگا اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ دی جائے گی۔

اگر کسی شخص نے حاکم کے سامنے چوری کرنے کا اقرار کیا پھر اپنے اقرار سے پھر گیا تو جس قدر مال چوری کرنے کا اس نے اقرار کیا اسی قدر مال اس پر واجب الادا ہوگا اور ہاتھ کاٹنے کی سزا عائد نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ اور کوئی حکم نہ دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ اگر مال کا مالک مجرم کے ہاتھ کاٹے جانے کا مطالبہ کرے اور مال کا مطالبہ نہ کرے تب بھی اس کا دعویٰ تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ ہاتھ کاٹنے کا درست ہونا مطالبہ مال کے تابع ہے مال سے دست برداری کی صورت میں ہاتھ کاٹنے کا مطالبہ بھی نہ رہا۔

حداد (سزا دینے والے جلا د) کی غلطی کا بیان

حنفیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر حاکم نے جلا د کو (یعنی جو سزا کو عملی جامہ پہناتا ہے) حکم دیا کہ چوری کرنے کی پاداش میں اس شخص کا دایاں ہاتھ کاٹ دو لیکن اس شخص نے دانستہ یا غلطی سے بایاں ہاتھ کاٹ دیا تو اس پر تاوان عائد نہ ہوگا البتہ اسے سزا دی جائے گی کہ اپنی سمجھ سے کام لینے میں غلطی کی۔ اور جو کام کوئی شخص اپنی دانستہ میں صحیح سمجھ کر کرے اور وہ درست نہ ہو تو بالا جماع قابل درگزر ہے اور اس معاملہ میں تو اجتہاد (رائے کو کام میں لانے) کی گنجائش بھی ہے کیونکہ ظاہری نص (الفاظ حکم) میں دائیں ہاتھ یا بائیں ہاتھ کی تخصیص نہیں کی گئی۔ اور اس لئے بھی (قابل درگزر ہے) کہ جو جلا د نے واجب العمل کام انجام نہیں دیا لیکن فعل واجب کی بجائے اسی طرح کا ایسا عمل کیا جو مجرم کے حق میں بہتر تھا (یعنی دائیں ہاتھ کی بجائے بائیں ہاتھ کا کاٹنا) اور اس کے بعد جبکہ بایاں ہاتھ کاٹا جا چکا ہاتھ کاٹنے کی مزید سزا نہیں دی جائے گی۔ یہ مجرم کے حق میں اچھا ہوا کیونکہ دائیں ہاتھ میں گرفت کی صلاحیت ہوتی ہے اور اکثر کام اسی سے لیا جاتا ہے لہذا (جلا د پر) کوئی تاوان عائد نہ ہوگا۔ اسی بناء پر اگر جلا د کے سوا کسی اور شخص نے (مجرم کا) بایاں ہاتھ کاٹ دیا تو اس سے تاوان کا مطالبہ نہ ہوگا خواہ اس نے دانستہ اس کا ہاتھ کاٹا ہو یا غلطی سے کٹ گیا ہو۔ کیونکہ مجرم کا دایاں ہاتھ تو (بہر حال) معرض تلف میں تھا گویا نہ ہونے کے برابر تھا اب اس کی بجائے دوسرا ہاتھ جو کاٹ دیا گیا تو دائیں ہاتھ کو گویا ہمیشہ کے لئے بچا لیا گیا۔

حنفیہ میں سے صاحبین کہتے ہیں کہ اگر جلا د نے غلطی سے بایاں ہاتھ کاٹ دیا، درآنحالیکہ اسے دایاں ہاتھ کاٹنے کا حکم تھا۔ اگر غلطی سے ایسا ہو گیا تو جلا د پر کوئی تاوان نہ ہوگا۔ لیکن اگر اس نے قصداً (دائیں ہاتھ کی بجائے) بایاں ہاتھ کاٹا تو اس ہاتھ کاٹنے کا تاوان ادا کرنا جلا د پر واجب ہوگا۔

شافعیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر جلا د نے غلطی سے ایسا کیا تب تو اس پر کوئی سزا عائد نہ ہوگی لیکن اگر اس نے حاکم کے اس حکم کے باوجود کہ دایاں ہاتھ کاٹو یہ کام کیا تو اس پر قصاص واجب ہے۔ لہذا جلا د کا بایاں ہاتھ کاٹا جائے گا۔ یہ قیاس (قاعدے) کی بناء پر ہے کہ اگر کسی شخص نے گواہی گزرنے کے بعد ہی سارق (مجرم) کا ہاتھ کاٹ دیا اور ہنوز عدالت کے فیصلہ کے انتظار میں ہاتھ کاٹنے کا حکم نہ ہوا ہو بلکہ یہ فیصلہ (ہاتھ کاٹنے کے بعد) ہوا۔ تو اب ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ جس ہاتھ کاٹنے کی سزا ہوئی تھی اب اس کا موقع ہی نہ رہا (کہ پہلے ہی وہ کٹ گیا) کیونکہ یہ صورت حال ایسی ہی ہے جیسے مال مسروقہ تلف ہو جائے اور چوری کی سزائے قطعید چور کو مل چکی ہو تو تاوان ساقط ہو جاتا ہے کیونکہ تاوان کا موقع ہی نہ رہا (اس لئے کہ تلف شدہ مال کی مالیت نہیں لگائی جاسکتی) اسی طرح اگر بایاں ہاتھ کاٹ دیا گیا تو اس کا قصاص جلا د سے نہیں لیا جائے گا اور چور کے دائیں ہاتھ کاٹنے کی سزا ساقط ہو جائے گی۔

(جلا د کے) اجتہادی غلطی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ حاکم کے اس حکم کے بعد کہ مجرم کا دایاں ہاتھ کاٹا جائے بدیں خیال جلا د نے بایاں ہاتھ کاٹ دیا کہ (جو حاکم نے دائیں ہاتھ کا حکم دیا ہے لیکن) نص قرآن ”فاقطعوا ایس دیہما“ (یعنی ان کے ہاتھ کاٹ دو) میں تو ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے دائیں بائیں کی صراحت نہیں ہے) لہذا اس چوری کی پاداش میں بائیں ہاتھ کو کاٹ دینا کافی ہے

واضح ہو کہ دائیں بائیں کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کرنا قابل درگزر نہیں ہے کیونکہ ایسی نا فہمی بعید از قیاس اور قابل الزام ہے۔ اسی طرح (پاؤں کو) دو جگہ سے کاٹنا بھی عہد احکم کی خلاف ورزی ہے۔ اور عہد (یا قصداً) کا مطلب یہ ہے کہ جلاد (دائیں ہاتھ کی بجائے) بائیں ہاتھ کو اپنی دانست میں جائز سمجھ کر نہ کاٹے بلکہ جان بوجھ کر (کہ بائیں ہاتھ کاٹنے کی اجازت نہیں ہے) بایاں ہاتھ کاٹ دے۔

اگر حاکم نے صرف یہ کہا کہ فلاں کا ہاتھ کاٹ دو اور دائیں بائیں کی صراحت نہیں کی اور جلاد نے بایاں ہاتھ کاٹ دیا تو بالاتفاق وہ بری الذمہ قرار دیا جائے گا اگر دایاں ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا اور جلاد نے حاکم کا حکم لئے بغیر اس شخص کا بایاں پاؤں کاٹ دیا اور ارادہ ایسا کیا تو قصاص واجب ہوگا اور جلاد کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ اگر غلطی سے ایسا کیا تو بالاتفاق تاوان کی ادائیگی کا ذمہ دار ہوگا اور مجرم کا دایاں ہاتھ کاٹنے کی سزا ساقط ہو جائے گی۔

مال مسروقہ کی چوری ہو جانے کا بیان

حنفیہ حنابلہ اور ایک قول کے مطابق شافعیہ کا کہنا اس بارے میں یہ ہے کہ اگر چوری کرنے والے کو جرم سرقہ کی پاداش میں ہاتھ کاٹنے کی سزا مل چکی ہو اس کے بعد وہ مال مسروقہ کسی نے چرایا تو اب نہ مجرم اول مطالبہ کر سکتا ہے اور نہ صاحب مال کہ دوسرے چور (مجرم دوم) کا ہاتھ کاٹا جائے کیونکہ جب مجرم اول پر (مال مسروقہ کے چوری ہو جانے کے باعث) اس کا تاوان واجب نہ رہا تو اب اسکے حق میں اس کی مالیت کا تعین بھی بیکار ہے۔ یہی حال مالک مال کا ہے کہ اسے مطالبہ تاوان کا حق نہیں ہے۔ جس مال کی چوری کے عوض سارق اول کا ہاتھ کاٹا گیا وہ مال نہ تو تاوان رہا نہ امانت اور نہ ملکیت۔ لہذا مال مسروقہ غیر محفوظ مال متصور ہوگا۔ اور ایسا مال چرانے کی سزا ہاتھ کاٹنا نہیں ہے کیونکہ وہ مال تلف شدہ ہے اور تلف شدہ مال کو اٹھالینے کی سزا قطع نہیں ہے۔ تاہم اگر وہ مال برآمد ہو جائے تو وہ مال نہ سارق اول کو ملے گا اور نہ سارق ثانی کو کہ وہ مال اس سے دستیاب ہوا ہے۔ دراصل ان دونوں سے خیانت (بے ایمانی) سرزد ہوئی ہے۔ یہ مال دوسرے چور کی طرف سے اس کے اصل مالک کو واپس کر دیا جائے گا بشرطیکہ مالک موجود ہو بصورت دیگر اسے اسی طرح قومی خزانے میں رکھا جائے گا جیسے گم شدہ مال کو رکھا جاتا ہے۔

مالکیہ نیز شافعیہ کے ایک دوسرے قول کے مطابق اگر مالک مال دعویٰ کرے تو سارق ثانی کا ہاتھ کاٹا جائے گا کیونکہ بلاشبہ وہ مال (چوری کی دونوں شرائط) پوری کرتا ہے کہ اس کی مقدار نصاب سرقہ کے مطابق ہے اور مال محفوظ ہے پس مالک مال کے دعویٰ کے مطابق اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ خواہ سارق اول کا ہاتھ کاٹا گیا ہو یا نہ کاٹا گیا ہو۔

اگر یہ صورت ہے کہ کسی سارق کو سزائے قطع ملنے سے پہلے یا شبہ کی بناء پر یا اس کے بری ہو جانے کے بعد اس کا مال مسروقہ کسی نے چرایا تو سارق اول کے دعویٰ کرنے پر دوسرے سارق کا ہاتھ کاٹا جائے گا کیونکہ مال کی مالیت کو اسی صورت میں نظر انداز کیا جاسکتا ہے جبکہ سزائے قطع ناگزیر ہو اور یہ نہیں ہوا لہذا اس کا ہاتھ (سارق کا ہاتھ نہیں بلکہ) غاصب کا ہاتھ تصور کیا جائے گا (یعنی اس کے قبضہ میں جو مال ہے وہ مال مسروقہ نہیں بلکہ مال مغصوبہ متصور ہوگا۔ جس کی چوری مستوجب قطع ید ہے)۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر حاکم نے (جرم سرقہ کی پاداش میں) کسی شخص کا ہاتھ کاٹے جانے کا حکم دے دیا اور مالک

ہے اور ان سے بھی صرف نظر کیا ہے جو اپنے مال کو نقصان دہ اور مضرت رساں نفسانی خواہشات کو پورا کرنے یا معاشرے کو نقصان پہنچانے میں صرف کر دیتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ کے جملہ احکامات خدائے عزیز و حکیم کے مقرر فرمودہ ہیں جو عین مصلحت و حکمت پر مبنی ہیں۔ اس کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

سرقہ (چوری) یہ ہے کہ پر ایسا مال خفیہ طور پر حرز^(۱) (محل محفوظ) سے اٹھالیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ چوری کرنے والے کا خطرہ ہر وقت اور ہر جگہ رہتا ہے کیونکہ چوری کرنے والا اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے ہر ایسے جرم کا ارتکاب کرتا ہے جس پر اس مطلب کا حاصل کرنا منحصر ہو۔ چنانچہ گھر میں نقب لگانے، قفل شکنی کرنے اور اگر کوئی شخص اس کی راہ میں حائل ہو یا جو شخص اس کا حلیہ (اور اتاپتا) بتا سکے اسے قتل کرنے میں تامل نہیں کرتا۔ ایسا شخص لوگوں کی زندگی اور ان کے مال اور آبرو کے حق میں سخت

نے وہ مال سارق کو بخش دیا اور اس کو دے دیا یا اس کے ہاتھ فروخت کر دیا تو اب اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہوگی۔ شافعیہ مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں بھی ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جائے گی۔ کیونکہ اقدام سرقہ چوری ہے اور حاکم کے نزدیک جرم ثابت ہے اور اس کی پاداش میں ہاتھ کاٹنے کی سزا کا حکم ہو چکا ہے۔ اب اس فعل کے سرقہ ہونے میں کوئی شبہ نہ رہا لہذا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اس کا ثبوت وہ روایت ہے جو حضرت صفوانؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک شخص کی بابت جس نے ان کی چادر چرائی تھی (بارگاہ نبویؐ میں) عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ میں یہ (قطع ید) نہیں چاہتا۔ میں نے اپنی چادر اس شخص کو بخش دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”فہلا قبل ان تاتیننی بہ“ (یعنی ہیں: اب کہتے ہو میرے سامنے اسے پیش کرنے سے پہلے یہ کیوں نہ کہا؟) اس حدیث کو ابو داؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ نسائی کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں ”فقطعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم“ (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کا ہاتھ کاٹ دیا)۔

حرز (حفاظت) سے کیا مراد ہے؟

۱۔ خفیہ کہتے ہیں کہ جس مال کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا ہے وہ مال ہے جو حرز (محل حفاظت) سے چرایا گیا ہو جس شے سے مال کے کچھ حصہ کی حفاظت ہو اس شے کو اس پورے مال کے لئے حرز تصور کیا جائے گا۔ پھر مختلف اموال کی حفاظت کے طریقے (یا حرز) اس مال کے مناسب حال ہوتے ہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علی وسلم نے فرمایا ”فاذا آواہ العجرین یعنی البیدر“ ففیہ القطع“ (یعنی جب پیداوار کو سکھانے کی جگہ (کھلیان) میں لایا جائے تو وہاں سے چوری کرنے والے کا ہاتھ کاٹا جائے) نیز حضور ﷺ کا ارشاد ہے ”لا قطع فی حریسة الجبل وما آواہ المراح ففیہ القطع“ (یعنی پہاڑ کی گھاٹی سے چوری ہو تو ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہے البتہ باڑے سے جہاں رات کو ریوڑ لایا جاتا ہے چوری ہو جائے تو سزا قطع ہوگی)۔

حرز نام ہے اس شے کا جس کے ذریعہ چوروں کی دسترس سے مال کو بچایا جائے اور محافظ اس کے پاس ہو۔ مثلاً کوئی شخص صحرا یا مسجد یا راہ میں ہو اور اس کے پاس مال ہو تو وہ حرز کے اندر (محفوظ) متصور ہوگا۔ خواہ وہ مال اس نے اپنے نیچے دبا کر رکھا ہو یا اپنے پاس رکھ لیا ہو بہر حال اسے لوگ محفوظ ہی خیال کرتے ہیں۔ اگر اس کا مال یا اسباب کوئی شخص چرالے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔

حرز مکانی (یعنی محفوظ جگہ) سے مراد وہ جگہ ہے جو حفاظت کے لئے بنائی گئی ہو مثلاً اقامت گاہ، گھر، دکان اور صندوق کہ یہ سب چیزیں محافظ ہیں۔ مالک موجود ہو یا نہ ہو اس کے لئے محافظ کے موجود ہونے کی قید نہیں ہے اس کی عدم موجودگی میں بھی وہاں کا مال حرز (حفاظت) کے اندر متصور ہوگا کیونکہ اسے حفاظت ہی کے لئے بنایا گیا ہے۔ البتہ وہاں سے کسی شے کو اٹھانے والے کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا جب تک کہ اسے لے کر باہر نہ آجائے کیونکہ جب تک چور مال کو لے کر وہاں سے نہ نکلے وہ مالک ہی کے قبضہ میں متصور ہوگا۔ لیکن جو مال محافظ کی نگرانی میں ہو اسے اٹھاتے ہی چور مستوجب قطع ہوگا کیونکہ اس صورت میں چور کے اٹھاتے ہی محافظ کے قبضہ سے وہ مال نکل جاتا ہے۔ اس کو پورے طور پر ارتکاب سرقہ قرار دیا جائے گا۔ اگر گھر کا دروازہ کھلا پڑا ہو اور دن کے وقت چور اس کے اندر داخل ہو کر سامان اٹھالے جائے تو اسے قطع ید کی سزا نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ کام اس نے چوری سے نہیں کیا بلکہ دشمنی سے کیا ہے جیسا کہ بتایا گیا۔ ہاں اگر رات کو اندر جا کر مال اٹھایا تو سزائے قطع کا مستوجب ہے کیونکہ وہ جگہ حفاظت ہی کے لئے تھی۔ مغرب اور عشاء کے درمیان جبکہ لوگ چل پھر رہے ہوں گھر میں داخل ہونا دن میں داخل ہونے کے برابر ہے

اگر مالک خانہ چور کو جانتا ہو اور چور کو اس کا علم نہ ہو یا اس کے برعکس (چور مالک کو جانتا ہو لیکن مالک کو اس کا علم نہ ہو) تو چوری کرنے والے کا ہاتھ کاٹا جائے گا کیونکہ سرقہ کا ارتکاب چھپ کر کیا گیا۔ لیکن اگر مالک اور سارق دونوں کو علم ہو تو (چوری نہیں بلکہ) عداوت کی بناء پر یہ کام ہوا ہے لہذا ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ ہوگی۔ اگر کسی نے رات کے وقت حمام میں چوری کی تو سزائے قطع ملے گی لیکن وہاں دن میں چوری کرے تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ کیونکہ وہاں داخلہ کی عام اجازت ہوتی ہے (جائے محفوظ نہیں ہے) بار بردار جانور کی پیٹھ لدے ہوئے مال کی محافظ ہے اور دکانوں کے ارد گرد کا (بیرونی حصہ) جہاں فروخت کا مال رکھا جاتا ہے وہ بھی حرز (جائے محفوظ) ہے اگرچہ وہ دکان نہیں ہے۔ اب خواہ وہاں پر مالک موجود ہو یا نہ ہو اور خواہ چوری دن کے وقت ہو یا رات کو ہو یہی حکم اس جگہ کا ہے جہاں پر بازار میں پھیری لگا کر مال بیچنے والے اپنی اپنی ریڑھیاں (یا گاڑیاں کھڑی کر دیتے ہیں یا بازار میں جہاں پر جانوروں کو کھڑا کیا جاتا ہے خواہ وہ جانور وہاں پر بندھے ہوئے ہوں یا بندھے نہ ہوں انہیں بہر حال حرز میں (محفوظ) مانا جائے گا۔ نیز وہ جانور جنہیں کھیت یا میدان میں باندھ دیا جائے۔ وہی جگہ حرز (جائے محفوظ) ہے خواہ مالک موجود ہو یا نہ ہو۔ اگر کوئی جانور مسجد کے دروازے پر یا بازار میں ہو تو جب تک کہ اس کا پاسبان نہ ہو اسے غیر محفوظ تصور کیا جائے گا۔ اگر کسی نے اپنے جانور کو مکان کے آگے میدان میں باندھ دیا وہاں کوئی جگہ باندھنے کے لئے بنائی ہے تو وہ جگہ حرز (مکان محفوظ) متصور ہوگی۔

اگر کسی شخص نے اصطبل سے موتی چرایا تو اسے سزائے قطع نہیں دی جائے گی کیونکہ وہ جگہ موتی کے لئے حرز (جائے محفوظ) نہیں ہے۔

کشتی کے سامان کے لئے کشتی ہی حرز ہے۔ اگر کسی نے کشتی کو چرالیا تو یہ چوری بار بردار جانور کی چوری کی مانند ہے۔ اگر کشتی کو یوں ہی چھوڑ رکھا ہو تو وہ محفوظ تصور نہ ہوگی۔ البتہ اگر مالک نے اسے باندھ کر اس جگہ لنگر انداز کر رکھا ہو۔ تو یہ بندش یا لنگر اس کا حرز (حفاظت ہے) اگر کوئی شخص کشتی کے ساتھ رہتا ہے تو وہی اس کا محافظ ہے۔ جیسے مسجد کے دروازے پر کوئی جانور اپنے چوپان کے ساتھ ہو۔ اگر کسی بکری کی پیٹھ پر سے کپڑا چوری ہو تو اس کی سزا قطع نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی پیٹھ (بار برداری) کے جانور کی طرح حرز نہیں ہے۔ سوا اس صورت کے جبکہ سفر میں اس سے یہی کام لیا جا رہا ہے (تو وہ حرز ہے) خواہ مالک موجود ہو یا نہ ہو۔

مالکیہ شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ مختلف مالوں اور مال کی ماہیت کے پیش نظر ان کے حرز (حفاظت) کے مختلف طریقے ہیں اور اس بارے میں ان کے مروجہ طریقوں کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ اس کے لئے لغت یا شریعت کی رو سے کوئی خاص قاعدہ تحفظ مذکور نہیں ہے۔ مال کی نوعیت اور اس کی قدر و قیمت کے لحاظ سے اس کے تحفظ کی مختلف صورتیں ہیں پھر مختلف شہروں کی، خصوصیات پھر بادشاہ (یا حکومت) کے عادل و جابر ہونے پر بھی (طریق تحفظ مال کا) انحصار ہے۔ ایسی تمام صورتوں میں عوام اور ان کے رسم و رواج ہی کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ پس گھر اور دکانیں اور جانوروں کے باندھنے کی جگہ (یا تھان) ان کے لئے حرز (جائے حفاظت) ہیں۔ اسی طرح جانوروں کی پیٹھ یا موٹر گاڑیاں لدے ہوئے مال اور ظروف وغیرہ کے لئے حفاظت کی چیزیں ہیں۔ انسان کا جسم لباس یا جو کچھ اس کے پاس ہے سب کے لئے حرز (محافظ) ہے۔ خواہ وہ سو رہا ہو یا بیدار ہو اور بچے نے جو زیور وغیرہ پہن رکھا ہے اگر اس بچہ کا کوئی محافظ نہیں ہے جو مویشیوں کی طرح اس کی دیکھ بھال کرتا ہو تو اس کی چوری پر سزائے قطع نہ ہوگی۔

ہوٹلوں اور ہوٹلوں میں چوری کرنے کا بیان

ائمہ فقہ کا اس پر اتفاق ہے کہ ایک ہی عمارت جہاں مختلف اشخاص اپنے اپنے کمروں یا (حجروں) میں جدا جدا رہتے ہیں مثلاً سرائے ہوٹل اور دارالعلوم کی متعلقہ اقامت گاہیں (بورڈنگ) اگر کسی کے کمرے سے جس کا دروازہ بند ہو کوئی شخص چوری کر لے تو وہ سزائے قطع کا مستوجب ہے بشرطیکہ مال مسروقہ لے کر باہر آ گیا ہو۔ خواہ وہ سامان لے کر اپنے گھر یا اس عمارت سے باہر نہ آیا ہو۔ کیونکہ مال مسروقہ لے کر (کمرے کے باہر) عمارت کے صحن میں آ جانا ایسا ہی ہے جیسے عام گزرگاہ پر آ جانا۔ چنانچہ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ جو شخص عمارت کے صحن میں سے کوئی شے چرائے۔ اگر مال مسروقہ اپنے گھر میں لے آئے یا عمارت سے باہر لے جائے۔ کیونکہ (ایسی عمارتوں کے) صحن یا بیڑے میں عام راستوں کی طرح ہر شخص کو خرید و فروخت (کاروبار) کی اجازت ہوتی ہے۔ (پس وہ مستوجب حد چوری نہیں ہے) بجز اس صورت کے جبکہ وہاں پر کوئی مویشی بندھا ہوا ہو یا اسی طرح کی کوئی چیز اور مثلاً سائیکل وغیرہ ہو (تو ان کی چوری مستوجب قطع ہے)۔

چاروں ائمہ فقہ کا اس پر اتفاق ہے کہ گھر کے دروازے کا بند ہونا حرز (تحفظ) ہے اور کپڑے نقدی اور جواہرات کا حرز قفل زدہ صندوق ہیں۔ اموال تجارت کی محافظ مقفل دکانیں ہیں۔ اور رات کے وقت حفاظت کرنے والا شخص 'حرز' ہے۔ قیمتی مویشیوں کی جائے محفوظ اصطبل ہے اور گھر کے برتن بھانڈے اور استعمال کے کپڑوں کی جائے حفاظت گھر کا اندرونی اور ملحقہ حصہ ہے۔

مشتہر کہ رہائش کے مکان میں چوری ہونے کے متعلق فقہاء کا اختلاف ہے۔

مالکیہ اور دوسرے فقہاء کہتے ہیں کہ مشتہر کہ بود و باش والے مکان میں سے چوری ہو جائے تو چرانے والے کا ہاتھ کاٹا جائے گا بشرطیکہ چور نے مال کو اس جگہ سے جہاں پر تھا باہر نکال لیا ہو کیونکہ وہ جگہ مال کی جائے حفاظت تھی۔

حنفیہ میں سے صاحبین کا کہنا ہے کہ جب تک مال مسروقہ اس پورے مکان سے باہر نہ نکال لیا جائے چوری کرنے والے کو قطع ید کی سزا نہیں دی جائے گی کیونکہ اس مکان میں سب کو آنے کی اجازت ہے اور اس لئے بھی کہ وہ مکان تمام کمروں سمیت (مکملیت مجموعی) ایک ہی حرز (جائے حفاظت) ہے۔ لہذا سزائے قطع اس وقت واجب ہے جبکہ مال مسروقہ اس پورے مکان (مشتہر کہ) سے باہر لے جایا جائے۔

دکان کی چوری کا بیان

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر عطار یا سبزی فروش وغیرہ اشیائے فروخت کو اکٹھا کر کے دکان کے دروازے پر نمائش کے لئے رکھ کر باندھ دیں یا اس پر کوئی جالی ڈھک دیں یا دروازوں کے پٹ بھیڑ دیں تو دن کے وقت یہ سب باتیں حرز (تحفظ) قرار پائیں گی کیونکہ اس طرح کرنے سے وہ مال پڑوسیوں اور ادھر سے گزرنے والوں کی آنکھوں کے سامنے ہوگا۔ اگر کوئی چور وہاں چوری کرنے کا ارادہ کرے گا تو انہیں خبر ہو جائے گی لیکن اگر ان حفاظتی اقدامات میں سے کچھ بھی نہیں کیا گیا اور مال کو کھلا چھوڑ دیا یا دروازہ کھلا رکھا تو (وہاں سے چوری ہو جانے پر) چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ اس صورت میں وہ مال محفوظ متصور نہ ہوگا۔ تاہم رات کے وقت (یہ کافی نہیں ہے) بلکہ چوکیدار وہاں پر رہے تب اس مال کو محفوظ مانا جائے گا۔ اگر دکان میں کوئی ایسا موکھا ہے کہ جس میں ہاتھ ڈال کر کوئی چوری کرے اور وہاں کوئی محافظ بھی نہ ہو تو سزائے قطع دی جائے گی۔ ترکاری قسم کی اشیاء مثلاً مولیٰ، گندنا اور کلڑی وغیرہ کو اکٹھا کر کے باندھنے کے بعد دکان کے باہر رکھ دیا جائے اور اس پر چٹائی وغیرہ ڈال دی جائے اور کوئی نگہبان ہو تو وہ حرز (حفاظت) ہے۔

شادی وغیرہ کی تقریبات میں سجاوٹ کی قیمتی اشیاء جو زیبائش کے لئے ہوتی ہیں دکانوں میں رکھی جائیں اور انہیں پلاسٹک وغیرہ سے ڈھک دیا جائے یا برقی قمقمے جو تقریبات شادی میں دکانوں اور مکانوں کے دروازوں پر لگائے جاتے ہیں ان کا نگہبان ہو تو محفوظ قرار دیا جائے گا یا پھر بازار والوں (دکانداروں) کا یہ طریقہ ہو کہ وہ باہم ایک دوسرے کا خیال رکھیں (تب بھی یہ اشیاء حفاظت میں متصور ہوں گی) لیکن عام راتوں میں ایسا نہیں ہے (یعنی جب تک نگہبان نہ ہو انہیں محفوظ قرار نہ دیا جائے گا)۔ سلعے سلائے کپڑے جو دھویوں (یا ڈرائی کلیئروں) کی دکان پر نمائش کے لئے رکھے جاتے ہیں وہ بھی ایسے ہی ہیں جیسے عطار (یا غارہ فروش) کا مال جو دکانوں کے دروازوں پر نمائش کے لئے رکھا جاتا ہے۔ اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

سبزی فروش کی دکان جس کا دروازہ مقفل ہو وہ محفوظ مانا جائے گا اور جو ہریوں (یا صرافوں) کا سونا، چاندی اور تجارت کی گھڑیاں وغیرہ بیش بہا اشیاء جو فروخت کے لئے دکانوں کے نمائشی خانوں میں رکھے رہتے ہیں وہ بھی حرز میں ہیں۔ خواہ دن ہو یا رات۔ اگرچہ ان کا کوئی محافظ نہ ہو لیکن امن کا زمانہ ہو۔ (فتنہ و فساد کے عہد میں انہیں محفوظ تصور نہیں کیا جائے گا)۔ ایسی دکان میں جو کھلی ہو اور عام طور پر اس میں لوگ جاسکتے ہوں اگر چوری ہو جائے تو چور کو سزائے قطع نہیں دی

جائے گی۔ یہی حکم فتنہ و فساد کے ایام میں بند دکان سے چوری ہونے کا ہے۔

بیج اور پیداوار کے لئے اراضی کاشت ہی کو بالعموم حرز (محافظ) تصور کیا جائے گا اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر نگہبان نہ ہو تو اسے محفوظ نہ مانا جائے گا۔ باڑ کی دیوار پھلوں کے لئے حرز (سامان حفاظت) نہیں ہے جب تک کہ اس کا کوئی محافظ نہ ہو اور گو پھل (اتارے ہوئے نہ ہوں بلکہ) درختوں پر ہوں۔ تاہم اگر قرب و جوار کے لوگ عام طور پر اس کی دیکھ بھال کرتے ہوں تو اسے محفوظ مانا جائے گا۔ ہاں مکان کے 'لان' میں جو درخت ہیں وہ بغیر محافظ کے بھی حرز (حفاظت) میں ہیں۔ بخلاف ان درختوں کے جو عوامی علاقہ میں ہیں۔

برف خانوں کی برف، سرد خانوں کی اشیاء درختوں میں لگے ہوئے انجیر، خرمن میں گندم، کھڈوں میں دبایا ہوا لوبیا۔ یہ تمام اشیاء غیر محفوظ ہیں جب تک کہ ان کا کوئی نگہبان نہ ہو۔

گھر کے دروازے اس کے کمرے اور دکانیں جن کے درازوں میں قفل کنڈیاں ہوں اور جنہیں بھیڑ کر محفوظ کیا جاسکے۔ یہ سب حرز (حفاظت) کی اشیاء ہیں۔ خواہ دروازہ کھلا ہو یا کمرے اور دکانوں میں کوئی (محافظ) نہ ہو۔ اسی طرح گھر کے چھپر، پتھر کی سلیاں نیز اصطبل ان قیمتی جانوروں وغیرہ کے لئے 'حرز' ہیں جو ان میں ہوں بشرطیکہ یہ مکان سے ملحق ہوں۔ اگر دور میدان میں ہوں تو ان کو جائے محفوظ قرار نہیں دیا جائے گا جب تک کہ ان کے لئے کوئی قوی نگہبان نہ ہو جو دیکھ بھال کر سکے۔

جلد خراب ہو جانے والی اشیاء کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ جو اشیاء جلدی خراب ہو جاتی ہیں۔ مثلاً دودھ، گوشت اور تازہ پھل وغیرہ۔ ان کی چوری کرنے والے کو سزائے قطع نہیں ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "لا قطع فی ثمر ولا کثر" (یعنی پھل اور پتھر خرما کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہے) بمعنی جمارا ☆ اسے 'ودی' ☆ بھی کہتے ہیں نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "لا قطع فی الطعام" (یعنی کھانے پینے کے کام میں آنے والی اشیاء کی چوری میں سزائے قطع نہیں ہے) بظاہر اس سے مراد ایسی اشیاء خوردنی ہیں جو خراب ہو جاتی ہیں۔ جیسے روٹی، گوشت، کھجور اور تازہ پھل۔ دانہ گندم اور شکر کی چوری میں بالاتفاق ہاتھ کاٹنے کی سزا ہے۔ بشرطیکہ قحط اور ایام قحط نہ ہوں کہ لوگ بھوکے مر رہے ہوں۔ ان حالات میں چوری مستوجب قطع نہیں ہے خواہ چوری کی چیز جلد خراب ہو جانے والی شے ہو یا نہ ہو۔

شافعیہ مالکیہ حنابلہ اور حنفیہ میں سے امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ جلد خراب ہو جانے والی اشیاء کی چوری میں بھی ہاتھ کاٹا جائے گا۔ بشرطیکہ مسروقہ شے کی مالیت اتنی ہو جس میں ہاتھ کاٹنے کی سزا ہے تاکہ بندوں کے حقوق کی ذمہ داری پوری ہو سکے اور اس لئے بھی کہ سب کے نزدیک ایسی اشیاء کو بھی مالیت والی اشیاء میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان اصحاب کے مسلک کی دلیل وہ روایت ہے جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لکھی ہوئی (یا درخت میں لگی ہوئی) کھجوروں کی چوری کی بابت دریافت کیا گیا۔ ارشاد فرمایا "من اصاب بقیۃ من ذی حاجۃ غیر متخذ 'خبنۃ' ☆ فلاشی علیہ" ومن خرج بشیء فعلیہ غرامۃ مثلیہ والعقوبۃ" ومن سرق منه

☆ 'کثر' یا جمار درخت کی چولی (یعنی مدھ) کو کہتے ہیں یہ ایک سفید مادہ ہے جو درخت خراج کی بھٹک سے نکلتا ہے (تمالیا پتھر خرما)۔

☆ 'ودی' کے معنی 'صفا، نخل' کے ہیں۔ یعنی شہد کی مکھی کا تھرا ہوا شیرہ واللہ اعلم بالصواب

☆ ☆ ☆ 'خبنۃ' وہ مقدار ہے جو کوئی اپنی آغوش میں لے سکے۔

شیئا بعد ان یو ویہ الجرین فبلغ ثمن المعلن ففیه القطع“ ابو داؤد والنسائی۔ (یعنی اہل حاجت سے بچا ہوا کچھ پھل۔ دامن بھر کر نہیں۔ کوئی لے لے تو اس پر مواخذہ نہ ہوگا۔ ہاں اگر اسے لے کر چلا جائے تو اس کا دگنا تاوان دے اور سزا لگ رہی۔ اور جب کھجوروں کو سکھانے کے لئے جرین یا کھتی) میں لا کر رکھا جائے اور وہاں سے اتنی مقدار میں چوری ہو کہ اس کی مالیت مجن کی قیمت کے برابر یعنی تین درہم ہو تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔) ایک اور روایت میں ہے کہ قبیلہ مزنیہ کے ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شب دزدی کی بابت جو حریسہ (محفوظ چراگاہ) سے چوری کر کے لے جائے دریافت کیا تو فرمایا ”فیہا ثمنہا مرتین“ و ضرب و نکال و ما اخذ من اجرانہ ففیه القطع“ بروایت احمد و نسائی۔ (یعنی ایسی صورت میں مال کی مالیت کا دگنا تاوان اور سزائے ضرب اور سخت سزائے سزا ہے۔ لیکن ان کھیتوں سے جہاں کھجور کو سکھاتے ہیں چوری کی جائے تو ہاتھ کاٹنے کی سزا ہوگی)۔ اس میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں۔

”ماتری فی التمر المعلق؟ فقال: لیس فی شیء من التمر المعلق قطع الا ما آواہ الجرین“ فما اخذ من الجرین فبلغ ثمن المعلن ففیه القطع“ و ما لم یبلغ ثمن المعلن ففیه غرامہ مثلیہ“ و جلدات و نکال“ (یعنی عرض کیا گیا کہ) لنگی ہوئی کھجوروں کی بابت جہاں ہاتھ پہنچ سکتا ہے آپ کی کیا رائے ہے؟ فرمایا اس کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ لیکن اگر کھجور کو جرین یا خشک کرنے کی جگہ پر لایا گیا اور وہاں سے اٹھایا گیا اور اس کی مقدار ”مجن“ قیمت کے برابر (یعنی تین درہم) ہے تو ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اگر مجن کی مالیت کے برابر نہ ہو تو اس سے دگنی مقدار میں تاوان دے اور اسے سزائے ضرب و سزائے دی جائے۔) یہ الفاظ حاکم کی روایت کے ہیں۔ جرین اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں خشک کرنے کے لئے کھجور کو ڈالا جاتا ہے اس کی جمع جرن ہے۔ اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ کھجور میں جب (خشک کرنے کی جگہ پر) لائی جائے گی تو تازہ (گیلی) ہوگی اور پھر وہاں پر سوکھ کر خشک ہو جائے گی (مطلب یہ ہے کہ تر کھجور کی چوری بھی مستوجب حد ہو سکتی ہے)۔ ایک روایت میں ہے ”ان سارقاً سرق اترجة فی زمن عثمان بن عفان فامر بها عثمان ان تقوم فقومت بثلاث دراهم فقطع عثمان یدہ“ (یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں ایک شخص نے لیموؤں کی چوری کی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ اس کی قیمت لگائی جائے۔ اس کی قیمت تین درہم لگائی گئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا دی)۔

(ان تمام باتوں کا) جواب یہ ہے کہ یہ (مسلم) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمومی ارشاد کے منافی ہے ”لا قطع فی ثمر ولا کثر“ (یعنی پھل اور کثر (پنیر خرما) کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا) اور رسول اللہ کا ارشاد ہے ”لا قطع فی الطعام“ (یعنی اشیائے خوردنی کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا) اور وہ جو روایت ہے کہ ایک لڑکے نے باڑ کی دیوار کے اندر سے ودی (گوند یا پنیر خرما) کی چوری کی اس کے خلاف مروان کے سامنے دعویٰ ہوا اس نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ اس پر رافع بن خدیج نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ”لا قطع فی ثمر ولا کثر“ (کہ پھل اور پنیر خرما کی چوری میں سزائے قطع نہیں ہے) اس حدیث کی صحت کو تمام امت نے تسلیم کیا ہے۔ لہذا تر کھجور جو جرین میں ہو اس کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا دینا اس ارشاد کے خلاف ہے اور شرعی سزاؤں کے بارے میں ایسے پہلو کو ملحوظ رکھنا واجب ہے جو سزا سے بچا سکے اور سزا نہ دی جائے۔ پھر ایک امر یہ ہے کہ سابق الذکر مسلک کا اختیار کرنا ظاہر حکم کے خلاف عمل کرنا ہے کہ مال مسروقہ کا تاوان دگنی مالیت کا نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ امام احمد سے ایسا ہی منقول ہے لیکن علمائے امت اس کے خلاف ہیں کیونکہ کسی شخص کا قول کتاب اللہ سے ثابت شدہ حکم کے برابر قوی نہیں

ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”فمن اعتدى عليكم فاعتدوا عليه بمثل ما اعتدى عليكم“ (یعنی اگر کوئی تمہارے ساتھ زیادتی کرے تو تم اس کے ساتھ بس اتنی ہی زیادتی کر سکتے ہو جتنی اس نے کی ہے) پس ایسی بات (جو حکم خدا سے متعارض ہو) کی نسبت رسول اللہ سے درست نہیں ہے۔ حضرت عبدالرحمن بن ابی حسین سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”لا قطع فی ثمر معلق ولا فی حریسة جبل“ (۱) (یعنی درخت کے معلق پھل کی چوری اور پہاڑ کے حریدہ (گھائی) میں چوری کرنے پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا)۔

حنفیہ کہتے ہیں معمولی سی چیز جس کا اٹھا لینا دارالسلام میں جائز سمجھا جاتا ہے ان کی چوری میں سزائے قطع نہیں ہے۔ مثلاً لکڑی، گھاس، بانس، مچھلی، پرندہ اور شکار۔ چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ ”کانت الید لا تقطع علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الشیء التافہ“ (یعنی عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں اشیائے تافہ (معمولی اشیاء) کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جاتا تھا) ”تافہ“ کے معنی ”حقیر شے“ کے ہیں اور ہر ایسی شے جسے غیر مصنوع حالت میں لے لینا جائز ہو اور لوگ اس کے خواہش مند نہ ہوں، حقیر ہے۔ ایسی اشیاء بہت کم لوگوں کو مطلوب ہوتی ہیں اور اسے بچا کر رکھنے کی پروا نہیں کی جاتی یہاں تک کہ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ اگر کوئی اسے اٹھا لے جائے تو اس کے مالک کو ناگوار گزرے اور اس میں خیانت کا تصور نہیں ہوتا بلکہ اگر کوئی اس میں بخل کرے تو اسے تنگ دل خیال کیا جاتا ہے۔ اس طرح کی اشیاء کی چوری کے بارے میں شرعی (قانونی) سرزنش کی ضرورت نہیں ہے نیز ایسی اشیاء کا تحفظ ناقص ہے۔ چنانچہ پرندہ کی خاصیت یہ ہے کہ وہ اڑ جاتا ہے۔ لہذا اس کے حصول کی کوشش بہت کم کی جاتی ہے۔ اسی طرح شکار سب کی مشترکہ چیز ہوتی ہے جب تک اسے محفوظ نہ کر لیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ”الصید لمن اخذہ“ (یعنی شکار کا مالک وہ ہے جو اسے پکڑ لے) نیز حضور ﷺ نے فرمایا ”الساس شرکاء فی ثلاثۃ فی الکلاء، والماء، والنار“ (یعنی تین اشیاء میں تمام لوگ شریک ہیں۔ گھاس، پانی اور آگ) چونکہ ان اشیاء میں عوام کو شریک قرار دیا گیا ہے لہذا اگر وہ زیر حفاظت ہوں تب بھی ملکیت کا شبہ رہتا ہے اور شبہ جرم کی صورت میں سزا ساقط ہو جاتی ہے۔ مچھلی میں مالح اور طری (یعنی نمک پاشیدہ اور تازہ) دونوں طرح کی مچھلیاں داخل ہیں اور پرندوں میں ہر طرح کے پرندے بشمول مرغی، بطخ اور کبوتر داخل ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ”لا قطع فی الطیر“ (یعنی پرندے کی چوری میں سزائے قطع نہیں ہے)۔

شافعیہ مالکیہ، حنابلہ اور ابو یوسف منجملہ حنفیہ کہتے ہیں کہ ہر شے جس کو محفوظ قرار دیا جائے اور مسروقہ شے کی مقید انصاف سرقہ کو پورا کرے تو سزائے قطع واجب ہوگی۔ اس حکم سے پانی، ”مٹی“، گارا، روڑی، آلات موسیقی اور شراب مستثنیٰ ہیں انکے علاوہ تمام اشیاء جن کی مالیت ہوتی ہے اور زیر حفاظت ہوں، تو ان کا حکم مختلف ہوگا۔ اور ان کی عمومی اباحت ملکیت میں آنے اور زیر حفاظت ہونے کے بعد جاتی رہے گی۔ اس کی بابت کتاب و سنت کا حکم عمومیت کا حامل ہے اور کسی شے کے بنیادی طور پر مباح ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہی حکم بھوسے اور لکڑی وغیرہ اشیاء کا ہے کہ دراصل وہ سب کے لئے مباح ہوں گی لیکن اگر زیر حفاظت ہوں تو سب کے لئے مباح نہ رہیں گی۔

(۱) کہتے ہیں حریدہ وہ چراگاہ ہے جس کا محافظ ہو اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حریدہ وہ جانور ہے جسے اپنے ٹھکانے پر پہنچتے پہنچتے رات پڑ جائے۔

درخت میں لگی ہوئی کھجوروں کی چوری کا بیان

شافعیہ اور حنفیہ کہتے ہیں کہ درخت میں لٹکے ہوئے پھل اور کھڑی فصل (جو ہنوز کاٹی نہ گئی ہو) میں سے چوری کرنے پر سزائے قطع نہیں ہے۔ کیونکہ وہ غیر محفوظ ہے۔ یہی حکم ہمارے (پیغمبرؐ) کا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، ”لا قطع فی ثمر ولا کثر“ یعنی پھل اور پیغمبرؐ کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ امام محمد فرماتے ہیں کہ ثمر سے مراد وہ پھل ہے جو درخت خرما پر لگا ہوا ہو اور ”کثر“ سے مراد ہمارے ہے۔ (اس سے مراد غالباً وہ سفید مادہ ہے جو خرما کے گچھے سے نکلتا ہے۔ اور اسے پیغمبرؐ کہتے ہیں) نیز یہ بھی حضور کا ارشاد ہے ”لا قطع فی الثمار“ (یعنی پھلوں کی چوری میں سزائے قطع نہیں ہے) نیز ابو داؤد نے احادیث مرسلہ کے زمرہ میں حضرت جریر بن حازم اور انہوں نے حسن بصری سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”انسی لا اقطع فی الطعام“ (یعنی میں اشیائے خوردنی کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دیتا)۔ عبدالحق نے بھی اس مسئلہ کا ذکر کیا ہے اور اس کی علت اس کے سوا نہیں بتائی، کہ یہ حدیث مرسل (سے ثابت) ہے۔ ان فقہاء کے نزدیک یہ کوئی علت نہیں ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ درخت میں لگے ہوئے پھل کی چوری مستوجب قطع ہے۔ بشرطیکہ وہ زیر حفاظت ہو۔ کیونکہ روایت میں آیا ہے کہ سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے (درختوں میں) چھپے ہوئے پھلوں کی چوری میں سزائے قطع دی ہے۔ صحابہؓ نے اس سے اتفاق فرمایا ہے۔ اور اس لئے بھی کہ یہ مالیت رکھتا ہے۔ اسی طرح تازہ پھل کی چوری بھی بایں لحاظ کہ وہ مال ہے (مستوجب قطع ہے) بشرطیکہ وہ حرز (حفاظت) میں ہو۔

حنابلہ کہتے ہیں کہ (سروۃ) پھل کی دگنی قیمت لگائی جائے۔ باقی تینوں ائمہ فقہ کا کہنا ہے کہ صرف پھل کی قیمت ادا کرنا واجب ہے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر تازہ پھل غیر محفوظ ہو تو ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ دی جائے لیکن اگر پھل گھر کے اندر ہو یا حفاظت میں ہو تو ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جائے گی۔

حرام مشروبات کی چوری کا بیان

ائمہ فقہ کا اس بارے میں اتفاق ہے کہ نشہ آور مشروبات مثلاً شراب، خمر، غلیظہ، اور سرکہ وغیرہ کی چوری میں سزائے قطع نہیں ہے کیونکہ چوری کرنے والا (اپنے فعل کی) یہ توجیہ کر سکتا ہے کہ اس نے تلف کرنے کے ارادہ سے اٹھایا تھا۔ پھر یہ بھی ہے کہ ان میں ایسی بھی بعض چیزیں ہیں جن کی کوئی مالیت نہیں ہے۔ لہذا یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ مال ہی نہیں ہے۔ لہذا سزائے قطع نہ ہوگی۔ اور وہ مال جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے مثلاً سہو، مردار جانور کی کھال جو غیر مدبوغ ہو (یعنی کمائی ہوئی یا رنگی ہوئی نہ ہو) یا موسیقی کے آلات (یعنی باجا وغیرہ) خواہ مشرک کا مال ہو اور گوٹھ پھوٹ جانے کے بعد اس کی مالیت مقدار مال سرقہ کے برابر ہو جائے۔ ان اشیاء کی چوری میں سزائے قطع نہیں ہے۔ کتے کی چوری میں بھی اگرچہ وہ سدھایا ہوا یا حفاظت کے لیے رکھا گیا ہو، ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہے۔ کیونکہ اس کو مال میں شمار نہیں کیا جاتا۔ قربانی کا جانور اگر ذبح ہونے سے پہلے چوری ہو تو چرانے والے کا ہاتھ کاٹا جائے گا لیکن ذبح ہونے کے بعد (گوشت کی چوری میں سزائے قطع نہیں ہے کیونکہ ذبح ہونے کے بعد وہ (قربانی کا) جانور مالک کی ملکیت سے خارج ہو کر اللہ کی ملکیت ہو جائے گا لیکن اگر قربانی کے گوشت یا اس کی کھال کو بطور صدقہ کسی محتاج کو یا عطیہ کے طور پر کسی شخص کو دے دیا گیا اور پھر

اسے کسی نے چرایا تو اسے سزائے قطع ہوگی۔

حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر کسی نے شراب یا سور کی چوری کی تو وہ اس کی قیمت کی ادائیگی کا ذمہ دار نہ ہوگا کیونکہ اسے مال تصور نہیں کیا جاتا خواہ اس کا مالک مسلمان ہو یا کافر۔ اسے مال قرار دیئے جانے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ نیز یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ چوری کرنے والا اپنے عمل کی توجیہ یوں کرے کہ اس نے اسے تلف کرنے کے لیے چرایا ہو۔ اس طرح یہ جرم مشکوک ہو جائے گا کیونکہ ممنوع اشیاء کا تلف کر دینا روا ہے۔ یہ ایسی شے ہے کہ اس کی کوئی مالیت نہیں لگائی جاتی۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر شراب یا سور کا مالک ذمی (اسلامی حکومت کی کافر رعایا) ہو اور مسروقہ شے ہنوز چوری کرنے والے کے پاس ہے تو اسے واپس کر دے۔ اور اس کی قیمت بطور تاوان ادا کرے۔ ہاں مسلمان کی چیز ہو تو کچھ واجب نہ ہوگا۔

مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ موسیقی کے آلات (باجا وغیرہ) کی چوری میں نہ سزائے قطع ہے اور نہ اس کا تاوان ہے۔ خواہ (مال مسروقہ) کسی مسلمان کا ہو یا غیر مسلم کا کیونکہ اس کی کوئی مالیت قرار نہیں دی گئی اور اس کی حفاظت یا استعمال ممنوع ہے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ آلات طرب (یعنی گانے بجانے کے آلات) کا کوئی تاوان نہیں ہے درآنحالیکہ اسے عیاشی یا فضولیات میں استعمال کیا جاتا ہو۔ لیکن اگر ان آلات اور باجے گاجے کو لہو (فضولیات) میں استعمال نہیں کیا جاتا تو اس کے مالک کو اس کی مالیت کے برابر تاوان دینا ہوگا۔ کیونکہ وہ آلات جس چیز سے بنے ہیں ان اشیاء کا استعمال روا ہے۔ بعض اصحاب کہتے ہیں کہ اگر وہ آلات ایسی اشیاء کے ہوں جن کا حاصل کرنا اور خرید و فروخت کرنا جائز ہے اور پھر اس شے سے ایسی چیز بنائی جائے جس کا استعمال ناجائز ہے۔ مثلاً طنبورہ، باجا، سارنگی یا ساز وغیرہ ایسی اشیاء جو لہو و لعب کا سامان (یعنی اللہ سے غافل کرنے والے) ہیں تو دیکھنا چاہیے کہ اگر اس کی موجودہ صورت کو توڑ پھوڑ کرنا کارہ کر دیا جائے اور اس کی مالیت ایک چوتھائی دینار یا اس سے زیادہ ہو تو ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جائے گی۔ یہی حکم سونے چاندی کے برتنوں کا ہے جس کا استعمال جائز نہیں ہے۔ ایسے (مسروقہ) برتنوں کو توڑنے کا حکم دیا جائے گا۔ پھر صرف اس کے سونے یا چاندی کی مالیت جس میں اجرت ساخت شامل نہ ہو لگائی جائے گی۔ اسی طرح سونے چاندی کی بنی ہوئی صلیب یا ناپاک تیل جس کی مالیت ناپاک ہونے کے بعد بھی مال سرقہ کے نصاب کے برابر ہو جائے تو اس کی چوری پر سزائے قطع دی جائے گی۔ اگر اتنی مالیت نہ ہو تو سزائے قطع نہیں دی جائے گی۔ یہی حکم نرد، شطرنج اور آلات قمار بازی کی چوری کا ہے۔

قرآن مجید اور علمی کتابوں کی چوری کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ قرآن کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ دی جائے۔ خواہ اس کی قیمت مقدار نصاب سرقہ کے برابر ہو اور گوچلی بالذہب ہو (یعنی مطلقاً ہو اور اس پر سونے کا کام ہوا ہو) کیونکہ چور اپنے فعل کی یہ توجیہ کر سکتا ہے کہ وہ اسے تلاوت کے لیے لایا ہے نیز اس لیے بھی کہ قرآن کی حفاظت اس کی تحریر (یعنی متن مکتوبہ) کے لیے ہے اور متن کی مالیت

نہیں ہوتی باقی اشیاء: جلد، ورق اور غلاف (یا زیب و زینت کی اشیاء) وہ اس کے ساتھ کی اشیاء (بالائی لوازمات) ہیں جن کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔ اس مسئلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ جب شے مسروقہ مشتمل ہو واجب القطع اور غیر واجب القطع اجزاء پر تو ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جائے گی کیونکہ اس صورت میں سزائے قطع کے واجب ہونے اور نہ ہونے دونوں باتوں کا امکان ہے۔ لہذا ارتکاب جرم مشتبہ ہو گیا (اور شبہ کا فائدہ ملزم کو ملتا ہے۔ لہذا سزا نہ ہوگی) اس طرح علمی اور دینی کتابوں کی چوری میں بھی سزائے قطع نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں بھی یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ اس شخص نے چوری نہیں کی بلکہ پڑھنے کے لیے اٹھا لایا ہے۔ یعنی اس فعل کا مقصد حصول علم ہے جو اس سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مال نہیں ہے جسے چرایا جاسکے۔ ہاں اگر کسی نے جلد اور غیر مکتوبہ اوراق کو (لکھے جانے سے پہلے) چرایا تو سزائے قطع عائد ہوگی۔ کیونکہ یہ مالیت والی شے ہے۔ رہا شعر اور ادب اور حساب (یا ریاضی) کی کتابیں یا دفتر سود کھینچا چاہیے کہ اس کتاب کی جلد اور کاغذ جو اس میں لگے ہیں اگر ان کی مالیت نصاب مال سرقہ مستوجب سزا کے برابر ہے تب تو ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جائے گی ورنہ نہیں۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید، شرعی کتب اور متعلقہ اشیاء کی چوری کرنے والے کا ہاتھ کاٹا جائے۔ کیونکہ یہ بھی مال ہے اس کی خرید و فروخت اور تجارت ہوتی ہے اور اس کی حفاظت کی جاتی ہے یہی حکم شعر اور مفید ادبی کتب کا ہے۔ ہاں اگر وہ کتاب جائز فائدہ کی نہ ہو تب اس کی جلد اور اوراق کی مالیت کو دیکھا جائے گا اگر اس کی مالیت مقدار مال سرقہ کے برابر ہو تو سزائے قطع دی جائے، ورنہ نہیں۔ ابو ثور، ابن قاسم اور ابن منذر بھی یہی کہتے ہیں کیونکہ اس کو مال قرار دیا گیا ہے۔ حنفیہ میں سے امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ اگر قرآن مجید مطلق ہو اور اس کی مالیت سرقہ کا نصاب پورا کرتی ہو تو اس کی چوری پر ہاتھ کاٹا جائے گا۔ کیونکہ یہ اشیاء قرآن میں داخل نہیں ہیں۔

کفن چور کا بیان

اس بات میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا مردے کی قبر کفن کا 'حرز' (جائے حفاظت) ہے یا نہیں؟ حنفیہ کہتے ہیں کہ قبر تو کفن کے علاوہ کسی بھی شے کے لیے 'حرز' نہیں ہے تو کفن کے لیے بھی 'حرز' نہیں ہے۔ لہذا کفن چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ کیونکہ قبر غیر محفوظ اور معرض تلف (یعنی ضائع ہونے کی جگہ) ہے اور چوری کرنے والا ایسا مال اٹھاتا ہے جس کا کوئی مالک نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، اوزاعی، مکحول اور زہری بھی یہی کہتے ہیں کہ 'قبر ویرانے میں ایک گڑھا ہے، جہاں سے رات دن ہر شخص کو گزرنے کی اجازت ہے نہ اس میں کوئی دروازہ ہوتا ہے اور نہ کوئی اس کا محافظ ہے جو اس کی دیکھ بھال کرے۔ پس اس کو محفوظ کہہ دینا محض کہنے کی بات ہے۔ کوئی حقیقت نہیں ہے اور ایسا کہنا منع ہے۔ پس اگر کوئی شے حفاظت میں نہیں ہے تو اسے ضائع کرنے کا الزام عائد نہیں ہوتا۔ بلکہ میت کی ضرورت میں صرف نہ ہو اور اسے کام میں لایا جائے تو اسے ضائع کرنا نہیں کہا جائے گا۔ لہذا اس پر تاوان عائد نہ ہوگا۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ (ضائع کیا گیا) تو کم از کم اس کا محفوظ قرار دینا مشتبہ ہے اور جب 'جرم مشتبہ' ہو جائے تو سزا موقوف ہو جاتی ہے۔ پھر کسی کو کفن کا مالک قرار دینا امر مشتبہ ہے اور اس سے سزائے شرعی کا مقصد پورا ہونے میں خلل پیدا ہوتا ہے اور ان باتوں سے سزا دینے سے دستکش ہو جانا واجب ہو جاتا ہے۔ اول یہ کہ کفن کا کوئی مالک نہیں ہوتا اور نہ میت کو اس کا مالک

قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں مالک بننے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ وارث بھی کفن میت کا مالک نہیں ہوتا کیونکہ وہ صرف اس مال کا مالک ہوتا ہے جو میت کے واجبات سے زیادہ ہو پس کسی میت کے ایسے ترکہ کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا ہوگی جس کے وصول کرنے کا حق میت کے قرض خواہ کو ہے۔ ترکہ میں سے واجب الادا مال قرض خواہ کا ہوتا ہے جو اپنا حق اس مال سے وصول کر سکتا ہے۔ پس اگر اس بات کو صحیح مان لیا جائے کہ کفن کا کوئی مالک نہیں ہوتا تو اس کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہو سکتی۔ تاہم اس کے مملوکہ ہونے میں شبہ تو ضرور ہے جیسا کہ بتایا گیا اور شبہ کی صورت میں بھی سزا نہیں دی جاسکتی۔ اور قبر کو گھر قرار دینا نہایت بعید از قیاس ہے۔ ہاں مجازاً کہہ دو کیونکہ گھر تو وہی ہے جس کے چاروں طرف اس گھر کی دیواریں بنی ہوں اور قبر ایسی نہیں ہوتی علاوہ اس کے حقیقی معنوں میں گھر بھی ہو تو ضروری نہیں کہ وہ (شرعی اعتبار سے) محفوظ بھی ہو بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ غیر محفوظ ہوتا ہم بنیادی طور پر اسے گھر کہا جائے جیسے مسجد۔

شافعیہ، مالکیہ، حنابلہ اور امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ مردوں کا کفن چرانے والے کو ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جانی واجب ہے۔ یہی مسلک حضرت عمر، ابن مسعود، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم اور علماء میں سے، ابو ثور، حسن، شعبی، قتادہ، حماد اور نخعی کا تھا تاہم وہ کہتے ہیں کہ صرف اس کفن کے چرانے والے کو ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جائے گی جو شرعاً واجب ہے۔ کفن مسنون سے زیادہ جو کچھ بھی ہے اس کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہے۔ اسی طرح ان اشیاء کے چرانے کی سزا بھی قطع ید نہیں ہے جو لوگ میت کے ساتھ رکھ دیتے ہیں مثلاً خوشبو (عطر وغیرہ) یا مال اور سونا وغیرہ۔ کیونکہ یہ سب مال کا ضائع کرنا اور احمقانہ حرکت ہے۔ ایسی اشیاء کی حفاظت نہیں ہوتی۔ اصحاب بالا کفن دُڑ دی کی سزائے قطع کی دلیل میں یہ روایت پیش کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”من لبس قطعناہ“ (یعنی جس نے کفن دُڑ دی کی ہم اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا دیں گے)۔ یہ حدیث ’مکر‘ (ناقابل تسلیم) مانی گئی ہے بیہقی نے اس کا اخراج کیا ہے۔ نیز آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”لا قطع علی المحدثی“ (یعنی محتفی کو سزائے قطع نہیں ہے)۔ فرمایا کہ اہل مدینہ کی بولی یا ’عرف‘ (یعنی روزمرہ) میں محتفی نباش (یعنی کفن چور) کو کہتے ہیں۔

(سزائے قطع نباش کے بارے میں جو روایات آئی ہیں منجملہ ان کے) ابن منذر کا کہنا ہے کہ ابن زبیر کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے کفن چرانے والے کو ہاتھ کاٹنے کی سزا دی، یہ ایک ضعیف روایت ہے۔

عبداللہ بن عامر بن ربیعہ سے مروی ہے کہ انھیں یمن میں ایک قوم سے سابقہ پڑا جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں قبروں سے چوری کرتے تھے۔ ان کی بابت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لکھا گیا۔ آپ نے جواباً لکھا کہ ان کا ہاتھ کاٹ دو۔

زہری روایت کرتے ہیں کہ مروان کے سامنے کچھ لوگ پیش کئے گئے جو اخطا کرتے یعنی قبروں سے کفن کی چوری کرتے تھے۔ مروان نے انھیں سزائے ضرب دی اور جلاوطن کر دیا۔ بہت سے صحابی رضوان اللہ علیہم اسی خیال کے حامی ہیں۔ نیز زہری ہی سے ایک روایت ہے کہ ایک کفن چور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں گرفتار ہوا۔ مروان مدینہ پر حاکم تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں موجود الوقت صحابہؓ اور فقہاء سے رائے طلب کی تو سب نے یہ رائے دی کہ اسے سزائے ضرب دی جائے اور اس کی تشہیر کی جائے۔

اور کفن کے جو معنی ہیں اس لحاظ سے یہ بھی مال ہے اور اس جیسے مال کی حفاظت کی جاتی ہے۔ اور قبر میت کی جائے حفاظت ہے اور میت پر جو کچھ اوغیرہ ہوتا ہے وہ میت کے لوازمات میں سے ہے لہذا قبر اس کی بھی حفاظت کی جگہ ہے۔ پس وہاں سے چوری کرنے والا سزائے قطع کا مستوجب ہے۔ اور بدیں جہت کہ میت کو برہنہ رکھنا جائز نہیں ہے میت کو اس کی ضرورت ہے لہذا قبر کو جائے حرز قرار دیا جائے گا۔ نیز حدیث ابو ذر میں آنحضرت ﷺ نے قبر کو گھر تصور فرمایا ہے۔ چنانچہ ابو ذر کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا کہ ”کیف انت اذا اصاب الناس موت، یكون الموت فیہ بالوصیف، یعنی القبر۔ قلت: اللہ ورسولہ اعلم، او ما قال اللہ ورسولہ“ (یعنی جب لوگوں کو موت آتی ہے تو تمہاری کیا کیفیت ہوتی ہے وہاں یعنی قبر میں موت ہی خادم (یا شریک حال) ہوتی ہے (وہ کہتے ہیں کہ) میں نے کہا (وہ کیفیت تو) اللہ اور اس کے رسول کو ہم سے بہتر معلوم ہے یا پھر جو کچھ خدا اور اس کا رسول ارشاد فرمائیں)۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”علیک بالصبر“ (یعنی تمہیں صبر لازم ہے)۔

ابوداؤد نے (اپنی تصحیح میں) ایک باب کا عنوان رکھا ہے ”باب قطع النباش“ (یعنی کفن چور کو سزا قطع دینے کا بیان) ابوداؤد نے اس حدیث سے اس طرح استدلال فرمایا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے قبر کو ایک گھر قرار دیا ہے اور گھر حرز (مقام حفاظت) ہے اور حرز کی جگہ سے چوری کرنے والے کو بالاتفاق ہاتھ کاٹنے کی سزا ہے۔ اور اس لیے بھی قبر کفن وغیرہ کے لیے ’حرز‘ ہے کہ مختلف اشیاء کی حفاظت اس کے مناسب حال جگہ سے ہوتی ہے۔ چنانچہ موسیٰ کے لیے اصطبل حرز ہے اور موتی کی حفاظت ڈبیا، صندوق یا خزانہ میں ہوتی ہے اور بھیڑ بکریوں کی حفاظت کے لیے باڑا ہے۔ پس اگر ان مقامات سے زیر حفاظت اشیاء کی چوری ہو تو سزائے قطع واجب ہے۔ چنانچہ اگر موتی اور جواہر اصطبل یا باڑے میں سے چوری ہو جائیں تو ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ ہوگی۔ پس کفن کا قبر میں سے لیا جانا سرقہ ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے زندگی میں انسان کے لیے زمین کو جائے سکونت بنایا ہے اور مرنے کے بعد قبر اس کے دفن ہونے کی جگہ ہے (یعنی دونوں مقامات انسان کے گھر ہیں)۔ اس تفصیل کی ضرورت اس صورت میں ہے جبکہ قبر کسی دیرانے میں ہو۔ لیکن اگر میت کی قبر کسی مکان کے اندر ہو جس کے دروازے بند ہوں جیسا کہ قاہرہ (دار الخلافہ مصر) میں ہوتا ہے کہ ہر خاندان کے لیے ایک وسیع مکان (یا احاطہ) ہوتا ہے جسے ’حوش‘ (خاندانی قبرستان) کہتے ہیں۔ اس کے اندر مردوں کی قبریں ہوتی ہیں۔ اس کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔ ایسے مقامات سے اگر کفن چرائے جائیں تو ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جائے گی۔ کیونکہ یہاں شرط حفاظت پائی جاتی ہے یعنی دروازہ اور اس کا بند ہونا۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں بھی ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہے۔ یہاں چوروں سے حفاظت پیش نظر نہیں بلکہ دوسری نقصان دہ اشیاء سے تحفظ پیش نظر ہوتا ہے مثلاً مال کے خراب ہونے سے بچانے یا کسی دوسرے شخص کے قابض ہو جانے سے باز رکھنے کے لیے حفاظت کی جاتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ مال ایسی شے کا نام ہے جس کے اور لوگ خواہش مند ہوں اور (مالک) دینا نہ چاہتا ہو۔ کفن ایسی شے ہے کہ جو شخص جانتا ہو کہ یہ مردہ کو پہنایا گیا ہے وہ اسے لینا پسند نہ کرے گا۔ اس کے خلاف شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ شریعت نے حد (سزائے شرعی) اس لیے مقرر کی ہے کہ لوگوں کو جرم سے باز رکھا جائے اور اس کی ضرورت اس لیے ہے کہ لوگ بکثرت اس کا ارتکاب کرتے ہیں۔ لیکن وہ جرم جو شاذ و نادر ہی

کسی سے سرزد ہوتا ہے اس کے بارے میں کوئی حد (شرعی) سزا نہیں ہے۔ (واضح ہو کہ سزائے قطع کے بارے میں) اسی طرح کا اختلاف اس صورت میں ہے جبکہ کسی قافلہ کے ساتھ کوئی جنازہ ہو اور تابوت میں سے چوری ہو جائے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص 'مردوں کے کفن چرانے کا عادی ہو جائے تو امام (حاکم اسلام) کو چاہیے کہ سرزنش کے طور پر حد شرعی کے طور پر نہیں۔ اس کا ہاتھ کاٹ دے۔ یہ حکم روایات و آثار صحابہؓ کی بناء پر ہے۔

تمام علماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ دی جائے تا آنکہ ایک شخص زیر حفاظت مال کو اس مقدار مال کی چوری کر کے نہ لے جائے جس مقدار میں ہاتھ کاٹنے کی سزا لازم ہو جاتی ہے۔ پس اگر کسی شخص نے (چرا کر لے جانے کے لیے) ایک کمرے میں کپڑے اکٹھے کر لیے لیکن ابھی وہاں سے لے جانے نہ پایا تھا کہ پکڑا گیا تو اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ ہوگی۔ اسی طرح اس صورت میں بھی (سزائے قطع نہ ہوگی) جبکہ چوری کا مال باندھ جوڑ کر رکھا اور گھر سے باہر آتے ہی پکڑا گیا اور اس کے پاس کوئی مال مسروقہ نہ تھا تو اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ ہوگی کیونکہ وہ پورا گھر ایک ہی حرز (جائے حفاظت) ہے۔ (لیکن وہاں سے مال مسروقہ باہر نہیں گیا اور حرز کے اندر رہا)۔ تاہم حاکم کو چاہیے کہ اس جرم کی سزا وہ اپنی سمجھ کے مطابق دے، یعنی قید یا جرمانہ یا ضرب وغیرہ۔

مسلمان کا متامن (غیر مسلم پناہ گیر) کے ہاں چوری کرنا

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان پناہ گیر (غیر مسلم) کا مال مقدار سرقہ میں چرائے تو چوری کرنے والے کو سزائے قطع واجب نہیں ہے۔ کیونکہ اصولی طور پر یہ مال حربی (دشمن برسر جنگ) کا ہے اور حربی کا مال مال غنیمت ہوتا ہے لہذا اس کی چوری میں سزائے قطع نہ ہوگی۔

شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر مسلمان متامن (پناہ گیر) کا مال بقدر نصاب چرائے تو چوری کرنے والے کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ کیونکہ وہ مال حرز میں ہے اور متامن کی ملکیت ہے۔ اس مال کو ایسا ہی سمجھا جائے گا جیسا ذمی (اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا) کا مال، اور جب تک کہ وہ شخص اسلامی ملک میں ہے اس کے ساتھ وہی برتاؤ ہوگا جو دوسرے ذمیوں اور مسلمانوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

متامن یا معاہدہ کے چوری کرنے کا بیان

مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی متامن (یعنی وہ غیر مسلم جو اسلامی حکومت میں پناہ لے) یا معاہدہ (جس کے ساتھ ہدم مجارحت کا معاہدہ ہوا ہو) مسلمان کے مال کی چوری کرے تو اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا ہوگی۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ (اس صورت میں) ہاتھ کاٹنے کی سزا واجب نہیں ہے بسا اوقات مسلمان قیدی دارالحرب (دشمن ملک) میں دشمن کے قبضہ میں ہوتے ہیں اگر اسلامی ملک میں معاہدہ کرنے والوں یا پناہ لینے والوں کے ہاتھ کاٹنے گئے تو دشمن بھی (مسلمانوں کے ساتھ) یہی سلوک روارکھیں گے۔ لہذا یہ تقاضائے مصلحت عمومی اس کے ہاتھ کاٹنے کی سزا موقوف ہو جائے گی نیز اس لیے بھی کہ شریعت اسلامیہ (کے احکام) ان پر عائد نہیں ہوتے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی معاہدہ (غیر مسلم حلیف) یا متامن (پناہ گیر) کسی مسلمان یا ذمی (اسلامی ملک کا غیر مسلم فرد) یا معاہدہ کا مال چوری کرے تو معاہدہ کو پیش نظر رکھا جائے گا۔ اگر معاہدہ میں یہ تھا کہ چوری کرنے کی پاداش میں

اس کو ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جائے گی تو اس کی پابندی کرتے ہوئے اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، ورنہ نہیں۔ کیونکہ اس پر یہ معاہدہ عائد نہیں ہوتا۔ نیز شافعیہ کہتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک زیادہ زور اسی پر ہے کہ ان کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔

ذمی کا مال چوری ہونے کا بیان

ائمہ فقہ کہتے ہیں کہ بقول مشہور اس مسلمان کا ہاتھ کاٹا جائے گا جو کسی ذمی (غیر مسلم رعیت) کا مال چرائے۔ کیونکہ مسلمان اس کے مال کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ ایک قول ضعیف یہ بھی ہے کہ اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ جیسا کہ مسلمان ذمی کا قتل کر دے تو اسے قتل نہیں کیا جاتا۔ البتہ اگر ذمی کسی مسلمان یا ذمی کا مال بمقدار نصاب چوری کر لے تو اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا ہوگی کیونکہ اس پر بھی اسلامی احکام کی پابندی لازم ہے۔ خواہ وہ اسلامی حکومت کے فیصلہ کو پسند کرے یا نہ کرے۔ کیونکہ دین اسلام نے ہم (سب مسلمانوں کو) یہی حکم دیا ہے۔

ائمہ فقہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی محتاج شخص کسی مسلمان یا ذمی (غیر مسلم رعایا) کا مال چرائے تو اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے لیکن یہ حکم ایام قحط و مصیبت اور عام گرانی کی صورت میں ہے۔ یہ عذر سزائے قطع سے مانع ہے۔ کوئی بچہ (نابالغ) یا جنون زدہ شخص محفوظ جگہ سے اور بمقدار نصاب چوری کرے یا کسی کو چوری کرنے پر مجبور کیا گیا ہو تو اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ دی جائے۔ کیونکہ یہ مرفوع القلم ہیں (جن پر احکام شرعیہ عائد نہیں ہوتے) اسی طرح حربی (دشمن) کو بھی یہ سزا نہیں دی جائے گی کیونکہ وہ اسلامی احکام کا پابند نہیں ہے یہی حکم ایسے عجمی (غیر عرب) کے لیے بھی ہے جو یہ نہ جانتا ہو کہ یہ فعل (ممنوع) ہے۔

آلات لہو و لعب کی چوری کا بیان

حنفیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ حسب ذیل اشیاء کی چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہے:

سونے چاندی کی بنی ہوئی صلیب یا مورتی (بت) شطرنج گواں کے مہرے سونے کے ہوں۔ نزد اور پانے کے کھیل کا سامان جبکہ ان کی مالیت نصاب سرقہ کے برابر ہو۔ گانے بجانے اور کھیل تماشے کے سامان بشرطیکہ انھیں لہو و لعب اور ناچ وغیرہ امور ممنوعہ میں استعمال کیا جاتا ہو، نیز قمار بازی اور پاسہ اندازی کا سامان وغیرہ۔ کیونکہ جو شخص ان اشیاء مذکورہ کو اٹھا کر لے جاتا ہے وہ اپنے اس فعل کی یہ توجیہ کر سکتا ہے کہ وہ ان اشیاء کو (چرانے کے لیے نہیں) بلکہ توڑنے پھوڑنے (تلف کرنے) کے لیے لایا ہے تاکہ ممنوعات کا خاتمہ کرے اور برے اشغال کے خلاف جنگ کرے۔ اور مسلمانوں کو روا ہے کہ وہ ایسی اشیاء کو توڑنے کے لیے اٹھائیں تاکہ کار خیر کی ترغیب اور بری باتوں کی حوصلہ شکنی ہو۔ پس اس طرح جرم کی نوعیت مشتبہ ہو جاتی ہے جو نفاذ حد سے مانع ہے۔ تاہم چوری کرنے والے کو مسروقہ مال کی قیمت کا تاوان ادا کرنا ہوگا۔ یہی حکم سونے چاندی کے برتنوں کا ہے جن کے استعمال کی ممانعت اور توڑنے کا حکم ہے۔

ابو یوسف کہتے ہیں کہ اگر صلیب عیسائیوں کے عبادت خانے سے چرائی جائے تو ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ ہو گی۔ کیونکہ وہ مکان حرز نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں آنے کی عام اجازت ہے۔ لیکن اگر یہ کسی شخص کے ہاتھ (یعنی ذاتی حرز) میں ہو تو بلاشبہ وہاں سے چرانے میں ہاتھ کاٹنے کی سزا ہوگی۔ کیونکہ یہ مال مملوکہ کی چوری ہے اور پورے طور پر حرز (حفاظت) میں ہے۔ اس صورت میں اس واردات میں شبہ نہیں ہے جو سزائے قطع سے مانع ہو۔

خطرناک ہے۔ پس اگر پہلے ہی اسے ہاتھ سے محروم نہ کر دیا جائے اور یہ سخت سزا سے نہ دی جائے تو اس کی شرارت زیادہ اور اس کا خطرہ سخت ہو جائے گا۔ واقعات شاہد ہیں کہ چوروں نے مال حاصل کرنے کی خاطر کتنی ہی جانوں کو ہلاک اور کتنوں کی آبروریزی کی۔

سرقہ کے علاوہ (اسی طرح کے) دوسرے جرائم کا بیان

سارق (یا چور) کے علاوہ اور جرائم کرنے والے بھی ہیں۔ مثلاً خائن اور غاصب وغیرہ۔ ایسے اشخاص مالک مال کے روبرو ارتکاب جرم کرتے ہیں۔ وہ دھوکے یا فریب سے کام لیتے ہیں یا پھر آنکھوں

حنا بلہ اور شافعیہ کی ایک رائے تو یہ ہے کہ آلات طرب (ناچ رنگ کا سامان) مثلاً طنبورہ، ساز، سارنگی اور کمانچہ وغیرہ کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہے نیز مورتی کی چوری میں بھی گو وہ سونے چاندی کی ہو یہ سزا نہیں ہے اور یہی شطرنج کے مہروں اور قمار بازی یا پانسہ اندازی کے آلات کی چوری کا ہے کیونکہ کو حکمت پر مبنی اسلامی شریعت نے ایسی چیزوں کو ناکارہ اور تلف کر دینے کا حکم دیا ہے۔ تاکہ بری باتوں اور اس کے اسباب کے خلاف جنگ کی جائے۔ اور ایسے کام جو گناہوں سے بچائیں، کار خیر میں بھی داخل ہیں۔ لہذا ان اشیاء کی چوری کے جرم ہونے میں ایسا شبہ ہے جو سزا کے نفاذ سے مانع ہے، جیسے شراب کو لا کر لٹھ ہا دینا (اس ارادے سے چوری کرنے والے کو سزا نہیں دی جائے گی)۔

شافعیہ کی اس بارے میں ایک دوسری رائے یہ ہے کہ اگر ایسی اشیاء کو توڑنے پھوڑنے کے بعد بھی اس کی مالیت نصاب سرقہ کو پورا کرے تو سزائے قطع واجب ہے کیونکہ یہ بھی جائے حرز سے بمقدار نصاب مال کا چرانا ہے۔ یہی حال کتب خانہ سے کتابوں کی چوری کا ہے ان کتابوں سے استفادہ تو حلال ہے لیکن اگر اس کی قیمت جلد اور کاغذ کی مالیت (محمّدہ کرنے کے بعد) نصاب سرقہ کے مساوی ہو تو سزائے قطع دی جائے گی۔ اسی طرح چرایا ہوا ناپاک تیل گندا ہو جانے کے بعد بھی مالیت نصاب سرقہ کے برابر ہو تو ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جائے گی۔ اس سلسلہ میں شافعیہ کا کہنا ہے کہ یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ (چوری کرنے والا) مسلمان ہو اور مال مسروقہ کی ماہیت بدل دینے کا ارادہ نہ رکھتا ہو (بلکہ اسی صورت میں اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہو)۔ لیکن اگر اس کا ارادہ اس شے کو خراب کر دینے کا ہے اور بری بات کی مخالفت ہی پیش نظر ہے تو قطعاً اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جائے گی۔ کیونکہ شریعت نے ایسا کرنا رواق قرار دیا ہے۔ اگر اس قسم کی (ممنوعہ) اشیاء کا مالک کوئی مسلمان ہے تو اس کے چرانے والے کو سزا نہ دی جائے۔ کیونکہ مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ اس سے دور رہیں۔ اگر یہ چیزیں کسی ذمی کی ہیں اور ان کی قیمت نصاب سرقہ کے برابر ہے تو قطعی طور پر ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جائے گی۔

اگر کسی شخص نے، زیر حفاظت رکھے ہوئے ظرف شراب یا طنبورہ وغیرہ کو توڑ پھوڑ دیا اور پھر اسے چوری کر کے لے آیا۔ اگر اس سامان کی مالیت نصاب کے برابر ہو جائے تو سزائے قطع واجب ہوگی۔ کیونکہ اس سے بلاشبہ چوری کا ارادہ ظاہر ہوتا ہے اور وہ مال قیمتی اور زیر حفاظت تھا۔

کے سامنے زبردستی دوسرے کا مال چھین لیتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی شرارت کا سد باب کیا جاسکتا ہے اور قبل اس کے کہ ان کا وار چلے انہیں نیچا دکھایا جاسکتا ہے۔ اسی لیے شریعت نے ایسے لوگوں کی سرزنش کا معاملہ حاکم (اسلام) پر چھوڑ دیا ہے کہ بحسب تقاضائے ماحول و بغرض قیام امن جو سزا مناسب سمجھے دے۔ علاوہ اس کے ان حالات کے پیش آنے کے اسباب مختلف ہیں، ہو سکتا ہے کہ کوئی معمولی بات ہو یا کوئی اہم معاملہ ہو، لہذا ضروری تھا کہ سزا کی نوعیت کا تعین حاکم پر چھوڑ دیا جاتا کہ وہی اس کی مناسب سزا تجویز کرے جرم سرقہ اس سے مختلف جرم ہے۔ اس کا ارتکاب نگاہوں سے چھپ کر ہوتا ہے اور اس کا جو نتیجہ ہوتا ہے وہ یکساں ہوتا ہے اور اس کا خطرہ لوگوں کو ہر وقت اور ہر حال میں لاحق رہتا ہے۔

احکام متعلقہ مال کی خلاف ورزی کا بیان

شرعی احکام متعلقہ مال کی خلاف ورزیاں بھی خیانت (بددیانتی) اور غصب (ناجائز قبض) کی مانند ہیں۔ چنانچہ ان کے لیے بھی ایک مقررہ اور لازمی سزا کا تجویز کیا جانا ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ اس قسم کے جرائم کے نتائج بہت مختلف ہوتے ہیں۔^(۱)

مثلاً ایک شخص اپنے مال کو جائز یا بے فائدہ کاموں میں ضرورت سے زیادہ خرچ کرتا ہے یہاں تک کہ سارا مال خرچ ہو جاتا ہے۔ اس شخص کا یہ عمل شریعت اسلامیہ کے نقطہ نظر سے ممنوع ہے لیکن اس کی مضرتیں مختلف قسم کی ہیں۔ چنانچہ اگر اس نے یہ اخراجات اچھے اور سیدھے ماحول میں کیے کہ کوئی دوسرا شخص

مختلس (دھوکے سے مال ہتھیا لینے والے) کا بیان

۱۔ شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر عاریہ (مانگے کی) لی ہوئی چیز سے لینے والا انکاری ہو جائے اور اس کی مالیت نصاب سرقہ کے برابر ہو تو اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا ہوگی کیونکہ کسی شے کا عاریہ دینا لینے والے کو اس کا محافظ بنانا ہے۔ ساتھ ہی دینے والے نے (اپنی چیز مانگے کو دے کر) لینے والے کو اس کی حفاظت کا ذمہ دار بنا دیا ہے تو اب اس کے دینے سے انکار کرنا، گویا محفوظ جگہ سے چرا لینا ہے اور اس لیے بھی کہ حدیث میں عاریہ لی ہوئی چیز کو قابل تاوان قرار دیا گیا۔ نیز روایت ہے ”ان امرأۃ کانت تستعیر المتاع وتجحدہ۔ فامر النبی ﷺ بقطعہا“ (یعنی ایک عورت کا وتیرہ یہ تھا کہ چیز مانگ کر (عاریہ) لے جاتی اور پھر (دینے کے وقت) مکر جاتی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا کا حکم دیا)۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے کسی سے کوئی چیز عاریہ (مانگے کے طور پر) لی اور جب مالک نے مطالبہ کیا تو انکاری ہو گیا اور واپس نہ کیا اور اس کی مالیت نصاب سرقہ کے برابر یا زیادہ ہے اور ثابت ہو گیا کہ وہ مال اس شخص کے ذمہ واجب الادا ہے تو اب ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جائے گی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ عاریت دینے والے نے یہ کوتاہی کی کہ

پہلے یہ اطمینان نہ کر لیا کہ یہ شخص حسب الطلب واپس دینے سے انکار نہ کرے گا۔ پھر جبکہ اسے ابتداً معتبر سمجھ لیا تو اب کہ اس سے محض خیانت سرزد ہوئی اس کا ہاتھ کاٹنا مروت کے منافی ہے۔ اور اس لیے بھی کہ اس شے کا حرز (تحفظ) ناقص تھا۔ وہ شے خائن کے پاس اور اس کے زیرِ حرز تھی، پورے طور پر مالک کے زیرِ حفاظت نہ تھی۔ کیونکہ اس شخص (خائن) کے پاس ہونا اگرچہ مالک ہی کی حفاظت میں ہونا ہے اور وہ شے عاریۃً اس کی حفاظت میں دی گئی تو گویا چور کو اس شے تک پہنچنے کی اجازت تھی (لہذا پورے طور پر وہ زیرِ حفاظت نہ رہی) اور حدیث مذکور جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے اور جسے تینوں ائمہ نے خائن مرد اور عورت پر سزائے قطع واجب ہونے کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ اس کی بابت حنفیہ کا کہنا ہے کہ اس حدیث میں ہاتھ کٹنے کا حکم کے جوڑ کر ہے وہ چوری کی پاداش میں ہے نہ کہ مانگے کی چیز لے کر مکر جانے یا خیانت کی پاداش میں۔ بات یہ ہے کہ وہ عورت جو عاریۃً لی ہوئی چیز سے مکر جانے میں مشہور تھی، اسی کو چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹنے کی سزا کا حکم حضور ﷺ نے دیا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب حضرت اسامہ ابن زیدؓ کو یہ قصہ معلوم ہوا تو انھوں نے حضور ﷺ سے اس کے حق میں سفارش کی۔ آگے چل کر اس حدیث میں راوی کہتے ہیں کہ اس پر رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے اور تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ”انما اهلك من كان قبلکم بانهم كانوا اذا سرق فيهم الشريف تركوه، واذا سرق فيهم الضعيف قطعوه“ (یعنی تم سے پہلے لوگوں پر جو ہلاکت آئی وہ اس لیے تھی کہ اگر ان کا کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو اس سے درگزر کر دیتے تھے اور کوئی معمولی شخص کرتا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیتے تھے)۔ یہ گفتگو بایں تقدیر ہے کہ اس واقعہ کا پیش آنا ایک ہی بار اور ایک ہی عورت کے متعلق ہو اس بارے میں ایک اور حدیث ہے۔ ان دونوں کو جمع کیا گیا ہے۔ خاص طور پر اس لیے کہ امت اسلامیہ نے دوسری حدیث کو صحیح مانا ہے اور اسی پر عمل ہے۔ تاہم اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ اس عورت نے چوری نہیں کی تھی تو حدیث جابر کو مقدم مانا جائے گا اور عاریۃً لی ہوئی چیز سے انکاری ہو جانے پر سزائے قطع کے حکم کو منسوخ تصور کیا جائے گا اسی طرح اگر یہ خیال کیا جائے کہ ایسے دو واقعات پیش آئے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک عورت کو تو (صرف) عاریۃً لی ہوئی شے سے مکر جانے کے الزام میں اور دوسری کو (عاریت سے قطع نظر فرما کر) چوری کی پاداش میں سزائے قطع دی۔ تب بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ عاریتی شے میں بددیانتی پر سزائے قطع منسوخ ہو گئی جیسا کہ بتایا گیا اور حدیث کی چار کتابوں میں حضرت جابرؓ سے یہ حدیث مروی ہے ”لیس علی خائن، ولا منتهب، ولا مختلس قطع“ (یعنی خیانت کرنے والے، لوٹنے والے اور عاریۃً لی ہوئی شے سے مکر جانے والے (یا فریبی) کو سزائے قطع نہیں ہے۔ اس حدیث کو پانچ محدثین نے روایت کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے کہا کہ یہ حدیث صحیح ہے اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ ”لا قطع علی مختلس ولا منتهب ولا فائن“ قطع ہے کہ دھوکے باز، چھین لینے اور خیانت کرنے والے پر۔

امانت دار کا مال امانت سے انکاری ہو جانے کا بیان

حنفیہ، شافعیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر امانت دار مال امانت سے انکاری ہو جائے اور اس پر یہ الزام ثابت ہو جائے اور مال امانت نصاب سرقہ کے برابر یا زیادہ ہو تو اسے کاٹنے کی سزا نہیں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مال امانت کسی کو سپرد کرنے والے سے (پہلے ہی) یہ کوتاہی ہوئی کہ اس نے اپنا مال ایسے شخص کے پاس رکھا جس کی بابت یہ اطمینان نہیں تھا

کہ وہ مال کو بحفاظت رکھے گا اور صحیح سالم واپس کر دے گا۔ اور ان کی دلیل یہ ہے کہ کتاب و سنت دونوں کی رو سے ہاتھ کاٹنے کی سزا چوری کرنے والے کے لیے ہے اور یہ چوری نہیں ہے۔

حنا بلہ، اسحاق، زفر اور خارجی کہتے ہیں کہ مال عاریت میں بددیانتی کرنے پر حد سرقہ واجب ہے اور ایسے شخص کا ہاتھ کاٹا جائے، کیونکہ ان کے نزدیک سرقہ واجب القطع ہونے کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ مال مسروقہ زیر حفاظت رہا ہو چنانچہ امانت دار کا مال امانت سے انکاری ہو جانا بھی سرقہ ہے۔ کیونکہ ایسے شخص اور چور کا مداوا ممکن نہیں ہے بخلاف مال (واجب الاداء) سے مکر جانے اور لوٹنے والے کے (کہ ان کا مداوا ممکن ہے) جیسا کہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ اصحاب بالا اپنے مسلک کے ثبوت میں یہ روایت پیش کرتے ہیں جو حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے ”کانت مخزومیہ تستعیر المتاع وتجدده، فامر النبی ﷺ بقطع یدھا“ بروایت احمد و نسائی و ابو داؤد۔ (یعنی قبیلہ بنی مخزوم کی ایک عورت عاریۃ سامان لے کر آتی اور پھر مکر جاتی تھی۔ نبی ﷺ نے اسے سزائے قطع دی)۔

جمہور ملت نے (اس حدیث کی بابت) یہ کہا کہ انکار عاریت کا ذکر اگرچہ حضرت عائشہ، جابر اور ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہ کے واسطے سے حدیث میں آیا ہے، لیکن صحیحین وغیرہ کتب میں اس عورت کے چوری کرنے کا ذکر بصراحت موجود ہے۔ نیز حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی روایت کردہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ اس عورت نے رسول اللہ ﷺ کے گھر سے ایک قطیفہ (تھیلی) چرائی تھی۔ ابن ماجہ اور حاکم نے اس کا اخراج فرمایا ہے اور اس کو صحیح بتایا ہے۔ اور حبیب ابن ابی ثابت کے مرسل میں ہے کہ اس عورت نے کوئی زیور چرایا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ ان دونوں روایتوں کا تطابق بایں طور ممکن ہے کہ وہ زیور اس قطیفہ میں رہا ہو۔ بہر حال اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس عورت نے چوری کا ارتکاب کیا اور یہ جو مذکور ہے کہ وہ عاریۃ لیتی تھی اور مکر جاتی تھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا اسی وجہ سے ملی تھی۔ ممکن ہے اس بات کا ذکر حدیث میں اس عورت کی نشاندہی (یا تعین) کے لیے ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس کے مکر کرنے کو سرقہ کے برابر قرار دیا ہو۔ یہ اس طبقہ کی دلیل ہے جو کہتا ہے کہ سرقہ کا لفظ مال امانت سے انکاری ہونے پر صادق آتا ہے۔

شوکانی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ امر مخفی نہیں ہے کہ احادیث کے ظاہری الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ کاٹنے کی سزا عاریۃ لی ہوئی شے سے مکر جانے کی پاداش میں تھی جیسا کہ حضرت ابن عمرؓ کی روایت کردہ حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ اس عورت کا قصہ بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں۔ ”فامر النبی ﷺ بقطع یدھا“ (یعنی تب آنحضرت ﷺ نے اس عورت کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا) اور بعض روایات میں جو یہ ذکر ہے کہ اس عورت نے چوری کی تھی تو وہ اسکے منافی نہیں ہے۔ پس حقیقت یہی ہے کہ مال امانت سے مکر جانے والا واجب القطع ہے۔ اور وہ دلائل جن کی رو سے سرقہ کے واجب الحد قرار دینے کے لیے جائے محفوظ سے چوری کرنا ضروری بتایا گیا ہے۔ اس حکم عام سے یہ صورت مستثنیٰ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو (ایک دوسرے سے) عاریۃ سامان لینے کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ اب اگر عاریۃ دینے والا یہ جان لے کہ لینے والا مکر جائے گا تو اس سے کوئی باز پرس نہ ہوگی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عاریۃ کسی کو کچھ دینے کا رواج قطعاً بند ہو جائے گا، حالانکہ یہ امر منشاء شرع کے خلاف ہے۔

غداری کرنے یا لوٹنے والے اور امانت میں خیانت کرنے والے کا بیان

حنفیہ، مالکیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ لوٹ کر لے جانے والا کھلم کھلا جرم کرتا ہے (لہذا وہ چوری نہیں ہے) اور خیانت (یا بددیانتی) کرنے والا وہ مال لیتا ہے جو صحیح معنوں میں حفاظت میں نہیں تھا (لہذا وہ بھی چوری نہیں ہے) اور غداری کرنے والا چور نہیں کہلاتا۔ اہل عرب اس فعل کے ارتکاب کو سرقت کے علاوہ کچھ اور کہتے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ قرآن وحدیث میں یہ تصریح ہے کہ ہاتھ کاٹنے کی سزا صرف سرقت کرنے والے کو دی جائے گی۔ دوسرے جرائم کو اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا پس ان میں سے کسی فعل کے مرتکب کو ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہے۔

خائن وہ ہے جو درپردہ مال ہضم کرتا اور مالک مال کی خیر خواہی کا اظہار کرتا ہے اور منتہب وہ ہے جو زبردستی اور قوت سے کسی کا مال لوٹ لے۔ اور مختلس وہ ہے جو چالاکی سے غبن کرتا ہے۔ اور نہایہ (شرح ہدایہ) میں بتایا گیا ہے کہ مختلس وہ ہے جو غیر کے مال کو دھاندلی سے ہضم کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے ”لیس علی المختلس ولا علی الخائن قطع“ (یعنی غبن کرنے والے اور خیانت کرنے والے کو سزائے قطع نہیں ہے)۔

حنابلہ اور امام زفر کہتے ہیں کہ غبن کرنے والے، لوٹنے والے اور بددیانتی کرنے والے کو ہاتھ کاٹنے کی سزا دینا واجب ہے۔ کیونکہ (ان کے نزدیک) مجرم کا مال حرز میں سے چوری کرنا لازم نہیں ہے۔ اور اس لیے بھی کہ یہ بھی ایک قسم کا سرقت ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ اس زمانے میں کروڑوں کا غبن ہوتا ہے لہذا ایسے اشخاص واجب الحد ہیں (حال میں) یہ خبر اخبارات میں شائع ہوئی ہے کہ ملازمین میں سے ایک شخص نے ایک سال میں بیس لاکھ پونڈ کا غبن کیا۔ پس لازم ہے کہ ایسے اشخاص کو اس طرح بے بس کر دیا جائے کہ ملک کا مال ضائع ہونے سے محفوظ رہے۔

مال مسروقہ کے تبدیل ہو جانے کا بیان

ائمہ فقہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر ایک شخص نے کوئی چیز جوں کی توں چرائی اس کی پاداش میں اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا ملی اور وہ شے مسروقہ اسی طرح مالک کو واپس کر دی گئی اس کے بعد اس شے کو تبدیل کر کے کچھ اور شے بنالی گئی۔ مثلاً مال مسروقہ جس کی چوری پر ہاتھ کاٹا گیا پہلے سوت تھا اور اب اس سے کپڑا بن لیا گیا۔ یا وہ مال روئی تھا اور اب اس کو کات کر سوت بنالیا گیا۔ اس کے بعد وہ چور پھر آیا اور دوسری بار چرا کر لے گیا تو اسے سزائے قطع ملے گی کیونکہ اب وہ مال تبدیل ہو گیا۔ (یعنی یہ دوسرا مال ہو گیا) یہی وجہ ہے کہ غاصب ایسی شے کا مالک ہو جاتا ہے جس کی ہیئت تبدیل کر دی جائے۔ اس کی بعینہ واپسی واجب نہیں ہوتی بلکہ تاوان دینا ہوتا ہے۔ پس چونکہ اصل مال مسروقہ تبدیل ہو جاتا ہے اس لیے یہ شبہ نہیں رہ جاتا کہ دونوں مرتبہ چوریوں کا مال مسروقہ ایک ہی تھا اور اس کی سزا بھی ایک ہی بار ہونی چاہیے (دوسری بار سزائے قطع نہ ہونی چاہیے)

ایسی اشیاء جن کو مال تصور نہیں کیا جاتا

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کسی شخص نے شراب یا سوریا کتے کی گوشت حفاظت کے لیے رکھا گیا ہو یا جانور کی غیر مدبوغ کھال کی چوری کی تو اس پر سزائے قطع نہیں ہے۔ کیونکہ ان اشیاء کو مال قرار نہیں دیا گیا۔ البتہ اگر ظرف شراب کی

مالیت نصاب سرقہ کے برابر ہو تو ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اسی طرح اگر چوری کرنے میں غیر مکلف شخص مثلاً بچہ، جنون زدہ یا وہ شخص جو کسی حلال شے کے کھانے سے نشہ میں (بے خود) ہو گیا ہو شریک سارق ہو تو غیر مکلف کو سزائے قطع نہ ہوگی۔ نیز اگر مال کے مالک کا باپ چوری میں چور کے شریک ہو جائے تو چوری کرنے والے کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ کیونکہ اس چوری میں ایسا شخص شریک کار ہے جس کا ارتکاب سرقہ کرنا سخت مشتبہ ہے۔

اگر کسی نے ذبح کی ہوئی قربانی سے چوری کی گو بمقدار نصاب ہو تو اسے قطع ید کی سزا نہ ہوگی کیونکہ قربانی میں ذبح کیا ہوا جانور مالک کی ملکیت سے خارج ہو کر اللہ کا مال ہو جاتا ہے۔ یہی حکم ہدیٰ کا ہے (یعنی اس جانور کا جو قربانی کے لیے بدوران حج بھیجا جائے) لیکن اگر ذبح ہونے سے پہلے قربانی کے جانور کی چوری ہو جائے تو چرانے والے کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اور قربانی کا وہ گوشت یا کھال جو کسی محتاج کو صدقہ کے طور پر دیں اور پھر اس کی ملکیت میں سے بقدر مالیت نصاب چوری کی جائے تو چور کو سزائے قطع دی جائے گی۔ اگر کسی مال مسروقہ پر چوری سے پہلے سارق کا حق بوجہ وراثت یا خریداری کے ثابت ہو جائے یا اس شے کی مقدار بوجہ کھالینے کے یا کسی اور طرح مقدار نصاب سے کم ہو جائے تو اس کے چرانے والے کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

مال مسروقہ پر سارق کے دعویٰ ملکیت کا بیان

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص جائے حفاظت سے، بقدر نصاب مال کی چوری کرے اور وہ شہادت سے ثابت ہو جائے اور پھر سارق دعویٰ کرے کہ وہ اس مال کا مالک ہے تو بہر حال اس کا ہاتھ کاٹا جائے اور اس کا دعویٰ ملکیت تسلیم نہیں کیا جائے گا کیونکہ چوری کے جرم کے مرتکب پر جو الزام ہے وہ قوی ہے اور اس جیسے ملزم کا جھوٹ بولنا بہت قرین قیاس ہے کیونکہ وہ ہاتھ پاؤں کے کاٹے جانے (کی سزا) سے رستگاری چاہتا ہے اور اس کا ایمان بھی کمزور ہے۔

حنفیہ، شافعیہ اور ایک روایت کے بموجب حنابلہ بھی یہ کہتے ہیں کہ ایسے شخص کو ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جائے گی۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے ایسے سارق کا نام سارق فقیہ (یعنی علم فقہ جاننے والا چور) رکھا ہے کیونکہ اس شخص کا یہ کہنا کہ اس مال کا میں مالک ہوں ممکن ہے کہ سچ ہو اور اس سے (جرم میں) شبہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے سزا ساقط ہو جاتی ہے۔ گویا اس کے قول کی شہادت مہیا نہ ہو۔

حنابلہ کی دو روایتوں میں سے ایک روایت کے بموجب تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا اور دوسری روایت میں ہے کہ اگر وہ شخص چوری میں بدنام نہیں ہے تو اس کی بات مان لی جائے اور سزائے قطع نہ دی جائے، لیکن اگر وہ بدنام چور ہے تو ہاتھ کاٹا جائے۔ یہی قول قابل ترجیح ہے تاکہ لوگ اس طرح دعویٰ ملکیت کرنے کو سزا سے بچنے کا ذریعہ نہ بنالیں۔

فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر چوری کرنے والا مال کو چرا کر نگل لے۔ اور وہ مال ایسا ہو جو نگلنے سے خراب نہیں ہوتا جیسے جواہرات۔ اور اس کی مالیت مقدار نصاب کے برابر ہو تو پیٹ کے باہر آ جانے پر اس چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ لیکن اگر وہ ایسی چیز ہے جو نگلنے کے بعد تلف ہو جاتی ہے۔ مثلاً گوشت یا انگور وغیرہ تو گو اس کی مالیت مقدار نصاب کے برابر ہے تو اسے سزائے قطع نہ ہوگی، البتہ تاوان ادا کرنا ہوگا۔

اگر کسی شخص نے زیر حفاظت شے کو آگ لگا کر یا توڑ پھوڑ کر ضائع کر دیا تو وہ بھی ادائے تاوان کا ذمہ دار ہوگا۔

لیکن اگر وہ اس چیز کو صحیح سالم جائے حفاظت سے لے کر باہر چلا آیا اور تب اسے تلف کیا تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔
اگر کسی شخص نے جانور کو گھاس وغیرہ دکھا کر جائے حفاظت سے اپنے پاس بلا لیا اور چرا کر لے گیا تو ہاتھ کاٹنے کا سزا دار ہے کیونکہ وہ جانور اسی کی ترکیب سے باہر آیا۔

مال غنیمت یا بیت المال سے چوری کرنے کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ مال غنیمت کی چوری کرنے والے کا ہاتھ نہ کاٹا جائے کیونکہ اس مال میں اس کا بھی حصہ ہے اور یہی بات اور اس کی یہی علت حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے۔ اس روایت کو عبدالرزاق نے اپنی ”مصنف“ میں بیان کیا ہے ثوری رحمہ اللہ نے سماک بن حرب سے، انہوں نے ابو عبیدہ بن ابرص سے، یعنی زید بن دثار سے نقل فرمایا ہے وہ کہتے ہیں کہ امام علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص کو پیش کیا گیا جس نے مال غنیمت میں سے جو ہنوز تقسیم نہ ہوا تھا ایک خود چرایا آپ نے اس کو سزائے قطع نہیں دی۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے بیت المال (خزانہ سرکاری) یا مال غنیمت میں سے چوری کی تو دیکھنا چاہیے، اگر وہ مال مسروقہ مخصوص تھا رشتہ داروں محتاجوں اور مجاہدین کے لیے، جن میں وہ شخص بھی شامل ہے یا شامل ہونے والے کی جڑ یا شاخ میں (یعنی باپ دادا یا بیٹے پوتوں میں) سے ہے تو اسے سزائے قطع نہیں دی جائے گی کیونکہ مال مسروقہ میں سے اس کا بھی حصہ ہے۔ ہاں اگر وہ مال ایسے اشخاص کا مخصوص حق ہے جن میں وہ شامل نہیں ہے تو سزائے قطع دی جائے گی کیونکہ اس کے جرم ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اگر وہ مال ایسا ہے جو کسی کے لیے مخصوص نہیں ہے تب بھی سزائے قطع نہ ہو گی۔

صحیح ترین قول یہ ہے کہ اگر مال مسروقہ میں، سارق کا حق ہے مثلاً یہ کہ وہ مال مسلمان محتاج کی بہبود کے لیے ہو (تب تو حتمی طور پر) اور اگر مالدار کے لیے ہو تب بھی بقول صحیح، یا یہ کہ وہ مال صدقہ کے لیے ہو اور وہ شخص محتاج ہو یا کسی مخالف کا قرض دار یا غازی (برسر جنگ) ہو تو (ان تمام صورتوں میں اس مال کی چوری کرنے پر) اس کو ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جائے گی کیونکہ اس مال مسروقہ میں (کچھ نہ کچھ) اس کا حق ہے۔ اگر کسی طرح کا حق نہ ہو تو ہاتھ کاٹا جائے کیونکہ (جرم میں) کوئی شبہ نہیں ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی نے بیت المال سے بمقدار نصاب چوری کی تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، کیونکہ یہ چوری مال محفوظ میں سے ہوئی اور اس مال میں اس کا کوئی حق نہیں تھا۔ یہی حکم فراہم شدہ مال غنیمت کا ہے، جبکہ لشکریوں کی تعداد زیادہ ہو، یا کم ہو لیکن سارق نے اپنے حق سے زیادہ مقدار مال کی چوری کی۔ (اس بارے میں) ایک قول یہ بھی ہے کہ مال غنیمت کی چوری مطلقاً مستوجب سزائے قطع ہے۔

حنابلہ کہتے ہیں کہ بیت المال کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ وہ عوام کا مال ہے جس میں اس کا حق بھی شامل ہے۔

خیمے کی چوری کا بیان

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر بستی کے اندر خیمہ نصب ہو تو وہ اس سامان کی مانند ہے جو بازار میں سامنے رکھا ہو۔ لیکن اگر وہ خیمہ میدان میں ہو اور اس کی طنابوں کو باندھنا نہ گیا ہو بلکہ اس کے دامن لٹک رہے ہوں تو وہ خیمہ اور اس کا سامان ایسا ہے جیسے میدان میں پڑی ہوئی شے۔ لیکن طنابیں بندھی ہوئی ہوں گو خیمہ کے دامن (پلو) لٹک رہے ہوں تو وہ خیمہ اس سامان کے لیے جو اس میں ہے جائے حفاظت متصور ہوگا۔ بشرطیکہ اس کا محافظ قوی ہو اور اس کے اندر یا اس کے قریب موجود ہو لیکن اگر محافظ اس کے اندر یا اس کے قریب نہ ہو یا ناتواں ہو اور مدد کرنے والے دور ہوں تو اس کو 'حرز' (حفاظت) تصور نہیں کیا جائے گا پس اگر خیمہ کا سامان چرایا جائے تو چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ جو خیمہ بدوران سفر نصب کر لیا جائے یا قیام گاہ میں لگا لیا جائے اس میں کنبہ کے لوگ رہتے ہوں یا نہ رہتے ہوں تب بھی وہ خیمہ اس سامان کے لیے اور خود مالک کے لیے بھی جائے حفاظت ہے۔ اگر اس خیمہ کے اندر سے کوئی سامان چرایا جائے یا خود خیمہ ہی کو کوئی شخص چرالے تو ہاتھ کاٹا جائے گا۔ بشرطیکہ مال مسروقہ کی مالیت نصاب سرقہ کے برابر ہو۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر خیمہ نصب ہو اور اس میں سے کوئی سامان چرایا جائے تو (چوری کرنے والے کا) ہاتھ کاٹا جائے گا۔ لیکن خود خیمہ کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ خیمہ کا محافظ نہیں تھا ہاں خیمہ کے سامان کا محافظ ضرور ہے۔

کعبہ مکرمہ سے چوری کرنے کا بیان

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے کعبہ کے اندر سے کوئی چیز چرائی اور یہ چوری اس وقت کی گئی جبکہ اس میں داخل ہونے کی عام اجازت تھی تو ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ ہوگی کیونکہ اس صورت میں کعبہ ان اشیاء کے لیے حرز (جائے حفاظت) متصور نہ ہوگا۔ ہاں اگر مال مسروقہ کو مطاف (طواف کرنے کی جگہ) سے باہر لے گیا تو سزائے قطع ہوگی۔ اور جو کچھ بھی کعبہ پر یا مقام محمود پر لٹکایا جائے اس کی چوری پر سزائے قطع ہے۔ اسی طرح شیشہ کا چرانا ہے جو ستونوں پر منڈھا ہوتا ہے تاکہ اس کی جڑ محفوظ رہے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر کعبہ کا غلاف جو اس کے اوپری دیا گیا ہو۔ کسی نے چرایا تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا کیونکہ وہ غلاف محفوظ تصور کیا جائے گا۔

حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر کسی نے بمقدار نصاب سرقہ غلاف کعبہ میں سے یا کعبہ کے اندر سے کچھ چرایا تو وہ سزائے قطع کا مستوجب ہے۔ کیونکہ اس نے اللہ کے گھر کی توہین کی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ایمان کمزور ہے۔ گویا وہ شخص کعبہ شریف کے احترام اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس کے منسوب ہونے کی عظمت سے ناواقف ہے۔ پس ضروری ہے کہ اس کے ساتھ سختی کی جائے اور چوری کرنے کی پاداش میں اس کا ہاتھ کاٹا جائے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ جس نے کعبہ کے غلاف میں سے کچھ چرایا۔ گو اس کی مالیت نصاب سرقہ کے برابر ہو اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے کیونکہ مال مسروقہ کا کوئی شخص مالک نہیں ہے۔ اور اس لیے بھی کہ بسا اوقات اسے (چوری کے لیے نہیں بلکہ) تبرک کے طور پر حاصل کیا جاتا ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر ایسے لوگ کعبہ کے غلاف میں سے کچھ چرائیں جن کا ایمان قوی ہے اور اللہ تعالیٰ کے

قابل احترام گھر اور کعبہ کی اللہ تعالیٰ سے نسبت ہونے کی عظمت کو جانتے ہیں تو انہیں ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جائے۔ جیسا کہ حدیث میں حرم کے اندر چوری کرنے والوں کو سخت سزا دینے کا ذکر ہے۔ لیکن ادنیٰ قسم کے عوام جن کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہے اور نہیں جانتے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوئے ہیں اور اس کی عظمت کا خیال نہیں کر سکتے وہ معذور ہیں یہ لوگ خلاف کعبہ میں سے کچھ چوری کر لیں تو ان کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔

مسجد میں چوری کرنے کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ مسجد کے دروازے کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے کیا کیونکہ مسجد جائے حفاظت نہیں ہے۔ وہ صبح و شام ہر وقت آنے والوں کے لیے کھلی رہتی ہے اور اس کا کوئی محافظ موجود نہیں ہوتا۔ نیز مسجد کے سامان مثلاً چٹائیاں، قندیلیں، جالیاں، چو کے اور پردے کی چوری میں سزائے قطع نہیں ہے کیونکہ یہ اشیاء کسی کے تحت حرز (حفاظت میں) نہیں ہیں اور جب حفاظت نہ ہو تو چوری مستوجب سزا نہیں ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ مسجد کا دروازہ اور مسجد کے اندر جو کچھ بھی ہے مثلاً فرش، چٹائی، قندیلیں ان سب کی محافظ خود مسجد ہے۔ خواہ وہ مسجد میں کہیں پر بھی رکھی ہوں۔ اگر وہاں سے چرائے ہوئے مال کی مالیت نصاب سرقہ کی مقدار پورا کرتی ہو تو اس کے چرانے والے کو سزائے قطع دی جائے گی۔ اور اس سزا کے لیے یہ شرط بھی نہیں ہے کہ وہ چیز مسجد سے باہر لے جانی جائے بلکہ اگر چوری کرنے والا (مسجد کی) کسی چیز کو اس کی جگہ سے پورے طور پر اکھاڑ دے یا اس کی سلوں اور چھت کو توڑ پھوڑ دے تب بھی (مستوجب حد ہے)۔

اگر مسجد کے فروش جو صرف دن میں بچھائے جاتے ہیں۔ رات کو پڑے رہنے دیئے گئے اور کسی نے چرا لیا تو چرانے والے کو ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہوگی۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر مسلمان مسجد کا دروازہ، درخت، باڑ، چار دیواری چھت یا سجاوٹ کی قندیلیں چرائے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے کیونکہ دروازہ حفاظت کے لیے اور درخت وغیرہ عمارت (کے کام) کے لیے ہوتے ہیں اور قندیلوں وغیرہ پر کسی کے مالک ہونے کا شبہ نہیں کیا جاسکتا، مسجد کی چٹائی اور دوسرے تمام فروش جو استعمال میں آتے ہیں ان کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا اور نہ ان فانوسوں کی چوری میں جن میں روشنی کے لیے چراغ جلائے جاتے ہیں کیونکہ یہ اشیاء تمام مسلمانوں کے فائدے کے لیے ہیں اور اس میں چرانے والے کا بھی حق ہے۔ جیسے بیت المال کا مال، مسجد کے سنگین چوکوں کا بھی وہی حکم ہے جو چٹائیوں کا ہے۔ یعنی ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ ہوگی۔ البتہ سجاوٹ کے فرش اور پیش بہا قالین کی چوری میں ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اسی طرح مہر کی چادر کی چوری میں بھی ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اگر کوئی ذمی (اسلامی حکومت کا غیر مسلم فرد) مسجد سے کچھ چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا کیونکہ ان اشیاء میں اس کے حقدار ہونے کا مطلق شبہ نہیں ہے۔

جیب کترے یا کیسہ بر کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر کس نے رقم کی تھیلی یا ہسیانی یا جیب سے جس سے مراد کیسہ یا پاکٹ ہے جہاں رقم کو باندھ کر رکھا ہو، رقم نکال لی تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ لیکن اگر جیب کے اندر ہاتھ ڈال کر نکالا تو ہاتھ کاٹا جائے گا کیونکہ پہلی

صورت میں بندش (پوٹلی)، اصل جائے حفاظت سے باہر تھی وہاں سے نکال لینا جائے حفاظت میں مداخلت نہیں ہے۔ لیکن دوسری صورت میں بندش (جائے حفاظت کے) اندر تھی اور یہاں سے نکالنا 'حرز' سے باہر لانا ہے۔ اور اگر گرہ (یا پوٹلی) کھل گئی اور کسی نے رقم لے لی تو اگر وہ پوٹلی باہر تھی تو ہاتھ کاٹا جائے گا لیکن اگر وہ گرہ یا پوٹلی (کیسہ پاکٹ) میں تھی تو سزائے قطع نہ ہوگی کیونکہ وہ رقم باہر سے اس نے لی ہے (حرز سے نہیں لی)۔

مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ اور امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ ان تمام صورتوں میں مجرم کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ کیونکہ اگر کسی نے پوٹلی کے اندر سے رقم نہیں نکالی اور پوٹلی کو جائے حرز (یا محفوظ جگہ) نہ مانا جائے تب بھی اس رقم کا محافظ اس کے مالک کو سمجھا جائے گا (یعنی مالک اس کا حرز ہے) چنانچہ اگر کسی شے کا مالک خود اس کا محافظ ہے اور اس کو اپنے برابر رکھ کر سو گیا تو وہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی جاگتا ہو اور اس کی حفاظت کر رہا ہو۔ پس جبکہ مال مالک کے وجود کے ساتھ وابستہ ہے تو بدرجہ اولیٰ وہ اس کا محافظ ہے اور اس شے کے چرانے والے کو سزائے قطع ہوگی۔

حنفیہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ اس مسئلہ میں (پاکٹ) کے سوا کسی اور کو حرز (جائے حفاظت) تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ مالک نے صرف پوٹلی یا جیب پر بھروسہ کیا ہے۔ خود کو محافظ نہیں ٹھہرایا۔ پس وہ جیب صندوق کی مانند ہے۔ یہاں تک یہ بات ٹھیک ہے کیونکہ چور نے کیس یا جیب ہی کو کھول کر مال لیا ہے۔ (لہذا واجب القطع ہے) لیکن چلنے پھرنے کی حالت میں اولین مقصد قطع مسافت ہوتا ہے مال کی حفاظت پیش نظر نہیں ہوتی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مالک مال اپنے مال کی حفاظت سے بے فکر ہو جانا چاہتا ہے تاکہ اس کا دل مال کی نگہداشت کے فکر سے فارغ ہو جائے۔ اس کی طبیعت مال کی طرف سے بوجھل ہوتی ہے لہذا وہ اپنے اطمینان خاطر کے لیے مال کو گرہ میں باندھ لیتا ہے اور اپنی بندش پر اعتماد کر لیتا ہے اور ایسے مسائل میں اسی بات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے چنانچہ اگر آہستہ خرام اونٹ پر لدے ہوئے 'گون' سے کسی نے چوری کی تو اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا ہوگی کیونکہ مال کے مالک نے گونوں (یا بور یوں) پر (مال کے محفوظ رہنے کا) بھروسہ کیا (یعنی اسے حرز بنایا) اور چور نے اس میں مداخلت کی لیکن اگر کوئی شخص گون ہی کو لے گیا جس میں مال تھا تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ ایسے مسائل میں گونوں کو حرز خیال کیا جاتا ہے یعنی مال کو چوروں سے محفوظ رکھنے کے لیے اس میں بند کر کے رکھا جاتا ہے جیسے تھیلی یا جیب کہ اگر اس کے اندر سے چوری کی جائے تو ہاتھ کاٹنے کی سزا ہوگی۔ اسی طرح اگر کسی نے گندم یا زیتون کے ظرف میں سوراخ کر کے بمقدار نصاب چوری کی تو ہاتھ کاٹنے کی سزا ہوگی کیونکہ حرز کے اندر سے چوری ہوئی ہے نیز اگر کسی نے لدے ہوئے سامان کو کاٹ کر اس میں سے بمقدار نصاب لے لیا تو مستوجب سزائے قطع ہے۔ بالخصوص اس زمانہ میں جبکہ جیب کتروں اور گٹھ کتروں کی بہت کثرت ہے۔

(واضح ہو کہ ان مسائل کے بارے میں) علماء کو لغزش ہوئی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ایک شخص کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ نہ کسی جائے حفاظت میں مداخلت کرتا ہے اور نہ جائے حرز سے مال چراتا ہے۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو گرہ، جیب یا برتن میں سے کاٹ کر مال نکال لیتے ہیں۔

قطار میں سے جانور کی چوری کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے قطار (لائن) میں سے کسی جانور کو چرایا۔ یعنی کوئی شخص اگر اونٹوں کی قطار میں

سے جو ایک ہی راہ پر جا رہے ہوں۔ ایک اونٹ چرائے۔ یا ان پر لدے ہوئے سامان میں سے کوئی بوجھ اتار کر لے جائے تو اس کو ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جائے گی کیونکہ اس مال کو مطلوبہ حرز (حفاظت) حاصل نہیں ہے۔ یہاں اس شبہ کا امکان ہے کہ (اہل قطار) کے پیش نظر مال کا تحفظ نہ ہو۔ یہ بات اس لیے کہی جاتی ہے کہ (ایسے حالات میں) ساربان، سوار اور پیش رو سب کے مد نظر سامان کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا ہے کہ مسافت طے کی جائے۔ سامان کی حفاظت کے لیے یہ کچھ (قطار بندی وغیرہ) نہیں ہے۔ تاکہ آنکھ بوجھ کے ساتھ ساتھ بغرض حفاظت کوئی مسلح آدمی ان کے عقب میں نہ ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں البتہ اگر کوئی چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے۔

شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اونٹوں یا خچروں کی قطار میں ایک دوسرے کے پیچھے رسی (نکیل یا لگام) بندھی ہوتی ہے اور وہ ایک ڈگر پر چلتے ہیں جس سے ایک قطار (لائن) بن جاتی ہے اور ایک پیش رو انہیں اپنے پیچھے لے کر۔ چلتا ہے۔ اور ان کی حفاظت کے لیے یہ شرط ہوتی ہے کہ پیش رو جو آگے آگے سوار ہو کر چلتا ہے گھڑی گھڑی مڑ کر دیکھتا رہے۔ تاکہ ان سب پر نظر رہے۔ پس قطار کو اس شخص کے زیر تحفظ شمار کیا جاتا ہے۔ پس جو شخص اس قطار لیجانے والا ہے جہاں تک اس کی نظر پڑتی ہے وہ سب قطار اس کی زیر حفاظت تصور ہوگی بدیں معنی کہ وہ پیچھے والوں کو ہوشیار کرتا رہتا ہے۔ اب اگر قطار کا کچھ حصہ کسی پہاڑی یا عمارت کے حائل ہو جانے کے باعث نظر سے اوجھل ہو جائے تو صرف اسی قدر حصہ خارج از تحفظ ہوگا۔ پھر اگر قطار میں پیش رو یا اخیر والے (یعنی ہانکنے والے) کے علاوہ کوئی اور شخص بھی (درمیان میں) سوار ہو جائے تو یہ شخص آگے والے (پیش رو) کیلئے ہانکنے والا اور پیچھے والے کیلئے رہنمائی کرنے والے کی مانند ہے۔ اور ایسا ہو سکتا ہے کہ جب (قطار) عمومی راستے یا بازار میں سے گزر رہی ہو تو قطار کی دیکھ بھال میں اس کی نظر چلنے پھرنے والوں پر نہ پڑے۔ اس بارے میں یہ بھی شرط ہے کہ آگے والے کی آواز پیچھے والے تک پہنچ سکے یہ بھی وجہ ہے کہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ قطار کے جانوروں کی تعداد نو (۹) سے زیادہ نہ ہو۔ اگر اس طرح کی قطار میں چوری ہو جائے تو سارق کا ہاتھ کاٹا جائے۔ لیکن اگر اونٹ (یا جانور) قطار کے اندر نہ ہوں اور منتشر طور پر چل رہے ہوں تو بقول صحیح انہیں تحت حرز تصور نہیں کیا جائے گا۔

قراہت داروں کی چوری کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی نے اپنے باپ، دادا کے ہاں چوری کی تو اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جائے گی کیونکہ دستور عام کے مطابق مالی امور میں اس شخص کے ساتھ فراخ دلی برتی جاتی ہے اور ایسی حرز (جائے حفاظت مال) تک رسائی کی اجازت ہوتی ہے حتیٰ کہ ان میں سے ہر ایک کو دوسرے کی بجائے تصور کیا جاتا ہے کیونکہ والدین اپنی اولاد کے بارے میں فیاض اور ان پر مہربان ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شرعاً ایک کی گواہی (دوسرے کے حق میں) ممنوع ہے۔ رہا باپ کا بیٹے کے مال کا چرانا، سو اس کی بابت رسول اللہ ﷺ نے کسی کی اولاد کو یہ ارشاد فرمایا کہ ”انت و مالک لابیک“ (یعنی تم خود اور تمہارا مال، تمہارے باپ کا ہے)۔

ان کے علاوہ باقی ذوی الارحام (نسلی رشتہ دار) مثلاً بھائی، بہن، چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ، سوان کو گھر میں بھی اگر داخلہ کی اجازت کے پیش نظر انہیں بھی اس بارے میں اولاد کے اندر شامل کیا گیا ہے کیونکہ شریعت نے ان کے

ساتھ رشتہ ازدواج کے حرام ہونے اور حسن سلوک کے فرض ہونے میں ان کو اولاد کے برابر رکھا ہے۔ چنانچہ حدیث قدسی میں آیا ہے۔ ”قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: اَنَا اللَّهُ وَاَنَا الرَّحْمَنُ، خَلَقْتُ الرَّحِمَ، وَشَقَقْتُ لَهَا اسْمًا مِنْ اسْمِي، فَمَنْ وَصَلَهَا وَصَلْتَهُ، وَمَنْ قَطَعَهَا قَطَعْتَهُ“ (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں معبود ہوں اور میں رحم میں نے ہی رحم بنایا ہے اور اپنے ناموں میں سے ایک نام اس کو مشتق کیا ہے۔ پس جو شخص رحم (یا رشتہ) کو جوڑ کر رکھتا ہے، میں اس کے ساتھ ہوں اور جو اسے چھوڑتا ہے میں بھی اسے چھوڑ دیتا ہوں)۔ بناء بریں فقہاء نے بھی ان رشتہ داروں کو چوری میں سزائے قطع نہ دینے اور ان کا نفقہ واجب ہونے کے بارے میں اولاد کے زمرہ میں رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں ایک دوسرے کے سامنے ہونے کی (یعنی پردہ نہ کرنے کی) اجازت ہے۔ چنانچہ ان سے رشتہ (نکاح) کا حرام ہونا اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا فرض ہونا ثابت ہے۔ اور ظاہری و باطنی سامان زینت (سنگھار) وغیرہ مثلاً بازو کے بازو بند اور سینے کے ہار اور پنڈلی کے جھانچر وغیرہ پر نظر کرنے کی اجازت ہے۔ اس لیے کہ اگر ان کے چھپانے کا حکم ہوتا تو دشواری ہو جاتی کیونکہ (بناء بر قرابت) ان کے پاس کثرت سے آنا جانا ہوتا ہے اور برابر ان سے کام پڑتا رہتا ہے اور وہ ایک دوسرے سے بیگانہ نہیں ہوتے۔ پس ضروری ہے کہ ان قابل احترام رشتہ داروں سے ملاپ رکھا جائے اور ان سے قطع تعلق کر لینا حرام ہے۔ جہاں ایسا تعلق نہ ہوگا سزائے قطع واجب ہوگی۔ پس سزائے قطع کو ترک کر کے تعلق کا برقرار رکھنا واجب ہے۔

واضح ہو کہ (وابستگی، قرابت کے باعث) شرائط حفاظت میں نقص رہ جاتا ہے۔ اس کے ثبوت میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے ”وَلَا عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَنْ تَأْكُلُوا مِنْ بَيْوتِكُمْ، أَوْ بَيْوتِ آبَائِكُمْ، أَوْ بَيْوتِ إِهْوَانِكُمْ، أَوْ بَيْوتِ أَخَوَاتِكُمْ، بَيْوتِ أَعْمَامِكُمْ، أَوْ بَيْوتِ إِخْوَانِكُمْ، أَوْ بَيْوتِ خَالَاتِكُمْ، أَوْ مَمْلُوكَتِكُمْ مَفَاتِحَ أَوْ صَدِيقِكُمْ، (یعنی اس میں کوئی الزام نہیں کہ تم اپنے گھر سے کھاؤ یا اپنے باپ دادا کے گھر سے یا اپنی ماؤں کے گھر سے یا اپنے بھائیوں کے گھر سے یا اپنی بہنوں کے گھر سے یا اپنے چچاؤں کے گھر سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھر سے یا اپنے ماموؤں کے گھر سے یا اپنی خالاؤں کے گھر سے یا ان گھروں سے جن کی کنجیاں تمہارے پاس ہیں یا اپنے دوستوں سے لے کر) اللہ تعالیٰ نے چچاؤں اور پھوپھیوں کے گھر سے کھانے کو ممنوعات سے خارج کر کے، ان کے گھروں میں داخلے کی مطلق اجازت دیدی ہے اگرچہ محفوظ ہوں۔ پس غیر مشروط طور پر گھروں میں داخل ہو کر ان کی چیزوں کو استعمال کرنے کی اجازت دینا سزائے قطع سے مانع ہے۔

یہ اصحاب کہتے ہیں کہ اگر قریبی رشتہ داروں کے گھر سے کسی غیر شخص کا مال چرایا تو سزائے قطع نہ ہوگی لیکن اگر اجنبی کے گھر سے قرابت دار کا مال چرایا تو ہاتھ کاٹا جائے گا کیونکہ ایک صورت میں شرط حفاظت پوری نہیں ہے اور دوسری میں ہے۔

اگر کسی نے دودھ شریک ماں باپ یا دودھ شریک بھائیوں کے گھر سے مال چرایا تو سزائے قطع ہوگی، کیونکہ دودھ کے رشتے بہت کم لوگوں کو معلوم ہوتے ہیں لہذا تہمت سے بچنے کے لیے بلا اجازت ان کے گھروں میں داخل ہونے کی گنجائش نہیں ہے بخلاف نسلی قرابت داروں کے کہ وہ مشہور ہوتے ہیں اور سب لوگ ان سے واقف ہوتے ہیں۔ بالکیہ کہتے ہیں کہ اگر باپ دادا اپنے بیٹے، پوتوں کے ہاں چوری کریں تو ان میں سے کسی کا ہاتھ نہ کاٹا جائے

لیکن اگر شاخ کے رشتہ دار جڑ کے رشتہ داروں کے ہاں (یعنی بیٹے پوتے باپ دادا کے ہاں) چوری کریں تو ہاتھ کاٹا جائے گا کیونکہ اولاد کو والدین کے مال میں حق نہیں ہے۔ چنانچہ اگر اولاد ماں یا باپ کی مملوکہ جاریہ (لوٹڈی) سے ملوث ہو جائے تو اس پر حد زنا نافذ ہوگی اور اگر اسے قتل کر دے تو سزائے قتل پائے گا۔ باقی دوسرے نسلی قرابت داروں کے مال کی چوری میں ہاتھ کاٹا جائے۔ اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ مال کو مسروقہ قرار دیئے جانے کی شرطوں میں سے یہ ہے کہ (اثبات جرم میں) کوئی شبہ نہ ہو۔ حدیث میں آیا ہے کہ ”ادروا الحدود عن المسلمین ما استطعتم“ (یعنی جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں پر حد لاگو کرنے سے باز رہو) اب یہ شبہ خواہ مال مسروقہ کے مالک ہونے کا ہو مثلاً کوئی شخص مشترکہ ملکیت کے مال کی چوری کر لے۔ یا پھر اس شبہ میں ہو کہ وہ مال خود اس کا یا اس کے باپ دادا یا بیٹے پوتے کا ہے اور اسے چرا کر لے آئے۔ یا جہاں سے مال چرایا ہے وہاں سے چوری کے مال کو مسروقہ قرار دینے میں شبہ ہو مثلاً اولاد اپنے باپ دادا کے مال کو چرا کر یا باپ دادا میں سے کوئی اپنی اولاد کا مال چرا لائے پس چوری کرنے والے کی جڑ (یعنی باپ دادا) کے مال سے چوری کرے یا اس کی شاخ (بیٹا، پوتا) چوری کرے تو اس کی سزا میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ نسلی اعتبار سے وہ ایک ہی ہیں اگرچہ ان کے مذہب میں اختلاف ہو اور اس لیے بھی کہ وہ باہم ایک دوسرے کی حاجت روائی کے متوقع ہوتے ہیں۔ بخلاف دوسرے قریبی رشتہ داروں کے خواہ وہ نسبی رشتہ دار ہوں یا اور کوئی ہوں ان میں سے کسی کے ہاں بھی چوری کرے تو ہاتھ کاٹا جائے گا۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے انہیں دور کے رشتہ داروں میں شمار کیا ہے۔ پس ان کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔

حنابلہ کہتے ہیں کہ والدین کتنے ہی اونچی پیڑھی کے ہوں، اولاد کے مال کی چوری میں ان کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اسی طرح ان کی اولاد اگر ان کا مال چرائے تو ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ اول الذکر کا سبب یہ ہے کہ یہ عام بات ہے کہ اولاد (کی خطا) پر باپ کا رحم غالب ہوتا ہے یہاں تک کہ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ کوئی باپ اپنے بیٹے کو جس نے اس کا مال چرایا ہو ہاتھ کاٹنے کی سزا دلانے کی کوشش کرے۔ اس سے باپ کو کچھ حاصل نہ ہوگا حالانکہ بیشتر حدود (شرعی سزائیں) صرف اس لیے ہوتی ہے کہ اللہ کے بندوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ ثانی الذکر صورت میں یہ حکم اس لیے ہے کہ باپ جو اپنی اولاد اور اس کے تمام اموال کا مالک ہوتا ہے اس کے پورے حقوق ادا ہو سکیں۔ اللہ کے حق کے بعد والدین کا حق ہے ”واعبدوا اللہ ولا تشركوا به شیئاً وبالوالدین احساناً“ (یعنی لوگو! اللہ کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ جانو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ) باقی اور نسلی قرابت داروں کا مال کوئی چرائے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائیگا۔

شوہر یا بیوی کے مال کی چوری کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر میاں بیوی میں سے کسی نے دوسرے کا مال چرایا تو ان میں سے کسی کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ یہ چوری کسی کے ذاتی مکان سے کی ہو یا اسی گھر میں چوری کی ہو جس میں دونوں اکٹھے رہتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ میاں بیوی باہم ایک ہی شخصیت ہیں۔ اور ان کے باہمی مفاد مشترک ہیں اور ان دونوں کو آنے جانے کی اجازت ہے۔ اس لئے حرز (حفاظت) کی جو شرط ہے اس میں خلل ہو گیا۔ اور یہ جرم اس لیے بھی واجب القلع نہیں ہے کہ دونوں دستور کے مطابق اور عملی طور پر مالی معاملات میں ایک دوسرے کے لیے فراخ دل ہوتے ہیں۔ چنانچہ بیوی جبکہ اپنے وجود کو خاوند کے

حوالے کر دیتی ہے جو مال سے زیادہ قابل قدر ہے تو مال کے بارے میں اس سے بھی زیادہ روادار ہوگی۔ پھر اس لیے بھی کہ وہ ایک دوسرے کے وارث ہوتے ہیں اور کوئی دوسرا شخص انہیں محروم نہیں کرتا جیسے کہ ماں باپ ہوتے ہیں۔ اور موطا امام مالکؒ میں حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے کہ حضرت ممدوح کے سامنے ایک غلام کو پیش کیا گیا جس نے اپنے آقا کی بیوی کا آئینہ چرایا تھا۔ تو آپ نے فرمایا کہ اس شخص پر جرم (سرقہ) عائد نہیں ہوتا کیونکہ چرانے والا تمہارا ہی خادم ہے جس نے تمہاری چیز چرائی ہے۔ پس جبکہ خاوند کے خادم کو سزائے قطع نہیں دی جاسکتی تو بیوی بہر حال اس کی زیادہ مستحق ہے (کہ اسے سزا نہ دی جائے)۔ پھر یہ بھی ہے کہ زوجین میں سے ایک کی گواہی دوسرے کے بارے میں تسلیم نہیں کی جاتی کیونکہ دونوں کے مفاد مشترک ہیں بناء بریں ایک کے مال کے عوض دوسرے کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

اگر دونوں (میاں بیوی) میں سے ایک نے دوسرے کا مال چرایا اور مباشرت سے پہلے طلاق ہوگئی۔ اور بغیر عدت گزارے ان میں مکمل علیحدگی ہوگئی تب بھی سزائے قطع نہ ہوگی۔ اسی طرح اگر کسی نے غیر عورت کا مال چرایا اور پھر اس سے شادی کر لی تب بھی سزائے قطع نہ ہوگی خواہ یہ شادی سزائے قطع کا (عدالتی) فیصلہ ہونے کے بعد ہوئی ہو یا فیصلہ سے پہلے ہوئی ہو۔ حضرت ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اگر ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ ہو گیا تھا (اور تب شادی کی) تو ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اگر کسی نے قطعی طلاق یافتہ یا خلع شدہ بیوی کا مال بدوران عدت چرایا تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اسی طرح اگر مطلقہ بیوی نے بھی عدت کے دوران خاوند کا مال چرایا تب بھی ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ ہوگی۔

شافعیہ کے اقوال میں سے قابل ترجیح قول اور مالکیہ و حنابلہ کی دو روایتوں میں سے ایک روایت کے مطابق ان کا کہنا یہ ہے کہ میاں بیوی میں سے کوئی جب دوسرے کا مال چرائے تو سزائے قطع نہ ہوگی کیونکہ انہیں وہاں آنے جانے کی اجازت تھی لہذا وہ جائے محفوظ نہیں ہے۔

شافعیہ کے ایک اور قول اور حنابلہ کی ایک دوسری روایت کی رو سے وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ زوجین (میاں بیوی) میں سے ایک دوسرے کا مال چوری کرے تو اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جائے گی کیونکہ دونوں باہم ایک ہی ہیں اور اس لئے بھی کہ ان میں باہم رشتہ مہر و محبت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”وَمِنْ آيَاتِهِ اَنْ يَخْلُقَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لَتَسْكُنُوا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً“ (یعنی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں (یا دلائل) میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تم ہی میں سے تمہارے جوڑے پیدا کئے تاہم تم ان سے سکون پاؤ۔ اسی نے تمہارے درمیان مہر و محبت کو پیدا کر دیا ہے)۔

شافعیہ کا تیسرا قول یہ ہے کہ صرف خاوند کو ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جائے گی (بیوی کو نہیں) کیونکہ بیوی کو (خاوند کے مال میں سے) خوراک اور لباس کا حق حاصل ہے۔ پس چونکہ یہ شبہ ہے کہ مال مسروقہ میں کچھ بیوی کا بھی حق ہے (جس نے چوری کی ہے) لہذا اسے سزائے قطع نہیں دی جائے گی۔ خاوند کے مال میں تو بیوی شریک ہے لیکن خاوند کا کوئی حق بیوی کے مال میں نہیں ہے۔ تاہم شافعیہ کے نزدیک اس مسلک کو ترجیح حاصل ہے کہ میاں بیوی میں سے جو بھی دوسرے کا مال چرائے اسے سزائے قطع دی جائے بشرطیکہ وہ مال حرز میں (زیر حفاظت) ہو۔

سزائے قطع کا دعویٰ کرنے کا بیان

حنفیہ حنابلہ اور اصحاب شافعی کہتے ہیں کہ ہاتھ کاٹنے کی سزا موقوف ہے۔ مالک مال کے مطالبہ (دعویٰ) پر کیونکہ سزائے قطع میں زیادہ تر حق العباد پیش نظر ہے۔ پس اس میں جرم سرقہ قرار دینے کے لئے مالک کا دعویٰ کرنا شرط لازم ہے۔ اس میں مدعی وہ ہے جس کا مال چرایا گیا۔

مالکیہ اور حنابلہ کی دو روایتوں میں سے ایک روایت کے بموجب ان کا کہنا ہے کہ ہاتھ کاٹنے کی سزا مال مسروقہ کے مالک کے مطالبہ پر منحصر نہیں ہے بلکہ مالک کے مطالبہ (یا دعویٰ) کے بغیر ہی سزائے مذکور عائد کر دی جائے گی۔ کیونکہ نفاذ حد میں خالق کا حق غالب ہے۔ مخلوق کا حق غالب نہیں ہے اور اس لئے بھی کہ (سزائے سرقہ والی) آیت عام ہے (مشروط نہیں ہے) جیسا کہ زنا کی صورت میں ہوتا ہے۔

جرم سرقہ میں شریک ہونے کا بیان

ائمہ فقہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر چوری میں ایک جماعت شریک ہو اور ان میں سے ہر فرد کو مال مسروقہ میں سے بمقدار نصاب حصہ ملے تو ان میں سے ہر ایک پر سزائے قطع لاگو ہوگی اور ان سب کے ہاتھ کاٹے جائیں گے کیونکہ ہر ایک نے جرم سرقہ کا ارتکاب کیا ہے اور ذہنی طور پر ہر ایک نے جائے حفاظت میں مداخلت کا قصد کیا اور عملی طور پر بھی بدیں لحاظ وہ شریک جرم کہ انہوں نے مال مسروقہ کے حاصل کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کی۔ پس چوری کا مال سب پر عائد ہوگا اور شرعاً سب کو اس جرم کا مرتکب تصور کیا جائے گا۔ لیکن اس صورت میں جبکہ سب کو مال سرقہ میں سے بقدر نصاب حصہ ملا ہو۔ لیکن اگر ہر ایک کے حصے میں نصاب سے کم مال آیا تو اس صورت میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے: حنفیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں ان کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ سزائے قطع ارتکاب جرم کی پاداش میں دی جاتی ہے۔ پس ہر ایک کے متعلق دیکھا جائے گا کہ یہ جرم پورے طور پر ان سے سرزد ہوا ہو۔ لیکن یہاں کسی پر بھی بقدر نصاب مال چرانا ثابت نہیں ہے اور ثبوت جرم کی تمام شرطیں پوری نہیں ہوئی۔ ہاتھ کاٹنے کی سزا نصاب سرقہ کے برابر مال کی چوری کرنے پر لاگو ہوتی ہے۔ اس سے کم مقدار مال کی چوری پر نہیں ہوتی کیونکہ ہاتھ کی قدر و قیمت ایک مقام رکھتی ہے نیز اس مقدار مال کی چوری میں جس پر ایک شخص کا ہاتھ کاٹنے کا حکم شریعت نے دیا ہے بہت سے آدمیوں کا ہاتھ نہیں کاٹا جاسکتا۔ انسانی عضو کی اس عظمت کے مقابلہ میں دنیا اور متاع دنیا بے حقیقت ہیں۔ غرض اس صورت میں ہاتھ کاٹنے کی سزا کسی کو نہیں دی جائے گی۔ حدیث میں آیا ہے ”اقطعوا فی ربع دینار ولا تقطعوا فیما ہوا دنی من ذلک“ (یعنی ایک چوتھائی دینار کے سرقہ میں ہاتھ کاٹنے کی سزا دو اس سے کم مالیت کے سرقہ میں یہ سزا نہ دو)۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر مال مسروقہ ایسا ہے کہ جس کی چوری کرنے میں دوسروں کی اعانت درکار ہو تب تو تمام شرکائے سرقہ کے ہاتھ کاٹے جائیں۔ لیکن اگر وہ مال ایسا ہے کہ ایک ہی شخص تنہا اس کو چرا سکتا ہے تو اس بارے میں مالکیہ کے دو اقوال ہیں: ایک یہ کہ جرم سرقہ کے تمام شرکاء پر حد لاگو ہوگی اور دوسرا قول یہ ہے کہ ان کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے۔ اگر ہر ایک چور نے اس میں سے کچھ نہ کچھ لیا ہے تو ان میں سے کسی کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا تا آنکہ (ان میں سے کسی کے) مال مسروقہ کی مالیت نصاب سرقہ کے برابر نہ ہو۔ ایک کے چرائے ہوئے مال کو دوسرے کے چرائے ہوئے مال کے ساتھ ملا کر نہ دیکھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”لا تسزدوا زدا۔ ووزدا خسرى“ (یعنی کوئی شخص دوسرے کا بار گناہ نہیں اٹھائے گا) غرض نصاب سے کم مال کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

حنا بلہ کہتے ہیں کہ تمام (شرکائے سرقہ) واجب القطع ہیں خواہ مال مسروقہ اتنا ثقیل ہو کہ اس کے چرانے میں دوسرے شخص کی اعانت درکار ہوتی ہے یا ایسا نہ ہو اور خواہ مال مسروقہ کو حرز (جائے حفاظت) سے نکالنے میں سب شریک رہے ہوں یا الگ الگ اشخاص نے منفرداً نکالا ہو اور تمام مال مسروقہ کی مجموعی مالیت نصاب سرقہ کے برابر ہو گئی ہو یہ حکم مال کی اہمیت اور حقوق العباد کی سختی کے ساتھ نگہداشت کے پیش نظر ہے اور اس لئے بھی کہ سزائے سرقہ کا انحصار مال مسروقہ کی اس مقدار پر ہے جس کی چوری پر (پرائے) مال کے تحفظ اور اس کے حرام ہونے کے پیش نظر سزائے قطع واجب ہو جاتی ہے تاکہ ایسے افراد کی چیرہ دستی کا سد باب کیا جاسکے جو عوام کا مال لوٹنے پر اکٹھے ہوئے ہیں۔

چوروں کے ایک گروہ کا گھر میں داخل ہونا

حنفیہ اور حنا بلہ کہتے ہیں کہ اگر چوروں کی ایک جماعت اندر آ جائے اور سب کسی ایک فرد (یا چند افراد) کو مال مسروقہ اٹھانے پر لگائیں اور باقی اشخاص کچھ نہ اٹھائیں اور نہ اٹھانے میں مدد کریں۔ پھر وہ مال باہم تقسیم کریں اور ہر ایک کے حصہ میں مال بقدر نصاب آ جائے تو ان سب کے ہاتھ کاٹے جائیں گے کیونکہ مال کا جائے حفاظت سے نکالنا اگرچہ (سب کا فعل نہ تھا) کسی ایک کا فعل تھا لیکن درحقیقت سب ہی چوری کرنے میں شریک تھے کیونکہ ان سب نے اس شخص کی (چوری کرنے میں) اعانت کی اور وہ سب مال اٹھانے والے کو جرأت دلانے میں شریک تھے۔ درحقیقت چور بالعموم ایسا ہی کرتے ہیں اس طرح جس نے مال وہاں سے نہیں اٹھایا ہوتا اسے بچاؤ کا موقع مل جاتا ہے۔ اب اگر اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ ہوئی تو حد (سزائے شرعی) سرے سے ختم ہو جائے گی اور اگر سزا سے نہ بچا تب بھی (گوفائدہ نہ ہو) نقصان بھی نہ ہوا لہذا واجب ہے کہ (اس جرم میں) جو بھی شریک ہے اس کے ساتھ سخت برتاؤ کیا جائے اگرچہ اس نے خود مال نہ نکالا ہو اور نہ مال کے اٹھانے میں مدد کی ہو۔ اس مسئلہ میں (مستوجب سزا ہونے کے لئے) یہ شرط جو لگائی گئی ہے کہ چوروں کی تمام جماعت اندر داخل ہو گئی ہو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ سب سرقہ میں شریک ہوئے اور سب نے چوری کرنے کی ٹھانی لیکن مکان (یعنی حرز) کے اندر صرف ایک یا چند آدمی داخل ہوئے جنہوں نے مال نکالا باقی اشخاص (باہر ہی رہے) داخل مکان نہ ہوئے تو اس صورت میں صرف انہیں ہاتھ کاٹنے کی سزا ملے گی جو گھر کے اندر گئے اور مال لے کر باہر آئے بشرطیکہ یہ معلوم ہو کہ اندر جانے والا ان میں سے ہے۔ اگر یہ معلوم نہ ہو تو انہیں تنبیہ سزا دینا اور قید کر دینا واجب ہے یہاں تک کہ ان کی توبہ کا یقین ہو جائے۔ اور وہ جو گھر میں داخل نہیں ہوا اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ اس کا حرز (جائے حفاظت) میں مداخلت کر کے مال اٹھانے والے کی اعانت کرنا ثابت نہیں ہے۔ پس ان کا شریک جرم ہونا تسلیم نہ کیا جائے گا۔ جائے حفاظت کی مداخلت پورے طور پر اسی حالت میں ہوگی جبکہ چور گھر کے اندر داخل ہو جائے۔ ان اصحاب کا کہنا یہ ہے کہ یہ مسائل اس صورت میں عائد ہوں گے جبکہ گھر کے اندر سے سامان اٹھانے والا ایسا شخص ہو کہ اگر وہ (بلا اشتراک غیرے) تنہا اس فعل کا ارتکاب کرتا تو مستوجب سزائے قطع ہوتا۔ یعنی وہ عاقل و بالغ ہو اور اجنبی ہو (یعنی مالک مکان کا) رشتہ دار نہ ہو۔ پس مال کو اٹھانے والا کوئی بچہ یا جنون زدہ یا مالک خانہ کا قرابت دار ہو تو ان اشخاص میں سے کسی کو سزائے قطع نہیں دی جائے گی۔ کیونکہ (باہر والا) جس نے مال کو نہیں اٹھایا وہ مال اٹھانے والے کا تابع (یعنی ثانوی حیثیت کا مالک) ہے۔ پس جبکہ اصل مجرم واجب القطع نہ ہو تو اس کا تابع بھی واجب القطع نہ ہوگا۔

شافعیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر چوروں کی ایک جماعت نے چوری کرنے کی ٹھانی اور مال کے حرز (حفاظت) میں داخل ہوئے اور ان میں سے کسی فرد نے مال نکالا تو صرف اسی کو جس نے حرز سے مال نکالا ہے ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جائے گی بشرطیکہ (نکال کر لانے والوں میں سے) ہر ایک کے حصہ کا مال مقدار نصاب کو پورا کرتا ہو یعنی تین درہم یا زیادہ کی مالیت کا مال ہو۔ غرض وہ شخص جو اندر گیا لیکن اس نے نہ مال کو نکالا اور نہ اسے ہاتھ لگایا تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ کیونکہ چوری کا فعل اس سے سرزد نہیں ہوا اور جرم سرقہ (قرار دیئے جانے) کی شرائط پوری نہیں ہوئیں۔ اسی طرح اگر مال مسروقہ ہر ایک کے حصے میں بمقدار نصاب نہیں آیا تو ان میں سے کسی کا بھی ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ کیونکہ نصاب سرقہ سے کم مال کی چوری میں سزائے قطع نہیں ہے۔

اگر دو مکلف اشخاص (جن پر دینی احکام عائد ہوتے ہیں) بمقدار دو نصاب کے یا اس سے زیادہ نکال کر لے آئے تو دونوں کے ہاتھ کاٹے جائیں گے کیونکہ دونوں میں سے ہر ایک نے بمقدار نصاب چوری کی ہے۔ اگر وہ مال دو نصابوں سے کم ہے تو ان میں سے کسی کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

دروازہ توڑنے یا نقب زنی کا بیان

حنفیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ اگر چور نے کسی گھر میں نقب لگائی اور اس میں داخل ہو کر وہاں سے مال اٹھایا اور اس مال کو ایک اور شخص کے حوالے کر دیا جو نقب کے قریب یا گھر کے دروازے پر تھا تو ان دونوں میں سے کسی کو بھی سزائے قطع نہ ملے گی کیونکہ مال مسروقہ اندر سے چرانے والے کے باہر لانے سے پہلے معتبر (غیر سارق) کے ہاتھ آ گیا تو اب اسے سرقہ قرار دینا مشتبہ ہو گیا اور چوری کی تکمیل دونوں میں سے کسی نے نہیں کی ہے۔

ابو یوسف رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ اگر اندر والے نے اپنا ہاتھ نقب سے باہر نکال لیا تھا تو اندر والا سزائے قطع کا مستوجب ہوگا اور اگر باہر والے نے اپنا ہاتھ اندر ڈال کر مال مسروقہ کو پکڑ لیا تو دونوں کے ہاتھ کاٹے جائیں گے لیکن اگر دونوں میں سے ہر ایک نے (بلا اعانت دیگر) یہ کام کیا تو ان میں سے کسی کو سزائے قطع نہ ہوگی۔ اس کی صورت یہ ہے کہ باہر کے آدمی نے نقب کا سوراخ دیکھا اور اس میں ہاتھ ڈال کر اندر والے چور کے جمع کئے مال کو اٹھا لیا تو ان میں سے کوئی بھی مستوجب قطع نہ ہوگا۔ اگر کسی نے مکان کی ایک منزل میں نقب لگائی اور وہاں سے مال اٹھا کر راستے میں پھینک دیا اور پھر باہر آ کر اسے اٹھا لیا تو کسی کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا، لیکن صحیح یہی ہے کہ ہاتھ نہ کاٹا جائے۔

اگر گھر کے اندر کوئی نہر بہہ رہی ہے اور چور نے مال چرا کر نہر میں بہا دیا اور پھر باہر آ کر (نہر سے) وہ مال نکال کر لے گیا۔ اس صورت میں دیکھا جائے گا اگر وہ مال پانی کے بہاؤ سے خود باہر آ گیا ہے تب تو اس شخص کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ اس مال کو اس شخص نے نہیں نکالا۔ تاہم یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جائے گی کیونکہ وہ مال اسی کی وجہ سے باہر آیا اور اسی کے فعل سے پانی اس مال کو بہا کر لایا، چونکہ اسی نے اس مال کو پانی میں ڈالا تھا لہذا اس مال کے باہر آ جانے کا موجب اسی کو قرار دیا جائے گا اور اس کا یہ عمل اس امر کا ایک بہانہ ہے کہ وہ مالک خانہ کے اس الزام سے خود کو بچانا چاہتا ہے کہ اس نے مال کو اٹھایا ہے۔ غرض اس کا یہ بہانہ سزائے قطع سے اسے بچا نہیں سکتا

اگر کسی نے گھر میں نقب لگا کر مال چرایا پھر اسے راہ میں پھینک دیا جسے کسی اور شخص نے اٹھالیا تو دونوں میں سے کسی کو سزائے قطع نہ ہوگی

اگر کسی شخص نے گھر کے اندر مال مسروقہ کو گدھے پر لاداد اور اسے ہٹکا دیا اور گدھا مال لے کر باہر آ گیا پھر اس شخص نے گدھے کو پکڑ کر سامان لے لیا تو اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا ہوگی کیونکہ گدھے کو وہاں سے نکالنے کا الزام اس شخص پر عائد ہوتا ہے۔

اگر کسی نے مال مسروقہ کتے کی گردن میں باندھ دیا اور اسے باہر نکال دیا اور پھر باہر آ کر کتے سے لے لیا تو ہاتھ کاٹا جائے گا لیکن اگر وہ کتا اس کے دھتکارے بغیر خود ہی باہر آ گیا تھا تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ جانور تو جدھر چاہے جا آ سکتا ہے۔ اور جب تک اس پر مال لاد کر یا ہٹکا کر اسے اپنے قابو میں نہ رکھا جائے اس فعل کو اس شخص کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔

اگر کسی شخص نے نقب لگائی اور سوراخ میں ہاتھ ڈال کر وہاں سے مال نکال لیا اور گھر کے اندر نہیں گیا تو سزائے قطع کا مستوجب نہ ہوگا کیونکہ مکمل طور پر سرقہ کا الزام عائد ہونے کے لئے جائے حفاظت میں مداخلت کی شرط کا پورا ہونا ضروری ہے تاکہ سرقہ کا جرم عائد ہونے میں جو شبہ ہے وہ نہ رہے۔ جرم مشتبہ ہو جائے تو سزا ساقط ہو جاتی ہے اور ناقص ثبوت جرم کو ساقط کر دیتا ہے اور ثبوت ناقص ہو تو جرم کا عدم ہو جاتا ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی نے گھر میں نقب لگائی اور اس کے اندر داخل ہو گیا اور پھر وہاں سے بقدر نصاب مال مسروقہ باہر والے شخص کے حوالے کر دیا۔ بایں طور کہ اس شخص نے اپنا ہاتھ حرز (جائے حفاظت) میں ڈالا اور مال اندر والے سے لے لیا۔ لیکن اندر والا باہر نہیں آیا تو اس صورت میں صرف باہر والے کو سزائے قطع ہوگی کیونکہ حرز سے نکال کر لانے والا یہی شخص ہے۔ اندر والا مال کو باہر نہیں لایا لہذا وہ واجب القطع نہیں ہے۔ اگر اندر والے نے ہاتھ کو باہر نکال کر دوسرے شخص کو مال پکڑایا اور اس باہر والے نے حرز میں مداخلت نہیں کی اور نہ اس نے مال وہاں سے نکالا تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اگر اندر والے نے باہر والے کو سوراخ نقب کے درمیان میں مال سرقہ پکڑایا یا اندر والے نے مال مسروقہ کو رسی وغیرہ میں باندھ دیا اور باہر والے نے اسے باہر کھینچ لیا تو دونوں کے ہاتھ کاٹے جائیں گے۔

اگر کسی شخص نے جائے حفاظت ہی میں مال مسروقہ کو دوسرے شخص کی پیٹھ پر رکھ دیا اور وہ اسے لے کر باہر آ گیا تو اب اگر مال مسروقہ کا بار اٹھانے کی صلاحیت اس میں اندر والے کی معاونت کے بغیر نہیں تھی تو ان دونوں کو سزائے قطع ہوگی لیکن اگر اٹھا کر لانے والے میں یہ صلاحیت تھی اندر والے میں بالکل نہ تھی تو صرف اس کو سزائے قطع دی جائے گی جو مال لے کر باہر آیا کیونکہ (حرز سے) باہر مال لے کر آنے والا وہی ہے۔

شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے مکان میں نقب لگا کر چوری کی اور کوئی دوسرا شخص وہاں سے مال لے کر باہر آیا، گو اسی وقت ایسا ہوا ہو تو ان دونوں میں سے کسی کو سزائے قطع نہ ہوگی کیونکہ جس نے نقب لگائی تھی اس نے چوری نہیں کی اور وہاں سے باہر لانے والے نے حرز (جائے حفاظت) سے مال نہیں اٹھایا۔ تاہم اول الذکر کو دیوار پھوڑنے کا معاوضہ دینا ہوگا اور ثانی الذکر کو مال مسروقہ کا تاوان ادا کرنا ہوگا۔ یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ مکان کے اندر کوئی شخص موجود نہ ہو لیکن اگر مکان کے اندر کوئی محافظ نقب کے قریب موجود ہو اور وہ مال کی دیکھ بھال کر رہا ہو تو اس مال کو تحت تحفظ قرار دیا جائے گا اور باہر لانے والے کا ہاتھ کاٹا جائے گا لیکن اگر محافظ سویا ہوا ہو تو بقول صحیح ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

جیسے (اس صورت میں ہوتا ہے جبکہ) کوئی شخص سو رہا ہو اور دروازہ کھلا ہوا ہو۔ اس کو جرم قرار دینے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ مال مسروقہ کو باہر لانے والا صاحب شعور ہو۔ چنانچہ اگر کسی نے نقب لگائی اور کسی بے شعور بچے یا دیوانے کو مال نکال کر لانے کے لئے کہا اور وہ مال نکال کر لے آیا تو مال کا منگوانے والا واجب القطع ہے۔ لیکن اگر کسی صاحب شعور کو کہا یا (سکھائے ہوئے) بندر کو کہا تو سزائے قطع نہ ہوگی کیونکہ یہ چیزیں اس کا آلہ کار نہیں ہیں (کہ اس سے بچے کی طرح کام نکالا جاسکے)۔

اگر دو شخصوں نے مل کر دیوار میں سیندھ لگائی پھر ان میں سے ایک نے مقدار نصاب کے برابر یا زیادہ مال نکال لیا یا پھر ان دونوں میں سے ایک نے مال مسروقہ کو نقب کے پاس رکھ دیا اور دوسرے نے جو اس کے ساتھ سیندھ لگانے میں شریک تھا اٹھا لیا اور بمقدار نصاب یا زیادہ مال نکال لیا تو دونوں صورتوں میں اس شخص کا ہاتھ کاٹا جائے گا جس نے مال کو نکالا کیونکہ چوری اسی نے کی (یعنی چوری کرنے کی تعریف اسی پر صادق آتی ہے)۔

اگر اندروالے چور نے مال کو سوراخ نقب کے بیچ میں رکھ دیا اور باہروالے شریک کار نے اسے اٹھا لیا یا اس شخص نے کسی اور شخص کو نقب کے دہانے سے پکڑا دیا اور مال مسروقہ دو نصابوں کے برابر یا اس سے زیادہ تھا تو بقیاس غالب ان کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے کیونکہ دونوں میں سے کوئی بھی کامل حرز یعنی دیوار خانہ سے باہر نہیں آیا۔ ایسے چور کو ”ظریف“ (دزدانا یا ہوشیار چور) کہتے ہیں۔ اس بارے میں ایک دوسری رائے یہ ہے کہ ان دونوں کے ہاتھ کاٹے جائیں کیونکہ نقب زنی اور مال اٹھانے میں دونوں شریک کار تھے اور اس لئے بھی کہ مبادیہ ترکیب حد (سزائے شرعی) سے بچنے کا ذریعہ بن جائے۔ اگر اندروالے چور نے باہروالے کے لئے مال مسروقہ کوری سے باندھا اور باہروالے نے اسے کھینچ لیا تو باہروالے کو سزائے قطع ملے گی اندروالے کو سزا نہ ہوگی البتہ مالک کا جو نقصان ہوا ہے اس کا تاوان بھرنا پڑے گا۔

ناپینا شخص کا ہاتھ اس مال کے چرانے کی پاداش میں کاٹا جائے گا جس کی نشان دہی کسی لہجے نے کی ہو اور اگر کوئی ناپینا ایک لہجے کو اٹھا کر جائے حفاظت میں لے گیا تا کہ وہ اسے مال کا پتہ بتائے اور وہ ناپینا اس مال کو اٹھائے اور لہجے کو ساتھ لے کر باہر آجائے تب بھی اس ناپینا کا ہاتھ کاٹا جائے گا کیونکہ اصل چور دراصل وہی ناپینا ہے اور وہ لہجے کوئی ناپینا اٹھا کر لے گیا اور لہجے نے چوری کی تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ ناپینا کو سزائے قطع نہ ہوگی۔ کیونکہ اس نے مال نہیں اٹھایا۔

واضح ہو کہ دروازہ کھولنا، قفل وغیرہ کو توڑنا اور یاد دیوار کو پھاند کر جانا ایسا ہی ہے جیسے نقب لگانا جس کا ذکر کیا گیا۔ اگر کسی نے مال کو حفاظت کی جگہ سے اٹھا کر باہر پھینک دیا یا بہتے پانی یا ٹھہرے ہوئے پانی میں ڈال دیا یا تیز ہوا میں اڑا دیا اور اس طرح وہ مال باہر آ گیا۔ ان تمام صورتوں میں اس شخص کا ہاتھ کاٹا جائے گا کیونکہ ان تمام حالتوں میں مال کو باہر لانے کا الزام اسی پر عائد ہوگا۔ خواہ وہ مال نقب کی راہ سے پھینکا یا دروازے سے یاد دیوار کے اوپر سے اور خواہ پھینکنے کے بعد اس کے ہاتھ لگائے یا نہیں لگا بلکہ تلف ہو گیا مثلاً آگ میں جل جائے یا ضائع ہو گیا ہو یا ضائع نہ ہوا۔

اگر کسی چور نے رات کو نقب لگائی اور چوری نہیں کی لیکن دوسری رات کو اس شے کے دوبارہ جائے حرز میں رکھے جانے سے پہلے پھر آیا اور چرا کر لے گیا تو بقول صحیح اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اس کا یہ فعل ایسا ہی ہے جیسے کسی نے اول

شب نقب لگائی اور پچھلی شب کو آکر چوری کی یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

کم عمر آزاد (غیر مملوک) لڑکوں کو چرانے کا بیان

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے ایک آزاد فرد کو چرایا اور وہ کم عمر (لڑکا) ہے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ (چوری مال کی ہوتی ہے اور) آزاد لڑکے کو (یعنی جو غلام نہیں ہے) مال قرار نہیں دیا جائے گا۔ اس پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ دارقطنی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے ”انہ صلی اللہ علیہ وسلم اتی برجل یسرق الصبیان ثم ینخرج بہم فی بیعہم فی ارض اخری فامر بہ فقطعت یدہ“ (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک شخص کو پیش کیا گیا جو بچوں کو چرا کر لے جاتا تھا۔ پھر کسی اور جگہ لے جا کر انہیں بیچ دیتا تھا آپ کے حکم سے اس کا ہاتھ کاٹا گیا)۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اگر اس حدیث کو صحیح مان لیا جائے تو یہ سمجھا جائے گا کہ اس کا تعلق مملوک (غلاموں) سے ہے جن کی بابت یہ حکم ہے کہ اگر کوئی شخص جائے حفاظت سے ایسے شخص کو چرا لے جائے جو کم عمر یا گونگیا جنون زدہ ہونے کے باعث بے شعور تھا اسے بھی مال چرانے والے کی طرح سزائے قطع دی جائے گی ایسے اشخاص کا حرز (جائے حفاظت) گھر وغیرہ کا ملحقہ علاقہ ہے۔

اگرنا سمجھ لڑکے دیوانے، گونگے یا اندھے شخص کو ایسی جگہ سے چرایا جسے محل ضیاع نہیں کہا جاسکتا، جبکہ گلے میں ہار ہے یا اس کے سوا اس کے پاس مال ہے جو اس زینت اور لباس سے اس کے شایان شان معلوم ہوتا ہے اور اس کی مالیت نصاب کے برابر ہے۔ تو چرانے والے کو بقول صحیح سزائے قطع نہیں دی جائے گی کیونکہ آزاد شخص ان اشیاء کا مالک ہوتا ہے جو اس کے ہاتھ (قبضہ) میں ہو (یعنی یہ اشیاء مالک کے پاس ہیں تو چوری نہ ہوئی) چنانچہ اگر کسی تنہا شخص کو پایا جس کے پاس زیور ہے تو اس کا بھی یہی حکم ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے اونٹ چرایا اور اس کا مالک اس پر سوار ہے (تو وہ چوری نہ ہوگی)۔

اس بارے میں دوسری رائے یہ ہے کہ ایسی صورتوں میں ہاتھ کاٹا جائے گا کیونکہ اس نے چرایا ہی اس شے کے لئے ہے جو ان کے پاس ہے۔

اگر ایک شخص کو ایسی جگہ سے چرایا جو محل ضیاع میں ہے مثلاً ویران جگہ یا صحرا تو بالاتفاق اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ ہوگی۔ اور اگر اس شخص کے پاس جسے چرایا گیا ہے غیر معمولی طور پر مال ہے اور اس کے مناسب حال جائے حفاظت سے چرایا گیا تو متفقہ طور پر اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا اور اگر ایسی جگہ سے لے گیا جہاں صرف بچے کی حفاظت ہے اور وہ کی نہیں ہے تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ ہار اس بچے کا ہوا اگر کسی اور کا ہے اور اس جگہ سے چرایا ہے جہاں اس کے مناسب حال تحفظ تھا تو ہاتھ کاٹا جائے گا ورنہ قطعاً نہیں کاٹا جائے گا۔

اگر کوئی بچہ جائے حفاظت سے باہر آ گیا اور کسی نے اس کے گلے کا ہار چرایا تو اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ ہوگی کیونکہ وہ ہار (مال) حرز (مقام حفاظت) سے چوری نہیں ہوا۔ اگر کسی نے آزاد بچے کے گلے کا ہار اتار لیا یا کتے کے گلے کا پٹہ مع کتے کے چرایا در آنحال یہ وہ جائے حرز میں تھے تو ہاتھ کاٹا جائے گا۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی نے آزاد اورنا سمجھ بچے پر سے اس کا زیور اور کپڑا یا جو کچھ اس کے پاس مثلاً جیب میں یا

گلے میں تھالے لیا۔ درآنحالیکہ اس کا کوئی نگران حال نہ تھا اور بچہ اپنے کنبہ والوں کے گھر میں نہ تھا تو ایسے شخص کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، کیونکہ نا سمجھ بچہ اپنی چیزوں کا محافظ قرار نہیں دیا جاسکتا جو وہ پہنے ہوئے ہے یہی حکم دیوانہ کا ہے اگرچہ وہ بڑا ہو۔ لیکن اگر کسی نے آزاد نا سمجھ بچے کو جو نہ چل پھر سکتا ہو اور نہ کلام کر سکتا چرا لیا تو وہ شخص واجب القطع ہے، کیونکہ ایسا بچہ قابل احترام مال کی مانند ہے یہ حکم اس لئے ہے کہ اگر بچہ نا سمجھ ہو تو اسے اٹھانے والے کا مقصد خود بچے ہی کو چرانا ہے بچے کی چیزوں کا چرانا اس کے مد نظر نہیں ہے۔ اکثر اوقات بچے کے اوپر کچھ نہیں ہوتا اور نہ اس کے زیور اور کپڑے کو لے لیتا اور بچے کو چھوڑ جاتا پس ایسے شخص پر (جو معصوم بچوں کو اٹھالے جائے) حد سرقہ لاگو کرنا واجب ہے، کیونکہ بچہ مال سے زیادہ بڑی شے ہے اور بدیں سبب بھی کہ دارقطنی میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک شخص کو لایا گیا جو بچوں کو چرا کر لے جاتا اور کسی دوسرے مقام پر بیچ دیا کرتا تھا، حضور کے حکم سے اس کا ہاتھ کاٹا گیا (یہ روایت اوپر نقل ہو چکی ہے)۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ آزاد بچے کو چرانے والا واجب القطع نہیں ہے، اگرچہ اس نے بمقدار نصاب زیور پہن رکھا ہو، زیور سے مراد سونے چاندی یا جواہرات کا زیور ہے جو پہننے کے کام آتا ہے یہ حکم اس لئے ہے کہ آزاد (غیر مملوک) بچہ مال نہیں ہوتا۔ رہا وہ مال جو اس کے جسم پر ہوتا ہے جو بچے کے تابع ہے (یعنی بچے سے الگ کوئی مستقل شے نہ ہے) چونکہ ہاتھ کاٹنے کی سزا صرف مال کی چوری میں ہوتی ہے لہذا بچے کی چوری میں (جو مال نہیں ہے) ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا یہ دوسری بات ہے کہ یہ گناہ اور اس کی سزا اللہ کے نزدیک مال کی چوری سے زیادہ سخت ہے چنانچہ حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”ثلاثہ ان حصمہم یوم القیامتہ: رجل اعطی بہ ثم غدر، ورجل باع حراً فاکل ثمنہ، ورجل استاجر اجیراً فاستوفی منہ عملہ، ولم یوفہ اجرہ“ (یعنی تین اشخاص ایسے ہیں جن کا میں قیامت کے روز دشمن ہوں گا: وہ شخص جس کے ساتھ عنایت کی جائے اور وہ غداری کرے اور وہ شخص جو آزاد آدمی کو فروخت کرے اس کے دام کھائے اور وہ شخص جو کسی سے اجرت پر اپنا پورا کام کرائے لیکن اس کی پوری اجرت نہ دے) تاہم ہاتھ کاٹنے کی دنیوی سزا اس پر عائد نہیں ہوتی، کیونکہ اس جرم میں یہ شبہ پیدا کرنے کی گنجائش ہے کہ بچے کو اٹھانے والا یہ بہانہ کر سکتا ہے کہ اس نے بچے کو بہلانے کے لئے یا دودھ پلانے والی کے پاس لے جانے کے لئے اٹھایا تھا، یہاں بچے سے مراد معصوم کم عمر بچہ ہے جو نہ چل پھر سکتا ہو نہ بات کر سکتا ہو اگر بچہ چل پھر سکتا اور کلام کر سکتا ہے اور باشعور ہے تو بالا جماع اسے سزائے قطع نہ ہوگی کیونکہ وہ خود اپنے نفس کا مالک ہے (یعنی چرایا نہیں گیا) پس اسے فریب یا اغوا سے اٹھایا جاسکتا ہے اور مکر و فریب کی پاداش میں ہاتھ نہیں کاٹا جاتا (کیونکہ اسے چوری قرار نہیں دیا جاسکتا) ابو یوسف سے مروی ہے کہ آزاد نا سمجھ بچے کو چرانے کی پاداش میں ہاتھ کاٹنے کی سزا واجب ہے، واللہ اعلم۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی غلام (مملوک) اونٹ پر سو گیا اور ایک شخص اس اونٹ کے گلے میں رسہ ڈال کر اسے قافلہ سے نکال لایا تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے لیکن اگر آزاد شخص اونٹ پر سوار سو جائے اور اسی طرح کوئی نکال کر لے جائے تو بقول صحیح اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ ہوگی، کیونکہ اونٹ مالک کے قبضہ میں ہے (لہذا یہ چوری نہیں ہے)۔

مہمان کے چوری کرنے کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر مہمان اپنے میزبان کے گھر سے مقدار نصاب سے زیادہ مال چرائے تو وہ واجب القطع نہ ہوگا کیونکہ جہاں سے اس نے چوری کی وہ مہمان کے لئے حرز (منوعہ جگہ) نہیں تھی اسے اندر آنے کی اجازت تھی اور جب کسی کو گھر میں آنے کی اجازت ہو تو وہ شخص اہل خانہ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے لہذا اس کا یہ فعل خیانت (بددیانتی) تو ہے چوری نہیں ہے یہی حکم اس صورت میں ہے جبکہ کوئی شخص گھر کے ایک کمرے سے جہاں اسے جانے کی اجازت ہے کوئی چیز چرائے (تو مستوجب قطع نہ ہوگا)۔ اگرچہ وہ کمرہ مقفل ہو یا مقفل صندوق میں سے چوری کر لے کیونکہ ایک مکان کے تمام کمرے (بحیثیت مجموعی) ایک ہی حرز (جائے حفاظت) ہیں پس اگر چرانے والا ایک کمرے کا مال نکال کر دوسرے کمرے میں لے گیا تو مستوجب سزائے قطع نہیں ہے تا آنکہ مال مسروقہ کو مکان سے باہر نہ لے جائے اور در آنحالیکہ تمام مکان ایک حرز ہے تو اگر اس میں آنے کی اجازت دی جائے تو مکان کے تمام کمروں کو حرز قرار دیئے جانے میں نقص پیدا ہو جائے گا اور وہاں سے چوری کرنا جرم کو مشتبہ بنا دیتا ہے لہذا مہمان (جسے حرز میں آنے کی اجازت دی گئی ہے) اگر چوری کرے تو مستوجب سزائے قطع نہ ہوگا۔

شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر مہمان اپنے میزبان کے گھر سے یا پڑوسی اپنے پڑوسی کی دکان یا غسل کرنے والا حمام سے چوری کر لے ہر چند کہ چوری کی نیت سے اندر گیا ہو واجب القطع نہیں ہے کیونکہ وہ مال غیر محرز (یا غیر محفوظ) جگہ سے اٹھایا گیا۔ فقہانے (جرم سرقہ کو) واجب القطع قرار دینے کے لئے ان چند امور کو شرط قرار دیا ہے:

اول یہ کہ مال مسروقہ کی مالیت ایک چوتھائی دینار ہو دوسرے یہ کہ وہ مال دوسرے شخص کا ہو تیسرے یہ کہ اس فعل کے جرم سرقہ ہونے میں کوئی شبہ نہ ہو چوتھے یہ کہ مال مسروقہ جائے حفاظت سے اٹھایا گیا ہو بایں طور کہ اس کا کوئی محافظ موجود ہو یا وہ جگہ (غیر اشخاص کے لئے) ممنوع ہو ان میں سے اگر کوئی ایک شرط نہ پائی جائے تو وہ جرم مستوجب قطع نہ رہے گا۔ مسئلہ مذکورہ کی ایک شرط یعنی مال کا حرز (جائے حفاظت) میں ہونا پوری نہیں ہوتی۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر مہمان مقدار نصاب سے زیادہ مال کی چوری (میزبان کے ہاں سے) کر لے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا بشرطیکہ اسے گھر کے اندر آنے کی اجازت دی گئی ہو مہمان گھر میں مالک خانہ کی اجازت سے داخل ہوا تو اسے خیانت کرنے والا تو کہہ سکتے ہیں چوری کرنے والا نہیں کہہ سکتے نیز ایسے شخص کو بھی سزائے قطع نہیں ہے جس نے ایسے مکان سے چوری کی جہاں داخلہ کی عام اجازت ہو مثلاً حاکم عادل یا نجی کا گھر جہاں اذن عام ہو اور لوگ مالک خانہ کی اجازت کے بغیر اندر داخل ہو سکتے ہوں پس اگر چور مال مسروقہ کو لے کر دروازے سے باہر چلا جائے تو اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ ہوگی کیونکہ اس شخص نے امانت میں جو کچھ اس کے سپرد کیا گیا اس میں خیانت کی ہے (چوری نہیں کی) البتہ اگر ایسی چیز چرائی جسے بچایا گیا تھا مثلاً ذخیرہ یا خزانہ جو عموماً مکان کے اندرونی حصہ میں ہوتا ہے اگر (چوری کرنے والا) جائے محفوظ سے نکال کر دروازے تک لایا تو ہاتھ کاٹا جائے گا اگر کوئی شخص مال کو دھوکہ سے نکال کر لایا تو اسے سزا قطع نہ ہوگی۔ عام دستور کے مطابق یا حقیقی معنوں میں اسے داخل ہونے کی اجازت تھی اور اندر آنے کی اجازت اس جگہ کے محفوظ ہونے میں خلل انداز ہوگی لہذا وہاں سے چرالینا پورے طور پر چوری نہیں ہے۔

تاجروں کی دکان، عمومی عمارات اور مشترکہ مقامات سے چوری کرنے کا بیان

حنفیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ ایسے چور کو سزائے قطع نہیں ہے جو تاجروں کی دکان اور فروخت گاہوں سے مال چرائے کیونکہ ان کے مالکوں نے لوگوں کو خرید و فروخت کے لئے اندر آنے کی اجازت دے رکھی ہے اور اس طرح اس کے 'حرز' (جائے حفاظت) ہونے میں خلل ہے لہذا اگر کوئی شخص دن میں وہاں سے چوری کرے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ دکاندار دن کو بازار میں اپنی دکان کھولتا ہے اور اندر آنے والوں کی پذیرائی کرتا ہے تاکہ لوگ اس کے مال دیکھیں اور خریدیں بلکہ جس قدر زیادہ وہاں سے آمد و رفت ہوتا ہے وہ زیادہ خوش ہوتا ہے کیونکہ اس میں اسے فائدہ اور اس کی تجارت کو فروغ ہوتا ہے اب اگر وہاں سے کسی نے چوری کی تو وہ واجب القلع نہ ہوگا کیونکہ دستور کے مطابق یا حقیقی معنوں میں وہاں پر آنے جانے کی عام اجازت ہے جس کے باعث شرط تحفظ میں خلل ہو جاتا ہے ہاں اگر رات کے وقت وہاں سے کوئی چرائے تو سزائے قطع ملے گی کیونکہ وہ جگہ تحفظ مال ہی کے لئے بنائی گئی ہے البتہ دن کے وقت عام اجازت داخلہ کے باعث اس کا تحفظ ناقص رہ جاتا ہے۔ یہ نقص رات کو (جبکہ عام اجازت نہیں رہتی) دور ہو جاتا ہے) اور وہ جگہ مکمل طور پر حرز ہو جاتی ہے) لہذا وہ شخص جو رات کو وہاں پر چوری کرے وہ واجب القلع ہوگا خواہ کوئی چوکیدار موجود نہ ہو بشرطیکہ مال مسروقہ نصاب سرقہ کے برابر ہو جائے۔

شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ جس شخص کو گھر میں یا دکان میں یا تجارت کے تھڑے میں داخل ہونے کی اجازت ہو اگر چوری کر لے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ جہاں دستور کے مطابق یا حقیقی معنوں میں داخل ہونے کی عام اجازت ہو۔ اس کا تحفظ مشتبہ ہو جاتا ہے۔ تمام اشخاص کو ان مقامات میں دن کے وقت اپنے کاروبار اور خرید و فروخت کے لئے بلا روک ٹوک اور بغیر پوچھے اندر آنے کی عام اجازت ہوتی ہے۔ لہذا جو مال اس میں ہوتا ہے وہ غیر محفوظ ہو جاتا ہے اگرچہ وہ مال عمارت کے اندرونی حصہ میں ہو اور مالک وہاں پر موجود ہو بہر حال عام داخلہ کی اجازت 'حرز' (حفاظت) میں شبہ کا موجب ہوتی ہے۔

دھوبیوں کی دکان کے دروازوں پر جو کپڑے گا ہوں کی نمائش اور جاذب نگاہ ہونے کے لئے رکھے جاتے ہیں اور عطر فروش کا مال جو دکانوں کے دروازے پر سجایا جاتا ہے اور کھانا پکانے کی سر بند دیکیں جو باورچی کی دکانوں کے دروازوں پر بغرض حفاظت باڑ لگا کر گڑی ہوئی ہوتی ہیں کیونکہ انہیں اندر لیجانا مشکل ہوتا ہے اور دکان کا دروازہ بند نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سب چیزیں دن کے وقت بھی جبکہ لوگوں کو اندر آنے کی اجازت ہو زیر حفاظت متصور ہوں گی۔ اور سبزی فروش کی دکان جو بند ہوگا اس کا کوئی محافظ موجود نہ ہو امن کے دنوں میں اس کی اشیاء رات کے وقت بھی زیر حفاظت مانی جائیں گی بخلاف اس صورت کے جبکہ دکان رات کو کھلی ہوئی ہو اور اس کا کوئی محافظ نہ ہو یا بند ہو لیکن فتنہ کا زمانہ ہو (تو اسے غیر محفوظ مانا جائے گا) اور بزاز (پارچہ فروش) کی دکان رات کے وقت زیر حفاظت متصور ہوگی کیونکہ رات کو اس میں آنے کی عام اجازت نہیں ہوتی۔

اب اصحاب کا کہنا ہے کہ مکان کے اور اس کے کمروں کے دروازے اور کنڈی زنجیر اور چٹنی اپنی ساخت کے لحاظ سے سامان حفاظت ہیں۔ گو دروازے کھلے ہوں اور مکان یا دکان میں کوئی شخص نہ ہو اسی طرح مکان اور دکان کی

چھت، سلیں اور اینٹیں عمارت کے لئے حرز (سامان حفاظت) ہیں اور فروخت کرنے والے اپنی چیزوں کو اکٹھا کر کے اس طرح باندھ دیں کہ ان میں سے کسی چیز کو اٹھانا ممکن نہ ہو جب تک حفاظت کے لئے لگائی ہوئی گرہوں کو کھولا یا ٹانگوں کو ادھیڑا نہ جائے تو وہ مال زیر حرز متصور ہوگا، بخلاف اس صورت کے جبکہ حفاظت کے لئے گرہ یا ٹانگے نہ لگائے گئے ہوں تو ایسی صورت میں (شرط حرز کو پورا کرنے کے لئے) دروازے کا بند ہونا ضروری ہے جیسا کہ اس زمانہ میں کیا جاتا ہے۔

اگر تاجر نے رات کے وقت دکان میں کوئی روشن دان یا سوراخ چھوڑ دیا اور کسی نے ہاتھ ڈال کر وہاں سے چوری کر لی اور بمقدار نصاب کچھ اٹھالیا تو سزائے قطع واجب نہ ہوگی، کیونکہ چرانے والے نے شرط حرز کو نہیں توڑا، اسی طرح اس صورت میں بھی ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ ہوگی جبکہ کسی چور نے دکان میں نقب لگا کر چھوڑ دیا ہو اور کوئی راہ گیر آیا اور اس نے نقب کے سوراخ میں ہاتھ ڈال کر بمقدار نصاب سے زیادہ مال اٹھالیا تب بھی ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، کیونکہ حرز میں مداخلت نہیں کی گئی۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ اگر چور نے ایام قحط اور سخت گراں سالی میں اشیاء خوردنی کی چوری کی جبکہ (جائز طریقے سے وہ) حاصل کرنے کے قابل نہیں تھا تو مستوجب قطع نہ ہوگا اور انسانی ہمدردی کے پیش نظر اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا جیسا کہ سیدنا عمر بن الخطابؓ کے عہد خلافت میں عام الرماد (کی قحط سالی) میں ہوا تھا۔

کشتی میں سے چوری کرنے کا بیان

مالکیہ کہتے ہیں کہ کشتی میں سے چوری کرنے کی حسب ذیل سولہ صورتیں ہیں:

منجملہ ان کے خالی کشتی یا کشتی سے ملحقہ اشیاء کی چوری کرنے کی آٹھ صورتوں میں ہاتھ کاٹا جائے گا: مال مسروقہ کشتی سے نکال لیا ہو یا نہ نکالا ہو چرانے والا کشتی کے سواروں میں سے ہو یا نہ ہو مال کا مالک موجود ہو یا نہ ہو مال کشتی کا ہو یا کشتی کی ملحقہ اشیاء کا، یہ آٹھ صورتیں ہوں گی۔ کشتی خالی نہ ہو تو چوری کرنے کی ان پانچ صورتوں میں بھی ہاتھ کاٹا جائے گا: چوری مالک کی موجودگی میں ہوئی ہو۔ مال مسروقہ (کشتی سے) باہر نکالا ہو یا نہ نکالا ہو چرانے والا کوئی باہر کا شخص ہو یا کشتی کے سواروں میں سے کوئی ہو۔ پانچویں صورت میں یہ ہے کہ باہر کے آدمی نے مالک مال کی غیر موجودگی میں چوری کی ہو۔ بقیہ ان تین صورتوں میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا: کشتی کی ملحقہ شے میں سے مالک کی غیر موجودگی میں چوری کی ہو۔ اور یہ کہ کشتی کے سواروں میں سے کسی نے چرایا ہو خواہ مال باہر لے گیا ہو یا نہ لے گیا ہو یا کسی اجنبی نے چرایا ہو اور وہاں سے نکال کر نہ لے گیا ہو۔

مقروض کے مال کی چوری کرنے کا بیان

حنفیہ اور مالکیہ رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ وہ چور واجب القطع نہیں جس نے بمقدار نصاب اس مال کی چوری کی ہو جس میں وہ شریک ہے بایں طور کہ دو (کاروبار کے) شریکوں میں سے ایک نے دوسرے کی جائے حفاظت سے مشترکہ ملکیت کا مال چرایا، کیونکہ اس مال میں چرانے والے کا بھی حق ہے۔ لہذا اس فعل کے چوری قرار دیئے جانے میں شبہ ہو گیا، جو سزا کے منافی ہے لہذا اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ ہوگی۔

اگر ایک شخص کے کچھ درہم دوسرے شخص پر قرض ہیں اور اسی قدر مال اس نے چوری کر لیا تو اسے ہاتھ کاٹنے کی

سزا نہ ہوگی کیونکہ (ممکن ہے) اس کی یہ حرکت اپنا حق واجب پورا کرنے کی غرض سے ہو۔ قطع نظر اس کے کہ وہ قرضہ فوری واجب الادا ہو یا معیادی ہو۔ یہ حکم استحساناً (یعنی قیاسی مصلحت) کی بناء پر ہے کیونکہ معیادی قرضہ میں صرف مطالبہ ادائیگی میں تاخیر مد نظر ہوتی ہے۔ گو قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے شخص کا ہاتھ کاٹ دیا جائے کیونکہ چرانے والے کو معاد قرض پوری ہونے سے پہلے رقم قرضہ کا ہتھیا لینا روا نہیں ہے تاہم قرض خواہ کا ثابت شدہ حق مطالبہ میں تاخیر کی گنجائش کے باوجود ارتکاب سرقہ کے جرم کو مشتبہ بنا دیتا ہے۔

اگر چوری کرنے والے نے اپنے حق سے زیادہ مال چوری کر لیا تب بھی ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ چوری کرنے والا بہر حال مال مسروقہ میں بمقدار حق شریک ہے۔ اس سے فرق نہیں پڑتا کہ وہ مقروض جس کی چوری کی گئی (ادائے قرض میں) ٹال مٹول کرتا ہو یا نہ کرتا ہو۔

اگر کسی شخص نے جنس مال مقروضہ کے علاوہ کوئی اور چیز چرائی مثلاً قرض خواہ کو درہم یا دینار لینے ہیں لیکن چوری سامان خانہ کی کر لی تو ہاتھ کاٹا جائے گا کیونکہ چوری کرنے والے کا کوئی حق اس سامان میں نہ تھا۔ لیکن اگر درہم لینے تھے اور دینار کی چوری کی یا اس کے برعکس کیا تو کہا جاتا ہے کہ ہاتھ کاٹا جائے گا کیونکہ یہ شے حق واجب الوصول کا بدل نہیں ہے۔ بلکہ یہ معاملہ بیع ہے اور یہ باہمی رضامندی کے بغیر نہیں ہو سکتا لہذا اس کے لینے کا حق اسے نہیں ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہیں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ ہوگی بایں لحاظ کہ دونوں ٹمن (قیمت) بننے کی صلاحیت میں ایک ہی جیسے ہیں۔ اسی طرح اگر قرض خواہ جسے مقروض سے درہم لینے ہیں کوئی زیور چرالے تو ہاتھ کاٹا جائے گا۔

اگر کسی نے اپنے باپ یا اپنے بالغ بیٹے کے مقروض کا مال چرایا تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا کیونکہ چرانے والے کو اس مال کے لینے کا حق نہیں بلکہ دوسرے شخص کو ہے۔ البتہ اگر اپنے صغیر بن بچے کے مقروض کا مال چرایا تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ اسے اپنے صغیر بن بچے کا قائم مقام ہونے کی حیثیت سے وصولی قرض کا حق ہے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی مقروض (ادائیگی، قرض میں) ٹال مٹول کرنے والا ہے تو اس کا مال چرانے میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ لیکن اگر مقروض ٹال مٹول کرنے والا نہیں ہے تو اس کا مال چرانے والے کو سزائے قطع ہوگی۔ تاہم اگر اپنا قرض وصول کرنے کے لئے چوری کر لے تو سزائے قطع نہ ہوگی کیونکہ اس طرح وصولی قرض کی اجازت ہے۔ اور ایسے شخص کو قرض میں دی ہوئی چیز کی ہم جنس چیز کے علاوہ دوسری چیز اٹھالینے کا حق ہے۔

واپس کیے ہوئے مال مسروقہ کو چرانے کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے چوری کی اور (سزائے سرقہ پانے کے بعد) وہ مال مسروقہ بشرط دستیابی مالک کو واپس کر دیا گیا اور پھر اسی مال کو بعینہ چرایا تو اب اسے سزائے قطع (دوبارہ) نہ ہوگی کیونکہ چوری کرنے والے کو جب سزائے قطع مل جائے تو اس کے حق میں مال مسروقہ کا تحفظ ختم ہو جاتا ہے اور اگر مال مسروقہ مالک کو واپس کر دیا جائے تو وہ تحفظ (واقعہ) مالک کے حق میں پھر آ جاتا ہے تاہم (چوری کے حق میں) یہ شبہ باقی رہتا ہے کہ وہ مال تحفظ سے باہر ہے۔ بایں لحاظ کہ وہ مال جس کا مالک وہی ہے اس کا تحفظ چوری کرنے والے کو سزائے قطع کے مل جانے پر باقی نہیں رہا۔ پس جبکہ وہ تمام امور جن سے تحفظ کا ساقط ہو جانا بوجہ سزائے قطع سارق کے واجب ہوتا ہے موجود ہو تو مالک کے تحت تحفظ آنے

اور سقوط تحفظ (بجائ مالک) دور ہو جانے کے باوجود (بجائ سارق) اس کے دور ہونے میں شبہ باقی رہتا ہے اور جب (بوجہ فقدان شرط) ثبوت جرم میں شبہ ہو جائے تو حد (سزائے شرعی) ساقط ہو جائے گی بخلاف اس صورت کے جبکہ اس مال کو (سزایافتہ سارق کے علاوہ) کوئی اور شخص چرائے۔

پھر یہ بھی ہے کہ ہاتھ کاٹے جانے کی سزا پانے کے بعد شاذ و نادر ہی کوئی شخص دوبارہ جرم سرقت کی جرأت کرے گا۔ ایسی ان ہونی بات پر انسداد جرم کے لئے دنیوی سزا شریعت میں نہیں ہے کیونکہ (سزائی) اصل غرض جرم کی روک تھام ہوتی ہے جو (سزائے قطع کی صورت میں) پہلے ہی موجود ہے۔ لہذا اس کی ضرورت نہیں ہے۔

شافعیہ مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے کوئی مال چرایا اور اس کی پاداش میں ہاتھ کاٹا گیا اور دوبارہ پھر بعینہ اسی مال کو چرایا (و دستیاب ہونے کے بعد مالک کو لوٹا دیا گیا تھا) تو اسے دوبارہ سزائے قطع ہوگی۔ چنانچہ دارقطنی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بطریق واقدی مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اذا سرق السارق فاقطعوا یدہ ثم ان عاد فاقطعوا رجلہ اليسری“ (یعنی اگر کوئی چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹ دو اور اگر مڑ کر پھر کرے تو اس کا بائیں پاؤں کاٹ دو)۔ پھر یہ بھی ہے کہ دوسری بار چوری کرنا اسی طرح مستوجب قطع ہے جیسا کہ پہلی بار تھا بلکہ بدیں سبب کہ جرم سے باز رکھنے والی سزا مل چکی ہے اور پھر بھی وہی جرم کیا تو یہ اس سے بھی بڑا گناہ ہوا لہذا اسے سزائے قطع دی جائے گی۔ اور اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ یہ مسئلہ اور ہے جیسے کوئی مالک مال اپنا مال چوری کرنے والے کے ہاتھ فروخت کر دے اور پھر اس سے خرید لے اور چرانے والا پھر اسی مال کو چرالے تو بالاتفاق چوری کرنے والے کو سزائے قطع ہوگی اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ نیز اس حکم کا یہ سبب بھی ہے کہ مال مسروقہ جب مالک کو واپس کر دیا گیا تو تاوان کے مسائل کی رو سے وہ مال سارق کے لئے ایک دوسری شے کی مانند ہے کہ سارق اس مال کو غضب کر لے (یعنی چھین لے یا ناجائز قبضہ کر لے) یا اسے ضائع کر دے تو اس کے تاوان کا ذمہ دار ہوگا۔ یہی صورت (اس مال مسروقہ کی) سزائے قطع کے وجوب کی ہوگی۔ پھر یہ بھی ہے کہ وہ مال جس طرح پہلے بمقدار نصاب جائے حفاظت سے چوری ہوا تھا اسی طرح دوبارہ بھی ہوا ہے۔

سزا کے ساتھ ادائیگی قرض کا بیان

حنفیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ جب سارق کا اپنے مقروض کے ہاں چوری کرنے کا جرم ثابت ہو جائے تو سزائے قطع کے بعد مال مسروقہ کا ادا کرنا واجب نہیں رہتا۔ چنانچہ اگر سارق مال مسروقہ کو دانستہ یا غیر دانستہ طور پر تلف کر دے تو اس کا تاوان واجب نہ ہوگا۔ غرض یہ کہ اگر تاوان ہو تو سزائے قطع نہ ہوگی اور سزائے قطع ہو جائے تو تاوان نہ ہوگا۔ تاہم اگر سارق کو سزائے قطع مل جائے اور مال مسروقہ دستیاب ہو تو وہ مال اس کے مالک کو واپس کر دیا جائے گا کیونکہ اس کا حق ملکیت باقی ہے جس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے، لیکن جس کی چوری ہوئی ہے اس کو اختیار ہے اگر وہ تاوان (مال مسروقہ کا) وصول کر لے تو چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اگر سزائے قطع دلوائے تو (سارق کے ذمہ) تاوان واجب الادا نہ ہوگا۔ چنانچہ نسائی میں ایک حدیث مسور بن ابراہیم عبد الرحمن بن عوفؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”لا یعوم السارق اذا اقيم عليه الحد“ (یعنی اگر مقروض کے ہاں چوری کرنے والے کا ہاتھ کاٹ دیا جائے تو پھر وہ قرض ادا نہ

کرے گا)۔ یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ اگر چوری کرنے والا مال مسروقہ کو تلف کر دے تو اس کا تاوان واجب الادا نہ ہوگا۔ نہ سزائے قطع سے پہلے نہ بعد میں ہاتھ کاٹنے کی سزا جو جرم سرقہ کی پاداش میں اسے ملی ہے وہ کافی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہاتھ کاٹنے کی یہ سزا جرم سرقہ کی پاداش میں ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ایک حق کی تلافی دو حقوں سے کرنا اصول کے خلاف ہے (یعنی سارق مستوجب سزائے قطع ہے تو مستوجب ادائے قرض نہ ہوگا۔ سزا پائے یا تاوان دے) چونکہ سزائے قطع مطالبہ قرض کے عوض میں ہوتی ہے اس لئے اگر سارق دوبارہ چوری کرے تو ہاتھ صرف ایک بار ہی کاٹا جائے گا۔ دوسری سزائے قطع نہ ہوگی کیونکہ سزا کا موجب ایک ہی شے یعنی چوری ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ تاوان واجب ہو جائے تو سزائے قطع کی نفی ہو جاتی ہے کیونکہ مجرم ادائے تاوان کے بعد اسی وقت سے اس مال کا مالک متصور ہوتا ہے جب اسے ہتھیا یا تھا۔ پس ظاہر ہے کہ اس کا قبضہ اپنی ہی مملوکہ شے پر ہے اور اپنی ہی مملوکہ شے کے عوض سزائے قطع نہیں ہو سکتی۔ پس در آنحالیکہ سزائے قطع مل چکی ہے جس سے بچانے والی شے تاوان کی ادائیگی تھی اور وہ عمل میں نہیں آئی تو اب ادائیگی تاوان سے وہ بچ جائے گا۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر (اپنے مقروض کا مال) چوری کرنے والے کو تاوان کا ادا کرنا آسان ہے تو سزائے قطع بھی ہوگی اور ادائے تاوان بھی۔ ہاں اگر دشوار ہو جیسا کہ اس کے ارتکاب جرم کے لئے فاقہ کشی اور تنگدستی کا عذر ہو سکتا ہے تو تاوان واجب نہ ہوگا صرف سزائے قطع ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کسی پر اس کے مقدور سے زیادہ ذمہ داری عائد نہیں کرتا۔

شافعیہ رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ چوری کرنے والے پر بہر حال سزائے قطع و ادائیگی تاوان دونوں امور لازم ہیں۔ صاحب مقدور ہو یا نہ ہو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ”علی الیثم اخذت حتی توء دیہ“ (یعنی لینے والے نے جو کچھ لیا ہے وہ اس کے ذمہ رہے گا تا آنکہ ادا نہ کر دے) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل“ (یعنی تم ایک دوسرے کا مال ناروا طریقہ سے لے کر مت کھاؤ) نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”لا یحل مال امرئ مسلم الا بطیبۃ من نفسه“ (یعنی کسی مسلمان کا مال اس کی مرضی کے بغیر کام میں لانا حلال نہیں ہے)۔ پھر یہ بھی ہے کہ چوری کرنے پر اللہ کی سزا بھی عائد ہوتی ہے اور انسان کا حق بھی لہذا اسے دونوں تقاضے پورے کرنے ہیں۔

یہ حکم اس لئے بھی ہے کہ تمام علماء اس پر متفق ہیں کہ مال مسروقہ اگر بعینہ دستیاب ہو جائے تو اس کے مالک کو واپس کر دیا جائے گا۔ پس اگر دستیاب نہ ہو تو اس کا تاوان دوسرے تمام واجب الادا مالی معاملات کی طرح سارق کے ذمہ ہوگا۔ یہ اس لئے بھی ہے کہ مجرم نے دوسرے شخص کے مملوکہ مال کو ناجائز طور پر تلف کیا۔ لہذا وہ مال مغصوبہ کے تاوان کا ذمہ دار ہے۔ غرض دونوں حقوق (حق اللہ اور حق العباد) کے پورا کئے جانے میں کوئی امر مانع نہیں ہے کیونکہ ان دونوں کے جائز ہونے کے دو مختلف اسباب ہیں۔ ایک سبب اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ یہ جرم خصوصیت کے ساتھ امر ممنوع کا ارتکاب ہے اور دوسرا انسان کا حق (چھیننا) ہے۔ پس نافرمانی حق تعالیٰ میں تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا اور بندے کا حق پورا کرنے کے لئے تاوان ادا کرے گا۔ اس مسئلہ کی صورت ایسی ہی ہے جیسے ایک شخص کسی کے مملوکہ شکار (کے جانور) کو حرم کے اندر ہلاک کر دے۔ اس صورت میں اللہ کے حق (کا تقاضا پورا کرنے کے لئے) اس جانور کا عوض لایا جائے اور بندے کا حق ادا کرنے کے لئے تاوان دینا ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی ذمی (غیر مسلم رعایا) کی شراب پی جائے تو حکم الہی کی تکمیل کیلئے اسے سزائے تازیانہ دی جائے گی اور ذمی کا حق پورا کرنے کے لئے اس کی قیمت ادا کرنی پڑے گی اور آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم سے لٹکی ہوئی (شاخ میں لگی ہوئی) کھجوروں کی (چوری کی) بابت دریافت کیا گیا تو حضور نے فرمایا ”من اصاب بغیہ من ذی حاجتہ غیر متخذ خبئۃ فلا شیء علیہ“ ومن خرج بشیء منه فعلیہ الغرامتہ والعقوبتہ“ (یعنی اگر کوئی حاجت مند پھلوں تک پہنچ کر کچھ لے لے لیکن دامن میں نہ بھرے تو اس سے کوئی باز پرس نہ ہوگی۔ البتہ اگر ان پھلوں کو لے کر چلا جائے تو ادا ایگی تاوان کا ذمہ دار اور مستوجب سزا ہوگا)۔

گھر کے اندر (اجنبی شخص کے) داخل ہونے کا بیان

حنفیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے دیکھا کہ اس کے گھر میں کوئی داخل ہو گیا ہے پھر اسے قتل کر دیا اور کہنے لگا کہ چور ہے جو میرا مال چرانے کے لئے گھر میں داخل ہوا۔ اگر اسے قتل نہ کر دیتا تو اس سے مال مسروقہ کا واپس لینا میرے بس میں نہ ہوتا۔ اس صورت میں یہ دیکھنا ہوگا کہ اگر مقتول مشہور فسادی اور چور ہے۔ تب تو اس کا خون بہا واجب الادا نہ ہوگا۔ البتہ تاوان ادا کرنا ہوگا، لیکن اگر وہ شخص چور اور فسادی مشہور نہ تھا تو قاتل کو خون بہا دینا ہوگا اور اس کا دعویٰ بغیر شہادت کے تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ قاتل پر قصاص واجب ہے بجز اس کے کہ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں گواہی پیش کرے۔ (نفاذ سزا کے لئے) مقتول کی حالت یا اس کے کردار کو نہیں دیکھا جائے گا۔ اس حکم کا مقصد یہ ہے کہ اس طرح برائی کا سد باب کیا جاسکے ورنہ ضعیف الایمان اشخاص کو اتلاف جان کیلئے سزا سے بچنے کا ایک ذریعہ ہاتھ آجائے گا۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کسی کو کچھ کام کے بہانے یا ضیافت کی غرض سے اپنے گھر میں بلاتا ہے اور دل میں کینہ رکھنے کے باعث اس کے ساتھ ظلم و جبر کرتا ہے اور پھر اس کے خلاف الزام لگا دیتا ہے کہ وہ شخص گھر میں چوری کرنے کی غرض سے آیا تھا اس لئے اسے قتل کر دیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی مسلمان کو قتل کر دینا سب گناہوں سے بڑا گناہ ہے پس ضروری ہے کہ ایسے تمام اسباب کا سد باب کر دیا جائے جو کسی کی جان لینے کا سبب ہوں۔

سزائے قطع پر عمل درآمد ہونے سے پہلے سارق کا مال مسروقہ پر ملکیت حاصل ہو جانے کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر حاکم نے کسی شخص کے خلاف جرم سرقت کی پاداش میں ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا۔ اس کے بعد مال مسروقہ کے مالک نے وہ مال سارق کو عطا کر دیا اور اس کے حوالے کر دیا یا اس کے ہاتھ فروخت کر دیا یا وہ مال ورثہ میں یا کسی اور طرح سے سارق کی ملکیت میں آ گیا تو اب اسے سزائے قطع نہ ہوگی اور ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ نفاذ حدود کے بارے میں کوئی فیصلہ اس وقت لاگو ہوتا ہے جبکہ سزا پر عمل درآمد ہو جائے۔ سزا پر عمل درآمد ہونے سے پہلے (جرم کی) وہی صورت حال ہوگی جو فیصلہ سے پہلے تھی۔ چنانچہ اگر ہاتھ کاٹے جانے سے پہلے چوری کرنے والا مال مسروقہ کا مالک ہو جائے تو اس کی سزائے قطع منسوخ ہو جائے گی اس پر سب کا اتفاق ہے۔ یہی حکم فیصلہ سزا پر عمل درآمد ہونے سے پہلے بھی عائد ہوگا۔ پھر یہ بھی ہے کہ قوی فیصلہ کی غرض مستحق کا حق بتا دینا ہے۔ اس معاملہ میں اللہ عزوجل کو ہی حق ہے (کہ وہ سزا دے) اور یہ حق غالب ہے اس کے لئے (حاکم کے) قوی فیصلہ کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ لہذا اسے لفظاً صادر کرنے کی حاجت نہیں ہے اور جب تک اس فیصلہ پر عمل درآمد نہ ہو اس کا وجوب ساقط نہیں ہوتا (یعنی بدستور واجب رہتا ہے) لیکن اس وجوب کے لئے دعوے کا برقرار رہنا شرط ہے اور دعوے کا قائم رہنا جس طرح فیصلہ کے وقت ضروری

ہے اسی طرح فیصلہ پر عمل درآمد کے وقت بھی ضروری ہے۔ اب در آنحالیکہ مال مسروقہ سارق کو ہبہ یا بیع کر دیا گیا تو دعویٰ باقی نہ رہا۔

شافعیہ حنابلہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں (بہر حال) ہاتھ کاٹنے کی سزا واجب ہوگی کیونکہ سرقہ کا ارتکاب کرنے کے بعد بہر صورت یہ جرم سارق پر عائد ہو جاتا ہے اور جب یہ حاکم کے نزدیک پایہ ثبوت کو پہنچ جائے اور وہ ہاتھ کاٹنے کا حکم صادر کر دے تو اس سرقہ کے جرم ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ البتہ اگر بعد میں ثابت ہو کہ وہ شخص پہلے سے اس مال (مسروقہ) کا مالک تھا تو یہ ملکیت تسلیم کر لی جائے گی جبکہ چرانے کے وقت رہی ہو۔ یہاں یہ صورت نہیں ہے۔ پس اس جرم میں کوئی شبہ نہ رہا اور ہاتھ کاٹا جائے گا۔ پھر وہ حدیث جو صفوان سے مروی ہے اس طرح صحت ملکیت کو تسلیم کئے جانے کے منافی ہے۔ انہوں نے (ایک سارق کے بارے میں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ یا رسول اللہ (سرقہ کا الزام تو) اس شخص پر وارد نہیں ہوتا کیونکہ میں نے اپنی چادر (مسروقہ) اسے صدقہ میں دے دی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”فهل قبل ان تائسی به؟“ بروایت ابو داؤد و ابن ماجہ (یعنی کیا میرے پاس لانے سے پہلے) نسائی کی روایت میں یہ الفاظ مزید آئے ہیں۔ فقطعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سزائے قطع دی)۔ بخلاف اس کے اگر وہ چوری حاکم کا فیصلہ ہونے کے بعد قرار پائے تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شخص پہلے ہی اس مال کا مالک تھا لہذا سزائے قطع نہ ہوگی۔

سزائے قطع سے پہلے مال مسروقہ کی مالیت کم ہو جانے کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ بخیاں غالب اگر سزائے قطع کا حکم ہونے کے بعد تعمیل سے پہلے مال مسروقہ کی قیمت دس درہم (نصاب سرقہ) سے کم ہو جائے تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ کیونکہ نصاب سرقہ کے پورا ہونے کی شرط کا پایا جانا صدور حکم اور اس پر عمل درآمد ہونے کے وقت بھی ضروری ہے کیونکہ حکم پر عمل درآمد حکم کا ایک حصہ ہے اور اگر مالیت کم ہو جائے تو یہ شرط باقی نہیں رہتی۔ بخلاف اس کے اگر سزائے قطع سے پہلے مال مسروقہ کم ہو جائے (تو یہ حکم عائد نہ ہوگا) کیونکہ جس قدر مال ضائع ہوا ہے سارق اس کے تادان کا ذمہ دار ہے۔ پس ہاتھ کاٹنے کے وقت گویا پورا نصاب مال مسروقہ موجود ہے جس کے منجملہ کچھ تو فرض (واجب الوصول) کی صورت میں ہے اور کچھ اپنی اصلی حالت میں۔ تاہم مال مسروقہ کا نرخ کم ہو جانے کی صورت میں یہ حکم عائد نہ ہوگا کیونکہ سارق اس کی مالیت کا ذمہ دار نہیں ہے۔ نرخ کی کمی مانگ کم ہو جانے کے باعث ہوتی ہے اور یہ مانگ ایسی شے ہے جس کا ذمہ دار کسی کو نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ پس جبکہ مال مسروقہ (بمقدار نصاب) نہ حقیقی معنوں میں باقی ہے اور نہ اعتباری معنوں میں لہذا ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ ہوگی۔ حدیث میں تو ہے ”اقطعوا فی ربع دینار ولا تقطعوا فیما هو ادنی من ذلك“ یعنی مال مسروقہ کی مالیت چوتھائی دینار ہو تو ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جائے اس سے کم میں نہ دی جائے۔

شافعیہ مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر مال مسروقہ کی مالیت حکم قطع صادر ہونے کے بعد نصاب کی مقدار سے کم ہو جائے تب بھی سزائے قطع واجب ہے جیسا کہ اصل مال کے کم ہو جانے کی صورت میں ہوتا ہے۔ یعنی اگر اصل مال مسروقہ سزا پر عمل درآمد کے وقت گھٹ گیا اور اس کی مالیت دس درہم سے کم رہ گئی تو بالاتفاق سزائے قطع ہوگی۔ اسی طرح

اگر اس مال کی قیمت سزا پر عمل درآمد کے وقت کم ہو جائے تو سزائے قطع (بدستور) واجب رہے گی واللہ اعلم۔

دین سے بیگانہ اشخاص کے اعتراضوں کا بیان

واضح ہو کہ سزائے سرقہ کے بارے میں کچھ بے دینوں نے شکوک ظاہر کئے ہیں اور احکام قرآن پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر چوری کی یہ سزا نافذ ہو جائے تو نصف معاشرہ کی صورت بگڑ کر رہ جائے گی اور بنی نوع انسان کی ایک بڑی تعداد ناکارہ ہو کر رہ جائے گی۔ چنانچہ ایسے اشخاص کی ایک بڑی تعداد ہے جن کے اعضاء جرم سرقہ کی سزا میں کاٹ دیئے گئے ہیں۔ اس اعتراض کا آسان جواب یہ ہے کہ ان اشخاص سے کہا جائے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور عہد خلفائے راشدین میں جو امن و عافیت کا عالم تھا اس کو دیکھو۔ وہ کیسی خوش بختی تھی جبکہ احکام شرعیہ کا نفاذ بڑی پابندی کے ساتھ کچھ نظر انداز کئے بغیر کیا جاتا تھا پھر اس کیفیت کو ہمارے موجودہ معاشرے سے موازنہ کرو کہ ہر جگہ مال کی فراوانی اور تہذیب و تمدن کا چرچا ہے لیکن امن و عافیت مفقود ہے اور لوگ اپنے مال و جان کی طرف سے غیر مطمئن ہیں۔ ہر جگہ خرابی ہی خرابی ہے اور فرد جماعت اور حکام پوشیدہ اور کھلم کھلا چوری کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ لیسے رات کو اور دن دھاڑے بھی لوگوں پر حملہ کرتے ہیں۔ یہی حال اقامت گاہوں، موٹروں اور گاڑیوں میں بھی ہے اور یہ سب نتیجہ ہے تعزیرات اسلامی کے نافذ نہ کرنے اور شریعت غزاکہ احکام کو پس پشت ڈال دینے کا۔ غرض سرقہ کی سزائے شرعی ہی موجودہ عہد کی بے راہروی کا واحد علاج ہے۔

بعض اشخاص نے احکام شریعت (کی حکمت) سے ناواقف ہونے کی بناء پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر کسی کے ہاتھ کو ضرر پہنچایا جائے تو اس کی دیت (رقم قصاص) خالص سونے کے پانچ سو (۵۰۰) دینار رکھی گئی ہے تو صرف تین درہم کے عوض جو نہایت معمولی سی رقم ہے (چور کا) ہاتھ کیوں کاٹ دیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاعر ابوالعلاء المعری جب بغداد میں آیا تو ایک چوتھائی دینار کی چوری میں ہاتھ کاٹے جانے کی جو سزا فقہاء نے رکھی ہے اس پر اس نے اعتراض کیا۔ چنانچہ اس کا یہ شعر اس کی جہالت اور کوتاہی عقل کا ثبوت ہے۔

یَدِ بَخْمَسِ مَنِّینِ عَسَجَدُ وَ دِیتِ

مَآبِ الْهَاقِطَعَتِ فِی رِبْعِ دِینَارِ

تَنَاقُضِ حَالِنَا اِلَّا السَّکُوتُ لَہِ

وَ اِنْ نَعُوذُ بِمَوْلَانَا مِنَ النَّارِ

مفہوم شعریہ ہے:

دیت میں ہاتھ کی قیمت ہے پانچ سو دینار

وہ سہ درہم کے عوض کاٹ دیتے ہیں یکبار

بجز سکوت کے دم نار ہم نہیں سکتے

اِنَّا عُوذُ بِمَوْلَانِیْ مِنْ عَذَابِ النَّارِ

جب اس کے اس کلام کا چرچا ہوا اور فقہاء نے اسے طلب کیا تو وہ فرار ہو گیا اس کا جواب قاضی عبدالوہاب مالکی نے یہ دیا کہ ”ہاتھ جب تک امین ہے (یعنی لوگ اس کے شر سے محفوظ ہیں) قابل قدر ہے اور جب خیانت کرے (یعنی

موجب تعدی ہو) تو بے قدر ہے“ (یعنی قابل قطع ہے) بعض اصحاب نے یہ جواب دیا ہے کہ یہ حکم شریعت عظمیٰ کی خوبیوں میں سے اور کامل حکمت و مصلحت پر مبنی ہے۔ جرم کے لحاظ سے تو یہی مناسب ہے کہ ہاتھ کی دیت پانچ سو (۵۰۰) دینار سرخ رکھی جائے تاکہ انسان کی بزرگی اس کے رتبہ عظیم اور اس کے احترام کے پیش نظر کوئی شخص اسے ضرر پہنچانے کی جرات نہ کرے۔ اور جرم سرقہ کے پیش نظر یہی مناسب تھا کہ ایک چوتھائی دینار کی چوری ہی پر اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے تاکہ کوئی شخص پر ایسا مال چرانے کی جرات نہ کرے۔ پس اہل عقل و فہم کے نزدیک یہ حکم عین حکمت پر مبنی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”جزاء بما کسبا نکالاً من اللہ واللہ عزیز حکیم“ (یعنی یہ سزا اس شخص کے اپنے کرتوت کی سزا ہے اور اللہ کی طرف سے اسے سخت سزائیں کا حکم ہے اس کی ہستی عظیم ہے اور وہ حکمت والا ہے) یعنی سزا کا یہ حکم پر ایسا مال چرانے کی مذموم حرکت کی پاداش میں ہے۔ مناسب یہی ہے کہ جس عضو سے اس نے اپنے اس کام میں مدد لی ہے اسے کاٹ دیا جائے۔ اور ”نکالاً من اللہ“ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس فعل مذموم کی عبرتناک سزا کا حکم دیا ہے جس کی طرف صرف بدسرشت اشخاص ہی مائل ہوتے ہیں جنہوں نے اپنے دین کو اپنے نفس کے تابع بنا لیا ہے اور یہ بھولے ہوئے ہیں کہ دین کا محافظ اللہ ہے۔ انہوں نے دنیا کے عوض اپنی آخرت کو فروخت کر دیا ہے اور بے دھڑک اور بے تامل اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کیا اور ناحق پر ایسا مال کھانے کی جرات کی۔ لہذا (اللہ تعالیٰ کی) حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ احکام شریعہ (کے نفاذ) میں ایسے اشخاص کے کردار کو پیش نظر رکھا جائے تاکہ انسان ہلاک ہونے سے بچے اور ارتکاب جرائم سے باز آجائے۔ ”واللہ عزیز“ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کو برائی کا انتقام لینے کی پوری قدرت حاصل ہے۔ اس سے کوئی جیت نہیں سکتا۔ بلکہ وہی جبر و تعدی کرنے والوں کو نیچا دکھاتا ہے۔ اور ”حکیم“ سے مراد یہ ہے کہ اس کے تمام احکام اور حد بندیاں اس کے بتائے ہوئے طریق کار اور پیمانہ حکمت پر مبنی ہیں۔ وہ اپنے بندوں پر جو حکم شرعی نازل فرماتا ہے اس میں ان کی بہتری ہوتی ہے۔ ان کے مال و جان کا تحفظ ہوتا ہے اور زندگی میں خوش بختی کا سبب بنتا ہے اور معاشرہ فساد یوں اور تلف کاروں سے پاک ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مال کو اس لئے پیدا فرمایا ہے کہ تمام خلق خدا اس سے فائدہ اٹھائے اور سب سے مقدم حکمت عملی اس کے بارے میں یہ ہے کہ مال کا مالک صرف وہی شخص ہے جو شریعت کی رو سے مالک ہوا ہو۔ اس کے ساتھ طمع وابستہ ہوتی ہے اور لوگ اس کے حصول کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ کم لوگ ایسے ہیں جو انسانیت اور دیانت کے پیش نظر اس سے الگ رہتے ہیں۔ زیادہ تر اسے محفوظ مقام اور نگہداشت ہی کے ذریعہ لوگوں سے بچایا جاسکتا ہے اور جب مالک اسے بچار کر رکھتا ہے تو دونوں باتیں (دیانت اور نگہداشت) انسانی حد امکان تک پوری ہو جاتی ہیں۔ اب اگر ان دونوں کے خلاف کیا جائے (یعنی دیانت اور حفاظت کے خیال کو بالائے طاق رکھ دیا جائے) تو جرم واضح اور سخت سزا کا مستوجب ہوگا اور اگر دونوں میں سے ایک امر یعنی ملکیت میں مداخلت کی جائے تو تاوان و تادیب واجب ہے۔ تاکہ ایسے ظالموں کو اس حرکت سے باز رکھا جائے جنہیں اللہ اور آخرت کا خوف نہیں ہے۔ پس چوری کرنے اور خیانت کرنے والے پر اللہ کی لعنت ہو جو نہایت قیمتی ہاتھ کو نہایت معمولی شے کے لئے ضائع کرتا ہے۔

فقہاء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت (سرقہ) میں چوری کرنے والے مرد کا ذکر چوری کرنے والی عورت پر مقدم فرمایا ہے۔ (اس کے برعکس) زنا والی آیت میں پہلے بدکار عورت کا ذکر ہے اور پھر بدکار مرد کا کیونکہ مال کی محبت مردوں کے دلوں میں عورتوں کے دلوں کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے لہذا سزائے سرقہ کے بیان میں پہلے مرد کا ذکر آیا اور

چونکہ عورتوں میں لذات نفس سے بہر اندوزی کی خواہش مردوں سے زیادہ ہوتی ہے اس لئے سزائے بدکاری کے بیان میں عورت کا ذکر پہلے فرمایا، واللہ اعلم۔

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے چوری کرنے کی سزا جو ہاتھ کاٹنا فرمایا وہ اس لئے ہے کہ وہ مال مسروقہ کو ہاتھ سے اٹھاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں بدکاری کی سزا عضو مخصوص کا کاٹ دینا نہیں ہے۔ حالانکہ بدکاری کا ذریعہ وہی ہے اس میں تین باتیں پیش نظر تھیں ایک تو یہ کہ چوری کرنے والے کے پاس ایک اور ہاتھ اسی طرح کا ہے۔ اگر ایک سے محروم ہو گیا تو اس کے عوض دوسرا ہاتھ موجود ہے جس سے وہ اپنا کام چلا سکتا ہے۔ لیکن بدکاری کرنے والے کے پاس عضو مخصوص کا بدل کوئی دوسرا عضو ایسا نہیں ہے اب اگر اسے کاٹ دیا جائے کہ آئندہ گناہ سے باز رہے تو (عبث ہے کیونکہ کوئی) اور دوسرا عضو ایسا نہیں ہے جس سے یہ کام لیا جاسکے۔ دوسرے یہ کہ نفاذ حد جہاں خود سزا پانے والے کے لئے موجب تنبیہ ہے وہاں دوسروں کے لئے بھی (عبرت کا سبب) ہے۔ ظاہر ہے کہ جب لوگ چوری کی پاداش میں کسی کا ہاتھ کٹا ہوا دیکھیں گے تو عبرت پکڑیں گے لیکن بدکاری کی پاداش میں اگر عضو مخصوص کاٹ دیا جائے تو بوجہ ستر ہونے کے کوئی شخص اسے دیکھ کر عبرت نہیں پکڑ سکتا۔ تیسرے یہ کہ عضو مخصوص کے کاٹنے سے سلسلہ نسل منقطع ہو جاتا ہے۔ ہاتھ کاٹنے میں ایسی کوئی بات نہیں ہے پھر اس آیت کے بعد ہی اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے ”الم تعلم ان اللہ له ملک السموات والارض یعذب من یشاء و یغفر لمن یشاء واللہ علی کل شیء قذیر“ (یعنی کیا یہ تمہیں معلوم نہیں؟ کہ وہ اللہ ہی ہے جو آسمان وزمین کا مالک ہے جسے چاہے عذاب میں ڈال دے اور جسے چاہے معاف کر دے اسے ہر شے پر قدرت حاصل ہے)۔ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسروں کو بھی خطاب فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے مابین کوئی قرابت داری نہیں ہے جس کی رو رعایت ضروری ہو۔ پس ہر وہ شخص جو مستوجب حد ہوگا اس پر حد شرعی نافذ ہوگی۔ جس کا حق اللہ تعالیٰ کو ہے کہ جس طرح چاہے حکم دے اور جو چاہے کرے کیونکہ وہی ملک کا مالک ہے اپنے فیصلہ پر جو مبنی بر عدل ہوتا ہے جسے چاہے عذاب دے اور اپنے لطف و کرم سے جسے چاہے معاف کر دے کہ اسے ہر امر کا اختیار ہے واللہ اعلم۔

سارق کی توبہ کا بیان

ہر چہار ائمہ فقہ اس امر پر متفق ہیں کہ اگر چوری کرنے والا نیک نیتی سے توبہ کر لے اور اس کی نیک نیتی کا ثبوت واضح ہو۔ وہ اس بات پر نادم ہو جو اس سے سرزد ہوئی اور یہ پختہ عزم کر لے کہ آئندہ سرقہ کا مرتکب نہ ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لے گا۔ چنانچہ سرقہ کے بارے میں جو آیت ہے اس کے آگے ہی دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

فمن تاب من بعد ظلمه و اصلح فان اللہ یتوب علیہ ان اللہ غفور رحیم

(یعنی جو شخص اس لالچ جرم کے بعد توبہ کر لے اور نیکی اختیار کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائے گا بلا شبہ اللہ تعالیٰ مغفرت کرنے اور رحم کرنے والا ہے)۔ پس اللہ تعالیٰ اس کے گناہ سے درگزر فرمائے گا اور اس کی خطا کو معاف کر دے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ حضور نے فرمایا ”التوبة تعجب ما قبلها“ (یعنی توبہ سرزد شدہ گناہ کو کاٹ دیتی ہے)۔ نیز حضور نے فرمایا ”التائب من الذنب کمن لا ذنب له“ (یعنی گناہ سے توبہ کر لینے والا ایسا ہے

جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہ تھا)۔ اور جسے دنیا میں حد (سزائے شرعی) ملی ہو تو یہ سزا اس کے گناہ کا کفارہ ہے اور قیامت کے دن اس پر عذاب نہ ہوگا۔ بشرطیکہ وہ شخص سزائے شرعی بھگتے پر آمادہ ہو اور اسے قبول کر کے اللہ تعالیٰ کی جناب میں توبہ کر لے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ”اللّٰہ اعدل ان یشی علی عبده العقوبة فی الاخرة“ (یعنی اللہ تعالیٰ کا انصاف اس سے بالاتر ہے کہ آخرت میں اپنے بندے پر دوبارہ عذاب کرے) تاہم توبہ کر لینے سے سزائے قطع ساقط نہ ہوگی اور نہ تقاضائے عدل کے خلاف کیا جائے گا۔ خواہ ثابت شدہ سرقہ کے بعد توبہ کرنے اور فیصلہ ہونے کے درمیان طویل مدت گزر گئی ہو۔ کیونکہ جب معاملہ حاکم کے روبرو پیش ہو جائے تو پھر سزائے قطع کا حکم ساقط ہونے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ جیسا کہ ابو داؤد کی اس روایت سے ثابت ہے جو صفوان بن امیہ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں مسجد میں اپنی ایک خمیصہ (غالباً چادر) پر سو رہا تھا جس کی قیمت تیس درہم تھی۔ ایک شخص آیا اور مجھے جل دے کرو وہ خمیصہ لے گیا اس کے بعد وہ اس شخص کو پکڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور لائے آپ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا کہ حضور نے صرف تیس درہم کی خاطر اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا۔ میں نے تو اس شخص کے ہاتھ اسے فروخت کر دیا اور اس کی قیمت ادھار کر لی ہے آپ نے فرمایا ”فہلا کان هذا قبل ان تاتى به؟“ (یعنی اس شخص کو میرے پاس لانے سے پہلے ہی تم نے ایسا کیوں نہ کیا؟) غرض معاملہ اگر حاکم کے سامنے نہیں لایا گیا تو معاف کرنے سفارش کرنے اور وہ مال سارق کو بخش دینے سے سزائے قطع ٹل جاتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ چوری کرنے والا بد قماش مشہور نہ ہو۔ بصورت دیگر اس کے بارے میں کوئی سفارش قبول نہیں کی جائے گی۔ تا آنکہ جرائم کے ارتکاب سے باز نہ آجائے۔ توبہ کے (موثر ہونے) کی شرط یہ ہے کہ نیک نیتی اور پختہ عزم کے ساتھ نیز تمام دنیوی اغراض سے قطع نظر کر کے توبہ کی ہو یہاں تک کہ اہل جرم سفارش پر بھروسہ کرنا چھوڑ کر ارتکاب سرقہ سے باز رہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”فمن تاب من بعد ظلمه واصلاح“ (یعنی جو شخص ظلم کرنے (یعنی ارتکاب جرم) کے بعد بھی توبہ کر لے اور نیک بن جائے) تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لے گا۔ پھر وہ جانے اور اس کا خدا اور پرایا مال جو اس نے چرایا وہ اس مال کے مالکوں کو واپس کر دیا جائے گا۔ جیسا کہ جمہور علماء کا ارشاد ہے۔

واضح ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایسے واقعات پیش آئے اور مرتکبین جرم نے خلوص دل سے توبہ کی چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک سارق کو پیش کیا گیا جس نے چادر چرائی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ میں یہ خیال نہیں کرتا کہ اس (جیسے نیک نفس انسان) نے چوری کی ہو۔ لیکن اس شخص نے خود کہا کہ یا رسول اللہ ہاں میں نے یہ (جرم) کیا ہے حضور نے فرمایا کہ ”اذھبوا بہ فاقطعوه“ تم اجسموہ“ (یعنی اسے لے جاؤ۔ اس کا ہاتھ کاٹو پھر اس کو داغ دو اس کے بعد میرے پاس لاؤ) لہذا اس کا ہاتھ کاٹا گیا اور اسے خدمت اقدس میں لایا گیا۔ آپ نے فرمایا ”تب الى اللہ“ (یعنی اللہ کے حضور توبہ کر) اس نے کہا کہ میں اللہ کے حضور توبہ کرتا ہوں۔ فرمایا ”تاب اللہ علیک“ (یعنی اللہ تیری توبہ قبول فرمائے) صحیح ابن ماجہ میں ابوہریرہ کی یہ حدیث مروی ہے جنہوں نے یزید بن ابی حبیب سے انہوں نے عبدالرحمن بن ثعلبہ انصاری سے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے عمر بن سمرہ بن حبیب بن عبد شمس سے روایت کی ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ میں نے فلاں قبیلے کا ایک اونٹ چرایا ہے حضور مجھے (اس گناہ سے) پاک فرمادیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے (تحقیق حال کے لئے) وہاں آدمی کو بھیجا۔ اہل قبیلہ نے بتایا کہ واقعی ان کا ایک اونٹ گم ہو گیا ہے۔ پس حضور نے حکم دیا اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ”الحمد لله الذی طهرنی منکم“ اردت ان تدخلی (جسدی النار) ”یعنی اللہ کا شکر ہے جس نے آپ کی بدولت مجھے گناہ سے پاک کیا“ میں نے تو سمجھا تھا کہ آپ مجھے یعنی میرے جسم کو آگ میں جھونک دیں گے۔ یہ ہے ’توبہ نصوح‘ (یعنی خالص توبہ) ابن جریر کہتے ہیں کہ ابو کریم نے اس حدیث کو بیان کیا انہوں نے موسیٰ بن داؤد سے انہوں نے ابن لہیعہ سے انہوں نے یحییٰ ابن عبد اللہ سے انہوں نے ابو عبد الرحمن حبلی سے اور انہوں نے عبد اللہ بن عمرو سے وہ کہتے ہیں کہ ایک عورت نے کوئی زیور چرا لیا۔ وہ لوگ جن کی چوری ہوئی تھی آئے اور انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ اس عورت نے ہماری چوری کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دے دیا ”اقطعوا یدھا الیمنی“ (یعنی اس عورت کا دایا ہاتھ کاٹ دو) پھر وہ عورت آئی اور کہا کیا اس گناہ کی توبہ ہو سکتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”انت الیوم من خطیبتک کیوم ولدتک امک“ (یعنی آج تیری خطا کی حیثیت ایسی ہے جیسے اس روز تھی جس دن تیری ماں نے تجھے جنا) راوی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت یہ آیت نازل فرمائی ”فمن تاب من بعد ظلمه واصلح فان الله يتوب علیه“ ان الله غفور رحیم“ (یعنی جرم کرنے کے بعد جس نے توبہ کر لی اور ٹکوار ہو گیا تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائے گا۔ بلاشبہ اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے)۔

امام احمد نے اس روایت کو زیادہ مبسوط طریقہ سے بیان فرمایا ہے: وہ کہتے ہیں کہ ابن لہیعہ نے حدیث بیان کی کہ یحییٰ بن عبد اللہ نے عبد الرحمن حبلی سے انہوں نے عبد اللہ بن عمر سے روایت کی ہے کہ ایک عورت نے عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں چوری کی۔ جن کی چوری کی تھی وہ اسے لے کر آئے اور کہنے لگے یا رسول اللہ اس عورت نے ہماری چوری کی ہے۔ اس عورت کے ہم قوم اشخاص نے کہا کہ ہم اس کا فدیہ ادا کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ”اقطعوا یدھا“ (یعنی اس کا ہاتھ کاٹ دو) ان لوگوں نے پھر کہا ہم پانچ سو (۵۰۰) دینار فدیہ دیتے ہیں لیکن حضور نے پھر فرمایا ”اقطعوا یدھا“ (یعنی اس کا ہاتھ کاٹ دو) چنانچہ اس کا دایا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ اس کے بعد اس عورت نے کہا یا رسول اللہ کیا اس گناہ سے توبہ کرنے کی میرے لئے گنجائش ہے۔ فرمایا ”نعم انت الیوم من خطیبتک کیوم ولدتک امک“ (یعنی ہاں آج تیری خطا کی حیثیت ایسی ہے جیسے اس روز تھی جبکہ تیری ماں نے تجھے پیدا کیا یہ وہی وقت تھا جبکہ اللہ تعالیٰ نے سورہء مائدہ کی یہ آیت نازل فرمائی ”فمن تاب من بعد ظلمه واصلح فان الله يتوب علیه“ ان الله غفور رحیم“ (یعنی جس شخص نے گناہ کے بعد توبہ کر لی اور نیکی اختیار کی تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائے گا۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے)۔ یہ عورت جس نے چوری کی تھی وہ قبیلہ بنی مخزوم کی تھی اور یہ حدیث صحیحین سے ثابت ہے جیسا کہ باب کے آغاز میں آچکا ہے۔

حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس عورت کے بارے میں فرمایا ہے کہ اس نے توبہ کر لی اور پھر اس توبہ کو خوب نبھایا پھر اس کی شادی ہو گئی حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اس کے بعد وہ میرے پاس آتی رہتی تھی اور میں اس کے مسائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتی تھی۔ اس کا نام سچی توبہ ہے یعنی توبہء نصوح ہے جو اسے اپنے کئے پر شرمندہ کرتا رہتا ہے اور حکم الہی سے سرتابی جو اس سے سرزد ہوتی ہے اس پر متاسف رہتا اور گناہ سے بچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

قذف کی حد (یعنی سزائے شرعی) کی تعریف

”حد“ اصطلاح شریعت میں اس سزا کو کہتے ہیں جو حق اللہ کے طور پر مقرر کی گئی ہو (یعنی خدا کی مقرر کردہ سزائے گناہ) جیسے بدکاری کی سزایا پھر حد وہ سزا ہے جو انسان کی حق تلفی (یا ایذا دہی) کی پاداش میں دی جائے۔ جیسے تہمت لگانے کی سزا۔ شریعت کی مقرر کردہ ان سزاؤں کو حد یا قدر (مقررہ سزا) کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان سزاؤں کی ایک حد یا مقدار مقرر فرمادی ہے۔ جس سے تجاوز کرنے کی اجازت کسی کو نہیں ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ“ (یعنی جس نے اللہ کی قائم کردہ حد بندیوں سے تجاوز کیا اس نے خود اپنے اوپر ظلم کیا) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ نام حد اس لئے رکھا گیا کہ لفظ حد کے لغوی معنی روکنے کے ہیں اور یہ حدود (سزائیں) کبیرہ گناہوں کے ارتکاب سے روکتی ہیں۔ تہمت لگانے پر سزا کے واجب ہونے اور کفر کا الزام لگانے پر نہ ہونے میں یہ راز ہے کہ جس پر کفر کا الزام ہو وہ توبہ کر سکتا ہے کہ کلمہ شہادتین پڑھ کر اس الزام سے بری ہو جائے بخلاف اس کے جس پر تہمت برے کام کی لگائی جائے وہ خود چاہے تو اس الزام سے بری نہیں ہو سکتا۔ اور لفظ رمی کے معنی کسی شخص پر پتھریا تیر وغیرہ کا پھینکنا ہے تاکہ دوسرے کو تکلیف یا ضرر پہنچے۔ یہ لفظ ”الزام تراشی“ کے معنوں میں استعارہ ہے۔ کسی پر عیب تھوپنا بہر حال اس کے لئے موجب اذیت و مضرت ہے۔ پس انسان کے منہ سے نکلی ہوئی بات ایسی ہی ہے جیسے ہاتھ سے چلایا ہوا تیر بلکہ:

جراحات السهام لها التثام ولا يلتام ما جرح اللسان

یعنی

سناں کا زخم ممکن ہے کہ بھر جائے

زبان کا زخم بھرتا ہی نہیں ہے

اللہ تعالیٰ نے (تہمت لگانے کو) رمی سے تعبیر فرمایا ہے چنانچہ حد قذف کی متعلقہ آیتوں میں یہ لفظ تین بار آیا ہے۔ اللہ فرماتا ہے ”والذین یرمون المحصنات“ (یعنی جو لوگ پاک دامن عورتوں پر اتہام کا تیر چلاتے ہیں)۔ اور فرمایا ”والذین یرمون ازواجہم“ (یعنی جو لوگ اپنی بیویوں کو تہمت کے تیر کا نشانہ بناتے ہیں) نیز ارشاد ہے ”والذین یرمون المحصنات الغافلات المؤمنات“ (یعنی جو لوگ پاک دامن سیدھی سادی اور با ایمان عورتوں پر تہمت کا تیر پھینکتے ہیں) یہ (نبی بیان) قرآن کریم کی بلاغت (پردال) ہے۔ چنانچہ دیکھئے لفظ جب بولنے والے کے منہ سے نکل جاتا ہے تو پھر انسان کے اختیار سے باہر ہو جاتا ہے اور جب زبان چلتی ہے تو اپنے نشانہ پر پہنچ کر ضرر و اذیت پہنچائے بغیر نہیں رہتی۔ گویا وہ ایک تیر ہے جو چلایا گیا اور جس نے چلایا پھر اس کے ہاتھ نہیں آتا پس لازم ہے کہ جو شخص یہ تیر چلانا چاہے چلانے سے پہلے اس کی پیش بندی کر لے تاکہ بعد میں شرمندہ ہونا نہ پڑے، جبکہ شرمندہ ہونے سے کچھ فائدہ نہ

سزائے قذف کے قانون شرعی ہونے کی مصلحت

اللہ تعالیٰ نے سورہ نور کے آغاز میں جرم زنا کا بیان فرمایا ہے جو اتنا بڑا گناہ اور مذموم فعل ہے کہ عظیم گناہوں اور بد اعمالیوں میں بھی اتنی خرابی نہیں ہے۔ اس کا تعلق ناموس انسانی سے ہے۔ اس کا الزام لگنے سے گردنیں شرم سے جھک جاتی ہیں اور آبرو خاک میں مل جاتی ہے اور شرع شریف کے مقاصد میں یہ امر ہے کہ انسانوں کی عزت اور اہل شرف کی آبرو بچائی جائے اور انسانی عظمت و عزت نفس کا تحفظ کیا جائے لہذا حکمت الہی کا تقاضا یہ ہوا کہ ایسے قوانین شرعیہ کی تشکیل ہو جو ان سرکش طبائع کو قابو میں رکھے جو عداوت اور حسد کی بناء پر عظمت و شرف انسانی کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ حالانکہ انسان کے نزدیک تمام عزیز ترین اشیاء میں سب سے زیادہ عزیز یہی ہے۔ وہ لوگ اپنے ان کرتوتوں کو معمولی بات خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”اذ تلقونہ بالسنتکم و تقولون بافوا حکم مالیس لکم بہ علم و تحسبونہ ہیناً و هو عند اللہ عظیم“ (النور ۱۵) (یعنی تم وہی الزامات اپنی زبانوں پر لاتے اور بے سمجھے بوجھے منہ سے کہتے ہو اور اسے معمولی بات خیال کرتے ہو حالانکہ اللہ کے نزدیک بڑی (بری) بات ہے)۔

اللہ تعالیٰ نے سزائے قذف کے جو احکام نافذ فرمائے ہیں وہ اس گناہ سے باز رکھنے اور روکنے کے لئے ہیں۔ یہ احکام انسانی شرف کے محافظ اور اسی کی عظمت و عزت کی ضمانت ہیں تاکہ طبائع انسانی اس مذموم گناہ کے ارتکاب سے باز رہیں۔ تمام مسلمان دوسروں کے ساتھ حسن ظن سے کام لیں۔ بدگمانی کرنے میں جلدی نہ کریں۔ بدزبانی سے بچیں۔ ادب کا پاس کریں اور بغیر علم کے عظیم تہمتیں تراشنے سے پرہیز کریں۔ ضرر رسانی کے اعتبار سے جو تہمتیں نمایاں ہیں ان کو بتا دیا گیا ہے تاکہ پر فریب اور غلط اتہامات پریشانی اور طعن و تشنیع کا موجب نہ ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ اقسام جرائم میں سے کوئی جرم بجز جرم زبان کے ایسا نہیں ہے جس کے عظیم خطرے سے انسان غافل ہو اور جس کی طرف انسانی طبیعت بڑی آسانی سے مائل ہوتی ہو اور عجیب طرح کی گفتگو سے لذت اندوز ہوتا ہو۔ اور یہ خیال کرتا ہو کہ جس کے بارے میں یہ گفتگو ہو رہی ہے اس کو ان باتوں سے کوئی قابل ذکر نقصان نہ ہوگا۔ لوگوں کو ایسی باتیں کہنے سننے کی عادت ہو جاتی ہے۔ ان امور کے باعث انسان سہل انگار ہو جاتا ہے اور اس کو معمولی بات تصور کرنے لگتا ہے حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک گناہ عظیم ہے یہی وجہ ہے کہ شریعت نے تہمت لگانے کی سزا کو بڑی اہمیت دی ہے۔ چوری کی سزا کے بارے میں ایک آیت زنا کی حد کے بارے میں دو آیتیں نازل ہوئیں ڈاکوں کی حد بارے میں ایک آیت اور حد قذف میں دو آیتیں نازل ہوئیں۔ اس کے بعد تہمت کی ایک اور قسم ’لعان‘ کا پورا ذکر ہے جس کے متعلق پانچ آیتیں ہیں۔ اس کے پیچھے حدیث افک کا ذکر آیا اور اس کے بارے میں نو آیات اتاریں، ان تمام کے بعد چار آیات اتاریں۔ جن میں بے گناہ نادان مسلمان عورتوں پر تہمت لگانے سے منع فرمایا ہے اور (بے قصور لوگوں کی بابت یہاں تک) فرمایا کہ ”اولشک مبرؤن مما یقولون لہم مغفرة و رزق کریم“ (یعنی یہ لوگ ان باتوں سے پاک ہیں جو ان پر تھوپی جاتی ہیں ان کے لئے مغفرت اور اچھا رزق ہے) غرض اللہ تعالیٰ نے قذف کی سزا اس کے متعلقہ احکامات اس کی اقسام اس کے عذاب اور اس کے اقدام کی خرابیوں کا ذکر فرمایا ہے اس بارے میں بیس (۲۰) آیتیں سورہ نور میں آئی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے ضمن میں بہتان لگانے کے مجرموں کی متعدد سزاؤں کا ذکر فرمایا ہے ایک یہ کہ

اسی (۸۰) کوڑے مارے جائیں۔ دوسرے یہ کہ تاحین حیات ان کی گواہی تسلیم نہ کی جائے۔ تیسری یہ کہ انہیں فاسقوں، مجرموں اور گناہ کبیرہ کے مرتکبوں میں شمار کیا جائے۔ چوتھے یہ کہ وہ عند اللہ کاذب اور دروغ گو ہیں۔ پانچویں یہ کہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ ان پر لعنت ہے۔ چھٹے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے قیامت کے روز سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ساتویں یہ کہ خود ان کے اعضاء جسم ان کے خلاف کھلم کھلا گواہی دیں گے جو ان کی ذلت و رسوائی کا موجب ہوگا۔ آٹھویں یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کے کرتوت کی پوری پوری سزا دے گا اور ان کے اعمال کے مطابق آتش جہنم کے طرح طرح کے عذابوں سے جن کے وہ سزاوار ہیں دو چار کرے گا۔ اور تمام ملت اسلامیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ بہتان لگانا تمام کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑا گناہ ہے۔ بہتان تراشی کی یہ سزا کتاب و سنت اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ کتاب اللہ میں ارشاد ہے ”والذین یرمون المحصنات اللہ ثم لم یاتوا بأربعة شہداء فاجلدوہم ثمانین جلدۃ ولا تقبلوہم شہادۃ ابدًا“ (یعنی جو لوگ بے قصور عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں اور اس کے لئے چار گواہ پیش نہیں کر سکتے انہیں اسی (۸۰) کوڑے لگاؤ اور ان کی گواہی کبھی تسلیم نہ کرو اور یہ لوگ فاسق ہیں) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فاذا لم یاتوا بالشہداء فاولئک عند اللہ ہم الکاذبون“ (بہتان لگانے والے اگر چار گواہ نہ پیش کر سکیں تو اللہ کے نزدیک وہ دروغ گو یعنی جھوٹا الزام لگانے والے ہیں)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے کسی مسلمان مرد یا مسلمان عورت پر تہمت لگائی اور اس کے ثبوت میں چار گواہ پیش نہ کر سکا تو اسے دروغ گو (یعنی جھوٹی تہمت لگانے والے) کی سزا ہوگی۔ پھر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”ان الذین یرمون المحصنات الغافلات المؤمنات لعنوا فی الدنیا والاخرۃ ولہم عذاب عظیم یوم تشہد علیہم السنتہم وایدہم وارجلہم بما کانوا یعملون“ یومئذ یوفیہم اللہ دینہم الحق“ و یعلمون ان اللہ هو الحق المبین“ (النور: ۲۳-۲۵) (یعنی جو لوگ بے گناہ بے خبر ایمان دار عورتوں پر بہتان لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت اور سخت عذاب ہے۔ اور اس روز ان کی زبان ان کے ہاتھ اور پاؤں ان کے خلاف ان باتوں کی گواہی دیں گے جو وہ کرتے رہے ہیں اور اس روز اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کی ٹھیک ٹھیک جزا دے گا اور تب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ ہی امر حق بیان کرنے والا ہے)۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں گناہ قذف کی قباحت اور اس کی شدت بیان فرمائی ہے اس میں ان لوگوں کی مذمت ہے جو اس میں مبتلا ہیں۔ اس کے عظیم خطرے سے آگاہ فرمایا۔ اس کا ارتکاب کرنے والے کی سزا اور اس کے برے انجام کو بتایا ہے اور اس کے بارے میں سخت وعید کی وضاحت فرمائی ہے۔ اس سے بری وعید کیا ہوگی کہ وہ دنیا میں انسانوں اور فرشتوں کا ملعون اور قیامت میں اللہ کی رحمت اور اس کی خوشنودی سے دور اور عذاب سخت کا مستحق ہو۔ اس کے اپنے اعضاء کا اس کے خلاف گواہی دینا اسکے رسوا کن گناہ کا ثبوت ہوگا یہ اس کے خلاف آخری فیصلہ ہے۔ گناہ سے چھٹکارے (یا بریت) کا دروازہ اس پر بند ہو جائے گا۔ بعض اصحاب نے اس کے خلاف اس کے اعضاء کی گواہی کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ دنیا میں بہتان لگانے والے سے اس سے ثبوت دعویٰ میں چار گواہوں کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ قیامت میں اس کے اعضاء و جوارح جسم کے پانچ گواہ اس کی کذب بیانی کا ثبوت ہوں گے یعنی اس کی زبان اس کے دو ہاتھ اس کے دو پاؤں (اس کے خلاف گواہی دے کر اس کے لئے) موجب ذلت و رسوائی ہوں گے۔ اسی طرح جیسا کہ اس نے بے گناہ اور بے خبر ایمان دار عورتوں کو کیا اور اس امر کے ثبوت کو کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو پوری اور ٹھیک سزا دے گا۔ آیت کا اخیر حصہ کافی ہے کہ لوگوں پر جھوٹا

طوفان باندھنے والا۔ گو سردست نہ جانے لیکن اس وقت جان لے گا کہ اللہ تعالیٰ برحق ہے اور اس کی وعید (تنبیہ) سچی ہے اور یہ کہ اس کا ارشاد حق اور واضح ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشۃ فی الذین آمنوا لہم عذاب الیم فی الدنیا والآخرة واللہ یعلم وانتم لاتعلمون“ (یعنی جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اہل ایمان کے درمیان گناہ کی اشاعت ہو ان کے لئے دردناک عذاب ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اس کو اللہ ہی خوب جانتا ہے تم نہیں جانتے)۔ اس آیت میں عذاب دنیا کی جو وعید آئی ہے اس میں حد قذف (سزائے بہتان) اور بہت سے دوسرے پیش آنے والے مسائل شامل ہیں۔ مثلاً دنیوی مصائب اور ذلتوں کا سامنا کرنا اور (بہتان طراز کے خلاف) عزت و آبرو پر حرف لانے والی جھوٹی سچی زبان درازیاں اور پردہ فاشیاں اور مخفی معائب کی تشہیر غرض مجلسوں میں لوگوں کی زبان پر اس کے کردار کی مذمت ہوگی۔ غرض جو شخص دوسروں کی پردہ دری کرتا ہے اس (کے کردار) کی بھی چھان پھٹک ہوتی ہے جو دوسروں کا پردہ فاش کرتا ہے اس کو بھی رسوائی کا سامنا ہوتا ہے۔ جو مسلمانوں کی عیب جوئی کرتا ہے خود اس کا بھانڈا بھی پھوٹتا ہے۔ اور جب خدا ہی کسی کی پردہ دری کرے تو وہ رسوا ہو کر ہی رہتا ہے خواہ اپنے گھر کے اندر گھس کر بیٹھ رہے۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ انسان جیسا کرے گا ویسا ہی بدلہ پائے گا۔ جیسا فعل ہوگا ویسی ہی اس کی جزا ہوگی۔ جو حسرت (بیجا توقعات) بوئے گندامت (ناکامی) کاٹے گا۔ رہا عاقبت کا عذاب سو وہ نہایت سخت اور دائمی ہے۔

یہ تو ان لوگوں کا حشر ہوگا جو بے شرمی کی باتوں کو پھیلانا اور اس کو شہرت دینا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو اپنے دل سے باتیں گھڑتے اور اس کا چرچا کرتے ہیں۔

سنت کی رو سے قذف (بہتان) کی سزا اس حدیث سے ثابت ہے۔ جسے امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”اجتنبوا السبع الموبقات، قالوا: یا رسول اللہ وما هن؟ قال: الشریک باللہ، والسحر، وقتل النفس الی حرم اللہ الا بالحق، واکل الربا، واکل مال الیتیم، والتوالی یوم الزحف، وقذف المحصنات، الغافلات، المومنات“ (یعنی سات باتوں سے بچو جو معرض ہلاکت ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ وہ کونسی باتیں ہیں؟ فرمایا: اللہ کا شریک ٹھہرانا، جادو، قتل ناحق، سود خوری، مال یتیم کھانا اور چڑھائی کے دن بھاگ نکلنا اور بے گناہ، سادہ لوح، مومن عورتوں پر بہتان لگانا)۔ نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”من قذف مملوکہ یقام علیہ الحد یوم القیامۃ، الا ان یکون کما قال“ (یعنی جو شخص اپنے مملوک (لونڈی، غلام) پر جھوٹی تہمت لگائے تو قیامت کے روز اس پر حد جاری کی جائے گی بجز اس صورت کے جب کہ امر واقعہ ویسا ہی ہو جیسا کہ اس نے بیان کیا) یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر آقا اپنے مملوک (لونڈی یا غلام) پر جھوٹی تہمت لگائے تو گو وہ شخص آیت قذف کے تحت آتا ہے لیکن اس بناء پر اسے سزائے قذف نہیں دی جائے گی کہ مملوک کو آزاد ہونے کا تحفظ حاصل نہیں ہوتا رسول اللہ ﷺ نے اسی طرح عمل فرمایا ہے۔

(حد قذف کے بارے میں) یہ حدیث حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ جب میری بریت (کی آیت) نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ منبر پر تشریف لائے اور اس کا ذکر فرمایا اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”ان الذین جاءوا بالافک“ سے لے کر اٹھارہ آیتوں کے آخر تک نازل شدہ آیات تلاوت فرمائیں ”فلما نزل امر

سر جلیں، وامرأة فضربوا الحد“ (یعنی پھر منبر سے اتر کر دو مردوں اور ایک عورت کو سزائے قذف کا حکم دیا) احمد اور محدثین اربعہ نے اس حدیث کا اخراج فرمایا ہے اور امام بخاری نے اس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اور وہ دو مرد جنہیں سزا کا حکم ہوا حسان اور مسطح تھے اور عورت حمہ بنت جحش تھی۔ یہ حدیث سزائے قذف کی دلیل ہے۔

قذف (الزام) کے مباح ہونے کی صورت

علمائے فقہ کہتے ہیں کہ قذف کی چند قسمیں ہیں۔ الزام دینا ممنوع بھی ہے، مباح بھی اور واجب بھی۔ اگر کوئی شخص بچے (کا باپ ہونے) سے انکار کرنا نہیں چاہتا تو (عورت پر) الزام لگانا واجب تو نہیں ہے۔ لیکن مباح بھی ہے یا نہیں؟ اس بارے میں دیکھنا ہوگا اگر خاوند نے اپنی آنکھوں سے عورت کو بدکاری کرتے دیکھا ہے یا عورت خود اس کا اقرار کرتی ہے اور وہ شخص سچے دل سے اس پر یقین کرتا ہے۔ یا پھر اس شخص نے ایسے شخص سے سنا ہے جس کی بات پر اسے وثوق ہے۔ یا پھر اس نے (معتبر آدمی سے) نہیں سنا لیکن لوگوں سے معلوم ہوا کہ فلاں شخص نے فلاں عورت سے بدکاری کی اور خاوند نے اسے اپنے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا یا اس عورت کو اس شخص کے پاس ایک کمرے میں دیکھا تو ان تمام صورتوں میں عورت پر الزام رکھنا روا ہے، کیونکہ ان واقعات سے الزام کو تقویت پہنچتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ بھی جائز ہے کہ اگر بیوی تو بہ کر لے تو اسے رکھ چھوڑے اور اس کا پردہ ڈھکے، اگر غیر معتبر آدمی سے ایسی بات سنی ہے یا لوگوں سے معلوم ہوا لیکن اس شخص کو اس عورت کے ساتھ تخیلہ میں یا عورت کو اس شخص کے پاس نہیں دیکھا تو اس پر الزام لگانا حلال نہیں ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ بیوی کے کردار کی نگرانی اور جستجو میں لگا رہے۔ یہاں تک کہ لوگوں کا سچ یا جھوٹ ثابت ہو جائے۔ اور وہ شخص دیوث نہ بنے اور اہل خانہ کو بدکاری میں مبتلا نہ رکھے۔

اس صورت میں جب کہ (ایک عورت کے ہاں) اولاد ہو جائے اور اس کا خاوند اس بچے کا باپ ہونے سے انکار کرے تو اب غور کرنا ہوگا۔ اگر یہ یقین ہو کہ یہ بچہ اس کا نہیں ہے بدیں جہت کہ خاوند نے بیوی کے ساتھ مباشرت ہی نہیں کی یا مباشرت کی ہے لیکن مباشرت کے بعد چھ ماہ سے کم عرصہ میں یا چار سال کے بعد ولادت ہوئی تو بیوی پر الزام لگانا واجب ہوگا اور لعان کر کے اس اولاد سے انکار کر لے گا۔ کیونکہ غیر کا نسب اپنے اوپر جوڑ لینا بھی ایسا ہی ممنوع ہے جیسے اپنے نسب سے انکار کرنا۔ نبی ﷺ سے روایت ہے آپ نے فرمایا ”ایما امرأة دخلت علی قوم من لیس منهم فلیست من اللہ، ولم یدخلها اللہ جنة“ (یعنی جو عورت اپنی اولاد کا رشتہ ایسے سے جوڑے جس سے وہ اولاد نہیں ہے تو وہ عورت اللہ والی نہیں ہے اور اللہ اسے جنت میں داخل نہ کرے گا)۔ پس جب کہ عورت (اپنی اولاد کا) رشتہ ایسے شخص سے نہیں جوڑ سکتی جس سے فی الواقع نہیں ہے تو مرد بھی یہ نہیں کر سکتا (کہ اپنی اولاد کو کسی اور کا بتائے)۔ لیکن اگر یہ احتمال ہو کہ وہ اولاد اسی کی ہو بایں طور کہ مباشرت کے بعد چھ ماہ سے زیادہ اور چار سال سے کم عرصہ میں پیدائش ہوئی ہو۔ ایسی صورت میں غور و تامل سے کام لینا ہوگا۔ اگر اس شخص نے ایک مدت حیض تک عورت کے (حمل سے) پاک ہونے کا انتظار نہیں کیا، یا انتظار کیا اور اس انتظار کے بعد چھ ماہ سے کم عرصہ میں بچہ پیدا ہو گیا تو نہ عورت پر الزام لگانا حلال ہے اور نہ اس اولاد سے انکار کرنا حلال ہے۔ اگرچہ بدکاری کی تہمت لگائی ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے ”ایما رجل جحد ولده وهو ينظر اليه، احتجب الله منه يوم القيامة، وفضحه علی رؤس الاولین والآخیرین“ (یعنی تم میں سے جو شخص اپنی اولاد سے انکار کرے درآنحالیکہ اس کا متوقع رہا ہو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے اپنے دیدار سے محروم رکھے گا اور اگلوں پچھلوں کے سامنے اس کی رسوائی ہوگی)۔

اس سے متاثر نہیں ہوتا تو اس کا نقصان صرف اس کی ذات تک محدود رہے گا۔ لیکن اگر ایسا ماحول ہے کہ دوسرے بھی اسے دیکھ کر ایسا ہی کرنے لگیں گے اور اس کی فضول خرچی کی یہ عادت دوسروں کو بھی خراب کرے گی تو اسے اس برائی کا سربراہ قرار دیا جائے گا۔ لہذا واجب ہے کہ حاکم پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ اس کی قرار واقعی سزا تجویز کرے۔ بعض ائمہ فقہاء کہتے ہیں کہ اگر کسی نے جائز کاموں میں فضول خرچی کی ہے۔ تو اس پر تشدد واجب نہیں ہے، لیکن جمہور کا کہنا یہ ہے کہ فضول خرچی بجائے خود مستوجب سزائے ہے اور یہ سزائے بھی ایک قسم کی سزا ہے جس سے اس امر کی تشہیر ہوتی ہے کہ یہ فلاں شخص اپنے مال کو ٹھیک طریقہ سے صرف میں نہیں لاتا لہذا مالی معاملات میں اس پر بھروسہ نہ کیا جائے۔ یہ ایک دائمی سزائے ہے جسے عاقل پسند نہیں کرتا۔ لیکن ممنوعہ خواہشات نفسانی میں فضول خرچی کرنے پر قدغن بالاتفاق واجب ہے۔

اسلامی احکام سرقہ کے بارے میں بعض بے دینوں کے اعتراض کا بیان

(حد سرقہ کے بارے میں) یہ سوال مشہور ہے کہ ہاتھ کاٹنے کی سزا اعضاء انسان میں سے ایک عضو کو ضائع کر دینا ہے، لیکن اس سزا کو جرم کی نوعیت سے مناسبت نہیں ہے، ”جرم ہلکی نوعیت کا ہے کہ کم سے کم مال سرقہ کی مالیت صرف دس درہم ہے اس جرم کی یہ سزا سخت ہے، یہ اعتراض جرم کی شدت اور اس کے نقصان دہ نتائج سے ناواقفیت کی بناء پر کیا جاتا ہے، اگر یہ جرم معاشرہ میں راہ پائے گا تو لوگوں کی جان مال اور آبرو سخت خطرہ میں پڑ جائے گی جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے اس کی وجہ سے زندگی تلخ اور اجیرن ہو کر رہ جائے گی، چوری کرنے والا ایک درندہ جانور کی مانند ہے کہ جو کوئی اس کے سامنے آتا ہے۔ وہ بھنبھوڑ کھاتا ہے۔ پس لازم ہے کہ اس جرم کا مقابلہ انتہائی سختی سے کیا جائے تاکہ معاشرہ کو اس کے برے نتائج سے قطعی طور پر بچایا جاسکے، اب جو شخص اس سزا کو سخت خیال کرتا ہے اسے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ جرم نہایت قبیح ہے اور معاشرہ پر اس کا نہایت برا اور خوفناک اثر پڑتا ہے، پھر سزائیں جو رکھی گئی ہیں وہ اسی لئے ہوتی ہیں کہ اخلاق کو تباہ کرنے والی برائیوں کو دور کیا جاسکے اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ برائیوں کو نرمی اور ملائمت سے دور نہیں کیا جاسکتا، پس اگر ایسے اشخاص کو مثالی سزا نہ دی جائے تو ان برائیوں کو کبھی دور نہیں کیا جاسکتا۔

دوسرے محرکات جرائم کے سد باب کا بیان

اب یہاں چند ایسی باتوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو عملی طور پر جرائم کی محرکات میں سے ہیں۔ مثلاً

کو کین اور بھنگ کا استعمال اس کے لئے شروع میں حکومت نے ہلکی سزائیں رکھیں، لیکن ضعیف الایمان اور شر پسند افراد میں اس کا ارتکاب بڑھتا گیا اور اس کی بیخ کنی نہ ہو سکی۔ بعد میں اس کے خلاف سخت قانون نافذ ہوئے اور شر پسند اشخاص نے اس کے نتائج کو محسوس کیا تو ان مبضرت رساں اشیاء کے استعمال سے باز آگئے۔ شریعت اسلامیہ ایسے قوانین کی تائید کرتی ہے اور پسند کرتی ہے۔ چنانچہ حاکم کو اس امر کا حق دیا ہے کہ ان جرائم کا قلع قمع کرنے کے لئے اپنی صوابدید کے مطابق سزائیں نافذ کرے۔ خواہ وہ جرم صرف مرتکب کی ذات تک محدود رہے یا معاشرہ پر اثر انداز ہو۔

بد اعمالوں کے حق میں بھی شریعت اسلامیہ باعث رحمت ہے

واضح ہو کہ ایک ایسا وقت تھا جبکہ بلا و مقدسہ میں سلسلہ امن و امان باقی نہ رہا اور سخت پریشان حالی کا سامنا تھا۔ پھر جب وہاں احکام الہی نافذ ہوئے اور بعض چوروں کے ہاتھ کاٹ دیئے گئے تو جلد ہی جرائم کم ہو گئے اور ان کی جگہ امن و امان کا دور دورہ ہو گیا۔

مذکورہ سابقہ سزاؤں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ گویا ہر یہ سزا سخت نظر آتی ہے لیکن درحقیقت یہ بھی سارے بد اعمال کے حق میں رحمت ہے کہ یہ سزا انہیں مجرمانہ حرکات کے ارتکاب سے باز رکھتی ہے اور حد سے تجاوز نہیں کرنے دیتی اور لوگ اس جرم کے ارتکاب سے باز آ جاتے ہیں جو معاشرہ کے حق میں سخت ضرر رساں ہے۔

جرم سرقہ کے مستوجب قطع ہونے کے لئے مقدار مال متعین کرنے کی حکمت

کہا جاسکتا ہے کہ جرم سرقہ کی اہمیت کے پیش نظر تو یہ جرم اس امر کا متقاضی ہے کہ ایک درہم کی چوری پر بھی ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ دس درہم کی چوری میں سزائے قطع رکھنے کے اندر کیا مصلحت ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت کے مد نظر یہ امر ہے کہ ہاتھ کاٹنے کی سزا اس قدر مال کی چوری پر ہونی چاہیے جس کی فی الجملہ کوئی حیثیت ہو۔ یعنی اس قدر مال ہو جس سے مالک کو ضرر پہنچے۔ دس درہم میں ایک معمولی حیثیت کا گھرانہ دو دن بسر اوقات کر سکتا ہے۔ پس اگر اس قدر مال چرایا جائے تو یہ مالک کے لئے ضرر رساں ہے لہذا اس سے کم چوری پر سزائے قطع نہ ہوگی کیونکہ بالعموم اس کے کم مقدار مال بے حقیقت ہے۔ تاہم اگرچہ مجرم اس (قلیل مقدار مال) کی چوری کرنے پر سزائے قطع سے بچ جائے تب بھی

سزائے قید یا سزائے ضرب سے نہیں بچے گا تا کہ دوبارہ ایسی حرکت نہ کرے۔

اسی طرح وہ صورت ہے جبکہ ایک شخص بارادہء سرقہ گھر میں نقب لگائے یا دیوار پھاند کر آجائے اور کسی وجہ سے چوری نہ کر سکے تب بھی وہ مستوجب سزا ہوگا تا کہ آئندہ ایسی حرکت سے باز رہے۔

اگر کسی شخص نے جرم سرقہ کا اقدام کیا لیکن ثبوت جرم سرقہ کی وہ شرطیں پوری نہ ہوئیں جن کی تفصیل فقہاء نے بتادی ہے تب بھی ایسے اشخاص سزاوار سرزنش ہیں تا کہ پھر ایسی حرکت نہ کریں۔

امید ہے کہ اس بیان سے ان اصحاب کی تشفی ہو جائے گی جو چوری کی اس سزا کو سخت خیال کرتے ہیں۔ انہیں معلوم ہو جائے گا یہ سزا خود چوری کرنے والوں کے لئے اور پورے معاشرے کے حق میں موجب رحمت ہے۔

”باب“

قذف (بہتان) کی سزا کا بیان

تہمت لگانے (یا بہتان تراشی) کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عظیم (قرآن) میں اس طرح فرمایا ہے ”والذین یرمون المحصنات ثم لم یأتوا بأربعة شهداء فاجلدوہم ثمانین جلدۃ“ ولا تقبلوا لہم شہادۃ ابداء“ و اولئک ہم الفاسقون (النور: ۴)“ (یعنی جو لوگ بے گناہ عورتوں پر بہتان لگاتے ہیں اور اپنے بیان کی تصدیق میں چار گواہ پیش نہیں کر سکتے تو انہیں اسی (۸۰) ”درے لگاؤ اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو یہ لوگ گنہگار ہیں)۔

قذف سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص واضح الفاظ میں کسی پر بدکاری کا الزام لگائے اور یہی کہے کہ تو نے زنا کیا۔ یا پھر ایسی بات کہے جس کا مطلب یہی نکلتا ہو مثلاً ایک شخص کسی دوسرے شخص کو اس کے باپ کے سوا کسی اور سے منسوب کرے اب جو شخص ایسی حرکت کا مرتکب ہو اس کی سزا یہ ہے کہ اسے اسی (۸۰) کوڑے مارے جائیں در آنحالیکہ وہ شخص ایسے چار گواہ نہ پیش کر سکے جو یہ شہادت دیں کہ انہوں نے فلاں شخص کو جس پر یہ تہمت لگائی گئی ہے، اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اس نے فلاں عورت کے ساتھ جو اس پر حلال نہیں ہے، بدکاری کی^(۱)

قذف کی شرعی تعریف

۱۔ لغت کی رو سے قذف کے معنی تیر چلانے یا پتھر پھینکنے کے ہیں۔ فقہاء کی اصطلاح میں کسی بے گناہ پر بدکاری کا صریح الزام لگانا یا ایسی بات کہنا جس کا مطلب یہی ہو قذف ہے۔ کسی بے گناہ پر بدکاری کی تہمت لگانے کو قذف (یعنی تیر یا پتھر پھینکتا) اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس فعل بد (زنا) کی تہمت کسی پر لگانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص غصہ میں آ کر پتھر کھینچ مارے اور یہ خیال نہ کرے کہ یہ پتھر کس کس پر جا کر پڑے گا۔ ایک بے گناہ عورت، اس کا باپ، ماں، بہن، بھائی خاوند اور اس کا کنبہ اور اس کے رشتہ دار سب اس کی اس غلط اندازی کا نشانہ بن جاتے ہیں اور وہ ہنتا اور خوش ہوتا ہے۔ اور اس ضرر سے جو ان سب کو پہنچا بالکل آنکھیں بند کر لیتا ہے ایسے شخص کو مفتری کہا جاتا ہے کیونکہ وہ جھوٹا الزام تراشتا ہے اور افترا سے کام لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے باقتضائے حال عورتوں کے اچھے خصائل کا ذکر فرمایا ہے۔ مثلاً محصنات وہ عورتیں ہیں جو (اہلائے گناہ سے) محفوظ ہوں یعنی ان کے خاوندوں کو ایک مستحکم حصن (قلعہ) تصور کیا گیا ہے۔ اور ”عافلات“ (بے خبر) فرمانے سے مراد یہ ہے کہ ان کا ذہن ناپسندیدہ خصائل کے تصور ہی سے خالی ہوتا ہے اس کی طرف توجہ کرنے کا

بہتان تراش اور جس پر بہتان لگایا گیا ہو وہ مرد ہو یا عورت دونوں کا حکم یکساں ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے اس عورت کا ذکر جس پر تہمت لگائی گئی ہو خصوصیت کے ساتھ پہلے محصنات (بے گناہ عورتوں) کے لفظ سے یاد فرمایا ہے۔ کیونکہ عورت کی بدکاری کا ضرر اس کی اپنی ذات سے گزر کر اس کے کنبہ تک پہنچتا ہے۔ تہمت کا برا اثر عورت پر سخت شرمناک ہوتا ہے۔ مرد پر اتنا نہیں ہوتا۔ تہمت لگانے والوں میں مرد کے ذکر کو خصوصیت کے ساتھ مقدم فرمایا گیا ہے۔ ”والذین یومنون“ (یعنی وہ مرد جو تہمت لگاتے ہیں) اس لئے کہ عام طور پر عورتوں پر شرم غالب ہوتی ہے لہذا وہ مردوں پر زنا کا الزام نہیں لگاتیں اور حدیث سے واضح ہے کہ تہمت کے متنبہ احکام کے بارے میں مردوں اور عورتوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے اور ان شرائط کو بیان کیا گیا ہے جو حد قذف لاگو ہونے کے لئے ضروری ہیں۔ مثلاً عاقل ہونا اور آزاد ہونا وغیرہ جن کا ذکر کتب فقہ میں آیا ہے۔

تو ذکر کیا؟ اور مومنات سے مراد وہ عورتیں ہیں جو قرآن حکیم اور اس کے احکام پر ایمان رکھتی ہیں اور اس کی مقرر کردہ پابندیوں پر کاربند ہیں۔

واضح ہو کہ احصان (محفوظ یا بے گناہ) کا لفظ شادی شدہ عورت کے لیے یا غیر شادی شدہ پاک دامن عورت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت مریم علیہا السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”والتی احصنت فرجھا“ (یعنی وہ عورت جس نے اپنی شرمگاہ کو بچایا)۔ غرض اس لفظ کا مفہوم شرمگاہ کو محفوظ رکھنا ہے۔ اگر عورت شادی شدہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خاوند کے سوا تمام مردوں سے بچ کر (الگ) رہتی ہے اور اگر غیر شادی شدہ ہو تو اپنی حرمت کو تمام اشخاص سے بچاتی ہے۔

ائمہ فقہ رحمہم اللہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی آزاد، بالغ، عاقل، مسلمان اور بااختیار شخص کسی آزاد، عاقل، بالغ، مسلمان اور بے گناہ مرد پر جسے اس سے پہلے سزائے زنا نہیں ملی یا کسی آزاد، بالغ، عاقل، مسلمان اور پاک دامن قابل مباشرت عورت پر جس کے ساتھ لعان نہیں ہوا اور زنا کی پاداش میں حد نہیں ماری گئی، تہمت لگائے اور وہ تہمت صراحۃً یا کنایۃً ہو اور دار الحرب میں نہ ہو اور جسے تہمت لگائی گئی وہ خود حد قذف کا مطالبہ کرے تو اس شخص کو سودرے لگائے جائیں گے بشرطیکہ وہ اپنے قول کے ثبوت میں چار معتبر گواہ نہ پیش کر سکے۔

واضح ہو کہ فقہاء نے مسلمان ہونے کو پاکباز ہونے کی شرط قرار دیا ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے ”من اشرک باللہ فلیس بمحصن“ (یعنی مشرک کو پاکباز قرار نہیں دیا جاسکتا)۔ اسی طرح عاقل و بالغ ہونا بھی محصن کو ضروری ہے کیونکہ حضور نے فرمایا ہے ”رفع القلم عن ثلاث“ (یعنی تین اشخاص مرفوع القلم ہیں جن سے مراد بے عقل، نابالغ اور مجنون ہیں)۔ اس کے لیے آزاد ہونا بھی شرط ہے کیونکہ غلام یوں بھی کم حیثیت ہوتا ہے زنا کے الزام سے اس کی حیثیت میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئے گی۔ پھر (حد قذف کا مستوجب ہونے کے لیے) یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ جس پر

الزام لگایا گیا ہے وہ بے گناہ ہو کیونکہ حد کا سزاوارہ ہوتا ہے جو جھوٹی تہمت لگائے۔ اگر فی الواقع وہ شخص گنہگار ہے جس پر تہمت لگائی گئی تو تہمت لگانے والا الزام تراشی میں سچا ہے۔ (اور تہمت جھوٹی نہیں ہے) یہی حکم اس صورت میں ہے جبکہ اس شخص پر زنا کی تہمت لگائی جائے جس نے بیوی کے شبہ میں (غیر عورت سے) مباشرت کر لی یا نکاح فاسد ہوا ہو اور مباشرت کر لے۔ کیونکہ ان صورتوں میں ارتکاب گناہ کا شبہ بھی ہے اور فعل حلال کا بھی پس جبکہ ان میں سے ایک شبہ کی بناء پر مباشرت کرنے والے کی سزائے زنا ساقط ہو جاتی ہے تو دوسرے شبہ کی بناء پر اسی طرح سزائے قذف بھی ساقط ہو جائے گی۔ پھر اس میں اختیار کو بھی دخل ہے۔ کیونکہ اگر کسی کو اس گناہ کے ارتکاب پر مجبور کیا جائے تو اس پر حد واجب نہ ہوگی۔ بلکہ سزا سے بری کر دیا جائے گا پھر فقہاء نے نکوکاری کی یہ شرط بھی رکھی ہے کہ اس سے پہلے اسے کبھی زنا کی سزا نہ ملی ہو۔ بلکہ اس کی صفت بے گناہی ظاہر ہو چنانچہ اگر کسی نے عفوان شباب میں ایک بار بدکاری کا ارتکاب کیا ہو اور پھر توبہ کر کے اپنی حالت سدھار لی ہو اور عمر رسیدہ ہونے تک خوش کردار رہا ہو تو ایسے شخص پر بھی تہمت لگانے والے کو سزائے قذف نہیں دی جائے گی۔ اسی طرح اگر کسی کافر یا غلام نے بدکاری کی پھر مسلمان یا آزاد ہو گیا اور اپنی اصلاح کر لی پھر اس پر کسی نے تہمت لگائی تو تہمت لگانے والے کو سزائے قذف نہ دی جائے گی۔ بخلاف اس کے اگر کسی نے نابالغی کے عالم میں یا دیوانگی میں بدکاری کی اور پھر اسے افاقہ ہو گیا تو اس پر بہتان لگانے والا مستوجب حد ہوگا، کیونکہ نابالغ شخص یا جنون زدہ کا فعل جرم زنا نہیں ہے (لہذا وہ بے گناہ ہے اور بے گناہ پر تہمت لگانا جرم مستوجب سزا ہے)۔

اگر کسی نامرد یا محبوب الذکر پر (جو قوت یا آلات مردی سے محروم ہو) یا ارتقاء (وہ مریض عورت جو نا اہل مجامعت ہو) یا صغیر سن عورت پر جو اس قابل نہ ہو تہمت لگائی تو اس پر حد واجب نہ ہوگی۔

اگر کسی بے گناہ شخص پر تہمت لگائی اور قبل اس کے کہ تہمت لگانے والے کو سزائے قذف دی جاتی اس شخص نے فی الواقع بدکاری کا ارتکاب کر لیا تب بھی تہمت لگانے والے پر حد لاگو نہ ہوگی۔ کیونکہ بعد میں اس شخص کا ارتکاب زنا کر لینا اس کے ماضی کے کردار کو مشتبہ بنا دیتا ہے۔ یہ حکم اس بناء پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کرم فرمانے والا ہے اپنے بندہ کے پہلے گناہ پر اس کی پردہ دری نہیں کرنا چاہتا ہے۔ اس گناہ کو ظاہر کرنے سے یہ سمجھا جائے گا کہ وہ شخص پہلے بھی اس گناہ میں مبتلا تھا۔

روایت ہے کہ ایک شخص نے خلافت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں گناہ زنا کا ارتکاب کیا۔ اس شخص نے کہا کہ بخدا میں نے اس کے علاوہ کبھی یہ گناہ نہیں کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تو جھوٹ کہتا ہے، اللہ تعالیٰ پہلی بار کے گناہ میں کسی کو رسوا نہیں کرتا۔

فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ تہمت جو مستوجب حد ہے یہ ہے کہ ایک شخص زنا یا اغلام کا الزام کسی پر لگائے یا گناہ کا الزام نہیں بلکہ صراحۃً اس کے نسب کا انکار کرے، درآنحالیکہ اس کی ماں آزاد اور مسلمان ہو۔ اور اس طرح بہتان لگانا واجب الحد اس لیے ہے کہ یہ الزام موجب عار ہے۔ اس سے کمینگی، پردہ دری، رسوائی، بے عزتی اور بے غیرتی ہوتی ہے جو بدترین حیوانات کی فطرت اور ہر گونہ ہلاکت کا موجب ہے۔ جس پر تہمت لگائی جائے اگر وہ عورت ہے تو یہ الزام اس کی قوم کے لیے ہتک آمیز ہوگا اور اس کا نتیجہ خونریزی ہوگا اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ خون خرابہ کے بغیر عار کا یہ داغ دھویا جاسکے۔ اور اگر مرد پر تہمت لگائی گئی تو اس سے ثابت ہوگا کہ نہ تو اس کی نگاہوں میں عزت کی کوئی حقیقت ہے اور نہ شرم و حیا

کا پاس ہے نہ اس کا خون جوش مارتا ہے یہی وجہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ غیرت مند انسان کبھی یہ فعل بد نہیں کرتا۔ اور یہ ایسی بے شرمی کی بات ہے کہ جس کا اثر بیٹوں پوتوں تک پہنچتا ہے اور سالہا سال تک باقی رہتا ہے۔ اور تمام فقہاء کا اس پر اجماع ہے کہ اس آیت شریفہ میں لفظ 'رمی' سے مراد خاص معصیت زنا کی تہمت ہے۔ کسی اور گناہ کا الزام مراد نہیں ہے یہاں (تہمت زنا مراد لینے کے) چند قرینے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک قرینہ یہ ہے کہ یہ آیت زنا کی متعلقہ آیت کے بعد آئی ہے۔ اور یہ کہ لفظ 'محسنات' سے مراد پاکدامن عورتیں ہیں جو اس حقیقت پر دال ہے کہ اس سے مراد تہمت ہے اور ان پر تہمت لگانے کا مقصد ان کی پاکدامنی کی مخالفت ہے۔ ایک اور قرینہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے 'ثم لم یأتوا بساربعہ شہداء' (یعنی اگر الزام لگانے والے چار گواہ نہ پیش کر سکیں) یعنی اپنے الزام کے ثبوت میں جو انھوں نے لگایا ہے۔ یہ معلوم ہے کہ گواہوں کی یہ تعداد (یعنی چار) ماسوا زنا کے شرط نہیں ہے۔ اور ایک قرینہ یہ ہے کہ اس بات پر اجماع ہے کہ بجز ثبوت زنا کے کسی اور جرم کی تہمت لگانے پر درہ زنی واجب نہیں ہے۔ ان تمام قرائن سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آیت میں لفظ 'رمی' سے مراد صرف زنا کی تہمت ہے کسی اور برائی کا الزام نہیں ہے۔

فقہاء کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ جب تک مقذوف (جس پر تہمت لگائی گئی ہے) وہ خود سزائے تہمت کا مطالبہ نہ کرے تہمت لگانے والے کو سزا نہیں دی جائے گی۔ کیونکہ اس الزام سے اس کی بے عزتی جو ہوئی ہے اس کے دفعیہ کا اسے حق ہے۔ اب اگر وہ اسے معاف کر کے درگزر کر دے اور سزا کا مطالبہ نہ کرے تو حد لاگو نہ ہوگی۔

الفاظ تہمت کا بیان

جن الفاظ میں تہمت لگائی جاتی ہے ان کی تین قسمیں ہیں: تہمت صریح (کھلے الفاظ میں تہمت لگانا) تہمت کنائی (غیر واضح پر تہمت لگانا) تہمت تعریض (بطریق طعنہ تہمت لگانا) بالفاظ صریح تہمت کی مثال یہ ہے کہ وہ کہے کہ "اے زنا کرنے والی" یا یوں کہے کہ "تو نے زنا کیا ہے" یا "تیری اگلی یا پچھلی شرمگاہ نے زنا کیا" لیکن اگر کہا کہ تیرے جسم نے بدکاری کی تو اس کے دو مفہوم ہیں ایک مفہوم کی رو سے یہ کنایہ ہے (صراحت نہیں ہے) جیسے کوئی یوں کہے کہ تیرے ہاتھ نے زنا کیا، کیونکہ بد فعلی کا تعلق دراصل شرمگاہ سے ہوتا ہے (اس کی بجائے ہاتھ کا لفظ استعمال کرنا کنایہ ہے) اور یہ حرکت بدن سے نہیں ہوتی بلکہ بدن اس فعل کا معاون ہوتا ہے دوسرا مفہوم جو زیادہ درست ہے یہ ہے کہ اس طرح کہنے کو تہمت صریح تصور کیا جائے کیونکہ یہ فعل پورا بدن انجام دیتا ہے شرمگاہ صرف آلہ کار ہے۔

کنایہ الزام لگانے کی مثالیں یہ ہیں کہ کوئی کہے اے فاسق یا فاجر یا خبیث، یا کچی یا حرام کی بچی یا یوں کہا کہ میری بیوی (غیر مرد کو) ہاتھ لگانے سے منع نہیں کرتی، یا اس کے برعکس کہا (کہ وہ غیر مرد کو ہاتھ لگاتی ہے) ان باتوں میں سے کوئی بات (قانوناً) بہتان نہیں ہے۔ لہذا اس طرح کہنے والے کو سزائے قذف نہ ہوگی۔ تا آنکہ اس شخص نے ان الفاظ سے الزام لگانے کا ارادہ نہ کیا ہو۔ پس اگر وہ شخص کہے کہ میرا مقصد ان الفاظ سے الزام لگانا نہیں ہے لیکن 'مقذوف' (جس پر الزام لگایا گیا) اس شخص کے اس بیان کو جھٹلائے تو اس شخص کی توجیہ مان لی جائے گی بشرطیکہ وہ قسم کھا کر کہے۔ تاہم حاکم شرع پر لازم ہوگا کہ اسے کوئی مناسب سزا دے کیونکہ ایسی باتیں کہہ کر اس نے مقذوف کو دکھ دیا اور عیب لگایا ہے لیکن حد (سزائے شرعی) محض قیاس کی بناء پر عائد نہیں ہوتی۔

رہا (تہمت کے لیے) الفاظ تعریض (یعنی طعنہ) کا استعمال کرنا سو اس کے بارے میں فقہاء رحمہم اللہ کے درمیان اختلاف ہے۔

حنفیہ کی اور شافعیہ کی بھی ایک رائے تعریض (طعنہ) کے بارے میں یہ ہے کہ تعریض (طعنہ) کے طور پر جو کچھ کہا جائے، اگرچہ اس سے مراد تہمت لگانا ہو۔ سزائے حد واجب نہ ہوگی۔ مثلاً (طعنہ کے طور پر) یوں کہنا کہ ”اے حلال زادے میں نے کبھی بدکاری نہیں کی، میرے خاندان کو سب جانتے ہیں، میری ماں بدکار عورت نہ تھی، میں تیری اصلیت کھول کر رکھ دوں گا، میری شرمگاہ پاک ہے۔“ (یہ الفاظ مستوجب حد نہیں ہیں) کیونکہ ان الفاظ میں تہمت کا احتمال ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ لہذا حد نہ لگانا واجب ہے کیونکہ بنیادی طور پر انسان معصیت سے بری متصور ہوتا ہے اور شبہ کی بناء پر کسی کو مجرم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ تاہم ایسی بات کہنے والے کی سرنش واجب ہے (کنایہ یا طعنہ کے طور پر) تہمت لگانے سے انسان کو زیادہ اذیت نہیں ہوتی کیونکہ ہر شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ ان الفاظ سے مراد کوئی اور شخص ہے، میں نہیں ہوں اور جب اظہار مقصد کے لیے (حقیقت کو چھوڑ کر) استعارہ سے کام لیا جائے تو اس میں شائبہ شک موجود ہوتا ہے اور شبہ کی حالت میں ملزم سزا سے بری ہو جاتا ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ تعریض (طعنہ) بہر حال مستوجب حد ہے۔ خواہ تہمت لگانے کا ارادہ ہو یا نہ ہو کیونکہ یہ طعنہ کسی نہ کسی کار وادہ رکھ کر ہوتا ہے۔ تو ہم اس سے نشانہ بننے والے کا حق وصول کریں گے۔ اگرچہ اس شخص کی اصلیت معلوم نہ ہو۔ تاکہ قاذف (الزام تراش) کو اس خصلت بد سے پاک کیا جائے اور اس کی بدسشتی کو دور کیا جاسکے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ طعنہ دینے والے پر حد لاگو فرماتے تھے۔ روایت ہے کہ عہد خلافت عمرؓ میں دو اشخاص گالم گلوچ کر رہے تھے، ان میں سے ایک شخص نے دوسرے سے کہا ”وللہ میں نے تو نہ زنا کیا اور نہ میری ماں بدکار تھی“ (یہ اشارہ اس امر کی جانب ہے کہ میں ایسا نہیں ہوں جیسا کہ تو ہے) اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے مشورہ کیا، ایک شخص نے کہا کہ اس نے اپنے باپ کی اور ماں کی تعریف کی ہے اور دوسرے نے کہا کہ اس کے ماں باپ میں اس کے سوا اور بھی خوبیاں تھیں (ان کا ذکیوں نہ کیا؟) تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو اسی (۸۰) درے لگائے جانے کی سزا دی۔ اور (طعنہ زن) اس لیے بھی مستوجب سزا ہے کہ بالعموم کنایہ نص صریح (کلام واضح) کا قائم مقام ہوتا ہے اگرچہ کنایہ میں لفظ کا استعمال معنی غیر موضوع لہ (یعنی بنیادی معنی کے علاوہ کسی اور معنی) میں ہوتا ہے۔ اور تعریض معززین اہل دنیا کا خاص شیوا ہے جنہیں لوگوں میں اپنی عزت کا بڑا مان ہوتا ہے۔

شافعیہ کا قول ایک دوسری روایت کے بموجب اور حنابلہ کا قول ایک روایت کے مطابق یہ ہے کہ اگر تعریض کا مقصد تہمت لگانا تھا اور اس نے یہی مقصد بتایا ہے تو حد قذف لاگو ہوگی، لیکن اگر یہ ارادہ نہ تھا تو لاگو نہ ہوگی۔ اور اس بارے میں اس شخص کی بات کو قسم کھالینے پر تسلیم کر لیا جائے گا۔

حنابلہ کا قول دوسری روایت کے مطابق یہ ہے کہ اس صورت میں بہر حال سزائے قذف واجب ہوگی۔ اس نے ارادہ کیا ہو یا نہ کیا ہو خاص کر غصہ اور اشتعال کی حالت میں کیونکہ اس حال میں یہ امر قرین قیاس ہو جاتا ہے کہ وہ شخص مقذوف کی توہین اور اس کی رسوائی کے درپے ہے۔

بہتان لگانے والے کی گواہی کے ناقابل تسلیم ہونے کا بیان

ائمہ فقہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جو شخص جرم قذف کی سزا پا چکا ہو اس کی گواہی تسلیم نہیں کی جائے گی، کیونکہ شریعت نے بے گناہ مرد یا بے گناہ عورت پر الزام تھوپنے والے کو تین باتوں کا سزاوار قرار دیا ہے: اسی کوڑوں کی سزا، ہمیشہ کے لیے اس کی گواہی کا ناقابل قبول ہونا اور اس کو فاسق قرار دینا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”فاجلدوہم ثمانین جلدۃ ولا تقبلوا لہم شہادۃ ابدًا، واولئک ہم الفاسقون“ (یعنی ایسے لوگوں کو اسی (۸۰) درے لگاؤ۔ ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو اور یہ لوگ گنہگار ہیں)۔ درہ زنی کا حکم تنبیہ کے لیے اور اس ضرر کی پاداش میں ہے جو اس نے دوسروں کو پہنچائی۔ گواہی کا تسلیم نہ کرنا زبان کی سزا ہے جیسے چوری کرنے والے کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے، اس سے غرض یہ ہے کہ وہ زبان جو اس گناہ عظیم (الزام تراشی) کا ارتکاب کرتی ہے اسے بیکار بنا دیا جائے اور اس کے تاثر کو ضائع کر دیا جائے تاکہ دوسروں پر اثر انداز نہ ہو اور لوگوں میں چرچا نہ ہو، پس اگرچہ زبان باقی ہے تب بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ رہا اس کا فاسق یا گناہگار قرار دیا جانا۔ تو یہ عبرت کیلئے ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس شخص کو سزائے قذف اور بے اعتبار ہو جانے کا جو سامنا کرنا پڑا ہے اس سے قاذف کے فاسق ہونے اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی اطاعت سے باہر جانے کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا، یہ تمام سزائیں اس امر کا کافی ثبوت ہیں کہ الزام تراشی کتنی بری بات ہے اور کیسی ہلاکت آفریں حرکت ہے اور جب یہ بدکاری کا الزام لگانے اور بہتان تراشی کے لیے ہو تو اس گناہ عظیم اور قابل مذمت جرم کے ارتکاب کا الزام لگانے والے کا کیا حشر ہوگا؟ غرض یہ حکم اور اس کے متعلقہ دلائل مذکورہ اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ یہ گناہ سخت قابل مذمت اور نہایت بری حرکت ہے اور شریعت نے اس کی روک تھام اور اس سے نفرت دلانے کی طرف کیسی توجہ فرمائی ہے تاکہ معاشرہ کو اس کے ضرر سے محفوظ رکھا جائے۔

واضح ہو کہ اگر کوئی کافر (غیر مسلم) جرم قذف کا سزا یاب ہو تو ذمیوں (یعنی اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا) کے خلاف اس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی اور اسے رد کر دیا جائے گا تاکہ سزائے قذف کی تکمیل ہو جائے۔

مقذوف کی ماں کا غیر مسلم یا لونڈی ہونا

مالکیہ کہتے ہیں کہ تہمت لگانے والے پر حد لاگو ہوگی، خواہ مقذوف کی ماں آزاد عورت ہو یا (مملوکہ) لونڈی اور مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ کیونکہ (حد قذف کی) آیت کا مفہوم عام ہے۔ اس طرح اگر آزاد مسلمان مقذوف کا باپ غلام ہو یا کافر ہو اس صورت میں بھی مسلک ترجیحی کے مطابق قاذف مستوجب حد ہے۔

حنفیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر مقذوف (جس پر تہمت لگائی گئی ہے) کی ماں لونڈی یا کتابیہ ہو تو تہمت لگانے والے پر حد لاگو کرنا واجب نہیں ہے لیکن اگر مسلمان آزاد مقذوف کا باپ غلام ہو یا غیر مسلم ہو یا تہمت لگانے والا نعوذ باللہ کافر ہو تو اسے سزائے حد ہوگی۔

سزائے قذف پر عملدرآمد ہونے سے پہلے قاذف کی گواہی کا بیان

شافعیہ اور لیث بن سعد کہتے ہیں کہ سزائے قذف کا حکم ہونے کے بعد لیکن سزا پر عمل درآمد ہونے سے پہلے کوئی

شخص گواہی دے تو وہ باطل ہوگی۔ (فیصلہ ہونے کے بعد سے ہی) اس پر فاسق ہونے کا اطلاق ہو جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بہتان لگانے والے پر، درآنحالیکہ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں چار گواہ نہ پیش کر سکے، چار باتیں عائد فرمائی ہیں۔ تین باتیں حرف عطف واؤ کے ساتھ آئی ہیں۔ ان میں ترتیب کا لحاظ نہیں ہے لہذا یہ ضروری نہیں کہ ان امور کو (قذف کے مرتکب پر) اسی ترتیب سے عائد کیا جائے لہذا ایسے شخص کی گواہی کا ناقابل تسلیم ہونا سزا یا بی پر منحصر خیال کرنا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ لازم ہے کہ قاذف کو سزائے قذف ملی ہو یا ہنوز نہ ملی ہو اس کی شہادت کو رد کر دیا جائے۔

حنفیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ کسی شخص کو سزائے قذف کا حکم ہو جائے تو جب تک اس حکم پر عمل درآمد نہ ہو اس کی گواہی تسلیم کی جائے گی اور اس شخص پر فاسق ہونے کا اطلاق اس وقت تک نہ ہوگا جب تک کہ اسے سزائے قذف نہ مل جائے کیونکہ اگر اسے فاسق کا نام دے دیا جائے تو اس کی گواہی جائز نہ ہوگی۔ اس لیے کہ فسق کا نام اس شخص کی گواہی کو باطل کر دے گا جو فسق سے موسوم ہو۔

اور یہ اس بناء پر کہ ظاہر آیت کا تقاضا ہے کہ حدان دو چیزوں کے مجموعے پر لاگو ہو ایک تہمت لگانا اور دوسرے شہادت قائم کرنے سے عاجز ہو جانا، لہذا اگرچہ حکم ہم صرف تہمت لگانے پر موقوف کریں تو یہ اس کے مذکورہ دو امور پر موقوف ہونے میں قاذف ہے اور اس کی گواہی کو تسلیم کرنا آیت کے ظاہری مفہوم کے خلاف ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ درہ زنی کا حکم موقوف ہے دو باتوں پر۔ لہذا ضروری ہے کہ محض ایک بات کے پورا ہونے پر حکم کی تکمیل نہ ہو۔

ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ آزاد انسان اگر اپنے غلام پر تہمت لگائے تو اسے حد قذف نہ ماری جائے گی، کیونکہ وہ شخص اس غلام کا مالک ہے اور خود اپنے مملوک پر تہمت لگانے سے مستوجب سزا نہ ہوگا۔

آزاد شخص پر غلام کے تہمت لگانے کا بیان

ائمہ فقہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر غلام حر (آزاد شخص) پر تہمت لگائے تو اسے آزاد شخص کی سزا کا نصف یعنی چالیس دروں کی سزا ہوگی۔ خواہ تہمت لگانے والا مرد ہو یا عورت۔ یہ حکم اس روایت کی بناء پر ہے جسے ثوری نے جعفر بن محمد سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”یجسد العبد فی القذف اربعین“ (یعنی غلام کے لیے سزائے قذف چالیس درے ہے) اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ”ادرکت ابابکر وعمر وعثمان، ومن بعدہم من الخلفاء وکلہم یضربون المملوک فی القذف اربعین“ (یعنی میں نے حضرات ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد کے خلفاء کا عہد دیکھا ہے یہ سب اصحاب غلاموں کو تہمت لگانے کی سزا چالیس درے دیتے تھے)۔ یہ سزا اس لیے بھی ہے کہ تمام سزائیں جو آزاد کے لیے مقرر ہیں غلاموں کی سزا ان سے نصف ہوتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”فاذا احصن فان اتین بفاحشة فعلیہن نصف ما علی المحصنات من العذاب“ (یعنی شادی کے بعد اگر لونڈیاں بدکاری کا ارتکاب کریں تو ان کی سزا آزاد زیر تحفظ عورتوں کی سزا سے نصف ہوگی)۔ اس عبارت سے واضح ہے کہ لونڈی کو بدکاری کی سزا آزاد عورت کی سزا سے نصف ملے گی۔ فقہاء نے لونڈیوں پر قیاس کرتے ہوئے غلام کے لیے بھی زنا کی سزا نصف قرار دی ہے۔ پھر زنا کی سزا آدمی قرار پانے پر قیاس کرتے ہوئے تہمت کی سزا بھی ان کے لیے نصف قرار دی گئی۔ حاصل کلام اندرین باب یہ ہے کہ

اللہ تعالیٰ کے عام حکم کو اس قیاس کی بناء پر خاص کر دیا گیا ہے۔ اور اس حکم کے لاگو ہونے میں اس وقت کا اعتبار ہوگا جب تہمت لگائی گئی۔ اگرچہ تہمت لگانے کے بعد اور سزا ملنے سے پہلے وہ شخص آزاد ہو جائے، کیونکہ اس شخص نے جس وقت تہمت لگائی اس وقت غلام (مملوک) تھا۔

کسی ملکی کو فارسی کہنے کا بیان

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی عرب والے کو اے نبٹی اے رومی یا اے بربری کہہ کر خطاب کیا اہل فارس کو اے رومی کہا یا رومی کو اے فارسی کہہ کر پکارا اور آنحالیکہ اس کے آباء و اجداد وہاں کے نہیں ہیں تو ایسا شخص مستوجب حد ہے۔ کیونکہ یہ بھی تہمت اور اس کے لیے موجب عار ہے اس طرح کہنا اس کی نسل کو مطعون کرنا ہے۔ لہذا یہ حکم ہر طرح کی اذیت کا سد باب کرتا ہے۔ اسی طرح یہ کہنا (بھی طعنہ) ہے کہ میں پاک رحم والا ہوں (یعنی تو نہیں ہے)۔

حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ رحمہم اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ اس طرح کہنے سے حد قذف واجب نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس طرح کی باتوں کو شاذ و نادر ہی کوئی شخص تہمت زنا خیال کرتا ہوگا۔ ایسی نادر الوجود صورتوں میں عام حکم نہیں دیا جاتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ ان الفاظ سے اخلاق و عادات کی مشابہت مراد ہو سکتی ہے۔

اگر کسی نے اپنی بیوی سے کہا کہ تو نے گدھے، اونٹ یا بیل کے ساتھ بدکاری کی تو اس پر حد قذف لاگو نہ ہوگی۔ کیونکہ زنا مرد اور عورت کے باہمی اعضائے جنسی کے عمل کا نام ہے اور یہ بات خارج از عقل ہے۔ اگر کسی نے بیوی سے کہا کہ تو نے اونٹنی یا گائے سے یا کپڑے یا درہم کے ساتھ زنا کیا اور گواہ نہ پیش کر سکا تو مستوجب حد ہوگا۔ کیونکہ اس کے منہ سے یہ ہیں کہ اس کی بیوی نے بدکاری کی اور اس کے معاوضہ یا اجرت میں یہ کچھ لیا۔

اگر کسی نے کہا کہ فلاں شخص بدکار ہے یا مخنث ہے تو اس پر حد واجب نہ ہوگی۔ اگر یوں کہا کہ ”تو نے صغریٰ میں بدکاری کی یا فلاں شخص نے تیرے ساتھ ناروا مجامعت کی تب بھی حد قذف نہ ہوگی کیونکہ یہ الفاظ (تہمت کے باب میں) واضح نہیں ہیں کیونکہ نکاح فاسد میں بھی ناجائز مجامعت ہوتی ہے۔ نیز یوں کہنے سے بھی حد عائد نہ ہوگی کہ ”فلاں شخص کی بہتان تراشی کا بیان ہے (لہذا اس طرح کہنے والا ملزم نہیں ہے) اگر ایک شخص نے کسی کو اے زانی! کہہ کر خطاب کیا اور اس نے کہا کہ میں نہیں بلکہ تو زانی ہے۔ اور یہ دونوں ایک دوسرے پر سزائے قذف کا دعویٰ کریں اور ان کا دعویٰ حاکم شرع کے رو برو تسلیم کر لیا جائے تو دونوں مستوجب حد ہوں گے اور ان پر حق اللہ یعنی حد واجب ہو جائے گی۔ اور ان میں سے کسی کے لیے ممکن نہ رہے گا کہ اس حد کو ساقط کر سکے۔ لہذا دونوں کو سزا ملے گی۔ بخلاف اس کے اگر کسی کو اے خبیث کہہ کر خطاب کیا اور اس نے بھی انتقاماً کہا کہ میں نہیں بلکہ تو خبیث ہے تو کوئی مستوجب حد نہیں ہوگا کیونکہ اس صورت میں سزا کا مطالبہ بندہ کا حق ہے اور ایک پر جو سزا عائد ہوتی ہے وہی دوسرے پر ہوتی ہے لہذا دونوں کی سزائیں ساقط ہو جائیں گی۔ اگر ایک شخص نے کسی سلمان کو کہا ”اے فاسق اے کافر اے چور، اے مخنث، اے قاتل، اے بدکار یا اے بے نمازی وغیرہ عیوب میں سے کوئی عیب بجز عیب زنا کے لگا کر پکارا تو ان تمام الفاظ میں سے کسی کی بناء پر حد قذف لاگو نہ ہوگی۔ البتہ حاکم تنبیہ کے طور پر اس سے باز رکھنے کے لیے جو سزا مناسب سمجھے دے سکتا ہے“ مثلاً سزائے ضرب یا قید یا برطرفی وغیرہ۔ کیونکہ ان الفاظ سے کسی کی بے عزتی یا توہین ایسی نہیں ہوتی جو زنا کے الزام یا صحت نسب کے انکار سے ہوتی ہے۔

جرم تہمت کے اقرار کرنے کا بیان

ائمہ فقہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص تہمت لگانے کا اقرار کر لے اور اس کی بات مان لی جائے تو اس پر حد لاگو ہو جائے گی۔ لیکن اگر وہ سزا پانے سے پہلے اپنے اقرار سے پھر جائے تو اس کا رجوع تسلیم نہیں کیا جائے گا کیونکہ جس پر تہمت لگائی گئی ہے اسے حق ہے کہ اس کے رجوع کرنے کو جھٹلائے بخلاف اس صورت کے جبکہ معاملہ حق اللہ کا ہو۔ کیونکہ اسے جھٹلانے والا کوئی نہیں ہے لہذا اس کا رجوع کرنا تسلیم کیا جائے گا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کا رجوع کرنا تسلیم نہ کیا جائے۔ کیونکہ اس نے دوسرے کی بے عزتی کی اور اسے عیب لگایا اور اس کی شہرت کو داغ لگایا اور اب یہ چاہتا ہے کہ دوسرے کے حق (مطالبہ سزا) سے اسے محروم کر دے اور لوگوں میں اس کی اپنی توقیر بڑھے اور بے عزتی سے بچ جائے۔

ثبوت الزام کے لیے شہادت پیش کرنے کا بیان

علماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اگر تہمت لگانے والا چار عاقل اور معتبر مردوں کی گواہی پیش کر دے کہ جو الزام لگایا گیا ہے وہ درست ہے تو قاذف پر حد لاگو نہ ہوگی اور اسے قاذف (تہمت لگانے والا) قرار نہیں دیا جائے گا اور زنا (کا الزام جو لگایا گیا ہے وہ) ثابت ہو جائے گا۔ کیونکہ قاذف کی بات سچ مانی گئی اور بدکاری کرنے والی کو سزائے تازیانہ دی جائے گی۔ بشرطیکہ اس کے خلاف جو شہادت گزری ہے وہ مکمل ہو اور شہادت کی وہ تمام شرطیں پوری ہوتی ہوں جن کا ذکر پہلے آچکا ہے اور جن کی بناء پر شہادت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔

الزام زنا کی گواہی کا بیان

ائمہ فقہ کا اس پر اتفاق ہے کہ زنا کا الزام ثابت نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے چار گواہ نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”والانسی یاتین الفاحشة من نسائکم فاستشهدوا علیہن اربعة منکم“ (یعنی تمہاری عورتوں میں سے کسی عورت سے بے حیائی کا کام سرزد ہو تو اس کے خلاف اپنے آدمیوں میں سے چار اشخاص کی گواہی لو) نیز ارشاد باری ہے ”والذین یرمون المحصنات ثم لم یاتوا باربعة شہداء“ (یعنی جو لوگ شادی شدہ عورتوں پر تہمت لگائیں اور چار گواہ نہ پیش کر سکیں) پھر ارشاد ہے ”ولو لا جاؤا علیہ باربعة شہداء“ (یعنی الزام لگانے والے چار گواہ کیوں نہ لائے؟) اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کیا ”یا رسول اللہ! ارایت ان وجدت مع امراتی رجلاً أمهلہ حتی آتی باربعة شہداء؟ قال نعم“ (یعنی اے رسول اللہ! کیا آپ کا یہ ارشاد ہے کہ اگر میں اپنی بیوی کو کسی غیر مرد کے ساتھ دیکھوں تو اسے چھوڑ دوں یہاں تک کہ اس کے لیے چار گواہ پیدا کروں؟ فرمایا ہاں) واضح ہو کہ اس (گناہ کو ثابت کرنے) کے لیے چار گواہوں کی شرط اس لیے ہے۔ کہ اس کو جاننے سے چشم پوشی کی جاتی ہے۔ پس چار گواہوں کی قید اس بارے میں احتیاط کی غرض سے ہے اور اس لیے بھی کہ انسانی عزت و شرف پر اس (الزام) کا اثر پڑتا ہے۔ لہذا اس کو ثابت کرنے کے لیے با احتیاط اور چھان بین سے کام لینا ضروری ہے، بخلاف اور عیوب کے۔ پس جب گواہ قاضی (حاکم شرع) کے سامنے شہادت دے تو لازم ہے کہ وہ جرم بدکاری کرنے

والے مرد اور عورت کا نام لے اور بتائے کہ اس نے خود اس شخص کو عورت کے ساتھ دیکھا اور وہ یہ جانتا تھا کہ وہ عورت اجنبی ہے نیز یہ بھی لازم ہے کہ وہ گواہی دے کہ اس نے خود دیکھا ہے کہ اس شخص کا عضو مخصوص عورت کے اندام نہانی میں سرمہ دانی میں سلائی کی طرح داخل ہوا۔ اگر گواہوں نے بغیر اس تفصیل کے صرف یہ کہا کہ فلاں شخص نے بدکاری کی تو الزام ثابت نہ ہوا۔ کیونکہ بسا اوقات ران سے ران ملنے کو بھی 'زنا' خیال کر لیا جاتا ہے۔ بخلاف اس کے اگر کسی شخص پر تہمت لگائی گئی اور اس شخص نے اس جرم کا اقرار کر لیا اور یہ کہا کہ میں نے بد فعلی کا ارتکاب کیا ہے تو وہ مستوجب حد ہو جائے گا اور یہ سوال اس سے نہیں کیا جائے گا پس اگر کوئی شخص خود ارتکاب زنا کا اقرار کر لے تو آیا اس سے (مزید تفصیل) پوچھی جائے گی۔ اس میں دو باتیں ہیں ایک یہ کہ "ہاں" جس طرح گواہوں سے پوچھا جاتا ہے اس سے بھی سوال کیا جائے گا دوسرے یہ کہ (اقرار کے بعد) مزید پوچھ گچھ نہیں کی جائے گی۔ جیسا کہ تہمت لگانے کا اقرار کرنے کی صورت میں ہوتا ہے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ چاروں گواہ یکجائی طور پر شہادت دیں یا متفرق طور پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ ہر صورت چاروں گواہوں کا یکساں بیان مطلوب ہے خواہ وہ سب اکٹھے شہادت دیں یا متفرق طور دیں اور ایسا بیان جس میں سب مشترک ہوں اس میں امتیاز کو دخل نہیں ہے۔ پس اگر گواہ متفرق طور پر بیان دیں تو حکم پر عمل ہو جائے گا اور (گواہی کی) ذمہ داری پوری ہو جائے گی اور بدیں جہت کہ ہر ایک کا اجتماعی طور پر شہادت دینے سے حکم ثابت ہوتا ہے، اگر متفرق طور پر شہادت دیں تو دوسرے احکام کی طرح یہ بھی ثابت ہو جائے گا۔ بلکہ اس معاملہ میں متفرق طور پر شہادت کا گزرنا اور بھی بہتر ہے۔ کیونکہ اگر جدا جدا شہادتیں گزریں گی تو اس پر اعتراض بعید از قیاس ہو جائے گا کہ ایک گواہ کی بات سن کر دوسرے نے گواہی دی۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اگر گواہوں کی شہادت حاکم کے نزدیک مشتبہ ہو تو ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھا جائے تاکہ اگر گواہی میں کوئی خلا ہو تو اس کا پتہ چل جائے۔ اسی لئے تمام گواہوں کو ایک ہی حالت میں اکٹھی شہادت دینا واجب نہیں ہے۔ بلکہ جب تمام گواہ حاکم کے سامنے جمع ہو جائیں اور یکے بعد دیگرے پیش ہو کر گواہی دیں تو اسے تسلیم کیا جائے گا اسی طرح یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمام گواہ کمرہ عدالت کے دروازے پر جمع ہو جائیں اور ایک ایک کر کے (گواہی دینے کے لیے) انہیں اندر طلب کیا جائے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر تمام گواہ متفرق طور پر گواہی دیں تو ان کی گواہی تسلیم نہ کی جائے اور ان پر حد قذف عائد ہو گی۔ کیونکہ جب ایک گواہ نے گواہی دی اور (ہنوز باقی تین گواہ نہیں آئے) تو یہ تہمت لگانا ہوا چونکہ چار گواہ پیش نہیں ہوئے لہذا وہ گواہ مستوجب حد ہو گیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد "والذین یرمون المحصنات ثم لم یاتوا بأربعة شہداء فاجلدوہم ثمانین جلدۃ" (یعنی جنہوں نے بے گناہ عورتوں پر تہمت لگائی اور اپنے الزام کے ثبوت میں چار گواہ پیش نہ کیے انہیں اسی (۸۰) درے مارو) یہاں پر زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں قذف کو شہادت سے تعبیر کیا گیا ہے (یعنی قاذف کو شاہد کہا گیا ہے) لیکن (اگر قابل تسلیم شہادت کو تہمت نہ تصور کیا جائے تو) اس حالت میں سرے سے حد قذف ہی ساقط ہو جائے گی کیونکہ تہمت لگانے والے (تہمت کی بجائے) لفظ شہادت کے استعمال کرنے سے عاجز نہیں ہیں پس وہ اس کو وسیلہ بنا کر بے خبر بے گناہوں پر تہمت لگانے کے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔

گواہوں کی تعداد، چار سے کم ہونے کا بیان

مالکیہ کہتے ہیں کہ (اگر صحت الزام کے) گواہوں کی تعداد چار سے کم ہو تو الزام لگانے والوں کی بات کو تہمت قرار دیا جائے گا اور انہیں سزائے قذف دی جائے گی۔ اور ہر ایک کو اسی (۸۰) دروں کی سزا ہوگی جیسا کہ آیت شریفہ میں آیا ہے ”والذین یؤمنون بالمحصات ثم لم یاتوا بأربعة شہداء فاجلدوہم ثمانین جلدۃ“ (یعنی جو لوگ بے گناہ عورتوں پر تہمت لگائیں اور چار گواہ پیش نہ کر سکیں انہیں اسی (۸۰) درے لگاؤ)۔

حنفیہ، حنابلہ اور شافعیہ کے اقوال کے منجملہ یہ بھی ہے کہ اگر گواہوں کی تعداد چار سے کم ہو تو انہیں تہمت لگانے والے تصور نہیں کیا جائے گا اور ان پر حد قذف نافذ نہ ہوگی کیونکہ وہ لوگ بطور گواہ پیش ہوئے ہیں، تہمت لگانے والے نہیں ہیں۔ لہذا ان پر کوئی جرم عائد نہ ہوگا اور شہادت پر زنا کا دروازہ بند کر دیا جائے گا۔

شافعیہ کا ایک دوسرا قول یہ بتایا جاتا ہے کہ اگر حاکم کی عدالت میں کسی شخص کے خلاف چار گواہوں سے کم نے زنا کی شہادت دی تو قوی تر مسلک کی رو سے ان پر حد قذف لاگو ہوگی۔ اس لیے کہ سیدنا حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان تین شخصوں کو سزائے قذف دی جنہوں نے حضرت مغیرہ بن شعبہ کے خلاف بدکاری کی شہادت دی۔ اس کا ذکر بخاری نے اپنی صحیح میں کیا ہے اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے کسی نے اس حکم کے خلاف آواز نہیں اٹھائی پھر یہ حکم اس لیے بھی ہے کہ مبادا شہادت سے لوگوں کو دوسروں کی آبروریزی کا موقع مل جائے اور ان پر حد بھی عائد نہ ہو پس یہ حکم ان ذرائع کا سد باب کرنے کی غرض سے ہے۔

واضح ہو کہ اس مسئلہ میں اختلاف اس صورت میں ہے جبکہ شہادت حاکم شرع کی عدالت میں ہو۔ اگر کوئی اس قسم کا بیان کسی اور جگہ دے تو یقیناً اسے قاذف (تہمت تراش) قرار دیا جائے گا۔ اگرچہ اس تہمت کو شہادت (گواہی) سے تعبیر کیا جائے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے بیان کا مقصد بہتان لگانے اور اس کا چرچا کرنے کے سوا نہیں ہے۔

گواہوں کے فاسق ہونے کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر تہمت لگانے والا اپنے دعوے کے ثبوت میں مقذوف (جس پر تہمت لگائی گئی) کے خلاف چار گواہ ایسے پیش کر دے جو فاسق ہوں تو سزائے قذف ساقط ہو جائے گی اور گواہوں پر بھی یہ حد عائد نہ ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”ثم لم یاتوا بأربعة شہداء“ (یعنی تہمت لگانے والے چار گواہ نہ پیش کر سکیں تو.....) لیکن اس صورت میں چار گواہ تو پیش کر دیئے گئے لہذا اس آیت کی رو سے حد واجب نہ رہی۔ اور اس لیے بھی کہ گواہی فاسق کی بھی ہو سکتی ہے امور ثبوت زنا کی گواہی کی شرائط پائی گئیں مثلاً حاکم شرع کے سامنے ان کا حاضر ہونا۔ تاہم حاکم ان کی گواہی اس لیے قبول نہیں کرتا کہ ان پر گنہگار ہو۔ نہ کا الزام ہے۔ پس جبکہ گواہوں کی اس خامی کی بناء پر مقذوف کو حد سے بری کیا جاتا ہے تو اسی بناء پر گواہوں کو بھی حد سے بری رکھا جائے گا۔

شافعیہ کے اقوال کے منجملہ ایک یہ ہے کہ (ایسے) گواہوں پر حد لاگو ہوگی کیونکہ ان کی شہادت کے تسلیم کیے جانے کی شرطیں ان میں نہیں پائی جاتیں لہذا ان کو گواہوں کے زمرہ سے خارج قرار دیا جائے گا، تہمت لگانے والے متصور ہوں گے۔ شافعیہ کے ایک دوسرے قول کے مطابق ان پر حد قذف نافذ نہ ہوگی جیسا کہ حنفیہ کا مسلک ہے۔

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ (مرد کے) ایک بار یا بقول ضعیف عورت کے دوبار اقرار کرنے اور دوسرے گواہوں کی

شہادت ہو جانے سے حد قذف واجب ہو جائے گی نیز اس پر بھی علماء متفق ہیں کہ اگر بات پرانی ہو جائے یا تہمت لگانے والا اپنے بیان سے رجوع کرے تو حد قذف باطل نہ ہوگی کیونکہ یہ حق العبد کا معاملہ ہے۔ وہ (مقذوف) اس رجوع کو رد کر سکتا ہے۔

تہمت لگانے میں مبالغہ سے نام لینے کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے (بخطاب مرد) کہا یا زانیہ بتائے تانیث (یعنی اے زنا کرنے والی) تو اس شخص کو قاذف (تہمت لگانے والا) قرار نہ دیا جائے گا اور اس پر حد لاگو نہ ہوگی کیونکہ اس الزام کا اطلاق اس پر ناممکن ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی ایسے کو (زنا کار) کہا جائے جس کا عضو مخصوص کٹا ہوا ہو یا عورت رتقاء (یعنی ناقابل مجامعت) ہو، اس پر حد لاگو نہ ہوگی۔ اسی طرح اگر گونگے شخص پر تہمت لگائی گئی تو وہ شخص مستوجب حد نہ ہوگا، کیونکہ ممکن ہے کہ اگر وہ بول سکتا تو الزام کی تصدیق کر دیتا (اور الزام نہ رہتا) اول الذکر دونوں صورتوں میں تہمت لگانے والے کا جھوٹ یقینی طور پر ثابت ہے۔ لہذا عیب جو لگایا گیا وہ اذ خود جاتا رہا۔ یہی حکم اس صورت میں ہے جبکہ یوں کہا کہ تو فلاں شخص سے زیادہ زنا کار ہے یا یہ کہا کہ تمام زانیوں میں سب سے زیادہ زانی ہے۔ یا زانیوں میں سب سے بڑا زانی ہے کیونکہ اس طرح کے صیغہ مبالغہ کا استعمال واقفیت میں فوقیت ظاہر کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ پس یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ ”انت اعلم بہ“ (یعنی تو اس بات سے زیادہ واقف ہے) پس اس میں تہمت مشتبہ ہے لہذا حد لاگو نہ ہوگی۔ لیکن اگر عورت سے (بصیغہ مذکر) کہا کہ اے زانی تو وہ مستوجب حد ہوگا کیونکہ کلام میں ترجیح کا طریقہ رائج ہے (یعنی امور مشترکہ میں بالعموم مذکر کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے)۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر مرد کو یا زانیہ کہہ کر خطاب کیا جائے تو وہ مستوجب حد ہوگا کیونکہ یہ لفظ تہمت میں مبالغہ کے لیے ہے لفظ زانیہ میں جو ’و‘ آئی ہے وہ (تانیث کے لئے نہیں بلکہ) مبالغہ کے لیے ہے جیسے علامۃ اور نسابۃ میں ہے (جس کے معنی ہیں بہت زیادہ علم رکھنے والا اور بہت زیادہ نسب کو جاننے والا)۔

اگر کسی شخص نے عضو بریدہ مرد پر یا زن رتقاء پر (جو مباشرت کے قابل نہیں رہتی) یا خنثی مشکل پر (جس کی جنس متعین نہ کی جاسکے) تہمت زنا لگائی تو وہ شخص مستوجب حد نہ ہوگا۔ البتہ اگر پیچھے کی راہ سے بدفعی کا الزام لگایا تو اسے تہمت قرار دیا جائے گا اور سزائے قذف ہوگی کیونکہ اس کا عیب لگانا زنا کے عیب کی مانند ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر عضو بریدہ پر یا نامرد پر یا ایسی عورت پر جس کے اندام نہانی پر ہڈی ہو (یعنی رتقاء کی مریضہ جس کے ساتھ مجامعت ممکن نہیں ہے) زنا کا الزام لگایا تو حد عائد نہ ہوگی۔ لیکن اگر اغلام کا الزام لگایا تو وہ مجرم قذف اور مستوجب حد ہوگا، یہی حکم نامرد یا خنثی مشکل کے ساتھ بدفعی کے الزام کا ہے۔ کیونکہ مالکیہ کہتے ہیں کہ حد قذف لاگو ہونے کے لیے مقذوف میں مندرجہ سابقہ متفق علیہ شرائط کے علاوہ ان چار باتوں کا پایا جانا بھی ہے۔

۱۔ مرتکب کا بالغ ہونا ۲۔ عورت کا قابل مجامعت ہونا اور اس کا حال معلوم ہونا جس کے ساتھ ارتکاب گناہ ہوا ۳۔ مقذوف کا عاقل اور بے گناہ ہونا ۴۔ آکہ ارتکاب کا ہونا۔ اگر (مقذوف) کہے کہ میں عقیف الفرج (یعنی پاک دامن) ہوں تو قاذف پر حد واجب ہوگی۔ اگر اس نے اندام نہانی کا ذکر نہیں کیا تو (قاذف) مستوجب حد نہ ہوگا بلکہ تعزیر کی

جائے گی۔ کیونکہ عقیف ہونے (یعنی بچنے) کا تعلق اندام نہانی کے علاوہ اور اشیاء مثلاً ظرف طعام سے بھی ہو سکتا ہے۔ اگر (مخطاب زن) کہا اے مجھ (پیار کرنے والی) یا اے بدکاریا اے زنا کاریا اے چھو کری (لوپچی) جو بالعموم بدکاری کے مفہوم پر مشتمل ہیں تو ایسا شخص مستوجب حد ہوگا۔ اگر کہا اے علق بکسر عین۔ (یعنی سوہنی یا بیش بہا) یا کہا اے منخت (بیہجرا) تب بھی مستوجب حد ہوگا، کیونکہ ان الفاظ سے مراد بد فعلی کرانے والا ہے پس اگر مقذوف بدکاری کے قابل ہے اور تہمت لگانے والے پر حد کا مطالبہ کرتا ہے تو اس پر حد لاگو ہوگی۔

بار بار اتہام لگانے کا بیان

ائمہ فقہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر ایک شخص نے کسی پر متعدد بار تہمت لگائی۔ خواہ ایک ہی جگہ یا مختلف جگہوں پر اور ایک طرح کے الفاظ یا مختلف الفاظ میں اور ایک شخص پر یا متعدد اشخاص پر تو بار بار تہمت لگانے والے کو بار بار سزائے قذف نہیں دی جائے گی۔ بلکہ ایک ہی بار حد لاگو ہوگی۔ اسی طرح اگر ایک شخص پر دو تہمتیں لگائیں تب بھی ایک ہی بار حد واجب ہوگی۔ البتہ اگر سزائے قذف پانے کے بعد دوبارہ کسی پر تہمت لگائی تو حد بھی دوبارہ لاگو ہوگی اگرچہ صریح الفاظ میں نہ لگائی ہو، بایں طور کہ سزائے قذف بھگتنے کے بعد اس نے کہا کہ میں نے بخدا جھوٹ نہیں کہا تھا، یا یہ کہا کہ میں نے (فلاں کے بارے میں) جو کچھ کہا تھا میں اس میں یقینی طور سچا ہوں۔ یا ایسی ہی باتیں کہیں ہوں جن سے جرم زنا کا الزام مفہوم ہوتا ہو کیونکہ یہ حد اول کے بعد نئی حد بھی جائے گی۔ غرض اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ اگر کسی نے ایک بار تہمت قذف میں سزا پانے کے بعد پھر تہمت لگائی تو دوسری بار مستوجب حد ہوگا اور اگر تیسری بار تہمت لگائی تو تیسری بار پھر حد لاگو ہوگی اور اسی طرح آئندہ بھی۔

کسی جماعت پر تہمت لگانے کا بیان

حنفیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے ایک گروہ پر تہمت لگائی، خواہ ایک جگہ یا مختلف جگہوں پر۔ ایک ہی جیسے الفاظ میں یا مختلف الفاظ میں۔ اجتماعی طور پر یا متفرق طور پر تو ایک بار ہی حد قذف ملے گی۔ لہذا (جماعت میں سے) کسی ایک پر تہمت لگانے کی پاداش میں جو سزائے قذف ملے گی وہ تہمت کے جتنے الزامات تھے سب کی سزا متصور ہوگی اور بعد میں جرم قذف کا جو الزام عائد کیا گیا اس کی عطلہ سزا نہ ہوگی بلکہ بعد میں عائد شدہ الزامات کی سزا بھی اس میں شامل ہوگی۔ فقہاء نے اس کی دلیل قرآن سے یہ پیش کی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”وَالسَّادِیْنَ بِرْمُونِ الْمَحْصَنَاتِ“ (یعنی جو لوگ بے گناہ عورتوں پر الزام لگاتے ہیں.....) اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھی بے گناہ عورتوں پر الزام لگائے اس پر حد واجب ہوگی۔ اس عبارت کا تقاضا یہ ہے کہ پاک دامن (یا بے گناہ) عورتوں کی جماعت پر الزام لگانے والے کو اسی (۸۰) دروں سے زیادہ کی سزا نہیں ہے۔ اب اگر کوئی شخص بے گناہ عورتوں کی جماعت پر تہمت لگانے والے کو ایک حد قذف سے زیادہ کی سزا قرار دے تو یہ آیت شریفہ کے خلاف ہوگا۔

سنت کی رو سے اس کی دلیل وہ روایت ہے جو حضرت عکرمہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں ”ان ہلال بن امیہ قذف امراتہ عند النبی ﷺ، بشریک بن سمحاء، فقال النبی ﷺ اما البینة او حصد فی ظہرک“ (یعنی ہلال بن امیہ نے رسول ﷺ کے سامنے اپنی بیوی پر شریک بن سمحاء کے ساتھ ملوث ہونے

کی تہمت لگائی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یا تو اس کے گواہ پیش کرو یا پیٹھ پر درے کھاؤ (یہاں پر رسول اللہ ﷺ نے صرف ایک حد جاری فرمانے کا حکم دیا حالانکہ ہلال بن امیہ نے اپنی بیوی اور شریک بن سحاء دونوں پر تہمت لگائی تھی۔ اس کے بعد لعان والی آیت نازل ہوئی جس میں بیوی پر تہمت لگانے کی صورت میں حد کی بجائے لعان کا حکم ہے۔ اور اس کے لیے دلیل قیاس یہ ہے کہ جرائم مستوجب حد میں اگر متعدد بار ارتکاب جرم کیا جائے تو ایک بار حد کافی ہے جیسے کہ جو کئی بار زنا کرے یا کئی بار شراب پیے یا کئی بار چوری کرے اور ابھی اس پر حد نہ قائم کی ہو تو ایک حد ہی کافی ہے۔ اور تمام سزاؤں کے نفاذ کی متفقہ طور پر ایک غرض ہے کہ معاشرہ کو خرابی سے محفوظ رکھا جائے سو وہ غرض اس طرح حاصل ہو جاتی ہے۔ پس اگر کسی پر ایک بار یہ جرم عائد ہوا اور اسے درہ زنی کی سزا دی گئی تو یہ تہمت کے ان تمام جرائم قذف کی پاداش میں ہوگی جو اس ارتکاب جرم سے قبل اس سے سرزد ہوئے۔

اگر کسی نے لوگوں سے کہا کہ ایک کے سوا تم سب زنا کار ہو تو وہ شخص مستوجب حد قذف ہوگا کیونکہ اس سزا کا موجب اتہام ہے اور جنہیں تہمت لگائی گئی ان میں سے ہر ایک کو سزائے قذف کے مطالبہ کا حق ہے۔

شافعیہ کی ایک دوسری رائے یہ ہے کہ ہر ایک جرم کی پاداش میں جداگانہ حد نافذ ہوگی کیونکہ ہر الزام کا جداگانہ مقذوف ہے (جس پر تہمت لگائی گئی ہے)۔ آیت شریفہ میں لفظ ”والذین“ بصغیہ جمع (یعنی جو لوگ) آیا ہے۔ اسی طرح ”والمحصنات“ (بے گناہ عورتیں) بھی بصغیہ جمع آیا ہے اور جب جمع کے مقابلہ میں جمع آئے تو ہر فرد کے مقابلہ میں فرد تصور کیا جاتا ہے لہذا آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ تم میں سے جس نے محصنات میں سے کسی فرد واحد پر تہمت لگائی وہ مستوجب حد ہے۔ اسی طرح انہوں نے اللہ کے ارشاد سے بھی اخذ فرمایا ہے ”والذین یرمون المحصنات ثم لم یاتوا بأربعة شہداء فاجلدوہم ثمانین جلدۃ“ (یعنی جو لوگ بے گناہ عورتوں پر الزام لگاتے ہیں اور چار گواہ پیش نہیں کر سکتے انہیں اسی (۸۰) کوڑے مارو) اس سے ثابت ہوا کہ سزائے عتاز یا نہ نتیجہ ہے بے گناہ پر الزام لگانے کا بایں طور کہ جب کبھی کسی پر یہ صفت منطبق ہوگی اس پر سزائے درہ واجب ہو جائے گا پھر دوسری بار کی تہمت پہلی سزائے قذف کا موجب نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ سزا پہلی بار تہمت لگانے کی پاداش میں واجب ہوئی تھی۔ اور واجب کو پھر واجب کرنا ممکن نہیں ہے لہذا دوسری بار تہمت لگانے کی پاداش میں دوسری بار حد واجب ہوگی۔ اور قاعدہ کی رو سے تہمت کی سزا انسان کا حق ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ حد قذف نافذ العمل نہیں ہوتی جب تک کہ مقذوف (جس پر تہمت لگائی گئی) مطالبہ نہ کرے۔ اور آدمی کے حق میں مداخلت نہیں کی جاسکتی۔ بخلاف اس کے زنا کی پاداش میں حد کا مطالبہ اللہ کا حق ہے (یعنی بدکار اللہ کا مجرم ہے کوئی شخص مطالبہ نہ کرے تب بھی بدکار مستوجب حد ہوگا)۔

یہ تمام بحث اس صورت میں ہے جبکہ کسی شخص نے ایک جماعت پر تہمت لگائی اور ہر ایک کے لیے جداگانہ الفاظ استعمال کئے ہوں۔ اگر ایک ہی عبارت میں تہمت لگائی مثلاً یوں کہا کہ ”تم لوگ زانی ہو“ یا ”تم سب نے زنا کیا“ تو اس بارے میں دو اقوال ہیں ان میں صحیح ترین قول جو جدید ہے وہ یہ ہے کہ ہر ایک تہمت پر مکمل سزائے قذف ہوگی کیونکہ یہ حقوق العباد ہیں اور ان میں دخل اندازی جائز نہیں ہے اور اس لیے بھی کہ اس نے ہر ایک کو تہمت کا نشانہ بنایا ہے، جیسا کہ بالفاظ مختلف تہمت لگانے میں ہوتا ہے اور قول قدیم یہ ہے کہ سب پر تہمت لگانے کی پاداش میں ایک ہی بار سزائے قذف ہوگی۔ کیونکہ سب کے لیے ایک ہی عبارت میں تہمت لگائی گئی ہے۔ اول الذکر کے صحیح ہونے کا سبب یہ ہے کہ وہ مفہوم

آیت کے زیادہ موافق ہے اسی بناء پر اگر ایک شخص نے کسی کو کہا کہ ”اے زنا کاروں کی اولاد“ تو یہ اس کے باپ اور ماں دونوں پر تہمت ہے اور دونوں کے لیے ایک ہی لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس شخص پر دوسرائیں تہمت لگانے کی عائد ہوں گی۔

حنابلہ کی روایتوں میں سب سے قوی یہ ہے کہ اگر سب پر ایک لفظ میں تہمت لگائی گئی تو ایک ہی سزائے قذف سے سب کی سزا پوری ہو جائے گی اگر مختلف عبارتوں میں تہمت لگائی گئی تو ہر ایک کے عوض جدا گانہ سزا ہوگی۔

حنابلہ کی ایک دوسری روایت کے بموجب ان کا کہنا ہے کہ اگر مقذوف اشخاص (جن پر تہمت لگائی گئی ہو) الگ الگ سزائے قذف کا مطالبہ کریں تو ہر ایک کی سزا بھی جدا جدا ہوگی اور اگر مقذوفوں کا مطالبہ نہ ہو تو سب کے عوض ایک ہی سزائے قذف واجب ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص کو تہمت کی سزا مل رہی ہو اور سزا کے دوران اس مجرم نے پھر تہمت لگانے کا ارتکاب کیا خواہ اسی شخص کو لگائی ہو (جس کی پاداش میں سزا پارہا ہے) یا کسی اور کو لگائی ہو تو اس وقت تک جو سزا ملی ہے وہ رائیگاں جائے گی اور اب دونوں جرموں کی سزا از سر نو یکے بعد دیگرے دی جائے گی۔ ہاں اگر وہ سزا جو جاری تھی وہ نصف سے کم رہ گئی ہو اور پندرہ ضربیں باقی ہوں تو پہلی سزا کو مکمل تصور کر لیا جائے گا اور دوسری بار جرم تہمت کی سزا شروع کی جائے گی۔ اور اس کو مکمل کیا جائے گا۔ پس مالکیہ کے نزدیک یہ صورت متداخل سزا کی ہے (یعنی ایک جرم کی سزا میں دوسرے جرم کی سزا شامل ہو جائے گی)۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ سزائوں میں متداخل ہوتا ہے (یعنی دو جرم قذف کی سزا کٹھی دی جائے) چنانچہ اگر (ایسا ہو کہ) قاذف کو ہنوز اسی (۷۹) ضربیں لگائی گئی تھیں کہ اس نے دوبارہ جرم قذف کا ارتکاب کر لیا تو اب صرف ایک ضرب اور لگا کر اسی (۸۰) دروں کی حد پوری کی جائے گی۔ یعنی دوسرے جرم قذف کی سزا پہلے جرم قذف کی سزا کے ساتھ شامل ہو جائے گی کیونکہ پہلی سزا کو ایک ضرب جو باقی تھی لگا کر حد کی مقدار پوری کر دی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ابن ابی لیلیٰ نے ایک شخص کی بابت سنا کہ اس نے کسی کو ابن الزانیین (یعنی زنا کار ماں باپ کی اولاد) کہا۔ انہوں نے اس شخص کو مسجد میں ایک ہی ساتھ دوہری سزائے قذف دی۔ جب امام ابو حنیفہ کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ ہمارے شہر کے قاضی کو کیا ہو گیا کہ اس نے ایک مسئلہ کے نفاذ میں پانچ غلطیاں کیں: ایک یہ کہ مقذوف کو (جسے تہمت لگائی گئی) طلب نہیں کیا۔ دوسرے یہ کہ اگر وہ دعویٰ کرتا تو ایک ہی حد واجب ہوتی۔ تیسرے یہ کہ اگر ابو لیلیٰ کے نزدیک دوہری سزا واجب تھی تو لازم تھا کہ دونوں سزائوں کے درمیان ایک دن کی مہلت دیتے تاکہ مجرم پر ضربات کی تکلیف ہلکی ہو جاتی۔ چوتھے یہ کہ انہوں نے مسجد کے اندر یہ سزا دی۔ پانچویں یہ کہ تصدیق کرنا تھا کہ اس شخص کے ماں باپ زندہ ہیں یا نہیں؟ اگر زندہ ہوتے تو ان ہی کو دعویٰ کا حق ہے۔ وہ زندہ نہ ہوں تو دعویٰ کا حق بیٹے کو تھا۔

اگر کسی غلام نے ایک آزاد شخص پر تہمت لگائی اور اس کے بعد وہ غلام آزاد ہو گیا اور آزاد ہونے کے بعد پھر جرم تہمت کا ارتکاب کیا تو بحیثیت مجموعی اسی (۸۰) دروں کی سزا ہوگی اور اگر پہلے جرم کی پاداش میں اسے چالیس ضرب تازیانہ کی سزا مل گئی اور اس کے بعد پھر اس نے الزام لگایا تو اسی (۸۰) درے پورے کئے جائیں گے کیونکہ پہلی چالیس ضربوں میں دونوں جرائم کی سزا ایک ساتھ متصور ہوں گی اور پالیس ضربیں باقی تھیں۔ اگر دوسرے جرم قذف کی سزا پانے

سے پہلے ارتکاب جرم قذف کیا تو مجموعی طور پر اسی (۸۰) دروں کی سزا ہوگی اور از سر نو اسی (۸۰) دروں کی سزا نہ ہوگی کیونکہ باقی تمام سزا آزاد شخص کے جرم کی سزاتھی۔ اور یہ جائز ہے کہ بحیثیت آزاد شخص کے جو سزاملی ہے وہ اس میں شامل ہوگی اور یہ اس لئے ہے کہ تہمت لگانے کی سزاؤں میں تداخل ہو سکتا ہے (یعنی دو سزائیں ایک ساتھ دی جاسکتی ہیں)۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر مقذوف (جس پر تہمت لگائی گئی) اور مقذوف بہ (جس بات کی تہمت لگائی) یعنی زنا (ایک ہی واقعہ سے متعلق نہیں بلکہ) مختلف واقعات ہیں تو سزائیں بھی ایک ساتھ نہ ہوں گی۔ کیونکہ سزائے قذف زیادہ تر حق العبد پورا کرنے کے لئے ہوتی ہے پس اگر ایک جماعت پر مختلف الفاظ میں تہمت لگائی (یعنی الزام کی نوعیت مختلف تھی) اور ہر شخص پر جدا جدا گناہوں کے الزام لگائے تو ہر تہمت پر سزائے قذف واجب ہوگی۔

نابالغ (لڑکے) یا جنون زدہ کا اپنی بیوی پر تہمت لگانا

اگر کسی لڑکے (نابالغ) یا جنون زدہ نے اپنی بیوی پر یا کسی اور عورت پر اتہام لگایا تو اس پر نہ حد عائد ہوگی اور نہ لعان ہوگا نہ تو اس حالت میں اور نہ بعد میں بالغ ہونے پر کیونکہ ایسے اشخاص غیر مکلف (احکام شریعت کی بجا آوری سے مستثنیٰ) ہیں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”رفع القلم عن ثلاث“ (یعنی تین اشخاص پابندی احکام سے مستثنیٰ ہیں)۔ ان تین میں سے دو یہ ہیں تاہم اگر ان میں شعور ہے تو انہیں تعزیر ہوگی۔ اگر لڑکے کے بالغ ہونے (یا مجنون کے افاقہ پانے) تک بھی (سرزنش) کا موقع نہ ملا تو یہ سزا بھی ساقط ہو جائے گی۔

گونگے کا کسی کو تہمت لگانا

حنفیہ کہتے ہیں کہ گونگے کی تہمت درست ہے اور نہ اس کا لعان کرنا صحیح ہے۔ پس اسے مستوجب سزا قرار نہیں دیا جائے گا۔ کیونکہ اس کا اشارہ ناقابل فہم ہوتا ہے اور اس (کے سمجھنے) میں شک و شبہ کی گنجائش ہوتی ہے اور جب (جرم میں) شبہ ہو جائے تو سزا ساقط ہو جاتی ہے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی گونگے کا اشارہ قابل فہم ہو یا اس کی تحریر سمجھی جاسکے اور وہ کسی بے گناہ مرد یا عورت پر اشارہ یا تحریر سے الزام لگائے تو مستوجب حد ہوگا اور اس کا لعان کرنا بھی درست ہوگا۔ یہی قول آیت کریمہ کے ظاہری مفہوم کے مطابق ہے کیونکہ اگر کسی نے تحریر یا اشارے کے ذریعے تہمت لگائی اور وہ سمجھی جاسکی تو گویا بے گناہ پر تہمت لگا کر اس کی بے عزتی کا موجب ہوا۔ لہذا اس کے فعل کو علانیہ ارتکاب جرم قرار دیا جائے گا نیز اس کی تہمت اور لعان کو بھی دوسرے احکام کی طرح اس پر عائد کیا جائے گا۔

کافر (غیر مسلم) کے بہتان لگانے کا بیان

جملہ ائمہ فقہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا اس پر اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت شریفہ ”والذین یرمون المہحسنات“ میں جو ارشاد فرمایا ہے وہ عام ہے اور کافر اس کے تحت آتے ہیں کیونکہ اسم موصول (والذین) یعنی ”جو لوگ“ میں کافر (غیر مسلم) شامل ہیں اور انہیں اس حکم کے تحت لانے میں کوئی امر مانع نہیں ہے لہذا اگر کوئی عیسائی یا یہودی کسی مسلمان پر تہمت لگائے تو ایسے بھی مسلمان کی طرح اسی (۸۰) درے لگائے جائیں گے۔

اگر کوئی حربی (دشمن قوم کا فرد) اسلامی ملک میں پناہ گیر ہو اور وہ کسی مسلمان پر تہمت لگائے تو وہ بھی مستوجب حد ہوگا کیونکہ یہ حق العباد کا معاملہ ہے اور حق العباد کا ادا کرنا لازم ہے اور چونکہ اس حربی کو یہ توقع ہے کہ اسے ایذا نہیں دی جائے گی لہذا لازم ہوگا کہ وہ بھی کسی کو ایذا نہ دے۔

کسی مجوسی کے مسلمان ہو جانے کے بعد اس پر تہمت لگائی جانے کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے کسی مجوسی (آتش پرست) پر جس نے اپنی ماں، بہن یا بیٹی کو بیوی بنا لیا اور پھر مسلمان ہو گیا اور ان کا نکاح ٹوٹ گیا۔ اب اگر کسی مسلمان نے اس پر الزام لگایا تو اس مسلمان پر حد قذف لاگو ہوگی کیونکہ مجوسی کا ایسا نکاح کر لینا ان کے نزدیک صحیح تھا۔

شافعیہ مالکیہ اور حنابلہ رحمہم اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان کسی مجوسی پر اس کے مسلمان ہو جانے کے بعد الزام لگائے تو اسے سزائے قذف نہ ہوگی کیونکہ اس کے نزدیک ان کے اس طرح کے نکاح صحیح نہیں ہیں لہذا مجوسی بے گناہ متصور نہ ہوگا (اور جو گناہ گار ہو اس پر تہمت لگانے والا مستوجب حد نہیں ہوتا)۔

مقذوف کے وفات پا جانے کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ سزائے قذف (کے مطالبہ) کا حق ورثہ میں نہیں ملتا بلکہ اگر سزائے قذف پانے سے پہلے مقذوف (جس پر تہمت لگائی گئی ہے) وفات پا جائے تو مطالبہ ختم ہو جاتا ہے اور اگر کسی قدر سزا مل چکی ہو اور مقذوف وفات پا جائے تو باقی سزا ساقط ہو جائے گی۔ کیونکہ سزائے قذف حق اللہ (یعنی مطالبہ حق) ہے اور کتاب و سنت سے کوئی ثبوت اس کا نہیں ملتا کہ مقذوف کے وارث یا وصی (یعنی جسے وصیت کی گئی ہو) از روئے شرع قاذف پر نفاذ حد قذف کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ اور یہ بھی ہے کہ اگر سزائے قذف کے مطالبہ کا حق ورثہ میں ملتا تو خاوند یا بیوی کو اس کا حق پہنچتا (یعنی خاوند کو اپنی وفات یافتہ بیوی کی طرف سے اور بیوی کو اپنے وفات یافتہ خاوند کی طرف سے مطالبہ حد قذف کا حق ملتا) نیز یہ بھی ہے کہ یہ حق ایسا ہے جو مال یا جائداد جیسا نہیں ہے۔ پس اس میں وراثت نہیں چلے گی جیسے وکالت اور مضاربت (شراکت) میں نہیں چلتی نہ اس کے عوض مال کا مطالبہ ہو سکتا ہے۔ اس بارے میں تہمت لگانے والے سے قسم نہیں لی جاتی اور مملوک ہونے کی صورت میں مطالبہ نصف نہیں رہ جاتا۔ (یعنی وراثت کی خصوصیات اس میں نہیں پائی جاتیں)۔

شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ مطالبہ سزائے قذف کا حق وارثوں کو پہنچتا ہے چنانچہ اگر تہمت کی پوری سزا ابھی نہ ملی ہو اور مقذوف وفات پا جائے تو باقی سزائے قذف پوری کی جائے گی نیز مقذوف کے وارث کو سزائے قذف کے معاف کر دینے کا حق ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر مجرم کسی تعزیر کا سزاوار ہو تو اس کے مطالبہ کا حق بھی وارث کو حاصل ہوتا ہے نیز اگر مورث کی وفات کے بعد اس پر تہمت لگائی جائے تو وارث کو مطالبہ حد کا حق ہے۔ کیونکہ سزائے قذف حقوق العباد میں سے ہے کہ اس کے معاف کر دینے سے سزا ساقط ہو جاتی ہے اور اگر مقذوف اس کا مطالبہ نہ کرے تو پوری سزا نہیں دی جاتی اور اگر مدعی (الزام سے) انکار کرے تو اسے قسم کھانی پڑتی ہے اور جہاں کہیں بھی انسان کو حق حاصل ہوتا ہے وہ حق (وفات کے بعد) اس کے وارثوں کو حاصل ہو جاتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ”ومن ترک حقاً

فلورثہ“ (یعنی جب کوئی شخص اپنا حق چھوڑ جائے تو وہ حق اس کے وارثوں کو ملے گا) اور اگر کوئی واقعہ دیر کا ہو تو اس کی گواہی باطل نہیں ہوتی بلکہ جسے ذمہ دار بنایا جاتا ہے اس پر واجب الادا ہوتی ہے اور اقرار کے بعد اس سے پھر نادراست نہیں ہے۔ واضح ہو کہ اصحاب شافعیہ کے نزدیک وارثوں کی تین صورتیں ہیں:

پہلی صورت جو شافعیہ کے نزدیک صحیح ترین ہے یہ ہے کہ تمام ہی ورثا کو (مطالبہ سزا) کا حق ہو جیسا کہ مال کی وراثت میں ہوتا ہے۔ اس میں مردوں اور عورتوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوتا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ یہ حق نسلی ورثہ کو حاصل ہو۔ اس صورت میں زوجین اس زمرہ سے خارج ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ میاں یا بیوی کا ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جانا ممکن ہے اور ایک فریق دوسرے فریق کو بدل سکتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ وفات کے بعد رشتہ از دواج منقطع ہو جاتا ہے۔ نیز یہ کہ حد نافذ کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ نسلی عیب کو (جو لگایا گیا ہے) دور کیا جائے اور یہ عیب میاں بیوی میں سے ایک پر لگنے سے دوسرے کو نہیں لگتا۔ کیونکہ ان میں باہم دور کی قرابت داری ہوتی ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ یہ حق (مطالبہ سزائے قذف) صرف مرد قرابت داروں کو پہنچتا ہو عورتوں کو نہیں کیونکہ ان میں باہم ایک کو دوسرے سے تقویت حاصل ہوتی ہے اور ان کا باہمی ربط و تعلق مقذوف کے ساتھ زیادہ اور مستحکم ہوتا ہے۔ لیکن اس قول پر دوسرے اقوال کو ترجیح حاصل ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ مقذوف کو حق ہے کہ وہ تہمت لگانے والے پر نفاذ حد کا مطالبہ کرے۔ اگرچہ وہ جانتا ہو کہ الزام درست ہے کیونکہ الزام لگانے والے نے اس کی نیک نامی کو نقصان پہنچایا ہے اور قاذف کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ مقذوف سے بریت الزام کی بابت حلف لے اور مقذوف کے ورثاء کو یہ حق ہے کہ ان کے مورث پر جو تہمت وفات سے پہلے لگائی گئی تھی قاذف کے خلاف سزائے قذف کا دعویٰ کرے۔ خاص کر اس صورت میں جبکہ مرنے والے نے مطالبہ نفاذ حد کی وصیت کی ہو۔ اس حالت میں وارث نہ تو معافی دے سکتا ہے اور نہ معاملہ کو رفت و گزشت کر سکتا ہے بلکہ واجب ہے کہ حاکم سے نفاذ حد کا مطالبہ کرے اور یہ حق دور کے وارث مثلاً پوتے کو بھی حاصل ہے کہ وہ اپنے مورث (بعید) کے حق مطالبہ سزا کا دعویٰ کرے۔ تاہم اس بارے میں بیٹے کا حق مقدم ہے۔ اس کے بعد پوتے پڑپوتے وغیرہ کا حق ہے۔ بشرطیکہ قریب ترین رشتہ دار خاموشی اختیار کر لیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قریبی رشتہ داروں کی موجودگی میں بھی دور کے رشتہ دار قاذف کی سزا کا مطالبہ کر سکتے ہیں گو قریبی رشتہ دار بھی خاموش نہ ہوں کیونکہ تہمت تو قریب بعید سب رشتہ داروں کی بدنامی کا موجب ہے۔ اس بارے میں ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن زوجین میں سے کسی ایک کو حق نہیں ہے کہ دوسرے فریق کے حق مطالبہ سزا کو استعمال کرے۔ کیونکہ ان میں سے کوئی دوسرے کا ولی (سربراہ) نہیں ہوتا۔ اور ایک کی وفات کے بعد (اس کی بدنامی) دوسرے پر عائد نہیں ہوتی۔ بجز اس صورت کے جبکہ زوجین میں سے کسی نے دوسرے کو اپنی وفات سے پہلے وصیت کی ہو کہ جس نے اس پر تہمت لگائی ہے اس پر حد لگائی جانے کا مطالبہ کرے ایسی صورت میں اسے یہ حق ہوگا کہ قاذف کی سزا کا مطالبہ کرے۔ کیونکہ وصیت کی بنا پر وہ فریق وفات پا جانے والے کا ولی متصور ہوگا۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے کسی کو کہا ”اے زنا کرنے والی کی اولاد“ اور اس کی ماں بے گناہ ہے اور وفات پا چکی ہے اور اس ماں کا بیٹا اس شخص کے خلاف حد قذف کا دعویٰ کرے تو اس شخص کو سزائے قذف دی جائے گی۔

کیونکہ اس نے ایک بے گناہ عورت پر اس کی وفات کے بعد تہمت لگائی لیکن یہ دعویٰ متوفیہ کی طرف سے جس پر تہمت لگائی گئی ہے درست نہ ہوگا جب تک کہ یہ تہمت خود مدعی کے نسب میں خرابی کا سبب اور اس کے لئے موجب عار نہ ہوئی ہو۔ ایسے اشخاص اس عورت کے باپ دادا یا بیٹے پوتے ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ یہی اشخاص مقذوف کی ذریت میں ہونے کے باعث بدنامی کا نشانہ بن سکتے ہیں اور اس تہمت میں یہ بھی شامل ہیں لہذا انہیں قذف کی سزا کے مطالبہ کا حق ہے۔

وفات یافتہ پر تہمت لگانے کا بیان

اگر مقذوف بے گناہ ہو تو اس کے غیر مسلم بیٹے اور اس کے غلام (مملوک) کو بھی مطالبہ سزا کا حق ہے۔ کیونکہ (قذف نے) ایک بے گناہ پر تہمت لگا کر اسے بدنام کیا لہذا اس پر حد عائد ہوگی۔ اس کے لئے مقذوف کا بے گناہ ہونا شرط ہے تاکہ پورے طور پر تہمت کو جرم قرار دیا جاسکے۔

غلام کا آقا کے خلاف اور بیٹے کا باپ کے خلاف دعویٰ کرنے کا بیان

حنفیہ شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ غلام اپنے آقا کے خلاف اپنی آزاد متوفیہ ماں پر تہمت لگانے پر مطالبہ سزا نہیں کر سکتا۔ (الزام کی صورت یہ ہے) کہ آقا اپنے غلام کو کہے کہ ”اے زانیہ کی اولاد“ جبکہ اس کی ماں وفات پا چکی ہو۔ اسی طرح بیٹے کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے باپ کے خلاف جس نے اس کی آزاد مسلمان ماں پر اس کی وفات کے بعد الزام لگایا ہو سزائے قذف کا دعویٰ کرے۔ بایں طور کہ باپ نے بیٹے کو کہا ہوا اے زانیہ کی اولاد یہ حکم اس لئے ہے کہ باپ کو اس کے بیٹے کی خاطر سزا نہیں دی جاسکتی۔ بنا بریں بیٹے کا قصاص باپ سے نہیں لیا جائے گا اور نہ بیٹے (کے مال) کی چوری پر باپ کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”فلا تقل لهما اف“ (یعنی ماں باپ کو اف تک نہ کہو) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ”لا یقاد الوالد بولدہ ولا السید بعبدہ“ (یعنی بیٹے کا قصاص باپ سے اور غلام کا آقا سے نہیں لیا جائے گا) اس پر اجماع ہے کہ آقا سے قصاص نہیں لیا جائے گا پس جبکہ جان کا قصاص نظر انداز کیا جاتا ہے تو عزت کے نقصان کو بدرجہ اولیٰ نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ قصاص کا موجب امر یقینی ہے اور اس میں بندہ کا حق غالب ہے اور آقا کو غلام کا مجرم اس لئے نہیں ٹھہرایا جاتا کہ غلام کا حق عین آقا کا حق ہوتا ہے اور یہ جائز نہیں ہے کہ کسی کو اپنی حق تلفی کی سزا دی جائے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ”لا یقاد الوالد بولدہ ولا السید بعبدہ“ (یعنی باپ پر بیٹے کا اور آقا پر غلام کا قصاص نہیں ہے) پھر یہ بھی ہے کہ غلام آقا کا مال اور اس کی ملکیت ہے لہذا غلام کا کوئی مطالبہ آقا پر عائد نہیں ہوتا۔

مالکیہ کا مشہور مسلک اس بارے میں یہ ہے کہ اگر باپ اپنے بیٹے پر اتہام لگائے اور اسے کہے کہ اے زانیہ کی اولاد جبکہ اس کی آزاد مسلمان اور بے گناہ ماں مر چکی ہے تو بیٹے کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے باپ پر تہمت لگانے کا جرم عائد کرے اور دوسروں کی طرح اسے قذف کی سزا دی جائے۔ کیونکہ یہ آیت شریفہ (اس بارے میں) مطلق ہے جس میں کوئی استثنیٰ نہیں ہے ”والدین یرمون المحصنات ثم لم یاتوا بأربعة شہداء فاجلدوہم ثمانین جلدۃ“ (یعنی جو لوگ بے گناہ عورتوں پر تہمت لگائیں اور چار گواہ نہ پیش کر سکیں انہیں اسی (۸۰) درے لگاؤ) پس اس آیت میں ایک دوسرے کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے اور نہ نزدیک یا دور کے رشتہ کا لحاظ رکھا گیا ہے پھر یہ بھی ہے کہ

’حد‘ (سزائے شرعی) اللہ تعالیٰ کا حق ہے (یعنی اس کا مطالبہ اللہ کی طرف سے ہے) لہذا اولاد کی قرابت داری (باپ کو) سزائے نہیں بچا سکتی تاہم مالکیہ کہتے ہیں کہ باپ کو سزائے قذف ہو جائے تو بیٹے کا اعتبار ختم ہو جائے گا کیونکہ وہ اپنے باپ کی سزایابی کا سبب بننے میں اس کا شریک ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”فلا تقل لهما اف ولا تنہرہما“ وقل لهما قولا کریماً“ (یعنی ماں باپ سے اظہار ناراضگی نہ کرو اور نہ انہیں جھڑکو بلکہ ان کے ساتھ نرم مزاجی سے کام لو)۔

ائمہ فقہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر ایک شخص نے اپنی اولاد کو جو وفات یافتہ بیوی سے ہے زانیہ کی اولاد کہا اور اس بیوی کی کوئی اور اولاد دوسرے خاوند سے ہے تو اس (سوتیلی اولاد) کو حق ہے کہ اپنے سوتیلے باپ کے خلاف سزائے قذف کا دعوے کرے۔ اس کا حق تو دراصل دونوں اولاد کو حاصل ہے لیکن ایک کو تو مطالبہ سزا کی ممانعت ہے لیکن دوسرے کو ممانعت نہیں ہے لہذا باپ کے عمل کے تقاضوں کو وہ پورا کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ایک جماعت مطالبہ سزا کا حق رکھتی ہو اور ان میں سے کوئی فرد معاف کر دے تو دوسروں کو مطالبہ کا حق باقی رہے گا۔ بخلاف اس کے اگر دو اشخاص مطالبہ قصاص کا مطالبہ رکھتے ہوں اور ان میں سے ایک معاف کر دے تو دوسرے کو نفاذ قصاص کا مطالبہ کرنے کی ممانعت ہے۔ کیونکہ میت کو صرف ایک قصاص کا حق ہوتا ہے اور وہی حق وارثوں کو ملتا ہے اگر ایک وارث معاف کر کے مطالبہ قصاص سے دست بردار ہو جائے تو پھر قصاص کا مطالبہ باقی نہیں رہتا کیونکہ قتل کے ایک جرم کا تجزیہ ممکن نہیں ہے اور حد کا مطالبہ اللہ کا حق ہے (یعنی اگر وہ معاف نہ کرے تو معاملہ رفع دفع نہیں ہو سکتا)۔

فقہاء کا کہنا ہے کہ اگر ایک شخص دوسرے کو کہے کہ ’اے زانی‘ اور دوسرا کہے ’نہیں بلکہ تو‘ تو یہ دونوں مستوجب حد قذف ہوں گے۔ کیونکہ اس جواب کے معنی یہ ہیں کہ ’میں زانی نہیں بلکہ تو زانی ہے‘ یہاں پر ’بلکہ‘ (حرف اضطراب) کلمہ عطف ہے جو غلطی کو دور کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ (یعنی میرا زانی ہونا غلط ہے دراصل تو زانی ہے)۔

اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو کہا ’اے زانیہ‘ اور بیوی نے کہا میں نہیں تو زانی ہے اور دونوں ایک دوسرے کے خلاف دعوے کریں تو عورت کو صرف حد قذف لگائی جائے گی اور لعان نہ ہوگا۔ کیونکہ دونوں نے ایک دوسرے پر تہمت لگائی ہے۔ خاوند بیوی پر تہمت لگائے تو لعان واجب ہوتا ہے اور بیوی کا خاوند پر تہمت لگانا مستوجب حد ہے۔ اور قاعدہ یہ ہے کہ جہاں دو سزائیں جمع ہو جائیں اور ایک پر عمل درآمد سے دوسری سزا ساقط ہوتی ہو تو واجب ہو جاتا ہے کہ ایک سزا پر عمل درآمد کو دوسری سزا ساقط ہو جانے کا بہانہ بنایا جائے اور چونکہ لعان بھی سزا کا قائم مقام ہے اس لئے اسے بھی حد ہی تصور کیا جائے گا۔ پس جب عورت کو سزائے قذف مل گئی تو لعان باطل ہو گیا کیونکہ عورت کو سزائے قذف مل چکی ہے نیز عورت چونکہ جرم تہمت کی سزایاب ہے لہذا جرم قذف کی سزایاب عورت اور اس کے خاوند کے درمیان ’لعان‘ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ لعان ایک شہادت ہے اور قذف کا سزا یافتہ شہادت نہیں دے سکتا۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ اگر خاوند کے جواب میں جس نے بیوی کو ’اے زانیہ‘ کہا بیوی یہ کہہ دے کہ ”ہاں میں نے تیرے ساتھ زنا کیا“ تو اب نہ حد قذف ہے نہ لعان کیونکہ دونوں باتیں مشکوک ہو گئیں۔ یہاں اس امر کا احتمال ہے کہ بیوی کے (اس طرح) کہنے کا مطلب یہ ہو کہ تو نے ہی نکاح سے پہلے میرے ساتھ بدکاری کی ہے تو یہ اس الزام کی تصدیق

علاوہ اس کے اس آیت کریمہ میں (ان الفاظ سے) شرائط حد قذف کے منجملہ سب سے ضروری شرط کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی یہ کہ جس پر تہمت لگائی گئی ہے وہ محسن (بے گناہ) ہو۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ یہاں پر ”احسان“ (بے گناہ ہونے) کا مطلب یہ ہے کہ تہمت لگنے سے پہلے یا اس کے بعد مکر سزا ملنے سے پہلے اس نے جرم زنا کا ارتکاب نہ کیا ہو۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ شخص فی الواقع گناہ زنا کا مرتکب ہوا ہے تو اسے ”محسن“ قرار نہیں دیا جائے گا اور تہمت لگانے والا سزائے قذف سے بری ہو جائے گا۔

اگر کسی نے ایک عورت سے عقد فاسد (یعنی غلط طریقہ سے نکاح) کر کے۔ مثلاً بغیر گواہ کے عقد کیا (اور اس سے مباشرت کر لی) یا کوئی عورت سو رہی تھی اور یہ خیال کر کے کہ وہ اس کی بیوی ہے اس سے مباشرت کر لی حالانکہ وہ اس کی بیوی نہ تھی تو اس شبہ کی بناء پر وہ شخص حد زنا سے تو بری ہوگا لیکن کیا اس شخص کی اس حرکت سے اس کی صفت احسان (یعنی بے گناہ ہونے کی خوبی) جاتی رہے گی کہ اگر کوئی شخص اس پر بدکاری کی تہمت لگائے تو اسے اسی (۸۰) کوڑوں کی سزا نہ دی جائے۔ یا صفت احسان باقی رہے گی کہ اس پر تہمت لگانے والا مستوجب حد ہوگا؟ اس بارے میں علماء کی رائیں مختلف ہیں:

بعض اصحاب کی یہ رائے ہے کہ اگر اس میں بے احتیاطی سے کام لیا گیا ہے تو اس شخص کی صفت احسان (بے گناہی) جاتی رہے گی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ احسان، کی صفت نہیں جاتی جب تک کہ زنا مستوجب حد کا ارتکاب نہ ہو۔ یہاں تک سزائے قذف کا بیان تھا۔

تمام مذاہب اس بات پر متفق ہیں کہ

کسی پر بہتان لگانا اس کی عزت پر ہاتھ ڈالنا ہے

تمام مذاہب اور تمام عقلیں اس پر متفق ہیں کہ بہتان لگانا عزت پر ہاتھ ڈالنا ہے۔ نظام عالم کا تقاضا یہ ہے کہ عزت کا تحفظ کیا جائے۔ بالخصوص اس لئے کہ یہ حرکت شرف و فساد کا موجب ہے۔ بے گناہ

ہوئی جو خاوند نے اس پر لگایا لہذا العان ساقط ہو گیا۔ اور بدیں جہت کہ عورت نے مرد پر زنا کا الزام لگایا اور اس کی تصدیق نہ ہوئی تو حد قذف لازم ہوئی لہذا العان واجب نہ ہوا اور اس امر کا بھی احتمال ہے کہ بیوی نے (اس طرح کہہ کر) خاوند کے ساتھ

عورتوں پر بدکاری کی تہمت لگانے سے لازمی طور پر خاندان میں بغض و عداوت پھوٹ پڑنے کا سبب ہوتا ہے اور دلوں میں کینہ و حسد جنم لیتے ہیں۔ جس کا انتقام قتل و املا ف جان کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جس کا انجام بہت برا ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ اس (جرم) کیلئے ایسی سزا تجویز کی جائے جو لوگوں کو اس کے شر سے بچائے اور اس کے لئے زبانیں مطلق العنان نہ ہو جائیں تاکہ اس شر و فساد سے نجات ہو جو اس (فعل بد) کے نتائج میں سے ہے۔

سزائے قذف کے بارے میں نادانوں کے اعتراض کا بیان

بعض اشخاص کا خیال ہے کہ درہ زنی کی یہ سزا سخت اور موجودہ معاشرہ کے مناسب حال نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جو لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں انہیں چاہیے کہ پہلے سمجھیں کہ یہ جرم کیا ہے پھر اس کے ارتکاب سے جو نقصان معاشرہ کو پہنچتا ہے اس کا موازنہ اس سزا سے کریں تو معلوم ہوگا کہ جرم قذف کی سزا کا مقصد یہ ہے کہ ہر ایسے قول و فعل سے معاشرہ کو محفوظ رکھا جائے جو معاشرہ کے لئے مضرت رساں اور انفرادی و اجتماعی طور پر ایذا دہ ہے۔ اگر لوگوں میں جرائم قذف کو پھیلنے دیا گیا تو کسی کی آبرو، جان اور مال کا تحفظ ممکن نہ رہے گا۔ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ بنی نوع انسان جسے اللہ تعالیٰ نے عقل سے نوازا ہے درندہ جانور کی مانند ہو کر رہ جائے گا جو قوی ہیں وہ کمزوروں پر جبر کرنے لگیں گے۔ اور یہ صورت حال فرد اور جماعت کے لئے تباہی و بربادی کا موجب ہے اور ضروری ہے کہ اس برائی کا سد باب کرنے والی کوئی ایسی تدبیر ہو جو بد اخلاق مجرموں کو برائی سے باز رکھے اور انہیں ان حدود سے تجاوز نہ کرنے دے جن میں حیات انسانی کی بقا ہے اور ایسے ذرائع کا اختیار کرنا ضروری ہے جو ان جرائم کی جڑ کاٹ دیں تاکہ نوع انسانی سے ان کا نام و نشان مٹ جائے غرض معاشرے کے لئے اور خود مجرموں کے لئے یہی بہتر ہے کہ ان جرائم سے روکنے کے لئے سخت سزا دی جائے اور مجرموں کے معاملہ میں ان سزاؤں کے نرم یا سخت ہونے کو اور مرد یا عورت ہونے سے قطع نظر کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جرم کرنے والے کی (خواہ کوئی ہو) ایک ہی حیثیت ہے اور اس کے نقصان دہ نتائج بھی یکساں ہیں لہذا کسی قانون پسند عاقل کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ جو مجرم دوسروں کی عزت کو نقصان پہنچائے اور اپنی دروغ بیانی یا افترا پردازی سے اس میں رخنہ انداز ہو وہ ضرب تازیانہ کی سخت سزا کا مستحق نہیں ہے۔ اس کی بجائے انہیں تو یہ کہنا چاہیے کہ یہ جرائم چونکہ فرد اور جماعت پر بہت برا اثر ڈالتے ہیں لہذا ضروری ہے کہ انہیں ایسی سزا دی جائے جو ان خرابیوں کا استحصال

کر دے۔ پس اس کے لئے جو سزا اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے وہ نہایت ضروری اور ناگزیر ہے۔ جو لوگ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں انہیں لازم ہے کہ وہ اپنی زبانوں کو لوگوں پر بہتان لگانے کے گناہ سے پاک رکھیں۔

اگر انہیں دنیا والوں سے خوف نہیں ہے تو اللہ سے ڈریں جس نے ایسے اشخاص کو 'فاسق' قرار دیا ہے۔ باقی وہ تلف کار اشخاص جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی پرواہ نہیں کرتے اور اللہ سے نہیں ڈرتے وہ چوپاؤں سے بدتر ہیں اور جب تک کہ انہیں سخت ایذا دہ سزا نہ دی جائے وہ باز آنے والے نہیں ہیں بصورت دیگر وہ لوگوں کو بے شمار نقصانات پہنچانے میں بڑھتے چلے جائیں گے۔^(۱)

قاذف کو معافی دینے کا بیان

شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ مقذوف کو (جسے تہمت لگائی گئی ہے) یہ اختیار ہے کہ وہ قاذف (تہمت لگانے والے) کو معاف کر دے۔ اس کے معاف کر دینے سے سزائے قذف ساقط ہو جائے گی۔ اس کی گنجائش ہے چنانچہ اگر کوئی کسی کی تہمت بدکاری کی جرأت کرے تو یہ ہو سکتا ہے کہ وہ مقذوف کو راضی کر لے اور اس الزام کا اثر زائل کر دے۔ اور اگر وہ معاف کر دے تو یہ معافی درست ہوگی خواہ حاکم کے سامنے معاملہ پیش ہونے سے پہلے یہ معافی ہو جائے یا بعد میں ہو۔

مالکیہ کو بھی اس رائے سے اتفاق ہے (کہ معافی ہو سکتی ہے) بشرطیکہ حاکم کے سامنے معاملہ پیش ہونے سے پہلے معافی ہوئی ہو۔ لیکن حاکم کے سامنے معاملہ پیش ہونے کے بعد صرف اس صورت میں معافی درست ہو سکتی ہے جبکہ مقذوف اپنی بدنامی سے خائف ہو۔ لیکن اگر اس کی پاکبازی مشہور ہو اور اس تہمت کے مشہور ہونے سے اسے کوئی اذیت پہنچے تو معافی درست نہ ہوگی۔ بہر حال یہ کہنا قرین عقل ہے کہ

نکاح کے بعد مرتکب ہونے کا ذکر کیا ہو اور یہ کہا ہو کہ میں نے تیرے سوا اور کسی کو اپنے اوپر قادر ہونے نہیں دیا۔ اور بالعموم ایسی صورت میں عورت پر لعان عائد ہوتا ہے حد عائد نہیں ہوتی۔ کیونکہ اسے تہمت بھی کہہ سکتے ہیں اور نہیں بھی کہہ سکتے۔ ایک لحاظ سے حد واجب ہوتی ہے لعان واجب نہیں ہوتا اور ایک لحاظ سے لعان واجب ہوتا ہے حد واجب نہیں ہوتی اور فیصلہ دونوں میں سے ایک امر کے تعین پر موقوف ہے۔ غرض یہاں دونوں باتوں یعنی حد یا لعان کا احتمال رہا اور اس شبہ کے باعث دونوں میں سے کسی ایک بات کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔

۱۔ واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ہر آزمائش کے ساتھ انعام اور ہر مصیبت کے ساتھ رحمت رکھی ہے۔ کسی کو اس کا احساس ہو یا نہ ہو۔ یہی حال سزاؤں کے نفاذ فرمانے کا ہے کہ اس سے مسلمانوں کی بہتری ہے۔ دلوں میں نیکی پروان چڑھتی

مقذوف معاف کر سکتا ہے کیونکہ تہمت کا تکلیف دہ اثر اسی کو پہنچتا ہے اور جب معاف کر دے تو (گویا) تہمت کا تکلیف دہ اثر بھی جاتا رہا۔ اب اگر قاذف نے معافی ہو جانے کے بعد پھر تہمت لگائی تو اسے حد قذف نہ ہوگی۔ البتہ سزا دی جائے گی تاکہ آئندہ بدنام کرنے سے باز رہے۔

یہاں پر یہ کہنا ممکن ہے کہ حنفیہ کے سوا باقی تینوں اماموں کے نزدیک معاف کر دینے سے حد قذف ساقط ہو جاتی ہے۔ تاہم حنفیہ کہتے ہیں کہ مقذوف اگر حاکم کے سامنے دعوئی نہ کرے تو حد قذف پر عمل درآمد نہ ہوگا۔^(۱)

ہے یہ سزائیں خرابی کے مواقع سے بچنے زبان کو بدگوئی سے پاک رکھنے لوگوں کی نیک نامی کو بٹہ لگانے اللہ کی نافرمانی اور معصیت الہی سے بری رہنے کے لئے ہیں۔ ان شرعی سزاؤں کے مقرر کرنے کی غرض یہ ہے کہ معاشرہ کو ایسے شرف و فساد سے پاک رکھا جائے جو لوگوں کی ہلاکت اور ان میں پھوٹ ڈالنے کا موجب ہوتے ہیں۔ جس معاشرہ میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں اگر اس کا عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاشرہ سے مقابلہ کریں تو ان دونوں میں بہت بڑا فرق اور وسیع خلا محسوس کریں گے اس کا سبب یہی ہے کہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور عہد خلافت راشدہ میں اور اس کے بعد بھی حدود شرعیہ کا نفاذ تھا۔

۱۔ شافعیہ اور حنابلہ کی قوی ترین روایت یہ ہے کہ اگرچہ سزائے شرعی حکم ہے تاہم حد قذف کا مطالبہ کرنا مقذوف کا حق ہے۔ بدیں جہت کہ اس بارے میں بندے کے حق کو فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ (بدنامی سے بچنے کے لئے سزا دلانے کی) ضرورت بندے کو ہے شریعت اس سے بے نیاز ہے۔ اور اس لئے بھی کہ بیشتر احکام شرعیہ حق العباد پر مبنی ہیں اور عقل اس کی شاہد ہے کہ سزائے قذف کے نفاذ سے خصوصیت کے ساتھ بندہ کو فائدہ پہنچتا ہے جیسے قصاص میں ہوتا ہے۔ چنانچہ سزائے قذف پر عمل درآمد نہیں ہوتا جب تک کہ مقذوف اس کا مطالبہ نہ کرے۔ اور مقذوف کو یہ حق ہے کہ وہ تہمت لگانے والے کی سزا ساقط اور اس کے قصور کو معاف کر دے اور وہ سزا سے بری ہو جائے اور مطالبہ سزا کا یہ حق جو وارثوں کو پہنچتا ہے۔ وہ بھی اسی لئے کہ سزائے قذف کے بارے میں بندے کا حق شریعت کے حق پر مقدم اور فائق ہے اور اسی میں لوگوں کی عزت ہے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ مقذوف کو یہ حق نہیں ہے کہ قاذف کی شرعی سزا کو ساقط اور اس کے گناہ کو معاف کر دے اور یہ ممکن ہی نہیں کہ الزام تہمت سے اسے بری کر سکے۔ کیونکہ اس میں اللہ کے حکم کو فوقیت حاصل ہے اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں بندہ اور شرع دونوں کا حق ہے۔ یہ سزا مقذوف کی بدنامی کو دور کرنے کے لئے اور اس کے نفاذ میں خصوصیت کے ساتھ اسی کا فائدہ ہے۔ بدیں جہت یہ بندے کا حق ہے اور چونکہ مقصد اس کا 'زجر' ہے جس کی بنا پر اسے حد (سزائے شرعی) کہا جاتا ہے اور 'زجر' سے مراد معاشرہ میں در آنے والی خرابیوں کو دور کرنا اور ناپسندیدہ باتوں سے پاک کرنا ہے پس یہ شریعت کا حق غالب ہونے کی علامت ہے کیونکہ اس میں دوسروں سے قطع نظر کر کے کسی ایک شخص کا فائدہ پیش نظر نہیں ہوتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ بندے کے حق کا دالی (نگران حال) اس کا آقا ہوتا ہے۔ جو اس کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے۔ اس کے برعکس نہیں ہوتا (کہ بندہ آقا کے حقوق کا تحفظ کرے) کیونکہ شریعت حقوق کی تکمیل بندہ کے اختیار میں نہیں

ہے۔ سوا اس کے کہ (اس کی تکمیل کے لئے) اسے نائب بنایا گیا ہے یہی وہ اصل ہے جس سے متعدد فروعی مسائل مختلفہ اخذ کئے گئے ہیں۔ مثلاً وراثت کا مسئلہ ہے جس کا تعلق حقوق العباد سے ہے۔ حقوق شریعت سے نہیں ہے۔ پس ایک بندہ دوسرے بندہ کا حق ورثہ میں پاتا ہے بشرطیکہ اس حق کا تعلق مال سے ہو اور حد (سزائے شرعی) مال کی قسم میں سے نہیں ہے لہذا یہ حق (وارث کی) وفات کے بعد جاتا رہتا ہے۔ جب کہ کوئی سمعی دلیل اس کی نہ ہو کہ کسی وارث کو شرعی حق کے مطالبہ کا اختیار دیا گیا ہو یا مطالبہ حق کی وصیت کی گئی ہو۔ جو اس حق کے ثابت کرنے کی شرط رکھی گئی ہے اسی طرح 'معافی' کا مسئلہ ہے کہ اگر حاکم کے نزدیک قاذف کا تہمت لگانا اور مقذوف کا بے گناہ ہونا ثابت ہو جائے اور مقذوف تہمت لگانے والے کو معاف کر دے تو یہ معافی درست نہ ہوگی اور قاذف کو سزائے قذف دی جائے گی۔ غرض حنفیہ کے نزدیک جرم قذف ثابت ہو جانے کے بعد حد ساقط نہ ہوگی بجز اس صورت کے کہ مقذوف کہے کہ اس شخص نے مجھ پر یہ تہمت لگائی ہی نہیں ہے یا یہ کہے کہ میرے گواہوں نے غلط بیانی کی ہے۔ اس سے عیاں ہے کہ محض تہمت لگا دینے سے سزائے قذف واجب نہیں ہوتی۔ قصاص کی معافی معاملہ اس سے مختلف ہے کہ سزائے قصاص واجب ہو جانے کے بعد بھی (معاف کر دینے سے) ساقط ہو جاتی ہے کیونکہ اس بارے میں بندے کے حق کو فوقیت حاصل ہے۔ اسی طرح کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ اس میں اعتیاض روا نہیں ہے (یعنی ایک جرم کی سزا کو دوسرے جرم کی سزا قرار دیا جائے) البتہ متداخل ہو سکتا ہے (یعنی دو ہرے جرم کی سزا ایک ساتھ دی جاسکتی ہے) چنانچہ اگر ایک شخص نے متعدد بار کسی پر تہمت لگائی یا ایک جماعت پر اتہام لگایا تو سزائے قذف ایک ہی ہوگی بشرطیکہ دوبار تہمتوں کے درمیان حد قذف نہ مل چکی ہو۔ اگر ایک جماعت میں سے جن پر تہمت لگائی گئی ہے کسی فرد واحد نے استغاثہ کیا اور حد لگائی جانے لگی کہ دوسروں نے بھی دعویٰ کر دیا تو صرف وہی ایک حد پوری کی جائے گی۔ حنفیہ کا کہنا یہ بھی ہے کہ اس سزا کی معافی نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ تو ایسا ہے کہ وہی شخص جو سزا کے عائد کرنے یعنی نفاذ حد کا ذمہ دار بنایا گیا ہے وہی الٹا معاف کر رہا ہے پھر یہ بھی ہے کہ معاف کرنا گویا الزام پر الزام سمیٹنا ہے۔ کیونکہ تہمت لگانے سے جو بے عزتی ہوئی ہے اس بے عزتی کو گوارا کر لینا بجائے خود بے عزتی ہے اور یہ دلیل سب سے زیادہ قوی ہے۔ عام مشائخ و اصحاب حنفیہ میں سب سے زیادہ مشہور قول یہ ہے کہ سزائے قذف کے مطالبہ کا زیادہ حق بندہ کو حاصل ہے۔ مالکیہ کہتے ہیں کہ سزائے قذف کے مطالبہ میں بندہ کا حق فائق ہے چنانچہ اگر مقذوف سزا کا مطالبہ نہ کرے تو سزا پر عمل درآمد نہیں ہو سکتا اور اگر حاکم کے پاس نالش نہ کی جائے تو سزا ساقط ہو جاتی ہے۔ لیکن جب معاملہ حاکم کے پیش ہو جائے اور جرم ثابت ہو جائے تب کسی کو سزائے قذف کے ساقط کرنے کا اختیار نہیں رہتا، کیونکہ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ 'جرم مستوجب حد' جب حاکم اسلام کے پیش ہو جائے تو اس پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ نفاذ حد کا حکم دے دے اور اس کے ساقط کرنے کی کوئی سفارش قبول نہ کرے۔ سوا اس صورت کے جب کہ خود مقذوف (جس پر تہمت لگائی گئی ہے) دعویٰ سے دست بردار ہو جائے۔ بدیں خیال کہ اس بارے میں چہ میگوئیاں ہوں گی (اور وہ اس سے بچنا چاہتا ہے)۔ مالکیہ کے درمیان اسی قول کو شہرت حاصل ہے۔

مالکیہ کا کہنا ہے کہ سزائے قذف میں "اعتیاض" کی گنجائش نہیں ہے کہ ایک جرم کی سزا کو دوسرے جرم کی سزا قرار دیا جائے) البتہ سزاؤں میں متداخل ہوتا ہے (یعنی قذف کے متعدد جرائم کی سزا ایک ساتھ دی جاتی ہے)۔ چنانچہ اگر ایک شخص نے کسی پر ایک بار یا ایک سے زیادہ بار تہمت لگائی تو سزائے قذف ایک ہی ہوگی نیز اگر ایک ہی مجلس میں

متعدد اشخاص پر الزام لگایا۔ یا متعدد مجالس میں ایک ہی طرح کا الزام لگایا۔ یا مختلف الفاظ میں اتہام لگائے تو ان سب کی پاداش میں حد قذف ایک ہی ہوگی۔ چنانچہ اگر جماعت میں سے کسی ایک فرد نے نالش کی اور حد قذف کے طور پر اسے سزائے ضرب ملی تو وہ تمام جرائم تہمت کی سزا متصور ہوگی۔ اگر بعد میں اور اشخاص (منجملہ جماعت) دعویٰ کریں تب بھی کئی بار تہمت لگانے کی سزا بار بار نہ ہوگی۔ خواہ متعدد اشخاص نے جن پر تہمت لگائی گئی ہے استغاثہ کیا ہو البتہ ایک جرم کی سزا پانے کے بعد اگر دوبارہ جرم قذف کا ارتکاب کیا تو سزا بھی دہرائی جائے گی اگرچہ اس کی تصریح نہ کی گئی ہو (کہ یہ وہی الزام ہے یا دوسرا)۔

کسی کو اس کے چچا یا ماموں سے منسوب کرنے کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص کسی کا نسب اس کے چچا یا ماموں یا نانا سے جوڑے تو اسے قاذف (تہمت کا مجرم) نہیں کہیں گے۔ کیونکہ ان کو باپ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ پہلی صورت یعنی چچا کو باپ کہنے کی مثال اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد (بخطاب یعقوب) میں ہے۔ ”والہ آبائک ابراہیم و اسمعیل و اسحاق“ (یعنی تیرے باپ ابراہیم اسماعیل اور اسحاق کا معبود) حالانکہ اسمعیل یعقوب علیہ السلام کے چچا تھے۔ (یہاں انہیں آباء میں شمار کیا گیا) اور دوسری صورت (یعنی ماموں کو باپ کہنے) کی مثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں ہے ”الخال والد من لا والد له“ (یعنی جس کا باپ نہیں اس کا ماموں باپ ہے) تیسری صورت (باپ کہے جانے کی) تربیت (پرورش) ہے۔ چنانچہ کہا جاتا کہ اللہ کے ارشاد (بہ نقل قول نوح) ”ان ابنی من اہلی“ (یعنی میرا بیٹا میرے کنبہ کا ہے) میں جسے بیٹا کہا گیا ہے وہ دراصل ان کا نہیں بلکہ ان کی بیوی کا بیٹا تھا (جس کی پرورش انہوں نے کی تھی)۔

اگر ایک شخص نے کسی کو کہا ”اے زانی“ اور دوسرے نے کہا ”میں نہیں بلکہ تو“ تو دونوں کو سزائے قذف ملے گی۔ بشرطیکہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف نالش کریں۔ کیونکہ دونوں ہی جرم قذف کے مرتکب ہوئے اور درآنحالیکہ دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف دعویٰ کیا اور حاکم کے نزدیک ان کے الزامات ثابت ہو گئے تو ان پر اللہ کا حق یعنی سزائے قذف عائد ہوگئی۔ اب ان میں سے کوئی بھی اس سزا کو ساقط نہیں کر سکتا۔ لہذا دونوں پر حد نافذ ہوگی۔ بخلاف اسکے اگر کہا ”اے خبیث“ اور دوسرے نے انتقاماً کہا ”میں نہیں بلکہ تو (خبیث) ہے“ تو دونوں میں سے کوئی بھی مستوجب تعزیر نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں نے (ایک دوسرے کی بدگوئی سے) اپنا حق کھودیا۔

غیر مسلم یا غلام کی شہادت کا بیان

شافعیہ کہتے ہیں کہ خاوند جس نے اپنی بیوی پر تہمت لگائی تھی اگر بیوی کے خلاف ارتکاب زنا کی گواہی دے تو وہ سزائے قذف کا مستوجب ہے کیونکہ قاضی قذف کا مجرم ہونے کے باعث اس کی گواہی کو تسلیم نہیں کرے گا اسی طرح اگر گواہوں کی تعداد چار سے کم ہو تو ان سب کو سزائے قذف ملے گی کیونکہ وہ سب تہمت لگانے کے مجرم ہیں اسی طرح اگر چار عورتوں یا چار غلاموں یا چار کافر اشخاص نے یا چار ذمیوں یا چار پناہ گیروں نے گواہی دی تو چاروں مسالک کی رو سے ان سب کو سزائے قذف ہوگی۔ کیونکہ یہ اشخاص شہادت کے نااہل نہیں تھے اور ان کا مقصد بجز تہمت لگانے کے اور کچھ نہ تھا۔ ایک اور طریقہ سے بھی وہ مستوجب حد ہیں کہ عدم صلاحیت شہادت کے باعث گواہوں کی (مطلوبہ) تعداد

میں کی تصور کی جائے گی لہذا وہ سزا پائیں گے اس بارے میں اختلاف کی گنجائش اس صورت میں ہے جب کہ بظاہر ان میں گواہ بننے کی صلاحیت موجود ہو اور بعد میں کافر یا غلام ہو جائیں۔ ایسی صورت میں پہلے ہی ان کی حالت معلوم ہوگئی تو حاکم ان کی گواہی کو رد کر دے گا اور اس کی سماعت ہی نہ کرے گا اور ان کا قول قطعی طور پر بے گناہ پر تہمت متصور ہوگا۔ جس میں کوئی شک نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔

شافعیہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر چار گواہوں نے ارتکاب زنا کی گواہی دی اور ان کی گواہی کو ان کے فاسق ہونے کی بنا پر حاکم نے رد کر دیا۔ اگرچہ وہ قطعی طور پر شراب اور زنا کے مرتکب ہوئے ہوں، تو وہ مستوجب حد نہ ہوں گے۔ اس بناء پر نہیں کہ ان میں شہادت دینے کی پوری شرائط نہیں ہیں یا ان کے نقائص کو جیسا کہ اوپر بتایا گیا، تعداد میں کمی تصور کیا گیا۔ کیونکہ ان دونوں صورتوں میں فرق ہے۔ کیونکہ (گواہوں کی) تعداد میں کمی ہونا امر یقینی ہے اور ان کا فسق و فجور اجتہادی اور ظنی امر ہے جو موجب شبہ ہے اور شبہ کی حالت میں سزا نہیں دی جاتی۔

اگر چار گواہوں سے کم نے شہادت زنا دی اور انہیں سزائے قذف دے دی گئی اور پھر چار گواہ پورے ہو کر گواہی دیں تو ان کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔ جیسے کوئی فاسق آدمی گواہی دے اور اس کی شہادت رد کر دی جائے اس کے بعد وہ توبہ کر لے اور پھر گواہی دے تو قبول نہیں کی جائے گی۔

اگر غلاموں نے گواہی دی اور انہیں سزائے قذف دی گئی پھر وہ غلام آزاد ہو گئے اور پھر دوبارہ گواہی دینے آئے تو ان کی گواہی تسلیم کی جائے گی کیونکہ ان پر اب کوئی تہمت نہ ہوگی۔

اگر پانچ اشخاص نے شہادت دی اور ان میں سے ایک گواہ اپنے بیان سے منحرف ہو گیا تو اسے اور دوسرے گواہوں کو سزا نہ ہوگی، کیونکہ گواہوں کی مطلوبہ تعداد میں کمی نہیں ہوئی۔ البتہ اگر (پانچ میں سے) دو گواہ اپنے بیان سے پھر گئے تو وہ دونوں مستوجب حد ہوں گے کیونکہ وہی دونوں بدنام کرنے میں شریک حال تھے باقی گواہ نہیں تھے۔ کیونکہ گواہی کے وقت تعداد مطلوبہ پوری تھی اور ان میں کوئی کوتاہی نہ تھی نیز اگر ان میں سے ایک گواہ منحرف ہوا تو اس بناء پر اسے بھی سزا دی جائے گی دوسروں کو نہ ہوگی۔

بدنام کرنے کا بیان

فقہاء کا قول ہے کہ اگر ایک شخص نے حاکم کے حضور کسی پر تہمت لگائی۔ یا اپنی بیوی پر کسی متعین شخص سے ملوث ہونے کا الزام لگایا اور وہ شخص عدالت میں موجود نہیں ہے تو لازم ہے کہ حاکم اس شخص کے پاس جس پر تہمت لگائی گئی ہے آدمی بھیج کر اسے مطلع کر دے کہ فلاں شخص نے تم پر تہمت لگائی ہے اور اب تمہیں اس شخص پر حد قذف عائد کرنے کا حق ہے جیسے تمہارا کسی پر مال کا حق ہو اور اسے خبر نہ ہو۔ ایسی صورت میں لازم ہے کہ اس کی اطلاع اس شخص کو دے دی جائے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک واقف کار کو بھیجا کہ اس عورت کو بتا دے کہ فلاں شخص نے اس پر اپنے بیٹے سے ملوث ہونے کی تہمت لگائی ہے۔ لیکن اس شخص کے پاس کوئی گماشتہ نہیں بھیجا جو (الزام) زنا کی بابت تفتیش و تحقیق کرے۔ شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام (حاکم) کا یہ کام نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص کسی پر زنا کا الزام لگائے تو وہ اس کی بابت پوچھ گچھ کے لیے کسی کو بھیجے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”ولا تبسّسوا“ (یعنی کسی الزام کی جستجو میں نہ پڑو) اس

کا مطلب یہ ہے کہ یہ حکم اس حالت میں ہے جب کہ تہمت لگانے والا نامعلوم ہو، مثلاً کوئی شخص کہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے بدکاری کی (لیکن کون کہتا ہے یہ معلوم نہیں۔)

بیوی پر کسی خاص شخص کے ساتھ ملوث ہونے کا الزام

حنفیہ شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے تو 'لعان' واجب ہو جاتا ہے بشرطیکہ بیوی اس کا مطالبہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں الزام زنا عام مفہوم میں آیا ہے "والذین یرمون ازواجہم ولم یکن لہم شہد آء الا انفسہم" فشہادۃ احدہم اربع شہادات باللہ انہ لمن الصادقین، (یعنی جو لوگ اپنی بیویوں پر الزام لگائیں اور اس کے ثبوت میں ان کے سوا کوئی گواہ نہ ہو تو ہر ایک چار بار اللہ کا حلف اٹھا کر یہ بیان دے کہ وہ اپنے قول میں سچا ہے) اس آیت میں زنا کی بابت یہ نہیں بتایا گیا کہ وہ اس طرح ہو اور اس طرح نہ ہو لیکن یہ شرط ہے کہ خاوند شہادت کا اہل ہو اور بیوی ایسی عورت ہو کہ اس پر تہمت لگانے والا مستوجب حد قرار دیا جاسکے نیز یہ کہ عورت لعان کا مطالبہ کرے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ محض الزام لگا دینے سے 'لعان' روا نہیں ہو جاتا۔ بلکہ لعان پر عملدرآمد کے لئے ضروری ہے کہ الزام لگانے والا اس زنا کا چشم دید ہونا بیان کرے۔ وہ احادیث اس کا ثبوت ہیں جن میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ منجملہ ان کے سعد بن عبادہ والی حدیث ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "ارایت لسوان رجلاً و جسد رجلاً مع امرائتہ" (یعنی کیا تم نے دیکھا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کے ساتھ ایک مرد کو پایا) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کردہ حدیث میں ہے کہ "فجاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال: واللہ یا رسول اللہ لقد رایت بعینی و سمعت باذنی فکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماجاء بہ واشتد علیہ فنزلت الآیۃ الکریمۃ: والذین یرمون ازواجہم" (یعنی وہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا یا رسول اللہ بخدا میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی یہ بات ناگوار ہوئی اور سختی سے پیش آئے۔ تب یہ آیت شریف نازل ہوئی کہ "جو لوگ اپنی بیوی پر الزام لگائیں۔۔۔") پھر یہ بھی ہے کہ جب کسی بات کا دعویٰ کیا جائے تو لازم ہے کہ وہ دعویٰ بالکل واضح ہو جس طرح شہادت ہوتی ہے غرض علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ جو شخص اپنی بیوی پر بدکاری کا الزام لگائے اور خود آنکھوں سے دیکھنے کا دعویٰ کرے تو ان پر 'لعان' کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

اولاد سے انکار کرنے کا بیان

جو شخص اولاد کا قرار کرے پھر اس سے انکار کرے تو اس پر لعان واجب ہوگا کیونکہ اس کے اقرار سے اس کے ساتھ نسب قرار پا گیا اس کے بعد اگر اس اولاد سے انکار کرتا ہے تو یہ بیوی پر تہمت لگانا ہے لہذا لعان واجب ہوگا۔ اور اگر پہلے جس اولاد سے انکار کیا پھر اسی کو اپنی اولاد بتایا تو مستوجب حد ہوگا، کیونکہ اس نے خود اپنے بیان کی تکذیب کی اور اولاد کے انکار سے جو لعان اس پر واجب ہوا تھا وہ باطل ہو گیا۔ اس لئے کہ لعان شرعی سزا ہے جو بدیں سبب ناگزیر ہوئی کہ زوجین نے بیوی کے ارتکاب زنا کے بارے میں ایک دوسرے کی تکذیب کی اور لعان کی بنیاد حد قذف (یعنی سزائے

تہمت) پر ہے۔ کیونکہ خاوند نے بیوی پر بدکاری کا الزام لگایا پس جب کہ یہ بنیاد یعنی زوجین کا ایک دوسرے کی تکذیب (جس کی وجہ سے لعان کی نوبت آئی) نہ رہی تو اصل شے (یعنی الزام تہمت) بحال رہا اور حد قذف نافذ ہوگی اور وہ اولاد بہر حال اسی کی قرار پائے گی خواہ پہلے اقرار کیا ہو اور بعد میں انکار کیا ہو یا پہلے انکار کیا ہو اور بعد میں اقرار کیا ہو۔ کیونکہ پہلی بار کا اقرار بحال رہے گا اور بعد میں انکار کرنے سے اس کی نفی نہ ہوگی اور انکار کے ساتھ اقرار لینے سے بھی اولاد ثابت ہوگی۔

اگر خاوند اپنی بیوی سے پیدا ہونے والے بچے کی بابت کہے کہ یہ نہ تو میری اولاد ہے اور نہ تیری اولاد ہے تو اس پر نہ سزائے قذف ہوگی نہ لعان ہوگا۔ کیونکہ بیوی کا بچہ ہونے سے انکار کرنا بیوی کے جھٹنے سے انکار کرنا ہے اور اس جھٹنے سے انکار کرنا اس کو اپنی اولاد قرار دینے سے انکار کرنا ہے۔ اور اس کے جھٹنے سے انکار کرنا تہمت نہیں ہے کیونکہ اس سے تو بدکاری کی نفی پائی جاتی ہے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی نے ایسی عورت سے جو اس کی مملوکہ نہیں ہے ناجائز مباشرت کی اور اس پر کسی نے تہمت لگائی تو اسکو سزائے قذف نہ دی جائے گی کیونکہ تہمت (کے ثبوت) کے لئے مقذوف کا بے گناہ ہونا شرط ہے جو پوری نہیں ہوئی حالانکہ احسان کی شرط کا مطلب یہی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ قاذف نے جو الزام لگایا ہے وہ سچا ہے۔ پس چونکہ یہ تہمت (یعنی جھوٹا الزام) نہیں ہے لہذا وہ مستوجب حد نہیں ہے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے کسی کو گالی دی تو اس کو جائز ہے کہ وہ بھی ایسی ہی گالی اسے دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”جزاء سیئة سیئة بمثلھا“ (یعنی برائی کا بدلہ ایسی ہی برائی ہے) لیکن یہ اجازت نہیں ہے کہ (گالی کے جواب میں) دوسرا اس کے ماں باپ کو گالی دے۔ ایسی گالی جائز ہے جس میں جھوٹ یا الزام تراشی نہ ہو مثلاً یہ کہنا کہ اے ظالم اے احمق اے گھامڑا اے نادان: کیونکہ ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں ہے جن سے بالعموم کوئی شخص بھی خالی ہو۔ اگر کسی شخص نے اپنے مخالف کی گالی کا انتقام اسی طرح کی گالی سے لے لیا تو اب وہ مظلوم نہ رہا اور اول الذکر بری الذمہ ہو گیا۔

خاوند کا اپنی بیوی کے حمل سے انکار کرنے کا بیان

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر خاوند بیوی کے حمل (کا باعث) ہونے سے انکار کرے اور یوں کہے کہ وہ بیوی سے بے تعلق رہا (یعنی استبراء کیا) اور بے تعلقی کے بعد اس سے مباشرت نہیں کی تو تمام (فقہاء) کی رائے یہ ہے کہ وہ حمل جائز قرار دیا جائے اور (اس بارے میں) لعان کرایا جائے۔ اور اگر خاوند (بغیر کسی توجیہ) کے مطلقاً انکار کرے کہ یہ حمل میرا ہے ہی نہیں تو اس صورت میں علماء کی رائیں مختلف ہیں۔

مالکیہ میں یہ قول مشہور ہے کہ اس سے لعان واجب نہیں ہوتا۔

شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ یہ قول بے معنی ہے کیونکہ عورت کبھی کبھی انجہاد خون سے بوجھل ہو جاتی ہے۔

انکار حمل کرنے کے لئے وقت کی قید

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر بیوی کو حمل ہو اور بدوران حمل خاوند نے اس سے انکار نہیں کیا تو ولادت کے بعد انکار کرنا اور پھر لعان کرنا جائز نہیں ہے اس ثبوت میں یہ اصحاب حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود، حضرت انس اور حضرت سہیل بن سعد رضی اللہ عنہما کی روایت کردہ ان احادیث متواترہ کو پیش کرتے ہیں جس میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میاں بیوی کو لعان کا حکم دیتے وقت فرمایا ”ان جائت به علی صفتہ کذا فما اراہ الا قد صدق علیہما“ (یعنی اگر عورت حاملہ ہو اور خاوند اس سے انکار کرے تو میری رائے میں اس کا کہنا درست ہوگا) اس سے عیاں ہے کہ لعان کے وقت وہ عورت حاملہ تھی (یعنی وضع حمل کے بعد لعان درست نہیں ہے)۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر خاوند کو بیوی کے حمل کا علم ہوا اور حاکم نے لعان کا موقع دیا اور اس نے لعان نہ کیا تو اب ولادت کے بعد اسے حق نہیں ہے کہ اس سے انکاری ہو۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ (خاوند) اولاد سے انکار نہیں کر سکتا جب تک کہ وضع حمل نہ ہو اس کی دلیل یہ ہے کہ حمل کبھی تحلیل ہو جاتا ہے اور کبھی ناپید ہو جاتا ہے۔ لہذا جب تک کہ حمل کا یقین نہ ہو لعان کی صورت نہیں بنتی اور حمل کا یقین وضع حمل کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

لعان کے بعد عورت پر تہمت لگانے کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے کسی عورت پر جس کے اولاد ہے لیکن ان کا باپ معلوم نہیں ہے تہمت لگائی یا لعان کرنے والی عورت پر ناجائز اولاد (جننے) کی تہمت لگائی۔ خواہ اس اولاد کی زندگی میں یا اس کے مرنے کے بعد تو اس شخص پر حد قذف عائد نہ ہوگی۔ کیونکہ زنا کی علامت یعنی اولاد کے باپ کا نام معلوم ہونا موجود ہے۔ اس لحاظ سے عورت کی بے گناہی جو حد قذف (کے نفاذ) کی شرط تھی پوری نہیں ہوئی) لیکن اگر لعان کرنے والی عورت کی اولاد کو یا ناجائز اولاد کو کسی نے تہمت لگائی تو اس پر حد عائد ہوگی جیسا کہ ہلال بن امیہ کی روایت کردہ حدیث میں آیا ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”ان لا یدعی ولدھا لاب ولا یرمی ولدھا ومن رماھا ورمی فعلیہ الحد“ (یعنی اس عورت کی اولاد کو کسی کی طرف منسوب نہ کرنا چاہیے اور نہ اولاد پر تہمت لگائی جائے اگر اس عورت پر ایسا الزام لگایا یا اس کی اولاد پر تو وہ مستوجب حد ہوگا)۔ اگر ایک شخص نے کسی عورت پر جس نے لعان کیا اور اس کے کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تہمت لگائی تو اس پر حد عائد ہوگی۔ کیونکہ اس صورت میں نہ اس عورت کی بدکاری کا کوئی ثبوت ہے اور نہ اس کی کوئی علامت موجود ہے۔ اگر خاوند نے لعان کے بعد اس عورت کی اولاد کو اپنی اولاد ہونے کا دعویٰ کیا اور (اس بناء پر کہ اس نے بیوی پر تہمت لگائی تھی) اسے سزائے قذف دی گئی یا ہنوز سزا نہیں ملی تھی کہ وفات پا گیا تو وہ بچہ اسی شخص کا قرار پائے گا۔ اس کے بعد اگر کسی نے اس عورت پر تہمت لگائی یا خود خاوند نے مرنے سے پہلے تہمت لگائی تو تہمت لگانے والا مستوجب حد ہوگا۔ لیکن وہ شخص مستوجب حد نہ ہوگا جس نے اپنے (خاوند) اعتراف کذب بیانی سے پہلے تہمت لگائی۔

اسی طرح اگر خاوند کی بابت یہ ثبوت مل جائے کہ اس نے اولاد کا پہلے اعتراف کیا اور پھر انکار کیا تو وہ اس اولاد کا باپ قرار دیا جائے گا اور اسے سزائے قذف دی جائے گی۔ اور اس کے بعد اگر کسی نے تہمت لگائی تو اسے سزائے قذف

دی جائے گی۔ کیونکہ اب وہ عورت بدکار عورتوں کے زمرہ سے خارج ہو گئی ہے۔

شافعیہ کے اقوال میں سے ایک قول یہ ہے کہ اگر لعان کرنے والی عورت پر کسی شخص نے وہی تہمت زنا لگائی جس کے لئے لعان کر چکی ہے تو اس شخص پر حد عائد نہ ہوگی۔ ان کی اس رائے پر اعتراض کیا گیا ہے کہ اس قول کا مطلب یہ ہے کہ اگر لعان ہو جانے کے بعد (یعنی الزام سے بریت کی قسم موکد بہ لعنت کھانے کے بعد) بھی خاوند بیوی پر تہمت لگاتا ہے تو وہ مستوجب حد نہ ہوگا۔ حالانکہ یہ نص (وضاحت شرعی) جو ہے کہ ایسے شخص پر حد قذف عائد ہوگی اور حق یہ ہے کہ لعان سے اس عورت کو بے گناہ قرار دیئے جانے کا حق زائل نہیں ہو جاتا۔ شافعیہ کا کہنا یہ ہے کہ لعان عورت کے حق میں سزائے زنا کا قائم مقام ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ تہمت لگانے والے کو سزائے قذف نہ دی جائے۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ عورت کو مستوجب حد زنا قرار دیا جائے اور لعان کو حد زنا کی بجائے تصور کیا جائے۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے کیونکہ زنا کا محض الزام لگا دینے سے کسی پر حد عائد نہیں ہوتی کہ الزام ثابت نہ ہونے کی صورت میں بھی اس کی بے گناہی پر حرف آجائے۔ لعان تو زوجین میں سے کسی کی سچائی ثابت کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ (الزمام جرم کے لئے نہیں ہوتا)۔

نفاذ حد کا بیان

واضح ہو کہ سزائے قذف اس وقت تک پوری نہیں ہوتی جب تک کہ امام (حاکم وقت) یا اس کے نائب کی موجودگی میں نہ دی جائے۔ کیونکہ حاکم کے لئے اس کا مشاہدہ اور یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کس طرح سزا دی جا رہی ہے۔ اگر کسی مجرم نے چوری یا بدکاری یا شراب نوشی کا ارتکاب متعدد بار کیا تو ایک طرح کے گناہوں کی سزا ایک بار ہی دی جائے گی، یعنی ان سزاؤں میں تداخل ہوگا۔ لیکن اگر کوئی بدکاری، چوری، تہمت اور شراب نوشی، مختلف جرائم کا مرتکب ہوا تو ان جرائم میں سے ہر ایک کی الگ الگ سزا ملے گی، کیونکہ اگر کسی ایک جرم کی سزا مل گئی تو بسا اوقات مجرم یہ خیال کرے گا کہ دوسرے جرائم کی سزا ہی نہیں ہے اور اس کے ارتکاب سے باز نہ آئے گا۔ اگر جرائم کی سزا الگ الگ ہو تو ایسا نہ ہوگا۔

مختلف جرائم کی سزاؤں میں ترتیب کا بیان

اگر کوئی شخص بدکاری، چوری، شراب نوشی، تہمت تراشی یا (جراحت رسانی) مثلاً آنکھ پھوڑ دینے کا مرتکب ہوا تو اس کے لئے پہلے آنکھ پھوڑنے کی سزا (یعنی قصاص چشم) ہے پھر جب اس کو آرام ہو جائے تب اسے سزائے قذف ملے گی کیونکہ یہ بندے کا حق ہے۔ اس کے بعد اگلی سزا کے لئے اسے قید میں رکھا جائے گا تا کہ اسے آرام ہو جائے کیونکہ اگر دو جرائم کی سزا (متصل) دی گئی تو بیشتر حالات میں مجرم ہلاک ہو جائے گا۔ لہذا جب اس سزا سے آرام ہو جائے تو امام کو اختیار ہوگا کہ چاہے تو پہلے ہاتھ کاٹنے کی سزا دے یا پہلے زنا کی سزا دے کیونکہ ان دونوں جرائم کی حیثیت ایک سی ہے۔ اخیر میں شراب نوشی کی سزا دی جائے گی، کیونکہ یہ سزا سنت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور اجماع صحابہؓ سے ثابت ہے۔ پھر اگر مجرم شادی شدہ ہو تو حاکم پہلے آنکھ پھوڑنے کی سزا دے گا اس کے بعد سزائے قذف اور پھر سنگسار کرنے کی سزا دی جائے گی۔ باقی سزائیں ساقط ہو جائیں گی، کیونکہ قتل کے بعد جان جاتی رہے گی اور نتیجہً باقی سزا ختم ہو جائے گی۔

اگر کسی کو حاکم نے حد (یعنی شرعی سزائے ضرب) کا حکم دیا یا اسے کوئی سزا دی اور ضربات کی شدت سے اسے

سزا کے بارے میں مجرم کی حالت کو ملحوظ رکھنے کا بیان

جن امور کو سزائے ضرب دینے کے وقت شرعاً پیش نظر رکھنا چاہیے، منجملہ ان امور کے مجرم کی حالت کو ملحوظ رکھنا اور اس کی قوت برداشت کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اگر مجرم نحیف و ناتوان یا مریض ہے کہ سزائے ضرب کو نہیں جھیل سکتا، تو اس کی سزا میں اتنی تاخیر کرنا چاہیے کہ اس میں سزا برداشت کرنے کی قوت آجائے۔ اگر اس کی کمزوری فطری ہے کہ اس میں طاقت آنے کی امید نہیں ہے، تو چاہیے کہ جتنی ضربیں لگانی ہیں اتنی ہی تعداد میں لکڑی (کے تنکے یا شاخیر) یک جا کر کے ایک بار ضرب لگائی جائے۔ جمہور علماء کی یہی رائے ہے۔

مندرجہ بالا احکام سے عیاں ہے کہ دراصل سخت سزائیں ان ہٹے کٹے شریروں کے لئے ہیں جو لوگوں کو اذیت پہنچاتے ہیں بدیں جہت انکے ساتھ دشمنی واجب اور ان کی حرکتوں سے درگزر نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی شرارتیں خود ان کے لئے اور معاشرہ کے لئے بھی سخت نقصان دہ ہیں لہذا کسی حالت میں اور کسی موقع پر بھی ان کے ساتھ رحم کا برتاؤ نہ کرنا چاہیے۔ (۱)

موت آگنی تو اس کا خون معاف ہے۔ کیونکہ جلاد کو شریعت کے مطابق سزائے ضرب دینے کا حکم تھا اور وہ مجرم کی صحت و سلامتی کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس کی موت اللہ کے حکم سے اور حق اللہ کی حمایت میں واقع ہوئی پس گویا اللہ تعالیٰ نے اس کو ہلاک فرمایا، کسی کی چیرہ دستی کا نتیجہ نہیں لہذا اس کا ذمہ دار کوئی نہ ہوگا۔

فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص نشہ کی حالت میں کسی پر زنا کا الزام لگائے۔ تو اس تہمت تراشی کے بارے میں اس سے باز پرس ہوگی اور اس پر سختی کی جائے گی اور ہوش میں آنے کے بعد اسے سزائے قذف دی جائے گی بشرطیکہ مقذوف اس کا مطالبہ کرے۔

(۱) حنفیہ شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ تمام شرعی سزاؤں میں جرم قذف کی سزا سب سے ہلکی رکھی گئی ہے کیونکہ الزام زنا جس کی بنا پر یہ سزا ہوتی ہے۔ وہ قطعی نہیں ہے یعنی ممکن ہے کہ الزام لگانے والا سچا ہو گواہ سے ثابت نہ کر سکا ہو بخلاف حد زنا کے کہ اس کی بناء شہادوں یا تہمت لگانے والے کی چشم دید گواہی ہے۔ یہ تو معلوم ہے کہ یہ سزا محض الزام لگا دینے اور سزا عائد کر دینے کی بناء پر نہیں ہے۔ بلکہ یہ سزا اس شخص کے حقیقۃً یا شہادت گزرنے کی بناء پر حکماً کاذب (دروغ بیانی کرنے والا) قرار دیئے جانے کی وجہ سے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "فاذا لم یاتوا بالشہد آء فاو لئک عند اللہ ہم الکاذبون" (یعنی الزام لگانے والے اگر گواہ نہ پیش کر سکیں تو اللہ کے نزدیک وہ جھوٹے ہیں)۔ غرض اللہ تعالیٰ نے کسی کی طرف بدکاری کا الزام منسوب کرنے سے منع فرمایا ہے درآنحالیکہ وہ ایسے گواہ نہ پیش کر سکے جو اس الزام کی شہادت دیں۔ کیونکہ الزام کا مدعا اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے۔ اگر وہ شخص گواہی پیش کرنے سے عاجز ہو تو وہ الزام

بیہودہ گوئی اور بکواس کی طرح بے فائدہ ہے۔

سزا کے بارے میں فقہاء کا کہنا ہے کہ سزائے قذف کے وقت مجرم کے کپڑے نہیں اتارے جائیں گے البتہ فر (پوشین) ہو یا لباس میں کچھ (روئی وغیرہ) بھرا ہوا ہو اتر وادیا جائے گا۔ کیونکہ اس سے سزا پانے والے کو تکلیف نہ ہوگی۔ اگر مجرم کے جسم پر استروالالباس ہے جس میں روئی وغیرہ بھری ہوئی نہیں ہے تو اس لباس کو اتروانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اگر کرتے کے اوپر کوئی لباس ہے تو ظاہر ہے کہ اسے اتر وادیا جائے گا۔ کیونکہ قمیص کے ساتھ مل کر وہ لباس بھرے ہوئے لباس کے برابر یا تقریباً ویسا ہی ہو جائے گا اور سزا کی وہ تکلیف نہ ہوگی جو آئندہ ارتکاب جرم سے اسے باز رکھے۔ مالکیہ کہتے ہیں کہ تہمت کی سزا بھی دوسری سزاؤں کی طرح ہے۔ لہذا لازم ہے کہ درہ زنی کے وقت مجرم کے کپڑے اتر وادیے جائیں اور بدن پر بجز اس لباس کے جو ستر عورت (یعنی جسم کا مخفی حصہ چھپائے رکھنے) کے لئے ہو اور کوئی لباس نہ ہونا چاہیے۔ سزائے قذف میں اسی (۸۰) درے مارے جائیں۔ اگر مجرم غلام ہو تو اسے صرف چالیس درے مارے جائیں۔

ان اصحاب کا کہنا ہے درہ زنی کے لئے چڑے کا کوڑا استعمال کیا جائے لیکن یہ تندرست اور مضبوط انسان کے لئے ہے لیکن ناتوان جسم اور مریض انسان کو کوڑوں سے ضرب لگانا درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے مجرم ختم اور ہلاک ہو جائے گا اور یہ چاہیے کہ مجرم کے تمام جسم پر ضربات لگائی جائیں۔ کیونکہ ایک ہی حصہ جسم پر ضربات لگانا بسا اوقات ہلاکت کا موجب ہو جاتا ہے اور مجرم اس سزا کا حقدار نہیں ہے نیز چاہیے کہ ہلاکت آفرین ضربات لگانے سے پرہیز کیا جائے۔ چنانچہ گرہ دار نوک والے تازیانے سے نہ مارا جائے اور جسم کے مخفی نازک حصہ اور چہرہ پر ضرب نہ لگائی جائے کیونکہ انسانی حسن کا مرکز یہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ”اذا ضرب احدکم فلیتق الوجه“ (یعنی سزا دو تو چہرے کو بچا کر) اور سیدنا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جلا دو کو یہ حکم دیا تھا ”ایاک ان تضرب الرانس والفرج“ (یعنی خبردار سر اور شرمگاہ پر ضرب نہ لگانا)۔

واضح ہو کہ سزا کے وقت مرد کو کھڑا رکھا جائے اور عورت کو ستر کے ساتھ بٹھا کر سزا دی جائے گی۔ سزا کے وقت اس کے کپڑے نہ اتارے جائیں کیونکہ عورت پردہ کی شے ہے اور پردہ کی شے کا کھولنا حرام ہے۔ البتہ اگر بھرا ہوا (یا روئی دار) کپڑا یا فر (پوشین) ہو تو اتر وادیا جائے۔ تاکہ سزا کی اذیت جھیلے۔ اگر مجرم دبلا کمزور یا ایسے مرض میں مبتلا ہو۔ جو ناقابل علاج ہے مثلاً سل یا جزام (کوڑھ) کا مرض ہے تو ایسے مجرم کو کھجور کی شاخ سے جس میں اسی (۸۰) ٹہنیاں ہوں ایک بار ضرب لگانا کافی ہے۔ سخت گرمی یا سخت سردی کے وقت بھی حد نہ ماری جائے۔ عورت کو ایام نفاس یا حمل کے دوران سزا نہ دی جائے تاکہ اس سے افاقہ ہو جائے۔

توبہ، نصوح کا بیان

اللہ تعالیٰ نے آیہ کریمہ میں بے گناہ پر تہمت لگانے والوں کو بصیغہء (اسم موصول) مذکر الذین سے ذکر فرمایا ہے اور جس پر تہمت لگائی جائے اسے بصیغہ مونث ”المحصنات“ سے ذکر فرمایا ہے حالانکہ تمام فقہاء کے نزدیک جرم قذف کے اعتبار سے قاذف و مَقْدُوف دونوں کے لئے مذکر ہوں یا مونث یکساں حکم ہے یعنی کوئی (صنف مقال پر) تہمت زنا لگائے اور مجرم میں مستوجب حد ہونے کی شرطیں پائی جائیں تو حاکم پر واجب ہے کہ اسے سزائے قذف دے خواہ وہ

مرد ہو یا عورت اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد میں یہ سچ عبارت اختیار فرمائی اور وہ بصورت اول (یعنی تہمت لگانے والے کو بصیغہ مذکر ذکر فرمانا) بطور تغلیب کے ہے یعنی صیغہ مذکر کو صیغہ تانیث پر غالب رکھا ہے۔ کیونکہ کسی حکم شرعی میں جب مذکر و مونث دونوں شریک ہوں تو اس حکم کو بصیغہ مذکر بیان کیا جاتا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”وكانت من القانتين“ (یعنی وہ عورت قانتوں یا طاعت کرنے والوں میں سے تھی)۔ کرنے والیوں میں نہیں کہا کیونکہ اس صیغہ مذکر کے مفہوم میں مونث بھی شامل ہیں) پھر یہ بھی ہے کہ اکثر صورتوں میں یا زیادہ تر خیال یہی ہے کہ تہمت تراشی زیادہ تر مرد ہی کرتے ہیں۔ عورتوں کی شرم و حیا کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس بارے میں محتاط رہیں لہذا ایسی حرکت کا صدور ان سے بعید از قیاس ہے بیشتر حالات میں مرد ہی تہمت لگایا کرتے ہیں۔

رہی دوسری صورت یعنی مقدوف کے لئے صیغہ مونث کا استعمال وہ اس لئے ہے کہ زیادہ تر عورتوں ہی پر اس فعل مذموم کا الزام لگایا جاتا ہے جو ان کے لئے باعث رنج و الم ہوتا ہے اور تہمت لگانے والوں کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو زیادہ سے زیادہ اسے دکھ پہنچے اگرچہ رسوائی میں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں اور الزام لگنے سے دونوں کی شرافت پر حرف آتا ہے۔ عزت جاتی رہتی ہے اور حرمت ضائع ہوتی ہے علاوہ اس کے لفظ ’المحصنات‘ میں جو الف اور ت کے ساتھ جمع آئی ہے اس سے یہ قیاس کر لینا کہ یہ حکم عورتوں ہی کے لئے مخصوص ہے بے معنی ہے۔ بلکہ اس بارے میں عورتوں کو مردوں کی مانند قرار دینے کے لئے ایسا کیا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ مردوں کے متعلقہ امور کو عورتوں کے متعلقہ امور پر قیاس کیا گیا ہے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ان دونوں صنفوں کے متعلقہ احکام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس آیت کا پس منظر (یا شان نزول) یہ واقعہ ہے کہ ہلال بن امیہ نے اپنی بیوی پر شریک بن سحاء کے ساتھ ملوث ہونے کی تہمت لگائی اور اپنی بیوی کی شکایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں کی تھی اور آپ نے فرمایا تھا ”البینۃ اوحده فی ظہرک“ (یعنی گواہ پیش کر دو ورنہ تمہاری پیٹھ پر درے لگیں گے)۔

واضح ہو کہ شریعت نے شادی شدہ مرد یا عورت پر تہمت لگانے والے کے بارے میں تین باتیں ارشاد فرمائی ہیں کہ اسی (۸۰) کوڑوں کی سزا دی جائے۔ اس کی گواہی کو تسلیم نہ کیا جائے اور اسے فاسق قرار دیا جائے۔ اللہ جل شانہ نے اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا ہے ”الا الذین تابوا من بعد ذلک واصلحوا فان اللہ غفور رحیم“ (یعنی ایسا فاسق اگر اس کے بعد توبہ کرے اپنی اصلاح کر لے تو اللہ تعالیٰ مغفرت کرنے والا ہے)۔

توبہ یہ ہے کہ ایک شخص نافرمانی کے بعد طاعت الہی کی جانب مائل ہو جائے اللہ کے حکم سے پھر جانے کے بعد فرماں برداری پر آمادہ ہو اور (راہ حق سے) روگردان ہونے کے بعد واپس آجائے۔ یاد رہے کہ معصیت کا ارتکاب خدا تعالیٰ کی بارگاہ سے دور ہونا۔ اس سے منہ موڑنا بلکہ فرار ہونا ہے۔

واضح ہو کہ توبہ صادق یا توبہ فصوح کی تکمیل تین باتوں سے ہوتی ہے۔ جن سے انسان کا قلب معصیت کی آلودگی اور گناہوں کی گندگی سے پاک ہو جاتا ہے ان تین امور میں اول توبہ ہے کہ انسان جان لے کہ ارتکاب گناہ سے خود اس کی اپنی ذات کو کیا نقصان پہنچتا ہے۔ بارگاہ الہی اور مقام رضائے حق سے وہ کتنا دور ہو جاتا ہے۔ اس کا ارتکاب اپنے اوپر ظلم کرنا اور خواہش نفس سے مغلوب ہو جانا ہے جب تک قطعی اور یقینی طور پر اس بات کا یقین نہ ہو جائے اور دل مان نہ

لے تو بہ کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کو معلوم ہو کہ یہ کھانا جس کے کھانے کو جی چاہتا ہے اس میں زہر ہلا ہل ہے۔ اور طبیب حاذق نے بتا دیا ہے کہ یہ غذا جان لیوا ہے، باوجود اس کے اگر وہ اس کے لالچ میں پھنس کر اسے کھا لے تو اس کا نتیجہ ندامت و حسرت اور زوال قوت و طاقت کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ کیا اس وقت اسے اپنے کئے پر اپنی ناکامی و ناکامی کا پچھتاوا نہ ہوگا؟ اور اس کھانے کی لذت ایک مصیبت بن کر اس پر نہ چھا جائے گی اور اس کی خوشی غم میں تبدیل نہ ہو جائے گی؟ اب اگر کوئی شخص اہل بصیرت ہے تو اسے اپنے فعل پر ندامت ہوگی اور تو بہ کا یہ دوسرا مرحلہ ہے یعنی ندامت لیکن محض پچھتائے اور افسوس کرنے پر اکتفا کر لینا اور غور و فکر سے کام نہ لینا اہل بصیرت کا شیوہ نہیں بلکہ یہ ندامت ہی نہیں ہے اور اس سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ اپنے کئے پر پچھتائے کا دعویٰ ہے تو تلافی مافات کے لیے ماضی حال اور مستقبل کو دیکھنا ہوگا پس سر دست تو لازم ہے کہ اس غذا سے متفر ہو جائے اور پختہ ارادہ کر لے کہ آئندہ کبھی ایسی غلطی نہ کرے گا۔ پھر اس غذا کا برا اثر جو معدہ پر ہوا ہے اس کے دور کرنے کی فوری تدابیر عمل میں لائے یہاں تک کہ اس کی طبیعت زہر قاتل کے اثر سے بالکل صاف ہو جائے۔ گناہوں اور قصوروں سے تو بہ کرنے کی اصل حقیقت یہی ہے اور صحیح معنوں میں نادم ہونے کا اندازہ ان تین باتوں سے ہو سکتا ہے۔

اول گناہ کا فوری طور پر ترک دوسرے آئندہ کو اس سے باز رہنے کا پختہ عزم تیسرے ماضی کی کوتاہیوں کے اثر سے نجات کی کوشش۔ اس میں یہ امر بھی شامل ہے کہ حقداروں کو ان کا حق ادا کر دیا جائے یہی خالص تو بہ ہے جس کا قبول ہو جانا یقینی ہے اور اللہ جل شانہ نے اس کی قبولیت کا وعدہ فرمایا ہے اور وہ کبھی اپنے وعدہ کے خلاف نہیں لرتا۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ تو بہ کا پورا ہونا تین باتوں پر موقوف ہے، یعنی علم، طریقہ اور عمل اس کا مطلب یہی ہے۔ اور عمل کا تعلق حال، استقبال اور ماضی کے معاملات سے ہے۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ جو شخص (تو بہ کر کے) ایک مدت تک اپنی حالت کو سدھارے رکھے تو اس کی گواہی قبول کی جاسکتی ہے اور اس میں سربراہی کی صلاحیت ہو جائے گی۔ پھر اس مدت کی مقدار پورا ایک سال قرار دی گئی ہے کہ اس دوران اس کے اوپر سے چاروں فصلیں (جاڑا، گرمی، بہار اور خزاں) گزر جائیں گی۔ جن میں بالعموم لوگوں کے حالات اور طبیعتوں میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ عنین (نامرد) کے (اصلاح حال) کی بھی اسی طرح ایک سال کی مدت رکھی گئی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ”من بعد ذلک“ (یعنی گناہ کرنے کے بعد) جو آیا ہے اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ تو بہ گناہ کرنے کے بعد ہوتی ہے جبکہ گنہگار کے دل میں خوف پیدا ہو اور اسے معلوم ہو جائے کہ اس میں کتنی خرابیاں ہیں اور یہ کتنا بڑا گناہ ہے۔

قاذف کی تو بہ قبول ہونے کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ جو شخص تہمت لگانے کے جرم میں سزا پا جائے اس کی گواہی قبول نہ ہوگی اگرچہ اس نے سچے دل اور نیک نیتی سے تو بہ کر لی ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”لا تقبلوا لہم شہادۃ ابدًا“ (یعنی ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو) اور اس لئے بھی کہ قاذف کی گواہی قبول نہ کرنے ہی سے حد قذف پوری ہوگی کیونکہ جرم قذف شہادت کے تسلیم کئے جانے سے مانع ہے اور تو بہ کے بعد بھی حیثیت قذف باقی رہی ہے یہ حکم بخلاف اس کے ہے جس کی گواہی تہمت کے

علاوہ کسی اور گناہ کی بناء پر رد کی جائے کیونکہ اگر کسی اور گناہ کی بنا پر شہادت کے ماننے سے انکار کیا گیا تو وہ گناہ بوجہ توبہ کر لینے کے دور ہو گیا۔

اس خیال کی بنا (یا اصول) یہ ہے کہ جب جملات عاطفہ میں بیان کئے گئے حکم سے کوئی صورت مستثنیٰ کی جائے تو اس استثناء کا تعلق صرف اخیر کے جملہ سے ہوگا اس آیت میں عطف کے ساتھ تین جملے آئے ہیں: ”فاجلدوہم“ (یعنی تہمت لگانے والوں کو تازیانے مارو)۔ لا تقبلوا لہم شہادۃ ابد (اور کبھی ان کی گواہی کو تسلیم نہ کرو) اور ”اولئک ہم الفاسقون“ (اور یہ لوگ گھنہ گار ہیں)۔ چونکہ لا تقبلوا کا لفظ حرف عطف کے بعد آیا ہے لہذا عدم قبول شہادت بھی قذف میں داخل ہے۔ کیونکہ اس سزا کو جرم سے مناسبت ہے اور اس کے ساتھ ”ہمیشہ“ کی قید لگی ہوئی ہے۔ اس جرم سے مناسبت یہ ہے کہ اگر قاذف کی شہادت کو نہ مانا جائے تو اس سے اس شخص کے دل کو اذیت پہنچے گی جس کا سبب بھی خود اس شخص کی زبان ہے جس طرح کہ اس کی زبان سے مقدوف کو اذیت پہنچی تھی اور اس کے ساتھ ”ابد“ کی جو قید ہے اس کے معنی سوا اس کے اور کچھ نہیں ہیں کہ ایسے شخص کی گواہی کبھی قبول نہ کی جائے ورنہ (بغیر قید ابد کے) صرف یہ کہا جاتا ”لا تقبلوا لہم شہادۃ“ (یعنی اس کی شہادت کو تسلیم نہ کرو)۔ رہا جملہ ”اولئک ہم الفاسقون“ ایک مستقل جملہ ہے جس میں فاسقون کی شہادت تسلیم نہ کئے جانے کا سبب بتایا گیا ہے (یعنی گناہ) پھر اس حکم سے ان لوگوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے جنہوں نے توبہ کر لی ہو بنا بریں یہاں شہادت کو رد کر دیئے کا سبب صرف گناہ بتایا گیا ہے جو توبہ کرنے سے جاتا رہتا ہے۔ ایسی صورت میں عدم قبولیت توبہ کے لئے ہمیشہ کی قید بے معنی ہے۔

واضح ہو کہ یہاں جو استثناء ہے وہ استثناء منقطع ہے (یعنی امر مستثنیٰ امر مستثنیٰ منہ میں داخل نہیں ہے) کیونکہ توبہ کرنے والا فاسقوں میں داخل نہیں ہے۔ پس گویا اس آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ گناہ گار ہیں بجز ان کے جنہوں نے توبہ کر لی کیونکہ اللہ معاف کرنے اور رحم فرمانے والا ہے۔ یعنی ان کی معافی ہو جائے گی اور اللہ ان پر رحم فرمائے گا۔ اب در آنحالیکہ گواہی کا رد ہونا حد قذف کی تکمیل ہے کیونکہ یہ سزا (یعنی رد شہادت) بھی مانع معصیت ہے اور برائی سے روکتی ہے لہذا یہ سزا بھی اصل سزائے حد کی طرح ہے۔ توبہ کرنے سے یہ سزا ساقط نہ ہوگی۔ پس جب حد کسی پر عائد ہو جائے تو اب وہ سزا ساقط نہیں ہو سکتی بلکہ حد کا نفاذ بالا جماع واجب ہے۔ خواہ کتنی ہی نیک نیتی سے توبہ کی ہو۔ حنفیہ جو استدلال کرتے ہیں کہ استثناء کا تعلق صرف آخری جملہ سے ہے اس کی چند وجہیں ہیں:

ایک وجہ یہ ہے کہ یہ استثناء ان استثناءؤں میں سے ہے جو آخری جملہ سے مخصوص ہے۔ اس باب میں یہی طریقہ رائج ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سابقہ جملوں کا مفہوم ”عمومیت کو متقاضی ہے۔ جس میں اس استثناء سے خلل واقع ہوا۔ اس عمومیت کی بحالی کے لئے یہ کافی ہے کہ اس استثناء کو ایک ہی جملہ کے ساتھ وابستہ قرار دیا جائے۔ ورنہ استثناء کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ پس اس کا تعلق ایک ہی جملہ سے قرار دیا جانا واجب ہے اور وہ آخری جملہ ہی ہو سکتا ہے۔

تیسرے یہ کہ اگر اس استثناء کا تعلق سابقہ تینوں جملوں کے ساتھ سمجھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر کوئی شخص توبہ کر لے تو اسے حد نہ لگائی جائے اور بالا جماع یہ خیال سب کے نزدیک باطل ہے۔ پس بہر حال اس استثناء کو آخری جملہ سے مخصوص کرنا واجب ہے۔

احناف نے اپنے اس مسلک کی تائید میں چند روایات و احادیث شریفہ سے استدلال فرمایا ہے:

ایک روایت وہ ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہلال بن امیہ کے واقعہ کے بارے میں مروی ہے جنہوں نے اپنی بیوی پر شریک بن سحاء سے ملوث ہونے کا الزام لگایا تھا۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”یجسد ہلال و تبطل شہادۃ فی المسلمین“ (یعنی ہلال کو درے لگائے جائیں اور مسلمانوں میں ان کی شہادت کو تسلیم نہ کیا جائے) یہاں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتا دیا ہے سزائے ضرب ملنے کے بعد اسکی گواہی کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ اس کے لئے توبہ کی کوئی شرط نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”المسلمون عدول بعضهم علی بعض الا محدود فی قذف“ (یعنی تمام مسلمان ایک دوسرے کے حق میں قابل اعتبار ہیں بجز ایسے شخص کے جو جرم قذف میں سزا یاب ہو) یہاں پر بھی توبہ کا ذکر نہیں ہے۔

تیسرے وہ روایت ہے جو حضرت عمرو بن شعیب نے اپنے باپ سے اور انہوں نے دادا سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”لا یجوز شہادۃ محدود فی الاسلام“ (یعنی اس کی گواہی جائز نہیں ہے جس پر حد نافذ ہو چکی ہو۔

شافعیہ مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ جرم قذف کا سزا یاب اگر توبہ کر لے اور وہ توبہ نیک نیتی سے ہو تو اس کی گواہی مانی جائے گی اور توبہ سے مراد یہ ہے کہ قاذف نے جو تہمت لگائی ہے اسے وہ خود جھٹلائے۔ رہا یہ سوال کہ آیا اس کے لئے عمل کی اصلاح کا بھی لحاظ کیا جائے گا یا نہیں؟ اس بارے میں ایک قول یہ ہے کہ ہاں یہ بھی دیکھنا ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”الا الذین تابوا“ (یعنی بجز ان کے جنہوں نے بعد میں توبہ کر لی اور اصلاح حال کر لیا) اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کا لحاظ ضروری نہیں ہے کیونکہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ابو بکر کو کہا تھا ”تب اقبل شہادتک“ (یعنی توبہ کر لے میں تیری گواہی مان لوں گا)۔

اصحاب بالانے اپنے اس مسلک کے بارے میں کہ جرم قذف کے سزا یاب کی گواہی قبول ہو سکتی ہے چند دلیلیں پیش فرمائیں ہیں:

ایک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ”التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ“ (یعنی گناہ سے توبہ کر لینے والا ایسا ہے جیسے اس نے وہ گناہ کیا ہی نہیں) پس جب کہ اس کی گواہی مانی جاتی ہے جس نے گناہ نہیں کیا تو توبہ کر لینے والے کی گواہی کا تسلیم کرنا بھی واجب ہوا۔

دوسرے یہ کہ اگر کوئی کافر تہمت لگانے والا ہے اور پھر اس نے اپنے گناہ سے توبہ کر لی اور اسلام میں داخل ہو گیا تو بالاتفاق اس کی گواہی تسلیم کی جاتی ہے۔ تو اگر مسلمان قاذف تہمت لگانے کے گناہ سے توبہ کر لے تو اس کی گواہی بھی واجب التسلیم ہوگی، کیونکہ مسلمان کا جرم قذف کافر کے جرم قذف سے ہلکا ہی ہوگا۔ اب اگر اس پر یہ کہا جائے کہ مسلمان کو کافر کی بدگویی سے کوئی رنج نہیں ہوتا، کیونکہ مسلمانوں کے ساتھ تو ان کی عداوت مسلمہ ہے اور ان کے طعنے باطل ہیں۔ لہذا کافر کے تہمت لگانے سے مسلمان مقدف کو رنج و بغض نہ ہوگا۔ پھر یہ بھی ہے کہ جو شخص کفر سے توبہ کر لے اس پر حد نافذ

نہیں ہوتی لیکن جرم قذف سے توبہ کرنے والے کی سزا ساقط نہیں ہوتی۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرما کر (مسلم اور غیر مسلم کے درمیان) فرق کو دور فرما دیا ہے: ”انبتھم ان لھم مال للمسلمین وعلیھم ماعلی المسلمین“ (یعنی غیر مسلموں کو بتا دو کہ ان کے حقوق وہی ہیں جو مسلمانوں کے اور ان پر بھی وہی پابندیاں ہیں جو مسلمانوں پر ہیں)

تیسرے یہ کہ تمام فقہاء کا اس پر اجماع ہے کہ جو شخص کفر، قتل، زنا، شراب نوشی اور چوری سے توبہ کر لے اس کی گواہی مانی جائے گی۔ یہی صورت مجرم قذف کی بھی ہے کیونکہ یہ گناہ تہمت ہر چند کہ کبیرہ ہے لیکن خود زنا سے بڑا گناہ نہیں ہے۔ چوتھے یہ کہ خود امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ قذف کے ایسے مجرم کی گواہی قبول کرتے ہیں جسے ہنوز سزائے قذف نہ ملی ہو۔ باوجود اس کے کہ حد کا نفاذ مقدوف کا حق ہے اور (چونکہ یہ بندے کا حق ہے) توبہ کرنے سے زائل نہیں ہوتا (پس جب کہ ایسے مجرم کی شہادت مانی جاتی ہے تو) اگر کوئی قاذف نفاذ حد کے بعد توبہ کر لے اور اپنی حالت سدھار لے اور فاسق ہونے کا دھبہ دور ہو جائے تو اس کی گواہی بدرجہ اولیٰ قابل قبول ہوگی۔

پانچویں یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ”الا الذین تابوا“ (یعنی بجز ان کے جنھوں نے توبہ کر لی) یہ استثناء چند جملوں کے بعد آئی ہے۔ لہذا یہ استثناء ان تمام باتوں پر عائد ہوتی ہے جو سابقہ جملوں میں بتائی گئی ہیں۔ اس کے چند ثبوت ہیں۔ ایک تو یہ کہ تمام فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کسی نے کہا کہ اس کا غلام آزاد اور اس کی بیوی کو طلاق ہے، انشاء اللہ (یعنی اگر اللہ نے چاہا) تو یہ شرط دونوں جملوں پر عائد ہوگی (یعنی اس شرط کے لگا دینے سے نہ غلام آزاد ہوگا اور نہ بیوی کو طلاق ہوگی) یہی صورت اس مسئلہ کی ہے۔

دوسرے یہ کہ ان جملوں کو حرف عطف (واو) سے ملایا گیا ہے جو جمع مطلق (یعنی مختلف باتوں کو ایک حکم میں جمع کرنے) کے لیے آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”فا جلدوہم ثمانین جلدۃ ولا تقبلوا لھم شہادۃ ابداء، واولشک ہم الفاسقون“ (یعنی قاذفوں کو اسی (۸۰) کوڑے مارو اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو اور وہ لوگ فاسق ہیں) ان تمام باتوں کو ایک ساتھ ہی ذکر فرمایا گیا ہے۔ اس میں ایک دوسرے کی تقدیم و تاخیر نہیں ہے۔ اب اگر اس حکم سے کسی کو مستثنیٰ کیا گیا تو اس استثناء کو ان تینوں باتوں میں سے کسی ایک پر مقدم نہ رکھا جائے گا۔ کیونکہ ان باتوں میں سے کسی بات کو دوسری باتوں پر قطعاً فوقیت نہیں ہے۔ لہذا اس استثناء کو ان تمام کی طرف لوٹایا جائے گا۔ اس کی نظیر بقول ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے ”اذا قمتم الی الصلوۃ فاغسلوا وجوھکم“ (یعنی جب نماز کو آمادہ ہو تو اپنے چہروں کو دھوؤ) اس میں حرف ”فا“ جو تعقیب (بعد کی بات) کے لیے ہوتا ہے وہ صرف چہروں کے لیے نہیں ہے بلکہ (ارادہ صلوٰۃ کے بعد) تمام ارکان وضو کے لیے ہے۔ کیونکہ حرف عطف ”واو“ میں ترتیب مد نظر نہیں ہوتی۔ اسی طرح یہاں پر (آیت ”الا الذین“ میں) لفظ ”الا“ (یعنی لیکن) کسی ایک امر سے مستثنیٰ کرنے کے لیے نہیں آیا۔ کیونکہ حروف ”واو“ (یعنی اور) کے ساتھ جو باتیں بیان کی جاتی ہیں ان میں ترتیب پیش نظر نہیں ہوتی بلکہ سب کو ایک حکم میں جمع کرنا ہوتا ہے (لہذا یہاں بھی ان تینوں امور سے بحیثیت مجموعی مستثنیٰ کرنا پیش نظر ہے)۔

تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ”اولشک ہم الفاسقون“ (یعنی وہ لوگ فاسق ہیں) ولا تقبلوا لھم

شہادۃ ابداء“ (اور کبھی ان کی گواہی کو تسلیم نہ کرو) کے بعد آیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی گواہی کا رد کیا جانا ان کے فاسق ہونے کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ کوئی حکم کسی وصف کا ذکر کرنے کے بعد آئے تو وہ وصف اس حکم کا سبب ہوتا ہے خاص کر اس حالت میں جبکہ اس وصف کو اس جرم سے مناسبت ہو۔ پس یہاں بھی ایک شخص کے فاسق ہونے کی صورت میں مناسب یہی ہے کہ اس کی گواہی قبول نہ کی جائے اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ شہادت کا سبب فاسق ہونے کے سوا نہیں اور یہ استثناء فسق کے جاتے رہنے کی دلیل ہے لہذا جب رد شہادت کا سبب جاتا رہا تو رد شہادت کا حکم بھی جاتا رہے گا۔

چوتھے یہ کہ اس قسم کی استثناء قرآن حکیم میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ”انما جزاء الذين يحاربون الله ورسوله“ سے ”الا الذين تابوا“ تک (یعنی جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین پر فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے یا سولی دے دی جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ دیئے جائیں یا انہیں ملک بدر کر دیا جائے یہ تو دنیا کی رسوائی ہوئی اور آخرت میں انہیں دردناک عذاب کا سامنا ہوگا۔ لیکن اگر پکڑے جانے سے پہلے وہ توبہ کر لیں تو یاد رہے کہ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے) اب اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہے کہ پہلی آیت کے شروع سے جو امور بیان کیے گئے ہیں یہ آیت ان سب سے استثناء کرتی ہے اور توبہ کا تعلق ان تمام باتوں سے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”لا تقربوا الصلوة وانتم سكارى“ سے فلم تجدوا ماء فتيمموا“ تک ملاحظہ ہو (یعنی نشہ کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ اس وقت جاؤ جبکہ تمہیں یہ معلوم ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اگر سفر میں نہ ہو اور ناپاکی کی حالت میں ہو تو غسل کئے بغیر نماز نہ پڑھو۔ ہاں اگر مریض ہو یا سفر میں ہو یا بیت الخلاء سے آئے ہو یا عورت کو ہاتھ لگایا ہو اور پانی دستیاب نہیں ہے تو پاک مٹی سے تیمم کر لو) اس آیت میں اس کے لیے تیمم کا حکم ہے جسے غسل کی حاجت ہو۔ ساتھ ہی اسے بھی تیمم واجب ہے جس پر وضو واجب ہے، واللہ اعلم۔

جرم قذف سے توبہ کرنے کا طریقہ

شافعیہ کہتے ہیں کہ تہمت لگانے کے گناہ سے توبہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ قاذف خود اپنے آپ کی تکذیب کرے، اصحاب شافعیہ نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے ان میں سے بعض کا کہنا تو یہ ہے کہ وہ شخص (قاذف) کہے کہ میں نے جو کچھ کہا تھا وہ جھوٹ تھا، آئندہ ایسی حرکت نہ کروں گا۔ ابواسحق کہتے ہیں کہ اس شخص کو یہ نہ کہنا چاہیے کہ میں نے جھوٹ بولا تھا، کیونکہ بہت ممکن ہے کہ اس نے سچ ہی کہا ہو۔ اس صورت میں اس کی یہ بات دروغ گوئی ہوگی اور دروغ گوئی بذات خود ایک گناہ ہے، گناہ سے توبہ کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ایک اور گناہ کر لیا جائے۔ اس کی بجائے قاذف کو سب کے سامنے یہ کہنا چاہیے کہ میں اپنی بات پر نادم ہوں اور اس بات سے پھرتا ہوں اور آئندہ ایسا نہ کروں گا۔ اور اللہ تعالیٰ کا جو یہ ارشاد ہے: ”فان الله غفور رحيم“ (یعنی اللہ مغفرت کرنے والا ہے) اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہونے کے باعث توبہ قبول فرمائے گا۔ اس سے ثابت ہے کہ عقلاً توبہ کا قبول کرنا واجب نہیں ہے۔ اگر قبولیت توبہ امر واجب ہوتا تو اللہ غفور رحیم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر دعا کا قبول کرنا اس پر واجب ہو تو وہ ناچار اس ڈر سے دعا قبول کرے گا کہ وہ جانتا ہے کہ اگر اس نے توبہ قبول نہ کی تو غلط کار تصور کیا جائے گا اور معبودیت کے دائرہ سے خارج ہو جائے گا۔

قصاص کا بیان

قصاص یہ ہے کہ جرم کرنے والے کو اسی طرح اذیت دہ سزا دی جائے جو اذیت مجرم نے کسی کی جان یا جسم کے کسی حصہ کو دی ہے۔ پس اگر ایک شخص نے کسی کو قتل کر دیا تو اس کی پاداش میں ویسی ہی سزا (یا قصاص) کا مستحق ہوگا یعنی اسے بھی قتل کیا جائے گا جیسے اس نے دوسرے شخص کو قتل کیا تھا۔^(۱)

۱۔ واضح ہو کہ مؤلف کتاب ہذا شیخ الجزائری رحمہ اللہ علیہ نے قصاص کا ذکر حدود (سزائے شرعی) کے سلسلہ میں فرمایا ہے۔ چنانچہ انھوں نے حدود کے باب میں شراب نوشی کی سزا، پھر چوری پھر تہمت تراشی پھر قصاص کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کے بعد دوسری سزاؤں کے طریقے بتائے اور حدود کا بیان ختم ہونے کے بعد ملک میں فساد پھیلانے اور سرکشی کرنے والوں اور باغیوں کا ذکر ہے۔ لیکن فقہائے سلف جنہوں نے ان سے پہلے تالیفات کی ہیں یہ روش اختیار نہیں کی۔ چنانچہ علمائے سلف صالحین جنہوں نے علوم فقہ کو اپنے اپنے مسلکوں کے مطابق جمع فرمایا ہے؟ قصاص کا ذکر حدود کے زمرہ میں نہیں فرمایا، بلکہ اس کے لیے ایک خاص مستقل باب باندھا ہے جس کا نام کتاب الجنایات اور کتاب الدیات رکھا ہے اور حدود کے بیان کو شراب نوشی، بدکاری، سرقہ، اتہام اور ان کی شرعی سزاؤں تک محدود فرمایا ہے۔

حقیقہ کے نزدیک مسائل فقہ کی ترتیب کتاب موسومہ الاختیار شرح المختار تالیف عبداللہ بن محمود بن مودود الموصلی میں ملاحظہ ہو۔ اس میں عنوان کتاب الحدود کے تحت زنا، اتہام، شراب سرقہ اور ہرنی کی حدود (شرعی سزاؤں) کا ذکر ہے اور عنوان کتاب السیر کے تحت ارتداد، سرکشی اور بغاوت کا بیان ہے۔ اس کے بعد کتاب الجنایات، جس کی متعدد فصلیں اور شعبے ہیں۔ اس کے بعد کتاب الدیات ہے جس میں تاوان (یا جرمانے) کے اقسام اور جزئیات کا ذکر ہے۔ اس میں پہلے بتایا گیا ہے کہ جنایت (یا جرم) عبارت ہے ایسے افعال ممنوعہ سے جو ضرر رساں ہوں۔ ایسے افعال سے کبھی تو خود مرتکب کو ضرر پہنچتا ہے اور کبھی دوسروں کو چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ”جنی علی نفسہ“ (یعنی اس نے اپنے اوپر ظلم کیا اور ”جنی علی غیرہ“ (یعنی دوسرے کو ضرر پہنچایا)۔ دوسرے کو ضرر یا تو جان کا ہوتا ہے یا جسم کے کسی حصہ کا یا آبرو یا مال کا ضرر ہوتا ہے۔ جان کے ضرر کو قتل کرنا یا سولی دینا یا آگ میں جلانا کہا جاتا ہے اور کسی عضو کے ضرر پہنچانے کو کاٹنا، توڑنا یا زخمی کرنا کہتے ہیں۔ اس باب میں ان ہی دونوں قسم کے جرائم کی تفصیل اور ان سزاؤں کا ذکر ہے۔ بے عزتی کرنے کے جرم کی دو قسمیں ہیں، ایک قذف (اتہام) جس پر حد (سزائے شرعی) واجب ہوتی ہے۔ اس کی تفصیل آچکی ہے اور دوسری قسم غیبت (پیٹھ پیچھے برا کہنا) ہے کہ یہ بھی گناہ ہے اور اس کی سزا کا تعلق آخرت سے ہے۔ مالی ضرر رسائی کو بے ایمانی، بددیانتی یا چوری کہتے ہیں، اس کی تفصیل اور سزا سرقہ کے بیان میں آچکی ہے۔

جاننا چاہیے کہ قصاص یعنی (سزائے مثلی) ایک شرعی حکم ہے جو کتاب و سنت (یعنی قرآن و حدیث) اور اجماع امت (یعنی مسلمانوں کے متفقہ دستور العمل) سے ثابت ہے۔ کتاب اللہ میں ارشاد باری ہے ”یا ایہا الذین امنوا کتب

علیکم القصاص فی القتلی، الحر بالحر والعبد بالعبد والأ نسی بالأنسی“ (البقرة: ۱۷۸) (یعنی اے مومنو تم پر (قانون) قصاص خون کا بدلہ خون فرض کیا گیا ہے، آزاد قاتل ہو تو اس کے عوض اس آزاد کو، غلام قاتل ہو تو اس کے عوض اس غلام کو، عورت قاتل ہو تو اس کے عوض اس عورت کو سزائے موت ہوگی) نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”ومن قتل مظلوماً فقد جعلنا لولیه سلطاناً فلا یسرف فی القتل، انه کان منصوراً“ (بنی اسرائیل: ۳۳) (یعنی اگر کوئی مظلوم قتل کر دیا جائے تو ہم نے اس کے ولی کو (مطالبہ قصاص کا) اختیار دیا ہے۔ لیکن اسے قتل کرنے میں زیادتی نہ کرنی چاہیے۔ ہاں وارث کی مدد کی جائے)۔ سنت سے اس کا ثبوت رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے ”من قتل قتلناہ“ (یعنی جو قتل کا مرتکب ہو، ہم مسلمان اسے قتل کر دیں گے) نیز آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے ”کتاب اللہ القصاص“ (یعنی قصاص اللہ کا فرمان ہے) اس پر سب متفق ہیں اور عقل و دانائی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کو شرعی قانون بنایا جاتا۔

واضح ہو کہ انسانی طبائع اور شرارت پسند ہستیاں ظلم اور زبردستی پر مائل رہتی ہیں اور جرم کا انتقام اس جرم کی حیثیت سے زیادہ لینا چاہتی ہیں۔ بالخصوص بادیہ نشین اور بے علم اشخاص جو عقل و انصاف کے طریقے سے ہٹے ہوئے ہیں۔ عہد جاہلیت (قبل از اسلام) میں ان کے خصائل کا ذکر آتا ہے۔ اب اگر ایسے احکام شریعت نہ ہوتے جو مظالم سے باز رکھتے اور بلا افراط و تفریط (مساویانہ) قصاص کا حکم نہ ہوتا تو جاہل متعصب اور خود پسند طبائع کو قتل و غارت کے ارتکاب کی جرات اور بڑھ جاتی اور جو تکلیف انہیں پہنچی ہے اس کے انتقام میں دگنی اذیت دیتے۔ اس سے باہمی کدورت اور بھی بڑھ جاتی۔ اس کی خرابی ظاہر ہے لہذا یہ تقضائے حکمت شریعت (اسلامیہ) نے ایسی سزا مقرر فرمائی جو اقدام قتل سے روکے اور اس جرم کے بدلے جو سزا دی جائے وہ اس کے مناسب ہو اور اس میں زیادتی نہ ہو۔ شرع کے احکام اسی مصلحت پر مبنی ہیں۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”ولکم فی القصاص حیاة یا اولی الالباب“ (یعنی اے دانشمندو اس حکم قصاص میں تمہاری زندگی ہے)۔

شافعیہ کی کتاب ”مغنی المحتاج“ میں یہ ابواب باندھے گئے ہیں کتاب البغاة، (باغیوں کا بیان) کتاب الردۃ، (مرتدوں کا بیان) کتاب الزنا، (بد فعلی کا بیان) کفارة حد القذف، (یعنی سزائے بہتان کا کفارہ) کتاب قطع السرقة، (یعنی چوری کرنے کی سزائے قطع کا بیان) باب قطع الطريق، (راہزنی کا بیان) کتاب الاشربة، (مشروبات کا بیان) فصل فی التعزیر، (تنبیہی سزائیں)۔ اس سے پہلے کتاب الجراح، (یعنی جراحت رسانی کا بیان) اور اس کی تفصیلات پھر کتاب الادیات، (تاوانوں) اور اس کی تفصیلات ہیں۔

اسی طرح امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب موسومہ الأم ہے اس میں پہلے باغیوں اور مرتدوں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد کتاب الحدود (شرعی سزائیں) اور (نسب سے) انکار کی تفصیل ہے۔ پھر چوری، زنا، شراب، رہزنی، مرتدوں اور مشروبات کے استعمال کا بیان ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کی کتاب مختصر المزنی کے حصہ کتاب الحدود میں سزائے زنا اور سزائے قذف کا ذکر ہے اور کتاب السرقة کے تحت راہزنوں اور مشروبات کا بیان اور مرتدوں سے جنگ کا ذکر ہے اس سے پہلے کتاب القتل اور کتاب القسامة ہے (یعنی ثبوت دعویٰ کے لیے مقتول کے ولی سے قسم لینے کا بیان)۔

مالکیہ مسائل فقہ کی ترتیب۔ حاشیہ شیخ الصاوی علی شرح الصغير میں باب فی احکام الجنایة علی النفس علی ما دونها، (یعنی جانی اور غیر جانی جرائم کے متعلق احکام) کے بعد باب تعریف البغی، (یعنی بغاوت کی تعریف) پھر باب تعریف الردۃ، (یعنی ارتداد کی تعریف) پھر باب حد الزن، (یعنی بدکاری کی شرعی سزا کا بیان) اردو باب حد القذف، (یعنی بہتان لگانے کی شرعی سزا) پھر باب احکام السرقة، (یعنی سرقت کے متعلق احکام) پھر باب ذکر باب الجراحة، (یعنی جراحت رسائی کا ذکر) پھر باب حد الشارب، (یعنی شراب نوشی کی شرعی سزا) کا بیان اور قصاص کا ذکر باب الحدود، (یعنی شرعی سزائوں) میں نہیں کیا گیا ہے اور احکامات جنایات، (یا فوجداری جرائم) کے متعلق احکامات کا ذکر پہلے کیا گیا ہے کیونکہ ان کے ذکر کو سب زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ شیخ عبدالوہاب شعرانی کی تالیف کتاب المیزان میں ترتیب مسائل یوں ہے کتاب الجنایات، (فوجداری جرائم) کتاب الدیات، (تاوان یا جرمانے) باب القسامة، (مقتول کے ولی کا حلف اٹھانا) باب کفارة القتل، (قتل کا کفارہ) کتاب حکم السحر والساحر، (جادو اور جادو کرنے والے کے متعلق مسائل) اور کتاب الحدود السبعة المترتبة علی الجنایات، (یعنی جرائم کی سات شرعی سزائیں) باب الردۃ، (دین اسلام سے پھر جانے کا بیان) باب حکم البغاة، (باغیوں کے متعلق احکامات) باب الزنا (بدکاری کا بیان) باب حد القذف، (بہتان کی سزا) باب السرقة، (چوری کا بیان) باب قطاع الطريق، (رہزنیوں کا بیان) باب حد شرب المسکر، (نشہ آور یا مسکرات کے استعمال کی شرعی سزا) باب التعزیر، (دوسری سزائوں کا بیان)۔

یہی کیفیت کتاب ”رحمة الامة فی اختلاف الائمة“ تالیف شیخ محمد بن عبدالرحمن الدمشقی الشافعی کی ہے۔ لیکن مرتب کتاب ہذا (جلد پنجم) یعنی علامہ شیخ علی حسن العریض کا کہنا ہے کہ انہوں نے (علامہ عبدالرحمن الجزیری) کی علمی امانت کی پاسداری کے پیش نظر اس کتاب کی ترتیب میں وہی روش اختیار کی ہے جو مؤلف (رحمہ اللہ علیہ) نے اختیار فرمائی تھی یعنی کتاب القصاص والجنایات (یعنی قصاص اور جرائم فوجداری کے بیان) کو باب الحدود (شرعی سزائوں میں) رکھا ہے۔ تاکہ مصنف رحمہ اللہ کا منشاء پورا ہو۔ اگرچہ ان کی ترتیب ابواب کا طریقہ جملہ مؤلفین کتب علوم فقہ سے مختلف ہے۔

اس بارے میں مرتب کتاب نے اپنی رائے کا اظہار یوں فرمایا ہے کہ: ”میں نے یہ وضاحت اس لیے کر دی ہے کہ قارئین کتاب کو اس طریق کار کا علم ہو جائے جو مصنف مرحوم نے ترتیب مضامین میں اختیار فرمایا اور اس لیے بھی کہ اس ترتیب اور ایک باب کا مضمون دوسرے باب میں داخل کرنے کو میری فروگزاشت پر محمول نہ کیا جائے۔ کیونکہ میں اسی ترتیب کو زیادہ ترجیح دیتا ہوں جو کتب فقہ کے سابقہ مؤلفین نے اختیار فرمائی۔ یعنی قصاص کا بیان کتاب الحدود سے جدا رکھنا۔“

قصاص کی تعریف

قصاص کا لفظ ’قص‘ الاثر، (بمعنی پیروی روایت) سے ماخوذ ہے۔ یعنی فلاں شخص نے روایت (حدیث) کی پیروی کی۔ اسی سے ”القص“ نکلا ہے (یعنی راوی یا ذاکر) نکلا ہے کیونکہ وہ (قاص) آثار و اخبار کی پیروی کرتا ہے۔ اور (قص الشعر، کے معنی ہیں بال تراشنے کا نشان)، قاتل بھی قتل کا جو راستہ اختیار کرتا ہے وہ اس پر اپنا اثر چھوڑ جاتا ہے اور اسے خود بھی اس راستے سے گزرنا ہوتا ہے (اسی معنی میں) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”فارتدا علی آثارهما قصصا“ (یعنی حضرت موسیٰ اور ان کے خادم یوشع اپنے نشان قدم پر واپس لوٹے)۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قص کے معنی قطع (کاٹنا) ہے چنانچہ محاورہ ہے ”قصصت مابینہما“ (یعنی دونوں کے باہمی تعلقات منقطع ہو گئے) اس سے لفظ ”قصاص“ نکلا ہے کیونکہ قصاص کسی کو ویسی ہی جراثحت رسائی ہے جیسی اس نے جراثحت پہنچائی یا قتل کے عوض قتل کیا گیا۔ اسی طرح کہا جاتا ہے ”اقص الحاکم فلانا من فلان، وابداه به فامثل مثله، ای اقتص منه“ (یعنی حاکم نے فلاں کا بدلہ فلاں سے دیا یعنی اس نے ہلاک کیا تو اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا یعنی اس سے قصاص لیا)۔

قصاص کا ثبوت

قصاص کا حکم کتاب و سنت (قرآن و حدیث)، رسول اللہ ﷺ کے عمل اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”یا ایہا الذین امنوا کتب علیکم القصاص فی القتلی، الحرب بالحر والعبد بالعبد ولا تشی بالانسی، فمن عفی له من اخیه شیئ فاتباع بالعمر وفواد آء الیہ باحسان، ذلک تخفیف من ربکم ورحمة، فمن اعتدی بعد ذلک فله عذاب الیم۔ ولکم فی القصاص حیاة یا اولی الالباب لعلکم تتقون“ (البقرة: ۱۷۸، ۱۷۹) (یعنی اے ایمان والو تم میں سے کوئی قتل کر دیا جائے تو اس کے برابر کا بدلہ تم پر فرض کیا گیا ہے۔ آزاد قاتل ہو تو اس آزاد کو، غلام قاتل ہو تو اس غلام کو، عورت قاتل ہو تو اس عورت کو ویسا ہی بدلہ دیا جائے، اگر مقتول کا وارث بھائی کچھ معافی دے دے تو دستور کے مطابق، حسن سلوک کے ساتھ اس کا خون بہا اس کے وارث کو دینا لازم ہے۔ تمہارے پروردگار کی طرف سے یہ سہولت اور مہربانی ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی زیادتی کرے تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔ یاد رکھو کہ اس حکم قصاص میں تمہاری زندگی (جان کی حفاظت) ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”وکتبنا علیہم فیہا ان النفس بالنفس والعین بالعين و الأنف بالأنف والأذن بالاذن والسن بالسن، والجروح قصاص، فمن تصدق به فهو كفارة له، ومن لم يحکم بما انزل الله فاولئک هم الظالمون“ (المائدہ: ۴۵) (یعنی ہم نے اس بارے میں جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور اسی طرح جراثحتوں کے بدلے فرض کر دیئے ہیں اب اگر کوئی اس بدلہ کی خیرات کر ڈالے تو وہی اس کے لیے کفارہ ہے۔ ہاں اگر اللہ کے نازل کردہ فرمان کے مطابق لوگ فیصلہ نہ کریں تو وہ ظالم ہیں)۔

واضح ہو کہ شرائع سابقہ میں جو سزائیں رکھی گئی تھیں انہیں کا حکم مسلمانوں پر بھی ہے بشرطیکہ شارع حکیم نے اس کی تنسیخ نہ فرمادی ہو اور اس کے منسوخ ہونے کا حکم نہ آیا ہو۔ نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”لا تقتلوا النفس التي حرم الله الا بالحق، ومن قتل مظلوماً فقد جعلنا لولیه سلطاناً فلا یسرف فی القتل، انه کان منصوراً“ (بنی اسرائیل: ۳۳) یہاں پر ”اتینا لولیه“ کا مطلب یہ ہے کہ مقتول کے ولی کو مطالبہ قتل کا اختیار دیا گیا ہے، (معنی آیت یہ ہے کہ اس کو ناحق قتل نہ کرو جس کا قتل اللہ نے حرام کیا ہے۔ اگر کوئی ظلم سے قتل کیا گیا تو اس کے ولی کو ہم نے مقتول کے قتل کا اختیار ہے، لیکن قتل کرنے میں اس حد سے تجاوز نہ کرو۔ ہاں ولی کی مدد کرو کہ تکمیل قصاص میں کوتاہی نہ ہو)۔

پھر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”من قتل مؤمناً خطاً فتحریر رقبة مؤمنة، ودية مسلمة الى اهله الا ان یصدقوا“ (یعنی اگر ایک شخص نے کسی مسلمان کو غلطی سے ہلاک کر دیا تو اس پر لازم ہے کہ ایک مسلمان غلام (برودہ) کو

آزاد کرے اور مقتول کے ورثاء کو دیت (خون بہا) ادا کرے۔ ہاں اگر وہ معاف کر دیں تو خیر) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نادانستہ قتل (یا قتل غیر عمد) کا حکم بتایا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قصاص کا حکم اس صورت میں عائد اور واجب ہوگا، جبکہ قتل غلطی سے سرزد نہ ہوا ہو جسے قتل عمد کہتے ہیں اور جب یہ بات ہے کہ قتل کا ثبوت عمد (قصد) پر منحصر ہے تو اس سے تجاوز نہیں کیا جاسکتا (یعنی قتل غیر عمد کو قتل عمد نہیں قرار دیا جاسکتا) تاکہ نص (حکم صریح) پر من مانی زیادتی نہ ہو۔ نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”کتب علیکم القصاص فی القتلی“ (یعنی مسلمانوں پر قتل کے بدلے قتل کا حکم لکھا جا چکا ہے) اس آیت میں کتب کا مطلب یہ ہے کہ تم پر فرض کیا گیا ہے اور قرار پایا ہے۔ جیسے ”کتب علیکم الصیام“ (یعنی تم پر روزہ فرض کیا گیا) اور فرمایا ”کتب علیکم القتال“ (یعنی تم پر جہاد فرض کیا گیا) نیز ارشاد ہے ”ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتابا موقوتا“ (یعنی مسلمانوں پر نماز پابندی وقت کے ساتھ فرض ہے) جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک ثابت شدہ فریضہ ہے۔

اس (لفظ کتب) کا مطلب یہاں پر یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ قرآنی آیت میں جو لکھا گیا وہی احکام ہیں جو لوح محفوظ میں درج ہیں اور جن کا فیصلہ ازل میں ہو گیا ہے۔ یعنی یہ کہ قاتل پر فرض ہے کہ اگر مقتول کا والی (قتل کے عوض) قتل کا مطالبہ کرے تو وہ اللہ کے حکم کے سامنے سر جھکا دے اور حکم شرع کے مطابق قصاص کے لیے تیار ہو جائے نیز ولی پر فرض ہے کہ وہ انتقامی جذبہ کو محض قاتل تک محدود رکھے۔ کسی اور پر زیادتی نہ کرے جیسا کہ (قبل از اسلام) اہل عرب ایسی زیادتی کے مرتکب ہوتے تھے اور قاتل کے علاوہ دوسروں کو قتل کرایا کرتے تھے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد میں اسی بات کا ذکر ہے۔ ”ان من اعصى الناس علی اللہ یوم القیامۃ، ثلاثة رجل قتل غیر قاتله، ورجل قتل فی الحرم، ورجل اخذ بدحول الجاہلیۃ“ (یعنی قیامت کے روز تین اشخاص کو خدا کا سب سے زیادہ مخالف قرار دیا جائے گا: وہ شخص جو قاتل کے علاوہ دوسرے کو قتل کرے، وہ شخص جو حرم کے اندر قتل کا ارتکاب کرے اور وہ شخص جو عہد جاہلیت کی سی کینہ پروری اختیار کرے) اس حدیث میں لفظ ”دحول“ کے معنی بغض و عداوت کے ہیں۔

شعسی اور قتادہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ عہد جاہلیت (قبل از اسلام) میں لوگ اللہ کی نافرمانی اور شیطان کی اطاعت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اگر کوئی قبیلہ معزز اور صاحب اقتدار ہوتا تھا اور اس کے کسی غلام کو دوسرے قبیلہ کا غلام قتل کر دیتا تھا تو اس قبیلہ والے مطالبہ کرتے تھے کہ اس (غلام) کے عوض آزاد شخص کو قتل کیا جائے۔ اگر ان کی کوئی عورت قتل ہو جاتی تو وہ کہتے تھے کہ اس کے عوض مرد کو قتل کیا جائے۔ اسی طرح اگر اس قبیلہ کے کسی ادنیٰ حیثیت کے آدمی کو قتل کر دیا جائے تو اس کے عوض (قاتل کے قبیلہ کے) معزز آدمی کو قتل کیے جانے کا مطالبہ کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ”القتل اوقی للقتل“ (یعنی اسی طرح کے قتل میں قتل سے بچاؤ ہے) ایک روایت کی رو سے اس مقولہ میں لفظ اوقی، بہ واد و قاف، کی بجائے البقی (با و قاف کے ساتھ) آیا ہے (جس کے معنی باقی یا محفوظ رہنے کے ہیں) ایک دوسری روایت میں اس کی بجائے ”ابقی“ آیا ہے جس کے معنی مانع ہونے یا باز رکھنے کے ہیں) اللہ تعالیٰ نے اس طرح کی زیادتی سے منع فرمایا ہے ارشاد ہوتا ہے: ”کتب علیکم القصاص فی القتلی الحر بالحر والعبد بالعبد..... ولکم فی القصاص حیاة“۔

بخاری، نسائی اور وار قطنی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ قوم بنی اسرائیل میں قصاص کا حکم تو تھا، لیکن دیت (خون بہا) کا رواج نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کے بارے میں فرمایا ”کتب علیکم القصاص فی القتلی، الحر بالحر والعبد بالعبد والانثی بالانثی، فمن عفی له من اخیه شی“ (یہاں پر) معافی دینے کی صورت یہ ہے کہ مقتول کے وارث قتل عمد کے عوض خون بہا قبول کر لیں۔ (اس کے آگے) ”فاتباع بالمعروف واداء باحسان“ کا مطلب یہ ہے کہ دستور العمل کی پیروی کی جائے اور خوش اسلوبی کے ساتھ خون بہا ادا کر دیا جائے اور ”ذلک تخفیف من ربکم ورحمة“ کا مقصد یہ ہے کہ اس سے پہلے کے احکامات میں نرمی کر دی گئی ہے ”فمن اعتدے بعد ذلک فله عذاب الیم“ (یعنی خون بہا قبول کر لینے کے بعد قتل کرنا زیادتی ہے اور مستوجب عذاب سخت ہے۔ بخاری نے اس آیت کا شان نزول بھی بتایا ہے۔

بظاہر آیت شریفہ سے یہ حکم نکلتا ہے کہ جہاں کہیں قتل ثابت ہو جائے اس کا قصاص واجب ہے۔ یہاں قتل عمد اور قتل غیر عمد کی کوئی تخصیص نہیں ہے لیکن (قصاص کے لیے) قتل کے ساتھ عدا کی قید اس حدیث مشہور کی بناء پر عائد کی گئی ہے جو ملت اسلامیہ کے نزدیک مسلمہ ہے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے ”العمد قود“ (یعنی ارادہ قتل مستوجب قصاص ہے) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عدا ارتکاب قتل کی صورت میں قصاص واجب ہوتا ہے۔ اگر حدیث کی رو سے آیت کے مفہوم میں عدا کی قید نہ لگائی جائے تو قصاص کا حکم صرف قتل عمد کیلئے نہ ہوگا۔ ایسی صورت میں لفظ عدا جو حدیث میں آیا ہے وہ بے فائدہ ہو جائے گا پھر یہ بھی ہے کہ فقہاء کہتے ہیں کہ پورے طور پر جرم وہی ہے جس کا ارتکاب بالا ارادہ کیا جائے اور اسی کی روک تھام کرنے میں حکمت ہیں۔ (یعنی بلا ارادہ جرم سرزد ہو جانے کی ممانعت فضول ہے) اور شریعت میں سد باب جرائم کے لیے جو سزائیں رکھی گئی ہیں اس کے سوا ان کا اور کوئی مقصد نہیں۔

سزائے قصاص کا ثبوت سنت سے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد ہے ”من قتل قتلناہ“ (یعنی جو شخص قتل کرے گا اسے مسلمان قتل کر دیں گے) نیز فرمایا کتاب اللہ القصاص (یعنی قصاص فریضہ الہی ہے) اور ارشاد ہے ”لا یحل دم امری مسلم یشہد ان الا الہ الا اللہ وانی رسول اللہ، الا باحدی الثلاث: الثیب الزانی، والنفس بالنفس، والتارک لدینہ المفارق للجماعة“ (متفق علیہ) (یعنی کسی مسلمان کا خون حلال نہیں ہے جو یہ اعتراف کرتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ تین صورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں: وہ جو زنا کر لے۔ جان کے بدلے کی جان اور وہ جو اپنے دین (اسلام) سے پھر جائے، اور جماعت مسلمین سے خارج ہو جائے)۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: لا یحل قتل مسلم الا باحدی ثلاث خصال: زان محصن فیرجم، ورجل قتل مسلماً متعمداً فیقتل، ورجل ینخرج عن الاسلام، فیحارب اللہ ورسولہ، فیقتل او یصلب، او ینفی من الارض“ ابو دائود و نسائی۔ (یعنی کسی مسلمان کو قتل کرنا جائز نہیں ہے بجز ان تین بد کرداروں کے: شادی شدہ جو زنا کرے اسے سنگسار کیا جائے اور وہ جو پہلا ارادہ کسی مسلمان کو قتل کر دے اسے قتل کیا جائے، اور وہ شخص جو دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے اور خدا اور رسول سے برسر پیکار ہو، ایسے شخص کو قتل کیا جائے یا

سولی دی جائے یا ملک بدر کر دیا جائے)۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح بتایا ہے..... اس بارے میں اور بھی متعدد احادیث ہیں۔ حکم قصاص پر تمام امت مسلمہ کا اتفاق ہے۔ کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا اور عقل سلیم بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ کیونکہ قتل عمد کے بدلے مال واجب نہیں ہوگا اس لیے کہ (جرم اور سزا میں) مماثلت نہیں ہے۔ آدمی حقیر شے (مال) کا مالک ہوتا ہے اور حقیر شے انسان کی مملوکہ ہوتی ہے۔ لہذا دونوں ایک دوسرے کے متماثل نہیں ہیں۔ بخلاف قصاص کے کہ اس میں جرم اور سزا کی نوعیت یکساں ہوتی ہے اور قصاص میں، مثل (بدل) بننے کی صلاحیت ہے۔ اس حکم میں بڑی حکمت اور انسانی زندگی کے لیے بہتری ہے کہ (یہ سزا) دوسروں کو اس جرم کے ارتکاب سے باز رکھتی ہے وارثوں کا دکھ کم ہو جاتا اور تشفی ہوتی ہے۔

قتل خطا میں خون بہا (یا ادائیگی مال) واجب ہو جاتا ہے یہ حکم اول تو اس لیے کہ انسان کے خون کو رائگاں ہونے سے بچا لیا جائے۔ کیونکہ قتل خطا میں قصاص تو ہے نہیں اب اگر خون بہا بھی واجب نہ ہو تو وہ خون رائگاں گیا حالانکہ انسان کی ہستی قابل احترام ہے اور اس کا خون رائگاں نہ ہونا چاہیے علاوہ اس کے یہ حکم (دیت یا خون بہا کا) قرآن کریم سے ثابت ہے۔

واضح ہو کہ قصاص کے حکم میں خصوصیت کے ساتھ ولی کا خیال مد نظر رکھا گیا کہ یہ انتقام ہو جائے اور دلوں کو تشفی کا باعث ہو۔ اور اس کی غرض عہد جاہلیت کے اس دستور کو مٹانا ہے کہ اگر ایک شخص کا خون ہو جائے تو وہ لوگ (قاتل کے) سارے قبیلے کو ہلاک کر دیتے تھے۔ اس سے ان کی غرض یہ نہیں ہوتی تھی کہ ایک شخص کے قتل ہو جانے پر وہ بہت سا مال حاصل کر لیں کیونکہ اگر قاتل اور اس کے متعلقین اپنا تمام مملوکہ اثاثہ اور اتنا ہی مزید دیدیں تب بھی مقتول کے ورثاء اس پر راضی نہ ہوتے۔ غرض قتل عمد کے عوض اگر محض مال (خون بہا) واجب ہوتا تو حکم قصاص میں جو حکمت تھی وہ فوت ہو جاتی۔ پس یہ امر ثابت شدہ ہے کہ اس حکم کی بنیاد قصاص (سزا مطابق جرم) پر ہے تو اس سے تجاوز کرنا جائز نہیں ہے جبکہ اس کی ضرورت نہ ہو مثلاً یہ کہ ورثاء مقتول میں سے کوئی شخص موجود نہ ہو تو اس صورت میں تاوان کی تکمیل نہیں ہو سکتی یا یہ کہ محل قصاص (یعنی جس عضو کو سزا دیتا ہے) وہ عضو ناقص ہو جیسے ہاتھ کاٹنے والے کا اپنا ہاتھ پہلے ہی انگلیوں سے ناقص ہو۔

قصاص نافذ کرنے والے حاکم مجاز کا بیان

ائمہ فقہاء کے درمیان اس امر میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حکم قصاص کا نفاذ اس حاکم کے سوا کوئی نہیں کر سکتا جو نفاذ قصاص اور اجرائے حدود وغیرہ کا مجاز ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حکم قصاص کے لیے تمام مسلمانوں کو اس طرح خطاب فرمایا ہے ”یا ایہا الذین امنوا کتب علیکم القصاص فی القتلی“ (یعنی اے مسلمانو قتل کی صورت میں تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے) اب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ نفاذ قصاص کے لیے تمام مسلمانوں کو جمع کیا جاسکے۔ لہذا مسلمانوں نے سب کی طرف سے ایک سلطان (یا حاکم با اقتدار) کو قصاص وغیرہ حدود شرعیہ کو نافذ کرنے کے لیے کھڑا کیا۔

بات یہ ہے کہ قصاص کا نفاذ کوئی ایسی اہم بات نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ قصاص وغیرہ کے نفاذ میں اس کی

مقررہ حد سے تجاوز نہ کیا جائے۔ اور اگر قصاص کی بجائے دیت پر باہمی رضا مندی ہو جائے یا معافی دے دی جائے تو روا ہے۔ غرض کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ بطور خود یہ حق دوسرے سے وصول کرے، یہ حق بجز سلطان کے جسے اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار عطا فرمایا ہے کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ انسانوں کو خود ہی اپنا یہ حق ایک دوسرے سے وصول کرنے کا اختیار نہیں ہے یہ کام صرف سلطان کا ہے یا اس کا ہے جسے سلطان نے اس کا مجاز بنایا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے سلطان ہی کو یہ اقتدار بخشا ہے کہ وہ انسانوں کے باہمی حقوق رسائی ایک دوسرے سے کرائے۔

بادشاہ (یا صاحب اقتدار) خود بھی قصاص کا پابند ہوگا

تمام علماء کا اس پر اجماع ہے کہ بادشاہ اگر اپنی رعایا میں سے کسی پر ناروا زیادتی کرے تو اسے خود اس کی تلافی کرنا ہوگی کیونکہ وہ بھی افراد رعایا میں سے ایک فرد ہے۔ درحقیقت وصی یا وکیل کی طرح عوام کے مفاد کی نگہداشت اس پر لازم ہے لیکن اس وجہ سے اس کو قصاص سے مستثنیٰ نہیں رکھا جاسکتا۔ جہاں تک احکام الہی کا تعلق ہے اس میں اور عامۃ الناس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”کتب علیکم القصاص فی القتلی“ (یعنی قتل کا قصاص تم پر فرض ہے) اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ امر ثابت ہے کہ ایک شخص نے ان سے شکایت کی فلاں حاکم نے ناحق اس کا ہاتھ کاٹ دیا ہے آپ نے فرمایا کہ ”لئن کنت صادقاً لا قید نک منہ“ (یعنی اگر تو سچا ہے تو میں اس سے تجھے تاوان دلاؤں گا) اور نسائی میں ابو سعید خدری سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کوئی چیز تقسیم فرما رہے تھے کہ ایک شخص ان پر جھپٹ پڑا حضور نے کھجور کی خشک شاخ سے جوان کے ہاتھ میں تھی اسے ضرب لگائی، اس پر وہ شخص چلانے لگا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”تعال فاستقد“ (یعنی ادھر آ میں اس کا تاوان تجھے ادا کر دوں) اس شخص نے کہا یا رسول اللہ میں نے معاف کر دیا اور ابوداؤد طیالسی نے ابو فراس سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا: الا من ظلمہ امیرہ فلیرفع ذلک الی اقصہ منہ“ (یعنی خبردار اگر کسی کے سردار نے کسی پر ظلم کیا ہو تو اسے چاہیے کہ اس کی شکایت مجھے کرے تاکہ میں اس کا تاوان اس سے دلاؤں) اس پر حضرت عمر بن عاص کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ ”یا امیر المومنین لئن ادب رجلاً من اهل رعیتہ، لتقصنہ منہ؟ قال: کیف الا قصہ منہ، وقد رایت رسول اللہ ﷺ یقص من نفسه“ (یعنی اے امیر المومنین اگر ہم میں سے کوئی شخص اپنی رعایا میں سے کسی کی سرزنش کرے تو کیا آپ اس کا تاوان اس سے دلاؤں گے؟ فرمایا کیسے ممکن ہے کہ میں تاوان نہ دلاؤں؟ درآنحالیکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ وہ خود تاوان ادا فرماتے تھے)۔ ابوداؤد اور بحتانی نے حضرت عمر کی اس روایت کو بدیں الفاظ ذکر فرمایا ہے کہ انہوں نے ہمارے سامنے یہ تقریر فرمائی کہ ”انسی لم ابعت عمالی لیضربوا ابشارکم، ولا لیساخذوا اموالکم فمن فعل ذلک بہ فلیرفعه الی اقصہ منہ“ (یعنی میں نے اپنے اہل کاروں کو اس لیے نہیں بھیجا کہ وہ تمہارے چہروں پر تھپڑ لگائیں اور نہ اس لیے کہ تمہارے مال پر قبضہ کریں، اگر کوئی ایسا کرتا تو چاہیے کہ میرے سامنے اس کی شکایت کی جائے، میں اس کا تاوان اسے دلاؤں گا)۔ انہوں نے اسی مضمون کی حدیث بیان کی۔

شریعت اسلامیہ کے نزدیک انسانی خون کی اہمیت

حقیقت یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ نے انسانی خون (مایہ حیات) محفوظ رکھنے کی طرف پوری توجہ مبذول فرمائی ہے اور ایسے مجرموں کو جو انسانی زندگی کے ساتھ ظلم روا رکھتے ہیں نہایت سخت تنبیہ کی ہے^(۱)

۱۔ اللہ تعالیٰ نے تمام سزاؤں میں قتل نفس کی سزا سب سے بڑی سزا مقرر فرمائی ہے اور اسے اللہ کے بندوں پر سب سے بڑا ظلم قرار دیا ہے اور قیامت کے روز اس جرم کی باز پرس کو سب پر مقدم فرمایا ہے۔ حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اول ما یقضى بین الناس یوم القیامة فی الدماء“ (بخاری و مسلم) (یعنی قیامت کے دن خون کا فیصلہ سب سے پہلے کیا جائے گا)، قتل کا جرم ہلاکت آفریں معصیتوں میں سب سے بڑی معصیت (یا گناہ کبیرہ) ہے چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”اجتنبوا السبع الموبقات: قیل یا رسول اللہ: وما هن؟ قال: الشربک باللہ، والسحر، وقتل النفس الی حرم اللہ الا بالحق، واکل مال الیتیم، واکل الربا، والتولی یوم الزحف، وقذف المحصنات الغافلات المؤمنات“ (بخاری، مسلم، ابوداؤد و نسائی) (یعنی سات ہلاکت آفریں گناہوں سے بچو۔ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ وہ کون کون سے ہیں؟ فرمایا اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، جادو کا عمل، ناحق کسی کی جان لینا جس کا قتل حرام ہے، یتیم کا مال کھانا سود کھانا، اور لام بندی کے روز پیچھا دکھا دینا اور بے گناہ بے خبر مسلمان عورتوں پر تہمت لگانا)۔

شارع علیہ السلام نے یہ بتا دیا ہے کہ مسلمان ہمیشہ فارغ البال اور شاد کام رہتا ہے۔ لیکن اگر وہ کسی مسلمان کو قتل کر دے تو وہ گھٹن اور کڑھن محسوس کرنے لگتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایسے عذاب کی خبر دی ہے جو اس کے علاوہ کسی اور ہم مذہب کو نہیں دی گئی۔ اس کی تنگی خاطر کا سبب خود اس کا دین ہے جس میں ناحق اور عداقتل کرنے والے کو عذاب الہی سے آگاہ کیا گیا ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”لن یزال المؤمن فی فسحة من دینہ، ما لم یصب دما حراماً“ (یعنی مومن اپنے دین کی طرف سے فارغ البال اور شاد کام رہتا ہے۔ جب تک کہ وہ خون ناحق کا ارتکاب نہ کرے)۔

ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ان من ورطات الامور الی لا یخرج لمن اوقع نفسه فیہا، سفک الدم الحرام بغیر حله“ (بخاری) (یعنی کسی شخص کا خون ناحق کرنا منجملہ ایسے امور سے ہے جن کے چکر میں پڑ کر انسان کبھی نہیں نکل سکتا)۔

واضح ہو کہ شریعت اسلامیہ میں کسی جاندار کو بے سبب مارنا بھی ممنوع ہے اور اس پر عذاب کی تنبیہ آئی ہے۔ انسان کے قتل کا اور پھر مسلمان کے قتل اور نیک انسان کے قتل کا تو ذکر ہی کیا۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”لزوال الدنیا ہون علی اللہ من قتل مؤمن بغیر حق“ (ابن ماجہ) (یعنی اللہ کے نزدیک دنیا بھر کا زوال ایک مسلمان کے قتل ناحق کی بہ نسبت زیادہ بے حقیقت ہے)۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ وہ کعبہ کا

طواف کر رہے تھے اور کہتے تھے ”ما اطیب ریحک، ما اعظمک وما اعظم حرمتک، والذی نفس محمد بیدہ لحرمة المؤمن عند اللہ اعظم من حرمتک، مالہ ودمہ“ بروایت وبالفاظ ابن ماجہ (یعنی اے کعبہ تو کتنا پاکیزہ ہے اور تیری خوشبو اچھی ہے۔ تو کتنا عظیم ہے اور تیری عزت کتنی بڑی ہے تاہم اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے کہ اللہ کے نزدیک ایک مسلمان کی عزت تیری عزت سے بڑھ کر ہے۔ اور اس کا مال اور خون بھی)۔

حضرت ابوسعید اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”لو ان اهل السماء واهل الارض اشتروا فی دم مؤمن لا کبہم اللہ فی النار“ بروایت ترمذی (یعنی اگر تمام اہل آسمان و اہل زمین کسی مسلمان کے خون میں شریک ہوں تو اللہ تعالیٰ ان سب کو جہنم واصل کر دے گا) شریعت نے تو اس شخص کو بھی مجرم قرار دیا ہے جس نے کسی مسلمان کے قتل میں مال یا ہتھیار سے (قاتل کی) اعانت کی یا ایک آدھ لفظ ہی سے اس کا ساتھ دیا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”من اعان علی قتل مؤمن بشطر کلمۃ، لقی اللہ مکتوباً بین عینیہ آیس من رحمة اللہ“ ابن ماجہ (یعنی جس شخص نے آدھی بات سے بھی کسی مسلمان کے قتل میں اعانت کی، اللہ تعالیٰ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان ایک تحریر لگا دے گا کہ ”یہ شخص اللہ کی رحمت سے محروم ہے“)۔

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے جرم قتل کو شرک کے بعد دوسرے درجہ پر رکھا ہے، معاذ اللہ، اور قتل کو فرمایا ہے کہ شرک کے قریب قریب ہے۔ تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ جرم کتنا بڑا اور کس قدر خوفناک ہے اور قیامت کے روز اس کی سزا کتنی سخت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”والذین لا یدعون مع اللہ الہاً آخر، ولا یقتلون النفس التی حرم اللہ الا بالحق، ولا یزنون، ومن یفعل ذلک یلق اثماً، یضعف لہ العذاب یوم القیامۃ، ویخلد فیہ مہاناً“ (الفرقان: ۱۹) (یعنی وہ (اچھے) لوگ اللہ کے ساتھ کسی اور کو اپنا معبود نہیں بنا لیتے، اور کسی کو ہلاک نہیں کرتے تا وقتیکہ وہ مستحق قتل نہ ہو۔ اور زنا نہیں کرتے۔ ایسی بات کرنے والا گنہگار ہے اور قیامت کے روز اس کے لیے عذاب سخت ہے جس میں وہ ہمیشہ ذلت کے ساتھ پڑا رہے گا)۔ نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”ولا تقتلوا انفسکم ان اللہ کان بکم رحیماً، ومن یفعل ذلک عدواناً وظلماً فسوف نصلیہ ناراً وکان ذلک علی اللہ یسیراً“ (النساء: ۲۹، ۳۰) (یعنی تو گوتم اپنی (جیسی) جانوں کو ہلاک نہ کر دے حکم اللہ تعالیٰ کی مہربانی پر مبنی ہے۔ اگر کوئی شخص جبر و ظلم کے ساتھ ارتکاب قتل کر لے گا تو اسے یقیناً جہنم میں پہنچا دیا جائے گا۔ یہ امر اللہ کے لیے آسان ہے) پھر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسی جان کو جس کا ہلاک کرنا حرام ہے قتل کرنا ایسا ہی گناہ قرار دیا ہے جیسے کسی کا تمام انسانوں کو قتل کرنا۔ کیونکہ اللہ کے نزدیک ایک دوسرے کی جانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پس اگر کسی کی جان ہلاک کرنے کو حرام تسلیم کر لیا جائے اور اس کا عقیدہ یہی ہو تو گویا اس نے تمام انسانوں کا خون حرام جانا اور تمام انسانوں کو زندہ رکھا۔ اس طرح تمام ہی انسان اس (شر) سے بچ گئے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”من اجل ذلک کتبنا علی بنی اسرائیل انہ من قتل نفسا بغير نفس، او فساد فی الارض، فکانما قتل الناس جمیعاً ومن احیایا فکانما احیا الناس جمیعاً“ (یعنی اسی

لیے ہم نے بنی اسرائیل کو یہ حکم دے دیا کہ جس نے بغیر پاداش قتل کے یا ملک میں فساد پھیلانے والے کے، کسی کو قتل کیا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا اور جس نے کسی کی جان بچائی اس نے تمام انسانوں کی جان بچائی۔

حضرت قتادہ نے، اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”من قتل نفساً بغير نفس فکانما قتل الناس جميعاً“ کے بارے میں فرمایا ہے کہ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ارتکاب قتل بہت بڑا گناہ ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ واللہ یہ کتنا بڑا گناہ ہے اور واللہ یہ کتنا بڑا کارِ ثواب ہے اور حسن بصری فرماتے ہیں کہ ”کانما قتل الناس جميعاً“ کا مطلب یہ ہے کہ گناہ کے اعتبار سے ایک ارتکاب قتل تمام انسانوں کے قتل کے برابر ہے اور کا نماز احیاء الناس جميعاً کا مطلب یہ ہے کہ ثواب کے اعتبار سے (ایک قتل سے بچنا) تمام انسانوں کو زندگی بخشنے کے برابر ہے۔

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمد ﷺ کو ہدایت فرمائی ہے کہ وہ اس کی زمین پر بسنے والے اللہ کے بندوں کو کچھ باتوں پر عمل پیرا ہونے کے لیے کہیں اور کچھ باتیں ایسی ہیں جن کو حرام فرمایا ہے چنانچہ ارشاد باری ہے قل تعالوا اتل ما حرم ربکم علیکم الا تشرکو ابہ شیئاً، وبالوالدین احساناً، ولا تقتلوا اولادکم من املاق، نحن نوزقکم وایاہم، ولا تقربوا الفواحش ما ظہر منها وما بطن، ولا تقتلوا النفس التي حرم اللہ الا بالحق ذلکم وصاکم بہ لعلکم تعقلون“ (الانعام: ۱۵۱) (یعنی لوگو آؤ میں تمہیں تمہارے رب کے وہ احکامات سناؤں جو اس نے تمہارے لیے نازل فرمائے ہیں۔ کہ اس کا کسی کو شریک نہ بناؤ۔ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک سے کام لو، افلاس کے مارے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو، کیونکہ روزی تم کو اور انہیں بھی ہم دیتے ہیں، بے حیائی کی باتیں ظاہر ہوں یا در پردہ ان کے قریب بھی نہ پھسکو، اور جس کی جان لینا اللہ نے حرام فرمایا ہے اس کا قتل نہ کرو، بجز اس صورت کے جب کہ کوئی شخص قتل کا مستحق ہی ہو جائے۔ یہ نصیحتیں اللہ تعالیٰ نے تمہیں کر دی تاکہ تم سمجھ جاؤ) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس کو قتل کرنے سے نہایت سختی کے ساتھ بار بار منع فرمایا ہے جس کا قتل کرنا حرام ہے۔ کیونکہ یہ نہایت اہم بات ہے اور جان بڑی قابل احترام شے ہے۔ ورنہ اس کی ممانعت دوسری ممنوعات کے ذکر میں پہلے ہی آگئی ہے: جہاں قتل اولاد کی ممانعت فرمائی ہے پھر تمام جانوں کو ہلاک کرنے کی ممانعت آئی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ظاہر و باطن ہر قسم کے گناہوں سے ممانعت میں جان کا ہلاک کرنا بھی داخل ہے۔ غرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے متواتر تین بار قتل نفس سے منع فرمایا۔

امیر المؤمنین سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے جبکہ وہ اپنے گھر میں مقید تھے مروی ہے کہ انہوں نے اس وقت کہا تھا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ حضور فرماتے تھے لا یحل دم امری مسلم الا باحدی ثلاث: رجل کفر بعد اسلامہ، او زنی بعد احصانہ، او قتل نفساً بغير نفس، فواللہ ما زیت فی جاہلیۃ ولا اسلام، ولا تمنیت ان لی بدینی بدلاً منہ، بعد ان ہدانی اللہ، ولا قتلت نفساً فبم تقتلونی؟“ بروایت امام احمد، ترمذی وابن ماجہ (یعنی تین حالتوں کے سوا کسی حال میں مسلمان کا قتل روا نہیں ہے۔ وہ شخص جو مسلمان ہونے کے بعد کافر ہوا اور وہ جس نے شادی شدہ ہونے کے باوجود بدکاری کی ہو یا وہ جس نے قتل کیا بغیر قتل عوض کے، اب میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے کبھی بدکاری نہیں کی نہ عہد جاہلیت میں اور نہ مسلمان ہونے کے بعد اور نہ میرے حاشیہ خیال میں آیا کہ مجھے اس دین کے بدلے کوئی اور دین چاہیے جبکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس دین کی ہدایت فرمادی ہے اور میں نے کبھی کسی کو قتل نہیں کیا تو آخر تم مجھے کس جرم کی پاداش میں قتل کرنا چاہتے ہو؟)۔

اللہ تعالیٰ نے قتل عمد کے بارے میں واضح حکم نافذ فرمایا ہے اور اس گناہ عظیم کے مرتکب کو عذاب شدید کی سخت دھمکی دی ہے اور ایک سے زیادہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس جرم کو شرک کے قریب بتایا ہے۔ غرض اس کے حرام ہونے کی بابت بکثرت آیات و احادیث آئی ہیں۔ یہاں پر جس قدر اوپر ذکر آچکا وہی کافی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا، وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ، وَلَعَنَهُ، وَاعْدَ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا“ (النساء: ۹۳)

(ترجمہ اوپر آچکا ہے) اس آیت کے بارے میں امام بخاری فرماتے ہیں کہ آدم نے حدیث بیان کی جنہیں شعبہ اور مغیرہ بن النعمان نے بتایا کہ انہوں نے ابن جبیر سے سنا جو یہ کہہ رہے تھے کہ اس پر اہل کوفہ میں اختلاف ہوا تو میں وہاں سے روانہ ہو کر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس گیا اور اس بارے میں ان سے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ آیت یعنی ”مَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ“ تا آخر..... (اس باب میں) آخری آیت ہے کسی اور آیت نے اسے منسوخ نہیں کیا۔ اس حدیث کو بخاری، مسلم اور نسائی نے مختلف طریقوں سے بروایت شعبہ بیان کیا ہے۔

فقہاء کہتے ہیں کہ مرتکبان قتل عمد کے متعلق کچھ احکام دنیا سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھ آخرت سے، دنیا میں تو یہ ہے کہ مقتول کے وارثوں کو قاتلوں پر تسلط (یا اختیار) دیا جائے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”مَنْ قَتَلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لَوْلِيهِ سُلْطَانًا“ (یعنی جس نے ظلم سے کسی کو قتل کیا اس مقتول کے وارثوں کو ہم نے قاتل پر اختیار دیا ہے) کہ چاہیں تو قاتل کو سزائے قتل دیں یا معاف کر دیں اور زیادہ سے زیادہ خون بہا تین گنا تک وصول کر لیں یعنی تیس راس حقہ (یعنی تیس (۳۰) چار سالہ اونٹ اور تیس جذعہ (قریب البلوغ اونٹ) اور چالیس خلقہ (شتر بچے)۔ رہا عاقبت کا معاملہ سو وہ آتش دوزخ کا عذاب، اس میں ہمیشہ پڑا رہنا، غضب الہی کا سزاوار ہونا اس کی رحمت سے محروم، اس کی لعنت کا مستحق اور دگنے عذاب میں پڑنا ہے جیسا کہ آیت شریفہ کے مفہوم سے عیاں ہے۔

ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ یہ سزائیں اس جرم کی پاداش میں ہیں یہی حال ہر گناہ کا ہے جس کے لیے سزا مقرر ہے۔ لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ کبھی اعمال صالحہ آڑے آجاتے ہیں اور سزا کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں لیکن اگر قاتل بغیر توبہ کئے مر جائے اور اس کے اعمال بھی اچھے نہ ہوں اور اسے جہنم میں داخل کیا جائے تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق اسے توبہ کا حق نہ ہوگا۔ یعنی اس کی توبہ قبول نہ ہوگی۔ جمہور علماء کے قول کے مطابق اگر وہ شخص عمل صالح سے بہرہ ور نہ ہو (ایک وقت) اس عذاب سے نجات پا جائے گا یعنی ہمیشہ دوزخ میں نہ رہے گا، اور آیت میں جو خلود (یعنی ہمیشہ رہنے) کا ذکر ہے۔ اس سے مراد لمبے عرصہ تک پڑا رہنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی احادیث متواترہ اس بارے میں آئی ہیں کہ ”انہ یسخر من النار من كان في قلبه ادنى مثقال ذرة من ايمان“ (یعنی جس کے دل میں ذرہ بھر بھی ایمان ہوگا اسے جہنم سے نکال لیا جائے گا) اور حدیث معادیہ میں ہے ”كل ذلبي عسى الله ان يغفره الا او الرجل يموت كافراً الرجل يقتل متعمداً“ (یعنی ہر گناہ کی معافی متوقع ہے بجز اس کے کوئی شخص حالت کفر میں مرے یا مسلمان کو قصداً قتل کرے) اس حدیث میں لفظ ”عسى“ متوقع ہونے کے معنی میں آیا ہے۔ پس جبکہ ان دونوں صورتوں میں توقع عفو کی نفی کی جائے گی تو تب بھی توقع عفو ایک صورت یعنی قتل میں کی جائے گی جیسا کہ دلائل بالا

سے ثابت ہے۔ البتہ جو شخص کافر ہی مرا اس کے بارے میں نص (صراحت) موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل کفر کو معاف نہیں کرے گا، اور قیامت کے روز مقتول کا قاتل سے مطالبہ منجملہ حقوق انسانی کے ہے۔ یہ حق (قاتل کے) توبہ کر لینے سے ساقط نہ ہوگا اور لازمی طور پر وہ حق انہیں دیا جائے گا۔ جہاں تک مطالبہ حق کا تعلق ہے اس میں مقتول مسروق منصوب، مقدوف اور ہر گونہ طالبان حق میں باہم کوئی فرق نہیں ہے غرض اس پر سب کا اتفاق ہے کہ (مجرم کے) توبہ کر لینے سے کسی حقدار کا انسانی حق ساقط نہیں ہو جاتا۔ صحیح معنوں میں توبہ کر لینے پر بھی وہ حق واجب الادا رہیں گے۔ البتہ اگر کسی حق کی ادائیگی ممکن نہ ہو تو قیامت کے روز اس کی ادائیگی کا مطالبہ ضرور ہوگا۔ لیکن اس مطالبہ میں مجازاۃ (یعنی یکسانیت معاوضہ) ضروری نہیں ہے بلکہ یہ ہو سکتا ہے کہ قاتل کے اعمال نیک یا ان میں سے کچھ عمل مقتول کو منتقل کر دیئے جائیں اور اس طرح اس کے ثواب میں اضافہ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائے یا اپنے فضل سے اسے جنت کی نعمتیں اور محل عطا کرے اور اس کا درجہ بلند فرمائے یہاں تک کہ مقتول اپنے قاتل سے راضی ہو جائے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ممکن ہے جہنم میں ہمیشہ رہنے کی سزا کا مستوجب اس کو قرار دیا جائے جو اپنے قتل عمد کو معاذ اللہ (ارشاد باری کے برعکس) حلال بنالے۔ اس سے تو انسان مرتد ہو جاتا ہے۔

ایک اور قول کی رو سے آیت میں خلود کا جو ذکر ہے اس کی تاویل کی گئی ہے کہ قاتل کو دائمی عذاب ہوتا اگر اللہ تعالیٰ (فضل و رحم نہ فرماتا) بلکہ عدل سے کام لیتا، یا پھر اس کے معنی مجاز کے طور پر عرصہ دراز کے کئے جائیں اور اس سے مراد یہ ہو کہ قاتل بہت عرصہ تک جہنم میں پڑا رہے گا، واللہ اعلم۔

قاتل کی توبہ کا بیان

علمائے سلف کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ جرم قتل کی توبہ نہیں ہے ان اصحاب میں عبداللہ بن عباس، زید بن ثابت، ابو ہریرہ، عبداللہ بن عمر، ابوسلمہ بن عبدالرحمن، عبید بن عمیر، حسن بصری، قتادہ اور ضحاک بن مزاحم رضی اللہ عنہم ہیں یہ بات ابن ابی حاتم سے منقول ہے۔

ابن حمید اور ابن کثیر نے حدیث بیان کی، وہ کہتے ہیں کہ انہیں جریر نے یحییٰ جابری سے اور انہوں نے سالم بن ابوجعد سے روایت کیا، وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس موجود تھے، اس وقت وہ بصارت سے محروم ہو گئے تھے کہ ایک شخص نے آکر انہیں آواز دی کہ اے عبداللہ بن عباس جو شخص کسی مسلمان کو عداقت کر دے اس کی بابت آپ کی کیا رائے ہے؟ فرمایا ”جزاؤہ جہنم خالداً فیہا وغضب اللہ علیہ ولعنه، واعد له عذاباً عظیماً“ (یعنی اس شخص کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ پڑا رہے گا، اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اس کے لیے عذاب عظیم تیار ہے) اس پر اس شخص نے کہا کہ اگر وہ توبہ کر لے نیک عمل اختیار کرے اور نیک راستے پر پڑ جائے تب؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”نکلتہ امہ قاتل مؤمن متعمداً جاء یوم القیامۃ، اخذہ بیمینہ او بشمالہ، فشحب او داحہ من قبل عرش الرحمن، یلزم قاتلہ بشمالہ، وبیذہ الاخری رأسہ یقول: یارب سل هذا فیم قتلنی، وایم الذی نفسی بیدہ لقد انزلت هذه الآیۃ فما نسختها من آیۃ حتی قبض نبیکم ﷺ، وما نزل بعدہا من برہان“ (یعنی خدا اسے کھوئے، اس نے ایک مسلمان کو عداقت کیا وہ مسلمان اسے

قیامت کے دن دائیں یا بائیں ہاتھ سے پکڑ کر لائے گا اور عرش الہی کے سامنے لائے گا پھر عرش الہی کے سامنے اپنے درد و غم کا اظہار کرے گا اور اپنے قاتل کو بائیں ہاتھ سے اور دائیں ہاتھ سے اس کے سر کو پکڑے ہوئے کہے گا اے پروردگار اس شخص سے دریافت فرما کہ اس نے مجھے کیوں قتل کیا؟ اور میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد کسی اور آیت سے اس کی تفسیح نہیں ہوئی یہاں تک کہ تمہارے نبی ﷺ نے وفات پائی، اور اس کے بعد کوئی اور توضیح اندریں باب نازل نہیں ہوئی۔

اس بارے میں متعدد احادیث ہیں۔ ان کے مجملہ وہ حدیث ہے جو امام احمد نے روایت کی ہے کہ ان سے صقر ابن عیسیٰ نے حدیث بیان کی کہ ان سے ثور بن یزید نے ان سے حدیث بیان کی، انہوں نے ابو عون سے اور انہوں نے ابو ادیس سے وہ کہتے ہیں کہ میں نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے سنا انہوں نے بتایا کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے سنا کہ حضورؐ نے فرمایا کہ ”کل ذنب عسی اللہ ان یغفرہ الا الرجل یموت کافراً، والرجل یقتل مؤمناً متعمداً“ (یعنی بہت ممکن ہے کہ تمام گناہوں (کے مرتکب) کو اللہ تعالیٰ معاف فرمادے بجز اس کے جو حالت کفر میں مرا ہو یا وہ شخص جس نے مسلمان کو قصداً قتل کیا ہو)۔

جمہور علمائے سلف و خلف اس طرف گئے ہیں کہ قاتل کی توبہ کا معاملہ اس کے اور خدائے بزرگ و برتر کے درمیان ہے۔ اگر اس نے توبہ کر لی، خشوع و خضوع سے کام لیا اور نیک عمل کئے تو اللہ اس کی برائیوں کو نیکیوں سے بدل دے گا۔ اور اس کی چیرہ دستی کا نیک بدلہ مقتول دے گا، اور قاتل کی یہ سیہ کاری مقتول کی خوشنودی کا باعث ہوگا اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”والذین لا یدعون مع اللہ الہا آخر..... الا من تاب وآمن وعمل عملاً صالحاً“ (یعنی جو لوگ اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو حاجت روا نہیں جانتے اور ناحق قتل نہیں کرتے جو اللہ نے حرام فرمایا ہے تا آنکہ وہ مستحق قتل نہ ہو۔ نیز وہ بدکاری نہیں کرتے اور جو شخص ایسا کرے وہ سخت گنہگار ہے اور قیامت کے روز اسے دگنا عذاب ہوگا اور اس عذاب میں ذلت کے ساتھ ہمیشہ پڑا رہے گا۔ البتہ جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک عمل کیا تو اللہ تعالیٰ اس کی برائیوں کو نیکی سے بدل دے گا۔ اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے) اس آیت میں ایک (ہونے والے واقعہ کی) خبر ہے جس کی تفسیح جائز نہیں ہے۔ اسے مشرکین کے لیے گمان کرنا اور اس آیت کو مسلمانوں پر منطبق کرنا ظاہر الفاظ آیت کے منافی ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”قل یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسہم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ“ (یعنی ہماری طرف سے کہہ دو کہ اے میرے ایسے بندو جنہوں نے اپنے اوپر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو) اس آیت کا مفہوم عام ہے اور تمام گناہوں پر منطبق ہوتا ہے۔ جس میں کفر، شرک، شک، نفاق، قتل اور معصیت وغیرہ سب کا ذکر ہے یعنی ان میں سے کوئی سا بھی گناہ ہو اس کی توبہ اللہ قبول فرماتا ہے پھر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذلک لمن یشاء“ (یعنی اللہ تعالیٰ گناہ شرک کو معاف نہیں کرے گا۔ اس کے علاوہ جس گناہ کو بھی چاہے معاف کر دے گا) یہ آیت تمام گناہوں کے لیے عام بجز شرک باللہ کے جس کا ذکر اسی سورۃ میں اس آیت کے بعد آیا ہے، اس سے امید رحمت (مغفرت) کو تقویت حاصل ہوتی ہے، واللہ اعلم۔

صحیحین (بخاری و مسلم) میں ایک حدیث آئی جس میں ایک اسرائیلی کا ذکر ہے جس نے ایک سو جانیں ہلاک

کی تھیں۔ اس نے ایک عالم سے دریافت کیا کہ کیا میرے لیے توبہ کی گنجائش ہے؟ عالم نے کہا کہ تیرے اور توبہ کے درمیان کوئی شے حائل ہے؟ پھر انہوں نے اسے ہدایت کی کہ فلاں شہر میں چلا جائے اور وہاں اللہ کی عبادت کرے چنانچہ وہ ہجرت کر کے روانہ ہوا لیکن راستے ہی میں اس کی قضا آگئی اور رحمت کے فرشتوں نے اس کی روح قبض کر لی۔ اس امت (ملت اسلامیہ) میں توبہ سے بہرہ ور ہونے کی صلاحیت بنی اسرائیل سے زیادہ ہے۔

قتل عمد کے کفارے کا بیان

حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ بھی ایک روایت کے بموجب کہتے ہیں کہ قتل عمد کا کفارہ واجب نہیں ہے کیونکہ شریعت نے عمد اُقتل کے مجرم کو قتل کیے جانے یا وارثان مقتول کے معاف کرنے پر خون بہا کی ادائیگی کے بارے میں سخت تاکید فرمائی ہے جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے (اس میں کفارے کا ذکر نہیں ہے) لہذا اس پر کچھ اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔ اور اس لیے بھی (کفارہ نہیں ہو سکتا) کہ قتل عمد ایک مستقل گناہ کبیرہ ہے اور کفارہ (تلافی گناہ) کا مطلب عبادت ہے لہذا اس کو گناہ کے ساتھ وابستہ نہیں کیا جاسکتا۔ اور گناہ کبیرہ ایسی شے کا سبب نہیں بن سکتا جس کا مطلب عبادت ہو یہاں پر کفارہ کی یہی صورت ہے۔ پس جرم قتل کا کفارہ نہیں ہو سکتا۔ اس مسئلہ کی بنیاد اس اصول فقہ پر ہے کہ کفارہ کو خالص گناہ کبیرہ سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ عمل کفارہ کی ایک مقدار مقرر ہے اور اسے شریعت نے یوں مقرر فرمایا ہے کہ ادنیٰ امور مثلاً خطا (بھول چوک) کے اثر کو دور کیا جائے، کفارہ یہ نہیں ہوتا کہ بڑے بڑے گناہوں کو جس کا ارتکاب عمداً کیا گیا ہو مٹایا جاسکے۔ چنانچہ بہت سی معمولی باتیں (بھول چوک کی) ایسی ہیں جو قابل برداشت ہو سکتی ہیں لیکن بڑی بڑی باتیں (یا گناہ) ناقابل برداشت ہوتے ہیں۔

صاحب عنایہ فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ کا کہنا ہے کہ حدیث واثلہ بن اسقع اس کے عدم عہدیت (پائیدار نہ ہونے) کی دلیل ہے۔ کہ واثلہ بن اسقع نے بتایا کہ ہم آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ایک صاحب کو لے گئے جو ارتکاب قتل کر کے مستوجب عذاب جہنم ہو گئے تھے۔ حضور نے فرمایا کہ ان کی طرف سے ایک غلام آزاد کر دو۔ اللہ تعالیٰ اس غلام کے ہر عضو کے بدلے اس شخص کے اعضاء کو آگ سے رہائی دے گا۔ ظاہر ہے کہ نار جہنم قتل عمد ہی سے واجب ہوتی ہے۔ ہر چند کہ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ امر مسئلہ نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے کوئی شخص کسی ایسے عمل کے ارتکاب سے مستوجب نار ہو جو قتل عمد کے مشابہ ہو مثلاً بڑے سے پتھر یا بڑی سی لاٹھی سے مارا ہو۔ تاہم اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو اللہ تعالیٰ کے اس قول میں کہ ”من یقتل مؤمناً متعمداً فجزاؤہ جہنم خالداً فیہا“ (یعنی جو شخص کسی مسلمان کو عمداً قتل کر دے اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ پڑا رہے گا) جو اشارہ ہے وہ (عدم وجوب) کفارہ کے منافی نہیں ہے کیونکہ حرف فا (بمعنی پس جو) ”فجزاؤہ جہنم“ میں ہے) کا تقاضا یہ ہے کہ امر مذکورہ (سزائے مکمل نہ ہوگی) بلکہ سزا کا بعض حصہ، لہذا یہ تجویز درست نہ ہوگی، پھر یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قتل عمد کی دنیوی سزا قصاص (خون کا بدلہ خون) مقرر فرمائی ہے ”کتب علیکم القصاص فی القتلی“ (یعنی اللہ تعالیٰ نے قصاص کو قتل کی دنیوی سزا مقرر فرمادیا ہے) اور آخرت کی سزا کے بارے میں ارشاد ہے ”ومن یقتل مؤمناً متعمداً فجزاؤہ جہنم خالداً فیہا“ (یعنی جس نے کسی مسلمان کو عمداً قتل کیا اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ پڑا رہے گا) اگر قتل عمد کے مرتکب پر کفارہ واجب قرار دیا جائے تو یہ نص (صراحت

در اصل ہر مسلمان جو اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتا ہے اس کی تنبیہ کے لیے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کافی ہے ”من یقتل مؤمناً متعمداً فجزاؤہ، جہنم خالداً فیہا، وغضب اللہ علیہ ولعنہ، واعد لہ عذاباً عظیماً“ (یعنی جو شخص کسی مسلمان کو عمدتاً قتل کرے اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ پڑا رہے گا، ایسے شخص پر اللہ کا غضب ہے، اس پر اللہ کی لعنت ہے اور اس کے لیے عذاب سخت تیار ہے)۔ اس آیت میں ایسے سخت عذاب کی خبر دی گئی ہے کہ اس حکم کے خلاف کرنے والا، اگر مسلمان ہے، تو اس کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔

قتل ناحق کی سزا کا بیان:

ائمہ مجتہدین میں سے بعض کا کہنا ہے کہ جرم قتل کا مرتکب کافر کی طرح بغیر کسی فرق کے ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ جیسا کہ اس سے ظاہر ہے ”ومن قتل مؤمناً متعمداً فجزاؤہ، جہنم خالداً فیہا“ (یعنی جو شخص کسی مسلمان کو عمدتاً قتل کرے گا اس کی سزا جہنم ہے جہاں وہ ہمیشہ رہے گا) ائمہ کا یہ خیال (یعنی عذاب دائمی کا ہونا) درست ہو یا نہ ہو لیکن یہی بہت ہے کہ قاتل بہت طویل عرصہ کے لیے آتش دوزخ کے عذاب میں پڑا رہے، اور یہی سختی بہت ہے کہ اللہ کا غضب اور اس کی لعنت اس پر ہو اور یہ کہ اس روز جبکہ ظالموں کا کوئی عذر قبول نہ ہوگا اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے عذاب سخت تیار کر رکھا ہو اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جس کے اندر ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا اور اس آیت کو سنے گا تو انسان کا خون کرنے کی جرات کرنے سے اس طرح بھاگے گا جیسے بکری بھیڑیے سے ڈر کر بھاگتی ہے۔ اگر بالفرض کوئی شخص

قرآنی) پر اضافہ ہوگا، جو درست نہیں ہے۔ نیز یہ بھی ہے کہ قتل عمد کا جرم کفارہ (تلافی مافات) سے بالاتر ہے، جیسے قصداً ترک صلوٰۃ کا گناہ ہے کہ اس پر بالاتفاق قضا واجب ہوتی ہے، کفارہ واجب نہیں ہوتا۔

شافعیہ اور حنابلہ بھی ایک دوسری روایت کے بموجب کہتے ہیں کہ قتل عمد میں کفارہ واجب ہے کیونکہ قصداً ارتکاب کرنے والے کا جرم قتل خطا (یا قتل غیر عمد) سے بہت زیادہ ہے لہذا اس کا کفارہ زیادہ مناسب ہے۔ بہ نسبت قتل خطا کے، چونکہ قتل خطا پر کفارہ بالاتفاق واجب ہے تو قتل عمد پر کفارہ کو واجب قرار دینا زیادہ اچھا ہے اسی بناء پر ان اصحاب نے (اس کفارہ کو) جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھانے کے کفارے کے ساتھ ملایا ہے جس کا واجب ہونا نص (حکم واضح) سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”ولکن یؤاخذکم بما عقدتم الايمان فكفارته اطعام عشرة مساکین“ (یعنی تم نے دانستہ جھوٹی قسم کھائی اس پر تمہاری گرفت ہوگی، اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے)۔ ان اصحاب نے اپنے مسلک کے ثبوت میں امام احمد کی وہ روایت پیش کی ہے جو داؤد بن اسحق سے مروی ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ قبیلہ بنی سلیم کا ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں آیا، لوگوں نے اس کی بابت بتایا کہ ان کا وہ ساتھی مستوجب عذاب ہو گیا یعنی جہنم کا

اندھیرے (بے خبری) میں کسی کو قتل بھی کر دے اور دنیا میں جیتے جی قصاص سے بچ بھی رہے تب بھی یہ اس کے لیے برا ہی ہے۔ اس میں کوئی خیر نہیں ہے۔ کیونکہ آخرت کا عذاب سخت اس کا منتظر ہے اور دنیا کی زندگی میں بھی اللہ کا غضب اس کے لیے تیار ہے۔ البتہ اگر اس دنیا میں قاتل کے جیتے جی اس کا قصاص لے لیا جائے تو یقین ہے کہ یہ آخرت میں اس کے اس گناہ کا کفارہ ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا کرم اس سے بالاتر ہے کہ ایک جرم کی سزا دو مرتبہ دی جائے، جبکہ فی الواقع اس کے اپنے کئے کے موافق اس کو اس جرم کی سزا مل چکی ہے جو اس نے کسی دوسرے کے ساتھ کیا۔^(۱)

سزائے قتل سے، آپ نے ارشاد فرمایا ”فلیعتق رقبة یفدی اللہ بكل عضو منها عضواً منه من النار“ (یعنی اسے چاہیے کہ ایک بردہ آزاد کرے اللہ تعالیٰ اس غلام کے ہر عضو کے بدلے اس شخص کے اعضاء کو آتش دوزخ سے نجات دے گا) یہ حدیث اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ قتل عمد کا کفارہ واجب ہے۔

۱۔ ائمہ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ مسلمان کی جان کی قصد ہلاک کرنے والے پر تین باتیں عائد ہوتی ہیں، اول گناہ عظیم جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”من یقتل مؤمناً متعمداً فجزاؤہ جہنم خالداً فیہا“ پھر اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت اور قیامت کے روز عذاب سخت کی تہدید، اس بارے میں کثرت سے حدیثیں آئی ہیں۔ اور اس پر ملت اسلامیہ کا اجماع ہے، دوسرے یہ کہ اس پر تاوان کا ادا کرنا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”یا ایہا الذین آمنوا کتب علیکم القصاص فی القتلی“ (یعنی اے مسلمانو قتل کی صورت میں تم پر قصاص فرض ہے) لیکن اس کے لیے یہ قید لگا دی گئی ہے کہ اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ قتل دانستہ ہو جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”العمد قود“ (یعنی قتل عمد مستوجب قصاص ہے)۔ تیسرے یہ کہ قاتل ورثہ سے محروم ہو جاتا ہے آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے ”لا میراث لقاتل“ (یعنی قاتل ورثہ کا حقدار نہیں ہے)۔

واضح ہو کہ علماء نے کسی قاتل کو قصاص کا سزاوار اور کسی کو مقتول اور کسی جرم کو جرم قتل قرار دیے جانے کی چند شرطیں رکھی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ قتل کا مرتکب جس سے قصاص (خون کا بدلہ خون) لینا ہے اس کے لئے یہ شرط ہے کہ اس میں عقل ہو لہذا قاتل اگر جنون زدہ ہے تو اس پر قصاص عائد نہ ہوگا اور یہ کہ قاتل بالغ ہو، پس نابالغ (بچے) پر قصاص نہیں ہے۔ اور یہ بھی شرط ہے کہ اسے ارتکاب جرم کرنے (یا نہ کرنے) کا اختیار حاصل ہو۔ ایسا نہ ہو کہ اسے قتل پر مجبور کیا گیا ہو۔ اس صورت میں قصاص لازم نہ ہوگا اور یہ کہ اس نے بذات خود ارتکاب قتل کیا ہو اگر اس نے خود اقدام قتل نہیں کیا تو ایسے شخص پر ارتکاب قتل میں عملاً شامل نہیں ہے قصاص نہیں ہے اور یہ بھی شرط ہے کہ قاتل مقتول کا باپ یا آقا نہ ہو، اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

مقتول قرار دیئے جانے کی شرائط میں یہ ہے کہ مقتول ایسا شخص ہو جس کے عوض قاتل کا خون حق بجانب ہو، اور جن امور سے ایک شخص کی حیثیت مختلف ہو جاتی ہے وہ یہ ہیں مثلاً مسلمان ہونا یا کافر ہونا، آزاد ہونا یا غلام ہونا، مرد ہونا یا عورت ہونا، فرد واحد ہونا یا متعدد ہونا، پھر یہ بھی شرط ہے کہ اس کا خون کرنا ممنوع ہو۔

قصاص کے معاف کرنے کا بیان

یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ معاف کر دینے یا صلح کر لینے سے قصاص (خون کا بدلہ خون) ساقط ہو جاتا ہے بخلاف حد (سزائے شرعی) کے کہ وہ معاف کر دینے سے ساقط نہیں ہوتی، کیونکہ اس کا تعلق حقوق اللہ سے ہے (اسے اللہ ہی معاف کر سکتا ہے) لیکن یہ حنفیہ کی رائے ہے ان کے علاوہ دوسرے اہل مسالک کا کہنا ہے کہ معاف کرنے سے جو سزا ساقط نہیں ہوتی وہ 'حد زنا' ہے اور چوری کی سزا بھی حاکم کے سامنے معاملہ پیش ہو جانے کے بعد ساقط نہیں ہوتی لیکن حد قذف معاف کر دینے کے بعد مطلقاً ساقط ہو جاتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ان حالات کے پیش نظر جن کا ذکر سابقاً ہو چکا ہے کہ حد زنا عائد نہیں ہوتی جب تک کہ چار چشم دید گواہ جنہوں نے اپنی آنکھوں سے اس فعل کا ارتکاب دیکھا ہو گواہی نہ دیں اور چونکہ ایسا ہونا دشوار ہے اور عملی طور پر اس کا ثبوت ممکن نہیں ہے لہذا اس سزا پر عمل درآمد صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ مجرم خود اس کا اقرار کرے۔ رہا شراب پینے کی سزا کا معاملہ سو اس کی بابت بعض اصحاب کی رائے یہ ہے کہ اس کا شمار حد و شرعیہ میں نہیں بلکہ یہ تعزیر ہے۔ بناء بریں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ سزا جس کے نفاذ کا خیال کیا جاسکتا ہے اور جو معاف کر دینے سے ساقط نہیں ہوتی وہ صرف چوری کی سزا ہے بشرطیکہ معاملہ حاکم کے پیش ہوا ہو جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا۔^(۱)

جرم کو قتل قرار دیئے جانے کی شرط یہ ہے کہ قاتل نے ارتکاب قتل عداً کیا ہو مقتول بے گناہ ہو اور اس نے کوئی جرم مستوجب قتل نہ کیا ہو جب یہ تمام شرطیں پوری ہوں تب ہی قاتل پر قصاص عائد ہوگا، بجز اس صورت کے جبکہ قاتل کے ورثاء معاف کر دیں، یا صلح کر لیں۔ انہیں اس کا حق ہے تاہم اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ دراصل قصاص واجب ہے اور مقتول کا ولی خون بہا کا مطالبہ نہیں کر سکتا تا آنکہ قاتل راضی نہ ہو جیسا کہ قرآن وحدیث میں آیا ہے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ ولی کو (خون کی بجائے) مال کے مطالبہ کا حق ہے، اس میں قاتل کی مرضی کو دخل نہیں ہے۔ کیونکہ خون کی بجائے مال کا تعین ہو گیا ہے تو خون بہا کا مطالبہ قاتل کی مرضی کے بغیر بھی جائز ہے۔ ایک اور قول کے بموجب، ان دونوں باتوں میں سے ایک پر بلا تعین ہونا واجب ہے جس کا تعین ولی کے اختیار میں ہے، کیونکہ بندوں کا حق شرعاً لازم قرار دیا گیا ہے اور جو کچھ لازم ہوا ہے اس میں حقدار کو اختیار ہے۔

۱۔ علماء کا اس باب میں اختلاف ہے کہ آیا قصاص سے مجرم کے گناہ کا کفارہ ہو جاتا ہے یا نہیں بعض اصحاب کہتے ہیں کہ اگر قاتل پر حد قصاص نافذ کر دی جائے، اور قاتل اس پر راضی ہو اور اس نے گناہ سے توبہ کر لی ہو تو یہ اس کے جرم کا کفارہ ہو جائے گا، کیونکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ "الحدود كفارات لاهلها" (یعنی شرعی سزائیں

مجرموں کے گناہوں کا کفارہ ہیں) اس ارشاد میں عمومیت ہے اور اس میں کسی خاص عمل کی خصوصیت نہیں ہے اور اس لیے بھی کہ اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم سے بہت بعید ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ایک جرم کی سزا دو مرتبہ دے۔ ایک بار دنیا میں بطور قصاص کے اور دوسری بار آخرت میں عذاب جہنم کی صورت میں اور اسی قول کو ترجیح حاصل ہے۔

بعض اصحاب کہتے ہیں کہ قصاص جرم گناہ کا کفارہ نہیں ہے، آخرت میں وہ شخص بے گناہ متصور نہ ہوگا، کیونکہ جسے ظلم سے (ناحق) قتل کیا گیا ہے اسے قصاص پر عملدرآمد کا فائدہ (مقتول کو نہیں بلکہ) صرف زندہ اشخاص کو پہنچتا ہے کہ قتل ناحق سے بچ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ“ (یعنی لوگو حکم قصاص پر عملدرآمد میں ہی تمہاری زندگی ہے)۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”یَجِی الْمَقْتُولُ مُتَعَلِّقًا بِقَاتِلِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، أَخَذَ رَأْسَهُ بِيَدِهِ الْآخِرَى، فَيَقُولُ: يَا رَبِّ سَلْ هَذَا فِيمَ قَتَلْتَنِي؟ قَالَ فَيَقُولُ: قَتَلْتَهُ لِتَكُونَ الْعِزَّةُ لَكَ، فَيَقُولُ: فَانْهَالِي، قَالَ: وَيَجِی آخِرُ مُتَعَلِّقًا بِقَاتِلِهِ فَيَقُولُ: رَبِّ سَلْ هَذَا فِيمَ قَتَلْتَنِي؟ قَالَ فَيَقُولُ: قَتَلْتَهُ لِتَكُونَ الْعِزَّةُ لِفُلَانٍ، قَالَ: فَانْهَالِي سَلْ لَهٗ، بَنُو بَاثِمَةٍ، فَيَهْوِي فِي النَّارِ سَبْعِينَ خَرِيفًا“ (یعنی قیامت کے روز مقتول اپنے قاتل کو لٹکائے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے اس کا سر پکڑے ہوئے لائے گا اور کہے گا اے رب اس سے پوچھ کہ اس نے مجھے کیوں قتل کیا وہ شخص کہے گا کہ اس کو میں نے اس لیے قتل کیا کہ تیری عزت ہو، ارشاد ہوگا کہ بلاشبہ میں عزت کا حقدار ہوں، پھر ایک اور شخص اپنے قاتل کو لٹکائے ہوئے آئے گا۔ اور کہے گا کہ یا رب اس سے پوچھ کہ اس نے مجھے کیوں قتل کیا؟ وہ شخص کہے گا کہ میں نے اسے اس لیے قتل کیا کہ فلاں شخص کی عزت ہو، ارشاد ہوگا کہ وہ عزت کا حقدار نہیں ہے تب وہ گنہگار قرار دیا جائے گا اور ستر سال کے لیے اسے آتش دوزخ میں ڈال دیا جائے گا) اس مضمون کی بکثرت حدیثیں آئی ہیں اور وہ حدیث جس میں آیا ہے کہ سزائیں گناہ کا کفارہ ہو جاتی ہیں، سو اس حدیث کا تعلق ایسے جرم کی سزا سے ہے جس کا تعلق حق اللہ سے ہے۔

مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ قتل عمد سے یا تو قطعی طور پر، قصاص واجب ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک مرتد دوسرے مرتد کو قتل کر دے، اس میں قطعی طور پر قاتل مرتد پر قصاص (خون کا بدلہ خون) عائد ہوگا، یا قتل عمد سے قطعی طور پر خون بہا واجب ہوگا، مثلاً باپ بیٹے کو قتل کر دے، یا مسلمان کسی ذمی (غیر مسلم رعایا) کو قتل کر دے تو اس میں قطعی طور پر خون بہا واجب ہوگا یا پھر قصاص اور خون بہا دونوں میں سے کسی ایک امر کا اختیار دیا جائے گا یعنی جائز ہوگا کہ مقتول کا ولی فدیہ لے کر قصاص کے مطالبہ سے دست بردار ہو جائے اور (جو کچھ بھی وہ پسند کرے) اس میں مجرم کی رضا مندی کو کوئی دخل نہیں۔ چنانچہ بیہقی نے مجاہد وغیرہ سے روایت کیا ہے ”كَانَ فِي شَرَعِ مُوسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ تَحْتَمُ الْقِصَاصُ جُزْمًا، وَفِي شَرَعِ عِيسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ الدِّيَةُ فَقَطْ، فَخَفَّفَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْ هَذِهِ الْأُمَّةِ وَخَيَّرَهَا بَيْنَ الْأَمْرَيْنِ“ (یعنی حضرت موسیٰ کی شریعت میں قطعی طور پر قصاص امر ناگزیر تھا اور حضرت عیسیٰ کی شریعت میں صرف فدیہ (خون بہا) لازم تھا لیکن اس امت کو اللہ تعالیٰ نے یہ سہولت دے دی ہے کہ دونوں باتوں میں سے ایک کو اختیار کرنے کی اجازت ہے) دونوں میں سے کسی ایک بات کو ناگزیر تشدد ہے۔ اور چونکہ سزا کا حکم مجرم کے خلاف ہوتا ہے لہذا اس پر عملدرآمد کے معاملہ میں اس کی مرضی کو دخل نہیں ہے۔ جیسے کسی کام کا معاملہ اوٹ لینے اور کسی کی ضمانت (دینے کے لیے فریق ثانی کی اجازت ضروری نہیں ہے)۔

اگر مجرم (مستوجب القصاص) کے اعضاء میں سے کسی عضو کو معاف کر دیا جائے تو وہ شخص کلیۃً بری ہو جائے گا۔ جیسے عورت کے کچھ حصہ کو (مثلاً آدھی یا چوتھائی کو) طلاق دینے سے کلیۃً طلاق ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر مطالبہ کے حقداروں میں سے کسی نے (قصاص) معاف کر دیا تو یہ معافی سب کی طرف سے منظور ہوگی اگرچہ دوسرے حقدار راضی نہ ہوں، اس صورت میں قصاص کا معاملہ دیت (خون بہا) کا معاملہ بن جائے گا، کیونکہ قصاص کے حصے نہیں ہو سکتے۔ اس میں خون کرنے سے باز رکھنے کے لیے سزا کے ساقط ہو جانے کا پہلو غالب ہے۔ اور قصاص کی نوعیت نامعلوم ہونے سے معافی پر کوئی اثر نہیں پڑتا چنانچہ اگر کسی غلام (مملوک) کا کوئی عضو کاٹ دیا گیا اور اس کے آقا نے (مجرم کو) معافی دے دی تو یہ معافی درست ہوگی اگرچہ اسے یہ معلوم نہ کہ کس عضو کے کاٹے جانے کا جرم اس نے معاف کیا ہے۔ کیونکہ (فی الجملہ) معاف کر دینا ایک امر مستحب (پسندیدہ) ہے۔ چنانچہ شریعت اسلامیہ نے اس کی ترغیب دی ہے اور ایسا کرنے کے لیے فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”فمن عفا واصلح فاجره علی اللہ انہ لا یحب الظالمین“ (الشوری: ۴۰) (یعنی جو شخص خطا کار کو معاف کر دے اور صلح کر لے تو اللہ اس کا اجر دے گا البتہ وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا) اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے ”من قتل لہ قتیل فاہلہ بین خیر تین؛ ان احبوا قتلوا وان احبوا اخذوا الدیۃ“ (یعنی جسے کسی نے قتل کر دیا ہو تو اس کے ورثہ کو دو باتوں میں سے ایک کا اختیار ہے چاہے قاتل کو قتل کریں، چاہے خون بہا لے لیں) اور بیہقی وغیرہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ”ان النبی ﷺ کان مارفع الیہ قصاص قط الا امر فیہ بالعفو“ (یعنی نبی ﷺ کے سامنے جب کبھی قصاص کا معاملہ پیش ہوتا تو حضور ہمیشہ معافی ہی کے لیے ارشاد فرماتے تھے) اور عدی بن ثابت سے مروی ہے کہ عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں کسی نے ایک شخص کے منہ کو زخم لگائے اور اس کی دیت یا تاوان پیش کیا لیکن اس شخص نے لینے سے انکار کیا اور اس سے مگنی مقدار کا مطالبہ کیا اس پر ایک شخص نے بیان کیا کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد فرمانا سنا ہے کہ ”من تصدق بدم، او دونہ کان کفارة لہ من یوم ولد الی یوم تصدق“ (یعنی جس نے قتل یا اس سے کم درجہ کے گناہ کو معاف کر دیا تو یہ عمل اس کی ان تمام خطاؤں کا کفارہ ہوگا جو اس سے یوم ولادت سے معافی دینے کے وقت تک سرزد ہوئیں)۔ اور عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے ”ما من رجل یبجرح فی جسدہ جراحۃ، فیتصدق بہا الا کفر اللہ تبارک وتعالیٰ عنہ مثل ما تصدق بہ“ (یعنی جب بھی کسی شخص کو زخم پہنچتا ہے اور وہ شخص اس کو معاف کر دیتا ہے تو خدا تعالیٰ اس معافی کو اس شخص کے اس جیسے گناہ کا کفارہ بنا دیتا ہے) اس حدیث کو احمد نے روایت کیا ہے اس کے سب راوی صحیح ہیں۔

اگر کوئی وارث (یا ولی) قصاص کے معاف کرنے کو نظر انداز کر دے اور خون بہا سے نہ انکار کرے نہ اقرار تو اس مسلک کی اردو سے مجرم پر خون بہا واجب نہ ہوگا کیونکہ قتل کے ارتکاب سے خون بہا واجب نہیں ہوتا (بلکہ قصاص واجب ہوتا ہے) اور معافی اس بات کو ساقط کرنے کے لیے ہوتی ہے جو ہوئی ہو، جو بات ہوئی ہی نہیں اسے ثابت کرنے کے نہیں ہوتی۔

ایک اور قول (فقہاء کا) یہ ہے کہ دیت (تاوان یا خون بہا) کی ادائیگی قاتل کے مال سے واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”فمن عفی لہ من اخیه شی فاتباع بالمعروف“ (یعنی کوئی شخص اپنے بھائی کو معاف کر دے

تو اسے مال دلایا جائے) یہاں معروف سے مراد مال ہے اور مطلب یہ ہے کہ مال دے کر اس کے جرم کی تلافی کی جائے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قصاص کی معافی دینے کے بعد تاوان واجب الادا ہو جاتا ہے اور اس لئے بھی کہ دیت (تاوان یا خون بہا) قصاص کا بدلہ ہے جب کہ معاف کر کے اسے ساقط کر دیا گیا ہو یا کسی اور طرح سے وہ ساقط ہوا ہو مثلاً جرم کا وفات پا جانا۔ اس حالت میں شریعت نے ولی کو اختیار دیا ہے کہ وہ قصاص لے یا مال۔

واضح ہو کہ حنفیہ کا اور ایک دوسری روایت کے بموجب مالکیہ کا نیز حنابلہ کا بھی ایک دوسرا قول یہ ہے کہ قتل عمد کی سزا متعین ہے یعنی قصاص۔ ولی کو یہ حق نہیں ہے کہ قاتل کی رضا مندی کے بغیر دیت (خون بہا) وصول کر لے (اور قصاص ترک کر دے) جیسا کہ قرآن و حدیث میں آیا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ مال میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ قتل عمد کے عوض واجب الادا ہو جائے (یا اس کا بدلہ بن سکے) کیونکہ ان میں (یعنی خون اور مال میں) کوئی مماثلت نہیں ہے۔ قصاص ہی کو جرم سے مناسبت ہے اور اس میں زیادہ بہتری ہے یعنی اس میں انسانی زندگی کو بچانے کی صلاحیت ہے کہ دوسروں کو اس فعل کے ارتکاب سے باز رکھے اور وارث مجبور ہو جائیں پس یہی سزا (خون کا بدلہ خون یا قصاص) متعین ہو گئی۔ شریعت نے حکم قصاص میں ایک اور طریقہ سے ولی کا خیال بھی مد نظر رکھا ہے کہ یہ انتقام ہے اور اس سے دلوں کو تسلی حاصل ہوتی ہے۔

دراصل شریعت نے یہ حکم عہد جاہلیت (قبل از اسلام) کے اس دستور کی بیخ کنی کے لئے دیا ہے جس پر اس وقت لوگ عامل تھے کہ ایک شخص کے عمل کے عوض پورے قبیلے کا خاتمہ کر دیا جاتا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ فرد واحد کے قتل کئے جانے پر مال کثیر کے طالب ہوں بلکہ قاتل اور ان کے متعلقین تمام دنیا کا مال جو ان کے پاس ہو یا اور اشیاء جس پر مقتول کے ورثاء راضی ہوں پیش کر دیں تب بھی مقتول کے آدمی اس پر راضی نہ ہوتے تھے۔ غرض قتل عمد کے عوض مال کی ادائیگی واجب ہونے میں قصاص کا مقصد فوت ہو جاتا ہے پس جب کہ یہ امر مسلمہ ہے کہ قتل عمد کی پاداش میں قصاص کو بنیادی حیثیت حاصل ہے تو اس سے تجاوز کرنا جائز نہیں ہے تا آنکہ یہ ضروری نہ ہو جائے۔ مثلاً یہ کہ اگر مقتول کے ولیوں (وارثوں) میں سے کوئی قصاص کو معاف کر دے تو پورے طور پر حکم قصاص کی بجا آوری دشوار ہو جائے گی۔ یا یہ کہ (مجرم کے) جس عضو پر قصاص کا حکم نافذ ہوتا ہے وہ عضو ناقص ہو مثلاً کسی کا ہاتھ کاٹنے والے مجرم کے اپنے ہاتھ کی انگلیاں کم ہوں۔ یا یہ کہ جس نے قتل کیا ہے وہ مقتول کا باپ یا اس کی ماں ہو۔ ان حالات میں قصاص پر عمل درآمد دشوار ہے ایسی حالت میں قصاص کو چھوڑ کر دیت (خون بہا یا تاوان) عائد ہوگا۔ تاکہ وہ خون راگیاں نہ جائے۔

شافعیہ حنفیہ اور حنابلہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر عورت معاف کر دے تو قاتل قصاص سے بری ہو جائے گا۔ مالکیہ کہتے ہیں کہ خون کے معاملہ میں عورت کو کوئی دخل نہیں ہے (یعنی نہ معاف کر سکتی ہے نہ خون بہا لے سکتی ہے) ساتھ ہی ایک اور روایت کی رو سے ان کا کہنا ہے کہ انہیں بھی خون کے معاملہ میں مردوں کی طرح دخل ہے جب کہ صلبی رشتہ داروں میں کوئی مردان کے برابر نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک حیثیت سے قصاص اور دیت کے معاملہ میں انہیں بھی دخل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عورتوں کو معاملات قصاص نمٹانے کا حق تین شرطوں پر منحصر ہے یعنی عورت (مقتول کی) وارث ہو اور کسی درجہ میں بھی کوئی جعلی رشتہ دار نہ ہو اور اس کی حیثیت ایسی ہو کہ اگر وہ مرد ہوتی تو عصبات (صلبی حصہ داروں میں) شمار ہوتی۔

حنفیہ اور مالکیہ رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ ولی اگر معاف کر دے تو سزائے قصاص دیت (تاوان یا خون بہا)

اسلامی احکام کی خوبیوں کا بیان

واضح ہو کہ بالعموم یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قصاص کے بارے میں شریعت اسلامیہ کا حکم یہ ہے کہ اگر قاتل کے جرم قتل کو معاف کر دیا جائے تو وہ سزائے قتل سے بری ہو جائے گا حالانکہ قتل قبیح ترین جرم ہے اور انسانی معاشرہ کے لئے سب سے زیادہ ضرر رساں ہے۔ یہ جرم تو اس کا متقاضی ہے کہ اس کی سزا حدود شرعیہ کی طرح کسی حالت میں بھی قابل درگزر نہ ہوتی تاکہ مجرم کو یقین ہو جائے کہ بہر حال (اس جرم کی پاداش میں) اسے قتل کیا جائے گا۔ تاکہ کبھی ایسے جرم کا اقدام نہ کرے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس بارے میں شریعت کا حکم اسلامی احکام شرعیہ کی خوبیوں میں سے ہے

میں منتقل ہو جائے گی۔ اس کے لئے مجرم کی رضا مندی (اجازت) ضروری نہیں ہے۔ لیکن ولی کو یہ حق نہیں ہے کہ قصاص کو چھوڑ کر مال کا مطالبہ کرے تاکہ مجرم راضی نہ ہو اگر ولی قصاص معاف کر دے لیکن معافی کے لئے خون بہا وغیرہ کی شرط نہ لگائے تو وہ معافی بلا تاوان متصور ہوگی۔

شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ مقتول کے وارث کو قطعی اختیار ہے کہ قصاص لے یا دیت کا مطالبہ کرے یا بغیر معاوضہ مال کے معاف کر دے۔ غرض ولی کو قصاص چھوڑ کر دیت (خون بہا یا تاوان) لینے کا اختیار ہے۔ قاتل راضی ہو یا نہ ہو کیونکہ دیت قصاص کا بدلہ ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دیت جان کا معاوضہ ہے قصاص کا بدلہ نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر عورت کسی مرد کو قتل کر دے تو اس مرد (کی جان) کا خون بہا واجب الادا ہوگا اگر یہ تاوان قصاص کا بدلہ ہوتا تو عورت (کے قصاص سے بچنے کا معاوضہ واجب ہوتا)۔ علمائے شافعیہ میں سے المتولیٰ کا کہنا ہے کہ اگر قصاص معاف کر دیا جائے تو مقتول کا خون بہا واجب الادا ہوگا نہ کہ قاتل کا خون بہا (یعنی قصاص سے بچ جانے کا معاوضہ نہیں ہے) بعض اصحاب نے ان دونوں خیالات کی مطابقت اس طرح کی ہے کہ قصاص مقتول (یا مجروح) کی ذات کا بدلہ ہے اور بدل کا بدلہ بھی بدل ہی ہوتا ہے (یعنی قصاص جان کا بدلہ ہے تو وہ بھی جان کے برابر ہے) فقہاء کا کہنا ہے کہ اگر ولی مال دیت کے علاوہ کسی اور طرح سے قصاص کو معاف کر دے یا کوئی اور شخص کسی شرط پر مصالحت کر دے تو وہ امر یا جس شے پر مصالحت ہوئی ہے وہ عائد ہو جائے گی خواہ خون بہا (یا تاوان سے) زیادہ ہو بشرطیکہ مجرم یا صلح کرانے والا اسے تسلیم کر لے اس طرح قصاص مجرم کے ذمہ سے ساقط ہو جائے گا۔ لیکن اگر مجرم یا صلح کرانے والا قبول نہ کرے تو یہ فیصلہ عائد نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ معاوضہ کا معاملہ ہے جس میں طرفین کی رضا مندی ضروری ہے۔ جیسے کہ صلح کے معاوضہ میں ہوتا ہے اور بقول صحیح اگر قاتل خون بہا کی ادائیگی سے قاصر رہا تو قصاص ساقط نہ ہوگا۔ کیونکہ جس شرط پر ولی مقتول معافی کے لئے راضی تھا وہ پوری نہیں ہوئی۔

فقہاء کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے نصف دیت کے عوض قصاص سے درگزر کیا تو قصاص لاگو ہوگا اور نہ (بقیہ) نصف دیت (دولوں امور ساقط ہو جائیں گے)۔

اور اس میں بھی ایک نکتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام عزیز میں بیان فرمایا ”ولکم فی القصاص حیوة یا اولی الا لباب لعلکم تتقون“ (البقرة: ۱۷۹) (یعنی اے دانش مندو! اس حکم قصاص میں تمہاری زندگی ہے کہ تم بچ جاؤ اب در آنحالیکہ حکم قصاص کا مقصد خون ریزی اور اتلاف جان سے بچنا ہے تاکہ لوگ امن وامان سے رہیں تو لازم ہے کہ شریعت اسلامیہ میں ان تمام پہلوؤں کو مد نظر رکھا جائے جو جان کے تحفظ اور اس کی دفاع کے لئے لازم ہیں۔ چونکہ سزا اس بد اخلاقی کا سد باب کرتی ہے جو انسان کو ارتکاب جرم پر آمادہ کرے اس لئے شریعت میں اپنی اور دوسرے کی جان کو مارنا ممنوع ہے۔ تاہم (احکام قصاص کی بجا آوری میں) ان امور کو پیش نظر رکھنا ضروری تھا جو اہل خاندان کے دلوں سے بغض و عداوت کو مٹا دے تاکہ خون خرابے سے نجات ہو اور جانیں محفوظ رہیں۔

قاتل پر مقتول کے ورثاء کی بالادستی کا بیان

یہ امر ظاہر ہے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ قتل کے بعد مقتول کے وارثوں میں کینہ پیدا ہو جاتا ہے اور ایسی آگ لگ جاتی ہے کہ جب تک قاتل کی طرف سے انہیں اطمینان نہ ہو جائے اور قاتل پر قابو نہ پالیں انہیں تسلی نہیں ہوتی۔ اس لئے شریعت نے مقتول کے وارثوں کے قاتل پر جو مستوجب قتل ہوتا ہے فوقیت دی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو مال وغیرہ کے عوض اسے معاف کر دیں یا چاہیں تو بغیر اس کے کہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کریں (یعنی مثلہ) کریں یا تشدد و آزار کھیں قصاص (خون کا بدلہ خون) لیں اسی طرح انہیں تسلی ہو سکتی اور کینہ دور ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد نہ تو کینہ تو زنی اختیار کریں گے اور نہ انتقام لینے میں زیادتی سے کام لیں گے کہ قاتل کے بے قصور اہل قبیلہ کو قتل کریں اور پھر نزاع پیدا ہو اور باہمی عداوت بڑھتی چلی جائے اور فریقین کے درمیان تشدد کا مقابلہ ٹھن جائے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت سے بے گناہ مارے جائیں گے اور بدترین نتائج سامنے آئیں گے۔

متعدد واقعات اس امر کے شاہد ہیں کہ قتل کے بیشتر جرائم ورثاء مقتول کی مرضی کو نظر انداز کر دینے کے باعث ہوتے ہیں۔ (ان کی رضائے لی جائے تو) وہ خود قاتل سے انتقام لینے کی کوشش کریں گے اور قاتل کے دوسرے بے قصور رشتہ داروں پر تہمت لگا کر اصل بات کو چھپائیں گے تاکہ موقع پا کر اپنے ہاتھ سے انہیں قتل کر دیں۔ اس طرح خاندان میں طوائف الملوکی پیدا ہو جائے گی اور قتل کی متعدد وارداتیں ظہور میں آنے لگیں گی اور دلوں سے قانون کا احترام جاتا رہے گا لیکن اگر قصاص کے بارے میں پہلے ہی وارث کی رائے لی جائے تو وہ اپنی بالادستی کے پیش نظر خود سوچے گا کہ وہ اپنی آتش کینہ کو کسی طرح فرو کر سکتا

اور اپنی توہین کو دور کر سکتا ہے۔ اس طرح وہ خود اپنے لئے راہ عمل تجویز کرے گا اب اگر وہ خود ہی معاف کر دے تو فہماور نہ قصاص لے گا اور فساد وہیں پر ختم ہو جائے گا۔^(۱)

۱۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”من قتل مظلوماً“ (یعنی جو مظلوم قتل کیا گیا) بغیر اس کے کہ وہ واجب القتل رہا ہو ”فقد جعلنا لولیہ سلطاناً“ (تو ہم نے اس کے ولی یا وارث کو غلبہ عطا کیا ہے) یعنی قاتل کے خون کا حقدار بنا دیا ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ (حقدار) ولی کا مرد ہونا ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جسے ولی فرمایا ہے اس کا ذکر بعینہ مذکور آیا ہے۔ پس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت پر ولی کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اسی بناء پر ناگزیر ہوا کہ قصاص کے معاملہ میں عورت کو دخل نہ ہو۔ اس کے معاف کرنے سے نہ معافی ہوگی اور نہ وہ دیت (وغیرہ) کی وصولیابی کر سکتی ہے۔

حنفیہ شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ آیت میں لفظ ”ولی“ سے مراد وارث ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”والمؤمنون والمؤمنات بعضهم اولیاء بعض“ (یعنی مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ایک دوسرے کے ورثاء ہیں) (التوبہ: ۱۷) یہ عبارت متقاضی ہے کہ قصاص کے مطالبہ کا حق وارثوں کو حاصل ہو (قطع نظر اس کے کہ وہ مرد ہوں یا عورت) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”و علی المقتتلین ان یبجزوا الاول فالاول وان کان امرأۃ (سلطاناً) ای تسلیطاً“ ان شاء قتل وان شاء عفا وان شاء اخذ الدیۃ“ (یعنی قتال کرنے والوں پر لازم ہے کہ وہ مقتول کے مقدم ترین رشتہ دار یا اس کے بعد کے مقدم ترین رشتہ دار کا حق پورا ادا کریں۔ خواہ وہ عورت ہو یعنی اسے اختیار ملنا چاہیے کہ چاہے تو قتل کر دے چاہے معاف کر دے اور چاہے تو دیت (تاوان) وصول کر لے)۔

امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سلطان سے مراد حکم الہی ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ سلطان سے حجت (ثبوت یا دلیل) مراد ہے۔

فقہاء کہتے ہیں کہ آیت ”ومن قتل مظلوماً فقد جعلنا لولیہ سلطاناً“ (یعنی جو شخص ناحق قتل کیا گیا ہم نے اس کے ولی کو اختیار عطا کر دیا) اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تفسیر ہے ”لا تقتلوا النفس الی حرم اللہ الا بالحق“ (یعنی اللہ تعالیٰ نے قتل نفس کو حرام فرمایا ہے پس ناحق اسے قتل نہ کرو) آیت کا بظاہر مفہوم یہ ہے کہ ظالمانہ قتل کے علاوہ اور کوئی سبب قتل کے حلال ہونے کا نہیں ہے۔ لیکن احادیث متقاضی ہیں کہ دو اور امور کو موجبات قتل میں شامل کیا جائے۔ ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرنا اور شادی شدہ ہونے کے بعد بدکاری کا ارتکاب کرنا۔ ایک اور آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ قتل کا ایک چوتھا موجب بھی ہے یعنی ”رہزنی“ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ ویسعون فی الارض فساداً ان یقتلوا او یصلبوا“ (یعنی جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں اور زمین میں خرابی پھیلا رہے ہیں بلاشبہ ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کئے جائیں یا انہیں سولی دے دی جائے) اسی طرح ایک اور آیت میں سزائے موت کا پانچواں سبب آیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”قاتلوا الذین لا یؤمنون باللہ ولا بالیوم الآخر“ (یعنی ان لوگوں سے قتال کرو جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں لاتے)۔ ان کے علاوہ کچھ اور امور ہیں جن کے موجب قتل ہونے کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ منجملہ ان کے نماز کا ترک کرنا، لواطت (اغلام) کا مرتکب ہونا اور جادو سے ہلاک کرنا ہے۔

آیت ”فلا یسرف فی القتل“ (یعنی قتل میں حد سے تجاوز نہ کرنا چاہیے) کا مطلب یہ ہے کہ جب وارث کو قصاص لینے یا دیت وصول کرنے کا اختیار دیا گیا ہے تو چاہیے کہ قتل کرنے میں پیش دستی نہ کریں بلکہ ”خون بہا“ پر اکتفا کریں یا ماکل بعفو ہوں تو قتل کے اقدام میں بے احتیاطی نہ ہوگی۔ آیت میں بھی خون بہا پر اکتفا کرنے کی ترغیب ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”وان تعفوا اقرب للتقویٰ“ (یعنی اگر معاف کرو تو یہ تقویٰ کے بہت قریب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یقینی طور پر اسراف فی القتل سے بچنا ہے)۔

کہا جاتا ہے کہ (قاتل کے) قتل میں اسراف (یا زیادتی) یہ ہے کہ مقتول کا ولی قاتل کے علاوہ دوسروں کو بھی قتل کرے۔ بات یہ ہے کہ جب کوئی شخص ایک معزز قبیلے کے کسی فرد کو قتل کر دیتا تھا تو مقتول کے قبیلہ میں سے اس کے ورثاء۔ ادنیٰ درجہ کے قبیلے کے متعدد اشخاص کو قتل کر دیتے اور محض قاتل کے قتل کرنے پر اکتفا نہیں کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا اور صرف قاتل کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسراف قتل کا مطلب یہ ہے کہ (قاتل کو) محض قتل کرنے پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ اس کا مثلہ کیا جائے یعنی اس کے اعضاء کاٹے جائیں یا اسے شکنجہ میں کسا جائے۔

بیشتر اصحاب نے ”فلا یسرف“ کو یا کے ساتھ ہی پڑھا ہے جس میں ضمیر کا مرجع قتل کا ظالم مرتکب ہے اور معنی یہ ہیں اس ظالم قاتل کو نہ چاہیے کہ قتل میں اسراف کرے اور اسراف یہ ہے کہ ظالمانہ (یا ناحق) اقدام قتل کرے۔ طبری کہتے ہیں کہ یہ (آیت) خطاب ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے بعد ائمہ اسلام کو کہ وہ قاتل کے سوا کسی اور کو قتل نہ کریں اور ارشاد باری ”انہ کان منصوراً“ (یعنی ولی مقتول منصور، منصور ہوگا) کے تین مفہوم ہیں ایک یہ کہ ظلم کی ابتداء کرنے والے (قاتل) کو جس نے ظالمانہ قتل کا ارتکاب کیا یہ گویا تنبیہ ہے کہ ایسا مت کر، وہ مقتول دنیا اور آخرت میں منصور (کامران) ہے دنیوی کامرانی تو یہ ہے کہ اس کے قاتل کو ہلاک کیا جائے گا اور آخرت کی کامرانی یہ ہے کہ اسے بہت ثواب ملے گا اور قاتل کو سخت عذاب ہوگا۔ دوسرے یہ کہ ولی مقتول کو اس ظالم قاتل پر بالادستی حاصل ہوگی۔ پس چاہئے کہ وہ اس طرح سزائے قاتل پر اکتفا کرے اور اس سے زیادہ کی خواہش نہ کرے۔ کیونکہ جس شخص کو اللہ کے ہاں سے نصرت ملی ہے اس سے زیادہ ظلمی حرام ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کہا کہ ”واسم اللہ لیظہرن علیکم ابن ابی سفیان“ (یعنی بخدا ابوسفیان کا بیٹا تم پر کامران ہوگا) کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”ومن قتل مظلوماً فقد جعلنا لولہ سلطاناً“ (یعنی جسے ظلم سے قتل کیا گیا اس کے ولی کو ہم نے کامرانی بخشی ہے) تیسرے یہ کہ یہ قاتل ظالم ہے اس سے پورا قصاص لینے پر اکتفا کرنا چاہیے اور زیادہ کا مطالبہ نہ کرے۔

اگر کہا جائے کہ کتنے ہی وارثان مقتول ایسے ہیں جو ناکام رہے اور انہیں ان کا حق نہیں ملا۔ اس کا جواب یہ ہے تقویت یا تو دلیل کے قوی ہونے سے حاصل ہوتی ہے یا پورا حق مل جانے سے یا تیسری صورت یہ ہے کہ دونوں باتیں ہو جائیں۔ ان میں سے جو کچھ بھی ہو جائے وہی اللہ تعالیٰ کی نصرت ہے اور مقتول کے ولی کو نصرت عطا فرمانا اسی اعتبار سے ہے۔

ضحاک کہتے ہیں کہ قتل کے بارے میں نازل ہونے والی یہ پہلی آیت ہے۔ واضح ہو کہ قصاص یا دیت جو مقتول کی جان یا جسم کے عوض لاگو ہوتا ہے اس کی شرط یہ ہے کہ اس نے قتل یا

جرم قتل کے بارے میں سلطان (حکومت) کے اختیارات کا بیان

یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اگر مطالبہ قصاص کے حقدار قتل کے مجرم کو معاف کر دیں تو ان کے بری ہو جانے سے امن کو خطرہ لاحق ہو جائے گا کیونکہ جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ مطالبہ خون کا حقدار (ولی) اکثر حالات میں تو قصاص لینے ہی پر اصرار کرتا ہے۔ اگر بالفرض وہ معاف بھی کر دے اور حکومت کی رائے میں اس کے چھوڑ دینے سے امن عامہ کے غارت ہو جانے کا اندیشہ ہے تو حاکم کو حق ہے کہ مجرم کو جو سزا بھی چاہے دے اور یہ ضروری ہے کہ اس وقت تک اسے نگرانی میں رکھے کہ وہ زیادتی نہ کرنے پائے یہاں تک کہ اسے یقین ہو جائے کہ اس کا رویہ درست ہو گیا ہے۔ شریعت اسلامیہ کی خوبی اور جزیری یہ ہے کہ اس نے قتل کی سزا میں قصاص رکھا ہے اور حاکم کو اختیار دیا ہے کہ اگر خون بہا کے حقدار معافی دیں تو وہ قبول کرے۔ اس کی تفصیل کتب فقہ میں ملاحظہ ہو یہاں اس کی گنجائش نہیں ہے۔^(۱)

جراحت رسانی کے لئے ایسی شے سے حملہ کیا ہو جس سے بالعموم قتل واقع ہو جاتا ہے۔ یا ایسی شے سے حملہ کیا جائے جو بالعموم جان لیوا نہیں ہوتی۔ یا کوئی ایسا اقدام کیا جائے جو موجب ہلاکت ہو اور مقتول قرار دیئے جانے کی شرط یہ ہے کہ وہ بے قصور ہو (مستوجب قتل نہ ہو) قاتل وہ قرار پائے گا جو مکلف ہو (جس پر احکام شرعیہ لاگو ہوتے ہوں)۔

۱۔ اگر قتل عمد کے مجرم کو معاف کر دیا جائے تو آیا سلطان (حکومت) کو اس پر کوئی اختیار رہتا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔

مالکیہ اور حنفیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ اگر مطالبہ خون کا حق رکھنے والا معاف کر دے تب بھی سلطان (حکومت) کو اختیار رہتا ہے کہ وہ قاتل کو سو دروں کے ضرب کی سزا دے یا پورے ایک سال کی قید کرے۔ مدینے کے لوگ بھی (ان پر صلوٰۃ و سلام ہو) یہی کہتے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی یہی مروی ہے۔

شافعیہ اور حنابلہ رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ حاکم کے لئے ان باتوں میں سے کسی پر عمل کرنا واجب نہیں ہے بجز اس صورت کے جبکہ قاتل شریعت پرستی اور اذیت رسانی میں مشہور ہو۔ ایسی صورت میں امام (حاکم) کے لئے جائز ہے کہ اپنی رائے کے مطابق اس کی سزائیں کرے: اسے قید کر دے یا سزائے ضرب دے یا شہر بدر کر دے اس بارے میں ان کی دلیل شریعت کے احکام ہیں۔

اگر قاتل دیوالیہ ہو جانے کے باعث مالی معاملات کا نا اہل قرار دیا جائے تو اسے مطالبہ سے معاف نہیں کیا جاسکتا جبکہ دونوں باتوں (یعنی قصاص یا خون بہا) میں سے کوئی ایک بات اس پر واجب کر دی گئی ہو لیکن کوئی ایک سزا متعین نہ کی ہو۔ (معاف نہ ہونے کا) سبب یہ ہے کہ ایسے شخص کے ساتھ سلوک عطا ممنوع ہے۔ اگر سزا میں قصاص کی تعیین کی گئی ہو اور دیت معاف کی جائے تو زیادہ سے زیادہ مال واجب الادا ہوگا لیکن اگر مطلقاً معافی دے دی گئی تو تاوان بھی نہ رہے گا۔ اگر نا اہل معاملہ (یاد یوالیہ) کو اس بناء پر معافی دی گئی کہ اس کے پاس بالکل مال نہیں ہے تو کوئی مال واجب

نہ ہوگا کیونکہ قتل سے مال واجب نہیں ہوتا۔

کہا جاتا ہے کہ مفلس (نادار یا دیوالیہ) سے قصاص لینا اور یا درگزر کر دینا (دونوں باتیں) درست ہیں اور مفلس کو جب تک نا اہل معاملہ نہ قرار دیا جائے گا صاحب حیثیت تصور کیا جائے گا اور مجھ علیہ (یعنی جسے نا اہل معاملہ قرار دیا جائے گا) مفلس ہے کیونکہ اس کا قول بے معنی ہوتا ہے جیسے بچے (نابالغ) یا جنون زدہ کا قول کہ ان کا معاف کر دینا لغو ہے اور فضول خرچ انسان کو اگر فضول خرچی کی بناء پر نا اہل معاملہ قرار دیا جائے تو مطالبہ قصاص یا اس سے درگزر کرنے کے بارے میں وہ خوش اطوار کی مانند تصور ہوگا کیونکہ اسے نا اہل قرار پانے کی ذمہ داری خود اس پر عائد ہوتی ہے کسی اور پر عائد نہیں ہوتی لہذا (قاتل پر) دیت واجب نہ ہوگی بشرطیکہ وہ قصاص یا دیت کو معاف کر دے۔

قاتل کے وفات پا جانے کا بیان

حنفیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے کسی کو عداً قتل کر دیا ہے حکم قصاص اس پر لاگو ہو گیا اور (قبل از قصاص) وہ شخص اپنی موت بغیر کسی کے تشدد کئے مر گیا تو اس کے بعد قصاص اور دیت کے مطالبہ کا حق رکھنے والوں کا یہ تمام حق جاتا رہے گا اور قاتل کے وارثوں کے ذمہ کچھ عائد نہ ہوگا۔ کیونکہ جس پر مطالبہ عائد ہوتا تھا وہ فوت ہو گیا۔

شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ قتل عداً کا مرتکب (سزائے جرم پانے سے پہلے) اگر مر جائے تو (ورثائے مقتول کا) حق مطالبہ ساقط نہ ہوگا بلکہ خون بہا قاتل کے ورثاء سے وصول کر کے مقتول کے ورثاء کو ادا کیا جائے گا جنہیں مطالبہ کرنے یا معاف کر دینے کا حق ہے۔ کیونکہ ان اصحاب کے نزدیک دونوں باتوں (یعنی قصاص یا خون بہا) میں سے کسی ایک بات پر عمل در آمد واجب ہے۔ اب چونکہ (ان دونوں میں سے) قصاص لینا ممکن نہ رہا تو دیت (خون بہا) واجب رہا تا کہ خون جو ہوا ہے وہ رانگاں تصور نہ ہو۔ اسی طرح باپ اگر اپنے بیٹے کو یا آقا اپنے غلام کو قتل کر دے اور قصاص لینا ممکن نہ ہو تو حکم قصاص دیت (تاوان یا خون بہا) کی طرف منتقل ہو جائے گا۔

مطالبہ خون کے حقداروں میں معافی کے بارے میں اختلاف کا بیان

فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کسی مسلمان کو جو واجب القتل نہیں ہے عداً قتل کر دیا جائے اور قاتل مکلف اور ذی عقل ہے اور مقتول کا باپ یا دادا نہیں ہے اور مقتول کی اولاد ذرینہ عاقل و بالغ موجود ہے اور اس نے قاضی کی عدالت میں حاضر ہو کر قصاص کا مطالبہ کیا تو حاکم پر واجب ہے کہ بلاتا خیر فوری طور پر حکم نافذ فرما دے ہاں اگر مجرمہ باردار عورت ہو تو اس حکم قصاص کے نفاذ میں وضع حمل ہونے اور بچے کو دودھ پلانے کی مدت تک تاخیر کی جائے۔

اگر اس مقتول کی اولاد قصاص کے مطالبہ سے گر کر دیت (خون بہا) کا مطالبہ کرے تو قاتل کے مال سے اس کی ادائیگی واجب ہے۔ گو مجرم اس پر راضی نہ ہو لیکن اگر مطالبہ کے حقداروں میں باہم اختلاف ہو کہ ان میں سے بعض تو قصاص کا مطالبہ کریں اور بعض مرتکب کو معاف کرنا چاہیں تو قصاص باطل ہو جائے گا اور قاتل کے مال سے دیت کی ادائیگی واجب ہوگی جو وصول کر کے ورثاء میں تقسیم کر دی جائے گی۔ گو اس پر بعض ورثاء راضی نہ ہوں کیونکہ (خون بہا) جو واجب ہے وہ تو تقسیم ہو سکتا ہے لیکن (قصاص ناقابل تقسیم ہے۔ لہذا اس کے ساقط ہو جانے کا پہلو غالب ہے تا کہ خون کرنے سے بچا جاسکے انسانی خون قابل احترام ہے پھر یہ کہ حدود شبہ کی صورت میں ساقط ہو جاتی ہیں یہاں یہی صورت ہے کہ

قاتل پر قصاص کے لاگو ہونے میں شبہ ہے (کیونکہ بعض ورثاء معاف کرنا چاہتے ہیں) لیکن اگر وارثوں میں مرد اور عورت ہوں اور وہ معاف کر دینے یا حد قصاص کے لاگو کرنے یا دیت کے وصول کرنے اختلاف رکھتے ہوں ایسی صورت میں ائمہ فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔

مالکیہ رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ اگر حقدار ورثاء میں سے ایک مرد بھی معاف کر دے تو قصاص کا حکم ساقط ہو جائے گا بشرطیکہ معاف کرنے والا درجہ اور حق میں دوسرے ورثاء کے برابر ہو مثلاً مقتول کے دو بیٹے یا دو چچا یا دو بھائی ہوں یا پھر معاف کرنے والا مقدم ہو مثلاً بیٹا مقدم ہے بھائی پر۔ اگر معاف کرنے والا درجے میں دوسروں سے نچلے درجہ میں ہو تو اس کے معاف کرنے کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ مثلاً مقتول کا بیٹا ہوتے ہوئے بھائی معاف کرے۔ اسی طرح وہ صورت ہے جب کہ معاف کرنے والے کا حق دوسروں کے برابر نہ ہو مثلاً ماں شریک بھائی اور باپ شریک بھائی ہیں تو مطالبہ کا حق اس مرد کو حاصل ہے جو صلی قرابت دار ہو۔ اس بارے میں بیوی ماموں یا نانا کا دعویٰ نہیں ہو سکتا پس اس میں قریب ترین اس کے بعد قریب ترین وارث مقدم ہے۔ لہذا پوتے سے بیٹا مقدم ہے البتہ قریب ترین دادا اور بھائی قصاص لینے یا معاف کرنے میں مساوی درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن بھائی کی موجودگی میں اوپر کے دادا (یعنی پڑدادا یا سگدادا) کو حق مطالبہ نہیں ہے لیکن اگر مطالبہ خون کا حق صرف عورتوں کو پہنچتا ہو یا اس طور کہ درجہ میں ان کے مساوی (مقتول کا) کوئی صلی رشتہ دار نہ ہو یا ہو مگر نچلے درجہ میں ہو تو مقتول کی بیٹی یا پوتی معاف کرنے یا نہ کرنے کا حق بہن سے زیادہ رکھتی ہے پس اگر گواہوں کی گواہی یا مجرم کے اقرار سے ثابت شدہ قتل پر (بیٹی یا پوتی) قصاص کا مطالبہ کرے یا معاف کر دے تو بہن کو اس میں مداخلت کا حق نہیں ہے اگرچہ بہن ورثہ میں بیٹیوں کے برابر حق رکھتی ہے۔ اس کو دیت (خون بہا) میں سے بھی کچھ نہ ملے گا تاہم اگر قصاص کے بارے میں باہمی تصفیہ کی ضرورت پڑے تو ان کو یعنی بیٹی یا پوتی کو تصفیہ کا اختیار نہیں ہے۔ کیونکہ قتل عمد کی صورت میں صرف مرد رشتہ دار تصفیہ کر سکتے ہیں عورتوں کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ چنانچہ اگر مردوں نے مصلحت کی اور قتل کا فیصلہ کیا اور بیٹی معاف کر دے تو اس کی معافی کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ قصاص کے بارے میں صرف مرد رشتہ دار کی بات مانی جائے گی۔ ہاں اگر مرد معاف کر دیں اور بیٹی خون کا بدلہ چاہتی ہے تو مردوں کے معاف کرنے کو اہمیت نہ دی جائے گی۔ اور بیٹی کے مطالبہ خون کو تسلیم کیا جائے گا۔ غرض اگر تمام مرد (خون) چاہیں یا کوئی بیٹی اور مردوں میں سے کوئی مرد قصاص چاہتا ہو تو معافی نہیں ہو سکتی۔

اگر کوئی بیٹی، پوتی یا بہن قصاص معاف کر دے اور کوئی مرد قرابت دار نہ ہو یا ہو لیکن اسے بدیں جہت مداخلت کا حق نہ ہو کہ بیٹی کا درجہ اس سے اونچا ہے اور قتل گواہوں یا اقرار سے ثابت ہو ایسی صورت میں حاکم ہی کو عصبہ یعنی مرد قرابت دار (تصور کیا جائے گا جیسا کہ وارثوں سے بچے ہوئے ترکہ کو حاکم ہی وصول کر کے بیت المال (سرکاری خزانہ) میں داخل کرتا ہے۔ پس اس صورت میں بھی حاکم اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کرے گا یعنی چاہے تو بیٹی کے معاف کرنے پر مجرم کو بری کر دے یا اس کی معافی کو رد کر دے۔

اگر (پسماندگان مقتول میں) مرد بھی ہوں اور عورتیں بھی جو عورتوں میں اونچے درجہ پر ہوں اور انہیں میراث کی پروانہ ہو تو مجرم کو قصاص سے بری نہیں کیا جاسکتا تا آنکہ دونوں فریق (مرد و زن) معاف نہ کر دیں۔ اگر فریقین میں سے کوئی فریق یا کوئی فرد قصاص کا مطالبہ کرے تو وہ مان لیا جائے گا۔ مطالبہ خون کے حقداروں میں سے کوئی بھی جس کا درجہ

دوسروں کے برابر ہے معاف کر دے اور قتل قطعی طور پر گواہوں وغیرہ سے پایہ ثبوت کو پہنچ گیا ہو تو قصاص ساقط ہو جائے گا اور جب قصاص ساقط ہو جائے تو اس وارث کو جس نے معاف نہیں کیا تھا قتل عمد کے خون بہا سے اپنے حصہ کے مطالبہ کا حق ہے۔ اسی طرح اگر دعویٰ داروں نے یکے بعد دیگرے معاف کیا تو معاف کرنے والے کا حق مطالبہ خون اور مطالبہ خون بہا ختم ہو جائے گا باقی خون بہا دعویٰ دار کا حق اور مثلاً خاوند یا بیوی یا بھائی اور وہ جسے خون بہا میں سے اپنے حصہ کے مطالبہ کا حق نہیں ہے مثلاً بیٹا بیٹی کیونکہ یہ مال وہ ہے جو پہلے شخص کے قصاص معاف کرنے پر واجب الادا ہوا ہے۔ بخلاف اس کے اگر سب نے فوری طور پر بیک وقت قصاص کو معاف کر دیا تو کسی دعویٰ دار کو کوئی حق نہ رہے گا اور یہ ایسا ہی ہوگا جیسے ایک ہی دعویٰ دار ہو اور اس نے معاف کر دیا ہو۔ جیسا کہ خون کے وارثوں میں ہوتا ہے (کہ اگر ایک شخص معاف کر دے تو پھر کسی اور کو مطالبہ خون کا حق نہیں رہتا) اسی طرح اگر کسی شخص کے دو بیٹوں میں سے ایک نے اپنے باپ کو قتل کر دیا اور اس کے بعد ہی دوسرا بھائی جس نے قتل نہیں کیا تھا مر گیا اور قاتل کے سوا اس کا کوئی وارث نہیں تو قاتل خود ہی اپنے قتل کے پورے خون بہا کا وارث ہوگا۔ اسی طرح قاتل خون بہا کے کچھ حصہ کا وارث ہوگا جب کہ قتل نہ کرنے والے (ورثاء) میں ایک سے زیادہ وارث ہوں اور ان میں سے کوئی ایک شخص قاتل اور کسی اور وارث کو چھوڑ کر وفات پا جائے تو اس صورت میں قاتل (پورے خون بہا کی بجائے) صرف اپنے حصہ کا وارث ہوگا۔ غرض قصاص کے ساقط ہو جانے پر باقی ماندہ ورثاء کو خون بہا سے ان کا حصہ ملے گا یہ حکم اسی صورت میں ہے جب کہ باقی ماندہ وارث خود معاف کرنے کا مجاز ہو۔ لیکن اگر مستقل وارث نے معافی دے دی تو اس کی طرف سے قصاص ساقط نہ ہوگا جو ایک حصہ کا وارث ہوتا آنکہ تمام ورثاء معاف نہ کر دیں۔ چنانچہ اگر حقیقی بھائی نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا اور مقتول نے قاتل کے علاوہ اپنے تین بھائیوں کی بیٹیاں چھوڑیں اور تین بھائیوں میں سے ایک وفات پا گیا تو قاتل (خود بھی) اپنے خون بہا کے ایک حصہ کا حقدار ہوگا اور قصاص اسی صورت میں معاف ہوگا جب کہ سب یا ان میں سے کوئی ایک معاف کر دے۔

تین امام اس بات پر متفق ہیں کہ قصاص کے ساقط کرنے اور خون بہا میں سے اپنا حق چھوڑ دینے یا اس کے مطالبہ اور وصول کرنے کے بارے میں (وارثوں میں سے) ہر ایک کی بات تسلیم کی جائے گی۔

امام شافعی کہتے ہیں کہ (ہر وارث) موجود ہو یا نہ ہو۔ چھوٹا ہو یا بڑا ہو۔ مرد ہو یا عورت ہو قتل عمد کے خلاف مطالبہ خون کا حق رکھتا ہے کیونکہ قتل (خون) اور خون بہا دونوں یکساں (حیثیت کے) ہیں۔

مقتول کا مرنے سے پہلے اپنے خون کو معاف کر دینا

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی بالغ عاقل اور بے گناہ نے ایک شخص سے کہا کہ اگر تو مجھے قتل کر دے تو میں اپنے خون کا دعویٰ چھوڑتا ہوں اور اس شخص نے اسے قتل کر دیا تو قاتل کے ذمہ سے قصاص ساقط نہ ہوگا۔ یا کسی نے اپنے زخمی کرنے والے سے جب کہ وہ ابھی جائے واردات سے باہر نہیں گیا تھا کہا کہ میں تجھے اپنے خون سے بری کرتا ہوں تو قصاص سے بری نہ ہوگا کیونکہ اس نے حق واجب ہونے سے پہلے اس حق کو ساقط کر دیا (جو درست نہیں ہے) بخلاف اس کے اگر مجرم کے جائے واردات سے چلے جانے کے بعد یہ بات کہی یا یوں کہا کہ اگر میں مر جاؤں تو تیرے خلاف میں کوئی دعویٰ نہ کروں گا تو مجرم اس جرم سے بری ہو جائے گا اگرچہ مجرم کے جائے واردات سے جانے سے پہلے کہا ہو۔ لیکن یہ درگزر رزخی

ہونے کے بعد ہی ہو سکتا ہے تاہم مقتول کے ولی کو قصاص کے مطالبہ یا بلا تاوان معاف کر دینے کا حق ہے اور تاوان لے کر بھی معاف کر سکتا ہے بشرطیکہ مجرم راضی ہو۔ اگر وہ دیت کے ادا کرنے پر تیار نہ ہو تو ولی کو قصاص کا مطالبہ کرنے یا بلا معاوضہ درگزر کرنے کا حق ہے۔ اگر اس نے غیر مشروط معافی دے دی تو بلا معاوضہ معافی کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔ سوا اس صورت کے جب کہ حالات کے قرائن سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ ولی کا ارادہ خون بہا لے کر معاف کرنے کا ہے یا وہ کہے کہ ”میں نے خون بہا وصول کرنے کے لئے معافی دی ہے“ ولی کے حلف اٹھالینے پر اس کی بات تسلیم کر لی جائے گی اور ولی کے حلف اٹھانے کے بعد اگر مجرم ادائے دیت سے باز رہے تو اسے قصاص کے مطالبہ کا حق ہے بصورت دیگر اسے خون بہا ادا کر کے ہی مطالبہ ولی کے مطابق معافی حاصل ہو سکے گی۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر مکلف انسان (جس پر احکام شریعت عائد ہوتے ہوں خواہ سمجھدار ہو یا احمق ہو) کسی شخص سے مثلاً یہ کہے کہ ”تو میرا یہ ہاتھ کاٹ دے“ اور وہ شخص یہ کر گزرے تو اس کی یہ حرکت رائگاں ہے اس پر نہ قصاص ہے نہ خون بہا کیونکہ اس کی اجازت اس نے خود دی تھی اور اپنے حق سے دست بردار ہو گیا تھا۔

اگر اس زخم کا اثر جان لیوا ثابت ہو اور زوہ مرہ جائے یا اس نے پہلے ہی کسی سے کہا تھا کہ مجھے قتل کر دو اور اس نے قتل کر دیا تو بقول ظاہر وہ قتل رائگاں ہوگا (اور اس کی باز پرس نہ ہوگی) کیونکہ یہ کام زخمی ہونے والے کی خواہش کے مطابق کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس صورت میں قاتل پر خون بہا واجب ہے۔ اس اختلاف کی بنا اس سوال پر ہے کہ آیا یہ خون بہا میت کی وفات کے آخری لمحہ میں پہلے اس میت کا حق ہوتا ہے پھر اس کا وارث اس دیت کو وصول کرتا ہے یا مقتول کے ختم ہو جانے پر براہ راست وارث کا حق ہوتا ہے؟ اگر پہلی بات کو تسلیم کیا جائے جو زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے تو دیت واجب ہی نہیں ہوگی کیونکہ یہ سرایت زخم کے دوران کی بات ہے اور یہ فعل وہ ہے جس کی اجازت مالک نے دے دی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دیت واجب ہو جاتی چنانچہ اگر عضو کاٹ جائے تو نصف تاوان واجب ہوگا کیونکہ یہ امر سرایت زخم کے دوران واقع ہوا۔ اور اس صورت میں جبکہ مقتول نے پہلے ہی قتل کے لیے کہا (اور قتل ہو گیا) تو خون بہا واجب ہوگا لیکن قول سابق کے مطابق خون بہا تو ساقط ہو جاتا ہے لیکن صحیح ترین قول کے مطابق کفارہ واجب ہوگا کیونکہ یہ حق اللہ ہے اور چونکہ اس کی اجازت غیر موثر ہے لہذا یہ کفارہ بہر حال واجب ہوگا۔ اگر کسی نے ایک شخص سے یوں کہا کہ تو مجھے قتل کر دے ورنہ تجھے جان سے مار دوں گا اور اس شخص نے قتل کر دیا تو بقول غالب نہ اس کا قصاص ہے اور نہ دیت (خون بہا) ہے۔

اگر کسی نے ایک شخص کا کوئی عضو کاٹ دیا تو اس کا تاوان (کاٹنے والے پر) واجب ہو گیا پھر اگر اس شخص نے اور اس کے وارثوں نے تاوان سے دست برداری کر لی اور زخم نے زیادہ سرایت نہیں کیا کہ زخم مندمل ہو گیا تو قصاص یا جرمانہ کچھ عائد نہ ہوگا کیونکہ جو حق ثابت ہوا تھا وہ ساقط ہو گیا۔ لیکن اگر وہ زخم جان لیوا ثابت ہوا تو جان یا عضو بدن کا کوئی قصاص نہیں ہے کیونکہ یہ اس زخم کا نتیجہ تھا جو معاف کر دیا گیا ہے لہذا قصاص امر مشتبہ ہو گیا (جس کی وجہ سے جرم کی سزا ساقط ہو جاتی ہے) پھر اگر وہ زخم دوسرے عضو پر سرایت کر جائے تو اس عضو کا کوئی معاوضہ نہ ہوگا اگرچہ پہلا جرم (جراحت رسانی) معاف نہ کیا گیا ہو۔

واضح ہو کہ اگر مجروح نے مجرم کو معاف کرنے کے لیے وصیت کے الفاظ استعمال کیے مثلاً قصاص سے درگزر کرتے ہوئے اس نے کہا کہ ”میں اس جرم کے تاوان کی وصیت مجرم کے حق میں کرتا ہوں“ تو اس وصیت کا فائدہ قاتل کو

ملے گا۔ اور اگر یہ الفاظ کہے کہ میں اس کو بری کرتا ہوں یا تاوان سے درگزر کرتا ہوں یا یہ کہا کہ میں نے اس کے جرم کو معاف کیا تو تاوان قطعاً ساقط ہو گیا۔ نیز یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان ہر سہ گانہ الفاظ کو وصیت ہی قرار دیا جائے گا۔ اور اس کا نفاذ ایک تہائی ورثہ کے اندر ہوگا اور معاف کردہ عضو کے تاوان میں زیادتی واجب ہوگی جبکہ یہ زیادتی سرایت زخم کے تاوان کو پورا کرنے کے لئے ہو۔ خواہ مجروح نے اپنی معافی میں سرایت زخم کا ذکر کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ ایک اور قول کے مطابق اگر مجروح نے اپنی معافی میں اس خرابی کا ذکر کر دیا ہے جو جرم کے ارتکاب سے پیدا ہوئی تو اب تاوان میں اضافہ نہیں کیا جاسکتا اور زیادہ قوی خیال یہی ہے کہ اضافہ ساقط نہ ہو۔ کیونکہ کسی شے کے وجود میں آنے سے پہلے اسے ساقط کر دینا درست نہیں ہے۔ پس اگر قطع عضو کا قصاص اور جرمانہ معاف کر دیا لیکن اس کا زخم دوسرے عضو تک سرایت کر گیا مثلاً انگلی کا ٹی اور وہ زخم ہتھیلی کے باقی حصہ میں سرایت کر گیا اور کٹے ہوئے عضو کا زخم بھر گیا تو مجرم صرف اس حصہ کے تاوان کا ذمہ دار ہوگا جو اصل زخم سے متاثر ہوا ہے کیونکہ اس نے صرف موجودہ جرم کے تاوان کو معاف کیا ہے اس کے علاوہ اور عضو کے نقصان کو معاف نہیں کیا۔ اگر کسی نے ایک شخص کے عضو کو جراحت پہنچائی اور اس کا زخم سرایت کر جانے کے باعث مجروح کی جان جاتی رہی مثلاً کسی کا ہاتھ کاٹا اور اس کا زخم (جسم کے دوسرے حصوں میں) سرایت کرنے کے باعث وہ شخص مر گیا اور ولی نے اس کا خون معاف کر دیا تو اب مجرم کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ وہ قتل کا مستوجب تھا جو معاف ہو چکا ہے ہاتھ کا کاٹنا تو محض ایک طریقہ قتل تھا یا اگر ولی نے قطع عضو کے جرم کو (جس کے باعث موت واقع ہوئی) معاف کر دیا تو اسے اصولی طور پر مجرم کی گردن مارنے کا حق ہے کیونکہ اسے دونوں باتوں (یعنی معافی دینے اور سزا دینے) کا حق ہے لیکن فائدہ باز رہنے میں ہے کیونکہ مجرم ہلاکت آفریں جراحت رسانی کے باعث مستوجب قتل ہے اور اس کو اس نے معاف کر دیا اگر ولی نے (جراحت رسانی کی پاداش میں) مجرم کا ہاتھ کاٹ دیا اور بلا معاوضہ مجرم کا خون بخش دیا یا معاوضہ لے کر معاف کر دیا۔ لیکن یہ ہاتھ کاٹنا ہلاکت آفریں ثابت ہوا تو ظاہر ہے کہ معاف کرنا بے سود رہا زخم کا سرایت کرنا ہی قصاص بن گیا کیونکہ وقوع قصاص کا ذریعہ (سرایت زخم) معافی سے پہلے لاحق ہوا اور اس کا نتیجہ (یعنی ہلاکت) مرتب ہو گیا تو یہ معافی بیکار ہو کر رہ گئی اور اگر ہاتھ کے زخم نے جسم میں سرایت نہیں کیا بلکہ جان بچ رہی تو معاف کرنا درست ہے اور اس معافی سے قصاص ساقط ہو جائے گا اور معاف شدہ عضو رہ جائے گا کیونکہ محض ہاتھ کاٹ دینے سے پورا خون بہا وصول نہیں ہو جاتا اور ہاتھ کاٹنے سے ولی کو کچھ حاصل نہ ہوگا۔

اگر ولی نے تکمیل قصاص کے لیے کسی شخص کو اپنا وکیل بنایا اور بعد میں اس نے تو قصاص کو معاف کر دیا لیکن وکیل کو اس کی خبر نہ ہوئی اور اس نے قصاص لے لیا تو وکیل پر قصاص عائد نہ ہوگا کیونکہ وہ معذور تھا اور زیادہ قوی بات یہ ہے کہ اس پر خون بہا واجب ہوگا کیونکہ یہ امر ظاہر ہے کہ اس کا قتل ناحق ہوا لہذا مؤکل پر نہیں بلکہ وکیل پر واجب ہے کہ مجرم کے وارثوں کو بھاری خون بہا ادا کرے اور صحیح قول اس باب میں یہ ہے کہ تاوان واجب الادا کا مطالبہ کسی اور سے نہیں کر سکتا۔ خواہ مؤکل کو معافی کی بابت وکیل کو مطلع کرنا ممکن رہا ہو یا نہ رہا ہو۔ کیونکہ اس نے معافی دے کر نیکی کا کام کیا ہے۔ اگر کسی عورت پر قصاص واجب ہو اور قصاص کی معافی کے عوض اس سے شادی کر لی جائے تو یہ امر جائز ہے اور اس سے قصاص ساقط ہو جائے گا اور اگر مباشرت سے پہلے اس عورت سے علیحدگی ہو گئی تو وہ عورت سے نصف خون بہا واپس لے سکے گا۔

حنفیہ اور حنابلہ رحمہم اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ اگر مقتول، قتل عمد کے مرتکب کو اپنا خون معاف کر دے تو یہ وارثوں کے حق میں جائز ہے اور قاتل کا قصاص ساقط ہو جائے گا اس کے بعد وارثوں کو کچھ بھی ادا کرنا واجب نہیں ہے۔ کیونکہ وارثوں کا جو حق ہوتا ہے وہ حق پہلے مقتول کا ہوتا ہے اور وارث اس کا قائم مقام اور نائب ہوتا ہے اور مقتول کو اختیار ہے کہ وہ جسے چاہے اسے اپنی وفات کے بعد اپنا قائم مقام بنالے۔

تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ آیت ”فمن تصدق به فهو كفارة له“ یعنی جو شخص خون بہا صدقہ میں دے دیتا ہے وہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔

یہ آیت اس مقتول کے بارے میں ہے کہ جو اپنے خون کا صدقہ کر دیتا ہے، اور یہ عمل اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ وہ موت سے پہلے اپنے ہوش و حواس میں ہو اور اس بارے میں اختلاف ہے کہ ”فهو كفارة له“ میں ضمیر لہ کا مرجع کیا ہے؟ کہا جاتا ہے کہ یہ ضمیر قاتل کی طرف لوٹی ہے کہ وہ نائب ہو جائے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ ضمیر مقتول یا مجروح کی طرف پھرتی ہے کہ اگر اس نے قاتل کا خون یا جراحت رسانی کی صورت میں اپنے کسی عضو کا قصاص، قاتل یا جارج کو صدقہ کر دیا تو یہ صدقہ اس کے اپنے گناہوں اور خطاؤں کا کفارہ ہو جائے گا، چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آیت ”فمن تصدق به“ کے بارے میں مروی ہے وہ کہتے ہیں ”فمن عفا عنه وتصدق عليه، فهو كفارة للمطلوب، واجر للمطالب“ (یعنی جس نے مجرم کی خطا معاف کر دی اور قصاص کا صدقہ کر دیا تو یہ امر حق مطالبہ کی تطافی اور مطالبہ کرنے والے کے لیے موجب اجر ہے)۔ اور حضرت جابر بن عبد اللہ سے ارشاد باری ”فمن تصدق به فهو كفارة له“ کے بارے میں مروی ہے کہ یہ آیت مجروح کے حق میں ہے کہ (حق مطالبہ کا) صدقہ کر دینے سے صدقہ کی حیثیت کے مطابق مجرم کے گناہ دھل جاتے ہیں، شععی نے ایک شخص سے جو مجلس میں حاضر تھا روایت کیا ہے کہ ارشاد باری ”فمن تصدق به فهو كفارة له“ کے بارے میں حضور نے فرمایا ”هو الذي تكسر سنه، او تقطع يده، او يقطع الشئ منه او يجرح في بدنه فيعفو عن ذلك“ (یعنی اس سے مراد وہ شخص ہے جس کا دانت توڑ دیا گیا ہو یا اس کا ہاتھ کاٹ دیا ہو یا اس کا کوئی عضو جدا کر دیا ہو یا اسے زخم پہنچایا ہو اور اس نے معاف کر دیا ہو) نیز فرمایا ”فيحط عنه خطاياہ، فان كان ربع الدية فربع خطاياہ، وان كان الثلث، فثلث خطاياہ، وان كانت الدية حطت عن خطاياہ كذلك“ (یعنی اس طرح معاف کر دینے سے معاف کرنے والے کی خطاؤں کو معاف دیا جاتا ہے۔ پس اگر دیت کا چوتھائی حصہ معاف کیا تو ایک چوتھائی خطائیں اور اگر تیسرا حصہ معاف کیا ہے تو ایک تہائی خطائیں اور اگر پوری دیت بخش دی ہے تو ساری خطائیں مٹا دی جائیں گی اور اسی طرح) اور امام احمد سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم سے حضرت وکیع نے بتایا کہ انیس یونس بن ابوالسخت نے اور ان کو ابوالسفر نے بتایا کہ قریشیوں میں سے ایک شخص نے ایک انصاری کا دانت توڑ دیا۔ اس کے خلاف حضرت معاویہ کے سامنے دعویٰ پیش ہوا حضرت معاویہ نے فرمایا کہ ہم اس کا راضی نامہ کرائے دیتے ہیں لیکن اس انصاری نے دعوے پر اصرار کیا حضرت معاویہ نے فرمایا تم اپنے ساتھی سے معاملہ طے کر لو، وہاں پر حضرت ابوالدرداء بیٹھے ہوئے تھے ابودرداء نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے انہوں نے فرمایا ہے ”ما من مسلم يصاب بشئ من جسده فيتصدق به الا رفعه الله به درجة، وحط به عنه خطيئته“ (یعنی کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ ایک مسلمان کو جسمانی ایذا پہنچائی گئی اور اس نے بخش دیا ہو، اللہ تعالیٰ نے اس مسلمان کا ہر گناہ بخش دیا اور اس کی

خطاؤں کو معاف نہ کیا ہو) اس پر اس انصاری نے کہا میں نے اسے معاف کر دیا۔

حضرت عدی بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عہد معاویہ میں ایک شخص تھا جس کا منہ کسی نے توڑ دیا وہ اس کی دیت دینے لگا اس شخص نے تاوان لینے سے انکار کر دیا کہ میں تو اس کا قصاص لوں گا، اس شخص نے دگنا تاوان دینا چاہا لیکن اس نے انکار کیا اس نے تنکا پیش کیا پھر بھی اس نے انکار کیا اس وقت آنحضرت ﷺ کے ایک صحابی نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے ”من تصدق بدم فما دونہ، ہو كفارة له، من يوم ان ولد، الی يوم يموت“ (یعنی جو شخص پوری دیت یا اس سے کم بھی معاف کر دے تو اس کے یوم پیدائش سے مرتے دم تک کے لیے کفارہ گناہ ہو جائے گا) اس بارے میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی نے ایک شخص کا ہاتھ قطع کر دیا اور اس شخص نے اس جرم قطع کو تو معاف کر دیا لیکن اس کے بعد وہ شخص (اس تکلیف سے) مر گیا تو مجرم کے ذمہ اس کے مال سے دیت عائد ہوگی۔ ہاں اگر (مجروح نے) اس جرم قطع کے ساتھ اس سے پیدا ہونے والے نتائج (یعنی سرایت زخم یا موت) کو بھی معاف کر دیا تھا اور اس کے بعد وفات پا گیا تو وہ معافی خون کی معافی قرار پائے گی چنانچہ اگر (مجرم کی) یہ حرکت غلطی سے سرزد ہوئی تھی تو اس کے مال میں سے ایک تہائی مال سے دیت وصول کی جائے گی اور اگر قصداً مجرم نے ایسا کیا تھا تو اس کے پورے مال میں سے دیت وصول کی جائے گی کیونکہ اگر ”مجروح“ نے کاٹنے، توڑنے یا جراحت رسانی کو معاف کر دیا ہے تو یہ معافی اس کے بعد اس سے پیدا ہونے والے نقصانات کو معاف کرنا نہیں ہے اگر ان میں سے کوئی بات سرزد ہوئی اور زخم کھانے کے بعد مجروح نے اسے معاف کر دیا ہے پھر اس زخم نے سرایت کیا اور موت واقع ہو گئی تو مجرم کے ذمہ اس کے اپنے مال میں سے تاوان واجب ہو گا۔ کیونکہ تاوان کے عائد کیے جانے کا سبب ”یعنی قابل قدر جان کا ناحق قتل ہونا“ موجود ہے اور معافی میں صراحتاً اس قتل کے معاف کرنے کا ذکر نہیں ہے اس نے تو زخم رسانی کے جرم کو معاف کیا ہے جس کو قتل نہیں کہہ سکتے تاہم اس زخم کے سرایت کرنے پر یہ پتہ چلا کہ اس سے قتل واقع ہوا ہے محض زخم نہیں تھا پس مجروح کو اس جبر نقصان کا حق ہے اور اس حق کو اس نے معاف نہیں کیا، جو کچھ معاف کیا وہ اس حق سے درگزر کرنا نہیں ہے، پس اس معافی کو کوئی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ چنانچہ اگر ولی (وارث) زخم کی ہلاکت آفریں سرایت کے بعد کہے کہ میں نے ہاتھ کاٹنے کے جرم کو معاف کر دیا تو اسے معافی قرار نہیں دیا جائے گا، اگر مجروح خود بھی کہے کہ میں نے تیرے اس قتل کرنے کو معاف کر دیا اور مراد اس سے جراحت رسانی کو معاف کرنا تھا تو اس کو معافی تصور نہیں کیا جائے گا (کیونکہ وقوع قتل سے پہلے قتل کا معاف کرنا بے معنی ہے) اسی طرح وہ صورت ہے جبکہ ہاتھ کاٹنے کو معاف کیا ہو اور ہاتھ کے زخم سے موت واقع ہو گئی ہو، چونکہ اس معافی کا کچھ اعتبار نہیں ہے ضمان (یا تاوان) واجب ہوگا۔

قاعدے کی رو سے یہ صورت حال قصاص کی متقاضی ہے، کیونکہ قتل عمد سے قصاص واجب ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں اس کو اس لیے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جس طرح کی معافی دی گئی ہے۔ اس سے مجرم کا ارتکاب قتل مشتبہ ہو جاتا ہے جس کے باعث سزا ساقط ہو جاتی ہے پس مجرم کے مال میں سے صرف تاوان واجب ہوگا۔ صاحبین کہتے ہیں کہ اگر کسی نے ایک شخص کا ہاتھ کاٹ دیا اور اس شخص نے ہاتھ کاٹنے کے جرم کو معاف کر دیا بعد

میں اس زخم کے (جسم میں) سرایت کر جانے کے باعث اس کی موت واقع ہوگئی تو وہ ہاتھ کاٹنے کی معافی جان کی معافی متصور ہوگی اور ہاتھ کاٹنے والے کے ذمہ کچھ عائد نہ ہوگا کیونکہ جس زخم سے قتل ہوا اس زخم کے معاف کر دینے سے قتل کر دینے کی معافی ہوگئی کیونکہ عمل ایک امر عارضی ہوتا ہے وہ باقی نہیں رہتا لہذا عمل کی معافی کا تصور نہیں کیا جاسکتا اور کسی عمل کو معاف کرنا دراصل اس عمل کے نتیجہ کو درگزر کرنا ہے۔ اب اس عمل قطع کا نتیجہ یا تو محض (عضو کا) کٹنا ہے در آنحالیکہ وہ آگے نہ بڑھے اور یا پھر قتل ہے جبکہ وہ زخم (جسم میں) سرایت کر کے موت کا سبب بن جائے۔ پس اس فعل قطع کا معاف کرنا ان دونوں صورتوں کا معاف کرنا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ لفظ قطع (کے مفہوم) میں سرایت کرنے والا اور سرایت نہ کرنے والا دونوں قسم کی جراحت شامل ہے۔ چنانچہ اگر قطع عضو کی اجازت دی جائے تو یہ اجازت عضو کے کاٹنے اور کاٹنے کے بعد جو نتیجہ ہو اس کی بھی اجازت ہے۔ یہاں تک کہ اگر ایک شخص نے کسی سے کہا کہ میرا ہاتھ کاٹ دے پھر اس کے ہاتھ کاٹنے سے اس شخص کی جان جاتی رہی تو کاٹنے والے پر کوئی تاوان عائد نہ ہوگا اور یہ معافی نتیجہ عمل کے اخیر تک رہے گی لہذا اس اجازت کو اس انتہا کی ابتداء تصور کیا جائے گا اور یہ معافی ایسی ہی ہوگی جیسے جرم ہی کو (سرے سے) معاف کر دیا جائے۔ غرض معافی دونوں طرح کے جرموں کو معاف کرنا ہے خواہ وہ جرم محدود ہو یا ہلاکت آفریں ہو۔

امام صاحب کا کہنا ہے کہ یہ امر تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ سرایت کنندہ (ہلاک کنندہ) جراحت بھی جراحت کی ایک صورت ہے اور ہلاکت آفریں زخم بھی زخم ہی کی ایک کیفیت ہے بلکہ ہلاک کرنے والا کا زخم لگانا پہلے ہی سے قتل کرنا ہے کیونکہ قتل اس عمل کو کہتے ہیں جس سے جان جاتی رہے اور جب اس عمل سے جان جاتی رہے تو اسی عمل کو قتل کرنا سمجھا جاتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ہر قطع عضو بحیثیت قطع کے قتل کا موجب نہیں ہوتا، لہذا (قطع کی) معافی میں قتل کی معافی شامل نہیں ہے بخلاف اس صورت کے جبکہ جرم ہی کو معاف کر دیا جائے کیونکہ لفظ جرم اسم جنس ہے (یعنی جرم خواہ کسی قسم کا ہو اس میں شامل ہے) اور بخلاف اس صورت کے جبکہ ”شج“ یعنی (جراحت رسانی) کے ساتھ اس کے نتائج کو بھی معاف کر دیا جائے۔ کیونکہ ان الفاظ کے ساتھ معاف کرنا، گہرے زخم اور نتیجہ قتل کی معافی کے بارے میں صریح ہیں۔ اب اگر غلطی سے عضو کٹ گیا اور اس کے نتیجہ میں جان جاتی رہی تو اسے قتل ہی کے زمرہ میں رکھا جائے گا، جبکہ معافی میں خالی قطع کو اور قطع کے ساتھ اس کے نتائج کو یا جراحت رسانی کو یا جرم ہی کو معاف کیا ہو پھر یہ بھی ہے کہ اگر قطع کو اور اس کے نتائج کو معاف کیا یا جرم ہی کو معاف کر دیا تو بالاتفاق یہ دیت سے درگزر کرنا ہے نیز صاحبین کے نزدیک ارتکاب قطع کو مطلقاً معاف کر دینا دیت سے درگزر کرنا ہے جبکہ یہ قطع غلطی سے واقع ہوا ہو۔ ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ معافی صرف ہاتھ کاٹنے کی صورت میں ہوگی کسی اور صورت میں نہ ہوگی اور صاحبین کے نزدیک اگر جراحت ہلاکت آفرین ہو تو اس کو معاف کر دینا، دیت سے درگزر کرنا ہے اور ابوحنیفہؒ کے نزدیک محض جراحت معاف ہوتی ہے اور کوئی شے معاف نہیں ہوتی اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگر قطع غلطی سے واقع ہوئی تو اس کی دیت مجرم کے ایک تہائی مال میں سے واجب ہوگی ہاں اگر قصد قطع کیا ہے تو مجرم کے تمام مال میں سے دیت واجب ہوگی۔

قتل عمد میں، مال کے عوض مصالحت کرنے کا بیان

ائمہ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر مقتول کے ورثاء قاتل کے ساتھ مال کے عوض صلح کر لیں تو قصاص ساقط ہو

جائے گا اور (اس کے عوض) مال واجب الاداء ہوگا۔ یہ مال مقررہ خون بہا سے کم ہو یا زیادہ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”فمن عفی له من اخیه شیئ فاتباع بالمعروف، واداء الیه باحسان“ (یعنی جس کو اس کے بھائی (یعنی مقتول کے ورثاء) کچھ معاف کر دیں تو چاہیے کہ بھلائی کے ساتھ پیچھا کرے۔ (مال وصول کرے) اور (قاتل) بھی اچھے انداز سے اس کو ادا کرے)۔

جیسا کہ کہا جاتا ہے بقول حضرت ابن عباسؓ، حسن، ضحاک اور مجاہد، یہ آیت مصالحت کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ حرف لام جو آیت کے لفظ لہ میں آیا ہے۔ اس کا یہی مفہوم ہے۔ ’عفی‘ کا لفظ جب لام کے ساتھ آتا ہے۔ (جیسا کہ عفالہ میں ہے) تو اس سے بدل (معاوضہ) مراد ہوتا ہے۔ پس اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ”اگر قاتل سے جو مطالبہ ہے اس میں سے مقتول کا وارث بغرض مصالحت کوئی بات (یعنی خون) نیکی اور خوش کرداری کے خیال سے معاف کر دے تو..... پھر یہ بھی ہے کہ قصاص کا مطالبہ ایک حق ہے جو ورثاء مقتول کو پہنچتا ہے اس حق کو نظر انداز کر کے معاف کیا جاسکتا ہے اور اس کا معاوضہ بھی لیا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں مقتول کے وارثوں کی طرف سے احسان ہوگا اور قاتل کی زندگی بچ جائے گی۔ یہ کام باہمی رضامندی ہی سے ہو سکتا ہے اس میں معاوضہ کا کم ہونا یا زیادہ ہونا یکساں ہے چونکہ مقدار معاوضہ کے بارے میں کوئی نص (صریح حکم) موجود نہیں ہے لہذا اس کا تصفیہ فریقین کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے گا۔ جیسا کہ ’خلع‘ وغیرہ میں ہوتا ہے۔ اگر ادائیگی معاوضہ کے بارے میں فوری یا بتا خیر ادائیگی کا ذکر نہ ہو تو اسے فوری واجب الاداء قرار دیا جائے گا۔ کیونکہ مال معاوضہ باہمی تصفیہ سے طے ہوا ہے اور معاملات میں فی الوقت ادائیگی بنیادی شے ہے جیسا کہ مہر اور کسی شے کی قیمت میں ہوتا ہے بخلاف دیت کے کہ وہ باہمی تصفیہ سے طے نہیں پاتا (بلکہ وہ جرم کی سزا ہے)۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ یہ جائز ہے کہ مجرم قتل عمد کی صورت میں وارث مقتول کے ساتھ اور جراحت رسانی کی صورت میں مجروح کے ساتھ (مال کے عوض) مصالحت کر لے خواہ (مال معاوضہ) مقدار کا تصفیہ دیت سے کم پر ہو یا زیادہ پر اور فوری ادائیگی کی شرط ہو یا بتا خیر ادائیگی۔ معاوضہ سونے چاندی کی شکل میں ہو یا مال اسباب کی شکل میں۔

خون کے وارثوں میں سے کسی فرد واحد کے معاف کرنے کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر مطالبہ خون کے حقداروں میں سے کوئی ایک فرد خون معاف کر دے یا مالی معاوضہ لے کر اپنے حق سے دست بردار ہو جائے تو دوسرے وارثوں کی طرف سے بھی قصاص ساقط ہو جائے گا اور انہیں ان کا حصہ دیت (خون بہا) سے ملے گا۔ دیت (کا مال) ایسی چیز ہے جس کے حصے کیے جاسکتے ہیں اور دیت بھی مال کے زمرہ میں آتی ہے اور اسی مقدار کے مطابق جو ورثاء کا حق ہے یہ ہر فرد کا احسان ہے۔ بخلاف قصاص کے۔ کہ اس کے حصے نہیں ہوتے۔ پس اگر (ورثاء خون میں سے) کسی کا حق مطالبہ ساقط ہو جائے تو سب کا حق ساقط ہو جائے گا۔

اس مسئلہ کی بنیاد یہ ہے کہ جس طرح مطالبہ قصاص تمام ورثاء مقتول کا حق ہے اسی طرح دیت (خون بہا) بھی ہے۔ کیونکہ یہ دونوں امور (یعنی خون اور خون بہا) دوسرے اموال (ورثہ) کی طرح بالاتفاق ورثہ کی اشیاء ہیں۔ لہذا واجب ہوا کہ اس میں جملہ ورثاء یہاں تک کہ میت کا خاوند اور یا اس کی بیوی بھی شامل ہیں۔ کیونکہ (دیت کا) حق پہلے میت کو حاصل ہوتا ہے اور پھر ورثاء کو منتقل ہوتا ہے اور میت کو یہ حق اس لیے ہوتا ہے کہ دیت کے عائد ہونے کا موجب وہ

زخم ہے (جس سے موت واقع ہوئی) اور قصاص ہو یا دیت دونوں باتیں (محض وجود سبب) موت سے پہلے ہی ثابت ہو جاتی ہیں۔ مال کی بھی یہی کیفیت ہے چنانچہ اگر میت اپنے مال کے تیسرے حصے کی وصیت (کسی کے حق میں) کرے تو اس کا اطلاق دیت کے مال پر بھی ہوگا اور میت کا قرض بھی اس میں سے ادا کیا جائے گا اور امام علی رضی اللہ عنہ دیت کو بھی ان میں تقسیم فرماتے تھے جو میراث پاتے تھے۔ اس کے لیے یہی ایک نظیر کافی ہے۔ پس درآنحالیکہ یہ امر ثابت ہے تو تمام ہی ورثاء دیت وصول کر سکتے ہیں اور جہاں تک حق وراثت کا تعلق ہے رشتہ ازدواج میت کی وفات کے بعد بھی عملاً باقی رہتا ہے یا اس لحاظ سے کہ موت کا سبب جراحت تھا (اور میت خون کا حقدار ہو گیا تھا) وہ حق مجروح کے وارثوں کو مل جاتا ہے۔ پھر اگر قصاص ساقط ہو جائے تو قصاص کا حق مال کے حق میں منتقل ہو کر بقیہ ورثاء کو ان کے حصوں کے مطابق ملے گا۔ کیونکہ حق قصاص (سبب میں تقسیم ہونا) محال ہے یعنی وہ قاتل کو لوٹا دیا جائے گا اور جس نے معاف کر دیا اسے کچھ نہ ملے گا کیونکہ اس نے اپنے قول و فعل سے اس حق کو ساقط کر دیا ہے۔

شافعیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ قصاص اور خون بہا میں خاوند یا بیوی کا کوئی حصہ نہیں ہے اور اس معاملہ میں انھیں کوئی حق نہیں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ موت کے بعد میت کے وارث اس کے قائم مقام ہوتے ہیں اور یہ وراثت نسب کی بناء پر عائد ہوتی ہے سبب کی بناء پر نہیں ہوتی کیونکہ سبب موت کے بعد منقطع ہو جاتا ہے اور رشتہ ازدواج بھی موت کے بعد منقطع ہو جاتا ہے پھر یہ بھی ہے کہ مالکیہ کا کہنا ہے کہ قصاص اور دیت دونوں میں عورتوں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ شافعیہ کا قول ہے کہ قصاص پورا لینے میں عورتوں کا حق نہیں ان کا صرف معافی دینے میں حق ہے۔

قصاص سے موت واقع ہو جانے کا بیان

شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر جرم سے متاثر ہونے والے نے مجرم سے قصاص لیا عضو کاٹنے کے بدلے میں اس نے بھی مجرم کا عضو کاٹ دیا اور اس زخم کے سرایت کر جانے کے باعث مجرم کی موت واقع ہو گئی تو قصاص لینے والے پر کوئی الزام نہیں ہے کیونکہ اس کا جو حق تھا وہ پورا کر لیا یعنی قطع کے عوض قطع کیا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ اس میں مجرم کی سلامتی کی شرط لگائی جاتی ایسی کوئی شرط لگائی جاتی تو قصاص ہی کا سد باب ہو جاتا۔ سرایت زخم کا رد کنا کسی کے بس میں نہیں ہے اور اس شخص کی مثال ایسی ہے جیسے حاکم یا شتر زن (اپریشن کرنے والا) یا پچھنے لگانے والا یا وہ شخص جسے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا جائے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”وَلَمَنْ أَنْتَصِرْ بَعْدَ ظَلْمِهِ“ (یعنی وہ شخص قابل مواخذہ نہیں جو ظلم اٹھانے کے بعد قابو پا کر انتقام لے)۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر جراحت رسیدہ (مجروح کرنے والے) مجرم سے قصاص لے اور اس کا عضو بھی کاٹ دے پھر وہ زخم مجرم کے جسم میں سرایت کر جائے اور نتیجہ وہ مر جائے تو اس کے ورثاء خون بہا کے مستحق ہوں گے جو مجروح کے ذمہ دار متعلقین ادا کریں۔ کیونکہ یہ خون ناحق ہوا ہے۔ وہ صرف قطع عضو کا مستوجب تھا اور یہ قتل ہے۔ اگر یہ موت (بدلہ لینے والے کے) ظالمانہ عمل سے واقع ہوئی تب تو یہ قتل ہے اور اس پر قصاص واجب ہے کہ اس نے بجائے عام طریق انتقام کے اس طرح کاٹا کہ اس کی زندگی جاتی رہی اور اس کو قتل ہی کا نام دیا جائے گا تاہم اس (کے قتل عد ہونے) میں شبہ ہے لہذا قصاص (خون کا بدلہ خون) ساقط ہو جائے گا اور اس کے عوض مال (تاوان) واجب ہوگا۔ بخلاف حاکم شرع وغیرہ

کے کہ وہ ان کے فرائض میں سے ہے۔ انھیں خود کو یہ اختیار ہوتا ہے یا بہ تعمیل حکم ایسا کرنا پڑتا ہے جیسے حاکم وقت یا حاکم مجاز۔ جیسا کہ دوسرے معاملات میں ہوتا ہے چنانچہ اگر قاضی (حاکم شرع) جس پر فیصلہ کرنے کی ذمہ داری ہے۔ فیصلہ کرے تو واجب ہے کہ وہ حکم دے اور اس کے حکم کے بموجب (مثلاً) چور کا ہاتھ کاٹا جائے اور (اس زخم کی تاب نہ لا کر) وہ مر جائے تو حاکم پر کوئی الزام عائد نہ ہوگا اور جب کسی حکم کی بجا آوری واجب ہو تو اس کے عملدرآمد میں سلامتی و تحفظ شرط نہیں لگائی جاسکتی جیسے سپاہی کو دشمن پر تیر (گولی) چلانے کا حکم دیا جائے۔

واضح ہو کہ اس مسئلہ میں صرف بازیابی حق کا ذکر ہے۔ یہ عمل واجب یا لازم نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں معاف کر دینے اور روادار کھنے کی گنجائش ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”وان تعفوا القرب للتعفوی“ (یعنی اگر معاف کر دو تو یہ امر پر ہیزگاری کے زیادہ قریب ہے)۔ پس اگر کسی نے شکار پر تیر چلایا اور وہ کسی شخص کو لگ گیا تو بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔

چھوٹے بچے کی وجہ سے قصاص میں تاخیر

حنفیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر مقتول کے ورثاء میں کم عمر بھی ہوں اور بالغ بھی تو بالغوں کو حق ہے کہ قاتل سے خون کا بدلہ لیں اور اس بات کا انتظار نہ کریں کہ مقتول کا وارث بچہ عمر بلوغ کو پہنچ جائے۔ قصاص ایک ایسا حق ہے جس کے حصے نہیں کئے جاسکتے کیونکہ اس کے عائد ہونے کا سبب بھی حصوں میں منقسم نہیں ہے اور قرابت داری ہر فرد پر بطور کامل عائد ہوتی ہے۔ جیسے نکاح میں ولی کے لیے حق ولایت ثابت ہوتا ہے۔ واضح ہو کہ کس (نابالغ) وارث اور بالغ وارث جو موجود نہ ہو کے درمیان، معافی کا احتمال ہونے یا نہ ہونے کے اعتبار سے فرق ہے۔ چنانچہ مطالبہ قصاص کے وقت یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ غیر موجود وارث نے معاف ہی نہ کر دیا ہو۔ اس لیے کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ موجودہ وارثوں کو اس کے معاف کرنے کی اطلاع نہ ہوئی ہو۔ لہذا پورا قصاص لینے کے حق میں اشتباہ رہے گا اور یہ جائز نہیں ہے اور قصاص پر عملدرآمد کے وقت کس وارث کے معاف کرنے کا خیال ہی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ معاف کرنے کا اہل نہیں ہے البتہ بالغ ہونے اور سن رشد کو پہنچنے کے بعد یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ وہ معاف کر دے۔ لیکن مالی معاملات میں شبہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ایسا کیا جائے تو قصاص کا دروازہ ہی بند ہو جائے اور ممکن ہے کہ مقتول کا ولی قاتل کے قتل میں پیش دستی کرے یا وارثائے مقتول میں سے کوئی جنون زدہ ہو تو قاضی (حاکم شرع) پر واجب ہے کہ قصاص پر عملدرآمد کرنے میں تاخیر نہ کرے اور دائمی جنون میں جس سے افاقہ نہیں ہوتا، مبتلا شخص (وارث) کی صحت یا بی کا انتظار نہ کرے۔

شافعیہ اور حنابلہ۔ بروایت غالب۔ اور حنفیہ میں سے صاحبین کہتے ہیں کہ اگر مطالبہ خون کے حقداروں میں کس (نابالغ بچہ) اور بالغ شامل ہوں تو چاہیے کہ بالغ ورثاء قصاص پر عملدرآمد کے بارے میں جلدی نہ کریں، بلکہ نابالغوں کے بالغ ہو جانے کا انتظار کریں قاتل کو قید میں رکھیں اور ضمانت پر بھی اسے رہا نہ کریں۔ یہاں تک کہ کس وارث عمر بلوغ کو پہنچ جائیں اور اگر ان میں سے کوئی جنون زدہ ہے تو اسے افاقہ ہو جائے۔ اس وقت اختیار ہوگا کہ قصاص کا مطالبہ کریں یا خون بہالیں یا مجرم کو معاف کر دیں یا پھر مال کا معاوضہ لے کر راضی نامہ کر لیں۔ یہ اس لیے ہے کہ حق قصاص ان سب میں مشترک ہے اور چونکہ قصاص کے حصے نہیں ہو سکتے اس لیے بعض ورثاء کا مطالبہ پورا کرنا ممکن نہیں ہے۔ اگر ان کا حق پورا پورا دے دیا جائے تو نابالغ یا جنون زدہ وارثوں کی حق تلفی ہوگی۔ پس واجب ہے کہ قصاص لینے میں اس

وقت تک تاخیر کر دی جائے کہ بچے بالغ ہو جائیں اور جنون زدہ کو جنون سے افاقہ ہو جائے یہی حکم اس صورت میں ہے جب کہ مقتول کے دو وارثوں میں سے ایک موجود نہ ہو یا اسی طرح اس کے دو والی ہوں۔ تاہم یہ چاہیے کہ سب متعلقین ایک شخص کو وصولی حق کے لیے بالاتفاق چن لیں ورنہ پھر قریعہ اندازی سے طے کر لیں۔

اس بارے میں اختلاف اس حالت میں ہوگا جب کہ مقتول کے آباء و اجداد میں سے کوئی نہ ہو۔ اگر ہوں تو بالاتفاق انہیں اپنا حق پورا کرنے کا اختیار ہے اور کمسن بچوں کے بالغ ہونے کا انتظار نہ کریں۔ کیونکہ باپ کو حق ولایت پہلے ہی حاصل ہے۔

اگر وارثوں میں سے کسی نے پیش دستی کی اور مجرم کو قتل کر دیا تو قوی بات یہ ہے کہ اس پر قصاص نہ ہوگا اور اس کے ترکہ میں سے باقی حقداروں کو خون بہا کا حصہ ملے گا اور کہا جاتا ہے کہ یہ حصہ اس سے وصول کیا جائے جس نے پورا قصاص لے لیا ہے۔

اگر مجرم کو معافی ملنے کے بعد کسی اور شخص نے اسے قتل کرنے کی جرأت کی تو اس پر قصاص عائد ہوگا اور یہ بھی کہتے ہیں کہ نہ ہوگا۔

صغیرن بیٹے کے قتل کا قصاص لینے کا بیان

حنفیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر ولی نے (زیر کفالت) کمسن بچے یا بے عقل کو قتل کر دیا تو اس کے باپ کو جو مقتول کا دادا ہوگا اس بے عقل یا صغیرن بچے کی طرف سے قصاص لینے کا حق ہے کیونکہ اسے نفسانی (یا جذباتی) طور پر ولی ہونے کا حق ہے بایں طور کہ شریعت میں قصاص کا حکم تشفی (تسلی) کے لیے ہے۔ چونکہ اولاد کو جو دکھ پہنچتا ہے وہ اپنی جان کا دکھ ہے لہذا وہ تسلی جو باپ کو حاصل ہوگی اسے بیٹے کو حاصل ہونے والی تشفی تصور کیا گیا ہے اور باپ کا قصاص لینے کے لیے ولی بننا ایسا ہی ہے جیسے نکاح کا ولی بننا۔ خواہ اس میں شریک ہو یا نہ ہو اور باپ کو مصالحت کا حق ہے کیونکہ وہی بے عقل یا صغیرن بچے کے حق کا نگران ہے۔ باپ کو یہ حق نہیں ہے کہ خون بہا کی مقدار کم کر کے تصفیہ کر لے بلکہ اس پر واجب ہے کہ اگر اس مال کی مقدار جس پر صلح ہوئی ہے، دیت (خون بہا) کی مقدار سے کم ہو تو اسے پورا کرے۔ باپ کو یہ بھی حق نہیں ہے کہ مالی معاوضہ کے بغیر قاتل کو معاف کر دے۔ کیونکہ اس میں حق تلفی ہے۔ اسی طرح اگر بے عقل یا صغیرن بچے کا ہاتھ کاٹ دیا جائے تو اس کے باپ کو مطالبہ قصاص کا حق ہے۔

شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ نہ باپ کو حق ہے اور نہ دادا کو کہ وہ اپنے صغیرن یا نادان بیٹے کا قصاص وصول کرے۔ اس امر پر سب کا اتفاق ہے باپ کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے بالغ بیٹے کی طرف سے قصاص وصول کرے۔ (اگر بیٹا وصول قصاص کا حقدار ہے تو بیٹے ہی کو خود پورا قصاص وصول کرنے کا حق ہے۔

بیٹے کو قتل کرنے کا بیان

حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ کوئی شخص اپنے بیٹے کو قتل کرنے کی پاداش میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”لایقادالوالد لولدہ“ (یعنی والد سے اس کے بیٹے کا قصاص نہیں لیا جائے) یہ حدیث مشہور

ہے جسے امت (ملت اسلامیہ) نے تسلیم کیا ہے۔ پس اس حدیث سے وہ آیت جس میں قاتل پر قصاص کے واجب ہونے کا عام حکم ہے خاص ہو گیا۔ اسی طرح جیسا کہ اس صورت میں جب کہ آقا اپنے یا اپنے بیٹے کے غلام کو قتل کر دے تو قصاص عائد نہ ہوگا۔ نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو اپنے بیٹے کے قتل کرنے پر خون بہا کے ادا کرنے کا فیصلہ کیا اور کسی نے اس فیصلہ پر اعتراض نہیں کیا اور یہ بھی ہے کہ باپ، اپنے بیٹے کی زندگی کا ذریعہ ہے تو ناممکن ہے کہ بیٹا باپ کے ختم کرنے کا موجب بنے۔ بناء بریں یہ جائز نہیں ہے کہ بیٹے کے قصاص میں باپ کو قتل کیا جائے ہر چند کہ وہ دشمنوں کی صف میں (بیٹے سے) برسر پیکار ہو یا شادی شدہ ہونے کے باوجود مرتکب زنا ہو البتہ باپ پر خون بہا واجب ہوگا جو بیٹے کے ورثاء کو ملے گا اور باپ کے لیے حرام ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ بیٹے (کے قتل) کا قصاص باپ سے نہیں لیا جائے گا بجز اس صورت کے جب کہ بیٹے کو لٹا کر ذبح کیا یا اسے قید میں بند رکھا یہاں تک کہ وہ مر گیا ایسی صورتوں میں کوئی عذر نہیں کیا جاسکتا اور نہ کسی شبہ کی گنجائش ہے۔ لیکن اگر کسی شخص نے تلوار یا لٹھی یا بھاری پتھر مار کر گرا دیا اور قتل کا ارادہ نہ تھا (اور وہ ہلاک ہو گیا) تو باپ کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ دادا کے بارے میں بھی یہی حکم ہے۔ (اس مسئلہ میں) ان اصحاب کی دلیل یہ ہے کہ قصاص کا حکم عام ہے جو تمام مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے اس میں باپ وغیرہ کی کوئی تفریق نہیں۔ ان کے قیاس کی بنیاد یہ حکم ہے کہ اگر کوئی شادی شدہ شخص (نعوذ باللہ) اپنی بیٹی کے ساتھ آلودہ ہو جائے تو بالاتفاق اسے سنگسار کیا جائے گا (یعنی اولاد کا مجرم ہونے کی وجہ سے وہ کسی رعایت کا مستحق نہ ہوگا) پھر یہ بھی ہے کہ آیت میں قصاص کے متعلق عام حکم ہے (جس میں کوئی استثناء نہیں ہے) اس حکم عام کو خبر واحد کی بناء پر خاص نہیں بنایا جاسکتا غرض اگر قتل عمد ثابت ہو جائے تو مجرم مستوجب قصاص ہو جائے گا۔ ہاں اگر کوئی اپنے باپ کے خلاف قصاص کا وارث ہو تو باپ کے احترام کی بناء پر وہ حق ساقط ہو سکتا ہے۔

قتل عمد کے مشابہ قتل کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ قتل کی پانچ صورتیں ہیں: قتل عمد، قتل مشابہ بہ قتل عمد، قتل خطا، قتل مشابہ بہ قتل خطا، غرض مندانہ قتل۔

قتل عمد یہ ہے کہ ہتھیار سے یا ہتھیار جیسی شے سے، مثلاً لوہا منڈھی لکڑی یا تیز کچھی، یا دھاردار پتھر مار کر یا آگ میں جلا کر ہلاک کیا جائے۔ مشابہ بہ قتل عمد یہ ہے کہ ہتھیار یا ہتھیار جیسی کسی شے سے نہیں بلکہ کسی اور طرح ضرب پہنچائی جائے۔ خواہ عام حالات میں اس سے بھی موت واقع ہو جاتی ہو مثلاً بھاری پتھر یا موٹا سا ڈنڈا یا دھوبی کی موگری سے یا اس سے موت نہ واقع ہوتی ہو مثلاً کوڑا یا چوب دستی، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”الا ان قتل خطا العمد قبل السوط، والعصا“ بروایت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ (یعنی یاد رہے کہ کوڑے یا چوب دستی کی ضرب سے خطا ہلاک کرنا بھی قتل عمد ہے) اس روایت سے استدلال کی صورت یہ ہے آنحضرت ﷺ نے کوڑے یا سوئی کی ضرب سے مقتول ہونے والے کو مطلقاً (یعنی کیسا ہی کوڑا یا سوئی ہو) قتل عمد کے مقتول کے مشابہ قرار دیا ہے۔ اب اس کو چھوٹی سی لکڑی کے ساتھ

مخصوص کر دینا حکم مطلق کو باطل کر دینا ہے جو جائز نہیں ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ سوئی خواہ چھوٹی ہو یا بڑی اس لحاظ سے یکساں ہیں کہ وہ قتل کرنے کے لیے نہیں ہوتیں اور نہ بالعموم ان کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کے استعمال میں پہل کرنے کی غرض قتل کر دینا ہو اور پہل کرنے میں اکثر قتل ہو جاتا ہو اور در آنحالیکہ اس لحاظ سے (چھوٹی اور بڑی) دونوں قسم کی لاثیمیاں برابر ہیں۔ اور چھوٹی سوئی سے قتل کرنا بالاتفاق قتل شبہ عمدہ ہے تو بڑی لاثیم سے قتل بھی اسی طرح مشابہ قتل عمدہ ہے۔ غرض عمدہ قتل کے تعین کا انحصار آلہ قتل پر ہے اور یہ صورت قتل عمدہ کے مشابہ متصور ہوگی (قتل عمدہ متصور نہ ہوگی)

شافعیہ اور حنابلہ نیز حنفیہ سے صاحبین کہتے ہیں کہ مشابہ قتل عمدہ قتل ہے جس میں ایسے آلے سے ضرب لگائی گئی ہو جس سے بالعموم موت واقع نہیں ہوتی۔ مثلاً چھوٹا ساعصا (چوب دستی) بشرطیکہ پے درپے ضربات نہ لگائی گئی ہوں اگر مسلسل اس سے مار مار کر ہلاک کر دیا جائے تو وہ قتل عمدہ قرار پائے گا۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ بھی شبہ عمدہ ہے اور اس قسم کے قتل کو بھی شبہ قتل عمدہ کہا جاتا ہے کیونکہ یہاں عمدہ کے مفہوم کو محدود کرنا یہ ہے کہ ایسا آلہ استعمال کیا جائے جس کے استعمال سے بالعموم موت واقع نہیں ہوتی۔ احیاناً موت واقع ہو جائے تو اسے قتل عمدہ قرار نہیں دیا جائے گا (مثلاً چھڑی (یا سوئی) کہ یہ قتل کرنے کے لیے استعمال نہیں ہوتی بلکہ سرزنش (یا سزا) کے لیے استعمال ہوتی ہے وغیرہ اب اگر اس کے لگنے سے کوئی مر جائے، تو خون بہا واجب الادا ہوگا، قصاص واجب نہ ہوگا، لیکن اگر کوئی ایسا آلہ استعمال کیا جائے جس سے بالعموم جان جاتی رہتی ہے مثلاً بڑا سا پتھر، موٹا سا لکڑ، دھوبی کی موگری وغیرہ۔ ان اشیاء سے ضرب لگانے کا مقصد قتل کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا اور یہ ایسا ہی ہے جیسے ہتھوڑے یا تلوار سے مارنا لہذا اسے قتل مستوجب قصاص قرار دیا جائے گا۔ ان اصحاب کا کہنا ہے کہ وہ اس امر میں ابوحنیفہؒ سے اتفاق کرتے ہیں کہ لوہے کے چھڑیا سریے یا سلاخ سے قتل کرنا مستوجب قصاص ہے۔

واضح ہو کہ دونوں اقوال کے مطابق قتل عمدہ کے مشابہ جرم کا ارتکاب معصیت ہے کیونکہ بہر حال یہ قتل اس کے ہاتھ سے ہوا گو ارادہ محض چوٹ پہنچانے کا تھا، اس پر کفارہ دینا واجب ہے اور اس آلے کے پیش نظر جس سے قتل ہوا اس کو قتل خطا قرار دیا جائے گا جو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق ہے ”وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ“ (یعنی اگر کسی نے غلطی سے مسلمان کو قتل کر دیا تو اس پر ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا لازم ہے) اور بدیں جہت کہ یہ قتل خطا کے مشابہ عمل ہے تاوان کے ذمہ دار پر بھاری تاوان عائد ہوگا جس کی مقدار ایک سو (۱۰۰) شتر ہے جن میں سے چالیس اونٹنیاں گیا بھن ہوں، تاوان کی ادائیگی تین سال کے اندر کی جائے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فیصلہ ہے کہ انہوں نے ادائے خون بہا کے ذمہ دار کو ادائیگی کے لیے تین سال مدت مقرر فرمائی تھی جس سے تمام صحابہ نے بلا اختلاف احدے اتفاق فرمایا تھا۔ پس یہ فیصلہ گویا ایسا ہے جیسے آنحضرت ﷺ سے روایت ہو کیونکہ یہ ایسی بات ہے جس کا فیصلہ انسان اپنی رائے سے نہیں کر سکتا۔ (ایسا کرنے سے در ثاء کی) محرومی کا اندیشہ ہے کیونکہ یہ قتل کے خون بہا کا معاملہ ہے۔ اور اشتباہ کی صورت میں قصاص ساقط ہو جاتا ہے البتہ میراث سے محرومی نہیں ہوتی اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”الا ان قَتِيلَ الْخَطَا شَبَهَ الْعَمْدِ، فَتَيْلُ السُّوْطِ، او الْعَصَا، فِيهِ مِائَةٌ مِنَ الْاِبِلِ مِنْهَا اَرْبَعُونَ فِي بَطْنِهَا او لَادِهَا“ (یعنی یاد رہے کہ غلطی کا قتل، قتل عمدہ کے مشابہ ہے۔ مثلاً کوڑا کھانے یا سوئی کے زخم سے کوئی مر جائے تو اس کا خون بہا ایک سو شتر ہے جن میں سے چالیس اونٹیوں کے پیٹ میں بچے ہوں)۔

امام احمد نے عمرو بن شعیب سے انہوں نے اپنے باپ سے اور باپ نے ان کے دادا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے ”قتل شبه العمد مغلظ، مثل قتل العمد، ولا یقتل صاحبه، وذلك ان ینزو الشیطان بین الناس فتکون دماء فی غیر ضغینة، ولا حمل سلاح.“ (یعنی وہ قتل جو قتل عمد کے مشابہ ہو اس کا خون بہا قتل عمد کے خون بہا کی طرح گرا نقدر ہوتا ہے اس میں مجرم کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ بات یہ ہے کہ شیطان چھپ کر لوگوں میں درآتا ہے اور بغیر کسی عداوت کے اور بغیر اسلحہ بندی کے قتل ہو جاتا ہے)۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ ڈنڈے یا چھوٹے پتھروں کے ساتھ مارنے سے بھی قتل عمد ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ قتل شبه عمد (یعنی قتل عمد کے مشابہ جرم) کیا ہے ان اصحاب کے نزدیک قتل کی صرف دو قسمیں ہیں، قتل عمد اور قتل خطا: قتل خطا تو یہ ہے کہ حادثاتی طور پر (یعنی اتفاق سے) یا غیر مکلف انسان (جس پر احکام شرعیہ عائد نہیں ہوتے) کے ہاتھوں یا ارادہ قتل کے بغیر (کسی حرکت سے) قتل واقع ہو جائے، یا ایسی شے کی ضرب سے جان جاتی رہے، جس سے بالعموم جان نہیں جاتی مثلاً کوڑا مارنا۔ (مگر اس سے قتل واقع ہو جائے تو) اس میں قصاص عائد نہ ہوگا البتہ خون بہا واجب ہوگا۔ اس کے علاوہ قتل کی اور صورتیں قتل عمد ہیں۔ کیونکہ جس طرح دوسرے امور میں عمد کو خطا سے کوئی نسبت نہیں ہے اسی طرح یہ عمل بھی ہے۔ اور قتل خطا کے مشابہ یہ جرم ہے کہ قتل کا ارادہ تو ہو لیکن طریق کار میں غلطی کرے، یا کسی کو (بہ ارادہ قتل) تازیانہ سے مارے جس سے بالعموم قتل واقع نہیں ہوتا یا ہاتھ سے مکا (گھونسا) مارے یا زور سے تھپڑ مارے (اور قتل واقع ہو جائے) ان تمام صورتوں میں قصاص عائد ہوگا۔ تاہم اگر بانس کی لاٹھی سے عمد امارا یا تازیانہ مارا جس سے بالعموم قتل واقع نہیں ہوتا یا کسی بھاری شے مثلاً پتھر وغیرہ سے مارا، یا گلا گھونٹایا بھوکا پیاسا رکھے، یہاں تک کہ موت آجائے اور ارادہ مار ڈالنے ہی کا رہا ہو تو اس پر قصاص عائد ہوگا لیکن اگر محض سزا دینا پیش نظر تھا (اور موت واقع ہوگئی) تو خون بہا واجب ہوگا۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ قتل کرنے کی تین صورتیں ہیں: قتل عمد، قتل خطا اور جرم مشابہ بقتل عمد، ان تینوں اقسام قتل میں سے صرف قتل عمد میں قصاص واجب ہوتا ہے۔ قتل عمد یہ ہے کہ ایک شخص قتل کرنے کے لیے ایسی چیز کو استعمال کرے جس سے بیشتر حالات میں قتل واقع ہو جاتا ہے۔ یعنی آکہ قتل زخمی کرنے والا ہو یا بھاری (کچلنے والا) ہو۔

ان کا کہنا ہے کہ قتل کے متعلق احکام کو پانچ اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: واجب، حرام، مکروہ، مستحب اور مباح۔ اول قتل واجب اس صورت میں ہے جبکہ کوئی مسلمان مرتد (دین اسلام سے برگشتہ) ہو جائے اور توبہ نہ کرے یا کوئی حربی (جو مسلمانوں سے برسر پیکار) ہو اور اسلام نہ لائے یا جزیہ نہ دے۔

دوم قتل حرام کسی بے قصور کو (جو مستوجب قتل نہ ہو) ناحق قتل کرنا ہے سوم قتل مکروہ یہ ہے کہ غازی (مجاہد) اپنے قرابت دار کافر کو قتل کر دے، درآنحالیکہ وہ شخص اللہ اور اس کے رسول کے حق میں بدزبانی نہ کرتا ہو۔

چوتھا قتل مستحب وہ ہے کہ مجاہد اپنے کافر قرابت دار کو جو اللہ اور اس کے رسول کے حق میں بدزبانی کرتا ہو، قتل کر دے۔

پانچواں قتل مباح یہ ہے کہ امام (حاکم وقت) کسی قیدی کو جسے قتل کرنے کا وہ مجاز ہے قتل کر دے۔
 رہا قتل خطا، سو وہ حلال ہے نہ حرام کیونکہ غلطی سے کسی کو قتل کرنے والے سے بھول چوک میں جو فعل سرزد ہو گیا
 اس میں اس شخص کو غیر مکلف (یعنی غیر ذمہ دار یا ناقابل باز پرس) قرار دیا جائے گا اور وہ فعل ایسا ہی ہے جیسے کسی دیوانے یا
 حیوان سے سرزد ہوا ہو پس اگر ایسے اشخاص سے بلا ارادہ کوئی ایسا فعل سرزد ہو گیا جس سے کوئی شخص مر گیا، یا کسی نے
 درخت (کے کسی جانور) پر نشانہ لگا یا اور غلطی سے کوئی شخص نشانہ بن گیا تو یہ قتل خطا (یا قتل بے ارادہ) ہے۔ اور اگر ایسی شے
 سے نشانہ بنایا جس سے بالعموم قتل واقع نہیں ہوتا (اور قتل ہو گیا) تو یہ قتل مشابہ قتل عمد ہے، اس میں کسی کو کوڑے یا لکڑی
 سے مارنا داخل ہے، اور اگر ایسی جگہ پر سوئی بھی چھوئی جہاں چھونے سے موت واقع ہو جاتی ہے تو یہ قتل عمد ہوگا۔ ہاں ایسی جگہ
 چھونا جہاں چھونے سے ضرر نہیں ہوتا مثلاً سخت کھال میں (اور احیاناً موت واقع ہو گئی) تو بہر حال اس پر کوئی جرم عائد نہ ہوگا۔
 اگر کسی کو جس میں رکھا اور اسے کھانے پینے اور ضروریات کچھ بھی مہیا نہ کی گئیں یہاں تک کہ وہ مر گیا تو اب
 دیکھنا ہوگا کہ اگر مرنے والے کو اتنے عرصہ تک جس میں رکھا جس میں بغیر کھائے پئے موت واقع ہو جاتی ہے تو یہ قتل عمد ہوگا،
 بصورت دیگر اگر وہ شخص پہلے سے بھوکا پیاسا نہیں تھا تو یہ قتل مشابہ قتل عمد تصور ہوگا۔ اگر وہ شخص کچھ بھوکا پیاسا تھا اور جس
 میں رکھنے والے کو اس کی یہ کیفیت معلوم تھی اور اس کے جس میں رکھنے کی مدت اتنی تھی کہ اگر اس مدت کو اس کی سابقہ بھوک
 پیاس کی مدت سے ملا کر دیکھا جائے کہ اس قدر عرصہ بنتا ہے جس میں انسان مر جاتا ہے تو یہ بھی قتل عمد ہوگا۔ کیونکہ اس سے
 عیاں ہے کہ اسے بند رکھنے کا مقصد ہلاک کرنا تھا۔ اگر بھوک پیاس کی دونوں مدتیں (یعنی جس سے پہلے اور جس کے بعد
 کی) ملا کر اتنا عرصہ نہیں بنتا جس میں انسان مر جاتا ہے تو اس کی بابت وہ صورت تصور کی جائے گی جیسے جس سے بیشتر اسے
 (بھوک پیاس) کچھ نہ تھی (لہذا یہ شبہ عمد کی مانند ہے) نیز اگر جس میں رکھنے والے کو اس شخص کا حال معلوم نہ ہو (کہ یہ بھوکا
 پیاسا ہے یا نہیں) اور (جس میں رکھنے سے) وہ مر جائے تو یہ بھی شبہ عمد (جرم مشابہ بقتل عمد) قرار دیا جائے گا۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے کسی کو جس (بیجا) میں رکھ کر کھانے پینے کی چیزوں سے محروم رکھا، یہاں تک
 کہ وہ اس کی وجہ سے مر گیا۔ یا اس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا، تو ان تمام صورتوں میں اس شخص پر قصاص عائد ہوگا۔ بشرطیکہ جان
 سے مارنے کے لیے یہ کچھ کیا ہو۔ یا جانتا ہو کہ اس طرح وہ مر جائے گا۔

اگر ایک شخص نے کھانے پینے کی چیز میں کسی کو زہر دے دیا جس سے موت واقع ہو گئی تو اس شخص پر قصاص عائد
 ہوگا۔ چنانچہ یہ اصحاب بیان کرتے ہیں کہ اگر کسی کے پاس اس کی اپنی ضرورت سے زیادہ پانی تھا اور ایک مسافر کو نہ دیا
 حالانکہ وہ جانتا تھا کہ ایسی حالت میں پانی کا نہ دینا امر حرام ہے اور اگر اس نے پینے کو پانی نہ دیا تو وہ پیاس سے مر جائے
 گا (اور فی الواقع وہ مر گیا) تو ایسے شخص کو اس کے بدلے قتل کر دیا جائے گا۔ اگرچہ اس نے اپنے ہاتھ سے قتل نہیں کیا۔

بھاری چیز سے ہلاک کرنے، ڈبوں یا جلادینے کا بیان

اگر ایک شخص نے کسی کو بھاری شے مثلاً پتھر وغیرہ سے مارا اور وہ پتھر ہلاک کرنے والی جگہ پر لگایا نہ لگا ہو لیکن
 اس کی دہشت سے مر گیا یا اس طور کہ چوٹ کھا کر یا زخمی ہو کر بے ہوش گر پڑا اور اسی حالت میں اٹھا کر لایا گیا اور مر گیا تو
 مارنے والے سے قصاص لیا جائے گا اس کے لیے مقتول کے وارثوں سے قسم لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ یہ سمجھا جائے گا

کہ گویا اسے مردہ حالت میں اٹھایا گیا ہے اور اگر ہلاک کرنے والی جگہ پر چوٹ نہیں لگی تھی اور چوٹ کھانے یا زخمی ہونے کے بعد اسے آرام ہو گیا تھا اور بعد میں موت واقع ہوئی تب بھی اس سے قصاص لیا جائے گا بشرطیکہ اس کے وارث قسم کھالیں (کہ اس کی موت کا سبب وہی تھا) اسی طرح اگر ایک شخص نے عداوت کی بناء پر یا بغیر عداوت کے کسی بے قصور کو جو تیرا کی سے واقف نہ ہو نہر میں دھکا دے دیا یا عداوت کی بناء پر تیرنا جاننے والے کو دھکا دیا اور وہ ڈوب گیا تو بہر دو صورت قصاص واجب ہوگا۔ اگر عداوت سے ایسا نہیں کیا بلکہ ہنسی مذاق میں ایسی حرکت کی تو خون بہا لازم ہوگا۔ یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ مجرم کو اس شخص کی بابت معلوم ہو کہ وہ اچھی طرح تیرنا جانتا ہے یا اسے معلوم ہو کہ وہ تیرنا نہیں جانتا۔ اگر اسے یہ نہیں معلوم (کہ وہ تیرنا جانتا ہے یا نہیں جانتا) اور عداوت اس نے ایسی حرکت کی تو قصاص، اگر مذاق کے طور پر کیا تو خون بہا لازم ہوگا۔

اگر ایک شخص نے کسی کو ہلاک کرنے کی تدبیر کی مثلاً گڑھا کھودا اور وہ نظر آ رہا تھا تاہم وہ شخص جسے وہ ہلاک کرنا چاہتا تھا اس میں گر پڑا۔ یا کوئی شے پھسلاواں اس کے پاس رکھ دی یا کوئی خونخوار کتا پیچھے لگا دیا اور وہ شخص کنوئیں (یا گڑھے) میں گر کر فوری طور پر یا بعد میں ہلاک ہو گیا تو ایسی تدبیر کرنے والے سے قصاص لیا جائے گا اگر اس کا رروائی میں اس شخص کے علاوہ جس کو ہلاک کرنا تھا کوئی اور شخص ہلاک ہو گیا۔ یا محض ایذا رسانی کے لیے (کسی کے خلاف) ایسی کوئی تدبیر کی تھی اور کوئی (بے تعلق شخص) اس میں گر کر ہلاک ہو گیا اور وہ بے قصور مستوجب قتل نہ تھا تو اس کا خون بہا اس شخص پر عائد ہوگا۔ لیکن اگر اس کنوئیں کے کھودنے کی غرض ضرر رسانی نہ تھی تو اس پر کوئی الزام عائد نہ ہوگا اور وہ خون راگیاں جائے گا۔

اگر ایک شخص نے کسی بے قصور کو زہریلی شے دے دی یہ جانتے ہوئے کہ یہ زہر ہے اور اس نے بے خبری میں اسے کھالیا اور مر گیا تو قصاص واجب ہوگا۔ لیکن اگر کھانے والے کو یہ معلوم تھا کہ اس کھانے میں زہر ہے اور پھر بھی کھالیا اور مر گیا تو یہ خودکشی میں شمار ہوگا اور اگر کھانے کو پیش کرنے والے کو کھانے میں زہر ہونا معلوم نہ تھا تو یہ قتل خطا ہے۔

اگر ایک شخص نے کسی پر زندہ سانپ پھینکا اور اس سے وہ مر گیا۔ گو سانپ نے ڈسانہ ہو بلکہ وہ شخص دہشت سے ہلاک ہو گیا ہو تو پھینکنے والے پر قصاص عائد ہوگا۔ لیکن اگر وہ سانپ مڑا ہوا تھا تو خون بہا واجب ہوگا۔ اگر وہ سانپ کا بچہ ہو اور ڈسنے والا نہ ہو اور یہ حرکت اس نے بطور مذاق کی ہو تو خون بہا واجب ہوگا۔ ہار عداوت سے ایسا کیا تو قصاص عائد ہوگا۔

اگر ایک شخص نے کسی کی طرف ہتھیار، توپ، بندوق یا خنجر وغیرہ سے اشارہ کیا اور جس کی طرف اشارہ کیا وہ اسے دیکھ کر اشارہ کرنے والے سے بھاگ گیا کہ مبادا وہ اسے پکڑ لے کیونکہ اس شخص کے ساتھ اس کی عداوت ہے اور بغیر گرے ہوئے اس کی جان نکل گئی تو وارثوں کے قسم کھائے بغیر اس پر قصاص عائد ہوگا۔ اگرچہ اس شخص نے قاتلانہ حملہ نہ کیا ہو۔ اگر (ڈر سے) بھاگتے ہوئے وہ گر گیا اور گرنے سے ہلاک ہو گیا تو وارثوں کے قسم کھالینے پر قصاص واجب ہوگا کیونکہ ممکن ہے کہ اس کی موت گرنے کے صدمہ سے ہوئی ہو اور (ہتھیار وغیرہ کا) اشارہ عداوت کی بناء پر نہیں تھا۔ اگر وہ شخص بھاگا نہیں بلکہ (محض ڈر سے) مر گیا تو یہ قتل خطا ہوگا اور خون بہا کے ذمہ دار پر بیچ گنا خون بہا عائد ہوگا اور اگر بھاگنے والے اور اشارہ کرنے والے میں عداوت نہیں تھی تو یہ قتل خطا قرار پائے گا اور اس کے بموجب خون بہا واجب ہوگا۔

شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ (موت کا) موجب بننے سے بھی قصاص واجب ہو جاتا ہے چنانچہ اگر دو اشخاص کی

شہادت پر قصاص میں کسی کو قتل کر دیا گیا اور بعد میں وہ دونوں اپنی شہادت سے مکر گئے اور کہنے لگے کہ ہم نے دانستہ جھوٹی گواہی دی اور ہم جانتے تھے کہ ہماری گواہی کی بناء پر اس شخص کو قتل کر دیا جائے گا یا ہماری گواہی پر اس کا عضو بدن کاٹ دیا جائے گا تو ان دونوں گواہوں پر قصاص عائد ہوگا۔ کیونکہ انھوں نے ایسا سبب بنایا جس کے نتیجہ میں اکثر مجرم مستوجب قتل ہو جاتا ہے۔ ان کا یہ فعل عملی جبر کے مشابہ ہے لیکن اگر (مقتول کا) ولی یہ اعتراف کر لے کہ اسے معلوم تھا کہ دونوں گواہ جھوٹ بول رہے ہیں تو ان پر قصاص عائد نہ ہوگا۔ کیونکہ اس شخص کے قتل کا انحصار عملاً نہ شرعاً ان گواہوں پر نہیں تھا۔ البتہ گواہوں کا بیان اس کے لیے ایک قوی شرط ضرور ہے۔ پس ولی پر قصاص عائد ہوگا، لیکن اگر مقتول کے ولی نے یہ کہا کہ مجھے ان گواہوں کا جھوٹ بعد میں معلوم ہوا تو گواہوں پر قصاص عائد نہ ہوگا۔

اگر کسی شخص نے زہر ہلاہل ملے ہوئے کھانے کی ضیافت کی اور ایسے کھانے کو نا سمجھ بچے یا جنون زدہ شخص نے کھا لیا اور اس کے اثر سے موت واقع ہوگئی تو اس شخص پر حکم قصاص عائد ہوگا اور اگر اس شخص نے کسی عاقل و بالغ شخص کی ضیافت کی اور مہمان کو کھانے کے وقت یہ معلوم نہ تھا کہ اس میں زہر ہے تو مجرم پر خون بہا عائد ہوگا، قصاص عائد نہ ہوگا۔ کیونکہ مہمان نے اسے اپنی مرضی سے کھایا۔ اس پر کسی نے اصرار نہیں کیا تھا۔ پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قصاص واجب ہو جائے گا اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس یہودی عورت کو قتل کا حکم دیا تھا جس نے مہم خیبر کے وقت بکرے کے گوشت میں زہر ڈال کر دیا تھا اور اس کے کھانے سے بشر بن وائل بن عمرو وفات پا گئے تھے۔ لیکن اگر مہمان کو کھانے کے وقت اس بات کا (کہ کھانے میں زہر ہے) علم ہو گیا (اور پھر بھی اسے کھا لیا) تو ضیافت کرنے والے پر مطلق کوئی الزام عائد نہ ہوگا۔ کیونکہ (مہمان کا جان بوجھ کر زہر آلود کھانا) خود کشی ہے۔

واضح ہو کہ جرم سے متاثر ہونے والے پر یہ واجب نہیں ہے کہ وہ جرم کے اثر کا دفعیہ کرنے کے لیے اس کا علاج کرے۔ چنانچہ اگر کسی زخم خوردہ شخص نے مہلک زخم کھا کر اس کا علاج نہ کیا اور اسی حالت میں مر گیا تو قطعی طور پر مجرم مستوجب قصاص ہوگا کیونکہ علاج بھی ہو تو زخم کے اثر سے بچ جانا یقینی امر نہیں ہے اور جراحت بجائے خود موجب ہلاکت ہے۔ اگر ایک شخص نے کسی کو پانی میں دھکا دے دیا اور پانی اتنا نہ تھا جس میں انسان ڈوب جائے۔ جیسے پچھلی سطح کا پانی اور وہ شخص اس میں گر کر پڑا رہا یہاں تک کہ مر گیا تو یہ خون رائگاں جائے گا اور اگر پانی گہرا تھا جس سے لکنا بغیر تیرے ہوئے ممکن نہ تھا، لیکن وہ شخص تیرنا نہ جانتا ہو یا اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہوں یا وہ اپاچ ہو تو یہ فعل قتل عمد قرار پائے گا۔ اگر وہ شخص مثلاً تیر کر باہر آ سکتا تھا لیکن کسی رکاوٹ کے باعث ایسا نہ کر سکا مثلاً طغیانی یا لہر کا زور ہو اور اس وجہ سے وہ مر جائے تو یہ جرم قتل عمد کے مشابہ متصور ہوگا اور خون بہا عائد ہوگا۔ ہاں اگر اس شخص کے لیے ممکن تھا کہ ڈوبنے سے بچ جاتا لیکن اس نے اس کی کوشش نہ کی تو بخیاں غالب مجرم پر خون بہا عائد نہ ہوگا

اگر ایک شخص نے کسی کو ایسی آگ میں ڈال دیا جہاں سے بچ کر نکل آنا ممکن تھا لیکن وہ شخص اسی میں پڑا رہا اور جل کر مر گیا تو اس پر خون بہا واجب ہونے کے بارے میں دو باتیں ہیں: کہا جاتا ہے کہ آگ میں ڈالنے کے جرم میں اس

شخص پر خون بہا واجب ہوگا۔ بخلاف پانی میں دھکا دینے کے کہ آگ تو اس میں پڑتے ہی انسان کو جلادیتی اور ہلاک کرنے والا زخم ڈال دیتی ہے لیکن پانی میں ایسا نہیں ہوتا۔ اگر ایک شخص نے کنواں کھودا اور کسی کو اس میں دھکا دے دیا اور اس میں دھکا دینے سے بالعموم جان جاتی رہتی ہے۔ کسی کو بلندی سے نیچے پھینک دیا اور اس کا خاتمہ ہو گیا۔ تو قاتل پر قصاص ہے پہلی صورت (آگ میں جلانے والا) اور دوسری صورت (کنوئیں) میں دھکا دینے والا تیسری صورت (بلندی سے گرا کر) ہلاک کرنے والا۔

اگر ایک شخص نے کسی کو گہرے پانی میں جہاں سے بچ کر نکلنا ممکن نہیں مثلاً گہرے سمندر میں ڈال دیا اور مچھلی نے اسے نگل لیا تو بقول غالب اس پر قصاص عائد ہوگا۔ کیونکہ اس کی ہلاکت کا سبب وہی شخص تھا۔ اس میں ہلاک ہونے کی کیفیت کو نہیں دیکھا جائے گا اور یہ ایسا ہی ہوگا جیسے کسی کو ہلاک کرنے والے کنوئیں میں ڈال دیا جائے جس میں برچھیاں گڑی ہوئی ہیں اور گرنے والے کو اس کا علم نہیں ہے۔

واضح ہو کہ بقول ان اصحاب کے اس مسئلہ میں اختلاف کی گنجائش اس حال میں ہے جب کہ مچھلی اپنا منہ کھول کر اس شخص کو نگل نہ لے (یعنی اس صورت میں ممکن ہے کہ اس کی موت کا سبب مچھلی کو قرار دیا جائے) بصورت دیگر (سمندر میں پھینکنے والے پر) قطعی طور پر قصاص عائد ہوگا اور ایسا ہی موقع وہ بھی ہے جب کہ دھکا دینے والے کو معلوم نہ ہو کہ اس میں (نگل لینے والی) مچھلی ہے۔ اگر اس کا علم ہو تو قطعی طور پر قصاص واجب ہوگا۔ اسی طرح جیسے کسی کو شیر کی کچھار میں یا تیز رفتار ریل گاڑی کے آگے ڈال دے۔

اگر ایک شخص نے کسی کو ایسے پانی میں ڈال دیا جو گہرا نہیں تھا لیکن وہاں پر کسی مچھلی (یا دریائی جانور) نے اسے لقمہ بنا لیا۔ جس کی موجودگی کا علم پھینکنے والے کو نہ تھا تو قطعی طور پر قصاص عائد نہ ہوگا، کیونکہ اس کا ارادہ ہلاک کرنے کا نہیں تھا اور اس ہلاک کرنے والے جانور کا علم اسے نہیں تھا۔ یہ واقعہ ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص نے کسی کو ہلکا سا دھکا دیا اور وہ اس چھری پر جو وہاں پڑی ہوئی تھی اور جس کا علم دھکا دینے والے کو نہ تھا لیکن وہ شخص اس سے زخمی ہو کر ہلاک ہو گیا۔ ان دونوں صورتوں میں یہ جرم مشابہ بہ قتل عائد ہوگا اور اس پر خون بہا عائد ہوگا۔

اگر کسی جنون زدہ نے ایک شخص کے خلاف ہتھیار سونت لیا اور اس شخص نے (اسے آمادہ قتل پا کر) اس پاگل کو قتل کر دیا تو اس پر کوئی الزام عائد نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ قتل حفاظت خود اختیاری کی بناء پر ہوا۔ اسی طرح اگر کوئی بچہ ایک شخص پر ہتھیار لے کر پل پڑے اور وہ شخص اس بچے کو ہلاک کر دے تو اس پر الزام عائد نہ ہوگا کیونکہ اس صورت میں اس بچے کی ہلاکت کا سبب خود بچے کا اپنا فعل قرار پائے گا اور یہ صورت ایسی ہے جیسے کسی کو اقدام قتل پر مجبور کیا جائے۔ اسی طرح اگر کوئی جانور کسی پر اچانک آپڑے اور وہ اس جانور کو جان سے مار دے تو اس پر کوئی تاوان عائد نہ ہوگا۔ کیونکہ اس نے اپنی جان بچانے کے لیے ایسا کیا۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ رات کا وقت ہو یا دن کا اگر ایک عاقل و بالغ شخص کسی پر ہتھیار سے حملہ کرنا چاہے یا رات کے وقت لاٹھی اٹھالے یا دن کے وقت بستی سے دور (سنان) راستے میں لاٹھی تان لے اور جسے مارنا چاہتا تھا اس نے اس شخص کو عمدہ قتل کر دیا تو اس پر کوئی الزام عائد نہ ہوگا چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”من شہر علی المسلمین سیفاً

فقد اطل دمہ“ (جس نے مسلمانوں پر تلوار سنت لی اس کا خون بلا قصاص ہوگا) اور اس لیے بھی کہ ایسے شخص کو باغی قرار دیا جائے گا اور اس کی زندگی غیر محفوظ گردانی جائے گی اور جب کسی سے جان بچانے کا یہی طریقہ رہ جائے تو اسے قتل کرنا جائز ہے تاکہ اپنی جان کو شر سے بچایا جاسکے۔ ایسی حالت میں شر کو دور کرنا روایا واجب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہتھیار کی ضرب کو روکا نہ جاسکے تو اسے ہٹانے کے لیے قتل کر دینا ضروری ہے۔ اگر چھوٹی سی لاشی (اس کے ہاتھ میں) ہو تو گو اس کو روکا جاسکتا ہے لیکن رات کے وقت جب مدد نہ مل سکتی ہو تو مجبوراً اس سے بچاؤ قتل کرنے ہی سے ہو سکتا ہے یہی صورت دن کے وقت شہر سے دور ایسے راستے کی ہے جہاں کوئی مدد نہ مل سکتی ہو یا بیابان ہو کہ وہاں ایسی صورت میں اس شخص کو قتل کر دیا جائے تو خون معاف ہے اور قاتل پر کوئی الزام نہ ہوگا۔

اگر ایک پاگل نے کسی شخص پر ہتھیار سنت لیا یا مال محفوظ کو جو مالک کا حق تھا تلف کرنے لگا اور اس شخص نے اپنے ارادہ سے اسے قتل کر دیا تو اس شخص پر خون بہا عائد ہوگا جو اس کے مال سے واجب الادا ہوگا کیونکہ اس نے ایک بے قصور کو، جس کا قتل جائز نہ تھا، قتل کیا یا (قتل نہیں تو تاوان لینے کی شکل میں) وہ مال ضائع کیا جو مالک کا حق تھا۔ واضح ہو کہ کسی جانور کا عمل مستوجب قتل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہی حال دونوں کا ہے۔ اگر چہ ان کی جان کا تحفظ ان کا حق ہے کیونکہ انہیں صحیح معنوں میں اپنے افعال پر اختیار نہیں ہے۔ بناء بریں اگر ان سے یہ فعل سرزد ہو تو ان پر قصاص واجب نہ ہوگا بخلاف اس صورت کے جب کہ بالغ عاقل انسان سے یہ حرکت سرزد ہوئی ہو کیونکہ صحیح معنوں میں اس کا یہ فعل بالارادہ متصور ہوگا۔ اگر ایسے شخص کو عداً ہتھیار سے قتل کیا جائے۔ تب بھی قصاص واجب نہ ہوگا۔ کیونکہ اس حالت میں وہ قتل حفاظت خود اختیاری کی بناء پر روا متصور ہوگا البتہ دیت (خون بہا) واجب ہوگی تاکہ ایک بے قصور مسلمان کا خون رائگاں نہ جائے۔

اگر ایک شخص نے دوسرے شخص پر ہتھیار سنت لیا اور اس شخص نے پہلے تو اسے مارا اور بعد میں قتل کر دیا تو قاتل پر قصاص عائد ہوگا۔ کیونکہ جب اسے مارا اور وہ باز آ گیا تو باز آ جانے کے باعث جنگ ختم ہو گئی اور (حملہ آور کو) اپنی جان بچانے کا حق حاصل ہو گیا (اور اس کا قتل ناروا ہو گیا)۔

اگر ایک شخص کسی کے ہاں رات کو گھس آیا اور مال چوری کر کے اٹھایا صاحب خانہ نے اس کا پیچھا کیا اور اپنا مال اس سے واپس لینے کے لیے اس کو قتل کر دیا تو قاتل پر کوئی الزام نہ ہوگا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے ”قاتل دون مالک“ (یعنی مالک مال ایسی صورت میں قاتل قرار نہ دیا جائے گا) پھر یہ بھی ہے کہ اگر پہلے ہی اسے قتل کر دے تو بغرض تحفظ مال یہ عمل روا ہوگا اور اگر اپنا مال واپس لینے کے لیے بعد میں قتل کیا تب بھی یہی حکم ہے، لیکن یہ حکم اسی صورت میں ہے جبکہ (مال مسروقہ کی) واپسی بدون قتل ممکن نہ ہو۔

اگر کسی شخص نے مسلمانوں کے راستے میں کنواں کھود دیا یا پتھر رکھ دیا کہ ادھر سے گزرنے والا ہلاک ہو جائے تو اس شخص کے ذمہ داروں پر خون بہا عائد ہوگا اگر اس کی اس حرکت سے کوئی مویشی ہلاک ہو جائے تو اس کے مال میں سے اس کا تاوان واجب الادا ہوگا۔ کیونکہ یہ عمل اس کی زیادتی تھی اور اس کے نتیجہ میں جو نقصان ہوا اسے بھرنا پڑے گا۔ بجز اس صورت کے جبکہ ادائے تاوان کا ذمہ دار مال کے عوض جان دینا گوارا کرے۔ رہا جانور کے نقصان کا تاوان سو خاص طور پر

اس کے مال سے واجب الادا ہوگا۔ یاد رہے کہ راستے پر مٹی کا ڈھیر کر دینا یا مٹی کھود لینا ایسا ہی جرم ہے جیسے پتھر یا لکڑی کا راستے پر رکھ دینا۔ اگر کسی نے راستے پر جھاڑ ددی یا چھڑکاؤ کیا اور اس سے کسی (آنے جانے والے کو) تکلیف پہنچی تو اس پر کوئی تاوان نہیں ہے۔ اس شخص نے راستے میں لا کر کچھ نہیں ڈالا، اس کا تو ارادہ یہ تھا کہ راستے پر سے تکلیف دہ اشیاء کو ہٹا دے۔ ہاں اگر راہ میں کوڑا کرکٹ جمع کیا اور کوئی انسان اس میں الجھ کر رہ گیا تو اس شخص کو اس کا تاوان ادا کرنا پڑے گا۔ کیونکہ راستہ میں کوڑا کرکٹ جمع کرنا ظلم ہے۔

اگر ایک شخص نے راہ میں پتھر رکھ دیا اور کسی نے اسے وہاں سے ہٹا دیا جس کے باعث ایک انسان کو تکلیف پہنچی تو جس نے ہٹایا اس پر تاوان عائد ہوگا۔ کیونکہ جس ارادہ سے وہ پتھر رکھا گیا تھا اس کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

اگر راستے میں چوبچہ (یعنی کٹر پائیک) کھودا گیا اور حکومت نے اس کا حکم دیا تھا یا پہلے سے لوگوں کو بتا دیا گیا تھا۔ تاہم اس سے کسی کو نقصان پہنچا تو اس نقصان کا تاوان اس شخص پر عائد نہ ہوگا، کیونکہ یہ زیادتی نہیں ہے اس لیے کہ یہ حکم جس نے دیا اسے عوام کے حقوق کی نگہداشت کا حق حاصل ہے۔ لیکن اگر چوبچہ کا کھودنا یا اس کے اوپر سے ڈھکنا ہٹا دینا بغیر حکم کے ہوا تو یہ ظلم ہے اور اس حالت میں جو نقصان ہوگا اس کا ڈنڈ بھرنا پڑے گا یا تو اس لیے کہ اس نے مداخلت بیجا کی یا اس لیے کہ حاکم کی رائے کی خلاف ورزی کی یا اس کا ایسا کرنا اس حال میں روا ہے جبکہ وہ کام بے ضرر تھا۔ یہی حکم ان تمام ناجائز تصرفات کا ہے جو شارع عام پر کیے جائیں۔

اگر کسی نے اپنی زمین میں کنواں کھودا تو اس پر کوئی تاوان نہیں ہے، کیونکہ اس میں کسی پر زیادتی نہیں کی گئی، یہی حکم اس صورت میں ہے جبکہ کسی نے اپنے گھر کے میدان میں کھودا، یہ فعل اس نے اپنے گھر کی مصلحت کے پیش نظر کیا اور وہ اس میدان (یا مکن) کا مالک ہے۔

اگر کسی نے راستے میں گڑھا کھودا اور اس میں کوئی شخص گر پڑا اور بھوک پیاس سے مر گیا تو گڑھا کھودنے والے پر کوئی تاوان نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کی موت کا سبب اس کی اپنی حالت (بھوک پیاس کی شدت) ہے۔ اس گڑھے کو اس موت کا موجب قرار نہیں دیا جائے گا ہاں اس صورت میں تاوان واجب ہوگا جبکہ محض گرنے کے باعث وہ مر جائے۔

امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ اگر بھوک سے مر اتب تو اس کا یہی حکم ہے، ہاں اگر گرنے کی تکلیف سے مر تو کھودنے والے کو اس کا ذمہ دار گردانا جائے گا۔ کیونکہ وہ تکلیف (جس کے باعث وہ ہلاک ہوا) اس کا سبب گڑھے میں گرنے کے سوا نہیں ہے، ہاں بھوک ایسی شے ہے جو کنوئیں میں گرنے پر منحصر نہیں ہے۔

امام محمد فرماتے ہیں ان تمام صورتوں میں گڑھا کھودنے والے ہی کو ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا کیونکہ گڑھے میں گر پڑنے کا باعث ہی اسے بھوکا (پیا سا) رہنا پڑا، اگر نہ گرتا تو خوراک اسے مل ہی جاتی۔

اگر شخص نے اجرت پر مزدوروں کو کنواں کھونے کے لیے لگایا اور انہوں نے اس کے لیے ایسی جگہ پر کنواں کھودا جس کا وہ شخص مالک نہ تھا (اور اس میں گرنے کا واقعہ پیش آیا) تو تاوان کا ذمہ دار صرف وہ شخص ہوگا جس نے مزدور لگائے، اور اگر مزدوروں کو معلوم تھا (کہ یہ پرائی زمین ہے) تو مزدوروں پر تاوان عائد ہوگا۔ کیونکہ اس شخص کو ایسی بات کے لیے حکم دینے کا حق ہی نہیں ہے جس کا اسے اختیار نہ تھا۔ اور یہ بھی نہیں کہ اس میں دھوکا ہوا ہو۔ ان اصحاب کا یہ قول بھی ہے کہ اگر کسی بچے یا بالغ کو سمندر میں ڈال دیا تو اس پر قصاص (خون کا بدلہ خون عائد نہ ہوگا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

ہے ”الا ان قتل خطا العمد قتيل السوط والعصا“ (یعنی یاد رکھو کہ اگر کوئی کوڑا لگنے یا چوبدستی سے ہلاک ہو جائے تو وہ جرم خطائے عمد ہے) پس اس جرم میں اور غلطی سے قتل واقع ہو جانے میں صرف تاوان عائد ہوگا۔ اور اس لیے بھی کہ ایسا آلہ جو نہ قتل کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہو اور نہ اس کے لیے بنایا گیا ہو اسے بارادہ قتل استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا یہاں یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ ارادہ قتل نہ تھا۔ حالانکہ قصاص کی بنیاد مماثلت پر ہے (یعنی جس طرح قصداً قتل کیا اسی طرح قصداً پھانسی ملنی چاہیے) اور محاورہ میں بولتے ہیں ”اقتص اثرہ“ (یعنی فلاں شخص نے فلاں کی روشن اختیار کی)۔

یہ اصحاب یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے کسی کو آگ میں جلا کر مار دیا تو اس سے ویسا ہی قصاص لیا جائے گا جو تلوار سے قتل کرنے کا ہے یہی حکم نوکدار لوہے یا لوہا لگی ہوئی لکڑی یا دھاردار پتھر سے قتل کرنے کا ہے کہ ان سب صورتوں سے تلوار سے قتل والا قصاص عائد ہوگا کیونکہ یہ قتل عمد ہے۔

پھر یہ اصحاب کہتے ہیں کہ اگر کسی نے خود اپنا سر پھوڑ لیا اور کسی نے زخمی کر دیا اور اسے شیر نے پھاڑ کھایا اور یا سانپ نے ڈس لیا اور ان تمام باتوں سے موت آگئی تو اس اجنبی شخص پر ایک تہائی خون بہا عائد ہوگا: کیونکہ شیر اور سانپ کے معاملہ کی تو ایک ہی حیثیت ہے کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں حیثیت سے رائگاں ہے۔ (یعنی نہ اس کی یہاں پرش نہ وہاں پرش) اور خود اپنے آپ کو زخمی کرنا دنیا میں رائیگاں ہے۔ (کہ اس پر کوئی کارروائی نہ ہوگی) البتہ یہ آخرت کا جرم ہے اور اس کا گناہ ہوگا۔ چنانچہ ایسے شخص کو ابو حنیفہ اور امام محمد کے نزدیک غسل دیا جائے گا، اور اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی لیکن امام ابو یوسف کے نزدیک غسل تو دیا جائے گا کہ نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔ کیونکہ اس نے خود کو زخمی کر کے اپنی جان پر ظلم کیا۔ اور اس اجنبی شخص کا عمل دنیا اور آخرت دونوں جگہ قابل مؤاخذہ ہے، اس طرح (قتل کے اسباب میں) تین باتیں جمع ہو گئیں۔ لہذا تیسرا سبب پورے عمل کے ایک تہائی کا ذمہ دار ہوگا لہذا اس پر ایک تہائی خون بہا عائد ہوگا۔

زخم کے اثر سے موت واقع ہو جانے کا بیان

ائمہ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر ایک شخص نے کسی کو ارادنا زخمی کر دیا اور زخمی ہونے کے بعد وہ شخص مسلسل بیمار رہا یہاں تک کہ اس زخم کے اثر سے وہ مر گیا تو زخمی کرنے والے پر قصاص عائد ہوگا، کیونکہ اس کی موت کا سبب وہی تھا یعنی اس کے جسم کا خون مسلسل اور عدا بہانا، پھر کوئی ایسی بات بھی پیش نہیں آئی جو اس جرم کو باطل کرتی ہو مثلاً معافی دینا یا ارتکاب جرم میں شبہ کا ہونا۔ جس سے جرم کی سزا سے درگزر کرنا واجب ہو جائے، لہذا بہر حال اس جرم کو اس شخص سے منسوب کیا جائے گا۔

اس پر بھی اتفاق ہے کہ جب خون کے بدلے خون کا سوال ہو، کہ قتل عمد کی پاداش میں قصاص کا حکم نافذ کیا جائے تو آزاد کے بدلے آزاد کو، غلام کے بدلے غلام کو، عورت کے بدلے عورت کو، ذمی کے بدلے ذمی کو اور پناہ گیر کے بدلے پناہ گیر کو (سزائے قتل ہوگی) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”کتب علیکم القصاص فی القتل، الحر بالحر والعبد بالعبد والانی بالانی“ (یعنی لوگو تم پر قصاص یا خون کا بدلہ خون فرض ہے، آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت) اس آیت میں ہم نوع قاتل و مقتول کا ذکر ہے یہ نہیں بتایا گیا کہ ایک نوع کا شخص دوسری نوع کے شخص کو قتل کرے تو کیا حکم ہے، اس اجمال کو اللہ تعالیٰ نے اس ارشاد میں دور فرما دیا ہے ”وکتبنا علیہم فیہا ان

النفس بالنفس“ (یعنی ہم نے اس میں یہ فرض کر دیا ہے کہ جان کے بدلے جان ہے) اس کی مزید تفصیل ان واقعات سے ہوتی ہے کہ: ایک یہودی کو ایک عورت کے قتل کرنے پر قتل کیا گیا، اس عورت نے غزوہ خیبر کے ایام میں، آنحضرت ﷺ کے ایک صحابی کو کھانے میں زہر دے کر ہلاک کر دیا تھا۔

کافر کو قتل کرنے کا بیان

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر کم درجہ کا آدمی اونچے درجہ کے آدمی کو قتل کر دے تو اس کو قتل کیا جائے گا مثلاً کوئی ذمی (اسلامی حکومت کا غیر مسلم باشندہ) ایک مسلمان کو قتل کر دے یا ایک آزاد اہل کتاب کسی مسلمان کو قتل کر دے (تو اسے قتل کر دیا جائے گا) کیونکہ مسلمان ہونے کو آزاد ہونے پر برتری حاصل ہے لیکن اگر اعلیٰ رتبہ کا آدمی ادنیٰ رتبہ کے آدمی کو قتل کر دے تو قاتل کو سزائے قتل نہیں دی جائے گا۔ مثلاً کافر کو قتل کر دینے پر مسلمان کو سزائے قتل نہ ہوگی یا آزاد اہل کتاب کے قتل کرنے پر مسلمان غلام کو قتل نہیں کیا جائے گا، نیز عورت کو قتل کرنے پر مرد کو سزائے قتل نہ ہوگی، بشرطیکہ قاتل آزاد ہونے یا مسلمان ہونے کے باعث مقتول پر برتری نہ رکھتا ہو، اور مریض کو قتل کرنے پر تندرست کو سزائے قتل نہ ہوگی ہر چند کہ مریض آمادہ بمرگ اور ہلاکت کے قریب ہو۔ اسی طرح ناقص الاعضاء جس کے اعضاء میں عیب ہو مثلاً لولا، لنگڑا یا بہرا، اندھا اگر کوئی تندرست صحیح الاعضاء اسے قتل کر دے تو اسے سزائے قتل دی جائے گی۔ فقہاء نے اس مسلک کے ثبوت میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی یہ روایت پیش کی ہے کہ قیس بن عبادۃ الاشقر نے حضرت ممدوح سے عرض کیا ”هل عهد اليه رسول الله ﷺ عهداً لم يعهده الى الناس؟ قال لا الا ما في كتابي هذا، واخرج كتاباً من قراب سيفه، فاذا فيه: المؤمنون تتكافأ دماؤهم، ويسعى بذمتهم اداناهم، وهم يد على من سواهم، ولا يقتل مؤمن بكافر، ولا ذو عهد في عهده لواحد حدث حدثاً، او آوى محدثاً فعليه لعنة الله والملائكة، والناس اجمعين“ بروایت ابوداؤد (یعنی قیس بن عباد اشقر نے حضرت ممدوح سے عرض کیا کہ آیا رسول اللہ ﷺ نے انہیں کوئی ایسی بات کہی ہے جو لوگوں کو نہیں کہی فرمایا ”نہیں“ سوا اس کے جو میری اس تحریر میں ہے، آپ نے اپنی تلوار کی میان سے ایک تحریر نکالی جس میں یہ درج تھا کہ (مسلمانوں کے خون باہم مساوی ہیں، ادنیٰ رتبہ کا مسلمان بھی اپنے حق کا مطالبہ کر سکتا ہے، مسلمانوں کو دوسرے تمام انسانوں پر بالادستی حاصل ہے۔ چنانچہ کافر کے بدلے مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا اور، نہ معاہدہ کو بدوران عہد، اگر کسی نے ایسی واردات کی یا واردات کرنے والے کو پناہ دی اس پر اللہ، اس کے فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے) اور یہ بھی ہے کہ حضرت عمرو بن شعیب نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اس کے دادا سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ ”لا يقتل مؤمن بكافر“ (یعنی قتل کافر کے عوض مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا)۔

نزلت ابو حنیفہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا ”هل عندكم شيء من الوحي غير القرآن؟ قال: لا، والذي فلق الحبة، وبرأ النسمة، الا فهم يعطيه الله تعالى رجلاً في القرآن الكريم، وما في هذه الصحيفة، قلت وما في هذه الصحيفة قال: العقل وفكاك الاسير، وان لا يقتل مسلم بكافر“ (یعنی آیا آپ لوگوں کے پاس قرآن کے علاوہ بھی کوئی وحی ہے۔ فرمایا اس

ذات کی قسم ہے جس نے بیچ کو پھاڑا اور نسیم کو پیدا کیا ہمارے پاس کچھ نہیں ہے سوا اس فہم قرآن کریم کے جو اللہ تعالیٰ نے کسی کو عطا فرمائی اور جو کچھ اس صحیفہ میں ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اس میں کیا ہے؟ فرمایا خون بہا اور قیدی کی رہائی اور یہ کہ کسی مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا) بروایت بخاری۔ اس کا اخراج ابوداؤد اور نسائی رحمہما اللہ نے کیا۔

اس کے علاوہ ان اصحاب نے یہ دلیل بھی دی ہے کہ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ کسی مسلمان کو اس حربی کے قتل پر جس کی جان بخشی کی گئی ہو اور وہ مسلمانوں کی پناہ میں ہو۔

فقہاء کا کہنا ہے کہ ایک ذمی (کے قتل) کے بدلے مسلمان کو سزائے موت نہیں دی جائے گی۔ بجز اس صورت کے جبکہ قاتل نے اسے لٹا کر ذبح کیا ہو یا اگر دھوکا دے کر مارا اور اس کے مال پر قبضہ کر لیا ہو۔ ایسی صورت میں (سزا کے لیے) شرائط سابقہ ضروری نہ ہوں گی بلکہ اسے قتل کر دیا جائے گا اور اس میں اسی نامہ یا معافی نہیں ہے۔

شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ (قصاص کے لیے) قاتل اور مقتول کے درمیان مماثلت اور صفات میں مساوات شرط ہے۔ یعنی قاتل کو اسلام، امان، آزادی، بنائے نسل اور آقا (یعنی مالک یمین) کی حیثیت سے مقتول پر برتری حاصل نہ ہو۔ ایسی صورت میں جرم کی اہمیت کو پیش نظر رکھا جائے گا۔ لہذا اگر مسلمان کسی ذمی یا اہل کتاب کو قتل کر دے تو اسے سزائے قتل نہ ہوگی گو قاتل شادی شدہ زانی ہونے کے باعث (مستوجب رجم ہو) یا قصد امارت صلوٰۃ ہو۔ اور بخاری رحمہ اللہ علیہ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ حضور نے فرمایا "لا یقتل مسلم بدمی" (یعنی مسلمان کو ذمی (غیر مسلم رعایا) کے قتل پر سزائے موت نہیں دی جائے گی)۔

ابن منذر کہتے ہیں کہ نبی ﷺ سے کوئی ایسی روایت مروی نہیں ہے جو اس کے خلاف ہو، جان کے علاوہ کسی اور جرم کے عوض کافر کو مسلمان سے تاوان لینے کا حق نہیں ہے اس پر سب کا اتفاق ہے۔ جیسا کہ ابن عبد البر کہتے ہیں تو جان لینے کا بدرجہ ادنیٰ حق نہ ہوگا اور حدیث مذکورہ بالا متقاضی ہے کہ اس کے مفہوم میں جملہ اقسام کے کافر کو شامل کیا جائے۔ لہذا من مانے طور پر مخصوص قسم کے کافر (یعنی کافر حربی) مراد لینا جائز نہیں ہے۔ اس لیے بھی کہ اگر اس کا مفہوم وہی لیا جائے جو حنفی لیتے ہیں تو اس سے کچھ فائدہ نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں یوں کہنا پڑے گا "لا یقتل المسلم اذا قتل کافر احب الیہ" (یعنی اگر مسلمان برسر پیکار کافر کو قتل کرے تو اس مسلمان کو سزائے قتل نہ ہوگی) اب ظاہر ہے کہ ایسے کافر کو قتل کرنا عبادت ہے، یہ بات کب عقل میں آتی ہے کہ ایسے شخص کو قتل کیا جاسکتا ہے۔

ایک ذمی (غیر مسلم رعایا) کو کسی مسلمان کے قتل کرنے کے بدلے سزائے قتل دی جائے گی کیونکہ مسلمان کا رتبہ زیادہ ہے۔ اگر مختلف مذاہب کے ذمی ہوں تو ایک کے قتل پر دوسرے کو سزائے قتل ہوگی مثلاً کوئی یہودی عیسائی کو قتل کر دے۔ اگر کوئی ذمی اپنے جیسے ذمی کو قتل کر دے اور پھر مسلمان ہو جائے تو قصاص ساقط نہ ہوگا کیونکہ ارتکاب جرم کے وقت دونوں ایک جیسے تھے اور سزا کے لیے جرم کی اہمیت کا تعین وقت ارتکاب کے پیش نظر کیا جاتا ہے اور یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ارتکاب جرم کے بعد مجرم کیسا ہو گیا۔

یہ اصحاب کہتے ہیں کہ مرد کو عورت یا مخنث کے قتل کرنے پر سزائے موت ہے یہی حکم اس کے برعکس ہونے کا ہے۔ اسی طرح جاہل کے بدلے عالم کو اور کمین کے بدلے شریف کو اور جوان کے بدلے بوڑھے کو یا اس کے برعکس ہو تو مجرم کو سزائے قتل ہوگی۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے مراسلہ میں جو انہوں نے اہل یمین کو بھیجا تھا تحریر فرمایا "ان الذکر یقتل

بالانسی“ (یعنی مرد عورت کا قاتل ہو تو اسے سزائے قتل ہے) بروایت نسائی۔ نیز آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے ”المؤمنون تكافأ دماؤہم، ویسعی بذمتہم ادناہم، وہم یسد علی من سواہم“ (یعنی تمام مسلمانوں کے خون یکساں (محترم) ہیں۔ ادنیٰ درجہ کا مسلمان اپنے حق کے مطالبہ کا حق رکھتا ہے۔ البتہ مسلمانوں کے علاوہ دوسرے اشخاص پر مسلمانوں کو بالادستی حاصل ہے)۔

اگر ایک ذمی نے دوسرے ذمی کو زخمی کر دیا پھر زخمی کرنے والا مسلمان ہو گیا اس کے بعد وہ مجروح زخم کے اثر سے وفات پا گیا تو وہ قصاص (خون کا بدلہ خون) جو اس پر عائد ہوا ہے وہ ساقط نہ ہوگا۔ کیونکہ جس وقت اس نے وہ زخم پہنچایا تھا جس کے اثر سے مجروح ہلاک ہوا اس وقت دونوں کی حیثیت یکساں تھی۔ اسی طرح اگر مقتول زخمی ہونے کے وقت یا زخم کھانے کے بعد مسلمان ہو گیا تو اس کے کافر و رثاء مطالبہ قصاص کا حق نہیں رکھتے۔ البتہ اس کی جانب سے حاکم مطالبہ قصاص کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کا وارث دعویٰ کرے۔ اگر وارث مطالبہ نہ کرے تو امام کو قصاص لینے کا حق نہیں ہے اور آزاد شخص کو کسی مملوک کے قتل پر سزائے موت نہیں دی جائے گی۔ ملکیت میں آیا ہوا غلام، مکاتب (وہ غلام جسے ایک خاص رقم کے عوض پر وائے آزادی کا وعدہ کیا گیا ہو) اور ام ولد (وہ لونڈی جس سے اولاد ہو گئی ہو، ان میں سے کوئی ایک اگر دوسرے کو قتل کر دے اور قتل کرنے یا جراحت رسانی کے بعد قاتل کو آزاد کر دیا جائے تو وہ ایسا ہی ہے جیسے مسلمان ہو جانا۔ یعنی سزائے قصاص ہرگز ساقط نہ ہوگی۔ مسلمان غلام کو یا آزاد شخص ذمی کو قتل کر دے تو قصاص کا سوال پیدا نہ ہوگا کیونکہ اسلام کو (کفر پر) برتری اور عزت حاصل ہے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ مسلمان ذمی کو قتل کر دے تو وہ مستوجب سزائے قتل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا جو ارشاد ہے ”الحر بالحر والعبد بالعبد والأشی بالانسی“ (یعنی آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت) کا جو حکم ہے وہ عورت کے قتل پر مرد کو یا اس کے برعکس مرد کے قتل پر عورت کو قتل کا مستوجب قرار دینے کے منافی نہیں ہے اس پر سب کا اتفاق ہے۔ کیونکہ آیت میں جو خاص طور پر ہم نوع کے قتل کا ذکر ہے اس کا مقصد اس خیال کی تردید ہے کہ قاتل کے علاوہ کسی اور کو (قصاص میں) قتل کیا جاسکتا ہے۔ اس کی صورت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں یوں آئی ہے کہ عرب کے دو قبیلوں میں سے ایک دوسرے سے افضل ہونے کا دعویٰ کرتا تھا، ان دونوں میں باہم کشت و خون ہوا افضل ہونے کا دعویٰ کرنے والے قبیلہ کا اصرار تھا کہ ہم میں سے جو عورتیں قتل ہوئی ہیں جب تک ان کے بدلے دوسرے قبیلے کے مردوں کو اور ہمارے غلاموں کے بدلے آزاد شخصوں کو قتل نہ کیا جائے ہم راضی نہ ہوں گے۔ لہذا ان کے مطالبہ کی تردید میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی جس میں ایکساں حیثیت کے بایں قتل کے متعلق احکام نازل ہوئے کہ آزاد شخص آزاد کو قتل کرے تو اس کا یہ حکم ہے کہ قاتل یا قاتلہ کو سزائے قتل دی جائے گی۔ اس آیت میں وہ مسائل نہیں بتائے گئے جس کا تعلق ایک نوع کے شخص کے دوسرے نوع کے شخص کو قتل کرنے سے ہے۔ پس یہ آیت اس خاص حکم کے بارے میں قطعی ہے۔ اس میں جو امر غیر واضح ہے اس کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں فرمائی ہے۔ ”وکتبتنا علیہم فیہا ان النفس بالنفس“ (یعنی ہم نے قرآن میں مسلمانوں کو جان کے بدلے جان کا حکم دیا ہے) اور مسلمان کا ذمی کے قتل کی پاداش میں قتل کرنا بھی جان کے بدلے جان لینا ہے۔ اس کی مزید وضاحت آنحضرت ﷺ نے اپنے طریق عمل سے فرمادی ہے کہ بقول مجاہد (حضور نے) ایک عورت قتل کرنے پر یہودی کو سزائے قتل دی۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ قصاص میں ایک ذمی (کی جان) بھی مسلمان (کی جان) کے برابر ہے۔ خون کا احترام دائمی ثابت شدہ امر ہے اور اسی طرح قابل احترام ہے جیسے مسلمان کا خون۔ پھر یہ کہ دونوں دارالاسلام (یعنی اسلامی حکومت) کے رہنے والے ہیں اور جس امر سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس مسلمان کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے جو کسی ذمی (غیر مسلم رعایا) کا مال چرائے۔ مال کی حرمت مالک مال کی حرمت کے ساتھ وابستہ ہے (یعنی مالک کی جان حرام ہے تو اس کا مال بھی حرام ہے)۔

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی ایک چشم (کانا) یا لہجہ ایسے شخص کو قتل کر دے جس کے اعضاء سالم ہیں تو مقتول کے وارث کو یہ حق نہیں ہے کہ قاتل کو قتل کر دے اور نصف خون بہا بھی وصول کرے اس بناء پر اس نے دو آنکھوں والے کو قتل کیا حالانکہ وہ خود کاٹا تھا یا دو ہاتھوں والے کو قتل کیا حالانکہ وہ خود لہجہ تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک جان دوسری جان کے مساوی رتبہ رکھتی ہے۔ اسی طرح (جان کے معاملہ میں) بچہ بوڑھا برابر ہیں۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو محمد بن الحسن نے ابراہیم رحمہما اللہ سے روایت کی ہے "ان رجلاً من المسلمین قتل رجلاً من اهل الذمة، فرفع ذلك الى رسول الله ﷺ فقال: انا احق من وفي بدمته، ثم امر به فقتل" (یعنی ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کر دیا۔ یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کے پیش ہوا، حضور نے فرمایا کہ میں اس کی ذمہ داری قبول کرنے کا سب سے زیادہ حقدار ہوں، چنانچہ آپ نے حکم دیا اور اس مسلمان کو قتل کر دیا گیا)۔ پھر یہ بھی ہے کہ قصاص کی بنیاد تحفظ حق میں یکسرانیت پر ہے اور یہ حق طرفین کو ذمہ دار (پابند احکام) ہونے اور ہم وطن ہونے کی حیثیت سے حاصل ہے۔ رہا وہ کفر جس سے خون روا ہو جاتا ہے، اس سے مراد ایسے کافر کا خون کرنا ہے جو مسلمانوں سے برسر پیکار ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "قاتلوا الذين لا يؤمنون بالله ولا باليوم الآخر، ولا يحرمون ما حرم الله ورسوله، ولا يدينون دين الحق من الذين اتوا الكتاب، حتى يعطوا الجزية عن يد وهم صاغرون" (التوبہ: ۲۹) (یعنی ان اہل کتاب سے قتال کرو جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان نہیں لاتے۔ نہ اللہ و رسول کی حرام کردہ شے کو حرام جانتے ہیں اور نہ دین حق کے پیرو ہیں۔ تا وقتیکہ وہ بطور ایک ماتحت کے بہ اختیار خود جزیہ دیں)۔

پھر یہ ہے کہ ایک ذمی دوسرے ذمی کے قتل کرنے پر مستوجب قتل ہوتا ہے۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ذمی کے کافر ہونے میں شبہ نہیں ہے کیونکہ اس میں شبہ ہو تو قصاص ہی (سرے سے) عائد نہ ہوتا۔ اور اس لیے بھی کہ ایک شخص کے مسلمان ہونے کو ایک ذمی سے آزاد ہونے پر فوقیت حاصل ہے اور اعلیٰ کو ادنیٰ کے قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ نیز مسلم کو مستامن (غیر مسلم پناہ گیر) کے قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس کا خون ہمیشہ کے لیے غیر محفوظ ہوتا ہے کیونکہ اس کا کفر اسے جنگ کے لیے اکساتا رہتا ہے اور وہ اپنے علاقہ (دارالحرب) میں واپس جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ لہذا وہ بھی حربی شمار ہوگا۔

عورت کے قتل پر مرد کو، چھوٹے کے قتل پر بڑے کو، ایک چشم، اپا ج عضو بریدہ یا جنون زدہ کے قتل پر تندرست کو مستوجب قتل قرار دیا جائے گا کیونکہ اس کے بارے میں جو آیات آئی ہیں ان کا حکم عام ہے اور وہ قصاص (خون کے بدلے خون) کو واجب قرار دیتی ہیں۔ اور اس لیے بھی کہ اگر حق تحفظ سے قطع نظر کر کے ان میں فرق مراتب کا لحاظ کیا

جائے تو (سرے سے) قصاص ہی ممنوع ہو جائے گا اور افراد معاشرہ میں باہم ایک دوسرے کو مٹانے اور قتل کرنے کا بازار گرم ہو جائے گا۔

غلام کے قتل پر آزاد کو سزائے قتل کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک آزاد شخص (یعنی جو غلام مملوک نہ ہو) کسی آزاد کو یا غلام کو قتل کر دے تو قاتل مستوجب قتل ہوگا کیونکہ قصاص کے بارے میں جو آیتیں آئی ہیں وہ عام (یعنی سب کے لیے) ہیں اور اس لیے بھی کہ قصاص میں مساوات تحفظ پیش نظر ہوتا ہے کہ فریقین مذہب کے اعتبار سے مساوی ہوں (یعنی دونوں کا مذہب ایک ہو یا ملک ایک ہو) اس میں آزاد اور غلام یکساں ہیں لہذا ان میں حکم قصاص نافذ ہوگا اور کسی کا کافر ہونا مانع قصاص نہیں ہے کیونکہ اگر فریقین غلام ہوں اور باہم صلح کر لیں تو قصاص عائد نہ ہوگا۔ اسی طرح فریقین اگر مستامن (پناہ گیر) ہوں تو ان میں بھی قصاص نافذ نہ ہوگا (حالانکہ وہ کافر ہیں مطلب یہ ہے کہ کفر مانع قصاص نہیں بلکہ صلح مانع قصاص ہے) اور آیت میں خاص طور پر جو مرد کا ذکر آیا ہے وہ دوسری (موجبات قتل) کی صورتوں کے منافی نہیں ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”وَالْأَنْثَىٰ بِالنِّسَاءِ“ (یعنی عورت کے بدلے عورت) میں ہے (کہ یہاں خاص طور پر عورت کا ذکر ہے) اس سے یہ نہیں پایا جاتا کہ عورت مرد کو قتل کر دے تو اسے سزائے قتل نہ دی جائے یا اس کے برعکس مرد عورت کو قتل کر دے تو اسے سزائے قتل نہ ہوگی۔ اس پر سب کا اتفاق ہے۔ دراصل (آیت میں) مرد کے بدلے مرد یا عورت کے بدلے عورت کا جو ذکر ہے یہ محض اس کی تردید کے لئے ہے جو قاتل کے علاوہ کسی اور کے قتل کا مطالبہ کرے یا قصاص میں زیادتی کرے مثلاً یہ کہ ایک شخص کے قتل پر دس اشخاص کو قتل کیا جائے۔

اگر کوئی آزاد (جو غلام نہیں ہے) کسی غلام کو قتل کر دے اور اس غلام کا ”آقا“ (بطور قصاص) قتل کا مطالبہ کرے تو آزاد قاتل کو قتل کیا جائے گا اور آزاد کا خون بہا دے گا۔ غلام (مقتول) کی قیمت کا مطالبہ نہ ہوگا۔ ہاں اگر چاہے تو اس کی جان بخشی کر سکتا ہے اور اس کے عوض غلام کی قیمت وصول کر لے۔ حضرت امام علیؑ اور حضرت حسنؑ سے یوں ہی منقول ہے۔ حنفیہ اپنے مسلک کے ثبوت میں آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد پیش کرتے ہیں ”الْمُسْلِمُونَ تَتَكَافَأُونَ دِمَائِهِمْ وَيُسَمَّى بِلَدْمَتِهِمْ أَدْنَاهُمْ وَهُمْ يَدُ عَلٰی سِوَاهُمْ“ (یعنی تمام مسلمانوں کے خون مساوی ہیں۔ ادنیٰ مسلمان بھی اپنے حق کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ مسلمانوں کو ان کے علاوہ تمام اشخاص پر بالادتی حاصل ہے)۔

حضرت سرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”مَنْ قَتَلَ عَبْدَهُ قَتَلَنَاوْهُ وَمَنْ جَدَعَ عَبْدَهُ جَدَعَنَاوْهُ“ (یعنی جو شخص اپنے غلام کو قتل کرے گا ہم اس شخص کو قتل کریں گے اور جو شخص غلام کی ناک کان وغیرہ کاٹے گا ہم بھی اس شخص کے ناک کان وغیرہ کاٹیں گے)۔ اس حدیث کو احمد اور چار محدثین نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے بروایت حسن بصری اس کو حدیث حسن بتایا ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آزاد شخص غلام کے قتل پر جان اور اعضاء کے قصاص کا مستوجب ہے۔ اس حدیث میں لفظ ”جدع“ کے معنی ناک کان ہاتھ یا لب کو کاٹ دینے کے ہیں۔ جیسا کہ ”قاموس“ میں ہے۔

اس حدیث کے مفہوم کے پیش نظر یہ اصحاب کہتے ہیں کہ جب غلام کا قتل کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ آزاد کو قتل کرنا تو

اس کا قصاص بھی وہی واجب ہوگا جو آزاد شخص کا ہوتا ہے۔ امام نخعی اور ایک گروہ کا قول ہے کہ غلام کے قتل پر آزاد کو قتل کیا جائے گا خواہ وہ غلام خود قاتل کا ہو یا کسی اور کا۔ اس کا ثبوت وہ عمومیت ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں پائی جاتی ہے ”کتبنا علیہم فیہا ان النفس بالنفس“ (یعنی ہم نے مسلمانوں پر فرض کر دیا ہے کہ جان کے بدلے جان ہے) لیکن یہ ایک قول ضعیف ہے۔

مالکیہ شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ غلام کے قتل کرنے پر آزاد شخص کو قتل نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”الحر بالحر والعبد بالعبد“ (یعنی آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام مستوجب قصاص ہے) اس تقابل سے لازم آتا ہے کہ کسی آزاد کو غلام کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا۔ پھر یہ ہے کہ قصاص کی بنیاد فریقین کے مساوی (ہم رتبہ) ہونے پر ہے۔ یہ مساوات آقا اور غلام (یا مالک اور مملوک) کے درمیان نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ غلام کا عضو کاٹنے پر آزاد کا عضو نہیں کاٹا جاتا، بخلاف اس صورت کے جبکہ یہ معاملہ ایک غلام اور دوسرے غلام کے مابین پیش آئے۔ کیونکہ اس میں فریقین مساوی حیثیت رکھتے ہیں اور اس صورت میں جبکہ غلام آزاد شخص کو قتل کرے یہ حکم نہیں ہے کیونکہ غلام ادنیٰ حیثیت رکھنے کے باعث اس سے مختلف ہے۔ اور یہ اصحاب ادنیٰ حیثیت کے شخص کو اعلیٰ حیثیت والے کے قتل پر سزائے قتل دیتے ہیں۔ صورت حال اس کے برعکس ہے یعنی اعلیٰ حیثیت کا شخص ادنیٰ کو قتل کرے تو قاتل کو سزائے قتل نہیں ہوتی۔

ابو ثور کا کہنا ہے کہ در آنحالیکہ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ خون سے کم درجہ کے جرائم میں غلاموں میں آزادوں کے درمیان قصاص نہیں ہے تو قرین قیاس یہ ہے کہ جن کے معاملہ میں بدرجہ اولیٰ قصاص نہ ہو۔ اگر کوئی فقیہ ان دونوں کے درمیان فرق سمجھتا ہے تو وہ متضادات ہوگی۔

پھر اس پر اجماع ہے کہ اگر کسی نے غلطی سے غلام کو قتل کر دیا تو اسے صرف غلام کی قیمت ادا کرنی ہوگی (یعنی دیت یا خون بہا نہیں ہے)۔ پس جس طرح قتل خطا میں آزاد کو غلام کی مانند تصور نہیں کیا گیا اسی طرح قتل عمد میں بھی وہ اس کے مشابہ نہ ہوگا۔ پھر یہ بھی ہے کہ غلام کی حیثیت مال کی سی ہے۔ جس کی خرید و فروخت ہوتی ہے اور آقا جس طرح کی خدمت چاہے اس سے لے سکتا ہے۔ لہذا غلام اور آزاد میں نہ باہم مساوات ہو سکتی ہے نہ ہمسری ہوتی ہے ان اصحاب نے بخاری کی اس روایت سے بھی استدلال فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ”لا یقتل مسلم بکافر“ (یعنی کافر کے قصاص میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا)۔

عورت کے قصاص میں مرد کو قتل کئے جانے کا بیان

فقہائے اسلام اس قول پر متفق ہیں کہ مرد عورت کو بڑا چھوٹے کو تندرست مریض کو قتل کر دے تو قاتل کو سزائے قتل ہوگی۔ کیونکہ حکم قصاص کی متعلقہ آیات کا مفہوم عام ہے (یعنی سب پر عائد ہوتا ہے)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی یہی تھا۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس یہودی کو سزائے قتل کا حکم دیا تھا جس نے مدینہ میں ایک مسلمان عورت کو قتل کرنے کا اقرار کر لیا تھا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت عبداللہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی مرد کسی عورت کو قتل کر دے تو اسی طرح مستوجب قصاص ہوگا جس طرح عورت کسی مرد کے قتل پر ہوتی ہے۔ نیز حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد آیا ہے ”المسلمون تتکافؤ دماؤہم“ (یعنی تمام مسلمانوں کا خون

یکساں قابل احترام ہے) لہذا عورت مطالبہ قصاص کے حق میں مرد کے برابر ہے اور وہ اس حدیث کے تحت آتی ہے پھر یہ بھی ہے کہ اگر تحفظ جان کے حق کو نظر انداز کر کے انسانوں کے درمیان فرق مراتب کو تسلیم کر لیا جائے تو قصاص کا نفاذ سرے سے ناممکن ہو جائے گا اور اس سے خرابیاں پیدا ہوں گی۔ اللہ کے بندے ایک دوسرے کو ختم کرنے لگیں گے جس سے فساد پھیلے گا۔ جو ٹھیک نہیں ہے۔ نیز مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن حزم کو ایک مراسلہ میں لکھا تھا ”ان الرجل يقتل بالمرأة“ (یعنی عورت کے قصاص میں مرد کو قتل کیا جائے)۔

قتل سے ادنیٰ جرائم میں مرد اور عورت کے درمیان نفاذ قصاص کا بیان

شافعیہ مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ قتل سے کم درجہ کے جرائم میں بھی مردوں اور عورتوں کے درمیان قصاص جائز ہے ان اصحاب نے اعضائے بدن کو جان پر قیاس کیا ہے کیونکہ اعضاء جان کے تابع ہیں۔ پس جس طرح مردوں اور عورتوں میں ایک دوسرے سے قصاص لینا متفقہ طور پر جائز ہے۔ اسی طرح ان کے اعضاء کا قصاص بھی روا ہے۔ کیونکہ اعضائے جسم جان سے وابستہ ہیں۔ بلکہ اعضاء کا قصاص زیادہ قرین قیاس اور مقدم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”والعین بالعين و الانف بالانف والاذن بالاذن والسن بالسن“ (یعنی قصاص میں آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت ہے)۔

حضرت علی بن ابی طلحہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا ”تقتل النفس بالنفس“ و تفتق العین بالعين، و يقطع الانف بالانف، و تنزع السن بالسن، و تقتص الجراح بالجراح“ فہذا یستوی فیہ احرار المسلمین فیہا بینہم و رجالہم نسائہم“ اذا کان عمداً فی النفس، و مادون النفس، و یستوی فیہ العبد و رجالہم و نسائہم“ اذا کان عمداً فی النفس، و مادون النفس“ بروایت ابن جریر و ابن ابی حاتم (یعنی قصاص میں جان کے بدلے جان کو قتل کیا جائے گا۔ آنکھ کے بدلے آنکھ پھوڑی جائے گی۔ ناک کے بدلے ناک کاٹ دی جائے گی اور دانت کے بدلے دانت اکھاڑے جائیں گے۔ اور زخم کے بدلے زخم سے بدلہ لیا جائے گا۔ اس حکم میں مرد اور عورت یکساں ہیں جب کہ عمداً قتل کیا ہو یا قتل سے کم درجہ کا جرم ہو اس میں غلام مرد اور عورتیں بھی مساوی ہیں۔ جبکہ عمداً قتل کیا ہو۔ یا قتل سے کم درجہ کا جرم ہو) اس کے علاوہ حنابلہ نے مزید کہا ہے کہ اگر مرد کسی عورت کو قتل کر دے تو اس کے قصاص میں قاتل کو قتل نہیں کیا جائے گا البتہ اس کے ولی مقتولہ کے وارثوں کو نصف خون بہا ادا کریں کیونکہ عورت کا خون بہا مرد کے خون بہا سے نصف ہوتا ہے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ قتل سے کم درجہ جرائم میں مرد اور عورت کے درمیان قصاص نہیں ہے۔ اسی طرح آزاد اور غلام کے درمیان اور باہم غلاموں کے درمیان بھی نہیں ہے۔ کیونکہ (معاملہ قصاص میں) اعضائے انسانی کو مال کی مانند قرار دیا گیا ہے۔ پس چونکہ ان میں بوجہ ان کی صلاحیت کے باہم تفاوت ہے لہذا ان میں (بوجہ اختلاف قدر) باہم مماثلت نہ رہی اور ان کی اقدار کا یہ اختلاف شرعی اندازے کے مطابق قطعی ہے۔ شریعت نے آزاد شخص کے ایک ہاتھ کی قیمت قطعی اور یقینی طور پر پانچ سو دینار قرار دی ہے اور غلام کے ہاتھ کی قیمت اتنی نہیں ہوتی اور اگر اتنی ہو تب بھی وہ (قطعی اور یقینی نہیں بلکہ) تخمینے اور گمان کی بناء پر ہوگی۔ ایک آزاد شخص کے ہاتھ کی یقینی قدر قیمت کے برابر نہ ہوگی پس اگر یقینی طور پر ان کا

بالہی فرق معلوم ہو تو اس کا لحاظ رکھنا ممکن ہوگا بخلاف اس فرق کے جو قوت گرفت میں ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے لئے کوئی ضابطہ مقرر نہیں ہے لہذا اس میں (قصاص کی) بنیادی حیثیت کو ملحوظ رکھا جائے گا۔

اعضائے جسم کے قصاص میں اس طریق عمل کو اختیار کیا جائے گا جو مال کے متعلق ہے۔ کیونکہ اعضائے جسم کو بھی مال کی طرح جان کی حفاظت کے لئے بنایا گیا ہے۔ پس واجب ہے کہ ان اشخاص کے اعضاء میں مال جیسا فرق ہونے کے پیش نظر قصاص اعضاء کو قطعاً ممنوع قرار دیا جائے۔

اگرچہ آیت کریمہ بلا تفریق ہر شخص کے اعضاء کے حق میں عام ہے اور (ایک دوسرے کے) اعضاء میں فرق نہیں رکھا گیا تاہم اگر خبر واحد کی بناء پر اس حکم کو خاص حالات کے لئے مخصوص کر دیا جائے تو یہ تخصیص جائز ہوگی چنانچہ عمران بن حصین کی اس روایت کی بناء پر اس عام حکم کو خاص کر دیا گیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ غریب طبقہ کے ایک غلام نے امیر طبقہ کے ایک غلام کا کان کاٹ دیا۔ یہ معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پیش ہوا۔ آپ نے قصاص کا حکم نہیں دیا۔

۱۔ کہا جاتا ہے کہ قصاص کی آیت مذکورہ یعنی ”یا ایہا الذین آمنوا کتب علیکم القصاص فی القتلی“ (یعنی اے مسلمانو! تمہیں اس میں حکم دیا گیا ہے کہ آزاد کے بدلے آزاد سے اور غلام کے بدلے غلام سے قصاص لیا جائے گا) میں قصاص کا حکم ہے اور اس سے فریقین میں مماثلت کا ذکر ہے۔ لیکن یہاں مراد وہی صورتیں ہیں جہاں فریقین میں یکسانیت ہو دوسری کا ذکر نہیں ہے۔

قتل کئے جانے پر مجبور کئے جانے کا بیان

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے کسی کو مجبور کر دیا کہ وہ فلاں شخص کو ناحق قتل کر دے اور اس نے مجبور اسے قتل کر دیا تو مکرة بالسکر (مجبور کرنے والے) پر حکم قصاص عائد ہوگا کیونکہ اس نے اس ذریعہ سے قتل کیا جو بالعموم ہلاک کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور یہ قتل ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی شخص تیر چلا کر ہلاک کر دے۔ اسی طرح بخیاں قوی مکرة بفتح الراء (جسے مجبور کیا گیا) پر بھی قصاص عائد ہوگا کیونکہ اس نے عدا ظلم و تعدی کی بناء پر قتل کیا تا کہ اس کی اپنی جان بچ جائے۔ یہ عمل اس فعل سے مشابہ ہے جس کا ارتکاب کسی نے بھوک سے مجبور ہو کر کھانے کے لئے کیا ہو بلکہ یہ حرکت بدرجہ اولیٰ اس سے مشابہ ہے کیونکہ اس ناچار کو تو یہ یقین ہے کہ اگر نہ کھائے گا تو مر جائے گا بخلاف اس کے جسے قتل کرنے پر مجبور کیا جائے کہ (اور کوئی چارہ کار نہیں ہے) کہا جاتا ہے کہ مکرة بالسکر پر (جس نے مجبور کیا) قصاص عائد ہوگا اور مکرة بالفتح پر (جسے مجبور کیا گیا) قصاص عائد نہ ہوگا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”رفع عن امتی الخطا و النسیان“ و ما استکروا علیہ“ (یعنی میری امت کی بھول چوک اور ایسے کام پر جس کے کرنے پر مجبور کیا گیا ہو پرش نہ ہوگی) اور وہ اس لیے بھی کہ مجبور انسان مجبور کرنے والے کے ہاتھ میں آلہ کار کی مانند ہوتا ہے۔ اور وہ ایسا ہی ہے جیسے مارنے کے لئے اس شخص کو (بطور ہتھیار کے) استعمال کیا گیا ہو یا ایسا ہے جیسے کوئی اونچی جگہ سے کسی پر گر پڑے یا ہوا اسے ایک جگہ سے اٹھا کر کسی کے اوپر پھینک دے اور کوئی شخص اس کے گرنے سے ہلاک ہو جائے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مجبور کرنے والے پر قصاص عائد نہ ہوگا۔ بلکہ قصاص اس پر واجب ہوگا جسے مجبور کیا گیا ہو۔ کیونکہ قتل کا مرتکب وہی ہے اور ارتکاب سب باتوں پر مقدم ہے اور اس لئے بھی کہ وہ شخص ایک لحاظ سے اپنے فعل کا مختار

ہے اور دوسرے لحاظ سے مجبور و مغلوب ہے اور مجبوری نہیں ہو سکتی تا وقت یہ کہ اسے قتل کی یا اس کے کسی عضو کے کاٹے جانے یا ضرب شدید پہنچانے کی دھمکی نہ دی جائے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جبر منجملہ دھمکیوں کے ایسی دھمکی کو کہا جائے گا۔ جس سے انسان (بیوی کو) طلاق دینے پر مجبور ہو جائے۔

اگر ایک شخص نے کسی کو کہا کہ فلاں شخص کو قتل کر دے ورنہ میں تیرے بیٹے کو قتل کر دوں گا اور فی الواقع وہ شخص اس کے بیٹے کو قتل کر سکتا ہو تو اسے مجبور نہیں کہا جائے گا۔ رو بانی کا کہنا یہ ہے کہ میرے نزدیک حقیقت تو یہ ہے کہ یہ مجبور کرنا ہے کیونکہ بسا اوقات ایک شخص اولاد کو اپنی جان کے برابر جانتا ہے۔ چنانچہ اولاد کو جو تکلیف پہنچتی ہے وہ گویا خود اس کی اپنی جان کو پہنچتی ہے بلکہ بعض ہستیاں ایسی ہیں کہ ان کے نزدیک بیٹا جان سے زیادہ عزیز ہوتا ہے اور یہ کھلی بات ہے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ مجبور انسان کے لئے بھی یہ روا نہیں ہے کہ ایسے شخص کو قتل کرنے کا مرتکب ہو جس کا قتل بذاتہ حرام ہو۔ اگرچہ ایسے شخص پر قصاص عائد نہ ہوتا ہم اگر ایسی جان کو ہلاک کرنا حرام تھا تو قیامت کے روز گنہگار ہوگا اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص مجبور ہو کر زنا کا مرتکب ہو۔ البتہ انسان کو مجبور ہو کر شراب پینا اور تہمت لگانا مباح ہے اور رمضان کے مہینے میں روزہ توڑ دینا بھی ایک قولن کے مطابق روا ہے اسی طرح (مجبوری کی حالت میں) فرض نماز سے ہٹنا۔ یا دوسرے کے مال کو ضائع کرنا بھی روا ہے اور مجبور ہو کر مال کی ضمانت دینا بھی روا ہے۔ یہی حال اس صورت میں ہے جب کہ ایک شخص کو ایسی بات کہنے کے لئے مجبور کرے جو کفر ہو یا کفرانہ عمل اختیار کرنے کو کہے مثلاً بت کے سامنے سجدہ کرنا معاذ اللہ (تو یہ فعل روا ہوگا) بشرطیکہ دل کو ایمان پر اطمینان ہو اور کفر سے متنفر ہو۔

کہا جاتا ہے کہ (مجبوری کی حالت میں) اپنی جان کو ہلاکت سے بچانے کے لئے ان الفاظ کا ادا کر دینا جائز ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر وہ شخص (جسے مجبور کیا جائے) علماء میں سے ہو جس کی لوگ پیروی کرتے ہیں تو اس کے لئے بہتر یہی ہے کہ ایمان پر ثابت قدم رہے۔ خواہ کتنا ہی ڈرایا دھمکایا جائے۔ اگر اسے قتل بھی کر دیا گیا تو اس کی موت شہیدوں کی موت ہوگی جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”من قتل دون دینہ فہو شہید“ (یعنی جو شخص اپنے مذہب (اسلام) کے پیچھے قتل ہوا وہ شہید مرا) تاکہ وہ دوسروں کے لئے اصحاب اخذ و (گھاٹیوں والے) کی طرح نمونہ بنے (جنہیں ایک بت پرست بادشاہ نے آگ میں جلا کر صرف اس لئے ہلاک کر دیا تھا کہ وہ ایمان پر قائم رہے اور اس کے کہنے پر بت کے آگے سجدہ نہیں کیا۔ ان کا ذکر سورہ بروج میں ہے)۔

واضح ہو کہ اگر مکرہ بالفتح (یعنی وہ شخص جسے مجبور کیا گیا ہو) یہ خیال نہیں کرتا کہ وہ اتنا مجبور ہے کہ ارتکاب قتل اس کے لئے روا ہو گیا ہے (پھر بھی اس نے ارتکاب قتل کیا) تو اس پر قصاص عائد ہو جائے گا۔ لیکن اگر اسے یقین ہے (کہ اب ارتکاب قتل اس کے لئے روا ہے) تو نہ اس پر تاوان ہوگا اور نہ قصاص عائد ہوگا اسی طرح اس پر بھی قصاص عائد نہ ہوگا جسے یہ علم نہ ہو کہ قتل پر مجبور کیا جائے تب بھی قتال حرام ہے۔ کیونکہ جرم کی نوعیت میں شبہ ہو تو قصاص ساقط ہو جاتا ہے اگر وہ خون معاف کر دیا جائے اور خون بہا کی ادائیگی قاتل پر واجب ہو تو یہ خون بہا ان دونوں پر (یعنی مجبور کرنے والے اور مجبور کئے گئے قاتل پر) بحیثیت مساوی واجب ہوگا جیسا کہ دو شرکائے کار میں ہوتا ہے اور جائز ہے کہ ولی مقتول دونوں میں سے کسی ایک پر حکم قصاص نافذ کرے اور دوسرے سے نصف مقدار خون بہا وصول کرے۔ یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ

وہ دونوں مقتول کے مساوی ہوں اگر مقتول ان میں سے صرف ایک کے مساوی ہو مثلاً مقتول ذی یا غلام ہو اور ان دونوں (مکرہ یا مکروہ بالکسر و بالفتح) میں بھی ایک شخص ایسا ہی (یعنی غلام یا ذمی) ہو اور دوسرا مسلمان یا آزاد ہو تو قصاص اس پر عائد ہوگا جو مقتول جیسا ہو دوسرے پر نہ ہوگا البتہ (قصاص کی بجائے) نصف خون بہا عائد ہوگا یا (غلام کی صورت میں) اس غلام کی نصف قیمت خون کے وارثوں کا حق ہوگا۔ کیونکہ ارتکاب قتل کے جرم میں دونوں شریک ہیں اور شریک جو (رتبہ میں) مقتول کے مساوی نہ ہوگا اس پر قصاص عائد نہ ہوگا۔ جیسے باپ شریک بھائی پر (مطالبہ عائد) نہیں ہوتا۔

اگر ایک عاقل بالغ شخص نے کسی بیوقوف کو یا اس کے برعکس کسی بیوقوف نے ایک عاقل بالغ شخص کو کسی کے قتل پر مجبور کیا اور اسے قتل کر دیا گیا تو بالغ شخص پر قصاص عائد ہوگا کیونکہ امر متقاضی قصاص سرزد ہوا اور دوسرے پر ظلم پایا گیا ایسا ہی اس حال میں ہے جب کہ لڑکے (نابالغ) کے ارادہ کو فعل عمد قرار دیا جائے۔ یہ صورت اس سے زیادہ قوی ہے۔ اگر اس فعل کو خطا قرار دیا جائے تو قاتل پر قصاص عائد نہ ہوگا کیونکہ وہ لڑکا خطا کرنے والے کا شریک کار تو ہے لیکن نابالغ بچے پر کسی حالت میں حکم قصاص عائد نہیں ہوتا کیونکہ وہ مکلف (جس پر احکام دین عائد ہوتے ہیں) نہیں ہے۔ تا آنکہ وہ بالغ نہ ہو جائے۔

اگر ایک شخص کسی مکلف انسان کو (جس پر احکام شرعیہ عائد ہوتے ہیں) مجبور کرے کہ فلاں شے (یا ڈھانچ) پر جو نظر آ رہا ہے تیر چلائے اور مجبور کرنے والا جانتا ہو کہ وہ شے ایک انسان ہے لیکن تیر چلانے والا اسے کوئی شکار یا پتھر سمجھتا ہے۔ اسی دھوکے میں اس نے تیر چلایا اور وہ شخص ہلاک ہو گیا تو صحیح یہ ہے کہ اس کے قصاص کا ذمہ دار وہ ہوگا جس نے اس شخص کو تیر چلانے پر مجبور کیا۔ کیونکہ اس نے عمدہ ہلاک کرنے کا وہ ذریعہ استعمال کیا جو عام طور پر کیا جاتا ہے۔

اگر کسی نے ایک شخص کو شکار پر تیر چلانے کے لئے مجبور کیا اور وہ تیر کسی انسان کو لگایا اس نے کسی کو ہلاک کر دیا تو دونوں میں سے کسی پر سزائے قصاص نافذ نہ ہوگی اگر ایک شخص نے کسی کو درخت پر چڑھنے یا کنوئیں میں اترنے پر مجبور کیا اور وہ پھسل کر گر پڑا اور مر گیا تو یہ قتل شبہ عمدہ تصور ہوگا کیونکہ عام طور پر اس سے ہلاک کرنا پیش نظر نہیں ہوتا لیکن مجبور کرنے والے کے ذمہ دار شخص پر خون بہا عائد ہوگا۔ امام غزالی رحمہ اللہ اسے قتل عمدہ فرماتے ہیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ محض ایک خطا ہے۔

اگر ایک شخص نے کسی کو خود اپنی جان ہلاک کرنے پر مجبور کیا کہ اس سے کہا کہ خودکشی کر لے یا یہ زہر پی لے ورنہ تجھے قتل کر دوں گا اور اس نے مجبور ہو کر اپنی جان ہلاک کر لی تو بخیاں غالب اس کہنے والے پر قصاص عائد نہ ہوگا کیونکہ یہ عمل درحقیقت جبر نہیں ہے کیونکہ جس بات پر مجبور کیا گیا اور جس کا ڈر دلایا گیا وہ دونوں ایک ہیں۔ پس گویا اسے اختیار دیا گیا۔ (یعنی اس نے اپنے اختیار سے خود کو ہلاک کیا)۔

کہا جاتا ہے کہ (ایسی صورت میں) قصاص واجب ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کو دوسرے شخص کے قتل کرنے پر مجبور کیا جائے۔ تاہم جسے مجبور کیا گیا اگر وہ کم عمر ہونے کے باعث نادان ہے یا جنون زدہ ہے تو ایسی صورت میں مجبور کرنے والا قطعی طور پر مستوجب سزائے قصاص ہے۔

اگر ایک شخص نے کسی سے کہا کہ مجھے قتل کر دے ورنہ میں تجھے قتل کر دوں گا اور اس نے قتل کر دیا تو اس بارے میں مسلک ثانیہ ہے کہ قاتل پر قصاص عائد نہ ہوگا کیونکہ قتل کی اجازت اس فعل کا جرم (قتل عمد) ہونا مشتبہ ہو گیا جس سے

سزا ساقط ہو جاتی ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس صورت میں قصاص واجب ہے کیونکہ قتل کی اجازت دینے سے قتل روا نہیں ہو جاتا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کو ماں کے ساتھ ملوث ہونے کی اجازت دی جائے۔ تاہم زیادہ قوی خیال یہی ہے کہ قصاص واجب نہ ہوگا۔ اگر بادشاہ (یا حکومت) نے کسی شخص کو ناحق، ظالمانہ طور پر قتل کرنے کا حکم دیا لیکن اس شخص کو بادشاہ کی نیت معلوم نہ تھی اور نہ اس کی غلطی سے آگاہ تھا تو قاتل پر تادان یا خون بہا واجب ہوگا اور بادشاہ پر لازم ہوگا کہ وہ صرف کفارہ گناہ ادا کرے اور جسے حکم دیا گیا وہ ذمہ دار نہ ہوگا کیونکہ وہ شخص تو محض اس کا ایک آلہ کار تھا اور سرکاری حکم کی تعمیل لازم ہوتی ہے۔ پھر یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ بظاہر حکمران ناحق حکم نہیں دیا کرتے اور جو حکم دیں ان کا بجالانا ضروری ہوتا ہے بشرطیکہ اس فعل کا گناہ ہونا معلوم نہ ہو۔ اگر (محکوم کو) یہ علم ہو کہ بادشاہ نے کس نیت سے یہ حکم دیا اور اس حکم میں اس نے غلطی کی ہے تو جسے حکم دیا گیا اس پر تادان (یا قصاص) واجب ہوگا درآںحالیکہ اسے حکمران کی سخت گیری کا علم نہ ہو جس کی وجہ سے اسے مجبور ہونا پڑا۔ ایسی صورت میں (جب کہ سختی کا اندیشہ نہ ہو) حکم کی تعمیل لازم نہیں رہتی۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے ”لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق“ (یعنی بروردگار کی نافرمانی ہوتی ہو تو کسی بھی مخلوق کا حکم نہ مانا جائے) پس یہ قتل ایسا متصور ہوگا جیسے بادشاہ کے حکم کے بغیر ہی اس نے ارتکاب کیا۔ اب اگر بادشاہ نے ظلم کیا ہے تو اس کا گناہ اس پر عائد ہوگا اور کوئی پاداش عائد نہ ہوگی۔ اگر اس شخص کا عقیدہ یہ ہے کہ بادشاہ کا ناجائز حکم بھی ماننا پڑے گا تو اس فعل کا تادان حاکم پر واجب ہوگا اس شخص پر نہ ہوگا۔ اگر (حکم عدولی پر) بادشاہ کے جبر و ستم کا اندیشہ ہے تو (اس کا ارتکاب فعل) پر قصاص وغیرہ کی ذمہ داری ان دونوں پر عائد ہوگی جیسا کہ جبر کرنے والے اور مجبور انسان پر ہوتی ہے۔

اگر ایک شخص نے اپنے غلام یا کسی اور شخص کے غلام کو جو سمجھ رکھتا ہو بیجا طور پر کہا کہ فلاں شخص کو قتل کر دے یا اسے نقصان جان پہنچائے اور اس غلام نے قتل کر دیا تو حکم دینے والا گنہگار ہوگا اور وہ غلام اگر بالغ ہے تو سزائے قصاص اس پر عائد ہوگی اور تادان (یا خون بہا) اس کی گردن پر رہے گا۔ اگر محکوم نابالغ یا دیوانہ لیکن صاحب شعور ہے اور وہ حکم کو تسلیم کرنا ضروری نہیں سمجھتا تو (جرم کی) ذمہ داری دونوں (نابالغ یا دیوانہ) پر عائد ہوگی۔ حکم دینے والے پر نہ ہوگی۔ اگر کوئی شخص بے شعور ہے اور اس نے بغیر کسی کے اکسائے نقصان پہنچایا تو وہی اس نقصان کا ذمہ دار ہوگا درآںحالیکہ وہ آزاد ہو اور اگر غلام ہے تو اس کی ذمہ داری اس کی گردن پر رہے گی۔

اگر ایک شخص نے کسی غلام کو جو باشعور ہے کسی کے قتل کرنے پر مجبور کیا اور اس نے ارتکاب قتل کر لیا تو اس کی گردن پر اس کا نصف خون بہا عائد ہوگا۔

مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر کسی نے ایک شخص کو مجبور کرنے پر اقدام قتل کیا تو مجبور کرنے والے پر تو حکم قصاص اس لئے عائد ہوگا کہ اس نے اس شخص کو ذریعہ قتل بنایا اور جسے مجبور کیا گیا اس پر بھی عائد ہوگا کیونکہ وہ اقدام قتل میں اس کا شریک تھا اس کی مجبوری کا عذر تسلیم نہیں کیا جائے گا اور حکم دینے والا قتل میں شامل ہونے کا عذر پیش نہیں کر سکتا۔ لہذا دونوں پر یکساں حکم قصاص عائد ہوگا۔ قتل پر مجبور کرنے والے کو قاتل قرار دیئے جانے کی یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ تمام امت کا اس امر پر اجماع ہے کہ اگر کوئی شخص بھوک سے مر رہا ہو تب بھی یہ جائز نہیں ہے کہ کسی انسان کو قتل کر کے اسے کھائے اور اپنی جان بچالے بلکہ اس پر واجب ہے کہ صبر کرے یہاں تک کہ مر جائے۔ لیکن اگر اس نے وہ جرم کیا تو گنہگار

ہوگا۔ غرض قتل کے لئے کسی کو ذریعہ بنانے والا اور اس کے ساتھ شریک قتل بھی قتل کا مستوجب ہے۔ لہذا اگر کوئی آقا اپنے غلام کو کسی آزاد شخص کے قتل کرنے کا حکم دے اور وہ قتل کر دے تو اس آقا کو سزائے قتل ہوگی اور اس کے ساتھ غلام کو بھی بشرطیکہ وہ بالغ ہو۔ اسی طرح اگر کوئی باپ اپنے کم عمر بیٹے کو کسی کے قتل کرنے کا حکم دے اور وہ یہ جرم کر بیٹھے تو باپ واجب القتل ہوگا اور بیٹا بھی اگر بالغ ہو تو وہ بھی واجب القتل ہوگا۔

اگر کوئی استاد خواہ وہ کوئی ہنر سکھاتا ہو یا علم پڑھاتا ہو یا قرآن کی تعلیم دیتا ہو اپنے شاگرد یا لڑکے کو کسی کے قتل کرنے کا حکم دے اور وہ شاگرد بالغ ہو تو استاد اور اس کے ساتھ شاگرد بھی واجب القتل ہوں گے۔ لیکن اگر اولاد یا شاگرد کم عمر اور بے سمجھ ہو تو اس کے قبیلہ پر خون بہا واجب ہوگا اور ساتھ ہی اس کے باپ یا استاد سے قصاص وصول کیا جائے گا۔ یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ جبر نہ کیا ہو (صرف حکم دیا ہو)۔

جو شخص ارتکاب قتل کرے اور کوئی بچہ اس میں شریک کار ہو تو اس شخص کو سزائے قتل ہوگی بچے کو قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ وہ غیر مکلف ہے (یعنی بچے پر احکام عائد نہیں ہوتے) اور بچے کے کنبہ پر آدھا خون بہا عائد ہوگا کیونکہ بچے کا عہد بھی خطا تصور کیا جائے گا۔ اگر دونوں نے اکٹھا قتل نہیں کیا لیکن ارادہ قتل دونوں نے کیا تو اس شخص کے مال سے خون بہا واجب ہوگا اور اس نابالغ کے کنبہ والوں پر نصف خون بہا عائد ہوگا اگر دونوں نے مل کر قتل کیا یا بالغ نے غلطی سے قتل کیا تو ہر ایک کے تاوان دار پر نصف خون بہا عائد ہوگا۔ یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ مقتول کے ورثاء یہ دعویٰ نہ کریں کہ وہ موت ایک مکلف انسان سے سرزد ہوئی۔ بصورت دیگر ورثاء سے قسم لی جائے گی (کہ فی الواقع اس شخص کے فعل سے موت واقع ہوئی) اور مجرم کو سزائے قتل ہوگی اور بچے کے کنبہ والوں سے نصف خون بہا ساقط ہو جائے گا۔ کیونکہ قسامہ (یعنی قسم پر فیصلہ) کے بعد سزائے قصاص ہوتی ہے اور ایک ہی شخص کو دی جاتی ہے۔

واضح ہو کہ کسی شخص کو ارتکاب جرم پر مجبور اس صورت میں سمجھا جائے گا جب کہ اس کے لئے انکار کرنا ممکن نہ رہے مثلاً جان سے مارے جانے یا کسی عضو کاٹے جانے یا اولاد کے قتل کئے جانے کا ڈر ہو۔ اگر ایسا کوئی اندیشہ نہ ہو تو صرف قاتل سے قصاص لیا جائے گا۔ مجبور کرنے والے سے نہیں لیا جائے گا۔

اگر ایک شخص نے کسی ناکردہ بے گناہ کو زہر آلود کھانا یہ جانتے ہوئے کہ اس میں زہر ہے پیش کیا اور اس نے بے خبری میں اسے کھا لیا جس سے موت واقع ہوگئی تو قصاص واجب ہو جائے گا۔ کیونکہ اس نے ہلاک کرنے کا سامان مہیا کیا لیکن اگر اس شخص کو یہ معلوم تھا کہ اس کھانے میں زہر ہے اور پھر بھی اس نے کھا لیا تو اس کو خودکشی تصور کیا جائے گا۔ اور کھانا پیش کرنے والے پر کوئی الزام نہ ہوگا۔ اگرچہ اسی نے ہلاکت کا یہ سامان مہیا کیا۔ اگر نہ کھانا پیش کرنے والے کو یہ علم ہو کہ اس میں زہر ہے اور نہ کھانے والے کو یہ معلوم ہو (اور اس کے کھانے سے جان جاتی رہی) تو اسے قتل خطا تصور کیا جائے گا اور اس صورت میں کھانا لانے والے کے ذمہ داروں پر خون بہا واجب ہوگا بشرطیکہ مقتول کے ورثاء قسم کھا لیں (کہ اس کی موت اس کھانے سے ہوئی ہے)۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے کسی کو اس پر مجبور کیا کہ وہ فلاں شخص کو قتل کر دے ورنہ وہ اسے جان سے مار ڈالے گا یا کوئی عضو کاٹ دے گا۔ چنانچہ اس سے ڈر کر اس نے ارتکاب قتل کر لیا تو مجبور کرنے والے پر سزائے قتل عائد ہوگی اور جسے مجبور کیا اس پر کوئی الزام نہ ہوگا۔ خاص کر اس صورت میں جب کہ وہ محکوم اس حکم دینے والے کا زیر دست (یا

مغلوب) ہو۔ ایسی صورت میں اس مجبور انسان کو ایک بے بس تصور کیا جائے گا اور یہ فعل اس کا اختیاری عمل متصور نہ ہوگا اور اس کی کیفیت ایسی ہوگی جیسے کوئی شخص بلندی سے گر جائے یہ امر مسلمہ فقہاء ہے کہ مجبوری کی حالت میں متعدد احکام شریعت ساقط ہو جاتے ہیں کیونکہ مجبور انسان جبر کرنے والے کے ہاتھ میں ایک آلہ کار کی حیثیت رکھتا ہے نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے ”رفع عن امتی الخطاء والنسیان“ واما استکرہوا علیہ“ (یعنی میری امت کی بھول چوک اور ایسی باتوں کو جن کے کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہو نظر انداز فرمایا گیا ہے) لیکن مجبور کرنے والا مستوجب سزا ہوگا کہ اسے سو کوڑے مارے جائیں یا پورے ایک سال کے لئے قید کر دیا جائے یا پھر جو سزا حاکم مناسب سمجھے وہ دی جائے۔

اگر کوئی غلام جو معاملہ کا اہل نہیں ہوتا ایک آزاد نابالغ شخص کو کسی شخص کے قتل کرنے کو کہے اور وہ اسے قتل کر دے تو اس نابالغ کے کنبہ والوں پر خون بہا عائد ہوگا۔ کیونکہ فی الواقع قتل کرنے والا وہی ہے اس کا یہ قتل عدا ہو یا سہوا یکساں ہے۔ حکم دینے والے (غلام) پر کوئی الزام نہیں ہے۔

تادیب کے لئے مارنے کا بیان

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے کسی کی اصلاح کے لیے اسے مارا اور شرعی نقطہ نظر سے وہ مارنا جائز تھا مثلاً بادشاہ (یا حکومت) نے کسی ایسے جرم کی پاداش میں جس پر حد (سزائے شرعی) واجب نہیں ہے سزا دی یا بارادہء سرزنش مارا۔ یا شرعی جرم کی پاداش میں حد لگائی اور اس کے سبب وہ شخص مر گیا یا چوری کی سزا میں ہاتھ کاٹا جس کا اثر جسم میں سرایت کرنے کے باعث اس کی موت واقع ہو گئی تو ان تمام صورتوں میں وہ خون معاف ہوگا اور حاکم پر کوئی تاوان عائد نہ ہوگا اور نہ بیت المال سے کچھ دینا ہوگا۔ کیونکہ جو کچھ اس نے کیا وہ شرع کے مطابق تھا اور ایک شرعی حکم کا نفاذ تھا، قتل کرنے کا ارادہ نہ تھا اور نہ انتقامی کارروائی تھی۔ اسی طرح اگر باپ یا ماں نے اپنے بیٹے کو تنبیہا مارا یا پٹا اور وہ مر گیا تو ان پر کوئی الزام عائد نہ ہوگا۔ نیز اگر کسی استاد نے جو کوئی ہنر سکھاتا، تعلیم دیتا یا قرآن پڑھاتا ہوا اپنے شاگرد کو تعلیم دینے اور علم سے استفادہ کرنے کے لئے مارا اور احیا نا وہ مر گیا تب بھی اس پر کوئی الزام نہ ہوگا کیونکہ اس کی نیت نیک تھی اور اگر خاوند نے بیوی کو سدھارنے برائی سے بچنے اور نیکی کے طریق پر گامزن رکھنے کے لئے مارا اور مارنے سے وہ مر گئی تو وہ مجرم قرار نہ دیا جائے گا۔ کیونکہ شریعت اسلامیہ نے بیوی کو بطور امانت کے خاوند کے سپرد کیا ہے تاکہ وہ اس کی تربیت کرے، شائستہ بنائے، پسندیدہ اخلاق سکھائے اس کے لیے لباس اور خوراک مہیا کرے۔ اب اگر وہ خاوند کی بات نہ مانے اور سرکشی کا اندیشہ ہو تو اسے مارنا روا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”واللاتی تخافون نشوزهن فعظوهن واهجروهن فی المضاجع“ واضرہن“ (یعنی جن عورتوں سے تمہیں سرکشی (یاد شنی) کا اندیشہ ہو (پہلے) انہیں سمجھاؤ اور انہیں انکے بستروں میں چھوڑ دو) (یعنی ازدواجی فرائض سے دستکش رہو) اور پھر مارو)۔

شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ شریعت اسلامیہ نے ماں باپ کو اجازت دی ہے کہ وہ اپنی اولاد کی اصلاح کے لئے اور انہیں اچھے کاموں کے کرنے اور بری باتوں سے باز رکھنے کے لئے مار پیٹ سے کام لیں۔ اسی طرح خاوند کو بھی سرزنش کی اجازت ہے تاکہ وہ اس کی عزت کی حفاظت کرے۔ اسی طرح تعلیم دینے والے کو اجازت ہے کہ وہ متعلم کو اس مقصد

کے لئے سزا دے۔ اور قاضی (حاکم شرع) کو اجازت ہے کہ اگر کوئی مسلمان سرکشی کرے اور حکم کی خلاف ورزی کرے تو اسے سزائے ضرب دے اور اگر کوئی شخص اس سزا سے مر جائے تو اس پر کوئی تاوان نہ ہوگا بشرطیکہ وہ سزا ایسی ہو جس سے عام طور پر موت واقع نہیں ہوا کرتی کیونکہ اس کا ارادہ قتل کرنے کا نہ تھا اور اس نے جو کچھ کیا وہ سزا پانے والے کی بہتری کے لئے تھا اور صاحب شریعت کے حکم کے مطابق تھا جو حکمت پر مبنی ہوتا ہے

ان اصحاب کا یہ کہنا ہے کہ اگر ان میں سے کسی نے ایک مریض کو ایسی سزا دی جس سے بالعموم تندرست آدمی کی جان نہیں جاتی اور اسے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ شخص مریض ہے تو اس پر قصاص عائد نہ ہوگا کیونکہ جو کچھ اس شخص نے کیا وہ اس کے خیال میں موجب ہلاکت فعل نہ تھا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس شخص پر حکم قصاص واجب ہوگا کیونکہ اس کی لاعلمی اس ہلاک کرنے والی ضرب کو روا قرار نہیں دیتی۔ البتہ اگر اسے معلوم تھا کہ وہ شخص مریض ہے تو قطعی طور پر حکم قصاص عائد ہوگا۔ فقہاء میں سے کسی کو اس سے اختلاف نہیں ہے کیونکہ اس حالت میں مارنے سے عیاں ہے کہ اس کا ارادہ ہلاک کرنے ہی کا تھا۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ امور کی بجا آوری کے لئے مجرم کی سلامتی کا تصور ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ اگر باپ اپنے بیٹے کو یا استاد شاگرد کو اس کے باپ کے کہنے پر سزائے ضرب دے تو ہر چند کہ اسے معلوم ہو کہ وہ شخص مریض ہے اور اس سزا سے موت واقع ہو جائے تو باپ یا استاد پر واجب ہوگا کہ اپنے مال سے وہی خون بہا ادا کرے جو قتل عمد کی صورت میں واجب الادا ہوتا ہے اور اس میں سے باپ کو کوئی ورثہ نہیں ملے گا کیونکہ وہ اس کی میراث سے محروم قرار دیا جائے گا۔ (غالباً اس لئے کہ قاتل اپنے مقتول کا وارث نہیں ہو سکتا)۔

مستوجب حد کا غیر مستوجب حد کے ساتھ قتل میں شریک ہونے کا بیان

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر عاقل و بالغ مسلمان کسی بے خطا انسان جس کا خون دائمی طور پر حرام ہے کے قتل کرنے میں کسی لڑکے (نا بالغ) کا شریک ہو تو اس بالغ شخص کو سزائے قتل ہوگی۔ اس لڑکے کو نہ ہوگی اور جبکہ دونوں ایک ساتھ قتل کرنے میں شریک کاررہے ہوں تو لڑکے کے صلیبی رشتہ داروں پر نصف خون بہا عائد ہوگا کیونکہ اس کا قتل عمد بھی قتل خطا ہے اگر دونوں نے ارتکاب قتل میں ایک دوسرے کے ساتھ سازش نہیں کی اور عمد ارتکاب کیا یا صرف بالغ نے کیا تو نصف خون بہا اس بالغ کے ذمہ ہوگا اور باقی نصف نا بالغ کے کنبہ پر عائد ہوگا یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ مقتول کے ورثاء کا یہ دعویٰ نہ ہو کہ صرف بالغ مکلف انسان کے ہاتھوں اس کی وفات ہوئی۔ بصورت دیگر ورثاء اس شخص کے خلاف قسم کھائیں گے (کہ فی الواقع اس شخص کے ہاتھوں موت واقع ہوئی) اور قصاص میں اس بالغ انسان کو قتل کیا جائے گا۔ اور نصف خون بہا لڑکے کے کنبہ والوں سے ساقط ہو جائے گا کیونکہ جب قسامہ (یعنی حلف) کی بناء پر فیصلہ کیا جائے تو سزائے قتل ہوتی ہے اور صرف ایک کو سزا ہوتی ہے۔ اگر دونوں نے مل کر قتل کیا یا اس بالغ نے غلطی سے قتل کیا تو ہر ایک کے کنبہ پر نصف خون بہا عائد ہوگا۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ قتل خطا میں شریک ہونے یا دیوانے سے مل کر قتل کرنے والے کو سزائے قتل نہ ہوگی بلکہ

نصف خون بہا شریک قتل کے اپنے مال میں سے واجب ہوگا اور نصف خون بہا غلطی سے قتل کرنے والے یا جنون زدہ کے کنبہ پر عائد ہوگا۔ یہ اس صورت میں جبکہ قتل خطا میں شریک ہو نیوالے نے عدا قتل کیا ہو بصورت دیگر یہ تاوان اس کے کنبہ پر عائد ہوگا۔

واضح ہو کہ اگر کوئی نابالغ عدا قتل کرے یا غلطی سے قتل کرے تو اس کے پدری رشتہ دار پر نصف خون بہا عائد ہوگا کیونکہ شریعت نے بچے کے قتل عدا کو بھی قتل خطا قرار دیا ہے۔

اگر ایک شخص نے کسی انسان کو ہلاک کرنے میں درندہ جانور کی عدا مدد کی مثلاً کسی کو درندہ جانور نے زخمی کر دیا پھر اسی زخمی کو اس شخص نے مارا جس سے وہ ہلاک ہو گیا۔ یا کسی نے خود اپنا سر اس طرح پھوڑا کہ بسا اوقات اس سے موت واقع ہو جاتی ہے پھر کسی اور شخص نے اسے برچھا مار کر ہلاک کر دیا۔ یا کوئی شخص کسی کے قتل کرنے میں ایک حربی (برسر جنگ) کے ساتھ شامل ہو گیا، گو اس کا اپنا ارادہ قتل کرنے کا نہ رہا ہو۔ ان تمام صورتوں میں ان اصحاب کا کہنا یہ ہے کہ مکلف انسان اگر قتل کرنے میں غیر مکلف کے ساتھ شریک ہو جائے تو وہ مکلف سزائے قصاص کا مستوجب ہو جائے گا۔ کسی درندہ کا زخم پہنچانا نہ اس دنیا میں قابل باز پرس ہے اور نہ آخرت میں اور کسی کا خود اپنے آپ کو زخمی کر لینا بھی اس دنیا میں قابل باز پرس نہیں ہے گو آخرت میں باز پرس ہوگی اور وہ گنہگار متصور ہوگا۔ اور حربی (جو میدان میں برسر جنگ ہے) اس (کے عمل) کی پرسش نہ دنیا میں ہے اور نہ آخرت میں (لہذا شریک قتل ہونے والے ہی واجب القصاص ہوں گے)۔

کہا جاتا ہے کہ مذکورہ صورت حالات میں (شرکائے قتل پر) قصاص نہیں ہے بلکہ نصف خون بہا عائد ہوگا اور ایک سو ضرب تازیانہ اور پورے سال بھر کی سزائے قید ہوگی اور قصاص اس صورت میں ہوگا جبکہ 'قسامہ' (ورثاء کے قسم کھالینے) پر فیصلہ ہو بغیر 'قسامہ' کے نصف خون بہا عائد ہوگا۔

اگر دو بالغ مکلف انسان آپس میں ٹکریں یا رسہ کشی کریں اور گر پڑیں خواہ سواری پر ہوں یا پیدل یا ایک سواری پر ہو اور دوسرا پیدل اور دونوں نے عدا یہ تصادم کیا ہو اور دونوں مرجائیں تو کسی پر حکم قصاص عائد نہ ہوگا کیونکہ محل قصاص (جس سے قصاص لینا ہے) نہ رہا۔ ہاں اگر ان میں سے ایک کی موت واقع ہو جائے تو دونوں کے درمیان خون بہا عائد ہوگا۔ یا صورت حال معلوم نہ ہونے کے باعث دونوں کو اس فعل کا مرتکب قرار دیا جائے گا۔ اس کو خطا پر محمول نہ کیا جائے گا۔ اس کے برعکس اگر دو کشتیوں میں تصادم ہو اور اصل سبب معلوم نہ ہو (کہ کس کی زیادتی سے حادثہ ہوا) تو دونوں کشتی بانوں کا یہ عمل بلا ارادہ متصور ہوگا نہ اس میں قصاص ہوگا نہ تاوان ہوگا۔ کیونکہ دونوں کشتیوں کو ہوا لے جا رہی تھی اور یہ کشتی رانوں (ملاحوں) کا کام نہ تھا۔ دراصل دونوں ہی بے بس تھے۔ ان میں سے کسی کے بس میں نہ تھا کہ اپنی سواری یا کشتی کو موڑ سکے۔ پس کسی بوزمہ دار قرار نہ دیا جائے گا۔ بلکہ فعل عبث تصور کیا جائے گا۔

اگر کوئی بیٹا شخص کسی نابینا کو اپنے پیچھے لے کر جا رہا ہو اور (ٹھوکر کھا کر) وہ بیٹا گر پڑے پھر اس کے اوپر نابینا اس طرح گرے کہ وہ بیٹا مر جائے تو اس نابینا کے رشتہ دار پر خون بہا واجب ہوگا۔

اگر کسی شخص نے ایک ڈوبتے ہوئے انسان کو پکڑ کر نکالنا چاہا، لیکن (وہ ایسا شخص تھا جس کی بابت) اسے ڈرتھا کہ وہ نکل کر اسے مار ڈالے گا لہذا اس نے اسے پانی ہی میں چھوڑ دیا اور وہ مر گیا تو اس شخص پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔

اگر کوئی شخص اپنی سواری پر جارہا تھا اور راستہ میں بیٹھے ہوئے کسی پر گر پڑا اور جس پر گرا وہ مر گیا تو اس کا خون بہا کرنے والے کے پدری رشتہ دار پر عائد ہوگا۔

شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر کسی کی موت دو شخصوں کے ہاتھ واقع ہوئی جن میں سے ایک نے عمدہ ہلاک کیا اور دوسرے نے غلطی سے ہلاک کیا۔ یا ان میں سے ایک شخص مکلف تھا (جس پر احکام شرعیہ عائد ہوتے ہیں) اور دوسرا غیر مکلف (جس پر احکام شرعیہ عائد نہیں ہوتے) مثلاً دونوں میں سے ایک بالغ ہو اور دوسرا بچہ (نابالغ) یا ایک عاقل ہو اور دوسرا پاگل لیکن اسے اپنے ہمسر کو قتل کرنے کی تمیز ہو تو اس عاقل مکلف کو سزائے قتل ہوگی اور اس پاگل کے رشتہ دار پر نصف خون بہا عائد ہوگا۔ اسی طرح اگر ایک آزاد اور غلام نے مل کر کسی غلام کو عمدہ قتل کر دیا تو غلام پر حکم قصاص عائد ہوگا اور آزاد پر اس کے اپنے مال سے نصف قیمت غلام عائد ہوگی پس ان دونوں پر الگ الگ فرد جرم عائد ہوگی کہ گویا وہ جرم قتل میں شریک نہ تھے (بلکہ دونوں نے الگ الگ جرم قتل کیا) (اس مسلک کے بارے میں) ان اصحاب کی دلیل یہ ہے کہ اس میں مصلحت عامہ کو مد نظر رکھا گیا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ قاتل پر سختی کی جائے کیونکہ خون کرنا حرام ہے۔ پس گویا ان دونوں میں سے ہر ایک نے جدا جدا ارتکاب جرم کیا اور ہر ایک پر اس کے جرم کی سزا عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص بیٹے کے قتل میں باپ کا شریک ہو تو اس پر حکم قصاص عائد ہوگا اور اس کے باپ پر اگرچہ وہ نچلے درجہ میں ہو بھاری خون بہا کا نصف اس کے اپنے مال میں سے واجب ہوگا اور اس میں اس کا حصہ وراثت نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ایک حربی (دشمن کے سپاہی) کے ساتھ شامل ہو کر کسی مسلمان کو قتل کر دے یا مثلاً قصاص میں کسی کا عضو یا سزائے شرعی میں (ہاتھ وغیرہ) کاٹا گیا ہو اور کوئی شخص اس سزایافتہ کو مزید زخم لگا کر ہلاک کر دے اور وہ شخص عضو کے کٹنے اور مزید زخم لگنے کے باعث مر جائے تو شرکت کرنے والا مستوجب قتل ہوگا۔ اگر کسی شخص نے خود کو بھاری زخم لگایا اور پھر کسی دوسرے شخص نے اسے مزید زخم پہنچایا اور ان زخموں کے باعث موت واقع ہوگئی تو یہ دوسرا شخص واجب القتل ہوگا۔ اسی طرح وہ شخص بھی مستوجب قتل ہے جس نے کسی پر حملہ کرنے والے کو ہٹا کر خود زخمی کیا اور دونوں کے زخم کھا کر وہ مر گیا یا کسی کو درندہ جانور یا سانپ نے اس طرح کاٹا بالعموم اس سے لوگ مر جاتے ہیں پھر ایک شخص نے اس کو مزید زخم پہنچایا اور وہ مر گیا تو یہ شخص واجب القتل ہوگا بشرطیکہ مرنے والا اس کا ہمسر ہو۔ نیز بقول ظاہر وہ غلام واجب القتل ہوگا جو کسی شخص کو اپنے غلام کے قتل کرنے میں یا اپنے بیٹے کے غلام کو قتل کرنے میں شریک ہو۔ جیسا کہ اس صورت میں ہوتا ہے جبکہ دو اشخاص کے بالارادہ ارتکاب سے جرم کا تعین مخفی ہو جائے۔ اور ان میں سے دوسرے شخص پر اس کی مخصوص حیثیت کے پیش نظر قصاص کا عائد کرنا ممکن نہ ہو جیسا کہ پہلے بتایا گیا۔ اس حالت میں یہ جرم ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی شخص بیٹے کے قتل میں باپ کے ساتھ شامل ہو جائے۔ اگر ایک شخص نے کسی کو غلطی سے زخمی کیا اور زخمی کو سانپ نے ڈس لیا اور درندے نے بھی پھاڑ کھایا اور ان تینوں کی جراحت رسانی سے وہ مر گیا تو اس شخص پر ایک تہائی خون بہا واجب ہوگا۔ جیسے کسی شخص کو تین اشخاص نے مل کر ہلاک کیا ہو۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص بیٹے کے قتل میں باپ کے ساتھ شامل ہو جائے تو اس شخص پر قصاص عائد نہ ہوگا۔ اسی طرح اس شخص کے شریک قتل ہونے پر بھی قصاص عائد نہ ہوگا جو اپنے غلام کو قتل کرے۔ پھر اس پر بھی حکم قصاص عائد نہ ہوگا جو قتل خطا میں یا بچے (نابلغ) کے قتل میں یا پاگل کے ارتکاب قتل میں یا کسی بھی ایسے شخص کے ارتکاب قتل میں شامل ہو جس پر سزائے قصاص عائد نہیں ہوتی کیونکہ یہ قتل ایسا ہے جس کے دو سبب ہیں منجملہ ان کے ایک پر قصاص واجب نہیں ہے۔ اور قصاص کو دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا (کہ آدھا قصاص لیا جائے) کیونکہ خون کرنا بنیادی طور پر حرام ہے اور اس کے مرتکب پر جو قصاص کا حکم ہے وہ خاص حالات پر منحصر ہے کہ وہ فرد واحد پر عائد ہو اور خون کا بدلہ خون لیا جاسکے۔ اور چونکہ قصاص کو اجزاء میں تقسیم کرنا ممکن نہیں ہے لہذا صورت بالا میں (جبکہ دو اشخاص قتل میں شریک ہوں اور ایک پر قصاص عائد نہ ہوتا ہو) قصاص کا نفاذ ممکن نہیں ہے اور حکم قصاص اس پر عائد نہ ہوگا۔ پھر جس پر قصاص واجب ہے اگر وہ ایک شخص ہے تو اس کے اپنے مال میں سے نصف خونیہا اس پر واجب ہوگا کیونکہ اس نے عدا ارتکاب جرم کیا اور پورا قصاص لینا ممکن نہ تھا اور اس کا عاقلہ (یعنی پدری رشتہ دار) قتل عمد کے خون بہا کا ذمہ دار نہیں ہے۔ باقی رہا دوسرا نصف خون بہا سو وہ دوسرے فریق پر عائد ہوگا جبکہ وہ بچہ (نابلغ) یا دیوانہ قتل خطا کا مرتکب ہوا ہو۔ اس میں خون بہا محض قتل واقع ہونے کی بناء پر عائد ہوگا اس لئے کہ ایک بچہ یا جنون زدہ کا عدا ارتکاب خطا شمار ہوتا ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر (فریق ثانی) باپ ہو تو اس کے ذاتی مال میں سے نصف خون بہا واجب ہوگا اور ورثہ سے محروم رہے گا۔ پھر یہ بھی ہے کہ ایسے شخص کے ساتھ جس پر قصاص واجب نہیں ہوتا شریک قتل ہونا محل شبہ ہے۔ جرم قتل کے حصے نہیں کئے جاسکتے اور شبہ کی صورت میں سزائیں ساقط ہو جاتی ہیں۔ پس خون بہا واجب ہوگا۔

یہ اصحاب فرماتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے اپنا سر پھوڑ لیا پھر اسے کسی اور شخص نے زخمی کیا، شیر نے حملہ کر دیا اور سانپ نے ڈس لیا اور نتیجہ وہ مر گیا تو اس اجنبی شخص پر ایک تہائی خون بہا عائد ہوگا کیونکہ شیر اور سانپ کا فعل ایک ہی نوعیت کا ہے کہ دونوں کا عمل دنیا اور آخرت میں رائیگاں ہے (کہ اس پر کچھ نہیں کیا جاسکتا) اور وہ جس نے خود اپنا سر پھوڑا اس پر دنیا میں کچھ نہ ہوگا۔ البتہ آخرت میں باز پرس ہوگی وہ گنہگار ہے اور اللہ کے نزدیک سزاوار عذاب ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک ایسے شخص (کی میت) کو غسل دیا جائے گا۔ لیکن نماز جنازہ واجب نہیں ہے کیونکہ وہ خود کشی کرنے والا متصور ہوگا۔ شریعت نے اس کی موت کو یک قلم ناقابل باز پرس قرار نہیں دیا۔ جیسا کہ مثلاً مرتد کی موت ہوتی ہے اور اس (قسم کے حادثہ) کو ایک مستقل قسم کا جرم قرار دیا ہے اور اس اجنبی شخص کی حرکت (جراحت رسانی) دنیا اور آخرت دونوں جگہ قابل باز پرس ہے۔ پس اس طرح تین قسم کی باتیں پیش آئی اور اس شخص کی جان تین طرح کے اقدامات سے تلف ہوئی۔ اب چونکہ ہلاک کرنے والوں میں سے ہر ایک پر اقدام قتل کی ایک تہائی ذمہ داری عائد ہوتی ہے لہذا اس اجنبی پر اس کے ذاتی مال سے ایک تہائی خون بہا واجب الادا ہوگا اور باقیوں سے ساقط ہو جائے گا اور ان کا فعل رائیگاں متصور ہوگا۔

ایک شخص کے قتل کی پاداش میں متعدد اشخاص کو سزائے قتل کا بیان

شافعیہ رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ ایک شخص کو اگر متعدد اشخاص نے قتل کیا ہو تو ان سب کو سزائے قتل ہوگی خواہ ان کی تعداد زیادہ ہو یا کم۔ وہ سب ارتکاب قتل میں شریک رہے ہوں یا جماعت کے بعض اشخاص نے قتل کیا ہو دھار والے آلے سے قتل کیا ہو یا کسی اور طرح سے۔ مثلاً کسی کو پہاڑ کی بلندی سے گرا دیں یا گہرے سمندر میں ڈال دیں یا کوئی دیوار اس پر ڈھا دیں۔ قطع نظر اس کے کہ اس شخص کو کتنے کیسے اور کس قدر بھاری رخم آئے۔ کیونکہ سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بابت روایت ہے کہ انہوں نے ایک فرد کے عوض پانچ آدمیوں کو یا بقول ضعیف سات آدمیوں کو قتل کیا جنہوں نے ایک شخص کو دھوکے سے مارا کہ اسے ایسی جگہ رکھا کہ کوئی اسے نہ دیکھ سکے۔ اس بارے میں حضرت ممدوح کا یہ قول مشہور ہے ”لو تملاء علیہ اهل صنعاء لقتلتهم جميعا“ (یعنی اگر تمام اہل صنعاء قتل کی سازش میں شریک ہوتے تو میں ان سب کو قتل کر دیتا) پھر ان کے اس عمل پر اس وقت کے کسی صحابی نے اعتراض نہیں کیا اور اس عمل پر اجماع ہو گیا۔ پھر یہ بھی ہے کہ اگر ایک جماعت کے قتل پر ایک شخص واجب القتل ہوتا ہے تو ایک شخص کے قتل پر تمام جماعت (شرکائے قتل) کو واجب القتل ہونا چاہیے۔ جیسا کہ تہمت وغیرہ کی پاداش میں (سب پر) حد نافذ ہوتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ حکم قصاص (خون کا بدلہ خون) کی غرض خون ریزی کے سد باب کے لئے ہے۔ اب اگر قتل میں تمام شریک ہونے والوں پر قصاص عائد نہ ہو تو ہر شخص جو کسی کو قتل کرنا چاہے کسی کے قتل میں دوسروں کو شریک کار بنالے گا اور اس طرح قتل کرنے کا بہانہ اس کے ہاتھ آجائے گا۔ کیونکہ اس پر قصاص تو عائد ہی نہ ہوگا۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ ولی مقتول کو یہ حق ہے کہ ان میں سے کسی کے حصہ کا خون بہا معاف کر دے نیز چاہے تو ان سب کو خون بہا کی ادائیگی سے معاف کر دے۔ پھر یہ ہے کہ جس جس نے اسے زخم پہنچایا واجب الادا خون بہا ان سب پر حصہ مساوی عائد ہوگا۔ کیونکہ مختلف زخموں کے اثرات کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا ممکن ہے کہ ایک شخص کے لگائے ہوئے زخم کی اذیت متعدد زخموں سے زیادہ ہوں اور اگر مثلاً ان سب نے تازیانے مار مار کر قتل کر دیا اور ان میں سے فرداً فرداً ہر ایک نے مارا تو ان سب کو قاتل تصور نہیں کیا جائے گا۔ پس قصاص کے عائد ہونے کی متعدد صورتیں ہیں:

ایک تو یہ ہے کہ تمام شرکائے قتل کو مستوجب قصاص قرار دیا جائے گا تاکہ کوئی صورت قتل کے روا ہونے یا ناقص خون کرنے کی نہ نکل سکے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جملہ (شرکائے قتل) میں سے کسی پر قصاص عائد نہ ہو کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا فعل (قتل عمد نہیں بلکہ) مشابہ بہ عمد ہیں لہذا خون بہا عائد ہوگا۔

تیسری صورت یہ ہے اور یہی سب میں درست معلوم ہوتی ہے کہ جملہ شرکائے قتل پر قصاص عائد ہو بشرطیکہ وہ سب ضربات لگانے کا اقرار کریں اور ان میں ہر ایک کی ضرب کو جان کے ہلاک کرنے میں دخل ہو۔ بخلاف اس صورت کے، جبکہ وہ سب ایک ساتھ پل پڑیں اور یکے بعد دیگرے چوٹ نہ لگائیں، ایسی صورت میں سب پر خون بہا عائد ہوگا۔ چوٹ سے مراد یہ ہے کہ اسے ہلاک کرنے میں دخل ہو۔ ہلکی خراش کو یہاں ضرب قرار نہیں دیا جائے گا۔ مقتول کے

وارث کو حق ہے کہ وہ ہر ایک سے پورا پورا قصاص لے کیونکہ جان کے حصے نہیں ہو سکتے اگر اسے خون کے کچھ حصے کا حقدار مانا جائے تو سزائے قتل نہ ہوگی۔

کہا جاتا ہے کہ کچھ حصے کی دلیل یہ ہے کہ اگر خون بہا کا معاملہ ہو تو حصہ کی صورت میں اسے کچھ نہیں ملے گا اور دیت (خون بہا) کا پورا ہونا سب کی شمولیت کے بغیر ممکن نہیں لہذا (حصوں سے) پورا کیا جائے گا۔ اور امام صاحب نے (جواز حصہ کی بابت) اس امر پر قیاس کرنا کہ مرد عورت کو قتل کر دے تو نصف خون بہا واجب ہوتا ہے غلط فرمایا ہے کیونکہ اس صورت میں (واجب خون بہا کو نصف نہیں کیا گیا بلکہ) نصف خون بہا کو (پورا خون بہا) قرار دے کر واجب کیا گیا ہے۔ عورت کا خون بہا (عام خون بہا کا) نصف ہی پورا خون بہا ہے۔

اگر کسی شخص کا زخم اچھا ہو جائے اور موت واقع نہ ہو تو اس زخم کے مطابق قصاص عائد ہوگا جان کا قصاص عائد نہ ہوگا کیونکہ یہ واردات اس حالت میں قتل قرار دی جاتی ہے جبکہ وہ زخم جسم میں سرایت کر کے ہلاکت لاتا۔

حنا بلہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص کو (چند اشخاص کی) جماعت قتل کر دے تو ان سب کو سزائے قتل نہ ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سزائے قتل میں مساوات کی شرط رکھی ہے اور فرد واحد جماعت کے مساوی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”وکتبنا علیہم فیہا ان النفس بالنفس“ (یعنی ہم نے انہیں تورات میں یہ حکم دیا ہے کہ جان کے بدلے جان لی جائے) نیز ارشاد ہے ”الحر بالحر والعبد بالعبد“ (یعنی آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام پر قصاص عائد ہوگا) پس ان (شرکائے قتل) پر حسب تعداد خون بہا عائد ہوگا یا صرف ایک کو قتل کیا جائے گا اور باقی خون بہا دیں گے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ ایک جان کے بدلے تمام جماعت (شرکائے قتل) کو سزائے قتل دی جائے گی۔ ہاں اگر چند اشخاص نے مل کر ایک عضو کو کاٹا ہے تو صرف ایک شخص کا وہ عضو کاٹا جائے گا۔ کیونکہ (قصاص میں) جو قتل کا حکم ہے اس کا مقصد قتل کو مٹانا ہے۔ اگر ایک شخص کے قتل کرنے پر (شرکائے قتل) کی تمام جماعت کو قتل نہ کیا جائے تو جرم قتل میں زیادتی ہو جائے گی کہ لوگ ایک ساتھ مل کر دوسروں کو قتل کرنے لگیں گے خواہ ایک جماعت اس کے ساتھ شامل ہو یا ایک شخص ہو۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ مقام صنعاء کی ایک عورت کا خاوند مفقود الخمر ہو گیا اور اپنا ایک بیٹا جو کسی اور بیوی سے تھا اس کا نام اصیل تھا اس کے کمرے میں یعنی (اس کے پاس) چھوڑ گیا۔ اس عورت نے خاوند کے جانے کے بعد ایک اور شخص سے آشنائی کر لی اور اس شخص سے عورت نے کہا کہ یہ لڑکا ہماری رسوائی کا باعث ہے اسے قتل کر دو اس شخص نے انکار کیا عورت بھی اس سے کھینچ گئی۔ تب وہ شخص پھر عورت کے کہنے میں آ گیا آخر اس شخص نے ایک اور شخص کو ملایا۔ اور اس عورت نے اپنے نوکر کو ساتھ لگایا اور سب نے مل کر اس لڑکے کو قتل کر دیا پھر اس کی لاش کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ایک چڑے کے تھیلے میں رکھا اور ایک غیر آباد جگہ پر لے جا کر اندھے کنوئیں میں جس میں پانی نہ تھا ڈال دیا عورت کے ایک راز داں نے یہ قصہ بیان کر دیا اس عورت کا آشنا پکڑا گیا اور اس نے اقرار جرم کر لیا اور باقی شرکائے قتل نے بھی اقرار کر لیا ان حالات کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جوان دنوں یمن کے حاکم (گورنر) تھے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لکھ بھیجا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سب کے قتل کرنے کا حکم نامہ ارسال کیا اور فرمایا ”واللہ لو ان اہل صنعاء

اشتراکوا فی قتله لقتلتهم اجمعین‘ (یعنی بخدا اگر صنعاء کے تمام باشندے اس قتل میں شریک ہوتے تو میں ان سب کو قتل کرنے کا حکم دیتا) اس واقعہ سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے میں ایک شخص کے قتل میں شریک ہونے والی تمام جماعت کو سزائے قتل ہوگی۔ تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم اس سے متفق ہیں۔ کسی نے اس رائے سے اختلاف نہیں کیا۔ پس اس حکم پر تمام امت کا اجماع ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ غلبہ کی بناء پر قتل کرنا موجب فساد عظیم ہے اور اس خرابی کی صورت میں بدکرداروں کی تنبیہ لازم ہوتی ہے لہذا جبری قتل کے خلاف سخت تدارک ہے چنانچہ قتل عمد کی سزا کی بجائے قصاص کا حکم ہے تاکہ بدکردار باز آجائیں۔ پس تحفظ جان کے لئے یہ حکم ضروری ہے۔

صاحب نہایت فرماتے ہیں کہ یہ حکم استحسان (مصلحت عمومی) کی بناء پر ہے وگرنہ قاعدہ کی رو سے ان پر قصاص عائد نہ ہوگا کیونکہ قصاص (مبادلہ کی سزا) میں یکسانیت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اگر سزا میں زیادتی کی جائے تو مجرم پر ظلم ہے اور کمی کی جائے تو مظلوم کی حق تلفی ہے۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ ایک اور دس میں مساوات نہیں ہے اور یہ امر بدیہی ہے جسے عقل تسلیم کرتی ہے۔ پس جبکہ دس میں سے ایک فرد ہی فرد واحد کے مساوی ہو سکتا ہے تو دس ایک کے مساوی کیسے ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اسی قاعدہ کی تائید کرتا ہے ”کتبنا علیہم فیہا ان النفس بالنفس“ (یعنی ہم نے تورات میں جان کے بدلے جان کا حکم دیا ہے) اور یہ ارشاد کئی جانوں کے مقابلہ میں ایک جان کو ہم بدلہ رکھنے کی نفی کرتا ہے۔ لیکن اس قاعدہ کو ایک روایت کی بنا پر نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ صنعاء کے سات باشندوں نے مل کر ایک شخص کو قتل کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سب کو قصاص میں قتل کا حکم دیا اور پھر فرمایا ”لو تملاء علیہ اہل صنعاء لقتلتہم بہ“ (یعنی اگر تمام اہل صنعاء اس قتل میں شریک ہوتے تو اس کے بدلے میں ان سب کو قتل کر دیتا)۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ تین یا زیادہ کی جماعت کو ایک شخص کے قتل کے عوض سزائے قتل ہوگی بشرطیکہ ان سب نے اسے مارنے کا ارادہ کیا ہو اور سب نے مل کر اسے ضرب لگائی ہو اور ان میں سے ہر ایک کی ضربات میں پہچان نہ ہوتی ہو (کہ کون سی ضرب کس نے لگائی) اب خواہ موت ان سب کے مارنے سے واقع ہوئی ہو یا بعض کے مارنے سے اگر یہ معلوم ہو کہ کس نے کہاں کہاں ضرب لگائی اور اگر کسی کی ضرب نازک (جان لیوا) جگہ پر لگی اور یہ نہ معلوم ہوا کہ کس کی ضربات سے موت واقع ہوئی تو قصاص ساقط ہو جائے گا اور ان سب کے مالوں سے خون بہا واجب الادا ہوگا بشرطیکہ ان سب نے مل کر قتل کی سازش نہ کی ہو۔ اسی طرح اگر سب کی ضربات یکساں تھیں تو سب کو سزائے قتل ہوگی اگر ضربات میں امتیاز کیا جاسکے۔ اور ان میں سے کسی کی ضربات کو جان لینے میں سب سے زیادہ دخل ہو تو جس کی ضرب سب سے زیادہ شدید تھی تو اسی شخص کو (سزائے قتل) بمقابلہ دوسروں کے مقدم رکھا جائے گا بشرطیکہ اس ضرب کا لگانے والا معلوم ہوا اگرچہ سب نے قتل کرنے اور مارنے کا ارادہ کیا ہو اور سب موجود ہوں اور ایک کے سوا سب شریک قتل نہ ہوں ہاں طور کہ اگر وہ ارتکاب نہ کرتا تو کوئی دوسرا اسے نہ چھوڑتا۔ اب خواہ یہ قتل ایسے آئے قتل سے ہوا ہو جس سے بالعموم قتل ہوتے ہیں یا ایسے آئے سے ہوا جسے بالعموم قتل کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اگر سب نے اتفاق کر کے قتل کا ارتکاب کیا ہو تو سب کو سزائے قتل ہوگی اگرچہ کسی ایک کی

چوٹ کاری لگی ہو یا وہ چوٹ کسی تازیانے وغیرہ کی ہو۔ اگر سب نے بالا ارادہ اسے مارا گو سب نے اتفاق نہ کیا ہو تب بھی تمام شرکاء واجب القتل ہوں گے۔ اگرچہ ان کی ضربات میں امتیاز نہ ہو سکے (کہ کس نے کون سی ضرب لگائی) یا امتیاز ہو سکتا ہو لیکن سب کی ضربات یکساں ہوں یا یکساں نہ ہوں لیکن یہ نہ معلوم ہو سکے کہ کس کی ضرب سب سے زیادہ شدید تھی یا کس نے پہلے ضرب لگائی اور کسی اور کو سزا دی گئی۔ یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ ایسے حالات میں مضروب مردہ پایا جائے یا اس کے نازک حصہ جسم پر چوٹ آئی ہو یا بیہوش ہو اور اسی بے شعوری کی حالت میں موت واقع ہو جائے۔ بصورت دیگر ”قسامہ“ واجب ہوگا (یعنی ورثائے مقتول قسم کھائیں گے کہ اس کی موت ان کی ضربات سے واقع ہوئی) (قسامہ کے بعد) صرف ایک شخص کو سزائے قتل ہوگی واللہ اعلم بالصواب۔

متعدد اشخاص کے قاتل کا بیان

حنفیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر فرد واحد نے آزاد مسلمانوں کی ایک جماعت کو قتل کر دیا تو اس پر خون بہا کے سوا اور کوئی سزا عائد نہ ہوگی اس کے بعد اس کے ذمہ کچھ نہ رہے گا۔ البتہ اگر مقتولوں کے ورثاء حاکم کے سامنے دعویٰ خون کریں تو ان سب کی طرف سے اس شخص کو قتل کر دیا جائے گا۔ اور ورثاء کو کچھ نہ ملے گا۔ اگر ان ورثاء میں سے کوئی ایک شخص دعویٰ کرے تب بھی اس قاتل کو سزائے قتل ہوگی اور دوسروں کا حق مطالبہ ساقط ہو جائے گا۔ کیونکہ اب جس سے قصاص لینا ہے وہی نہ رہا۔ نیز اس لئے بھی کہ ورثائے مقتول میں سے ہر ایک کو بلحاظ احکام شرع (مقتول کی طرف سے) جو مماثلت مد نظر ہے وہ پوری ہو جائے۔ اب در آنحالیکہ (جرم قتل کے عوض) مجرم کو بنا بر فیصلہ اول قتل کر دیا گیا تو مماثلت پوری ہوگئی۔ اگر مماثلت مد نظر نہ ہوتی تو قصاص (خون کا بدلہ خون) واجب ہی نہ ہوتا۔

پھر یہ بھی ہے کہ اس طرح ورثائے مقتول میں سے ہر ایک کی طرف سے گویا کاری (جان لیوا) زخم لگایا گیا لہذا سزائے قتل (جو ایک شخص کے مطالبہ پر ہوئی) وہ تمام ورثاء کی طرف سے سمجھی جائے گی کیونکہ قتل کو دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا (کہ سزائے قتل میں تھوڑا تھوڑا حصہ سب نے لے لیا) بہر حال یہ حکم قصاص ان اسباب کے نتیجہ میں ہوا جن کو جماعت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے یہ نسبت حصہ رسدی ہوگی یا یک جائی۔ پہلی صورت صحیح نہیں ہے کیونکہ قصاص کو اجزاء میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا لہذا دوسری صورت قرار پائے گی (یعنی سزائے قتل یک جائی متصور ہوگئی) ایسی وجہ ہے کہ اگر (مثلاً) ایک جماعت کسی کو قتل نہ کرنے کی قسم کھائے اور سب نے مل کر قتل کیا ہو تو (یہ نہیں کہا جائے گا کہ سب نے تھوڑا تھوڑا قتل کیا کیونکہ فعل قتل کے حصے نہیں ہو سکتے بلکہ) سب کو قاتل قرار دیا جائے گا اور سب قسم توڑنے والے متہم ہو رہے ہوں گے۔

پھر یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ”الآدمی بنیان العرب“ ماعون من ہدم بنیان العرب“ (یعنی انسان اللہ تعالیٰ کی ایک تعمیر ہے جو اللہ کی تعمیر کو ڈھائے) یہ ارشاد باوجود اس کے کہ قتل کے منافی ہے شریعت نے قصاص کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ قاتل کو قتل کئے جانے کے حکم سے لوگوں کی زندگی کے (کے تحفظ) کی غرض پوری ہوگئی۔ لہذا صرف اسی کو کافی سمجھا گیا اس کے علاوہ ورثاء کو اور کچھ نہ ملے گا۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے مسلمانوں کی ایک جماعت کا ناحق خون کیا تو (مقتولوں میں سے) پہلے شخص

کے قتل پر قاتل کو سزائے قتل ہوگی اور باقی مقتولوں (کے ورثاء) کو اموال کی شکل میں خون بہا کا حق ہوگا۔ اگر تمام آدمیوں کا قتل ایک ہی وقت میں ہوا مثلاً وہ لوگ سو رہے تھے اور ان پر دیوار گرا دی جس سے بیک وقت سب ہلاک ہو گئے تو مقتولوں کے ورثاء میں قرعہ ڈالا جائے گا جس مقتول کے وارث کے نام قرعہ نکلے اس مقتول کے عوض قاتل کو سزائے قتل ہوگی اور باقی ورثائے مقتولین کو صرف خون بہا ملے گا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان سب کے قتل کی پاداش میں قاتل کو قتل کیا جائے گا اور خون بہا کو ورثاء کے درمیان تقسیم کیا جائے گا۔ کیونکہ اب قصاص ممکن نہیں جیسے کسی ملزم کی وفات کے بعد (ہوتا ہے کہ) سزا ممکن نہیں۔ اگر قاتل کے ترکہ میں اتنی گنجائش ہے کہ (پورا خون بہا) مقتولوں کے ورثاء میں تقسیم کیا جاسکے تو فیہا ورنہ جو ترکہ بھی ہے وہ حصہ رسدی خون بہا کی طرح تقسیم کیا جائے گا۔ یہ حکم اس لئے کہ یہ معاملہ ایک شخص کے متعدد قتلوں کا ہے اور وہ شخص جس پر قتل نافذ ہوا ایک ہے لہذا اس میں مماثلت نہیں ہے بلکہ اسے فیصلہ سابقہ پر قیاس کیا گیا ہے۔ لیکن یہ شریعت میں مشہور ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ دین اسلام میں قصاص اور جرم میں یکسانیت کا لحاظ مد نظر رکھا گیا ہے تاکہ سزا کی زیادتی سے مجرم پر ظلم نہ ہو اور کسی سے اس شخص کی حق تلفی نہ ہو جس کا جرم کیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر سزا جرم کے مطابق ہو تب ہی ظلم یا حق تلفی سے بچا جاسکتا ہے۔ اب اگر قصاص کے پہلے حقدار کے علاوہ کسی اور نے یا جسے قرعہ کی رو سے قصاص کا حقدار قرار دیا گیا اس کے سوا کسی اور نے قصاص لیا تو یہ گناہ ہوگا۔ کیونکہ یہ ایسے شخص کو قتل کرنا ہے جسے قتل کا حکم نہیں تھا تاہم حاکم پر لازم ہے کہ اس عمل میں دوسرے کا حق ضائع کرنے پر اسے معذور سمجھے اور سزائے قتل کو قصاص قرار دیا جائے گا۔ کیونکہ اب (قصاص لینے کا) حق (قصاص یافتہ شخص کے ولی کی طرف منتقل ہو جائے گا۔ اس کے لئے دلیل یہ ہے کہ اگر وارث اول (اپنا حق) معاف کر دے تو حق ولایت اس کے بعد کے دوسرے ولی کو منتقل ہو جاتا ہے باقی ورثاء کے لئے خون بہا واجب ہے کیونکہ مجبوراً انہیں قصاص لینا ناممکن ہے۔ اگر تمام (دعویداروں) نے (قاتل کو) مارا یہاں تک کہ وہ مر گیا تو برا کیا یہ ان سب کی طرف سے خون کا بدلہ سمجھا جائے گا اور ان میں سے ہر ایک خون بہا کا بقیہ حصہ اسے واپس کر دے گا۔ چنانچہ اگر مارنے والوں کی تعداد تین ہے تو ان میں سے ہر ایک اپنے حق کا ایک تہائی حصہ لے گا اور اس ولی کو دو تہائی حصہ ملے گا اگرچہ کسی اجنبی نے اسے قتل کر دیا ہو اور مقتول اول کے ولی نے خون بہا کا اپنا حق معاف کر دیا ہو۔

اگر مقتول کے تمام ورثاء قصاص اور خون بہا میں شریک ہونے کا مطالبہ کریں تو یہ مطالبہ منظور نہیں کیا جائے گا۔ اگر مقتول اول کا ولی یا مقتولوں میں سے کسی کا ولی بچہ جنون زدہ یا موجود نہ ہو تو قاتل کو قید میں رکھا جائے گا یہاں تک کہ وہ ولی بالغ ہو جائے جنون سے افاقہ پا جائے یا سفر سے واپس آجائے (اس کے بعد قصاص دیت یا معافی کا تصفیہ ہوگا)۔

اگر ایک شخص نے کسی کو ضرب شدید لگائی مثلاً پچیس کوڑے مارے اور اس کے بعد کسی دوسرے شخص نے سابقہ ضربات کی تکلیف پر دو تین کوڑے اور مارے اور وہ جانتا تھا کہ اسے پہلے مار پڑ چکی ہے (اور ان ضربات سے) اس کی موت واقع ہوگئی تو وہ دونوں مستوجب قصاص ہوں گے۔ کیونکہ دونوں کا ارادہ ہلاک کرنے کا تھا۔ ہاں اگر دوسرے شخص کو

پہلی مار کا علم نہ تھا تو دونوں میں سے کسی پر قصاص عائد نہ ہوگا۔ کیونکہ (ظاہر ہے) دوسرے شخص نے ہلاک کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ اور پہلا شریک ضرب (جو بلا ارادہ قتل تھی) متصور ہوگا۔ البتہ پہلے شخص پر قتل عمد کے خون بہا میں سے (اس کے اقدام کے مطابق) اس کے حصہ کا خون بہا عائد ہوگا اور دوسرے پر قتل شبہ عمد کے خون بہا کا حصہ اس کی ضربات کی نسبت سے عائد ہوگا۔ اگر وقوعہ کی نوعیت اس کے برعکس ہو (یعنی ایک شخص نے پہلے صرف دو کوڑے مارے اور دوسرے نے پچاس کوڑے مارے) تب بھی دونوں میں سے کسی پر قصاص (خون کا بدلہ خون) عائد نہ ہوگا، کیونکہ پہلے شخص کا اقدام شبہ عمد ہے اور دوسرا اس (شبہ عمد کے اقدام میں شریک ہے) لہذا پہلے شخص پر اس کی ضربات کے مطابق شبہ عمد کے قتل کا حصہ خون بہا عائد ہوگا اور دوسرے پر اس کی ضربات کے مطابق شبہ عمد کے خون بہا کا حصہ عائد ہوگا۔

اگر کسی نے ایک جماعت کو یکے بعد دیگرے قتل کیا یا ان کے اعضاء جسم کاٹے تو سزائے قتل یا سزائے قطع اس جرم کی پاداش میں ملے گی جو پہلے وقوع پذیر ہوا بشرطیکہ قصاص کے اولین حقدار نے اپنے حق کو معاف نہ کیا ہو۔ واضح ہو کہ قاتل آزاد ہو یا غلام دونوں کا ایک ہی حکم ہے۔ تاہم کہا جاتا ہے کہ اگر قاتل غلام ہو تو تمام مقتولوں کی پاداش میں اسے قتل کیا جائے گا۔ اگر ایک کا قتل معاف کر دیا جائے تو دوسرے کے قتل کی پاداش میں یا پھر تیسرے قتل کے بدلے وغیرہ اور مقتول کا پہلا یا بعد کا ہونا موت کے واقع ہونے پر ہوگا ضرب لگانے کے اعتبار سے نہ ہوگا۔

حنا بلہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے کئی اشخاص کو یکے بعد دیگرے قتل کیا اور تمام مقتولوں کے ورثاء نے حاضر ہو کر مطالبہ قصاص کیا تو اسے سزائے قتل پہلے مقتول کے قتل کی پاداش میں ہوگی۔ باقی ورثاء مقتول کے مطالبہ پر نہ ہوگی۔ اگر قاتل نے ان سب کو یکجائی طور پر ہلاک کیا اور یہ معلوم نہ ہوا کہ پہلے کس کو موت آئی اور مقتولوں کے وارثوں نے حاکم کے سامنے قصاص کا مطالبہ کیا تو ان سب کے قتل کی پاداش میں اس کو قتل کیا جائے گا اور خون بہا اس پر عائد نہ ہوگا۔

اگر مقتولوں کے ورثاء میں سے بعض نے قصاص کا مطالبہ کیا اور بعض نے دیت (خون بہا) کا تو قصاص کا مطالبہ کرنے والے کی طرف سے سزائے قتل ہوگی اگرچہ وہ دو سے زائد ہوں اور باقی ورثاء میں سے جنہوں نے خون بہا کا مطالبہ کیا انہیں خون بہا ملے گا۔

اگر تمام ورثاء نے خون بہا کا مطالبہ کیا تو ان میں سے ہر ایک کو پورا پورا خون بہا قاتل کے ذاتی مال سے دیا جائے گا۔ بشرطیکہ وہ قتل عمد ہو۔ قاتل کے پدری رشتہ داروں پر کچھ عائد نہ ہوگا۔ اگر (قاتل کے) ترکہ میں اتنی گنجائش نہ ہو کہ تمام ورثاء کو دیا جاسکے تو جو کچھ بھی ہے ہر ایک وارث کو حصہ رسدی اس میں سے ملے گا جیسا کہ قرض خواہوں سے کیا جاتا ہے۔

دو آدمیوں کا مل کر ایک شخص کا ہاتھ کاٹنا

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر دو آدمیوں نے مل کر عمد ایک شخص کا ہاتھ کاٹ دیا ہے تو دونوں میں سے کسی پر قصاص عائد نہ ہوگا۔ البتہ دیت (تاوان) واجب ہوگا۔ کیونکہ ان اصحاب کے نزدیک چند مجرموں کا مل کر قطع عضو کے جرم کا ارتکاب کرنا چند اشخاص کا مل کر کسی کو ہلاک کر دینے کے برابر نہیں ہے۔ پس اگر دو آدمیوں نے مل کر ایک آزاد مرد یا عورت کا یا غلام کا ہاتھ کاٹ دیا تو اس پر قصاص (یعنی عضو کا بدلہ عضو) نہیں اس لئے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک نے ہاتھ کا کچھ حصہ

کاٹا) پورا ہاتھ نہیں کاٹا) قطع نظر اس کے کہ ایک ہی جگہ سے دونوں نے کاٹا ہو یا مختلف جگہوں سے اس لئے کہ وہ حصہ جو ایک نے کاٹا وہ دوسرے کا کاٹا ہوا نہیں ہے لہذا ایک ہاتھ کے کچھ حصہ کا کاٹنے والا پورا ہاتھ کاٹے جانے کی سزا کا مستوجب نہیں ہے۔ کیونکہ اس طرح (جرم اور سزا میں) مطابقت نہیں رہتی۔ عضو مقطوع کے کئی حصے ہو سکتے ہیں اور یہ ہو سکتا ہے اور عقل میں یہ بات آ سکتی ہے کہ ایک شخص کچھ حصہ عضو کو کاٹے اور کچھ چھوڑ دے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ جس نے ادھورا کام کیا ہے اسے پورے عمل کا مرتکب قرار دیا جائے۔ بخلاف جان ہلاک کرنے کے کہ جان کا اتلاف اجزا میں نہیں کیا جاسکتا۔ جیسا کہ اپنی جگہ پر اس کی تفصیل آچکی ہے۔ غرض ایسے مجرموں پر نصفاً نصف دیت عائد ہوگی۔ کیونکہ ان پر ایک ہاتھ کی دیت عائد ہوگی۔ انہوں نے عہد اس جرم کا ارتکاب کیا ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ چند اشخاص نے قتل نفس کے علاوہ کسی اور جرم (یعنی قطع عضو) کا ارتکاب کیا اور ان کی ضربات کا امتیاز کیا جاسکے کہ ان میں سے کس نے کہاں کہاں ضرب لگائی تو واجب ہے کہ ان میں سے ہر ایک زخم کی پیمائش کے مطابق (مجرموں سے) قصاص لیا جائے۔ اس میں عضو مقطوع کے نرم سخت یا چھوٹا بڑا ہونے کا لحاظ نہیں کیا جائے گا۔ اگر چند مجرموں نے مل کر قطع عضو کے جرم کا ارتکاب کیا تو ہر ایک سے پورا قصاص لیا جائے گا۔ خواہ ان کی ضربات میں امتیاز ہو سکتا ہو یا نہ ہو سکتا ہو۔ یہ حکم بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ جان کے قتل میں ہوتا ہے کہ اگر چند اشخاص نے باہم مل کر ایک شخص کو قتل کیا تو اس ایک کے بدلے تمام مجرموں کو سزائے قتل ہوگی۔ لیکن اگر جراحت رسائوں نے جرم کا ارتکاب باہم مل کر نہیں کیا اور زخموں میں امتیاز نہ ہو سکے (کہ کون سا زخم کس نے لگایا) تو آیا ان تمام مجرموں کو تمام اعضاء مقطوع کا تاوان دینا ہوگا اور قصاص (یعنی عضو کے بدلے عضو) کا حکم نہ ہوگا یا تمام زخموں کا مجموعی قصاص ہر ایک سے لیا جائے گا۔ چنانچہ اگر (مثلاً) تین اشخاص نے جرم کیا۔ ایک نے آنکھ پھوڑی دوسرے نے ہاتھ جدا کیا اور تیسرے نے پاؤں کاٹ دیا اور یہ معلوم نہ ہو کہ آنکھ کس نے پھوڑی اور ہاتھ یا پاؤں کس نے کاٹا؟ اور اس میں انہوں نے ایک دوسرے کی مدد نہ کی ہو اور ہر ایک سے منفرد ایہ جرائم وقوع پذیر نہ ہوئے ہوں تو ہر ایک سے پورا قصاص لیا جائے گا یعنی سب کی آنکھ پھوڑی جائے گی اور ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں گے بصورت دیگر زیادہ قوی مسلم وہی ہے جو پہلے بتایا گیا (کہ بقدر جراحت ہر ایک سے تاوان لیا جائے)۔

شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ عضو کاٹنے اور جراحت رسائی کے مجرم کا مستوجب قصاص ہونا ان ہی شرائط پر موقوف ہے جو قتل کے لئے ہیں۔ یعنی مجرم مکلف ہو (جس پر احکام شرعیہ عائد ہوتے ہیں) اور ذمہ دار ہو۔ مجروح کی بنیاد (یعنی باپ دادا وغیرہ) نہ ہو اور یہ کہ مجروح مجرم کا ہم پلہ ہو (یعنی ایسا نہ ہو کہ مثلاً مجروح غلام ہو اور مجرم آزاد ہو تاہم جرم اور سزا میں مساوات شرط نہیں ہے جیسا کہ بیان کے قصاص میں بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ غلام کے بدلے غلام کو عورت کے بدلے مرد کو نیز اس کے برعکس (یعنی مرد کے بدلے عورت کو) مسلم کے بدلے ذمی (یعنی غیر مسلم رعایا) کو اور آزاد کے بدلے غلام کو سزائے قطع دی جائے گی اس کے برعکس (یعنی ذمی کے بدلے آزاد کو) سزائے قصاص نہ ہوگی نیز اس کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ جرم کا ارتکاب عہد اور عہد وانا کیا گیا ہو۔ کیونکہ عہد ارتکاب جرم نہ ہو یا غلطی سے جرم سرزد ہو گیا ہو یا شبہ عہد ہو (یعنی عہد

ارتکاب کے مشابہ فعل سرزد ہوا ہو) تو قصاص عائد نہ ہوگا۔ غلطی سے زخمی کر دینے کی ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص کسی دیوار پر پتھر کھینچ کر مارے اور وہ پتھر کسی انسان پر جا پڑے اور اس کا سر زخمی ہو جائے۔ شبہ عمد کی ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص کسی کے سر پر چیت مارے۔ یا چھوٹا سا پتھر جس سے بالعموم زخم نہیں ہوا کرتا لیکن اس پتھر سے گومڑا پڑ جائے یا کھوپڑی کھل جائے یا اس طرح کا کوئی عمل سرزد ہو جائے وغیرہ۔

ایک ہاتھ کے بدلے متعدد اشخاص کے ہاتھ بھی کاٹے جاسکتے ہیں۔ جب کہ چند اشخاص مل کر (کسی کا) ہاتھ کاٹ دیں۔ مثلاً وہ سب مل کر خنجر کسی کے ہاتھ پر رکھ دیں اور سب مل کر اسے اتنا دبائیں کہ ہاتھ کٹ جائے تو ان سب پر قصاص عائد ہوگا یعنی سب نے ہاتھ کاٹنے کا ارادہ کیا تو سب کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں گے جیسا کہ جان ہلاک کرنے پر ہوتا ہے۔ یہاں پر کہا جاسکتا ہے کہ دو شخص مل کر اگر چوری کرتے ہیں اور بحیثیت مجموعی مال مسروقہ مقدار سرقہ کے برابر ہو جائے (لیکن وہ مال دونوں میں تقسیم ہو کر مقدار سرقہ کے برابر نہیں ہوگا) تو ان دونوں کو سزائے قطع ید نہ ہوگی اسی طرح اس صورت میں بھی کیوں نہیں کیا جاتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چوری کی پاداش میں ہاتھ کاٹنا جانا اللہ کا حق ادا کرنا ہے اور (اللہ بے نیاز ہے لہذا نفاذ حدود میں نرمی برتی جاسکتی ہے۔ بخلاف قصاص کے کہ وہ بندے کا حق ہے اور ایسی سزا ہے جو آئندہ کے لئے جرم کا سد باب کرنے اور انسانی جان کا احترام ملحوظ رکھنے کے لئے تجویز کی گئی ہے) لہذا حقدار کے سوا کسی اور کو معافی یا نرمی کا حق نہیں ہے۔

اگر شرکائے جرم میں سے ہر ایک کے افعال کی تعیین ہو سکے۔ مثلاً ان میں سے ہر ایک نے (کسی کا عضو بدن) مختلف زاویوں سے کاٹا ہو یا دونوں نے مختلف دھار دار آلے استعمال کئے ہوں تو ان میں سے کسی پر بھی قصاص واجب نہ ہوگا۔ کیونکہ دونوں میں سے ہر ایک نے (پورا ہاتھ نہیں کاٹا بلکہ) ہاتھ کا حصہ کاٹا لہذا (مجرم کا) پورا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا بلکہ ہر ایک پر نصف دیت عائد ہوگی۔

اگر چند اشخاص نے مل کر کسی کے عضو کا کچھ حصہ کاٹا یا مثلاً آری سے کاٹنے میں ایک دوسرے کی مدد کی کہ ایک طرف سے ایک نے اور دوسری طرف سے دوسرے نے کھینچا تو جمہور علماء کا کہنا ہے کہ ان میں سے کسی پر قصاص عائد نہ ہوگا کیونکہ جرم اور سزا میں مماثلت دشوار ہوگی۔ محل قصاص (یعنی جس عضو پر قصاص عائد ہوتا ہے) پیچیدہ پٹھوں، رگوں اور شریانوں پر مشتمل ہے۔ ساتھ ہی اعضاء کی ساخت میں بھی اختلاف ہوتا ہے لہذا ان میں سے ہر ایک پر ان کے جرائم کے مطابق اس قدر مطالبہ عائد کیا جائے گا جس کا مجموعہ کی ہاتھ کی دیت (تاوان) کے برابر ہو جائے۔

ایک شخص کا دو شخصوں پر زیادتی کرنا

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے دو شخصوں کے دائیں ہاتھ کاٹ دیئے اور دونوں نے دعویٰ قصاص کیا تو ان کو حق ہے کہ اس شخص کا ہاتھ کاٹ دیں اور اس شخص سے نصف خون بہا وصول کر کے نصفاً نصف باہم تقسیم کر لیں خواہ اس شخص نے دونوں کے ہاتھ ایک ہی وقت میں کاٹے ہوں یا یکے بعد دیگرے کاٹے ہوں، کیونکہ دونوں کیلئے حق مطالبہ کا موجب یکساں ہے۔ لہذا دونوں کے حق میں یکساں فیصلہ ہوگا۔ جس طرح کہ مال ترکہ میں دو قرض خواہوں کا حق ہوتا ہے اور

قصاص نام ہے کسی فعل کے مالک ہونے کا۔ اگرچہ امر منافی قصاص موجود ہو۔ لہذا قصاص اس کے حق میں ہوگا جس نے پورا حق لیا اور جب محل قصاص (یعنی وہ عضو جس پر قصاص عائد ہوتا ہے) باقی نہ ہو تو دوسرے کے ثبوت حق کو مانع نہیں ہے۔ بخلاف رہن کے۔ پس یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک غلام نے دو شخصوں کے دائیں ہاتھ یکے بعد دیگرے کاٹ دیئے تو دونوں کو ایک ہی غلام پر حق ہے۔

اگر ان دونوں میں سے جن کے ہاتھ کاٹے گئے ایک نے دعویٰ کیا تو مجرم کا ہاتھ کاٹا جائے گا اور دوسرے شخص کو نصف تاوان کا حق ہوگا۔ کیونکہ موجود الوقت کو اپنا حق لینے کا اختیار ہے اور غیر موجود کا حق رد کیا جائے گا اور درآنحالیکہ پورا حق ادا ہو گیا تو مزید ادائے حق کا امکان نہ رہا۔ لہذا دوسرے شخص کا حق صرف خون بہا قرار پائے گا کیونکہ ایک مستحق نے اپنا حق پورا لے لیا تو وہ ادا ہو گیا جب ایک مستحق کو پورا حق مل گیا تو دوسرے کا حق تاوان سے پورا کیا جائے گا (کیونکہ قصاص تو ممکن نہیں ہے)۔

اگر کسی نے ایک شخص کا دایاں ہاتھ اور دوسرے کا بایاں ہاتھ کاٹ دیا تو مجرم کے دونوں ہاتھ کاٹے جائیں گے اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس صورت میں (جرم کو سزا کے ساتھ) مناسبت نہیں رہی کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک نے ایک طرح کے نقصان اٹھائے اور ان دونوں نے مجرم کو اسی طرح کا نقصان پہنچا دیا۔ اس طرح ہر ایک کے حق کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس صورت میں نہ جنس منفعت کو نظر انداز کیا گیا ہے اور نہ حق سے زیادہ دیا گیا ہے۔

یہ اصحاب کہتے ہیں کہ اگر دونوں نے ایک ساتھ قصاص کا مطالبہ کیا تو ان دونوں کے حق میں مجرم کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا اور تاوان نہ ہوگا اگر دونوں میں سے ایک نے قصاص کا اور دوسرے نے تاوان کا مطالبہ کیا تو قصاص کے مطالبہ میں ہاتھ کاٹا جائے گا اور دوسرا تاوان کا حق دار ہوگا۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی نے دو شخصوں پر زیادتی اور ان دونوں کے دائیں ہاتھ بیک وقت یا یکے بعد دیگرے کاٹ دے تو اس کا دایاں ہاتھ دونوں جرموں کی پاداش میں کاٹا جائے گا۔ اس کے علاوہ کوئی اور تاوان نہ ہوگا۔ کیونکہ اب پورا پورا بدلہ لینا ممکن نہیں ہے اور سزا مطابق جرم نہیں دی جاسکتی۔

شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے دو اشخاص کے دائیں ہاتھ یکے بعد دیگرے کاٹ دیئے تو پہلے جرم کی پاداش میں مجرم کا ہاتھ کاٹا جانا واجب ہے اور دوسرے جرم کی پاداش میں تاوان واجب ہوگا۔ اگر ان دونوں کے ہاتھ ایک ساتھ ہی کاٹے گئے تو ان دونوں کے درمیان قرعہ اندازی کی جائے گی۔ جس کے نام قرعہ نکلے اس کے ہاتھ کے عوض تو مجرم کا ہاتھ کاٹا جائے اور اس میں دوسرے کے حق کی ادائیگی متصور نہ ہوگی اور یہ ایسا ہی ہے جیسے (ایک مال کو) رہن رکھنے کے بعد پھر رہن رکھنا اور (چونکہ دو جرموں کے مشترک ارتکاب قطع میں مجرم کا ایک ہاتھ کاٹنے سے دونوں کا حق ادا نہیں ہو سکتا لہذا قرعہ ڈال کر ایک کے حق کو فوقیت دی جائے گی اور دوسرے کے لئے مجرم پر تاوان واجب الادا ہوگا تا کہ مجرم پر جو اس کا حق ہے راگیاں نہ ہو۔ قتل عمد کی صورت میں بھی (جب کہ بیک وقت دو قتل کیا جائے) یہی ہوتا ہے اسی طرح جب مستحق اول کے تعیین کا معاملہ مشتبہ ہو جائے۔ (کہ مطالبہ قصاص کا پہلا حق دار کون ہے) تو اسی طریق کار (قرعہ اندازی) کو اختیار کیا جائے گا۔

اس حالت کا بیان جب کہ ایک شخص نے کسی کو پکڑ رکھا اور دوسرے نے اسے قتل کر دیا

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک کو کسی نے جکڑ رکھا اور دوسرے نے اسے قتل کر دیا تو قاتل پر قصاص عائد ہوگا اور جس نے پکڑ رکھا تھا اس پر قصاص عائد نہ ہوگا کیونکہ ارتکاب قتل کرنے والا وہی شخص ہے اور پکڑ کر رکھنے والا قتل کرنے کے کام میں اس کا شریک نہیں تھا۔ البتہ وہ مستوجب سزا ہے اور حاکم وقت اسے عمر قید سزا دے گا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما آنحضرت ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور نے فرمایا کہ ”اذا امسک الرجل الرجل وقتله الآخر“ یقتل الذی قتل، وینحبس الذی امسک“ بروایت دارقطنی (یعنی اگر ایک شخص نے کسی کو پکڑ رکھا اور کسی دوسرے شخص نے اسے قتل کر دیا تو قتل کرنے پر حکم قصاص عائد ہوگا)۔ کیونکہ فعل قتل کا ارتکاب اسی نے کیا ہے اور جس نے پکڑ رکھا تھا وہ مستوجب سزا ہوگا۔ حاکم جتنے عرصے کے لئے مناسب سمجھے اس کو سزائے قید دے۔ قید کی مدت کا کم یا زیادہ ہونا اس کے اختیار میں ہے۔ کیونکہ اس سزا کا مقصد مجرم کی اصلاح ہے۔ یہ مقصد نہیں ہے کہ اسے تمام عمر قید میں رکھا جائے۔ اس کے بارے میں انہوں نے یہ شرط رکھی ہے کہ مجرم (قتل کرنے والا) مکلف ہو۔ پس اگر کسی شخص نے ایک شخص کو پکڑ کر کسی پاگل کے حوالے کر دیا یا کسی درندے کے آگے ڈال دیا اور اس درندے نے اسے پھاڑ کھایا تو ان دونوں صورتوں میں پکڑنے والے پر حکم قصاص عائد ہوگا اور اگر ایک شخص نے کسی صغیر کو بدوران نشانہ بازی نشانہ پر رکھا۔ یعنی پہلے سے نشانہ پر رکھ کر دوسرے کا نشانہ نہیں بنایا اور وہ بچہ اس نشانہ باز کا نشانہ بن گیا تو جس نے اس بچے کو آگے رکھا تھا اس پر حکم قصاص عائد ہوگا کیونکہ اس صورت میں وہ شخص (پکڑنے والا) مرتکب قتل متصور ہوگا۔ یہ جرم ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص کسی کو گڑھے میں پھینک دے غرض اس صورت میں نشانہ باز پر الزام عائد نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ ایسا ہے جیسے کسی نے گڑھا کھودا ہو۔ بخلاف اس کے اگر کسی بچہ کو کسی کے نشانہ سے پہلے نشانہ پر لا کر رکھا۔ ایسی صورت میں نشانہ لگانے والا مستوجب قصاص ہوگا۔ کیونکہ اس نے بچے کو نشانہ بنا کر ارتکاب قتل کیا اور اس پر اسی طرح قصاص عائد ہوگا جیسے کسی کو کنوئیں میں دھکا دے کر مارا ہو۔ کنواں کھودنے والا نہیں پکڑا جائے گا۔ کنواں کھودنے کو ارتکاب قتل میں کوئی دخل نہیں ہے۔

امام علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ ”انہ قضی فی رجل قتل رجلاً متعمداً وامسکہ آخر قال: یقتل القتال، وینحبس الآخر فی السجن حتی یموت“ (یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کی بابت فیصلہ دیا جس نے ایک ایسے شخص کو قتل کیا جسے کسی اور نے پکڑ رکھا تھا کہ جس نے قتل کیا اسے سزائے قتل اور دوسرے کو عمر قید سزا دی جائے) بروایت امام شافعی رحمہ اللہ۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے کسی کو قتل کرنے کے ارادے سے پکڑ رکھا اور ایک دوسرے نے اسے قتل کر دیا اور پکڑنے والے کی گرفت ایسی تھی کہ اگر وہ نہ پکڑتا تو قاتل اسے قتل نہ کر سکتا تو ان دونوں پر یکساں خون بہا عائد ہوگا۔ پکڑنے والے پر اس لئے کہ وہ سبب قتل بنا اور قاتل پر اس لئے کہ اس نے خود ارتکاب قتل کیا۔ مالکیہ نے پکڑنے والے پر خون بہا کے عائد ہونے کی تین قابل لحاظ شرطیں رکھی ہیں ایک تو یہ ہے کہ قتل کرانے کے لئے پکڑ رکھا ہو دوسرے یہ کہ وہ جانتا ہو کہ قاتل اسے قتل کرنا چاہتا ہے۔ تیسرے یہ کہ اگر وہ اسے پکڑ کر نہ رکھتا تو قاتل کا بس اس پر نہ چل سکتا۔ پس اگر کسی نے عام طور کی مار پیٹ کے لئے پکڑ لیا ہے یا اسے علم نہ ہو کہ قاتل کا ارادہ اسے قتل کرنے کا ہے یا یہ کہ اس کا قتل ہونا اس کے پکڑنے پر منحصر نہ تھا تو اس صورت میں صرف اس کو سزائے قتل ہوگی جس نے عملاً ارتکاب قتل کیا اور پکڑ کر رکھنے

والے کو ایک سو دروں اور پورے ایک سال قید سزا ہوگی تاکہ اسے عبرت حاصل ہو۔

مقابلہ کی دو روایتوں میں سے ایک کی رو سے (مندرجہ بالا صورت میں) قتل کرنے والے کو بہر حال سزائے قتل ہوگی اور جس نے پکڑ رکھا تھا اسے عمر قید کی سزا ہوگی۔ دوسری روایت کی رو سے ان کا کہنا یہ ہے کہ ان دونوں کو غیر مشروط طور پر سزائے قتل ہوگی قاتل کو تو ارتکاب قتل کی بناء پر اور پکڑ کر رکھنے والے کو اس لئے کہ وہ قتل کا سبب بنا کہ اگر وہ پکڑ کر نہ رکھتا تو قتل نہ ہوتا۔

قتل خطا (یا قتل غیر عمد) میں دیت کی معافی کا بیان

مالکیہ حنفیہ شافعیہ اور جمہور فقہائے دیار کا کہنا ہے کہ اگر مقتول اپنا خون بہا معاف کر دے تو تاوان کے صرف تیسرے حصہ میں اس معافی کا نفاذ ہوگا، سوا اس صورت کے جبکہ ورثاء اس معاف کرنے کو جائز قرار دیں اس حالت میں قاتل کے ذمہ کا تاوان معاف ہو جائے گا۔ کیونکہ ورثاء مقتول نے مال موروثہ کی وراثت میں سے اپنا حق معاف کر دیا ہے اور اس کی دلیل ان کے نزدیک یہ ہے کہ مقتول اپنا مال موت کے بعد وارثوں کو بخش دیتا ہے اور چونکہ دیت (تاوان) بھی مقتول کی جان جانے کے بعد ہی واجب ہوتا۔ اس لئے وہ (تاوان) وارثوں کو منتقل ہو جاتا ہے اور متوفی کے لئے جائز نہیں ہے کہ ایک تہائی سے زیادہ ورثہ کے بارے میں وصیت کرے۔ اس کی بنیاد وہ شرعی حکم ہے جو وصیت کے متعلق آیا ہے کہ اس حکم کے بموجب وصیت پر عمر آمد ایک تہائی مال سے زیادہ میں نہیں ہو سکتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (وصیت کے بارے میں استفسار کرنے والے ایک صحابی کو) فرمایا، ”الثلث، والثلث کثیر“ (یعنی وصیت ترکہ صرف تیسرے حصہ تک کر سکتے ہو اور تیسرا حصہ بھی بہت ہے) ”حسن طاووس اور فقہاء کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ قتل خطا (قتل غیر عمد) کی صورت میں تاوان واجب کو معاف کر دینا جائز ہے جس کے بعد قاتل کے ذمہ سے اس کی ادائیگی جاتی رہے گی۔ اس کی بابت ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر مقتول کے خون کو معاف کیا جاسکتا ہے تو مال (تاوان) معاف کیا جانا زیادہ قرین قیاس ہے اس لئے بھی کہ تاوان کا حقدار پہلے مقتول ہوتا ہے اور بعد میں وہ وارثوں کو منتقل ہوتا ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر ورثاء (مقتول) میں بڑے اور چھوٹے ہیں اور بڑے معاف کر دیں تو چھوٹوں کو تاوان میں سے صرف ان کا حصہ ملے گا اور بڑے کی معافی چھوٹے پر اثر انداز نہ ہوگی۔ اگر (وارث) بچے کا کوئی ولی مثلاً باپ یا اس کا وصی ہے اور وہ بچہ بلا شرکت غیرے قصاص کا مستحق ہو تو ولی کو چاہیے کہ وہ دیکھے کہ مجرم کو سزائے قتل دینے یا دیت (تاوان) وصول کرنے میں سے کس بات میں (بچے کے لئے) بہتری ہے اگر دونوں ہی باتیں مصلحت کے اعتبار سے یکساں ہیں تو ولی کو اختیار ہوگا (کہ دونوں میں سے جس بات کو چاہے مطالبہ کرے) لیکن اس کیلئے یہ جائز نہیں ہے کہ مجرم کی سہولت کے لئے خون بہا کا کچھ حصہ وصول کرے اگر کامل خون بہا میں سے کچھ حصے پر صلح کر لی تو وہ بچہ بڑا ہو کر قاتل سے بقیہ (خون بہا) کا مطالبہ کر سکتا ہے اگر مجرم نادار ہو تو اب بھی وہ (تاوان سے) کم مقدار پر صلح کر سکتا ہے اگر کسی نابالغ کو قتل کیا گیا تو اس کے ولی کو (اس کی پاداش کے بارے میں) دخل دینے کا اختیار نہیں ہے بلکہ اس کے پشتینی رشتہ دار کو فیصلہ کا حق ہے۔ چنانچہ اگر ایک شخص نے کسی بچے کے غلام کو قتل کر دیا یا اسے زخم پہنچایا تو نابالغ (مقتول) کے ولی کے لئے بہتر

یہی ہے کہ رقم تاوان وصول کرے، قصاص (خون کا بدلہ خون) نہ لے، کیونکہ اس سے بچے کو کوئی فائدہ نہ ہوگا، لیکن یہ اس صورت میں ہے جبکہ اس قاتل سے بچے کو اور کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو، اگر ایسا اندیشہ ہو تو سزائے قصاص ہی لازم ہوگی۔ اور (اس قسم کے مسائل میں) کوتاہ فہم انسان کا بھی یہی حکم ہے نیز اعضائے بدن کے قصاص کا بھی یہی حکم ہے۔

قصاص جان کے طریقہ کا بیان

مالکیہ کہتے ہیں کہ قاتل کو بھی اسی طرح قتل کیا جائے جس طرح اس نے (مقتول کو) قتل کیا ہے، اگرچہ اس نے آگ میں جلا کر قتل کیا ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”وَأَن عَاقِبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهِ“ (یعنی اگر سزائے قصاص دینی ہو تو اسی طرح کی سزا دو جس طرح کی تمہیں اذیت دی گئی)۔ مفسروں کا کہنا ہے کہ یہ آیت اس امر کا ثبوت ہے کہ سزائے قصاص کا اسی طرح دینا جائز ہے جس طرح جرم کیا گیا۔ چنانچہ اگر دھاردار آلے سے قتل ہوا تو مجرم کو بھی دھاردار آلے سے قتل کیا جائے، اگر اس نے پتھر سے مارا ہے، تو پتھر مار کر سزائے موت دی جائے، لیکن حد واجب سے تجاوز نہ کیا جائے، قصاص کے طور پر آگ میں جلانے کی اجازت اس مشہور حکم سے مستثنیٰ ہے جس میں آگ میں جلانے سے ممانعت آئی ہے۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ اس حکم کا مطلب یہ ہے کہ ولی مقتول کو حق ہے کہ وہ اسی طرح کی سزائے قتل کا مطالبہ کرے جس طرح مجرم نے قتل کیا ہو، یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ قتل کا جرم گواہوں کی گواہی سے یا مجرم کے اعتراف سے ثابت ہو، اگر قتل کا ثبوت ’قسامت‘ کے ذریعہ ہو (یعنی مقتول کے ورثاء قسم کھائیں کہ اس کی موت قاتل کے فعل سے واقع ہوئی ہے) تو مجرم کو تلوار سے قتل کیا جائے گا، اسی طرح اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اسے شراب پلا کر ہلاک کیا گیا ہے تب بھی مجرم کو تلوار سے قتل کیا جائے، اگر مجرم اقرار کرے کہ اس نے اغلام کر کے مارا ہے تو اسے اس طرح سزائے قتل نہ دی جائے کہ ایک لکڑی مجرم کی مقعد میں ڈال کر ہلاک کر دیا جائے بلکہ اسے بھی اسی طرح تلوار سے قتل کیا جائے گا، اور اگر اس کی یہ بد فعلی (یعنی عمل غیر فطری) چار گواہی سے پایہ ثبوت کو پہنچ جائے تو اس کی سزا حد جرم (پتھر مار کر ہلاک کرنا ہے) خواہ وہ غیر شادی شدہ ہو، اسی طرح اگر کسی نے جادو سے ہلاک کیا اور اس کا یہ جرم گواہوں کی گواہی یا اس کے اقرار سے ثابت ہو جائے تو اسے تلوار سے قتل کیا جائے، یہ ضروری نہیں ہے کہ جادو سے ہلاک کرنے والے مجرم کو جادو سے ہلاک کیا جائے کیونکہ گناہ کے لیے حکم دینا بجائے خود ایک گناہ ہے۔

بعض اصحاب کہتے ہیں کہ اگر مجرم اپنے اس عمل کا (جو اس نے ہلاک کرنے کے لیے کیا ہے) اقرار کر لے تو اسے کہا جائے گا کہ وہی عمل وہ اپنے اوپر کرے اگر وہ اس طرح مر جائے تو خیر، ورنہ اسے تلوار سے قتل کر دیا جائے، اگر زہر دے کر ہلاک کیا تو مسلک غالب کی رو سے اسے تلوار سے قتل کیا جائے گا یہی صورت کھانا پینا بند کر کے مارنے یا حد سے زیادہ کھلا پلا کر مارنے کی ہے اور بقول راجح سوئی چھو چھو کر ہلاک کرنے کا بھی یہی حکم ہے کہ مجرم کو اسی طرح قتل نہیں کیا جائے گا، بلکہ تلوار ہی سے اسے قتل کیا جانا اقرار پائے گا۔

ان اصحاب کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر کسی نے ڈبو کر ہلاک کیا تو اسے بھی ڈبو کر ہلاک کیا جائے۔ اگر گلا گھونٹ کر مارا

ہے تو گلا گھونٹا جائے اگر پتھر مار کر ہلاک کیا ہے تو مجرم کو بھی پتھر مار کر ہلاک کیا جائے اور پتھر خطرناک حصہ جسم پر مارا جائے تا کہ جلد موت واقع ہو جائے اگر کسی نے لاٹھی سے مارا ہے تو اسے بھی لاٹھی مار کر ہی ہلاک کیا جائے۔

ان اصحاب کا قول یہ بھی ہے کہ قصاص کے حق دار کو تلوار ہی سے قتل کرنے کا اختیار ہے۔ اگرچہ مجرم نے تلوار کی بہ نسبت کم آزار آلہ سے مارا ہو۔ مطالبہ قصاص کے حق دار کو حق ہے کہ مجرم کے لیے اسی طرح سزائے قتل کا مطالبہ کرے۔ اگر وہ تلوار سے قتل کر دیئے جانے کا مطالبہ کرے تو اسے تسلیم کر لیا جائے، کیونکہ اس میں قاتل (مجرم) کے حق میں نرمی ہے۔

شافعیہ اور حنابلہ کی دو روایتوں میں سے ایک کے مطابق ان کا کہنا ہے کہ قاتل سے اسی طرح قصاص لیا جائے جس طرح اس نے دوسرے کو قتل کیا ہے اور سزائے قتل میں اسی طرح کا آلہ استعمال کیا جائے کہ جو مجرم نے ارتکاب قتل میں استعمال کیا۔ تاکہ حقیقی معنوں میں بدلہ ہو جائے کہ مجرم بھی اسی اذیت سے دوچار ہو جو مقتول کو ہوئی۔ اگر اسی عمل سے مجرم مر جائے تو خیر ورنہ تلوار سے اس کی گردن کاٹ دی جائے۔ دراصل قصاص (بدلہ) کی بنیاد لغت اور شرع کی رو سے (جرم سے) یکسانیت پر ہے (یعنی جیسا جرم ہے ویسی ہی سزا بھی ہونی چاہیے) اور وہ مسلک جو بتایا گیا اس میں یہی بات ہے۔ کیونکہ اس میں (جرم و سزا) دونوں کے درمیان کیفیت اور مقصد عمل میں یکسانیت ہے۔ چنانچہ اگر ایک شخص نے کسی کو پانی میں غرق کر کے ہلاک کیا تو اسے بھی غرق کر کے مارا جائے اور اگر پتھر مار کر ہلاک کیا تو مجرم کو بھی اسی طرح ہلاک کیا جائے۔ مگر اس میں اذیت زیادہ ہے۔ لہذا تلوار سے قتل کرنے میں زیادہ سہولت ہوگی۔

اگر کسی کا ہاتھ کاٹ دیا اور زخم کے سرایت کر جانے کے باعث وہ مر گیا تو اس مجرم کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا جائے اور اتنے عرصہ تک توقف کیا جتنا عرصہ مقتول (زخم کھا کر) زندہ رہا۔ اس عرصہ میں اگر وہ مر جائے تو فہر اور نہ تلوار سے اس کی گردن کاٹ دی جائے۔

اگر کسی کو ایسی شے کے استعمال سے ہلاک کیا جس کے استعمال کی شرعاً گنجائش نہیں ہے، مثلاً کسی کو جبراً اتنی شراب پلا دی کہ وہ اسے پی کر مر گیا۔ یا کسی کسن بچے سے بد فعلی کی اور وہ ہلاک ہو گیا یا کسی صغیر سن بچی کے ساتھ بدکاری کر کے اس کو ہلاک کر دیا تو ان تمام صورتوں میں تلوار سے قتل کر کے قصاص لیا جائے۔ کیونکہ یہ اعمال شرعاً ممنوع ہیں لہذا اس طرح کے اعمال سے قصاص لینا ممکن نہیں ہے۔ اس کے بارے میں ان اصحاب کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے ”و ان عاقبتہم فاعقبوا بمثل ما عوقبتہم بہ“ (النحل: ۱۲۶) یعنی اگر تمہیں سزائے قصاص دینی ہے تو ایسی ہی سزا دو جیسی تمہیں اذیت دی گئی ”فمن اعتدی علیہ فاتعدوا علیہ بمثل ما اعتدی علیکم“ (البقرہ ۱۹) (یعنی جس نے تمہارے ساتھ زیادتی کی اسی طرح کی زیادتی تم اس کے ساتھ کرو جس طرح کی زیادتی اس نے تمہارے ساتھ کی) قرطبی کہتے ہیں کہ علماء کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ یہ آیت بنیادی طور پر قصاص میں یکسانیت کے بارے میں ہے۔ پس جس آلہ سے قتل سرزد ہوا ہو اسی جیسے آلے سے قتل کر کے بدلہ لینا چاہیے، جمہور علماء کا قول ہے۔ لیکن یہ حکم اسی صورت میں ہے جبکہ (قاتل نے) ارتکاب قتل میں فعل گناہ کو ذریعہ نہ بنایا ہو مثلاً بد فعلی کرنا شراب پلا دینا اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک روایت ہے ”ان جاریۃ وجدہا سہا قد رض بین حبیرین“

فسالوہا: من صنع بك هذا؟ فلان؟ فلان. حتی ذکروا یہودیاً، فإومات براسہا، فاخذ الیہودی، فاقر، فامر رسول اللہ ﷺ ان ترض راسہ بین حجرین. متفق علیہ و اللفظ المسلم (یعنی ایک لوٹری کا سردو پتھروں کے درمیان رکھ کر کچلا گیا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا کہ تیرے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا؟ کسی کا نام لیا گیا۔ یہاں تک کہ ایک یہودی کا نام آیا تب اس لڑکی نے اپنے سر سے اشارہ کیا۔ چنانچہ اس یہودی کو گرفتار کیا گیا۔ اس نے اقرار جرم کیا آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ اس یہودی کا سردو پتھروں کے درمیان کچلا جائے۔ یہ حدیث اس امر کا ثبوت ہے کہ قصاص کے لیے بھاری شے مثلاً آہنی شے کو استعمال کیا جائے گا اور یہ کہ عورت کا قتل کرنے کے عوض مرد کو قتل کیا جائے۔ نیز یہ کہ قاتل کو اسی جیسی شے سے قتل کیا جائے جس سے اس نے ارتکاب قتل کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”جزاء سیئۃ سیئۃ مثلہا“ (یعنی برائی کی سزا اسی جیسی برائی ہے)۔ بیہقی نے حضرت براء رضی اللہ عنہ سے اخراج فرمایا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ ”من غرض غرضنا بہ، ومن حرق حرقناہ، ومن غرق غرقناہ“ (یعنی جو ہمیں نشانہ بنائے ہم اسے نشانہ بنائیں گے، ہمیں جلائے تو ہم بھی اسے جلانیں گے اور جو ہمیں ڈبوئیں اسے ڈبوئیں گے)۔ اس حدیث میں لفظ غرض کے معنی ”تیرا نشانہ بنانے کے ہیں“ پھر یہ بھی ہے کہ قصاص کا مقصد اطمینان دلانا ہے اور اس کی تکمیل اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب کہ (مجرم کو بھی) اسی طرح قتل کیا جائے جس طرح اس نے کیا اور حدیث میں (بالعموم) ہاتھ ناک کاٹنے کی جو ممانعت آئی ہے وہ ممانعت کسی اور وجہ سے واجب القتل ہونے کی صورت میں ہے مکافات (جیسے کو تیسرا) کے تحت قتل کی صورت میں نہیں ہے۔

قصاص کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ جرم سے مماثلت کا لحاظ رکھا جائے اور سزا کی کیفیت اور مقدار کا بھی خیال رہے (یعنی جرم سے زیادہ سزا نہ ہو) لہذا بھوکا رکھ کر مارنے کی پاداش میں اتنے ہی عرصہ تک مجرم کو قید میں بھوکا رکھا جائے جتنے عرصہ اس نے رکھا اور پانی یا آگ میں اسی طرح اور اتنے ہی عرصہ تک رکھا جائے جتنے عرصہ مجرم نے رکھا اور پانی میں ڈبونے کے لیے مجرم کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے جائیں جب کہ وہ تیرنا جانتا ہو اسی طرح اس کا گلا بھی ویسا ہی گھونٹا جائے جیسا اس نے گھونٹا تھا اور بلندی سے اسی طرح گرایا جائے جیسے اس نے گرایا اور دیکھ لیا جائے کہ گرنے کی جگہ ویسی ہی سخت ہے اور بھاری شے مارتے وقت اس شے کا حجم اتنا ہی ہو اور اتنی ہی بار مارا جائے جیسا کہ مجرم نے کیا۔ اگر پتھر۔ آگ یا تعداد ضربات کا تعین دشوار ہو تو اپنے یقین سے کام لیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایسی صورت میں قصاص مثلی سے ہٹ کر تلوار سے قتل کر دیا جائے۔ یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ یہ ارادہ ہو کہ اگر مجرم کو موت نہ آئی تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔

اگر مطالبہ قصاص کا حقدار یہ کہے کہ اگر مجرم قصاص مثلی سے نہ مرے تو میں اسے معاف کرتا ہوں تو اس کا اختیار اسے نہیں دیا جائے گا کیونکہ یہ (قصاص نہ ہوگا بلکہ) محض ایذا ہی ہے۔

جادو کر کے مارنے والے کو تلوار سے قتل کیا جائے کیونکہ ہر قسم کا جادو حرام ہے اور اس کی کوئی صورت روا نہیں ہے جو (جرم سے) مشابہت رکھتی ہو اور نہ اس کا کوئی خاص طریق کار ہے اور حدیث میں آیا ہے ”حد الساحر ضربہ بالسيف“ (یعنی جادو کرنے والے کی شرعی سزا تلوار سے قتل کرنا ہے)۔

اگر کھانے میں زہر دے کر یا کسی آلہ زہر آلود سے قتل کیا تو اسی جیسی شے سے اس کا قصاص لیا جائے لیکن وہ زہر زخم کو پکانے والا اور اذیت دہ نہ ہو۔

اگر کسی نے سانپ سے ڈسوا کر کسی کو مارا اور وہ سانپ موجود ہو تو کسی اور سانپ سے مجرم کو نہ ڈسوا یا جائے البتہ اگر وہ سانپ نہ ہو تو کسی اور سانپ کو اس پر ڈالا جائے کہ وہ اسے ڈس لے۔ اسی طرح اگر کسی کو شیر کی بھٹ (یا باڑے) میں ڈال دیا گیا اور اس نے اسے پھاڑ کھایا تو اس مجرم کو بھی شیر کے سامنے ڈالا جائے جیسا کہ اس نے کیا تھا۔

اگر زنا کے گواہوں کی شہادت پر کسی کو سزائے سنگساری دی گئی اور بعد میں وہ گواہ اپنے بیان سے پھر گئے تو انہیں بھی سنگسار کیا جائے اسی طرح اگر درہ زنی کی سزا کے بعد گواہ پھر جائیں تو انہیں بھی قصاص میں درہ لگائے جائیں۔

اگر کسی کو قصاص میں اتنے عرصہ تک بھوکا رکھا گیا جتنے عرصہ مجرم نے بھوکا رکھ کر مارا تھا اور اس عرصہ میں اسے موت نہ آئی تو قید کی مدت اتنی بڑھا دی جائے کہ وہ بھوک سے مر جائے، تاکہ جرم قتل کی یہ سزا اسی طرح کی ہو جائے جس طرح مجرم نے مارا تھا، اس میں جوازیت اور تکلیف زیادہ ہوئی اس کی پروانہ کی جائے، یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی مجرم کی گردن ایک وار میں نہ کٹے اور جب تک دوسرا وار نہ کیا جائے گردن جدا نہ ہو، کیونکہ قصاص کو جرم کے ساتھ مماثلت تو ہو گئی صرف جان کا نکلنا باقی تھا تو اس کا نکالنا سہل ترین طریقہ سے واجب ہے۔

مطالبہ قصاص کے حقدار اولیائے مقتول کو یہ حق ہے کہ وہ قصاص مثلی سے ہٹ کر مجرم کو تلوار سے قتل کیے جانے کا مطالبہ کریں گو مجرم اس پر راضی نہ ہو، کیونکہ (قصاص مثلی کی بہ نسبت) اس میں زیادہ رحم اور سہولت ہے۔ بلکہ اختلاف سے بچنے کے لیے تو یہی بہتر ہے (کہ تلوار سے قتل کر کے قصاص لیا جائے) البتہ اگر ولی قصاص کے اس طریقہ سے ہٹ کر جانوروں کی طرح ذبح کیے جانے کا مطالبہ کریں تو وہ روانہ ہوگا، کیونکہ یہ امر احترام (انسانیت) کے منافی ہے۔ اگر قاتل نے تلوار سے قتل کیا اور مقتول کا ولی یہ چاہے کہ مجرم کو تلوار کے علاوہ کسی اور طرح سے مارا جائے تو اس کی اجازت نہ ہوگی۔

اگر کسی کا ہاتھ کاٹ دیا گیا اور اس کا زخم وجود میں سرایت کر گیا اور اسے موت آگئی تو مقتول کے ولی کو حق ہے کہ وہ مجرم کی گردن زنی کا مطالبہ کرے، کیونکہ مجرم کے لیے یہ آسان ہے کہ پہلے ہاتھ پھر گردن کاٹی جائے۔ ولی کو حق ہے کہ وہ (بنا بر مماثلت) پہلے ہاتھ کاٹے اور پھر اسی وقت گردن کاٹنے کا مطالبہ کرے۔ اگر مجرم درخواست کرے کہ مجھے بھی اتنے عرصہ تک جینے دیا جائے جتنے عرصہ تک اس کے ارتکاب قطع کے بعد مقتول زندہ رہا تو اس کی یہ درخواست نہیں مانی جائے گی، کیونکہ حکم قصاص فوری طور پر عائد ہو چکا ہے، ہاں اگر ولی چاہے تو یہ ہو سکتا ہے یعنی ہاتھ کاٹنے کے بعد زخم کے سرایت کرنے تک توقف کیا جائے تاہم مجرم کو یہ حق نہیں ہے کہ مقتول کے ولی سے (فوری طور) قتل کرنے یا معاف کر دینے کی درخواست کرے، یہ اختیار صرف مطالبہ قصاص کے حق دار کو ہے، کیونکہ یہ اسی کا معاملہ ہے۔

اگر کھال میں چہرہ لگ جانے یا کسی عضو کے ٹوٹ جانے سے یا اسی طرح کے کسی اور عمل سے جس کا قصاص نہیں ہے کسی کی موت واقع ہو جائے، تو ولی مقتول کو صرف تلوار سے مجرم کے قتل کیے جانے کے مطالبہ کا حق ہے (کسی اور طرح سے قصاص کا مطالبہ نہیں کر سکتا، کیونکہ ایسی صورتوں میں مماثلت کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر وہ تکلیف

دور ہو جائے تو اس تکلیف کا قصاص نہیں ہے۔ لہذا موت واقع ہو جانے کی صورت میں صرف تلوار سے قتل کر دینا واجب ہے۔

اگر مقتول کا ولی یہ مطالبہ کرے کہ مجرم کی کھال میں اسی طرح چیرہ دیا جائے اگر اس سے وہ نہ مرے تو قتل کر دیا جائے تو یہ مطالبہ اس کا حق ہے، لیکن اگر وہ یہ کہے کہ اس طرح چیرہ دینے سے نہ مرا تو میں اس کا خون معاف کر دوں گا تو اس کو رواق قرار نہیں دیا جائے گا۔

اگر کسی شخص کا عضو اتنا کاٹ دیا جس کی دیت (تاوان) نصف ہوتی ہے اور اس شخص نے اپنے زخم کا قصاص لے لیا، بعد میں وہ شخص عضو بریدہ سرایت زخم سے مر گیا تو اس عضو بریدہ کے ولی کو کاٹنے والے کے خون کے مطالبہ کا حق ہے اور نصف تاوان معاف کرنا ہوگا، اور حق تاوان جو اس نے وصول کر لیا وہ دوسرے نصف کے عوض رہا۔

اگر مجرم (ارتکاب جرم کے بعد) اپنی موت مر جائے یا ولی مقتول کے علاوہ کوئی اور شخص اسے قتل کر دے تو اس کے ترکہ میں سے نصف خون بہا واجب الادا ہوگا۔

اگر کسی کے دونوں ہاتھ کاٹ دیئے اور اس دست بریدہ شخص نے کاٹنے والے سے قصاص لے لیا (یعنی اس کے ہاتھ بھی کاٹ دیئے گئے) اس کے بعد وہ دست بریدہ شخص ہاتھوں کا زخم سرایت کرنے کے باعث مر گیا تو اس کے ولی کو اپنے مورث کی جان کے عوض اس کی گردن کاٹنے کا حق ہے، لیکن اگر اس نے جان کا قصاص معاف کر دیا تو اب اسے کوئی حق نہ رہے گا کیونکہ اس نے پوری دیت وصول کر لی ہے۔

اگر کوئی مجرم قصاص میں کاٹے گئے عضو کے زخم سے مر گیا تو اس کی جان راگیاں متصور ہوگی جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”وَلَمَنْ اتَّصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولَئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِنْ سَبِيلٍ“ (یعنی مظلوم اگر ظلم سہنے کے بعد ظالم پر زبردستی کر لے تو اس سے کوئی باز پرس نہ ہوگی) اور بیہقی نے حضرت علی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے ”مَنْ مَاتَ فِي حَدٍّ أَوْ قِصَاصٍ فَلَا دِيَّةَ لَهُ وَالْحَقُّ قَتْلُهُ“ (یعنی جو شخص سزائے شرعی یا قصاص میں مر جائے اس کا کوئی تاوان نہیں اس کا قتل برحق ہے) کیونکہ وہ مستوجب قطع تھا، لہذا اس کا جواثر جسم میں سرایت کر گیا اس پر کوئی تاوان عائد نہیں ہوتا، یہ ایسا ہی ہے جیسے چور کا ہاتھ حد کے طور پر (یعنی بطور سزائے شرعی) کاٹ دیا جائے۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ حاکم وقت یا اس کا کوئی نائب قصاص کے حقداروں میں سے کسی کو اجازت دے سکتا ہے کہ وہ خود قصاص (خون کا بدلہ) لے بشرطیکہ ولی اس کا مطالبہ کرے تاکہ اسے پورے طور پر تشفی ہو جائے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ ہر ایک حالت میں ولی کا خود قصاص لینا جائز نہیں ہے البتہ صرف گردن مار سکتا ہے، خواہ قاتل نے تلوار سے قتل کیا ہو یا کسی اور شے سے، اس مسلک کے بارے میں ان کی دلیل وہ روایت ہے جو بزار اور ابن عدی نے حدیث بکرہ رضی اللہ عنہ سے اخراج فرمائی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ ”لَا قُودَ إِلَّا بِالسِّيفِ“ (یعنی تلوار کے سوا اور کوئی طریقہ قصاص نہیں ہے)۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ صاحب شریعت نے مثلہ کرنے (ناک کان کاٹنے) سے منع فرمایا ہے، نیز آنحضرت ﷺ کے ارشاد میں کہ ”إِذَا قُتِلَ فَاَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ“ (یعنی قتل کرنا ہو تو سلیقہ سے قتل کرو) واضح طور پر

کسی اور طرح سے قتل کرنا منع فرمایا گیا ہے اس حکم میں تلوار کے علاوہ دوسرے آلات مثلاً توپ، بندوق داخل ہیں پھر یہ ہے کہ اماموں نے جو مسلک اختیار فرمایا ہے اس میں حق سزا کے استعمال میں زیادتی ہے جس سے جرم و سزا کی مماثلت کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ پس اس سے احتراز واجب ہے، جیسا کہ ہڈی توڑنے اور پیٹ پھاڑنے میں ہوتا ہے پھر یہ بھی ہے کہ ڈبونے، گلا گھونٹنے اور جلانے کے جو ذرائع ہیں وہ ذرائع قتل نہیں ہیں اور نہ قتل کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں کیونکہ ان کا استعمال دشوار ہے لہذا اس میں قتل عمد نہ ہونے کے شے کی گنجائش ہے اور اس لیے بھی کہ قصاص کی بنیاد مماثلت پر ہے اسی مفہوم کے پیش نظریوں کہا جاتا ہے کہ ”اقتص اشہ“ (یعنی فلاں نے فلاں کی پیروی کی)، (قتل کی) دونوں صورتوں میں کوئی مماثلت نہیں ہے، کیونکہ دوسری صورت میں خرابی نمایاں نہیں۔ اسی طرح (قصاص میں) جو تنبیہ کی مصلحت ہے وہ دونوں صورتوں میں یکساں نہیں ہے کیونکہ زیادہ تر تلوار ہی سے قتل کیا جاتا ہے، بھاری آلہ سے شاذ و نادر ہی قتل ہوتا ہے۔

شافعیہ نے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد جو پیش کیا ہے کہ ”من غرق غرقناه، ومن حرق حرقناه، ومن قتل عمداً قتلناه“ (یعنی جو غرق کرے گا ہم اسے غرق کر لیں گے اور جو جلائے گا ہم اسے جلا لیں گے اور جو کسی بندے کو قتل کرے گا ہم اسے قتل کریں گے) یہ حدیث مرفوع نہیں ہے (یعنی اس کی سند حضور تک نہیں پہنچتی اور شافعیہ کے مسلک سے یہ لازم آتا ہے کہ جلانے کی سزا جلانا ہے، حالانکہ یہ شرعاً ممنوع ہے چنانچہ نبی ﷺ سے روایت ہے کہ حضور نے فرمایا ”لا تعذبوا احداً بعدا ب اللہ“ (کسی کو عذاب الہی جیسی سزا مت دو) یا پھر حدیث کا یہ مطلب لیا جائے کہ اس کو سزا قرار دیا جائے (قصاص نہیں ہے) چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس محل کو اپنی ذات کی طرف منسوب فرمایا ہے کہ ’غرقناه‘ (یعنی ہم اسے ڈبو دیں گے) حضور نے ’حرقوہ یا غرقوہ‘ (یعنی تم اسے جلا دو یا غرق کر دو) نہیں فرمایا، خفیوں نے اس حدیث سے ثابت کیا ہے کہ قصاص واجب ہے، لیکن پورا پورا بدلہ لینے میں اس پر عمل نہیں کیا، کیونکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”لا قود الا بالسيف“ (یعنی تلوار کے سوا اور کسی طرح قصاص نہیں ہے) محدثین کے نزدیک یہ حدیث دوسری حدیث سے زیادہ قابل اعتماد ہے اور یہ حدیث بعد کی ہے لہذا اس کا حکم منسوخ ہو گیا۔

ارتکاب قتل کے بعد حرمین میں پناہ لینے کا بیان

شافعیہ کہتے ہیں کہ جان کا قصاص لینے کا حقدار فوری طور پر قصاص لے سکتا ہے ان کے مسلک کی رو سے اعضائے جسم کے قصاص کا بھی یہی حکم ہے، قصاص اتلاف کو واجب کرتا ہے، لہذا اس میں تعیل کرنی چاہیے جیسے قابل تلف اشیاء کے ٹھکانے لگانے میں، اس کی تاخیر میں احتمال عفو کے لیے ہوتی ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ حرم میں (یعنی جہاں اتلاف جان حرام ہے) قصاص لیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ حرم (کا علاقہ) سزائے قصاص کو مانع نہیں ہے۔ جیسے سانپ بچھو کا حرم میں مارا جانا، مجرم کا وہاں پناہ لینا یا نہ لینا یکساں ہے۔

چنانچہ عبد اللہ بن حنظل تمیمی جو مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہو گیا تھا اور آنحضرت ﷺ کی بھو میں اشعار کہتا اور اپنی دو گانے والی لونڈیوں کو یاد کرا دیا تھا جو گاتی پھرتی تھیں، جس سال مکہ فتح ہوا اور آنحضرت ﷺ اس میں داخل ہوئے تو وہ

خائف ہوا اور خانہ کعبہ کی خدمت کے لیے اس کے غلاف سے لگا رہتا، جب کہ آنحضرت ﷺ اس کا طواف کر رہے ہوتے اس (کے مرتد ہونے) کی بابت حضور کو مطلع کیا گیا تو آپ نے فرمایا ”اقتلوہ فان الکعبۃ لا تعید عاصیاً، ولا تمنع من اقام حد واجب، فقتل“ (یعنی اسے قتل کر دو کعبہ کسی گنہگار کو پناہ نہیں دے سکتا اور مستوجب سزا کو سزائے شرعی کے دیئے جانے سے مانع نہیں ہے، پس اسے قتل کر دیا گیا)۔ یہی حال حویرث ابن نقید کا ہوا کہ وہ بھی آنحضرت ﷺ کی خدمت کر کے انہیں ایذا دیا کرتا تھا امام علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے مکہ مکرمہ میں قتل کر دیا تھا، اسی طرح مقیدس صباہہ کنڈی مرتد ہو گیا اور جب مکہ میں واپس آیا تو نبی ﷺ نے اسے قتل کرنے کا حکم دیا اور اس کا خون بہا معاف کر دیا، چنانچہ اس کے چچا نمیلہ بن عبد اللہ اللیشی کے بیٹے نے اسے جبکہ وہ غلاف کعبہ سے لگا ہوا تھا قتل کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسے کسی اور جگہ قتل کیا گیا تھا۔ پھر یہ بھی ہے کہ قصاص پر فوراً عملدرآمد ہونا چاہیے، اس میں تاخیر نہ ہو۔ غرض مجرم اگر کعبہ میں پناہ لے یا حرم میں یا کسی اور مسجد میں، یا کسی دوسرے شخص کی مملوکہ جگہ میں تو وہاں سے پہلے اس شخص کو باہر آنے دیا جائے، پھر قتل کیا جائے تاکہ مسجد کی بے حرمتی نہ ہو اور دوسرے کی زمین کو اس کی اجازت کے بغیر استعمال کرنا منع ہے۔ اس میں جو تاخیر ہوگی وہ اتنی بری نہیں، وہاں پر قتل کرنے میں مسجد حرام یا کسی اور مسجد کے ناپاک ہو جانے کا بھی اندیشہ ہے لہذا وہاں سے باہر لانا چاہیے، اگر مجرم مسلمانوں کے مقبرہ میں پناہ لے اس کا بھی یہی حکم ہے، کیونکہ خون گرائے بغیر وہاں پر قتل کرنا ممکن نہیں ہے۔ اگر مجرم حرم سے باہر نہ آئے اور وہیں پر قیام کر لے تو جائز ہے کہ وہیں پر قصاص لیا جائے اور قتل کر دیا جائے، کیونکہ انسانی خون کا احترام اس مقام کے احترام پر مقدم ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے علاقہ حرم کے باہر ارتکاب قتل کیا اور اس کے بعد حرم میں داخل ہو گیا تو اس کے جرم کی سزا میں تاخیر نہ کی جائے، بلکہ واجب یہ ہے کہ اسے وہاں سے نکالا جائے اور حرم سے باہر لا کر حد نافذ کی جائے۔ اگر مجرم حالت احرام میں ہو (یعنی حج کی ادائیگی کے دوران) تکمیل حج کا انتظار نہ کیا جائے، تاہم حرم کے اندر قصاص پر عملدرآمد جائز نہیں ہے تاکہ وہ جگہ خون سے ناپاک نہ ہو، خواہ جرم مستوجب قصاص کا ارتکاب حرم کے اندر کیا ہو یا باہر کیا ہو اور قصاص سے بچنے کے لیے وہاں پناہ لی ہو اور اللہ کے اس ارشاد میں کہ ”من دخلہ کان آمناً“ (یعنی جو حرم میں آ گیا وہ بچ گیا) اس دستور کا ذکر ہے جو عہد جاہلیت (زمانہ قبل از اسلام) میں تھا جیسا کہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص قتل کرتا پھر اپنی گردن پر کملی لپیٹ کر حرم میں داخل ہو جاتا اور وہاں مقتول کا بیٹا بھی دیکھتا تو مشتعل نہ ہوتا جب تک کہ مجرم وہاں سے باہر نہ آ جائے۔

ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ ابو سعید انصاری نے ان سے یہ حدیث بیان کی انہیں ابو یحییٰ تمیمی نے عطاء سے اور انہوں نے سعید بن جبیر سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”من دخلہ کان آمناً“ کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ ”من عاذ بالبيت اعاده البيت، ولكن لا يؤوی، ولا يطعم، ولا يسقي، فاذا خرج اخذ بذنبه“ (یعنی جس نے اللہ کے گھر میں پناہ لی اسے اللہ کا گھر پناہ دے گا لیکن وہ اسے اپنا ٹھکانہ بنا سکے گا، اسے کھانا، پانی نہیں دیا جائے گا، جب وہ باہر آ جائے تو جرم کی پاداش میں اسے گرفتار کیا جائے)۔

صحیحین (بخاری و مسلم) میں بالفاظ مسلم ابو شریح عدوی سے روایت ہے کہ انہوں نے عمرو بن سعید سے جو مکہ کو دھونڈ بھیجا کرتے تھے کہا کہ اے حاکم وقت اگر اجازت ہو تو میں رسول اللہ ﷺ کا وہ ارشاد بیان کروں جو فتح مکہ کے اگلے روز انہوں نے فرمایا تھا۔ اس ارشاد کو میرے کانوں نے سنا، میں نے اپنے دل میں رکھا اور جب حضورؐ یہ ارشاد فرما رہے تھے تو میری آنکھیں انہیں دیکھ رہی تھیں، حضورؐ نے پہلے اللہ کی حمد و ثناء کی پھر فرمایا ”مکہ حرمہا اللہ، ولم یحرمہا الناس، فلا یحل لامری یؤمن باللہ والیوم الآخر ان یسفک بہادماً، او یعضد بہا شجراً، فان احد ترخص بقتال رسول اللہ ﷺ فیہا، فقولوا لہ ان اللہ اذن لنبیہ، ولم یاذن لکم، وانما اذن لی فیہا ساعة من نهار، وقد عادت حرمتها الیوم، کحرمتها بالامس، فلیبلغ الشاہد الغائب“ (یعنی اللہ تعالیٰ نے مکہ کو حرمت عطا فرمائی ہے لیکن لوگوں نے اس کا احترام نہ کیا، پس کسی شخص کو بھی جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لایا ہے یہ حلال نہیں ہے کہ یہاں پر خونریزی کرے یا کسی درخت پر درانتی چلائے، اگر کوئی شخص اس بناء پر کہ خود رسول اللہ ﷺ نے وہاں قتال فرمایا اس جگہ قتال کی اجازت دے تو اسے کہہ دو کہ یہ اجازت صرف اس کے رسول کو ہوئی تھی تمہیں اس کی اجازت نہیں ہے) دراصل اس کی اجازت مجھے دن میں گھڑی بھر کے لیے ملی تھی اور کل کی طرح آج پھر اس کی حرمت عائد ہو گئی ہے، پس جو لوگ موجود ہیں وہ انہیں بتادیں جو یہاں نہیں ہیں)۔ اس پر ابو شریح سے دریافت کیا گیا کہ یہ سکر عمرو نے کیا کہا؟ انہوں نے بتایا کہ عمرو نے کہا کہ اے ابو شریح اس کی بابت مجھے تم سے زیادہ علم ہے، حقیقت یہ ہے کہ حرم کسی مجرم کو پناہ نہیں دیتا اور نہ اس واجب القتل کو پناہ دیتا ہے جو جان بچانے یا جزیہ سے گریز کرنے کے لیے یہاں آجائے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ (روایت کا) یہ جملہ باعتبار مفہوم انشائیہ (یعنی شرطیہ) ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ جگہ قتل اور ظلم سے امان دیتی ہے۔ بجز اس صورت کے جبکہ کوئی شخص شرعی طور پر مستوجب سزا ہو، اس گناہ کی بابت اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے ”ومن یرد فیہ بالحد بظلم ندقہ من عذاب الیم“ (الحج: ۲۵) (یعنی اگر کوئی شخص ظلم سے دین کے خلاف عمل کرے گا تو ہم اسے دردناک عذاب دیں گے)۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے کسی انسان کو عداوت حرم سے باہر قتل کیا پھر قصاص سے گریز کرنے کے لیے حرم میں آکر پناہ لی اور وہیں پرٹھکانا بنا لیا یا کوئی شخص مرتد ہو جانے یا شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کا مرتکب ہونے یا مسلمانوں کی جماعت کے خلاف اٹھ کھڑا ہونے کے باعث واجب القتل ہو گیا اور پھر اس نے مکہ مکرمہ میں پناہ لی تو جب تک وہ حرم میں رہے اس کا قتل واجب نہیں ہے، کیونکہ حرم کے اندر قتل کرنا حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”من دخلہ کان آمناً“ (یعنی جو شخص ڈر کے مارے حرم مکہ میں آ گیا ہر بدسلوکی سے بچ گیا) پس جو شخص بھی بیت اللہ میں پناہ لے، اللہ کا گھر اسے پناہ دے گا اور صحیحین (بخاری و مسلم) میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے روز ”ان هذا البلد حرم اللہ یوم خلق السموات والارض، فهو حرام بحرمة اللہ الی یوم القیامة، والہ لم یحل القتال فیہ لا حد قبلی، ولم یحل لی الا فی ساعة من نهار، فهو حرام بحرمة اللہ الی یوم القیامة، ولا یعض شوکہ، ولا ینفر صیدہ، ولا یلتقط لقطتہ، الا من عرفھا ولا یختلی بخلاھا، فقال العباس: یا رسول اللہ الا ذخر،

فانہ لقینہم ولیوتہم، فقال الا الا ذخر، (یعنی اس شہر کو اللہ تعالیٰ نے اسی وقت سے جبکہ اس نے آسمان وزمین کو پیدا کیا ممنوعہ علاقہ قرار دیا ہے، اور اسے اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے محفوظ بنا دیا ہے نیز اس سے پہلے بھی یہاں خونریزی حلال نہ تھی اور میرے لیے بھی دن کے وقت گھڑی بھر کے سوا حلال نہیں ہوئی، غرض چونکہ اللہ تعالیٰ نے روز قیامت تک کے لیے اسے حرام فرمایا لہذا کوئی شخص اس کے کانٹوں کی جھاڑیوں پر بھی درانتی نہ چلائے اور نہ اس کے شکار کو برا بیختہ کرے، نہ کوئی یہاں کسی کی گری پڑی چیز کو اٹھائے، سوا اس کے کہ وہ اس شہر کی رحمتہ اللہ علیہ کو پہچانتا ہو اور وہاں کی گھاس بھی نہ کاٹی جائے اس پر حضرت عباس نے عرض کیا سوا اذخر گھاس کے؟ یا رسول اللہ یہ تو برتن مانجھنے اور گھر صاف کرنے کے کام آتی ہے فرمایا ”الا الا ذخر“ یعنی ہاں اذخر کے سوا۔ مطلب یہ ہے کہ اذخر کے سوا کسی اور گھاس کو نہ کاٹا جائے۔

واضح ہو کہ قرآن حکیم کی متعدد آیتیں ایسی ہیں جنہیں حرم کے اندر آ جانے والے کو پناہ مل جانے کا ذکر ہے۔ منجملہ ان آیات کے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”واذ جعلنا البيت مثابة للناس وامنا“ (یعنی ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے اکٹھے ہونے کی اور امن کی جگہ بنایا ہے) اور فرمایا ”اذ قال ابراهيم رب اجعل هذا بلداً آمناً“ (البقرة ۱۲۵-۱۲۶) (یعنی جب ابراہیم نے التجا کی کہ اے پروردگار اس شہر کو امن کی جگہ بنا دے) اور فرمایا ”الذی اطعمهم من جوع وامنهم من خوف“ (القریش: ۴) (یعنی رب وہ ہے جس نے بھوک میں خوراک دی اور خوف سے نجات دی) بقول ظاہر اس آیت شریفہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جو شخص بھی اس میں آیا وہ مامون ہو گیا، لیکن اس آیت کا یہ مفہوم لینا ممکن نہیں ہے، کیونکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ حرم میں آ جانے والا ہر حال میں مامون نہیں رہتا۔ پس اس آیت سے حکم کا مفہوم لینا واجب ہے کہ جو حرم میں آ گیا وہ صاحب ایمان ہو اور چھوٹے موٹے گناہوں (کے ضرر) سے بچ رہا، کیونکہ ان گناہوں کا ضرر قتل نفس کی بہ نسبت بہت ہلکا ہوتا ہے، البتہ اگر مجرم حرم کے اندر ایسے گناہ کا ارتکاب کرے جو مستوجب قصاص ہو تو ایسی صورت میں حرم کے اندر اس کا قتل روا ہے کیونکہ اس نے حرم کی بے حرمتی کی ہے لہذا اس کے خون کا احترام بھی نہ کیا جائے گا۔ لیکن اگر اس نے حرم سے باہر ارتکاب جرم کیا ہے پھر اس نے حرم کی پناہ لے لی ہے تو اس سے حرم میں بدلہ نہیں لیا جائے گا۔ ہاں اسے تنگ کیا جائے کہ کھانے، پینے، بات چیت کرنے اور لین دین سے باز رکھا جائے گا یہاں تک کہ وہ خود ہی حرم سے باہر جائے اور تب حکم قصاص کی تکمیل کی جائے اور اسے قتل کر دیا جائے گا یا وہ خود ہی حرم کے اندر بھوک سے اور دوسری پابندیوں سے ہلاک ہو جائے گا (وہاں پر نہ قتل کرنے کا) یہ حکم بیت الحرام کے احترام کی بناء پر ہے۔

حنا بلہ کہتے ہیں کہ حرم میں پناہ لینے والے سے قطعاً پورا قصاص نہیں لیا جائے گا خواہ اس نے ارتکاب جرم حرم سے باہر کر کے وہاں پناہ لی ہو اور اس کی پناہ میں آ گیا ہو یا حرم کے اندر ہی ارتکاب جرم کیا ہو اور اس کی پناہ میں آئے، نیز وہ جرم خواہ جان (لینے) کا ہو یا عضو (کاٹنے) کا ایسے شخص کو حرم سے باہر آنے یا وہیں پر مر جانے کے لیے تنگ بھی نہ کیا جائے، ہاں اگر وہ حرم سے باہر آ جائے تو پاداش جرم میں اسے قتل کیا جائے گا، اور قصاص واجب پر عملدرآمد کیا جائے گا۔ بصورت دیگر وہ جس حال میں ہے اسی طرح اسے حرم میں رہنے دیا جائے، یہ حکم ان آیات کے پیش نظر ہے جو حرم میں داخل ہونے والے کو پناہ میں آ جانے کے بارے میں ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ حرم کی فضیلت اور اس کے تقدس کی تائید میں فرماتا ہے ”من

دخلہ کان آمنا“ (یعنی جو بھی اس کے اندر آجائے وہ امن میں ہے)۔ قرآن وحدیث میں علاقہ حرم کے احترام کی سخت تاکید آئی ہے کیونکہ یہ خالص اللہ تعالیٰ کی بارگاہ ہے، پس اس مقام کو ایسا ہی سمجھا جائے گا جیسے کسی حاکم پر خدائے عزوجل اور حرم بیت اللہ کی ہیبت طاری ہو جائے، ایسی حالت میں نفاذ حدود (شرعی سزاؤں پر عملدرآمد) رہ جاتا ہے پس مجرم سے قصاص لینا اس وقت تک ملتوی رکھا جائے کہ مجرم حرم سے باہر آجائے۔

ایسا قتل عمد جس میں قصاص عائد نہیں ہوتا

حنفیہ کہتے ہیں کہ ایک مسلمان اگر متامن (پناہ گیر مخالف اسلام) کو قتل کر دے تو اس پر قصاص عائد نہ ہوگا، کیونکہ متامن کا خون ہمیشہ کے لیے ممنوع نہیں ہے۔ اس کا کفر اسے مسلمانوں سے جنگ پر آمادہ کر سکتا ہے اور یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ملک (دارالحرب) میں واپس جانے کا تہیہ کیے ہوتا ہے اور اس کی حیثیت ایک حربی (برسر جنگ کی سی ہوتی ہے)۔ اگر کوئی شخص اپنے بیٹے کو قتل کر دے تو اس کے باپ کو سزائے قتل نہ ہوگی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے ”لا یفسد ا لوالد بولدہ“ (یعنی باپ سے بیٹے کا قصاص نہیں لیا جائے گا)۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ باپ بیٹے کی زندگی کا ذریعہ ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس کی موت کا سبب قرار دیا جائے، ماں بھی اسی حکم میں شامل ہے اور اس میں حقیقی دادا دادی اور نانائانی بھی آتے ہیں خواہ (سلسلہ نسب میں) دور کے ہوں۔

غلام کے قتل کا قصاص بھی آقا سے نہیں لیا جائے گا، خواہ غلام مدبر ہو (یعنی ایسا غلام ہو جسے آقا نے کہد یا ہو کہ اس کی موت کے بعد وہ آزاد ہو جائے گا) یا وہ غلام مکاتب ہو (یعنی وہ غلام جسے خاص رقم کی ادائیگی کی شرط پر آزادی کا پروانہ دیا گیا ہو) نیز بیٹے کے غلام کو قتل کرنے پر بھی قصاص عائد نہ ہوگا کیونکہ اپنے نفس کا قصاص خود اپنے اوپر عائد نہیں ہو سکتا، غلام کا بیٹا اپنے باپ کے قتل کرنے پر مستوجب قصاص نہ ہوگا۔

کوئی شخص اپنے ایسے غلام کو قتل کر دے جس کے نصف کا وہ مالک ہے تب بھی قصاص عائد نہ ہوگا، یہ نصف ملکیت خواہ ہبہ کرنے سے ملی ہو، یا ورثہ میں یا خریدنے سے ملی ہو، کیونکہ قصاص کے اجزاء نہیں ہوتے۔

اگر کسی شخص کے باپ نے ارتکاب قتل کیا اور قصاص قتل کا حق اس کے بیٹے کو ورثہ میں ملا، مثلاً ایک شخص اپنے بالغ بیٹے کی ماں کو قتل کر دے اور ماں کے قتل پر قصاص کا حق اس کے بیٹے کو ملا تو یہ حق باپ کے احترام کے پیش نظر ساقط ہو جائے گا (یعنی باپ سے ماں کے قتل کا بدلہ نہیں لے گا)۔

اگر رہن شدہ غلام جو رہن رکھنے والے کے پاس ہے، قتل کا ارتکاب کرے تو قصاص کا حق کسی کے لیے واجب نہ ہوگا، جب تک راہن اور مرتہن اکٹھے نہ ہوں کیونکہ مرتہن (رہن رکھنے والا) اس غلام کا مالک نہیں ہے، لہذا وہ اس کا ولی قرار نہ پائے گا، اگر راہن کو اس کا ولی قرار دیا جائے تو قرضہ پر سے مرتہن کا حق جاتا رہے گا، پس واجب ہوا کہ دونوں اکٹھے ہوں تاکہ مرتہن کا حق اس کی رضامندی سے ساقط ہو سکے۔

اگر کوئی غلام آقا کی وفات کے بعد نصف آزاد ہو جائے اور آقا نے اتنا ترکہ نہ چھوڑا ہو جو غلام کی نصف قیمت کو پورا کر سکے اور کوئی شخص اس غلام کو قتل کر دے تو قاتل پر قصاص عائد نہ ہوگا کیونکہ آقا اس کی وفات کے بعد پھر اس کا مالک

نہیں ہو جاتا اور جس قدر وہ آزاد ہو چکا ہے اس کی آزادی بقیہ قیمت ادا نہ ہونے کے باعث منسوخ نہ ہوگی۔

اگر کسی شخص نے ایک بچے (نابالغ) کو یا ایک بالغ شخص کو دریا میں ڈبو دیا تو ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس پر قصاص عائد نہ ہوگا، لیکن صاحبین فرماتے ہیں کہ اس شخص پر قصاص واجب ہوگا اور قصاص کی تکمیل صرف تلوار سے قتل کر کے ہوگی۔

اگر ایک شخص نے عدا کسی پر تیر چلایا اور وہ تیرا سے لگ کر ایک اور شخص کو لگا اور دونوں مر گئے تو پہلے شخص کے قتل کی پاداش میں اس پر قصاص عائد ہوگا اور دوسرے مقتول کے عوض قاتل کے کنبہ پر خون بہا ہوگا، کیونکہ پہلا قتل عمد ہے اور دوسرا اتفاقی ہے لہذا اسے قتل خطا تصور کیا جائے گا اور یہ ایسا ہوگا جیسے کسی نے شکار پر تیر چلایا اور وہ تیر کسی شخص کو جا لگا، اور ارتکاب قتل سے متعدد اشخاص متاثر ہوں تو وہ قتل متعدد تصور کیا جائے گا۔

اگر کسی شخص نے چور کو قتل کر دیا جو رات کے وقت اس کے گھر میں داخل ہوا اور اس کے مال یا اس کی عزت پر ہاتھ ڈالا تو قصاص عائد نہ ہوگا۔

بچے (نابالغ) اور جنون زدہ قاتل پر قصاص عائد نہ ہوگا کیونکہ وہ غیر مکلف ہیں (یعنی ان پر احکام شرعیہ عائد نہیں ہوتے) تاہم خون بہا ان کے ذمہ دار رشتہ داروں پر ہوگا۔

اگر کوئی مسلمان ایک دوسرے مسلمان کو غلطی سے مشرک سمجھ کر قتل کر دے تو قصاص عائد نہ ہوگا، جبکہ مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان صف بہ صف جنگ ہو رہی ہو اور اس شخص پر بھی قصاص نہیں ہے جو کسی باغی (ڈاکو) کو قتل کرے بشرطیکہ اس کی بابت یہ مشہور ہو کہ وہ ظالم ہے اور اس کی تلوار مسلمان راہگیروں پر چلتی رہتی ہے۔

شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ وجوب قصاص کی شرط یہ ہے کہ مقتول مسلمان ہو، حدیث مسلم میں آنحضرت ﷺ سے روایت ہے کہ ”امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ، فاذا قالوها عصموا منی دماؤہم واموالہم، الا بحقہا“ (یعنی مجھے یہ حکم ہے کہ میں ان لوگوں سے جنگ کروں جب تک وہ لا الہ الا اللہ نہ کہیں اگر وہ یہ کہیں تو ان کی جان و مال دونوں محفوظ ہیں، البتہ اگر ان میں بھی کوئی مستوجب قتل ہے تو وہ قتل کیا جائے گا) وجوب قصاص کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ مقتول کو جان کی امان حاصل رہی ہو، یہ امان یا تو اسے بطور ذمی ہونے کے حاصل ہو یا کسی معاہدہ کے تحت یا غیر مشروط طور پر، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”وان احذ من المشرکین استجارک فاجرہ حتی یسمع کلام اللہ“ (التوبہ: ۶) (یعنی مشرکوں میں سے اگر کوئی تمہاری پناہ چاہے تو اسے پناہ دو تا کہ وہ اللہ کا ارشاد سن سکے)۔

برسر جنگ شخص کو قتل کرنے پر قصاص عائد نہ ہوگا، اس کا خون معاف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموہم“ (التوبہ: ۵) (یعنی اب مشرک جہاں بھی ہاتھ آجائیں انہیں قتل کر دو) اسی طرح مرتد کے قتل پر بھی جو نعوذ باللہ اسلام سے پھر جائے قصاص نہیں ہے، کیونکہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے ”من بدل دینہ فاقتلوہ“ (یعنی تم میں سے جو اپنا مذہب بدل لے اسے قتل کر دو)۔

نابالغ (بچہ) اور جنون زدہ کے ذمہ سے قصاص ساقط ہو جاتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے آپ نے فرمایا ”رفع القلم من ثلاث“ (یعنی تین قسم کے لوگ مرفوع القلم ہیں۔ ان پر جرم عائد نہیں ہوتا) ان میں سے مجنون پر

قصاص اس صورت میں عائد نہ ہوگا جبکہ اس کا جنون ہمہ وقتی ہو اور کسی وقت اسے جنون سے افاقہ نہ ہوتا ہو لیکن اگر جنون دورے کے طور پر ہوتا ہے تو دیکھنا ہوگا کہ اگر اس نے ارتکاب قتل افاقہ کی حالت میں کیا ہے تو صاحب عقل تصور کیا جائے گا۔ جیسے وہ مجنون نہیں ہے اور اگر قتل بحالت جنون سرزد ہوا ہو تو اسے ہمہ وقتی پاگل کی طرح سمجھا جائے گا۔

رہا (نشہ میں) مدہوش انسان، گو غالب مسلک اس کے بارے میں یہی ہے کہ اس پر قصاص عائد ہوگا، بشرطیکہ وہ نشہ کا عادی ہو، کیونکہ وہ مکلف (بجا آوری احکام کا ذمہ دار) ہے۔ اور اس لیے بھی کہ مبادا اس کا نتیجہ یہ ہو کہ قصاص لینا ہی بند ہو جائے، کیونکہ جب ایک شخص قتل کرنے کا ارادہ کر سکتا ہے تو وہ نشہ سے (ارتکاب جرم میں) اتنا مجبور قرار نہیں دیا جاسکتا کہ اس سے قصاص نہ لیا جائے، اسی میں وہ صورت بھی شامل ہے کہ کوئی شخص ایسی دوا استعمال کرنے کا عادی ہو جس سے انسان عقل کھو بیٹھے کہ اس سے قصاص لیا جائے گا۔

اگر قاتل کہے کہ جس وقت میں نے قتل کیا نابالغ یا جنون زدہ تھا، لیکن مقتول کا ولی اس کی تکذیب کرے تو قاتل کی بات تسلیم کر لی جائے گی بشرطیکہ وہ حلف اٹھالے اور یہ ممکن بھی ہو کہ قتل کے وقت اسے نابالغ تصور کیا جاسکے یا اس پر جنون کی حالت طاری ہو سکتی ہو، کیونکہ اس بارے میں بنیادی بات یہ ہے کہ زندگی بچائی جاسکے۔ بخلاف اس صورت کے جبکہ یہ ممکن ہی نہ ہو کہ اس وقت قاتل کو بچہ تصور کیا جاسکے یا اس وقت جنون کا دورہ نہ ہوتا ہو، ایسی صورت میں قصاص لیا جائے گا۔

اگر قاتل کہے کہ میں اس وقت نابالغ ہوں اور اس کا نابالغ ہونا ممکن ہو تو اس پر قصاص عائد نہ ہوگا، اس حالت میں اسے اپنے نابالغ ہونے کے لیے حلف اٹھانا ضروری نہیں ہے، کیونکہ اس سے حلف لینا (بجائے خود) اس کے بالغ ہونے کا ثبوت ہے (نابالغ سے حلف نہیں لیا جاتا) اگر اس کا بچہ ہونا ثابت ہو تو حلف بے سود ہے۔

اگر کسی حربی نے بدوران جنگ قتل کیا اس کے بعد مسلمان ہو جانے یا ذمی ہو جانے کے باعث (مسلمان کی) حفاظت میں آگیا تو اب اس پر قصاص عائد نہ ہوگا، جیسا کہ آنحضرت ﷺ اور ان کے بعد صحابہ کے متواتر طرز عمل سے ثابت ہے کہ مسلمان ہو جانے پر قصاص نہیں لیا جائے گا، کیونکہ اسلام تمام پچھلی باتوں پر غالب ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قاتل وحشی کو (مسلمان ہو جانے پر) معاف فرمادیا تھا۔

واضح ہو کہ مسلمان اگر چہ شادی شدہ زانی ہو کسی ذمی کے قتل کر دینے پر مستوجب قصاص نہ ہوگا، کیونکہ صحیح بخاری میں یہ حدیث آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”الا لا یقتل مسلم بکافر“ (یعنی خبردار کسی مسلمان کو کافر کے قتل پر قتل نہ کیا جائے) کیونکہ ان اصحاب نے قاتل قرار دیے جانے کے لئے اس مقتول کا بدل (یا ہم پلہ) ہونا شرط قرار دیا ہے بہ اس جہت کہ مقتول کو قاتل پر بحیثیت مسلمان ہونے یا مامون (یعنی پناہ گیر) ہونے یا جزیہ دار (یعنی جزیہ دینے والا غیر مسلم) ہونے کے خاندان کی جڑ ہونے یا آقا ہونے کی حیثیت سے برتری حاصل نہ ہو۔ چنانچہ اگر کوئی ذمی مرتد کو قتل کر دے تو قاتل پر قصاص نہیں ہے۔ اسی طرح اگر آزاد شخص اس غلام کو قتل کر دے جو ہنوز پورے طور پر آزاد نہیں ہوا، تو قصاص عائد نہ ہوگا، اگر ایک آزاد مسلمان نے ایسے شخص کو قتل کیا جس کی بابت یہ علم نہیں ہے کہ وہ مسلمان ہے یا کافر یا یہ معلوم نہ ہو کہ مقتول آزاد ہے یا غلام تو جرم مشتبہ ہو جانے کی بناء پر قصاص عائد نہ ہوگا۔ نیز اگر کسی نے اپنے غلام مکاتب کو

(یعنی جسے ایک خاص رقم ادا کرنے کی شرط پر آزادی کا پروانہ دیا گیا ہو) قتل کر دیا تو مستوجب قصاص نہ ہوگا، اگر ایسا شخص جو جزوی طور پر آزاد ہے اپنے ہی جیسے کسی کو قتل کر دے تب بھی قصاص عائد نہ ہوگا گو قاتل مقتول سے زیادہ حصہ آزاد ہو یا نہ ہو کیونکہ یہ آزاد حصہ کے عوض آزاد حصہ کا اور غلام حصہ کے عوض غلام حصہ کا قصاص متصور نہیں ہے بلکہ قصاص پورے شخص کا پورے شخص کے عوض ہوگا جو آزادی اور غلامی میں باہم شریک ہیں۔ نتیجہ (یہ قصاص) آزاد حصہ کو غلام حصہ کے عوض قتل کرنا ہوگا جو ممنوع ہے۔

مسلمان غلام سے آزاد ذمی کے قتل کا قصاص نہیں لیا جائے گا کیونکہ مسلمان کو ذمی کے قتل پر قتل نہیں کیا جاسکتا اور نہ آزاد کو غلام کے قتل پر قصاص ہوگا کیونکہ اسلام اور آزادی کا شرف وجود غلام کے مساوی نہیں ہے۔ اگر کسی ذمی نے غلام کو قتل کر دیا اور قتل کرنے کے بعد اس نے عہد ذمہ توڑ دیا (یعنی ذمی نہ رہا) بلکہ غلام بن گیا تب بھی اسے قتل نہیں کیا جائے گا اگرچہ وہ اس کا کفو (ہم پلہ) ہو گیا، کیونکہ اس کی جو حیثیت ارتکاب قتل کے وقت تھی اس کا لحاظ رکھا جائے گا۔ اس وقت مقتول کی حیثیت اس کے برابر نہیں تھی۔

بیٹے کے قتل کر دینے پر باپ سے قصاص نہیں لیا جائے گا، جیسا کہ حاکم اور بیہقی کی روایت کردہ اس حدیث میں آیا ہے جسے دونوں نے صحیح بتایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”لا یفسد للابن من ابیہ“ (یعنی بیٹے کے قتل پر باپ سے قصاص نہ لیا جائے) علاوہ اس کے باپ کا احترام بھی اسی میں ہے۔ یہی حکم ماں، دادا، دادیوں اور نانا، نانیوں کا ہے، کیونکہ اس حکم کا تعلق اولاد ہونے کی بناء پر ہے اس حیثیت سے ان سب کا احترام یکساں ہوگا۔

بیٹے کو باپ سے بالواسطہ مطالبہ حق قصاص بھی نہیں ہے، مثلاً کسی نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا اور اس بیوی سے کوئی لڑکا ہے، تو یہ لڑکا اپنی ماں کے خون کا وارث ہے یا باپ نے اپنے بیٹے کی بیوی (اپنی بہو) کو قتل کر دیا، یا باپ پر خون بہا عائد ہوا اور بیٹا بھی اس خون بہا کے کچھ حصہ کا وارث ہے، مثلاً کسی نے بیوی کے باپ (یعنی خسر) کو قتل کر دیا، اور بیوی وفات پا گئی لیکن اس بیوی سے اس کا بیٹا ہے جو اپنی ماں کے ورثہ میں نانا کے خون بہا کا حقدار ہے، (ان تمام صورتوں میں باپ پر قصاص یا خون بہا عائد نہ ہوگا) کیونکہ اگر ایک شخص (بلا واسطہ) اپنے بیٹے کے قتل پر مستوجب قصاص نہیں ہوتا تو ایسے جرم میں بدرجہ اولیٰ قصاص عائد نہ ہوگا جس کا حق بیٹے کو ورثہ میں (بالواسطہ) ملا ہو۔

اگر کوئی شخص اپنے باپ یا اپنی ماں کو قتل کر دے تو اسے قتل کیا جائے اور محرموں میں سے اگر ایک دوسرے کو قتل کر دے تو محرم کو غیر محرم کی طرح قتل کیا جائے گا، اگر آزاد مسلمان کا بیٹا کا فر باپ کو قتل کر دے تو بیٹا مستوجب قصاص نہ ہوگا۔

اگر مقتول کا نسب معلوم نہ ہو اور دو اشخاص اس کے قصاص کا حقدار ہونے کا دعویٰ کریں اور ہنوز مقتول کے نسب کا تعین نہ ہوا تھا کہ ان دونوں میں سے ایک کو قتل کر دیا گیا تو سردست قصاص کا نفاذ روک دیا جائے گا، کیونکہ ان دونوں میں سے ایک تو بہر حال مقتول کا باپ ہے لیکن امر واقعہ ہنوز مشتبہ ہے، جیسے دو اشیاء میں شبہ ہو کہ کوئی پاک ہے کوئی ناپاک تو دونوں میں سے کسی کو استعمال نہ کیا جائے جب تک کہ خاطر خواہ تصفیہ نہ ہو جائے۔ اسی طرح اس معاملہ کو بھی قائف (قیافہ شناس) کے سپرد کیا جائے، اگر قیافہ شناس دوسرے شخص کے حق میں فیصلہ کر دے تو اس دوسرے شخص کو

قصاص لینے کا حق ہوگا، کیونکہ اس کا باپ ہونا ثابت ہو گیا، اور قاتل سے اس کا رشتہ منقطع ہوگا، اگر دوسرے شخص سے اس کا رشتہ ثابت نہ کیا جائے تو وہ قصاص نہ لے گا کیونکہ اس کا باپ ہونا ثابت نہیں ہے۔

اگر دونوں قتل میں شریک ہوں اور قیافہ شناس ان میں سے ایک کی طرف مقتول کو منسوب کرے تو دوسرے شخص سے جو (اس کا باپ نہیں بلکہ) اجنبی ہے قصاص لیا جائے کیونکہ وہ قتل کرنے میں باپ کا شریک کا رہتا۔

اگر ایک مسلمان نے کسی مسلمان پر تیر چلایا جو (تیر کھانے کے بعد) نعوذ باللہ مرتد ہو گیا اور زخم کے سرایت کر جانے سے حالت ارتداد میں وفات پا گیا تو اس مسلمان پر قصاص عائد نہ ہوگا کیونکہ اگر اس وقت بھی وہ (تیر چلا کر) قتل کر دے تو قاتل پر کچھ عائد نہ ہوگا۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ بچے (نابالغ) اور جنون زدہ کے ذمہ سے جبکہ اس نے حالت جنون میں ارتکاب قتل کیا ہو قصاص ساقط ہو جائے گا، البتہ اگر جنون سے افاقہ کی حالت میں قتل کیا تو مستوجب قصاص ہوگا لیکن اگر حالت جنون میں ہو تو افاقہ پانے تک انتظار کیا جائے گا اگر افاقہ نہ ہو تو اس کے مال سے خون بہا وصول کیا جائے اور ایسے مدہوش انسان پر قصاص عائد نہ ہوگا جسے حلال شے کے استعمال سے نشہ لاحق ہوا ہو، ایسی حالت میں اسے مجنون تصور کیا جائے گا۔ لہذا اس کے کنبہ پر خون بہا واجب ہوگا جیسے قتل خطا میں ہوتا ہے، لیکن اگر نشہ حرام شے کے استعمال سے ہو تو اسے مکلف (یعنی ایسا شخص) تصور کیا جائے گا جس پر احکام شرعیہ عائد ہوتے ہیں۔

جنگ کرنے والے کا خون معاف ہے، لہذا اس کا قتل قصاص کے طور پر کیونکہ جان کو محفوظ رکھنے والی شے یا تو ایمان ہے یا امان (یعنی پناہ میں آجانا) آزاد مسلمان شخص کو غلام کے قتل پر اور آزاد شخص کو ذمی کے قتل پر اور مسلمان غلام کو آزاد ذمی کے قتل پر قصاص کا مستوجب قرار نہیں دیا جائے گا، کیونکہ اسلام کو ذمی شخص کی آزادی کے مقابلہ میں برتری حاصل ہے اور ادنیٰ کے قتل پر اعلیٰ کی جان نہیں لی جائے گی، ان اصحاب کے نزدیک قصاص کے لیے یہ شرط ہے کہ قاتل کو آزاد ہونے یا مسلمان ہونے کے باعث مقتول پر برتری حاصل نہ ہو۔

برسر جنگ (مخالف) اور مرتد کے قاتل پر قصاص نہیں ہے، کیونکہ ان اصحاب کے نزدیک ان کے محفوظ رہنے کی ذمہ داری نہیں ہوتی۔

زخم لگنے کے بعد مجروح کی سماجی حیثیت بدل جانے کا بیان

شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر مسلمان نے، ذمی یا حربی (دشمن کے آدمی) کو یا مرتد کو یا ذاتی غلام کو زخمی کیا اور زخم خوردہ شخص کی سماجی حیثیت اس کی زندگی میں بدل گئی یعنی وہ مرتد یا حربی مسلمان ہو گیا یا (حربی کو) پناہ دے دی گئی اور غلام آزاد ہو گیا۔ اس کے بعد زخم کے سرایت کر جانے کے باعث مر گیا تو جراثیم رساں پر نہ مالی تاوان عائد ہوگا اور نہ قصاص، کیونکہ وہ زخم ہی جو پہلے لگایا گیا ناقابل تاوان تھا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ارتکاب جرم کے وقت کا ہلکا تاوان عائد ہوگا اس سے مراد ایک آزاد مسلمان کی دیت ہے، کیونکہ وہ زخم جو ابتداء میں قابل باز پرس ہو وہ حالت مجروح میں تبدیلی آ جانے سے قابل باز پرس نہیں ہو جاتا چنانچہ وہ زخم جو ابتداء میں قابل تاوان ہوا اگر اس سے موت واقع ہو جائے تو وہ موت رائگاں متصور ہوگی۔ البتہ اس جرم کا تاوان واجب ہو گا، اور اگر جرم جراحت کی نوعیت آغاز میں بھی اور انجام میں بھی قابل تاوان ہو تو وہ تاوان عائد ہوگا جو آخری حالت میں واجب ہو اور قصاص کے لیے اس بات کو ملحوظ رکھا جائے گا کہ عمل مستوجب قصاص کا انجام کیا ہوا؟ ایسی صورت میں اگر کسی مسلمان نے مرتد یا حربی پر یا ذاتی غلام پر تیر چلایا اور وہ حربی یا مرتد مسلمان ہو گیا یا حربی کو پناہ دے دی گئی یا وہ غلام آزاد ہو گیا اور اس کے بعد تیر کا اثر ہوا تو قطعاً قصاص عائد نہ ہوگا کیونکہ آغاز جرم سے نوعیت جرم یکساں نہیں رہی۔ اور مسلک یہ ہے کہ مسلمان پر تاوان کے لیے اس حالت کو ملحوظ رکھا جائے گا جو زخم لگنے کے وقت تھی، کیونکہ جرم سرزد ہونے کی حالت وہی تھی، اور تیر اندازی تو محض ذریعہ اقدام جرم ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کنواں کھودا گیا اور اس وقت وہاں پر کوئی حربی یا مرتد شخص ہے، لیکن وہ مسلمان ہو گیا اور اس میں جا پڑا تو اب کنواں کھودنے والا اس جرم کا ذمہ دار قرار دیا جائے گا۔ اگرچہ ذریعہ جرم (یعنی کنواں) اس وقت ناقابل باز پرس تھا، اور (اگر گرنے والا) اس کا غلام ہے تو ان دونوں (حربی یا مرتد) کے مقابلہ میں بدرجہ اولیٰ حقدار تاوان ہے، کیونکہ وہ تحت تحفظ ہوتا ہے اور اس کا نقصان مستوجب کفارہ ہے۔

اس بارے میں صحیح ترین مسلک یہ ہے کہ ہلکا خون بہا لازم ہے جو اس کے ذمہ دار رشتہ داروں سے قابل وصول ہو گا، کیونکہ اسے جرم خطا کی دیت قرار دیا جائے گا، جیسے کسی نے شکار پر تیر چلایا اور وہ تیر کسی شخص کو جا لگا ہو۔ غرض کہا جاتا ہے کہ یہ وقوعہ شبہ عمدہ ہے (یعنی عمدہ ارتکاب جرم کے مشابہ عمل ہے) اور یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ قتل عمدہ ہے۔

اس کے برعکس اگر کسی حربی نے ایک مسلمان کو زخمی کر دیا اور زخمی کرنے والا مسلمان ہو گیا یا عہد ذمہ کر لیا (یعنی ذمی ہو گیا) اور وہ مجروح وفات پا گیا، تو بقول صحیح اس سے کوئی باز پرس نہ ہوگی، اور اگر وہ مجروح (جو مسلمان تھا)، بغیر باللہ مرتد ہو گیا اور اس زخم کے اثر سے مر گیا اور مرتد ہی مرا لیکن زخم لگانے والا مرتد نہیں ہے تو وہ خون رائگاں (ناقابل باز پرس) متصور ہوگا اور نہ اس کا قصاص ہوگا نہ خون بہا نہ کفارہ خواہ زخمی کرنے والا حاکم وقت ہو یا کوئی اور ہو، کیونکہ اگر اس حالت میں (جبکہ وہ مرتد ہے) قتل کر دیا جائے تو اس پر کوئی جرم عائد نہ ہوگا اسی طرح زخم کے سرایت کر جانے پر بھی مواخذہ نہ ہوگا، لیکن اگر زخمی کرنے والا مرتد ہو تو بقول قوی اس پر حکم قصاص عائد ہوگا۔ تاہم زخم کرنے کی دیت واجب ہوگی، بشرطیکہ وہ زخم مستوجب قصاص ہو مثلاً زخم کھلا یا عضو کاٹ دیا گیا ہو، کیونکہ اعضائے جسم کا قصاص جان کے قصاص

سے جدا گانہ شے ہے اور وہ زخم ایسا ہے جیسے وہ زخم جو جسم میں سرایت نہ کرے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ کوئی قصاص عائد نہ ہوگا کیونکہ وہ زخم ہلاکت جان کی مانند ہے اور جان معاف ہو جاتی ہے اسی طرح قطع عضو کا جرم بھی قابل درگزر ہے، لیکن اگر کسی مسلمان کا ہاتھ کاٹا اور پھر وہ مرتد ہو گیا اور اس مسلمان کا زخم بھر گیا تو جراحت رساں پر تاوان عائد ہوگا، اگر ادائے تاوان سے پہلے مر گیا تو اس مسلمان کا قرابت دار پورا تاوان وصول کرے گا، کیونکہ قصاص تشفی کے لیے ہوتا ہے یہاں تک کہ اگر قرابت داری کی حیثیت سے اس میں کمی ہو تو اس کی تکمیل ہونے تک انتظار کیا جائے تاکہ پورا حق وصول کیا جاسکے۔

یہ بھی کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں حاکم وقت تاوان وصول کرے، کیونکہ مرتد کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ لہذا امام تاوان وصول کرے گا، جیسے اس شخص کا قصاص لیتا ہے جس کا کوئی وارث نہیں ہوتا اور پہلی صورت میں یہ جائز ہے کہ حقدار کچھ مال کے عوض تاوان معاف کر دے، امام (حاکم وقت) اس مال کو وصول کر کے بیت المال (سرکاری خزانہ) میں داخل کرے اگر مرتد کی جراحت رسائی کی پاداش میں کسی پر مالی تاوان عائد کیا جائے مثلاً غلطی سے ہاتھ کٹ گیا ہو تو تاوان کی وہ مقدار واجب ہوگی جو زخم کے تاوان اور خون بہا کی مقدار دونوں میں سے کمتر ہوگی، کیونکہ یہ مقدار یقینی طور پر عائد ہوتی ہے اگر تاوان واجب (نسبتہ خون بہا سے) کم ہو مثلاً پیٹ پھاڑنے کا تاوان ہے جس سے زخم کھانے والے کی موت واقع ہو جائے تو اس کے مرتد ہو جانے پر اس میں اضافہ نہ ہوگا، اور اگر خون بہا کی مقدار زخم کے تاوان سے کم ہو مثلاً ایک شخص نے کسی کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں کاٹ دیئے اور اس کے بعد وہ زخمی مرتد ہو گیا اور پھر مر گیا (تو خون بہا کی مقدار ان چاروں اعضاء کے تاوان سے کم ہوگی) ان دونوں میں سے جس کی مقدار زیادہ ہے اتنا تاوان واجب نہ ہوگا، کیونکہ اگر وہ شخص (زخمی) مسلمان ہی مر جاتا (مرتد نہ ہوتا) تب بھی زیادہ مقدار والا تاوان عائد نہ ہوتا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ جراحت رسائی کا تاوان خواہ کتنا ہی زیادہ ہو وہی واجب الادا ہوگا خواہ اس کی مقدار خون بہا سے زیادہ ہو۔ پس دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں کاٹنے پر دو ہر تاوان واجب ہوگا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ زخم رائیگاں متصور ہوگا لہذا اس کی کوئی باز پرس نہ ہوگی، کیونکہ یہی زخم اگر سرایت کر جائے تو وہ قتل ہے، اور اعضاء جسم جان کے تابع ہیں تو جبکہ یہ خون معاف ہے تو زخم بھی اسی طرح قابل مواخذہ نہیں ہے۔

یہ تمام مسائل اس صورت میں ہیں جبکہ مجروح زخم کھانے کے بعد مرتد ہوا ہو اور اگر وہ تیر چلنے کے بعد مگر زخم لگنے سے پہلے ہی مرتد ہوا تو بالاتفاق یہ جرم قابل مواخذہ ہے کیونکہ جس وقت ارتکاب مجرم ہوا وہ شخص مرتد ہو چکا تھا۔

اگر مجروح مرتد تھا پھر مسلمان ہو گیا لیکن اس زخم کے اثر سے مر گیا تو بقول صحیح جراحت رساں پر قطعاً کوئی قصاص عائد نہ ہوگا کیونکہ اب جرم کی نوعیت مشتبہ ہو گئی اور اشتباہ کی حالت میں مجرم سزا سے بچ جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اگر مرتد مجروح (جو مسلمان ہو گیا) کی حالت ارتداد اتنی مختصر تھی کہ زخم جسم میں سرایت نہیں کر پایا تھا اور وہ مسلمان ہو گیا تو جراحت رساں پر قصاص واجب ہوگا۔ کیونکہ جب اس نے ارتداد سے توبہ کی اس وقت زخم کے سرایت کرنے کی کوئی علامت ظاہر نہ تھی۔ ہاں اگر اس مرتد نے مسلمان ہونے میں دیر کی تو مجرم پر قطعاً قصاص واجب نہ

ہوگا، کیونکہ زخم اور موت دونوں باتیں مقتول کے تحفظ کی ذمہ داری کے دوران واقع ہوئیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ نصف خون بہا عائد ہوگا، کیونکہ اس حالت میں (تاوان واجب کو) مجروح کے محفوظ اور غیر محفوظ ہونے کے درمیان تقسیم کر دیا جائے گا۔

اگر کسی مسلمان نے ایک ذمی کو زخم پہنچایا اور وہ ذمی مسلمان ہو گیا یا کسی کے غلام کو زخمی کیا اور وہ غلام آزاد ہو گیا۔ پھر زخمی سرایت زخم کے باعث وفات پا گیا تو ان دونوں صورتوں میں زخمی کرنے والے پر قصاص عائد نہ ہوگا، کیونکہ اس نے ہم پلہ کو زخمی کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ لہذا جرم (کا مستوجب قصاص ہونا) مشتبہ ہو گیا۔ تاہم اس پر ایک مسلمان کا خون بہا عائد ہوگا۔ کیونکہ پہلے تو زیر تحفظ تھا اور بعد میں آزاد مسلمان ہو گیا اور اگر وہ غلام غیر مسلم ہو تو اس کا خون بہا ایک غیر مسلم آزاد شخص کے خون بہا کے برابر ہوگا۔ اب اگر زخم بھر گیا اور آرام ہو گیا اور اس کے بعد وفات پا گیا تو جراحت رساں (مسلم) پر جرمانہ عائد ہوگا اور غلام کے حق میں جو جرمانہ عائد ہوا ہے اس کا حقدار غلام کا مالک ہوگا اور آزاد شدہ غلام کا خون بہا اس کے مالک کا حق ہے بشرطیکہ زخم کے سرایت کرنے سے موت واقع ہوئی ہو اور اس جراحت کا کوئی تاوان مقرر نہ ہو۔ خواہ تاوان اس غلام کی قیمت کے برابر ہو یا اس سے کم ہو، کیونکہ اس کا مالک اس جرم کی پاداش میں اسی قدر تاوان کا مستحق تھا جب کہ وہ جرم اس کی ملکیت کے دوران سرزد ہوا ہوتا اور بصورت موجودہ اس کا کوئی حق قرار نہیں دیا گیا بلکہ مجرم کو حق ہے کہ اس کی قیمت کا تعین کرے اور جب دیت موجود ہو اور رقم ادا کی جائے تو اس کے آقا کو اسے تسلیم کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔ اگر غلام کی دیت (تاوان) غلام کی قیمت سے زیادہ ہو تو جس قدر زیادہ ہے وہ غلام کے ورثاء کو ملے گی کیونکہ یہ رقم اس کو آزاد ہونے کی حیثیت سے ملے گی۔ اگر جراحت کا کوئی مقررہ تاوان ہے مثلاً غلام کا ہاتھ کسی نے کاٹ دیا یا اس کی آنکھ پھوڑی اور پھر اسے آزاد کر دیا گیا (یعنی غلام نہ رہا لیکن) اس زخم کے سرایت کر جانے کے باعث اس کی وفات ہو گئی اور پورا تاوان واجب الادا ٹھہرا تو اس کے آقا کو واجب الادا خون بہا اور غلام کی نصف قیمت دونوں میں سے جس کی مقدار کم ہوگی اسی قدر حق ہوگا اور یہ اس عضو کا تاوان ہے جو اس شخص کی ملکیت کے دوران تلف ہوا۔ یہ اس حالت میں ہے جب کہ وہ زخم اچھا ہو گیا ہو۔ کیونکہ غلام (مملوک) ہونے کی حالت میں اس زخم کے اثر سے موت واقع نہیں ہوئی کہ اس میں اس کے آقا کا حق تسلیم کیا جائے۔ پس اگر تاوان غلام کی آدھی قیمت سے کم ہے تو اس کے سوا اور کچھ واجب نہ ہوگا اور اگر اس کی نصف قیمت تاوان سے کم ہے تو یہی اس جرم کا تاوان قرار پائے گا جو اس غلام کے خلاف اس کے مملوک ہونے کے دوران سرزد ہوا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس صورت میں خون بہا اور غلام کی پوری قیمت میں سے جو مقدار کم ہے وہی واجب الادا ہوگا۔ اگر کسی شخص نے ایک غلام کا ہاتھ کاٹ دیا، اس کے بعد دو شخصوں نے اسے زخم پہنچایا مثلاً ایک شخص نے اس کا دوسرا ہاتھ کاٹ دیا اور دوسرے نے اس کا پاؤں کاٹ دیا اور وہ ان زخموں کے سرایت کر جانے سے وفات پا گیا تو پہلے شخص پر اگر وہ آزاد ہے قصاص عائد نہ ہوگا۔ کیونکہ ارتکاب جرم کے وقت دونوں میں مطابقت نہ تھی۔ باقی دو شخصوں پر اس مسلک کی رو سے اعضاء کا قصاص قطع عضو کرنے اور جان کا قصاص (خون کا بدلہ خون) واجب ہوگا۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی مسلمان پر تیر چلایا گیا اور جس پر تیر چلایا گیا وہ شخص نعوذ باللہ مرتد ہو گیا اس کے بعد اسے

تیر لگا تو ابو حنیفہؒ کے نزدیک تیر چلانے والے پر خون بہا واجب ہوگا، لیکن صاحبین فرماتے ہیں کہ اس پر کچھ عائد نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کے مرتد ہو جانے کے باعث اس کی قدر جاتی رہی نہ وہی صورت ہے جس میں ضامن بری الذمہ ہو جاتا ہے کیونکہ جب کوئی شے اپنی قدر سے گرا دی جائے تو اس کی کوئی حقیقت نہیں رہ جاتی۔ مثلاً کسی شخص کا غلام غصب کر لیا جائے اور وہ شخص اس کو آزاد کر دے تو اب وہ غصب کرنے والا ذمہ داری سے بری ہو جائے گا۔ اسی طرح تیر چلانے والے کو بھی جرم سے یا زخم کے حق تاوان سے بری قرار دیا جائے گا۔ یعنی (مطالبہ قصاص) حاصل ہونے کے سبب جس سے مراد تیر چلانا ہے تیر لگنے سے پہلے ہی جاتا رہا۔

ابو حنیفہؒ کا کہنا یہ ہے کہ (جرم کی) ذمہ داری مجرم پر اس کے اپنے عمل یعنی تیر چلانے سے عائد ہوئی۔ اس کے بعد اس سے کوئی اور فعل سرزد نہیں ہوا یہ صورت حال صورت سابقہ پر منطبق نہیں ہوتی۔ لہذا اس بارے میں اس وقت کو ملحوظ رکھا جائے گا جب یہ فعل سرزد ہوا۔ جیسا غصب کے معاملہ میں ہوتا ہے۔ غرض تیر چلانے والے (یا وار کرنے والے) کی حالت کا لحاظ رکھا جائے اور جس پر تیر چلایا گیا اس پر انحصار ہوگا (کہ اس کی حیثیت وار کے وقت کیا تھی؟) اس مسئلہ کی وضاحت اس سے ہوتی ہے کہ ایک شخص نے مثلاً شکار پر تیر چلایا اور تیر چلانے کے بعد، نعوذ باللہ۔ وہ شخص مرتد ہو گیا تو (اس تیر سے کیا ہوا) شکار حرام نہ ہوگا کیونکہ اس کا فعل شرعی نقطہ نظر سے موجب زکاۃ صید (یا بسم اللہ کہنا) ہے پوری ہوئی۔ اسی طرح اگر جرم غلطی سے سرزد ہوا اور مجرم تیر چلانے کے بعد لیکن زخم لگنے سے پہلے کافر ہو گیا تو اسے جرم خطا ہی تصور کیا جائے۔ اگر اس نے قصداً تیر چلایا تھا تو اس بناء پر کہ زخم کارگر ہونے کے وقت مجرم کا حال مشتبہ تھا قصاص ساقط ہو جائے گا اور اس کے مال سے خون بہا واجب الادا ہوگا۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہو (یعنی حالت کفر میں تیر چلایا اور معا بعد مسلمان ہو گیا)۔ تو باتفاق جملہ فقہاء اس پر کچھ عائد نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی نے حربی پر تیر چلایا اور وہ مسلمان ہو گیا (تب بھی قصاص عائد نہ ہوگا) کیونکہ محض تیر چلانے سے ذمہ داری عائد نہیں ہوتی اس لیے کہ محل جرم مقدم (درست) نہیں تھا (یعنی جس پر تیر چلایا گیا وہ ایسا شخص نہ تھا کہ تیر چلانے والا مستوجب قصاص ہوتا) اور بعد میں اس کے مقوم ہو جانے کے باعث وار کرنے والے پر الزام عائد نہیں ہو سکتا۔

اگر ایک شخص نے کسی کے غلام پر تیر چلایا اور اسی دم اس کے آقا نے غلام کو آزاد کر دیا اور بعد میں وہ تیر لگا تو امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک تیر چلانے والے پر لازم ہے کہ غلام کی قیمت اس کے مالک کو ادا کرے۔ امام محمدؒ کہتے ہیں کہ اس شخص پر غلام کی دو قیمتوں یعنی زخم کھانے سے پہلے اور بعد کی قیمت میں جو فرق ہے اسی قدر تاوان عائد ہوگا۔ چنانچہ اگر تیر کھانے سے پہلے اس کی قیمت ایک ہزار (۱۰۰۰) درہم تھی اور تیر کھانے کے بعد آٹھ سو (۸۰۰) رہ گئی تو دو سو درہم (تاوان) واجب الادا ہوگا کیونکہ غلام کے آزاد ہو جانے پر زخم کے نتیجہ میں عائد ہونے والا حق مطالبہ ختم ہو جائے گا کیونکہ اب حقدار کے تعین میں اشتباہ لاحق ہوگا کہ مطالبہ کا حق کس کو ہے؟ جرم کے سرزد ہونے پر تو ابتداء میں اس کے تاوان کا حقدار آقا تھا اور زخم لگنے کے بعد جب آزاد ہو گیا تو اب غلام خود اس زخم کے تاوان کا حقدار ہے۔ پس اس کا آزاد کر دینا اس سے بری الذمہ ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے کسی کے غلام کا ہاتھ کاٹ دیا یا اسے زخمی کر دیا۔ اس کے بعد مالک نے اسے آزاد کر دیا۔ پھر وہ زخم غلام کے جسم میں سرایت کر گیا (اور اس کی موت واقع ہو گئی) تو اب اس غلام کے آزاد کئے جانے کے بعد سرایت زخم کا کوئی واسطہ مالک سے نہیں رہے گا۔ آزاد کرنے کے بعد اب وہ کوئی مطالبہ تاوان یا

قیمت کا نہیں کر سکتا۔ البتہ غلام کو جو نقصان پہنچا مجرم اس کا ذمہ دار ہے۔ غلام کے زخم سے قطع رابطہ کے بعد صرف تیر چلانے کا وہ جرم قابل مواخذہ رہ گیا جس وجہ سے زخم خوردہ غلام کی قیمت میں بہ نسبت زخم سے پہلے کی حالت کے کمی آگئی لہذا جس قدر کمی ہے اسی قدر تاوان واجب ہوگا۔

صاحبین کا کہنا ہے کہ ایسی صورت میں اس فعل کو بلحاظ اس حالت کے جب کہ تیر چلایا گیا تھا قتل قرار دیا جائے گا۔ اس وقت وہ غلام مملوک تھا۔ لہذا مجرم پر اس کی قیمت واجب ہوگی۔ بخلاف عضو کاٹ دینے یا زخمی کر دینے کے کیونکہ یہ زخم (جان کو نہیں بلکہ) بدن کے بعض حصہ کو نقصان پہنچاتا ہے لہذا آقا کو اس کے تاوان کا حق ہے۔ پھر اس زخم کے برائیت کر جانے کی صورت میں جو کچھ عائد ہوگا وہ اس غلام کا حق ہے (کیونکہ وہ آزاد ہو چکا ہے) پس انجام کی صورت حال آغاز سے مختلف ہے۔ لیکن اگر تیر کاری نہ ہو تو اس سے کوئی شے تلف نہ ہوگی کیونکہ محل جرم (یعنی غلام) پر اس کا کوئی اثر نہیں ہے البتہ اس کی پذیرائی میں کمی آجائے گی۔ اس پر کوئی تاوان عائد نہیں ہوتا۔ لہذا اس (مجرم) کے آغاز و انجام میں کوئی فرق نہیں اور (موت واقع ہو جانے پر) غلام کی قیمت اس کے آقا کو ادا کی جائے گی۔ اگر کسی شخص کو سنگسار کئے جانے کا فیصلہ کیا گیا اور ایک شخص نے اس کو پتھر مارا تھا کہ (اس کے خلاف گواہی دینے والوں میں سے) ایک گواہ اپنے بیان سے پھر گیا (نتیجہ وہ مجرم نہ رہا) اور تب اسے پتھر لگا تو اس پتھر مارنے والے پر کوئی الزام عائد نہ ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں اس وقت کو ملحوظ رکھا جائے گا جب اس نے پتھر مارا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت اس کا خون حلال تھا۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی نے ایک مسلمان شخص پر تیر چلایا اور وہ شخص نعوذ باللہ معا مرتد ہو گیا اور مرتد ہونے کے بعد تیر اسے لگا تو تیر انداز پر کوئی الزام عائد نہ ہوگا، بلکہ وہ خون کا عدم متصور ہوگا۔ اس پر قصاص ہوگا نہ تاوان۔ کیونکہ اس سے جس کو نقصان پہنچا وہ محفوظ حیثیت میں نہ تھا لہذا جرم کا عدم ہوگا۔ اس طرح اگر زخم کھانے کے بعد بھی وہ مرتد ہو جائے اور پھر مر جائے تب بھی کوئی الزام جراحت کرنے والے پر عائد نہ ہوگا یہی حال اس شخص کا ہے جسے جرم پر یا مطالبہ حق میں ضرب لگائی گئی اور اسے جرم سے یا مطالبہ سے بری کر دیا گیا یا یہ ہوا کہ کسی خطا پر تیر کا نشانہ بنایا لیکن زخم نے خطا سے بری ہونے کے بعد اسے ہلاک کیا۔ اسی طرح کی وہ صورت ہے کہ کوئی شخص اپنے غضب شدہ مملوک غلام کو آزاد کر دے تو غاصب اس کی ذمہ داری سے بری ہو جائے گا کیونکہ ضرب لگانے یا تیر چلانے کو جرم قرار دینے کی شرط یہ ہے کہ ارتکاب فعل کے وقت مجروح کو بے خطا اور محفوظ مان لیا گیا ہو اور اس لیے بھی یہ جرم نہ رہا کہ مرتد ہو جانے کے باعث اس کی جان کا عہد تحفظ جاتا رہا پس وار کرنے والا اس کے نتائج سے بری الذمہ ہو گیا۔ جیسے کوئی شخص زخمی ہونے کے بعد موت سے پہلے اپنے مطالبہ سے مجرم کو بری کر دے۔ اس صورت میں وہ خون کا عدم ہو جائے گا اور مجرم پر کوئی مطالبہ عائد نہ ہوگا پھر یہ بھی ہے کہ سزائے جرم کا واجب نہ ہونا اس لیے نہیں ہے کہ مجرم کو مطالبہ حق سے بری کر دیا گیا بلکہ اس لحاظ سے ہے کہ زخمی کے مرتد ہو جانے کے بعد زخم کو اس کے نتیجہ (یا موت) سے کئی تعلق نہیں رہتا۔ جیسے زخمی غلام کو آزاد کر دینے پر ہوتا ہے (کہ آزاد ہونے کے بعد اس زخم کا نتیجہ خواہ کچھ ہو مجرم بری الذمہ ہوگا) اسی طرح مجروح کے تحت تحفظ ہونے کا انحصار اس وقت پر ہے جب کہ اس پر تیر چلایا گیا۔ اگر ایسے شخص پر وار کیا گیا جس کی جان واجب الحفظ نہ تھی یا غلامی میں آ جانے یا کافر ہو جانے کے

باعث وہ پورے طور پر محفوظ نہ تھا۔ لیکن زخم کے کاری ہونے سے پہلے وہ مسلمان ہو گیا یا غلام تھا آزاد کر دیا گیا تو مجرم مستوجب قصاص نہ ہو گا تاہم اگر کسی تحت تحفظ شخص کا مثلاً ہاتھ کاٹا گیا اور وہ دست بریدہ شخص مرتد ہو گیا اور اس زخم کے باعث حالت ارتداد میں مر گیا تو ہاتھ کاٹنے پر قصاص قطع کا مستوجب ہو گا۔ کیونکہ جرم سرزد ہونے کے وقت وہ تحت تحفظ تھا۔

دوہرے جرائم کے ارتکاب کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی نے غلطی سے ایک شخص کا ہاتھ کاٹا اور ہنوز وہ زخم اچھا نہ ہوا تھا کہ اسے عداً قتل کر دیا یا ایک بار تو عداً عضو کاٹا اور پھر دوسری بار غلطی سے قتل کر دیا۔ یا یہ ہوا کہ کسی کا ہاتھ غلطی سے کاٹ دیا اور زخم اچھا ہو گیا اور پھر غلطی سے قتل کر دیا یا ایک بار عداً ہاتھ کاٹا پھر ٹھیک ہو گیا اور دوسری بار پھر عداً قتل کر دیا، تو ان دونوں جرائم کا مواخذہ ایک ساتھ کیا جائے گا۔ اس مسئلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو جرم اول کی تکمیل کے لیے دونوں کو یکجا کر دینا واجب ہے۔ کیونکہ قتل بالعموم اپنے درپے ضربات سے واقع ہوتا ہے۔ اگر ہر جرم کو مستقل جرم قرار دیا جائے تو اس میں خرابی پیدا ہوگی۔ ہاں اگر جرائم ایسے ہیں کہ دونوں کو جمع کرنا ممکن نہیں ہے تو ہر ایک کو بجائے خود ایک جرم قرار دیا جائے گا۔

واضح ہو کہ مندرجہ بالا صورتوں میں جرائم کا جمع کرنا مشکل ہے۔ ابتدائی دو جرائم میں تو اس لیے کہ دونوں افعال نوعیت اور نتائج کے اعتبار سے باہم مختلف ہیں۔ ایک جرم غلطی سے اور دوسرا عداً سرزد ہوا۔ اسی طرح اخیر کے دو افعال کو بھی جمع کرنا دشوار ہے۔ کیونکہ دونوں جرائم کے درمیان، مجروح کا اچھا ہو جانا حائل ہو گیا پس ان کو قطعاً جمع نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ پہلا جرم (زخم کے اچھا ہو جانے کے بعد) ختم ہو گیا اور اس کا اثر باقی نہ رہا اس کے بعد جو قتل ہوا وہ نیا جرم ہوا۔ لہذا ان دونوں جرائم کو دو جرم تسلیم کیا جائے گا۔ پس اگر دونوں جرم ایک ہی نوعیت کے ہوں کہ دونوں جرم غلطی سے سرزد ہو گئے ہوں اور ان کے درمیان مجروح کی صحت یا بی حائل نہ ہو تو ان کا فیصلہ یکجائی طور پر کیا جائے گا کیونکہ ان میں جمع کرنا ممکن ہے۔ ان دونوں کی دیت (تاوان) ایک ہی کافی ہے اس لیے کہ دونوں کے جمع کرنے میں کوئی امر مانع مثلاً پہلے زخم کا آرام ہو جانا یا دوسرے زخم کی نوعیت کا پہلے سے مختلف ہونا موجود نہ ہو۔

اگر عداً ارتکاب کے لحاظ سے دونوں جرائم یکساں ہوں بایں طور کہ مثلاً ہاتھ عداً کاٹا اور ابھی وہ زخم اچھا نہ ہوا تھا کہ عداً قتل بھی کر دیا تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

امام ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں (مقتول کے) ولی کو اختیار ہے کہ وہ پہلے ہاتھ کاٹے اور پھر قتل کرے یا محض قتل پر اکتفا کرے۔

صاحبین کہتے ہیں کہ صرف قتل کیا جائے اور ہاتھ کاٹا جائے کیونکہ دونوں افعال کی نوعیت یکساں ہونے اور صحت کی مداخلت نہ ہونے کے باعث ان کو جمع کرنا ممکن ہے۔

ابو حنیفہ کا کہنا ہے کہ ان دونوں جرائم کا یکجائی تصفیہ ممکن نہیں ہے۔ اس کا سبب یا تو وہ اختلاف ہے جو ان دونوں کے افعال کی نوعیت میں ہے۔ قصاص کا انحصار اس امر پر ہے کہ محل جرم اور سزا میں یکسانیت کا لحاظ رکھا جائے۔ یعنی قتل کے

عوض قتل اور قطع کے عوض قطع ہو اور (جمع کرنے میں) یہ ممکن نہیں یا پھر اس لیے کہ فعل قطع کو جرم قرار دینا اس امر سے مانع ہے کہ اسے سرایت زخم سے تعبیر کیا جائے۔ چنانچہ اگر یہ افعال (یعنی قطع اور قتل) دو اشخاص سے سرزد ہوں تو کاٹنے والے پر قصاص عائد ہوگا اور یہ ایسا ہی ہے جیسے زخم اچھا ہو گیا ہو۔ (اس کے بعد قتل دوسرا جرم ہوگا) بخلاف اس صورت کے جب کہ عضو کاٹا اور اس کے سرایت کر جانے سے (بغیر قتل کے) موت واقع ہو گئی۔ اس صورت میں فعل جرم ایک ہی ہو گا اور بخلاف اس صورت کے جب کہ دو خطائیں ہوں۔ اس صورت میں خون بہا واجب ہوگا جو جان کے عوض ہے اور اس میں (جرم و سزائیں) مساوات ملحوظ نہیں رہتی۔

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ یہاں پر یہ بھی ہے کہ ہاتھ کاٹنے کا تاوان اسی حالت میں عائد ہوگا، جب کہ فعل جرم کی تکمیل ہو اور وہ یہی ہے کہ جو عضو کاٹا گیا اس کے زخم کا جسم میں سرایت کرنا ممکن نہ ہو۔ ایسی حالت میں عضو کامل اور جزو عضو کا تاوان یکجائی عائد ہوگا یعنی وہ تاوان جو کاٹنے کے وقت عائد ہوا اور اس صورت میں (کہ دونوں جرائم کی سزا یکجائی طور پر دی جائے ہاتھ کے تاوان کی تکرار ہوگی) کیونکہ پورے عضو کے تاوان میں جزو عضو کا تاوان شامل ہے اور تاوان کا بار بار عائد کرنا شریعت کے خلاف ہے۔ لہذا ان دونوں جرائم کو اکٹھا نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ قصاص کے طور پر ہاتھ کاٹنے اور قتل کرنے کی سزا کو اکٹھا کیا جاسکتا ہے کیونکہ قصاص کی بناء (جرم و سزائی) مساوات ہے اور ان دونوں کو یکجا کر کے ہی یہ مقصد پورا ہو سکتا ہے اس لیے کہ جرم عمد شدت اور سختی پر مبنی ہے۔ چنانچہ ایک شخص کے قتل کی پاداش میں دس اشخاص کو قتل کیا جاسکتا ہے اور جس طرح ارتکاب جرم ہوا سزائیں اس کا لحاظ رکھنا اس امر کا مقتضی ہے کہ سزائیں سختی کی جائے۔ لیکن جرم خطا بنیادی طور پر نرمی کا مقتضی ہے چنانچہ اگر قتل خطا متعدد اشخاص سے سرزد ہو تو ان سب کا خون بہا ایک ہی ہوگا۔ لہذا اس میں سختی سے کام لینا درست نہیں ہے۔

اگر ایک شخص نے کسی کو سو کوڑے مارے جن کی منجملہ نوے (۹۰) کوڑوں کا زخم اچھا ہو گیا لیکن دس کوڑے کھا کر مر گیا تو اس کا خون بہا ایک ہی ہوگا۔ کیونکہ جو زخم اچھے ہو گئے انھیں مستوجب تاوان قرار نہیں دیا جائے گا اگرچہ مستوجب تعزیر قرار دیا جائیگا۔ غرض اس صورت میں قابل لحاظ دس کوڑے ہیں (جن سے موت واقع ہوئی) یہی حکم امام ابو حنیفہ کے اصول کے مطابق ہر ایسے زخم کا ہے جو اچھا ہو جائے اور اس کا کوئی اثر باقی نہ رہے لیکن امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک ایسی صورتوں میں انصاف پر مبنی (یعنی جیسا ضرر پہنچا اس کے مطابق) فیصلہ کیا جائے گا اور امام محمد کے نزدیک معالج کی اجرت واجب ہوگی۔ اگر کسی نے ایک شخص کو سو (۱۰۰) کوڑے مارے اور اسے زخمی کر دیا اور اس کا اثر باقی رہا تو اس اثر کے پیش نظر منصفانہ فیصلہ ہوگا اور اس کا تاوان اس ضرر کے مطابق تجویز کیا جائے گا جو مجروح کی زندگی پر اثر انداز ہوا ہو گیا کہ وہ زخم مندمل نہیں ہوا اور گو وہ زخم موجود نہ ہو لیکن اس کا اثر باقی ہے۔ ہاں اگر ابتدا ہی سے کوئی زخم نہیں ہوا تو بالاتفاق کوئی تاوان عائد نہ ہوگا اور اگر زخم ہوا لیکن مندمل ہو گیا اور اس کا اثر باقی نہ رہا تب بھی امام ابو حنیفہ کی رائے کے مطابق یہی حکم ہے۔ کیونکہ اس سے ایک دھن کے سوا اور کچھ نہیں ہوا اور اس پر کوئی سزا عائد نہیں ہوتی اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کو کوئی مارے اور اس سے (پٹنے والے کو) تکلیف (دکھ) پہنچے۔

شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر کسی نے ایک شخص کا پہلے ہاتھ کاٹ دیا اور پھر اسے قتل کر دیا۔ ایسی صورت میں

پہلے مجرم کا ہاتھ کاٹا جائے پھر اسے بطور حد (سزائے شرعی) کے قتل کر دیا جائے تاکہ (جرم و سزا میں) مماثلت رہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”فمن اعتدى عليكم فاعتدوا عليه بمثل ما اعتدى عليكم“ (یعنی اگر تمہارے ساتھ کوئی چیرہ دستی کرے تو تم بھی اسی طرح کی سختی اس پر کرو)۔

اگر ایک شخص نے دوسرے شخص کا ہاتھ کاٹ دیا اور زخم سرایت کر جانے کے باعث وہ دست بریدہ شخص مر گیا۔ تو (اس جرم کی پاداش میں) پہلے مجرم کا ہاتھ کاٹا جائے۔ اگر مجرم زخم کے سرایت کر جانے کے باعث مر جائے تو فیہا کہ قصاص کا مقصد پورا ہو گیا اگر نہ مرے تو اسے قصاص کے طور پر قتل کر دیا جائے تاکہ (جرم و سزا میں) مماثلت ہو۔ ان اصحاب کا کہنا یہ بھی ہے کہ مقتول کے ولی کے لیے جائز ہے کہ وہ اس بات کا انتظار کرے کہ ہاتھ کاٹنے کی سزا پانے کے بعد مجرم مرتا ہے یا نہیں؟ اگر نہ مرے تو بعد میں اس کی گردن کاٹ سکتا ہے اور اسے یہ بھی جائز ہے کہ پہلے ہی اس کی گردن کاٹ دے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا۔ نیز یہ اصحاب کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے کسی انسان پر ایک ضرب لگائی اس کے بعد ایک اور شخص نے سو ضربیں لگائیں اور وہ شخص ایک سو ایک ضرب کھا کر مر گیا اور صورت حال یہ ہے کہ وہ ایک زخم جو پہلے شخص نے لگایا اور وہ سو (۱۰۰) زخم جو دوسرے نے لگائے ان دونوں میں سے اگر کوئی ساز ختم بھی لگتا تو مجروح مر جاتا تو اس صورت میں ایک زخم لگانے والا اور سو زخم لگانے والا دونوں قطعی طور پر مستوجب قصاص ہیں خواہ دونوں شریک قتل رہے ہوں یا نہ رہے ہوں۔ کیونکہ فی الواقع ایک زخم کاری لگانے والا متعدد وار کرنے والوں سے زیادہ خطرناک ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ان دونوں میں سے ہر ایک کا اقدام ایسا ہے کہ اگر جدا جدا ہوتا تو مجروح کی وفات نہ ہوتی لیکن قتل میں دونوں کو دخل ہے تو اس کا فیصلہ تفصیل کا محتاج ہے۔ اگر دونوں قتل کرنا ہی چاہتے تھے تو دونوں کو سزائے قتل ہوگی اگر دونوں شریک قتل نہیں تھے تو انھیں قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ خون بہا واجب ہوگا کیونکہ ان کا یہ اقدام شبہ عمد (یعنی قتل عمد کے مشابہ عمل) ہے۔ اگر ان دونوں میں سے ایک کا اقدام جراحت ایسا ہے کہ اس سے موت واقع ہو جاتی اور دوسرے کے اقدام سے موت نہ ہوتی تو ان میں سے ہر ایک کے لیے الگ الگ حکم ہے پہلا مجرم (جس کا وار ہلاک کرنے والا ہے) تو یقینی طور پر مستوجب قتل ہے اور دوسرا شخص بھی (جس کا زخم ہلاک کرنے والا نہیں ہے) قتل کیا جائے بشرطیکہ وہ بھی ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ قتل کرنا نہیں چاہتا تھا تو اسے سزائے قتل نہیں ملے گی۔ بلکہ اپنے حصہ کا خون بہا ادا کرنا ہوگا۔ اگر دونوں میں سے ایک کی ضرب خفیف ہے جسے قتل کرنے میں مطلقاً دخل نہیں ہے۔ مثلاً کپڑے کے پلو سے مارنا یا ہلکا سا تازیانہ لگانا تو اسے قصاص میں کوئی دخل نہیں ہے اور نہ تاوان واجب ہوگا۔ بلکہ وہ موت قدرتی موت متصور ہوگی۔ اگر دوسرے مجرم نے ایسا جرم کیا جو پہلے مجرم کے ظلم سے الگ تھلگ قسم کا ہے۔ مثلاً ایک نے ہاتھ یا پاؤں کاٹا اور دوسرے نے گردن کاٹ دی یا اس کے دو ٹکڑے کر دیئے تو پہلے شخص پر جراحت رسانی کی پاداش میں ہاتھ یا پاؤں کا قصاص عائد ہوگا۔ یا اسے تاوان دینا ہوگا اور دوسرا قاتل قرار پائے گا کیونکہ اس نے اپنے اقدام سے پہلے شخص کے جرم کو اپنے جرم سے بے تعلق کر دیا اور جان لے لی لہذا اس پر قصاص عائد ہو گا دوسرے پر نہ ہوگا۔

ان اصحاب کا کہنا یہ بھی ہے کہ اگر دو شخصوں سے یک جائی طور پر بیک وقت دو اقدامات ہرزاد ہوئے کہ وہ دونوں جان لیوا تھے، ہاں طور کہ ان دونوں اشخاص میں سے ہر ایک کی منفرد ایہ کوشش تھی کہ فلاں شخص کی جان لے لے اور

دونوں ہی قتل کرنے میں جلدی سے کام لے رہے تھے کہ گردن کاٹ دیں یا جسم کے دو ٹکڑے کر دیں یا جلدی کرنا نہ چاہتے ہوں مثلاً دو عضوؤں کا کاٹ دینا۔ اگر ان دونوں کے عمل سے موت واقع ہوگئی تو ان تمام مذکورہ صورتوں میں انہیں قاتل قرار دیا جائے گا اور دونوں مستوجب قصاص ہوں گے۔ اسی طرح اگر خون بہا واجب ہوا تو ان دونوں پر واجب ہوگا کیونکہ (وجوب قصاص یا دیت) کا سبب بننے میں دونوں شریک تھے، اگر یہ دونوں افعال ان سے ایک ساتھ بیک وقت سرزد نہیں ہوئے بلکہ یکے بعد دیگرے ہوئے ہوں مثلاً ایک شخص نے کسی کو حرکت مذبوحی میں ڈال دیا کہ نہ وہ دیکھ سکتا ہو نہ اپنی مرضی سے بول سکتا ہو نہ اپنے اختیار سے حرکت کر سکتا ہو اور ایک روز یا چند روز میں اس کی موت قطعی ہو، جسے حالت یاس کہتے ہیں اور جو (قاتل پر) قصاص کے واجب ہونے کی شرط ہے اور اس حال میں اسلام لانا یا مرتد ہونا صحیح نہیں ہے اور نہ اس سے کوئی معاملہ کیا جاسکتا ہے اور اس کا مال وجود الوقت و رثاء کو منتقل ہو جاتا ہے، بعد کے ورثاء کو نہیں ہوتا اور اس حالت میں کوئی قرابت دار وفات پا جائے تو وہ اس کا وارث نہیں ہوتا، بجز اس کے کہ وہ مسلسل زندہ رہے یعنی اگر اسی حالت میں چھوڑ دیا جائے تو وہ زندہ رہے۔ اس حالت مذبوحی کو پہنچ جانے کے بعد اگر کسی اور شخص نے اس مظلوم کے ساتھ جرم کیا (یعنی اسے قتل کر دیا) تو ایسی صورت میں پہلا مجرم (جس نے اسے اس حال تک پہنچایا) قطعی طور پر قاتل ہے بشرطیکہ اس نے عداً قتل کیا ہو اور اگر غلطی سے قتل ہوا تو خون بہا واجب ہوگا، کیونکہ اس نے اس بیچارے کو حالت مرگ تک پہنچا دیا۔ رہا دوسرا شخص سو اس کی سزا حاکم اپنی رائے کے مطابق مقرر کرے گا کیونکہ اس نے موت کی بے حرمتی کی، جیسے کوئی شخص کسی کے مرنے کے بعد اس کا عضو بدن کاٹ دے۔

اگر دوسرے شخص نے مجروح کے حالت مذبوحی (یا حالت یاس) پر پہنچنے سے پہلے ہی زخم لگانے کا جرم کیا، مثلاً ایک شخص نے کسی کو زخمی کیا یا اس کا کوئی عضو کاٹ دیا اس کے بعد دوسرا شخص آیا اور اس نے گردن کاٹ دی یا اس کے دو ٹکڑے کر دیے یا جان نکال دی تو یہ دوسرا شخص بالاتفاق قاتل قرار پائے گا اور مستوجب قصاص ہوگا کیونکہ زخم گو سرایت کر کے ہلاک کرتا ہے لیکن اگر (زخم کے بعد) گردن کاٹ دی جائے یا جسم کے دو ٹکڑے کر دیے جائیں تو اس موت کو اس زخم کے اثر سے بے تعلق تصور کیا جائے گا اور اس قتل کا ذمہ دار (پہلا زخم پہنچانے والے کو نہیں بلکہ) دوسرے شخص کو قرار دیا جائے گا قطع نظر اس کے کہ سابقہ زخم کے مندرجہ ہو جانے کی امید رہی ہو یا نہ رہی ہو یا دو ایک دن کے بعد اس کی ہلاکت متوقع ہو، کیونکہ اسے ایسی حالت میں بدستور زندہ تصور کیا جائے گا۔ چنانچہ امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وقت جب آگیا اور وہ خطرہ موت کی حالت میں تھے تو انھوں نے عہد لیے اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ان وعدوں کو جو ان کی زندگی میں کیا گیا تھا اور ان وصیتوں کو جو انھوں نے کی تھیں پورا کیا (یعنی انھیں زندہ تصور کیا گیا)۔ پس مجرم اول سے جس نے عضو کاٹنا قصاص قطع لیا جائے گا اور اس جرم کے عداً ہونے یا بغیر عداً سرزد ہونے پر جو تاوان عائد ہوتا ہے وہ ہوگا۔ اگر دوسرے مجرم کا فعل ایسا ہو جس سے موت نہیں ہوتی۔ مثلاً پہلے شخص نے پہنچوں سے ہاتھ کاٹا اور دوسرے نے کہنی تک کاٹ دیا اور مجروح دونوں زخموں مجموعی طور پر سرایت کرنے سے مرگیا تو ان دونوں مجرموں کو قاتل تصور کیا جائے گا جن کے زخموں کے نتیجہ میں اس شخص کی موت واقع ہوئی اور یہ نہیں کہا جائے گا کہ دوسرے شخص کے وار کرنے کے باعث پہلے زخم کے اثر سے موت بے تعلق ہے۔ کیونکہ یہ موت ان دونوں مجرموں کے ارتکاب جرم سے واقع

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ اگر کسی نے ایک مریض کو قتل کر دیا جو حالت نزع میں ہے یعنی اس کی زندگی ایسی ہے جیسے کسی مذبح کی تب بھی وہ قاتل مستوجب قصاص ہوگا، کیونکہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی موت کو تاخیر میں ڈال دے اور وہ بدستور زندہ رہے۔ غرض (اس حالت میں بھی) موت امر غیر یقینی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ موت کا وقت کون سا ہے؟

امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ اگر مریض سکرانہ موت کی حالت میں ہو اور موت کا تشخّص ہونے لگے تب بھی اس کو مردہ نہیں کہا جائے گا۔ ہر چند کہ یہ گمان کیا جاتا ہو کہ وہ زندگی سے منقطع ہو چکا ہے۔ ان اصحاب نے اس حالت کو موت سے مختلف سمجھا ہے اسے قطعی طور پر موت قرار نہیں دیا۔ کیونکہ بعض اوقات یہ گمان کیا جاتا ہے کہ کوئی شخص مر گیا لیکن وہ پھر شفا یاب ہو جاتا ہے بخلاف اس کے جسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا ہو یا اس کے زمرے میں ہو۔ پھر یہ بھی کہ اس حالت سے پہلے کوئی ایسا عمل جس پر قتل کا یا احکام قتل کا اطلاق ہوتا ہو (کہ زخم کو قتل تصور کر لیا جائے اور) دوسرے شخص کے عمل کو بے اثر مانا جائے۔

اگر ایک شخص نے کسی پر دو وار کئے ایک عدا اور دوسرا غلطی سے سرزد ہو گیا۔ اور ان دونوں کے اثر سے وہ مجروح ہو گیا تو اس پر قصاص عائد نہ ہوگا۔ کیونکہ (جن افعال سے موت واقع ہوئی) ان دونوں افعال کی نوعیت مختلف ہے ایک فعل عدا تھا اور دوسرا غلطی سے سرزد ہوا یہ دونوں اقدامات مختلف نوعیت کے ہیں یا یہ صورت ہو کہ کسی نے دو زخم لگائے، ایک زخم تو اس حالت میں جبکہ وہ غیر مضمون (دائرہ تحفظ سے خارج) تھا اور دوسرا اس وقت جبکہ وہ مضمون (دائرہ تحفظ کے اندر) تھا مثلاً کسی شخص نے ایک حربی یا مرتد یا اپنے غلام کو یا حملہ آور کو زخمی کیا۔ اس کے بعد اس حربی کو پناہ دی گئی، مرتد مسلمان ہو گیا۔ زخمی غلام آزاد کر دیا گیا یا وہ حملہ آور حیوان ہے انسان کی جون میں آ گیا اور اس کے بعد مجرم نے پھر زخم پہنچایا اور ان دونوں زخموں کی وجہ سے مجروح کی موت واقع ہو گئی تو ایسی صورت میں مجرم پر قصاص عائد نہ ہوگا یا یہ صورت ہو کہ کسی شخص کو بجا طور پر پاداش جراثحت میں یا سرقہ کی سزا میں زخمی کیا۔ اس کے بعد دشمنی کی بناء پر پھر اسے زخمی کیا گیا یا کسی حربی کو زخمی کیا پھر وہ مسلمان ہو گیا اور دوسری بار (بر بنائے عداوت) پھر زخمی کیا اور زخم کے سرایت کر جانے کے باعث وہ مر گیا تو ان حالات میں (زخمی کرنے والا) سزائے قتل کا مستوجب نہ ہوگا۔

واضح ہو کہ پہلی صورت میں جبکہ دو زخموں میں سے ایک تو دانستہ پہنچایا گیا اور دوسرا غلطی سے سرزد ہوا تو قصاص واجب نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ محض اس وجہ سے کہ عدا کسی فعل کا ارتکاب کیا، جان نہیں جایا کرتی لہذا عدا زخم پہنچانے پر (اگر احیاناً موت واقع ہو جائے) بھاری خون بہا کا نصف عائد ہوگا جو مجرم کے اپنے مال سے ادا کیا جائے۔ اور اگر غلطی سے زخم پہنچ گیا تو مجرم کے ذمہ داروں پر نصف خون بہا کا نصف عائد ہوگا۔ باقی صورتوں میں جبکہ مجروح کو حالت تحفظ اور حالت غیر تحفظ میں دو زخم لگائے گئے تو وہ صورت غالب ہوگی جس میں قصاص خون واجب نہیں ہوتا۔ البتہ وہ زخم جو مستوجب قصاص (یادیت) وغیرہ ہیں وہ ثابت ہوں۔ اگر دونوں زخموں میں سے کوئی زخم بے شعور نابالغ یا دائمی جنون زدہ نے اس شخص کے کہنے پر لگایا تب بھی قصاص واجب نہ ہوگا بلکہ قاتل کے ذمہ داروں پر نصف خون بہا عائد ہوگا کیونکہ نابالغ بچے یا جنون زدہ کا عدا ارتکاب جرم بھی نادانستہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ جنون زدہ کی حیثیت ایک آلہ کار کی سی ہے۔ اسے

مجرم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اگر مجروح نے اپنے زخم کا علاج کسی زہریلی دوا سے کیا اور فوری طور پر موت واقع ہو گئی مثلاً دوائی زہریلی تھی اور مجروح نے اس کو پی لیا یا زخم پر لگایا تو زخمی کرنے والے پر اس خون کا قصاص عائد نہ ہوگا کیونکہ مجروح نے خود کو اپنے ہاتھوں ہلاک کیا ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی نے اس کو زخمی کیا ہو اور پھر اس نے خود اپنے آپ کو ہلاک کر لیا ہو۔ البتہ اس نئے زخم کا تاوان جراحت رساں پر عائد ہوگا خواہ مجروح اس علاج کے زہریلے ہونے سے واقف ہو یا نہ ہو۔

اگر وہ زہریلی دوائی ایسی تھی جو بالعموم ہلاک نہیں کرتی تو اس سے علاج کرنے سے موت کے واقع ہو جانے پر شبہ عمد یعنی (قتل عمد کے مشابہ جرم) قرار پائے گا۔ لہذا جارج پر جان کا قصاص عائد نہ ہوگا اور مجروح شبہ قتل عمد کے مرتکب کا شریک کار متصور ہوگا۔ تاہم مجرم (زخمی کرنے والے) پر بھاری خون بہا کا نصف عائد ہوگا اور اس زخم کے مطابق اس عضو کا قصاص عائد ہوگا۔

اگر وہ دوا ایسی ہے جو بالعموم ہلاک کرنے کی خاصیت رکھتی ہے اور مجروح کو اس بات کا علم ہو تو دونوں طرح سے وہ جارج نفس (اس کی جان پر ظلم کرنے والے) کا شریک کار ہے اور قوی ترین مسلک کی رو سے جارج پر قصاص عائد ہوگا بایں لحاظ کہ مجروح کے عمل کو قتل عمد کی حیثیت میں رکھا جائے گا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ جرم خطا میں شریک ہے کیونکہ اس کا ارادہ علاج کا تھا لیکن علاج میں غلطی ہو گئی لہذا شریک کار پر کوئی قصاص عائد نہ ہوگا لیکن اگر مثلاً زہر سے اپنی جان ہلاک کرنے کا ارادہ کیا تا کہ اذیت سے نجات ہو تب تو قطعی طور پر وہ اپنے قاتل کا شریک کار ہے۔ تو جارج پر نہ قصاص عائد ہوگا نہ خون بہا اور اگر مجروح کو اس دوا میں زہر ہونے کا علم نہ ہو تو یقینی طور پر قصاص عائد نہ ہوگا کیونکہ وہ ایسے جرم میں شریک ہے جو غلطی سے سرزد ہوا۔

اگر زخمی شخص اپنے زخم میں کسی زندہ انسان کے گوشت کو سینے (اور موت واقع ہو جائے) اگرچہ بطور علاج کے ہو لیکن یہ جوڑ ایسا ہو جس سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس میں دو طریقوں سے قصاص عائد ہوگا۔ بخلاف اس کے اگر کسی زخم کو کسی مردہ شخص کے گوشت سے سیا تو اس کا اثر نہ کچھ اس پر ہوگا اور نہ کھال پر جیسا کہ پہلی صورت میں خیال کیا گیا کیونکہ اس سے ہلاک کرنے والی اذیت نہیں ہوتی تو زخم پہنچانے والے پر قصاص یا کھل خون بہا عائد ہوگا۔ اگر کسی اور شخص نے مجروح کی اجازت کے بغیر زخم کو سیا (اور موت واقع ہوئی) تو سینے والے اور زخمی کرنے والے دونوں سے قصاص لیا جائے گا۔ اگرچہ زخم سینے والا حاکم ہو کیونکہ اس نے بھی جارج کے ساتھ مل کر ظلم کیا۔ اگر اس زخم کا پیوند کوئی طبیب بچے یا جنون زدہ (کے علاج) کی خاطر لگائے (اور مجروح کی موت واقع ہو جائے) تو اس پر قصاص عائد نہ ہوگا بلکہ اس کے قرابت دار پر پورا خون بہا کا نصف عائد ہوگا۔ اور بقیہ نصف خون بہا زخمی کرنے والے کے مال سے واجب الوصول ہوگا۔ اگر زخمی خود یا کوئی اور شخص میت کے گوشت میں پیوند کا ارادہ کرے اور کسی زندہ انسان کے گوشت میں پیوند لگ جائے تو یہ فعل غلطی سے جرم سرزد ہو جانے والے کے شریک کار ہونے کے برابر ہے۔ اسی طرح اگر کھال کو سینے کا مقصد ہو اور عمل گوشت میں اثر انداز ہو جائے اور ہڈی سے گوشت جدا ہو جائے تو وہ ایسا ہی ہے جیسے (زندہ کے) گوشت میں پیوند لگانا جس کا سابقاً ذکر ہوا اور ایسی دوا کے استعمال سے جو مضر نہ ہو کچھ نہ ہوگا اور نہ زخم کو دیکھا جائے گا۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر چند اشخاص انفرادی طور پر قتل سے کم درجہ کی جراحت رسائی کا ارتکاب کریں اور ہر ایک

مجرم نے جہاں جہاں زخم لگایا ہے اس کا تعین کیا جاسکے اور ہر ایک نے جو اقدام کیا ہے وہ معلوم ہو تو ہر مجرم سے اس کے جرم کے مطابق قصاص (بدلہ) لیا جائے۔ اور اس میں مختلف اعضاء کے نرم یا سخت ہونے کو نظر انداز کر دیا جائے گا۔ اور اگر چند اشخاص نے یک جائی طور پر ارتکاب جرم کیا تو ہر ایک مجرم سے بلا امتیاز جراحت یک جائی طور پر قصاص لیا جائے گا جیسا کہ سزائے قتل میں ہوتا ہے کہ چند اشخاص مل کر جب ایک شخص کو قتل کر دیں تو ان سب کو قتل کیا جائے گا اگر یہ صورت ہو کہ یک جائی طور پر تو ضربات نہ لگائی گئی ہوں لیکن زخموں میں امتیاز نہ کیا جاسکے کہ (کون سا زخم کس نے لگایا؟) تو آیا ان تمام مجرموں پر تمام زخموں کا تاوان عائد ہوگا اور قصاص نہیں لیا جائے گا؟ یا ہر ایک سے تمام زخموں کا قصاص لیا جائے گا مثلاً تین اشخاص میں سے ایک نے کسی کی آنکھ پھوڑ دی دوسرے نے ہاتھ کاٹ دیا اور تیسرے نے پاؤں کاٹا اور یہ معلوم نہیں کہ آنکھ کس نے پھوڑی ہاتھ کس نے کاٹا اور پاؤں کس نے کاٹ دیا۔ ان سب میں اشتراک عمل نہ تھا تو ان تینوں سے آنکھ ہاتھ اور پاؤں کا قصاص لیا جانا چاہیے لیکن یہ دیکھنا ہوگا کہ یہ کہاں تک درست ہے جبکہ ان جرائم کا ارتکاب ہر ایک نے نہیں کیا۔ لہذا سب سے قوی طریق کار وہی ہے جو پہلے ذکر کیا گیا۔

واضح ہو کہ جان کا بدلہ جان لینے میں اعضاء جسم (ہاتھ پاؤں) کے کاٹنے کی سزا بھی شامل ہے۔ مثلاً کسی نے (پہلے) ہاتھ (ایک حصہ بدن) کاٹ دیا اور پھر قتل بھی کر دیا تو صرف سزائے قتل ہوگی لیکن سزائے قطع عضو اس میں اسی حالت میں شامل ہوگی جبکہ مجرم نے عداوت قتل کا ارادہ کیا ہو ورنہ عضو بدن کے کاٹنے کا تاوان عائد ہوگا اگر کسی شخص سے قطع عضو کا جرم غلطی سے سرزد ہو گیا اور پھر بخروج کو قتل کر دیا تو اس کی پاداش سزائے قصاص میں شامل نہ ہوگی۔ یہ اس صورت میں ہے جبکہ کٹا ہوا عضو مقتول کا ہوا اگر مقتول کے علاوہ کسی اور کا عضو بدن کاٹا ہے۔ مثلاً ایک شخص کا ہاتھ کاٹا دوسرے کی آنکھ نکالی اور تیسرے کو عداوت قتل کیا تو ان اعضاء جسم کی سزا جان کے قتل میں شامل ہے لہذا مجرم کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کہ اس کے بعد قتل کیا جائے۔

ان اصحاب کا کہنا ہے عضو مقتول کے کاٹنے کا جرم قتل کے جرم میں شامل اس حالت میں متصور ہوگا جبکہ مجرم نے مقتول کو مشکہ کرنے (یعنی اس کے ناک کان ہاتھ وغیرہ اعضاء کاٹنے) کا ارادہ نہ کیا ہو۔ لیکن اگر (قتل سے پہلے) مجرم کا ارادہ مقتول کو مشکہ کرنے کا رہا ہو تو پہلے مجرم سے قطع اعضاء کا قصاص لیا جائے اس کے بعد قتل کیا جائے۔ تاہم مقتول کے علاوہ کسی اور کے اعضاء کاٹنے کا جرم اس کے ارتکاب قتل کے جرم میں شامل متصور ہوگا۔ اگرچہ اس کا ارادہ مشکہ کرنے کا رہا ہو۔ اس بارے میں اہل مسلک کی قابل ترجیح رائے یہی ہے۔

ان اصحاب کا کہنا یہ بھی ہے کہ جس طرح اعضاء بدن کا قطع کرنا نفس کے جرم میں شامل ہے اسی طرح عداوت پورا ہاتھ کاٹنے کے جرم میں عداوت انگلیاں کاٹنے کا جرم شامل ہے (جو پہلے کاٹی گئیں) بشرطیکہ مشکہ کرنے کا ارادہ نہ ہو۔ اب خواہ مجرم نے اس شخص کا ہاتھ کاٹا ہو جس کی انگلیاں کاٹی ہیں یا کسی دوسرے شخص کی انگلیاں کاٹی ہوں۔ اگر کسی شخص کی انگلیاں قصداً کاٹ دیں پھر اس کی ہتھیلی بھی عداوت کاٹ دی تو مجرم کا ہاتھ پہنچوں سے کاٹ دیا جائے۔

اگر کسی نے ایک شخص کے پیر کی انگلیاں کاٹ دیں اور دوسرے شخص کا ہاتھ پہنچے سے اور تیسرے شخص کا ہاتھ کہنی

سے کاٹ دیا۔ تو ان سب جرائم کی پاداش میں اس کا ہاتھ کہنی سے کاٹ دیا جائے بشرطیکہ اس نے یہ حرکت مثلاً کرنے کے ارادہ سے نہ کی ہو۔ اگر مثلاً کرنے کی نیت سے اس نے یہ کام کئے تو یہ جرم سابقۃ الذکر دونوں مسائل کے زمرہ میں نہیں آتا لہذا پہلی صورت میں تو پہلے مجرم کی انگلیاں کاٹی جائیں اور اس کے بعد ہتھیلی کاٹی جائے اور دوسری صورت میں پہلے مجرم کی انگلیاں کاٹی جائیں پھر دوسرے جرم کی پاداش میں پہنچے تک ہاتھ کاٹا جائے اور پھر تیسرے جرم کی پاداش میں کہنی تک ہاتھ کاٹ دیا جائے تاکہ اس تکلیف کا مجرم کو احساس ہو جس میں اس نے دوسرے کو ڈالا اور اس لئے بھی کہ جرم و سزا میں یکسانیت ہو۔

ان اصحاب کا کہنا یہ بھی ہے کہ قتل جان کے علاوہ دوسرے جرائم کی سزائے قصاص میں کسی وجہ سے تاخیر کی جاسکتی ہے مثلاً سردی کی شدت یا گرمی کی حدت سے (سزایاب) مجرم کے مر جانے کا اندیشہ ہو کہ اگر وہ سزا سے مر جائے تو بغیر اس کے کہ جان کے معاوضہ میں ہو جان لینے کا الزام عائد ہوگا۔ اس خون کے علاوہ دوسرے جرائم قطع کا قصاص لینے میں اتنی تاخیر کی جائے کہ مجروح کا زخم اچھا ہو جائے کیونکہ اس امر کا احتمال ہے کہ مجروح کو زخم کے سرایت کر جانے کے باعث موت آجائے۔ اس صورت میں مجروح کے ورثاء اگر حلف اٹھالیں کہ موت اسی زخم سے ہوئی ہے (جو مجرم نے لگایا تھا) تو مجرم واجب القتل ہو جائے گا۔ (صرف قصاص جراحات پر اکتفا نہ ہوگا)۔ اب اگر عضو مقطوع کا زخم اچھا ہو جائے اور کوئی عیب (اس زخم کی وجہ سے) نہ رہ گیا ہو تو مجرم پر نہ تاوان عائد ہوگا نہ اس کی تنبیہ ضروری ہے کیونکہ شرعاً ایسے زخم کی کوئی حیثیت نہیں ہے (اور وہ نظر انداز کر دینے کے قابل ہے) لیکن اگر زخم کو آرام ہو جائے لیکن مجروح عیب دار ہو جائے تو اس قسم کے زخموں کو جاننے والے دو انصاف پسندوں سے فیصلہ کرانا واجب ہے۔ چنانچہ اگر بالفرض وہ مجروح مملوک (غلام) ہے اور صحت مند حالت میں دس (۱۰) کا تھا اور عیب دار ہو کر نو (۹) کا رہ گیا تو دونوں قیمتوں میں دسویں حصہ کا تفاوت ہو گیا لہذا رقم جرمانہ میں سے دسواں حصہ کم کر دیا جائے گا اور اسی نسبت سے مجرم پر خون بہا عائد ہوگا مثلاً (ہزار میں سے) سو دینار کم۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایسے حالات میں دو اصحاب سوچ سمجھ کر خود فیصلہ کر دیں کہ جس کے ساتھ جرم کیا گیا ہے اسے مجرم سے کس قدر تاوان لینے کا حق ہے؟

کیا مرد کے ہاتھ کاٹنے کے جرمانے کو عورت اپنا حق مہر قرار دے سکتی ہے؟

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک عورت نے کسی مرد کا ہاتھ کاٹ دیا اور اس جرم کے تاوان کے عوض (یعنی اسے مہر قرار دے کر) اس عورت سے شادی کر لی تو اس کی دو صورتیں ہوں گی یا تو وہ زخم محض زخم رہے گا یا جسم میں سرایت کر جائے گا پہلی صورت میں یہ معاملہ درست متصور ہوگا اور جرمانہ کی رقم مہر قرار پائے گی جس کی مقدار بالاتفاق پانچ ہزار درہم ہے۔ خواہ جرم قطع ید عدا ہوا ہو یا غلطی سے سرزد ہو گیا ہو اور خواہ یہ شادی محض ہاتھ کاٹنے کے عوض ہوئی ہو یا اس کے علاوہ جراحات رسانی کے نتیجہ کو بھی مہر قرار دیا ہو اس لئے کہ اگر زخم اچھا ہو گیا تو ظاہر ہے کہ اس پر جرمانہ ہوگا نہ کہ قصاص کیونکہ مرد اور عورت کے درمیان قطع عضو کا قصاص نہیں ہوتا اور تاوان ہی مہر بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر دوسری صورت ہو (یعنی زخم

بدن میں سرایت کر جائے) اور وہ مرد مر جائے تو اس صورت میں دیکھنا ہوگا کہ ہاتھ کاٹنے کا جرم غلطی سے سرزد ہو گیا یا عمدہ کیا گیا؟ پہلی (یعنی غلطی کی) صورت میں عورت مہر مثل کی حقدار ہوگی اور جرمانہ اس کے ذمہ دار قرائتی ادا کریں گے، اگر دوسری صورت (یعنی جرم عمدہ) ہے تب بھی امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وہ عورت مہر مثل کی حقدار ہوگی اور خون بہا عورت کے مال سے واجب الادا ہوگا۔ امام موصوف کے نزدیک چونکہ ہاتھ کاٹنے کے جرم سے درگزر کرنا قطع جرم کے نتیجہ سے درگزر کرنا نہیں ہے لہذا ہاتھ کے عوض شادی کرنا قطع ید سے عائد ہونے والی شے کے عوض شادی کرنا نہیں ہے لہذا وہ مال عورت کا مہر ہو سکتا ہے جو جرم قطع کی پاداش کے علاوہ ہو۔ پھر اگر قطع ید کا جرم عمدہ ہو تو وہ شادی عضو بدن کے قصاص کے عوض ہوگی اور چونکہ یہ مال نہیں ہے لہذا اسے مہر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بالخصوص اس صورت میں جبکہ سزائے قصاص ساقط ہوگئی ہو اب درآنحالیکہ قصاص نفاذ کے باوجود مہر بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو ساقط ہو جانے کے بعد بدرجہ اولیٰ مہر بننے کی صلاحیت نہیں رکھے گا۔ اور قصاص کا ساقط ہونا یا تو اس لئے ہے کہ عورت نے رشتہ ازدواج قبول کیا اور قصاص کے ساقط ہونے کی شرط ہی شادی کا قبول کرنا تھی۔ پس اگر عورت نے شادی قبول کرنی تو قصاص ساقط ہو گیا یا پھر اس لئے ہے کہ اس صورت میں مہر کی وصولیابی ممکن نہیں ہے، کیونکہ اگر قصاص کو مہر قرار دیا جائے تو گویا عورت خود معاوضہ خون کی وارث ٹھہری حالانکہ اسے خود کو اپنے آپ سے وصولیابی قصاص کا حق حاصل کرنا ممکن نہیں ہے اور جبکہ قصاص یا قصاص کے بدل کو مہر بنانا درست نہ ہوا اور شادی کے لئے مہر کا ادا کرنا واجب ہے تو مہر مثل اس مرد پر عائد ہوگا اور عورت کو اپنے مال سے خون بہا ادا کرنا ہوگا کیونکہ یہ شادی اگرچہ معافی پر مشتمل ہے۔ لیکن یہ معافی بصورت موجودہ جرم قطع کی ہے اور جبکہ زخم قطع بدن میں سرایت کر جائے (اور موت واقع ہو جائے) تو ظاہر ہے کہ یہ (ہاتھ کاٹنے کا جرم نہ رہا بلکہ) قتل نفس ہے اور اس کی معافی نہیں ہوتی بلکہ خون بہا واجب ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ خون بہا مجرمہ (عورت) کے مال سے واجب الادا ہوگا کیونکہ یہ قتل عمدہ ہے۔ اب درآنحالیکہ عورت مہر مثل کی حقدار ہے اور خود اس پر خون بہا عائد ہوتا ہے تو باہمی تصفیہ اس صورت میں ہو جائے گا جبکہ (خون بہا اور مہر دونوں کی) مقدار مساوی ہو اگر خون بہا کی مقدار (مہر سے) زیادہ ہو تو مرد کے ورثاء کو وہ زیادہ مقدار واپس کر دی جائے گی اور اگر مہر (خون بہا) سے زیادہ ہو تو مرد کے ورثاء اسی قدر عورت کو واپس کر دیں گے۔ اگر (مرد کا) ہاتھ (عورت کی) غلطی سے کٹ گیا تو یہ شادی جرم قطع کے جرمانہ کے عوض متصور ہوگی لیکن اگر ہاتھ کا زخم (جو غلطی سے ہوا) مرد کے جسم میں سرایت کر جائے (یعنی موت واقع ہو جائے) تو اب قطع ید کا جرمانہ مہر نہ رہے گا بلکہ مہر کی مقدار نامعلوم ہو جائے گی لہذا مہر مثل عائد ہو جائے گا۔ جیسے اس صورت میں ہوتا ہے جبکہ کوئی شخص یہ کہہ کر جو کچھ میری مٹھی میں ہے اس کے عوض شادی کرتا ہوں عقد کر لے اور مٹھی میں کچھ نہ ہو۔ پس اس صورت میں (مہر اور تادان) باہمی معاوضہ قرار نہیں پائیں گے کیونکہ قتل خطا میں خون بہا مجرم کے ذمہ دار قرابت داروں پر عائد ہوتا ہے اور مہر خود عورت کا حق ہوتا ہے (جو خاوند پر عائد ہوتا ہے)۔ پس اگر قطع عضو اور اس کے نتائج کے عوض (یعنی عورت کو اس کے تادان سے بری کرنے کے عوض یا جرم سے درگزر کرنے کے عوض یعنی اسے مہر قرار دے کر) شادی کی۔ لیکن اس (ارتکاب جرم) کے باعث مرد کو موت آگئی اور وہ ارتکاب عمدہ تھا تو اس صورت میں عورت کو مہر مثل کا حق ہے کیونکہ اب یہ شادی گویا قصاص (سے درگزر) کے عوض ہوئی اور قصاص مہر بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا لہذا مرد پر مہر مثل واجب ہوگا اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی

شخص شراب یا سوئے کے عوض (یعنی اسے مہر ٹھہرا کر) شادی کرے۔ صورت مذکورہ میں عورت کے ذمہ مرد کا کوئی حق نہ رہے گا کیونکہ جب مرد نے قصاص کو مہر قرار دے دیا تو گویا وہ قصاص سے دست بردار ہو گیا اور قصاص سرے سے ساقط ہو گیا جیسے اس صورت میں ساقط ہو جاتا ہے جبکہ قصاص کا مطالبہ مال کی شکل میں کیا جائے تو اس میں بھی قصاص سرے سے ساقط ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ جرم قتل غلطی سے سرزد ہوا ہے تو (مرد کے) ذمہ دار قرابتی کے مجموعی مال سے مہر مثل وصول کیا جائے گا کیونکہ گویا وہ مرد مرض الموت کا مریض ہے اور شادی کسی بنیادی مصلحت کی بناء پر کی گئی ہے اور مہر مثل میں زیادتی کا حق نہیں ہے۔ کیونکہ یہ حق باہمی رضا مندی سے عائد ہوتا ہے لہذا یہ وصیت ہے جو عورت کی طرف سے مرد کے رشتہ داروں پر عائد ہوتی ہے اور یہ ناممکن ہے کہ عورت کے جرم کا تاوان اس مرد کے قرابت داروں سے وصول کیا جائے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک مرد کو کسی عورت سے قصاص لینے کا حق ہو اور اس قصاص کے عوض (یعنی اسے مہر قرار دے کر) اس عورت سے شادی کر لے تو یہ نکاح اور وہ مہر درست ہوگا۔ نکاح کا درست ہونا تو ظاہر ہے کہ اس طرح نکاح کے تمام ارکان و شرائط (اجزائے داخلی و خارجی) پورے ہو جاتے ہیں رہا مہر سو وہ بھی پورا ہو گیا کیونکہ یہ معاوضہ مقرر ہو گیا۔ تاہم یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ مہر درست نہیں ہے۔ عورت کو مہر مثل ادا کرنا واجب ہے اور قصاص ساقط ہو جائے گا اس لئے کہ اسے مہر قرار دینے سے قصاص معاف ہو جاتا ہے وہ عورت (مرد کی بجائے) خود قصاص کی مالک ہو جاتی ہے۔ اگر رخصتی (مباشرت) سے پہلے وہ مرد عورت سے علیحدگی اختیار کر لے تو وہ مرد عورت کے جرم کی پاداش کے نصف تاوان کا حقدار ہوگا۔ کیونکہ وہ تاوان عقد شادی کا بدلہ ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی نے قرآن حکیم کی ایک سورۃ کے تعلیم دینے کے عوض شادی کی اور مباشرت سے پہلے طلاق دے دی تو وہ عورت سے نصف سورۃ کے تعلیم دینے کی اجرت واپس لے سکتا ہے ایک اور قول جو کتاب ”الام“ میں مذکور ہے وہ شخص اس صورت میں عورت سے نصف مہر مثل وصول کرنے کا حقدار ہے۔ یہی حکم اس صورت میں ہوگا جب کہ عورت سے قصاص لینا واجب ہو۔ اگر جرم کے عوض مال واجب ہو جیسے کسی عورت سے جرم خطا سرزد ہوا اور اس جرم خطا کے جرمانہ کے عوض نکاح کیا تو نکاح درست ہوگا لیکن مہر درست نہ ہوگا کیونکہ تاوان کی مقدار متعین نہیں ہے۔

احکام متعلقہ نفاذ قصاص کا بیان

شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ جو شخص مستوجب قصاص ہے اس کا خون ایسے شخص پر حرام ہے جو مطالبہ قصاص کا حقدار نہیں ہے یعنی حقدار کے علاوہ دوسرے تمام مسلمانوں پر (اس کا خون حرام ہے) چنانچہ اگر غیر مستحق نے ایسے شخص پر زیادتی کر کے اس کو ہلاک کر دیا تو اس سے قصاص لیا جائے گا چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب عزیز (قرآن) میں فرماتا ہے ”وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا فَقَدْ جَعَلْنَا لَوْلِيهِ سُلْطَانًا فَلَا يَسْرِفُ فِي الْقَتْلِ“ (بنی اسرائیل: ۳۳) (یعنی جس نے کسی کو ظلم سے قتل کیا تو اس مقتول کے وارث کو ہم نے قاتل پر بالادستی عطا فرمائی ہے لہذا چاہیے کہ قتل میں کوئی اپنے حد سے تجاوز نہ کرے) پس مجرم کو قتل کرنے کا اختیار مقتول کے ولی ہی کو ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ولی کے علاوہ کسی کو قاتل

پر غلبہ کرنے کا حق نہیں ہے۔ تاہم اس حکم سے وہ صورت مستثنیٰ ہے جب کہ مجرم کا قتل لازمی نہ ہوا ہو۔ پس اگر راہزنی کی پاداش میں قتل لازم ہو جائے تو صحیح یہ ہے کہ اس شخص کو بطور قصاص قتل کیا جائے۔ اب اگر قصاص کے مستحق نے اسے قتل کر دیا تو رہزن کے قاتل کو قتل نہیں کیا جائے گا۔

اگر شادی شدہ مسلمان کو جو زانی ہے کوئی ذمی قتل کر دے تو ذمی مستوجب قتل ہوگا۔ کیونکہ اس ذمی کو مسلمان پر بالادستی حاصل نہیں ہے اور در آنحالیکہ ذمی (غیر مسلم رعایا) کو اس کی پاداش میں قتل کیا جاتا ہے تو مرتد معاہدہ (دشمن کا آدمی جس سے معاہدہ ہوا ہو) اور مستامن (پناہ گیر) اگر قتل کر دے تو وہ بدرجہ اولیٰ سزائے قتل کا مستوجب ہوگا۔ لیکن اگر اس زانی کو ایسا شادی شدہ مسلمان قتل کر دے جو زانی نہ ہو تو بقول صحیح اسے سزائے قتل نہ ہوگی۔ کیونکہ اس نے اللہ کی مقررہ کردہ حد کو پورا کیا ہے اس بارے میں ایک دوسری رائے یہ ہے کہ اس شخص پر (جس نے زانی کو قتل کیا) سزائے قصاص عائد ہوگی کیونکہ سزائے جرم کا مکمل عملدرآمد امام (حاکم) کا کام ہے۔ لہذا یہ فعل ایسا ہوگا جیسے کسی مستوجب قصاص کو ایسے شخص نے قتل کر دیا جسے حق قصاص حاصل نہیں ہے۔

اول الذکر صورت میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ (مستوجب قتل کو) امام کے حکم سے پہلے ہی قتل کر دیا ہو یا حکم کے بعد کیا ہو اور خواہ جرم زنا شہادت سے ثابت ہو یا (ہنوز) نہ ہو ہو یا مجرم کو اقرار جرم سے مکر جانے سے پہلے ہی قتل کیا ہو یا بعد میں اگر شادی شدہ زانی کو اسی جیسے شخص نے قتل کر دیا تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔

تارک صلوٰۃ اگر حاکم کے حکم دینے پر عدا ترک صلوٰۃ کرتا ہے تو اس کا حکم بھی وہی ہے جو شادی شدہ زنا کار کا ہے۔ مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی مکلف (احکام شرعیہ کے ذمہ دار) شخص نے کسی معصوم کو ہلاک کر دیا تو اس کے خون کے حقدار (ولی) کو اس شخص سے قصاص لینا واجب ہے۔ کسی اور کو واجب نہیں ہے کیونکہ قاتل کا خون مالک قصاص کے علاوہ ہر شخص پر حرام ہے۔ چنانچہ اگر حقدار کے علاوہ کسی اور شخص نے معصوم کے قاتل کو قتل کر دیا تو اس سے قصاص لیا جائے گا۔ کیونکہ اس کا حق صرف ولی کو حاصل ہے تاہم ولی کو قصاص پر عملدرآمد کا حق حاصل نہیں ہے جب تک کہ امام وقت یا اس کا نائب اس کی اجازت نہ دے۔ اگر ولی حاکم کی اجازت کے بغیر قاتل سے خون کا قصاص لے لے تو اسے حاکم وقت کے اختیار میں مداخلت پر سزا دی جائے گی۔

علمائے مالکیہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر قاتل بالغ اور عاقل ہے تو قصاص واجب ہے اور معافی یا مصالحت کی صورت میں قصاص تو نہ لیا جائے گا۔ خواہ وہ مجرم مرد ہو یا عورت آزاد ہو یا غلام مسلمان ہو یا غیر مسلم تاہم سو کوڑوں کی سزا اور پورے ایک سال کی قید واجب ہے۔ البتہ جلاوطن نہیں کیا جائے گا اس امر میں اختلاف ہے کہ دونوں سزائوں میں سے پہلے کون سی سزا دی جائے کہا گیا ہے کہ تازیانے کی سزا پہلے ہوگی۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ پہلے قید کی سزا ہوگی۔ ان اصحاب نے غلام معصوم کے قتل کو اس حکم سے جدا نہیں رکھا۔ کیونکہ قتل میں سخت خرابی ہے۔

ان امور کا بیان جن سے جرم مستوجب قصاص ثابت ہوتا ہے

حنفیہ شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ قتل یا جراحات رسانی کا جرم مجرم کے اقرار کرنے یا دو اشخاص کی شہادت سے

ثابت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ (آیت متعلقہ میں) فرماتا ہے ”واستشهدوا شہیدین من رجالکم“ (البقرہ: ۲۸۲) (یعنی ثبوت جرم کے لئے اپنوں میں سے دو مردوں کو گواہ بناؤ) نیز ارشاد ہے ”واشہدوا ذوی عدل منکم“ (الطلاق: ۲) (یعنی تم اپنوں میں سے دو معتبر اشخاص کی گواہی لو) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”شاہداک او یمینہ“ (یعنی ثبوت مدعا کے لئے تمہارے لئے دو گواہ ہونے چاہیں یا مدعی علیہ قسم کھائے)۔ اور حدود و قصاص کے سلسلے میں عورتوں کی گواہی قابل قبول نہیں۔ امام زہری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور پہلے دو خلیفوں کے حوالے سے یہی لکھا ہے۔ ان اصحاب نے ان (ذرائع اثبات جرم) میں قاضی کے علم مدعا علیہ کے قسم سے اقرار کرنے اور مدعی کی قسم کو بھی شامل کیا ہے کہ ان سے بھی جرم ثابت ہو سکتا ہے اور قاتل غلطی سے جراحت رسانی کرنے والے یا جرم مشابہہ عہد پر مال (تاوان) واجب ہونا موقوف ہے مجرم کے اقرار یا دو قابل اعتبار اشخاص کی شہادت یا قاضی کے علم یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت یا ایک مرد اور مدعی کے قسم کھانے پر۔ دو عورتوں کی شہادت اور مدعی کے قسم کھالینے پر مال (یا تاوان) عائد نہیں ہوتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”فان لم یکون ارجلین فرجل وامراتن ممن ترضون من الشہداء“ (البقرہ: ۲۸۲) (یعنی اگر دو مرد گواہ دستیاب نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جن پر تمہیں اطمینان ہو شہادت دیں) یاد رہے کہ ایک مرد اور دو عورتوں کو چشم دید گواہی سے مال (تاوان) تو عائد ہو سکتا ہے لیکن ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت سے نہ قصاص کا دعویٰ ثابت ہوتا ہے نہ خون بہا عائد ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے لئے خصوصیت کے ساتھ مردوں کی شہادت درکار ہے۔ چنانچہ اگر مطالبہ قصاص کا حقدار مال حاصل کرنے کے لئے مطالبہ قصاص سے دست بردار ہو جائے اور ایک مرد اور دو عورتیں اس (دست برداری) کی شہادت دے دیں یا ایک شخص گواہی دے اور (مدعی) قسم کھائے تو اس کی بنا پر فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ مال (یا خون بہا) واجب ہونے سے پہلے وجوب قصاص کا ثابت ہونا ضروری ہے اور اس صورت میں وجوب قصاص ثابت نہیں ہوتا۔ لہذا لازم ہے کہ پہلے وجوب قصاص ثابت ہو (جس کے لئے دو مردوں کی گواہی لازم ہے) اس کے بعد معافی کی شہادت تسلیم کی جائے گی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس صورت میں اس شہادت کو تسلیم کیا جاسکتا ہے کیونکہ یہاں مالی معاملہ درپیش ہے اختلاف اس حالت میں ہوگا جب کہ وہ شخص پہلے دعویٰ قصاص کرے اور پھر معافی کی شہادت پیش کر دے۔

اگر ایک شخص کسی کے خلاف جرم عہد کے ارتکاب کا دعویٰ کرے اور اس کے لئے ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت پیش کر دے پھر مال کے عوض قصاص کو معاف کرنا چاہیے اور اس شہادت کی بناء پر (حاکم کے) حکم کا طالب ہو تو قطعاً اس کے حق میں فیصلہ نہ کیا جائے کیونکہ وہ شہادت اسی وقت ناقابل قبول تھی۔ اس پر عمل نہیں ہو سکتا۔ جیسے اس صورت میں جب کہ ایک نابالغ یا غلام شخص گواہی دے اور بعد میں وہ نابالغ بالغ ہو گیا یا وہ غلام آزاد ہو گیا (کیونکہ گواہی کے وقت اس کی شہادت ناقابل قبول تھی)۔

ان اصحاب کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر ایک مرد اور دو عورتیں کسی کا سر پھوٹنے کی بابت یہ شہادت دیں کہ سر کی ہڈی ٹوٹ گئی جو پہلے کھل گئی تھی تو اس گواہی کی بناء پر جرم مانہ عائد نہ ہوگا کیونکہ ہڈی کا ٹوٹ جانا اور اس کا دکھائی دینا دراصل ایک ہی جرم ہے جس پر قصاص عائد ہوتا ہے لہذا اس کے ثبوت کے لئے احتیاط سے کام لیا جائے گا اور یہ جرم پورے ثبوت

یعنی دو مردوں کی شہادت کے بغیر ثابت نہ ہوگا۔

صحت شہادت کے لئے جرم کی صراحت واجب ہے۔ لہذا اگر گواہ نے یوں کہا کہ مجرم نے فلاں شخص پر تلوار کا وار کیا اور وہ زخمی ہوا اور مر گیا تو اس سے اس کا دعویٰ قتل ثابت نہ ہوگا کیونکہ یہ احتمال ہے کہ اس کی موت (زخم کھانے کے بعد) کسی اور سبب سے واقع ہوئی ہو پس ثبوت قتل کے لئے گواہ کو یہ کہنا چاہیے کہ فلاں شخص اس تلوار کے زخم سے مر گیا۔ یا یوں کہے کہ اسے تلوار کا وار کر کے اس نے قتل کر دیا۔ یا ایسی ہی کوئی اور بات مثلاً یہ کہنا کہ اس نے ضرب لگائی اور وہیں اس نے جان دے دی۔ تاکہ (الزام جرم میں) کوئی شبہ نہ رہے۔

اگر گواہ نے کہا کہ مجرم نے فلاں شخص کے سر پر ضرب لگائی جس سے وہ لہو لہان ہو گیا یا مثلاً یہ کہا کہ سر پر چوٹ لگنے سے خون نہ نکلا تو اس سے قاتل کے فعل ضرب کا خون ریز ہونا ثابت ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے اگر کہا کہ (فلاں کے) خون نکل آیا تو قتل ثابت نہ ہوگا کیونکہ یہ احتمال ہے کہ خون بہنے کا کوئی اور سبب ہو۔

یہ اصحاب کہتے ہیں کہ کھلے ہوئے زخم کی شہادت میں گواہ کا یہ کہنا شرط ہے کہ اس شخص نے فلاں کو اس طرح زخم پہنچایا کہ سر کی ہڈی نظر آنے لگی اس طرح کہنے کے بعد مزید وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی۔

کہا جاتا ہے کہ (گواہ کا) یہ کہنا ہی کافی ہے کہ فلاں کا سر کھل گیا۔ گو اس میں ہڈی کے نمایاں ہونے کا ذکر نہ ہو۔ نیز گواہ پر واجب ہے کہ زخم کی جگہ اور اس کی پیمائش بتائے یا اشارہ کرے کہ اس کا حجم بیان کر دے۔ تاکہ (اسی طرح) قصاص لینا ممکن ہو۔

یہ تفصیل اس حالت میں ضروری ہے جب کہ سر کئی جگہ سے پھوٹا ہو۔ اگر ایک ہی جگہ سے سر پھوٹا ہے اور گواہ نے بتایا کہ فلاں کا سر کھل گیا تو اس سے قصاص عائد نہ ہوگا کیونکہ ممکن ہے کہ کوئی چھوٹا سا زخم ہو اور مجرم (کے عمل کے علاوہ) کسی اور طریقہ سے وہ زخم چوڑا ہو گیا ہو۔

ان اصحاب کا یہ بھی کہنا ہے کہ جادو کر کے ہلاک کرنے سے بھی قتل ثابت ہوتا ہے۔ بشرطیکہ جادو گراں کا اقرار کرے۔ اگر وہ کہے کہ میں نے فلاں شخص کو جادو کر کے قتل کر دیا اور وہ بالعموم اس طرح قتل کا مرتکب ہوتا رہا ہے تو یہ قتل عمد متصور ہوگا اور اس پر سزائے قصاص عائد ہوگی۔ اگر وہ کہتے ہیں کہ اس طرح شاذ و نادر ہی قتل ہوتا ہے تو یہ جرم شبہ عمد ہوگا اور اگر وہ کہے کہ میں نے اس کے نام میں غلطی کی ہے یعنی جادو سے کسی اور کو قتل کرنا چاہتا تھا تو یہ جرم قتل خطا متصور ہوگا اور ان دونوں صورتوں میں جادو گر کے مال سے خون بہا واجب ہوگا۔ اس کے قرابت داروں سے وصول نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ اس کے اقرار جرم سے ان پر ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔ البتہ قرابت دار اگر اس کی امداد کرنا چاہیں تو خون بہا ان پر عائد نہ ہوگا۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ قتل یا جراحات رسانی کا قصاص مجرم کے اقرار کرنے یا دو معتبر گواہوں کی شہادت سے عائد ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر وہ سزا جو مالی یا مال کی طرف منتقل ہونے والی نہ ہو اس کا ثبوت کافی نہیں ہے جب تک دو معتبر گواہوں کی شہادت نہ ہو ایسی صورتوں کی مثالیں (غلام کا) آزاد کرنا، قصاص کا معاف کرنا، شراب پینے کا الزام، تہمت، قتل اور جراحات رسانی وغیرہ ہیں۔

حاکم کے روبرو شہادت کے درست ہونے کی شرط یہ ہے کہ شاہد عادل (معتبر اور حق پسند) ہوں یعنی مسلمان۔ بالغ۔ عاقل ہوں بدکار نہ ہوں نا اہل معاملہ نہ ہو۔ بدعتی اور مکار نہ ہو بامروت ہو اور ناشائستہ باتوں مثلاً کبوتر بازی یا شطرنج سے محترز ہو اور گانا وغیرہ سننے سے بچتا ہو۔ بدکلام نہ ہو اور صغیرہ گناہوں سے کنارہ کش ہو۔ اندھے کا قول اور بہرے کی عقل تسلیم کی جائے گی۔ ان گواہوں کے قابل قبول ہونے کی شرط یہ ہے کہ ذہین ہوں اور جو بیان دے رہے ہوں وہ ان کے یقین کے مطابق ہو۔ ان پر غلط بیانی کا الزام نہ ہو۔

اگر دونوں گواہ شہادت دینے کے بعد فیصلہ ہونے سے پہلے اپنے بیان سے پھر جائیں تو ان کی گواہی رد کر دی جائے گی اور اس پر فیصلہ نہ ہوگا اور وہ مستوجب سزا ہوں گے۔ اگر فیصلہ ہونے اور سزائے قتل پر عمل درآمد کے بعد بیان سے پھرے ہوں تو ان کی گواہی کو باطل قرار نہ دیا جائے گا لیکن جس کے خلاف گواہی دی ہے اس کی دیت ادا کرنے کی ذمہ داری ان پر ڈالی جائے گی اور ان کے مال سے تاوان یا قصاص کے عوض خون بہا ان پر عائد ہوگا۔

اشتبہ کا کہنا ہے کہ اگر (شہادت کی بناء پر) فیصلہ ہونے کے بعد گواہ اپنے بیان سے پھرے ہیں تو ان سے قصاص لیا جائے گا کیونکہ بلاشبہ ان ہی کی وجہ سے ایک شخص کی جان گئی۔ پس انہیں قتل کر دیا جائے۔

اگر (شہادت پر) فیصلہ ہوا اور ہنوز قتل قطع یا مستوجب حد جرم کی سزا پر مکمل عہد درآمد نہ ہوا تھا کہ گواہوں کی غلط بیانی ثابت ہوگئی تو سابقہ فیصلہ کا عدم قرار دیا جائے گا۔ اگر گواہوں کا جھوٹا ہونا حاکم کو بدوران شہادت پایہ ثبوت کو پہنچ گیا باوجود اس کے حاکم نے گواہوں کے جھوٹے بیان پر ہی فیصلہ دے دیا۔ خواہ فیصلہ قتل کا ہو یا قصاص کا یا خون بہا کا اور خود حاکم اس جرم میں شریک رہا ہو یا نہ رہا ہو بہر حال اس حاکم سے قصاص لیا جائے گا اور حاکم کو خود اپنے مال سے قرائتی کے مال سے نہیں خون بہا ادا کرنا ہوگا۔ لیکن اگر گواہوں کا جھوٹ حاکم کو (ذاتی طور پر) معلوم نہ ہوا ہو۔ تو اس پر کوئی الزام نہ ہوگا اگر گواہوں کے بدخواہوں سے اسے علم ہوا ہو۔

ان اصحاب کا کہنا یہ بھی ہے کہ 'قسامہ' (ورثائے مقتول کے حلفیہ بیان) جس پر قتل عمد میں قصاص اور قتل خطاء میں خون بہا واجب ہوتا ہے۔ آزاد مسلمان کو سزائے قتل ہوگی خواہ وہ بالغ ہو یا نابالغ اور وہ قتل جراحات رسانی سے ہوا ہو یا مارنے سے یا زہر خورانی سے۔ یہ سزا "لوٹ" کی بناء پر ہوگی۔ "لوٹ" سے مراد ایسی بات ہے جس سے یہ گمان غالب پیدا ہو کہ مجرم نے ارتکاب قتل کیا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے دو معتبر اشخاص یہ گواہی دیں کہ فلاں آزاد مسلمان اور بالغ شخص نے (ان کے سامنے) کہا ہے کہ فلاں شخص نے مجھے قتل کیا ہے یا زخمی کیا یا مارا ہے اور اس کا نام بھی بتایا ہو۔ خواہ وہ مجرم آزاد ہو یا غلام بالغ ہو یا لڑکا مرد ہو یا عورت یا یوں کہا ہو کہ میرا خون فلاں شخص (کی گردن) پر ہے۔ قلع نظر اس کے کہ اس مسلمان نے یہ کہا ہو کہ فلاں شخص نے عمداً مجھے قتل کیا یا غلطی سے قتل کیا۔ عمداً قتل کی صورت میں قسامہ (وارث مقتول کے حلفیہ بیان) پر وہ شخص مجرم مستوجب قصاص ہوگا اور جرم خطا کی صورت میں اس پر تاوان لاگو ہوگا۔ اگر وہ شخص جس نے کہا کہ "فلاں نے مجھے قتل کیا" اپنے وقت کے عادل اور پاکباز ترین شخص کے نزدیک بدکار ہو تب بھی ورثائے مقتول کے قسم کھانے پر مجرم کو سزائے قتل ہوگی۔

اگر بیٹا اپنے باپ کے خلاف دعویٰ کرے کہ اس کے باپ نے اسے ذبح کیا یا اس کا پیٹ پھاڑا ہے یا اس پر لوہے کے ہتھیار سے بہ ارادہ قتل حملہ کیا ہے تو اس کے ورثاء سے قسم لی جائے گی اور اس کے باپ سے پورا خون بہا وصول کیا جائیگا۔ اگر مقتول نے (مرنے سے پہلے) صراحت کے ساتھ یہ نہیں بتایا کہ مجرم نے عداوت کا قتل کیا یا غلطی سے سرزد ہو گیا۔ تو اس کا ولی بتا سکتا ہے کہ وہ قتل عمد تھا یا قتل خطا تھا اور اپنے بیان پر حلف اٹھائے گا۔ اگر ورثاء یہ کہیں کہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ قتل عمد تھا یا قتل خطا تھا تو 'قسامہ' بیکار ہوگا اور اگر ورثاء یہ نہ بتا سکیں کہ کس نے قتل کیا؟ یا ان کے بیان میں اختلاف ہو۔ کوئی کہے کہ "عدا قتل کیا" اور کوئی کہے کہ "یہ نہیں معلوم کہ قتل عمد تھا یا قتل خطا" تو وہ خون کا عدم متصور ہوگا کیونکہ ورثاء مقتول اس پر متفق نہیں ہیں کہ وہ قتل عمد تھا تا کہ قصاص کے حقدار ہوتے اور نہ اس پر اتفاق ہے کہ وہ قتل کس نے کیا تا کہ وہ قسامہ کر سکتے (یعنی قسم کھاتے) یا پھر (قسامہ سے ثبوت جرم اس طرح ہو سکتا ہے کہ) دو معتبر اشخاص چوٹ لگنے یا زخم کی آنکھوں دیکھی شہادت دیں کہ جرم غلطی سے سرزد ہوا یا عداوت کا قتل ہو جب کہ مضروب کی موت تاخیر سے ہوئی ہو اگر موت میں دیر نہ ہوئی ہو تو ورثاء مقتول قسامہ کے بغیر ہی خون یا خون بہا کے حقدار ہوں گے کیونکہ قتل کی چشم دید شہادت موجود ہے۔ غرض ورثاء مقتول مجرم کی لگائی ہوئی اس ضرب یا زخم کے بارے میں قسم کھائیں گے کہ وہ موت اسی ضرب سے واقع ہوئی اور اسی وجہ سے مقتول کی وفات ہوئی یا پھر چشم دید معتبر شہادت ہو کہ وہ ضرب یا جراحت عداوتی یا غلطی سے سرزد ہوئی خواہ موت تاخیر سے ہوئی ہو یا تاخیر سے نہ ہوئی ہو۔

(قسامہ میں) مقتول کے ورثاء پچاس بار قسم کھا کر کہیں گے کہ (فلاں شخص نے جو) زخمی کیا یا مارا تھا اسی سے موت واقع ہوئی ہے۔ یا پھر کوئی معتبر شخص گواہی دے کہ مقتول جو ایک آزاد مسلمان اور بالغ و عاقل تھا اس نے بتایا ہے کہ فلاں شخص نے مجھے عدا یا غلطی سے مارا یا زخمی کیا۔ ایسی شہادت وقوع قتل کے لئے 'لوٹ' ہے (یعنی اس سے وقوع قتل کے ثبوت کا گمان غالب ہوتا ہے) اس پر مقتول کے ورثاء پچاس بار قسم کھائیں گے کہ اسے قتل کیا ہے یا کوئی معتبر گواہ اس بات کا ہو کہ اس نے مقتول کو خون میں لوٹا دیکھا اور جس پر الزام قتل ہے وہ اس کے پاس تھا اور اقدام جرم کی نشانی اس کے ساتھ تھی مثلاً آلہ قتل خون آلود اس کے ہاتھ تھا۔ یا (یوں بیان دے کہ) قاتل مقتول کے گھر سے نکلا اور اس وقت (قاتل کے سوا) کوئی اور اس گھر میں نہ تھا۔ ایسی صورت میں اس معتبر شخص کی یہ شہادت ارتکاب جرم کے ثبوت کو 'لوٹ' (باعث تقویت) ہے۔ لہذا ورثاء حلف اٹھالیں تو وہ مطالبہ قصاص یا خون بہا کے حقدار ہوں گے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر مقتول کا کوئی وارث خواہ فاسق ہو یہ اقرار کرے کہ کسی وارث نے قصاص کو معاف کر دیا ہے خواہ اس کا نام لیا ہو یا نہ لیا ہو تو قصاص ساقط ہو جائے گا۔ کیونکہ قصاص کے اجزاء نہیں کئے جاسکتے (کہ ایک حصہ قصاص کا معاف ہو جائے باقی کا حصہ بدستور رہے) پس اگر اس نے اپنا حق قصاص معاف کرنے کا اقرار کر لیا ہے تو دوسرے ورثاء کا حق بھی جاتا رہا بخلاف خون بہا کے کہ وہ (ایک کے معاف کرنے سے سب کا حق) ساقط نہیں ہوتا اگر معاف کرنے والے کی تعیین نہیں کی تو تمام وارثوں کے خون بہا (سے حصہ) ملے گا۔ اگر وہ قسم کھالے کہ اس نے معاف نہیں کیا تو اس کی بات تسلیم کی جائے گی۔ اگر کسی وارث نے بلا معاوضہ یا مطلقاً معاف کرنے کا اقرار کیا تو خون بہا سے صرف اس کا حق۔

ساقط ہو جائے گا اور باقی حقداروں کو ان کا حصہ ملے گا۔

واضح ہو کہ کسی وارث کے حق قصاص کی معافی ثابت کرنے کے لئے وارث کے اپنے حصے کی معافی کے لئے نہیں۔ دو معتبر گواہوں کی شہادت لازم ہے کیونکہ قصاص کا حق مال کا حق نہیں ہے (جو دلیل ناقص سے بھی ثابت ہو جاتا ہے) اور جو شے ناقص دلیل سے نہیں ہوتی اس کے ساقط ہونے کا فیصلہ بھی (ناقص دلیل سے) نہیں ہوتا چنانچہ خون بہا میں سے کسی کے حصے کی معافی کا ثبوت ناقص دلیل سے ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت سے یا ایک مرد کی شہادت اور قسم سے۔ اس سے مالی مطالبہ ثابت ہو جاتا ہے اور اس طرح مطالبہ ساقط بھی ہو جاتا ہے۔

معلوم ہو کہ شافیہ نے ورثائے مقتول میں سے کسی کی معافی کے سلسلے میں جو اس کے لئے اقرار (یعنی اعتراف) کا لفظ استعمال کیا ہے اس سے 'شہادت' (یعنی گواہی) کی صورت خارج ہے۔ پس اگر وارثوں میں سے کوئی فاسق ہو اور یا قصاص کے معاف کرنے والے کا تعین نہ کرے تو وہ اقرار کی مانند ہے۔ لیکن اگر وارث معتبر آدمی ہو اور مجرم کے دعویٰ معافی کے بعد ایک خاص معافی دینے والے کی بابت یہ شہادت دے کہ فلاں شخص نے قصاص اور خون بہا سب کچھ معاف کر دیا تو اس کی یہ گواہی صرف خون بہا کے حق میں قبول کر لی جائے گی اور اس کے لئے مجرم بتا سید شاہد قسم کھا سکتا ہے کہ معاف کرنے والے سے (اپنا حق) خون بہا معاف کر دیا ہے لیکن کلیتہً خون بہا اور قصاص کی معافی کے لئے قسم نہیں کھا سکتا کیونکہ قصاص اقرار سے ساقط ہوا اور خون بہا میں سے صرف معاف کرنے والے کا حصہ ساقط ہوا۔ اگر شاہد نے صرف خون بہا کے معاف کرنے کی گواہی (کسی وارث کی بابت) دی تو گواہی دینے والے کا حق قصاص ساقط نہ ہوگا۔

اگر دونوں گواہ وقوعہ قتل کے بارے میں مختلف بیان دیں۔ مثلاً ایک نے کہا کہ قتل رات کو ہوا اور دوسرے نے کہا کہ دن میں ہوا یا وقوعہ کی جگہ میں اختلاف ہو کہ ایک نے کہا کہ اسے مسجد میں قتل کیا اور دوسرے نے بتایا کہ گھر میں قتل ہوا یا آلہ قتل میں اختلاف ہو ایک نے کہا کہ تلوار سے قتل ہوا دوسرے نے کہا کہ نیزہ مارا یا پھر قتل کرنے کی کیفیت میں اختلاف ہو ایک نے کہا کہ گردن کاٹی اور دوسرے نے بتایا کہ دو ٹکڑے کر دیئے تو ان تمام صورتوں میں ان کی گواہی کا لعدم ہو جائے گی اور اس میں کوئی 'لوٹ' (ثبوت قتل کا گمان) نہیں ہے کیونکہ ایک گواہ کے بیان کو دوسرے گواہ نے توڑ دیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ گواہیاں 'لوٹ' (وقوع جرم کے ثبوت کے لئے گمان غالب کا ذریعہ) ہیں۔ لہذا مقتول کے ولی کو قسم دلائی جائے گی اور خون بہا (مجرم پر) عائد ہو جائے گا کیونکہ دونوں گواہ اصل معاملہ قتل کے بارے میں متفق ہیں۔ اختلاف کیفیت قتل میں ہے۔ جس میں غلطی یا بھول ہو سکتی ہے۔

اگر کہا جائے کہ صورت سابقہ میں کسی ایک گواہ کی تائید میں ولی کی قسم پر کیوں نہ فیصلہ کیا جائے یا اس کا بدل لیا جائے جیسا کہ سرفہ میں ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قسامہ کا معاملہ یعنی ورثاء کے قسم کھا لینے پر قصاص کے حق میں فیصلہ دینا (اہم بات ہے۔ اس وجہ سے) قسامہ میں) متعدد بار قسم دلائی جاتی ہے۔

مندرجہ بالا مسائل کا تعلق مجرم کے عمل کی بابت شہادت سے ہے۔ اگر اس کے اقرار جرم کے وقت یا جگہ کے بارے میں گواہوں کے درمیان اختلاف ہو تو اس سے کچھ نہیں ہوتا کیونکہ بہر حال وقوعہ قتل اور کیفیت قتل کے بارے میں

کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف جب ہوتا کہ اس کے اقرار کے بارے میں ہو۔ ہاں: اگر دونوں گواہوں نے مجرم کے اقرار کرنے کی جگہ میں اختلاف کیا اور دونوں نے جو مقامات بتائے ان میں باہم اتفاقا صلہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک گواہ دوسرے گواہ کی بتائی ہوئی جگہ پر بیک وقت موجود نہیں ہو سکتا مثلاً ایک گواہ نے بتایا کہ مجرم نے مکہ میں قتل کرنے کا اقرار کیا اور دوسرے نے بیان کیا کہ مجرم نے اسی تاریخ کو مصر میں قتل کرنے کا اقرار کیا تو یہ شہادت لغو متصور ہوگی اور اسے تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر مقتول کے دو بیٹے ہیں ایک موجود ہے اور دوسرا غیر حاضر ہے۔ موجود الوقت بیٹے نے قتل کی شہادت پیش کر دی اس کے بعد دوسرا بیٹا جو موجود نہ تھا آگیا اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اسے لازم ہے کہ دوبارہ شہادت پیش کرے۔ کیونکہ موجود الوقت (ولی) کو پورا قصاص لینے کا حق ہے اور یہ بھی ہے کہ قصاص لینے کا حق بطور خلافت کے حاصل ہوتا ہے بطور وراثت کے نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ (مقتول کے) قصاص کا اختیار اس کی موت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اور خود متوفی اس کا اہل نہیں ہوتا۔ بخلاف قرض (واجب الوصول) اور دیت کے کہ متوفی کو (وفات کے بعد بھی) مال کی ملکیت حاصل ہوتی ہے چنانچہ اگر مثلاً کسی شخص نے اپنے حین حیات جال بچھایا اور اس کی وفات کے بعد اس جال میں شکار پھنس گیا تو متوفی کو اس شکار کی ملکیت حاصل ہوگی اور جبکہ ملکیت حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہو کہ پہلے ملکیت ثابت کی جائے تو حقداروں میں سے کوئی ایک باقی حقداروں کی طرف سے دعویٰ کر نہیں ہو سکتا۔ لہذا دوسرے (بیٹے) کے واپس آنے پر قتل کا گواہ پھر پیش کیا جائے تاکہ محروم الحق ہونے سے بچا جائے۔

صاحبین کہتے ہیں کہ غیر موجود الوقت بیٹے کے آجانے پر دوبارہ گواہی پیش کرنا ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ مورث (مقتول) کو مکمل قصاص کا حق ہے۔ لہذا قصاص کا بھی وہی طریقہ ہے جو وراثت کا ہے جیسے قرض (واجب الوصول) میں ہوتا ہے۔ یہ صورت (قصاص) جان کا معاوضہ ہے لہذا جو شخص بھی اس معاوضہ کا حقدار ہے وہ اس کا مالک ہے جیسا کہ تاوان میں ہوتا ہے۔ پس قصاص جب مال کی صورت میں منتقل ہو گیا تو میت کو اس کی ملکیت حاصل ہوگئی۔ چنانچہ اگر زخم کھانے کے بعد موت سے پہلے اس نے قصاص معاف کر دیا ہو تو اس کی ملکیت جاتی رہتی ہے۔ لہذا وارثوں میں سے ایک شخص باقی ورثاء کی طرف سے دعویٰ کر ہو سکتا ہے۔ پس دوسرا بیٹا واپس آنے کے بعد دوبارہ قتل کی گواہی پیش نہیں کرے گا۔ اگر وہ قتل غلطی سے سرزد ہوا اور (مقتول کا) غیر موجود الوقت بیٹا واپس آیا تو بالاتفاق دوبارہ ثبوت قتل پیش کرنا واجب نہ ہوگا۔ اگر قاتل ایسی گواہی پیش کر دے کہ غیر موجود الوقت بیٹے نے قصاص کو معاف کر دیا ہے تو قصاص خون کا موجودہ حقدار اس کا فریق مخالف ہو جائے گا اور قصاص ساقط ہو جائے گا کیونکہ مجرم نے موجود الوقت حقدار کے خلاف قصاص کا حق ساقط ہونے اور مال واجب ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور چونکہ اس کا ثابت کرنا ممکن نہ تھا جب تک کہ اس بیٹے کا جو موجود نہیں ہے معاف کرنا پایہ ثبوت کو نہ پہنچے۔ پس موجود الوقت بیٹا غیر موجود بیٹے کا فریق متصور ہوگا۔ اسی طرح اگر ایک غلام کے دو (آقا) ہوں اور اس غلام کو عداً قتل کر دیا جائے اور دونوں میں سے ایک مالک موجود نہ ہو تو اس کا بھی یہی حال ہوگا۔

اگر (مقتول کے) ورثاء کی تعداد تین ہو اور ان میں سے دو نے دعویٰ کیا کہ دوسرے نے اپنا حق معاف کر دیا

ہے تو ان دونوں کی گواہی باطل ہوگی اور تیسرے کو ان سے جدا تصور کیا جائے گا اور ان دونوں کو ان کی شہادت کی بناء پر ”مفت بری“ یعنی قصاص کو مال میں تبدیل کرنے کا مجرم قرار دیا جائے گا۔ اگر (مجرم) قاتل ان دونوں کے بیان کو سچ ثابت کر دے تو ان تینوں کو خون بہا ملے گا۔ کیونکہ ایک کی تصدیق دونوں کے حق میں دو تہائی خون بہا کا اقرار ہے اور اس کا یہ اقرار درست ہوگا۔ لیکن یہ اس کا حق باطل کرنے کا دعویٰ ہے جس کے خلاف شہادت دی گئی ہے اور وہ شخص انکار کرتا ہے تو وہ دعویٰ تسلیم نہیں کیا جائے گا اور اس کا حصہ (مجرم کے ذمہ) واجب الادا رہے گا۔ لیکن اگر قاتل نے ان دونوں ورثاء کے بیان کی تکذیب کی تو ان دونوں کو کچھ نہیں ملے گا اور تیسرے وارث کو جو موجود نہیں ہے ایک تہائی تاوان ملے گا کیونکہ ان دونوں نے اپنے حق قصاص کے ساقط ہو جانے کا اقرار کر لیا وہ تسلیم کر لیا اور اپنے حصے کے قصاص کو مال میں منتقل کرنے کا دعویٰ بلا دلیل تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ جس کے بارے میں (معافی کی) شہادت دی ہے اس کا حق قصاص مالی مطالبہ (دیت) میں منتقل ہو جائے گا۔ کیونکہ ان دونوں نے اس شخص کی بابت دعویٰ کیا ہے کہ اس نے معاف کر دیا حالانکہ وہ انکار کرتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے انہوں نے اس کے حق میں پہلے ہی دست برداری کا اقرار کر لیا۔ کیونکہ قصاص کا ساقط کرنا ان دونوں کی طرف سے منسوب ہے۔ اگر وہ جس کے خلاف انہوں نے گواہی دی (معافی قصاص کے بارے میں) ان دونوں کی تصدیق کرے تو مجرم اس ایک تہائی تاوان ادا کرنے کا ذمہ دار ہوگا کیونکہ اس نے اس کا اقرار کر لیا ہے۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ اگر گواہوں نے یہ شہادت دی کہ فلاں شخص نے کسی کو مارا اور وہ زخمی ہو کر بستر مرگ پر پڑا رہا یہاں تک کہ مر گیا تو مجرم پر قصاص عائد ہوگا بشرطیکہ اس نے عداوت کا بقتل کیا ہو کیونکہ جو امر گواہوں کی شہادت سے ثابت ہو وہ چشم دید واقعہ کی مانند ہے۔ اور اس صورت میں بھی قصاص عائد ہوگا جبکہ شاہدوں نے یہ گواہی دی ہو کہ اس نے فلاں شخص پر زخم کرنے والے آلے سے عداوت کیا۔ قتل عداوت کا سچا ہونا اسی طرح ثابت ہو سکتا ہے۔ ضرب سے موت واقع ہونے کی پہچان یہ ہے کہ چوٹ کھانے کے بعد مقتول بستر پر پڑا رہے یہاں تک کہ وہ مر جائے۔

اگر قتل کے دونوں گواہوں کے بیانات میں وقوعہ والے دن کے تعین میں اختلاف ہو کہ ایک گواہ کہے کہ قتل ہفتہ والے دن ہوا اور دوسرا کہے کہ وہ دن جمعرات کا تھا۔ یا وقوعہ والے شہر کے بارے میں اختلاف ہو کہ ایک گواہ کہے کہ مکہ میں قتل ہوا اور دوسرا کہے کہ یہ قتل کوفہ میں ہوا یا آکہ قتل میں اختلاف ہو ایک کہے کہ تلوار سے قتل کیا اور دوسرا کہے کہ لاشی سے مارا تو یہ گواہی باطل ہوگی اور اس کی بناء پر کوئی فیصلہ نہ کیا جائے گا کیونکہ قتل ایسا جرم نہیں ہے جس کا اعادہ کیا جاسکے یہ بار بار نہیں ہو سکتا۔ پس وہ قتل جو ایک وقت میں یا ایک جگہ پر واقع ہو وہ اس قتل سے مختلف ہے جو دوسرے وقت میں یا دوسری جگہ پر واقع ہو۔ اسی طرح لاشی سے جو قتل ہو وہ ہتھیار کا قتل نہیں ہے کیونکہ ثانی الذکر بالاتفاق عمدہ ہے اور اول الذکر شبہ عمدہ ہے۔ ان دونوں سے متعلق احکامات مختلف ہیں پھر اس طرح ہر قتل کی شہادت ایک ہوگی (یہ دو شہادتیں نہ سمجھی جائیں گی) اسی طرح اگر دو گواہوں میں سے ایک نے قتل مطلق کی شہادت دی (یعنی اس میں اوزار وغیرہ کی قید نہیں ہے) تو مجرم کے مال میں سے خون بہا واجب ہوگا۔ اور اگر لاشی سے قتل ہونا بتایا تو مجرم کے قرابت دار پر دیت واجب ہوگی لہذا یہ شہادت باطل ہو جائے گی کیونکہ (دونوں بیانات میں سے ایک میں لاشی کی قید ہے اور دوسرے میں کوئی قید نہیں) مطلق قتل کا ذکر

ہے) اور جو بیان مطلق ہے اور بیان مقید سے مختلف ہوتا ہے۔ بیان مطلق میں مجرم کے مال سے دیت واجب ہوتی ہے اور جس بیان میں لاشی کی قید ہے اس میں خون بہا عاقلہ (تاوان کے ذمہ دار قرائتی) پر عائد ہوتا ہے۔

ان اصحاب کا کہنا یہ بھی ہے کہ اگر دونوں نے شہادت دی کہ فلاں شخص کو قتل کیا گیا لیکن انہوں نے کہا کہ ہمیں نہیں معلوم کہ کس شے سے قتل کیا گیا تو اس صورت میں استحسانا (بہتر سمجھ کر) خون بہا عائد ہوگا۔ اور قرین عقل یہ ہے کہ یہ گواہی قبول نہ کی جائے کیونکہ آگے قتل کے مختلف ہونے سے جرم قتل کی نوعیت مختلف ہو جاتی ہے اور گواہوں کو اس کا علم نہ ہو تو گواہی باطل ہو جاتی ہے کیونکہ گواہوں کا یہ کہنا کہ ہمیں معلوم نہیں کہ کس چیز سے قتل کیا گیا؟ یا تو سچ ہے یا جھوٹ ہے۔ اس کے بین بین کوئی امر نہیں ہو سکتا۔ دونوں صورتوں میں ایسی گواہیوں کو رد کر دینا واجب ہے۔ کیونکہ اگر ان کی بات سچ مان لی جائے تو فیصلہ دشوار ہوگا اس لئے کہ تلوار یا لاشی کے استعمال سے عائد ہونے والی سزائیں مختلف ہیں (ایک سے خون اور دوسرے سے دیت واجب ہوتی ہے) اور اگر وہ جھوٹے ہیں تب بھی یہی صورت ہے کہ فیصلہ دشوار ہے کیونکہ گواہ فاسق ٹھہرے (اور فاسق کی گواہی ناقابل تسلیم ہے)۔

اس میں استحسان (بہتری) کی صورت یہ ہے کہ گواہوں نے قتل مطلق کی گواہی تو دے دی اور مطلق کو مجمل (غیر واضح) نہیں کہا جاسکتا ایسی صورت میں یہ گواہی کم سے کم الزام یعنی دیت (تاوان) کا موجب ہو سکتی ہے پھر ایک خیال یہ بھی ہے کہ گواہوں کو یہ معلوم ہو کہ قتل تلوار سے ہوا لیکن انہوں نے یہ جو کہا کہ ہمیں معلوم یہ قاتل کے جرم پر پردہ ڈالنے اور اس کی زندگی کو بچانے میں بہتری سمجھ کر کہا اور اس کذب بیانی کو اللہ کے نزدیک قابل معافی تصور کیا کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے ”لیس کذاب من یصلح بین اثین“ (یعنی ایسے جھوٹ سے جس کی غرض دو آدمیوں کے درمیان آشتی پیدا کرنا ہو ایک شخص کو جھوٹا قرار نہیں دیا جائے گا) پس اس طرح ہر جھوٹ کی توجیہ کرنے والے کو فاسق نہیں کہا جاسکتا اور ان کی گواہی قبول کر لی جائے گی اس احتمال کی بناء پر گواہ کے بیان میں تضاد نہیں مانا جائے گا اور مجرم کے مال میں سے خون بہا واجب ہوگا چونکہ اس ارتکاب میں اصل شے مجرم کا عمد (ارادہ) ہوتا ہے لہذا یہ دیت عاقلہ (مجرم کے صلی قرابت دار) پر عائد نہ ہوگی۔

اگر دو اشخاص میں سے ہر ایک نے یہ اقرار کر لیا کہ اس نے فلاں شخص کو قتل کیا ہے اور مقتول کا ولی کہے کہ تم دونوں نے مل کر قتل کیا ہے کہ تو ولی کو حق ہے کہ دونوں کو قتل کرے اگر کچھ لوگوں نے ایک شخص کے بارے میں شہادت دی کہ اس نے فلاں شخص کو قتل کیا اور کچھ نے ایک اور شخص کے بارے میں شہادت دی کہ اس نے قتل کیا اور ولی مقتول کہے کہ تم دونوں نے قتل کیا تو یہ ساری شہادت باطل ہو جائے گی ان میں فرق یہ ہے کہ اقرار اور شہادت میں سے ہر ایک سے مکمل قتل اور قصاص واجب ہوتا ہے ان دونوں کی تکذیب کی گئی البتہ جن امور کا اقرار کیا گیا ہے اگر ان امور میں سے کسی کی تکذیب کی جائے تو اس سے باقی امور کا اقرار باطل نہیں ہوتا لیکن گواہ جن امور کی گواہی دے اگر ان میں سے بعض باتوں کو جھٹلا دیا جائے تو وہ شہادت بالکل ہی باطل ہو جاتی ہے کیونکہ جھوٹ بولنے سے وہ شخص فاسق قرار پاتا ہے اور فاسق کی شہادت ناقابل قبول ہوتی ہے۔

گواہوں کی شہادت کا بیان

ائمہ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی وارث اپنے مورث کے زخمی ہونے کی گواہی دے اور ہنوز زخم اچھا نہ ہوا ہو تو اس کی گواہی قبول نہ کی جائے کیونکہ اگر اس کا مورث (اس زخم سے) مر جائے تو (وارث) گواہ اس کے جرم نامہ کا حقدار ہوگا۔ لہذا وہ گواہی اس کے اپنے حق میں ہوگی اور شرعاً ایسی شہادت قابل قبول نہیں ہے۔ تاہم ان اصحاب کا کہنا ہے کہ اگر وہ زخمی مقروض ہو اور اس کا ترکہ ادائیگی قرض کے لئے کافی ہو تو (وارث کی) شہادت قبول کی جائے گی کیونکہ اس گواہی سے خود اسے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا، لیکن یہ خیال محتاج نظر ہے، کیونکہ مورث کے مقروض ہونے سے کوئی شخص وراثت سے محروم نہیں ہو جاتا اور بسا اوقات ترکہ سے قرضہ ادا ہی ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ مورث کے کسی مخفی مال کا اسے پتہ لگ جائے۔

امام رافعی کہتے ہیں کہ وارثوں کا گواہوں کے صالح ہونے کی گواہیاں دینا بھی ایسا ہی ہے جو جراحۃ رسائی کی گواہی کا ہے۔

وارث کی گواہی کا مطلب ایسے وارث کی گواہی ہے جو مورث کی جڑ یا شاخ (یعنی آباء و اجداد اور اولاد و احفاد میں سے نہ ہوں) کیونکہ ان کی گواہی تو سرے ہی سے ناقابل قبول ہے کیونکہ وہ مورث کے جزو ہوتے ہیں ان اصحاب کا کہنا ہے کہ اگر وارث اپنے مورث کے حق میں جو مرض الموت میں مبتلا ہو کسی مال کا حقدار ہونے کی گواہی دے تو بقول صحیح اکثر علماء کے نزدیک وہ گواہی قابل قبول ہوگی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جراحۃ رسائی کی گواہی کی طرح اس گواہی کو بھی قبول نہیں کیا جائے گا، لیکن دونوں میں یہ فرق بتایا گیا ہے کہ اگر گواہوں نے (مریض) مورث کے حق میں کسی مال کے حقدار ہونے کی گواہی دی تو اس کے ثبوت ہونے سے سردست گواہوں کو کچھ فائدہ نہیں ہے، کیونکہ اس کی گواہی سے تو اس شخص کا مالک مال ہونا ثابت ہوگا جس کے حق میں گواہی دی ہے اور وہ حقدار خود اس مال کو اپنے حسب منشاء اپنی خواہشات کے مطابق صرف میں لائے گا۔ اگر اس کے برعکس اگر زخم کی گواہی دی تو اس کے ثابت ہو جانے پر اس کا تاوان (انجام کار) وارث گواہوں ہی کو مل جائے گا، کیونکہ تاوان واجب الوصول (مخرج کی) وفات سے پہلے واجب الادا نہیں ہوتا بلکہ وفات کے بعد وارثوں کو ملتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ فرق بھی بتایا گیا ہے کہ زخم (جس کی گواہی وارث نے دی) موت کا سبب ہے جس سے (ن) دیت (وارث کو) منتقل ہوتا ہے۔ پس اگر وارثوں نے زخم کے ثبوت میں شہادت دی تو گویا اس سبب کی گواہی دی جس سے ان کا حق ثابت ہوتا ہے لہذا یہ صورت مال کی گواہی سے مختلف ہے۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ اگر عاقلہ (مجرم کے ذمہ دار قراہتی) قتل خطا یا قتل عضونا دانستہ یا قتل مشابہ بہ عمد کی گواہوں کے فاسق (یعنی ناقابل اعتبار) ہونے کی گواہی دیں جس کے تاوان کے بوقت شہادت وہ ذمہ دار ہیں تو وہ تسبیہ نہیں کی جائے گی، کیونکہ اس طرح وہ اپنے آپ کو تاوان سے بچانے کے لئے ہوگی، لیکن اگر وہ گواہی کے وقت اس تاوان کے ذمہ دار نہیں تھے تو اب دیکھنا ہوگا کہ اگر یہ رشتہ دار محتاج ہیں تو ان کا بیان رد کر دیا جائے گا یا اگر وہ دور کے رشتہ دار ہیں اور قریبی رشتہ داروں میں ایسے اشخاص ہیں جو واجبات ادا کر سکتے ہیں تو ان کی گواہی قبول کی جائے گی ان میں فرق یہ ہے،

کہ مال آنی جانی چیز ہے اور صاحب مال اس سے محروم نہیں ہے لہذا اس میں احتمال تہمت کا ہے (کہ محتاج عاقلہ نے اپنا مال بچانے کیلئے گواہی کو ناقابل اعتبار بنانا چاہا) اور دور کے رشتہ دار کی موت ایسی ہے جیسے معاملات سے الگ تھلگ ہو لہذا ایسے معاملات سے تہمت نہیں لگتی بخلاف اس کے اگر (مقتول کے) رشتہ دار قتل عمد کے یا اقراری ملزم قتل کے گواہوں کے فاسق ہونے کی بابت شہادت دیں تو وہ شہادت قابل تسلیم ہوگی، کیونکہ اس میں تہمت کا الزام نہیں ہے۔

واضح ہو کہ ان اصحاب کا کہنا ہے کہ شہادت کے درست ہونے کی شرط یہ ہے کہ ایک دوسرے کے بیان کو جھٹلایا نہ گیا ہو۔ پس اگر دو گواہوں نے دو اشخاص کے خلاف ایک شخص کو قتل کرنے کی گواہی دی اور جن کے خلاف گواہی دی گئی انہوں نے ان گواہوں کے خلاف یا کسی اور کے خلاف قتل میں پیش دستی کی شہادت دی تو ایسی حالت میں اگر ولی نے پہلے گواہوں کو تسلیم کر لیا تو اس کے بموجب فیصلہ کیا جائے گا کیونکہ ان کی گواہی میں تہمت کا احتمال نہیں ہے۔ ان کے خلاف دوسروں نے جو گواہی دی وہ کالعدم قرار پائے گی، کیونکہ وہ سابقہ گواہوں کے الزام قتل سے خود کو بچانا چاہتے ہیں لہذا خود کو بچانے کی غرض سے جو شہادت ہو اس میں اس تہمت کا احتمال ہے، اگر ولی (مقتول) نے بعد کے دو گواہوں کو سچا مانا یا سب کی گواہی کو جھٹلادیا تو دونوں گواہیاں ان مسائل کی تینوں صورتوں میں باطل متصور ہوں گی، پہلی گواہی تو اس لئے کہ بعد کے گواہوں کی تصدیق سابقہ گواہوں کی تکذیب ہے اور پہلے گواہوں سے پچھلے گواہوں کی عداوت ہے دوسری گواہی کی صورت میں بھی ایک فریق کی تصدیق دوسرے فریق کی تکذیب ہے تیسری گواہی کا باطل ہونا ظاہر ہے کہ اس میں دونوں فریقوں کی تکذیب ہے۔

ان اصحاب کا کہنا یہ بھی ہے کہ اگر وارثوں میں سے کوئی وارث۔ گو فاسق ہو۔ اگر کسی ایک وارث کی بابت مجرم کے معاف کر دینے کا اقرار کرے خواہ اس معاف کرنے والے کی تعیین کی ہو یا نہ کی ہو تو قصاص (کلیتہ) باطل ہو جائے گا کیونکہ قصاص ایسی شے نہیں ہے جس کے حصے کئے جاسکیں (یعنی کچھ حصہ قصاص کا معاف کیا جائے اور کچھ قصاص لے لیا جائے)۔ پس اگر کوئی اپنے حق کو ساقط کرنے کا اعلان کرے تو دوسروں کا حق قصاص طلبی ساقط ہو جائے گا۔ البتہ دیت بدستور باقی رہے گی اور ساقط نہ ہوگی، گو معاف کرنے والے کا تعیین نہ کیا گیا ہو لہذا مال دیت (تاوان) تمام وارثوں میں تقسیم کیا جائے گا، اگر معاف کرنے والے کی تعیین کی گئی لیکن وہ معافی سے انکار کر دے تب بھی دیت ساقط نہ ہوگی، اگر اس شخص نے معاف نہیں کیا تھا تو اس کے قسم کھالینے پر اس کی بات تسلیم کر لی جائے گی، اگر کسی نے بلا معاوضہ یا مطلقاً (غیر مشروط) دیت سے معافی دے دی تو صرف معاف کرنے والے کا حصہ ساقط ہو جائے گا باقی در ثاء کو دیت میں سے ان کا حصہ ملے گا۔

مقتول کا کوئی وارث اگر قصاص کو معاف کرے تو اس معافی کو ثابت کرنے کے لئے اپنے حصہ کی دیت معاف کرنے کے لئے۔ دو معتبر گواہوں کی شہادت درکار ہوگی، کیونکہ قصاص کا مطالبہ مالی مطالبہ نہیں ہے، یاد رہے کہ جو حکم ناقص دلیل کی بناء پر عائد نہیں ہوتا اس کے ساقط ہونے کا فیصلہ بھی ناقص دلیل کی بناء پر نہیں ہوتا، کسی وارث کا اس کے حصہ کی دیت کی معافی کا ثبوت ناقص دلیل سے یعنی ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی سے یا ایک شخص کی گواہی اور قسم کھالینے سے بھی ہو جاتا، کیونکہ یہ مالی حق کا معاملہ ہے جو اس طرح ثابت ہو جاتا ہے اور اسی طرح (ناقص گواہی) سے یہ مطالبہ ساقط

اعضائے انسانی کو نقصان پہنچانے کا بیان

واضح ہو کہ شریعت اسلامیہ نے جرائم متعلقہ اعضائے بدن مثلاً ہاتھ، ناک، دانت وغیرہ کی سزا کے لئے بھی طریق قصاص رکھا ہے۔ یعنی مجرم کو اس کے جرم کے موافق اسی طرح کی سزا دی جائے۔ اس کے لئے شرط یہ ہے کہ دونوں کے اعضاء ایک جیسے ہوں۔ چنانچہ تندرست آنکھ کے عوض اندھی آنکھ کو نہیں پھوڑا جائے گا اسی طرح بولنے والی زبان کے عوض گونگے کی زبان نہیں کاٹی جائے گی اور نہ لٹے ہاتھ کے عوض کام بھی ہو سکتا ہے۔

اگر کوئی وارث جو فاسق ہو کسی اور وارث کے بارے میں معافی قصاص کی شہادت دے یا گواہ نے معاف کرنے والے کی تعیین نہ کی ہو تو اسے اقرار معافی تصور کیا جائے گا، اگر گواہی دینے والا معتبر شخص ہو اور اس نے معاف کرنے والے کی تعیین کر دی اور بتایا کہ فلاں شخص نے قصاص اور دیت سب کچھ معاف کر دیا تو مجرم کے دعویٰ کرنے پر اس شخص کی گواہی کو (صرف) دیت سے معافی کے بارے میں قبول کیا جائے گا اور مجرم گواہ کے ساتھ قسم کھائے گا کہ معاف کرنے والے نے دیت کو معاف کر دیا ہے، دیت اور قصاص دونوں کو معاف نہیں کیا، قصاص اقرار معافی کے بعد ساقط ہو گیا اور دیت میں سے صرف معاف کرنے والے کا حصہ ساقط ہوا، اور اگر صرف دیت کے معاف کرنے کی گواہی دی ہے تو دیت ساقط ہو جائے گی گواہ کا حق قصاص ثابت نہ ہوگا۔

اگر ثبوت قصاص کے گواہ اپنے بیان سے پھر جائیں تو وہ ادائے دیت کے ضامن ہوں گے، لیکن ان پر قصاص عائد نہ ہوگا، کیونکہ ان کا شریک قتل ہونا ثابت نہیں ہے اور (قتل کا) سبب بننے سے قصاص عائد نہیں ہوتا جیسے کنواں کھودنا (کہ اگر اس کنوئیں میں گر کر کوئی ہلاک ہو جائے تو کنواں کھودنے والے کو قاتل تصور نہیں کیا جائے گا) بخلاف اس صورت کے جبکہ کسی کو جبراً ہلاکت میں ڈالا جائے، کیونکہ ایک بیچارہ انسان ہلاکت میں پڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے لہذا اس جبر کا اثر اس کی زندگی پر پڑتا ہے، یہی حال ولی کا ہے (اسے مجبور نہیں کیا جاسکتا) اسے (معافی کا) اختیار ہے اور اختیار کو ذریعہ جرم نہیں بنایا جاسکتا، اور جنب قصاص نہ ہو تو خون بہا واجب ہوتا ہے، کیونکہ قتل ناحق کی صورت میں دو باتوں میں سے ایک ضرور عائد ہوتی ہے (یعنی قصاص یا دیت)۔

اگر دو گواہ قصاص کے معاف کر دینے کی گواہی دیں اور پھر اس سے پھر جائیں تو ان پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوگی کیونکہ قصاص مالی معاملہ نہیں ہے۔

ان اصحاب کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر ثبوت 'شاخ' کے گواہ منحرف ہو جائیں تو (ادائے تاوان کے) ذمہ دار ہوں گے کیونکہ اختلاف کو ان ہی کی طرف منسوب کیا جائے گا۔ یہی وہ اشخاص ہیں جنہوں نے قاضی (حاکم شرع) کو فیصلہ قصاص پر آمادہ کیا اور اگر ثبوت اصل کے گواہ منحرف ہو جائیں اور یہ کہیں کہ ہم نے ثبوت فرع کے حق میں گواہی نہیں دی تو وہ تاوان کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ کیونکہ وہ (تاوان کے عائد ہونے کا) سبب بننے سے انکاری ہیں اور قاضی کا فیصلہ بحال رہے گا کیونکہ یہ اطلاع مشتبہ ہے۔

اگر لوگ کہیں کہ ہم نے فلاں شخص کو گواہ بنانے میں غلطی کی تو ان پر کوئی تاوان عائد نہ ہوگا کیونکہ جو فیصلہ صادر

کرنے والے ہاتھ کو کاٹا جائے گا۔ یہی طریق کار اور صورتوں میں بھی ہوگا جس کی تفصیل اپنی جگہ پر آرہی ہے۔ (۱)

ہوا ہے وہ ایسی دلیل کی بناء پر ہے جس نے اس فیصلہ کو بیکار بنادیا۔ یعنی فروع کی شہادت لہذا (اس نقصان کو) انہیں کی طرف منسوب کیا جائے گا۔

۱۔ چاروں ائمہ فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ جس نے کسی زندہ انسان کو ضرر پہنچایا اس پر پورا تاوان عائد ہوگا چنانچہ ناک کی نرم کھال جو ملائم ہوتی ہے اور وہاں ہڈی نہیں ہوتی جسے ناک کا بانسہ کہتے ہیں اس کے عوض پوری ناک کا تاوان عائد ہوگا یہ حصہ چہرہ کی خوبصورتی کا باعث بھی ہے اور کارآمد بھی ہے۔ اس کے دو حصے ہوتے ہیں جن کو ناک کے نتھنے کہا جاتا ہے جن کے درمیان سخت کھال کا ایک پردہ حائل ہوتا ہے اور اس کے تاوان میں یہ پورا مجموعہ شامل ہوتا ہے۔ لہذا (اسکے اتلاف پر) ایک تاوان سے زیادہ کا مطالبہ عائد نہ ہوگا کیونکہ (بحیثیت مجموعی) یہ ایک ہی عضو ہے اور زبان کاٹ دینے کے جرم پر تاوان عائد ہونے کا سبب یہ ہے کہ اس سے زبان کا مقصد یعنی گویائی جاتی رہتی ہے۔ خواہ وہ زبان ہیکلے کی ہو جو ہکلا کر بولتا ہے یا گونگے کی ہو یا توتلے کی جس کا شین قاف درست نہیں ہوتا یا بچے کی زبان ہو جو بات نہیں کر سکتا۔ علاوہ اس کے زبان ایک حسین اور کارآمد شے ہے جس میں اظہار حال اور بیان مافی الضمیر کی قوت ہے اور انسان کو جانوروں سے ممتاز کرتی ہے۔ اس کے تین فائدے ہیں گفتگو ذائقہ کھانے میں سہولت اور لقموں کو (منہ میں) پھرانا تاکہ اچھی طرح چبایا جاسکے۔ پس زبان کے تلف ہونے پر پوری دیت واجب ہوگی۔ اسی طرح اگر زبان کو باقی رکھتے ہوئے قوت گویائی کو تلف کیا جائے تب بھی مکمل دیت عائد ہوگی۔

کہا جاتا ہے کہ ننھے بچے کی زبان کاٹنے کے جرم کا تاوان اس حالت میں عائد ہوگا جبکہ اس میں گویائی کی قوت ظاہر ہو۔ کہ وہ رونے کے لئے یا چھاتی سے دودھ چوسنے کے لئے زبان کو ہلا سکتا ہو زبان کے صحیح ہونے کی یہ نمایاں علامات ہیں۔ اگر یہ علامات ظاہر نہ ہوں تو حاکم کی اپنی رائے پر انحصار ہوگا کیونکہ زبان کا صحیح ہونا یقینی طور پر معلوم نہیں ہے۔ بنیادی شے ذمہ داری کو پورا کرنا ہے۔ اگر کسی کی نصف زبان کاٹی جس سے ایک چوتھائی گویائی ختم ہوگئی یا اس کے برعکس (نصف زبان کاٹ دی اور چوتھائی گویائی جاتی رہی) تو اس مجرم پر نصف تاوان عائد ہوگا اور اگر زبان شل (بے حس) ہوگئی تو دو ہراتاوان عائد ہوگا۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ نصف تاوان ہوگا۔

اگر کئی ہوئی زبان ذائقہ نہ محسوس کرتی ہو یا گونگی ہو تو اس کا فیصلہ تقاضائے عدل کے مطابق کیا جائے گا۔ اگر تھوڑی سی زبان کاٹی جس کی وجہ سے بولنا نہ جاسکے تو پوری دیت عائد ہوگی کیونکہ زبان کا مقصد فوت ہو گیا ہو عضو برقرار رہے اور اگر بعض حروف کے ادا کرنے پر قادر ہو تو دیت کو تمام حروف ہجا کی تعداد پر تقسیم کر دیا جائے گا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی اپنی زبان کے حروف ہجا پر تقسیم کیا جائے۔ غرض ادائے الفاظ سے جس قدر وہ معذور ہے اسی کے مطابق تاوان واجب ہوگا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر بیشتر الفاظ ادا کرنے پر قادر ہے تو اس کا فیصلہ مبنی برانصاف واجب ہے کیونکہ وہ افہام مدعا کر سکتا ہے اگرچہ ناقص طور پر ہو۔ اگر زیادہ تر الفاظ ادا کرنے سے عاجز ہو تو پورا تاوان واجب ہوگا کیونکہ ظاہر ہے کہ

اور یہی عین انصاف کا تقاضا ہے۔ اب اگر ایک شخص کسی کا عضو ظلم سے ضائع کر دیتا ہے تو اس کی پاداش سوا اس کے نہیں ہے کہ مجرم کا بھی وہی عضو تلف کر دیا جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”جزاء سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ“ (الشوری: ۴۰) (یعنی مضرت رسائی کی سزا بھی ویسی ہی مضرت ہے) بالعموم کہا جاتا ہے کہ ایسی سزاؤں سے افراد قوم میں ناکارہ اشخاص کی تعداد زیادہ ہو جائے گی کہ مظلوم تو ناقص العضو کیا ہی گیا تھا۔ ظالم (مجرم) بھی اسی طرح ناقص العضو ہو کر رہ جائے گا جو قومی صلاحیت کا زیان اور اس کے بہبود کا منافی ہے۔

پورے طور پر گفتگو کرنے کی غرض حاصل نہ رہی۔

ایک روایت میں ہے کہ کسی نے حضرت امام علی کرم اللہ وجہہ کے عہد میں ایک شخص کی زبان تھوڑی سی کاٹ دی۔ آپ نے اس شخص کو ا۔ ب۔ ت۔ ث پڑھنے کو کہا۔ جب وہ ایک حرف پڑھتا تھا تو اس کے تاوان میں سے اسی قدر ساقط فرما دیتے تھے اور جو حرف اس سے ادا نہ ہوتا تھا۔ اس کے حساب سے اس پر تاوان واجب فرما دیتے تھے۔ واضح ہو کہ عربی زبان کے حروف اٹھارہ (۱۸) ہیں جن میں (۶) حروف حلق اور حروف لب جن کی تعداد چار ہے شامل نہیں ہیں۔

آلہ تناسل کے کاٹنے کے مجرم پر پورا تاوان عائد ہوگا اور حشفہ (سر ذکر) کاٹنے پر بھی پورا تاوان عائد ہوگا خواہ آلہ تناسل صغیر سن بچے کا ہو یا عمر رسیدہ بڑھے کا یا خسی یا عنین کا (یعنی جس کا عضو مخصوص کاٹا گیا ہو یا قوت مردی سے محروم ہو) کیونکہ اس بارے میں جو حدیث آئی ہے وہ مطلق (بلا استثناء کے) ہے۔ بیشتر فقہاء کے نزدیک خسی یا مخنث کے عضو مخصوص کے بارے میں حاکم خود فیصلہ کرنے کا مجاز ہے۔

اس بارے میں بنیادی حکم وہ ہے کہ جو سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”فی النفس الدیۃ“ و فی اللسان الدیۃ و فی المارن الدیۃ“ (یعنی تاوان جان کا ہے اور زبان اور نتھنوں کا)۔ اسی طرح اس مکتوب میں ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بن حزم رضی اللہ عنہ کو ارسال فرمایا تھا۔ اسے ابوداؤد نے اپنے مراسیل میں ابوشہاب سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب موسومہ ابن حزم میں خود پڑھا ہے۔ یہ خط انہیں اس وقت بھیجا گیا تھا جب وہ نجران کی مہم پر گئے تھے۔ یہ مکتوب ابوبکر بن حزم کے پاس تھا (بروایت نسائی)۔ یہ حکم اس لئے بھی ہے کہ خسی مرد کے آلہ تناسل میں جماع یا اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کا نہ ہونا یا نامردی عضو مخصوص کا عیب نہیں ہے کیونکہ شہوت (خواہش نفسانی) کی جگہ دل ہے اور مادہ تولید انسان کی پشت میں ہوتا ہے۔ اس کی جگہ آلہ تناسل نہیں ہے لہذا یہ عیوب عضو مخصوص کے نہیں ہیں اور حشفہ (سر ذکر) کا حکم وہی ہے جو آلہ تناسل کا ہے کیونکہ آلہ تناسل کا بقیہ حصہ حشفہ کے تابع ہے۔ جیسے ہتھیلی اور انگلیاں۔ عضو مخصوص کا سب سے بڑا فائدہ مباشرت کی لذت ہے۔ جس کا تعلق حشفہ (سر ذکر) سے ہے اور جماع کا انحصار اسی پر ہے۔ اگر اس کا کچھ حصہ کاٹا تو اس کے حصے کے مطابق تاوان واجب ہوگا کیونکہ پورا تاوان اسے پورا قطع کرنے پر عائد ہوتا ہے لہذا اگر کچھ حصہ کاٹا گیا تو تاوان کا بھی حصہ کیا جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ پورے عضو مخصوص کے ساتھ اس حصہ تاوان واجب ہوگا۔ کیونکہ تاوان کی

اس کا جواب یہ ہے کہ (در حقیقت) قصاص (یعنی جرم کے مطابق سزا) میں ہی ہلاکت زدہ افراد کی تعداد کم ہوگی، زیادہ نہ ہوگی، بلکہ حکم قصاص جرم کی سرے سے بیخ کنی کر دے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ أُولَىٰ ۖ أَلَا لَبَّابٌ لَّعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ" (البقرة: ۱۷۹) (یعنی اے ارباب عقل حکم قصاص میں ہی تمہاری زندگی ہے۔ کاش تم میں خوف خدا ہو) کیونکہ جب مجرم کو یقین ہوگا کہ اسے اپنے جرم کی ویسی ہی سزا ملے گی اور یہ معلوم ہوگا کہ اگر کسی شخص کے عضو بدن کے ساتھ ستم روا رکھا گیا تو اس کے بدن کا بھی وہی حصہ کاٹ دیا جائے گا تو ناگزیر ہے کہ وہ ارتکاب جرم سے بچے گا اور عداوتیں ختم ہو جائیں گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ کوئی کلفت زدہ رہے گا نہ ظلم کرنے والا اور نہ مظلوم۔ لیکن اگر کسی نے یہ خیال کر لیا کہ اس کے جرم کی سزا صرف کچھ عرصہ کی قید ہے تو بہت سے لوگوں کے ساتھ مل کر بار بار جرم کرنے پر

تکمیل کا مقصد یہی ہے۔ اگر آلہ تناسل سوکھ گیا ہو تو اس کے کاٹنے کا تاوان بمقتضائے عدل حاکم کے فیصلہ پر موقوف ہے اور منخث کے آلہ تناسل کا تاوان مقررہ تاوان کا نصف ہوگا اور باقی نصف کا فیصلہ حاکم کرے گا۔

اعضائے بدن کے تاوان کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اگر وہ عضو اپنی پوری صلاحیت کا رکھو دے یا وہ خوبی جو اس کے مکمل ہونے کی حالت میں تھی وہ بالکل جاتی رہے تو پوری دیت عائد ہوگی کیونکہ اس طرح انسان کے پورے وجود کو ایک لحاظ سے ختم کر دیا گیا اور انسانی عظمت کے لحاظ سے یہ فعل ایسا ہے کہ گویا اسے قریب قریب تلف کر دیا گیا۔ پس اگر نفع کی نوعیت اور تکمیل ایک ہی عضو پر منحصر ہے تو اس کے تلف کرنے پر پوری دیت واجب ہوگی اور اگر وہ فائدہ دو عضوں پر منحصر ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کے لئے نصف تاوان ہوگا اور اگر اس کی منفعت کا انحصار چار اعضاء پر ہے تو ان میں سے ہر ایک کے تلف کرنے پر چوتھائی دیت لازم ہوگی اور اگر منفعت دس اعضائے بدن پر موقوف ہے تو ان میں سے ہر ایک کے عوض تاوان کا دسواں حصہ اور اگر دس سے زیادہ اعضاء پر منحصر ہے تو بیسواں حصہ واجب الادا ہوگا مثلاً انگلیوں میں سے انگوٹھے کے پور کو کاٹ دیا۔

واضح ہو کہ اگر انسان آلہ تناسل کے کاٹے جانے سے متعدد فائدوں سے محروم ہو گیا مثلاً جماع کرنا، اولاد پیدا کرنا، پیشاب کا روکنا، خارج کرنا اور یا مادہ تولید کا اچھل کر نکلنا یا اس طرح سے جماع کرنا جو بالعموم استقرار حمل کا باعث ہوتا ہے وغیرہ یا عضو مخصوص کو اوپر سے چیر دیا اور وہ بیکار ہو کر رہ گیا تو پوری دیت واجب ہوگی اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی نے عضو مخصوص پر ضرب لگائی اور اسے خشک (یا سن) کر دیا یا چوٹ کے باعث جماع کے قابل نہ رہا مگر سکڑتا اور پھیلتا ہے تو اس کی سزا کا فیصلہ حاکم بقاضائے انصاف خود کرے گا۔ کیونکہ ہنوز وہ عضو اور اس کا فائدہ باقی ہے۔ خرابی اور باتوں میں ہوئی ہے تاہم اگر اس حالت میں عضو مخصوص کاٹ دیا تو اس پر قصاص یا پورا تاوان عائد ہوگا۔

اگر عدا یا خطا ضرب لگانے سے کسی کی عقل جاتی رہے تو مجرم پر پورا تاوان عائد ہوگا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا فیصلہ اسی طرح فرمایا ہے۔ یہی حکم قوت فہم سے محروم ہو جانے کی صورت میں ہے کیونکہ اسی سے انسان معاش زندگی اور آخرت (کا ثواب) حاصل کرتا ہے اور یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ ماہرین کی رائے میں کچھ عرصہ کے بعد اس شخص کی

ولیر ہو جائے گا۔ جس سے اپاہجوں اور مجرموں کی تعداد زیادہ ہو جائے گی۔ پھر یہ کہ طویل مدت کی جیل میں رہنا مجرموں کی زندگی کے لئے سخت مصیبت ہے۔ وہاں پر رہ کر وہ جرائم پسند ہو جاتے ہیں جیسا کہ بہت سے قید و بند کے عادی مجرموں کی حالت مشاہدہ میں آئی ہے۔

صحت مندی کے عود کر آنے کی توقع نہ ہو جیسا کہ عمرو بن حزم کی روایت میں آیا ہے۔

ابن المذکر کہتے ہیں کہ تمام حفاظ اہل علم اس سے متفق ہیں کیونکہ عقل جملہ قوائے باطنی اور اعضائے انسانی میں سب سے اشرف ہے اور یہی انسان اور جانور میں ماہہ الامتیاز ہے جس کی پابندی انسان کو برائیوں میں پڑنے سے بچاتی ہے اور یہاں عقل سے مراد وہ فطری عقل ہے جو انسان کو مکلف (احکام شرعیہ کا ذمہ دار) بناتی ہے۔ اس سے مراد حاصل کردہ فراست نہیں ہے

جو حسن عمل کا ذریعہ ہے۔ (اتلاف عقل کے بارے میں) حاکم اپنی رائے سے فیصلہ دے گا۔ اگر (زوال عقل کے بعد) ایک خاص میعاد وقت میں (فائت العقل کے) اپنے اصل حال میں عود کر آنے کی توقع ہو تو اس وقت تک انتظار کرنا چاہیے۔ اگر آرام ہو جائے تو تاوان عائد نہ ہوگا جیسے اس شخص کا دانت جس کا دانت ہنوز گرا نہ ہو۔ اگر کچھ عقل زائل ہوئی ہو تو دیت بھی اس کے مطابق بالاقساط واجب ہوگی۔ مثلاً بشرطیکہ (زوال عقل) وقتی طور پر ہو مثلاً کوئی شخص ایک دن بے عقلی کی حالت میں رہے اور پھر ایک دن افاقہ پا جائے۔ یا کسی اور طرح کا فتور عقل ہو مثلاً اس کے اقوال و افعال جہاں ٹھیک ٹھاک ہوں وہاں اس میں گڑبڑ بھی ہو جاتی ہو اور دونوں حالتوں کا فرق معلوم ہو سکے اگر اس کا علم نہ ہو سکے تو اس کا فیصلہ حاکم اپنی سمجھ کے مطابق کرے گا۔

اور اگر اس خاص عرصہ میں جس میں اس کو افاقہ پا جانا تھا وہ شخص وفات پا گیا تو مجرم پر پورا تاوان عائد ہوگا اور اس کے جرم کا قصاص عائد نہ ہوگا کیونکہ جرم سے متاثر ہونے والے حصہ جسم کے تعین کرنے میں اختلاف ہے کہتے ہیں کہ جرم سے دل متاثر ہوا۔ کچھ کہتے ہیں کہ اس کا تعلق دماغ سے ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس جرم سے دل اور دماغ دونوں متاثر ہوتے ہیں۔ بیشتر اصحاب اول الذکر رائے کے قائل ہیں۔ نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ عقل کی جگہ دماغ ہے جسے دل تقویت دیتا ہے اور اسے عقل (رسی کا پھندا) اس لئے کہتے ہیں کہ عقل کی پابندی خراب باتوں میں مبتلا ہونے سے روکتی ہے۔

واضح ہو کہ جس مجرمانہ حرکت سے عقل زائل ہوئی ہے اگر وہ حرکت ایسی ہے جس کا کوئی جرمانہ نہیں ہے تو زوال عقل کے تاوان پر کچھ اور اضافہ نہیں کیا جائے گا مثلاً سر پر مارا یا تھپڑ لگایا (جس سے عقل زائل ہوگئی) تو اس حرکت کا جدا گانہ جرمانہ عائد ہوگا۔ تاہم بقول صحیح اس کی سزا ہوگی۔ لیکن اگر وہ فطری عقل ایسی مجرمانہ حرکت سے زائل ہوئی جس کا جرمانہ مقرر ہے۔ مثلاً گہرا زخم (جس سے ہڈی نظر آنے لگے) یا وہ زخم ایسا ہو جس کا (تاوان مقرر نہیں بلکہ) فیصلہ حاکم کے اختیار میں ہے مثلاً سر پھوڑ دینا (یا شگاف ڈال دینا) تو جرمانہ اور زوال عقل کا تاوان یا حاکم کی عائد کردہ سزا اور تاوان عقل دونوں سزائیں عائد ہوں گی اور اس کی سزا کو (ازالہ عقل کے) تاوان میں شامل نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس جرم نے ایسی منفعت سے محروم کیا ہے جس کا تعلق محل جرم سے نہیں ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے سر پر زخم لگنے سے قوت بصارت یا

جاننا چاہیے کہ اگر قطع اعضاء کے جرم کی پاداش میں مجرم کو بھی اسی طرح کی سزائے قطع دینا ممکن ہو تو یہ عین عدل و انصاف ہے کہ ویسی ہی سزا دی جائے جیسا اس نے ارتکاب جرم کیا ہے۔ اگر (جرم و سزا میں یکسانیت) ممکن نہ ہو تو حاکم کو اختیار ہے کہ مجرم کو ایسی سزا دے جو آئندہ ارتکاب جرم سے اسے باز رکھے اور چونکہ یہ مسلمہ ہے کہ قصاص (یعنی جرم کا بدلہ اسی طرح کی سزا) مظلوم کا حق ہے لہذا اسے اختیار ہے کہ اگر حاکم کے خیال میں اس کے معاف کر دینے سے کسی خرابی کا اندیشہ ہو تو حاکم مجاز ہے کہ قیام امن کی خاطر جو طریقہ چاہے اختیار کرے۔

سماعت جاتی رہے۔ یا کسی نے عقل کو نقصان پہنچانے کے علاوہ کوئی اور مستقل جرم بھی کیا۔ پس اگر کسی شخص کے ذہنوں ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیئے اور اس (کے صدے) سے عقل کھو بیٹھا تو اس پر تین تا دان عائد ہوں گے اور اگر کسی مجنون کے ولی نے یہ دعویٰ کیا کہ اس مجنون کی عقل مجرم نے زائل کی ہے اور مجرم اس سے انکار کرے اور کہے کہ یہ شخص پاگل بنا ہوا ہے تو اس کے عام اطوار سے حقیقت حال کا پتہ لگایا جائے۔ اگر اس کی اپنی زندگی میں اس کے اقوال و افعال سنجیدگی سے عاری ہوں تو مجرم پر تاوان عائد ہوگا اور اس کے لئے قسم کھلانا ضروری نہیں ہے لیکن یہ اس حالت میں ہے جبکہ اس شخص کا جنون ہمہ وقتی ہو اگر جنون کی کیفیت وقتی ہوتی ہو تو اتفاقہ کی حالت میں اس سے قسم لی جائے گی اگر اس کی باتوں اور کاموں میں سنجیدگی ہو تو مجرم سے قسم لی جائے گی۔ کیونکہ یہ ممکن ہے۔ کہ اتفاق سے اس نے سنجیدگی کا اظہار کر دیا ہو یا عادت سنجیدہ کام اس سے سرزد ہوا ہو۔ تاہم ایسے شخص کے اطوار سے (اس کی دماغی کیفیت کا پتہ لگانے کے لئے) کوئی خاص مدت مقرر نہیں ہے بلکہ گمان غالب کے طور پر اس کا سچ یا جھوٹ معلوم ہو سکتا ہے۔ اور ثور عقل کے دعوے کی سماعت اس صورت میں ضروری ہے جبکہ جرم کی نوعیت ایسی ہو جس سے زوال عقل کا احتمال ہو سکے بصورت دیگر مدعی کے دعوے کو قابل سماعت نہ سمجھا جائے گا۔ جیسے موت کا ایک ہلکے سے جھٹکے سے واقع ہو جانے کا دعویٰ۔

اگر ارتکاب جرم سے سماعت جاتی رہے تو پورا تاوان عائد ہوگا جیسا کہ پہلی کی روایت میں آیا ہے۔ ابن منذر کا کہنا ہے کہ اس پر اجماع ہے کیونکہ قوت سماعت ایک اعلیٰ درجہ کی حس ہے اور بینائی کی مانند ہے بلکہ بیشتر فقہاء کے نزدیک سماعت کو بصارت پر برتری حاصل ہے کیونکہ اس میں ادراک فہم اور شش جہات کا احساس ہوتا ہے اور (قوت سمع) روشنی اور تاریکی دونوں حالت میں کارآمد ہے۔ آنکھ سے تو صرف اس شے کا ادراک ہوتا ہے جو سامنے آجائے۔ اس کے لئے روشنی اور عکس درکار ہے لیکن متکلمین (دینی فلسفی) بصارت کو سماعت پر فوقیت دیتے ہیں کیونکہ سماعت صرف آواز کا ادراک کرتی ہے لیکن آنکھ جسمات رنگت اور شکل و صورت کا ادراک کرتی ہے لہذا یہ اس سے زیادہ قابل قدر ہے۔

واضح ہو کہ تاوان عائد ہونے کے لئے ضروری ہے کہ قوت سماعت کے زائل ہو جانے کا ثبوت ہو جائے۔ اگر ماہرین کے خیال میں قوت سماعت کے پھر عود کر آنے کا امکان ہے۔ اور اس کے لئے اتنی طویل مدت رکھی گئی ہے جس میں (مجروح کا) زندہ رہنا بعید از قیاس نہ ہو تو اتنے عرصہ تک انتظار کرنا چاہیے اور اگر یہ بعید از قیاس ہو اس کے لئے کوئی وقت مقرر نہ ہو تو تاوان فوری طور پر واجب الادا ہوگا۔ اگر ماہرین کہیں کہ سماعت کی صلاحیت تو بجائے خود باقی ہے لیکن

سننے کا راستہ بند ہو گیا ہے تو حاکم خود اس کا تصفیہ کرے گا۔

کہا جاتا ہے کہ سماعت کی صلاحیت موجود ہونے کا پتہ لگانے کے جو طریقے ہیں انہیں بروئے کار لانا چاہیے اگر ان طریقوں سے معلوم نہ ہو سکے تو مدعی کے دعوے کو تسلیم کرنا اور اسے رد کر دینا دونوں ہی باتیں ہو سکتی ہیں۔
قوت سماعت کے باقی ہونے کی آزمائش اس طرح ہو سکتی ہے کہ اس شخص کو احیانا (غفلت کی حالت میں) آواز دی جائے۔ اگر وہ (چونک کر) جواب دے دے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ سن رہا ہے اور اس صورت میں تاوان عائد نہ ہوگا۔

جناب ناطقی نے قاضی ابو حازم کا یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک عورت ان کی عدالت میں بہری بن گئی۔ قاضی صاحب اس کی طرف سے تہہ بٹا کر اپنے کاروبار عدالت میں مصروف ہو گئے اور اچانک اس کی طرف مڑ کر کہا ”اپنا ستر تو ڈھک“ وہ چونک پڑی اور جلدی سے اپنے کپڑوں کو سمیٹنے لگی جس سے اس کا مکر کھل گیا۔

اگر ایک کان کی سماعت جاتی رہے۔ تو نصف تاوان عائد ہوگا۔ اگر دونوں کانوں کا ظاہر حصہ کاٹ دیا جائے تو تاوان عائد ہوگا۔ کیونکہ کان (انسانی) چہرے کے جمال کا باعث ہیں۔ اگر دونوں کانوں کے ساتھ سماعت بھی جاتی رہے تو دگنا تاوان عائد ہوگا کیونکہ آلہ سماعت بریدہ عضو (کان سے جدا گانہ شے) ہے لہذا (اس کا تاوان الگ ہوگا) ایک کو دوسرے میں شامل نہیں کیا جائے گا۔

اگر مجروح (جس کے ساتھ جرم کیا گیا) یہ دعویٰ کرے کہ اس کے دونوں کانوں کی سماعت جاتی رہی ہے اور مجرم کے جھٹلانے پر وہ بے قرار ہو کر سب کے سامنے چیخنے چلانے لگے تو اسے جھوٹا خیال کیا جائے گا۔ کیونکہ یہ حرکت اس کی بناوٹ کی دلیل ہے۔ ایسی صورت میں مجرم کو حلف اٹھانا پڑے گا کہ اس شخص کی سماعت باقی ہے۔ کیونکہ یہاں احتمال ہے کہ مجروح نے جو اضطراب کا اظہار کیا ہے وہ قوت سمع کے زائل ہونے (محض زخمی ہونے پر) کیا ہو۔ اگر چیخ پکار کر کے اس نے اضطراب کا اظہار نہیں کیا تو اس کا دعویٰ درست مانا جائے گا اور مجرم پر تاوان لاگو ہوگا۔

اگر سماعت میں نقص ہو جائے اور یہ پتہ چل سکے کہ یہ نقصان کس قدر ہے تو اسی قدر تاوان کا حصہ کم لاگو ہوگا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ اگر آواز ایک خاص فاصلہ سے سنی جاسکتی ہے اور وہ شخص اس کے نصف فاصلہ سے سن سکتا ہے تو گویا آدھی قوت سماعت کا نقصان ہوا۔ فاصلہ (سماعت) کے اندازہ لگانے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک شخص اس سے بات کرے اور پھر اس سے دور ہوتا جائے یہاں تک کہ وہ کہے کہ اب مجھے سنائی نہیں دیتا تب وہ کسی قدر اپنی آواز اور اونچی کر دے یہاں تک کہ وہ کہے کہ اب میں سن رہا ہوں اور یہ سمجھا جائے کہ وہ سچا ہے پھر اسی طرح کا عمل دوسری طرف سے کیا جائے اگر دونوں طرف سے یکساں فاصلوں پر وہی کیفیت ہو تو اس کے بیان کی صداقت ظاہر ہو جائے گی اور اگر یہ معلوم ہو کہ مجرم کے ارتکاب جرم سے پہلے وہ کس قدر فاصلے سے سن سکتا تھا تو موجودہ قوت سماعت سے اس کا فرق دیکھا جائے اور اسی نسبت سے تاوان عائد کرنا واجب ہے یعنی اگر فاصلہ کا فرق نصف ہے تو اس کا تاوان لاگو ہوگا۔ اگر اس طرح فاصلہ کے موازنہ سے (نقصان سماعت کا پتہ چلانا) ممکن نہ ہو تو حاکم خود ہی نقصان کا اندازہ لگا کر اپنی رائے کے مطابق فیصلہ دے گا۔ اگر مظلوم قسم کھا کر بتائے کہ اس کی سماعت میں کس قدر فرق آیا ہے تو اس بات کو تسلیم کیا جائے گا کیونکہ اس

کے قول کے علاوہ اور کسی طرح سے (نقصان سماعت کا) علم نہیں ہو سکتا۔

اگر صرف ایک کان میں سماعت کی خرابی ہوئی ہے۔ تو اس کان کو بالکل بند کر کے دیکھا جائے کہ دوسرا کان کتنے فاصلے سے سن سکتا ہے۔ پھر دوسرے کان کو اس طرح بند کر کے دیکھا جائے کہ دونوں میں کس قدر فرق ہے۔ اسی فرق کے مطابق تاوان کا حصہ واجب الوصول ہوگا۔ یعنی اگر سننے والے (صحت مند) کان اور دوسرے (متاثرہ) کان میں نصف مسافت کا فرق ہے تو ایک چوتھائی دیت واجب ہوگی۔ کیونکہ اس طرح وہ مجروح ایک چوتھائی قوت سماعت سے محروم ہوا اور اگر ایک تہائی مسافت کا تفاوت ہے تو دیت کا چھٹا حصہ لاگو ہوگا وغیرہ۔

اگر (نقصان سماعت کا اندازہ) اس طریقہ سے نہ لگایا جاسکے تو حاکم اس کا منصفانہ فیصلہ خود کرے گا۔

ہر آنکھ کی بصارت زائل ہونے پر خواہ وہ آنکھ چھوٹی ہو یا بڑی۔ تیز نظر والی ہو یا کم نظر والی۔ صحت مند ہو یا مریض۔ چندھی ہو یا بھینگی۔ جوان کی آنکھ ہو یا بوڑھے کی یا بچے کی اگر بینائی موجود تھی نصف تاوان واجب ہوگا اور دونوں آنکھ کے تلف ہونے پر پوری دیت عائد ہوگی۔ کیونکہ انسان کی بینائی اس کی زندگی کے منافع مقصودہ میں سے ہے (یعنی آنکھ کے بغیر زندگی بیکار ہے) چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسے جرم جراحات رسائی کے عوض جس میں عقل طاقت گفتگو۔ سننے اور دیکھنے کی صلاحیت جاتی رہی تھی چار گنا تاوان کا فیصلہ فرمایا تھا۔ پس اگر مجروح انسان اپنی بصارت کے زائل ہو جانے کا دعویٰ کرے اور مجرم اس سے انکار کرے تو اس کی بابت دو معتبر ماہروں سے صداقت دعویٰ کی بابت دریافت کیا جائے گا اور غلطی سے یا شبہ عہد کے طور پر ایسا حادثہ واقع ہونے کی صورت میں ایک مرد اور دو عورتوں سے دریافت کرنا کافی ہوگا۔ یہ اصحاب اس شخص کو سورج کی روشنی میں کھڑا کر کے اس کی آنکھ کا معائنہ کر کے معلوم کریں گے کہ آیا پوری بینائی جاتی رہی یا باقی ہے۔ بخلاف قوت سمع کہ اس کی بابت لوگوں سے دریافت نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ اس کے معلوم کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ یا پھر بینائی کے موجود ہونے کا امتحان اس طرح ہو سکتا ہے کہ اس کے قریب کوئی بچھو یا دکھتا لوہا وغیرہ اچانک آنکھ کے سامنے لایا جائے اور پھر دیکھیں کہ اسے دیکھ کر وہ شخص بے چین ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر وہ گھبرا جائے تو مجرم کی بات اس کے قسم کھا کر کہنے پر مان لی جائے گی۔ ورنہ پھر مجروح کا قول اس کے قسم کھانے پر تسلیم کیا جائے گا۔

اگر مجروح کی آنکھ کی روشنی میں کمی آجائے تو اس کا حکم وہی ہے جو سماعت میں کمی آ جانے کا ہے یعنی اگر معلوم ہو جائے کہ بینائی میں کس قدر نقص آیا ہے کہ وہ شخص پہلے جتنے فاصلے سے کسی شے کو دیکھ لیتا تھا اب اس کو اس فاصلے سے زیادہ دور سے نہیں دیکھ سکتا تو اسی حساب سے اس پر تاوان کا ایک حصہ لاگو ہوگا۔ بصورت دیگر حاکم عادل اپنی رائے سے فیصلہ کرے گا۔

اگر مجروح کی کسی آنکھ سے کم دکھائی دینے لگے تو اس آنکھ پر پٹی باندھ دی جائے اور ایک شخص کو ایسی جگہ پر کھڑا کیا جائے جہاں سے وہ (اپنی صحت مند آنکھ سے) اسے دیکھ سکتا ہو اور پھر کہا جائے کہ وہ شخص پیچھے ہٹتا چلا جائے یہاں تک کہ وہ کہے کہ اب مجھے وہ شخص دکھائی نہیں دیتا۔ اس طرح معلوم ہو گیا کہ وہ کس قدر سے دیکھ سکتا ہے اب صحت مند آنکھ پر پٹی باندھی جائے اور مریض کی آنکھ کو کھول دیا جائے اور اس شخص کو جسے کھڑا کیا گیا تھا قریب تر آنے کے لئے کہا جائے جب

وہ اتنا قریب آجائے کہ وہ (مریض آنکھ سے) اسے دیکھ سکے تو دونوں فاصلوں کے لحاظ سے۔ تاوان کا حصہ مقرر کیا جائے کہ اگر وہ صحت مند آنکھ سے مثلاً دو سو گز کے فاصلہ سے اور مریض آنکھ سے ایک سو گز کے فاصلے سے دیکھ سکتا ہے تو (اس آنکھ کا) نصف تاوان واجب الادا ہوگا۔ البتہ اگر ماہرین یہ کہیں کہ دو سو گز کے فاصلہ سے کسی شے کو دیکھنے کیلئے اس بصارت کی دو گنی قوت درکار ہوتی ہے جو پہلے سو گز کے لئے درکار ہے، کیونکہ پہلا فاصلہ قریب کا ہے اور دوسرا دور کا تو اس بیمار آنکھ (کے نقصان کا) دو تہائی ہوگا۔ اگر بینائی کمزور ہوگئی تو نصف تاوان عائد ہوگا اگر آنکھ چندھی یا بھینگی ہوگئی یا تو نندھا پن آگیا یا نظر پتھرا گئی تو اس کی بابت حکومت اپنی رائے سے فیصلہ دے گی۔ اگر کسی کی آنکھ میں پھولا ہے لیکن بینائی میں نقص نہیں ہے تو اس آنکھ کے پھوڑنے پر نصف تاوان عائد ہوگا۔

ابن الصلاح سے ایک شخص کی بابت دریافت کیا گیا جس کی آنکھیں دکھتی تھیں کہ وہ ایک بدوی عورت کے پاس آیا جو علاج معالجہ کا دعویٰ کرتی تھی کہ اس کی آنکھ کا علاج کرے۔ اس عورت نے اس کی آنکھ میں ایسا سرمہ لگایا جس سے بینائی جاتی رہی اب سوال یہ ہے کہ آیا وہ عورت ادائے تاوان کی ذمہ دار ہوگی؟ اس کا جواب انھوں نے یہ دیا کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ فی الواقع اس عورت کی دوا سے آنکھ جاتی رہی تو اس عورت کے عاقلہ (رشتہ داروں) پر تاوان عائد ہوگا۔ اگر اس کا کوئی صلبی رشتہ دار نہیں ہے تو بیت المال (سرکاری خزانہ) سے تاوان ادا کیا جائے اگر یہ ممکن نہ ہو تو عورت کے اپنے مال سے تاوان ادا کیا جائے۔ لیکن اگر اس دکھتی آنکھ والے نے خود ہی کہہ کر وہ دوا آنکھ میں ڈلوائی تو کوئی تاوان عائد نہ ہوگا۔ یہ وہی معاملہ ہے جو اس زمانہ میں بھی مریض اور طبیب کے درمیان پیش آتا رہتا ہے۔

اگر کسی نے ایک شخص کے سر پر ضرب لگا کر مجروح کے دونوں زخروں سے سونگھنے کی قوت زائل کر دی تو اس پر پورا تاوان عائد ہوگا۔ جیسا کہ روایت سے ظاہر ہے جو عمرو بن حزم سے مروی ہے۔ کیونکہ یہ بھی ایک کارآمد حس ہے۔ لہذا سماعت (زائل کرنے) کی طرح اس میں بھی پورا تاوان واجب ہوگا۔ اگر ایک نتھنے کی قوت شامہ زائل ہوئی ہے (دوسرا نتھنا کام کر رہا ہے) تو نصف تاوان لگے گا۔ اگر سونگھنے کی قوت میں کمی آگئی ہے تو جس قدر کمی آئی ہے اس کی نسبت سے تاوان عائد ہوگا بشرطیکہ کمی کی مقدار کا تعین ممکن ہو اگر ممکن نہ ہو تو حکومت خود اس کا فیصلہ کر دے۔

اگر مجرم مجروح کی قوت شامہ کے ضائع ہونے سے انکار کرے تو مجروح کی بے خبری میں تیز بو پھیلا کر اس کے سونگھنے کی قوت کا امتحان لیا جائے۔ اگر خوشبو سے بشارت کا اور بدبو سے بیزاری کا اظہار کرے تو مجرم سے اس کے (دعویٰ کے ثبوت کی خاطر) قسم لی جائے۔ تاکہ اس شخص کا جھوٹا ہونا ثابت ہو ایسی صورت میں وہ تاوان کا حقدار نہ ہوگا اگر وہ شخص خوشبو سے بشارت کا اور بدبو سے بیزاری کا اظہار نہ کرے تو اس سے قسم لی جائے تاکہ اس کے بیان کی صداقت ظاہر ہو۔ باوجود اس کے یہ بات اس کے سوا اور کسی سے نہیں معلوم ہو سکتی۔ قوت ذائقہ سے مراد زبان کی وہ صلاحیت ہے جس سے کھانے کا مزہ معلوم ہوتا ہے اگر اسے زائل کر دیا جائے تو مجرم پر پورا تاوان عائد ہوگا کیونکہ (ذائقہ) بھی منجملہ حواس خمسہ کے ہے اور قوت شامہ کی مانند ہے۔ اس قوت ذائقہ کا مرکز متعین کرنے کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا وہ حلق کا کوئی گوشہ ہے۔ یا زبان ہے؟ بیشتر اہل علم ثانی الذکر خیال کے حامی ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ یہی مشہور ہے اور حکماء کا خیال بھی یہی ہے۔ تاہم وہ کہتے ہیں کہ یہ قوت (شامہ) زبان کے لوٹھڑے پر پھیلے ہوئے اعصاب سے ابھرتی ہے اور لعاب دہن

کے ساتھ مخلوط ہو کر غذا کو ان پٹھوں تک پہنچاتی ہے۔ اہل سنت کا کہنا ہے کہ یہ حسن بھی مشیت الہی ہے۔ یعنی اس اختلاف مذکورہ کا پیدا کرنے والا بھی وہی ہے۔ پس یہ حس بھی زبان میں ایسی ہی ہے جیسے بولنے کی قوت۔ لہذا اس کے تلف کرنے پر (زبان کے تاوانوں میں سے) ایک تاوان زبان عائد ہوگا۔ کیونکہ زبان کی قوت ذائقہ میں، مٹھاس، کھٹاس، تلخی، نمکینی اور خوشگواریت کا احساس شامل ہے لہذا زبان کے پورے تاوان کو ان تمام احساسات پر تقسیم کیا جائے اگر ان میں سے زبان کی کوئی حس زائل ہو جائے تو زبان کے پورے تاوان کا پانچواں حصہ لاگو ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس۔ اگر ان میں کسی حس میں کمی ہو جائے اور اس کمی کی مقدار کا اندازہ لگایا جاسکے مثلاً ان پانچوں قسم کا ادراک تو زبان سے ہوتا ہو لیکن پورے طور پر نہ ہوتا ہو اس خرابی کے پیدا ہونے پر حکومت منصفانہ فیصلہ کرے گی۔ غرض قوت حس میں نقصان یا کمی کی مختلف حالتیں ہیں اگر اس خرابی کی مقدار متعین ہو سکے تو اسی کے مطابق تاوان کا حصہ مقرر کیا جائے۔

اگر مجرم اور مجروح ذائقہ کی قوت ادراک زائل ہونے کے بارے میں اختلاف کریں تو سخت کڑوی شے یا ایسی ہی سخت کھٹی شے سے جو بالعموم ناگوار ہو اس کا امتحان کیا جائے اگر مجروح شخص یہ بیان کرے کہ پورے طور پر اس نے محسوس نہیں کیا۔ تو اس کی قسم کھالینے پر اس کا بیان تسلیم کر لیا جائے۔ اگر وہ اس (کے ذائقہ) سے تکلیف یا ناگوار ہونے کا احساس کرے تو مجرم کی قسم پر اس کی بات مانی جائے گی۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ اگر چبانے کی قوت زائل ہو جائے مثلاً دانتوں کو نقصان پہنچا کر اسے سن (یا ناکارہ) بنادیا جائے اور وہ چبانے یا کچلنے کے قابل نہ رہے اور مسوڑھے کام نہ کریں تو تاوان واجب ہوگا۔ کیونکہ دانت کا عظیم فائدہ یہی ہے جس کے اتلاف پر دیت لازم ہے۔ دانت کا یہ فائدہ ایسا ہی ہے جیسے آنکھ میں دیکھنے کی صلاحیت اور ہاتھ میں پکڑنے کی قوت۔

ریڑھ کی ہڈی کو توڑ کر مادہ تولید کے ختم کر دینے پر بھی تاوان واجب ہوگا کیونکہ اس سے مقصد تناسل فوت ہو جاتا ہے۔ بخلاف اس صورت کے جب کہ کسی جرم کے ارتکاب سے عورت کے پستان کا دودھ بند ہو جائے۔ اس جرم کا فیصلہ حکومت کا کام ہے۔ کیونکہ پستان کا دودھ تو یوں بھی (بغیر کسی کی زیادتی کے) بند ہو جاتا اور یا ختم ہو جاتا ہے۔ تاہم کہتے ہیں کہ اس پر بھی پورا تاوان عائد ہوگا۔

فطرت انسانی میں مادہ منویہ کی صلاحیت کا ہونا مردانگی کے لیے ایک لازمی وصف ہے اور مادہ تولید کا زائل ہو جانا انسان کی تہذیبی اور باطنی خوبیوں کی موت ہے۔ لہذا اس (کے اتلاف) پر تاوان واجب ہوگا۔

اسی طرح عورت کی صلاحیت حمل کے ضائع کر دینے پر جس سے نسل ختم ہو جاتی ہے تاوان واجب ہوگا اور چونکہ اس سے سلسلہ تناسل منقطع ہو جاتا ہے اس لیے پوری دیت واجب الادا ہوگی۔

اور مرد کی حمل رکھوانے کی قوت زائل کرنے پر بھی تاوان واجب ہوگا اس کی صورت یہ ہے کہ مرد کی صلیبی ہڈی توڑ دی جائے جس سے اس کا مادہ منویہ فاسد اور ناقابل استقرار حمل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس حالت میں بھی دیت واجب ہوگی جبکہ ریڑھ کی ہڈی پر مجرمانہ زیادتی کی جائے کہ جماع کرنے کی صلاحیت جاتی رہے۔ گو مادہ منویہ اور آکھ تناسل باقی ہو لیکن لذت مباشرت ختم ہو جائے۔ کیونکہ یہ صلاحیت بھی انسانی منافع مقصودہ میں سے ہے۔ اس کے بارے میں خلفائے

راشدین کی روایت موجود ہے۔

اگر ریڑھ کی ختم ہڈی پر ایسی شدید ضرب لگائی کہ مرد کے عضو مخصوص کی قوت استادگی جاتی رہی تو دیت لاگو ہو گی۔ لیکن اس کے تاوان میں ریڑھ کی ہڈی کے نقصان کا تاوان شامل نہ ہوگا، اگرچہ یہ قوت اس میں ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر ریڑھ کی ہڈی شکستہ ہوئی اور عضو مخصوص کی قوت استادگی بھی جاتی رہی تو مجرم پر دو تاوان عائد ہوں گے کیونکہ یہ دونوں جرم ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

اگر مجرمانہ حرکت سے کسی عورت کی شرمگاہ میں افضا کا عیب پیدا کر دیا تو پورا تاوان عائد ہوگا۔ خواہ یہ جرم عمد ہو یا شبہ عمد یا مجامعت میں بدعنوانی سے یا غلطی سے سرزد ہوا ہو یا کسی اور طرح سے ہوا ہو اور خواہ یہ حرکت خاوند سے سرزد ہوئی یا کسی غیر شخص سے، کیونکہ اس سے مباشرت کی غرض جاتی رہتی ہے یا اس میں خلل پیدا ہو جاتا ہے اور اس لیے بھی کہ اس سے سلسلہ تناسل منقطع ہو جاتا ہے اور عورت بانجھ (یعنی ناقابل استقرار حمل) ہو جاتی ہے۔ اس عیب (افضا) کے بعد نطفہ اس جگہ قرار نہیں پکڑتا جہاں اس کی نشوونما ہو سکے کیونکہ اس عیب سے مادہ تولید پیشاب کے ساتھ خلط ملط ہو جاتا ہے۔ پس یہ جرم ایسا ہی ہے جیسے کسی مرد کا آلہ تناسل قطع کر دیا جائے۔

افضا ایک پردہ کا نام ہے جو عضو مخصوص کے شرمگاہ میں داخل ہونے اور رفع مادہ اجابت کی راہوں میں ایک پردہ ہے جس سے جماع اور رفع حاجت کے راستے (جو الگ الگ ہیں) افضا کے پھٹ جانے سے ایک ہو جاتے ہیں۔ اس سے اندام نہانی کا مقصد کلیتہً فوت ہو جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ 'افضا' (بمعنی توسیع) سے یہ مراد ہے کہ جماع اور پیشاب کی راہوں میں جو پردہ ہے وہ پھٹ جائے اور دونوں راہیں ایک ہو جائیں۔ واضح ہو کہ آگے اور پیچھے کی دونوں راہوں کے درمیان ایک مضبوط پردہ ہے جو عضو مخصوص سے نہیں ہٹتا کیونکہ ان دونوں کے درمیان ایک ہڈی ہوتی ہے جسے وہ توڑ نہیں سکتا۔

مالکیہ کہتے کہ (عورت کا عیب) افضا میں مبتلا کرنے کے جرم کا فیصلہ حکومت کرے گی جس کا طریقہ یہ ہے کہ عقد ازدواج کے وقت عورت کے حق کو دیکھا جائے کہ اگر وہ عورت 'غیر مفضا' ہے (یعنی اس میں افضا کا عیب نہیں ہے) تو اس کا حق مہر کس قدر ہے اور اگر اس میں یہ عیب ہے تو اس کا مہر کس قدر ہے؟ ان دونوں میں جو فرق حق مہر کا ہو اس قدر تاوان مجرم پر عائد ہوگا۔ اگر یہ حرکت خاوند سے سرزد ہوئی تو اس جرم کو جرم خطا سے تعبیر کیا جائے گا۔ کیونکہ شریعت نے بہر طور مجامعت کی اجازت دی ہے۔ اگر یہ عیب حق مہر کی ایک تہائی مقدار تک ہو تو مجرم کے عاقلہ پر واجب الادا ہوگا۔ بصورت دیگر مجرم کے اپنے مال سے تاوان وصول کیا جائے گا اور اس جرم 'افضا' کا تاوان مہر میں شمار نہ ہوگا بلکہ یہ مہر کے علاوہ حکماً خاوند پر لاگو ہوگا۔ یہی حکم اس حالت میں ہے جب کہ کوئی اور شخص ناجائز طور پر کسی عورت کے ساتھ یہ جرم کرے۔ خاوند کا بکارت کو توڑنا یا کسی اور شخص کا اس میں مرتکب ہونا ایک جداگانہ مسئلہ ہے یعنی بکارت کے زائل کرنے پر مہر کے علاوہ اور کچھ واجب نہ ہوگا۔ کیونکہ ازالہ بکارت کے بغیر مجامعت ممکن نہیں ہے۔ یہ امر جماع کے لوازمات میں سے ہے۔ 'افضا' کا ارتکاب اس سے مختلف امر ہے شرعاً اس کی ممانعت ہے تاہم اگر کسی نے بکارت کو انگلی ڈال کر توڑا تو حکومت اس حرکت کو معاوضہ مہر میں شامل نہیں کرے گی۔ خواہ یہ حرکت خاوند نے کی ہو یا کسی اور نے اگر کوئی شخص ایسی حرکت کرے

تو حکومت اسے جرم قرار دے گی۔ اگرچہ اس نے مجامعت نہ کی ہو۔ لیکن اگر مجامعت کر لے اور اس کا مہر ادا کیا ہو تو یہ فعل مہر کے تحت آئے گا۔ اگر خاوند مجامعت سے پہلے انگلی سے بکارت توڑے اور اسے طلاق دے دے تو اس بکارت توڑنے کا جرمانہ اور نصف مہر عائد ہوگا۔ ہاں اگر اس حرکت کے بعد اس سے مباشرت بھی کر لی تو یہ فعل معاوضہ مہر میں شامل ہو جائے گا یعنی اگر اسے اپنی بیوی بنا کر رکھے تو اس پر کوئی تاوان عائد نہ ہوگا۔ تاہم انگلی سے بکارت کو توڑنا جرم ہے اور خاوند کو اس پر سرزنش کی جائے۔

یہ اصحاب (فقہاء) کہتے ہیں اگر کسی نے ایک شخص کے ساتھ کوئی ایسی حرکت کی جس سے اس شخص کے بدن میں 'جذام' (کوڑھ) کا مرض پیدا ہو گیا۔ یہ مرض انسان کے عضو کو گلا دیتا ہے۔ یا ایسی حرکت ہو جس سے تبریص یعنی برص (پھل بہری) جیسا مرض لاحق ہو جائے مادہ شخص سیاہ جثہ نہ ہو لیکن اس حرکت کے بعد اس کا بدن سیاہ ہو جائے۔ یا اس کے بدن پر سیاہ۔ سفید دھبے پڑ جائیں، ان تمام صورتوں میں مکمل تاوان واجب ہوگا، کیونکہ اس حرکت کے باعث وہ شخص صاحب جمال و کمال ہونے سے محروم ہو جائے گا۔ پس اگر جراحت رسانی کے ایک جرم سے کسی کا جسم سیاہ پڑ جائے یا اسے جذام لاحق ہو جائے تو مجرم پر دگنی دیت عائد ہوگی۔ کیونکہ یہ دونوں خرابیاں جدا جدا حیثیت رکھتی ہیں۔

کان کے دونوں اعضائے ظاہر کے کاٹ دینے کا بیان

دونوں کان کاٹ دیئے جانے پر دیت واجب ہوگی بشرطیکہ قوت سماعت بحال ہو۔ لیکن اس جرم کی منصفانہ سزا حکومت دے گی۔

ائمہ ثلاثہ (یعنی ابوحنیفہؒ کے سوا باقی فقہاء) کہتے ہیں کہ دونوں کان کاٹ دینے پر پوری دیت اور ایک کان کاٹنے پر نصف دیت لاگو ہوگی۔ کیونکہ اس سے چہرہ کی خوش نمائی فوت ہو جاتی ہے اور قوت سماعت پر سنساہٹ بڑھ جاتی ہے۔

کانے کی آنکھ پھوڑ دینے کا بیان

مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر کانے کی صحت مند آنکھ پھوڑ دی جائے یا اس کی بصارت زائل کر دی جائے تو پورا تاوان ادا کرنا واجب ہے۔ کیونکہ ضائع شدہ آنکھ کی بصارت بھی صحت مند آنکھ میں آ جاتی ہے اور یہ بھی ہے کہ کانے کی ایک آنکھ اور ہر دو یکساں اعضاء میں سے ایک عضو کے درمیان فرق یہ ہے کہ ایک آنکھ بھی بینائی کے مقصد عظیم کو پورا کرنے میں رتبہ میں دو آنکھوں کے برابر ہوتی ہے اور یہ اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

حنفیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر کانے کی آنکھ پھوڑ دی جائے تو نصف تاوان عائد ہوگا۔ جیسا کہ ایک ہاتھ یا ایک پاؤں اور دوسرے دو ہرے اعضاء کے کاٹنے میں ہوتا ہے۔

سر، داڑھی اور برو کے بال کاٹنے دینے کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر داڑھی اور سر کے بال کو اس طرح اتار دیا جائے کہ آمیزہ بال نہ نکل سکیں تو ان میں سے ہر ایک پر تاوان واجب ہوگا۔ کیونکہ اس سے جو خوش نمائی ہوتی ہے وہ جاتی رہے گی۔ لیکن اگر انسان کے سر کے بال اس طرح

مونڈ دیئے جائیں کہ وہ پھر نکلنے کے قابل نہ رہیں یا ڈاڑھی کو اسی طرح مونڈا جائے تو فوری طور پر تاوان کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ دوبارہ بال نکل آنے کا انتظار ایک سال تک کیا جائے اگر وہ شخص جس پر یہ زیادتی کی گئی ہے اس سے پہلے ہی وفات پا جائے اور بال بالکل نہ نکلے ہوں تو مجرم پر تاوان عائد نہ ہوگا۔ کیونکہ اس امر کا احتمال ہے کہ اگر وہ زندہ رہتا تو بال نکل آتے تو اس صورت میں دیت کی بجائے حکومت کوئی فیصلہ کرے گی۔ اس میں مرد عورت یا چھوٹے بڑے سب کا یکساں حکم ہے۔ کیونکہ مرد کے لیے ڈاڑھی کے بال کا اپنے وقت پر نکل آنا خوش نمائی کا موجب ہے اور اسے مونڈ دینے سے انسان کا جمال اور کمال فوت ہو جاتا ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ فرشتے یہ ورد کرتے ہیں کہ ”سبحان من زین الرجال باللحی، والنساء بالزوائد“ (یعنی پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو ڈاڑھی سے اور عورتوں کو زلفوں سے آراستہ کیا) پس اس کے تلف کرنے پر تاوان واجب ہوگا۔ عورت کے سر کے بال کا بھی یہی حال ہے کہ بال اس کے سنگھار اور زینت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور مردوں کے لیے بھی زیب و زینت کا موجب ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس کے سر کا بال مونڈ دیا جائے یا اس کے سر کے بال خود ہی جھڑ جائیں یا گنجا ہو جائے تو یہ اسے ناگوار ہوتا ہے اور اسے اپنا سر ڈھک کر رکھنا پڑتا ہے۔ لوگوں کے سامنے سر کو کھولنے سے شرماتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ اس کے حسن و خوبی اور وجود میں نقص ہے بعض اہل عرب بال کی لڑیاں بنا کر لٹکا رکھتے ہیں۔ سینے اور پنڈلی کے بال اس سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان بالوں سے کوئی زیب و زینت نہیں ہوتی۔

مونچھوں کے بال مونڈنے کی سزا کا فیصلہ حکومت کرے گی، کیونکہ یہ بھی ڈاڑھی کی مانند اور اسی کا ایک حصہ ہے۔ لیکن غلام کی ڈاڑھی مونڈنے پر اس کی قیمت پوری کرنا ہوگی کیونکہ غلام کا مقصد تو محض اس سے خدمت لینا ہے زیب و زینت پیش نظر نہیں ہے۔ بخلاف آزاد شخص کی ڈاڑھی کے (کہ وہ موجب زیب و زینت ہے)۔

یہ اصحاب کہتے ہیں کہ چلی ڈاڑھی والا جس کی ٹھوڑی پر محدودے چند بال ہوں۔ ان کو اگر مونڈ دیا جائے تو اس پر کوئی تاوان عائد نہ ہوگا۔ کیونکہ ان کا ہونا بڑا معلوم ہوتا ہے۔ خوش نمائی نہیں ہے۔ اگر بال زیادہ ہوں اور تمام چہرے اور ٹھوڑی پر ہوں گو وہ چھدرے ہوں تو ان کے مونڈ دینے پر سزا کا فیصلہ حکومت کرے گی۔ کیونکہ (گو اس سے پورے طور پر خوش نمائی نہیں ہے تاہم) کسی قدر جمال ہے۔ ہاں اگر بال گھنیرے ہوں تو ان کے ضائع کرنے پر پوری ڈاڑھی کے تاوان کی طرح پورا تاوان عائد ہوگا۔ کیونکہ اسے چلی ڈاڑھی نہیں کہا جائے گا بلکہ مردانہ جمال کا موجب ہے۔ واضح ہو کہ یہ (دیت) اس حالت میں ہے جب کہ بال اگنے کی سطح کو اس طرح خراب کر دیا جائے کہ وہاں دوبارہ بال نہ نکل سکیں۔ اگر دوبارہ بال نکل آئیں اور پہلے کی طرح تمام پھیل جائیں تو اس جرم پر کوئی تاوان عائد نہ ہوگا۔ کیونکہ جرم کا کوئی اثر باقی نہ رہے گا۔ البتہ اس فعل ناجائز کے ارتکاب پر مجرم قابل تادیب ہے۔ اگر بال (دوبارہ سفید نکلیں اور معاملہ آزاد شخص کا ہے تو مجرم پر کچھ عائد نہ ہوگا کیونکہ سفید بال باعث زیادتی جمال ہے۔ لیکن اگر یہ کسی غلام کا معاملہ ہے تو اس جرم کا فیصلہ حکومت کرے گی۔ کیونکہ سفید ریش غلام کی قیمت کم ہو جاتی ہے اور صاحبین بھی یہی کہتے ہیں لیکن اس لیے کہ اگر بے وقت (سفید بال) نکل آئیں تو یہ عیب ہے خوبی نہیں ہے۔ اس قسم کی زیادتی دانستہ ہو یا غلطی سے دونوں حالت میں یکساں جرم ہے۔ چنانچہ جس طرح غلطی سے سر اور ڈاڑھی کے بال مونڈ دینے سے تاوان واجب ہوتا ہے اسی طرح قصداً بھی یہ جرم کیا

جائے تو تاوان واجب ہوگا۔

ان اصحاب کا کہنا یہ بھی ہے کہ دونوں ابروؤں کے بال کاٹ دینے پر بھی دیت واجب ہوگی اور ایک ابرو پر نصف دیت ہوگی۔ (وجوب دیت کا سبب یہ ہے) کہ اس کے کاٹنے سے چہرہ کی خوش نمائی جاتی رہتی ہے۔

شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر سر اور ڈاڑھی کے بال موٹے دیئے گئے تو اس جرم کا منصفانہ فیصلہ حکومت کرے گی۔ کیونکہ یہ (بال) انسانی وجود کی فالتوشے ہے۔ چنانچہ لوگ خود اپنا سر منڈا دیتے ہیں اور بعض علاقوں میں کچھ اشخاص ڈاڑھی بھی منڈاتے ہیں، لہذا اس کی حیثیت سینے اور پنڈلی کے بال کی مانند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر غلام کے (چہرے پر) بال ہوں تو اس کی قیمت بالاتفاق کم ہو جاتی ہے۔ یہ اصحاب کہتے ہیں کہ ابرو کے بال کاٹنے پر حکومت مناسب فیصلہ کرے گی خواہ ایک ابرو کے بال ہوں یا زیادہ کے کیونکہ یہ باعث جمال ہیں۔ اب یہ بالوں کا زائل کرنا خواہ عمدہ ہو یا غلطی سے۔ یہی حکم برنیوں کا ہے یعنی وہ بال جو پلکوں کے کنارے پر ہوتے ہیں ان کے ضائع کرنے کی سزا کا فیصلہ حکومت کرے گی۔ جب کہ وہ دوبارہ پیدا نہ ہوں۔ تاہم اگر دانستہ جرم کیا گیا ہے تو دوبارہ بال کے نکل آنے پر بھی سزا ہوگی۔ ہاں اگر غلطی سے وہ ضائع ہوئے ہیں تو کوئی تاوان نہ ہوگا۔

دونوں ہاتھوں اور دونوں پیروں کی دیت کا بیان

چاروں فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کا اس پر اتفاق ہے کہ دونوں ہاتھوں کے نقصان پر پوری دیت واجب ہوگی۔ اسی طرح دونوں پاؤں، دونوں لبوں یا دونوں فوطوں کے کاٹنے، جدا کر دینے یا کچل دینے پر بھی پورا تاوان لاگو ہوگا۔ اور ان سے کسی ایک کو تلف کیا جائے تو نصف تاوان عائد ہوگا۔ خسیوں کے ساتھ عضو مخصوص کاٹ دینے پر دو ہراتاوان ہوگا۔ حضرت سعید بن مسیب کی روایت کردہ حدیث میں یہی آیا ہے کیونکہ ان دو ہرے اعضاء میں سے اگر دونوں کو تلف کر دیا جائے تو ان سے جو فائدہ ہے وہ کلیۃً مفقود ہو جاتا ہے اور دونوں کے ہونے میں جو خوشنمائی ہے وہ کامل طور پر جاتی رہتی ہے۔ لہذا دونوں کے اتلاف پر پوری دیت اور ایک کے ضائع کرنے پر نصف دیت لاگو ہوگی۔

عورت کی دونوں چھاتیوں کے کاٹنے پر پوری دیت عائد ہوگی کیونکہ اس سے اس کا تمام جمال ختم ہو جائے گا۔ یہ تاوان اس صورت میں عائد ہوگا جبکہ خواہ دودھ کا نکلنا بند ہو جائے یا بند نہ ہو اور خواہ وہ عورت جوان ہو یا بوڑھی۔ بخلاف مرد کی چھاتی کے کہ اس کے (اتلاف کے) جرم کا عادلانہ فیصلہ حکومت کرے گی۔ کیونکہ اس سے نہ تو کوئی غرض فوت ہوتی ہے اور نہ جمال جاتا ہے اور بھٹیوں (سرپستان) کے کاٹنے سے بھی مجرم پر پوری دیت عائد ہوگی بشرطیکہ اس سے دودھ کا اخراج ختم ہو جائے۔ اگر (بند نہ ہو) بلکہ دودھ خراب ہو جائے تو یہ بند ہو جانے کی مانند ہے۔ اس صورت میں جو تاوان عائد ہوگا وہ دودھ کے موقوف ہو جانے اور دودھ پلانے کا مقصد فوت ہو جانے کا تاوان متصور ہوگا۔ نیز کہا جاتا ہے کہ یہ تاوان دودھ کے بند ہو جانے کا ہے۔ سرپستان کے کاٹنے کا تاوان نہیں ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر (کسی ارتکاب جرم کے نتیجہ میں) دودھ کا نکلنا بند ہو جائے گو (سرپستان کو) کاٹنا نہ گیا ہو تب بھی دیت عائد ہوگی۔ اگر جراحت رسانی سے دودھ بند نہ ہوا تو اس کی سزا کا منصفانہ فیصلہ حکومت کرے گی۔ اگر کسن لڑکی کی بھٹیاں کاٹ دی جائیں تو اس کے بعد ایام یاس (یعنی وہ وقت جبکہ چھاتیوں میں دودھ نہیں آتا) آ جانے تک انتظار کیا جائے اور اس پر ایک سال گزر جائے۔ ایام یاس

کے آنے تک (اگر دودھ نہ اترے) تو مجرم پر پورا تاوان عائد ہوگا اگر بدوران انتظار دودھ اتر آئے تو دونوں بھٹیوں کے بارے میں سزا کا فیصلہ حکومت کرے گی۔ اگر ایک بھٹی کٹی ہے تو نصف تاوان عائد ہوگا۔

آنکھ کی پلک اور برنیوں کے متعلقہ جرائم کا بیان

مالکیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ دونوں آنکھوں کی ہر پلک کے کاٹنے والے مجرم پر ایک چوتھائی تاوان عائد ہوگا۔ پلک پوشین کا وہ پردہ ہے جو آنکھ کو ڈھکتا ہے۔ خواہ یہ پردہ (پلک) بالائی ہو یا زیریں۔ اگر مجرم نے چاروں پلکیں کاٹ دی ہیں تو پورا تاوان عائد ہوگا خواہ مظلوم نابینا ہو یا برنیاں (پلک کے بال) نہ ہوں کیونکہ پلکوں سے جمال بھی ہے اور وہ کارآمد بھی ہیں دوسرے اعضاء بدن کے مقابلہ میں اس کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی تعداد چار ہے۔ پلکوں کے تلف کرنے کے جرم کا جو فیصلہ ہو اس میں برنیوں کا جرم بھی شامل ہے۔ بخلاف اس صورت کے جبکہ صرف برنیوں کو کاٹا گیا ہو اور دوسری بار پیدا ہونے کے قابل نہ رہی ہوں۔ (اس صورت میں) دوسرے بالوں کے متعلقہ جرائم کی طرح اس جرم کا فیصلہ بھی حکومت کرے گی بشرطیکہ بال دوبارہ نکلنے کے قابل نہ رہیں کیونکہ ان بالوں کے کٹ جانے سے (چہرہ کی) زیب و زینت جاتی رہتی ہے یہ اصل مقصد (بینائی وغیرہ) کے فوت ہونے کی سزا نہیں ہے۔ بصورت دیگر مجرم پر تعزیر عائد ہوگی۔ اگر سوکھی ہوئی پلک کو کاٹا تو اس کا فیصلہ حکومت کرے گی۔ اگر پلک کے سکیڑنے یا (خشک کر دینے) کا جرم کیا تو اس پر ایک چوتھائی دیت عائد ہوگی۔ ایک پلک کا کچھ حصہ تلف کرنے پر ایک چوتھائی تاوان کا اسی قدر حصہ عائد ہوگا۔ اگر ایک حصہ کاٹنے سے باقی حصہ بھی سکڑ جائے تب بھی پورا تاوان عائد نہ ہوگا۔ اگر جرم کے نتیجہ میں چاروں پلکیں اور دونوں آنکھیں تلف ہو گئیں تو دوہرا تاوان عائد ہوگا جیسا کہ عمرو بن حزم کی روایت میں آیا ہے بالخصوص اس لیے بھی کہ آنکھ (کی بینائی) کا فائدہ تمام اعضاء انسانی میں سب سے بڑا فائدہ ہے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر دونوں پلکوں کی جڑ عدا غلطی سے کاٹ دی تو اس کا تاوان واجب الاداء ہوگا۔ ایک پلک کی جڑ کاٹ دی تو چوتھائی دیت عائد ہوگی پلک کی جڑ سے مراد مجازی طور پر برنیاں (پلک کے بال) ہیں۔ ان اصحاب کا کہنا یہ ہے کہ پلک کی جڑ سے مراد وہ جگہ ہے جہاں پر بال اگتے ہیں۔ یعنی دونوں آنکھوں کے کنارے اور ان کی نوکیں، آنکھوں کے پردوں کو جس میں بال ہوتے ہیں پلک کہا جاتا ہے اور جبکہ چاروں (پلکوں) پر تعدی ہوئی ہو تو پورا تاوان عائد ہوتا ہے لہذا اگر ایک پر ہو تو چوتھائی تاوان ہوگا۔ اگر پلک کی جڑ سے مراد وہ جگہ ہے جہاں بال پیدا ہوتے ہیں تب بھی اس کا یہی حکم ہے۔ اگر پلکوں کو ابروؤں سمیت کاٹ دیا تو اس کا ایک تاوان ہوگا کیونکہ وہ ایک ہی عضو ہے، جیسے اونٹنی کے کان کا تراشہ (یا کھال مع بال)۔

انگلی وغیرہ کاٹ دینے کا بیان

فقہاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ہاتھ پاؤں کی انگلیوں میں سے کوئی ایک انگلی اگر کوئی شخص غلطی سے کاٹ دے تو اس پر کامل دیت کا دسواں حصہ عائد ہوگا۔ انگلی خواہ انگوٹھا ہو یا پننگلی، مرد کی ہو یا عورت کی یا چھوٹے کی ہو یا بڑے کی یا مسلمان کی ہو یا کافر کی۔ (تاوان کا) اونٹ چار پانچ سال کا ہونا چاہیے، آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے ”فسی کل اصبع عشر من الابل“ (یعنی ہر انگلی کا تاوان دس اونٹ ہے) (ہاتھ کی) تمام انگلیوں کے تلف کرنے کا پورا تاوان ایک سو

اونٹ ہے لہذا اس تاوان کو تمام انگلیوں پر تقسیم کیا جائے گا۔ (تاوان کے بارے میں) تمام انگلیاں یکساں حیثیت رکھتی ہیں کیونکہ حدیث کا مفہوم عام ہے، پھر یہ بھی ہے کہ کارآمد ہونے کے لحاظ سے تمام انگلیاں یکساں ہیں۔ ان میں سے ایک کو دوسری پر کوئی فوقیت نہیں ہے۔ اسی طرح دائیں اور بائیں ہاتھ (کی انگلیوں) میں باہم کوئی فرق نہیں ہے۔ یہی حال پیر کی انگلیوں کا ہے کہ اگر ساری انگلیوں کاٹ دی جائیں تو چلنے پھرنے کی تمام سہولت جاتی رہے گی۔ لہذا پورا تاوان عائد ہوگا اور چونکہ دونوں پیروں میں دس انگلیاں ہیں لہذا تاوان کو دس حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا اور ہر انگلی کے نقصان پر تاوان کا دسواں حصہ عائد ہوگا اور یہ تاوان ہر انگلی کے تین پیروں کے عوض ہے۔ تین پیروں میں سے ہر پور کے عوض ایک تہائی تاوان عائد ہوگا۔ ہاں اگر انگلی میں دو پور ہوں تو ہر ایک پور کے عوض انگلی کا نصف تاوان ہوگا۔ دیت کی یہ تقسیم ایسی ہی ہے جیسے ہاتھ کی دیت کو انگلیوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، لہذا انگلی کے ہر جوڑ کے عوض تین اونٹ اور ایک تہائی اونٹ (یعنی ۳/۱۰) تاوان ہوگا، ہاتھ کے انگوٹھے اور پیر کی انگلیوں کے علاوہ (کہ ان میں دو پوریں ہوتی ہیں) ان کے ہر پور کے عوض نصف تاوان یعنی پانچ اونٹ یا پچاس (۵۰) دینار تاوان واجب ہوگا۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ ہر دانت کے عوض پانچ اونٹ تاوان واجب ہوگا جیسا کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے جو ابو موسیٰ اشعری کی روایت کردہ حدیث میں ہے کہ ”وفی کل سن خمس من الابل“ (یعنی ہر دانت کا تاوان پانچ اونٹ ہے) دانت میں داڑھیں اور کچلیاں سب شامل ہیں کیونکہ حدیث لفظ ”سن“ (دانت) مطلق آیا یہ لفظ اسم جنس ہے جس میں تمام بہتر بتیں (۳۲) دانت شامل ہیں، پس اگر ایک شخص کو کسی نے نادانتہ ضرب پہنچائی جس سے اس کے تمام دانت اکھڑ گئے تو اس پر ایک بوری اور تین خمس دیت (تاوان) عائد ہوگا جس کی مقدار رسولہ ہزار (۱۶۰۰۰) درہم ہوتی ہے۔

انسان کے بدن میں دانت کے علاوہ کوئی عضو ایسا نہیں ہے جس کے تلف ہونے پر پورے تاوان سے زیادہ تاوان واجب ہوتا ہے۔ اب اگر عدا کسی نے جراحہ پہنچائی ہے تو بشرط ممکن مجرم پر قصاص عائد ہوگا۔ قطع نظر اس کے کہ دانت جڑ سے اکھڑ گئے ہوں یا صرف مسوڑے کے اندر چھپا ہوا حصہ باقی رہا ہو۔ یا دانت سفید ہوں اور جرم کے نتیجہ میں ان پر سیاہی آگئی ہو کیونکہ ایسی حالت میں دانت کا حسن جاتا رہتا ہے۔ یہی حکم اس حالت میں ہے جبکہ دانت سیاہ ہو کہ جھڑ جائیں یا سفید دانت سرخ ہو جائیں یا پیلے پڑ جائیں اور یہ سرخ یا پیلہ ہو جانا سیاہ ہو جانے کی طرح دانت کی خرابی شمار ہوتا ہے۔

آزاد مسلمان عورت کے دانت توڑ دیئے جائیں تو مجرم پر ڈھائی بعیر (کم سے کم چار سال کا شتر) تاوان عائد ہوگا اور ذمی کے دانت اکھاڑ دینے کا تاوان ایک بغیر اور دو تہائی بغیر ہے اور مجوسی (آتش پرست) کے دانت کا تاوان ایک تہائی بعیر ہوگا اور غلام کے دانت توڑ دینے کا تاوان ایک بعیر کی قیمت کا بیسوں حصہ، علیٰ ہذا القیاس۔

اگر کسی عضو کو جراحہ پہنچانے سے وہ عضو ناکارہ ہو جائے تو مجرم پر پورا تاوان عائد ہوگا۔ (ناکارہ ہونے کی صورت یہ ہے کہ) مثلاً زخم کے باعث ہاتھ شل (بے حرکت) ہو جائے یا آنکھ کی بینائی جاتی رہے۔ یہ تاوان اس عضو کی ہیئت بگاڑنے کا نہیں ہے بلکہ اسے بیکار بنادینے کا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی پہلے ہی لجا ہے اس کا (بے مصرف) ہاتھ کاٹ دیا تو اس پر تاوان عائد نہ ہوگا بلکہ حکومت عادلانہ فیصلہ کرے گی۔ یہ اس لیے ہے کہ (مثلاً) ہاتھ کا مقصد وہ فائدہ ہے جو اس سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر اس سے پہلے ہی خاطر خواہ فائدہ نہ تھا تو محض جمال کے فوت ہو جانے پر وہ جرم پورے طور پر

مستوجب تاوان متصور نہ ہوگا۔ ہاں اگر اپانچ کا ہاتھ پورے طور پر کارآمد ہو تو قصاص یا دیت کے واجب ہونے کے بارے میں اس ہاتھ کو سالم کی مانند تصور کیا جائے گا۔

اگر ایک شخص نے ضرب لگا کر کسی کی پیٹھ توڑ دی اور اسے کبڑا کر دیا تو مجرم پر پورا تاوان عائد ہوگا کیونکہ اس سے مکمل خوبی (کارکردگی) یعنی سیدھا کھڑے ہو جانے کی صلاحیت جاتی رہی۔ ہاں اگر یہ کبڑا پن زائل ہو جائے تو (تاوان) کچھ عائد نہ ہوگا کیونکہ تکلیف کا زائل ہو جانا جرم کے آثار میں سے نہیں ہے۔

عورت کے شفرین (یعنی پلہ ہائے اندام نہانی) کو جو ہڈی کے اوپر ہوتے ہیں، کے عوض عورت کا پورا تاوان عائد ہوگا درآنحالیکہ زخم ہڈی تک کھل جائے۔ اگر ہڈی نمایاں نہ ہو تو حکومت اس جرم کا مناسب فیصلہ کرے گی۔ دونوں شفرین میں سے اگر ایک متاثر ہوا ہے تو نصف دیت عائد ہوگی کیونکہ یہ عضو کارآمد بھی ہے اور باعث جمال بھی، اس سے مباشرت میں لذت حاصل ہوتی ہے اور پیشاب اور درار کے خون کو روکتا ہے اور نسوانی خوبی کی تکمیل اسی سے ہوتی ہے۔

اگر کسی شخص کے عضو مخصوص (آلہ تناسل) کو جس کا حشفہ (سر ذکر) پہلے ہی کٹا ہوا ہو، کاٹا جائے تو اس کا تصفیہ حکومت کرے گی۔ لیکن حشفہ (سر ذکر) کاٹنے پر پوری دیت عائد ہوگی۔ اگر کچھ حصہ کٹا ہے تو اسی نسبت سے تاوان عائد ہوگا۔ یعنی (عضو مخصوص کے) تاوان کا تعین حشفہ کے نقصان سے کیا جائے گا باقی عضو کے نقصان سے نہیں کیا جائے گا۔ پس اگر حشفہ کا ایک چوتھائی کٹا تو اس کا تاوان ایک چوتھائی ہوگا۔ اسی طرح ایک تہائی کے نقصان پر ایک تہائی اور نصف پر آدھا تاوان عائد ہوگا، علی ہذا القیاس۔

یہ اصحاب کا کہنا ہے کہ جرم متعدد ہوں تو تاوان بھی متعدد ہوں گے چنانچہ اگر کسی کے ذونوں ہاتھ کاٹے گئے جس کے صدمے سے اس کی عقل بھی زائل ہو گئی تو مجرم پر دو تاوان عائد ہوں گے، ہاتھوں کے تلف کرنے کا تاوان اور عقل کے ضائع کرنے کا تاوان، اور اگر اس کی آنکھ بھی جاتی رہی تو مجرم پر تین تاوان لاگوں ہوں گے۔ ایک تاوان ہاتھوں کا دوسرا عقل کا اور تیسرا بینائی کا کیونکہ ان میں سے ہر ایک بجائے خود کارآمد اعضاء ہیں اور فائدہ ان کا ہتھا وہ ختم ہو گیا۔ علی ہذا القیاس۔ چنانچہ روایت ہے کہ سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مجرم پر چار گنا تاوان عائد کرنے کا فیصلہ فرمایا کیونکہ اس کی ایک ضرب سے مضروب کی عقل جاتی رہی، بولنا بند ہو گیا، سننے اور دیکھنے سے محروم ہو گیا، لیکن زندگی رہ گئی اور اس نے چاروں تاوان وصول کیے۔ یہ حکم اعضاء انسانی کے احترام کے پیش نظر ہے۔

یہ اصحاب یہ بھی کہتے ہیں کہ جڑے کی ہڈی توڑ دینے پر بھی دیت واجب ہے کیونکہ یہ کارآمد ہے اور باعث جمال بھی۔ لہذا مجرم پر دیت عائد ہوگی۔ اگر ایک ہی جڑاٹوٹا ہے تو نصف دیت ہوگی۔ جیسے کان کی دیت ہوتی ہے۔ جڑوں سے مراد وہ ہڈیاں ہیں جن میں دانت لگے ہوتے ہیں، نچلا جڑاٹھوڑی کی ہڈی سے اور اوپر کا جڑا سر کی ہڈی سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔

جڑوں کے ضائع کر دینے پر تاوان عائد ہونے کے بارے میں بعض علماء کو تامل ہے کیونکہ اس کے متعلق کوئی حدیث رسول اللہ ﷺ کی نہیں آئی اور یہاں دوسری ہڈیوں پر قیاس کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ جڑے اندرونی ہڈیوں کی مانند

ہیں جیسے ہنسی اور پسلی کی ہڈیاں۔ پھر یہ بھی ہے کہ کلائی، بازو، پنڈلی اور ران کی ہڈی تلف کرنے پر تاوان نہیں ہوتا۔ البتہ زخم کے اثر کو پیش نظر رکھتے ہوئے مناسب سزا کا تصفیہ کیا جائے گا۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ (جڑے کی) دونوں ہڈیاں دوسری تمام ہڈیوں پر فوقیت رکھتی ہیں کیونکہ یہ چہرے کی ہڈیاں ہیں لہذا اس پر تاوان واجب ہوگا اور بقول صحیح جڑے کے تلف کرنے کے تاوان میں دانتوں کے اتلاف کا تاوان شامل نہیں ہے کیونکہ ان دونوں کی حیثیت مستقل اعضاء کی ہے ان کا بدل مقررہ ہے اور ان کے مخصوص نام ہیں۔ لہذا ایک کے تاوان میں دوسرے کا تاوان شامل نہ ہوگا۔ یہ دونوں ایسے ہیں جیسے دانت اور زبان۔

کہا جاتا ہے کہ جڑے کے تاوان میں دانت کا جرمانہ شامل ہے۔ جیسے انگلیوں کی دیت میں ہتھیلی کا تصفیہ شامل ہے۔ لیکن اس خیال کی تردید کی گئی ہے کیونکہ لفظ 'ہاتھ' کے مفہوم میں ہتھیلی اور انگلی شامل ہیں لیکن لفظ 'جڑا' کے مفہوم میں دانت داخل نہیں ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ 'جڑا' وہ عضو ہے جو دانت سے پہلے معرض وجود میں آتا ہے۔ جیسا کہ بچہ میں مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ بخلاف ہتھیلی اور انگلی کے (کہ وہ سب ایک ساتھ پیدا ہوتے ہیں) اور ایک ہی عضو کی مانند ہیں۔

ائمہ ثلاثہ کہتے ہیں کہ دونوں 'کولبے' جو ران اور پیٹھ کے جوڑ پر ابھرے ہوتے ہیں اگر ان کو غلطی سے زخم پہنچایا جائے تو پوری دیت عائد ہوگی کیونکہ ان میں خوبی بھی ہے اور سواری کرنے اور بیٹھنے میں کارآمد بھی ہے۔ اگر ان میں سے ایک کو تلف کیا جائے تو نصف دیت عائد ہوگی اور اگر کچھ حصہ اور اس کی مقدار کا تعین ہو سکے (کہ کس قدر تلف ہوا) تو اس کے موافق تاوان لاگو ہوگا اگر مقدار کا تعین نہ ہو سکے تو اس کا تصفیہ حکومت کرے۔ کولہا خواہ مرد کا ہو یا عورت کا۔ اس کے بھاری ہونے اور ہیبت میں جو اختلاف ہوتا ہے اسے نظر انداز کر دیا جائے گا۔ یہ اختلاف ایسا ہی ہے جیسے مختلف اشخاص کے (ہم نوع) اعضاء میں پایا جاتا ہے۔ اس جرم میں دیت عائد ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ زخم ران کی ہڈی تک گہرا ہو اور بقول قوی اگر زخم منہل بھی ہو جائے تو تاوان ساقط نہ ہوگا۔ اگر جرم کا ارتکاب عمداً ہوا ہے تو دونوں کو لھے کٹے ہوں یا ایک بہر صورت دیت واجب ہوگی۔

مالکیہ کا قول، ایک روایت کے مطابق، اس بارے میں یہ ہے کہ عورت کا کولہا اگر غلطی سے کٹ جائے تو اس کی سزا کے بارے میں تصفیہ کیا جائے گا جیسے مرد کے کولہوں کے اتلاف میں ہوتا ہے۔ لیکن اگر عمداً ارتکاب کیا ہے تو حکم قصاص عائد ہوگا۔

ائمہ اربعہ رحمہم اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ اگر (مجرم نے کسی کے) بدن کی کھال اتاری تو جس عضو کی کھال اتاری ہے اس کی دیت مجرم پر عائد ہوگی۔ بشرطیکہ وہ کھال دوبارہ آجانے کی توقع نہ ہو کیونکہ کھال سے خوشنمائی بھی ہوتی ہے اور کارآمد بھی ہے جیسا کہ ظاہر ہے، یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ اس (مظلوم) شخص کی زندگی بدستور باقی رہے کیونکہ دیت کا حکم اس حالت میں عائد ہوتا ہے جبکہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ کھال کھینچنے کے بعد زندگی باقی رہی۔ اگر کھال کھینچنے سے نہیں بلکہ کسی اور طرح سے اس کی موت واقع ہو جائے مثلاً کھال کھینچی جانے کے بعد کسی اور شخص نے اس کی گردن کاٹ دی تو اس شخص پر قصاص عائد ہوگا۔ کیونکہ اس نے جان لے لی ہے اور کھال کھینچنے والے پر تاوان عائد ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی اور شخص نے

اس پر دیوار گرا دی یا اونٹ سے کچلوا دیا یا کسی اور طرح سے ہلاک کیا تو اس کا حکم بھی یہی ہے۔ اگر مظلوم کھال اتارنے کے صدے سے مر جائے یا مجرم خود اس کی گردن کاٹ دے تو اس صورت میں اگر قصاص کی معافی ہو جائے تو جان کے عوض خون بہا واجب ہو ورنہ مجرم پر سزائے قصاص عائد ہوگی۔

یہ اصحاب کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص کی 'ترقوہ' (ہنسل) توڑ دے تو اس کی سزا کا فیصلہ دوسری ہڈیوں کی طرح کیا جائے گا۔ 'ترقوہ' بفتح التاء (یا ہنسل) وہ ہڈی ہے جو مونڈھے اور حلقوم کے درمیانی گڑھے سے ملحق ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس جرم کا تاوان ایک اونٹ ہے جیسا کہ روایت میں آیا ہے کہ سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (اس معاملہ میں) یہی فیصلہ فرمایا اور صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم نے اس سے اتفاق کیا۔ کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی۔ اور پہلا خیال اس بناء پر ہے کہ اس جرم کی سزا میں ایک اونٹ کا تاوان حکومت کے فیصلہ سے ہوا ہے۔

واضح ہو کہ ہر شخص کی دو ہنسلیاں ہوتی ہیں ایک دائیں جانب اور دوسری بائیں جانب۔

ان ہی اصحاب کا یہ کہنا ہے کہ اگر اس جرم کے ارتکاب سے مجروح شخص کے ہاتھوں کی گرفت جاتی رہے اور وہ شل ہو جائیں تب دیت عائد ہوگی کیونکہ اس (عضو) سے جو فائدہ تھا وہ جاتا رہا۔

اگر ریڑھ کی ہڈی کو ضرب پہنچی جس کے باعث دونوں پاؤں چلنے سے رہ گئے تو اس کا پورا تاوان ہوگا کیونکہ اس سے جو مقصد تھا (کہ پاؤں میں چلنے کی قوت رہے) وہ فوت ہو گیا اگر ہاتھ، پاؤں یا انگلیوں سے محسوس کرنے اور پکڑنے کی قوت جاتی رہی تو مجرم مستوجب دیت ہوگا۔ تاہم دیت اس زخم کے مندل ہونے تک وصول نہیں کی جائے گی۔ اب اگر پٹی باندھی گئی اور علاج کیا گیا اور گرفت کرنے، محسوس کرنے یا پیروں میں چلنے کی قدرت عود کر آئی تو دیت واجب نہ رہے گی۔ اگر زخم کے اچھا ہو جانے پر عیب رہ جائے تو اس کا فیصلہ حکومت کی رائے پر ہوگا۔ اور (ہاتھ پیر کی) قوت گرفت و رفتار میں جو نقص پیدا ہو گیا ہے اگر اس کا تصفیہ کیا جائے کہ اسکے کام اور جمال میں کس قدر کمی آئی ہے اور اس بارے میں اختلاف رائے ہو کہ خرابی کم ہوئی ہے یا زیادہ یا وہ شخص چلنے میں عصا کے سہارے کا محتاج ہو گیا ہے یا نہیں ہوا تو اگر اس نقص کا اندازہ لگایا جاسکے (کہ کس نسبت سے یہ نقص ہوا ہے) تب تو اسی مقدار نقص کے موافق تاوان کا حصہ واجب ہوگا۔ جیسا کہ سماعت، بصارت اور قوت گویائی وغیرہ کے اطلاق میں ہوتا ہے۔ اگر مجرمانہ طور پر کسی شخص نے دوسرے کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی اور پاؤں اور آلہ تناسل سلامت رہے لیکن وہ مجروح چلنے پھرنے اور مباشرت کے قابل نہ رہا یا قوت رفتار اور مادہ تولید تلف ہو گیا تو دو تاوان عائد ہوں گے ایک تاوان دونوں پیروں کے ناکارہ کر دینے کا اور دوسرا مادہ تولید کے ختم کر دینے کا کیونکہ ان دونوں کا اطلاق جدا جدا اسی طرح مستوجب تاوان ہے جس طرح اجتماعی طور پر ہوتا ہے، نیز ان دونوں اعضاء کے فوائد الگ الگ ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اس صورت میں ایک ہی تاوان واجب ہوگا کیونکہ ریڑھ مادہ تولید کا مرکز ہے اور صلاحیت رفتار و قوت جماع یہیں سے حاصل ہوتی ہے۔ پس چونکہ قوتوں کی جڑ ایک ہی عضو ہے۔ لہذا (اس کا اطلاق) ایک ہی دیت کا

متقاضی ہے۔ لیکن پہلی ہی بات کہ دونوں قوتوں کا مرکز ایک ہی ہے ناقابل تسلیم ہے اور اسی خیال کو ترجیح حاصل ہے۔ واضح ہو کہ سابقہ الذکر رائے کے مطابق اگر ایسی چوٹ لگائی کہ دونوں پاؤں شل ہو گئے۔ ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی اور مادہ تولید ختم ہو گیا تو تین تاوان عائد ہو گئے ایک پیروں کا دوسرا ریڑھ کا اور تیسرا مادہ تولید کے ختم ہو جانے کا۔ پس اگر ضرب سے آگے تاسل بھی شل ہو گیا تو چار تاوان لاگو ہوں گے۔ تین تاوان وہ جن کا ذکر ہوا اور چوتھا آگے تاسل کے ناکارہ اور ناقابل جماع ہو جانے کا۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ دونوں لب کاٹ دینے پر دیت واجب ہے اگر دونوں میں سے ایک لب کٹا تو آدھی دیت عائد ہوگی۔ جیسا کہ عمر بن حزم کے مکتوب میں آیا ہے: ”وفی الشفتین دية“ (یعنی دونوں لبوں کے اطلاق پر ایک تاوان ہے) اور اس لیے بھی کہ دونوں لبوں میں جمال بھی ہے اور سودمند بھی۔ لبوں ہی سے کلام کا امتیاز ہوتا ہے، تھوک اور غذا کو روکا جاتا ہے نیز لب کیڑے مکوڑے اور مٹی کو پیٹ میں چلے جانے سے روکتے ہیں۔ لبوں کو کاٹ دینا یا اسے شل (ناکارہ) بنا دینا یکساں جرم ہے۔

جان کے علاوہ دوسرے نقصانات کے قصاص کا بیان

چاروں امام رحمہم اللہ تعالیٰ اس امر پر متفق ہیں کہ اگر ایک شخص نے عدا کسی کا ہاتھ پہنچوں سے کاٹ دیا تو اس کے ہاتھ کو بھی پہنچے سے کاٹا جائے اگرچہ مجرم کا ہاتھ کٹے ہوئے ہاتھ سے بڑا ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”وَالْجُرْحُ قِصَاصٌ“ (المائدہ: ۴۵) (یعنی جراحت رسانی کا بدلہ ایسی ہی جراحت رسانی ہے) واضح ہو کہ سزائے قصاص (جرم و سزا) کی یکسانیت پر مبنی ہے۔ جن جرائم کی سزا میں یکسانیت ممکن نہ ہو ان میں قصاص نہیں ہوتا۔ چونکہ جوڑے سے ہاتھ کاٹنے کے جرم کی سزا جوڑے سے ہاتھ کاٹنے میں مماثلت ممکن ہے۔ لہذا اس کا لحاظ رکھا جائے گا۔ (جرم و سزا کی) یکسانیت میں عضو کے چھوٹے بڑے ہونے کا خیال نہیں کیا جائے گا کیونکہ ہاتھ کے عضو کا جو فائدہ ہے وہ دونوں صورتوں (یعنی چھوٹا بڑا ہونے) میں مختلف نہیں ہو جاتا، یہی حکم پاؤں اور ناک کے دونوں ٹھنوں اور دونوں کان کے نمایاں اعضاء کے کاٹنے کا ہے، کیونکہ ان اعضاء کے جرائم میں سزا کی یکسانیت کا ملحوظ رکھنا ممکن ہے پس اگر کسی نے پہلے (ہاتھ کی) انگلیاں کاٹ دیں اس کے بعد اسی نے یا کسی اور شخص نے ہتھیلی کو کاٹ دیا خواہ پہلا زخم آرام ہو جانے کے بعد کاٹا ہو یا آرام ہونے سے پہلے ہی کاٹ دیا خواہ پہلا زخم آرام ہونے سے پہلے ہی کاٹ دیا ہو تو اس جرم کی سزا کا تصفیہ حاکم خود کرے گا، یہی حکم اس حالت میں ہے جبکہ ہتھیلی کا بالائی حصہ کاٹ دیا ہو، اگر کسی نے عدا دھار دار آلے سے آنکھ پر ضرب لگائی اور آنکھ نکال دی تو اس کا قصاص نہیں ہے، کیونکہ آنکھ نکالنے کے عمل کے ساتھ (سزا کی) یکسانیت دشوار ہے، لیکن اگر آنکھ بچ رہے اور بینائی جاتی رہے تو قصاص لازم ہے کیونکہ اس جرم (ازالہ بینائی) کو اس کی سزا (ازالہ بینائی) سے مماثلت ہے، اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ پہلے ایک آئینہ کو سخت گرم کیا جائے پھر مجرم کے چہرے پر روئی کو تر کر کے اور اس کی آنکھ کے سامنے اس (دہکتے) آئینے کو رکھا جائے تو آنکھ کی روشنی جاتی رہے گی، روایت ہے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اسی طرح کیا کرتے تھے، اس سے قطع نظر کہ وہ آنکھ چندھے، کانے، رتوندھے والے، یا شب کو رکھی ہو، کیونکہ ان سب کو آنکھ کا جو فائدہ ہے وہ حاصل ہے۔

دانتوں کے بارے میں ان اصحاب کا کہنا ہے کہ دانت کے جرم (دندان شکنی) پر قصاص واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”السن بالسن“ (المائدہ: ۴۵) (یعنی دانت کا بدلہ دانت ہے)۔ اگرچہ مجرم کا اپنا دانت اس دانت سے بڑا ہو جو اس نے توڑا، کیونکہ دانت چھوٹا ہو یا بڑا، فائدہ کے لحاظ سے یکساں ہے، دانت کے علاوہ کسی اور ہڈی کے توڑنے پر قصاص نہیں ہے، جیسا کہ حضرت عمر بن الخطاب اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ”لا قصاص فی العظم“ (یعنی ہڈی کے توڑنے میں قصاص نہیں ہے) یہ دانت کے علاوہ دوسری ہڈیوں کے لئے ہے، کیونکہ دانت کے علاوہ دوسری ہڈیوں کے توڑنے کے جرم کی سزا اس جیسی ممکن نہیں ہے، کیونکہ اس میں (سزا کا جرم سے) کم یا زیادہ ہونے کا احتمال ہے، بخلاف دانت کے کہ مجرم نے دانت کو جس قدر توڑا ہے اس کے دانت کو بھی ریتی سے اتنا ہی رگڑا جاسکتا ہے، (یہ کیفیت کسی اور ہڈی کی نہیں ہے) اور اگر دانت جڑ سے اکھاڑا گیا اور اس کی یاداش میں مجرم کا دانت جڑ سے اکھاڑ دیا گیا تو (جرم و سزائیں) یکسانیت ہو جائے گی، ایک روایت میں آیا ہے ”ان المربع عمة انس بن مالک رضی اللہ عنہ کسرت ثیبة جاریة من الانصار بلطمه فامر النبی ﷺ بالقصاص“ (یعنی حضرت انس بن مالک کی پھپی نے ایک انصاریہ لڑکی کو ایسا طمانچہ مارا کہ اس کی کچلی توڑ دی اس پر آنحضرت ﷺ نے قصاص کا حکم دیا)۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ جان کے علاوہ کسی اور جرم میں شبہ عہد جیسا کوئی جرم نہیں ہے، دوسرے تمام جرائم یا تو غلطی سے ہوں گے یا عمدہ ہوں گے یا عمدہ کیے جائیں گے (تیسری کوئی صورت جرم نہیں ہے) اور شبہ عہد (یعنی وہ جرم جو عمدہ ارتکاب کے مشابہ ہو) کا تعلق آلہ ارتکاب سے ہے، اور قتل ہی ایک ایسا جرم ہے کہ اس کی نوعیت آلہ ارتکاب کے مختلف ہونے کی بناء پر مختلف ہو جاتی ہے، بخلاف دوسرے اعضائے بدن کے جرائم کے کسی عضو کے تلف کرنے کا جرم آلہ ارتکاب کے مختلف ہونے کی بناء پر متعین نہیں ہوتا، لہذا اس جرم کی دو ہی قسمیں ہیں، کہ یا تو ارتکاب جرم عمدہ ہوگا یا غلطی سے، اگر جرم قتل کے علاوہ کوئی اور جرم عمدہ ارتکاب کے مشابہ ہو تو اسے بھی عمدہ ارتکاب جرم تصور کیا جائے گا، اور جس جرم کا قصاص ممکن نہ ہو اسے جرم خطا قرار دیا جائے گا۔

ان اصحاب کا بھی کہنا ہے کہ اگر کسی نے ایک شخص کا ہاتھ نصف ساعد (کہنی سے مونڈھے تک کے حصہ) سے کاٹ دیا یا ایسا گہرا زخم لگایا (جس سے ہڈیاں نظر آنے لگیں) اور وہ زخم مندمل ہو گیا تو اس پر حکم قصاص عائد نہ ہوگا، ان صورتوں میں (جرم و سزا کے درمیان) یکسانیت کو ملحوظ رکھنا ممکن نہیں ہے، کیونکہ پہلی صورت میں ہڈی توڑی گئی ہے اور (ہڈی کے جرائم میں) مقدار جرم کا تعین ممکن نہیں ہے، اسی طرح ایسے زخم کا مندمل ہو جانا بہت کم ہوتا ہے اور اکثر اوقات ایسا زخم موجب ہلاکت ہوتا ہے، اگر ہاتھ کو ذراع (یعنی کہنی سے انگلیوں تک کے حصہ) کے درمیان سے کاٹا یا بازو کے درمیان سے کاٹا تو کف دست کے قصاص کا مستوجب ہوگا، اور پہلی صورت میں مجرم کا ہاتھ ”گئے“ سے کاٹا جائے گا کیونکہ یہ اس جگہ سے قریب تر ہے جہاں سے ہڈی توڑی گئی اور دوسری صورت میں مجرم کا ہاتھ کہنی سے کاٹا جائے گا کیونکہ یہ اس جگہ سے قریب تر ہے جہاں سے ہڈی کاٹی گئی، باقی صورتوں میں حکومت کو خود تصفیہ کرنا واجب ہے کہ تاوان کا کس قدر حصہ لاگو کرے

جائے، ان دونوں صورتوں میں مجروح کو قصاص لینے یا اس کے عوض مال وصول کرنے کا حق ہے، اور (مجرم کا ہاتھ) پہنچوں سے کاٹ دینے کا مطالبہ ممکن ہے۔

لہجے کا سالم ہاتھ والے کے ہاتھ کاٹنے (اور اسی کے مثل جرائم) کا بیان

ائمہ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ اگر سالم ہاتھ کاٹنے والا مجرم لہجہ ہو تو دست بریدہ شخص کو اختیار ہے کہ چاہے تو لہجے کے عیب دار ہاتھ کاٹ دے، اس کے بعد کوئی اور مطالبہ نہیں کر سکتا یا چاہے تو اس جرم کا پورا جرمانہ وصول کرے، قصاص لیا گیا تو وہ پورا قصاص نہ ہوگا (کیونکہ سالم ہاتھ کے بدلے لہجہ ہاتھ کاٹا جائے گا) البتہ وہ اپنے حق سے زیادہ لے سکتا ہے یا پھر اس جرم کا پورا تاوان وصول کر لے جیسا کہ مثلی سزاؤں میں ہوتا ہے جبکہ جرم اطلاق کرنے کے بعد مجرم لوگوں کے ہاتھ سے نکل جائے۔ پس اگر مجروح ناقص قصاص کو پورا قصاص تصور کرے تو گویا وہ اس پر راضی ہے لہذا اب اس کا اور کوئی حق باقی نہ رہے گا، جیسے کوئی شخص عمدہ شے (کا حقدار ہونے کے باوجود اس) کی بجائے گھٹیا شے لینے پر راضی ہو۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ اگر ایک زخم خوردہ شخص نے کسی کا سر پھوڑ دیا اور اس زخم کا شکاف مجرم کے قرنین (یعنی پیشانی دونوں ابھری ہوئی ہڈیوں) کے درمیانی حصہ کے برابر پھیلا ہوا ہو تو مجروح کو اختیار ہے کہ وہ صرف اپنی جراحت کے موافق قصاص لے اور دائیں بائیں جدھر سے چاہے لے یا پھر اگر چاہے تو اس جرم کا تاوان وصول کر لے کیونکہ جرم جراحت رسائی مستوجب تاوان صرف اس لیے ہے کہ اس سے عیب پیدا ہو جاتا ہے اگر (حق سے) زیادہ قصاص لیا تو مجرم کے عیب میں زیادتی ہو جائے گی، اگر زخمی کرنے والے کے ماتھے کی ہڈیوں کے درمیانی حصہ سے قصاص لیا تو یہ اس جرم پر زیادتی ہوگی جو مجروح کے ساتھ کیا گیا اور پورا قصاص لینے میں مجرم کو اس قدر عیب لاحق ہوا، لہذا اسے اختیار ہے جیسے کہ لہجے کا ہاتھ کو تندرست ہاتھ کے عوض کاٹنے میں ہوتا ہے، اگر صورت حال اس کے برعکس ہو (یعنی تندرست آدمی زخم خوردہ کا سر پھوڑ دے) تب بھی مجروح کو اختیار ہے (کہ اپنے حق سے کم قصاص پر اکتفا کرے یا جرمانہ وصول کر لے) کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ اپنا واجب حق قصاص پورا کر سکے، اس میں حق سے تجاوز ہوگا (کیونکہ وہ پہلے ہی زخم خوردہ تھا اس کے عوض تندرست کا سر پھوڑنا زیادتی ہے)، اسی طرح اگر مجرم نے سر کو لمبائی میں زخمی کیا ہو تو اس کا قصاص پیشانی سے لے کر گدی تک کے حصے سے لیا جاسکتا ہے، گدی اس میں شامل نہ ہو، اس بارے میں مجروح کو (قصاص کا) اختیار ہے کیونکہ (زخم سر کے) معنے میں اختلاف نہیں ہے۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ زبان اور آلہ تناسل کا قصاص نہیں ہوتا کیونکہ ان میں قبض وسط (یعنی سکڑنا اور پھیلنا) ہوتا ہے، لہذا (جرم و سزا میں) یکسانیت ممکن نہیں ہے بجز اس صورت کے جبکہ حشفہ (سر زکریا سپاری) کو کاٹا جائے اس صورت میں اس جگہ کا تعین ممکن ہے جہاں سے کاٹا گیا جیسا کہ اعضاء کے جوڑ میں ہوتا ہے اگر حشفہ (یا آلہ تناسل کی سپاری) کا کچھ حصہ کاٹا تو اس کا قصاص نہیں ہے۔ کیونکہ اس ٹکڑے کی مقدار نہیں معلوم ہو سکتی، بخلاف کان کے کہ وہ پورا بھی کاٹا جاسکتا ہے اور اس کا کچھ حصہ بھی کیونکہ وہ سکڑتا ہے نہ پھیلتا ہے، اور عضو کان کی ایک مستقل تعریف ہے (کہ کان کس عضو کو کہتے ہیں؟) لہذا اس (کے متعلقہ جرائم) میں سزا و جرم کے درمیان یکسانیت کو ملحوظ رکھا جاسکتا ہے۔

ہونٹ کی بابت یہ ہے کہ اگر اسے پورا کاٹ دیا جائے تو قصاص واجب ہوگا، کیونکہ اس جرم کی سزا میں یکسانیت کا لحاظ رکھا جاسکتا ہے، لیکن اگر اس کا کچھ حصہ کاٹا جائے تو اس کی سزا میں یکسانیت کا لحاظ دشوار ہے کیونکہ وہ حصہ سکڑتا اور پھیلتا ہے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ آلہ تناسل اگر جڑ سے قطع کیا جائے یا زبان، ناک کے نتھنوں، فوطوں یا اندام نہانی کے دونوں پلوں کو کاٹ دیا جائے تو قصاص واجب ہے بشرطیکہ حق سے بغیر تجاوز کے پورا پورا قصاص لینا ممکن ہو۔ اگر ہڈی کے قصاص کیلئے گوشت کو پھاڑنا پڑے تو وہ قصاص عائد نہ ہوگا۔ خواہ مجرم نے گوشت پھاڑے بغیر وہ جرم کیا ہو یا بغیر پھاڑے کیا ہو، اگر مقطوع العضو شخص جرم قطع کے نتیجے میں مر جائے تو پہلے مجرم کا حصہ بدن کاٹا جائے اور انتظار کیا جائے کہ مجرم اس زخم کے سرایت کر جانے کے باعث خود نہ مر جائے، اگر ایک خاص میعاد کے اندر وہ نہ مرے تو اس کا سر کاٹ دیا جائے۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ دائیں ہاتھ، آنکھ، نتھنے، فوطے یا دائیں پلک یا دائیں کو لمبے کا قصاص بائیں جانب کے ان اعضاء سے نہیں لیا جائے گا اسی طرح بالائی پلک، بالائی دانت یا دائیں ہاتھ پاؤں کی انگلیوں کے بالائی پوروے کا قصاص نچلے اعضاء مذکورہ سے نہیں لیا جائے گا، نیز بائیں جانب کے اعضاء بدن کا قصاص دائیں طرف کے اعضاء سے نہیں لیا جائے گا اور نہ نچلے اعضاء کا قصاص بائیں اعضاء سے لیا جائے گا، کیونکہ ان اعضاء میں باہم یکسانیت اور مساوات نہیں ہوتی، ان کے محل وقوع مختلف ہونے کے باعث ان کی افادیت میں بھی اختلاف ہوتا ہے، اسی طرح صحیح سالم عضو کا قصاص شل اور مقابلہ ناکارہ عضو سے نہیں لیا جائے گا، اگرچہ مجرم خود اس کے لیے تیار ہو، کیونکہ شل عضو بے فائدہ اور ناکارہ ہو جاتا ہے چنانچہ دیکھتی آنکھوں کا حلقہ تلف کرنے پر نابینا آنکھ کو قصاص میں نہیں نکالا جائے گا ناک اور کان اس حکم سے مستثنیٰ ہیں لہذا ان میں سے سوکھے ہوئے عضو کے بدلے میں صحیح عضو کو قصاص میں تلف نہیں کیا جائے گا، کیونکہ (شل ہو جانے کے بعد بھی) ان کی افادیت یعنی آواز، ہوا اور جمال باقی رہتے ہیں۔ اگر کسی کا عضو تناسل مع فوطوں جڑ سے کاٹ دیا گیا تو ان کے ناکارہ ہو جانے کے باعث مجرم پر دو پورے ثاوان عائد ہوں گے، قوی عضو کے اتلاف پر ضعیف عضو کو کاٹ دینا جائز ہے، اسی طرح صحیح آنکھ کے اتلاف پر دکھتی ہوئی آنکھ کاٹی جاسکتی ہے، کیونکہ یہ سزا حق واجب سے کم پر اکتفا کرنا ہے، لیکن یہ اس صورت میں صحیح ہے جبکہ مجرم کی آنکھ کا خون بند ہو سکے اگر خون بند نہ ہو تو یہ قصاص نہ ہوگا کیونکہ یہ عضو بدن کے عوض جان لینا ہے اور مجرم کی تباہی کا موجب ہے۔

ہڈی توڑنے پر حکم قصاص عائد نہ ہوگا، کیونکہ اس میں جرم کی حد متعین نہ ہونے کے باعث اسی جیسی سزا نہیں دی جاسکتی۔ ہڈی میں، پسلی پیٹھ، کلائی پنڈلی، ران اور بازو وغیرہ کی ہڈیاں شامل ہیں۔

یہ اصحاب کہتے ہیں کہ ہر ایسے زخم پر جو گہرا ہو اور ہڈی تک کھل گیا ہو لیکن ہڈی نہ ٹوٹی ہو قصاص لاگو ہوگا اور اس کی حیثیت وہی ہے جو چہرے یا سر کی جراحت موضحہ کی ہے، اس سے مراد وہ زخم ہے جو اتنا گہرا ہو کہ ہڈی نظر آنے لگے، ایسے زخم کے حدود کا متعین کرنا آسان ہے اور مجرم کو اسی طرح زخمی کر کے قصاص لیا جاسکتا ہے۔ یہی حکم بازو اور پنڈلی کے گوشت کو کاٹنے اور ان کو زخمی کرنے کا ہے کہ ان تینوں جرائم میں قصاص عائد ہوگا جبکہ زخم ہڈی تک پہنچ جائے، ان جرائم میں

قصاص اس لیے ہے کہ ان کا پورا پورا قصاص لیا جاسکتا ہے، اگر بدن کا زخم موضعی (یعنی ہڈی تک پہنچا ہوا) نہ ہو اور چہرے یا سر کا زخم ہو تو اس کا جرمانہ شریعت نے پانچ اونٹ رکھا ہے ان کے علاوہ بدن کے دوسرے زخموں کا منصفانہ تصفیہ حکومت کرے گی جیسا کہ دوسرے زخموں میں ہوتا ہے۔

اندھی آنکھ، بہرے کان، گونگی زبان، اپانچ ہاتھ اور پاؤں، ناکارہ ٹانگ، مضحل عضو تناسل، سوکھے ہوئے فوطوں کو زخمی کرنے کی سزا کا تصفیہ محض حکومت کا کام ہے۔

مجرم کے ناکارہ یا مقطوع ہاتھ کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر وہ ہاتھ جسے مجرم نے کاٹا صحیح تھا اور کاٹنے والے کا ہاتھ شل (ناکارہ) تھا اور حاکم نے دست بریدہ شخص کو اس امر کا اختیار دیا کہ وہ چاہے تو مجرم کے شل ہاتھ کو کاٹ دے اور جرمانہ سے دست بردار ہو جائے یا چاہے تو ہاتھ کا پورا تاوان وصول کر لے۔ اب قبل اس کے وہ مجروح اپنے اختیار کو کام میں لائے بدور ان مدت اختیار مجرم کا مریض ہاتھ جھڑ گیا یا کسی نے مجرمانہ طور پر اس کا ہاتھ کاٹ دیا تو ایسی صورت میں مجروح (مظلوم) کو جو (قصاص یا تاوان میں سے کسی امر کے) اختیار کرنے کا حق دیا گیا تھا وہ ختم ہو جائے گا اور مزید کچھ مطالبہ کا حق نہ رہے گا کیونکہ اس کا مقررہ حق قصاص اس کی اپنی مرضی سے وصولی مال کے حق میں منتقل ہوا اور جب محل قصاص فوت ہو گیا تو یہ حق (وصولی مال) بھی ساقط ہو گیا، بخلاف اس صورت کے جبکہ مجرم کا ہاتھ قصاص یا سزائے سرقہ میں کاٹا گیا ہو، تو اب صرف جرمانہ عائد ہوگا جو پوری دیت کا نصف ہوگا، اس طرح مستحق کا حق ادا ہوا اور تاوان کا مدعا پورا ہو گیا، لیکن اگر اپانچ مجرم کا علاج کیا گیا اور اس کا اپانچ پنا جاتا رہا اور ہنوز پورا جرمانہ وصول نہ ہوا تھا تو اب قصاص کے علاوہ اور کچھ واجب نہ ہوگا، کیونکہ ان اصحاب کے نزدیک اس کا مقررہ حق قصاص ہی ہے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ (اس صورت میں بھی) دونوں باتوں میں سے ایک واجب ہے، یعنی قصاص یا تاوان ہاں اگر محل قصاص کے فوت ہو جانے کے باعث ایک امر پر عمل محال ہو جائے جیسا کہ حالت زیر نظر میں ہے تو دوسری بات یعنی جرمانہ واجب ہو جائے گا۔

ایک مجرم کے متعدد جرمانوں کا سزاوار ہونے کا بیان

ائمہ اربعہ نے اس صورت حال کی تفصیل بتائی ہے جبکہ ایک شخص متعدد جراحات رسانی کا مرتکب ہونے کے باعث متعدد تاوانوں کا سزاوار ہو جائے، مثلاً اس نے کئی اعضاء کاٹ دیئے اور (مجروح کو) مختلف فائدوں سے محروم کر دیا ہو جن کی تعداد بہت ہے۔ بعض اصحاب نے ان کی تعداد بیس (۲۰) بلکہ اس سے زیادہ بتائی ہے، بعض کہتے ہیں کہ ان کی تعداد چودہ (۱۴) ہے، ان کے منجملہ عقل، سماعت، بصر، قوت شامہ، گویائی، آواز، ذائقہ، چہانہ، مادہ تولید کا انزال، حمل رکھوانا، اظہار مدعا کرنا، جماع کرنا، پکڑنا، چلنا، بال تراشنا یا کھال اتارنا وغیرہ ہیں۔ (ان فوائد سے محروم کر دینا جرم ہے) ان جرائم کے ساتھ اور جرائم بھی شامل ہیں جنہیں گہرے زخم اور عام جراحاتیں، پیٹ پھاڑنا، تصفیہ طلب جرائم، ہڈیوں کا توڑنا

اور دوسرے بے شمار جرائم ہیں، اور ایک شخص متعدد جرائم کا مرتکب ہو سکتا ہے چنانچہ اگر کسی نے ایک شخص کے کئی اعضاء تلف کر دیئے تو وہ متعدد تاوانوں کا سزاوار ہوگا مثلاً دونوں ہاتھ، دونوں پیر اور دونوں کان کاٹ دیئے تو ان سب کا قصاص ہوگا اسی طرح مختلف صلاحیتوں (کے اتلاف) پر متعدد تاوان عائد ہوں گے، مثلاً سماعت بصارت قوت شامہ قوت ذائقہ اور نسل پیدا کرنے کی صلاحیتیں ہیں کہ ہر ایک کا تاوان ہے، اب اگر ان جرائم کا ارتکاب کیا اور متاثر ہونے والا ان جرائم یا ان میں سے کسی ایک جرم کے اثر سے وفات پا جائے اور بعض زخم مندمل نہ ہوئے ہوں تو مجرم پر ایک تاوان عائد ہوگا اور تمام تاوان اسی کے اندر شامل ہو جائیں گے اور مذکورہ جرائم کا بدلہ ساقط ہو جائے گا، کیونکہ وہ تاوان جان ہو جائے گا، لیکن اگر مجروح شخص بعض جراحات کے سرایت کر جانے سے مر جائے اور دوسرے زخموں کو آرام ہو جائے تو جو زخم مندمل ہو گئے ان کے تاوان خون بہا میں قطعاً داخل نہ ہوں گے اور یہی حکم اس صورت میں ہے جبکہ مجرم کوئی ہلکا سا زخم لگائے جس کے جسم میں سرایت کر جانے سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس کے بعد مجرم نے پیٹ پھاڑ دیا اور پیٹ کا زخم جسم میں سرایت کر گیا جس سے موت واقع ہو گئی اور وہ ہلکا زخم ہنوز مندمل نہ ہوا تھا تو اس زخم کا جرمانہ خون بہا میں شامل نہ ہوگا۔ تاہم وہ زخم جس کی دیت مقرر نہیں ہے (اس کا جرمانہ) خون بہا میں شامل متصور ہوگا، اسی طرح اگر مجرم نے زخم لگایا اور ہنوز وہ اچھا نہ ہوا تھا کہ مجروح کی گردن کاٹ دی تو اس پر، بقول صحیح، صرف خون بہا عائد ہوگا، کیونکہ یہ خون بہا دوسرے جرائم کا تاوان عائد ہونے سے پہلے لاگو ہوا لہذا اس جرم کا بدلہ سرایت زخم (کے بدل) کی طرح خون بہا میں داخل متصور ہوگا۔

کہا جاتا ہے کہ (خون بہا عائد ہونے سے پہلے کی) تمام قسم کی جراحات رسانیوں کا تاوان بھی (مجرم پر) عائد ہوگا، کیونکہ سرایت کرنے والا زخم مجروح کے قتل ہو جانے پر جرم قتل سے جداگانہ جرم متصور ہوگا، اور یہ بھی ایسا ہی ہے جیسے مندمل ہو جانے والا زخم (جس کا تاوان خون بہا میں داخل نہیں ہوتا)، کیونکہ تاوان آدمی (کے تحفظ کی) ایک مقررہ ضمانت ہے جس کی پابندی مسلم ہے۔

اگر مجرمانہ فعل کی نوعیت مختلف ہو مثلاً کسی کی گردن عدا کاٹی اور اس سے پہلے جو زخم پہنچائے گئے وہ نادانستہ یا مشابہ بہ عمد تھے یا اس کے برعکس گردن تو بغیر عمد کے کٹ گئی اور اس سے پہلے جو جرائم تھے وہ عدا یا مشابہ بہ عمد تھے تو صحیح ترین مسلک کی رو سے اس کے خون بہا میں دوسرے جرائم کے تاوان شامل نہ ہوں گے بلکہ جراحات اعضاء کا تاوان (الگ) اور جان کے ہلاک کرنے کا خون بہا (الگ) عائد ہوگا، کیونکہ ان دونوں جرائم کی نوعیت اور محل جرائم (یعنی اعضاء متاثرہ) مختلف ہیں۔ پس اگر ایک شخص کی غلطی سے یا بطور شبہ عمد کے کسی کے دونوں ہاتھ یا دونوں پاؤں کٹ گئے پھر اس شخص نے عدا اس کی گردن کاٹ دی یا (اس کے برعکس) ان اعضاء کو تو عدا کاٹا اور غلطی سے یا بطور شبہ عمد کے گردن کٹنے کا جرم سرزد ہو گیا، اور متاثر ہونے والے کے ولیوں نے جرائم کو خون بہا کے عوض معاف کر دیا تو پہلی صورت میں جرم خطا یا جرم شبہ عمد کا ایک تاوان اور عدا ارتکاب جرم کا ایک تاوان عائد ہوگا اور دوسری صورت میں دو تاوان عدا ارتکاب کے عائد ہوں گے اور ایک تاوان جرم خطا کا ہوگا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دونوں صورتوں میں دیتیں ساقط ہو جائیں گی، اگر (جراحات رسانی کے) مجرم کے سوا گردن کسی اور شخص نے کاٹی تو ان سب کے تاوان متعدد ہوں گے، کیونکہ ایک انسان کا عمل دوسرے

انسان کے عمل میں شامل نہیں ہوتا، لہذا دونوں میں سے ہر ایک پر جو الزام عائد ہوگا اس کی سزا واجب ہوگی پس جس نے زخم پہنچانے کا جرم کیا وہ اس کا تاوان دے اور جن نے قتل کیا وہ خون بہا ادا کرے۔

ایسے جرائم کا بیان جن میں سزا کے لیے حکومت کی تجویز درکار ہے

ائمہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا اس امر میں اتفاق ہے کہ جہاں (قصاص کی بجائے) مال واجب ہو وہاں تاوان کی کوئی مقدار مقرر نہیں ہے، اور نہ مقررہ تاوان کے ساتھ کوئی مناسبت ہے، جیسا کہ پسی، سینہ، ران اور گٹے وغیرہ (کے جرائم) ہیں البتہ اگر (جرم مستوجب مال کے) تاوان کی نسبت معلوم المقدار جرم کے تاوان سے ہو سکے مجرم نے جو زخم لگایا وہ زخم موضع یا پیٹ پھاڑنے کے قریب قریب ہو تو اس کا تاوان محل جرم کے بڑے حصے کے برابر اور حکومت کی تجویز پر موقوف ہو گا۔ اور یہ تاوان کا ایک حصہ ہوگا جو بقول صحیح دیت نفس (خون بہا) کی نسبت سے عائد ہوگا، اس بارے میں کہا جاتا ہے کہ جراحت رسیدہ عضو کا تاوان اسی نسبت سے عائد ہوگا جس نسبت سے اس جیسے صفات والے غلام مملوک کی قیمت میں زخمی ہو جانے کے بعد کمی ہو جاتی ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص نے کسی کا ہاتھ زخمی کر دیا تو دیکھا جائے گا کہ اگر مجروح اسی جیسی صفات رکھنے والا، غلام مملوک ہوتا تو مجروح ہوئے بغیر اس کی قیمت کیا ہوتی، اگر (مثلاً) اس کی قیمت ایک (۱۰۰) سو دینار بتائی جائے پھر دیکھا جائے کہ زخمی ہونے کے بعد اس کی کیا قیمت ہوگی اور یہ معلوم ہو کہ اب (زخمی ہو جانے کے بعد) اس کی قیمت تو (۹۰) رہ گئی، تو یہ فرق دس دینار یعنی دسواں حصہ) ہوا۔ لہذا مجروح کے خون بہا کا دسواں حصہ جو دس (۱۰) اونٹ ہوتا ہے مجرم پر واجب الا ادا ہوگا در آنجا لیکہ مجروح، آزاد، مرد اور مسلمان ہو، چونکہ ایک شخص کے پورے وجود کی کفالت کے لیے دیت کی مقدار مقرر کر دی ہے لہذا اس کے جزو بدن کی کفالت اس دیت کے متناسب جزو سے ہوگی جیسا کہ فروخت کے مال میں عیب کی صورت میں ہوتا ہے۔

اس بارے میں ایک دوسرا قول یہ ہے کہ تاوان اس عضو کی نسبت سے لگایا جائے جسے زخمی کیا گیا، جان کے خون بہا کی نسبت سے نہ ہوگا لہذا صورت مذکورہ میں جراحت رسیدہ ہاتھ کے تاوان (مقررہ) کا دسواں حصہ عائد ہوگا، جو پانچ اونٹ ہوتا ہے، اگر ایک انگلی کا جرم ہے تو ایک اونٹ تاوان ہوگا اور اگر انگوٹھے کے علاوہ کسی انگلی کا ایک پورا ضائع ہوا تو ایک تہائی اونٹ تاوان ہوگا، دوسرے جرائم کے فیصلوں کو بھی اسی نظیر پر قیاس کیا جائے گا۔

واضح ہو کہ سزائے جرم کی تجویز کا استدلال مجروح آزاد کو غلام قرار دینے کی بناء پر ہوگا۔ ائمہ فقہاء کا کہنا ہے کہ ایسے جرائم (کی سزا تجویز کرنے) میں جن کے تاوان کی مقدار مقرر نہیں ہے، آزاد کے حق میں غلام کو بنیاد قرار دیا جائے جیسا کہ شریعت نے ان جرائم میں بھی جن کے جرمانے کی مقدار (شرعاً) مقرر ہے آزاد کے حق میں غلام کو بنیاد قرار دیا گیا ہے (یعنی اس کے وجود اور اعضاء کی قیمت ہے)۔

(تاوان بارے میں) حکومت کو اختیار ہے کہ وہ اونٹ کی شکل میں (مجوزہ) جرمانہ عائد کرے یا نقدی کی شکل میں، دونوں باتیں موقع محل کے تقاضوں کے مطابق جائز ہیں کیونکہ پیش نظر مقصد (وجود انسانی کے حق) کفالت کو پورا کرنا

اور مظلوم کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی کرنا ہے، اس میں فقہاء کا اختلاف ان اعضاء کے متعلقہ جرائم کے تاوان کے بارے میں ہے جن کی مقدار (شرعاً) مقرر ہے پس ایسے اعضاء کے متعلقہ جرائم جن کا تاوان مقرر نہیں ہے مثلاً سینہ یا ران وغیرہ کے جرائم، سوان جرائم میں تاوان کی تجویز قطعی طور پر خون بہا کی نسبت سے کی جائے گی۔

ایک عورت کی ڈاڑھی کی جگہ کو تلف کرنے کے تاوان کا اندازہ بالغ غلام کی ڈاڑھی (کے اطلاق) سے، جو اس کا موجب جمال ہے، لگایا جائے گا، اسی طرح کا حکم منٹ کے بارے میں ہے۔

اگر کسی کا زائد دانت اکھاڑا یا زائد انگلی کاٹ دی اور اس سے کوئی نقص پیدا نہ ہوا تو اس کے تاوان کی مقدار کا اندازہ عضو زائد کی حیثیت سے لگایا جائے گا موجودہ اصلی انگلی کی حیثیت سے نہیں، اس کے لیے مجروح کی وہ قیمت لگائی جائے گی جو (بحیثیت غلام کے) زائد انگلی کی موجودگی میں ہو پھر زائد عضو کے کٹ جانے کے بعد اس کی قیمت لگائی جائے گی، جس سے فرق واضح ہو جائے گا، کیونکہ عضو زائد سے وجاہت میں کمی اور اس سے ایک طرح کا جمال حاصل ہوتا ہے۔ اگر زائد انگلی کی پور کائی جائے تو اس کے تاوان (کے تعین) کو تناسب سے مستثنیٰ رکھا جائے گا۔ اور اس کے تاوان کی تجویز اس انگلی کی پور کے ساتھ کی جائے گی اس کی مقدار کا تعین قاضی (حاکم شرع) اپنی رائے سے کرے گا، تناسب کا لحاظ ممکن نہیں ہے۔ اگر کسی ایسے عضو (کے نقصان) کی تجویز تاوان کرنا ہو جس کے تاوان کی مقدار (شرعاً) مقرر ہے مثلاً ہاتھ یا پاؤں (کا زخم ہے) اس کے لیے یہ شرط ہے کہ مجوزہ تاوان اس عضو کی (مقررہ) مقدار تاوان سے زیادہ نہ ہو، تاکہ ایسا نہ ہو کہ جس عضو کے جرم کا تاوان ادا کیا گیا اس عضو کی کفالت (یعنی بصورت جراحت اس کا قابل تاوان ہونا) بدستور باقی رہے لہذا انگلی کے پور کی جراحت یا ناخن کو انگلی سے جدا کر دینے یا انگلی کو درمیان سے چیر دینے کی سزائے تاوان جو تجویز کی جائے وہ (انگلی کی مقررہ تاوان سے) کم ہونی چاہیے نیز جراحت رسانی کا ایسا جرم جو زخم جائفہ یا اسی طرح کے جرم مثلاً پیٹ پھاڑنے وغیرہ سے کم ہو اس کی سزا جراحت جائفہ (یعنی ہڈی تک پہنچنے والے گہرے زخم) کے جرمانہ کے برابر نہ ہو، اگر اس کے برابر سزا تجویز کی جائے تو قاضی اپنی رائے سے اس میں کچھ کمی کر دے تاکہ مذکورہ بالا خرابی پیدا نہ ہو، یہ کافی نہیں ہے کہ مجوزہ تاوان اور مقررہ تاوان میں سے جس کی مقدار کم ہو اسی قدر فیصلہ کیا جائے جیسا کہ امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کہتے ہیں، اگر ایسے عضو کے تاوان کا فیصلہ پیش نظر ہو جس کا تاوان مقرر نہیں ہے جیسے ران، بازو، پیٹھ یا ہتھیلی وغیرہ تو اس کے لیے شرط یہ ہے کہ مجوزہ تاوان دیت نفس (یا خون بہا) کے برابر نہ ہو جائے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اس کی مقدار اتنی نہیں ہو سکتی، کیونکہ (بہر حال) کل جزو سے زیادہ ہوتا ہے۔ پس یہاں پر اس سے مراد یہ ہے کہ تاوان کی مجوزہ مقدار اس عضو کے جرمانہ کے برابر نہ ہو جس کے تاوان کی مقدار مقرر ہے۔ اگر مجوزہ تاوان کی مقدار زیادہ ہو اور وہ (یعنی مجوزہ تاوان والا) عضو مقررہ تاوان والے عضو کے تابع ہے جیسے ہتھیلی جو انگلیوں کے تابع ہے تو اس (مجازہ تاوان کے صحیح ہونے) کی شرط یہ ہے کہ مجوزہ تاوان، مقرر شدہ تاوان سے زیادہ نہ ہو، ہاں اگر ہتھیلی کا مجوزہ تاوان صرف ایک انگلی کے تاوان کے برابر ہو جائے تو مضائقہ نہیں، کیونکہ ہتھیلی کی افادیت ہٹانے اور سمیٹنے کی صلاحیت میں ایک انگلی سے زیادہ ہے اسی طرح اپاچ ہاتھ (سے متعلق جرم) کا تاوان سالم ہاتھ کی دیت کے برابر نہ ہو جائے البتہ ایک انگلی کی دیت کے برابر ہو تو جائز ہے بلکہ

اس سے زائد بھی ہو جائے تو مضائقہ نہیں، لیکن بازو کو ہتھیلی کے برابر نہیں رکھا جاسکتا کہ اس کے زخم کا تجویز کردہ تاوان انگلیوں کے تاوان کے برابر ہو جائے کیونکہ ہتھیلی انگلیوں کے ساتھ ہونے کے باعث ان کی تابع ہے بازو انگلیوں کے تابع نہیں ہے کیونکہ وہ انگلیوں سے دور واقع ہے۔ پس اگر ہاتھ کو گتے سے کاٹ دیا تو اس کا تاوان وہی ہوگا جو انگلیاں چھانٹ دینے کا ہے۔ اگر ہاتھ کہنی سے کاٹ دیا گیا تو ہاتھ کے تاوان کے ساتھ بازو کا تجویز شدہ نصف تاوان بھی عائد ہوگا۔

واضح ہو کہ جرم کی سزا تشخیص کرنے کے لیے مجروح کو مملوک (غلام) فرض کر لیا جائے گا لیکن تشخیص زخم کے مندرجہ ہونے کے بعد ہونی چاہیے۔ اس سے پہلے نہ کی جائے، کیونکہ زخم جسم میں سرایت کر کے موجب ہلاکت بھی ہو سکتا ہے، یا ایسے اعضاء کے تلف کرنے کا موجب ہو سکتا ہے، جس کے تاوان کی مقدار مقرر ہے۔ ایسی صورت میں وہی مقررہ تاوان عائد ہوگا مجوزہ (یا مشخص) تاوان عائد نہ ہوگا۔ اگر زخموں کے مندرجہ ہونے کے بعد عضو مجروح کی افادیت میں کوئی کمی نہ ہو، نہ جمال میں فرق آئے، اور نہ قیمت میں کمی ہو تو زخموں کے پہنچنے سے پہلے مندرجہ ہونے تک کے دوران کم سے کم جو نقص ہوا ہے اسی کے پیش نظر تاوان مقرر ہوگا اور اس پر عمل کرنا اس لیے ضروری ہے کہ بے گناہ پر جرم عائد نہ ہو، اگر خون بہنے کے وقت جو نقص تھا اس کے علاوہ اور کوئی نقص ظاہر نہ ہو تو اس حالت میں مجروح کی قیمت لگائی جائے گی اور اس زخم کو خون نکالنے والا زخم تصور کیا جائے گا۔ (مطلب یہ ہے کہ زخمی حالت میں غلام کی قیمت غیر مجروح حالت کے مقابلہ میں جس قدر کم ہوگی وہی تاوان ہوگا) اگر زخم خفیف ہو اور مجروح کے زخم سے خون بہنے کا کوئی اثر نہ ہوا ہو تب بھی مجرم کو اس سزا کا مستوجب قرار دیا جائے گا جو تھپڑ مارنے یا ایسی ضرب لگانے کی صورت میں ہوتی ہے جس کا بعد میں کوئی اثر نہیں رہتا۔ یہ سزا اس لیے لازم کی گئی ہے کہ عناد کا سد باب ہو جائے اور حکومت پر اعتماد کیا جاسکے۔

کہا جاتا ہے کہ ایسی صورت میں قاضی اپنی رائے سے تاوان کی تشخیص کرے گا، تا کہ جرم بے باز پرس کے نہ رہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس پر تاوان نہیں بلکہ سزا واجب ہے جیسے کہ زد و کوب کرنے یا تھپڑ مارنے میں ہوتا ہے جبکہ اس کا نشان جسم پر نہ رہے، وہ زخم موضع (ہڈی تک کھل جانے والے زخم) کی مانند ہے، جس سے زخم کے ارد گرد عیب لاحق ہو جاتا ہے۔ اس کے تاوان کی تشخیص جدا گانہ نہیں ہوتی اور وہ زخم جس کا تاوان مقرر نہیں ہے زخم دامیہ (جس میں صرف خون نکل آئے) کی مانند ہے اس سے جو عیب لاحق ہو اس کے (تاوان کی) تشخیص زخم کے ماہرین سے کرائی جائے کیونکہ حکومت اس کا پتہ لگانے سے قاصر ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ زخم سر کے سوا اور جگہ کے زخموں کا قصاص، اس عضو (مجرم) سے لیا جانا شرط ہے۔ چنانچہ دائیں طرف کے عضو کی جراحت کا قصاص مجرم کے بائیں عضو سے یا اس کے برعکس قصاص لینا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح یہ بھی جائز نہیں ہے کہ اگر مثلاً کسی نے انگشت شہادت کاٹی تو اس کے بدلے مجرم کا انگوٹھا کاٹا جائے، نیز اگر مجروح کا (زخم خوردہ عضو) لبا ہے اور مجرم کا وہ عضو چھوٹا ہے تو اس کی کمی ثانی الذکر کے کسی اور عضو سے پوری نہیں کی جائے گی۔

واضح ہو کہ اگر طبیب (یا ڈاکٹر) جو مقدار قصاص کی تشخیص میں شریک ہے، عہد زخم کا حجم اصل زخم سے زیادہ بتائے تو جس قدر اس نے زیادہ بتایا اتنے حصہ کا قصاص اس سے لیا جائے، اگر زخم کا حجم عہد اصل حجم سے کم بتایا، اور مجروح اس زخم

سے مر جائے، تب تو طبیب سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا، جبکہ عدا قصاص لینے میں زیادتی نہ کی گئی ورنہ حکم سے زیادہ سزا دینے پر قصاص عائد ہوگا۔

اگر (محل جرم محل قصاص) یکساں نہ ہوں یا طبیب نے عدا زیادتی نہ کی ہو بلکہ اس سے (حجم زخم کی تشخیص میں) غلطی ہو گئی ہو تو مجرم پر (قصاص نہیں بلکہ) دیت واجب ہوگی، پس اگر مثلاً مجرم نے چھنگلیا (چھوٹی انگلی) کاٹی اور مجرم کی چھنگلیا نہ ہو تو قصاص واجب نہ ہوگا کیونکہ محل قصاص وہی نہیں ہے بلکہ تاوان عائد ہوگا۔ اب اگر جرم عدا کیا گیا ہے یا جرم ایسا ہے جس میں ایک تہائی سے کم دیت عائد ہوتی ہے تو اس کا تاوان مجرم کے مال سے وصول کیا جائے گا، اور اگر جرم غلطی سے سرزد ہو گیا، لیکن اس کی دیت ایک تہائی سے زیادہ ہے تو وہ تاوان عاقلہ (تاوان کے ذمہ دار رشتہ دار) پر عائد ہوگا، یہ ایسا ہی ہے جیسے اندھے کی آنکھ کہ اگر کسی آنکھ والے نے جرم کیا اور اس آنکھ کو نکال دیا تو اندھی آنکھ کے عوض صحیح آنکھ نہیں نکالی جائے گی، کیونکہ دونوں میں یکسانیت نہیں ہے، ایسی صورت میں قصاص نہ ہوگا اور نہ نصف دیت عائد ہوگی بلکہ اس کی سزا کی تشخیص منصفانہ فیصلہ کی بناء پر ہوگی اور وہ اس لحاظ سے ہوگی کہ آنکھ اندھی ہو جانے پر ایک شخص کی قیمت میں کس قدر کمی آ جاتی ہے لیکن اگر مجرم نابینا ہے اور اس نے ایک بیٹا شخص کی آنکھ پھوڑ دی تو قصاص عائد نہ ہوگا۔ سالم آنکھ کے عوض اندھی آنکھ نہیں نکالی جائے گی، بلکہ مجرم پر نصف دیت واجب ہوگی اگرچہ جرم عدا کیا گیا ہو۔ اسی طرح وہ زبان جو بول نہیں سکتی بولتی زبان کے قصاص میں نہیں کاٹی جائے گی۔ اگر صورت حال اس کے برعکس ہو تب بھی قصاص نہ ہوگا، بلکہ بولتی زبان میں دیت عائد ہوگی اور گوئی زبان کی صورت میں سزا حکومت تجویز کرے گی جیسا کہ اندھی اور دیکھتی آنکھوں کے بارے میں بیان ہوا۔

چہرے پر تھپڑ مارنے کا قصاص نہیں ہے، درآنحالیکہ اس سے زخم نہ ہوا ہو اور نہ (چہرے کی) افادیت گئی ہو اور نہ عقل زائل ہوئی ہو اگرچہ چہرے کے سوا کسی اور جگہ پر ہاتھ سے مارا جائے، مثلاً گدی سے دھکا دیا اور اس سے کوئی زخم نہیں ہوا اور نہ اس کی افادیت زائل ہوئی تو اس جرم پر قصاص عائد نہ ہوگا اور یہ تھپڑ مارنے کی مانند متصور ہوگا۔

ڈاڑھی یا شفر چشم کے بال کاٹ دینے پر قصاص نہیں ہے، شفر بضم شین و سکون فایک کو کہتے ہیں ابرو کے بال کاٹ دینے پر بھی قصاص نہیں ہے لیکن اگر یہ جرم عدا کیا گیا تو اس پر سزائش کی جائے گی، غلطی سے سرزد ہونے پر نہیں، اور ڈاڑھی، آنکھ اور پلکوں کے بال سے متعلقہ جرائم پر سزا کی تشخیص حکومت کرے گی بشرطیکہ وہ بال دوبارہ پہلے کی طرح پیدا نہ ہو جائیں، یہ حکم اول تو اس لئے ہے کہ پلکیں اور بھویں ایسے اعضاء نہیں ہیں جن سے کام لیا جاسکے اور نہ خلقی طور پر ان کی کوئی نمایاں افادیت ہے، تاہم اگر ان اعضاء کو ضرب پہنچانے سے زخم ہو جائے یا ان کی افادیت جاتی رہے تو اس پر قصاص واجب ہو جائے گا۔

عدا کوڑے سے ضرب پہنچانے پر قصاص عائد ہوگا، گو اس سے کوئی زخم نہ ہوا ہو اور نہ اس کی افادیت جاتی رہی ہو، کیونکہ تازیانہ سے مارنا محض تادیب کے پیش نظر یا سزائے شرعی کے طور پر ہوتا ہے اور بالعموم اس سے جان کا ضرر نہیں ہوتا۔

اگر زخم (کے کسی حصہ پر) سخت خطرناک زخم پہنچایا جائے تو اس پر قصاص نہ ہوگا چنانچہ جراحات منقلہ (جس میں ہڈی ٹوٹ کر اپنی جگہ سے ہٹ جائے) یا جراحات آمہ (چند یا کا وہ زخم جو دماغ کی ہڈی کے خول تک پہنچ جائے) میں تو قصاص قطعاً نہیں ہوتا کیونکہ یہ دونوں زخم ہوتے ہی خطرناک ہیں، (اس کے لیے سخت خطرناک ہونے کی شرط ضروری نہیں ہے) پس سینے کی ہڈی یا ریڑھ کی ہڈی توڑنے پر قصاص نہیں ہے، اور فوطوں کے کچلنے پر قصاص نہ ہوگا بلکہ اس جرم کے مرتکب پر پوری دیت عائد ہوگی، لیکن زخم کے مندل ہو جانے کے بعد، بخلاف اس صورت کے جبکہ ان دونوں کو کاٹ دیا جائے یا محض زخمی کیا جائے کہ اس میں مجرم سے قصاص لیا جائے گا، کیونکہ اس سے جان کا خطرہ نہیں ہے۔

اگر کسی کو ایسی جراحات پہنچائی جس پر قصاص عائد ہوتا ہے، مثلاً وہ زخم موضع ہے (یعنی گہرا ہے جو ہڈی تک پہنچ جائے) اور اس زخم کے باعث مجروح کی بینائی بھی جاتی رہی یا ہاتھ شل (ناکارہ) ہو گیا تو اس کا قصاص ہوگا اور مجرم کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنا واجب ہوگا جیسا کہ اس نے جرم کیا، پس اگر مجرم کو بھی ویسا ہی زخم پہنچایا گیا جس سے مجروح کی بصارت وغیرہ جاتی رہی یا مجرم کو اس سے بھی زیادہ نقصان پہنچ گیا بایں طور کہ قصاص میں جو موضع (گہرا زخم) لگایا گیا اس سے مجرم کی بصارت کے ساتھ قوت سماعت بھی جاتی رہی تو اس پر اس مجرم کو جس سے قصاص لیا گیا اعتراض کا کوئی حق نہیں ہے کیونکہ اس نے جو ظلم کیا تھا اس کی پاداش میں اسی طرح قصاص کا سزاوار تھا جیسا کہ اس نے کیا اور زیادہ نقصان جو ہوا وہ منجانب اللہ متصور ہوگا۔

اگر مجرم سے اسی طرح قصاص لیا گیا جیسا اس نے جرم کیا تھا، لیکن اس سے مزید نقصان ہوا یعنی مجرم کی بصارت وغیرہ پر کوئی اثر نہیں ہوا، اور مجرم کا وہ جرم عدا تھا تو مجرم کا جو نقصان ہوا ہے اس کا تاوان مزید مجرم پر عائد ہوگا اگر وہ جرم غلطی سے سرزد ہوا تھا تو اس کے عاقلہ (ادائے قصاص کے ذمہ دار اشخاص) پر تاوان واجب ہوگا جیسے اس صورت میں ہوتا ہے جبکہ کسی نے ایک شخص کے فوطے (یا بیضہ آکہ تناسل) پر اس طرح کی ضرب لگائی جس پر قصاص عائد نہیں ہوتا یا چہرے پر مارا یا گدی سے دھکا دیا تو اس طرح کی چوٹ پر قصاص نہیں ہے، قصاص صرف جراحات رسانی پر ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”والبصروح قصاص“ (یعنی قصاص جراحات رسانی پر ہے) پس اگر اس طرح کی چوٹ سے (احیانا) بصارت جاتی رہے تو مجرم کو اسی طرح کی ضرب نہیں پہنچائی جائے گی، بلکہ تاوان واجب ہوگا، ہاں اگر مجرم کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جیسا کہ اس نے جرم کیا تھا تو قصاص عائد نہیں ہوتا لیکن اس سے بصارت کا جانا ممکن ہے تو وہی عمل کیا جاسکتا ہے، مثلاً مجرم نے کوئی ایسی بات کی جس سے مظلوم کی بصارت باقی رہی تو مجرم کے ساتھ بھی وہی عمل کیا جائے گا، اگر ایک شخص نے کسی کا عضو بدن (مثلاً ہاتھ) کاٹ دیا اور اس کے بعد خود مجرم کا وہی عضو کسی اور شخص کے ساتھ عدا جرم قطع کے ارتکاب کی پاداش میں کاٹ دیا گیا، یا کسی آسانی حادثے سے اس کا وہی عضو کٹ گیا، یا چوری کی سزائے شرعی میں اس کا ہاتھ کاٹا گیا یا اس کے کسی سابقہ جرم کی پاداش میں جو کسی اور کے ساتھ اس نے کیا اس کا ہاتھ کاٹا گیا تو اب مظلوم کا کوئی مطالبہ اس مجرم پر نہ ہوگا نہ قصاص کا اور نہ تاوان کا، کیونکہ اسے حق مطالبہ اسی کے عضو جیسے عضو کے متعلق ہو سکتا تھا اور وہ عضو باقی نہیں ہے، اسی طرح اگر جرم قطع عضو کا مجرم مر جائے تو اس کے ورثہ پر کوئی مطالبہ عائد نہ ہوگا، ہاں اگر مجرم کا وہ عضو (جو محل قصاص ہے) ارتکاب

جرم سے پہلے ہی کٹا ہوا ہو تو (قصاص کی بجائے) دیت عائد ہوگی۔

اگر مجرم نے کسی کا کوئی عضو کاٹا اور اس کا اپنا وہی عضو اس کٹے ہوئے عضو سے زیادہ قوی ہے تو (کمزور عضو کے بدلے اس کے) قوی عضو کو قصاص میں کاٹنا جائز ہے چنانچہ اگر کسی نے ایک ایسے شخص کی آنکھ تلف کرنے کا جرم کیا جس کی بصارت قدرتی طور پر یا کبرسنی کے باعث کمزور ہو تو اس کے عوض مجرم کی تندرست آنکھ تلف کر دی جائے گی بشرطیکہ مظلوم کی بصارت نہایت ہی کمزور نہ رہی ہو اگر عضو محل جرم مقابلۂ نہایت ہی ضعیف ہو تو (قصاص کی بجائے) دیت واجب ہوگی۔

اگر ایسے شخص نے جس کی دونوں آنکھیں سالم ہیں کسی کانے کی آنکھ پھوڑ دی تو اس (کانے) کو اختیار ہے کہ چاہے تو اپنی تندرست آنکھ جیسی مجرم کی آنکھ تلف کر دے یا پورا تاوان یعنی اپنی آنکھ کا تاوان مجرم کے مال سے وصول کر لے۔ اگر ارتکاب جرم عدا ہوا ہے اور مشہور مسلک یہی ہو تو قصاص ہی امر حتمی ہوگا (قصاص اور دیت کا جو اختیار دیا گیا وہ نہ رہے گا) مظلوم کو (تاوان یا قصاص کا) اختیار اس لئے دیا گیا ہے کہ مجرم اور مظلوم دونوں کی آنکھیں یکساں نہیں ہیں کیونکہ مظلوم کی آنکھ کی دیت ایک (۱۰۰۰) ہزار دینار ہے بخلاف مجرم کی آنکھ کے کہ اس کی دیت پانچ (۵۰۰) سو دینار ہے اگر قصاص میں آنکھ کو لازم قرار دیا جائے تو اعلیٰ کے بدلے قصاص میں ادنیٰ کا لینا ہوگا جو مجروح پر ظلم ہے اس لئے اسے اختیار دینا واجب ہوا۔

اگر کسی کانے نے سالم آنکھوں والے کی ایسی آنکھ پھوڑ دی جو اس کی (سالم) آنکھ کی مانند تھی تو جائز ہے کہ (قصاص میں) اس کی سالم آنکھ کو پھوڑ دیا جائے اس طرح اسے اندھا ہونا پڑے گا یا اگر وہ قصاص سے دست بردار ہو جائے تو اپنی آنکھ کے عوض ایک (۱۰۰۰) ہزار دینار کی رقم وصول کر سکتا ہے کیونکہ قصاص میں محل قصاص کا (محل جرم سے) یکساں ہونا مسلم ہے اور کانے کی دوسری آنکھ کی دیت پوری دیت ہوگی کیونکہ کانہ شخص اپنی ایک آنکھ سے وہی کام لیتا ہے جو صحیح آنکھوں والا اپنی دونوں آنکھوں سے لیتا ہے۔

اگر کسی کانے نے شخص نے صحیح آنکھ والے کی وہ آنکھ پھوڑ دی جو اس کی (سالم) آنکھ کی مانند تھی یعنی وہ آنکھ پھوڑی جو اس کی اندھی آنکھ کی مانند تھی تو مجرم کے مال میں سے نصف دیت عائد ہوگی اور مظلوم کو مطالبہ قصاص کا حق نہ ہوگا کیونکہ محل قصاص کو (محل جرم سے) مماثلت نہیں ہے۔

اگر کسی کانے نے ایک شخص کی دونوں سالم آنکھیں عدا پھوڑ دیں خواہ ایک ساتھ پھوڑی ہوں یا یکے بعد دیگرے پھوڑی ہوں اور بقول راجح خواہ وہ آنکھ جو اس کی آنکھ کی مانند ہے پہلے پھوڑی ہو یا بعد میں پھوڑی ہو تو مظلوم کو قصاص لینے کا حق ہے بایں طور کہ مجرم (کانے) کی وہ آنکھ پھوڑ دی جائے گی جو مظلوم کی سالم آنکھ کی مانند ہے اور اسے بھی اندھا کر دیا جائے گا علاوہ اس کے وہ مظلوم نصف تاوان مزید مجرم سے وصول کرے گا جو مجرم کی اس آنکھ کے بدلے میں ہوگا جو (بے بصارت ہونے کے باعث) مظلوم کی آنکھ جیسی نہیں ہے (مظلوم) سالم آنکھوں والے کو بنا بر مماثلت یہ اختیار نہ ہوگا کہ وہ قصاص لے یا تاوان وصول کرے کیونکہ اگر دونوں آنکھ کے تاوان وصول کرنے کا اختیار ہو تو ایک پورا اور ایک کا نصف تاوان لینا لازم نہ ہوگا یہ صاحب شریعت علیہ السلام کے ارشاد کے خلاف ہے۔

انگلیوں اور ہتھیلی کے تاوان کا بیان

شافعیہ مالکیہ اور حنفیہ کہتے ہیں کہ ہاتھ کی انگلیوں کے کاٹنے کا تاوان (پورے ہاتھ کا) نصف ہوگا، کیونکہ انگلیوں کے کاٹ دینے سے ہاتھ سے پکڑنے کی صلاحیت جاتی رہتی ہے جو تاوان کے واجب ہونے کا سبب ہے، اگر انگلیوں کے ساتھ ہتھیلی بھی کاٹ دی تب بھی نصف دیت (تاوان) عائد ہوگی، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ”وفی الیدین الیدۃ وفی احداهما نصف الیدۃ“ (یعنی دونوں ہاتھ کی دیت ایک پوری دیت ہے اور ایک ہاتھ کی دیت نصف ہوگی) پھر یہ بھی ہے کہ ہتھیلی انگلیوں کے تابع ہے کیونکہ انگلیوں ہی سے پکڑا جاتا ہے، اگر ایک ہاتھ کو نصف بازو سے کاٹ دیا تو انگلیوں اور ہتھیلی کا تو نصف تاوان ہوگا اور اس سے زیادہ جو نقصان ہوا ہے اس کے تاوان کا فیصلہ حکومت سے ہوگا کیونکہ شریعت نے ایک ہاتھ کا تاوان نصف مقرر فرمایا ہے اور ہاتھ نام ہے اس عضو کا جو مونڈھے تک ہے، پس شریعت کی مقرر کردہ حد سے تجاوز نہیں کیا جاسکتا، اگر ہتھیلی کو جوڑ (گئے) سے جدا کیا گیا اور اس میں صرف ایک انگلی تھی تو اس کا تاوان پوری دیت کا دسواں حصہ ہوگا اور اگر اس ہتھیلی میں دو انگلیاں ہوں تو پانچواں حصہ تاوان ہوگا اور محض ہتھیلی کاٹ دینے پر کچھ عائد نہ ہوگا، کیونکہ اصل شے انگلیاں ہیں اور ہتھیلی حقیقتہً اور شرعاً انگلیوں کے تابع ہے، کیونکہ قوت گرفت انگلیوں سے ہے، اگر کٹی ہوئی ہتھیلی کے ساتھ تین انگلیاں ہوں تو پوری انگلیوں کا تاوان عائد ہوگا، ہتھیلی کا بالاتفاق کوئی تاوان نہیں ہے کیونکہ بنیادی طور پر ہتھیلی کا وجود انگلیوں سے ہے اور انگلیوں کی بیشتر تعداد کو پوری تعداد قرار دیا جائے گا، ہتھیلی ان کے تابع ہوگی اگر انگلیوں کی بیشتر تعداد موجود ہے تو گویا تمام انگلیاں ثابت ہیں۔

یہ اصحاب کہتے ہیں کہ انگلیاں گنتی میں تعداد سے زیادہ ہوں تو وجود انسان کے شرف کو پیش نظر رکھتے ہوئے زائد انگلی (کے تلف کرنے) کی سزا مناسب تجویز کی جائے گی، کیونکہ بہر حال وہ بھی ہاتھ کا ایک جزو ہے۔ گو اس کی افادیت کچھ نہ ہو اور نہ اس سے کوئی خوشنمائی ہوتی ہے، یہی حال فالو دانت کا ہے کہ اس کے تلف کرنے کی مناسب سزا تجویز کی جائے گی۔ اگر مثلاً ہتھیلی کی انگلیاں ناقص ہوں تو ان کے اطلاق پر سالم انگلیوں کو نہیں کاٹا جائے گا، اگر ایک انگلی کاٹی اور اس کے اثر سے دوسری انگلی بھی گل گئی یا ساتھ کی انگلی یا ہتھیلی شل ہو کر رہ گئی تو اس گلی ہوئی انگلی یا شل ہو جانے والی انگلی کا قصاص نہ ہوگا، کیونکہ مجرم نے عدا سے ایسا نہیں کیا، البتہ اس کی دیت مجرم پر عائد ہوگی یا مجرم کے مال سے حکومت کا مجوزہ تاوان دلایا جائے گا۔

اگر پانچ انگلیوں میں سے ایک انگلی کے زخم پر حکم قصاص نافذ کر دیا گیا لیکن اس انگلی کا زخم دوسری انگلیوں میں سرایت کر گیا تو زخم کے سرایت کر جانے کو اس قصاص میں تصور نہیں کیا جائے گا بلکہ مجرم پر ان چاروں انگلیوں کے عوض دیت کے پانچ حصوں میں سے چار حصے عائد ہوں گے اور انگلیوں کی جڑ (گھائی) کے لئے (جداگانہ) تشخیص سزا نہ ہوگی بلکہ اس کا نقصان انگلیوں کی دیت میں شامل متصور ہو گیا۔

اگر کسی نے ہاتھ پر ضرب لگائی اور وہ ہاتھ سوج گیا اور کچھ دنوں کے بعد گل کر گیا تو اس پر قصاص واجب ہوگا، اگر جرم کے نتیجہ میں انگلیوں کے ناخن پیلے یا کالے پڑ جائیں تو اس کا قصاص نہ ہوگا، کیونکہ یہ کیفیت ناخن کے امراض میں

سے ہے اور بے ناخن کی انگلیاں ناخن والی انگلیوں کے عوض کاٹی جائیں گی کیونکہ وہ نسبت کم حیثیت کی ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس ہو تو یہ حکم نہ ہوگا (یعنی ناخن والی انگلیوں کو بے ناخن والی انگلیوں کے عوض نہیں کاٹا جائے گا) کیونکہ ناقص کے اتلاف پر کامل کو نہیں لیا جائے گا اگر مجرم کے ہاتھ کی ایک انگلی کم ہے اور اس نے کسی کا پورا ہاتھ کاٹ دیا ہے تو مجرم کا پورا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا (اور چونکہ اس میں ایک انگلی نہیں تھی) اس انگلی کے عوض جرمانہ ادا کرنا ہوگا اگر ثابت ہاتھ والے شخص نے ناقص ہاتھ والے کا ہاتھ کاٹ دیا تو یہ دست بریدہ شخص چاہے تو اپنی چار انگلیوں کی دیت وصول کرے اور چاہے تو مجرم کی انگلیاں کاٹ دے اگر بے انگلی کی ہتھیلی کاٹی جائے تو اس کا قصاص نہ ہوگا ہاں اگر مجرم کا ہاتھ بھی دیا ہی (بے انگلیوں کا) ہے تو قصاص ہو سکتا ہے اگر بے انگلیوں والے انسان نے کامل انگلیوں والے کا ہاتھ کاٹ دیا تو اس مجرم کی ہتھیلی کاٹ دی جائے گی اور انگلیوں کے نقصان کا تاوان بھی وصول کرے گا۔

اقسام جراحات کا بیان

چاروں ائمہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا اس امر پر اتفاق ہے کہ لغت اور فقہ کی رو سے جراحاتوں کی دس (۱۰) قسمیں ہیں:-
 پہلا قسم کا زخم ”حارصہ“ ہے یعنی وہ زخم جس سے جلد پھٹ جائے لیکن خون نہ بہے۔
 دوسرا ”دامعہ“ وہ زخم جس میں خون نمایاں ہو لیکن بہے نہیں جیسے آنکھ کا آنسو۔
 تیسرا ”دامیہ“ وہ زخم جس سے خون نکل آئے بایں طور کہ جلد پھٹے نہیں بلکہ رسنے لگے۔
 چوتھا ”باصعہ“ زخم جس میں جلد کٹ پھٹ جائے۔
 پانچواں ”متلاحمہ“ وہ چوٹ جو جلد میں دھس جائے لیکن ہڈی تک نہ پہنچے۔
 چھٹا ”سحاق“ وہ زخم جو ”سحاق“ تک پہنچ جائے یہ ایک باریک جھلی ہے جو گوشت اور استخوان سر کے درمیان ہوتی ہے اسے ”ملطاة“ بھی کہتے ہیں۔

ساتواں ”موضیہ“ وہ زخم جو اتنا گہرا ہو کہ ہڈی تک پہنچ جائے یعنی ہڈی نظر آنے لگے۔

آٹھواں ”ہاشمہ“ وہ زخم جو ہڈی کو توڑ کر چورا کر دے۔

نواں ”منقلہ“ وہ زخم جو ہڈی کو توڑ کر اپنی جگہ سے ہٹا دے۔

دسواں ”آمہ“ وہ زخم جو سر کی اس ہڈی تک پہنچ جائے جس میں بھیجا ہوتا ہے اور جسے ”مامومتہ“ کہتے ہیں۔

روایات احادیث کا مکمل مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ جراحاتوں کی قسمیں مذکورہ دس اقسام سے زیادہ نہیں ہیں تاہم ان کے علاوہ ایک اور جراثحت ”دامعہ“ ہے اس سے وہ زخم مراد ہے جس سے بھیجا نکل پڑے لیکن اس کے بعد بالعموم انسان زندہ نہیں رہ سکتا لیکن اس کو جراثحت رسانی نہیں کہنا چاہیے بلکہ یہ قتل ہے اور بقول صحیح حقیقت لغوی کے اعتبار سے (اس زخم کا) یہی مفہوم ہے۔

زخم، موضہ کی تفصیل

فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر یہ زخم عمداً لگایا جائے تو قصاص واجب ہوگا کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جراحۃ موضہ پر قصاص کا حکم دیا ہے اور یہ بھی ہے کہ (قصاص کے لئے) چھری کو ہڈی تک پہنچایا جاسکتا ہے اور اس طرح جرم اور سزا میں یکسانیت ہو جاتی ہے قصاص کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ زخم دل پر اثر انداز ہو یا چوڑا ہو بلکہ زخم موضہ کتنا ہی چھوٹا ہو خواہ ایک سوئی کے سوراخ کی مانند ہو مجرم پر قصاص لاگو ہوگا۔

فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر غلطی سے زخم موضہ ہو گیا تو پوری دیت کا بیسواں حصہ عائد ہوگا جو پانچ اونٹ ہوتا ہے اور یہ حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم سے ثابت ہے جو انہوں نے حضرت عمرؓ بن حزم کو ایک مراسلہ میں تحریر فرمایا تھا اور عمرو بن شعیب کی حدیث سے بھی ثابت ہے جو انہوں نے اپنے باپ سے اور باپ نے ان کے دادا سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”فی الموضحة خمس“ (یعنی جراحۃ موضہ کی دیت پانچ ہے) یعنی پانچ اونٹ ترمذی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے اور اسے حدیث حسن بتایا ہے ”فی الموضحة خمس من الابل“ (یعنی جراحۃ موضہ کا تاوان پانچ اونٹ ہے) یہ تاوان آزاد مرد اور مسلمان کے ساتھ جرم کا ہے یہ جنین (پیٹ کے بچے) پر جرم کرنے کا تاوان نہیں ہے اور عورت یا اہل کتاب وغیرہ پر جرم ہو تو اسی نسبت سے تاوان جرم عائد ہوگا اگر اہل کتاب پر یہ جرم غلطی سے سرزد ہو جائے تو اس کا تاوان ایک پورا اور دو تہائی اونٹ ہے اور اگر مجوسی وغیرہ پر یہ جرم ہو تو تین اونٹ تاوان ہوگا اور مسلمان آزاد عورت کی صورت میں ڈھائی اونٹ تاوان عائد ہوگا جو اس کے تاوان کا بیسواں حصہ ہے۔

جراحۃ موضہ کا محل وقوع

مالکیہ کہتے ہیں کہ زخم موضہ وہ ہے جس میں سر کی ہڈی دکھائی دی جائے یا پیشانی کی ہڈی جو دونوں بھوؤں اور سر کے بال کے درمیان ہوتی ہے یا چہرے کی ہڈی کھل جائے نچلے جڑے کے زخم پر قصاص نہیں ہے کیونکہ اس کا تعلق گردن سے ہے (سر یا پیشانی سے نہیں ہے) ناک کی ہڈی کا قصاص نہیں ہے گو عمداً ارتکاب کی صورت میں قصاص لاگو ہوتا ہے (نچلے جڑے کے زخم موضہ پر) قصاص اس لئے نہیں ہے کہ لفظ وجہ (یعنی شکل) ”مواجہہ“ (یعنی آمنے سامنے ہونا) سے نکلا ہے اور دیکھنے والے کو وہ نظر نہیں آتا لہذا اگر نچلے جڑے یا ناک پر جراحۃ پہنچائی جائے تو اس کا کوئی مقرر تاوان نہیں ہے۔

حنفیہ شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ موضہ پورے چہرے سر پیشانی اور جڑے کی ابھری ہوئی ہڈیوں تک پہنچنے والے گہرے زخم کو کہتے ہیں جس سے ہڈی کھل جائے ٹھوڑی اس میں داخل ہے۔

چاروں ائمہ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ دس (۱۰) قسم کی جن جراحاتوں کا ذکر کیا گیا وہ لغت کے اعتبار سے چہرے اور سر کی مخصوص جراحاتیں ہیں چہرے اور سر کے علاوہ کسی اور جگہ کی جراحاتوں کو جراحۃ (مستوجب تاوان مقررہ) نہیں سمجھا جائے گا (اور اس زخم کو ان ناموں سے نامزد نہیں کیا جائے گا) بلکہ اسے زخم کہا جائے گا دراصل حکم شرع حقیقی معنوں پر منطبق ہوتا ہے اگر ان دونوں مقامات (سر اور چہرے) کے علاوہ کسی اور جگہ مثلاً پنڈلی یا ہاتھ پر ایسا زخم لگایا جائے تو اس کا

کوئی مقررہ تاوان نہیں ہے بلکہ اس جرم کی سزا کی مناسب تشخیص کی جائے گی کیونکہ مقدار جراحت کا تعین ایک حد تک موقوف ہوتا ہے اور اس کے متعلقہ احکام اس کے لئے مخصوص ہیں پھر یہ بھی ہے کہ جراحت 'موضہ' کے بارے میں جو حکم ہے وہ دراصل اس عیب کے پیش نظر ہے جو زخم کے بعد باقی رہ جاتا ہے اور بالعموم عیب وہی ہے جو دکھائی دے اور عیب ان ہی دو اعضاء کا نظر آتا ہے اور کسی عضو کا نظر نہیں آتا۔

زخموں کی بقیہ اقسام

حنفیہ کہتے ہیں کہ 'موضہ' کے علاوہ دوسری جراحتوں کا قصاص نہیں ہے کیونکہ ان کے قصاص میں جرم کے ساتھ ان کی یکسانیت کو ملحوظ نہیں رکھا جاسکتا اور اس زخم کی گہرائی کو جس حد تک آلہ جراحت پہنچا ہو متعین نہیں کیا جاسکتا پھر یہ بھی ہے کہ زخم 'موضہ' سے بڑے زخموں میں جیسے 'ہاشمہ' (جس میں ہڈی چور چور ہو جائے) یا 'منقلہ' جس میں ہڈی ٹوٹ کر الگ ہو جائے) یا 'آمہ' (جس میں بھیجے کی کھوپڑی متاثر ہوتی ہے) ایسے زخم ہیں جن میں ہڈی ٹوٹ جاتی ہے اور ہڈی توڑنے کا قصاص نہیں ہوا کرتا ابوحنیفہؒ سے یہی قول مروی ہے۔

امام محمد نے اصل ظاہر الراویہ میں فرمایا ہے کہ (اقسام جراحت میں سے) 'جراحت موضہ' سے پہلے کی (چھ) جراحتوں میں قصاص ہو سکتا ہے کیونکہ ان جراحتوں میں ہڈی نہیں ٹوٹی اور نہ عام طور پر اس میں موت کا اندیشہ ہوتا ہے لہذا ان زخموں کی گہرائی کا اندازہ آلہ زخم پیمائے کیا جاسکتا ہے اس کے بعد ایک دھار دار آلہ اسی کے مناسب لے کر اسی قدر کاٹا جائے تو قصاص پورا ہو سکتا ہے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ 'جراحت موضہ' سے کم درجہ کے چھ زخم جن کا ذکر موضہ سے پہلے کیا گیا یعنی زخم حارصہ سے سحاق تک کی بابت مناسب تشخیص کی جائے گی کیونکہ ان کا کوئی مقررہ تاوان نہیں ہے اور اس جرم کو نظر انداز کر دینا ممکن نہیں ہے لہذا ان کی سزا کی بابت حکومت عدل (مناسب تصفیہ مبنی پر تعدیل) پر واجب ہے جیسا کہ نخعی اور عمر بن عبدالعزیز سے مروی ہے نیز ان کا کہنا ہے کہ زخم 'ہاشمہ' (جس میں ہڈی چور چور ہو جاتی ہے) دیت کا دسواں حصہ اور زخم 'منقلہ' میں ایک دسواں اور ایک بیسواں حصہ اور زخم 'آمہ' (چند یا کے گہرے زخم) میں ایک تہائی حصہ لاگو ہوگا اور جائفہ (اندر تک پھاڑ دینے والے زخم) میں بھی تاوان کا ایک تہائی حصہ عائد ہوگا لیکن اگر زخم جائفہ آر پار ہو جائے تو وہ وہ جائفوں کے برابر ہو جائے گا اور دو تہائی حصہ تاوان کا عائد ہوگا جیسا کہ عمرو بن حزم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے مراسلہ میں بتایا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "وفی الموضحة خمس من الابل وفی الهاشمة عشر وفی المنقلة خمسة عشر وفی الآمة و یروی المامومة ثلث الدية" (یعنی جراحت موضہ کا تاوان پانچ (۵) اونٹ ہاشمہ کا دس منقلہ کا پندرہ اور آمہ کا جو روایت میں مامومہ بھی کہا گیا ہے دیت کا تہائی حصہ لاگو ہوگا) نیز حضور کا ارشاد ہے "وفی الجائفة ثلث الدية" (یعنی زخم جائفہ میں ایک تہائی دیت ہے) کیونکہ ابو بکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایسے زخم کے بارے میں جو پیٹ کے آر پار ہو جائے دو تہائی تاوان کا فیصلہ فرمایا ہے اور یہ بھی ہے کہ زخم اگر آر پار ہو جائے تو وہ دو جائفوں کے برابر ہو جاتا ہے ایک زخم پیٹ کی جانب سے اور دوسرا پیٹھ کی طرف سے اور ہر جائفہ (پھاڑنے والے زخم) پر ایک دیت کا تہائی

حصہ عائد ہوتا ہے لہذا دو تہائی تاوان لاگو ہوگا۔

یہ اصحاب کہتے ہیں کہ 'زخم جائفہ' (کی اصطلاح) جوف کرنے والے (یعنی پھاڑنے کا شگاف کرنے والے زخم) کے لئے مخصوص ہے خواہ وہ زخم سر کا ہو یا پیٹ کا۔

ان مسائل (متذکرہ) میں لفظ حکومت عدل (منصفانہ تجویز یا تشخیص عادلانہ) کا جو ذکر آیا ہے اس کی توضیح بقول امام طحاوی رحمہ اللہ علیہ یہ ہے کہ پہلے ایک ایسے مملوک غلام کی قیمت لگائی جائے جو زخمی نہ ہو پھر اس حالت میں قیمت لگائی جائے جبکہ وہ زخم جائفہ سے متاثر ہو چکا ہو پھر ان دونوں کی قیمتوں کا فرق دیکھا جائے اگر دونوں میں بیسویں حصہ کا (یعنی پانچ فیصدی فرق ہے تو تاوان کا بھی بیسواں حصہ لاگو ہوگا اور اگر چالیسویں حصہ (یعنی ڈھائی فیصدی) کا فرق ہے تو تاوان کا بھی چالیسواں حصہ عائد ہوگا۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر 'جراحت ہاشمہ' کے ساتھ 'جراحت موضیہ' بھی ہو (یعنی ہڈی بھی کچلی گئی ہو اور زخم بھی کھل گیا ہو) یا شکستہ ہڈی کو نکالنے یا ہڈی کو بٹھانے کے لئے چیرا دینا پڑا ہو تو اس کا تاوان دس اونٹ ہے جو آزاد شخص کے پورے تاوان کا دسواں حصہ ہے جیسا کہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "اوجب فی الهاشمۃ عشرأ من لابل" (یعنی 'زخم ہاشمہ' کا تاوان جس میں ہڈی کچلی جائے دس اونٹ واجب ہوگا) اس حدیث کو دارقطنی اور بیہقی نے روایت کیا ہے اور اس پر عمل ایک اندازے ہی سے ہو سکتا ہے 'زخم ہاشمہ' نہ ہو تو بقول صحیح پانچ اونٹ تاوان ہوگا کیونکہ دس اونٹ تاوان اس صورت میں ہوتا ہے جب کہ 'زخم ہاشمہ' کے ساتھ 'موضیہ' بھی ہو چونکہ زخم موضیہ کا تاوان پانچ اونٹ ہے لہذا باقی پانچ اونٹ ہاشمہ کا تاوان ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ 'زخم ہاشمہ' (جس میں ہڈی چور چور ہو جائے) اگر وہ ہڈی نظر نہ آتی ہو تو اس کا فیصلہ حکومت کی تجویز سے ہوگا کیونکہ یہ جرم بھی دوسری ہڈیوں کو شکستہ کرنے کی مانند ہے اس کا اور 'زخم منقلہ' کا تاوان (جس میں ہڈی ٹوٹ کر اپنی جگہ سے ہٹ جاتی ہے) پندرہ (۱۵) اونٹ ہے جیسا کہ نسائی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے اور کتاب "الام" میں نقل کیا گیا ہے اس پر اجماع ہے اور ابن المنذر سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

قصاص صرف 'جراحت موضیہ' میں ہی عائد ہوتا ہے (جس میں زخم کھلا ہوتا ہے اور ہڈی نظر آتی ہے) 'جراحت مامومہ' (یا آمہ) میں پوری دیت کا ایک تہائی تاوان عائد ہوتا ہے جیسا کہ عمرو بن حزم نے 'بحر' میں روایت کیا ہے اور اس پر اجماع ہے اور نص صحیح کے بموجب 'زخم دامغہ' (جس میں بھیجا نکل آتا ہے) کا تاوان بھی وہی ہے جو مامومہ کا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس پر دماغ کا پردہ پھاڑ دینے کا مزید تاوان تجویز کیا جائے۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ 'جراحت مامومہ' اور اس سے پہلے کے نو (۹) اقسام مذکورہ کی جو تفصیل بتائی گئی ہے وہ اس حال میں ہے جبکہ مجرم ایک شخص ہو اور ارتکاب جرم کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہو تو ان کا حکم حسب ذیل ہے:

اگر ایک شخص نے کسی مرد آزاد اور مسلمان کو زخم موضیہ (گہرا زخم جس سے ہڈی کھل جائے) پہنچایا اور اس کے بعد یا پہلے ہی کسی دوسرے شخص نے 'زخم ہاشمہ' (ہڈی کچل دینے والا زخم) لگایا پھر تیسرے نے زخم 'منقلہ' (ہڈی کو توڑ کر اپنی جگہ سے ہٹا دینے والا اور چوتھے نے زخم آمہ (چند یا کا زخم) بھی پہنچایا تو تین جراحتوں کے ملزموں میں سے ہر ایک پر پانچ

اونٹ تاوان ہوگا: پہلے پر تو اس لئے کہ اس نے زخم موضع پہنچایا (جس کا تاوان پانچ اونٹ مقرر ہے) اور دوسرے پر اس لئے کہ اس تاوان سے جو زیادہ ہے وہ زخم ہاشمہ کا ہے۔ اور تیسرے پر اس لئے کہ ان دونوں سے جو زیادہ ہے وہ زخم منقلہ کا تاوان ہے ان کے علاوہ چوتھے شخص پر جو تاوان ہوگا اس سے پورے تاوان کا تہائی حصہ کاٹل ہوتا ہے۔ یعنی اٹھارہ اونٹ اور ایک تہائی اونٹ $15 + 18 \times \frac{1}{3} = 33$ پورے تاوان سو (۱۰۰) اور اونٹ کا تہائی حصہ ہے) جو جراحت منقلہ اور جراحت مامومہ کے بین بین ہے۔

یہ اصحاب کہتے ہیں کہ جن جراحتوں کا ذکر موضع سے پہلے کیا گیا ہے ان میں حارصہ سے لے کر سحاق تک پانچ قسم کے زخم ایسے ہیں کہ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ ان زخموں کو جراحت موضع سے کیا نسبت ہے؟ بایں طور کہ کسی کے سر میں "جراحت موضع" ہو اور اس کا موازنہ مثلاً باضعہ سے کیا جائے اور معلوم ہو کہ گردن (کے زخم) سے جو گوشت کٹا ہے اس کی گہرائی زخم موضع کی نسبت سے ایک تہائی یا نصف ہے تو اس کا تاوان اسی نسبت سے ہوگا۔ اگر موضع کے ساتھ یہ نسبت مشکوک ہو تو اسے قطعی بنانے کی کوشش کی جائے۔ اگر پھر بھی تناسب متعین نہ ہو سکے تو عادلانہ حکومت (یعنی منصفانہ تشخیص) کی جائے۔ لیکن مشخصہ تاوان جراحت موضع کے تاوان کے برابر نہ ہونا چاہیے۔ یہی حکم تمام جسمانی جراحتوں کے لئے ہے۔ مثلاً جراحت موضع جراحت ہاشمہ یا منقلہ کہ اس کا فیصلہ صرف تشخیص حکومت پر ہوگا کیونکہ زخم موضع ہاشمہ اور منقلہ کے متعلقہ دلائل کا ان زخموں سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ تینوں نام سر اور چہرے کے زخموں کے لئے مخصوص ہیں اور ان دونوں جگہوں کے علاوہ اور کسی جگہ کے زخم ان کے ہم معنی نہیں ہیں۔

یہ اصحاب کہتے ہیں کہ اگر زخم جائفہ (یا موضع) چھوٹا سا بھی ہو تو ایک تہائی دیت عائد ہوگی جیسا کہ عمرو بن حزم کی روایت کردہ حدیث سے ثابت ہے۔ یہ حکم احکام متذکرہ سابقہ سے مستثنیٰ کی مانند ہے کیونکہ زخم جائفہ کے سوا جسم کا کوئی اور زخم ایسا نہیں ہے جس کے حجم کی مقدار معلوم ہو سکے اور اسی نسبت سے سزا تجویز کی جائے۔ جائفہ وہ زخم ہے جس کے اندر غذا یا دوا کا اثر قبول کرنے کی صلاحیت ہو مثلاً پیٹ کے اندرونی حصہ تک پہنچا ہوا زخم یا سینہ یا ہنسی کے خلاف یا ماتھے کے اندرونی حصہ یا پہلو کی گہرائی کا زخم اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ زخم جائفہ کا شکاف دھاردار آلے یا لاٹھی کی چوٹ سے لگا ہو۔ منہ ناک آنکھ پلک اور پیشاب کی نالی کا زخم جائفہ نہیں ہے کیونکہ اس میں سابقہ الذکر زخموں کی طرح جان کا خطرہ نہیں ہے۔ ان کو اجواف (یا شکافوں) میں شمار نہیں کیا گیا۔ لہذا ان کے متعلقہ جرائم میں حکومت کی تجویز کردہ سزا (یا تاوان) ہے۔ اگر چہرے کا زخم جائفہ اتنا گہرا ہو کہ منہ تک پہنچ جائے تو مجرم پر جرم زخم جائفہ کا تاوان عائد ہوگا جو پانچ اونٹ ہے۔ اگر وہ زخم ناک کا بانسہ توڑ کر ناک کے اندرونی حصہ تک پہنچ جائے تو جراحت ہاشمہ کا تاوان یعنی دس اونٹ لاگو ہوگا۔ ساتھ ہی اس زخم کے لئے بھی تاوان کی تجویز حکومت کرے گی جو منہ اور ناک تک پہنچا ہوا ہے کیونکہ یہ ایک دوسرا جرم ہے۔ اس میں خطرہ بھی زیادہ ہے اور بدنامی بھی ہے۔

ان اصحاب کا کہنا یہ بھی ہے کہ اگر کسی نے مونڈھے یا ران پر اس طرح چھرا مارا کہ اس کا زخم پیٹ تک جا پہنچا اور وہاں تک چیر دیا تو مجرم پر جائفہ پیٹ پھاڑ دینے والے (یا خلا تک پہنچنے والے) زخم کا پورا تاوان عائد ہوگا جو ایک دیت

کا تہائی ہے۔ ساتھ ہی مونڈھے یا ران کے زخموں کا تاوان بھی حکومت تجویز کرے گی۔ کیونکہ یہ زخم جائفہ کے مخصوص مقامات پر نہیں لگائے گئے اور اگر سینے پر چھرا مار کر (نیچے) پیٹ تک یا (اوپر) گلے تک پھاڑ دیا تو اس کا تاوان صرف زخم جائفہ کا تاوان ہوگا مزید فیصلہ حکومت کا درکار نہ ہوگا کیونکہ یہ وہ جگہیں ہیں جہاں کے زخم کو جائفہ کہا جاتا ہے۔ اگر اس قدر گہرا زخم لگا جس سے جگر یا تلی کو نقصان پہنچا تو تاوان جائفہ کے علاوہ مزید تاوان تجویز حکومت عائد ہوگا۔ اگر اس زخم سے پسلی ٹوٹ گئی تو اس کا تصفیہ زخم کی گہرائی کے اعتبار سے کیا جائے گا۔ اگر وہ زخم پسلی سے آگے تک پہنچ گیا (یعنی زخم دائرہ جائفہ سے باہر تک ہے) تو اس پر اس کے تاوان کے علاوہ مزید تاوان تجویز کیا جائے گا۔ اگر صرف پسلی ٹوٹی ہے اور زخم آگے نہیں گیا تو جائفہ کے تاوان میں پسلی کی ہڈی ٹوٹنے کا تاوان شامل ہو جائے گا۔

زخم موضعہ خواہ (جسم میں) بڑا ہو یا چھوٹا اس کا تاوان یکساں ہوگا کیونکہ اس کا نام 'موضعہ' ہے۔ نیز وہ زخم نمایاں ہو یا بالوں میں چھپا ہوا ہو تب بھی یہی حکم ہے۔ تاوان عائد کرنے کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ نمایاں بھی ہو۔ چنانچہ اگر ایک سوئی چھوئی اور وہ خلا تک پہنچ گئی تو وہ بھی زخم 'جائفہ' ہے۔ اسی لئے امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سر کا کوئی بھی زخم ہو اس کا اپنا مخصوص نام ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ صورت، حکم، جگہ اور فاعل کے اعتبار سے جراحات 'موضعہ' کی تعداد کا تعین ہوتا ہے۔ پس اگر مجرم نے دو مختلف جگہوں پر جراحات موضعہ پہنچائی جن کی بابت ایک ہی جیسا حکم ہے، لیکن ان دونوں زخموں کے درمیان گوشت اور کھال دونوں یا بقول ضعیف صرف گوشت یا صرف کھال حائل ہے تو یہ دو جراحات متصور ہوں گی ایک تو اس لئے کہ ان کی صورت (یا حجم) مختلف ہے اور دوسرے اس لئے کہ دونوں کے درمیان فاصلہ ہے۔ تاہم صحیح یہی ہے کہ اسے ایک ہی زخم مانا جائے۔ اگر جراحات موضعہ کئی ایک ہیں تو ان کے تاوان بھی کئی ایک ہوں گے۔ ان کی کوئی حد نہیں ہے اور کہا جاتا ہے کہ ایک خون بہا سے زیادہ تاوان عائد نہیں ہو سکتا۔

یہ اصحاب کہتے ہیں کہ اگر زخم موضعہ دانستہ یا غلطی سے متعدد جگہوں میں بٹ گئے ہوں تو وہ دو زخم ہوں گے۔ اگر سر اور چہرے کے زخم مل جائیں تو بقول صحیح یہ دو زخم متصور ہوں گے۔ اگر ملزم زخم کو بڑا کر دے، لیکن نوعیت ایک ہی ہو تو وہ بقول صحیح ایک زخم ہوگا اور کہا جاتا ہے کہ یہ دو زخم مانے جائیں گے۔ اگر مجرم کے علاوہ کسی اور شخص نے زخم کو چوڑا کر دیا تو وہ دو شخصوں کے زخم ہوں گے۔ کیونکہ ایک شخص کا عمل دوسرے کا عمل متصور نہ ہوگا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے کسی کا ہاتھ کاٹ دیا اور دوسرے نے اس کی گردن ماری تو ان دونوں پر جداگانہ جرائم عائد ہوں گے اور زخم جائفہ (خلا تک پہنچنے والا زخم) ایک ہونے یا متعدد ہونے اور مقدم و موخر ہونے میں "زخم موضعہ" کی مانند ہے۔

اگر نیزہ نما آلہ پیٹ میں مارا اور وہ پیٹھ سے نکل گیا یا اس کے برعکس ہوا کہ پیٹھ میں مارا اور پیٹ سے نکل گیا یا ایک پہلو سے مارا اور دوسرے پہلو سے باہر آ گیا تو بقول صحیح ان کو دو زخم جائفہ قرار دیا جائے گا۔ بدیں لحاظ کہ ایک زخم باہر سے اندر تک ہے اور دوسرا اندر سے باہر تک اور یہ ثابت ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص پر جس کو کسی نے تیر مارا اور وہ آر پار ہو گیا، دو تہائی تاوان کا حکم دیا پھر یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے بھی اسی کے مطابق

فیصلہ فرمایا تھا اور ان دونوں اصحاب کے فیصلے سے کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ لہذا اس پر اجماع ہو گیا۔

مالکیہ فرماتے ہیں کہ جراحات موضعہ کی صورت میں قصاص لیا جائے اور موضعہ سے پہلے جن چھ اقسام جراحات کا ذکر کیا گیا ہے اور جن میں زخم ہڈی تک نہیں پہنچتا (یعنی ہڈی نہیں کھل جاتی) ان میں بھی قصاص لیا جائے (یعنی مجرم کو بھی ویسا ہی زخم پہنچایا جائے) ان زخموں میں سے تین یعنی دامیہ حارصہ اور سحاق کا تعلق جلد سے ہے، باقی تین کا تعلق گوشت سے ہے یعنی باضعہ متلاحمہ اور ملطاء (بکسریم)۔

وہ اصحاب کہتے ہیں کہ ہاشمہ میں بھی قصاص ملحوظ رہ سکتا ہے بشرطیکہ زخم کی جگہ لمبائی چوڑائی اور گہرائی میں ایک ہی ہو (یعنی زخم اپنے محل سے تجاوز نہ کر گیا ہو) اور موضعہ کے بعد جن جراحاتوں کا ذکر ہے ان میں قصاص نہیں ہے بلکہ ان میں عقل (تاوان) تشخیص کیا جائے گا۔ ان میں جرم عمد اور جرم خطاء دونوں کا حکم ایک ہے۔ ان میں سے ایک منقلہ (بفتح نون و کسر قاف مشدودہ) ہے۔ یہ سر یا چہرے کا زخم ہے جس میں سر کی ہڈی کا خول ٹوٹ کر الگ ہو جاتا ہے۔ یہ خول پتلی سی ہڈی کا ہوتا ہے جو پیاز کے چھلکے کی مانند ہڈی کے اوپر ہوتا ہے جسے معالج زخم میں دوائی لگانے کے لئے اوپر سے ہٹا دیتے ہیں تاکہ زخم بھر جائے۔ اس جرم میں قصاص اس لئے نہیں ہوتا کہ اس سے (مجرم کی جان کا) شدید خطرہ اور اتلاف روح ہے۔ دوسرا زخم آمہ (بفتح الف ممدودہ) ہے جو ام الدماغ (یعنی دماغ کی جھلی) تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن اسے پھاڑنا نہیں ہے۔ ام الدماغ ایک پتلی سی جھلی ہوتی ہے جو دماغ پر پھیلی ہوئی ہوتی ہے اگر وہ پھٹ جائے (یعنی مغز کھل جائے) تو انسان مرجاتا ہے اور دماغ بھیجے کا نام ہے۔

واضح ہو کہ جراحات و منقلہ اور آمہ مذکورہ بالا کا قصاص نہیں ہے کیونکہ یہ دونوں زخم ہوتے ہی خطرناک ہیں ان کے قصاص کے لئے خطرناک ہونے کی شرط نہیں ہے۔ جراحات موضعہ کے علاوہ ذکر کی گئیں جسم کی دوسری جراحاتیں بھی اگر زیادہ خطرناک اور سخت خوفناک ہوں تو ان کا قصاص بھی واجب نہیں ہے مثلاً سینے یا ریڑھ کی ہڈی یا گردن کا منقلہ توڑ دیا یا فوطوں کو کچل دیا تو یہ بھی جسم کے ایسے زخم ہیں جن سے موت واقع ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

قصاص لینے میں تاخیر کرنے کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے کسی کو عمداً مجروح کیا اور مستوجب قصاص ہو گیا تو زخم کے بھر جانے تک قصاص میں توقف کیا جائے گا۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ”یستأنس فی الجراحات سنۃ“ (یعنی زخموں کا قصاص لینے میں سال بھر تک تاخیر کی جاسکتی ہے) پھر یہ بھی ہے کہ زخموں (کے قصاص) میں ان کے نتائج کو ملحوظ رکھا جائے گا زخم کی موجودہ حالت کو نہیں دیکھا جائے گا کیونکہ فی الحال یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ (نتیجہ کے اعتبار سے) وہ زخم کس نوعیت کا ہے۔ بسا اوقات زخم جان لیوا ہوتا ہے اس حالت میں ظاہر ہے کہ جرم جراحات رسانی نہ رہے گا بلکہ جرم قتل ہو جائے گا۔ اس کا تعین زخم کے اچھا ہو جانے ہی پر ہو سکتا ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ جان کے علاوہ دوسرے قصاصوں کے عمل درآمد میں کوئی عذر ہو تو تاخیر واجب ہے مثلاً شدت سردی یا سخت گرمی کے باعث مجرم کے مرجانے کا اندیشہ ہو۔ اسی طرح اگر مجرم مریض ہے اور وہ پہلو میں جراحات رسانی کا

مجرم ہے تو اس کا قصاص لینے میں تاخیر لازم ہے یہاں تک کہ وہ اچھا ہو جائے۔ نیز قصاص جان کے علاوہ دوسرے زخموں کے قصاص میں بھی مجروح کے اچھا ہو جانے تک تاخیر کی جائے کیونکہ یہ اندیشہ ہے کہ مجروح اس زخم کے اثر سے فوت ہو جائے۔ ایسا ہو تو 'قسامہ' کے بعد (یعنی وارثوں کے حلف اٹھانے پر کہ اس شخص کی موت مجرم کی جراحت رسانی سے ہوئی ہے) مجرم کو موجب قصاص قرار دیا جائے گا اور زخم کے اچھا ہو جانے تک قصاص کو ملتوی رکھا جائے گا۔ اگرچہ اس میں ایک سال کا عرصہ گزر جائے یا وہ جرم ایسی صورت اختیار کر لے جس کا تاوان عاقلہ (مجرم کے ذمہ داران تاوان) پر عائد ہوتا ہے۔ حکومت پر تاوان کا تصفیہ اس وقت واجب ہے۔ جب زخم کا عیب دور ہو جائے۔ بصورت دیگر عدا جرم کے مرتکب کو تادیب سزا دی جائے گی۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ جان کا قصاص مستوجب قصاص سے فوری طور پر لیا جائے بشرطیکہ قصاص جان کا مطالبہ کیا گیا ہو اور جیسا کہ جان کے قصاص میں ہوتا ہے دوسرے اعضاء کے قصاص بھی بروقت لئے جائیں۔ کیونکہ جب جرم موجب قصاص ثابت ہو جائے تو اسے التوا میں نہیں ڈالا جاسکتا اور اس لئے بھی کہ قصاص موجب اتلاف ہے لہذا اس میں عجلت سے کام لینا چاہیے جیسا کہ فساد کے ذمہ داروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہاں اگر معافی کا احتمال ہو تو اس میں تاخیر زیادہ بہتر ہے اور مجروح کو حق ہے کہ مجرم کے اعضاء کو یکے بعد دیگرے (بلا تاخیر) کاٹ دے کہ مجرم نے اس کے اعضاء کو وقفہ وقفہ سے کاٹا ہو کیونکہ ان اعضاء کے کاٹنے کا حق اسے حاصل ہو چکا ہے۔

حاملہ عورت کے قصاص میں التوا کا بیان

تمام ائمہ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر حاملہ عورت قصاص جان یا قصاص اعضاء کی سزاوار ہو جائے اور مظلوم (مقتول یا مجروح) نے مطالبہ قصاص کیا تو اس عورت کو قید میں رکھا جائے۔ اور قصاص جان یا قصاص عضو کو التوا میں ڈال دیا جائے یہاں تک کہ بچہ پیدا ہو جائے اور وہ اپنے بچے کو دودھ پلائے یا نفاس کا خون بند ہو جائے اور اس کا بچہ کسی اور عورت کے زیر پرورش ہو کر ماں سے بے نیاز ہو جائے یا حلال جانور کا دودھ پلا کر اسے رکھا جاسکے۔ اگر ایسا کوئی بندوبست نہ ہو سکے کہ بچے کو ماں کی پروانہ رہے تو شیر خوارگی کی دو سال کی مدت گزارنا ہوگی یہ حکم قصاص جان کے بارے میں ہے۔ اس میں فریقین کے دو حق عائد ہوتے ہیں۔ ایک حق پیٹ کے بچے کا ہے (جو التوا سے قصاص کا متقاضی ہے) اور دوسرا حق مقتول کے ولی کا ہے (جو تجلیل کا متقاضی ہے) صبر کی صورت میں بچے کا حق ادا ہو جاتا ہے۔ ان دونوں کے حقوق میں سے اگر ایک کے حق کو نظر انداز کرنا ہو تو یہی صورت بہتر ہے۔

رہا اعضاء کے قصاص یا تہمت لگانے کی سزا اس میں تاخیر کی جائے کیونکہ اگر قصاص پر عمل در آمد کیا گیا تو پیٹ کے بچے کو ضائع کرنا ہوگا کیونکہ بیشتر حالات میں اس سے بچے کی جان جاتی رہتی ہے۔ حالانکہ وہ بے خطا ہے دوسرے کے ارتکاب جرم میں اسے ہلاک نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے فرق نہیں پڑتا کہ وہ بچہ حلال کا ہے یا حرام کا یا یہ کہ وہ بچہ ارتکاب جرم (قتل) کے بعد عورت (مجرمہ) کے پیٹ میں پڑا یا پہلے کا حمل ہے۔ یہاں تک کہ اگر مرتدہ عورت بدکاری سے حاملہ ہے تو اسے بھی (مرتدہ ہو جانے کی بناء پر) قتل نہیں کیا جائے گا جب تک کہ بچہ پیدا نہ ہو جائے۔ بچے کی (مجرمہ) ماں کے

قصاص کو ”لباء“ (پیوسی) پلا لینے کے وقت تک تاخیر میں ڈالے رکھنا، اس لئے ہے کہ بچہ اگر ماں کا ”لباء“ (یعنی پیوسی یا وہ رقیق دودھ جو بچے کی ولادت کے ابتدائی ایام میں اترتا ہے) نہ پی لے تو وہ فی الواقع یا بیشتر حالات میں زندہ نہیں رہتا پھر یہ بھی ہے کہ یہ تاخیر بہت آسان امر ہے۔ اور اتنی دیر تک (سزائیں) توقف کرنا کہ وہ بچہ ماں سے بے نیاز ہو جائے یہ بھی بچے کی زندگی بچانے کے لئے ہے۔ پس در آنحالیکہ (مجرمہ حاملہ) کے قصاص کو وضع حمل تک کے لئے التوا میں ڈالنا واجب ہے تو بچے کی ولادت کے بعد اس کی زندگی کا اطمینان حاصل کرنے کے لئے (سزائیں) تاخیر کا واجب کرنا اور بھی زیادہ بہتر ہے۔ واضح ہو کہ بچے کو دودھ پلانے والیوں کے دستیاب ہو جانے یا بکری وغیرہ کا دودھ میسر ہو جانے پر بھی قصاص پر عمل درآمد میں تاخیر پر مقتول کے ولی کا صبر کرنا سنت (کار ثواب) ہے یہاں تک کہ کوئی ایسی سمجھدار دودھ پلانے والی عورت دستیاب ہو جائے تاکہ مختلف ماؤں کا دودھ پینے یا جانور کا دودھ پینے سے بچے کے اخلاق اور اس کی نشوونما میں خرابی واقع نہ ہو۔ دودھ پلانے والی عورت کو اجرت پر دودھ پلانے کے لئے اجرت پر رکھا جائے گا۔ اگر دودھ پلانے والیاں ہیں لیکن اس بچہ کو دودھ پلانے سے انکار کرتی ہیں تو حاکم ان میں سے کسی کو اجرت پر دودھ پلانے کے لئے مجبور کر سکتا ہے۔

یہ اصحاب کہتے ہیں کہ اگر حق قصاص کا مطالبہ کرنے کا حقدار شخص پیش دستی کر کے مجرمہ عورت کے بچے کی پیدائش کے معاذ قتل کر دے۔ قبل اس کے کہ بچے کو ماں سے بے نیاز کرنے کا بندوبست ہو جاتا اور اس کے (قتل کرنے کے) باعث وہ بچہ مر گیا تو اس کا قصاص اس پر عائد ہوگا کیونکہ یہ شخص اس کی موت کا سبب بنا۔ اور یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص کسی کو ایک کوٹھڑی میں بند کر دے اور کھانا پانی نہ دے یہاں تک کہ وہ مرجائے لیکن اگر حالت حمل میں قتل کیا جبکہ هنوز وضع حمل نہیں ہوایا بچہ پیدا ہوا اور مر گیا تو اس پر کوئی تاوان نہ ہوگا کیونکہ یہ ثابت نہیں ہے بچے کی موت کو اس سے کوئی نسبت ہے۔ اگر قتل کے بعد بچہ مرا ہوا نکلا تو اس پر غرہ (جرمانہ) اور کفارہ واجب ہوگا۔ اگر بچہ پیدا ہونے کے وقت تکلیف میں تھا اور اسی حالت میں مر گیا تو تاوان اور کفارہ دونوں واجب ہوں گے کیونکہ ظاہر ہے کہ اس کا اذیت میں ہونا اور مرجانا اس کی ماں کے مرجانے کے باعث ہوا ہے۔ واضح ہو کہ یہ تاوان اور جرمانہ مجرم کے عاقلہ (ذمہ دار قصاص) پر عائد ہوگا کیونکہ پیٹ کے بچے کو جرم سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا اور اس کا زندہ رہنا یقینی نہ تھا لہذا اس کی موت جرم خطا یا جرم مشابہ بہ عہد متصور ہوگی۔ تاہم کفارہ کی ادائیگی خاص مجرم کے مال سے ہوگی۔

اگر مقتول کے ولی نے حاکم کے حکم سے مجرمہ (قاتلہ) کو قتل کیا تو امام (سربراہ مملکت) اس کا ذمہ دار ہوگا۔ خواہ اسے مجرمہ کے حاملہ ہونے کا علم رہا ہو یا نہ رہا ہو کیونکہ (بہر حال) اس بارے میں معلومات کا حاصل کرنا اس کی ذمہ داری تھی اور اسی نے قتل کرنے کا حکم دیا تھا تعمیل کرنے والا تو اس کی رائے اور تحقیق کے مطابق حکم کی بجا آوری کا محض ایک آلہ ہے۔

یہ اصحاب کہتے ہیں کہ درست بات یہ ہے کہ عورت اگر ایسی ہے کہ اس کا حاملہ ہو جانا معمول کے مطابق ممکن ہے تو اس کی بات کو مزید علاماتی ثبوت کے بغیر تسلیم کر لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”ولا یحل لهن ان یکتمن ما خلق اللہ فی ارحامہن انکن یؤمنن باللہ والیوم الآخر“ (البقرہ: ۲۲۸) (یعنی عورتوں کو یہ حلال نہیں کہ ان کے رحموں

میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ رکھا ہے اسے چھپائیں اور اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان بھی رکھتی ہوں) (رحم کی چیز سے مراد) حمل یا حیض ہے اور جس بات کا چھپانا حرام ہے اگر اس کا اظہار کیا جائے تو گواہی کی طرح اسے قبول کرنا واجب ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حمل کے بارے میں غامدیہ کی بات کو تسلیم فرمایا تھا اور اس کے لئے مزید ثبوت طلب نہیں فرمایا اور نہ قسم لی۔ ہاں اگر کسی عورت کا حاملہ ہونا معمول کے مطابق نہ ہو مثلاً وہ عورت آئیہ ہو (یعنی طویل العمری کے باعث اس کے ایام آنے بند ہو گئے ہوں) ایسی عورت اگر حمل کا دعویٰ کرے تو وہ نہیں مانا جائے گا، کیونکہ امر واقعہ اس کی تکذیب کرتا ہے۔

اس بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ (مجرمہ) عورت کے اعتراف حمل کو تسلیم نہیں کیا جائے گا کیونکہ حمل کا نہ ہونا بنیادی بات ہے۔ پھر مجرمہ عورت پر یہ الزام عائد ہو سکتا ہے کہ وہ جس سزا کی مستوجب ہے اس کو تاخیر میں ڈالنا چاہتی ہے لہذا جب تک کہ علامات حمل ظاہر ہو جانے کا ثبوت مہیا نہ ہو یا مستحق بیان نہ کرے عورت (مجرمہ) کی بات تسلیم نہ کی جائے۔ قول اول کی صورت میں آیا عورت سے اقرار حمل کے بارے میں حلف لیا جائے یا نہ لیا جائے۔ اس بابت دو رائے ہیں اور قابل ترجیح پہلی بات ہے (یعنی حلف لیا جائے) کیونکہ عورت کا بیان غرض پر مبنی ہے کہ قصاص میں تاخیر ہو جائے۔

مجرم سے قصاص جراثحت لینے کے بعد مجروح کے وفات پا جانے کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے کسی کا ہاتھ عدا کاٹ دیا اور اس کا قصاص ہاتھ کے بدلے ہاتھ کاٹنے کی صورت میں لے لیا گیا۔ اس کے بعد مجروح مظلوم وفات پا گیا تو اب مجرم کو جس کا ہاتھ قصاص میں کاٹا جا چکا ہے قتل کر دیا جائے گا کیونکہ یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ وہ جرم (جراثحت کا نہ تھا بلکہ) قتل عدا تھا اور ہاتھ کا قصاص لینے والے کو جان کے قصاص کا حق ہے اور ہاتھ کا قصاص لے لینے سے قصاص جان جو واجب ہوا ہے وہ ساقط نہ ہوگا۔ چنانچہ وہ شخص جسے مجرم سے ہاتھ کا قصاص لینے کا حق ہے اسے قصاص جان کا بھی حق ہے۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ یہ کہتے ہیں کہ (ہاتھ کا قصاص لینے کے بعد) جان کا قصاص ساقط ہو گیا۔ کیونکہ جب اس مجرم کا ہاتھ کاٹا گیا تو گویا تمام دوسرے مطالبات سے اسے بڑی کر دیا گیا۔ لیکن حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ ہاتھ تو اس گمان میں کاٹا گیا کہ مجروح کو صرف اسی کا حق ہے لیکن زخم کے سرایت کر جانے (اور مجروح کی وفات) کے بعد یہ ثابت ہوا کہ وہ شخص مستوجب قصاص جان ہے۔ لہذا وہ اس لاعلمی کے باعث اس جرم سے بری نہیں ہو سکتا۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر ایسے عضو کا قصاص لیا گیا جس کے جرم پر نصف دیت عائد ہوتی ہے اور اسی جرم سے مجروح بوجہ سرایت زخم کے وفات پا گیا تو مجرم سے قصاص جان لینا واجب ہے۔ ہاں مقتول کے ورثاء کو یہ جائز ہے کہ وہ نصف خون بہا کے عوض قصاص معاف کر دیں کیونکہ مقتول کی وفات سے پہلے مجرم کا ہاتھ جو قصاص میں کاٹا گیا وہ نصف دیت کی بجائے منظور ہوگا۔

اگر مجرم قدرتی موت مر جائے یا کوئی اور شخص اسے قتل کر دے۔ تو مجرم کے ترکہ میں سے نصف خون بہا واجب الادا ہوگا۔ اگر کسی کے ہاتھ کاٹ دیئے گئے اور اس کا قصاص لے لیا گیا پھر وہ دست بریدہ مظلوم زخم کے سرایت کر جانے

سے مر گیا تو اس کے ولی کو اختیار ہے کہ اپنے مورث کی جان کے عوض مجرم کی گردن کاٹ دے اگر ولی اس سے درگزر کرے تو اب وہ کسی شے کا حقدار نہ ہوگا کیونکہ قصاص میں ہاتھوں کے کاٹے جانے سے دیت واجب کا مطالبہ پورا ہو گیا۔

دیت کا بیان

مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ رحمہم اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ دیت وہ مال ہے جو ایک آزاد شخص کو قتل کرنے یا جراثیم رسانی کی پاداش میں مجرم پر عائد ہوا صل میں یہ لفظ 'ودیۃ' ہے جو لفظ 'ودی' (تاوان) سے نکلا ہے (آخر میں 'ت' حرف 'واو' کی بجائے بڑھائی گئی ہے جیسے وزن سے ذنہ) اس کے معنی تاوان حاصل کرنے کے ہیں اور اس کی بنیاد کتاب و سنت اور اجماع ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ومن قتل مؤمناً خطاً فتحرير رقبة مؤمنة ودية مسلمة الى اهله الا ان يصدقوا" (النساء: ۹۲) (یعنی جس نے غلطی میں کسی مسلمان شخص کو قتل کر دیا تو اس پر واجب ہے کہ ایک مسلمان غلام آزاد کرے اور تاوان دے جو اس شخص کے ورثاء کو ادا کیا جائے گا ہاں وہ معاف کر دیں تو خیر) اس کے بارے میں بکثرت احادیث آئی ہیں اور اس کے واجب ہونے پر فی الجملہ اجماع ہے۔

یہ اصحاب (فقہائے ثلاثہ) کہتے ہیں کہ ایک مسلمان مرد۔ آزاد جس کا خون حرام ہو پیٹ کا بچہ نہ ہو قتل کرنے پر ایک سوانٹ تاوان واجب ہوگا۔ درآنحالیکہ قاتل کو اس شخص پر کسی قسم کی ملکیت حاصل نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے آیت سابقہ میں دیت کو واجب فرمایا ہے اور اس کی وضاحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مکتوب بنام عمرو بن حزم میں فرمادی ہے جس میں ارشاد ہوا ہے "فی النفس مائة من الابل" (یعنی جان کی دیت ایک سوانٹ ہے) بروایت نسائی۔

سب سے پہلے جس شخص نے ایک سو کی یہ تعداد مقرر فرمائی اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب تھے۔ شریعت اسلامیہ نے اسی تعداد کو برقرار رکھا۔ لفظ 'بعیر' (اونٹ) کا اطلاق نر اور مادہ دونوں پر ہوتا ہے اور شخص مظلوم صاحب فضل ہو یا گھٹیا درجہ کا آدمی ہو دیت میں اختلاف نہ ہوگا ہاں مذہب یا جنس کے اعتبار سے مختلف ہو تو اس کی دیت بھی مختلف ہوگی۔ برخلاف اسی کے اگر کسی (مملوک) غلام پر جرم کیا جائے تو (اس پر مقررہ تاوان نہیں) بلکہ اس کی قیمت مختلف ادا کرنا ہوگی۔ اگر مقتول غیر محفوظ الدم ہے (یعنی اس کی جان کی حفاظت واجب نہیں ہے) مثلاً وہ شخص جو نماز کی پروانہ کرتا ہو اور تارک صلوٰۃ ہو جائے یا شادی شدہ شخص زانی ہو ان دونوں میں سے اگر کسی کو قتل کر دیا جائے تو مجرم پر نہ دیت عائد ہوگی نہ کفارہ واجب ہے۔ بعض صورتیں ایسی ہیں جن میں مجرم پر بھاری دیت عائد ہوتی ہے۔ ان پانچ اسباب میں سے کوئی سبب اس کا موجب ہو سکتا ہے: ارتکاب قتل عمد کیا گیا ہو یا قتل مشابہ بہ عمد ہو۔ یا حد و حرم میں واقع ہوا ہو یا کسی ذورحم محرم کو (جس کے ساتھ رشتہ حرام ہے) قتل کیا ہو۔ اسی طرح کچھ باتیں ایسی ہیں جن میں ہلکی دیت عائد ہوتی ہے جس سے موجب ان اسباب چارگانہ میں سے کوئی سبب ہے۔ یعنی عورت، مملوک، جنین (پیٹ کا بچہ) یا کافر کا قتل ہو تو پہلی صورت میں دیت کے حصے کر کے ایک حصہ عائد ہوگا۔ دوسری صورت میں مملوک کی قیمت واجب الادا ہوگی۔ تیسری صورت میں جرمانہ اور چوتھی صورت میں ایک تہائی دیت واجب ہوگی۔ قتل عمد میں دیت مثلاً (یعنی نہ نوعی) ہوگی خواہ قصاص واجب معاف کرنے سے دیت واجب ہوئی ہو یا بغیر معافی کے واجب ہوئی ہو جیسے والد کا اپنے بیٹے کو قتل

کر دینا، یہاں پر دیت کا مثلثہ (سہ گانہ) ہونے سے دیت کے جانوروں کا تین اقسام پر مشتمل ہونا ہے۔ خواہ مالیت میں ایک قسم دوسری سے زیادہ ہو جائے۔ پس دیت (مغلظہ) کی مقدار یہ ہے: تین حقہ (یعنی وہ اونٹنی جو چوتھے سال میں ہو) اور تین جذعہ (جو پانچویں سال میں ہو) اور چالیس خلفہ (یعنی گیا بھن) جیسا کہ امام ترمذی کی روایت میں ہے۔ یہ دیت تین اعتبار سے بھاری ہے یعنی مجرم، کیفیت جانور اور اسی کی عمر کے اعتبار سے۔ قتل عمد کی صورت میں یہ سہ گونہ دیت مجرم پر فوری طور پر واجب الادا ہوگی۔ ہاں شبہ عمد کی صورت میں (مجرم کا) عاقلہ اس سہ گانہ دیت کو تاخیر سے ادا کر سکتا ہے اور قتل عمد میں مسلمان مقتول کے احترام کی عظمت اور مطالبہ خون کے حقداروں کی تشفی خاطر کے لئے دیت کی فوری ادائیگی واجب ہے جیسا کہ خون بہا میں ہوتا ہے۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ سہ گونہ اور چہار گونہ دیت کی یہ سختی جراحت عمد میں بھی اسی طرح ہے جیسی کہ قتل میں ہوتی ہے۔ جراحت مستوجب قصاص ہو جیسے زخم موضعی یا مستوجب قصاص نہ ہو دیت میں اس سے کوئی فرق نہ ہوگا۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ قتل عمد اور شبہ عمد میں عاقلہ پر دیت مغلظہ اور قاتل پر کفارہ عائد ہوگا اور میراث سے محروم رہے گا کیونکہ یہ محرومی قتل کی پاداش میں ہے اور جرم شبہ عمد میں قصاص ساقط ہو جائے گا لیکن مجرم میراث سے محروم رہے گا اور شبہ عمد میں مجرم کے عاقلہ پر دیت مغلظہ پر واجب ہونے کی بنا وہ حدیث ہے جو حمل بن مالک سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے سامنے دو سو کنوں میں سے ایک نے دوسری پر خیمہ کی چوب یا اس کا ستون اٹھا کر دے مارا جس سے اس عورت کے پیٹ کا بچہ مردہ ساقط ہو گیا۔ اس عورت کے ولیوں نے رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے حضور استغاثہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجرمہ کے ولی کو کہا ”فدوہ“ (یعنی دیت ادا کر) اس پر عورت کے بھائی نے کہا کہ آیا آپ ایسے کا تاوان دلانا چاہتے ہیں جو نہ چیخا نہ رویا، کچھ کھایا نہ پیا ایسوں کا تو خون معاف ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”اسجع کسجع الکھان“ (یعنی کاہنوں کی سی باتیں بناتے ہو) ایک اور روایت میں ہے کہ ”دعنی و اراجیز العرب“ (یعنی اہل عرب کے سخن سازوں کو مجھ پر چھوڑ جاؤ اس کا فدیہ ادا کرو)۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عاقلہ (حامیان مجرم) پر دیت کا عائد فرمانا جیسا کہ حدیث کی تفصیل میں بتایا گیا ہے جرم مشابہہ عمد کی پاداش میں ہے جرم خطاء کی بناء پر نہیں ہے لہذا جرم شبہ عمد میں دیت کا لازم ہونا حدیث کی صراحت سے ثابت ہے۔ قیاس سے نہیں ہے۔

ان اصحاب کا فرمانا یہ بھی ہے کہ قتل کی دیت ابتدا ہی میں عائد ہو جاتی ہے بعد میں پیش آنے والے حالات کے پیش نظر نہیں ہوتی پس عاقلہ پر عائد ہونے والی دیت غلطی سے جرم سرزد ہو جانے پر ہوتی ہے جس کی ادائیگی تین سال کے اندر واجب ہے جیسا کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فیصلہ فرمایا اور یہ تاخیر مجرم کا خیال اور اس پر رحم کے طور پر ہے۔ پس اس طرح مقررہ میعاد کے اندر اس شخص کو جس کا جرم کیا گیا ہے پوری دیت پہنچ جائے گی اور مجرم کے توبہ اور اس کی معافی کی توقع ہوگی۔

واضح ہو کہ جرم مشابہہ عمد کی دیت کی مقدار چار قسم کے سوانٹ بدیں تفصیل ہیں کہ ان میں سے پچیس (۲۵)

بنت مخاض (یعنی وہ اونٹنی جو عمر کے دوسرے سال میں ہو) اور بچیس (۲۵) بنت لبون (جو تیسرے سال میں ہو) اور بچیس (۲۵) حقہ (جو چوتھے سال میں ہو) اور بچیس (۲۵) جذعہ (جو عمر کے پانچویں سال میں ہو)۔ اس دیت کی تاکید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے ”فسی نفس المؤمن مائة من الابل“ (یعنی مومن کی جان کا بدلہ ایک سواونٹ ہے)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے لیکن اس حدیث سے ان صفات کی تغلیظ (پابندی) کا ثبوت نہیں ہوتا۔ اس کے لئے اجماع کا ہونا ضروری ہے۔ اس بارے میں جو روایتیں آئی ہیں وہ ثابت شدہ نہیں ہیں اور کیفیت تغلیظ کے بارے میں صحابہ رضوان اللہ علیہم کے درمیان اختلاف ہے۔ پس عمر اور زید وغیرہ نے جو کہا، سو کہا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دیت میں تین قسم کے اونٹ واجب ہیں ن میں تینتیس (۳۳) حقہ تینتیس (۳۳) جذعے اور چونتیس (۳۴) خلفے ہوں اور ابن مسعود نے (دیت کے بارے میں) وہی کہا جو چہارگانہ اونٹ کی بابت حنفیہ کہتے ہیں۔ مقررہ مقدار میں ذاتی رائے کو دخل نہیں ہے پس وہ تو حدیث مرفوعہ (یعنی براہ راست ارشاد نبوی) کی مانند ہے اور ان اصحاب کی رائے کے خلاف ہے اور جب ان میں اختلاف ہو تو جو امر یقینی ہے اسی کو اختیار کرنا بہتر ہے۔ واضح ہو کہ جرم مشابہ بہ عہد کی دیت محض جرم عہد کے تاوان کی مانند ہے۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ تغلیظ (یعنی سختی تاوان) محض اس تاوان میں ہے جو اونٹوں کی صورت میں ہو لہذا جو تاوان ایک لاکھ درہم کی صورت میں ہو اس کی مالیت میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ یہی حال ایک ہزار دینار کے تاوان کا ہے (کہ اس کی مالیت بڑھ نہیں سکتی)۔

جرم خطاء کی دیت

حنفیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ غلطی سے جرم سرزد ہو جانے کا خون بہا (مجرم کے) عاقلہ پر ایک سواونٹ ہے نیز قاتل کے مال میں سے کفارہ واجب ہے اور دیت میں پانچ قسم کے اونٹ ہوں گے جن کے منجملہ بیس (۲۰) بنت مخاض، بیس بنت لبون، بیس ابن مخاض، بیس حقہ اور بیس جذع ہوں۔ یہ قول حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ہے جس کو ان اصحاب نے اختیار فرمایا۔ اس لئے کہ یہ تاوان ہلکا ہے اور جرم خطاء کے لئے زیادہ مناسب ہے کیونکہ بھول چوک کا جرم قابل درگزر ہے۔

شافعیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ غلطی سے جرم قتل سرزد ہو جانے پر پنج گانہ اونٹ عاقلہ کے ذمہ ہیں۔ جو جھجیل واجب الاداء ہوں گے اور ان اصحاب نے بیس (۲۰) ابن مخاض کی جگہ بیس (۲۰) ابن لبون رکھا ہے۔ جیسا کہ ترمذی وغیرہ کی روایت میں ہے یہ دیت ہلکی ہے اس لئے کہ یہ (مجرم کی بجائے اس کے) عاقلہ پر عائد ہے اور عمر میں رعایت ہے اور ادائیگی بتاخیر ہوگی جرم شبہ عہد کی دیت میں سہ گونہ اونٹ ہیں جو عاقلہ پر بتاخیر واجب الادا ہیں۔ پس یہ بھی دو لحاظ سے (یعنی عاقلہ پر عائد ہونے اور تاخیر کی اجازت سے) ہلکی ہے اور ایک لحاظ سے بھاری ہے (کہ اقسام سہ گانہ کی قید ہے)۔

دیت کی اقسام

حنفیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اونٹ دستیاب ہوں تب بھی ان کی بجائے درہم و دینار کا دیت میں لینا جائز ہے۔ لیکن

ان تین اقسام یعنی اونٹ، سونا اور چاندی کے علاوہ کسی اور شکل میں (دیت) ثابت نہیں ہے۔ پس اونٹ ایک سو (۱۰۰) چاندی دس ہزار درہم اور سونا ایک ہزار دینار دیت میں واجب الادا ہوں گے کیونکہ مقدار کا تعین ایسی شے ہی سے ہو سکتا ہے جس کی مالیت معلوم ہو۔ ان تین اشیاء کے علاوہ دوسری اشیاء کی مالیت معلوم نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تلف شدہ شے کے تاوان واجب کی مالیت کا تعین ان ہی اشیاء سے کیا جاتا ہے اور مقدار مالیت کا اونٹوں سے تعین کرنا احادیث مشہور سے ثابت ہے۔

امام ابو یوسف اور محمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ دیت کی ادائیگی اونٹ، سونے یا چاندی کی شکل میں ثابت ہے اور گائے بیل ہو تو دو سو، بھیڑ بکری دو ہزار اس اور کپڑے کی صورت میں دو سو جوڑے۔ ہر جوڑے میں دو کپڑے ہوتے ہیں۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ان میں سے ہر قسم کے صاحب مال پر اسی طرح دیت عائد فرمائی ہے۔ شافعیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ دیت میں نہ گائے نہ بھیڑ بکری ہے اور نہ لباس نہ سامان لیا جائے گا۔ مستوجب دیت کے پاس اگر اونٹ ہیں تو وہی لئے جائیں گے۔ ان کے علاوہ کسی اور شے کی ادائیگی کا ذمہ دار اسے نہیں بنایا جائے گا۔ کیونکہ دیت میں سہولت پیش نظر ہوتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مستوجب تاوان سے وہ اونٹ لئے جائیں گے جن کی اکثریت اس کے قبیلہ میں ہو۔ گو اس کے اپنے اونٹ غیر قبیلہ کے ہوں۔ اگر اس کے پاس ایسے اونٹ نہ ہوں تو بدوی قبائل کی اکثریت کے اونٹ لئے جائیں گے کیونکہ یہ ضائع شدہ حق کے بدلے میں ہیں۔ وہ نہ ہوں تو اس علاقے کے اونٹ لئے جائیں جو تاوان ادا کرنے والے کی قیام گاہ سے قریب تر ہو۔ بشرطیکہ انہیں وہاں سے دستیاب کرنے کے اخراجات اور اس کی مالیت قبیلہ کے غیر دستیاب اونٹوں سے زیادہ نہ ہو جائے۔ ایسی حالت میں اونٹوں کا وہاں سے لانا واجب نہیں ہے۔ اور جب کسی بھی قسم کے اونٹوں کی ادائیگی واجب قرار دے دی جائے تو پھر ان واجب شدہ اونٹوں سے ہٹ کر کسی اور اونٹ کا مطالبہ یا اس کے مساوی مالیت کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا سوا اس کے کہ دیت ادا کرنے والا اور حقدار دیت دونوں رضامند نہ ہوں کیونکہ دیت میں مظلوم کے احترام کی عظمت مد نظر ہوتی ہے۔

اگر دیت کے اونٹ دستیاب نہ ہوں تو شافعیہ کے پرانے قول کے مطابق صاحب زر (مجرم) پر ایک ہزار دینار اور مالک درہم پر چاندی کے بارہ ہزار درہم واجب الادا ہوں گے۔ جیسا کہ حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے ”علی اہل اللہ الف دینار و علی اہل الورد اثنا عشر الف درہم“ (یعنی سونار کھنے والے پر ہزار دینار اور چاندی والے پر بارہ ہزار درہم دیت واجب ہوگی) ابن حبان اور حاکم نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ ماخوذ از حدیث عمرو بن حزم۔ شافعیہ کے نئے قول کی رو سے (نایابی شتر کی صورت میں) اونٹوں کی وہ قیمت واجب الادا ہوگی جو ادائیگی کے وقت ہو۔ خواہ وہ کس قدر بنتی ہو کیونکہ یہ تلف شدہ شے کے عوض میں ہے۔ جب کہ اصل شے واجب الادا کا حصول مشکل ہے تو اس کی قیمت کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور مالیت اس بستی کے عام رائج الوقت نقدی میں لگائی جاتی ہے کیونکہ

دوسرے مقامات سے اس کا شہر قریب ترین اور مستند ہے۔ اگر دیت کے اونٹوں میں سے کچھ دستیاب ہو جائیں تو جتنے موجود ہیں انہیں لے لیا جائے اور باقی کی مالیت وصول کی جائے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ دیت کے اونٹوں کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔ البتہ اس بات پر انحصار ہے کہ اونٹنیاں گیا بھن ہوں خواہ وہ حقہ ہوں یا جذعہ یا کچھ اور اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ دیت میں نہ مریض اونٹ لیا جائے گا اور نہ عیب دار اونٹ۔ ہاں حقدار خود اس پر راضی ہو جائے اور نیکی کرنا چاہتا ہو تو خیر۔ کیونکہ یہ اس کا حق ہے اور وہ اس سے دست بردار ہو سکتا ہے۔ اگر مستحق دیت کی اونٹنیوں کے گیا بھن ہونے سے انکار کرے تو اس کا ثبوت دو معتبر واقف کار گواہوں کی شہادت سے ہو سکتا ہے کہ حمل کتنے عرصہ کا ہے۔ اگر گواہوں کے کہنے سے حقدار اسے لے لے یا وہ خود اس کے حمل کی تصدیق کر لے اور وہ اونٹنی اس کے پاس اگر مر جائے پھر اس کا پیٹ چاک کرنے سے معلوم ہو کہ وہ اونٹنی گیا بھن نہیں تھی تو مجرم اس کی تلافی کرے اور حقدار اس کے عوض گیا بھن اونٹنی لے لے۔ اس بارے میں صحیح بات یہ ہے کہ اگر اونٹنی پانچ سال کی نہ بھی ہوئی ہو تو اسے گوارا کر لینا چاہیے کیونکہ اونٹ کے نام کا اطلاق اس پر بھی ہوتا ہے۔

عورت اور عیسائی یا یہودی کی دیت کا بیان

شافعیہ کہتے ہیں کہ عورت اور۔ خنثی مشکل (جس کی جنس متعین نہ کی جاسکے) اگر آزاد ہوں (یعنی غلام یا لونڈی نہ ہوں) تو ان میں سے ہر ایک کا خون بہایا جراثحت رسانی کا تاوان مجرم پر آزاد مرد کے تاوان کا نصف عائد ہوگا۔ جیسا کہ بیہقی کی روایت میں آیا ہے ”دیت المرأة نصف دیت الرجل“ (یعنی مجرم پر عورت مظلومہ کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہوگی) اور خون بہا کی طرح جراثحت رسانی کا حکم بھی ہے۔ منٹ کے تاوان کا حکم بھی اسی کے ساتھ آگیا کیونکہ عورت کے تاوان سے زیادہ عائد کرنا امر مشکوک ہے۔ پس اگر کسی عورت یا منٹ کو غلطی سے ہلاک کر دیا جائے تو (مجرم پر) دس بنت مخاض اور دس بنت لبون دیت عائد ہوگی اور عورت کے قتل عمد یا شبہ عمد میں پندرہ حقہ پندرہ جذعہ اور بیس خلفہ تاوان ہوگا۔

یہودی عیسائی معاہدہ (غیر مسلم جو معاہدہ کے تحت اسلامی ریاست میں رہتا ہو) یا مستامن (پناہ گزین) جبکہ وہ معصوم (واجب الحفظ) ہو اور اس سے نکاح جائز ہو تو (اس کے مجرم پر) ایک مسلمان کے تاوان کا تہائی واجب ہوگا۔ اس میں تاوان جان ہو یا اور کوئی تاوان ہو۔ تاوان جان کی بابت حدیث مرفوعہ (جس کی سند حضور تک پہنچتی ہو) آئی ہے۔

امام شافعیؒ نے اپنی کتاب ”الامم“ میں بتایا ہے کہ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما نے اسی کے مطابق فیصلہ فرمایا ہے اور اس لئے کہ یہ مقدار کم سے کم ہے جس پر اجماع ہے اور یہ مقدار بے توقف مقرر نہیں کی گئی۔ پس اگر ان میں سے کسی کو عمد قتل کیا گیا تو مجرم پر دس مہار حقہ اور دس مہار جذعہ اور تیرہ مہار اور ایک تہائی جذعہ عائد ہوں گے۔ شبہ قتل عمد میں یہی حکم ہے اور غلطی سے قتل سرزد ہو گیا تو دیت مغلطہ (بھاری دیت) لاگو نہ ہوگی بلکہ بنت مخاض، بنت لبون، ابن لبون، حقہ اور جذعہ کے اقسام منجگانہ میں سے ہر ایک کے چھ اس اور ایک تہائی مقدار دیت واجب ہوگی۔ دیت کے

بارے میں سامری، یہودی کی مانند اور صابی، عیسائی کی مانند ہے بشرطیکہ خود اس کے ہم قوموں نے اسے کافر نہ قرار دیا ہو اور مجوسی (آتش پرست) کی دیت سب سے معمولی ہے یعنی مسلمان کی دیت کے دسویں حصے میں سے دو تہائی حصہ جیسا کہ حضرت عمر، عثمان اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم نے فرمایا ہے۔ چنانچہ دیت مغلطہ میں دو حقے دو جذبے دو خلفے پورے اور دو تہائی خلفہ لاگو ہوں گے اور دیت مخففہ کی صورت میں بلحاظ عمر (ہججگانہ اقسام شتر میں سے) ہر قسم کا ایک مہار شتر اور ایک تہائی (یعنی مجموعی طور پر $6 \times 2 = 12$) مجرم پر واجب الادا ہوں گے۔ اس (امتیازی) حکم کا سبب یہ ہے کہ یہودی اور عیسائی میں پانچ باتیں خوبی کی ہیں، یعنی وہ اہل کتاب ہیں۔ وہ ایسے مذہب کے پیرو ہیں جو بالاجماع ایک وقت میں برحق تھان کے ساتھ نکاح اور ان کا ذبیحہ حلال ہے اور جزیہ ادا کرتے ہیں اور مجوسی میں بجز ادائے جزیہ کے اور کوئی بات نہیں ہے لہذا ان کی دیت یہودی اور عیسائی کی دیت کا پانچواں حصہ ہوگی۔ اسی میں بت پرست سورج اور چاند کا پرستار، زندیق (بے دین یا منافق) اور وہ جو کسی مذہب کا پیرو نہیں ہے مثلاً وہ شخص جو اپنی قوم کی طرف سے بطور قاصد کے اسلامی ریاست میں آیا ہو تو اسلامی ریاست میں واجب التحفظ ہے لیکن وہ بت پرست (مشرک) جس کی حفاظت واجب نہیں ہے اس کا خون معاف ہے اور اس قسم کے اشخاص کی عورتوں کا تاوان ان کے مردوں کے تاوان سے نصف ہے۔

ان اصحاب کا مسلک یہ ہے کہ جس نے ایسے شخص کو قتل کر دیا جس کی حفاظت کے مسلمان ذمہ دار ہیں لیکن اسے ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت نہیں پہنچی اور اپنے دین کو نہیں بدلاتو اس کی دیت وہی ہوگی جو اس کے ہم مذہب کی ہے۔ چنانچہ اگر وہ اہل کتاب ہے تو اس کی دیت بھی اہل کتاب کی، اگر مجوسی ہے تو مجوسی کی ہوگی۔ اگر اس نے اپنا دین بدل لیا اور اس دین کے خلاف کسی اور دین کی اسے خبر نہیں ہے اور کسی نبی کی دعوت اسے نہیں پہنچی تو اس کی دیت وہی ہوگی جو مجوسی کی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس صورت میں اس کی دیت وہی ہوگی جو اس کے ہم مذہب کی ہے۔

یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کے مجرم پر کچھ لاگو نہ ہوگا، کیونکہ وہ شخص سچے مذہب پر نہیں ہے نہ اس سے کوئی معاہدہ ہے اور نہ وہ ذمی ہے۔ (علامہ) زرکشی فرماتے ہیں کہ اس بارے میں مسلک یہ ہے کہ اگر اس نے (اپنا مذہب بدل کر) اب یہودی یا عیسائی مذہب اختیار کر لیا تو (اس کے مجرم پر) وہ دیت عائد ہوگی جو مجوسی کے مجرم پر ہوتی ہے کیونکہ اس میں تبدیلی آگئی ہے۔ یعنی اس حالت میں ان سے نکاح حلال نہیں ہے۔

یہ اصحاب کہتے ہیں کہ جس شخص کو دعوت محمدی نہیں پہنچی اسے قتل کرنا جائز نہیں ہے بلکہ وہ معذور ہے اور جو شخص دارالحرب (دشمن کے علاقہ) میں مسلمان ہو جانے اور مسلمان ہونے کے بعد باوجود اس کے کہ وہاں سے ہجرت کر سکتا ہو لیکن وہ جگہ نہ چھوڑے تو ایسے شخص کا قاتل بھی مستوجب قصاص ہوگا۔ کیونکہ مسلمان ہو جانے کے باعث وہ معصوم (واجب التحفظ ہے)۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ عورت کی دیت مرد سے آدھی ہے۔ یہ قول براہ راست حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے اور

یہ حدیث مرفوع ہے (یعنی اس کی سند آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے)۔

زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک تہائی دیت یا اس سے زیادہ مقدار کا نصف (کسی پر عائد ہو) تو ہو سکتا ہے۔ لیکن اس سے کم مقدار کی دیت کی تنصیف نہیں کی جائے گی۔ امام شافعیؒ نے اس کو اختیار فرمایا ہے نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ حضور نے فرمایا ”تعاقل المرأة الرجل الى ثلث الدية“ (یعنی عورت مرد کے تاوان کے ایک تہائی حصہ تک حقدار ہو سکتی ہے) اور حضرت ربیعہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن مسیب سے پوچھا کہ اگر ایک شخص کسی عورت کی ایک انگلی کاٹ دے تو اس کا کیا حکم ہے؟ انہوں نے کہا کہ مجرم دس شتر تاوان دے گا۔ میں نے کہا اگر دو انگلیاں کاٹ لے فرمایا بیس شتر۔ عرض کیا اگر تین انگلیاں ہوں تو فرمایا تیس شتر۔ پھر میں نے سوال کیا اگر چار انگلیاں کاٹ دے انہوں نے کہا بیس شتر میں نے کہا کیا خوب؟ اس عورت کو جب زیادہ اذیت ہوئی اور زیادہ شدید دکھ دیا گیا تو اس کا تاوان کم ہو گیا۔ انہوں نے کہا کہ کیا آپ عراقی ہیں؟ میں نے کہا نہیں میں جانتا نہیں ہوں جاننا چاہتا ہوں۔ یا عالم سہی تحقیق کا طالب ہوں۔ فرمایا کہ یہ حکم سنت سے ثابت ہے اور اسی کو امام شافعی رحمہ اللہ علیہ نے لیا ہے اور اس کے خلاف وہ روایت ہے جو حنفیہ بالعموم پیش کرتے ہیں۔

(عورت کی دیت کا آدھا ہونا) اس لئے بھی ہے کہ اس کی کیفیت (نسبت) مرد سے کم اور افا دیت (مقابلت) تھوڑی ہے۔ اس کی کمی کا اظہار (عورت کے مجرم پر) خون بہا کے نصف عائد ہونے سے ہوتا ہے۔ یہی کیفیت اس کے اعضاء اجزائے بدن کا تاوان نصف یا تہائی یا اس سے زیادہ عائد کئے جانے کی ہے تاکہ اصل وجود کے متعلق احکام اور اس کے تابع کے احکام ایک دوسرے کے مخالف نہ ہوں اور وہ روایت کردہ حدیث نادر الوجود ہے۔ اگر یہ حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہوتا تو یہ اصحاب اس کی مخالفت نہ کرتے۔

واضح ہو کہ مسلمان اور ذمی کی دیت مساوی ہے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ حضور نے فرمایا ”دبۃ کل ذی عہد فی عہدہ الف دینار“ (یعنی ہر معاہدہ کی دیت ہر دوران عہد ایک ہزار دینار ہے) حضرات ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما نے اسی کے مطابق فیصلہ فرمایا ہے اور وہ روایت جو امام شافعیؒ نے پیش فرمائی ہے اور اس کا راوی نامعلوم ہے اور کتب احادیث میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ محدثین جو روایتیں لائے ہیں وہ امام مالک رحمہ اللہ کی روایت سے زیادہ مشہور ہیں اور صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کے عمل سے ان کی تصدیق ہوتی ہے۔

جرم عمد اور جرم خطا دونوں کے حکم میں کوئی فرق نہیں کیونکہ آیت کریمہ کا مفہوم عام ہے ”النفس بالنفس“ (یعنی جان کے بدلے جان ہے) اس حکم کو کسی اور آیت نے منسوخ نہیں کیا۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ عورت کی دیت یا یہودی یا نصرانی کی دیت مسلمان مرد کی دیت سے نصف ہے۔ خواہ جرم کا ارتکاب عمد ہو یا غلطی سے سرزد ہو گیا ہو۔ حکم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس کی مقدار چھ ہزار درہم یا پانچ سو دینار ہے۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ”عقل الکافر مثل عقل المسلم“ (یعنی کافر کی دیت مسلمان کی دیت

کی مانند ہے)۔ امام مالکؒ کے نزدیک دیت کی پوری تعداد بارہ ہزار درہم ہے لیکن مجوسی معاہدہ اور مرتد میں سے ہر ایک کی دیت مسلمان کی دیت کا پانچواں حصہ ہے۔ جرم خواہ عدا کیا گیا ہو یا غلطی سے سرزد ہو گیا ہو۔ پس سونے کی شکل میں چھیا سٹھ (۶۶) دینار اور دو تہائی دینار دیت ہوگی اور چاندی کی صورت میں آٹھ سو (۸۰۰) درہم اور اونٹ ہو تو چھ مہار شتر اور ایک شتر کا دو تہائی (یعنی ۲/۳) تاوان ہوگا اور عورت کی دیت ان تمام صورتوں میں آدھی ہوگی لہذا آزاد مسلمان عورت کی دیت پچاس اونٹ اور اسی طرح (دوسری اشیاء میں نصف) ہوگی۔

خاتلہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی عیسائی یا مجوسی معاہدہ ہو اور ایک مسلمان نے اسے عدا قتل کر دیا تو اس کا تاوان مجرم پر مسلمان کے تاوان کی طرح پورا عائد ہوگا اور اگر غلطی سے جرم سرزد ہوا تو مسلمان کے دیت کا نصف تاوان عائد ہوگا۔ لیکن مرتدین میں سے جو غیر واجب التحفظ ہیں یا وہ جنہیں امان نہیں دی گئی تو وہ بہر حال واجب القتل ہیں (ان کے تاوان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا) اور وہ جس کے ساتھ نکاح جائز نہیں ہے اس کا حکم مجوسی کی مانند ہے اور اعضاء و جوارح کے متعلقہ جرائم میں بھی (پورا یا آدھا ہونے کے بارے میں) تاوان جان پر قیاس کیا جائے گا۔

پیٹ کے بچہ کے ساتھ جرم کا ثبوت

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر ماں کے پیٹ میں بچہ کا ہونا ثابت ہو تو اس کی (جداگانہ) ذمہ داری نہیں لی جاسکتی کیونکہ وہ انسانی جسم کے ایک جزو کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم وہ بذات خود زندگی کی صلاحیت رکھتا ہے اور ایک ایسی ہستی ہے جو ذمہ داری کی صلاحیت رکھتا اور حقوق کا مالک ہوتا ہے اور اس لحاظ سے اس کے حقوق واجب ہیں مثلاً آزاد رہنا، وارث ہونا، صاحب نسب ہونا، وصی ہونا، البتہ اول الذکر حیثیت سے اسے کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ ہاں پیدا ہو جانے کے بعد اس میں حقدار ہونے کی صلاحیت ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی کا مال اس کے پاس آجائے اور وہ اسے تلف کر دے تو وہ اس کے تاوان کا ذمہ دار ہوگا۔ اور اگر ولی اس کے ساتھ کسی کا عقد کر دے تو ادا نیگی مہر اس پر واجب ہو جائے گی۔ پس اگر کسی شخص نے حاملہ عورت کے پیٹ پر مارا اور اس کے پیٹ سے مرا ہوا بچہ ساقط ہو گیا تو مجرم پر غرہ (جرمانہ بصورت غلام یا لونڈی) عائد ہوگا۔ اگر وہ بچہ لڑکا ہے تو ایک مردانہ دیت کا دسویں حصے کا نصف لاگو ہوگا۔ یعنی دونوں صورتوں میں پانچ سو درہم تاوان ہوگا کیونکہ دس ہزار درہم کے دسویں حصے کا نصف اور پانچ ہزار درہم کا دسواں حصہ مقدار میں ایک ہے۔ اس مقدار (کے تعین) کی دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے: ”آپ نے فرمایا: ”لنسی الجنین غرة عبد اوامة قيمته خمس مائة“ (یعنی پیٹ کے بچے کی مقدار غرہ ایک غلام ہے یا لونڈی جس کی قیمت پانچ سو ہے) ایک اور روایت میں ”او خمس مائة“ (یعنی وہ جرمانہ لونڈی یا غلام ہے یا پانچ سو درہم ہے) اور غرہ (پانچ سو درہم کا یہ جرمانہ) عاقلہ (ذمہ دار دیت) کو ادا کرنا ہوگا۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جرمانے کی ادا نیگی عاقلہ پر ڈالی ہے اور چونکہ یہ جان کے بدلے میں ہے لہذا اس کو حضور نے دیت کے نام سے یاد فرمایا ہے چنانچہ اس (جرمانے کے بارے میں) آپ نے فرمایا ”ذوہ“ (یعنی دیت ادا کرو) اور لوگوں نے بھی اس جرمانہ کی بابت کہا: ”الدى من لاصح ولا استھل“

الحديث (یعنی کیا ہم اس کی دیت ادا کریں جو نہ چیخانہ رویا، مردہ بچہ؟)۔

واضح ہو کہ عواقل (ذمہ داران دیت) پانچ سو درہم سے کم مقدار کی ادائیگی کے ذمہ دار نہیں گردانے جاتے۔ اس کی ادائیگی ایک سال کی مدت میں واجب ہے جیسا کہ محمد بن حسن رحمہ اللہ تعالیٰ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت کی ادائیگی کے لئے ایک سال کی مہلت رکھی ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ اگر اس (جرمانے) کو جان کا بدل قرار دیا جائے بدیں جہت کہ وہ ایک مستقل جان رکھتا ہے تو ماں کے وجود کے ساتھ وابستہ ہونے کے باعث اس جرمانہ کو ایک عضو کا بدل بھی کہا جاسکتا ہے۔ پس پہلی صورت سے مشابہ ہونے کے باعث بحیثیت وارث ہونے کے عمل کیا اور دوسرے شبہ کی بناء پر (ادائے جرمانہ کے لئے) ایک سال کی مہلت رکھ دی۔

واضح ہو کہ اس بارے میں مرد اور عورت دونوں کا حکم یکساں ہے کیونکہ اس کا مفہوم مطلق (غیر مشروط ہے) ہے اور اس لئے بھی کہ زندہ انسانوں میں تو خصوصیات انسانیت کے اعتبار سے فرق ہوتا ہے لیکن جنین (پیٹ کے بچے) میں یہ فرق نہیں ہوتا لہذا دیت کی مقدار ایک ہی ہوگی یعنی پانچ سو درہم۔

اگر (مضروب عورت) کے زندہ بچہ پیدا ہو گیا پھر مر گیا تو مجرم پر پورا خون بہا عائد ہوگا کیونکہ اس نے ایک زندہ ہستی کو پچھلی ضرب سے ہلاک کیا۔ اگر بچہ مردہ پیدا ہوا اور اس کے بعد ماں بھی مر گئی تو ماں کے قتل کا خون بہا اور جنین (پیٹ کے بچے) کو ضائع کرنے کا جرمانہ لاگو ہوگا اور یہ بروایت صحیح ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صورت میں خون بہا اور جرمانہ (دونوں) کو عائد فرمایا ہے۔

اگر چوٹ لگنے سے ماں مر گئی اور اس کے بعد پیٹ کا بچہ زندہ پیدا ہو گیا لیکن بعد میں مر گیا تو ایک خون بہا ماں کا اور ایک بچے کا لاگو ہوگا۔ کیونکہ ماں کی موت بچے کی موت کے دو اسباب میں سے ایک سبب ہے اور بچے کا تنفس ماں کے نفس سے وابستہ ہوتا ہے۔ شک کی حالت میں تاوان عائد نہیں ہوتا اور جنین کے حق میں جو تاوان عائد ہوگا۔ وہ ورثہ ہوگا کیونکہ یہ اس کی جان کا خون بہا ہے۔ لہذا اس کے ورثاء اس کے حقدار ہوں گے۔ اور جراحت رساں (مجرم) کبھی وارث نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی اپنی (حاملہ) بیوی کے پیٹ پر ضرب لگائے جس سے مردہ بچہ ساقط ہو گیا تو اس بچے کے باپ کے عاقلہ (ذمہ دار دیت) پر جرمانہ عائد ہوگا اور مجرم دیت کا وارث نہیں ہو سکتا کیونکہ اس نے بلا شرکت غیرے ارتکاب قتل ناحق کیا اور قاتل مقتول کی میراث کا حقدار نہیں ہوتا۔ یہ حکم آزاد عورت کے جنین (پیٹ کے بچے) کا ہے۔ اگر لونڈی کے پیٹ کا بچہ تلف ہوا ہو اور وہ لڑکا ہو تو اس کی قیمت کا دسواں حصہ لاگو ہوگا کیونکہ یہ جان کا عوض ہے عضو کا عوض تو واجب نہیں ہوتا جب تک عضو تلف نہ ہو جنین کے عوض کو عضو کا عوض نہیں قرار دیا جاسکتا۔ لہذا یہ جان کا بدل ہے اور اس کی مقدار جان کے اعتبار سے لگائی جائے گی اور یہ دیت جو کچھ بھی ہو مجرم کے مال سے دیت وصول کی جائے گی پانچ سو درہم کی مقدار کی قید ضروری نہیں ہے۔

ابو یوسف رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر بچے کی ماں (مملوکہ) کی حیثیت کو نقصان پہنچا ہے (یعنی اس کی قیمت گھٹ گئی

ہے) تو اس کمی کو پورا کیا جائے جیسا کہ مویشیوں کی حالت میں ہوتا ہے (کہ اگر گیا بھن مویشی کا بچہ تلف ہو جائے تو اس کی حیثیت کم ہو جاتی ہے) اور یہ بھی ہے کہ مملوک (غلام) کو قتل کیا جائے تو مالی تاوان عائد ہوگا۔ یہی اصول یہاں بھی لاگو ہوتا ہے۔

اگر کسی مملوک (لوٹڈی) کو ضرب پہنچائی گئی اور اس کے مالک نے اس کے پیٹ کے بچے کو آزاد کر دیا اور وہ بچہ ماں کے پیٹ سے زندہ پیدا ہوا لیکن مر گیا تو مجرم پر مردہ بچے کی قیمت لاگو ہوگی اور خون بہا واجب نہ ہوگا۔ اگرچہ وہ بچہ آزاد ہو جانے کے بعد مرا ہے کیونکہ اس کی موت اس ضرب سے واقع ہوئی جو اس کے غلام ہونے کے دوران لگائی گئی تھی لہذا قیمت ہی واجب ہوگی ویت واجب نہ ہوگی اور یہ قیمت ایک زندہ (مملوک) بچے کی عائد ہوگی کیونکہ ضرب کے وقت وہ زندہ تھا اور مجرم اس کا قاتل متصور ہوگا۔ غرض (واجبات عائد کرنے سے پہلے) موت کا سبب اور موت کے وقت دونوں کو دیکھنا ہوگا۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ جنین کے تلف ہو جانے پر کفارہ واجب نہیں ہوتا انسانی جان کے ذکر میں اس کی تفصیل آچکی ہے اس سے تجاوز نہیں کیا جاسکتا تاہم اگر کوئی چاہے تو کفارہ بھی ادا کر سکتا ہے کیونکہ اس نے امر ممنوعہ کا ارتکاب کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے ہی میں بہتری ہے۔ وہ اپنے کئے کی معافی مانگ سکتا ہے۔

ان اصحاب کا کہنا یہ بھی ہے کہ اگر جنین (پیٹ کے بچے) میں اس کے وجود کے کچھ آثار پیدا ہو جائیں تو یہ تمام احکام مذکورہ پورے بچے کے احکام متعلقہ کی مانند عائد ہوں گے کیونکہ حدیث عام (غیر مشروط) ہے (یعنی ہر قسم کے جنین پر عائد ہوتی ہے)۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس کی پیدائش سے اس کی ماں پر تمام حق مادری عائد ہو جاتے ہیں مثلاً ایام عدت کا گزر جانا اور ایام نفاس وغیرہ کا تعین اس مسئلہ میں بھی یہی صورت حال ہے نیز اس لئے بھی کہ اس (آثار وجود) سے خون اور علقہ (پھلکی) میں امتیاز ہو جاتا ہے اور یہ جان کا معاملہ قرار پاتا ہے واللہ اعلم بالصواب۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر مارنے سے حاملہ عورت کے پیٹ کا بچہ مر کر ساقط ہو جائے یا عورت مر جائے اور اس جرم کے نتیجہ میں جو زندگی میں اس کے ساتھ ہوا بچہ ساقط ہو گیا تو مجرم پر جرمانہ لاگو ہوگا۔ اسی طرح اس حالت میں بھی جرمانہ ہوگا جبکہ (پورا بچہ نہیں) بلکہ قدرتی ولادت کے بغیر اس کا کچھ حصہ مثلاً مردہ بچے کا سر باہر آ جائے۔

کہا جاتا ہے کہ (جرمانہ عائد ہونے کے لئے) بچے کا (ماں کے پیٹ سے) باہر آ جانا ضروری ہے کیونکہ جب تک ایسا نہ ہو وہ بچہ ماں کے جسم کا ایک عضو متصور ہوگا۔ واضح ہو کہ جرم قوی بھی ہو سکتا ہے مثلاً دھمکانا اور فعلی بھی (یعنی مار پیٹ) یا قطع تعلق کر لینا (یہ بھی ایک ذہنی اذیت ہے جس سے اسقاط وغیرہ ہو سکتا ہے)۔

اگر ارتکاب جرم کے وقت وہ بچہ معصوم (واجب الحفظ) نہ ہو مثلاً حمی بی کا بچہ جو هنوز جریمہ عورت کے پیٹ میں ہو گا بعد میں دونوں میں سے کوئی مسلمان ہو جائے یا اس بچہ کا کوئی اور ذمہ دار نہ ہو مثلاً مجرم خود اس بچہ اور اس کی ماں کا مالک (آقا) ہو اور اپنی لوٹڈی پر جرم کرے جو کسی غیر سے حاملہ ہو جو اس بچے کا مالک ہے اور وہ عورت (لوٹڈی) آزاد

کردی جائے اس کے بعد (جرم کے نتیجہ میں) بچہ ساقط ہو جائے یا ماں مرجائے یا پیٹ سے باہر نہ آیا ہو یا اس کا باہر آنا ماں پر جرم کے نتیجہ میں نہ ہو تو ان تمام صورتوں میں مجرم (آقا پر کوئی تاوان عائد نہ ہوگا۔ کیونکہ پہلی صورت میں اس کی زندگی قابل احترام نہ تھی دوسری صورت میں مجرم تاوان کا ذمہ دار نہیں تھا۔ تیسری صورت میں بچے کی موت ماں کی موت کا نتیجہ ہے) جو مستوجب تاوان نہیں ہے) اور اخیر کی دو صورتوں میں بچے کا وجود ہی ثابت نہیں (تو اس پر جرم کیسا؟)

اگر بچہ زندہ پیدا ہوا اور پیدا ہونے کے بعد بغیر کسی تکلیف کے کچھ عرصہ تک باقی رہا اور اس کے بعد مر گیا تو مجرم پر اس کی ذمہ دار عائد نہ ہوگی۔ لیکن اگر پیٹ سے باہر آنے کے فوراً بعد ہی مر گیا یا سخت بے چینی ظاہر کرتا رہا: مثلاً بار بار ہاتھ بھینچنا اور کھولنا یا اس سے حرکت مذبوجی سرزد ہوتی رہی (یعنی وہ حرکتیں جو ذبح شدہ جانور کرتا ہے) اور اس کی بے چینی جاری رہی اور اسی حال میں مر گیا تو مجرم پر ایک جان ہلاک کرنے کی پوری دیت لاگو ہوگی اگرچہ وہ بچہ چھ مہینے سے کم کا ہے۔

اگر جرم کے نتیجہ میں کسی عورت کے دو بچے (پیٹ کے) ضائع ہو گئے تو دو جرمانے اور تین بچے ہوں تو تین جرمانے عائد ہوں گے دلی ہذا القیاس۔ اگر جنین کا صرف ہاتھ یا پاؤں باہر آیا اور ماں مر گئی تب بھی جرمانہ عائد ہوگا کیونکہ اس سے پیٹ میں بچے کا ہونا ثابت ہے اور بگمان غالب بچے کے ہاتھ یا پاؤں کا جدا ہو جانا مجرم کے جرم ہی سے مانا جائے گا، لیکن (اس صورت میں) اگر ماں زندہ رہی اور کوئی بچہ ساقط نہ ہوا تو مجرم پر نصف تاوان عائد ہوگا جیسے کسی زندہ انسان کا ایک ہاتھ کاٹ دینے پر نصف تاوان عائد ہوتا ہے باقی حصہ (کے جرمانے) کا ذمہ دار نہ ہوگا کیونکہ فقہاء کے نزدیک تہائی حصہ تک کی کوئی حقیقت نہیں اگر (ضرب خوردہ) عورت کے مرجانے کے بعد مردہ بچہ پیدا ہوا تو مجرم پر عورت کا خون بہا اور بچے کا جرمانہ لاگو ہوگا کیونکہ اس بچے کی موت بھی اسی کے ضرب لگانے سے ہوئی۔ اگر بچے کا ایک ہاتھ ساقط ہوا پھر مردہ بچہ بغیر ہاتھ کے پیدا ہوا اور زخم ہنوز مندل نہ ہوا تھا لیکن ماں کی تکلیف دور ہو گئی تو جرمانہ لاگو ہوگا کیونکہ ظاہر ہے کہ بچہ کا ہاتھ جرم کے نتیجہ میں جدا ہوا۔ یا اگر بچہ زندہ پیدا ہوا اور (جرم کے نتیجہ میں) پیدا ہونے کے بعد ہی مر گیا تو خون بہا عائد ہوگا جس میں ہاتھ کا تاوان شامل ہے لیکن اگر وہ بچہ زندہ ہے اور دایاں اس کی زندگی کی شہادت دیں یا یہ معلوم ہو جائے کہ وہ ہاتھ ایک زندہ جسم کا تھا تو اس ہاتھ کی نصف دیت لاگو ہوگی۔ اگر دایاں اس کی شہادت نہ دیں اور یہ نہ سمجھا جاسکے (کہ وہ ہاتھ زندہ وجود کا ایک حصہ ہے) تو (جہاں تک امر یقین ہے) اس یقین کی بناء پر نصف غرہ (غلام یا لونڈی) سے اور اس کی ادائیگی تین سال میں عاقلہ پر عائد ہوگی کیونکہ یہ (غرہ یا جرمانہ) جان کے عوض لاگو ہوا ہے اور وارثوں کو بطور ورثہ کا حق پہنچتا ہے۔

اگر (نتیجہ جرم میں) عورت کے پیٹ سے گوشت (کا ٹکڑا) ساقط ہوا تو غرہ (جرمانہ بشکل مملوک) عائد ہوگا بشرطیکہ دایاں بتائیں کہ یہ بھی حمل کی ایک شکل ہے جسے دوسری عورتیں نہیں جان سکتیں یا وہ گوشت ایسا ہو جس نے کوئی شکل مطلق نہ اختیار کی ہو جسے دایاں سمجھ سکتیں تاہم ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر یہ گوشت پیٹ میں رہتا تو شکل اختیار کر لیتا اور ایک وجود بن جاتا تب بھی غرہ واجب ہوگا اور اسی طرح اس کے پیدا ہو جانے پر ایام عدت پورے متصور ہوں گے یہی حکم اس

صورت میں ہے جبکہ (ساقط ہو جانے والا) گوشت مضغہ (مچہ) کی شکل میں ہو لیکن اگر وہ محض پشکی (چیپ دار مادہ) ہو تو مجرم پر کوئی مطالبہ عائد نہ ہوگا اور نہ اس سے عدت کی تکمیل ہوگی۔

یہ اصحاب کہتے ہیں کہ (ان صورتوں میں) غرہ جو واجب ہوگا وہ ایک غلام یا ایک لونڈی ہے جیسا کہ حدیث (مذکورہ) میں بتایا گیا ہے۔ اس میں مجرم کو اختیار ہے کہ (غلام یا لونڈی) جو چاہے دے، حقدار کو وہی قبول کر لینے پر مجبور کیا جائے گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ غرہ (میں دیا جانے والا مملوک) صاحب تمیز ہو (یعنی بچہ یا دیوانہ نہ ہو) اور اس میں ایسا عیب نہ ہو جسے مال فروخت میں عیب خیال کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں مجرم کے اختیار کو دخل نہیں ہے۔ (اس مسئلہ میں) صحیح ترین قول یہ ہے کہ غرہ کو قبول کرنا واجب ہے جبکہ وہ بڑا ہو گیا ہو، خواہ غلام ہو یا باندی۔ لیکن عمر رسیدگی کے باعث ناکارہ نہ ہو اور جب تک کہ اس کی افادیت ناقص نہیں ہوئی اسے بطور غرہ دینے کا مجرم کو اختیار ہے اور غرہ (یعنی دیت بشکل غلام یا کنیز) کے لئے یہ شرط ہے کہ اس کی قیمت مسلمان باپ کے تاوان کے بیسویں حصے کے مساوی ہو ہو مسلمان ماں کے تاوان کے دسویں حصہ کے برابر ہے۔

آزاد مسلمان کا جرم کرنے کی صورت میں غرہ (یادیت) ایک فرد مملوک (یعنی غلام یا لونڈی) ہے جس کی قیمت پانچ اونٹ ہوتی ہے جیسا کہ حضرت علی، عمر اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور چونکہ یہ دیت ہے لہذا اس کی مقدار کا تعین دوسری دیتوں کی طرح کیا جائے گا اور چونکہ جنین (بچہ شکم) حیات انسانی کے ادوار میں ادنیٰ ترین دور کا نام ہے لہذا اس کی دیت بھی شریعت کی مقرر کردہ دیت کی کم سے کم مقدار ہوگی۔ جیسے جراحت موضعہ اور دانت توڑنے کی دیت ہے۔ پس اگر غرہ (غلام یا باندی) محسوس طور پر دستیاب نہ ہو یا شرعاً حصول ممکن ہو لیکن اس کی واجبی قیمت سے زیادہ قیمت میں دستیاب ہو تو اس کے عوض پانچ اونٹ واجب ہوں گے کیونکہ وہ ملتا ہے تو اسی قیمت میں ملتا ہے اور جب دستیاب نہ ہو تو اتنی ہی قیمت واجب الادا ہوگی اور بدیں جہت کہ بنیادی طور پر دیت میں اونٹ ہی واجب ہوتے ہیں اور اگر وہ شے دستیاب نہ ہو جس کی وضاحت حکم شرع میں کی گئی ہے تو اونٹ ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے، ہاں اگر اونٹ دستیاب نہ ہوں تو ان کی قیمت (یا ان کی مالیت کی شے) واجب ہوگی جیسا کہ اس حالت میں ہوتا ہے جبکہ تاوان کا اونٹ گم ہو جائے۔ اگر دیت کے اونٹوں میں سے کچھ اونٹ گم ہو جائیں تو دستیاب اونٹوں کے ساتھ ساتھ گم شدہ اونٹ کی قیمت واجب الادا ہوگی۔

کہا جاتا ہے کہ غرہ (تاوان) کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ اس کی قیمت اتنی جتنی کہ اوپر بتائی گئی بلکہ جب بھی صحت مند اور صاحب شعور (مملوک) دستیاب ہو حقدار کو اسے قبول کرنا واجب ہے، اگرچہ اس کی قیمت مقدار مذکورہ سے کم ہو کیونکہ (عبد یا امۃ) کا جو لفظ حدیث میں آیا ہے اس کا اطلاق اس پر ہوتا ہے، قطع نظر اس کے کہ وہ جنین (بچہ شکم) مذکر تھا یا مؤنث کیونکہ حدیث میں یہ لفظ مطلق (غیر مشروط) آیا ہے غرہ (مملوک) کا وارثوں پر عائد ہونا، فریضہ الہی ہے۔ کیونکہ یہ معاذضہ جان (یعنی خون بہا) ہے اور یہ مان لیا جائے گا کہ بوقت اسقاط وہ بچہ زندہ تھا اور بعد میں مر گیا اور دیت (غرہ) مجرم کے عاقلہ پر عائد ہوگا جیسا کہ صحیحین کی حدیث میں آتا ہے "قضى في الجنين بغرة عبد او امة" (یعنی آنحضرت ﷺ)

نے یہ فیصلہ فرمایا ہے کہ جنین کی دیت غرہ ایک غلام یا ایک باندی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اگر مجرم نے عداوت کا جرم کیا یعنی (جنین کی) ماں کو ایسی اذیت دی جس سے بالعموم اسقاط حمل ہو جاتا ہے تو دیت غرہ اس پر عائد ہوگی اور یہ جرم اس کا جرم خطایا جرم مشابہ بہ عمد متصور ہوگا۔ قطع نظر اس کے کہ بچے کی ماں کے ساتھ جو جرم ہوا وہ غلطی سے سرزد ہوا یا عمداً کیا گیا یا وہ جرم شبہ عمد تھا کیونکہ بچے کا پیٹ میں ہونا یا زندہ ہونا یقینی امر نہیں تھا جس کے تلف کرنے کے ارادہ سے ارتکاب جرم کیا جائے یہی وجہ ہے کہ اگر (ارتکاب جرم کے بعد) بچہ شکم زندہ پیدا ہو کر مر جائے تو قصاص واجب نہ ہوگا کیونکہ قصاص صرف قتل عمد میں واجب ہوتا۔ اور اس صورت میں عمد کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

یہ اصحاب کہتے ہیں کہ یہودی یا نصرانی کا بچہ جو شکم مادر میں ہے اس بچہ کو حکم میں باپ کا تابع تصور کیا جائے گا۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ تاوان غرہ کے بارے میں اسے مسلمان بچے کی مانند قرار دیا جائے گا اور یہ بھی کہا جاتا ہے یہ خون رائیگاں ہو گا۔ یہ دونوں قول اس بناء پر ہیں جب کہ غرہ کی مالیت کا تعین نہ ہو سکے اور صحیح یہ ہے کہ اس (یہودی یا نصرانی بچہ) کا تاوان (بشکل غرہ) مسلمان بچے کے ایک تہائی غرہ کی مانند ہے جیسا کہ دیت میں ہوتا ہے یعنی ایک اونٹ اور دو تہائی اونٹ، یہی حکم بالغ یہودی اور نصرانی کے بارے میں ہے۔

ان اصحاب کا قول ہے کہ مملوک بچہ شکم لڑکا ہو یا نہ ہو اس (کے اطلاق) کا تاوان اس کی ماں کی قیمت کا دسواں حصہ ہے خواہ وہ ماں قنہ (یعنی بنائی گئی لونڈی) ہو یا مدبرہ (یعنی آقا کی زندگی تک کے لیے اس کی مملوکی ہو) یا مکاتبہ ہو (یعنی ایک خاص رقم کی ادائیگی کی شرط پر آزادی کا پروانہ دیا گیا ہو) یا اس سے اولاد ہو گئی ہو، جیسا کہ آزاد بچہ شکم کی صورت میں ہوتا ہے، پس جنین (بچہ شکم) کے غرہ کے تعین میں اس کی ماں کے تاوان کے دسویں حصہ کو مد نظر رکھا جائے گا۔ بچہ کی اپنی قیمت کو ملحوظ نہیں رکھا جائے گا کیونکہ اس کے مردہ پیدا ہونے کی صورت میں اس بچے کا موجود ہونا ثابت نہیں ہے (اس حکم سے) وہ صورت مستثنیٰ ہے جب کہ ماں خود اپنی جان کو ہلاک کرنے کی مجرم ہو۔ اس صورت میں اس کے بچہ شکم کا جو اس کے آقا کی ملکیت ہے کوئی تاوان نہ ہوگا کیونکہ آقا کو اپنے مملوک (لونڈی غلام) سے تاوان جرم کا کوئی حق نہیں ہے۔

جنین کی ماں کے مجرم پر تاوان جرم عائد کرنے کے لیے ماں کی اس قیمت کو پیش نظر رکھا جائے گا جو ارتکاب جرم والے دن تھی کیونکہ جرم کا تحقق اسی روز ہوا ہے، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تعین تاوان کے لیے بچے کے مرجانے والے دن جو اس کی ماں کی قیمت تھی اس کو مد نظر رکھا جائے گا کیونکہ جرم مجرم پر اس روز عائد ہوگا۔ یہ احکام اس حالت کے ہیں جبکہ جنین مردہ ساقط ہوا ہو جیسا کہ پہلے بتایا گیا۔ اگر وہ بچہ زندہ پیدا ہوا اور بعد میں مر گیا لیکن اسی جرم کے نتیجہ میں جو ماں پر ہوا تو قطعی طور پر اس بچے کی وہ قیمت واجب ہوگی جو پیدائش کے وقت اس کی لگائی جائے گو اس کی قیمت ماں کی قیمت کے دسویں حصے سے کم ہو۔ اس بچے کے غرہ (یادیت) کا حقدار اس کا مالک ہے۔ اگر ماں کے اعضاء کٹے ہوئے ہوں لیکن پیدا ہونے والا بچہ سلامت ہو تو بقول صحیح ماں کی وہ قیمت لگائی جائے گی جو سالم الاعضاء ہونے کی حالت میں ہوتی ہے کیونکہ بچے کے اعضاء سالم ہیں۔ جیسا کہ اس صورت میں ہوتا ہے جبکہ عورت کافرہ ہو اور بچہ شکم مسلمان ہو۔ اس صورت میں اس

عورت کی قیمت مسلمہ ہونے کی حیثیت سے لگائی جائے گی اور اگر وہ عورت آزاد ہو اور بچہ غلام ہو تو عورت کی قیمت بھی مملوکہ (لونڈی) کی حیثیت سے لگائی جائے گی، وعلیٰ ہذا القیاس۔

ان اصحاب کا یہ بھی کہنا ہے کہ مسلک غالب کی رو سے دسویں حصہ تاوان (مذکورہ) کا بار مجرم کے عاقلہ پر ہوگا۔ جیسا کہ مسائل غرہ میں بتایا گیا۔ اگر بچہ شکم مردہ ساقط ہوا اور اس کے وارثوں نے کسی شخص پر یہ الزام لگایا کہ یہ بچہ اس کے ارتکاب جرم کے نتیجہ میں ساقط ہوا اور ملزم اس سے انکار کرے اور اس پر حلف اٹھالے تو اس کی بات مان لی جائے اور دعویدار کو گواہ پیش کرنا لازم ہوگا اور اس کے دعوے کو دواشخاص کی شہادت کے بغیر تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

اگر مجرم نے ارتکاب جرم کا تو اقرار کیا لیکن اس سے انکار کیا کہ وہ بچہ اس کے جرم سے ساقط ہوا بلکہ وہ کہتا ہے کہ یہ بچہ کہیں سے اٹھایا ہوا ہے تب بھی اس کی بات مانی جائے اور دعویدار کو (اسقاط کے) گواہ پیش کرنے ہوں گے اور اس بارے میں عورتوں کی گواہی تسلیم کی جائے گی کیونکہ اسقاط حمل بھی ولادت ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں گو بچہ کا اسقاط اس حالت میں تسلیم کیا جائے گا جب کہ چوٹ لگنے یا بغیر کسی شرعی وجہ کے خوف و ہراس پیدا کرنے سے ہوا ہو، لیکن اگر سرزنش کے طور پر مارنے سے بچہ گر گیا تو واجب نہ ہوگا۔ اسی طرح اس حالت میں بھی جبکہ بدبو کے سونگھنے یا غلاظت خانہ کے کھلنے سے ایسا ہو گیا ہو۔ اگر ساقط شدہ چیز علقہ (لوتھڑے) کی شکل میں ہو یعنی ایک خون منجمد کہ اگر گرم پانی اس پر ڈالا جائے تو وہ تحلیل نہ ہو۔ خواہ اس کا سبب جرم خطا ہو یا جرم عمد ہو۔ اور خواہ وہ کسی اجنبی سے سرزد ہوا یا خود ماں سے ہوا ہو مثلاً ماں نے کوئی چیز استعمال کر لی جس سے حمل ساقط ہو جاتا ہے اور اس سے حمل ساقط ہو گیا۔ لڑکا ہو یا لڑکی، خاوند کا حمل ہو یا ناجائز ہو۔ ان تمام صورتوں میں ماں کا دسواں حصہ مرتکب فعل پر لاگو ہوگا یعنی اگر ماں آزاد ہے تو اس کے تاوان واجب کا دسواں حصہ اور اگر مملوکہ (لونڈی) ہے تو اس ماں کی قیمت کا دسواں حصہ واجب ہوگا۔ یہ قیمت ماں کی اس روز کی لگائی جائے گی جس دن اس کو ضرب پہنچائی گئی اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بچہ ساقط ہونے والے دن کی قیمت کو دیکھا جائے گا۔ اگر باپ نے جرم کیا تو اس پر بچے کی ماں کے تاوان کا دسواں حصہ عائد ہوگا جو اس بچے کے دوسرے حقدار وارثوں کو ملے گا باپ کچھ حقدار نہ ہوگا۔ ارتکاب عمد کی صورت میں دسویں حصہ کا یہ تاوان فوری طور پر بصورت نقد مجرم کے مال سے واجب الادا ہوگا اور غلطی سے جرم سرزد ہو جانے کی صورت میں بھی یہی حکم ہے بشرطیکہ غرہ (غلام یا لونڈی) جو بطور تاوان واجب ہو اس کی مقدار بچے کی دیت کے ایک تہائی تک نہ پہنچ جائے، ایسی صورت میں یہ تاوان عاقلہ مجرم کے ذمہ ہوگا۔ جیسا کہ اس صورت میں ہوتا ہے جبکہ ایک مجوسی نے مسلمان عورت کو ضرب پہنچائی اور اس کا بچہ شکم ساقط ہو گیا۔ یا آزاد عورت کا جنین ساقط ہونے پر تاوان بصورت غرہ (غلام یا لونڈی) عائد ہوتا ہے اور (نقد یا غرہ) دونوں میں سے کسی کے اختیار کرنے کا حق مجرم کو ہے۔ تاوان کے حقدار کو یہ حق نہیں ہے۔ لیکن اس حالت میں جبکہ لونڈی کا بچہ تلف ہوا ہو۔ خواہ وہ بندہ ہو یا باندی دونوں حالت میں مجرم کو تاوان بصورت نقد ہی ادا کرنا ہوگا (نقدی یا غرہ کے اختیار کرنے کا مجاز نہ ہوگا) یہ نقدی چھوٹی عمر کی باندی کے عوض ہے جو سات سال کی ہو گئی ہو یہ نقدی کا تعین (بندہ اور بندی کا)

فرق دور کرنے کے لیے ہے۔

واضح ہو کہ (ارتکاب جرم کے نتیجہ میں) عشر یا غرہ اس حالت میں واجب ہوگا جبکہ پورا بچہ مردہ ساقط ہو جائے اور اس کی ماں زندہ رہے اور اگر ماں بچہ پیدا کرنے سے پہلے ہی مر گئی تو مجرم پر بچہ کا تاوان کچھ عائد نہ ہوگا کیونکہ وہ ماں کے خون بہا میں شامل متصور ہوگا ہاں اگر پیدائش کے بعد بچہ رویا یا پیدائش کے وقت اس کی آواز نکلی یا ماں نے اسے دودھ پلایا کوئی ایسی بات ہوئی جس سے ثابت ہو کہ وہ بچہ پورے طور پر زندہ تھا تو مجرم پر دیت لازم ہوگی، بشرطیکہ بچے کے وارث قسم کھائیں کہ اس بچے کی موت مجرم کے فعل سے ہوئی ہے۔ اگر بچے کی زندگی کا علم ہوا لیکن فوراً ہی مر گیا اور ورثاء نے اس بات کی قسم نہیں کھائی کہ اس کی موت جرم کے نتیجہ میں ہوئی تو نہ غرہ واجب ہوگا اور نہ دیت عائد ہوگی کیونکہ یہاں اس امر کا احتمال ہے کہ بچے کی موت جرم کے باعث نہ ہوئی ہو۔ اگر (جرم سے) ماں مر گئی اور وہ بچہ جو ساقط ہوا وہ رویا لیکن مر گیا تو مجرم پر قصاص عائد ہوگا بشرطیکہ بچے کے ورثاء قسم کھا کر کہیں کہ وہ بچہ اس جرم کے نتیجہ میں مرا ہے۔ اس کے خلاف جو رائے ہے اس پر اسی قول کو ترجیح حاصل ہے۔

اگر مجرم نے ماں کے سر پر اس ارادہ سے ضرب لگائی کہ بچہ شکم مر جائے تو بقول راجح اس پر خون بہا عائد ہوگا۔ یہی حکم ہاتھ پاؤں پر بھی اسی غرض سے ضرب پہنچانے کا ہے۔

بات یہ ہے کہ (حاملہ عورت کے) پیٹ، پیٹھ اور سر ضرب رسانی کے بارے میں مختلف رائیں ہیں: ابن القاسم کہتے ہیں کہ ورثاء کے قسم کھالینے پر قصاص لاگو ہوگا اور اشہب کا کہنا ہے کہ اس صورت میں قصاص نہیں ہے بلکہ مجرم کے مال سے خون بہا واجب الاداء ہوگا بشرطیکہ ورثاء قسم کھا کر مجرم کے جرم کو اس کا موجب قرار دیں۔ لیکن ان اعضاء جسم کے علاوہ کسی اور جگہ پر عدا ضرب رسانی کی صورت میں ورثاء کے قسم کھانے سے مجرم کے مال میں سے خون بہا اور واجب ہوگا۔

ان مسائل میں قصاص اسی صورت میں واجب الادا ہوگا جبکہ مرتکب جرم باپ نہ ہو۔ اگر باپ نے جرم کیا ہو تو اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا سوا اس صورت کے جبکہ اس نے بچے کو ہلاک کرنے کے لیے ماں کے پیٹ پر عدا مارا ہو۔

اگر ایک سے زیادہ بچہ ہائے شکم (جرم کے نتیجہ میں) مردہ ساقط ہو جائیں تو تاوان کی تعداد بھی اتنی ہی واجب ہوگی خواہ تاوان بصورت عشر ہو یا بصورت غرہ (یعنی غلام لونڈی)۔ پھر اگر وہ جرم غلطی سے سرزد ہوا اور تاوان کی مقدار ماں کے تاوان کے تہائی حصہ کے برابر ہو جائے تو اس کی ادائیگی کا بار مجرم کے عاقلہ پر ہوگا لیکن اگر جرم کا ارتکاب عدا ہو یا غرہ (غلام لونڈی) کی مالیت ماں کے تہائی تاوان سے کم ہو تو اس کا بار مجرم کے عاقلہ پر نہ ہو بلکہ خود مجرم کے اپنے مال سے اسی وقت، فوری طور پر واجب الادا ہوگا۔

جنین کے ورثاء عشر واجب وغیرہ کے اسی نسبت سے وارث ہوں گے جیسا کہ شریعت نے حق مقرر فرما دیا ہے۔ اس میں اہل فرائض (جن کا حصہ مقرر شدہ ہے) اور عصبہ (جن کا حصہ مقرر نہیں ہے) دونوں طرح کے ورثاء شامل ہیں۔ چنانچہ اس بچہ کا کوئی بھائی نہیں ہے تو باپ کو دو تہائی اور ماں کو ایک تہائی ملے گا اور اگر بھائی ہے تو ماں کو چھٹا حصہ ملے گا۔

جملہ مسالک میں سے اسی مسلک کو ترجیح حاصل ہے۔ بخلاف اس کے جس نے کہا کہ یہ تاوان بچے کی ماں کے لیے مخصوص ہے۔ بشرطیکہ اس نے خود یہ جرم نہ کیا ہو، ربیعہ بھی یہی کہتے ہیں کیونکہ یہ ماں کے جزو بدن کے تاوان کی مانند ہے۔ ابن ہر مز کا قول اس کے خلاف ہے جو کہتے ہیں کہ (اس صورت میں) ماں اور باپ کو بہر حال ایک تہائی اور دو تہائی کا حق ہے۔ اگرچہ اس بچہ کا بھائی موجود ہو۔ امام مالک رحمہ اللہ پہلے اسی خیال کے حامی تھے۔ بعد میں اول الذکر قول کی طرف رجوع کر لیا تھا کیونکہ اسی قول کو ترجیح حاصل ہے۔

جاننا چاہیے کہ اگر بچہ شکم کے ساقط ہونے کا سبب خود ماں کا اپنا یا باپ کا فعل ہو تو اسے قاتل قرار دیا جائے گا اور مطلق تاوان کا وارث نہ ہوگا، کیونکہ قاتل (مقتول کا) وارث نہیں ہو سکتا۔

عاقلہ کی تفصیل اور بتا خیر ادائیگی تاوان کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ جرم مشابہ بہ عمد اور جرم خطا کی دیت اور جرم قتل کے جملہ تاوان جو عاقلہ پر واجب الادا ہیں، ان کی ادائیگی کا بار عاقلہ پر ہوگا، عاقلہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو ادائیگی تاوان کے ذمہ دار ہیں، عاقلہ پر تاوان لاگو ہونے کی بنیاد آنحضرت ﷺ کی حدیث متعلقہ حمل بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہے جس میں حضور کا یہ حکم ہے ”قوموا فادوہ“ (یعنی اٹھو نہ یہ ادا کرو) یہ حکم اس لیے بھی ہے کہ انسان کی جان قابل احترام ہے، اسے رائیگاں تلف قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے، ادھر غلطی سے ارتکاب جرم کرنے والا بے اختیار تھا، اسی طرح وہ شخص بھی جس کا فعل مشابہ بہ عمد ہو اسے بطور آگہ ارتکاب کے تصور کیا جائے (جس پر جرم عائد نہیں ہوتا) لہذا اس پر سزا کا عائد کرنا بے وجہ ہوگا اور بھاری رقم کا عائد کرنا اس پر زیادتی اور اس کی بیخ کنی ہے لہذا جو سزا اس پر عائد ہوگی بغرض تخفیف اس میں عاقلہ کو شامل کیا جائے گا، اور عاقلہ کو خاص طور پر تاوان میں شامل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قاتل نے جراحت رسانی کے ارتکاب میں ہچکچاہٹ اور توقف نہیں کیا جس کا سبب طاقت کا زعم تھا، اور طاقت کا یہ زعم حامیوں کی بدولت ہوتا ہے اور مجرم کے حامی اس کے عاقلہ ہی ہو سکتے ہیں، بدیں جہت وہ بھی مجرم کی نگہداشت اور اس کی نگرانی نہ رکھنے کے قصور وار ہیں، لہذا خاص طور پر انہیں ذمہ دار ٹھہرایا گیا، اب اگر مجرم (یا قاتل) سرکاری ملازم ہے تو اس کے عاقلہ اہل دیوان (افسران محکمہ) ہیں جن کے عطایا (منظور شدہ رقم) سے تین سال میں وہ تاوان وصول کیا جائے گا، اہل دیوان سے مراد وہ لوگ ہیں جو علم اور جھنڈوں والے ہیں یعنی اہل جیش جن کے نام دفاتروں اور فہرستوں میں درج ہیں (غالباً مراد کمیشنڈ افسران سے ہے) سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سب سے پہلے وفاتر قائم کیے اور ملازمین کے ارتکاب جرائم کے تاوان کا ذمہ دار اہل دیوان کو قرار دیا، اور یہ فیصلہ انہوں نے صحابہ رضوان اللہ علیہم کی موجودگی میں کیا اور اس پر کسی نے اعتراض نہ کیا، علاوہ اس کے تاوان کا بار مجرم کے حمایتیوں پر ہوتا ہے اور یہ حمایت کے مختلف اسباب ہیں، مثلاً قرابت (رشد داری) حلف (معاہدہ) ولا (سرپرستی) عد (ہمسری)۔ عہد عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سرکاری محکمہ سے وابستگی، حمایت ہونے لگی، لہذا اس مفہوم کے پیش نظر ان اہل دیوان کو عاقلہ قرار دیا گیا، بناء بریں ان اصحاب کا کہنا ہے کہ اگر آج ہم پیشگی کی بناء پر کچھ لوگوں کو باہم ایک دوسرے کی حمایت حاصل ہو تو اہل

حرفہ ایک دوسرے کے عاقلہ ہوں گے، اگر حلف (عہد وفاداری) کی بناء پر کسی کو حمایت حاصل ہو تو اہل عہد عاقلہ ہوگا۔ واضح ہو کہ تاوان کو صلہ کی حیثیت حاصل ہے لہذا بہتر یہ ہے کہ اس کی ادائیگی صلہ یا عطیات سے کی جائے۔ نسبت اس کے کہ اس کے ذاتی مال سے تاوان وصول کیا جائے عاقلہ سے وصولیابی (تاوان) کے لیے تین سال کی مدت آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد سے ثابت ہے جو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت کیا ہے، پھر یہ بھی ہے کہ مال عطیہ میں سے ادائیگی تاوان میں سہولت ہوتی ہے اور عطیات سال میں ایک بار نکالے جاتے ہیں، اگر عطیہ ایک سال سے زیادہ یا کم عرصہ میں ہوتا ہو تو جب بھی ہو اسی میں سے ادا کیا جائے، تاکہ سہولت کا جو مقصد ہے وہ پورا ہو جائے، اگر قاتل کو آئندہ ایک سال میں تین عطیے ملنے ہوں تو اس میں سے تاوان پورا کیا جائے، کیونکہ اس کے واجب الادا ہونے کا فیصلہ ہو چکا ہے، (اس لیے ضروری نہیں کہ تین سال پورے کیے جائیں)۔

اگر تین سال میں پورا تاوان ادا کرنا ہو تو ہر سال ایک تہائی ادا کی جائے اگر صرف ایک تہائی خون بہایا اس سے کم عائد ہو تو ایک ہی سال میں واجب الادا ہے اور ایک تہائی سے زیادہ دو تہائی تک دوسرے سال میں ادا کیا جائے اور اس سے زیادہ تین تہائی تک تیسرے سال میں ادا کیا جائے، جو خون بہا عاقلہ پر ڈالا گیا ہو یا جو خود قاتل پر عائد ہوا ہو بایں طور کہ باپ نے اپنے بیٹے کو عداقت کر دیا ہو تو وہ قاتل کے مال سے تین سال میں واجب الادا ہوگا، کیونکہ شرع میں مقررہ وقت کے اندر (بتاخیر) ادائیگی کا حکم ہے لہذا اس سے تجاوز نہیں کیا جاسکتا۔

اگر دس اشخاص نے ایک شخص کو غلطی سے قتل کرنے کا ارتکاب کیا تو ان میں سے ہر ایک پر تاوان کا دسواں حصہ تین سال میں ادا کرنا واجب ہے، ہر جزو کو ادائیگی کے بارے میں کل کی حیثیت میں رکھا جائے گا، بدیں لحاظ کہ وہ تاوان جان کا بدل ہے (جو حکم پوری جان کا ہے وہی عائد ہوگا) اور تین سال کی یہ مدت اسی وقت سے شروع ہوگی جبکہ ادائیگی تاوان کا فیصلہ ہوا، کیونکہ اصل واجب ہونے والی شے تو مثل ہے (یعنی جان کا بدلہ جان ہے جو ارتکاب جرم کے وقت ہی سے واجب ہو جاتا ہے) لیکن اس سے ہٹ کر قاضی سزائے مثلی کو تاوان میں بدل دے تو (تاوان اسی وقت واجب ہوگا اور) مدت ادائیگی تاوان اسی وقت سے شروع ہوگی جب یہ فیصلہ ہوا جیسے غیر متعین شخص کی اولاد کی صورت میں ہوتا ہے (کہ اس کی ولدیت کا تعین قاضی کے فیصلہ پر موقوف ہو جائے)۔

اگر کوئی شخص اہل دیوان (یعنی سرکاری ملازمین کے زمرہ میں) نہیں ہے تو اس کے عاقلہ اس کے قبیلہ کے لوگ ہوں گے، کیونکہ اسے ان کی حمایت حاصل ہے، عاقلہ ہونے کے لیے اس امر کو پیش نظر رکھا جاتا ہے، تاوان عائد شدہ ان سب پر تقسیم کر دیا جائے گا، جو تین سال میں واجب الادا ہوگا، تاہم کسی شخص پر ہر سال چار درہم سے زیادہ عائد نہ ہوگا، ہاں اس مقدار میں کمی کرنا جائز ہے۔ پس ہر ایک سے سالانہ ایک درہم کے سوا یا ایک درہم اور ایک تہائی درہم کے سوا نہیں لیا جائے گا۔ اگر اہل قبیلہ میں گنجائش ادائیگی نہ ہو تو قبیلے کے خاندانی رشتہ دار جو مجرم سے قرابت رکھتے ہوں ان کو شامل کر لیا جائے گا اور اس میں اقرب فاقرب کا اصول مد نظر رہے گا (یعنی پہلے نزدیک ترین رشتہ دار کو پھر ان کے بعد کے نزدیک

ترین رشتہ دار کو شامل کر لیا جائے گا) اور قرابت داری کی ترتیب بلحاظ عصبیت (یا صلبی رشتہ) کے ہوگی، مثلاً پہلے بھائی پھر بھتیجے، پھر چچا، پھر چچا زاد بھائی کہتے ہیں کہ باپ دادا اور بیٹے پوتے بوجہ قرابت دار ہونے کے عاقلہ میں شامل ہونے والوں میں نہیں ہیں، کیونکہ اہل قبیلہ کی شمولیت دشواری ادائیگی کو دور کرنے کے لیے ہے تاکہ کسی کو تین چار درہم سے زیادہ ادا نہ کرنا پڑے اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے، جبکہ تاوان دینے والوں کی تعداد زیادہ ہو اور باپ دادا اور بیٹے پوتوں کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی اگر عاقلہ اصحاب رزق (یعنی رسد پانے والے اشخاص) ہیں تو ان کی رسد میں سے ہر سال ایک تہائی کے حساب سے تین سال میں تاوان وصول کیا جائے گا۔

یہ اصحاب کہتے ہیں کہ اگر قاتل خود اہل دیوان میں سے ہے تو وہ بھی عاقلہ کے زمرہ میں شامل ہوگا، اگر اہل دیوان میں سے نہیں ہے تو اس پر کچھ لاگو نہ ہوگا یہ اس لیے ہے کہ فعل جبکہ اسی سے سرزد ہوا ہے تو اسے مطالبہ سے الگ کر دینے اور دوسروں سے مواخذہ کرنے کے کچھ معنی نہیں ہیں لہذا اسے بھی دوسرے ادا کنندگان تاوان میں شامل کیا جائے گا۔

یہ بھی ان اصحاب کا کہنا ہے کہ عورتیں اور بچے ہر چند کہ انہیں دیوان (سرکاری محکمہ) میں دخل ہوان پر ڈنڈ عائد نہ ہوگا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ”لا یعقل مع العاقلۃ صبی ولا امرأۃ“ (یعنی بچہ اور عورت عاقلہ کے ساتھ شریک تاوان نہ ہوں گے) یہ اس لیے کہ قتل کا الزام مجرم کے حمایتیوں پر بھی ہوتا ہے کہ وہ اس کی روک ٹوک اور نگرانی نہیں کرتے، بچوں اور عورتوں کی حمایت انہیں حاصل نہیں ہوتی، لہذا ان پر تاوان نہیں ڈالا جاتا، اسی وجہ سے اگر بچہ یا عورت قاتل ہو تو ان پر خون بہا عائد نہیں ہوتا، بخلاف بالغ مرد کے، اور قاتل پر کچھ تاوان جو عائد کیا جاتا ہے وہ بھی اس لیے ہوتا ہے کہ اسے اپنے نفس کا حمایتی ہونے کے باعث عاقلہ تصور کیا جاتا ہے، یہ کیفیت عورت اور بچے میں نہیں ہوتی۔

ایک شہر کا رہنے والا دوسرے شہر والے کا عاقلہ قرار نہیں دیا جائے گا البتہ شہر کے مضافات میں رہنے والا اہل شہر کا عاقلہ ہو سکتا ہے، کیونکہ مضاف شہر بھی شہر میں داخل ہے۔

اگر کسی شخص نے ایک شہری کا جرم کیا اور اسے دیوان (سرکاری محکمہ) سے کچھ نہیں ملتا گو صحرائین اس شخص کے اقرباء ہیں اور وہ خود شہر میں رہتا ہے تو اس شہر کے اہل دیوان اس کا تاوان واجب ادا کریں گے، یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اہل دیوان اور مجرم باہم قرابت دار ہوں، اگر کوئی بدوی (بدویا اہل قریہ) شہر میں رہائش پذیر ہو لیکن اس کا گھر یا شہر میں نہیں ہے تاہم اہل شہر ہی اس کے عاقلہ متصور ہوں گے، کیونکہ اہل عطا اس کی اعانت نہیں کرتے جس کا گھر وہاں نہ ہو (جہاں ان کا گھر ہے) اسی طرح اگر اہل بادیہ کے درمیان کوئی شہری اقامت گزریں ہو جائے تو بدوی اس کا تاوان ادا نہیں کریں گے کیونکہ اسے ان کی حمایت حاصل نہیں ہے۔

ان اصحاب کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر ذمی اشخاص کے عاقلہ معلوم ہوں تو وہ اس کی طرف سے تاوان ادا کریں گے، چنانچہ اگر کسی ذمی نے غلطی سے ارتکاب قتل کر لیا تو اس کا خون بہا ایک مسلمان کے خون کی طرح اس کے عاقلہ پر لاگو ہوگا، کیونکہ ان پر بھی جملہ معاملات میں احکام اسلامی عائد ہوتے ہیں، خاص کر ایسے احکام جو ضرر رسانی سے بچانے والے

ہوں، بشرطیکہ عاقلہ اور مجرم کے درمیان باہمی حمایت کے حقدار ہونے کا مفہوم موجود ہو، پس اگر اس کے عاقلہ کا علم ہو تو اس کے مال میں سے تین سال کی میعاد دی دیت واجب الوصول ہوگی، اور میعاد کی ابتدا اس دن سے ہوگی جس دن قاضی نے (تاوان کا) فیصلہ کیا، جیسا کہ مسلمان کے بارے میں ہوتا ہے۔

یاد رہے کہ کوئی کافر مسلمان کا یا مسلمان کافر کا عاقلہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ ایک دوسرے کے حامی متصور نہیں ہوتے، ہاں اہل کفر باہم ایک دوسرے کے عاقلہ ہو سکتے ہیں، گو ان کے مذاہب مختلف ہوں، کیونکہ تمام کافر ایک قوم ہیں یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ ان کے درمیان باہمی عداوت ظاہر نہ ہو، اگر عداوت ظاہر ہے جیسے یہودی اور نصرانی کے درمیان ہے تو چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کے عاقلہ قرار نہ دیئے جائیں۔

ان اصحاب کا قول ہے کہ آزاد کردہ غلام کا عاقلہ اس کے آقا کا قبیلہ ہوگا کیونکہ اس کو ان کی نصرت (حمایت) حاصل ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”مولى القوم منهم“ (یعنی کسی قوم کا آزاد شدہ غلام اسی قوم میں شمار ہوگا) اور والیوں کے غلام کا تاوان اس کا آقا اور آقا کا قبیلہ ادا کرے گا کیونکہ وہی اس غلام کا ناصر (حامی) ہے جیسے آزاد شدہ غلام کی صورت میں ہوتا ہے۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ عاقلہ تاوان کے بیسویں حصہ سے کم مقدار کی ادائیگی نہیں کرے گا، پورے تاوان کے بیسویں حصے یا اس سے زیادہ کے تاوان کی ادائیگی کرے گا جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث موقوف (جس کا سلسلہ روایت آنحضرت ﷺ تک نہ پہنچا ہو) میں ہے اور آنحضرت ﷺ کی حدیث مرفوع ہے (جس کا سلسلہ روایت حضور تک پہنچا ہے) ”لا تعقل العواقل عمداً، ولا عبداً، ولا صلحاً، ولا اعترافاً، ولا ما دون ارش الموضحة“ (یعنی عاقلہ پر تاوان نہیں ڈالا جائے گا جبکہ جرم کا ارتکاب عمداً ہو، یا غلام کا قتل ہو، یا مصالحت کا تاوان ہو یا اعتراف جرم کا تاوان یا جراحت موضحة کے جرمانے سے کم مقدار کا تاوان ہو۔ واضح ہو کہ جراحت موضحة کا جرمانہ پورے خون بہا کا بیسواں حصہ ہوتا ہے۔ عاقلہ پر بھاری تاوان کا بار ڈالنے کا مقصد یہ ہے کہ کسی پر بیجا سختی نہ ہو، تھوڑی بہت زیادتی تباہ کن نہیں ہوتی ہاں بڑی زیادتی ہو تو تباہ کن ہوتی ہے دونوں حالتوں کے فرق کا اندازہ سمائی ہے (یعنی قیاسی یا قاعدے کی بناء پر نہیں ہے) پس مقدار بالا سے کم تاوان ہو تو مرتکب فعل کے مال سے وصول کیا جائے گا (زیادہ ہو تو عاقلہ پر ڈالا جائے گا) حالانکہ قیاس یہ ہے کہ تاوان کم ہو یا زیادہ ایک ہی بات ہے، لہذا تاوان عاقلہ پر ڈالا جانا چاہیے (کم ہو یا زیادہ) چنانچہ امام شافعیؒ اسی طرف گئے ہیں، یا پھر دونوں کے یکساں ہونے کی صورت یہ ہے کہ عاقلہ پر کوئی تاوان عائد ہی نہ کیا جائے (جو تاوان ہو وہ سب اسی سے وصول کیا جائے جس پر ڈالا گیا ہے)، حنفیوں نے اس قاعدہ کو نظر انداز کر دیا ہے کیونکہ نبی ﷺ سے روایت ہے کہ حضور نے جنین (بچہ شکم) کے تلف کرنے کا جرمانہ عاقلہ پر ڈالا جس کی مقدار ایک بالغ مرد کے خون بہا کا بیسواں حصہ ہے، اس سے کم مقدار میں دوسرے مالی معاملات کی روش اختیار کی جائے گی یعنی وہ تاوان حکیم (تشخیص حاکم) کے بموجب لاگو ہوگا جیسا کہ مال کی ضمانت کی صورت میں ہوتا ہے کہ اس کا تخمینہ لگا کر (ضامن سے) وصول کیا

جاتا ہے۔ پس تاوان دار سے اسی قاعدے کے مطابق تاوان وصول کیا جائے گا۔

ان اصحاب کا کہنا یہ بھی ہے کہ غلام (قتل) کا مجرم ہو تو اس کا تاوان عاقلہ پر نہیں ڈالا جائے گا، اور نہ وہ تاوان جس کے بارے میں باہمی تصفیہ ہوا ہو یا وہ تاوان جو مرتکب فعل ادا کرنے کا اقرار کر لے کیونکہ عاقلہ اور مجرم غلام میں باہمی تناصر (حمایت) نہیں ہوتی اس طرح اگر مجرم اقرار کر لے یا کسی بات پر مصالحت کر لے تو عاقلہ پر کچھ لازم نہ ہوگا بجز اس صورت کے جبکہ اہل عاقلہ مجرم (کے قول و قرار یا مصالحت) کی تصدیق کریں، تصدیق کی بناء پر تاوان ثابت ہو جائے گا، تاہم (مجرم کے قول سے) انہیں انکار کر دینے کا حق ہے، انہیں اپنے آپ کی سربراہی کا حق حاصل ہے۔

اگر کسی شخص نے قتل خطا کا اقرار کیا اور کئی سال گزرنے کے بعد یہ معاملہ قاضی (حاکم شرع) کے پیش ہوا تو قاضی اس کے مال سے خون بہا کے ادا کیے جانے کا فیصلہ کرے گا اور یہ ادائیگی اس کے خلاف فیصلہ ہونے کے دن سے تین سال میں کی جائے گی کیونکہ جب شہادت سے ثابت ہونے والے جرائم کے تاوان کی ادائیگی کے لیے فیصلہ دن سے تین سال کی میعاد مقرر ہے تو اقرار سے ثابت ہونے والے جرائم کی صورت میں بدرجہ اولیٰ ادائیگی (تاوان واجب) کے لیے مہلت ملنی چاہیے۔

اگر قاتل اور مقتول کا ولی دونوں اس بات کی تصدیق کریں کہ فلاں شہر کے قاضی نے گواہوں کی بناء پر فیصلہ کیا ہے کہ مجرم کے عاقلہ جو کوفہ میں ہیں وہ تاوان ادا کریں لیکن وہ لوگ اس سے انکار کریں ان پر کچھ عائد نہ ہوگا، کیونکہ ان دونوں کی اس طرح باہمی تصدیق کوئی دلیل نہیں ہے اور مجرم کے مال میں سے کچھ واجب الادا نہ ہوگا، ہاں اگر مجرم کو عاقلہ کے ساتھ عطیہ (وظیفہ وغیرہ) ملتا ہے تو عاقلہ کے حصے کے مطابق عاقلہ پر تاوان لاگو ہوگا، کیونکہ مجرم نے خود تاوان کے ایک حصہ کا اقرار اپنے اوپر اور ایک حصہ کا اپنے عاقلہ پر کر لیا ہے۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ اگر ایک آزاد شخص نے کسی غلام کا جرم کیا کہ وہ غلطی سے قتل کا مرتکب ہو گیا تو آزاد شخص کے عاقلہ پر اس غلام کی قیمت واجب الادا ہوگی کیونکہ یہ جان کا بدلہ ہے اور ملا عنہ عورت کا بیٹا (یعنی اس عورت کا بیٹا جس نے لعان کیا ہو) اگر جرم کرے تو اس کے تاوان کے ذمہ دار اس کی ماں کے عاقلہ ہوں گے، کیونکہ (لعان کے بعد) اس لڑکے کا نسب اس کی ماں سے ثابت ہے باپ سے نہیں، اب اگر اس عورت کے عاقلہ نے ادائیگی کر دی اور اس کے بعد اس لڑکے کا باپ اس کا دعویٰ ادا ہو جائے تو اس کی ماں کے عاقلہ کو اس کے باپ سے اپنے ادا کردہ خون بہا کی واپسی کا حق ہے جس کی میعاد اس دن سے تین سال ہوگی جس دن قاضی نے ماں کے عاقلہ کے حق میں باپ کے عاقلہ کے خلاف فیصلہ کیا، کیونکہ اسی دن یہ ثابت ہوا کہ باپ کے عاقلہ پر خون بہا واجب ہے۔

شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اطراف جسم وغیرہ کے جرم میں جو غلطی سے سرزد ہو گیا ہو اور جرم شبہ عہد میں نیز بغیر کسی قاتل کے خود اپنی جان پر جرم کرنے یا حکومت کے تشخیص کردہ تاوان یا تاوان بشکل غرہ میں مجرم کے عاقلہ پر دیت عائد ہوگی، مجرم پر نہ ہوگی کیونکہ عہد جاہلیت میں لوگ ہلاک شدہ شخص کے وارثوں کو مجرم کے پاس آنے اور خون کا بدلہ لینے سے باز رکھتے تھے، شارع علیہ السلام نے (مجرم کی) اس حمایت کے عوض ادائیگی مال کا حکم دیا اور اس کو جرم خطا یا جرم مشابہ بہ عہد

کے لیے مخصوص فرمایا، کیونکہ ایسے حادثات اکثر ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں خاص کر ان لوگوں میں جو ہتھیار کے استعمال میں جلد بازی کرتے ہیں، یہ اعانت اس لیے کی کہ ایسی بات کے عوض جس میں ایک شخص معذور تھا اس پر زیادہ دباؤ ڈالا جائے اور واضح ہو کہ یہ تاوان عاقلہ پر اس حالت میں ڈالا جائے گا جبکہ گواہوں سے یہ ثابت ہو جائے کہ وہ فعل (باعث نقصان یا ہلاکت) بھولے سے سرزد ہوا یا مشابہ بہ عمد ہو (یعنی بہ ظاہر عمد ہو لیکن حقیقی معنوں میں عمد نہ ہو) یا مرتکب خطا کا اعتراف کر لے اور در ثناء اسے تسلیم کر لیں۔

یہ اصحاب کہتے ہیں کہ خون بہا کا بار اٹھانے والے تین ہیں: قرابت دار، ولی (سربراہ) اور بیت المال، ان کے علاوہ نہیں ہیں مثلاً بیوی، (مجرم کے) متعلقین یا غیر صلبی (یا غیر پدری) رشتہ دار، کیونکہ آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں یہی دستور العمل تھا جس کی تنسیخ بعد میں نہیں ہوئی نیز یہ بھی ہے کہ یہ معاوضہ ہے اور اس کی ادائیگی کے سب سے زیادہ ذمہ دار وہی ہیں اور مجرم کے عصبہ (پدری رشتہ دار) وہ مرد ہیں جو نسب یا ولاء (سربراہی) کی بناء پر (مجرم کے) وارث ہوں اور مکلف ہوں اور یہ قرابت داری باپ کی طرف سے ہو۔ (ان میں) عورت اور بچے اگرچہ مقدور والے ہوں اس تاوان کا بار ان پر نہیں ڈالا جائے گا، یہی حال اس کا ہے، جسے کوتاہ عقلی کے باعث نا اہل معاملہ قرار دیا گیا ہو، یاد رہے کہ مجرم کی جڑ (یعنی باپ دادا) خواہ کتنے ہی اوپر کے درجہ میں ہوں اور شاخ (یعنی بیٹے پوتے) خواہ کتنے ہی نیچے کے درجہ میں ہوں عصبات سے خارج ہیں کیونکہ یہ سب اسی کے وجود کا حصہ ہیں، پس جس طرح خود مجرم پر بدیں جہت کہ پورا تاوان عائد نہیں ہوتا جزوی تاوان بھی عائد نہیں ہوتا کیونکہ وہ معذور تھا اسی طرح اس کے اجزائے وجود (یعنی باپ، بیٹے) بھی تاوان کا بار نہیں اٹھائیں گے، چنانچہ نسائی کی روایت کردہ حدیث ہے کہ ”لا يؤخذ الرجل بحریرة، ای جریرۃ ابنہ“ (یعنی کوئی شخص کسی کے کیے پر نہیں پکڑا جائے گا۔ یہاں پر کسی سے مراد بیٹا ہے) اور ابو داؤد کی روایت کردہ حدیث سابقہ میں جو دو عورتوں کے بارے میں آیا ہے کہ ”وسراء الولد“ (یعنی بیٹا بری ہے) مطلب دیت سے بری ہونا ہے۔ اسی پر دوسرے ابغاض کو (یعنی ان افراد کو جو اسی کے وجود کے اجزاء ہیں جن سے مراد باپ دادا یا بیٹا پوتا وغیرہ ہیں) قیاس کیا گیا ہے اور دیت خواہ تھوڑی ہو یا بہت عاقلہ پر لاگو ہوتی ہے۔

اور دیت کا بار قریب ترین عصبہ (خاندانی رشتہ دار) پر پھر اس کے بعد کے قریب ترین پر ہوگا، اب اگر قریب ترین فرد خاندان تاوان کو پورا نہ ادا کر سکے یعنی کچھ باقی رہ جائے تو باقی تاوان بعد کے قریب ترین افراد پر ڈال دیا جائے گا اور ان افراد میں سے اسے اولیت حاصل ہوگی جسے باپ ماں دونوں سے تعلق ہو بمقابلہ اس کے جسے صرف باپ سے ہو، جیسا کہ وراثت میں ہوتا ہے (کہ حقیقی رشتہ کو سوتیلے پر ترجیح دی جاتی ہے) تاہم تاوان کے لاگو ہونے میں دونوں یکساں ہیں کیونکہ عاقلہ ہونے میں عورت کا کوئی دخل نہیں لہذا (تاوان کے لاگو ہونے میں سب برابر ہوں گے) ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ ہوگی، پھر اگر خاندانی رشتہ دار نہ ہوں یا مطالبہ واجب ادا نہ کر سکیں اس کا آزاد شدہ غلام اس کی طرف سے تاوان کا بار اٹھائے گا جیسا کہ آنحضرت ﷺ کی حدیث ہے ”الولاء لحمۃ کلحمۃ النسب“ (یعنی دلایا آقا ہونا بھی نسبی قرابت

کی مانند ایک قرابت ہے) اگر آزاد کردہ غلام نہ ہو یا مطالبہ واجب پورا نہ کر سکے تو اس کے ایسے رشتہ داروں کو آگے لایا جائے گا جو اس کی جڑ یا شاخ میں سے نہ ہوں اور ان میں اقرب فالاقرب کے اصول کو مد نظر رکھا جائے گا، جیسا کہ شافعیؒ اور بیہقی کی روایتوں میں آیا ہے کہ ”ان عُمَرَ قُضِيَ عَلَى عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا بَانَ يَعْقِلَ عَنْ مَوَالِي صَفِيَّةِ بِنْتِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ“ (یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر یہ فیصلہ عائد کیا کہ وہ صفیہ بنت عبد المطلب کے آزاد کردہ غلاموں کی طرف سے تاوان ادا کریں) کیونکہ وہ صفیہ کے بھتیجے ہیں، صفیہ کے بیٹے زبیر پر تاوان لاگو نہیں کیا گیا، پھر آزاد کنندہ کی عدم موجودگی میں آزاد کردہ کے آزاد کردہ اور باپ کے رشتہ داروں پر اسی طرح، اس کی عدم موجودگی میں دادا کے آزاد کردہ پر پھر اس کے مادری رشتہ داروں پر جہاں تک کہ وراثت کا حق پہنچتا ہے۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ اگر عورت کا آزاد کردہ (غلام) مجرم ہو تو اس کے تاوان کا بار عورت کے عاقلہ پر ہوگا، اس عورت پر نہیں ڈالا جائے گا کئی آزاد کرنے والوں کو ایک ہی آزاد کنندہ (یا آقا) تصور کیا جائے گا یعنی سالانہ تاوان واجب الادا کے بارے میں ہر ایک کے رشتہ دار کو ایک ہی کا تصور کیا جائے گا اور ہر ایک (آقا) کے تمام رشتہ دار اسی قدر بار تاوان اٹھائیں گے جتنا کوئی ایک (آقا) اپنی زندگی میں اٹھاتا خواہ وہ تاوان نصف ہو یا چوتھائی۔

نیز ان کا کہنا ہے کہ بقول قوی کوئی غلام جسے عورت نے آزاد کر دیا ہو اسی عورت پر عائد ہونے والا تاوان ادا نہیں کرے گا، جس طرح کہ وہ (عورت کا) وارث نہیں ہوتا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ ادا کرے گا کیونکہ عاقلہ بننے کی بنیاد حمایت و اعانت ہے (یعنی تاوان مجرم کے حامی پر ڈالا جاتا ہے)، اگر ادائے تاوان کے مذکورہ ذمہ داروں میں سے کوئی موجود نہ ہو یا موجود ہو اور اسے علم نہ ہو کہ اس پر کیا تاوان ڈالا گیا تو اس کے رشتہ دار ادا کریں گے، بشرطیکہ ان کے ذی حیثیت ہونے کا گمان ہو بصورت دیگر مجرم کی رقم تاوان بیت المال سے ادا کی جائے گی کیونکہ (بیت المال) اس کا وارث ہوتا ہے اور آنحضرت ﷺ کی حدیث ہے ”انسا وارث من لا وارث له، واعقل عنه وارثه“ (یعنی لا وارث کا وارث میں ہوں اور اس کی طرف سے تاوان میں ادا کروں گا اور اس کا وارث میں ہوں گا)۔ ابو داؤد اور نسائی نے اس حدیث کا اخراج فرمایا ہے۔ اگر بیت المال نہ ہو یعنی اس میں کچھ نہ ہو یا اس کے انتظام میں ظالموں کی خلل اندازی سے بد نظمی ہو یا بیت المال کا علم نہ ہو تو بقول صحیح پوری دیت یا جزوی ادا شدہ دیت کا کچھ حصہ ادائیگی سے رہ گیا ہو تو مجرم کے مال سے واجب الوصول ہو گی، کیونکہ تاوان کی ادائیگی ابتداءً تو اسی پر لازم ہوتی ہے پھر تاوان عاقلہ پر ڈالا جاتا ہے، لہذا دیت مجرم پر لاگو کی جائے گی تاکہ حقدار کا حق ضائع نہ ہو اور اسے نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا، تاکہ ایک مسلمان کا خون رائگاں نہ جائے، مجرم پر تاوان عائد ہو تو اس کی ادائیگی کے لیے مہلت دی جائے گی اور سال بہ سال ایک تہائی دیت وصول کی جائے گی، اگر بدوران سال وہ وفات پا جائے تو بقول صحیح میعاد ادائیگی ختم متصور ہوگی اور فوری طور پر وصولیابی کی جائے گی۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ ایک شخص جو اسلام، آزادی اور مرد ہونے کی حیثیت سے کامل ہے اس کا خون بہا جب مجرم کے عاقلہ پر ڈالا جائے، اس کی مدت ادائیگی تین سال مقرر ہے، ہر سال کے خاتمہ پر دیت کی ایک تہائی مقدار وصول

کی جائے گی جیسا کہ بیہقی کی روایت میں حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کا یہی فیصلہ مذکور ہے، اور امام شافعیؒ نے اسے آنحضرت ﷺ کا فیصلہ قرار دیا ہے، بہر حال تاوان کی وصولی ہر سال کے آخر میں ہوگی، کیونکہ جملہ قسم کے فوائد مثلاً اناج، پھل، اور اونٹ (وغیرہ جانوروں) کے بچے سال بہ سال حاصل ہوتے ہیں اسی لیے سال کے پورا ہو جانے کو مد نظر رکھا گیا ہے تاکہ لوگ جن منافع کے متوقع ہوتے ہیں وہ حاصل ہو جائیں اور انہیں ادائیگی واجب میں سہولت ہو۔

ذی کے خون کے وصولیابی کی معیاد بقول صحیح ایک سال ہے، کیونکہ اس کی مقدار مسلمان کے دیت کی ایک تہائی ہوتی ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ اسے بھی تین سال کی مہلت دی جائے گی کیونکہ یہ ایک قابل احترام جان کا بدل ہے۔

مسلمان عورت کا خون بہا ادا کرنے کے لیے دو سال کی مہلت ہے، پہلے سال کے خاتمہ پر پورے خون بہا کا ایک تہائی اور باقی دوسرے سال کے اخیر تک ادا کیا جائے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے لیے بھی تین سال کی مہلت ہے۔

اگر آزاد شخص کسی غلام (کے قتل) کا مجرم ہو تو بقول قوی اس کے تاوان کا بار اس شخص کے عاقلہ پر ہوگا، پس ہر سال کے اخیر میں اس غلام کی قیمت کا ایک تہائی حصہ وصول کیا جائے گا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ پورا تاوان تین سال میں وصول کیا جائے گا، کیونکہ یہ ایک قابل احترام جان کا بدل ہے۔

اگر ایک شخص نے دو آدمیوں کو قتل کیا تو ان دونوں کی دیتیں مجرم کے عاقلہ سے تین سال میں وصول کی جائیں گی کیونکہ یہ دو مختلف دیتیں واجب ہوئی ہیں، یہ بھی کہا گیا ہے کہ دونوں دیتوں کی ادائیگی کے لیے چھ سال مہلت ہوگی اور ہر ایک دیت کا چھٹا حصہ سالانہ وصول کیا جائے گا، کیونکہ ایک جان کے معاوضہ کو تین سال پر ڈالا جاتا ہے لہذا دوسری جان کے عوض کے لیے بھی اتنی ہی مدت کا اضافہ کیا جائے گا۔

اگر ایک شخص نے دو عورتوں کو قتل کیا تو ان دونوں کے خون بہا کی ادائیگی کے لیے مجرم کے عاقلہ کو دو سال کی مہلت دی جائے گی اور اطراف بدن مثلاً دونوں ہاتھ کاٹنے کی دیت اور تشخص شدہ تاوان یا دوسرے جرائم کی ادائیگی تاوان کے لیے مہلت دی جائے گی کہ پورے تاوان کا ایک تہائی حصہ ہر سال ادا کیا جائے، لیکن اگر تاوان واجب کی مقدار ایک جان کے خون بہا سے زیادہ مثلاً دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں کاٹ دیئے گئے ہوں تو اس کے لیے چھ سال کی مہلت ہوگی اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پوری دیت ایک سال میں وصول کی جائے خواہ وہ کتنی ہی ہو کیونکہ یہ جان کا بدل (خون بہا) نہیں ہے کہ اس کے لیے مہلت دی جائے۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ جان کی دیت کے لیے مدت کا تعین اس وقت سے کیا جائے گا جب جان نکلی ہو کیونکہ خون بہا اسی وقت واجب ہوتا ہے، جان کے سوا دوسرے جرائم کا تاوان مثلاً ہاتھ کاٹ دیا اور وہ زخم اچھا ہو گیا، تو اس کی مدت اس وقت سے شروع ہوگی جب ارتکاب جرم ہوا، کیونکہ یہ تاوان جراحت رسانی کے وقت ہی سے واجب الادا ہو جاتا ہے اگر زخم مندمل نہ ہوا، مثلاً انگلی کاٹی اور زخم ہتھیلی تک سرایت کر گیا تو انگلی کے جرمانے کی مہلت ادائیگی اس وقت سے ہوگی جب وہ کائی گئی اور ہتھیلی کے جرمانے کی معیاد مہلت اس وقت سے ہوگی جب وہ ناکارہ ہو جائے۔

عاقلہ (ادائے تاوان کے ذمہ داروں) میں سے اگر کوئی سال مہلت کے دوران وفات پا جائے تو اس سال سے واجب ہونے والی دیت ساقط ہو جائے گی اور بہ تقاضائے کرم اس کے ترکہ سے وصول نہیں کی جائے گی۔

عاقلہ کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ مرد ہوں محتاج نہ ہوں، آزاد ہوں اور مکلف ہوں اور طرفین کا مذہب ایک ہو، لہذا محتاج، غلام، بچہ (نابالغ) اور جنون زدہ عاقلہ نہیں بن سکتے نیز عورت بھی عاقلہ نہیں بن سکتی نیز نہ مسلمان کافر کی طرف سے تاوان ادا کرے گا اور نہ کافر مسلمان کی طرف سے، بقول صحیح یہودی نصرانی کا یا اس کے برعکس (نصرانی یہودی) کا عاقلہ بن سکتا ہے، اور مالدار پر اگر اس کے پاس سونا ہے تو نصف دینار واجب ہوگا اور اگر اس کے پاس چاندی ہے تو اسی قیمت کے درہم واجب ہوں گے، جو چھ درہم ہوتے ہیں، چنانچہ نقد زکوٰۃ باعتبار مواسات (برابری) اسی مقدار کو اولیت حاصل ہے اور اس سے زیادہ کے لیے کوئی قاعدہ نہیں ہے، اوسط درجہ کے عاقلہ پر ایک چوتھائی دینار یا تین درہم تاوان واجب ہوگا، کیونکہ یہ مقدار محتاج جس کے پاس کچھ نہیں ہے اور مالدار جس پر نصف دینار ڈالا گیا ہے، کے درمیان ایک درمیانی درجہ کا مطالبہ ہے، ہر سال اس مقدار کا تیسرا حصہ واجب الادا ہوگا، اس رعایت کا تعلق چونکہ سال سے ہے لہذا سال بہ سال ہوتی رہے گی جیسا کہ زکوٰۃ میں ہوتا ہے، پس تین سال میں مالدار پر ڈیڑھ دینار لاگو ہوگا اور اوسط درجہ کے عاقلہ پر پون دینار لاگو ہوگا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک تہائی واجب ہوگا۔

واضح ہو کہ نصف یا چوتھائی دینار سے مراد اس کی مالیت ہے فی الواقع آدھا یا چوتھائی دینار مراد نہیں ہے، اور کسی کا مالدار یا اوسط درجہ کا ہونا اخیر سال کے اعتبار سے ہوگا، کیونکہ مالی حقوق (کے عائد ہونے) کا انحصار سال گزارنے پر ہے اگر بدوران سال حالت خراب ہو جائے تو مطالبہ ساقط ہو جائے گا اور واجب الوصول نہ رہے گا، کیونکہ اب وہ (کسی کے ساتھ) مالی ہمدردی کرنے کے قابل نہیں ہے بخلاف جزیہ کے کہ (وہ مالی ہمدردی کے طور پر ادا نہیں کیا جاتا بلکہ) وہ مطالبہ دار الاسلام میں رہنے کا معاوضہ ہے، اگر کوئی مالدار شخص (مجرمہ عاقلہ) محتاج ہو جانے کا اظہار کرے اور قسم کھالے تو اس کی بات کو تسلیم کر لیا جائے، گواہ پیش کرنا لازم نہیں ہے، غنی (مالدار) وہ شخص ہے جس کے پاس کفارہ ادا کرنے کے بعد بیس دینار یا اسی قدر مال بچ رہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ عاقلہ ہونے کی چند باتیں ہیں: اگر مجرم فوجی ہے تو اس کے تمام اہل دیوان (جو فوجیوں کی فہرست میں ہیں) اس کے عاقلہ ہیں گوان کا تعلق مختلف قبیلوں سے ہو، لیکن اگر ان کی تعداد سات سو سے کم ہو۔ اور عاقلہ کی تعداد کم از کم سات سو (۷۰۰) ہوتی ہے۔ تو اس تعداد کو پورا کرنے کے لیے مجرم کے ایسے رشتہ داروں کو شامل کر لیا جائے گا جو اس کے ساتھ فوجیوں میں نہیں ہیں، یا وہ سب فوجی ہیں لیکن مجرم زمرہ اہل دیوان میں سے نہ ہو، یا انہیں ان کی مقررہ رسد نہ ملتی ہو تو ایسے مجرم پر عائد شدہ تاوان اس کے رشتہ دار 'الاقرب فالاقرب' کے اصول پر بموجب ترتیب نکاح ادا کریں گے، اگر لڑکوں کی تعداد سات سو ہو جائے تو ان کی اولاد پر کچھ لاگو نہ ہوگا، اگر تعداد پوری نہ ہو تو اولاد کی اولاد سے یہ تعداد پوری کی جائے گی، اور بھتیجیوں کے بعد داد کو اس میں شامل کیا جائے گا، اگر رشتہ دار موجود نہ ہوں یا ہوں لیکن تاوان واجب

ادانہ کر سکتے ہوں تو اوپر کے بزرگوں میں جو آقا، یعنی معتق، بکسرتاء یعنی آزاد کرنے والے ہیں انہیں عاقلہ قرار دیا جائے گا کیونکہ یہ بھی ایک لحاظ سے رشتہ دار قرار دیئے گئے ہیں اور وہ ایسے ہیں جیسے نسلی قرابت دار، چنانچہ آنحضرت ﷺ کی حدیث ہے ”الولاء لحمۃ لحمۃ النسب“ (یعنی والی ہونا بھی نسلی قرابت کی طرح ایک قرابت ہے) اور فقہاء کا کہنا ہے کہ والی ہونا رشتہ داری ہے کیونکہ آزاد کنندہ (آقا) جس نے مملوک کو آزادی کی نعمت بخشی ان میں اونچے درجہ میں (یا خاندان کے بزرگوں میں) آزاد کنندہ نہ ہوں تو نچلے درجہ میں (یعنی پگھلی نسل میں) جو آزاد کنندہ ہیں انہیں شامل کیا جائے گا اگر وہ بھی نہ ہوں تو بیت المال (سرکاری خزانہ) عاقلہ متصور ہوگا، بشرطیکہ مجرم مسلمان ہو کیونکہ بیت المال کافر کی طرف سے عاقلہ نہیں ہو سکتا، اگر بیت المال ہی سرے سے نہ ہو تو دیت قسط وار خود مجرم پر ڈالی جائے گی بشرطیکہ وہ ادائے تاوان کی صلاحیت رکھتا ہو یعنی عاقل، بالغ، مرد اور توانا ہو۔

ذمی شخص (مسلم ریاست کا غیر مسلم فرد) کا عاقلہ وہ ہے، کہ اگر اس پر دیت عائد ہو تو اتنی ہی ہو، یعنی وہ شخص جو اس کے ساتھ جزیہ ادا کرتا ہو، گو وہ اس کا قرابت دار نہ ہو۔ پس نصرانی کا تاوان اس شہر میں رہنے والا نصرانی ہی ادا کرے گا یہودی ادا نہیں کرے گا، اور نہ اس کے برعکس ہوگا (کہ یہودی کا تاوان نصرانی ادا کرے) اور دیت ہر اس شخص پر حسب استطاعت ڈالی جائے گی جس پر عائد کی جائے، مثلاً اہل دیوان، رشتہ دار اور آقائیز ذمی جنہوں نے اسلامی حکومت کا فیصلہ حاصل کر لیا ہو۔

اگر بچہ (نابالغ) جنون زدہ محتاج یا مقروض ارتکاب جرم کرے، تو اس کی طرف سے تاوان ادا کیا جائے گا، جس کا بار اس کے عاقلہ پر ہوگا، اور کسی کا بالغ یا جنون زدہ ہونا اور تنگ دست یا فارغ البال ہونا نیز موجود ہونا یا موجود نہ ہونا اس وقت تک معتبر سمجھا جائے گا جبکہ تاوان عاقلہ پر ڈالا گیا ہو۔ یعنی تاوان عائد کرنے کے وقت جو لوگ اہل عاقلہ (یعنی ادا یگی تاوان کے ذمہ داروں میں) سے موجود ہوں گے ان پر تاوان ڈالا جائے گا، جو موجود نہ ہوں ان پر نہیں ڈالا جائے گا، لہذا اگر کوئی شخص تاوان ڈالے جانے کے وقت موجود نہ ہو اور بعد میں آئے تو تاوان کی ذمہ داری تقسیم کرنے کے بعد جو بھی آئے اس پر تاوان نہیں ڈالا جائے گا، اسی بناء پر اگر تاوان کی ذمہ داری تقسیم ہونے کے (وقت کوئی محتاج ہو رہا ہو اور اس کے بعد مال دار ہو جائے یا اس وقت بچہ ہو اور بعد میں بالغ ہو جائے یا جنون زدہ کوفاقہ ہو جائے یا مخنث رہا ہو اور اس کا مرد ہونا ثابت ہو جائے تو اب ان میں سے کسی پر تاوان عائد نہ ہوگا، اسی طرح اگر عاقلہ یا ان میں سے کوئی مر جائے یا محتاج ہو جائے تو وہ دیت جو ڈالی گئی ہے وہ ختم ہو جائے گی خواہ وہ ایک ہو یا زیادہ ہوں۔

مجرم کے بدوی رشتہ داروں کو شہری رشتہ داروں کے ساتھ عاقلہ میں شامل نہیں کیا جائے گا اور نہ شامی کو مصر کے ساتھ یا حجازی رشتہ دار کو یمنی رشتہ دار کے ساتھ شامل کیا جائے گا، البتہ ایک اقلیم کے لوگ جو موجود ہوں ان سب پر تاوان ڈالا جائے گا، اگر ایک شہر کے لوگ عاقلہ کی تعداد پوری نہ کر سکیں تو جو لوگ موجود ہیں ان کے رشتہ داروں کو شامل کر لیا جائے گا۔ یہ اصحاب کہتے ہیں کہ مکمل دیت کو اجرائے حکم سے تین سالوں پر تقسیم کیا جائے گا، خواہ دیت کسی مسلمان کی ہو

یا غیر مسلم کی، مرد کی دیت ہو یا عورت کی، نقصان جان کی دیت ہو یا اطراف جسم (ہاتھ پاؤں وغیرہ) کی، اگر ایک تہائی دیت لاگو ہو جیسے زخم جائفہ (ہڈی کھل جانے والے زخم) میں ہوتا ہے تو اس کا تاوان ایک سال میں واجب الادا ہوگا اور اگر دو تہائی تاوان ڈالا جائے مثلاً دو زخم جائفہ ہوں تو اس کے لیے دو سال مدت ادائیگی ہوگی، نصف تاوان عائد ہونے کی صورت میں بھی دو سال کی مہلت ہوگی، ہر سال ایک چوتھائی کے حساب سے واجب الادا ہوگا اور تین چوتھائی تاوان کی صورت میں فی سال ایک چوتھائی کے حساب سے وصول کیا جائے گا، اور عاقلہ کی تعداد سات (۷۰۰) سو ہے جس میں کچھ اضافہ نہیں کیا جائے گا، اگر یہ تعداد رشتہ داروں سے پوری ہو جائے تو ان کے ساتھ موالی (یعنی آزاد کنندگان غلام) کو شامل نہیں کیا جائے گا، ہاں اگر یہ تعداد پوری نہ ہو، گو موجودہ اشخاص مالدار ہوں، ان کی تعداد پوری کرنے کے لیے موالی کو ملا لیا جائے گا، و علیٰ ہذا القیاس۔

ان اصحاب کا کہنا یہ بھی ہے کہ مجرم کو عاقلہ میں شمار نہیں کیا جائے گا، کیونکہ عاقلہ کے بھروسے پر ہی مجرم کو جرأت ہوئی۔ حنفیہ اور حنابلہ نیز شافعیہ بھی ایک قول کے مطابق یہ کہتے ہیں کہ دیت کا بار اٹھانے میں موجود اور غیر موجود دونوں برابر ہیں۔

شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ ہم پیشہ شخص کو یا اسی بازار والوں کو جہاں مجرم کا رو بار کرتا ہے، تاوان کا بار اٹھانے میں کوئی دخل نہیں ہے تا آنکہ وہ مجرم کے قرابت دار نہ ہوں۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر مجرم اہل دیوان (یعنی ملازمین دفتر) میں سے ہو تو اس کے دفتر والے عاقلہ متصور ہوں گے اور سوتی (دکاندار) کے عاقلہ اولاً اس بازار کے دکاندار ہوں گے، اس کے بعد اس کے رشتہ دار اور پھر اہل محلہ اس کے عاقلہ ہوں گے۔

قسامہ (ارتکاب جرم کے بارے میں قسم کھانے) کا بیان

تمام اماموں کا اس پر اتفاق ہے کہ ”قسامہ“ (یعنی وقوعہ جرم کے بارے میں قسم کھانا) ایک شرعی معاملہ ہے جبکہ کسی جگہ پر مقتول پایا جائے اور قاتل کا پتہ نہ چلے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ لفظ قسامہ لغت کی رو سے قسموں کے معنی میں آتا ہے، اور اصطلاح شرع میں اس سے مراد حلفی بیان ہے کہ اس محلہ یا گھر کے لوگ جہاں کوئی مقتول ہوا اور اس کے جسم پر ارتکاب قتل کی علامات پائی جائیں قسم کھا کر کہیں کہ نہ ہم نے اسے قتل کیا اور نہ یہ معلوم ہے کہ اس کا قاتل کون ہے اور مدعی علیہ پر بھی لازم ہوگا کہ وہ اللہ عزوجل کی قسم کھا کر کہے کہ اس نے قتل نہیں کیا تو بری ہو جائے گا۔

یہ حلف برداری اس صورت میں واجب ہے جبکہ مقتول ایسی جگہ پایا جائے جہاں لوگوں کے تحفظ اور ان کی حمایت کی ذمہ داری کسی جماعت پر عائد ہوتی ہو جیسے محلہ یا گھر ہے یا کسی محلہ یا گاؤں کی مسجد ہے اور قاتل (مقتول) جس کے بارے میں شرعی قسم کھانے کا حکم ہے اس سے مراد وہ فوت شدہ شخص ہے جس کے جسم پر زخم ہوں یا چوٹ (کا نشان) یا گلا

گھونٹے جانے کا نشان ہو۔ اگر اس شخص کے نتھنے یا دبر (پاخانہ کے مقام) سے خون نکلا ہو تو اسے مقتول تصور نہیں کیا جائے گا بخلاف اس کے اگر کان سے یا آنکھ سے خون نکلا ہے تو وہ مقتول ہے اور اس صورت میں شریعت نے ”قسامہ“ کا حکم دیا ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”البینۃ علی المدعی والیمین علی من انکر“ (یعنی مدعی کو گواہ پیش کرنا چاہیے اور جو جرم سے انکاری ہو اسے قسم کھانا ہوگی) ایک روایت میں ”علی من انکر“ کی بجائے ”علی المدعی علیہ“ (یعنی جس پر دعویٰ کیا جائے) آیا ہے اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ ”ان النبی ﷺ بدأ بالیہود بالقسامۃ، وجعل الدیۃ علیہم لوجود القتل بین اظہرہم“ (یعنی نبی ﷺ نے عمل درآمد کی ابتداء یہودیوں سے کی تھی اور مقتول کی موجودگی کے پیش نظر ان پر تاوان عائد فرمایا تھا)۔ حلف اٹھانے والے کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ بالغ، عاقل اور آزاد ہو اور اسکی تکمیل پچاس قسموں سے ہوتی ہے اور اس کی بابت حکم یہ ہے کہ مطالبہ خون کے حقداروں (مقتول کے ورثاء) کے حق میں ادائے دیت کا فیصلہ کیا جائے اور قسم سے انکار کرنے والوں کو، جب تک کہ وہ قسم نہ کھالیں قید میں رکھا جائے اور مطالبہ خون کے حقدار (وارث مقتول) کو اختیار ہے کہ جس جس سے چاہے، قسم لے، کیونکہ قسم لینا اس کا حق ہے اور ظاہر ہے کہ اسے اختیار ہے جس پر چاہے قتل کا الزام عائد کرے یا اہل محلہ میں سے اچھے لوگوں کو قسم کے لیے چن لے۔ کیونکہ نیک لوگوں کا قسم کھانے سے احتراز کرنا بہت زیادہ معنی خیز ہے اور اس سے قاتل کا پتہ چل جاتا ہے اور قسم کا فائدہ جرم سے انکار ہے۔ اب اگر وہاں کے لوگ جرم میں شامل نہ رہے ہوں اور اس فعل کے کرنے سے باز رہے ہوں تو نیک لوگوں کی قسم سے جو امر معلوم ہو گا وہ برے لوگوں کی قسم کی بہ نسبت زیادہ مفید مطلب ہو گا۔ اگر قسم کھانے کے لیے کسی نابینا کو یا تہمت تراشی کے الزام میں سزا یافتہ شخص کو کہا جائے تو جائز ہے کیونکہ یہ حلف برداری ہے (جو ہر شخص کر سکتا ہے) شہادت دینا نہیں ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ حلف برداری میں صرف میت کے حق اور اس کے احترام کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور جب سب حلف اٹھالیں تو اہل محلہ پر دیت لاگو کرنے کا فیصلہ دیا جائے گا اور مجرم کے ولی سے حلف نہیں لیا جائے گا کیونکہ آنحضرت ﷺ نے حدیث ابن ہبل اور حدیث زیاد ابن مریم میں قسامہ اور دیت دونوں کو جمع کیا ہے یعنی جس سے قسم لی ہے اس پر تاوان بھی عائد کیا ہے) اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی دارع پر دونوں باتیں عائد فرمائی ہیں۔

روایت ہے کہ عبد اللہ بن ہبل، عبد الرحمن بن ہبل، حویصہ اور عیصہؓ یہ سب بغرض تجارت خیبر کو روانہ ہوئے اور اپنے اپنے کسی کام میں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ پھر انہوں نے عبد اللہ بن ہبل کو خیبر کے ایک شکستہ کنوئیں میں، خون میں لت پت پڑا ہوا پایا۔ پھر وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے کہ انہیں اس واقعہ کی اطلاع دیں عبد الرحمن نے جو مقتول کے بھائی تھے۔ حضور کی خدمت میں عرض حال کا ارادہ کیا۔ آنحضرت نے فرمایا ”الکبر الکبر“ (یعنی بڑا آدمی بتائے، بڑا آدمی) تب ان چچاؤں میں سے حویصہ یا عیصہ نے جو ان دونوں میں بڑے تھے بتایا اور حضور کو اس کی اطلاع دی۔ فرمایا: ”من قتلہ“ (بھلا اسے کس نے قتل کیا؟) انہوں نے کہا کہ انہیں یہودیوں کے سوا اور کون قتل کرتا؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”تبرئکم الیہود بایمانہا؟“ (تم یہودیوں کے قسم کھا لینے پر انہیں بری کر دو گے؟) انہوں نے کہا کہ ہم

کافروں کی قسم سے مطمئن نہ ہوں گے، وہ اپنی قسم کی پروا نہیں کرتے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”اتحلفون وتستحقون دم صاحبکم؟“ (یعنی کیا تم قسم کھا کر اپنے ساتھی کے خون بہا کا حقدار ہونا چاہو گے؟) انہوں نے کہا ایسی بات کی قسم کیسے کھا سکتے ہیں جو ہم نے دیکھی نہ ہمارے مشاہدے میں آئی؟ لیکن حضورؐ نے یہ پسند نہ فرمایا کہ ان کا خون رائیگاں جائے لہذا اس کے فدیہ میں صدقہ کے اونٹوں میں سے ایک سواونٹ دے دیئے۔

واضح ہو کہ حضور کے اس ارشاد سے کہ ”تبرئکم الیہود“ پایا جاتا ہے کہ (نا معلوم مجرم کو) قصاص اور قید سے بری ہو جانا ممکن ہے۔ اسی طرح یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قسم کھالینے سے وہ الزام جاتا رہتا ہے جس کے لیے قسم کھائی گئی۔ اور یہ (بھی ثابت ہوتا ہے) کہ شریعت نے قسامہ (کا طریقہ) اس لیے نہیں رکھا ہے کہ اگر لوگ قسم سے انکار کریں تو دیت واجب ہو بلکہ یہ حکم اس لیے ہے کہ اگر لوگ جھوٹی قسم کھانے سے گریز کریں گے تو قصاص ثابت ہو جائے گا اور قتل کا اقرار کر لیں گے۔ پس اگر وہ حلف اٹھالیں تو قصاص سے بری ہو جائیں گے لیکن قتل ہونا تو ظاہر ہے کہ مقتول سامنے ہے لہذا خون بہا واجب ہوگا اور یہ مقتول کے موجود ہونے کے باعث واجب ہوگا۔ اس لیے نہیں کہ انہوں نے حلف اٹھانے سے گریز کیا۔ یا یہ کہا جائے کہ یہ خون بہا اس لیے عائد کیا گیا ہے کہ انہوں نے (مقتول کے) تحفظ میں کوتاہی کی جیسا کہ قتل خطا میں ہوتا ہے (کہ قاتل کو بے پرواہی کی سزا ملتی ہے جرم کی نہیں) اگر ان لوگوں میں سے کوئی شخص قسم کھانے سے گریز کرے تو جب تک کہ وہ قسم نہ کھائے قید میں رکھا جائے۔ کیونکہ قسم لینا بجائے خود احترام جان کے حقوق میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حلف (انکاری) کے بعد بھی دیت عائد ہوتی ہے بخلاف اس صورت کے جبکہ مالی واجبات سے قسم کھا کر انکار کیا جائے۔ کیونکہ اس صورت میں حلف برداری حق کے عوض میں ہوتی ہے۔ چنانچہ قسم کھالینے کے بعد مدعی کا حق مطالبہ جاتا رہتا ہے اور زیر بحث معاملہ میں دیت کے معاوضہ میں قسم نہیں کھائی جاتی (یعنی قسم کے بعد بھی دیت واجب رہتی ہے)۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ اگر اہل محلہ کی تعداد سے (قسم کی تعداد پچاس) پوری نہ ہو تو ان ہی اشخاص سے دوبار قسم لی جائے، یہاں تک کہ پچاس قسموں کی تعداد پوری ہو جائے چنانچہ روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (ایک معاملہ میں) قسامہ (قسم دلانے) کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے انچاس (۴۹) اشخاص آمادہ ہوئے۔ آپ نے ایک شخص سے دوبار قسم لی جس سے قسم کی تعداد پچاس (۵۰) پوری ہو گئی۔ اس کے بعد آپ نے ادائے دیت کا فیصلہ فرمایا۔

بچے اور مجنون پر قسم عائد نہیں ہوتی، کیونکہ ان میں صحیح بیان دینے کی صلاحیت نہیں ہوتی حالانکہ قسم صحیح بات ہی کے اظہار کو کہتے ہیں۔ اسی طرح عورت اور غلام پر قسامہ کا حکم عائد نہیں ہوتا کیونکہ یہ دونوں اہل نصرت (حمایتی) ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

اگر مقتول کے جسم پر قتل کیے جانے کی علامات نہیں ہیں تو اس کے بارے میں قسامہ ہوگا نہ دیت عائد ہوگی۔ کیونکہ ایسے شخص کو مقتول قرار نہیں دیا جائے گا۔ اگر مقتول کا پورا جسم یا نصف سے زیادہ جسم مل جائے یا نصف جسم لیکن سر بھی وہیں پر ہو تو وہاں کے لوگوں پر قسامہ اور دیت دونوں باتیں واجب ہوں گی۔ اگر نصف بدن لسانی میں چرا ہوا ہو۔ یا نصف سے کم

بدن دستیاب ہو اور اس کا سر بھی ساتھ ہو یا اس کا ہاتھ یا پاؤں یا سر دستیاب ہو تو لوگوں پر کچھ عائد نہ ہوگا کیونکہ یہ حکم صراحت سے آیا ہے اور وہ بدن کے بارے میں ہے۔ البتہ اگر جسم کا بیشتر حصہ موجود ہو تو انسانی وجود کی عظمت کے پیش نظر اسے پورا وجود تصور کیا جائے گا۔ بخلاف اس صورت کے جبکہ جسم کا کمتر حصہ موجود ہو کیونکہ وہ بدن نہیں ہے اور وہ بدن سے وابستہ ہے ایسی حالت میں قسامہ کا حکم اس پر نافذ نہ ہوگا۔

اگر کوئی جنین (بچہ شکم) پڑا ہوا یا اسقاط شدہ ہے جس پر چوٹ کا نشان نہ ہو تو محلہ والوں پر کچھ عائد نہ ہوگا، کیونکہ اس حالت میں اس پر جرم نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر اس پر چوٹ کے نشانات ہیں اور اس کا وجود پورا بن گیا تھا تو وہاں کے لوگوں پر قسامہ اور دیت دونوں باتیں عائد ہوں گی، کیونکہ ظاہر ہے کہ پورا بچہ زندہ تھا اور (اسے مارا گیا ہے) اور اگر وہ پورا نہیں بنا تھا تو لوگوں پر کچھ عائد نہ ہوگا کیونکہ ناقص بچے کو مردہ بچہ قرار دیا جائے گا، زندہ نہیں مانا جائے گا۔

یہ اصحاب کہتے ہیں کہ اگر کسی مقتول (کی لاش) کو (سواری کے) جانور پر لاداد ہو اور اسے کوئی چلار ہا ہو تو اس شخص کے عاقلہ پر تاوان عائد ہوگا، اہل محلہ پر نہ ہوگا کیونکہ مقتول اس کے قبضہ میں ہے اور ایسا ہے جیسے اس کے گھر سے برآمد ہوا ہو، یہی حکم اس صورت میں ہے جبکہ کوئی شخص اس جانور کو اپنے پیچھے لگائے ہوئے (کھینچتا ہوا) لے جا رہا ہو یا خود بھی اس پر سوار ہو۔ اگر کئی اشخاص اس کے ساتھ ہوں تو ان سب پر الزام ہے کیونکہ مقتول (کی لاش) ان کے پاس ہے گویا ان کے گھر سے برآمد ہوئی ہے۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ اگر کسی جانور پر مقتول (کی لاش) ہے اور وہ جانور دو بستیوں کے درمیان میں ہے تو ان دونوں بستیوں میں سے جو اس جانور سے زیادہ قریب ہے اس بستی پر یہ حکم (قسامہ اور دیت کا) عائد ہوگا۔ کیونکہ روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس ایک ایسے مقتول (کی لاش) کو لایا گیا جو دو بستیوں کے درمیان دستیاب ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس جگہ سے دونوں بستیوں کا فاصلہ ناپا جائے۔ نیز روایت ہے کہ قریہ وادعہ اور ار جب کے درمیان ایک مقتول کی لاش دستیاب ہوئی، اس کی بابت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا گیا۔ آپ نے (جواباً) تحریر فرمایا کہ دونوں قریوں کا فاصلہ دیکھا جائے، جب معلوم ہوا کہ وہ لاش قریہ وادعہ سے زیادہ قریب تھی تو آپ نے اہل وادعہ کو قسامہ کا حکم دیا۔

اگر مقتول کسی شخص کے گھر میں پایا جائے تو اس شخص پر حکم قسامہ عائد ہوگا اور اس شخص کے عاقلہ پر دیت لاگو ہوگی۔ ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس مکان والے کی موجودگی میں وہاں کے رہنے والوں پر قسامہ لاگو نہ ہوگا۔ لیکن ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ ان سب پر حکم قسامہ عائد ہوگا اور جس گھر میں مقتول دستیاب ہوا اس گھر والے اور اس کی قوم پر قسامہ ہوگا اور اس کے موجود الوقت عاقلہ کو قسامہ میں شامل کیا جائے گا تو مالکان خانہ پر قسامہ ہوگا اور (قسم کی تعداد پوری کرنے کے لئے) ان سے بار بار قسم لی جائے گی۔ اگر مقتول مشترکہ ملکیت والے گھر سے برآمد کیا جائے تو جملہ افراد جال (شرکاء) پر یہ حکم نافذ ہوگا۔ اگر کسی نے مکان خریدا اور ہنوز اس کا قبضہ نہیں لیا تھا کہ اس مکان میں کوئی مقتول پایا گیا تو یہ احکام اس مکان کے

فروخت کنندہ پر عائد ہوں گے۔

اگر کوئی مقتول کشتی میں پایا گیا تو ملاح سمیت جتنے اشخاص کشتی میں ہیں اس سب پر حکم قسامہ عائد ہوگا۔

اگر محلہ کی مسجد میں مقتول کی لاش ملی تو اہل محلہ پر قسامہ عائد ہوگا، کیونکہ وہی لوگ اس مسجد کے نگران ہیں۔ لیکن اگر لاش جامع مسجد یا شارع عام پر ملی تو کسی پر حکم قسامہ عائد نہ ہوگا۔ اس کا خون بہا بیت المال سے ادا کیا جائے کیونکہ وہ عوام کی جگہ ہے کسی خاص شخص کی جگہ نہیں ہے۔ یہی حکم عمومی پل کا ہے (جو عام گزرگاہ ہو)۔

اگر مقتول کسی بازار میں پایا جائے اور وہ جگہ کسی کی ملکیت میں ہو اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک وہاں کے رہنے والوں پر تاوان عائد ہوگا اور صاحبین کے نزدیک مالک پر عائد ہوگا لیکن اگر اس جگہ کا کوئی مالک نہ ہو جیسے وہ شارع عام ہے جو وہاں بنائی گئی، تب اس کا تاوان بیت المال سے ادا کیا جائے کیونکہ وہ تمام مسلمانوں کی جگہ ہے۔

اگر قید خانہ میں کوئی مقتول پایا جائے تو اس کی دیت بھی بیت المال پر عائد ہوگی، ابو یوسف کے قول کے مطابق دیت اور قسامہ دونوں حکم قید خانہ والوں پر عائد ہوں گے کیونکہ یہ وہاں پر رہتے ہیں اور وہ سب اس کے حامی متصور ہوں گے۔ اگر کوئی مقتول ایسے میدان میں پایا جائے جس کے قرب و جوار میں کوئی عمارت نہیں ہے تو وہ خون رائیگاں ہوگا۔ اسی طرح اگر مقتول کی لاش بہتی نہر سے دستیاب ہو تو وہ بھی رائیگاں ہوگا۔ اگر وہ نہر کناروں والی ہے (جس کا پانی باہر نہیں نکلتا) تو یہ حکم اس جگہ سے نزدیک ترین بستی پر عائد ہوگا۔

اگر مقتول کا ولی محلے والوں میں سے کسی خاص شخص پر خون کا دعویٰ کرے تب بھی اہل محلہ قسامہ (حلف برداری) سے مستثنیٰ نہ ہوں گے۔ ہاں اگر اہل محلہ کے علاوہ کسی اور پر دعویٰ کیا تو اہل محلہ سے قسامہ پر عمل درآمد کا حکم ساقط ہو جائے گا۔ اگر ایک گروہ نے دوسرے گروہ پر تلوار اٹھائی اور ایک مقتول کے بارے میں انہوں نے ایک دوسرے کو ملزم گردانا تو تمام اہل محلہ پر قسامہ عائد ہوگا، بجز اس صورت کے جبکہ مقتول کے اولیاء ان لوگوں پر کسی خاص شخص پر خون کا دعویٰ کریں، ایسی حالت میں اہل محلہ پر یہ حکم عائد نہ ہوگا اور نہ ان لوگوں پر عائد ہوگا (جن پر الزام لگایا گیا) تا آنکہ اس کے لیے شہادت نہ پیش کی جائے۔

اگر کوئی مقتول کسی چھاؤنی (کے میدان) میں، جہاں پر لشکر ٹھہرا ہوا ہو پایا جائے اور وہ جگہ (ان میں سے) کسی کی ملکیت نہ ہو تو دیکھنا ہوگا کہ اگر مقتول کی لاش پناہ گاہ میں یا خیمہ کے اندر ملی ہے تو جو شخص اس میں اقامت گزریں ہے یا رہتا ہے اس پر دیت اور قسامہ دونوں عائد ہوں گے، اور اگر وہ لاش خیمہ سے باہر ملی ہے تو وہاں سے جو پناہ گاہ قریب ترین ہے، وہاں لوگوں پر یہ حکم جاری ہوگا، بدیں لحاظ کہ اس کا کوئی مالک نہیں ہے اور وہ اس شخص کے قبضہ میں ہے (اسی کو مالک قرار دیا جائے گا)۔

اگر ایک قوم (دشمن سے) جنگ و جدل میں مصروف ہے اور وہاں کوئی مقتول دستیاب ہو تو اس صورت میں نہ قسامہ ہوگا اور نہ دیت عائد ہوگی کیونکہ ظاہر ہے کہ اسے دشمن نے قتل کیا ہے، اگر اس زمین کا کوئی مالک ہے تو وہاں جو لشکر

ہے وہی وہاں پر رہنے والوں کی مانند شمار ہوگا۔

اگر کوئی قسم کھانے والا یوں کہے کہ اس شخص کو فلاں نے قتل کیا اور میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے اسے قتل نہیں کیا بلکہ میں جانتا ہوں کہ فلاں شخص کے سوا اور کوئی اس کا قاتل نہیں ہے تو اس کا یہ کہنا چونکہ اپنے اوپر سے الزام ہٹانے کی غرض سے ہے لہذا اس کی بات نہیں مانی جائے گی، اسی طرح اگر اہل محلہ میں سے دو اشخاص اس امر کی گواہی دیں کہ دوسرے محلہ کے کسی شخص نے اسے قتل کیا ہے تو ان کی گواہی تسلیم نہیں کی جائے گی اگر اہل محلہ میں سے کسی خاص شخص پر خون کا دعویٰ کیا گیا اور محلہ والوں میں سے دو اشخاص نے اس کی شہادت دی تو یہ گواہی تسلیم نہیں کی جائے گی کیونکہ ان میں باہمی تنازع ہے۔ اگر قبیلہ کے آدمی نے کسی کو زخمی کیا اور اسے مقتول کے کنبہ میں لایا گیا اور یہاں آکر وہ مر گیا۔ اب اگر وہ زخمی ہونے کے بعد بدستور بیماری کے بستر پر رہا اور اسی حالت میں مر گیا تو قسامہ اور خون بہاد دونوں اس قبیلہ پر عائد ہوں گے۔

اگر کوئی شخص خود اپنے گھر میں مقتول پایا گیا تو اس کا خون بہا اس کے عاقلہ سے، وارثوں کو دلایا جائے گا نیز ان اصحاب کا کہنا ہے اگر در ثاء میں بہت سے لوگ ہوں تو ان سے باری باری قسم لی جائے گی اور اس کی ابتداء قرعہ اندازی کے ذریعہ ہوگی۔ پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک مسلمان کی عظمت کے پیش نظر غلام کے بارے میں اسی طرح بغیر فرق کے قسامہ (حلف برداری) ہوگی۔

ان کا کہنا ہے کہ قسامہ میں عورتوں سے مطلق قسم نہیں لی جائے گی، نہ تو جرم عہد میں اور نہ جرم خطا میں، کیونکہ انہیں (مجرم کے) حامیوں میں شمار نہیں کیا گیا۔

ان اصحاب کا کہنا ہے شرعاً قسامہ (حلف برداری) صرف ان لوگوں کے خلاف ہوگی جن پر خون کا دعویٰ ہو، کیونکہ ان پر قتل کا الزام آتا ہے، اور قسم اس لیے لی جاتی ہے کہ وہ اپنا پہلو بچا سکیں۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ تمام دعووں میں خواہ وہ خون کا ہو یا کسی اور بات کا مثلاً غصب (نا جائز قبضہ کر لینے) چوری کرنے یا نقصان پہنچانے کا (دعوے کے درست ہونے کی) چھ شرطیں ہیں:

پہلی یہ کہ جرم کی کافی تفصیل معلوم ہو کہ آیا وہ جرم عہد تھا یا جرم خطا تھا یا جرم مشابہہ عہد تھا، اور اس کا ارتکاب ایک فرد واحد نے کیا یا مشترکہ طور پر کیا گیا، اور قتل مستوجب دیت میں کتنے اشخاص شریک تھے، اگر مدعی تفصیل نظر انداز کر دے مثلاً وہ صرف یہ کہے کہ فلاں شخص نے میرے باپ کو قتل کیا تو بہتر یہ ہے کہ قاضی (حاکم شرع) مصلحتاً اس سے دریافت کرے کہ وہ قتل آیا عہد تھا یا غلطی سے سرزد ہو گیا یا عہد ہوا لیکن شبہ میں ہوا؟ یہ بھی کہتے ہیں کہ حاکم یا قاضی یوں تفصیل دریافت نہ کرے بلکہ اس سے پرہیز کرے، کیونکہ یہ سوالات ایک طرح کی تلقین ہیں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ وہ دعویٰ الزام عائد کرنے والا ہو لہذا جبہ، فروخت یا اقرار کا کوئی دعویٰ قابل سماعت نہ ہوگا جب تک مدعی خود نہ کہے کہ میں نے فلاں شے پر ہبہ کرنے والے کے کہنے سے قبضہ کیا یا فروخت کنندہ نے اسے میرے حوالے کر دیا اور مجھے دے دینے کا اقرار کیا ہے۔

تیسری شرط ہے کہ مدعی اپنے دعوے میں مدعا علیہ کی تعیین کر دے، خواہ جس پر دعویٰ ہوا وہ ایک ہو یا جماعت ہو (یا کئی ہوں)، مثلاً تین اشخاص حاضر ہیں اور مدعی کہتا ہے کہ ان میں سے ایک شخص نے قتل کیا ہے، لیکن وہ سب انکار کرتے ہیں اس پر مدعی قسم دلانے پر اصرار کرتا ہے تو بقول صحیح حاکم شرع ان سے حلف نہیں لے گا کیونکہ هنوز (مدعا علیہ کے بارے میں) ابہام ہے۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ مدعی نے جب دعویٰ دائر کیا تو وہ بالغ، عاقل اور مکلف انسان رہا ہو لہذا بچے یا دیوانے کے دعوے کی سماعت نہ ہوگی (وقوعہ) قتل کے وقت اگر مدعی نابالغ یا جنون زدہ رہا ہو لیکن دعوے کے وقت اس میں یہ نقائص نہ رہے ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

پانچویں شرط یہ ہے کہ دعوے کے وقت مدعا علیہ مکلف ہو، لہذا کسی بچے پر یا اس پر جو حالت جنون میں ہو دعویٰ کرنا، ایسا ہی ہے جیسے مدعا علیہ مفقود ہو اور اس پر دعویٰ دائر کیا جائے۔

چھٹی شرط یہ ہے کہ دعوے میں تناقض (تضاد بیانی) نہ ہو، پس اگر کسی ایک شخص پر خون کا دعویٰ کیا اور اس کے بعد پھر ایک اور شخص پر بھی دعویٰ کیا کہ یہ اس کے ساتھ شریک کار تھا، یا (دوسرے شخص کی بابت بتایا کہ) یہ قاتل ہے تو دوسرا دعویٰ ناقابل سماعت ہوگا کیونکہ یہ پہلے دعوے کو جھٹلاتا ہے یا یہ کہ اس کے برعکس ہے، خواہ پہلے دعوے پر قسم کھالی ہو اور فیصلہ دیا جا چکا ہو یا نہ دیا گیا ہو۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ قسامہ پر عملدرآمد صرف جان ہلاک کرنے کے بارے میں ہوگا اس کے علاوہ جراحت رسانی یا اتلاف مال کے جرم میں قسامہ نہ ہوگا، اور مستوجب قسامہ قتل اس قتل کو سمجھا جائے گا جبکہ وقوعہ ایسی جگہ پر ہوا ہو جہاں لوٹ (وقوعہ قتل) کا احتمال ہو اور جرم کے محل وقوع یا صورت حال سے مدعی کے دعویٰ کی صداقت ثابت ہوتی ہو یعنی باگمان غالب اسے راست گو قرار دیا جاسکے بایں طور کہ مقتول کی لاش دستیاب ہو جائے یا اس کا کوئی عضو شہر کے قریب کسی جگہ سے مل جائے اور قاتل کا پتہ نہ چلتا ہو اور نہ اس کے قتل کا کوئی گواہ ہو یا پھر یہ وقوعہ کسی چھوٹی سی بستی کا ہو جس میں رہنے والے، مقتول کے ساتھ دینی یا دنیوی عداوت رکھتے ہوں، اور عداوت قتل پر ابھارتی ہو، تاکہ اس سے انتقام لیں نیز اس بستی والوں کے سوا وہاں اور لوگ نہ رہتے ہوں، ایسی حالت میں بستی والوں پر حکم قسامہ عائد ہوگا، یا پھر یہ ہو کہ مقتول کی لاش ایسی جگہ پر پائی جائے جہاں لوگ جمع ہوتے ہوں جیسے کنواں یا کعبہ کا دروازہ اور مقتول کو وہاں چھوڑ کر چلے گئے ہوں، ایسی حالت میں یہ گمان قوی ہے کہ انہوں نے قتل کیا ہے، اور یہ بھی شرط ہے کہ لوگ ایک محدود علاقہ میں رہتے ہوں اور یہ خیال کیا جاسکے کہ سب نے مل کر اسے قتل کیا ہے۔

اگر شرائط بالا موجود نہ ہوں تو دعوے کی سماعت ہوگی اور نہ قسم لی جائے گی۔

ان کا کہنا ہے کہ (لوٹ ثبوت عمل قتل) پائے جانے اور قسامہ پر عملدرآمد کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ مقتول خون آلود ہو یا اس کے جسم پر زخم ہوں کیونکہ قتل گلا گھونٹ کر یا خسیہ کو بھینچ کر یا کسی اور طرح سے بھی کیا جاسکتا ہے اگر اس قسم کی

علامتیں پائی جائیں تو وہ بھی خون بہا متصور ہوگا، اگر ایسی کوئی علامت قطعاً موجود نہ ہو تو بقول صحیح قسامہ پر عملدرآمد نہ ہوگا تاہم کہتے ہیں کہ قسامہ عائد ہوگا۔

وہ اصحاب کہتے ہیں کہ ایک معتبر شخص کی گواہی بھی لوٹ (ثبوت عمل قتل) ہے کیونکہ (دعویٰ قتل) کی صداقت کا گمان ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ عمل قسامہ صرف قتل مستوجب قصاص پر عائد ہوتا ہے، اگر قتل خطا یا شبہ بہ عمد ہو تو اسے لوٹ (ثبوت عمل قتل) نہیں قرار دیا جائے گا بلکہ (اس صورت میں) صرف ایک قسم کھانے سے (مدعی) مستحق خون بہا ہو جائے گا، اور غلاموں اور عورتوں کی شہادت بھی لوٹ (ثبوت عمل قتل) ہے، کیونکہ اس سے مقتول کے قتل کا گمان غالب ہو جاتا ہے، خواہ یہ جدا جدا گواہی دیں یا ایک ساتھ نیز کہتے ہیں کہ ان کا جدا جدا گواہی دینا شرط ہے کیونکہ اجتماعی شہادت میں ملی بھگت کا احتمال ہے۔ ان اصحاب کا کہنا ہے کہ بقول صحیح فاسقوں، بچوں اور عورتوں کا اطلاع دینا لوٹ (ثبوت عمل قتل) ہے۔ اس طرح عام، خاص اشخاص کی افواہ سے: کہ فلاں نے فلاں شخص کو قتل کیا، نیز مقتول کے خون آلود ہونے اور اس کے قریب ہتھیار کی موجودگی سے بھی لوٹ (ثبوت قتل کا سراغ ملتا) ہے، اسی طرح اگر بچے باہم لڑ پڑیں اور آپس میں ٹھن جائے اور وہ (لڑائی کے دوران) کس مقتول کا انکشاف کر دیں تو فریق ثانی کے لیے وہ بھی لوٹ (ثبوت عمل قتل) ہے، ورنہ ایک فریق کے نزدیک تو قتل ثابت ہے ہی۔

واضح ہو کہ جب امر متقاضی قسامہ پایا جائے تو قاتل کے خلاف دعویٰ کرنے والے پچاس قسمیں کھائیں تب بھاری خون بہا کے حقدار ہوں گے بشرطیکہ وہی قتل عمد ہو اور حلف برداری کے لیے پہلے مدعیوں کو طلب کیا جائے گا، مدعا علیہم کو نہیں، اگر مدعیوں نے (قسم سے) انکار کیا اور ثبوت قتل موجود نہیں ہے تو مدعی علیہ پچاس قسمیں کھائے تو بری ہو جائے گا، اور قسامہ کے لیے مدعیوں کو اس لیے طلب کیا جائے گا کہ قاتل سے خون کے انتقام کا مطالبہ انھوں نے کیا تھا۔ یہ اصحاب کہتے ہیں کہ اگر (مقتول کے) وارثوں میں ایک جماعت ہے تو ان کے حصہ وراثت کے مطابق قسموں کی تعداد واجب کو ان میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

اگر مقتول میں لوٹ (علامت قتل) پائی گئی اور اس کے بیٹوں میں سے ایک نے کہا کہ فلاں شخص نے اسے قتل کیا ہے اور علامت قتل موجود ہے اس کا دوسرا بیٹا کہے کہ اس شخص نے اسے قتل نہیں کیا تو وہ ثبوت قتل باطل متصور ہوگا، کیونکہ قدرتی طور پر ایک قرابت دار اپنے نزدیک قرابت دار کے قاتل کی بابت جاننا چاہے گا اور اس بیان سے اسے تشفی نہیں ہوئی، لہذا دونوں کا دعویٰ ساقط ہو جائے گا، کیونکہ اس طرح جھٹلائے جانے سے ظاہر ہوتا ہے قتل ہوا ہی نہیں اور علامت قتل باطل ہے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس سے علامت قتل باطل نہیں ہو سکتی، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فاسق آدمی کے جھٹلانے سے مقتول کا قتل ہونا باطل نہ ہوگا اگر مقتول کے بیٹے ایک دوسرے کی تکذیب نہ کریں بلکہ ایک تو کہے کہ اسے زید نے قتل کیا ہے لیکن میرے علم میں نہیں ہے اور دوسرا کہے کہ اسے عمرو نے قتل کیا ہے لیکن میرے علم میں نہیں ہے، تو ان دونوں میں سے ہر ایک سے اس

کے خلاف قسم لی جائے جس کا نام اس نے لیا، کیونکہ اس طرح کہہ کر انہوں نے ایک دوسرے کو جھٹلایا نہیں ہے، بلکہ یہ احتمال ہے کہ جس کا نام ایک نے لیا ہے وہی ہو جس کے بارے دوسرے نے احتمال ظاہر کیا، پس ان دونوں میں سے ہر ایک کو چوتھائی تاوان ملے گا کیونکہ اس صورت میں ہر ایک کو اعتراف ہے کہ اس کا نصف تاوان کا حق ہے لہذا اس نصف کا نصف (یعنی چوتھائی) اس کا حصہ ہے،

اگر مدعا علیہ اپنے متعلق جرم میں ملوث ہونے کا انکار کرے، کہ میں ان میں شامل نہیں ہوں جو مقتول کو چھوڑ کر چلے گئے، تو اس کے قسم کھالینے پر اس کا بیان تسلیم کر لیا جائے گا کیونکہ بنیادی طور پر وہ قتل سے بری الذمہ ہے، مدعی پر لازم ہے کہ وہ شواہد قتل کے بارے میں ثبوت (گواہ) بہم پہنچائے، یعنی دو گواہ پیش کرے۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ اگر مقتول میں لوٹ (علامت قتل) پائی جائے اور اس کا قتل ہونا ثابت ہو لیکن یہ معلوم نہ ہو کہ وہ قتل عمد ہے یا قتل خطا یا شبہ عمد تو بقول صحیح حکم قسامہ نافذ نہ ہوگا، کیونکہ محض ثبوت قتل پر قاتل سے کوئی مطالبہ بے فائدہ ہے، اس کے لیے یہ ثابت کرنا ضروری ہے کہ وہ قتل عمد ہوا ہے، اسی طرح (محض قتل ثابت ہونے کے بعد) عاقلہ پر مطالبہ دیت عائد نہ ہوگا، بلکہ یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ قتل خطا یا قتل شبہ عمد ہے نیز کہا جاتا ہے کہ قسامہ صرف خون کو رائگاں جانے سے بچانے کے لیے ہوتا ہے (دیت وغیرہ مقصود نہیں ہوتی)۔

یہ اصحاب یہ بھی کہتے ہیں کہ جراحت رسانی، اعضائے بدن کاٹنے، یا مالی نقصان رسانی کی صورت میں قسامہ نہیں ہے غلام یا لونڈی کے قتل میں ثبوت قتل موجود ہونے پر قسامہ ہوگا اور بقول قوی سید (آقا یا مالک) اس کے خلاف جس نے قتل کیا ہے قسم کھائے گا، خواہ وہ قاتل آزاد ہو یا غلام ہو، پس مملوک (مقتول) کا عوض (تاوان یا خون بہا) قاتل کے عاقلہ برداشت کریں گے، تاہم یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قتل غلام کے عوض قسامہ نہیں ہوگا، قاتل کے عاقلہ اس کا بار برداشت نہیں کریں گے کیونکہ اس کی حیثیت جانور کی سی ہے۔

قسامہ یہ ہے کہ مقتول کا وارث، مدعی مقتول کے ہلاک ہو جانے کی قسم کھائے، اگرچہ مقتول فرد ناقص ہو مثلاً عورت ہو یا ذمی ہو بشرطیکہ لوٹ (ثبوت قتل) موجود ہو، قسم کی تعداد پچاس ہے اور یہ قسم اسی طرح کھائی جائے جس طرح حاکم حلف دے، پس وہ کہے گا کہ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس شخص کو قتل کیا گیا ہے، اگر مقتول موجود ہو تو اس کی طرف اشارہ بھی کرے، اگر موجود نہ ہو تو اس کے نسب کا بھی اظہار کرے یا اس کی امتیازی خصوصیت جس سے وہ قبیلہ یا ہم پیشہ اشخاص میں پہچانا جاتا ہو یا لقب (صفی نام) جس سے وہ مشہور ہو اس کو بیان کر دے اور اس کے لیے بار بار قسم کھانا شرط صحت نہیں ہے، اگر حلف کے دوران خلل واقع ہو جائے، مثلاً قسم کھانے والے کو، جنون یا بیہوشی طاری ہو جائے تو اتفاق ہو جانے کے بعد سابقہ بیان کا سلسلہ جاری رکھے، اگر قسم کھانے والا مقتول کا ولی (بدوران حلف) وفات پا جائے تو اس کا وارث، اپنے بیان کی بناء وارث متونی کے بیان پر نہیں رکھے گا بلکہ از سر نو بیان دے گا، اگر وارثوں میں سے ایک قسم کھانے سے انکار کرے تو دوسرا وارث پچاس قسمیں کھائے گا، اگر ایک وارث موجود نہ ہو تو دوسرا وارث پچاس قسمیں کھائے اور اپنا

حصہ دیت میں سے وصول کر لے، ورنہ غیر موجود وارث کا حق ثابت ہونے تک صبر کرے۔

اندریں باب مسلک یہ ہے کہ واقعہ بے لوث (بے غلبہ ظن) کے بغیر مدعا علیہ کی قسم اور اس کی روکی ہوئی قسم مدعی پر ڈالی جائے گی یا مدعا علیہ پر، اور تمام قسمیں گواہ کی قسموں کو ملا کر تعداد میں پچاس ہوں گی۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ ”حکم قسامہ“ پر عملدرآمد اس حالت میں ہوگا جبکہ قتل عمد مستوجب قصاص ہو یا قتل خطا مستوجب دیت ہو اور مقتول آزاد مسلمان ہو غلام اور کافر کے قتل میں قسامہ نہیں ہے، خواہ مقتول آزاد بالغ ہو یا بچہ (نابالغ)۔ نیز یہ قتل جراحات رسانی یا ضرب لگانے سے ہوا ہو یا زہر سے، جبکہ لوث (علامت قتل) ثابت ہو جائے، لوث سے مراد ایسا امر ہے جس سے یہ گمان غالب ہوتا ہے کہ فی الواقع قتل ہوا ہے (اس کی صورت یہ ہے کہ) مثلاً مسلمان بالغ شخص (موت سے پہلے) یہ بیان دے دے کہ مجھے فلاں شخص نے قتل کیا یا جراحات پہنچائی یا مارا یا پھر دو معتبر اشخاص گواہی دیں کہ انہوں نے (قاتل کو) مارتے یا اسے زخمی کرتے دیکھا ہے، یا چوٹ کا نشان معائنہ کیا ہے، یا ایک ہی معتبر شخص یہ گواہی دے کہ اس نے خود زخم یا چوٹ (موجب ہلاکت) کو دیکھا ہے یہ شہادت دے کہ اس نے قتل ہوتے دیکھا ہے، یا مقتول کو اس حالت میں دیکھا جبکہ ایک شخص اسے مار رہا تھا، اور مقتول کے جسم پر قتل کا نشان ہے تو یہ تمام امور لوث (ثبوت قتل) ہیں، لیکن اگر کوئی یہ بیان دے کہ اسے فلاں نے نہیں بلکہ فلاں نے قتل کیا یا اسے تردد ہے یا مقتول پر کوئی نشان جراحات (مستوجب ہلاکت) نہیں ہے تو لوث (ثبوت قتل) باطل ہو جائے گا اور ”حکم قسامہ“ نافذ نہ ہوگا، پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس طرح کہنے والے کی بات تسلیم کر لی جائے گی اور اسے بھی لوث (ثبوت قتل) تصور کیا جائے گا اور وارثوں سے اس بارے میں حلف لیا جائے گا اور قسامہ ہوگا، لیکن پہلا قول زیادہ قوی ہے۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ مقتول کا یہ کہنا کہ میرا خون فلاں شخص کی گردن پر ہے اور مرتے دم تک اسی کا اقرار کرتے رہنا لوث (ثبوت قتل) ہے اور اس پر حکم قسامہ نافذ ہوگا، ساتھ ہی علمائے فقہاء یہ بھی کہتے ہیں کہ کسی شخص کے محض دعویٰ پر وہ حقدار نہیں ہو جاتا اور قسم کھا لینے سے دعویٰ ثابت نہیں ہوتا لیکن اس صورت میں مقتول کی بات قابل تسلیم ہونے کا سبب یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی موت کے وقت کسی کی جان لینے کے لیے جھوٹ بولنے کی جسارت نہیں کر سکتا، بلکہ وہ وقت تو ایسا ہوتا ہے، کہ انسان پر ندامت طاری ہوتی ہے، ظالم بھی ظلم سے باز رہتا ہے اور اس کے مظالم خود اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور احکام شرعیہ کا دار و مدار گمان غالب پر ہے، جس کی تائید قسامہ (حلف برداری) سے ہوتی ہے اور خون کے معاملہ میں گاڑھی قسم لی جاتی ہے، کیونکہ بیشتر حالات میں قاتل چاہتا ہے کہ گواہ اس کے افشاء راز قتل سے باز رہیں، اسی لیے قسم میں سختی کی جاتی ہے۔

ان اصحاب کا کہنا ہے اگر آزاد اور بالغ مسلمان کہے کہ مجھے فلاں شخص نے عمد قتل کیا یا غلطی سے قتل سرزد ہو گیا، تو قسامہ (حلف برداری) کے بعد مقتول کے ورثاء قتل عمد کی صورت میں قصاص اور قتل خطا کی صورت میں ”دیت“ کے حقدار ہوں گے اگر یہ بیان دینے والا کہ مجھے فلاں نے قتل کیا کوئی فاسق شخص ہو اور جس کے خلاف اس نے دعویٰ کیا ہے وہ معتبر

شخص ہو، اگرچہ وہ اپنے وقت کا سب سے زیادہ عادل اور پرہیزگار انسان ہو، یا بیٹا باپ کے خلاف کہے کہ اس کے باپ نے اسے ذبح کیا ہے یا اس کا پیٹ پھاڑ دیا ہے یا نیزہ مار کے قتل کیا ہے، تب بھی مقتول کے ورثاء اس بارے میں ”قسامہ“ (حلف برداری) کا مطالبہ کریں گے اور قتل عمد کی صورت میں مدعی علیہ کو قتل کیا جائے گا یا قسم کھانے کے بعد ورثاء مقتول بھاری دیت وصول کریں گے۔

اگر خون کا دعویٰ قتل کا بیان دے اور عدا یا خطا کا ذکر نہ کرے تو مقتول کے ورثاء بتائیں گے کہ وہ قتل عمد تھا یا قتل خطا تھا اور اس پر وہ قسم کھائیں گے یا یہ کہیں گے کہ ”ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ قتل عمد تھا یا قتل خطا یا یہ کہیں گے کہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اسے قتل کیا، یا ان کے بیانوں میں اختلاف ہو کہ کچھ وارث تو کہیں کہ یہ قتل عمد تھا اور بعض کہیں کہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ قتل غلطی سے ہوا یا عدا کیا گیا تو وہ خون باطل قرار پائے گا، کیونکہ ان کا اس پر اتفاق نہیں ہو سکا کہ ان کے مورث کو عدا قتل کیا گیا کہ وہ مطالبہ قصاص کے حقدار ہوتے اور نہ وہ اس بات پر متفق ہیں کہ وہ قتل خطا تھا کہ دیت (خون بہا) کے حقدار ہوتے، اور نہ اس پر اتفاق ہے کہ اس کا قاتل کون ہے، کہ قسامہ پر عملدرآمد ہوتا، لیکن اگر (ورثاء میں سے) کسی نے کہا کہ وہ قتل غلطی سے سرزد ہوا اور بعض نے (ورثاء میں سے) یہ کہا کہ ہمیں یہ علم نہیں ہے کہ یہ قتل خطا ہے یا قتل عمد تو ایسی صورت میں جس نے قتل خطا کا دعویٰ کیا اسے تمام قسمیں (یعنی پچاس) پوری کرنی ہوں گی اور تب وہ دیت میں سے اپنے حصہ کا حقدار ہوگا، کیونکہ قتل خطا میں (قاتل پر) مال واجب ہوتا ہے جسے ورثاء میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، اس صورت میں دوسرے ورثاء کو کچھ نہیں ملے گا، ایسا ہی حکم اس صورت میں ہے، جبکہ سب کا دعویٰ یہ ہو کہ یہ قتل خطا ہے اور ایک وارث اس سے انکار کرے لیکن اگر کچھ تو اسے قتل خطا اور کچھ قتل عمد بتائیں لیکن تمام بیان کرنے والے ایک ہی زمرہ کے افراد ہوں، مثلاً سب مقتول کے بھائی ہیں یا بیٹے ہیں تو ان میں سے ہر ایک وارث میں اپنے اپنے حصوں کے مطابق (یعنی اتنی بار جتنا کہ ان کا حصہ ہے) قسم کھائے اسی حق وارث کی نسبت سے جرم قتل خطا کی دیت میں ان کے حصوں کا فیصلہ کیا جائے گا، لیکن اگر کوئی جرم خطا کا دعویٰ کرنے والا قسم کھانے سے انکار کرے تو وہ سب دیت میں سے کچھ نہ پائیں گے، اور اگر اس جرم کے قتل خطا ہونے سے انکار کرے تو وہ شخص جس نے قتل عمد ہونے کا دعویٰ کیا اسے اپنے حصے کے مطابق حلف میں شامل کیا جائے گا۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ اگر دو معتبر گواہوں نے شہادت دی کہ انہوں نے خود اپنی آنکھ سے چوٹ کا یا زخم کا مشاہدہ کیا ہے، خواہ وہ عدا ہو یا خطا ہو، اور اس کی موت زخم کھانے کے بعد واقع ہوئی، اور مقتول آزاد مسلمان ہے، تو مقتول کے ورثاء سے قسم لی جائے گی کہ اس کی موت اسی چوٹ یا زخم سے ہوئی ہے، یا وہ (قسم کھا کر) کہیں گے کہ اور کوئی سبب موت کا لاحق نہیں ہوا، لیکن اگر (چوٹ لگنے یا زخم کھانے کے بعد) موت میں تاخیر نہیں ہوئی تو دونوں حالتوں میں بغیر قسامہ کے ورثاء کو مطالبہ خون یا دیت کا حق ہوگا، کیونکہ یہ ارتکاب قتل کی چشم دید شہادت ہوگی، یا اگر ایک معتبر گواہ چوٹ لگانے یا زخمی کرنے کی چشم دید شہادت دے، خواہ عدا ہو یا خطا ہو، اور خواہ موت اسی وقت واقع ہوگئی ہو یا تاخیر سے ہوئی ہو مقتول کے ورثاء پچاس قسمیں کھائیں گے کہ مجرم نے اسے زخمی کیا یا مارا اور اسی زخم یا چوٹ سے اس کی موت ہوئی اور یہ بھی کہا گیا کہ

ورثاء میں سے (پہلے) ایک شخص اس معتبر گواہ کی شہادت کی تکمیل کے لیے قسم کھائے گا کہ فلاں شخص نے اسے زخمی کیا یا اسے مارا اس کے بعد سب ملکر پچاس حلف اٹھائیں گے، اور اگر ایک معتبر گواہ یہ شہادت دے کہ مقتول نے (مرنے سے پہلے) اپنے قتل عمد یا قتل خطا کا اقرار کیا یعنی بالغ مقتول نے یہ بیان دیا کہ فلاں شخص نے عدا مجھے زخمی کیا یا یہ کہا کہ غلطی سے یہ فعل اس سے سرزد ہو گیا اور ایک معتبر شخص مقتول کے اس قول کی تائید میں گواہی دے تو اس شہادت کو لوٹ (ثبوت قتل) تصور کیا جائے گا اور اس پر مقتول کے ورثاء سے قسم کے مقررہ الفاظ میں پچاس قسمیں لی جائیں گی یہاں تک کہ قسم کی تعداد پوری ہو جائے، پس قابل اعتماد مسلک کے مطابق اس بارے میں سب سے قسم لی جائے گی انفرادی قسم نہیں لی جائے گی۔

اگر ایک معتبر شخص اس امر کی شہادت دے کہ اس نے مقتول کو خون آلودہ حالت میں دیکھا ہے اور ملزم پر بظاہر ارتکاب قتل کی علامات پائی جاتی ہیں، مثلاً اس کے ہاتھ میں خون آلودہ قتل ہے یا وہ اس گھر سے باہر آتے ہوئے دیکھا گیا (جہاں مقتول ہے) جبکہ کوئی دوسرا شخص وہاں نہیں پایا گیا تو ایسی حالت میں اس ایک معتبر شخص کی شہادت کو لوٹ (ثبوت قتل) تصور کیا جائے گا اور ورثاء مقتول حلف قسامہ اٹھائیں گے، اور جرم عدا ہوا ہو تو قصاص لیں گے ورنہ خون بہا کے حقدار ہوں گے۔

جاننا چاہیے کہ قتل کے متعدد شواہد ہونے کے باوجود ”قسامہ“ (حلف برداری) ضروری ہے مثلاً قتل کا کوئی قابل اعتبار چشم دید گواہ ہو اور اس کے ساتھ دو معتبر گواہ مقتول کے اس بیان کی شہادت دیں کہ اس نے (مرنے سے پہلے) یہ بتا دیا تھا کہ مجھے فلاں شخص نے قتل کیا ہے تو اس صورت میں بھی جب تک کہ ”قسامہ“ پر عملدرآمد نہ کیا جائے مقتول کے ورثاء خون بہا کے حقدار نہ ہوں گے۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ ایک مقتول کا کسی بستی میں پایا جانا اگرچہ وہ مقتول مسلمان ہو اور بستی کافروں کی ہو لوٹ (یعنی ثبوت قتل) نہیں ہے درآنحالیکہ اس بستی کے لوگوں کا میل جول باہر کے لوگوں سے ہو، ایسا نہ ہو تو (لاش کی موجودگی کو) لوٹ (ثبوت قتل) تصور کیا جائے گا اور اہل قریہ پر قسامہ واجب ہوگا چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے بمقام خیر عبد اللہ بن سہل کے مقتول پائے جانے پر عبد اللہ بن سہل کے دو چچا زاد بھائیوں کے حق میں (بستی والوں پر) ”قسامہ“ (حلف برداری کا حکم) نافذ فرمایا، کیونکہ خیر ایسی جگہ ہے جہاں یہودیوں کے سوا کسی اور شخص سے ان کا خلا ملنا نہ تھا، یا اہل قریہ کے کسی گھر میں جہاں باہر کے لوگ آکر ملتے جلتے ہوں اگر کسی مقتول کی لاش پائی جائے تب بھی قسامہ واجب ہوگا کیونکہ ممکن ہے کہ اس گھر یا اس بستی والوں کے علاوہ کسی اور شخص نے قتل کر کے وہاں پر ڈال دیا ہو۔

یہ اصحاب کہتے ہیں کہ قسامہ میں یکے بعد دیگرے پچاس قسمیں ہوتی ہیں جن میں وقت یا جگہ کا فرق نہیں ہونا چاہیے، سب لوگ قطعی طور پر پورے یقین کے ساتھ ان الفاظ میں حلف اٹھائیں گے کہ ہم اس اللہ کی قسم کھاتے ہیں جس کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں ہے کہ بلاشبہ فلاں شخص ہی نے اس کو قتل کیا ہے، اگرچہ قسم کھانے والا نابینا ہو یا وہ وقوعہ قتل کے وقت موجود نہ رہا ہو اور اس وقوعہ کا علم اسے دوسروں کے کہنے سے اس طرح ہوا ہو جیسے مشاہدہ سے ہوتا اور جب قسموں کی

تعداد (پچاس) قاعدہ کے مطابق قسم کھانے والوں (حصہ رسدی) ڈال دی جائے اور دو یا زیادہ کی کسر رہ جائے تو اس کی تکمیل سب سے زیادہ قسم کھانے والے سے کرائی جائے، اگرچہ زیادہ قسم والا سب سے کم حصہ کا حقدار ہو، اگر باقی ماندہ حصے (قسم کھانے والوں کی تعداد کے) برابر ہوں تو ان سب سے باقی ماندہ قسم کی تکمیل بحیثیت مساوی کرائی جائے۔

قتل خطا کی صورت میں، ورثائے مقتول کے منجملہ مکلف اشخاص سے حصہ میراث کے مطابق قسم لی جائے گی، اگر ایک ماں شریک بھائی یا ایک عورت کے سوا اور کوئی وارث نہ ہو تو وہی پچاس قسمیں کھائے گا اور خون بہا میں سے اپنا حصہ لے گا، اور موجودہ بالغ ورثاء میں سے کسی کو مجرم کے عاقلہ سے منجملہ دیت کے کچھ نہیں ملے گا درآنحالیکہ بعض ورثاء موجود نہ ہوں یا صغیر سن (نابالغ) ہوں تا وقتیکہ (موجودہ وارث) پوری (پچاس) قسم نہ کھالے (اس کے بعد) وہ صرف اپنا حصہ لے سکتا ہے کیونکہ جب تک خون پایہ ثبوت کو نہ پہنچے، عاقلہ سے کوئی مطالبہ نہیں کیا جاسکتا، وارث موجودہ کے پوری قسمیں کھانے کے بعد غیر موجود وارث کے آنے یا نابالغ وارث کے بالغ ہونے پر ان کے حصے کے مطابق ان سے قسم لی جائے گی تب وہ تاوان سے اپنا حصہ لے سکیں گے۔

واضح ہو کہ قتل عمد میں حلف قسامہ دو مردوں (ورثاء) سے کم کی صورت میں نہیں لیا جائے گا، قتل عمد کے بارے میں عورتیں حلف نہیں اٹھائیں گی، کیونکہ اس معاملہ میں ان کی شہادت نہیں ہوتی، اگر ورثاء میں دو مرد نہ ہوں اور صرف عورتیں ہی وارث ہوں تو مقتول کو لاوارث قرار دیا جائے گا، کمزور قسم سے مدعا علیہ کو تقویت حاصل ہوتی ہے اور قتل کے ملوثین میں سے صرف اس کے خلاف حلف قسامہ لیا جائے گا جس کی نشاندہی خصوصیت کے ساتھ مدعی نے کی ہو، ان سب کے مارنے سے مراد اس کے پاداش میں ایک سے زیادہ اشخاص کو قتل نہیں کیا جائے گا، اگر ارتکاب قتل میں سب برابر کے شریک ہوں مثلاً سب لوگ ملکر ایک پتھر اٹھا کر لائے اور مقتول کے اوپر گرا دیا جس سے دب کر وہ مر گیا تو ان سب کے خلاف قسم لی جائے گی اور سب کو قتل کیا جائے گا، درآنحالیکہ مقتول کو (زخمی حالت میں) زندہ اٹھا کر لایا گیا ہو اور بعد میں مرا ہو، اگر وہ اسی جگہ مر گیا اور وہیں پر موت آگئی تو قسامہ (حلف برداری) کے بغیر ہی سب کو قتل کیا جائے۔

ولی کو حق ہے کہ قسامہ میں وہ مقتول کے عاصب (صلبی قرابت دار) سے مدد لے اگر مقتول کا کوئی صلبی رشتہ دار نہ ہو مثلاً مقتولہ عورت ہو جس کا کوئی عاصب (صلبی رشتہ دار) بجز اس کے اپنے بیٹے کے نہ ہو اور ولی کا باپ شریک بھائی ہو تو وہ ان دونوں سے یا ان میں سے کسی سے مدد لے سکتا ہے یا مثلاً اپنے چچا سے مدد لے سکتا ہے۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ یہ قسمیں خون بہا کے حقداروں پر ان کی تعداد کے مطابق تقسیم کر دی جائیں گی، لیکن قتل خطا میں حق وارث کے حصوں کے مطابق قسمیں ڈالی جائیں گی اور صرف پچاس افراد پر اکتفا کیا جائے گا اور قسموں کی تعداد (پچاس) پوری کرنے کے لیے دو ولیوں کی موجودگی کافی ہے، جبکہ ورثاء کی تعداد زیادہ ہو اور ان میں صرف دو افراد (رضا کارانہ) قسم کھالیں تو کافی ہوگا، بشرطیکہ باقی ورثاء نے قسم کھانے سے انکار نہ کیا ہو۔ اگر ولی کے عصبی رشتہ داروں میں سے کوئی خاص فرد قسم سے انکار کرے تو اسے نظر انداز کر دیا جائے گا ہاں اگر بالعموم (ورثاء) قسم سے انکار کریں تو یہ امر قابل

توجہ ہوگا، اگر وہ کئی ایک ہیں تو ان میں سے ہر ایک پچاس قسمیں کھائے گا کیونکہ ان میں سے ہر ایک پر قتل کا الزام ہے، گو (فی الواقع) ارتکاب قتل ایک فرد نے کیا ہو، اگر ایک ہی شخص ملزم قتل ہے تو اس سے پچاس قسمیں لی جائیں گی۔

اگر قتل کا کوئی ملزم قسم کھانے سے انکار کرے تو اسے قید میں رکھا جائے یہاں تک کہ وہ قسم کھائے یا قید خانے میں مرجائے، کیونکہ وہ سرکشی پر آمادہ ہے بصورت دیگر ایک سال کے بعد اسے سو کوڑے مار کر رہا کر دیا جائے گا اور قابل ترجیح عمل وہی ہے جو پہلے مذکور ہوا۔

یہ اصحاب کہتے ہیں کہ حاکم پہلے مدعیوں سے قسم لے گا، مدعا علیہم سے نہیں اگر مدعی قسم سے انکار کریں اور کوئی شہادت جرم کی نہ ہو تو مدعا علیہ (مدعی کے خلاف) پچاس قسمیں کھا کر الزام خون سے بری الذمہ ہو جائے گا۔

حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر محلہ میں کوئی مقتول پایا جائے اور قاتل کا علم نہ ہو تو حکم شرع کے مطابق 'قسامہ' پر عمل ہوگا، لیکن محض قسامہ (حلف برداری) پر فیصلہ نہیں دیا جائے گا، بجز اس صورت کے جبکہ مقتول اور مدعا علیہ کے درمیان لوٹ (شواہد قتل) موجود نہ ہوں، لوٹ سے مراد فریق ثانی بالخصوص حقیقی رشتہ داروں میں عداوت کا ہونا ہے جیسا کہ قبائل میں خون کا بدلہ یا انتقام لینے کا جذبہ ہوتا ہے یا جس طرح شریکوں اور سلامت رووں میں ہوتا ہے رہا ایک مسلمان بالغ مقتول کا یہ کہنا کہ فلاں شخص نے مجھے قتل کیا 'لوٹ' (ثبوت قتل) نہیں ہے۔

جب جرم مستوجب قسامہ ثابت ہو جائے تو قتل کا دعویٰ کرنے والے قاتل کے خلاف پچاس قسمیں کھائیں گے اور اگر وہ قتل عمد ہے تو وہ مطالبہ خون کے حقدار متصور ہوں گے، اور قسامہ کے پہلے مدعیوں کو طلب کرنا واجب ہے، مدعا علیہم کو قسم کے لیے پہلے طلب نہیں کیا جائے گا۔

اگر مدعیوں نے قسم کھانے سے انکار کیا اور قتل کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے تو مدعا علیہ سے پچاس قسمیں لی جائیں گی کہ: نہ اس نے قتل کیا ہے اور نہ اسے یہ معلوم ہے کہ کس نے قتل کیا؟ اس حلف کے بعد وہ الزام قتل سے بری ہو جائے گا۔ اگر خون کے والی (ورثاء) متعدد اشخاص ہیں تو ان سب پر حصہ ورثہ کے مطابق قسم عائد ہوگی تاکہ اسی کے مطابق سب کو حصہ (دیت میں سے) مل جائے بمصداق اس کہادت کے کہ "الغرم علی قدر الغنم" (یعنی ادائیگی قرض واجب بھینٹ بکریوں کی تعداد کے مطابق ہوگی)۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ غلاموں (کے قتل) کے بارے میں بھی 'قسامہ' (حلف برداری) پر عملدرآمد ہوگا اور یہ ایک مسلمان انسان کی حرمت کے پیش نظر ہے جس کا وہ مستحق ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے شرف ایمان سے نوازا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ 'قسامہ' میں عورتوں کی قسم کو مطلقاً دخل نہ ہوگا خواہ وہ قتل عمد ہو یا قتل خطا تاکہ عورتیں ذمہ داری کے بوجھ سے ہلکی رہیں، ان کے ذمہ کسی کی حمایت نہیں ڈالی گئی قسامہ کی بنیاد افراد عاقلہ اور اہل محلہ کی حمایت پر قائم ہے (یعنی جن افراد کو مجرم کا حمایتی تصور کیا جاتا ہے ان ہی سے حلف 'قسامہ' لیا جاتا ہے) قاتل مجرم ان ہی اشخاص کے بل بوتے اور حمایت پر بھروسہ کر کے ارتکاب جرم کرتا ہے۔

کفارہ قتل کا بیان

ائمہ فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ اگر کسی شخص سے بلا ارادہ قتل سرزد ہو گیا، اور مقتول ذمی یا غلام نہیں ہے تو اس شخص پر کفارہ (یعنی گناہ کے داغ کو دھونے کا شرعی عمل) واجب ہے، تمام فقہاء کہتے ہیں کہ غلطی سے قتل سرزد ہو جانے کا کفارہ یہ ہے کہ ایک مسلمان مملوک (غلام یا لونڈی) کو آزاد کرے، اگر یہ دستیاب نہ ہو تو دو ماہ تک متواتر (بلا ناغہ) روزہ رکھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، ”وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَا فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٌ، وَدِيَّةٌ مُسْلِمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ يَصَدَّقُوا، فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٌ، وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ فَدِيَّةٌ مُسْلِمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٌ، فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِنَ اللَّهِ، وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا“ (النساء ۹۲) (یعنی اگر کوئی شخص غلطی سے کسی مسلمان کو قتل کر دے تو ایک مسلمان فرد (مملوک) کو آزاد کرے اور خون بہا مقتول کے اہل (ورثاء) کو ادا کرے، ہاں اگر ورثاء معاف کر دیں تو خیر، اگر مقتول ان میں سے ہے جو تمہارے دشمن ہیں، لیکن وہ مسلمان ہے تو صرف ایک مملوک (غلام) کو آزاد کرنا کافی ہے ہاں اگر مقتول ان میں سے ہے جن کے ساتھ تمہارا باہم معاہدہ امن ہے تو غلام کے مالک کو اس کا خون بہا ادا کرنا اور ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا بھی ہوگا، اگر غلام دستیاب نہ ہو تو اللہ کے سامنے توبہ واستغفار کے لیے، بلا ناغہ دو مہینے تک روزہ رکھے، اللہ سب کچھ جانتا بوجھتا ہے۔)

مالکیہ اور حنفیہ نیز شافعیہ کے دو اقوال میں سے ایک صحیح تر قول کے مطابق اور حنابلہ کی دو روایتوں میں سے ایک روایت کے موافق قتل خطا کے کفارہ میں (روزے کی بجائے) کھانا کھلا دینا جائز نہیں ہے کیونکہ اس مسئلہ میں مرد مومن کے احترام کی عظمت کے پیش نظر کفارہ میں اس امر کو جو اکثر حالات میں کھانا کھلانے سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے مخصوص کر دیا گیا ہے، یہ اس لیے بھی ہے کہ قرآن میں کفارہ کے روزے کے عوض، کھانا کھلانے کی صراحت نہیں آئی اور مقدار کا اندازہ تعین وقت سے کیا جاتا ہے، پھر یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس جرم کی پوری پاداش کا ذکر حرف تعقیب یعنی ’فا‘ (بمعنی پس) کے ساتھ فرمایا دیا اور جو کچھ مذکور ہے اس سے یہی کچھ سمجھا جاتا ہے، اور (اس حکم عتاق کے نفاذ کے لیے) مملوک کے پروردہ، ماں باپ میں سے کسی کا مسلمان ہونا کافی ہے، کیونکہ آزاد کرنے کے لیے بردہ کا مسلمان ہونا اور صحیح الاعضاء ہونا شرط ہے اور پہلی بات (اسلام) تو اس کے ماں باپ میں سے کسی کے مسلمان ہونے سے ثابت ہے اور دوسری بات (صحیح الاعضاء ہونا) اس کی ظاہری حالت سے ثابت ہے کہ اس کے اعضاء صحیح سلامت ہیں ہاں پیٹ کے بچے کو آزاد کرنا درست نہیں ہے کیونکہ (پیدائش سے پہلے) نہ اس کا زندہ ہونا ثابت ہے نہ صحیح الاعضاء ہونا۔

شافعیہ اور حنابلہ کی دوسری دونوں روایتوں میں آیا ہے کہ اگر روزہ رکھنے سے معذوری ہو تو کھانا کھلا دینا بھی جائز ہے جیسا کہ کفارہ ظہار میں (یعنی بیوی کو ماں کہہ لینے کے کفارہ میں) ہوتا ہے۔

حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ ذمی کے قتل پر کفارہ غیر مشروط طور پر واجب ہے اسی طرح مسلمان غلام کے قتل

پر بھی واجب ہے، اور ایسا کرنا رسول اللہ ﷺ کی وصیت پر عمل پیرا ہونے کے لیے ضروری ہے، آنحضرت ﷺ نے ذمی پر زیادتی کرنے والے کو تنبیہ فرمائی ہے کہ قیامت کے روز وہ ایسے اشخاص کے خلاف احتجاج فرمائیں گے، مثلاً آپ نے فرمایا ہے کہ ”من ظلم ذمیا کنت حبیبه یوم القیامۃ“ (یعنی جو شخص کسی ذمی پر ظلم کرے گا قیامت کے دن میں اس کے خلاف احتجاج کروں گا) پس جبکہ یہ حکم ایسے شخص پر بھی عائد ہوتا ہے جو ذمی کے مال سے ایک درہم بھی بیجا طور پر لے یا بدکلامی سے اس کی بے عزتی کرے تو اس کا کیا حال ہوگا جو ناحق اسے قتل کر دے۔

ہر مسلمان غلام کے قتل کر دینے پر کفارے کا واجب ہونا اس لیے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے آخری وقت میں یہ ارشاد فرمایا ”الصلوۃ و ماملکت ایمانکم“ (یعنی خبردار نماز کا اور مملوک (لوٹڈی غلام) کا خیال رکھنا) روایات میں آیا ہے کہ یہ آخری بات تھی جس میں حضور نے لوٹڈی غلام کی بابت ہدایت فرمائی اس وقت آپ کی زبان سے یہ الفاظ بمشکل ادا ہوئے، پس اس حکم کا انتہائی احترام واجب ہے، اور ایسے اشخاص کے قتل کرنے پر ادائے کفارہ کا واجب کرنا بھی منجملہ احترام کے ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ ذمی کے قتل پر کفارہ واجب نہیں ہے کیونکہ ذمی کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی یہ وصیت مخصوص امور کے متعلق سمجھی گئی ہے، مثلاً یہ کہ اس کا مال ناحق نہ ہتھیا لیا جائے گا اور اس کے واجبات، کفارے کے علاوہ، سب پورے کیے جائیں گے لہذا اس کی موت آجانے پر اس کے کفن و دفن وغیرہ کا بندوبست کیا جائے گا، لیکن اس کے قتل کا کفارہ واجب نہیں ہے، کیونکہ بدیں لحاظ کہ وہ کافر ہے اور اللہ کے رسول کی تکذیب کرتا ہے، فی الجملہ وہ مستوجب قتل ہے۔ حنفیہ، مالکیہ نیز حنابلہ کی دو روایتوں میں سے ایک کی رو سے اس کے قتل عہد پر کوئی کفارہ واجب نہیں ہے، کیونکہ شریعت نے اس کے قتل عہد کی صورت میں اس کے قتل کیے جانے اور اگر اس کے ورثاء خون بہا کے عوض خون معاف کر دیں تو ادائے دیت کے بارے میں پہلے ہی سختی سے عمل کرنے کا حکم دیا ہے، اس پر اور کچھ زیادہ نہیں کیا جاسکتا، پھر یہ بھی ہے کہ جرم قتل خالص گناہ کبیرہ ہے اور کفارہ عبادت ہے عبادت کو گناہ کے ساتھ مربوط نہیں کیا جاسکتا، اور اس لیے بھی کہ کفارہ قابل قدر شے ہے اور شرع نے ادنیٰ شے کی تلافی کے لیے اسے مقرر فرمایا ہے لہذا اعلیٰ شے کی تلافی کے کام میں نہیں لایا جاسکتا۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ قتل عہد کے ارتکاب پر کفارہ واجب ہے، کیونکہ قتل عہد کے جرم کی تلافی زیادہ ضروری ہے بہ نسبت قتل خطا کے، پس قتل عہد کفارے کا زیادہ متقاضی ہے، کیونکہ جرم عہد کا گناہ قتل خطا کی بہ نسبت زیادہ سخت ہے اور جرم خطا کی بہ نسبت یہ جرم زیادہ لائق کفارہ ہے۔

یہ اصحاب یہ بھی کہتے ہیں کہ بقول صحیح قتل کے ہر شریک پر منفرد ادائے کفارہ واجب ہے، کیونکہ یہ ایک ایسی بات ہے جس کا تعلق جرم قتل سے ہے لہذا اس حق کو ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا جیسا کہ قصاص میں ہوتا ہے پھر یہ بھی ہے کہ کفارہ قتل کے گناہ کو ہلکا کرنے کے لیے ہوتا ہے اور (شرکائے قتل میں سے) ہر ایک قاتل ہے (اور سب پر کفارہ واجب

ہے) نیز اس لیے بھی کہ کفارہ کے مفہوم میں عبادت ہے اور جو عبادت کسی جماعت پر واجب ہو اس کو ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا، یہ بھی کہا جاتا ہے۔ کہ تمام شرکائے جرم کا کفارہ ایک ہوگا جیسے جرم شکار کا (کہ سب مل کر شکار کریں تو صرف ایک کفارہ دینا پڑتا ہے)۔

شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی کافر غلطی سے ایک مسلمان کو قتل کر دے تو اس کا فر پر بھی ادائے کفارہ واجب ہوگا اور مسلمان کی حفاظت نہ کرنے کی پاداش میں کافر پر سختی سے ڈنڈا ڈالا جائے گا، تاکہ یہ بات دوسری بار نہ ہو اور اس سے اس کے دوسرے ہم مذہب اشخاص کو عبرت ہو، بلکہ اگر غلام قاتل ہو تو اس پر بھی کفارہ قتل واجب ہے جیسا کہ اس کے قتل پر قصاص اور ضمان (بدل) واجب ہوتا ہے لیکن چونکہ اس مقتول میں مالک مال ہونے کی صلاحیت نہیں ہوتی لہذا روزہ رکھ کر کفارہ دینا ہوگا، یہی حکم اس صورت میں ہے جبکہ قاتل ذمی ہو، کیونکہ وہ بھی بجا آوری احکام کا ذمہ دار ہے۔ اب اس میں خواہ اس نے ایک مسلمان کو عداوت قتل کیا ہو یا غلطی سے قتل سرزد ہو گیا ہو یا موت کا سبب مہیا کیا ہو اور خواہ وقوع قتل دار الحرب میں ہو یا ہو، یا اس کا مقتول ذمی ہو یا بچہ شکم ہو یا خود اپنے غلام کو یا خود اپنے آپ کو ہلاک کیا ہو، حربیہ عورت یا حربی بچے کو قتل کرنے پر کفارہ واجب نہیں ہے اور نہ باغی کے قتل پر واجب ہے، کیونکہ باغی کا خون حلال ہے، اسی طرح حملہ آور کے قتل پر بھی (کفارہ نہیں ہے) کیونکہ اس کے تحفظ کی ضمانت نہیں دی جاتی نیز مرتد اور شادی شدہ مرتکب زنا پر اور اس شخص کے قتل پر جو مستوجب قصاص ہو اور مدعی قصاص اسے قتل کر دے (تو کفارہ نہیں ہے) کیونکہ قاتل کے نزدیک اس کا خون مباح ہے۔

حنفیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ کافر اور جنون زدہ قتل کر دے تو اس پر کفارہ واجب نہیں ہے، کیونکہ کفارہ قاتل کو گناہ سے پاک کرنے اور اسے روز قیامت کے عذاب سے بچانے کے لیے ہوتا ہے اور کافر (سرے سے) اس کا حقدار ہی نہیں ہے کیونکہ حشر کے دن دوزخ کی آگ میں جلا کر بھی اسے گناہ سے پاک نہیں کیا جاسکتا تو ادائے کفارہ سے کیونکر پاک ہو سکتا ہے؟

مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی بچہ یا جنون زدہ قتل کا ارتکاب کرے تو کفارہ واجب ہوگا کیونکہ بالعموم ایسے فعل کے ارتکاب کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ان کی خاطر خواہ نگرانی نہیں کی جاتی، اگر بچے کا ولی (سرپرست) اسے قتل سے باز رہنے کے لیے ڈراتا دھمکاتا رہے یا جنون زدہ کا ولی اسے قید میں رکھے یا زنجیر سے باندھ کر رکھے تو وہ کسی کو قتل کرنے کا موقع نہ پاسکے گا، علاوہ اس کے اکثر اوقات مجنون کو ایسی غذا کے سبب جنون لاحق ہوتا ہے جو موافق مزاج نہیں ہوتی، لہذا بعض ائمہ فقہاء جو اس پر کفارہ عائد کرتے ہیں ان کے نزدیک اس کا سبب وہی ہے جو سبب ہلاکت مہیا کرنے کی صورت میں ہوتا ہے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ بچے اور جنون زدہ پر کفارہ واجب نہیں ہے، کیونکہ مجنون غیر مکلف ہوتا ہے اور بچہ مکلف ہونے کی عمر کو نہیں پہنچتا (اور غیر مکلف پر احکام شرعیہ عائد نہیں ہوتے) لہذا ان کے اعمال پر کوئی مواخذہ نہیں ہے، نیز اس لیے بھی کہ ان کے افعال امر مباح کی حیثیت رکھتے ہیں جو اعمال کی پانچ قسموں (یعنی فرض، واجب، حلال، حرام اور مباح) میں سے ایک ہے۔

مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ ایسی وجہ پیدا کرنے پر بھی کفارہ واجب ہو جاتا ہے جس کے باعث موت واقع ہو جائے (یعنی یہ بھی قتل ہے) مثلاً عداوت نکالنے کی غرض سے کنواں کھودے، یا راہ میں پتھر رکھ دے، یا جبراً قتل کر دیا ہو یا ایسے شخص سے ہلاک کرایا ہو جو فعل قتل کے نتیجہ سے بے خبر ہو، یا جھوٹی گواہی دے کر کسی کو مستوجب قتل بنا دیا ہو، خواہ کوئی شخص کنواں کھودنے والے کی موت کے بعد اس میں گر کر ہلاک ہو، کیونکہ بہر دو صورت قاتل کا نام اس پر عائد ہوتا ہے اور یہ فعل آیت قتل کے مفہوم میں داخل ہے، اس صورت میں حکم کفارہ کو دیت کے واجب ہونے کے حکم پر قیاس کیا گیا ہے (یعنی ان صورتوں میں دیت واجب ہوتی ہے اسی طرح کفارہ بھی واجب ہوگا)۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اسباب قتل مہیا کرنے کی بناء پر جسے قاتل قرار دیا جائے اس پر ہر حال میں کفارہ واجب نہیں ہوتا لیکن تمام اصحاب کا اس پر اتفاق ہے کہ قتل کا سبب مہیا کرنے پر خون بہا واجب ہوتا ہے، کیونکہ سبب قتل والے کو شریک قتل نہیں کہا جاسکتا، قتل کرنے میں شریک ہونے کے مقابلہ میں ذریعہ قتل کا مہیا کرنا ہلکا جرم ہے، جبکہ وہ خود قتل میں شریک نہ ہوا ہو۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر ام ولد نے (یعنی اس لونڈی نے جس کے لطن سے اس کے آقا کا لڑکا پیدا ہو جائے) اپنے آقا کو قتل کر دیا تو اس لونڈی پر اپنی قیمت (تاوان میں) دینا واجب ہے، کیونکہ آقا کو قتل کرنے کے بعد وہ آقا کی ملکیت میں نہیں رہی اور آزاد ہو گئی اور (آقا اس کا وارث نہ رہا) یہ ایسا ہی ہے جیسے وہ کسی اور کو قتل کر دے، یہ حکم اس حالت میں ہے جبکہ اس پر قصاص عائد نہ ہو۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اس پر خون بہا کی ادائیگی واجب ہے، کیونکہ اب وہ ایک آزاد (غیر مملوکہ) عورت ہے، اور جس سبب سے اسے مملوک قرار دیا جاتا وہ سبب ختم ہو گیا اور آزاد قاتل پر خون بہا عائد ہوتا ہے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ ام ولد اگر جرم قتل کی مرتکب ہو تو اس پر اس کی قیمت سے زیادہ مقدار کا تاوان عائد نہ ہوگا جیسا کہ اس صورت میں ہوتا ہے جبکہ وہ (غیر از آقا) کسی اور کو قتل کر دیتی، اور یہ اس لیے ہے کہ مجرم کے جرم کی نوعیت اس حالت کے موافق متعین کی جائے گی جبکہ اس نے ارتکاب جرم کیا، ارتکاب جرم کے وقت وہ لونڈی تھی، اور چونکہ مملوک ہونے کی حیثیت سے وہ ناقص ہے لہذا وہ قن (قطعی غلام) کے مشابہ ہے، اگر اس کے آقا کا کوئی لڑکا اس سے نہ ہو تو آقا کے ورثاء کو اس سے قصاص لینے کا حق ہے، اگر اس سے آقا کا کوئی لڑکا ہے اور وہی تنہا اس کا وارث ہے تو قصاص واجب نہ ہوگا، کیونکہ اگر قصاص واجب ہو تو اس کے اپنے بیٹے کی طرف سے (دعویٰ قصاص) ہوگا اور بیٹا اپنی ماں سے مطالبہ قصاص نہیں کر سکتا۔

حنابلہ اس مسئلہ میں خاموش ہیں۔

تعزیرات (سزاؤں) کا بیان

واضح ہو کہ تعزیر (سزا سے) مراد ایسی سزائیں ہیں جو کسی فعل ممنوع کو دوبارہ کرنے سے منع ہو، پس جب کوئی شخص ایسے فعل کا ارتکاب کرے جس کی حد (شرعی سزا) مقرر نہیں ہے اور نہ قصاص (اس جیسی سزا) مقرر ہے اور نہ اس کے لیے کفارہ (عمل تلافی گناہ) ہے تو حاکم کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ اس شخص کو ایسی سزا (اذیت) دی جائے جو اس شخص کو دوبارہ اس فعل کے ارتکاب سے باز رکھے، خواہ وہ سزائے تازیانہ ہو یا قید ہو یا اذیت دہ تعذیب ہو۔

اس معاملہ میں بعض ائمہ فقہاء نے یہ شرط لگائی ہے کہ یہ سزائیں کوڑوں سے زیادہ نہ ہونی چاہیے، بعض اصحاب جس میں مالکیہ ہیں فرماتے ہیں کہ امام (حاکم) کو اختیار ہے کہ اس کی رائے (اس فعل کے) سد باب کی خاطر جتنی بھی ضرب لگانا مناسب ہو وہ لگا سکتا ہے، خواہ سو دروں سے زیادہ ہو جائے لیکن اتنی نہ ہو کہ قصور دار ہلاک ہو جائے۔^(۱)

۱۔ **تعزیر کی تعریف:** واضح ہو کہ تعزیر فعل 'عزّر' کا مصدر ہے اور 'عزّر' کے معنی روک دینے یا باز رکھنے کے ہیں، اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "و تعزروه" (یعنی دشمن کو روک دو یا باز رکھو) اور اصطلاح شرع میں اس کے معنی (گناہ) پر سزائیں کرنے کے ہیں، اس کی کوئی مقررہ حد نہیں ہے اور نہ اس گناہ کا کفارہ ہے اور تعزیر حدود (یعنی شرع کی مقرر کردہ سزاؤں) سے دو امور میں مختلف ہے:

اول یہ کہ سزائیں مختلف اشخاص کے لیے مختلف ہوتی ہیں، چنانچہ ایک ذی وجاہت شخص کی سزائیں عوام الناس کی سزا سے مختلف ہوں گی، بخلاف اس کے حدود شرعیہ دونوں پر یکساں نافذ ہوتی ہیں چنانچہ کوئی عربی ہو یا غیر عربی ہر ایک کے ساتھ حدود (شرعی سزاؤں) کے نفاذ میں برابر کا سلوک ہوگا۔

دوسرے یہ کہ ان سزاؤں کے بارے میں سفارش قبول کرنا اور معاف کر دینا جائز ہے خواہ معاملہ حاکم کے سامنے پیش ہو چکا ہو، بخلاف حدود شرعیہ کے کہ جب معاملہ حاکم کے سامنے پیش ہو جائے تو اب اس میں سفارش جائز نہیں ہے۔ حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ تعزیروں میں بھی حدود شرعیہ کی طرح نرمی برتنے کو دخل نہیں ہے، کیونکہ اس پر عملدرآمد کا حکم ہے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ تعزیرات میں رعایت یا پاسداری کو دخل ہے البتہ حدود میں دخل نہیں ہے۔

بعض اصحاب حنابلہ کہتے ہیں کہ تعزیر دس کوڑوں سے زیادہ کی نہ ہونی چاہیے لیکن ابن قیم جو حنبلی ہیں اس سے اتفاق نہیں کرتے، چنانچہ انہوں نے اپنی کتاب اعلام الموقعین میں بتایا ہے کہ سزائے تازیانہ حنابلہ کے نزدیک سو کوڑوں تک پہنچتی ہے، مثلاً کوئی شخص اپنی بیوی کی لونڈی سے مباشرت کرے تو اسے سو درے مارے جائیں، ان کا کہنا ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شراب کی سزا چالیس کوڑوں سے بڑھا کر اسی کوڑے کر دی تھی، اور یہ خیال نامعقول ہے کہ انہوں نے اصل حد شرعی چالیس کوڑوں میں جو رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے، زیادتی کر دی ہو، پھر یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ بعض علماء

علماء کا کہنا ہے کہ اولاد یا بیوی کو سرزنش کرنا بھی ان کے نزدیک تعزیر (سزا) میں داخل ہے تاکہ انہیں برائی سے محفوظ اور دور رکھا جاسکے۔

سرزنش کے کئی طریقے ہیں: زبان سے ڈانٹ ڈپٹ کرنا، (عمل سے) خفگی کا اظہار کرنا، مارنا، قید میں رکھنا یا جرمانہ کر دینا جیسا بھی خطا کار کے حالات کا تقاضا ہو یا جس طرح بھی حاکم اس کے حق میں مناسب سمجھے۔

تعزیر کے بارے میں شرعی ہدایات

حنفیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر حاکم کا گمان غالب یہ ہو کہ بغیر جسمانی سزا کے مجرم کی اصلاح نہیں ہو سکتی تو سزا کا دینا واجب ہو جائے گا لیکن اگر اس کے بغیر اس کی اصلاح کی توقع ہو تو واجب نہ ہوگا، سزا کا مقصد بارگاہ خداوندی کی عظمت کو مد نظر رکھنا ہے کہ مبادا یہ بندہ پھر ایسی حرکت کرے اور اللہ اسے دیکھ رہا ہو، پس سزا میں شدت اس لیے واجب ہے کہ مجرم کو آئندہ کے لیے اپنے فعل کی قباحت معلوم ہو جائے، سزا کی جوازیت اس نے اٹھائی ہے اسے یاد آ جائے اور اللہ سے مغفرت کا طلبگار ہو۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ حاکم کے لیے تعزیر واجب نہیں ہے، کیونکہ اس سے کچھ زیادہ سد باب برائی کا نہیں ہوتا اور نہ اس طرح آئندہ اسے معصیت سے باز رکھا جاسکتا ہے، جبکہ اس کا انحصار صرف اس اذیت پر ہو جو بندہ کو سزا میں پہنچتی ہے۔ حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص اس فعل کی سزا کا مستحق ہو جائے تو سزا واجب ہوگی۔ اگر مستحق نہ ہو واجب نہ ہوگی۔

باپ کا بیٹے کو تادیباً سزا دینا

مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر باپ سرزنش کے طور پر بیٹے کو مارے یا استاد بغرض تعلیم لڑکے کو مارے اور اس چوٹ کے باعث بیٹا یا شاگرد مر جائے تو اس پر کوئی باز پرس نہ ہوگی، کیونکہ باپ یا استاد کا مقصد مارنے سے بجز اصلاح کے اور کچھ نہ تھا۔

حنفیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر باپ کے مارے بیٹا مر جائے تو باپ کے مال سے دیت وصول کی جائے گی اور باپ کو اس مال سے ورثہ نہ ملے گا، اسی طرح استاد اگر قرآن حفظ کرانے یا لکھنا سکھانے یا کوئی ہنر بتانے کے لیے سزا دے

کہتے ہیں کہ شراب پینے کی جملہ سزائیں بطور تعزیر کے ہیں حد (شریعت کی مقرر کردہ) نہیں ہیں اور ابن قیم کی عبارت اعلام الموقعین سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حاکم کو اختیار ہے کہ جو سزا چاہے دے سکتا ہے: قید ہو یا سزائے ضرب ہو جیسا کہ مالکیہ کہتے ہیں لیکن بہر حال سزا (یا سزائے) تقاضائے وقت کے مناسب ہونی چاہیے، ہاں جہاں تک ہو سکے مجرموں کے ساتھ نرمی واجب ہے، اور حنفیہ جو یہ کہتے ہیں کہ حاکم کو تیس دروں سے زیادہ کی سزا دینا جائز نہیں ہے وہی یہ بھی کہتے ہیں کہ حاکم سزا کے طور پر قتل بھی کر سکتا ہے چنانچہ حنفیہ کے نزدیک لواطت (عمل غیر فطری) ہر چند کہ مستوجب تعزیر ہے (مستوجب حد نہیں ہے) باوجود اس کے ان کا کہنا ہے کہ اگر کوئی شخص اس بے حیائی کا ارتکاب بار بار کرے تو اسے موت کی سزا دی جائے کیونکہ ایسا

اور اس سے موت واقع ہو جائے تو مارنے والے پر تاوان عائد ہوگا، یہ حکم اس لیے ہے کہ باپ بیٹے کو سزا دینے کے وقت احتیاط سے کام لے، بسا اوقات باپ بیٹے سے خفا ہو کر یوں ہی اجنبی کی طرح مارنے لگتا ہے، لہذا احتیاطاً اس پر تاوان واجب کیا گیا۔

حاکم کا سزا کے طور پر مارنا

حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر حاکم نے کسی شخص کو بطور سزا کے مارا اور چوٹ لگنے سے وہ شخص مر گیا تو اس پر کوئی تاوان عائد نہ ہوگا، کیونکہ امام (سربراہ حکومت) کا عہدہ اس سے بالاتر ہے کہ بغیر مصلحت کے وہ کسی کو سزا دے، بخلاف دوسرے اشخاص کے کہ ان کا مارنا کسی اپنی غرض سے ہوتا ہے، مثلاً کوئی عداوت چلی آرہی ہے جس کی بناء پر اسے مارا اور یہ تو کبھی سننے میں نہیں آیا کہ حاکم کو اس لیے سزائے قتل دی گئی ہو کہ اس کے سزا دینے سے مجرم مر گیا ہے، یا اسے خون بہا ادا کرنا پڑا ہو۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر امام (حاکم وقت) کے سزا دینے سے کوئی خطا کار مر جائے تو اس حاکم پر تاوان عائد ہوگا، کیونکہ شریعت نے اس میں کسی کے ساتھ رعایت روا نہیں رکھی، لہذا بڑے سے بڑا امام (حاکم) بھی دوسروں کی طرح شرع کے مطابق احکام کا پابند ہے۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ تعزیرات پر عملدرآمد شریعت کے موافق ہے، خواہ اس گناہ کا تعلق حقوق اللہ سے ہو یا انسان سے اور خواہ وہ اعمال ایسے ہوں جو جرائم مستوجب حد کا پیش خیمہ ہوتے ہیں، مثلاً کسی شخص کا غیر عورت کے ساتھ شرمگاہ کے علاوہ کسی اور طرح سے ملوث ہونا، یا ایسی چوری کرنا جس میں ہاتھ کا مثلاً لازم نہ ہو، یا ایسی گالی دینا جس میں تہمت نہ لگائی گئی ہو، یا وہ گناہ ایسا نہ ہو مثلاً سرکاری تمسکات میں جعل سازی کرنا، یا الزام تراشی سے کام لینا، یا فریب دے کر مال ہتھیالینا، یا جھوٹی گواہی دے دینا۔

فعل کسی طرح بھی شایان انسانیت نہیں ہے جو اس حد تک غیر فطری ہو، اس حکم سے عیاں ہے کہ حاکم وقت تقاضائے مصلحت کے مطابق سزا کے بارے میں کہاں تک جاسکتا ہے۔

بعض شبہات کا ازالہ

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تعزیرات کو اس درجہ کی عقوبت تک کیسے لے جایا جاسکتا ہے جبکہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے ”لا يضرب فوق عشرة اسواط الا في حد من حدود الله“ (یعنی حدود اللہ کی حد کے علاوہ کسی اور بات پر دس کوڑوں سے زیادہ نہ مارے جائیں)، ظاہر ہے کہ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حد کے علاوہ کوئی اور سزا دس کوڑوں سے زیادہ نہیں دی جاسکتی جیسا کہ حنابلہ کہتے ہیں^(۱)

اس کا جواب خود ابن قیم نے یہ دیا ہے کہ لفظ ”حد“ کا اطلاق جہاں عقوبت پر ہوتا ہے وہاں نفس گناہ اور معصیت پر بھی ہوتا ہے، جیسا کہ پہلے اس کی بحث گزر چکی ہے یہاں حدیث میں ”حد“ سے مراد معصیت (گناہ) ہے عقوبت (سزا) مراد نہیں ہے پس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ دس دڑوں سے زیادہ کی سزا بجز ان گناہوں (کی پاداش) کے عائد نہ ہوگی جن کا ارتکاب اللہ تعالیٰ نے حرام فرما دیا ہے (باقی صورتوں میں) حاکم کو اختیار ہے کہ (دوسرے جرائم کی) جو سزا مناسب چاہے دے، ان جرائم کی مثالیں یہ ہیں کہ اجنبی عورت کے ساتھ تخلیہ کرنا، جھوٹی گواہی دینا، دغا یا فریب سے کام لینا فریب دے کر مطلب برآری کرنا، جوا

۱۔ حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ تعزیری سزا اتنی نہ ہو کہ حدود کی زیادہ سے زیادہ کے برابر ہو جائے، کیونکہ امام وقت اور اس کے نائب اس بات کے پابند ہیں کہ وہ شریعت غزرا (یعنی روشن احکام شرع) کے موافق حکم دیں، انہیں یہ اختیار نہیں ہے کہ شریعت کی مقررہ تعداد سے ذرہ بھر بھی زیادہ سزا تجویز کریں۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ تعزیر (عام سزا) کا معاملہ امام کی رائے پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ بر بنائے مصلحت کسی فعل پر حدود (شریعت کی مقرر کردہ سزاؤں) سے زیادہ سزا دے، کیونکہ صاحب شریعت نے حاکم (یا سربراہ) اعلیٰ کو اپنی امت کا امانت دار بنایا ہے اور امت کو حکم دیا ہے کہ وہ ہر حکم کو سنتے ہی اس کی تعمیل کریں بشرطیکہ اس کی بجا آوری میں اللہ عزوجل کی معصیت نہ ہو، بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بعض سرکش اور بدکار اشخاص کو مقررہ حد (سزائے شرعی) معصیت سے باز نہیں رکھتی ایسی صورت میں امام کے لیے جائز ہو جاتا ہے کہ اصلاح سزایاب کی غرض سے مقررہ سزا سے زیادہ سزا دے دی جائے۔

حنفیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ اسباب تعزیر کے مختلف ہونے کی صورت میں سزا مختلف نہ ہوگی کہ اس میں اتنی زیادتی کر دی جائے کہ وہ کم سے کم حد شرعی کی میعاد تک پہنچ جائے خواہ وہ کسی حیثیت سے ہو، ابوحنیفہؒ کے نزدیک کم سے کم ”حد“ (سزا) شراب نوشی کی ہے یعنی چالیس کوڑے، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک کم سے کم مقدار حد بیس کوڑے ہے، اس لحاظ سے حنفیہ کے نزدیک زیادہ سے زیادہ تعزیر انتالیس (۳۹) دڑے ہوگی اور شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک انیس (۱۹) دڑے۔

کھیلنا، اذیت رسانی کے کام میں مال خرچ کرنا، کسی کے خلاف چغلی اور بدگوئی کرنا وزن اور پیمانے میں گھاٹا کرنا یا لہو و لعب میں وقت صرف کرنا وغیرہ اور بہت سی برائیاں ہیں جن کا شمار نہیں کیا جاسکتا، ان تمام جرائم کے لئے شریعت نے نہ کوئی حد (متعین سزا) مقرر فرمائی ہے اور نہ ان کا کوئی کفارہ ہے، پس حاکم کو اختیار ہے کہ ان گناہوں کی پاداش میں قید کر دے یا سزائے ضرب دے تاکہ آئندہ کے لیے مجرم کو دوبارہ ارتکاب سے باز رکھا جاسکے گناہوں (یا جرائم) کے علاوہ بعض سزائیں مخالفت کی بناء پر ہوتی ہیں، مثلاً بیٹے کا اپنے باپ کی مخالفت کرنا، یا ایسی ہی اور باتیں جو بچوں سے سرزد ہوتی رہی ہیں ان سب میں مارنے کی سزا دی جاسکتی ہے لیکن وہ دس دروں سے زیادہ نہ ہونی چاہیے حدیث کا مطلب یہی ہے اور خوب ہے، غرض تعزیر کا میدان بہت وسیع ہے اور حاکم کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ ہر ایسے جرم کے بارے میں جس کی حد یا کفارہ شرعاً متعین نہ ہو اقتضائے حال کے مطابق کوئی بھی سزا تجویز کرے خواہ قید ہو یا ضرب یا جلا وطنی کی یا سرنش یا کچھ اور۔ (۱)

مالکیہ کہتے ہیں کہ سربراہ اعلیٰ کو اختیار ہے کہ اس کی رائے میں جتنے دروں کی سزا مناسب ہو اتنے دڑے مارے جائیں خواہ ان کی تعداد حد (شرع کی مقرر کردہ سزا) سے زیادہ ہو۔

حنابلہ کہتے ہیں کہ اسباب سزا کی نوعیت مختلف ہونے پر سزا بھی مختلف ہوگی چنانچہ اگر اس امر میں شبہ ہو کہ مجرم نے (نا جائز طور پر) مباشرت کی اندام نہانی میں یا کسی اور طرح تو اس صورت میں سزائے حد کی کم سے کم تعداد سے زیادہ سزا دی جاسکتی ہے لیکن وہ سزا زیادہ سے زیادہ مقدار حد شرعی سے تجاوز نہ کرے، لہذا ایک کم سو درے تک لگائے جائیں لیکن اگر اندام نہانی کے علاوہ مباشرت کی کوئی اور صورت ہو مثلاً بوسہ تو اس کی سزا حد کی کم سے کم تعداد تک نہ پہنچنی چاہیے۔

۱۔ واضح ہو کہ اسلام نے ہر طرح کی سزا دینے کی اجازت صرف حاکم کو دی ہے، پس حاکم کو یہ جائز نہ ہوگا کہ وہ سزا دینے کا کام مدعی حقدار یا کسی اور کو سپرد کر دے شریعت نے بجز ان تین صورتوں کے اور کسی صورت میں امام کے سوا کسی کو سزا دینے کی اجازت نہیں دی:

اول باپ کہ اسے جائز ہے کہ وہ اپنے نوعمر بیٹے کو تعلیم و تربیت کے لیے یا خوش اطوار بنانے نیز بری باتوں اور بد اخلاقی سے باز رکھنے کے لیے سزا دے، ظاہر ہے کہ اس حکم میں ماں بھی آتی ہے جس کی نگرانی میں وہ لڑکا یا لڑکی ہوں، اسی طرح اولاد کو نماز کا حکم دینا اور اس کے لیے مارنا جائز ہے، تاہم باپ کے لیے روا نہیں ہے کہ وہ اپنے جوان بیٹے کو مارے خواہ اس نے کتنی ہی گھٹیا حرکت کی ہو، کیونکہ اولاد کے بڑا ہو جانے کے بعد مار پیٹ سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ دوسرا آقا ہے کہ اسے شرع نے اجازت دی ہے کہ وہ اپنے مملوک (لوٹڈی غلام) کو اپنے اور اللہ کے حقوق کا پاس ادب سکھائے اور سرنش کرے۔

بعض حنفیہ نے مالی سزا کی اجازت دی ہے کہ اگر مجرم گناہ سے توبہ کر لے تو مال اسے واپس دے دیا جائے، غرض جرم سرقہ اور تہمت کی سزا اور سزائے قصاص کو نیز ایسی خطاؤں کو جس کے لیے شرع نے کفارہ مقرر فرمایا ہے مثلاً قابل کفارہ قسمیں ہیں اور حالت ناپاکی میں بیوی کے ساتھ مباشرت کرنا ہے ان کو چھوڑ دیا جائے تو تمام اخلاقی اور مالی جرائم اور دوسرے گناہوں کی سزا کا تعین و تجویز حاکم کی رائے پر منحصر

تیسرا خاوند ہے کہ اسے بھی شرعاً جائز ہے کہ بیوی کی سرکشی حکم کی مخالفت اور نافرمانی پر سزا دے قرآن میں اس کی صراحت آئی ہے ”والاتی تخافون نشوزهن فاعظوهن، واهجروهن فی المضاجع، واضربوهن“ (النساء: ۳۴) (یعنی جن عورتوں سے سرکشی کا اندیشہ ہے انہیں سمجھاؤ، انہیں بستروں پر الگ پڑا رہنے دو اور بالآخر مارو)، سوال یہ ہے کہ آیا خاوند کو یہ حق ہے کہ نماز اور نیک اعمال کے ترک کر دینے پر انہیں سزا دے، سو ظاہر ہے کہ اسے یہ حق ہے بشرطیکہ وہ سمجھانے بجھانے اور زبردستی کے باوجود (بد کرداری سے) باز نہ آئے، کیونکہ یہ بھی بات نہ ماننے کے برابر ہے، اور خاوندان میں سے ہے جنہیں یہ حق ہے کہ وہ بیوی کو بد کرداری سے باز رکھے۔

واضح ہو کہ جب کوئی شخص حد (سزائے شرعی) اور کفارہ سے بری ہو تو وہ سزا سے بھی بری ہوتا ہے، مثلاً وہ شخص جو خود اپنے عضو بدن کو کاٹ ڈالے، تاہم کبھی حد کے ساتھ تعزیر بھی دی جاسکتی ہے بلکہ بار بار مرتد ہونے کا جرم ہے، اسی طرح کفارہ کے ساتھ بھی سزا ہو سکتی ہے جیسے کہ ظہار (یعنی بیوی کو ماں کہہ دینے کے جرم) میں ہو سکتا ہے (کہ کفارے کے روزے بھی رکھے اور سزا بھی پائے)، جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھانے یا ماہ رمضان میں عورت سے مباشرت کرنے میں بھی یہ ہو سکتا ہے وغیرہ۔

ائمہ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ جرائم زنا، سرقہ، نشہ کے استعمال، دنگا فساد زنا کی یا قتل کی تہمت لگانے پر ”حد“ (شرعی سزا) نافذ ہوگی اور جان لینے یا اعضائے بدن کے تلف کرنے پر حکم قصاص عائد ہوگا اور مرتد ہونے پر قتل کیا جائے گا، موخر الذکر دونوں صورتوں (یعنی قصاص اور قتل) کو حد سے تعبیر کرنے کے بارے میں اختلاف ہے باقی اور بہت سے گناہ ہیں جن کے مرتکب مستوجب سزا ہیں ان سزاؤں کو بھی حد کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں اختلاف ہے، ایسے جرائم کی فہرست میں یہ امور آتے ہیں: امانت سے انکار کرنا، لواطت (عمل غیر فطری) جانور سے ملوث ہونا، کسی عورت کا جانور سے حمل رکھوانا، یا عورت کا ہم جنسی استلذاز، خون کھانا اور بغیر مجبوری کے مردار یا سور کا گوشت کھانا، جادو کے کام کرنا، شراب پینے کی تہمت لگانا، سستی کے مارے نماز ترک کر دینا، ماہ رمضان میں روزہ نہ رکھنا بدکاری کے وسائل فراہم کرنا، زکوٰۃ سے روکنا، اجنبی عورت کے ساتھ تخلیہ کرنا، یا بدکاری کے بغیر اور کسی طرح سے عورتوں کے ساتھ اختلاط کرنا یا لواطت (عمل غیر فطری) کے بغیر بے ریش لڑکوں سے خلط ملط وغیرہ۔

سزائے تازیانہ دینے کا طریقہ

حنفیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ مجرم کو کھڑا کر کے حد ماری جائے، کیونکہ جرم کے سد باب میں یہ صورت زیادہ کارگر ہے، اس سے مجرم کو زیادہ اذیت ہوتی ہے۔

متصور ہوگا، کہ وہی جملہ اقسام کی برائیوں پر سزا تجویز کرے گا تا کہ مجرموں کو ارتکاب جرم سے باز رکھا جاسکے۔

اسلامی شریعت کی جزوری کا بیان

ان احکامات سے شریعت اسلامیہ کی باریکی اور اس کی خوبی کا اظہار ہوتا ہے، اور اس سے عیاں ہوتا ہے کہ یہ احکامات خدائے دانا و برتر کی جانب سے نازل ہوئے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ مختلف احوال و ظروف میں انسانی تقاضے مختلف ہوتے ہیں چنانچہ ایک سزا جو کسی خاص طبقہ کے مناسب حال ہو وہ دوسری جماعت کے لئے جن کے طور طریقے مختلف ہوں مناسب نہیں ہو سکتی، لہذا ایسی تعزیرات کا تعین کرنا جو تمام حالات کے مطابق ہو ممکن نہیں ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے جو اپنے بندوں کے حالات سے آگاہ اور ان کے تقاضائے طبائع سے باخبر ہے سزاؤں کا تعین ارباب حکومت کو سونپ دیا ہے اور انہیں اس امر کا ذمہ دار قرار دیا ہے کہ وہ رعایا کی بہبود پر نظر رکھیں اور ہر ایسے ذریعہ کو کام میں لائیں جس سے بہتر سے بہتر طور پر لوگوں کی اصلاح ہو سکے اور مناسب سزائیں تجویز کر کے معاشرہ کو درست کیا جاسکے، تا کہ عوام امن و امان اور راحت و اطمینان سے زندگی بسر کر سکیں۔

مالکیہ اور، بموجب ایک روایت کے، حنابلہ بھی کہتے ہیں کہ مجرم کو سزا کے وقت بٹھا دیا جائے کیونکہ مارنے کا مقصد یہ ہے کہ اسے زیادہ اذیت کا احساس ہو اور یہ مقصد بٹھا کر سزا دینے سے حاصل ہوتا ہے۔

حنفیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ (سزا کے وقت) صرف تہمت لگانے کی حد (سزا) میں، مجرم کے کپڑے نہ اتارے جائیں، باقی تمام سزاؤں میں کپڑے اتار کر مارا جائے، البتہ پردہ کی جگہ ڈھکی رکھی جائے، تا کہ سزا میں شدت کے باعث جرم کے اعادہ سے باز رکھا جاسکے۔

حنابلہ کہتے ہیں کہ خواہ کوئی بھی سزا ہو کپڑے اتار کر نہ دی جائے، البتہ، پوتین، فر، اور تہ دار (یا روئی دار) کپڑے خاص طور پر اتار دیے جائیں اور ایسے لباس میں سزائے ضرب دی جائے کہ اس کی اذیت میں رکاوٹ کا باعث نہ ہو، مثلاً ایک یاد کرتے ہوں یا ایسا ہی کوئی لباس ہو، کیونکہ اس میں مجرم کو اذیت پہنچتی ہے۔

حنفیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ چہرہ، شرمگاہ، اور سر کو چھوڑ کر تمام بدن پر ضرب لگائی جاسکتی ہے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ مقام ستر، چہرہ پہلو اور کسی ایسی جگہ پر جہاں چوٹ لگنے سے موت واقع ہو جائے ضرب نہ لگائی جائے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ پیٹھ اور اس کے ملحقہ حصوں پر ضرب لگائی جاسکتی ہے، اذیت دینے کے لیے تمام اعضاء پر

جانباً ضرب لگانا واجب نہیں ہے کہ اس میں زیادہ اذیت ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں پر ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تعزیری سزاؤں کے لیے اسلام میں کوئی خاص تشریح نہیں ہے تو اس بارے میں حاکم کا جو عمل ہے آیا اسے شرعی حکم قرار دیا جائے گا یا قانونی؟ (سلسلہ احکام تعزیرات کا) یہ آخری سوال ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ جب تک آسمان وزمین قائم ہیں تمام اسلامی احکامات میں سے کوئی حکم بھی ایسا نہیں ہے جس کی سند اسلامی شریعت میں موجود نہ ہو، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جس قدر واقعات پیش آتے رہتے ہیں ان سب کی بابت فرداً فرداً نص (صراحت کتاب و سنت) موجود ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ خواہ کوئی بھی نیا مسئلہ درپیش ہو وہ لازمی طور پر شریعت اسلامیہ کے بنیادی قواعد کے تحت ہوگا۔^(۱)

ثبوت تعزیرات کی دلیل کا بیان

واضح ہو کہ تعزیر (عمومی سزا کا دیا جانا) آنحضرت ﷺ سے ثابت ہے اس بارے میں (ثبوت کے لیے) ایک ہی حدیث کافی ہے جو پہلے بیان کی گئی ہے ”لا یضرب فوق عشرة اسواط الا فی حد من حدود اللہ“ (متفق علیہ) (یعنی منجملہ حدود اللہ کے کسی حد کے بغیر دس کوڑوں سے زیادہ سزا نہ

۱۔ غرض انسانی معاشرہ کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کی بابت شریعت اسلامیہ کے اصول میں سے کسی نہ کسی اصل کے تحت حکم موجود نہ ہو، بالخصوص ایسے تعزیری احکامات میں جنہیں نافذ کرنے کی ہدایت حکومت کو دی گئی ہے کہ وہ انہیں اس طرح پر نافذ کریں جو ان کی رائے میں مناسب ہو کہ آئندہ کے لیے جرائم کا سد باب کیا جاسکے، چنانچہ روایت ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ سر راہ ناز خڑے کرتے ہوئے چل رہا ہے جس سے تکبر اور بیہودہ پن کا اظہار ہوتا ہے جو کسی شریف انسان کے شایاں نہیں ہے، آپ نے اس کی مذمت فرمائی اور اس روش کو ترک کر دینے کا حکم دیا، وہ شخص جنت کرنے لگا کہ یہ تو میری فطرت میں داخل ہے اور میں اسے ترک نہیں کر سکتا اس پر سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے دڑے لگانے کا حکم دیا، کچھ دنوں کے بعد آپ نے پھر اسے بیہودگی اور مخنث پن کا مظاہرہ کرتے دیکھا اس بار پھر آپ نے درہ لگانے کا حکم دیا، اسے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ وہ شخص آپ کی خدمت میں آیا اور اس دفعہ اس کی رفتار میں سنجیدگی اور اعتدال تھا، اس نے کہا کہ اے امیر المؤمنین اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے کہ شیطان جو مجھے چمٹا ہوا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سزا سے وہ بھاگ گیا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ انہوں نے ایک عورت کو ایسے ناشائستہ لباس میں دیکھا جو اس عورت کا کردار مشتبہ ہونے کی چغلی کر رہا تھا، آپ نے اس کی بابت دریافت فرمایا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک کنیر ہے آپ نے اسے ڈانٹا، دڑہ مارا اور دھمکایا کہ آئندہ اسے ایسی ذلیل حالت میں نہ دیکھیں، چنانچہ اس کے بعد وہ عورت ہمیشہ باوقار حالت میں نظر آئی، ایک

دی جائے)، اس حدیث میں یہ صراحت ہے کہ حاکم بغرض اصلاح سزائے ضرب دے سکتا ہے، اور اقدامات گناہ میں بھی ایسی سزا دے سکتا ہے جو اس کی رائے میں مزید ارتکاب سے مانع ہو، لیکن گناہ کے ارتکاب کی سزا کے بغیر کسی اور سزا میں دس دروں سے زیادہ نہ مارے جائیں اس کی تفصیل اوپر آچکی ہے، پھر یہ بھی ہے کہ عہد رسالت مآب ﷺ کے بعد صحابہ کبار نے مارنے، قید کرنے اور قتل کرنے تک کی سزا دی ہے اور (روایات سے) ثابت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک بار علمائے صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم اجمعین کو جمع کیا اور لواطت (عمل غیر فطری) کے بارے میں مشورہ کیا تو سب نے ایسے شخص کو آگ میں جلا کر ہلاک کر دینے کا فتویٰ دیا جو سزاؤں میں سب سے زیادہ سخت سزا تصور کی جاتی ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو معلوم ہوا کہ ایک شخص نے کسی عورت کے ساتھ طریق مباشرت کے علاوہ اور طرح سے مباشرت کی تو آپ نے اسے سو کوڑوں کی سزا دی۔^(۱)

اور حدیث میں ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک روز بازار مدینہ سے گزر رہے تھے ایک شخص کو دیکھا جس کا نام ایاس بن مسلمہ تھا جو مسلمانوں کے عین راستے میں کھڑا تھا، اور چلا چلا کر اپنے مال کی بولی لگا رہا تھا اور لوگوں کا راستہ روکے کھڑا تھا، آپ نے اپنا کوڑا اس پر اٹھا لیا وہ شخص دب گیا، امیر المؤمنین کا ارشاد مان لیا اور ٹھیک ہو گیا۔

غرض ان صورتوں میں گو کوئی حد (سزائے شرعی) مقرر نہیں ہے، لیکن حاکم اللہ تعالیٰ کی شریعت کے مطابق تعزیرات کے بارے میں تصرف کر سکتا ہے۔

۱۔ یہی حکم بیوی کی سرکشی اور خاوند کو اس کے حق زوجیت سے باز رکھنے کا ہے، بشرطیکہ وہ اس پر قادر ہو (یعنی کسی وجہ سے معذور نہ ہو)، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”والا تسی تسخافون نشوزھن فعظوھن، و اھجر وھن فی المضاجع واضربوھن“ (النساء: ۳۴) (یعنی جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہے انہیں سمجھاؤ اور بستروں پر تنہا چھوڑ دو اور بالآخر مارو) غرض شریعت نے مخالفت پر آمادہ بیوی کو سزائے ضرب کی اجازت دی ہے، اسی طرح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سرقہ تھر (کھجور کی چوری) کے بارے میں ارشاد فرمایا ”اذا كان دون نصاب غرم مثله، و جلدات نکال“ (روایت بالفاظ ابو داؤد و روایت نسائی) (یعنی اگر چرائی ہوئی کھجوریں نصاب سرقہ سے کم ہوں تو اس کے برابر ڈنڈ وصول کرو اور سرزنش کے طور پر درے لگاؤ) اور امام بیہقی رحمہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب صحیح السنن میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ”ان الامام علیاً کرم اللہ وجہہ، و رضی اللہ عنہ سئل عن رجل نيا فاسق، یا خبیث، فقال: یعزر“ (یعنی امام علی کرم اللہ وجہہ سے ایسے شخص کی بابت دریافت کیا گیا جس نے کسی کو کہا ”اے فاسق“ ”اے خبیث“ آپ نے فرمایا ایسے شخص کو سزا دو)، اور آنحضرت ﷺ سے روایت ہے کہ حضور نے فرمایا ”لا یجلد فوق عشرة اسواط الا فی حد من حدود اللہ تعالیٰ“ (یعنی اللہ کی حدود سے تجاوز کرنے کی صورت میں دس سے زیادہ کوڑے مارے جا سکتے ہیں) یہ حدیث متفق علیہ ہے اور بریدہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ

آنحضرت ﷺ نے خود اس پر عمل فرمایا اور عہد نبوی ﷺ کے بعد صحابہ رضوان اللہ علیہم نے اس پر عمل کیا اور کسی نے اس سے انکار نہیں کیا، نیز تمام ائمہ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے ایک روایت میں ہے کہ امام علی کرم اللہ وجہہ کو معلوم ہوا کہ ایک شخص کسی عورت کے ساتھ عمل غیر فطری کا مرتکب ہوا آپ نے دو کم سودرے لگائے ایک شخص جس نے اپنے نگینہ پر تصویر بنوائی تھی سو درے لگائے، اسی طرح کی روایت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ہے، غرض درہ زنی کی سزا قرآن، حدیث اور اجماع امت سے ثابت ہے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ تعزیری سزا حد زنا سے زیادہ شدید ہوتی ہے اور زنا کی سزا شراب نوشی کی سزا سے زیادہ سخت ہے اور شراب کی سزا تہمت کی سزا سے زیادہ ہے، تمام سزاؤں میں تہمت کی سزا سب سے ہلکی ہے کیونکہ تہمت کا جرم قطعی نہیں ہوتا تہمت ایک امر کی خبر (یا اطلاع) کا نام ہے جس میں سچ یا جھوٹ ہونے کا احتمال ہوتا ہے، تہمت لگانے والا سچا بھی ہو تو اپنی بات کے ثبوت میں چار گواہ پیش نہیں کر سکتا اور تعزیری کی ضربات کے زیادہ شدید ہونے کا سبب یہ ہے کہ اس سزا کا مقصد برائی سے باز رکھنا ہے اور اس میں تخفیف کی یہ صورت ہے کہ تعداد ضربات کم کر دی جائیں، اب اگر (تعداد کی کمی کے ساتھ) چوٹ بھی ہلکی کر دی جائے تو نفاذ سزا کی جو مصلحت ہے وہ فوت ہو جائے گی، کیونکہ سزا جب تک پوری طرح سے تکلیف دہ نہ ہو گناہ سے روکا نہیں جاسکتا، اسی لیے یہ اصحاب کہتے ہیں کہ سزائے ضرب کے وقت مجرم کے کپڑے اتار دیے جائیں، صرف ستر ڈھکنے کے لیے رہنے دیا جائے مثلاً کوئی تہبند (یا پا جامہ)۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ تمام سزاؤں کے اندر ضربات میں فرق نہ رکھا جائے سب ضربیں یکساں ہوں۔
شافعیہ کہتے ہیں کہ زنا کی سزا تہمت کی سزا سے زیادہ شدید ہو اور تہمت کی سزا شراب کی سزا سے زیادہ سخت ہو، کیونکہ جرم زنا دلیل قطعی سے ثابت ہوتا ہے۔

بعض وضاحتیں

علماء نے بتایا ہے کہ چند صورتیں تعزیر سے مستثنیٰ ہیں:

پہلی یہ کہ اگر (احیاناً) کسی اچھے آدمی سے کوئی جرم سرزد ہو جائے تو اس کی خطا کو معاف کیا جاسکتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے ”اقبلوا من ذوی الہینات عشر اتھم“ (ابوداؤد) (یعنی اہل ہیئات کی لغزشوں کو نظر انداز کر سکتے ہو لیکن حدود کو نہیں کر سکتے)۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ یہاں اہل ہیئات سے مراد ایسا شخص ہے جو برائی سے نا آشنا ہو لیکن اس سے لغزش سرزد ہو جائے اور اس سے وہ توبہ کر لے اور نادام ہو، اگر وہ شخص دوبارہ وہی حرکت کرے تو مستوجب سزا ہوگا۔
دوسرے یہ کہ کوئی شخص خود اپنے عضو بدن کو کاٹ ڈالے یا صورت بگاڑ لے یا آگ میں جلا لے تو اسے سزا نہ دی جائے، کیونکہ اس نے پہلے ہی خود کو عذاب میں مبتلا کر لیا ہے۔

تیسری یہ کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی یا لونڈی کے ساتھ عمل غیر فطری کا مرتکب ہو تو پہلی بار اسے سزا نہ دی جائے بلکہ آئندہ کے لیے تنبیہ کر دی جائے اگر وہ پھر یہی حرکت کرے تو اب اسے سزا دی جائے۔
یاد رہے کہ اصول یعنی باپ دادا کو فروغ بیٹے پوتوں کی حق رسی کے لیے سزا نہیں دی جائے گی۔

چوتھی یہ کہ اگر کسی نے دیکھا کہ ایک غیر شخص اس کی بیوی کے ساتھ آلودہ ہے اور وہ اسی حالت میں اسے قتل کر دے تو اگرچہ حاکم سے پیشدستی کی ہے لیکن اسے کوئی سزا نہ ہوگی بشرطیکہ وہ شخص شادی شدہ ہو کیونکہ اس شخص کی غیرت و حمیت کا جس کی شریعت نے حوصلہ افزائی کی ہے یہی تقاضا تھا۔

پانچویں یہ کہ اگر مرد پھر مسلمان ہو جائے تو سزا سے بچ جائے گا۔

چھٹی یہ کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کا نان و نفقہ دینے میں تاخیر کرے تو بہر حال وہ گنہگار ہے لیکن اس پر اسے تعزیر (سزا) نہ دی جائے۔

ساتویں یہ کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے ظہار کی قسم کھالے تو اسے سزا بھی ہوگی اور کفارہ بھی ادا کرے گا، اور اگر خاوند بیوی کے ساتھ مباشرت کر کے رمضان کا روزہ توڑ دے تو اسے صرف سزا ہوگی۔

اس امر میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ امام (حاکم) مجرم کو قید کی سزا دے سکتا ہے، بشرطیکہ اس کی رائے میں مجرم سزا پا کر جرم سے باز رہے گا، ان تمام مسائل سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلمان کے سربراہ یا اس کے نائب کو یہ حق ہے کہ جرم کے سد باب کے لیے جو سزا چاہے مجرم کو دے بلکہ اس پر واجب ہے کہ وہ ایسی مناسب سزا تجویز کرے جس سے رعایا کی تادیب و اصلاح ہو سکے، کیونکہ ہر فرد مسلم راعی (نگہبان) ہے اور اس کی رعیت (یعنی زیر اثر) کی بہبود کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اسے جواب دہ ہونا ہے، جیسا کہ حدیث رسول اللہ ﷺ میں آیا ہے، پس تمام سزاؤں میں سے ہر ایک سزا جسے حاکم مانع جرم تصور کرتا ہے اس کا فائدہ وہی ہے جو دوسرے احکام شرعیہ کا ہے اور اس بارے میں کوئی امر مابہ النزاع نہیں ہے، بالآخر معلوم ہونا چاہیے کہ جو شخص اسلامی شریعت سے آگاہ ہے، اس میں غور و فکر سے کام لیتا، اس کی حکمتوں اور اسرار سے واقفیت حاصل کرتا اور اس کے قواعد و ضوابط کو سمجھتا ہے اسے عظمت اسلام کے سامنے سر جھکانے کے سوا چارہ نہیں ہے، اسے یقین کامل ہو جائے گا کہ یہ مذہب خدا حکیم و علیم کی طرف سے آیا ہے، اسلام ان تمام قوانین کا مجموعہ ہے جو انسانی بہبود و خوش بختی کے ضامن ہیں، اس میں ہر ایسے امر کی تفصیل موجود ہے جس کے ساتھ نوع انسان کی بہبود اور ہر قسم کی خرابیوں سے نجات وابستہ ہے، درحقیقت قومی اور جماعتی خوبیوں میں سے کوئی خوبی ایسی نہیں ہے جس کی ترغیب (اسلام میں) نہ ہو اور کوئی ایسی اخلاقی یا مادی برائی نہیں ہے جس سے منع نہ کیا گیا ہو اور نوع انسان کو اس سے محفوظ نہ رکھا گیا ہو۔

اسلام کا معاشرتی نظام

واضح ہو کہ شریعت اسلامیہ کا معاشرتی نظام ایک ایسی پائیدار اور عمرانی بنیاد پر استوار کیا گیا ہے جو مدت مدید اور سالہا سال گزر جانے پر بھی بوسیدہ نہیں ہوتی، چنانچہ اسلام نے، آزاد معاشرہ میں سے ہر فرد کے تقاضائے حال کے مطابق مناسب حقوق از قسم حفظ مراتب، نفقہ، وراثت و وصیت وغیرہ مقرر فرمادیے ہیں، اولاد کو حکم ہے کہ وہ امور معصیت و گناہ سے بچتے ہوئے اپنے والدین کے ہر حکم کو بجالائیں، اور والدین کو حکم ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اچھی تربیت دیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے ”الزموا ابناءکم و علموہم الادب“ (یعنی اپنی اپنی اولاد کی تربیت کرو اور انہیں خوش اطوار بناؤ)، نیز باپ دادا اور بیٹے پوتوں کے میراث مناسب حقوق مقرر فرمائے اور میاں بیوی میں سے ہر ایک کے حقوق نیکی اور خوش اسلوبی کے پیش نظر متعین فرمائے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”ولہن مثل الذی علیہن بالمعروف“

(البقرہ: ۲۲۸) (یعنی عورتیں بھی اسی طرح حسن سلوک کی حق دار ہیں جس طرح ان پر عائد ہوتے ہیں) پھر بھائی بہنوں کے باہمی حقوق جو ایک دوسرے پر عائد ہوتے ہیں مقرر فرمادیے اس کے علاوہ صلہ رحمی اور ازدواجی رشتہ داروں سے خوش معاملگی پر زور دیا اور ان کے حقوق بتا دیے نیز پڑوسیوں اور اہل شہر کے حق بیان کر دیے اور بالآخر حاکم و محکوم (یا افسر و ماتحت) کے باہمی حسن سلوک کا بیان فرمایا اور جیسا کہ پہلے مذکور ہوا اسلام باہمی حسن سلوک اور اخلاق دستور العمل کا ایک مکمل ضابطہ ہے۔

قوانین شرعیہ کے اصول کا بیان

حقیقت یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ نے بنیادی مصالح پر مبنی جملہ مادی اور اخلاقی قاعدوں میں سے کسی کو یہاں تک کہ عادات و خصائل کو بھی جو انسانی فضائل کے ستون ہیں نظر انداز نہیں فرمایا، چنانچہ یہ تک بتا دیا ہے کہ کھانے پینے کے کیا آداب ہیں؟ اور لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت، مجلسی آداب، ملاقات، میل جول اور تمام باتیں جن کا تعلق انسان کی اپنی ذات اور دوسروں کے ساتھ برتاؤ سے ہے بیان کر دی گئی ہیں اور کوئی امر جو ظرف و احوال کے بدلتے رہنے میں پیش آ سکتا ہے نظر انداز نہیں کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو معاملہ بھی پیش آئے اس کی بابت شریعت اسلامیہ کے عام اصول سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ ﷺ کو بذریعہ الہام بتا دیا ہے کہ وہ ایسے جامع اور ہمہ رس اصول بیان فرمادیں کہ خواہ کیسا ہی معاملہ پیش آئے اسے اصول شریعت کے تحت طے کیا جاسکے۔

علامہ ابن قیم نے اپنی کتاب اعلام الموقعین میں ایسے بکثرت اصول بیان فرمائے ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے، منجملہ ان کے رسول اللہ ﷺ کے حسب ذیل ارشادات ہیں ”کل مسکر حرام“ (یعنی ہرنشہ آور شے حرام ہے) اور ”وکل عمل لیس علیہ امرنا فہورد“ (یعنی ہر ایسی بات جس کی بابت ہمارا کوئی حکم نہیں ہے وہ قابل رد ہے) اور ”کل قرض جر نفعاً فہورباً“ (یعنی جو قرض بھی نفع آور ہو وہ سود ہے) ”وکل شرط لیس فی کتاب اللہ فہو باطل“ (یعنی ہر وہ پابندی جو قرآن میں عائد نہیں کی گئی لغو ہے) اور ”کل المسلم علی المسلم حرام دمنہ و مالہ و عرضہ“ (یعنی ہر مسلمان کا خون اس کا مال اور آبرو دوسرے مسلمان پر حرام ہے) پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ”کل احد احق بمالہ من ولدہ و والدہ و الناس اجمعین“ (یعنی ہر فرد مسلم اپنے مال کا زیادہ حقدار ہے یہ نسبت اولاد، باپ اور تمام انسانوں کے) نیز ارشاد فرمایا ”کل معروف صدقہ“ (یعنی ہر نیکی صدقہ ہے) وغیرہ۔

غرض یہ تمام اصول اور اسی طرح کے اور اصول شرعیہ ایسے ہیں کہ جملہ جزئیات پیش آمدہ ان کے تحت آجاتی ہیں، اگر بالفرض کوئی جزئیہ ایسی پیش آئے جس کا جملہ اصول شرعیہ میں سے کسی اصل کے تحت لانا اہل علم کے لئے آسان نہ ہو، تو اسے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر عمل کرنا تو آسان ہے کہ ”لا ضرر و لا ضرار“ (یعنی دیکھ لو کہ وہ کام بے ضرر بھی ہے اور ضرر رساں بھی نہیں ہے)، یہاں پر ”ضرار“ کے معنی ضرر رسانی کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ مسلمان کو چاہیے کہ وہ (اپنے کسی عمل سے) دوسرے کو نقصان نہ پہنچائے۔

ہر سربراہ پر خواہ وہ حاکم ہو یا نہ ہو واجب ہے کہ وہ اپنے ماتحت کو نقصان پہنچنے سے بچائے، یعنی نہ وہ خود کسی کو نقصان پہنچائے اور نہ نقصان پہنچانے والوں سے درگزر کرے، اس میں شک نہیں کہ انسان پر سے اس قانون کی پابندی کا ہٹالینا جو تکلیف اور نقصان سے تحفظ کا ضامن ہے اس حدیث کے منافی ہے۔

باغیوں اور سرکشوں کا بیان

تفسیر و توضیح:

اس مسئلہ کی بنیاد حدیث ہے جو حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قبیلہ عرینہ کے کچھ لوگ مدینہ آ کر بوجہ ناسازگاری آب و ہوا بیمار ہو گئے رسول اللہ ﷺ نے مال صدقہ میں سے ایک اونٹنی مع چرواہے کے انہیں بھیجی اور حکم دیا کہ اس کا پیشاب اور دودھ پئیں انہوں نے ایسا ہی کیا اور صحت یاب ہو گئے اور اس کے بعد دین اسلام سے پھر گئے (مرتد ہو گئے) اونٹ چرانے والے کو قتل کر دیا اور اونٹ کو چلتا کیا، رسول اللہ ﷺ نے ان کے تعاقب میں آدمی بھیجا اور انہیں واپس لایا گیا، ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ دیے گئے اور آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی، اور دھوپ میں ڈال دیا گیا (روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے بھی چرواہے کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا تھا) حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ان میں سے ایک شخص کو دیکھا کہ شدت تشنگی سے زمین پر منہ مار رہا تھا اور اسی حالت میں مر گیا، تب اللہ تعالیٰ کا یہ حکم نازل ہوا "انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ ویسعون فی الارض فسادا ان یقتلوا، او یصلبوا، او تقطع ایدیہم وارجلہم من خلاف، او ینفوا من الارض ذلک لہم خزی فی الدنیا، ولہم فی الآخرة عذاب عظیم" (المائدہ: ۳۳) (یعنی خدا اور رسول سے سرکشی کرنے والوں اور زمین پر فساد برپا کرنے کی کوشش کرنے والوں کی سزا یہ ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے یا سولی دے دی جائے یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ دیے جائیں یا انہیں زمین کے فیض سے محروم کر دیا جائے) (یعنی قید میں رکھا جائے) اس طرح دنیا میں ان کی رسوائی ہوگی اور آخرت میں سخت عذاب سے دوچار ہوں گے۔

حضرت عکرمہ، حسن بصری اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ یہ آیت مشرکین کے بارے میں ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ اہل کتاب کے اس گروہ کے بارے میں ہے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ (عدم جارحیت کا) عہد و پیمان کر رکھا تھا، لیکن وہ عہد توڑ دیا اور علاقہ میں فساد برپا کیا تب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو یہ اختیار دیا کہ وہ چاہیں تو انہیں قتل کر دیں یا ان کے دائیں ہاتھ اور بائیں پاؤں کاٹ دیں، (بروایت ابن جریر) اور صحیح بات یہ ہے کہ آیت ایک عام حکم ہے جو مشرکوں اور غیر مشرکین میں سے ہر ایسے شخص کے بارے میں ہے جو ایسی بدکرداریوں کا مرتکب ہو جن کا ذکر حدیث بخاری و مسلم میں آیا ہے، اس کو ابو قلابہ نے جن کا نام عبد اللہ بن زید الجری البصری ہے انس بن مالک سے روایت کیا ہے کہ: "ان نفرا من عکل ثمالیۃ قدموا علی رسول اللہ ﷺ، فبايعوه علیہ الا سلام فاستوحثوا المدینۃ وسممت اجسادہم فشکوا الی رسول اللہ ﷺ ذلک فقال: الا تخرجون مع راعینا فی اہلہ فتصیبوا من ابوالہا والبانہا؟ فقالوا: بلی فخرجوا فشربوا من ابوالہا والبانہا فصحبوا فقتلوا الراعی وطر دوا الابل، فبلغ ذلک رسول اللہ ﷺ فبعث فی آثارہم

فادر کوا فجیء بهم، فامر بهم فقطعت ایدیہم وارجلہم وسمرت اعینہم، ثم نبذوا فی الشمس حتی ماتوا“ (اللفظ مسلم) (یعنی قبیلہ عکل کے کوئی آٹھ اشخاص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام پر حضور ﷺ سے بیعت کی، مدینہ انہیں موافق نہ آیا وہ گھبرائے اور جسمانی مرض میں مبتلا ہو گئے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کی بابت شکایت کی فرمایا، کیا ایسا نہیں کر سکتے کہ ہمارے چرواہے کے ساتھ اونٹنی کو لے جاؤ اور اس کے پیشاب اور دودھ کا استعمال کرو؟ انہوں نے مان لیا اور لے کر چلے گئے اس پیشاب اور دودھ کو پیا اور صحت یاب ہو گئے، اس کے بعد انہوں نے چرواہے کو قتل کر دیا اور اونٹنی کو بھگا دیا، اس کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو پہنچی، حضور نے ان کے پیچھے آدمی بھیجا وہ پکڑے گئے اور حضور کے پاس لائے گئے آپ کے حکم سے ان کے سیدھے ہاتھ اور بانیں پاؤں کاٹ دیے گئے، اور آنکھ میں گرم سلائی پھیر دی گئی اور دھوپ میں ڈال دیا گیا یہاں تک کہ مر گئے) یہ روایت بالفاظ مسلم ہے۔ آیت مذکورہ کا نام آیت محاربہ ہے محاربہ کے معنی باہمی ضد اور مخالفت کے ہیں، کافر، ڈاکو اور راہ زن سب اس کے مصداق ہیں، اسی طرح ”الافساد فی الارض“ (یعنی زمین کے اندر فساد پھیلانے) کا اطلاق ہر طرح کی مذموم حرکت پر ہوتا ہے، یہاں تک کہ بیشتر اسلاف نے جن میں سعید بن مسیب بھی ہیں فرمایا ہے کہ ملک میں گڑبڑ پھیل کر درہم و دینار (یا روپیہ پیسہ) بٹورنا بھی فساد برپا کرنا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”اذا تولى سعى فى الارض ليفسد فيها ويهلك الحراث والنسل والله لا يحب المفسدين“ (البقرة: ۲۰۵) (یعنی جب حکومت مل جاتی ہے تو حکمران زمین کے اندر فساد پھیلانے میں لگ جاتا ہے اور کھیتوں کو برباد اور جانوروں کی نسل ختم کرنے لگتا ہے، اللہ تعالیٰ اس فساد انگیزی کو پسند نہیں کرتا)۔

”ذلک لہم خزی فی الدنیا“ (کے معنی یہ ہیں کہ یہ جو ایسے اشخاص کو قتل کرنے، سولی دینے، ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹنے اور یا ملک بدر کرنے کا ذکر ہے) یہ امور ابنائے نوع کے درمیان ان کی ذلت و رسوائی، شرمساری بے عزتی اور بد حالی و اذیت کا موجب ہوگا اور یہ تو سردست دنیا کی سزا ہے اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے قیامت کے روز ان کے لیے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے، اس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ یہ آیت مشرکین کے حق میں نازل ہوئی، رہے اہل اسلام سوان کی بابت صحیح مسلم میں عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ ”اخذ علینا رسول اللہ ﷺ کما اخذ علی النساء الا نسرک باللہ شیئاً، ولا نسرق، ولا نزنی، ولا نقل اولادنا، ولا یعضہ بعضنا بعضاً، فمن وفی منکم فاجرہ علی اللہ تعالیٰ، ومن اصاب من ذلک شیئاً فعوقب بہ فهو کفارة لہ، ومن سترہ اللہ فامرہ الی اللہ ان شاء عذبه، وان شاء عفا عنه“ (یعنی رسول اللہ ﷺ نے ہم مردوں سے عہد لیا اور اسی طرح عورتوں سے بھی کہ ہم کسی کو اللہ کا شریک نہ بنائیں گے، چوری نہ کریں گے، زنا نہ کریں گے، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے ایک دوسرے کی بدگوئی نہ کریں گے، پس اے لوگو! جو کوئی تم میں سے اس عہد کو پورا کرے گا اللہ تعالیٰ اس کا اجر ضرور دے گا اور اگر ان باتوں میں سے کسی کا ارتکاب کیا اور اس کی سزا مل گئی تو یہ اس کے گناہ کا کفارہ ہوگا اور اگر کسی کے گناہ کو اللہ ہی چھپا دے تو اس کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے، چاہے تو اسے عذاب دے اور چاہے معاف فرما دے)۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”من اذنب ذنباً فی الدنیا فعوقب بہ، فاللہ اعدل من ان یثنی عقوبتہ علی عبدہ، ومن اذنب ذنباً فی الدنیا فسترہ اللہ علیہ، وعفاهنہ فاللہ اکرم من ان یعود علیہ فی شئ قد عفا عنہ“ (بروایت امام احمد و ترمذی و ابن ماجہ) (یعنی جس نے کوئی گناہ دنیا میں کیا اور اسے سزا مل گئی تو اللہ تعالیٰ کا عدل اس سے بالاتر ہے کہ وہ اپنے بندے کو دوبارہ سزا دے۔ اور جس نے کوئی گناہ دنیا میں کیا اور اللہ نے اس کے گناہ پر پردہ ڈال دیا اور اسے معاف کر دیا تو اللہ کا کرم اس سے بالاتر ہے کہ معاف کردہ خطا پر دوبارہ عذاب دے) امام ترمذی رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن اور غریب ہے، حافظ دارقطنی سے اس حدیث کی بابت دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ حدیث مرفوع اور موقوف دونوں طرح سے روایت کی گئی ہے، تاہم وہ فرماتے ہیں کہ صحیح بات یہ ہے کہ اسے ’مرفوع‘ قرار دیا جائے (یعنی اس کے راویوں کا سلسلہ آنحضرت ﷺ تک پہنچتا ہے کہیں یہ سلسلہ ٹھہرتا نہیں ہے جسے حدیث موقوف کہتے ہیں)۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”الا الذین تابوا من قبل ان تقدروا علیہم“ (المائدہ: ۳۴) (یعنی جو لوگ (مجرم) گرفتار ہونے سے پہلے اس گناہ سے توبہ کر لیں وہ اس سزا سے بچ رہیں گے) پس ان لوگوں کی رائے کے مطابق جو یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت مشرکوں کے بارے میں ہے تو آیت کا حکم ظاہر ہے (یعنی توبہ کے بعد باز پرس نہ ہوگی) رہا مسلمان محاربوں (سرکشوں) کا معاملہ سوا گرایے لوگ (یعنی مسلمان فساد انگیز اشخاص) اگر گرفتار ہونے سے پہلے توبہ کر لیں تو قتل، سولی اور پاؤں کاٹنے کی سزا ان پر عائد نہ ہوگی، رہا یہ کہ ہاتھ کاٹنے کی سزا کا حکم بھی ساقط ہو جائے گا یا نہیں؟ اس بارے میں دو رائے ہیں لیکن از روئے آیت زیادہ قوی رائے یہ ہے کہ تمام ہی سزائیں ساقط ہو جائیں گی، صحابہؓ نے اسی پر عمل فرمایا ہے امام شعبیؒ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ ”جاء رجل من مراد الی ابی موسیٰ وهو علی الکوفۃ فی امارۃ عثمان رضی اللہ عنہ، بعد ما صلی المکتوبۃ فقال: یا ابا موسیٰ هذا مقام العائد بک انا فلان بن فلان المرادی واذکنت حاربنت اللہ ورسولہ وسعیت فی الارض فساداً، وانی تبت قبل ان تقدروا علی، فقام ابو موسیٰ فقال: ان هذا فلان بن فلان وانه کان حارب اللہ ورسولہ، وسعی فی الارض فساداً، وانه تاب من قبل ان نقدر علیہ فمن لقیہ فلا یعرض لہ الا بخیر، فان یک صادقاً فسبیل من صدق، وان یک کاذباً تدرکہ ذنوبہ، فقام الرجل ماشاء اللہ ثم انه خرج فادرکہ اللہ تعالیٰ بذنوبہ فقتلہ“۔ (یعنی مراد کا ایک شخص ابو موسیٰ کے پاس آیا اور وہ عہد عثمان رضی اللہ عنہ میں کوفہ کے حاکم تھے فریضہ صلوٰۃ ادا کرنے بعد اس نے کہا اے ابو موسیٰ یہاں پر میں آپ کی پناہ مانگنے آیا ہوں، میں فلاں بن فلاں مرادی ہوں، میں نے اللہ اور اس کے رسول سے سرکشی کی اور زمین پر فساد پھیلاتا رہا لیکن قبل اس کے کہ میں گرفتار ہوتا میں نے توبہ کر لی ہے، ابو موسیٰ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ یہ شخص فلاں بن فلاں ہے اس نے اللہ اور اس کے رسول سے سرکشی کی اور زمین میں فساد پھیلانے پر تیار رہا لیکن قبل اس کے کہ اسے گرفتار کیا جاتا اس نے توبہ کر لی ہے لہذا جو شخص اس سے ملے بھلائی سے اس کے ساتھ پیش آئے، اگر وہ سچا ہے تو اس کا راستہ کھلا ہے، اگر جھوٹا ہے تو اپنے گناہ میں پکڑا جائے گا اس کے بعد مشیت الہی سے وہ شخص اٹھا اور باہر آیا، اللہ نے اس کے گناہوں میں اسے پکڑا اور قتل ہوا)۔

رہزوں کے متعلق احکامات کا بیان

ائمہ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ جو شخص عام گزرگاہوں پر نکل آئے ہتھیار اٹھالے اور مسافروں کو خوف زدہ کر دے، خواہ وہ آزاد ہو یا غلام مسلمان ہو یا ذمی یا پناہ گیر یا برسر جنگ تو وہی محارب (سرکش آمادہ حرب) ڈاکہ مارنے والا ہے اور اس پر وہی احکام نافذ ہوں گے، جو محارب (دشمن جنگجو) پر ہوتے ہیں، اگرچہ وہ تنہا ہو، اور اس پر بھی سب متفق ہیں کہ ایسے محاربین میں سے کوئی شخص اگر قتل کر دے اور مال لوٹ لے تو اس پر حد (شرعی سزا) کا نفاذ واجب ہے، اگر مقتول کے ورثاء معاف کر دیں اور لوٹا ہوا مال چھوڑ دیں تو جہاں تک حد (سزا) کا تعلق ہے اس پر اس معافی کا کوئی اثر نہ ہوگا، اگر ان ڈاکوؤں میں سے کوئی گرفتار ہونے سے پہلے مر جائے تو سزا ساقط ہو جائے گی کیونکہ شرعی سزائیں اللہ عزوجل کا حق ہیں، البتہ بندوں کے حقوق جو جانی، مالی اور جراحت رسانی کے باعث لازمی ہوں گے ان کا مطالبہ برقرار رہے گا، تا آنکہ اسے معاف نہ کیا جائے۔

حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ ڈاکوؤں پر اسی ترتیب سے حد نافذ ہوگی جیسا کہ آیت شریفہ میں مذکور ہے، اب اگر رہزوں کا گروہ یا فرد واحد جو راستہ روک سکتا ہو رہزنی کے ارادے سے نکل پڑے اور قبل اس کے کہ مال کو لوٹ سکتا یا کسی کو قتل کر سکتا گرفتار ہو جائے تو امام (حاکم وقت) ایسے ڈاکوؤں کو قید میں رکھے گا یہاں تک کہ وہ توبہ کریں، یہاں قید سے مراد قید بامشقت ہے، اگر ڈاکوؤں نے کسی مسلمان یا ذمی (غیر مسلم رعایا) کا مال لوٹا اور اپنے ساتھیوں میں تقسیم کیا اور ہر ایک کو دس درہم یا اس سے زیادہ رقم ملی یا اسی مالیت کا مال ملا تو حاکم ان کے دائیں ہاتھ اور بائیں پاؤں کٹوا دے گا، اگر انہوں نے قتل کیا اور مال نہیں لوٹا تو انہیں حد کے طور پر قتل کیا جائے گا اور مقتول کے وارثوں کے معاف کرنے سے سزائے قتل ساقط نہ ہوگی۔

واضح ہو کہ رہزوں کو محاربوں میں شمار کیا گیا ہے اور بیابانوں میں مال کا محافظ اللہ ہوتا ہے، اگر ڈاکوؤں نے مال زبردستی چھینا ہے تو وہ محارب قرار پائیں گے، اگر انہوں نے قتل بھی کیا اور مال بھی لوٹا تو امام (حاکم) کو اختیار ہوگا کہ وہ چاہے تو ان کے دائیں ہاتھ اور بائیں پاؤں کاٹ دے یا انہیں قتل کر دے یا سولی دے کر ہلاک کرے دونوں سزائیں ایک ہی ہیں، جرم کی شدت کے اعتبار سے سزائیں بھی سختی ہوگی، چنانچہ قتل کرنا اور مال لوٹنا انتہائی بدامنی ہے، پس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ سزا کو چاروں حالتوں میں تقسیم کیا جائے (یعنی محض قتل، ڈاکہ، محض لوٹ مار دونوں اور یا اس سے پہلے گرفتاری)۔

مالکیہ رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ محارب وہ ہے جو راستہ روک دے اگرچہ مال لوٹنے کا ارادہ نہ ہو بلکہ مسافروں کو سفر کے فائدے سے محروم کرنا چاہتا ہو، یا کسی ناجائز طریقہ سے ایک مسلمان یا ذمی یا معاہدہ کا مال ہتھیانا چاہتا ہو، گو وہ مال نصاب سرقہ کے برابر نہ ہو یا پھر کسی کی آبروریزی کا اس طرح ارادہ رکھتا ہو کہ اس کی فریاد نہ کی جاسکے اور چھٹکارا ممکن نہ ہو، اس میں وہ جابر و ظالم حاکم بھی شامل ہیں جو اس طرح استحصال کرتے ہوں کہ اس کی فریاد علماء یا کسی اور سے نہ کی جاسکے، یہ سب لوگ محارب ہیں، محارب قرار دیے جانے کے لیے گروہ کا ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ ایک فرد واحد کو بھی محارب قرار دیا جاسکتا ہے جو شہر کا باشندہ ہو اور کسی کو اذیت دینے پر تلا ہوا ہو، اس کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ عوام کو اذیت دے اسی میں وہ شخص بھی آتا ہے جو کسی کی عقل زائل کر دینے کا عمل کرتا ہو، مثلاً کسی کا مال جبر و ظلم سے اڑالے جانے کے لیے بھنگ یا

دھتور ابلادے اور وہ بھی محارب ہے جو کسی صاحب تمیز شخص (ہوش و حواس والے) کو اس کا مال ہتھیانے کے لیے فریب دے، خواہ یہ شخص لڑکا ہو یا بالغ اسے دھوکے سے کہیں پر لے جا کر اس کا مال لے لے، گو قتل نہ کرے یا کسی جنگ گلی کوچہ یا گھر میں رات کو یا دن کے وقت داخل ہو کر اس کا مال چھیننے کے لیے اس پر حملہ کر دے بایں طور کہ اس کے خلاف نہ کوئی مدد کر سکے اور نہ چیخ پکار کر سکے اور نہ کوئی مدد حاصل کی جاسکے یہاں تک کہ مار پیٹ کر مال لے جائے تو وہ بھی محارب ہے اگر یہ محارب جنگ میں پیش دستی نہ کرے تو پوچھ گچھ کے بعد اسے قتل کیا جائے اگر محارب نے قتل کیا ہے تو اسے قتل کا مجرم قرار دیا جائے گا خواہ وہ قتل مستوجب قصاص ہو جیسے کسی آزاد مسلمان کا قتل کرنا یا نہ ہو جیسے کافر یا غلام کا قتل۔ اس محارب کو بہر حال قتل کیا جائے گا۔ سولی دے کر یا بغیر سولی کے، محض ہاتھ کاٹنا یا قید کرنا کافی نہیں ہے، بشرطیکہ اس نے توبہ نہ کی ہو، اگر محارب نے کسی کو قتل نہیں کیا اور گرفتار ہو گیا تاہم حاکم کو اختیار ہے کہ ان چار قسم کی سزاؤں میں سے کوئی بھی سزا دے، اول قتل دوسرے سولی پر چڑھانا، جسے مصلوب کرنا کہتے ہیں، تیسرے دائیں ہاتھ کو پہنچوں سے اور بائیں پاؤں کو ٹخنوں سے کاٹ دینا، اگر اس کا بایاں پاؤں کٹا ہوا ہو تو بایاں ہاتھ اور داہنا پاؤں کاٹا جائے، اگر چہ وہ اس سے مر جائے، اگر مجرم کا داہنا ہاتھ کٹا ہوا یا شل (ناکارہ) ہو تو بایاں ہاتھ اور داہنا پاؤں کاٹا جائے گا صرف ایک ہاتھ یا ایک پاؤں ہو تو وہ کاٹ دیا جائے، اگر کسی کے صرف دو ہاتھ یا دو پاؤں ہیں تو صرف دایاں ہاتھ یا بایاں پاؤں کاٹا جائے اور چوتھی سزا یہ ہے کہ مرد آزاد مجرم کو فذک اور خیر جیسی جگہ پر جلا وطن کر دیا جائے اور ایک سال سے زیادہ اور توبہ کر لینے تک قید میں رکھا جائے اور حاکم اگر مناسب سمجھے تو ایسے اشخاص کی تنبیہ کے لیے اپنی رائے کے مطابق جلا وطن کرنے سے پہلے سزائے ضرب دے۔

واضح ہو کہ محاربہ بر (ڈاکہ مارنے والی) اگر عورت ہو تو اسے نہ سولی دی جائے گی اور نہ جلا وطن کیا جائے گا۔ اس کی سزا صرف قتل یا مختلف سمتوں سے ہاتھ پاؤں کاٹنا ہے۔ اگر مجرم غلام ہے تو اس کی سزا قتل ہے یا سولی دینا یا ایک ہاتھ یا ایک پاؤں کاٹنا ہے، اسے جلا وطن نہیں کیا جائے گا۔

شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ قطع طریق (یار ہزنی) کہتے ہیں، مال کو لوٹنے قتل کرنے یا (رہروں کو) ہیبت زدہ کرنے کے لیے زبردستی اور طاقت کے بھروسے پر تل جانے کو، جہاں سے کسی کی فریاد نہ سنی جاسکے، اس کو راہ زنی اس لیے کہتے ہیں کہ اس سے لوگوں کو خوف زدہ کر کے اس راستے پر گزرنے سے روکا جاتا ہے، خواہ اس کے پاس ہتھیار ہوں یا نہ ہوں، ہاں ان میں اتنی طاقت ہو کہ ایک جماعت پر غالب آسکیں خواہ تھپڑ اور مکے ہی سے ممکن ہو، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ (رہزنی قرار دینے کے لیے) مجرم کا ہتھیار بند ہونا ضروری ہے، اگر رہزن (ڈاکو) کسی کو قتل کرنے، مال لوٹنے یا آبروریزی سے پہلے ہی گرفتار ہو جائے تو امام (حاکم) پر واجب ہے کہ اس جرم کے ارتکاب پر یعنی حرب (شورش) کی پاداش میں اسے سزائے قید دے، اس پر حد یا کفارہ عائد نہ ہوگا، آیت کریمہ (کے لفظ ینفو) میں جو نفی (قید) کا ذکر آیا ہے اس کی تفسیر یہی ہے اور سزا کی تجویز کا اختیار امام (حاکم وقت) کو ہے، چنانچہ جائز ہے کہ سزائے قید و ضرب دونوں کو جمع کر دے، اور بقاضائے مصلحت اس سے درگزر بھی کر سکتا ہے نیز قید کی کوئی میعاد مقرر نہیں ہے بلکہ جب تک اس کی توبہ پایہ ثبوت کو نہ پہنچے وہ قید میں رکھا جاسکتا ہے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قید کی میعاد چھ ماہ سے کسی قدر کم ہونی چاہیے تاکہ غلام کو ارتکاب زنا کی پاداش میں جو سزائے قید دی جاتی ہے اس کی میعاد سے زیادہ نہ ہو۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قید کی میعاد ایک

سال سے کچھ کم ہونی چاہیے تاکہ آزاد شخص کو زنا کی پاداش میں جو قید ہوتی ہے اس سے زیادہ نہ ہو، اور بہتر یہ ہے کہ مجرم کو اس کی رہائش گاہ (یا بستی) کے علاوہ کسی اور جگہ پر قید کیا جائے کیونکہ اس میں زیادہ احتیاط ہے اور تنبیہ کے لیے زیادہ مؤثر ہے، اگر مجرم بھاگے تو اسے طلب کر کے حد نافذ کی جائے۔

حنابلہ کی دو روایتوں میں سے ایک کے بموجب اگر ڈاکو قتل کرنے یا مال لوٹنے سے پہلے گرفتار ہو جائے تو اسے زمین کے فوائد سے محروم (یعنی قید) کر دیا جائے اس کی صورت یہ ہے کہ کسی بستی میں پناہ لینے کا موقع نہ دیا جائے، اگر ڈاکوؤں نے مال لوٹا ہو اور کسی کو قتل نہ کر سکے ہوں تو امام (حاکم) ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں کے کاٹ کر چھوڑ دے، داہنا ہاتھ تو مال لوٹنے کی پاداش میں کاٹا جائے گا اور بائیں پاؤں فساد برپا کرنے، ڈاکہ ڈالنے اور پرامن شہریوں میں ہراس پیدا کرنے اور حکومت کے خلاف سرکشی کرنے کی پاداش میں کاٹا جائے گا، اگر انہوں نے قتل بھی کیا اور مال بھی لوٹا تو لازمی طور پر انہیں قتل کیا جائے اور سولی پر لٹکایا جائے، اگر قتل کیا اور مال نہیں لیا تو انہیں لازمی طور پر قتل کیا جائے گا۔

مجرم کو سولی پر قتل کے بعد لٹکایا جائے گا، اس کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ تین دن تک سولی پر لٹکا کر رکھا جائے، بلکہ سولی دینے کا اطلاق ہو جانا کافی ہے لہذا تھوڑی دیر کے لیے سولی پر لٹکا کر چھوڑ دیا جائے، کیونکہ سولی کی سزا مشروع ہے اور سولی کے وقت الثانیہ لٹکایا جائے۔

حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ رہزنوں کے ہاتھ پاؤں کو مخالف سمتوں سے کاٹے جانے کے لیے شرط یہ ہے کہ انہوں نے مال لوٹا ہو اور ان میں سے ہر ایک کو اس قدر مال ملا ہو جو نصاب سرقہ واجب الحد کی مقدار کے برابر ہو یہ مقدار امام ابوحنیفہ کے نزدیک ایک دینار یا دس درہم نقد یا اسی قیمت کا مال ہے اور حنابلہ و شافعیہ کے نزدیک ایک چوتھائی دینار یا تین درہم ہے جیسا کہ سرقہ مستوجب قطع میں ہوتا ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ ڈاکہ مارنے کی صورت میں (مستوجب سزا ہونے کے لیے) یہ ضروری نہیں ہے کہ لوٹ کا مال مقدار نصاب کے برابر ہو بلکہ اگر (لوٹا ہوا مال) مقدار نصاب سے کم ہو تب بھی ان پر حد نافذ ہوگی کیونکہ ڈاکہ ڈالنے میں مال لینے کے علاوہ محاربہ (فساد انگیزی) کا جرم بھی شامل ہے، لہذا ان پر سزا کی شدت بحیثیت ڈاکہ ڈالنے کے ہے نصاب سرقہ کے پیش نظر نہیں ہے۔

ڈاکوؤں کے جتھے کا بیان

حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ محاربوں (ڈاکوؤں) کا ایک جتھا ہو اور ان میں سے کچھ لوگ تو لوٹ مار کرنے والے ہوں اور کچھ مرتد ہوں تو مرتدوں کو بہر حال محاربوں میں شمار کیا جائے گا اس لیے کہ ان میں حربی ہونے کی صفت (ارتداد) موجود ہے جو (مستوجب سزا ہونے کے لیے) کافی ہے خواہ وہ قتل میں شریک ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں، پس ان سب پر حد کا نفاذ ہوگا، جو محاربہ (شورش انگیزی) کی سزا ہے اور یہ اس طرح ثابت ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے معاون ہیں، یہاں تک کہ اگر ان کے ارادہ میں کوتاہی ہو تو اس کو پورا کرنے کے لیے سب مل کھڑے ہوں گے، اور ان (سب کے واجب القتل ہونے) کے لیے شرط یہ ہے کہ ان میں سے کسی بھی فرد واحد کا ارتکاب قتل ثابت ہو گیا ہو، اب یہ قتل خواہ لاشی سے ہو یا پتھر سے یا تلوار سے، سب کا حکم ایک ہے، کیونکہ ان سب نے راہ رکولوٹ کر رہزنی کا جرم کیا ہے۔

روایت ہے کہ یہ واقعہ ولید بن عقبہ کے عہد میں جبکہ وہ کوفہ کے حاکم تھے پیش آیا کہ کوفہ کے نو جوانوں کی ایک جماعت نے وہاں کے ایک شخص کے گھر میں نقب لگائی اور اسے قتل کر دیا اس کا ایک پڑوسی وقوعہ کے وقت وہاں پہنچ گیا اور انہیں دیکھ لیا اس نے پولیس کو پکارا جس نے آکر انہیں گرفتار کر لیا، ان کا معاملہ حاکم کے پیش ہوا اور ان پر جرم قتل ثابت ہو گیا چنانچہ وہ سب قتل کر دیے گئے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ڈاکوؤں سے مل گیا جس سے ان کی تعداد زیادہ ہو گئی لیکن نتیجہ اتنی ہی رہی بایں طور کہ اس نے مقدار نصاب سرقہ کے برابر مال نہیں لیا اور کسی کو قتل بھی نہیں کیا تب بھی حکومت اسے قید یا جلا وطنی وغیرہ کی سزا دے گی جیسا کہ دوسرے جرائم میں ہوتا ہے۔ نیز حدیث میں آیا ہے ”من کثر سواد قوم فہو منہم“ (یعنی جس نے کسی جماعت میں شامل ہو کر اس کی تعداد میں اضافہ کر دیا، وہ اسی جماعت میں شامل متصور ہوگا) پس حکومت مذکورہ سزاؤں میں سے جو کسی سزا بھی چاہے انہیں دے سکتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ان کی سزا ایک جگہ پر جہاں حاکم مناسب سمجھے قید کر دینا ہے کیونکہ آیت میں ان کے لیے نفی (قید) کی سزا آئی ہے۔

شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ شہر میں ڈاکہ ڈالنا بھی ایسا ہی جرم ہے جیسے شہر کے باہر ہزنی کرنا پس محاربہ (یعنی شورش برپا کرنا) یا حدود سے تجاوز کرنا جیسا کہ شریعت میں آیا ہے، خواہ شہر سے باہر ہو یا شہر کے اندر دوسرے گناہوں کی طرح یکساں ہے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ ڈاکہ کا جرم اسی وقت مانا جائے گا جبکہ شہر سے باہر کا وقوعہ ہو، کیونکہ ہزنی کا اطلاق آبادی سے باہر کے وقوعہ پر ہوتا ہے اور ڈاکہ ڈالنے کا مطلب بالعموم یہی سمجھا جاتا ہے کیونکہ عام حالات میں وہی ایسی جگہ ہے جہاں کوئی فریادری کرنے یا ڈاکوؤں سے نجات دلانے والا نہیں ہوتا، بخلاف اس کے اگر کسی نے شہر کے اندر ڈاکہ ڈالا تو وہاں بہت سے لوگ فریادری کرنے والے موجود ہوتے ہیں لہذا شہر کے اندر یہ جرم (ڈاکہ کی بجائے) جرم غصب (نا جائز طور پر ہتھیا لینے) سے زیادہ مشابہ ہے، پس ایسے شخص کو حکومت جو سزا مناسب سمجھے دے سکتی ہے جس سے ان جرائم کی بیخ کنی اور ان کا سد باب ہو سکے، پھر وہ مال جو چھینا گیا ہے اس کے حقداروں کو واپس کر دیا جائے تاکہ حقدار کو اس کا حق مل جائے اور اس جرم مستوجب قطع کے مرتکبوں کی تنبیہ و تادیب ہو سکے، اور اگر وہ قتل کے مرتکب ہوئے ہوں تو مطالبہ خون کا معاملہ حقداروں کے سپرد کر دیا جائے۔

ڈاکوؤں کا کسی شخص کو زخمی کر دینے کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر ڈاکوؤں نے قتل نہیں کیا اور نہ مال چھینا بلکہ کسی کو زخمی کر دیا تو جن صورتوں میں قصاص واجب ہے، قصاص لیا جائے اور جن صورتوں میں جرمانہ عائد ہوتا ہے جرمانہ وصول کیا جائے اور یہ معاملہ مجروح کے وارثوں کا ہے، کیونکہ بصورت موجودہ وہ جرم مستوجب حد نہیں ہے (جو حقوق اللہ میں سے ہے) البتہ اس میں بندہ کا حق غالب ہے، جیسا کہ ذکر ہوا، پس ولی اپنا وہ حق وصول کرے گا، اگر مجرم نے مال لیا پھر زخمی بھی کیا تو مجرم کے ہاتھ اور پاؤں کاٹے جائیں گے، اور جراحت کو نظر انداز کر دیا جائے گا، کیونکہ جب جرم مستوجب حد جو اللہ تعالیٰ کا حق ہے قرار پائے تو

عصمت نفس جو بندے کا حق ہے نظر انداز کر دیا جائے گا، اسی طرح مال کا حق تحفظ بھی ساقط ہو جاتا ہے (یعنی حق اللہ پورا کرنے کے بعد نہ بندے کی جان کا حق باقی رہتا ہے نہ مال کا)۔

اگر مجرم قتل عمد کا مرتکب ہوا اور اس نے توبہ کر لی اس کے بعد گرفتار ہو گیا تو اب مقتول کے وارثوں کو اختیار ہے کہ چاہیں تو اسے قتل کر دیں اور چاہیں تو معاف کر دیں کیونکہ توبہ کرنے کے بعد (حق اللہ جاتا رہتا ہے اور) 'حد' نافذ نہ ہو گی قرآن میں اس کی استثناء آئی ہے "الا اللہین تابوا من قبل ان تقبذوا علیہم" (یعنی ان لوگوں پر حد نافذ نہ ہو گی جنہوں نے گرفتار ہونے سے پہلے توبہ کر لی) اور اس لئے بھی کہ توبہ مال (سروقتہ) کے واپس کرنے پر موقوف ہے جس کے بعد سزائے قطع نہیں ہوتی، غرض جان و مال کے بارے میں بندے کے حق کو فوقیت حاصل ہے، یہاں تک کہ ولی کو یہ حق ہے کہ پورے قصاص کا مطالبہ کرے یا معاف کر دے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر ڈاکہ ڈالنے والے نے قتل کا ارتکاب کیا ہو تو سزائے قصاص کے مفہوم کو فوقیت حاصل ہو گی، کیونکہ ایسی صورتوں میں جہاں اللہ کا حق اور بندے کا حق دونوں مجرم پر عائد ہوتے ہوں تو آدمی کے حق کو مقدم رکھا جائے گا کیونکہ یہ اس سختی کی بناء پر عائد ہوتا ہے جو مدعی جھیلتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ رہزن پر جو حد عائد ہوتی ہے اس کا مطلب اللہ تعالیٰ کا حق ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کی معافی نہیں ہوتی اور وارث مطالبہ نہ کرے تب بھی حکومت اسے پورا کرے گی۔ پس پہلی صورت میں (جبکہ سزا کا مطالبہ بندے کا حق تصور کیا جائے) باپ اگر ڈاکو ہو اور اپنے بیٹے کو (بدور ان رہزنی) قتل کر دے تو باپ کو قتل نہیں کیا جائے گا اور نہ ذمی کے قتل کر دینے پر مسلمان ڈاکو کو قتل کیا جائے اسی طرح ایسی صورت میں یہ حکم ہے جس میں مکافات (یعنی جرم کا بدلہ ویسی ہی سزا) نہ ہو جیسے کوئی آزاد شخص غلام کو قتل کر دے، کیونکہ اس میں مکافات نہیں ہے بلکہ دیت یا (غلام کی) قیمت واجب الادا ہوگی، دوسری صورت میں (جبکہ سزا کو اللہ کے حق کی ادائیگی تصور کیا جائے) قاتل کو سزائے قتل ہوگی بشرطیکہ مقتول واجب التحفظ نہ ہو مثلاً کوئی مرتد ہو یا شادی شدہ زانی (کہ ایسے اشخاص واجب القتل قرار دیے جا چکے ہوتے ہیں) ان کے قاتل (رہزن) کو سزائے قتل نہ ہوگی۔

اگر کسی ڈاکو کو ہنوز سزائے قتل نہ دی گئی ہو بلکہ وہ اپنی موت مر جائے تو پہلی صورت (یعنی حق العبد) میں آزاد شخص کے قتل کی پاداش میں اس پر خون بہا عائد ہوگا جو مجرم متوفی کے ترکہ سے وصول کیا جائے گا اور غلام کے قتل کرنے کی پاداش میں غلام کی قیمت واجب الادا ہوگی اور دوسری صورت (یعنی حق اللہ قرار دیے جانے) میں کوئی مطالبہ لاگو نہ ہوگا۔

اگر رہزن نے متعدد اشخاص کو ایک ساتھ قتل کیا ہو تو مجرم ڈاکو کو اس مقتول کے بدلہ میں جس کے نام قرعہ نکلے قتل کیا جائے اور باقی مقتولوں کے لیے پہلی صورت میں خون بہا عائد ہوگا جیسے سزائے قصاص عائد ہوتی ہے اور دوسری صورت میں اسے تمام مقتولوں کے بدلہ میں قتل کیا جائے، اگر اس ڈاکو نے (متعدد اشخاص کو) یکے بعد دیگرے قتل کیا، تو لازم ہے کہ پہلے کے بدلے میں اسے سزائے قتل دی جائے۔

اگر مقتول کا وارث مال لے کر قصاص معاف کر دے تو پہلی صورت میں اس کا معاف کرنا درست ہے، صرف مال معاوضہ واجب الادا ہوگا، قصاص سے درگزر کیا جائے گا اس کے علاوہ بہر حال مجرم کو حد کے طور پر قتل کیا جائے گا، جیسا

کہ واجب القصاص مرتد کہ مقتول کے ولی نے معاف کر دیا ہو تب بھی بہر صورت اسے قتل کیا جائے، دوسری صورت میں یہ معافی لغو متصور ہوگی اور اس پر عمل نہ ہوگا۔

اگر کسی کو بھاری چیز سے قتل کیا یا عضو کاٹ کر یا کسی بھی طریقہ سے ہلاک کیا تو بصورت اول مجرم کو بھی اسی طرح قتل کیا جائے اور بصورت دیگر مرتد کی طرح تلوار سے قتل کیا جائے۔

اگر ہرن کسی شخص کو ایسی جراحت پہنچائے جو مستوجب قصاص ہے مثلاً ہاتھ کاٹ دے اور زخم اچھا ہو جائے تو بقول قوی یہ ضروری نہیں ہے کہ قصاص میں مجرم کے اسی عضو بدن کو کاٹا جائے جو عضو اس نے کاٹا تھا، بلکہ مجروح کو اختیار ہے کہ وہ قصاص لے یا معاف کر دے، کیونکہ یہ اللہ کا حق ہے جیسے کفارہ، اور اس میں (عضو کا کاٹنا لازم قرار دینا) اللہ کے حق میں سختی کا رد رکھنا ہے، اور یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت (محاربہ) میں جراحت کا ذکر نہیں فرمایا، لہذا ہرنی کے علاوہ اور صورتوں میں جو حکم ہے وہی برقرار رکھا جائے گا، لیکن دوسری صورت میں یہ حکم لازم ہوگا، جیسے جان کا بدلہ جان لازم ہے، اور تیسرے یہ کہ ہاتھوں اور پیروں کی سزا میں ان اعضاء کا قطع لازم ہے، کیونکہ ان اعضاء کے زیاں پر حالت حرب میں قصاص کا حق عائد ہوتا ہے۔

یہ اصحاب کہتے ہیں کہ جو سزائیں خاص طور پر ڈاکوؤں پر عائد ہوتی ہیں مثلاً قتل، سولی، پاؤں اور ہاتھ کا کاٹنا وہ سب سزائیں بقول صحیح ساقط ہو جاتی ہیں بشرطیکہ مجرم توبہ کر لے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”الا الذین تابوا من قبل ان تقدروا علیہم“ (تا آخر آیت) (یعنی وہ لوگ ان سزاؤں سے بچ جائیں گے بشرطیکہ گرفتار ہونے سے پہلے توبہ کر لیں) لیکن گرفتاری کے بعد توبہ کرنے سے یہ سزائیں ساقط نہ ہوں گی۔ آیت کا یہی مفہوم ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں جو ”من قبل“ کی قید آئی ہے وہ بے فائدہ ہو جاتی، دونوں حالتوں میں معنوی لحاظ سے یہ فرق ہے کہ گرفتار ہونے کے بعد (توبہ) سے یہ گمان ہو سکتا ہے کہ سزائے حد سے بچنے کے لیے توبہ کی ہے، بخلاف اس کے پکڑے جانے سے پہلے توبہ کرنا صدق دل سے زیادہ قرین قیاس ہے بہ نسبت الزام عائد ہونے کے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ ڈاکوؤں کا لوٹا ہوا مال اس کے دعویداروں کو واپس کیا جانا واجب ہے بشرطیکہ دعویدار اس کی نشاندہی کریں جیسا کہ گری پڑی یا گم شدہ مال کی صورت میں ہوتا ہے، ان اشیاء کی تصدیق اور بازیابی کے لیے مدعی کو قسم کھانا ہوگا یا پھر مدعی اپنے ساتھیوں میں سے دو مردوں کی یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی پیش کرے (کہ فی الواقع وہ مال مدعی کا ہے) اس کے بعد گرفتار ہو جانے والے مجرم سے ہتھیائی ہوئی اشیاء واپس لی جائیں گی، اگرچہ وہ اشیاء انہوں نے زبردستی یا غصب کر کے حاصل نہ کی ہوں، واضح ہو کہ اگر یہ فساد (ڈاکو) پناہ مانگیں تو انہیں پناہ نہ دی جائے، ہاں ایسے ڈاکوؤں کی سزائے (حد) ساقط ہو جائے گی جو گرفتار ہونے سے پہلے، حاکم یا اس کے نائب کے سامنے رضا کارانہ طور پر حاضر ہو کر توبہ کا اظہار کریں، بشرطیکہ قتل کا ارتکاب نہ کیا ہو، ورنہ قصاص کے طور پر سزائے قتل ہوگی درآنحالیکہ مقتول کے وارث نے خون معاف نہ کر دیا ہو، اگر اس نے خون معاف کر دیا ہو تو سزائے قصاص معاف ہو جائے گی لیکن زنا، تہمت، شراب اور قتل کی سزا معاف نہ ہوگی جبکہ مجرم نے گرفتار ہونے کے بعد توبہ کی بلکہ اس پر حد نافذ ہوگی، اور محارب (یعنی سرکش، ڈاکو وغیرہ) ہونے کا الزام گرفتار ہونے کے بعد توبہ کرنے سے ساقط نہ ہوگا جیسا کہ تاوان ساقط نہیں ہوتا اور

جو کچھ اس پر عائد ہوتا ہے وہ اس سے بری نہیں ہو سکتا اگرچہ حاکم کے سامنے پیش نہ ہوا ہو۔

رہزنی میں عورت کی شمولیت کا بیان

شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی عورت ڈاکوؤں کی جماعت میں شامل ہو جائے اور قتل کرنے اور مال لوٹنے میں ان کا ساتھ دے تو اسے بھی بطور حد کے قتل کیا جائے گا۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر رہزنوں کے منجملہ کوئی عورت بھی ہو تو اسے بھی قصاص میں قتل کیا جائے اور تاوان وصول کیا جائے گا، اگر کوئی نابالغ یا جنون زدہ شخص ڈاکوؤں کے ساتھ مل جائے یا جس پر ڈاکہ ڈالا اس کے رشتہ داروں میں سے کوئی ڈاکہ مارنے میں شریک ہو تو (اس کے ساتھ) باقی ڈاکوؤں سے بھی حد ساقط ہو جائے گی کیونکہ سب کا جرم ایک ہی نوعیت کا ہے۔ اگر مجرموں میں سے کسی کا جرم مستوجب سزا قرار نہ دیا جائے تو باقی مجرموں کا جرم سزا کا جزوی سبب ہوگا اور ایسی صورت میں حکم ثابت نہیں ہوتا اور اس کی حیثیت ایسی ہو جاتی ہے جیسے کوئی شخص عدا جرم کرنے والے کے ساتھ غلطی سے شریک جرم ہو گیا ہو۔ مظلوم کے قریبی رشتہ دار پر سزا واجب نہ ہونے کی توجیہ یہ ہے کہ یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ اس شخص کے مال میں جسے لوٹا گیا ہے یہ رشتہ دار (ڈاکو) بھی شریک ہو۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ حکم غیر مشروط ہے، کیونکہ جرم کی نوعیت ایک ہے جو سب پر عائد ہوتی ہے (اگر ایک بری ہو تو سب بری ہوں گے)۔

حنابلہ اور حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی (ڈاکو) نے زنا کیا، شراب پی اور سرقہ کیا اور حرب وغیرہ کے جرم میں مستوجب قتل قرار پایا تو اسے قتل کیا جائے گا لیکن اسے سزائے قطع و سزائے تازیانہ نہ دی جائے گی اور (قتل کے سوا) باقی حدیں نافذ نہ ہوں گی۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ تمام سزائیں پوری کی جائیں گی اور ایک سزا کو مطلقاً دوسری میں شامل نہیں کیا جائے گا کیونکہ ان میں سے ہر ایک جرم کی حد (شرعی سزا) مقرر ہے۔

رہزنوں کی میت پر نماز جنازہ پڑھنے کا بیان

حنفیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ قتل کرنے کے بعد ان کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اگر سولی پر لٹکایا گیا ہو تو ستون دار (یعنی سولی یا ٹنگلی) کے پیچھے جنازہ کی نماز ادا کی جائے۔ بعض اصحاب نے کہا ہے کہ (مجرم کو) تین دن سے زیادہ سولی پر لٹکا رہنے نہ دیا جائے تاکہ اس کی بدبو سے لوگوں کو تکلیف نہ ہو۔

توبہ کر لینے والے کی شہادت کا بیان

مالکیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ جس نے محاربہ (فتنہ و فساد) سے توبہ کر لی لیکن اس کے کردار میں اصلاح کا مشاہدہ نہیں ہوا تو اس کی راہی تسلیم نہ کی جائے گی جب تک کہ وہ اپنے اعمال کو نہ سنوارے تاکہ لوگوں کا مال و املاک اس کی (دست درازی سے) محفوظ رہے۔ پس اگر توبہ کرنے کے بعد اپنے اعمال کی اصلاح نہ کرے تو گویا اس نے توبہ ہی نہیں کی۔ غرض اصلاح اعمال اور مسلمانوں کا سارویہ اختیار کرنے کے بعد ہی اس کی شہادت کو الزام سے پاک سمجھا جاسکتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ (اصلاح اعمال کے بارے میں) فرماتا ہے ”فمن تاب من بعد ظلمه واصلاح“ (یعنی ظلم کے بعد

توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لینے والا) اور ”الا الذین تابوا من بعد ذلک واصلحوا“ (یعنی وہ لوگ ناقابل اعتبار ہونے سے مستثنیٰ ہیں جنہوں نے بعد میں توبہ کر لی اور اپنے اعمال کی اصلاح کر لی)۔ ان آیات سے عیاں ہے کہ توبہ کے بعد اصلاح اعمال ضروری ہے۔

حنفیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اہل محاربہ (یعنی فتنہ و فساد والوں) میں سے جو توبہ کر لے اس کی شہادت مانی جائے گی۔ اگرچہ اس کے اعمال میں اصلاح کا مشاہدہ نہ ہوا ہو، کیونکہ ”حد“ کی تکمیل رد شہادت پر منحصر نہیں ہے، بلکہ رد شہادت کا سبب گناہ ہے جو توبہ کرنے سے دور ہو گیا اور اس کے لیے حدیث کے ظاہری مفہوم کو دیکھا جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے ”واتبع السيئة الحسنة تمحها“ (یعنی برائی کو دور کرنے کے لیے نیکی کی پیروی شرط ہے)۔

قتل غیر واجب القصاص کا بیان

حنفیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر محارب (یعنی فساد، رہزن وغیرہ) اگر ایسے شخص پر ہلہ بول دے جو دین کی رو سے اس کا ہم پلہ نہ ہو مثلاً کافر یا غلام یا آزاد یا اولاد یا خود اس کا مملوک ہو اور لوٹ مار کے دوران اس شخص کو قتل کر دے تو گرفتار ہو جانے کے بعد مجرم کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ مقتول کے ورثاء کو خون بہا یا غلام کی قیمت ادا کرے گا، کیونکہ قصاص کا حکم اس پر عائد نہیں ہوتا۔

مالکیہ اور شافعیہ بھی، بموجب ایک روایت کے، یہ کہتے ہیں کہ محارب اگر کسی ادنیٰ حیثیت کے آدمی کو یا اپنے بیٹے کو یا کسی کے غلام کو یا خود اپنے غلام کو قتل کر دے تو اسے بھی سزائے قتل ہوگی، واللہ اعلم۔

متعدد جرائم کے ارتکاب کا بیان بجز محاربہ کے

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص قتل کرنے اور عضو بدن کاٹنے پر مستوجب قصاص ہو اور تہمت لگانے کے جرم میں سزائے حد بھی اس پر عائد ہوتی ہے اور مدعی سزا کا مطالبہ کرے تو سب سے پہلے اسے تہمت لگانے کی پاداش میں حد لگائی جائے۔ اس کے بعد قطع عضو کا قصاص لیا جائے پھر جان کے عوض قتل کیا جائے کیونکہ یہی طریقہ جملہ سزاؤں کی تکمیل کا سب سے زیادہ قرین قیاس طریقہ ہے۔ اگر مجرم ان سزاؤں کے علاوہ اور بھی کسی سزا کا مستوجب ہے تو پہلے وہ سزا دی جائے گی۔ واضح ہو کہ سزائے قطع کا سزائے ضرب کے بعد ہونا ضروری نہ ہوگا۔ اگر مطالبہ قتل کا حقدار موجود نہ ہو اسی طرح اس کی موجودگی میں بھی یہی ہوگا در آنحالیکہ وہ کہے پہلے سزائے قطع دی جائے۔ اس کے بعد میں اسے قتل کروں گا البتہ اگر مطالبہ خون کا حقدار اپنے حق (قتل) کو تاخیر میں ڈال دے تو پہلے تہمت کی سزائے ضرب دی جائے اور جب اس کا زخم اچھا ہو جائے تو سزائے قطع دی جائے اور اگر حقدار اپنے حق قطع کے نفاذ میں تاخیر چاہے تو پہلے سزائے ضرب دی جائے اور مطالبہ خون کے حقدار پر واجب ہے کہ اپنی حق طلبی میں صبر سے کام لے یہاں تک سزائے قطع پوری ہو جائے اگر اس نے جلد بازی سے کام لے کر اسے قتل کر دیا تو سزائے قطع کا دعویٰ مقتول کے ورثہ سے تاوان کا حقدار ہوگا۔ اگر مطالبہ سزائے ضرب کے حقدار نے اپنے مطالبہ کو تاخیر میں ڈال دیا تو یہ سمجھا جائے گا کہ اخیر کے دونوں جرائم کے بارے میں اس نے صبر سے کام لیا ہے۔

اگر مجرم نے ایسے کئی جرائم کا ارتکاب کیا جن کا تعلق حدود اللہ سے ہے (یعنی اس کی سزا اللہ نے مقرر فرمائی

ہے) تو واجب ہوگا کہ جو سزا ہلکی ہے وہ پہلے دی جائے اس کے بعد دوسری سزا جو ہلکی ہو دی جائے۔ اگر کوئی ایسی سزاؤں کا سزاوار ہے جن کا تعلق اللہ اور بندے دونوں کے حق سے ہے تو تہمت کی حد زنا کی حد سے پہلے نافذ کی جائے گی اور جب قتل کرنے اور عضو کاٹنے کی سزائیں جمع ہو جائیں تو ان کو حد زنا پر مقدم رکھا جائے گا۔ اگر قتل بدون محاربہ اور قتل بدوران محاربہ کی سزائیں عائد ہوں تو ان جرائم میں سے جو جرم پہلے ہوا ہے اس کی سزا پہلے ہوگی اور دوسرے قتل کا خون بہا وصول کیا جائے گا۔ اگر کسی نے ایک سے زیادہ مرتبہ جرم زنا کیا یا چوریاں کیں یا شراہیں پیں تو ان میں سے ہر ایک نوع جرم کی ایک ایک سزا کافی ہے۔

امامت (حکومت) کی شرطوں کا بیان

ائمہ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کا اس پر اتفاق ہے کہ امام کا ہونا فرض ہے اور یہ ضروری ہے کہ ان کا کوئی امام (حاکم) ہو جو امور دین کو خوبی کے ساتھ چلا سکے اور ظالموں سے مظلوموں کا انصاف لے اور اس پر بھی سب متفق ہیں کہ بیک وقت تمام دنیا میں مسلمانوں کے دو امام ہوں، خواہ وہ باہم متفق الخیال ہوں یا ان میں باہم اختلاف ہو اور اس پر بھی کہ امام قریشی ہو۔ ہاں یہ جائز ہے کہ وہ اپنا خلیفہ (نائب) کسی کو مقرر کر دے۔

اس پر بھی سب متفق ہیں کہ امام بننے کے لیے حسب ذیل امور کی شرط ہے:

ایک یہ کہ امام مسلمان ہوتا کہ وہ اسلام اور اہل اسلام کی بہبود کا خیال رکھ سکے۔ پس امت مسلمہ پر کافر کو امام (حاکم) بنانا درست نہیں۔

دوسرے یہ کہ امام مکلف ہو (یعنی احکام شرعیہ اس پر عائد ہوتے ہوں) تاکہ وہ امور عامۃ المسلمین کی دیکھ بھال کر سکے۔ لہذا بالغ یا جنون زدہ کی امامت بالاتفاق جائز نہیں ہے۔ حدیث شریف میں بروایت احمد آیا ہے ”نعوذ باللہ من امارۃ الصبیان“ (یعنی بچوں کی امامت سے خدا بچائے)۔

تیسرے یہ کہ امام آزاد ہو (غلام نہ ہو) تاکہ کار امامت کی انجام دہی کے لیے فارغ ہو اور اس کے لیے خود کو وقف کر دے۔ غلام ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اپنے آقا کی خدمت میں لگا رہتا ہے۔ نیز اس کا وقار نہیں ہوتا اور امام مسلم کی وہ روایت جو ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اسمعوا، واطیعوا، وان امر علیکم عبد حبشی“ (یعنی تمہارا کام یہ ہے کہ سنو اور حکم بجالاؤ اگرچہ تمہارا حاکم کوئی حبشی غلام ہو) یہ حکم امامت عظمیٰ (یعنی اونچی امامت) کے علاوہ دوسری (یعنی خلی امامت) کے لیے ہے۔

چوتھے یہ کہ امام مرد ہوتا کہ اسے مردوں کے ساتھ میل جول کا موقع ممکن ہو۔ پس کسی عورت کا والی امر ہونا ثابت نہیں ہے کیونکہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”لن یفلح قوم ولوا امرہم امراة“ (یعنی وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پاسکتی جبکہ عورت حکمران ہو)۔

پانچویں یہ کہ امام قبیل قریش میں سے ہو، چنانچہ نسائی میں آنحضرت ﷺ سے روایت ہے ”الائمة من قریش“ (یعنی امام قریشی ہونا چاہیے) اس حدیث کو تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم اور ان کے جانشینوں نے تسلیم فرمایا ہے یہ حکم اس حالت میں ہے جبکہ اوصاف امامت کا رکھنے والا قریشی موجود ہو، اگر قریشی امام دستیاب نہ ہو تو بنی کنانہ میں سے امام

ہونا چاہیے اگر وہ بھی نہ ہو تو ان میں سے امام لیا جائے جو سیدنا حضرت اسماعیل کی اولاد میں سے ہو۔ اس کے بعد بنی جرم میں سے کوئی شخص امام ہو سکتا ہے۔ وہ بھی نہ ہو تو اولاد اسحاق میں سے کوئی شخص ہو۔

غرض امامت کے لیے بالاتفاق یہ شرط نہیں ہے کہ وہ ہاشمی ہی ہو چنانچہ حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم بنی ہاشم میں سے نہیں تھے۔

چھٹے یہ کہ امام عادل ہو شیخ عزالدین فرماتے ہیں کہ اگر امامت و حکومت کے لیے عادل کا دستیاب ہونا دشوار ہو تو ایسے شخص کو فوقیت دی جائے جس کے گناہ کم ہوں۔

ساتویں یہ کہ امام صاحب علم ہو اور اجتہاد (تحقیق مسائل) کی قابلیت رکھتا ہو کہ وہ احکام شرعیہ کو سمجھتا ہو اور تفقہ (یعنی مسائل کی سوجھ بوجھ) رکھتا ہو کہ وہ خود لوگوں کو تلقین کر سکے۔ دوسرے سے پوچھنے کی ضرورت نہ پڑے۔

آٹھویں یہ کہ وہ شجاع (دلیر) ہو، اس سے مراد یہ ہے کہ نا کامیوں کا مقابلہ اپنی ہمت سے کر سکے اور قوی دل ہو اور لشکر میں نظم و ضبط قائم رکھ سکے، دشمنوں کو زیر کر سکے، قلعہ کشا ہو (یعنی ان کی طاقت کو توڑ سکے) اور حادثات رفتن اور پیش آمدہ مشکلات پر قابو پا سکے۔

نویں یہ کہ اس کی رائے پختہ ہوتا کہ رعایا کا بندوبست اور دنیوی اصلاحات (بہبود) کا انتظام کر سکے۔ دسویں یہ کہ اس کی بصارت، سماعت اور قوت گویائی اچھی ہوتا کہ معاملات رعایا سے پوری طرح آگاہ ہو اور ان کا تصفیہ بخوبی کر سکے۔

جملہ ائمہ فقہاء اس پر متفق ہیں کہ امامت (یا سرداری) اس وقت قائم ہوتی ہے جبکہ ملک کے معاملات کو چلانے والے امام کی بیعت (اطاعت کا معاہدہ) کر لیں۔ ان میں ملک کے علماء و رؤساء اور اہم اشخاص شامل ہیں جن کا اکٹھا ہونا ممکن ہو۔ اس کے لیے کسی مقررہ تعداد کی شرط نہیں ہے۔ امام کی بیعت کرنے والوں کے لیے شرط یہ ہے کہ ان میں گواہ بننے کی صلاحیت یعنی معتبر اور عادل ہونا وغیرہ پائی جائے۔ امامت کے قائم ہونے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ امام کسی خاص شخص کو اپنی زندگی میں، اپنے بعد خلافت کے لیے نامزد کر جائے جیسا کہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو بایں الفاظ خلافت کے لیے متعین فرمایا: ”بسم اللہ الرحمن الرحیم، هذا ما عهد ابو بکر خلیفۃ رسول اللہ ﷺ، عند آخر عہدہ من الدنیا، واول عہدہ بالآخرۃ، فی الحالۃ الّتی یؤمن فیہا الکافر، ویتقی فیہا الفاجر، انی استعملت علیکم عمر بن الخطاب، فان ہر و عدل فذاک علمی بہ وعلمی فیہ، وان جار و بدل فلا علم لی بالغیب، والخیر اردت، ولكل امرئ ما اکتسب“ وسیعلم الدین ظلموا ای منقلب ینقلبون“ (یعنی بنام خدائے رحمن و رحیم یہ ایک وصیت ہے جو ابو بکر خلیفۃ رسول اللہ ﷺ نے کی جبکہ دنیا سے رخصت ہونے کا آخری اور آخرت کا ابتدائی وقت ہے۔ اور ایسی حالت میں کی جس میں کافر ایمان لاتا اور گنہگار خائف ہوتا ہے، کہ لوگوں میں عمر بن الخطاب کو تم پر حاکم بناتا ہوں۔ اب اگر انہوں نے آئندہ نیکی اور عدل سے کام لیا تو یہ میری سوچ سمجھ کے عین مطابق ہوگا لیکن اگر انہوں نے ظلم کیا اور بدل گئے تو میں عالم الغیب نہیں ہوں۔ میرا ارادہ نیک ہے اور ہر شخص کو وہی کچھ ملتا ہے جو اس نے کمایا اور ”ان ظالموں کو جلد معلوم ہو جائے گا کہ ان کی بازگشت کہاں ہے؟“ واضح ہو کہ امامت

مسلمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے۔

امام سے سرکشی کرنے کا بیان

تمام ائمہ اس امر پر متفق ہیں کہ امام کامل (یا حاکم مجاز) جو حکم بھی دے اسے بجالانا واجب ہے۔ بشرطیکہ اس حکم کی تعمیل میں اللہ کی نافرمانی نہ ہو، اور یہ کہ امام، اس کے نائب اور اس کے گماشتوں کے تمام احکام نافذ العمل ہوں گے اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص مسلمانوں کے سردار سے باغی ہو جائے یا کوئی بااثر جماعت اس کی اطاعت سے سرکشی کرے تو واجب ہے کہ امام اس جماعت سے قتال کرے اگرچہ اس کی توجیہ مشتبہ اور قابل تسلیم ہو۔ اس حالت میں بھی امام کا ان سے جنگ کرنا روا ہے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ حکم الہی کی طرف مائل ہو جائیں۔ اب اگر وہ (سرکشی سے) باز آجائیں تو ان سے باز پرس ترک کر دی جائے۔

ایسے اشخاص کے ساتھ مقاتلہ جائز ہونے کی بنیاد ارشاد ہے ”وان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا فاصلا حوا بینہما“ (الحجرات: ۹) (یعنی اگر مسلمانوں کے دو گروہ باہم لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرادو) اس آیت میں اگرچہ امام کے خلاف برسر پیکار ہونے کا ذکر نہیں ہے، لیکن مفہوم کی عمومیت یا اقتضائے حال کی بناء پر یہ صورت بھی اس میں شامل ہے کیونکہ اگر ایک گروہ کے دوسرے گروہ پر زیادتی کرنے پر اس کے ساتھ جنگ کرنے کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے تو امام سے بغاوت کرنے پر بدرجہ اولیٰ یہ مطالبہ درست ہوگا۔ نیز باغیوں کے ساتھ جنگ کے روا ہونے پر اجماع ہے۔ جس کی کسی نے مخالفت نہیں کی اس حکم کی متعلقہ احادیث کے بارے میں امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مشرکوں اور مرتدوں کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے اخذ کیا گیا ہے جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نیز باغیوں سے جنگ کے متعلق احکامات حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہیں۔

واضح ہو کہ امام سے آمادہ جنگ ہونے کی دو صورتیں ہیں یا تو کوئی شخص از خود آمادہ شورش ہو یا حاکم کے حکم سے روگردانی کر کے ہو۔ یا ایسا نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کے مالی حق کی ادائیگی یا بندہ کے حق کی ادائیگی سے مثلاً قصاص سے یا حد کے نفاذ سے جو اس پر عائد ہوتی ہے سرتابی کرے۔ چنانچہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ زکوٰۃ نہ دینے والوں سے بوجہ اس کے کہ انہوں نے ادائے زکوٰۃ سے انکار کیا تھا، جہاد کیا، حالانکہ وہ لوگ آمادہ جنگ نہ تھے بلکہ اس حق کے ادا کرنے سے جو (ان پر اللہ کی طرف سے) عائد ہوتا ہے انکار کیا تھا۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ امام کی بدیں گوئی مخالفت کرنے والوں کو باغی قرار دیا جائے گا، بشرطیکہ انہیں کثرت تعداد یا دوسرے وسائل کی قوت حاصل ہو اور امام (حاکم وقت) کا مقابلہ کرنا ممکن ہو اور اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ لوگ امام (حاکم) کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کو یا ادائے حق واجب سے روگردانی کو جائز تصور کرتے ہوں۔

ایک شرط یہ ہے کہ ان کا کوئی سردار ہو جس کے حکم پر چلتے ہوں اور اس کی بدولت انہیں قوت و شوکت حاصل ہو۔ اگرچہ وہ کوئی باقاعدہ مقرر کردہ سردار (یا حاکم) نہ ہو، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہل جمل سے جنگ کی حالانکہ ان کا کوئی سردار نہ تھا اور صفین والوں سے بھی جنگ کی جبکہ ان کا کوئی امام نہ تھا۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ امام برحق کی فرمانبرداری سے سرتابی کرنے والوں کی چار قسمیں ہیں۔

ایک وہ جنہوں نے کسی کی حمایت اور اشتعال کے بغیر بلا وجہ سرتابی کی اور قتل و غارت کرنے لگے اور گزرگاہوں میں ہراس پیدا کیا۔ یہ لوگ رہزن (ڈاکو) ہیں۔

دوسرے وہ لوگ جو اسی طرح بغیر کسی کی حمایت کے ایسا ہی کرتے ہیں لیکن اس کی کوئی وجہ ہوتی ہے۔ ان کی بابت بھی یہی حکم ہے جو ڈاکوؤں کے لیے ہے۔ یعنی اگر قتل کریں تو انہیں بھی قتل کیا جائے وغیرہ۔

تیسرے وہ جنہیں کسی کی حمیت اور قوی پشتی حاصل ہے۔ وہ حاکم کے خلاف نکل کھڑے ہوتے ہیں لیکن اس کی توجیہ کرتے ہیں کہ ان کی رائے میں حاکم باطل راہ یعنی کفر و معصیت پر ہے جس کے باعث انہیں آمادہ حرب ہو جانا واجب ہو گیا ہے۔ ایسے اشخاص کو خارجی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کی جان و مال کا اطلاق حلال سمجھتے ہیں اور ان کی عورتوں کو قیدی بنا لیتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے صحابیوں کو کافر قرار دیتے ہیں۔ ان لوگوں کے بارے میں جمہور فقہاء اور اہل حدیث کے نزدیک وہی حکم ہے جو باغیوں کے لیے ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ ایسے اشخاص کو توبہ کرنے کے لیے کہا جائے۔ اگر توبہ کر لیں تو خیر و زندان کے فتنے کو دور کرنے کے لیے، اس لیے نہیں کہ وہ کافر ہو گئے ہیں، قتل کر دیا جائے۔ ایسے اشخاص قاسق (گنہگار) ہیں اور علمائے مجتہدین کے قابل ترجیح قول کے مطابق کافر نہیں ہیں۔ بعض اہل حدیث کے نزدیک یہ لوگ مرتد ہیں اور ان پر وہی حکم عائد ہوتا ہے جو مرتدوں پر ہوتا ہے۔

چوتھے وہ مسلمان گروہ ہے جو امام عادل کے خلاف سرکشی پر تلے ہوئے ہیں لیکن ان باتوں کو رد نہیں رکھتے ہیں جو خارجی کرتے ہیں۔ یعنی مسلمانوں کا خون روا نہیں رکھتے اور ان کی اولاد کو قید نہیں کرتے۔ ایسے اشخاص ایک ایسے سبب کی بناء پر جو ان کے عقیدہ میں درست ہے سرکشی کرتے ہیں۔ لیکن وہ غلطی پر ہیں اور انہیں قاسق تصور کیا جائے گا۔ ایسے اشخاص کے بارے میں جو حدیثیں آئی ہیں ان کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی مذمت کی جائے۔ مثلاً من حمل علينا السلاح فليس منا“ (یعنی جو شخص ہم (مسلمانوں) پر ہتھیار اٹھاتا ہے وہ ہم میں سے نہیں ہے) ایک اور حدیث ہے ”من خرج من الطاعة و فارق الجماعة فميتة جاهلية“ (یعنی جو شخص حکم برداری سے باہر ہو گیا اور جماعت کو چھوڑ گیا اس کی موت عہد جاہلیت کی موت ہے) ایسے لوگ ان میں شامل ہیں جو بلا توجیہ سرتابی کرتے ہیں۔

اصحاب شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی ایسی جماعت ہو جو بدعتی خارجیوں کے ہم خیال ہو کہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر کہتے ہیں اور اسی خیال سے اماموں پر طعنہ زنی کرنے اور جمعہ یا جماعت میں ان کے ساتھ شریک نہیں ہوتے۔ ایسے لوگوں سے قطع نظر کرنا چاہیے۔ نہ انہیں کافر کہیں اور نہ ان کے مزاحم ہوں۔ تاوقتیکہ وہ حاکم کی اطاعت سے سرتابی نہ کریں اور کسی کو قتل نہ کریں۔ خارجیوں کا بھی عقیدہ یہی ہے کہ جس نے گناہ کبیرہ کیا وہ کافر ہو گیا اور اس کے اعمال راہگاہ گئے اور وہ ہمیشہ کے لیے جہنمی ہو گیا اور چونکہ امام کی قلم رو میں گناہ کبیرہ عام ہے اس لیے وہ کفر اور اباحت کا علاقہ ہے (یعنی سب کچھ رد ہو گیا ہے) اسی بناء پر انہوں نے ائمہ پر طعنہ کیے ہیں۔ (ایسے اشخاص کو نظر انداز کرنے کی دلیل یہ ہے کہ) امام علی کرم اللہ وجہہ نے ایک خارجی کو مسجد میں یہ کہتے ہوئے سنا کہ ”اللہ اور رسول کے حکم کے سوا کسی کا حکم نہیں چلے گا، پھر اس نے حضرت علی کے احکام پر نکتہ چینی کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کا قول حق ہے لیکن مقصد باطل ہے۔ لوگو! ہم

تمہیں اللہ کی مسجدوں میں آنے سے کہ اس میں اللہ کا ذکر کرو منع نہیں کرتے اور نہ فی (مال غنیمت) کا حق تم سے چھینا جائے گا جب تک کہ تم ہمارے مددگار ہو۔ ہم تم سے جنگ کی ابتدا بھی نہیں کریں گے۔ پس ان کی بابت وہی حکم ہے جو اہل عدل کی بابت ہے۔ ہاں اگر وہ ہم سے قتال کریں تو ہم انہیں کافر قرار نہیں دیں گے جیسا کہ ڈاکوؤں کے بارے میں حکم ہے کہ اگر وہ ایسے شخص کو قتل کر دیں جس کا قاتل مستوجب سزائے قصاص ہے تو دوسروں کی طرح اسے بھی قصاص میں قتل کیا جائے گا۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ باغیوں کے ساتھ قتال کرنا کافروں کے ساتھ قتال کرنے سے حسب ذیل گیارہ امور میں مختلف ہے:

- ۱۔ امام کا مقصد قتال سے یہ ہے کہ باغیوں کو بغاوت سے باز رکھا جائے۔ جان سے مارنا مقصد نہیں ہے۔
- ۲۔ ان میں سے جو پیچھا دکھا دے اسے قتل نہ کیا جائے۔
- ۳۔ جو زخمی ہو جائیں انہیں ہلاک نہ کیا جائے۔
- ۴۔ قیدیوں کو قتل نہ کیا جائے۔
- ۵۔ ان کا مال نہ لوٹا جائے۔
- ۶۔ ان کی اولاد کو قیدی نہ بنایا جائے۔
- ۷۔ ان کے خلاف مشرک سے مدد نہ لی جائے۔
- ۸۔ انہیں چھوڑنے کے لیے مطالبہ مال نہ کیا جائے۔
- ۹۔ ان پر راستے نہ بند کیے جائیں۔
- ۱۰۔ ان کے گھروں کو آگ نہ لگائی جائے۔
- ۱۱۔ ان کے باغ (یا کھیتی) کو نہ اجاڑا جائے۔

اگر کچھ لوگ امام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور حق اللہ یا حق الناس کے ادا کر دینے سے انکار کریں یا امام کے حکم سے سرتابی کریں بلکہ اسے برطرف کرنا چاہیں تب بھی ایک امام کی سربراہی کو تسلیم کر لینے کے بعد اسے برطرف کرنا جائز نہیں ہے بلکہ ان مسلمانوں میں سے جو لوگ بااثر ہوں انہیں چاہیے کہ وہ حاکم کو سمجھائیں اور امام پر بھی واجب ہے کہ وہ ان باغیوں کو ڈرائے دھمکائے اور حکم ماننے کے لیے کہے اگر وہ پھر جماعت میں شامل ہو جائیں تو ان سے درگزر کیا جائے۔ لیکن اگر وہ سرکشی کریں تو ان کے ساتھ تلوار، نیزے اور تیر سے قتال کیا جائے اور ان میں پھوٹ ڈال دی جائے اور ان پر راستہ اور پانی بند کر دیا جائے اور ان پر پتھراؤ کیا جائے اور آگ لگا دی جائے بشرطیکہ ان میں عورتیں اور بال بچے نہ ہوں۔ تاہم ان کی اولاد کو قیدی بنالینا حرام ہے کیونکہ وہ مسلمان ہیں۔ نیز ان کا مال ضبط کرنا اور بلا ضرورت اس پر قبضہ کرنا حرام ہے اور ان کے قتل کے بعد سروں کو بلند کرنا بھی حرام ہے کیونکہ یہ فعل مسلمانوں کا مشلہ کرنے (یعنی ناک کان وغیرہ کاٹنے) کے برابر ہے۔ ان سے جنگ کرنے کے لیے ان کے مال، ہتھیار اور گھوڑوں سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔ بشرطیکہ جنگ میں اس کی ضرورت پڑے اور جب ضرورت نہ رہے تو ان کا مال دوسرے سامان کی طرح واپس دے دیا جائے اور

جب ان پر قابو حاصل ہو جائے تو انہیں غلام نہ بنایا جائے نہ ان کے زخیوں کو ہلاک کیا جائے اور شکست خوردوں کا پیچھا نہ کیا جائے۔ ہاں اگر وہ اب بھی نہ مانیں تو ان کے زخیوں کو ٹھکانے لگایا جاسکتا ہے اور شکست خوردہ اشخاص کا تعاقب بھی کیا جاسکتا ہے۔

واضح ہو کہ اگر باپ باغیوں میں ہو تو اسے قتل کرنا مکروہ ہے۔ لیکن دادایا بیٹے کو قتل کرنا مکروہ نہیں ہے اور قتل کرنے کے بعد اس (کے مال) کا وارث بھی ہوگا۔ اگرچہ قصد قتل کیا ہو لیکن عداوت کی بناء پر قتل نہ کیا ہو۔ عورت اگر ہتھیار سے مقابلہ کرے تو اسے بھی قتل کیا جاسکتا ہے۔ بصورت دیگر اسے قتل نہ کیا جائے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کی کوئی جماعت کسی شہر میں فساد برپا کرے اور امام کی اطاعت سے سرتابی کرے تو امام کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ انہیں پھر (وفاداروں) کی جماعت میں شامل ہو جانے کے لیے کہے اور اس شبہ کو دور کرے جو ان کی بغاوت کا موجب ہوا، کیونکہ امام علی رضی اللہ عنہ نے اہل حرور کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا۔ یہ امر مستحب (پسندیدہ) ہے، واجب نہیں ہے۔ اس کی حیثیت ایسی ہے جیسے اسلام کی دعوت کسی کو پہنچی ہو کہ دوبارہ انہیں دعوت اسلام دینا واجب نہیں ہے۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ امام باغیوں کے ساتھ مقابلہ کی ابتدا نہ کرے۔ ہاں اگر وہ خود لڑائی کا آغاز کریں تو امام ان سے قتال کرے یہاں تک کہ ان کی جماعت منتشر ہو جائے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر وہ لوگ صف بندی کر لیں اور سب آمادہ جنگ ہو جائیں تو امام کی طرف سے بھی ابتدا کی جاسکتی ہے کیونکہ اس صورت میں ان کی طرف سے آغاز جنگ ثابت ہے کہ وہ ارادہ جنگ سے جمع ہو گئے ہیں اور امام کی اطاعت سے برگشتہ ہو گئے ہیں۔ یہ اجازت اس لیے دی گئی ہے کہ اگر عملاً ان کے آغاز جنگ کرنے کا انتظار کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ ان کی مدافعت ممکن نہ رہے۔ بدیں سبب کہ اس دوران انہیں حمایت کرنے والوں کی جمعیت حاصل ہو اور ان کی جمعیت میں اضافہ ہو جائے گا اور شورش پسندوں کو فساد برپا کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اب در آنجا لیکہ ان کی تعداد کثیر ہے تو ان پر حملہ میں پیش دستی ان کے شر سے بچنے کے لیے ہوگی۔

اگر امام کو یہ اطلاع ملے کہ وہ لوگ ہتھیار خرید رہے ہیں اور جنگ کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں تو امام کو چاہیے کہ انہیں گرفتار کر کے قید میں ڈال دے تاکہ وہ بغاوت سے باز آجائیں اور توبہ کر لیں۔ یہ حکم اس لیے ہے کہ حتی المقدور ان کے شر سے بچا جاسکے اور ابو حنیفہؒ سے مروی ہے کہ ایسے حالات میں لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ خانہ نشین ہو جائیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب مسلمانوں میں فتنہ و فساد رونما ہو تو ہر مسلم ان پر واجب ہوگا کہ شورش (میں شریک ہونے) سے بچے اور گھر میں بیٹھ رہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے ”من فتر من الفتنة، اعتق الله رقبته من النار“ (یعنی جو شخص فتنہ و فساد سے دور رہا اللہ نے اسے نار جہنم سے آزاد کر دیا)۔ نیز آنحضرت ﷺ نے اپنے ایک صحابی کو ارشاد فرمایا ”کن حلساً من اخلاص بیتک“ (یعنی ایسے حالات میں چاہیے کہ تم خانہ نشین ہو کر بیٹھ رہو) یہ روایت حسن بن زیاد سے مروی ہے اور یہ حکم اس حالت میں ہے جبکہ مسلمانوں کا کوئی سربراہ نہ ہو اور یہ جو روایت (میں مذمت) آئی ہے کہ صحابہؓ کی ایک جماعت فتنہ کے وقت گھر میں بیٹھ رہی تھی، اس کی بابت یہ خیال کیا گیا ہے کہ ان اصحاب میں نہ قوت تھی نہ استطاعت تھی، مقدرت ہوتے ہوئے عادل اور برحق امام (حاکم) کی مدد کرنا واجبات میں سے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا

ارشاد ہے ”فقاتلوا التي تبغى حتى تفي الى امر الله“ (یعنی باغی جماعت سے قتال کرتے رہو، یہاں تک کہ وہ احکام الہی کی جانب مائل ہو جائیں)۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ باغی زخمی کا خاتمہ کر دو اور بھاگنے والوں کا پیچھا کیا جائے تاکہ ان کے شر کو ختم کیا جائے اور وہ پھر باغیوں سے نہ مل جائیں، تاہم اگر ان کا کوئی گروہ نہ ہو تو نہ ان کے زخموں کو ٹھکانے لگایا جائے اور نہ فراریوں کا پیچھا کیا جائے، تاکہ شر کا خاتمہ ہو جائے جو اصل مقصد ہے۔

شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ باغیوں کے ساتھ لڑائی میں حاکم کو پہل کرنا جائز نہیں ہے، تا آنکہ وہ پہل نہ کریں (مسلمانوں کو پیش دستی نہ کرنا چاہیے) کیونکہ مسلمان کے لیے مسلمان کا قتل جائز نہیں ہے، بجز اس صورت کے جبکہ اپنا تحفظ پیش نظر ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”وان طائفتان من المؤمنين اقاتلوا فاصلحوا بینهما“ (یعنی مسلمان کے دو گروہ باہم لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرادو) بخلاف کافر کے کیونکہ ان کا کافر ہونا ہی ان کے خون کو رواقراردیتا ہے۔

شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ زخمی کو ہلاک کرنا جائز نہیں ہے اور نہ فرار کرنے والے کا پیچھا کرنا روا ہے، خواہ باغیوں کا گروہ ہو یا نہ ہو، کیونکہ اگر وہ جنگ سے بھاگتے ہیں یا زخمی ہو کر ناکارہ ہو جاتے ہیں تو ان کا قتل کرنا دفاعی یا خود حفاظتی کے لیے نہ ہوگا، یہ بھی ہے کہ ابن ابی شیبہ نے عبد خیر سے یہ روایت کی ہے کہ جنگ جمل کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”لا تتبعوا مدبراً، ولا تجهزوا علی جریح، ومن القی سلاحه فهو آ من“ (یعنی پیٹھ دکھانے والے کا پیچھا نہ کرو اور زخمی کو ہلاک نہ کرو اور جو ہتھیار ڈال دے وہ محفوظ ہے) اس کے ساتھ یہ الفاظ بھی اضافہ کئے گئے ہیں ”لا تقتل اسیراً“ (یعنی قیدی کو قتل نہ کیا جائے)۔

امام (حاکم) کو چاہیے کہ باغیوں سے جنگ نہ کرے جب تک کہ پہلے ایک معتبر اور ذہین شخص کو ان کے پاس نہ بھیجے جو انہیں سمجھائے اور کہے کہ وہ لوگ مشتعل نہ ہوں، اگر وہ لوگ حاکم کے ظلم کا یا کسی شبہ کا ذکر کریں تو اسے دور کرنے کی کوشش کی جائے، اگر وہ بغاوت پر اڑے رہیں تو انہیں نصیحت کے ساتھ بغاوت کے انجام کا خوف دلائے اور قتال کے نتیجے سے آگاہ کرے۔

باغی اشخاص کے قید کرنے اور ان کے مال کے متعلق مسائل

حنفیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ باغیوں کی ذریت (بال بچوں) کو قیدی نہ بنایا جائے، کیونکہ وہ مسلمان ہیں اور ان کا مال تقسیم نہ کیا جائے، اس پر مال غنیمت کا حکم عائد نہیں ہوتا جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ جمل کے موقع پر فرمایا ”لا یقتل اسیر، ولا یکشف ستر، ولا یؤخذ مال“ (یعنی کسی قیدی کو قتل نہ کیا جائے، ستر نہ کھولی جائے اور مال نہ لیا جائے)، واضح ہو کہ حضرت مدوح اس بارے میں ہمارے رہنما ہیں، پھر یہ بھی ہے کہ باغی مسلمان ہیں اور مسلمان کی جان بھی محفوظ ہے اور مال بھی، ہاں اگر مجبوری ہو تو مسلمان ان کے ہتھیاروں کو جنگ میں استعمال کر سکتے ہیں کیونکہ امام علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بصرہ میں اپنے ساتھیوں کو ان کے ہتھیار تقسیم کیے تھے لیکن یہ عمل بوجہ مجبوری کے تھا ان ہتھیاروں پر قبضہ کرنا مقصود نہ تھا۔ پھر یہ بھی ہے کہ امام کو اختیار ہے جبکہ ضرورت کے وقت وہ امن پسندوں کے مال کو بھی کام میں لاسکتا

ہے تو باغیوں کے مال کو اس سے بڑے نقصان کی مدافعت میں بدرجہ اولیٰ کام میں لایا جاسکتا ہے، نیز حاکم مستدرک میں اور بزاز اپنی کتاب میں کوثر بن حکیم کی وہ روایت لائے ہیں جو نافع سے مروی ہے، انہوں نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”هل تدري يا ابن ام عبد؟ كيف حكم الله فيمن بغى من هذه الامة؟ قال: الله ورسوله اعلم، قال: لا يجهز على جريحها، ولا يقتل اسيرها، ولا يطلب هاربها، ولا يقسم فيؤها“ (یعنی اے ابن ام عبد تمہیں معلوم ہے کہ اس امت مسلمہ میں سے کوئی بغاوت کرے تو اس کی بابت اللہ تعالیٰ کا کیا حکم ہے؟ انہوں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول ہی کو بہتر علم ہے، اس پر ارشاد ہوا کہ باغی زخمی کو جان سے نہ مارا جائے، قیدی کو قتل نہ کیا جائے جو بھاگ جائے اسے حاضر ہونے کو نہ کہا جائے اور ان سے حاصل شدہ مال کو فوجیوں میں تقسیم نہ کیا جائے)۔

امام محمد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہمیں یہ اطلاع ملی ہے کہ امام علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مقام رجبہ پر نہروان باغیوں کی جماعت سے جو کچھ ہاتھ لگا تھا وہ آپ نے ایک جگہ بچھا دیا تھا کہ جو شخص اپنی چیز کو پہچان لے وہ لے جائے، یہاں تک کہ ایک شخص کی اہنی ہڈیا رہ گئی تھی وہ بھی وہ شخص لے گیا۔

ابن ابی شیبہ سے روایت ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جب طلحہ اور ان کے ساتھیوں کو شکست دی تو ایک منادی کو حکم دیا کہ وہ اعلان کر دے کہ حاضر ہو جانے والے یا بھاگ جانے والے کو قتل نہ کیا جائے یعنی وہ شخص جو شکست کھا کر بھاگے، (اسے ہلاک نہ کیا جائے) کسی بند گھر کا دروازہ نہ کھولا جائے اور نہ کسی عورت کو نہ کسی کے مال کو حلال سمجھا جائے، رہا قیدی کا معاملہ سوا اس کے بارے میں امام کو سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہیے کہ ان دو باتوں یعنی قتل کرنے اور قید کرنے میں سے کونسا عمل ان کی قوت کو ختم کر دینے کے لیے زیادہ بہتر ہوگا۔ تقاضائے حالات کے پیش نظر احکام مختلف ہوں گے، لیکن بہر حال اس میں نفسانی خواہش اور انتقامی جذبہ کی تسکین کو دخل نہ ہونا چاہیے، اگر باغیوں کی کوئی عورت گرفتار ہو جائے جو جنگ میں شامل رہی ہو تو اسے قید کر لیا جائے اور حالت قتال میں اپنے بچاؤ کے سوا اور کسی حالت میں قتل نہ کیا جائے، ہاں معصیت (گناہ) کی سزا میں یا اس کے شر و فساد سے بچنے کے لیے اسے قید کیا جاسکتا ہے جیسا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے جنگ جمل کے موقع پر فرمایا ”واياكم والنساء وان شتمن اعراضكم، وسبن امراءكم، ولقد رانينا في الجاهلية، ان الرجل ليتناول المرأة بالجريدة، او بالهراوة، فيعير بها هو وعقبه من بعده“ (یعنی خبردار عورتوں سے بدسلوکی نہ کرنا، اگرچہ وہ تمہارے شرفاء کی مذمت کریں اور تمہارے سرداروں کو گالیاں دیں، تم نے عہد جاہلیت میں ہم کو دیکھا ہے کہ مرد چٹھی یا ڈنڈے سے عورت کی خبر لیتا تھا اور اسے برہنہ کر دیتا تھا اور پھر عیب لگاتا تھا)۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر بغاوت کرنے والے مہلت مانگیں تو مہلت دینے یا نہ دینے کے بارے میں سوچ سمجھ سے کام لینا چاہیے، اس کے بعد جو طرز عمل بہتر ہو حاکم کو اس پر عمل درآمد کرنا چاہیے، اگر یہ معلوم ہو کہ وہ لوگ اس لیے مہلت کے طالب ہیں کہ اپنی غلط فہمی کو دور کر لیں تو انہیں مہلت دی جائے تاکہ انہیں حقیقت حال معلوم ہو جائے، لیکن اگر یہ پتہ چلے کہ وہ اس لیے مہلت چاہتے ہیں کہ اپنی جمعیت کو فراہم کر لیں تو انہیں مہلت نہ دی جائے، پھر جب ان میں جنگ

چھڑ جائے تو پیٹھ دکھانے والے باغیوں اور ہتھیار ڈال دینے والوں اور زخیبوں اور قید میں آ جانے والوں کو قتل نہ کیا جائے، بشرطیکہ حاکم کی رائے میں مناسب ہو چنانچہ (ان کے بارے میں) اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”حتی تفسی“ (یعنی یہ حکم اس حالت میں ہے جبکہ وہ بغاوت سے باز آجائیں) آیت میں لفظ ”تفسی“ کے معنی ہار کر جنگ سے باز آ جانے کے ہیں، پھر یہ بھی ہے کہ ان کے ساتھ لڑائی اس لیے کی گئی کہ انہیں سرکشی سے باز رکھا جائے اور اب تو (ان کی شکست کے بعد) یہ غرض ہی جاتی رہی اور گرفتار ہو جانے والے باغیوں کو خواہ وہ بچے ہوں یا عورت یا غلام قید میں رکھا جائے، یہاں تک کہ جنگ ختم ہو جائے اور ان کا جتھا منتشر ہو جائے۔

یہ اصحاب کہتے ہیں کہ جب لڑائی ختم ہو جائے تو امام پر واجب ہے کہ باغیوں کے ہتھیار اور گھوڑے وغیرہ انہیں واپس کر دیے جائیں، ان ہتھیاروں اور جانوروں میں سے کسی چیز کو استعمال کرنا حرام ہے، بشرطیکہ ان کو استعمال کرنا ناگزیر نہ ہو جائے، مثلاً یہ کہ اور گھوڑے دستیاب نہ ہوں اور یہ اندیشہ ہو کہ اگر ان کے گھوڑوں وغیرہ کو استعمال نہ کیا گیا تو امن پسندوں کو ان سے ہار ماننا پڑے گی، ایسی حالت میں باغیوں کے گھوڑوں اور ان ہتھیاروں کو استعمال میں لانا جائز ہوگا۔ (ان کے مال کو استعمال کرنے کی ممانعت) آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کے پیش نظر ہے ”لا یحل مال امری مسلم الا بطیب نفس منہ“ (یعنی کسی مسلمان کا مال اس کی رضامندی کے بغیر استعمال کرنا حلال نہیں ہے)۔ اسی طرح ان کے خلاف ناپسندیدہ ذریعہ ہلاکت کا استعمال نہ کرنا چاہیے۔ مثلاً آگ لگا دینا یا منجیق (آلہ سنگ اندازی یا گوپے) کا استعمال کرنا۔ بشرطیکہ اس کا استعمال ناگزیر نہ ہو جائے۔ باغیوں کے خلاف کافروں سے اور ایسے شخص سے جو فرار کرنے والوں کو قتل کرنا روا سمجھتا ہو مدد نہ لی جائے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ امام (حاکم) کو چاہیے کہ باغیوں کے مال کو ضبط کر لے اور انہیں واپس نہ کیا جائے اور نہ (فوجیوں میں) تقسیم کیا جائے، یہاں تک کہ وہ توبہ کر لیں، اگر وہ توبہ کر لیں تو سب کچھ انہیں واپس کر دیا جائے، تقسیم کرنے کی ممانعت اس لیے ہے کہ باغیوں کے مال کو مال غنیمت قرار نہیں دیا گیا، اور قبضہ کر لینے کو جو کہا گیا ہے یہ ان کی شرارت سے محفوظ رہنے اور ان کا زور کچلنے کے لیے ہے، اس لیے لازم ہے کہ اگر اس کی ضرورت نہ ہو تب بھی اسے روک لیا جائے البتہ کراغ (بار برداری کے جانوروں) کو فروخت کر دیا جائے۔ کیونکہ ان کی قیمت کو محفوظ رکھنا زیادہ قرین عقل اور آسان ہے اور باغیوں نے جو کچھ ان بستیوں جن پر انہوں نے غلبہ حاصل کیا ہے، وصول کر رکھا ہو، مثلاً خراج یا عشر (یعنی پیداوار کا دسواں حصہ) اسے حاکم دوبارہ نہ لے، کیونکہ اس نے انہیں تحفظ ہی نہیں دیا۔

مرتد کا بیان

مرتد کے متعلق مسائل اور مرتد کی تعریف

واضح ہو کہ مرتد ہونا یعنی نعوذ باللہ دین اسلام سے پھر جانا یہ ہے کہ ایک مسلمان شخص جس کا مسلمان ہونا کلمہ شہادتین کے اعتراف سے ثابت ہو، اصول اسلام سے آگاہ ہونے اور احکام اسلامی کا پابند ہونے کے باوجود (دین اسلام سے پھر کر) کفر اختیار کر لے، اب اس کا ارتداد (دین سے پھر جانا) یا تو اس کے صریح قول سے ثابت ہوگا کہ وہ کہے کہ میں

مشرک ہوں یعنی اللہ کے ساتھ معبودیت میں کسی اور کو بھی شریک سمجھتا ہوں یا پھر کوئی ایسی ہی بات کہ جس کا لازمی مفہوم 'کفر' (یعنی اللہ سے انکار) ہو مثلاً یہ کہے کہ اللہ بھی دوسری مجسم اشیاء کی طرح مجسم ہے، یا پھر کوئی ایسا فعل کرے جس سے واضح طور پر کفر (انکار اسلام) لازم آتا ہو مثلاً قرآن پاک یا اس کے کسی حصہ کو اگرچہ وہ ایک ہی لفظ ہو (حقارت کے ساتھ) پھینک دے، یا پھر اسے توہین آمیز طریقہ سے آگ میں ڈال دے، بخر اس کے کہ اسے بھڑکتی سے بچانے کے لیے (اس کی دھونی وغیرہ سے) مریض کا علاج مد نظر ہو (جلانے ہی کی طرح) یہ حرکت بھی ہے کہ قرآن کو غلاظت میں یا گندی جگہ پر پھینک دے خواہ وہاں پر ناپاک شے نہ ہو مثلاً ناک، تھوک ڈالنے کی جگہ ہو (مثلاً اگال دان وغیرہ) نیز ایسی اشیاء سے (کلام الہی کو) آلود کرنا مثلاً تھوک لگا لگا کر اس کے اوراق کو پلٹنا بھی اسی میں ہے، قرآن کی طرح حدیث، اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور کتب احادیث کے بارے میں بھی یہی حکم ہے اور یہی حکم کتب فقہ کے بارے میں بھی ہے جبکہ یہ حرکت شریعت اسلامیہ اور احکام شرعیہ کی توہین و تحقیر کی غرض سے ہو۔ انبیاء کے ناموں کی تحقیر بھی اس میں آتی ہے، نیز کفر سے رغبت رکھتے ہوئے زنا کا باندھنا بھی کفر ہے، البتہ بطور کھیل تماشے کے ایسا کیا تو (کفر نہیں لیکن) فعل حرام ہے، ایسا ہی بت خانوں میں جانا اور بتوں کے آگے سجدہ کرنا بھی ہے، جادو کا سیکھنا اور جادو کا عمل کرنا بھی کفر ہے، کیونکہ اس میں ایسی باتیں ہیں جن سے غیر اللہ کی عظمت ظاہر ہوتی ہے اور جادو گر اللہ کی قدرت کو اس کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اسی طرح یہ کہنا بھی کفر ہے کہ دنیا قدیم ہے یا اس (کی تخلیق) میں اللہ تعالیٰ کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس طرح کہنے سے اللہ کے خالق کائنات ہونے کی نفی ہوتی ہے، اسی طرح یہ کہنا ہے کہ عالم ہمیشہ باقی رہنے والا ہے جسے فنا نہیں ہے، اس سے قیامت کا انکار لازم آتا ہے گو وہ عالم کو حادث (پیدا شدہ) مانتا ہو۔ یہ خیال قرآن کو جھٹلانا ہے۔ دنیا کو قدیم (ازلی) اور ہمیشہ رہنے والی (ابدی) ہونے کا تصور بھی کفر ہے۔ اسی طرح اللہ کے موجود ہونے سے انکار کرنے والا بھی کافر ہے اور وہ بھی جو تاسخ ارواح کا قائل ہو (یعنی یہ خیال کرتا ہو کہ جو شخص مر جاتا ہے اس کی روح کسی اور قالب میں منتقل ہو جاتی ہے کیونکہ یہ خیال بعثت (حیات اخروی) سے انکار ہے۔ پھر ایسی بات سے انکار کرنا بھی کفر ہے جس پر تمام ملت کا اتفاق ہو، مثلاً نماز کا واجب ہونا یا زنا کا حرام ہونا، یا روزے کی فرضیت سے انکار کرنا اور یہ بھی کفر ہے کہ ایسی شے کے حلال ہونے سے انکار کیا جائے جس کے جائز ہونے پر سب کو اتفاق ہو اور وہ اسلام میں قرآن اور حدیث متواترہ سے قطعی طور پر ثابت ہو۔ اور یہ کہنے سے بھی انسان کافر ہو جاتا ہے کہ نبوت ایک اکتسابی شے ہے اور ریاضت سے اسے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس سے آنحضرت ﷺ کے بعد نبی آنے کے امکان کو جائز مانا جاسکتا ہے۔ ایسے نبی کو گالی دینا جس کی نبوت پر تمام امت اسلامیہ کو اتفاق ہے یا ایسے فرشتے کو گالی دینا جس کے فرشتہ ہونے پر سب کا اجماع ہے، کفر ہے۔ اور یہ بھی کفر ہے کہ انبیاء کے ذکر میں مداخلت کرتے ہوئے کوئی شخص یوں کہے کہ "میں تو بدکار یا جادو گر نہیں ہوں" (یعنی وہ نبی جس کا ذکر ہو رہا تھا وہ ایسا ہی ہے)۔ اسی طرح کسی فرشتہ یا نبی میں نقص نکالنا خواہ وہ جس کا عیب بتایا گیا ہو، مثلاً لولا لنگڑا بتانا یا علم میں ناقص ہونے کا طعنہ دینا کفر ہے۔ کیونکہ ہر نبی اپنے وقت کا سب سے بڑا عالم ہوتا ہے اور نبیوں کے سردار ﷺ تمام جہاں سے زیادہ صاحب علم ہیں نبی کے اخلاق یا ان کے دین پر طعنہ کرنا بھی کفر ہے۔ اسی طرح فرشتوں میں برے اخلاق کا ذکر کرنا یا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی پرہیزگاری کو مطعون کرنا بھی کفر ہے۔

ائمہ فقہاء کا کہنا کہ کسی شخص کے مرتد ہو جانے کے ثبوت کی خاطر دو معتبر اشخاص کی گواہی ضروری ہے۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ گواہوں نے کفر کے ثبوت میں یکساں بات بتائی ہو۔ چنانچہ جب دو شخص گواہی دیں کہ فلاں شخص نے کفر کیا ہے تو قاضی (حاکم دین) ان سے دریافت کرے گا کہ کون سی بات کفر کی ہوئی تو گواہ کو بیان کرنا ہوگا کہ فلاں شخص یوں کہتا ہے یا یوں کرتا ہے (جو مستوجب کفر ہے)۔

چاروں ائمہ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ اس پر متفق ہیں کہ اگر نعوذ باللہ کسی پر ارتداد کا الزام عائد ہو جائے تو اسے قتل کر دینا واجب ہے اور اس کا خون معاف ہے اور اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ زندیق کا قتل بھی واجب ہے اور زندیق وہ ہے جو اپنے کفر کو چھپائے اور اسلام کا اظہار کرے۔

مرتد کے توبہ کرنے کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان۔ نعوذ باللہ۔ اسلام سے پھر جائے تو اس کے سامنے پر اسلام کو پیش کیا جائے (یعنی اسے دوبارہ مسلمان ہونے کے لیے کہا جائے) اور اگر اسلام کے بارے میں اسے کوئی شبہ لاحق ہو تو اسے دور کیا جائے۔ ممکن ہے کہ اسے دین اسلام میں کوئی شبہ پیش آیا ہو جس کے باعث وہ دین سے ہٹ گیا ہو کیونکہ اب دو ہی باتیں ہیں یعنی اسلام یا قتل ان میں سے جو بہتر ہے اسے اختیار کرنا ہے۔ تاہم مرتد کو دعوت اسلام دینا ایک امر پسندیدہ ہے، واجب نہیں ہے کیونکہ اسلام تو اسے پہلے ہی پہنچ چکا ہے اور پھر اسلام کا پیش کرنا بھی تبلیغ دین ہے۔ اور جب دین اسلام کا پیغام پہنچ چکا ہو تو پھر اسی پیغام کا پہنچانا امر واجب نہیں بلکہ ایک مستحب (پسندیدہ کام) ہے۔ اگر وہ (سوچنے کے لیے) مہلت مانگے تو مستحب یہ ہے کہ قاضی اسے تین دن کی مہلت دے اور تین دن اسے قید میں رکھا جائے، اگر اسلام لے آئے تو خیر ورنہ قتل کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”فاقتلوا المشرکین“ (یعنی مشرکوں کو قتل کر دو) اس میں مہلت دینے کی کوئی پابندی نہیں ہے، نیز آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے ”من بدل دینہ فاقتلوه“ (یعنی تم مجھ سے جو اپنا دین بدلے اسے قتل کر دو) اس میں ڈھیل دینے کا کوئی ذکر نہیں ہے، پھر یہ بھی ہے کہ مرتد بہر حال کافر حربی ہے، مستامن تو ہے نہیں کہ اس نے امان کی درخواست نہیں کی اور نہ ذمی ہے کہ اس سے جزیہ نہیں لیا جاتا، لہذا اس کا قتل بلا تاخیر واجب ہے اور درآنحالیکہ اس کا اسلام امر موہوم ہے تو ایسی حالت میں امر واجب (قتل) کی بجا آوری میں تاخیر جائز نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ شخص مہلت مانگتا ہے تو اب اس کا پھر مسلمان ہو جانا امر وہی نہ رہا لہذا اسے مہلت دینا مستحب (بہتر) ہے۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ مرتد خواہ آزاد ہو یا غلام اس سے اس کا قتل واجب ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان۔ نعوذ باللہ۔ دین اسلام سے پھر جائے تو امام پر واجب ہے کہ اسے تین دن کی مہلت دے اس سے پہلے قتل کرنا روا نہیں ہے، کیونکہ ایک مسلمان کا دین سے برگشتہ ہونا کسی شبہ کے باعث ہوگا، لہذا ضروری ہے کہ اسے (سوچنے کا) موقع دیا جائے کہ حق یا باطل اس پر آشکار ہو جائے، اس کے لیے فقہاء نے تین دن کی مدت رکھی ہے۔ خواہ وہ شخص اس کی درخواست کرے یا نہ کرے۔ (اس مدت کے تعین کی تائید میں) سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وہ واقعہ ہے جو ایک مرد صالح کے ساتھ پیش آیا کہ (حضرت مدوح نے اس مرد صالح سے کہا تھا کہ) ”ان سالتک عن شیء بعد ما فلا تصاحبنی“ (یعنی دوبار تو خیر ہو چکا۔ اگر اب تیسری بار بھی آپ کی بات پر کچھ کہوں

تو آپ مجھے ساتھ نہ رکھیے گا) پھر جب تیسری بار بھی حضرت موسیٰ نے سوال کر دیا تو فرمایا ”قد بلغت من لدنی عذرا“ (یعنی میرے متعلق آپ کو ترک رفاقت کا، عذر ہاتھ آ گیا) اور سیدنا حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے پاس سے آپ کی خدمت میں آیا آپ نے اس سے دریافت کیا کہ ”هل من معربة خبر؟ فقال: نعم رجل ارتد عن الاسلام فقتلناه فقال له: هلا حبستموه في بيت ثلاثة ايام، واطعمتموه في كل يوم رغيفا، لعله يتوب، ثم قال: اللهم اني لم احضر، ولم امر، ولم ارض“ (یعنی نوآباد عربیوں کی بابت کوئی اطلاع ہے؟ انہوں نے کہا جی ہاں ایک شخص ان میں سے مرتد ہو گیا، ہم نے اسے قتل کر دیا، فرمایا ارے تم نے اسے کسی گھر میں تین دن تک قید میں کیوں نہ رکھا، اسے ہر روز ایک روٹی دے دیا کرتے، کیا عجب ہے کہ وہ توبہ کر لیتا، پھر فرمایا، خداوند امیں وہاں موجود نہ تھا اور میں نے اس کے قتل کا حکم بھی نہیں دیا تھا اور نہ اس خبر سے میں خوش ہوا)۔ یہ حدیث امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب موطا میں لائے ہیں، اس میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس عمل سے بیزاری کا اظہار فرمایا ہے، ایسے حالات کا تقاضا یہ ہے کہ مرتد کو ہلاک کرنے سے پہلے اسے تین دن کی مہلت دی جائے، اگر وہ توبہ کرے یا کلمہ شہادتین یا کلمہ توحید پڑھ لے تو اسے رہا کر دیا جائے اگر وہ تسلیم نہ کرے تو فوراً اسے تلوار سے قتل کر دیا جائے، اور دوسری متذکرہ سزاؤں کی طرح اس کے نفاذ میں تاخیر نہ کی جائے، کیونکہ مرتد ہونا بدترین کفر ہے، اور اس کے لیے نہایت سخت حکم ہے، اگر مرتد اسی حالت میں مرجائے تو اس کے تمام نیک اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”ومن یرتد منکم عن دینہ فیمت وهو کافر“ (یعنی تم میں سے جو اپنے دین سے پھر گیا اور حالت کفر ہی میں مر گیا تو اس کے تمام اعمال رائگاں ہیں) ہاں اگر وہ شخص پھر مسلمان ہو جائے اور اس نے مرتد ہونے سے پہلے حج کر رکھا ہے تو دوبارہ حج اس پر واجب نہیں ہے، بخلاف اس کے احناف کہتے ہیں کہ اگر اس نے توبہ کر لی ہے تو دوبارہ حج کرے۔ کیونکہ مرتد ہو جانے پر اس کے تمام اعمال ضائع ہو گئے ہیں۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ امام (حاکم) پر لازم ہے کہ مرتد کو تین دن اور تین رات کی مہلت دے اور یہ تین دن کی مہلت اس دن سے شروع ہوگی جس دن اس پر مرتد ہونے کا الزام ثابت ہوا، اس دن سے نہیں جس دن اس نے کفر اختیار کیا اور تیسرا دن ایام مہلت میں شامل نہیں کیا جائے گا۔ پس اگر فجر سے پہلے کفر ثابت ہو گیا تو وہ دن مہلت میں شامل نہ ہوگا اور بدوران قید مرتد کو اس کے مال سے کھانا پینا مہیا کیا جائے گا۔ لیکن اس کی اولاد اور بیوی پر اس میں سے خرچ نہ کیا جائے گا۔ اگر اس کا کچھ مال نہ ہو تو اس کا خرچ بیت المال سے پورا کیا جائے گا۔ خواہ اس نے توبہ کرنے کا ارادہ کیا ہو یا نہ کیا ہو اور قید میں اگر وہ اپنے ارادہ سے باز نہ آنے پر اڑا رہا ہے تو اسے مارا پیٹا نہ جائے اور بہر حال اتنے عرصہ تک لازمی طور پر توبہ کرنے کی ترغیب واجب ہے تاکہ اسے موت سے بچایا جاسکے اور محض شے کی بناء پر ایک دم حد نافذ کرنے سے احتراز کیا جاسکے نیز چاہیے کہ اسلام لانے کے لیے اسے بار بار کہا جائے اور اس کے شبہات کو دور کیا جائے، اور اسے سوچنے کا موقع دیا جائے، ممکن ہے کہ وہ اپنے ارادے سے رجوع کر لے اور مہلت کے دوران وہ توبہ کر لے۔ اگر قاضی اس مدت سے پہلے ہی اسے قتل کا حکم دے دے تو اس کا حکم نافذ العمل ہوگا۔ کیونکہ یہ ایک مختلف فیہ امر ہے (جس بات پر بھی عمل کر لیا جائے درست

ہوگا)۔ اگر مرتد نے تین دن گزرنے کے بعد ہی توبہ کر لی تو اسے رہا کر دیا جائے اور اگر کفر پر اڑا رہے تو تیسرے دن کا آفتاب غروب ہونے کے بعد ہی اسے قتل کر دیا جائے اور نہلایا کفنایا نہ جائے اور نہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے نیز کافروں کے قبرستان میں بھی دفن نہ کیا جائے۔ کیونکہ اسلامی اعتبار سے وہ ان میں شامل نہیں ہے۔ اس کی لاش یونہی پھینک دی جائے گی تاکہ دوسروں کے لیے موجب عبرت ہو۔

حنابلہ کی ایک روایت کے بموجب، مرتد سے تین دن تک توبہ کا مطالبہ کرنا واجب ہے جیسا کہ مالکیہ اور شافعیہ کہتے ہیں۔ ان کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ توبہ کر لینے کے لیے کہنا کوئی امر واجب نہیں ہے بلکہ مرتد کو اسلام لانے کے لیے کہنا اچھی بات ہے اگر مان لے تو اسے رہا کر دیا جائے ورنہ قطعی طور پر فوراً قتل کر دیا جائے۔

مرتدہ (اسلام سے پھر جانے والی عورت) کا بیان

شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ مرتدہ عورت کے بارے میں بھی وہی حکم ہے جو مرتد مرد کا ہے لہذا قتل کرنے سے پہلے اسے بھی تین دن کی مہلت توبہ کے لیے دی جائے اور اسے اسلام لانے کے لیے کہا جائے کیونکہ اسلام میں عورت کی جان بھی قابل احترام ہے۔ اکثر ایسا ہو سکتا ہے کہ اسلام کے بارے میں دل میں شبہ پڑ جاتا ہے لہذا اس شبہ کو دور کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اور توبہ کی ترغیب کا واجب ہونا سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ثابت ہے۔

دارقطنی میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ”ان امرأۃ یقال لها زومان ارتدت فامر النبی ﷺ ان یعرض علیہا الاسلام فان ثابت والا قتلت“ (یعنی ایک عورت جسے رومان کہتے تھے مرتد ہو گئی نبی ﷺ نے حکم دیا کہ اسے پھر مسلمان ہو جانے کی دعوت دی جائے تاکہ وہ توبہ کر لے یا پھر اسے قتل کر دیا جائے) کیونکہ مرتدہ ہو جانے پر وہ حربیہ کی مانند ہو گئی، ایسی صورت میں بطور حد کے اسے قتل کر دیا جائے بلکہ اس کا گناہ ایک حربیہ (اصل جنگ کرنے والی کے گناہ) سے زیادہ برا ہے۔ کیونکہ اسے پہلے ہی اسلام کی دعوت پہنچ چکی ہے، اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے ”من بدل دینہ فاقتلوه“ (یعنی جو شخص اپنا دین اسلام بدل دے اسے قتل کر دو) یہ ارشاد مردوں اور عورتوں سب پر عائد ہوتا ہے، پھر یہ بھی ہے کہ مسلمان کا اپنے دین سے پھر جانا بالاتفاق اسے واجب القتل کر دیتا ہے۔ کیونکہ ارتداد بہت بڑا گناہ ہے لہذا اس کی سزا بھی نہایت سخت ہے اور چونکہ مرد ہو یا عورت دونوں اس جرم میں برابر کے شریک ہیں لہذا اس جرم کی سزا یعنی قتل کے حکم میں بھی دونوں کو شامل کیا جائے گا۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر ترک اسلام کرنے والی عورت دودھ پلا رہی ہو تو اس کے قتل میں اتنی تاخیر کی جائے کہ وہ اپنے بچے کو پوری مدت تک دودھ پلا سکے، بشرطیکہ کوئی دودھ پلانے والی دستیاب نہ ہو یا ہو لیکن بچہ اسے قبول نہ کرے، خاوند والی عورت کی سزائے قتل میں بھی (امکان حمل کی بناء پر) تاخیر کی جائے اور طلاق رجعی پانے والی عورت کی سزا بھی، لیکن بائسہ عورت جس کو طلاق بائسہ ملی ہو (یعنی وہ طلاق جس میں قطعی طور پر علیحدگی ہو جاتی ہے) وہ اگر طلاق کے بعد مرتد ہوئی اور ایک بار ایام ماہواری آچکے ہیں تو اس کی سزائے قتل میں تاخیر نہ کی جائے ورنہ ایک بار ایام کے آ جانے تک تاخیر کی جائے بشرطیکہ وہ عورت ایسی ہے جسے ایام ماہواری آتے ہی نہیں، اگر چہ پانچ سال میں ایک بار آتے ہوں اور اگر اسے ایام

آتے ہی نہیں خواہ کمزوری کے باعث یا عمر رسیدگی کے باعث اس کا امکان مشکوک ہو لیکن اس کے حاملہ ہونے کا امکان ہو (استقرار حمل کے قابل ہو) تو استبراء (حاملہ نہ ہونے کا اطمینان کرنے) کی خاطر تین ماہ تک (قتل میں) توقف کیا جائے، اگر ایسی عورت ہو جسے حمل ہو جانے کا احتمال ہی نہ ہو تو توبہ کا مطالبہ کرنے کے بعد (اس کے انکار کرنے پر) قتل کر دیا جائے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ مرتدہ عورت کا قتل واجب نہیں ہے۔ تاہم اگر کسی نے اسے قتل ہی کر دیا تو قاتل پر کوئی تاوان عائد نہ ہوگا خواہ وہ عورت آزاد ہو یا مملوکہ ہو، (اور قتل کی ممانعت اس لیے ہے کہ) آنحضرت ﷺ نے عورتوں کے قتل کرنے سے منع فرمایا ہے اور اس لیے بھی کہ سزاؤں میں (تا بعد امکان) آخرت تک کے لیے تاخیر کرنا ایک بنیادی مسئلہ ہے، سزا میں تعجیل کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ابتلاء میں خلل ڈالا جائے لیکن تعجیل کی بجائے جو تاخیر کی جاتی ہے وہ اس لیے ہے کہ جنگ نہ کرنا پڑے اور چونکہ عورت جسمانی لحاظ سے (یا فطری طور پر) صلاحیت جنگ نہیں رکھتی جیسا کہ مرد میں ہوتی ہے۔ لہذا عورت مرتدہ کے ساتھ اصلی کافرہ کا سا سلوک کیا جائے گا۔

واضح ہو کہ دارالاسلام میں جو سزا بھی شریعت نے مقرر فرمائی ہے وہ مسلمانوں کی اصلاح (معاشرہ) کے لیے ہے مثلاً سزائے قصاص، شراب، زنا اور سرقہ کی سزائیں جان، آبرو، رشتہ، کنبہ، خاندان اور مال کے تحفظ کی غرض سے ہیں۔ اسی طرح جرم ارتداد کی سزائے قتل اس لیے واجب ہے کہ اس کی خرابی سے بچا جاسکے اور اس کا سد باب کیا جائے، دراصل یہ کفر کی سزا نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی سزا تو اللہ کے ہاں اس سزا سے کہیں سخت ہے۔ پس یہ سزا اسے دی جاتی ہے جو جنگ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو یعنی مرد ہو، یہ یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ نے عورتوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے اور اس کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ عورت جنگ نہیں کیا کرتی، جیسا کہ احادیث صحیحہ مذکورہ سابقہ میں آیا ہے اور یہ جو کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتدہ عورت کو قتل کیا اس کی بابت بتایا گیا ہے کہ اسے محض مرتد ہونے کی بنا پر قتل نہیں کیا گیا بلکہ اس لیے کیا گیا کہ وہ جادو کرتی تھی اور شعر کہتی تھی جس میں رسول اللہ ﷺ کی ہجو (مذمت) کیا کرتی تھی، اس کے تیس (۳۰) بیٹے تھے جنہیں وہ حضور سے لڑنے کے لیے اکسایا کرتی تھی۔ لہذا اسے قتل کا حکم فرمایا۔ تاہم مرتدہ عورت کو قید میں رکھا جائے یہاں تک کہ وہ مسلمان ہو جائے یا اسی حالت میں مر جائے اور ہر روز اسے اتالیس (۳۹) کوڑوں کی سزا دی جائے یہ بھی قتل کرنا ہی ہے کیونکہ مسلسل ضربات سے موت کا آجانا امر ناگزیر ہے۔ اور قید کی سزا اس لیے واجب ہے کہ اس نے مسلمان ہو جانے کے بعد حق اللہ کے پورا کرنے سے انکار کیا لہذا حق العباد کی ادائیگی کی طرح اسے حق اللہ (وعدہ الہی) کو پورا کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔

’جامع صغیر‘ میں آیا ہے کہ عورت کو مسلمان ہونے پر مجبور کر دیا جائے خواہ وہ آزاد ہو یا لونڈی (مملوکہ) ہو، اگر لونڈی ہے تو اس کا آقا اسے مسلمان ہونے پر مجبور کرے کیونکہ اس لونڈی پر دو حق عائد ہوتے ہیں۔ اللہ کا حق اور اس کے آقا کا حق۔

واضح ہو کہ اگر آزاد عورت مرتدہ ہو جائے تو جب تک وہ دارالاسلام میں ہے اسے لونڈی بنا کر نہیں رکھا جاسکتا۔ لیکن اسے ہر روز سزائے ضرب دی جائے بہت ممکن ہے کہ وہ پھر مسلمان ہو جائے۔ مرتدہ عورت نے جو کچھ کمایا ہے وہ اس کے

وارثوں کا حق ہے، کیونکہ اس نے جنگ کا مظاہرہ نہیں کیا، اس کا مسلمان خاوند اس کے مال کا وارث ہوگا۔

ابو یوسفؒ نے ابو حنیفہؒ سے، انہوں نے عاصم بن ابی النخود سے اور انہوں نے ابوزین سے اور انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے، کہ انہوں نے فرمایا ”لا تقتل النساء اذا هن ارتددن عن الاسلام، ولكن يجسن ويد عين الى الاسلام يجبرن عليه“ (یعنی عورتیں اگر مرتد ہو جائیں تو انہیں قتل نہ کیا جائے لیکن قید میں رکھا جائے اور دعوت اسلام دی جائے اور اس پر مجبور کیا جائے)۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک مقتولہ عورت کی لاش اسلامی جنگ میں دستیاب ہوئی اسے دیکھ کر آپ نے عورتوں اور بچوں کے قتل پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ اور امام محمدؒ کو جو روایات پہنچی ہیں منجملہ ان کے ایک یہ ہے وہ کہتے ہیں کہ ہمیں ابن عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ”عورت اسلام سے برگشتہ ہو جائے تو اسے قید میں ڈال دیا جائے“ (ظاہر ہے کہ) یہ بات ایسی نہیں ہے کہ کوئی شخص (بلا ثبوت) اپنی طرف سے ایسی بات کہے۔ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب ان کو یمن میں مامور کیا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں یہ ہدایت فرمائی تھی کہ ”ایما رجل ارتد عن الاسلام فادعه، فان تاب فاقبل منه، وان لم يتب فاضرب عنقه، وایما امرأة ارتدت عن الاسلام فادعها فان تابت فاقبل منها، وان ابت فاستبھا“ (یعنی تم میں سے جب کوئی مرد اسلام سے پھر جائے تو اسے دعوت اسلام دینا، اگر توبہ کر لے تو اسے تسلیم کر لینا اگر توبہ نہ کرے تو اس کی گردن مار دینا، اور کوئی عورت اگر مرتدہ ہو جائے تو اسے دعوت اسلام دینا توبہ کر لے تو قبول کر لینا، اگر انکار کرے تو اسے توبہ کرنے کے لیے کہتے رہنا..... وغیرہ) اور دارقطنی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی صحیح میں امام علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اخراج فرمایا ہے کہ امام مدوح نے فرمایا۔ ”المرتدة تستاب ولا تقتل“ (یعنی مرتدہ عورت سے توبہ کے لیے کہا جائے لیکن قتل نہ کیا جائے) یہ تمام دلائل امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کی تائید کرتے ہیں جن کا ارشاد ہے کہ ایسی عورت کو قتل کرنا واجب نہیں ہے بلکہ اسے قید کیا جائے اور مارا جائے۔

مرتد کی املاک کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ جو شخص مرتد ہو جائے اس کے مال پر مرتد کا قبضہ سردست ختم ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا حشر معلوم ہو جائے۔ یعنی اگر وہ پھر سے مسلمان ہو جائے تو اس کا مال اپنی سابقہ حیثیت اختیار کر لے گا۔ (یعنی بدستور وہ اس مال کا مالک رہے گا) کیونکہ اس کی حیثیت ایک شکست خوردہ حربی کی مانند ہوتی ہے جو اس وقت تک حکومت کے قبضہ میں ہوتا ہے کہ وہ قتل کر دیا جائے اور اگر وہ لڑائی برپا نہ کرے تو اسے قتل نہیں کیا جاتا اور مرتد کے مال پر اس کا قبضہ ارتداد کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ بجز اس حالت کے جبکہ اسے مسلمان ہو جانے کے لیے کہا گیا ہو اور اس پر اسے مجبور کیا جا رہا ہو اور یہ توقع ہو کہ وہ پھر مسلمان ہو جائے گا تو اس کی بابت فیصلہ کرنے میں توقف کیا جائے گا۔ اگر وہ مسلمان ہو گیا تو یہ حکم (ضبطی املاک کا) کالعدم متصور ہوگا اور یہ سمجھا جائے گا کہ گویا وہ مسلمان ہی رہا (اور ترک اسلام کیا ہی نہیں) اور مال کے خارج از ملکیت ہونے کا کوئی سبب نہ رہا۔ لیکن اگر وہ اسی حالت میں مر گیا یا قتل کر دیا گیا۔ یا دار الحرب (غیر مسلم علاقہ) میں چلا گیا اور اسے

خارج از دارالاسلام قرار دے دیا گیا۔ تو اس کا کفر ثابت شدہ قرار پائے گا جو زوال ملکیت مال کا سبب موثر ہوگا۔ اور اس کی ملکیت ختم ہو جائے گی۔ اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ اگر وہ پھر مسلمان ہو جائے اور اس کی املاک موجود ہے تو وہی اس کا سب سے زیادہ حقدار ہوگا اور ان دونوں صورتوں میں ان کے مناسب حال عمل واجب ہے۔ یعنی وہ کہتے ہیں کہ مرتد ہو جانے پر حق ملکیت ختم ہو جائے گا اور بارگرمسلمان ہو جانے پر وہ پھر مالک متصور ہوگا۔

صاحبین یعنی امام ابو یوسف و امام محمد فرماتے ہیں کہ مرتد کے مال میں اس کی ملکیت بحال رہتی ہے، کیونکہ وہ مکلف ہے اور محتاج مال ہے۔ یہ ملکیت قتل ہونے تک بحال رہے گی جیسے اس شخص کی ملکیت بحال رہتی ہے جسے سنگساری کا یا قصاص کا حکم ہوا ہو کیونکہ دونوں مکلف ہیں اور ان کا خون معاف ہے۔

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص مرتد ہو جانے کے بعد مر جائے یا قتل کر دیا جائے تو اس کا وہ تمام مال جو اس نے حالت اسلام میں کمایا وہ اس کے مسلمان ورثاء کو منتقل ہو جائے گا اور وہ مال جو اس نے مرتد ہونے کے بعد حاصل کیا وہ 'نی' (مال غنیمت) متصور ہوگا۔ اس پر تمام مسلمانوں کا حق ہے اور وہ بیت المال میں داخل کر دیا جائے گا۔

صاحبین کہتے ہیں کہ مرتد کی تمام ہی املاک سے اس کا حق ملکیت ختم نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کے مسلمان ورثاء میں تقسیم کر دی جائے گی کیونکہ دونوں حالات میں جو کچھ اس نے کمایا اس پر حق ملکیت قائم رہتا ہے اس لیے کہ وہ مکلف ہے (یعنی وہ شخص جس پر احکام عائد ہوتے ہوں) اور وہ اس کا حجت مند ہے پس اس کا مال مرنے کے بعد اس کے وارثوں کو منتقل ہو جائے گا اور وہ سب مال اس کے مرتد ہونے سے پہلے کا مال متصور ہوگا۔ کیونکہ اس کی موت مرتد ہو جانے کے باعث ہوئی ہے۔ لہذا یہ مسلمان کا مال ہو جو مسلمان کے ورثے میں آیا۔ اور یہ سمجھا جائے گا کہ وہ تمام مال وہ ہے جو حالت اسلام میں اس نے کمایا۔

مرتد اگر وفات پا جائے یا بوجہ ارتداد کے قتل کر دیا جائے۔ تو اس کی مسلمان بیوی جو عدت میں ہے اس کی وارث ہوگی اور (اس کے ارتداد کو) قریب المرگ ہونا تصور کیا جائے گا اگرچہ وہ مرتد ہونے کے وقت صحت مند رہا ہو۔ کیونکہ مرتد ہونا ہی اس کی موت کا سبب ہے۔

مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ مرتد کا وہ مال جو اس نے حالت اسلام میں کمایا اور وہ مال جو مرتد ہونے کے بعد اس نے کمایا وہ سب 'نی' (مال غنیمت جو بغیر جنگ کے ہاتھ آیا ہو) متصور ہوگا۔ کیونکہ وہ شخص حالت کفر میں مرا اور کوئی مسلمان بالاتفاق کافر کا وارث نہیں ہوتا۔ لہذا وہ حربی کا مال ہے جو غیر محفوظ قرار دیا گیا ہے۔ چونکہ اس کے لیے اونٹ۔ گھوڑے نہیں دوڑائے گئے لہذا وہ 'نی' ہے (یعنی بلا جنگ ہاتھ آنے والا مال)۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ مرتد کا وہ مال جو ترک اسلام سے پہلے اس نے حاصل کیا یا حالت کفر میں کمایا اس کی بابت کئی رائیں ہیں اور سب سے قوی رائے یہ ہے کہ یہ مال ایسا ہے جیسے اس کی بیوی کہ اس کے بارے میں فیصلہ کے اندر توقف کرنا چاہیے خواہ وہ دارالحرب میں چلا گیا ہو یا نہ گیا ہو۔ پس اگر اس نے مرتد ہو کر حصول مال کی کوشش کی ہے تو جو کچھ اس نے حاصل کیا وہ 'نی' (مال غنیمت) متصور ہوگا اور وہ مال جو اس نے لکڑی ڈھو کر یا ایسے ہی کسی اور طریقہ سے (یعنی محنت

مزدوری سے) کمایا وہ اس کے لیے روار ہے گا۔ اگر وہ دوبارہ مسلمان ہو جائے تو یہ سمجھا جائے گا کہ وہ مسلمان ہی رہا۔ کیونکہ حالت ارتداد میں مرنے پر ہی اعمال کا ضائع ہونا موقوف ہے اسی طرح حق ملکیت بھی مرنے پر ختم ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مرتد کے مال پر اس کا حق ملکیت مرتد ہونے ہی پر ختم ہو جاتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مرتد ہو جانے پر اس کی جان ہی محفوظ نہیں رہتی تو مال بدرجہ اولیٰ غیر محفوظ ہو جائے گا۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ مرتد ہو جانے سے حق ملکیت ختم نہیں ہوتا۔ کیونکہ کافر ہونا ملکیت مال کے منافی نہیں ہے۔ جس طرح کہ اصل کافر کا حق ملکیت باقی رہتا ہے۔ ان اقوال سے یہ نتیجہ نکلا کہ مرتد کے ذمہ جو قرضہ واجب الادا ہے یا مال وغیرہ کے تلف کرنے سے جو واجبات اس پر عائد ہوتے ہیں وہ سب اس کے مال سے ادا کئے جائیں اور اگر یہ مانا جائے کہ ملکیت زائل ہو جاتی ہے تو موت سے کچھ اضافہ نہ ہوگا۔ (بہر حال اسی سے ادا کرنا ہوگا) اور قرض واجب الادا کو وارثوں کے حق پر اسی طرح حق 'نی' (یعنی مال غنیمت کے حق) پر فوقیت دی جائے گی۔

زندیق (یا منافق) کا بیان

مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ جب معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص زندیق ہے تو اسے قتل کر دینا واجب ہے۔ اس سے توبہ کرنے کو نہیں کہا جائے گا۔ زندیق وہ ہے جو اپنے کفر کو چھپائے اور ظاہریہ کرے کہ وہ مسلمان ہے۔ آنحضرت ﷺ اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عہد میں ایسے شخص کو منافق کہا جاتا تھا۔ اگر وہ توبہ کر لے تب بھی واجب القتل ہے ہاں توبہ کے بعد اس کا قتل بطور حد کے ہوگا۔ بطور کافر ہونے کے نہ ہوگا۔ لہذا اس کی تجہیز و تکفین کی جائے اور اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے اور مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے باقی انجام اللہ کے سپرد کیا جائے گا۔ لیکن اگر کسی کے زندیق ہونے کا حال توبہ کے بعد معلوم ہو (کہ وہ زندیق ہو گیا تھا لیکن توبہ کر لی) تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ زندیق کی پانچ حالتیں ہیں۔ تین حالتوں میں تو اس کا مال اس کے ورثاء کو مل جائے گا۔ یعنی جب کہ وہ توبہ کر لے۔ یا اس کا نفاق معلوم ہو جانے کے بعد اس نے توبہ کی۔ یا اس کا زندیق ہونا مرنے کے بعد معلوم ہوا ہو باقی دو حالتوں میں اس کا مال بیت المال میں جائے گا۔ ایک تو یہ کہ اس کا حال مرنے سے پہلے ہی معلوم ہو گیا اور بغیر توبہ کئے اسے قتل کر دیا گیا۔ دوسرے یہ کہ توبہ نہ کی اور موت آگئی۔ یہی حکم اس شخص کے لیے ہے جو ایسے نبی کو دشنام دے جس کی نبوت جملہ امت مسلمہ کے نزدیک مسلمہ ہو۔ ایسے شخص کو توبہ کرنے کے لیے نہ کہا جائے گا اور توبہ کر لے تو اسے تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ تاہم اگر وہ توبہ کر لے تو اسے سزائے قتل بطور حد کے ہوگی۔ اگر ایسا شخص ناواقفیت کا بہانہ کرے تو وہ عذر قابل قبول نہ ہوگا۔ کیونکہ کفر کرنے کے لیے نادانی کا عذر قابل تسلیم نہیں ہے۔ اسی طرح، حرام شے کے استعمال سے نشہ کی حالت میں ہونے یا بیجا جوش یا غصہ کا عذر قبول نہیں کیا جائے گا اور اسے قتل کیا جائے گا۔ اگر کسی کافر اصلی نے نبی کے حق میں بدکلامی کی اور بعد میں مسلمان ہو گیا۔ اگرچہ قتل کے خوف سے مسلمان ہوا ہو تو اس کا قتل واجب نہیں ہے کیونکہ مستوجب قتل وہی ہوگا جو پہلے مسلمان رہا ہو۔

اگر کوئی مسلمان دشنام دہی کے علاوہ کسی اور جہت سے مرتد ہو گیا ہو اور مرتد ہونے کے بعد کسی نبی برحق کے حق میں بدکلامی کی اور پھر مسلمان ہو گیا تو اس کی سزائے قتل ساقط نہ ہوگی کیونکہ نبی کی شان میں بدکلامی کی سزا حدود اللہ

(یعنی اللہ کی مقرر کردہ سزاؤں) میں سے ہے جو بہر حال واجب النفاذ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی زندیق دوبارہ اسلام کی جانب لوٹ آئے تو اس کی توبہ قبول کی جائے گی جیسا کہ امام شافعیؒ کا مسلک ہے۔ یہاں تک کہ فرشتوں اور انبیاء کی شان میں دشنام طرازی کرنے والے کا بھی یہی حکم ہے۔

واضح ہو کہ حق تعالیٰ کی شان میں بدکلامی کرنے والے کی توبہ تسلیم کر لی جائے گی اس میں اور نبیوں یا فرشتوں کے حق میں بدکلامی (یا گستاخی) کرنے والا توبہ کر لے تو وہ توبہ تسلیم نہیں کی جائے گی کیونکہ دونوں میں فرق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عقل کے اعتبار سے بذات خود شائبہ عیب سے پاک ہے۔ اگر بندہ نے اس کی شان میں گستاخی کی اور توبہ کر لی تو وہ قابل قبول ہوگی بخلاف اس کے ایمان لانے والے اللہ کے خاص بندوں (انبیاء و ملائکہ) میں عیب کا محال ہونا اللہ تعالیٰ کے ارشاد سے ثابت ہے۔ ذاتی حیثیت سے نہیں ہے۔ لہذا اس کے بارے میں سختی سے کام لیا گیا ہے اور (ان کی شان میں گستاخی کرنے پر) توبہ قبول نہیں کی جائے گی اور ایسے شخص کو قتل کر دیا جائے گا اور بار دیگر مسلمان ہونے کے بعد جملہ واجبات، نماز، روزہ اور زکوٰۃ جن کی ادائیگی اس کے ذمہ تھی وہ سب ساقط ہو جائیں گے اور دوسری بار مسلمان ہو جانے پر ان واجبات کے ادا کرنے کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ ہاں اگر نماز واجب ہوئی اور ہنوز اس کا وقت ختم نہ ہوا تھا کہ وہ شخص (مرتد) پھر مسلمان ہو جائے تو اس نماز کو ادا کرے گا۔ یہ مسئلہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی بناء پر ہے ”قل للذین کفروا ان ینتھوا یغفر لھم ما قد سلف“ (یعنی کافر ہو جانے والوں کو کہہ دو کہ وہ اپنی کثرت سے باز آجائیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی سابقہ فرگذاشتوں سے درگزر فرمائے گا) (یادر ہے کہ مرتد ہو جانے پر تمام اعمال سابقہ کا ثواب جاتا رہتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”لئن اشرکت لیحبطن عملک“ (یعنی در آنحالیکہ تم نے شرک کیا تمہارے عمل کا ضائع ہو جانا ناگزیر ہے)۔

واضح ہو کہ جب کوئی شخص توبہ کر لے تو اسے وضو کرنا واجب ہے۔ غسل کرنا واجب نہیں ہے، در آنحالیکہ حاجت غسل نہ ہو اور اگر وقت یعنی عمر فرصت دے تو دوبارہ حج کرنا واجب ہے۔ نذر (منت) جو مانی ہے اور قسم کا کفارہ اور پردہ کا آزاد کرنا اور ظہار کا کفارہ جو واجب الادا ہے وہ سب ساقط ہو جائیں گے اور طلاق (معلقہ یا مشروط) بھی نہ پڑے گی مثلاً اگر اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر میں فلاں گھر کے اندر جاؤں تو تجھ پر طلاق ہے۔ اس کے بعد وہ شخص مرتد ہو گیا یا مرتد ہونے کے بعد توبہ بھی کر لی اور اس گھر میں داخل ہوا تو وہ طلاق نہیں پڑے گی لیکن اس کی خاوند کی حیثیت باقی نہ رہے گی۔ اگر مرتد ہونے سے پہلے جو طلاق دی تھی وہ طلاق ثلاثہ (مغلظہ) تھی تو مرتد ہونے کے بعد وہ عورت بغیر شادی کئے (یعنی بدون حلالہ) اس پر حلال نہ ہوگی۔ ہاں اگر دونوں بیک وقت مرتد ہوئے اور پھر (بیک وقت) مسلمان ہو گئے تو سابقہ نکاح بحال رہے گا۔

حنفیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر زندیق توبہ کر کے مسلمان ہو جانے کا اعلان کر دے تو اس کی توبہ تسلیم کر لی جائے گی۔ زندیق کو توبہ کے لیے کہا جائے گا اسے قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ کافر اصلی کے زمرہ میں شامل قرار دیا جائے گا اور جب وہ اسلام قبول کر لے تو اسے رہا کر دیا جائے گا۔

شافعیہ کے ایک اور قول کے مطابق اگر زندیق اسلام (حقیقی) سے ہٹ کر کفر خفی یا کفر باطنیہ اختیار کر لے۔ یعنی یہ کہنے لگے کہ قرآن یہ نہیں ہے جو ظاہر ہے بلکہ ایک باطنی (مخفی) ہے۔ یا ایسا دین اختیار کرے جس کی بابت اس کا گمان یہ ہو کہ محمد (ﷺ) صرف ملک عرب کے رسول تھے یا یہ عقیدہ رکھے کہ آنحضرت ﷺ کا دین برحق تھا لیکن ان کی رحلت کے بعد اب اس کا دخل نہیں ہے یا کسی دینی فریضے کے فرض ہونے یا حرام کے حرام ہونے سے انکار کرے تو اس کا دعویٰ اسلام درست نہیں ہے اور اسے بطور حد کے قتل کر دیا جائے گا اسی طرح وہ فلسفی بھی (تارک اسلام) ہیں جنہیں یہ گمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک چیز پیدا کر دی پھر اس سے ایک اور شے پیدا ہوئی جس نے نظام عالم کو سنبھالا۔ اول الذکر کو وہ عقل اور ثانی الذکر کو نفس کہتے ہیں۔ یہ علانیہ کفر ہے۔ ایسے ہی وہ اہل طبعیات ہیں جو کہتے ہیں کہ زندگی اور موت ایک امر طبعی ہے (اللہ کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے) ویسا ہی وہ شخص بھی (کافر) ہے جو رسول اللہ ﷺ پر تہمت لگائے اور ان کے حق میں بدکلامی کرے یا انبیاء برحق میں سے جن کا ذکر قرآن حکیم میں آیا ہے کسی کی شان میں بدکلامی کرے یا رسول اللہ ﷺ کی بات کو جھٹلائے تو اسے بطور حد کے سزائے قتل دی جائے گی اور توبہ کرنے پر بھی حد ساقط نہ ہوگی۔

کہا جاتا ہے کہ اگر وہ شخص توبہ کر لے تو اسے قتل نہ کیا جائے بلکہ اسی (۸۰) کوڑوں کی سزا دی جائے کیونکہ مسلمان ہو جانے پر جرم ارتداد تو جاتا رہے گا لیکن (تکذیب کی) سزائے تازیانہ نافذ ہوگی۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ جس کے دل میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے بغض ہو وہ مرتد ہے تو حضور کی شان میں بدکلامی بدرجہ اولیٰ (ارتداد) ہے۔ ایسے شخص کو بطور حد کے قتل کیا جائے گا اور اس کے توبہ کر لینے سے بھی حکم قتل ساقط نہ ہوگا۔

مرتد کے دارالحرب میں چلے جانے کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی مرتد دارالحرب (غیر اسلامی ملک) میں چلا جائے اور قاضی (حاکم شرع) اس کے بارے میں یہ فیصلہ کر دے کہ وہ دشمن سے مل گیا تو اس شخص کا مدبر (وہ غلام جسے آقا کی وفات کے بعد آزادی کا پروانہ حاصل ہو) اور اس کی ام ولد (وہ لونڈی جس کے بطن سے اولاد پیدا ہوگئی ہو) دونوں قسم کے مملوک آزاد ہو جائیں گے اور وہ قرض جو اس پر واجب الادا ہے وہ سب ختم ہو جائے گا اور وہ مال جو اس نے حالت اسلام میں حاصل کیا وہ اس کے مسلمان ورثاء کو منتقل ہو جائے گا کیونکہ وہ دارالحرب سے وابستہ ہونے کے باعث اہل حرب (دشمنان اسلام برسر جنگ) میں شامل ہوگا۔ ایسا شخص احکام اسلام کے لحاظ سے مردہ ہے۔ اب اس پر احکام اسلام کی پابندی ختم ہوگئی ہے جیسے مردہ شخص سے پابندی احکام ختم ہو جاتی ہے۔ اسے ایک متوفی شخص قرار دیا جائے گا۔ تاہم اس کا دشمن سے مل جانا تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ جب تک کہ قاضی (حاکم شرع) اس کا فیصلہ نہ دے دے کیونکہ نفاذ حکم سے پہلے، اس کے اسلام کی طرف واپس آنے کا احتمال رہتا ہے۔ پس اس کے لیے قطعی فیصلہ ناگزیر ہے اور جب قانونی طور پر اسے مردہ قرار دیا جائے تب ہی وہ متعلقہ احکام عائد ہوں گے جن کا ذکر اوپر کیا گیا یعنی اس کے مدبر غلاموں کا آزاد ہو جانا وغیرہ۔ جیسا کہ حقیقی موت کے واقع ہو جانے پر ہوتا ہے۔ واضح ہو کہ بقول امام محمدؒ اس کا وارث ہونا اسی وقت تسلیم کیا جائے گا جب وہ دارالحرب میں شامل ہوگا کیونکہ شامل ہونا ہی اس کا موجب ہے اور جب حاکم شرع اس کا فیصلہ کر دے تو اب اس کے واپس آنے کا احتمال جاتا رہے گا اور

ابو یوسفؒ کا کہنا ہے کہ اس کے وارث کا ہونا اس وقت تسلیم کیا جائے گا جب قاضی (حاکم اسلام) اسے فوت شدہ قرار دیدے اور مرتدہ عورت اگر دار الحرب (کافروں) میں جائے تو اس کے بارے میں بھی مالک کے درمیان یہی اختلاف ہے۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ وہ تمام قرضے جو مرتد پر قرض لینے کے وقت عائد ہوئے وہ اس کے ایسے مال میں سے ادا کیے جائیں گے جو اس نے حالت اسلام میں کمایا ہے۔ اگر وہ ادائے قرض کے لیے کافی نہ ہوں تو حالت ارتداد میں حاصل کیے ہوئے مال سے جو اس نے مرتد ہونے کے بعد حاصل کیا ادا کیے جائیں کیونکہ دونوں حالتوں میں جو کمائی اس نے کی ہے اس کی نوعیتیں مختلف ہیں اور دونوں حالتوں میں جو کمائی اس نے کی ہے اس کے حصول میں اس سبب کو ملحوظ رکھا جائے گا جس کی بناء پر وہ قرض واجب الادا ہو (یعنی اگر قرض حالت اسلام کا تھا تو حالت اسلام کی کمائی سے اور اگر حالت ارتداد کا تھا تو حالت ارتداد کی کمائی سے واجب الادا ہوگا) اور یہ ادائیگی قرض بطور غنیمت حاصل شدہ مال میں سے ہوگی۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ ادائے قرض پہلے حالت ارتداد کی کمائی سے ہوگی کیونکہ درحقیقت وہ حالت اسلام کی کمائی کا مالک ہے یہاں تک کہ وارث اس کے پیچھے اس کا مالک ہوتا ہے اور پسماندگان کا حق اس وقت ہوتا ہے جب مورث کا حق ختم ہو جائے۔ پس ادائے قرض پہلے اس مال سے ہونا چاہیے جس کا مورث (اپنی زندگی میں) مالک رہا ہو۔ لیکن مرتد (شروع سے) حالت ارتداد کی کمائی کا مالک ہی نہیں ہوتا کیونکہ مرتد ہو جانے کے بعد مالک ہونے کی اہلیت نہیں رہتی (پس جبکہ وہ مالک ہی نہیں ہے) تو اس سے قرض ادا نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس صورت میں جبکہ کسی اور طرح ادائیگی ممکن نہ ہو تو اس مال سے (جو مرتد ہونے کے بعد اس نے کمایا اور جو اب مال غنیمت کی حیثیت میں تھا) قرض ادا کیا جائے، جیسے ذمی کہ اگر مر جائے اور اس کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کا مال بیت المال (سرکاری خزانہ) میں جائے گا اور اگر اس پر کسی کا قرضہ ہو تو وہ اس مال سے ادا کیا جائے۔ اسی طرح مرتد کی صورت میں بھی عمل ہوگا۔

ایک صورت یہ بھی ہے کہ مرتد نے حالت اسلام میں جو کچھ کمایا تھا وہ تو اس کے وارث کا حق ہے۔ ہاں حالت ارتداد کی کمائی پر صرف اسی کا حق ہے۔ لہذا قرض کی ادائیگی اس مال میں سے زیادہ بہتر ہے۔ البتہ اگر وہ مال ادائے قرض کے لیے ملے نہ ہو تو اس کا قرضہ حالت اسلام کی کمائی سے ادا کیا جائے کیونکہ قرض کی ادائیگی مقدم ہے۔

ابو یوسف اور محمد رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ مرتد اگر دشمن کے ملک میں چلا جائے تو اس کا قرض دونوں حالتوں کی کمائی سے ادا کیا جائے کیونکہ وہ سب مال اس کی ملکیت ہے۔ یہاں تک کہ وراثت کے احکام اس پر عائد ہوتے ہیں، واللہ اعلم۔ شافعیہ کہتے ہیں کہ مرتد کا مال، اس کے دار الحرب میں شامل ہو جانے کے بعد (محفوظ) رہے گا۔ پھر اس کے مال سے وہ واجبات ادا کیے جائیں جو کسی کا مال وغیرہ ضائع کرنے کی بناء پر اس پر عائد ہوتے ہیں کیونکہ اگر یہ مان لیا جائے کہ اس کی ملکیت (مرتد ہونے کے بعد) باقی رہتی یا اس مال کو محفوظ تصور کیا جائے تب تو ظاہر ہے کہ یہی حکم ہونا چاہیے۔ اور اگر یہ مانا جائے کہ مرتد کا حق ملکیت ختم ہو گیا تو اس کی حیثیت موت سے زیادہ نہ ہوگی (یعنی اس کا وہی حکم ہوگا جو متوفی کا ہوتا ہے) اور ادائے قرض وارثوں کے حق پر مقدم ہوگا جیسا کہ مال 'نی' (یعنی مخالف کا وہ مال غنیمت جو بلا مقابلہ حاصل ہوا ہو) میں ہوتا ہے (کہ پہلے قرض ادا کیا جائے گا) کہ قرض حق 'نی' پر مقدم ہے۔ پس اگر مرتد، حالت ارتداد میں مر

جائے اور اس پر قرض واجب ہے اور مال 'نی' اس سے قابل وصول ہے تو پہلے قرض واجب وصول کیا جائے گا اور اس سے جو بچے گا وہ مسلمانوں کے بیت المال میں جائے گا۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ مرتد، مجبور (نا اہل تصرف) قرار دیا جائے گا کیونکہ بوجہ مرتد ہو جانے کے اسے اپنے مال پر تصرف کا حق نہ رہے گا۔ تاہم یہ کہا گیا ہے کہ اس کا نا اہل ہونا، قاضی کے فیصلہ پر موقوف ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کو دیوالیہ ہونے کی وجہ سے مالی تصرف سے محروم قرار دیا جائے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ نا اہلیت ایسی ہوگی جیسے بے عقل ہونے کے باعث کسی کو مالی معاملات میں تصرف سے محروم کر دیا جائے۔ نیز یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ نا اہلیت ایسی ہے جیسے کسی مریض کو نا اہل معاملہ قرار دے دیا جائے۔ اور مرتد پر ترغیب تو بہ کے دوران جو مصارف ہوں وہ اس کے مال سے ادا کیے جائیں اور اس کے ضروری اخراجات ذاتی پر جو خرچ ہوگا وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ مردہ کی تجہیز و تکفین کے مصارف جو خود اس کے مال سے کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ موت کے بعد اس کا حق ملکیت ختم ہو جاتا ہے۔

اس باب میں صحیح ترین مسلک یہ ہے کہ مرتد نے ارتداد کے بعد جو مالی نقصان کسی کو پہنچایا ہے اس کی تلافی کا وہی ذمہ دار ہوگا۔ یہاں تک کہ اگر مسلمان کی ایک جماعت امام (حاکم) سے بغاوت اور اس کے احکام سے سرتابی کرے اور جنگ کے بغیر اس پر قابو نہ پایا جاسکے تو شورش کے دوران جو مالی نقصانات انہوں نے کیے ہیں بقول قوی مسلمان ہو جانے کے بعد ان سب (کی تلافی) کے وہ لوگ ذمہ دار ہوں گے۔

بیوی کے نان و نفقہ کے بارے میں صحیح ترین قول یہ ہے کہ مرتد پر واجب ہے کہ نکاح کرنے سے جو واجبات اس پر عائد ہوتے ہیں وہ سب ادا کرے۔ اسی طرح اس کے کسی قرابت دار کا نفقہ بھی جو اس کے ذمہ تھا ادا کرے گا۔ کیونکہ ان حقوق کا تعلق اس مرتد سے ہے اور چونکہ اس مال پر مرتد کا حق باقی ہے لہذا اس کا ادا کرنا لازم ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کسی قسم کا نفقہ مرتد پر عائد نہ ہوگا کیونکہ وہ (بوجہ مرتد ہو جانے کے) مال کا مالک نہ رہا اور اس کا حق تصرف جاتا رہا۔ اور اس قول کے مطابق کہ اس کی ملکیت محفوظ رہے گی لیکن نا اہل تصرف قرار دیا جائے گا تو در آنحالیکہ مرتد ہونے کے وقت اسے حق تصرف حاصل تھا لیکن جو تصرف اس نے کیا اس کے عملدرآمد میں توقف کیا جاسکتا ہے: مثلاً (کسی مملوک کو) آزاد کرنا یا مدبر بنانا یا کوئی وصیت کرنا تو اس کے مال کو روک رکھا جائے گا۔ اگر وہ مرتد پھر مسلمان ہو جائے، تو وہ تصرفات جو اس نے (اپنی مملوک اشیاء میں) کیے وہ سب بحال رہیں گے۔ لیکن اگر وہ (مسلمان نہ ہوا اور) حالت ارتداد ہی میں مر گیا تو وہ تصرفات نافذ العمل نہ ہوں گے (یعنی اس کے آزاد کردہ غلام لوٹ دی نہ آزاد ہوں گے نہ انہیں مدبر بنایا جائے گا اور نہ اس وقت کی وصیت پر عملدرآمد ہوگا) کیونکہ اگر عملدرآمد میں تاخیر کی جائے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تصرف ہو ہی نہیں سکتا (کیونکہ یہ تاخیر اس کے پھر مسلمان ہو جانے کی توقع پر تھی) لیکن اگر وہ تصرف ایسا ہے جس کے عملدرآمد میں التوا کی گنجائش نہیں ہے۔ مثلاً خرید و فروخت کرنا، ہبہ کرنا یا غلام لوٹ دی کے حق میں کتابت کرنا (یعنی مال کے عوض آزاد کر دینے کی تحریر کر دینا) وغیرہ ایسے تمام تصرفات جن میں توقف کی گنجائش نہیں باطل (یا کالعدم) تصور ہوں گے۔ اس بناء پر کہ ان معاملات میں التوا باطل ہے اور پرانے معاملات پر عملدرآمد التوا میں رہے گا کیونکہ ایسے

معاملات میں التوا درست ہے۔ لہذا اگر مرتد مسلمان ہو جائے تو ان معاملات کو درست مان لیا جائے گا۔

متذکرہ بالا صورت حالات میں یہ لازم ہے کہ مرتد کے مال کو ایک ایماندار شخص کی تحویل میں رکھا جائے اور اس لونڈی کو کسی معتبر عورت کی یا احتیاطاً کسی محرم شخص کی جس کے ساتھ تنہائی میں رہنا حلال ہو سپرداری میں رکھا جائے یہ حکم اس لیے ہے کہ مرتد کے مال پر تمام مسلمانوں کا حق ہوتا ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ مرتد ہو جانے سے حلالہ کرنے والے کا حلالہ باطل نہ ہوگا چنانچہ اگر کسی شخص نے قطعی طلاق یافتہ عورت کے ساتھ نکاح کر لیا تو اس سے عمل حلالہ پورا ہو گیا اور مرتد ہو جانے سے عمل حلالہ باطل نہ ہوگا اور طلاق مغلطہ دینے والے پر وہ پھر حلال ہو جائے گی۔ بخلاف عورت کے اگر قطعی طلاق یافتہ عورت کسی سے نکاح کر کے مرتد ہو جائے تو یہ حلالہ نہ ہوگا اس کے مرتد ہو جانے سے یہ حلالہ باطل ہو جائے گا۔ چنانچہ اگر مطلقہ سے کسی شخص نے شادی کر لی اور وہ عورت مرتد ہو گئی اور پھر مسلمان ہو گئی تو وہ سابقہ خاوند کے لیے جس نے طلاق قطعی دی تھی حلال نہ ہوگی جب تک کہ کسی اور سے شادی نہ کر لے (اور پھر طلاق) نہ ہو جائے کیونکہ اس نے خود ہی اس نکاح کو جس کی بناء پر حلالہ ہو سکتا (مرتد ہو کر) باطل کر دیا۔ اسی طرح اس شخص کا نکاح باطل ہو گیا جس نے اس کے ساتھ شادی کی تھی۔

واضح ہو کہ مرتد ہو جانے سے (غلام یا لونڈی کا) آزاد کرنا جو کسی قسم کی بھی شرط پر موقوف نہ تھا، باطل نہ ہوگا۔ خواہ دوبارہ مسلمان ہو جائے یا حالت ارتداد میں قتل کر دیا جائے یا دارالکفر میں جا ملے۔ اسی طرح اگر اس نے بیوی کو طلاق دے دی ہے، تو وہ طلاق بحال رہے گی اور باطل نہ ہوگی۔ اگر ہبہ شدہ یا وقف شدہ شے کو پہلے ہی الگ کر دیا ہے تو ہبہ یا وقف بحال رہے گی خواہ وہ شخص مسلمان ہو جائے یا حالت ارتداد ہی میں مر جائے۔ لیکن اگر اس مال کو ہنوز نکالا نہ تھا اور وہ شخص مرتد ہو گیا اور حالت ارتداد ہی میں مر گیا یا کافر سے جا ملا تو اب اس پر عمل درآمد نہ ہوگا۔ بلکہ مرنے سے پہلے یہ دیکھا جائے گا کہ آیا وہ پھر مسلمان ہو جاتا ہے یا اس کے تصرفات کو باطل یا کالعدم قرار دیا جائے۔

ان اصحاب کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر کوئی کافر اپنا مذہب بدل کر کوئی اور مذہب کفر اختیار کرے مثلاً نصرانی، یہودی یا مجوسی بن جائے تو اسلامی حکومت کوئی مداخلت نہیں کرے گی۔ اور کافروں میں سے اگر کوئی مسلمان ہو جائے اور پھر کفر اختیار کر لے اور قاضی اس کے توبہ نہ کرنے پر اس کے قتل کا ارادہ کرے تو وہ اپنی اس حرکت کا (کہ مسلمان کیوں ہوا تھا؟) یہ عذر بیان کرے کہ میں تو اپنی جان یا مال کے جانے سے ڈر کر مسلمان ہوا تھا۔ تو اس کا یہ عذر تسلیم کر لیا جائے گا۔ اگر اس کا یہ عذر قرینہ سے درست ثابت ہو تو اس کو مان لیا جائے اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اور اگر اس کی یہ بات غلط ثابت ہو تو اسے مرتد قرار دیا جائے گا کہ توبہ نہ کرے تو بطور کافر قتل کر دیا جائے۔

اگر کوئی شخص شہادتین کا اقرار کرے (یعنی اشہدان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمداً عبده ورسوله کہہ دے) لیکن ارکان اسلام کی پابندی نہ کرتا ہو۔ ایسے شخص کی سرزنش کی جائے اور حاکم جو سزا مناسب سمجھتا ہو اسے دے سکتا ہے اگر وہ (اپنے رویہ سے) باز آ جائے تو اسے مرتد کے زمرہ میں شمار نہیں کیا جائے گا۔ لیکن یہ حکم اس امر کے بارے میں ہے جو مسلمانوں میں عام نہیں ہے تاہم وہ شخص اتنا جانتا ہے کہ نماز، روزہ اور زکوٰۃ مسلمان پر فرض ہے۔ بصورت دیگر وہ

شخص مرتد ہے کیونکہ مسلمانوں کے ساتھ اس کا ربط ضبط رہا ہے اور اسلام کے دینی احکام سے واقف ہے ایسے شخص کی تادیب کی جائے گی لیکن اگر وہ اسلامی فرائض کا منکر ہو تو اسے مرتد قرار دیا جائے۔ اسی طرح اس جادوگر کو بھی تنبیہ کی جائے جو جادو کرتا ہو لیکن اس سے مسلمان کو مضرت نہ پہنچی ہو۔ اگر مسلمان کو ضرر پہنچے تو اس کی یہ حرکت عہد کی خلاف ورزی ہوگی اور حاکم وقت اسے قتل کر سکتا ہے یا اس وقت تک کے لیے غلام بنا کر رکھ سکتا ہے جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائے۔ اگر اس شخص نے اپنے جادو سے کسی اہل کتاب کو نقصان پہنچایا تو اسے سرزنش کی جائے گی بشرطیکہ اس نے جادو کر کے کسی کو ہلاک نہ کیا ہو۔ ایسی صورت میں اسے قتل کر دیا جائے گا۔

اگر کوئی شخص ایسی (مقدس) ہستی کو دشنام دے جس کی نبوت پر سب کا اتفاق ہو مثلاً خضر اور لقمان یا حضرت مریم کے حق میں (تہمت زنا کے علاوہ) کوئی اور بدکلامی کرے تو اسے شدید سزائے ضرب دی جائے اور قید میں ڈال دیا جائے اور اگر خاندان رسالت آنحضرت ﷺ میں سے کسی کو، یہ جانتے ہوئے کہ وہ حضور کی نسل میں سے ہے، گالی دے تو اسے بھی سزائے ضرب دی جائے گی۔ اور اگر کوئی شخص خاندان نبوت سے نہ ہو لیکن صراحتاً یا اشتباہاً یہ دعویٰ کرے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی ذریت میں سے ہے۔ مثلاً ہرے رنگ کا عمامہ باندھ کر یا ایسی ہی کوئی اور بات (یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ خاندان نبوت سے ہے) کرے تو ایسے کو سزا دینے یا تنبیہ کرنے پر زیادتی نہ کی جائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے ”لعن اللہ الداخل فینا بغیر نسب، و الخارج منا بغیر سبب“ (یعنی اس پر اللہ کی لعنت جو نسلی تعلق کے بغیر ہمارے خاندان میں داخل ہو یا بلا سبب اس سے خارج ہو جائے)۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے شریف النفس ہونے کا جھوٹا دعویٰ کرے تو اسے ایک مہینے تک سزا دی جائے اور اتنے لمبے عرصہ تک قید میں رکھا جائے کہ وہ مسلمانوں کے سامنے تو بہ کرے کیونکہ ایسا کرنے سے رسول اللہ ﷺ کی توہین ہوتی ہے۔

یہ اصحاب کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اصحاب رسول اللہ ﷺ میں سے کسی صحابی کو دشنام دے تو اسے سزائے ضرب و قید دی جائے۔ لیکن اسے حد نہیں لگائی جائے گی۔ یہی حکم ان میں سے کسی کو کافر کہنے کا ہے۔ اگر کوئی شخص خلفائے اربعہ (ابوبکر، عمر، عثمان و علی رضوان اللہ علیہم) میں سے کسی کی تکفیر کرے۔ تو اسے کافر نہیں کہا جائے گا لیکن اس کی سرزنش کی جائے گی اور اگر تمام صحابہ کی تکفیر کرے تو وہ بالاتفاق کافر ہے کیونکہ اس نے دین کی مسلمہ سچائی کا انکار کیا اور خدا اور رسول کو جھٹلایا۔ اگر اس بارے میں ایک معتبر گواہ یا غیر معتبر اشخاص کے ایک گروہ نے گواہی دی کہ فلاں شخص نے ایک نبی کو جس کی نبوت پر سب کا اتفاق ہے دشنام دیا تو اسے سزائے ضرب (تازیانہ) دی جائے گی۔

اسی طرح اگر جٹلایے مرض نے یوں کہا مجھے اس مرض کی جو تکلیف دی گئی ہے۔ اگر میں حضرت ابوبکرؓ کو قتل بھی کر دیتا تو اس سزا کا مستحق نہ ہوتا اس کی بابت بھی یہی حکم ہے اور اگر ان الفاظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرنا مقصود ہو تو وہ شخص بالاتفاق مرتد قرار دیا جائے گا۔

مرتد کے تصرفات (انجام دادہ معاملات) کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ مرتد جو معاملات انجام دے اس کی چند قسمیں ہوں گی۔

۱۔ وہ معاملات جو بالاتفاق درست مانے گئے ہیں۔ مثلاً اولاد کا باپ بننا اور بیوی کو طلاق دینا (یعنی مرتد کے ہاں جو بچہ پیدا ہو وہ مرتد اس کا باپ ہوگا اور بیوی کو جو طلاق دی وہ نافذ ہوگی)۔

۲۔ وہ معاملات جو بالاتفاق درست نہیں ہے۔ مثلاً نکاح کرنا یا جانور کا ذبح کرنا (یعنی نہ مرتد کا کیا ہوا نکاح درست ہے اور نہ اس کا ذبیحہ حلال ہے) کیونکہ ان دونوں باتوں کا انحصار مذہب پر ہے اور مرتد کا کوئی مذہب نہیں ہے اور جو مذہب اختیار کیا وہ درست نہیں ہے کیونکہ مرتد ہونے کے بعد وہ واجب القتل ہے (یعنی وہی نہیں تو مذہب کہاں؟)

۳۔ وہ معاملات جن کا نفاذ بالاتفاق التوا میں رہے گا مثلاً عہد شراکت، چنانچہ اگر مرتد نے کسی مسلمان کے (کاروبار میں) شراکت کرنی ہے تو اس پر عملدرآمد التوا میں رہے گا۔ البتہ اگر مرتد پھر مسلمان ہو جائے تو شراکت کا معاملہ بحال رہے گا۔ اگر مرگیا یا اسے قتل کر دیا گیا یا دارالحرب (دشمنوں) سے جا ملنے کا، بموجب فیصلہ حاکم، مرتکب قرار دیا گیا تو یہ شراکت بالاتفاق (بے اثر) ہو جائے گی کیونکہ شراکت کے معاملہ (کے درست ہونے) کا انحصار فریقین کے (مذہبی) مساوات پر ہے اور مسلمان اور مرتد یکساں نہیں مانے جائیں گے تا آنکہ وہ مرتد پھر مسلمان نہ ہو جائے۔

۴۔ وہ معاملات جن کے التوا کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ ان میں خرید و فروخت، غلام کا آزاد کرنا، ہیہ کرنا، رہن رکھنا اور بحالت ارتداد اپنے مال میں تصرف کرنا، ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ (مرتد کے) ان تمام معاملات کے لاگو کرنے کو التوا میں رکھا جائے گا۔ اگر وہ پھر مسلمان ہو جائے تو یہ تمام معاملات بحال رہیں گے۔ اگر مرگیا یا قتل کر دیا گیا یا دارالحرب (غیر مسلم علاقہ) میں چلا گیا تو یہ سب باطل متصور ہوں گے کیونکہ اس صورت میں گویا وہ ایک محارب ہے جو اسلامی حکومت میں بے دھڑک رہ رہا ہو۔ جس طرح ایسے شخص کا مالکانہ حق التوا میں رہتا ہے اور اس التوا کی بناء پر اس کا حق تصرف ملتوی رہتا ہے۔ اس کی حیثیت ایک حربی کی مانند ہے جو اسلامی حکومت میں بلا معاہدہ امان کے داخل ہوا ہو ایسے شخص کو گرفتار کر لیا جائے گا اور سخت نگرانی میں رکھا جائے گا اور جو معاملہ اس نے کیا ہو اس پر عملدرآمد ملتوی رہے گا کیونکہ ہنوز اس کے انجام کا علم نہیں ہے۔ یہی حکم مرتد کے بارے میں بھی ہے۔ پھر یہ بھی کہ مرتد، حق تحفظ سے محروم ہو کر مستوجب قتل ہو جاتا ہے جس کے باعث اس کی صلاحیت تصرف باقی نہیں رہتی بخلاف شادی شدہ زانی یا قتل عمد کے مرتکب کے (کہ گو وہ بھی مستوجب قتل ہوتے ہیں لیکن ان کا حق تصرف بحال رہے گا) کیونکہ ان کے تحفظ کا سبب یعنی مسلمان ہونا باقی ہے۔ وہ قتل کے سزاوار بوجہ ارتکاب جرم کے ہوئے ہیں۔ پس ان کا حق ملکیت فی الواقع باقی رہے گا۔ بخلاف مرتدہ عورت کے، کیونکہ اسے حربیہ (برسر جنگ) تصور نہیں کیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ مرتدہ ہونے کے بعد اسے قتل نہیں کیا جاتا لیکن مرد مرتد ہو جائے تو وہ اپنے مال کا مالک نہیں رہتا جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔

امام ابو یوسفؒ اور محمدؒ فرماتے ہیں کہ مرتد کے کیے ہوئے تمام معاملات کا لاگو کرنا جائز ہے خواہ مرتد ہونے سے پہلے کے معاہدے ہوں یا بعد کے کیونکہ صحت معاملہ کا انحصار اہلیت پر ہے اور اس پر عملدرآمد ہونے کا انحصار مالک ہونے پر

ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کو معاملہ کا اہل تو مانا گیا ہے کیونکہ اس کے افعال پر (اس سے) باز پرس ہوتی ہے۔ اسی طرح اسے حق ملکیت بھی ہے کیونکہ مرنے سے پہلے وہ حق باقی رہتا ہے اور مرتد ہو جانے سے وہ حق زائل نہیں ہو جاتا۔ کیونکہ وہ مکلف (احکام کا پابند) ہوتا ہے اور اس پر لازم ہے چنانچہ مالک تصرف ہوئے بغیر وہ (ان) احکام کو بجا نہیں لاسکتا اور قتل ہو جانے تک تصرف کا حق باقی رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر مرتد ہونے کے چھ ماہ بعد اس کی مسلمان بیوی سے بچہ پیدا ہو جائے تو وہ بچہ اس کے مرنے کے بعد اس کے مال کا وارث ہوگا۔

یہ اصحاب کہتے ہیں کہ اگر ایک مرتد کے بارے میں دارالحرب میں منتقل ہو جانے کا فیصلہ ہو گیا ہو اور وہ پھر مسلمان ہو کر دارالاسلام میں آجائے تو وہ مال جو بعینہ اس کے وارثوں کے قبضہ میں تھا وہ ان سے حاصل کر سکتا ہے کیونکہ وہ مال اس کے وارثوں کو اس لیے منتقل ہوا تھا کہ وہ دارالحرب میں چلے جانے کے بعد قانونی طور پر (حقیقی طور پر نہیں) اس مال سے مستثنیٰ قرار دیا گیا لیکن جب مسلمان ہو کر واپس آ گیا اور اس مال کا مطالبہ کرے تو وارثوں پر اسے فوقیت دی جائے گی۔ بجز اس صورت کے جبکہ وارثوں نے اس مال کو اپنی ملکیت سے خارج کر دیا ہو اسی طرح اس کی ام ولد لوٹیاں اور مدبر غلام پر بھی یہ حکم عائد نہ ہوگا کیونکہ اس کا فیصلہ دلیل قطعی کی بناء پر ہو چکا ہے جو ٹوٹ نہیں سکتا۔ لیکن اگر (مرتد کی بابت) قاضی کا فیصلہ صادر ہونے سے پہلے ہی وہ مرتد واپس آجائے تو گویا وہ مسلمان ہی رہا (یعنی مرتد ہوا ہی نہ تھا) اس حالت میں بدستور وہ اپنے اموال کا مالک رہے گا اور جو قرضہ اس کے اوپر تھا وہ اپنے وقت پر واجب الادا ہوگا۔

نابالغ (بچے) یا جنون زدہ کے مرتد ہو جانے کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ وہ نابالغ جس میں عقل ہو اگر نادانستہ طور پر مرتد ہو جائے تو اس کو مرتد قرار دیا جائے گا۔ اس کا نکاح باطل ہو جائے گا اور میراث سے محروم ہو جائے گا۔ اس کو مسلمان ہونے کے لیے کہا جائے گا۔ لیکن قتل نہیں کیا جائے گا اگر حالت کفر میں سن بلوغ کو پہنچ جائے تو اسے (مرتدہ) عورت کی طرح قید میں رکھا جائے گا اور صاحب شعور نابالغ لڑکے کے اسلام کو، اسلام مانا جائے گا کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ عہد طفولیت میں، جبکہ وہ پانچ سال کے تھے مسلمان ہوئے اور آنحضرت ﷺ نے ان کے اسلام کی تصدیق فرمائی اور خود سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حالت طفلی میں مسلمان ہو جانے پر فخر فرمایا ہے: سبقتکموا الی الاسلام طراً غلاماً ما بلغت اوان حلمی“ (یعنی میں نے اسلام لانے پر تم پر سبقت کی جبکہ ہنوز میں نو عمر تھا اور عمر بلوغ کو نہیں پہنچا تھا)۔

نابالغ کا اسلام اس لیے بھی قابل تسلیم ہے کہ اس نے حقیقت اسلام کا اعتراف کر لیا جس سے مراد زبانی تصدیق و اقرار ہے باقی رہی دل کی تصدیق سو اس کا (زبانی) اقرار ہی اس کی دلیل بھی ہے۔ لہذا اس کو بھی تسلیم کر لیا جائے گا۔ چنانچہ عقائد قلبی کے متعلق احکامات کا انحصار (اسی اقرار باللسان) پر ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ (کسی امر کا) رضا کارانہ اعتراف کر لینا عقیدہ (قلبی) کی دلیل ہے۔ نیز اس لیے بھی کہ نبی ﷺ نے ابن صیاد کو دعوت اسلام دی تھی۔ حالانکہ وہ اس وقت عہد طفولیت میں تھے اور بلوغت کو نہیں پہنچے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ سب سے بری بات ہوگی کہ ایسے شخص کو مسلمان نہ کہا جائے جو علم قرآن حاصل کرتا اور اس کی تعلیم

دیتا ہو۔ کلمہ شہادتین پڑھتا اور نماز ادا کرتا ہو۔

ان اصحاب کا کہنا ہے کہ حقیقت اسلام (کے اظہار کو) رد نہیں کیا جاسکتا اور یہی بنیادی حکم ہے جس کے ساتھ دائمی خوش بختی اور نجات آخرت، کہ یہی سب سے بڑا فائدہ ہے، وابستہ ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے فوائد کی جڑ یہی ہے۔ لہذا اگر اس میں کوئی شائبہ ضرر ہو تو اس کو نظر انداز کیا جائے گا۔ پھر یہ بھی ہے کہ ایسے شخص کی (جو اقرار باللسان کرے) نماز روزہ مقبول ہیں اور اللہ ان کا اجر دیتا ہے۔

ان اصحاب کا کہنا یہ بھی ہے کہ مرتد ہونا بھی ایک امر واقعہ ہے اور اس امر واقعی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جیسا کہ مسلمان ہونے کے بارے میں بتایا گیا۔ اگر ارتداد سے انکار کیا جائے تو یہ جرم ارتداد کو معاف کر دینا ہوگا، اور یہ ایک امر قبیح ہے۔ البتہ اس کو مسلمان ہونے پر مجبور کیا جائے گا۔ کیونکہ اسی میں اس کا فائدہ ہے۔ اور اسے قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ قتل ایک سزا ہے اور رحم کے پیش نظر (بچوں کی) سزا سے درگزر کیا جائے گا۔ یہ حکم ایسے نابالغ (بچے) کے بارے میں ہے جو عقل رکھتا ہو اگر بچہ بے عقل ہے تو اس کا مرتد ہونا بے معنی ہے۔ اس کے (عمل) ارتداد سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس نے اپنا عقیدہ بدل لیا ہے۔ اسی طرح اس کا اسلام لانا بھی کچھ معنی نہیں رکھتا کیونکہ وہ بے شعور ہے۔ غرض اس کا اسلام اور ارتداد غیر معتبر ہے۔

جنون زدہ کا مرتد ہو جانا بالاتفاق درست نہیں ہے اور نہ مسلمان ہونا درست ہے کیونکہ وہ غیر مکلف ہے (جس پر احکام عائد نہیں ہوتے) اور بموجب حدیث شریف وہ مرفوع القلم ہے (یعنی جوابدہی سے بری ہے)۔

امام ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ عقل رکھنے والے بچے کا نہ مرتد ہونا ارتداد ہے اور نہ مسلمان ہونا اس کا اسلام لانا ہے۔ شافعیہ کہتے ہیں صاحب عقل بچے کا مرتد ہو جانا ارتداد نہیں ہے۔ اسی طرح اس کا مسلمان ہونا بھی اس کا اسلام نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا اسلام ماں باپ کے اسلام کے تابع ہے۔ اس کا اصلی اسلام نہیں (بلکہ نقل) ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ مسلمان ہونے میں اس کا نقصان ہے لہذا وہ اسے اپنا نہیں سکتا اور مرتد ہونے میں تو نقصان ہی نقصان ہے لہذا اس کے مسلمان ہونے یا ترک اسلام کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔ کیونکہ وہ غیر مکلف ہے اور اس میں اس کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہے۔ وہ غیر مکلف ہے اور اختیار سے محروم ہے (اس نے تو محض ماں باپ کی پیروی کی ہے) اسی طرح جنون زدہ مرتد کے ارتداد کو بھی صحیح نہیں مانا جائے گا۔ کیونکہ وہ غیر مکلف (یا غیر ذمہ دار) ہے ان کی بات نہ کسی گنتی میں ہے نہ اعتقاد۔ لہذا ان کے فعل ارتداد کو مرتد ہونا تصور نہ کیا جائے گا۔

یہی مال، تبراً اسلام سے برگشتہ کیے جانے والے شخص کا ہے۔ بشرطیکہ اس کے دل کو اپنے ایمان پر اطمینان ہو چنانچہ قرآن کریم میں اس کی تصریح ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”من کفر باللہ من بعد ایمانہ الا من اکوہ وقلبه مطمئن بالا یسمان، ولکن من شرح بالكفر صدراً فعلیہم غضب من اللہ، ولہم عذاب عظیم“ (النحل: ۱۰۶) (یعنی جو ایمان لانے کے بعد اللہ سے کفر کرے وہ بھی مستحق غضب الہی ہے بجز اس صورت کے جبکہ اسے کفر پر مجبور کیا جائے۔ اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہے لیکن جس نے بخوشی خاطر کفر اختیار کر لیا تو وہ اللہ کے غضب اور عذاب مستحق ہے)۔

جنون زدہ شخص اگر مرتد ہو جائے اور ہنوز اسے توبہ کرنے کو نہیں کہا گیا کہ جنون طاری ہو تو اس حال میں اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ ممکن ہے کہ جنون سے اسے افاقہ ہو جائے اور پھر مسلمان ہو جائے۔ تاہم اگر حالت جنون میں ہی اسے قتل کر دیا جائے تو قاتل پر جرم قتل عائد نہ ہوگا۔ البتہ اسے سزا دی جائے گی بجز اس صورت کے جبکہ اس شخص کا بالارادہ مرتد ہونا ثابت ہو یا جرم قذف کے مرتکب ہونے کا اعتراف کرے یا مستوجب قصاص ہے اور اس پر جنون طاری ہو گیا۔ تو ایسے شخص کو (ان جرائم کی) سزا اس حالت میں دی جائے گی جب اسے جنون سے افاقہ ہو۔

بچے کے بالغ ہو کر مرتد ہو جانے کا بیان

حنفیہ رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ چار حالتوں میں مرتد واجب القتل نہیں ہوتا:

ایک تو وہ بچہ جو ماں باپ کی اتباع میں مسلمان ہوا لیکن بالغ ہو کر مرتد ہو گیا اسے قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ قید میں رہے گا یہاں تک کہ توبہ کر لے۔ کیونکہ اس کا اسلام دوسروں کے دیکھا دیکھی تھا لہذا وہ مشتبہ اسلام قرار پا کر قتل کو ساقط کر دے گا۔

ثانیہ کہ وہ بچہ بھی یہی ہے کہ اسے ضرب و قید سے مجبور تو کیا جاسکتا ہے لیکن قتل نہیں کیا جائے گا۔

شافعیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ اس بچے کو مرتد قرار دیا جائے گا۔ اگرچہ وہ اسلام میں ماں باپ کا صرف پیرو تھا، پس اسے توبہ کرنے کے لیے کہا جائے۔ اگر ارتداد سے توبہ کر کے وہ پھر حلقہ اسلام میں آجائے تو اس کو تسلیم کر لیا جائے۔ اور اسے چھوڑ دیا جائے ورنہ مرتد کی طرح قتل کر دیا جائے۔

دوسرے یہ کہ کم سنی میں کوئی بچہ مسلمان ہوا اور بالغ ہو کر مرتد ہو جائے تو اسے بھی قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ عہد طفلی کے اسلام کو تسلیم کرنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، لہذا الزام مشتبہ ہو گیا، شافعیہ کا کہنا بھی یہی ہے تاہم اگر کوئی شخص اس کے دوبارہ مسلمان ہونے سے پہلے اسے قتل کر دے تو بصورت موجودہ اس قاتل پر کوئی الزام عائد نہ ہوگا۔ اور اگر اس کا کوئی مسلمان قرابت دار مر جائے تو وہ وارث بھی نہ ہوگا۔

مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی بچپن میں مسلمان ہو جائے اور بالغ ہو کر مرتد ہو جائے تو بطور مرتد کے اسے قتل کر دیا جائے گا اور اس پر احکام مرتد لاگو ہوں گے۔

تیسرے یہ کہ عہد طفلی (یا بچپن) کی حالت میں مرتد ہونے والے (کے فعل) کو ارتداد تسلیم نہیں کیا جائے گا اور اس پر کوئی عمل درآمد نہ ہوگا۔ البتہ اسے قید کر لیا جائے اور اسے مارا پیٹا جائے یہاں تک کہ وہ توبہ کر لے۔ کیونکہ مسلمان ہو جانا ہی اس کے لیے زیادہ مفید ہے۔ پس اس کے لیے اسے مجبور کیا جاسکتا ہے اور سخت سزا دی جائے گی تاکہ وہ باز آئے اور صدق دل سے توبہ کر لے۔

چوتھے یہ کہ جبریہ مسلمان ہونے والا اگر مرتد ہو جائے تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ اسے دکھاوے کا مسلمان مانا گیا ہے، ظاہر ہے کہ اس کے سر پر تلوار کا ہونا اس امر کا ثبوت ہے کہ دل سے اس نے عقیدہ اسلام کو نہیں مانا، پس اس کے امر اسلام کے مشتبہ ہو جانے کے باعث قتل کا حکم ساقط ہو جائے گا۔

شافعیہ کا کہنا بھی یہی ہے، کہ وہ مکلف نہ تھا اور ایسا شخص تھا جسے (اسلام لانے پر) مجبور کیا گیا لہذا اس کے فعل

(ارتداد) پر باز پرس نہ ہوگی۔

چاروں علمائے فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر نعوذ باللہ۔ کسی کے والدین مرتد ہو جائیں اور ساتھ ہی ان کا بچہ بھی مرتد ہو جائے اور پھر وہ دارالحرب میں چلے جائیں، اور ان کے کفر کا فیصلہ (قانونی طور پر) ہو جائے تو اس بچے کے مرتد ہونے کو درست مان لیا جائے گا اور بالاتفاق ان سب پر احکام کفر لاگو ہوں گے۔ پھر اگر وہ بچہ مسلمان ہو جائے تو بالاتفاق اس کے اسلام لانے کو تسلیم کر لیا جائے گا، اور شریعت کی رو سے اس کا مسلمان ہونا مسلم ہوگا، لیکن وہ اپنے کافر ماں باپ کا وارث نہ ہوگا البتہ وہ اپنے ایسے مسلمان قرابت داروں کا وارث ہوگا جو اس کے مسلمان ہونے کے بعد وفات پائیں۔ مشرکہ عورت کے ساتھ اس کا نکاح درست نہ ہوگا، ہاں مسلمان عورت سے نکاح درست ہے، اور اب سور یا شراب (کا اگر مالک تھا) پر اس کی ملکیت جاتی رہے گی۔

اگر ایک مسلمان اور اس کی بیوی دونوں نعوذ باللہ۔ مرتد ہو کر دارالحرب میں چلے جائیں اور اس کی بیوی حاملہ ہو کر بیٹا جنے اور پھر اس کے بیٹے کے ہاں بھی بیٹا پیدا ہو جائے پھر مسلمانوں کو ان سب پر غلبہ حاصل ہو تو دونوں باپ (یعنی لڑکوں کے باپ اور دادا) قبی (مال غنیمت) ہوں گے، کیونکہ مرتدہ عورت تو لونڈی بنالی جاتی ہے اور اس کا لڑکا بھی اس کے ساتھ ہوتا ہے، اب پہلا لڑکا جو ہے اسے اسلام لانے پر مجبور کیا جائے گا (کیونکہ وہ مرتد کی حیثیت میں ہے) بیٹے کے بیٹے کو مجبور نہیں کیا جائے گا کیونکہ پوتا (مسلمان ہونے میں) اپنے دادا کا پیرو نہیں تھا کہ (اسے مرتد قرار دیا جاتا) بلکہ وہ اپنے باپ کا پیرو تھا (لہذا وہ کافر ہی رہا اور مرتد قرار نہیں دیا گیا) آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے ”کل مولود یولد علی الفطرۃ فابوہ یہودانہ وینصرانہ“ (یعنی ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی بنا لیتے ہیں)۔

نشہ کی حالت میں مرتد ہو جانے یا اسلام لانے کا بیان

حنفیہ، مالکیہ اور ایک روایت کے بموجب حنا بلہ بھی کہتے ہیں کہ مخمور انسان (جو نشہ کی حالت میں ہو) اگر عقل سے خالی اور فہم و ادراک سے عاری ہو اس کی مثال ایک مجنون کی سی ہے کہ اس کا مرتد ہونا کچھ معنی نہیں رکھتا اور اس حالت میں اسلام لانا بھی درست نہیں ہے، پس بالاتفاق جنون زدہ کا ارتداد لاگو نہ ہوگا، کیونکہ ارتداد کی بنیاد عقیدہ (یا خیال) کو تبدیل کرنے پر ہے اور یہ معلوم ہے کہ انسان نشہ کی حالت میں جو کچھ کہتا ہے اس کا قصد نہیں ہوتا اور اس حالت میں طلاق جو واقع ہو جاتی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ طلاق میں قصد کرنا ضروری نہیں ہے، چنانچہ بھولے سے طلاق دے دی جائے تو وہ طلاق پڑ جاتی ہے۔

حنفیہ کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ اگر وہ نشہ کسی امر ممنوع ارتکاب سے لاحق ہوا ہو اور وہ امر کسی نے بلا جبر واکراہ اختیار کیا ہو تو اس حالت میں ارتداد کا حکم لاگو ہوگا اور وہ جرم ناقابل معافی ہے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر حالت نشہ کے معاملات لاگو ہوتے ہیں مثلاً طلاق وغیرہ تو اس حالت میں مرتد ہونا بھی لاگو ہوگا، نشہ کی حالت میں توبہ کے لیے کہنے کے بارے میں دورائیں ہیں: ایک تو یہ کہ اس حال میں توبہ کی ترغیب کرنا درست ہوگا جیسا کہ اس کے مرتد ہو جانے کو تسلیم کیا جاتا ہے عام خیال یہی ہے اور اسی پر فتویٰ ہے، تاہم بہتر یہ ہے کہ نشہ دور ہو جانے تک توقف کیا جائے تاکہ اس سے اختلاف نہ رہے جو کہتا ہے کہ ایسے شخص کی توبہ قبول نہ ہوگی، یہی دوسری رائے ہے

کہ اس حالت میں شبہ باقی رہتا ہے۔

اگر ایسا نشہ ہو جو متعدی نہ ہو (جس میں قول و فعل لاگو نہیں ہوتا) مثلاً اس شخص کا نشہ جسے جبراً نشہ آور چیز پلائی گئی ہو تو اس نشہ کی حالت میں مرتد ہونے سے ارتداد لاگو نہ ہوگا۔

اس سلسلہ میں قابل ترجیح مسلک یہ ہے کہ حالت نشہ میں مرتد ہو جانے سے اسلام باقی رہتا ہے، پس اگر کوئی شخص نشہ دور ہونے پر مرتد ہوا اور پھر مسلمان ہو گیا تو اس کا فعل ایسا ہی سمجھا جائے گا جیسے بے نشہ انسان کا فعل۔

واضح ہو کہ نشہ کی حالت میں مسلمان ہونے والے کو مسلمان شمار کیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ نشہ دور ہو جانے کے بعد اسے اپنے اسلام کی تجدید و ضروری کرنی ہوگی، لیکن ان اصحاب کا کہنا ہے کہ نشہ اتر جانے کے بعد اس کے سامنے اسلام پیش کیا جائے گا اور اگر اس نے مان لیا تو اسلام کے تسلیم کیے جانے پر اسے مسلمان شمار کیا جائے گا، لیکن اگر اسلام کی بجائے اس نے کافر ہونا پسند کیا تو اسی وقت سے اس کو کافر تصور کیا جائے گا، اور اس سے پہلے اس کو مسلمان مانا جائے گا، اور اگر توبہ نہ کرے تو قتل کر دیا جائے گا (کیونکہ وہ اسلام سے مرتد ہوا)۔

ارتداد کے اقرار یا شہادت کا بیان

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی مرتد ہو جانے کا اقرار کرے (یا شہادت دے) تو غیر مشروط طور پر قبول کر لیا جائے گا اور مزید تفصیل کے بغیر اس پر فیصلہ صادر کر دیا جائے گا، کیونکہ مرتد ہونے میں جو خطرات ہیں ان کے پیش نظر کوئی شخص بغیر سوچے سمجھے اقدام اقرار (یا شہادت) نہیں کر سکتا، اس پر قاضی کہے گا کہ کلمہ شہادتین زبان سے ادا کر، اس کی ضرورت نہیں ہے کہ اس سے یہ دریافت کیا جائے کہ کیوں ترک اسلام کیا؟ اگر مرتد کلمہ شہادت کے ادا کرنے سے انکار کرے تو یہ انکار ہی مرتد ہونے کا ایک قرینہ ہے اب یہ پوچھنے کی حاجت نہیں ہے کہ کیوں ترک اسلام کیا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس میں تفتیش واجب ہے اور سبب ارتداد کا دریافت کرنا اس لیے ضروری ہے کہ اسباب کفر کے متعلق مختلف رائیں ہیں اور کسی کو اسلام سے برگشتہ (یا مرتد) قرار دینا بڑی بات ہے۔ پس اس میں احتیاط سے کام لینا واجب ہے اور یہی طریق قطعی ہے کیونکہ ایسا ہوا کرتا ہے کہ بعض باتوں پر جو کفر نہیں ہیں کفر کا گمان ہو جاتا ہے لہذا قاضی کو دریافت کر لینا چاہیے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ مرتد کی توبہ قبول نہیں ہوتی لہذا تفتیش کے بغیر شہادت کو قبول نہیں کیا جائے گا۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ (مرتد ہو جانے کے بارے میں) دو معتبر اشخاص کی شہادت درکار ہے کہ فلاں مسلمان دین اسلام سے پھر گیا (مرتد ہو گیا) پھر قاضی ان کو اہوں سے دریافت کرے گا کہ تم کیوں اسے مرتد کہتے ہو، ممکن ہے کہ وہ ایسی وجہ بیان کریں جو فی الواقع کفر نہیں ہے لیکن ان کے نزدیک کفر ہے: اور اس لیے بھی (تفتیش لازم ہے) کہ اگر وہ شخص اس الزام سے انکار کرے تو یہ توبہ اور دوبارہ اسلام میں داخل ہوتا ہے۔

مرتد کے توبہ کرنے کا بیان

حنفیہ کہتے ہیں کہ مرتد کی توبہ یہ ہے کہ وہ بجز اسلام کے تمام مذاہب سے بیزاری کا اظہار کرے اور کہے کہ ”میں نے توبہ کی اور پھر دین اسلام میں داخل ہو گیا اور بجز دین اسلام کے ہر دین سے بیزار ہوں“ ساتھ ہی قیامت کا اور پھر زندہ ہونے کے عقیدے کا اظہار کرے یہ امر مستحب ہے اور وہ اس طرح بدیں جہت کہتا ہے کہ اس کا کوئی دین نہیں ہے (یعنی اب دین اسلام میں داخل ہو رہا ہے اور اگر وہ اس دین سے بے تعلقی کا اظہار کرے جو اس نے (اسلام کو چھوڑ کر) اختیار کر لیا تھا تو یہ بھی توبہ کے لیے کافی ہے کیونکہ اس سے دین اسلام میں واپس آ جانے کا مقصد پورا ہو گیا۔

طحاویؒ کہتے ہیں کہ امام ابو یوسفؒ سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ مسلمان کس طرح بنتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ وہ یوں کہے کہ ”اشھد ان لا اله الا الله، وان محمداً عبده ورسوله“ (یعنی میں اقرار کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اس کے بندے اور رسول ہیں) ساتھ ہی وہ اس وحی پر ایمان لائے جو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ پر نازل فرمائی اور جب اس نے اس مذہب سے بیزاری کا اظہار کیا جو اس نے (ترک اسلام کر کے) اختیار کر لیا تھا اور اس امر کو تسلیم کر لیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں اور کہتا ہے کہ میں اب ہرگز اس مذہب میں داخل نہ ہوں گا میں اس دین سے بیزار ہوں جو میں نے اسلام سے پھر کر اختیار کر لیا تھا، تو یہی اس کی توبہ ہے۔ شرح طحاوی میں آیا ہے کہ عیسائی کے مسلمان ہونے کا یہ طریقہ ہے کہ وہ کہے اشھد ان لا اله الا الله، وان محمداً عبده ورسوله، (یعنی میں مانتا ہوں کہ بجز اللہ کے اور کوئی معبود نہیں اور بلاشبہ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں) نیز عیسائیت سے بیزاری کا اظہار کرے۔ اور یہودی بھی اسلام لائے تو اسی طرح یہودیت نیز ہر مذہب سے بیزاری کا اظہار کرے۔ محض کلمہ شہادت پڑھ لینے سے کوئی شخص مسلمان نہ ہوگا۔ کیونکہ لوگ اتنا تو مان لیتے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ اس رسالت کو محض اہل عرب کے لیے مخصوص قرار دیتے ہیں۔ ان میں اور مسلمانوں میں یہ نمایاں تفاوت ہے لیکن اگر دار الحرب کا کوئی شخص جبکہ مسلمان اس پر حملہ آور ہو یہ کہہ دے کہ ”محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں“ تو وہ مسلمان قرار پائے گا۔ یا وہ یوں کہے کہ میں نے دین اسلام اختیار کر لیا یہ کہے کہ میں اس دین میں داخل ہو گیا جو محمد ﷺ کا دین ہے تو یہ اس کے اسلام کا ثبوت ہوگا۔ اور اگر کلمہ شہادتین پڑھ لے تو کیوں نہ مسلمان قرار پائے؟ پس اس حالت میں اس کا یہ کہنا (کفر سے) باز آ جانا ہے۔ لہذا اتنا کچھ کہہ دینے ہی سے اسے مسلمان قرار دیا جائے گا اور قتل سے بچ رہے گا۔ لیکن اگر اس کے بعد مرتد ہو جائے تو اسے قتل کر دیا جائے گا اور اگر دوسری تیسری اور چوتھی بار بھی مسلمان ہو کر مرتد ہو تو اس کی توبہ قبول کی جائے گی غرض جتنی بار بھی وہ امام سے مہلت مانگے گا اسے مہلت (توبہ کے لیے) دی جائے گی لیکن چوتھی بار مسلمان ہو کر پھر کافر ہو جائے اور مہلت مانگے تو اب مہلت نہیں دی جائے گی۔ پھر بھی اگر مسلمان ہو جائے تو خیر ورنہ قتل کر دیا جائے۔

علامہ کرنی نے اپنی کتاب ’مختصر‘ میں بتایا ہے کہ اگر چوتھی بار پھر اسی طرح مرتد ہو جائے تو اسے سخت سزائے ضرب دی جائے لیکن اتنی نہیں کہ سزائے حد (یعنی شرعی سزائے تازیانہ) کے برابر ہو جائے اس کے بعد اسے قید میں رکھا جائے، یہاں تک کہ اس کے کردار سے توبہ کی عاجزی مشاہدہ میں آئے اور اس کی حالت سے خلوص ظاہر ہو تو ایسی حالت میں اسے

آزاد کر دیا جائے۔ اگر پھر وہی حرکت کرے تو ہمیشہ اس کے ساتھ یہی سلوک کیا جائے یہاں تک کہ بالآخر اسلام میں داخل ہو جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد عمومیت کا حامل ہے ”فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ فخلوا سبیلہم، ان اللہ غفور رحیم“ (التوبہ: ۵) (یعنی جب توبہ کر لیں اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے لگیں تو انہیں آزاد کر دو اللہ معاف کرنے اور رحم فرمانے والا ہے)۔

حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جو شخص بار بار مرتد ہوتا رہے، اس کی توبہ قبول نہ کی جائے۔ جیسے زندیق (کہ اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی) پس وہ قتل کر دیا جائے۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ ایسے کافر مرتد کی توبہ قبول نہ کی جائے جو بار بار اسلام سے پھرتا ہو۔ بلکہ اس کا قتل واجب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”ان الذین آمنوا ثم کفروا ثم آمنوا ثم کفروا، ثم اذدادوا کفراً لم یکن اللہ لیغفر لہم ولا لیہدیہم سبیلاً“ (النساء: ۱۳۷) (یعنی جو لوگ مسلمان ہوئے پھر کفر اختیار کیا اس کے بعد پھر مسلمان ہوئے پھر کافر بن گئے اور پھر کفر میں بڑھتے ہی چلے گئے تو اللہ ان کی مغفرت نہیں کرے گا اور انہیں راہ ہدایت سے محروم رکھے گا)۔ اگر ایسے شخص کو دوبارہ مسلمان ہونے (کا موقع پانے) سے پہلے ہی قتل کر دیا جائے تو قاتل پر نہ کوئی الزام ہوگا اور نہ قصاص لاگو ہوگا۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی زندیق یا مرتد توبہ کرنا چاہے اور پھر سے مسلمان ہو جائے تو اس کی توبہ قبول کی جائے۔ اگرچہ بار بار اس نے ایسا کیا ہو خواہ کتنی ہی بار وہ ایسا کر کے مسلمان ہوتا رہے اسے قتل نہ کیا جائے، یہاں تک کہ وہ مسلمان ہونے سے انکار کر دے (تب ہی وہ مستوجب قتل ہوگا)۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ زندیق کی توبہ کے بارے میں دو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ اس کی توبہ قبول نہیں ہے جیسا کہ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کی رائے ہے اور دوسری یہ کہ اگر وہ رجوع کر لے تو اس کی توبہ قبول کر لی جائے جیسا کہ شافعیؒ کہتے ہیں۔ لیکن اس کا تعلق احکام دنیا سے ہے رہا اللہ کے ساتھ اس کا معاملہ سوا اگر وہ سچا ہے تو بالاتفاق اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائے گا۔

مرتد کے متعلق احکامات

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی بستی کے لوگ مرتد ہو جائے تو اس بستی کو دار الحرب قرار دیا جائے گا۔ بشرطیکہ اس میں یہ تین شرطیں پائی جائیں۔

اول: کفر کا غلبہ ہونا۔

دوم: یہ کہ اس بستی میں کوئی مسلمان نہ ہو اور نہ کوئی باقاعدہ ذمی مسلمان کی امان میں ہو۔

سوم: یہ کہ اسے دار الحرب قرار دے دیا گیا ہو۔

واضح ہو کہ مرتدین کے ساتھ سب سے پہلی جنگ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کی۔ ان لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا اور کہا کہ وہ تو صرف اس کو زکوٰۃ دیں گے جس کی نماز ان کے سکون کا موجب ہوگی یعنی نبی ﷺ کو اور یوں وہ مقام دار الحرب ہو گیا۔

مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ جب کسی بستی میں کافرانہ امور کا غلبہ ہو جائے تو وہ دار الحرب ہو جاتی ہے۔

حنفیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی بستی کے لوگ مرتد ہو جائیں تو مرتد ہونے کے بعد ان کی ذریت کو مال غنیمت بنا لینا جائز نہیں ہے اور نہ ہی انہیں مملوک (لونڈی غلام) بنایا جائے گا، بلکہ انہیں مسلمان ہونے پر مجبور کیا جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائیں۔ بالغ ہو جانے پر اگر وہ مسلمان نہ ہوں تو انہیں قید کر لیا جائے اور ان پر مسلمان ہونے کے لیے تشدد کیا جائے گا اور ان کی ذریت کو مملوک بنالیا جائے۔

شافعیہ کی دورائیں ہیں جن میں صحیح رائے یہ ہے کہ انہیں مملوک (غلام لونڈی) نہ بنایا جائے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کی اولاد اور اولاد کو مملوک بنالیا جائے گا۔

حنابلہ بھی کہتے ہیں کہ ان کی ذریات (بال بچوں) کو اور ذریات کی ذریات کو مملوک بنالیا جائے۔ کیونکہ کافروں کی نسل بھی کافر ہی ہوتی ہے۔

بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک جماعت کو آگ میں جلادیا تو وہ کہنے لگے کہ میں ہوتا تو انہیں آگ میں نہ ڈالتا، کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ کسی کو عذاب الہی جیسا عذاب یعنی آگ میں جلانے کا عذاب مت دو بلکہ انہیں قتل کر دیتا جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”من بدل دینہ فاقتلوه“ (یعنی جو مسلمان اپنا مذہب تبدیل کر لے اسے قتل کر دو) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان زندیقوں سے جنگ کی تھی جو مذہب مانوہ (یعنی انا پسندوں کے مذہب) کی پیروی میں دین اسلام سے برگشتہ ہو گئے تھے۔ یہ لوگ نور اور تاریکی کو قدیم مانتے تھے اور کہتے تھے کہ دنیا ان ہی سے بنی ہے۔

مرتد ہو جانے کا نتیجہ

حنفیہ کہتے ہیں کہ مرتد ہو جانے سے وہ تمام اعمال نیک جو ایک شخص نے ترک اسلام سے پہلے کئے ضائع ہو جاتے ہیں۔ پھر اگر کوئی مرتد توبہ کر کے پھر دائرہ اسلام میں داخل ہو جائے تو، گو اس نے اس وقت کی نماز پڑھ لی تھی مسلمان ہو جانے کے بعد دوبارہ اسے ادا کرے۔ اسی طرح دوسری بار حج کرنا بھی واجب ہے۔ اگرچہ پہلے حج کر چکا ہو اور ثواب کے ساقط ہو جانے سے عمل (کا وجوب) ساقط نہیں ہوتا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر ناجائز قبضہ کئے ہوئے گھر میں نماز ادا کی جائے تو وہ نماز درست ہوگی یعنی اس کی قضا واجب نہیں ہے لیکن اکثر علماء کے نزدیک اس نماز کا ثواب نہ ہوگا۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ مرتد اگر حالت ارتداد میں مرجائے تو اس کے پچھلے تمام اعمال راکاں ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”ومن یرتد منکم عن دینہ فیمت وهو کافر فاولئک حبطت اعمالہم فی الدنیا والآخرۃ“ (یعنی تم میں سے جو لوگ اپنے دین اسلام سے پھر جائیں اور حالت کفر میں مرجائیں تو ان کے اعمال دین و دنیا دونوں رائیگاں ہیں) نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”ولقد اوحی الیک والی الدین من قبلک لئن اشرکت لیسحبطن عملک ولتکونن من الخاسرین اور تم سے پہلے والوں کو یہ حکم بذریعہ وحی بھیجا گیا کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارا عمل راکاں جائے گا اور تم خسارے میں رہو گے) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”ومن یکفر بالایمان فقد حبط

گناہ کبیرہ کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”اجتنبوا السبع الموبقات قالوا: یا رسول اللہ ما هن؟ قال: الشرب، والشکر، والسر، وقتل النفس التي حرم اللہ الا بالحق واکل الربا، واکل مال الیتیم، والتولی یوم الزحف، وقذف المحصنات المثلثات الغافلات“ بخاری و مسلم (یعنی لوگوں کو سات ہلاک کرنے والی برائیوں سے بچو عرض کیا گیا، یا رسول اللہ وہ کون کون سی ہیں؟ ارشاد فرمایا۔ شرک، جادو، قتل نفس جس کا ناحق ارتکاب اللہ نے حرام کیا ہے، سود کھانا، یتیم کا مال ہضم کرنا، لشکر کشی کے دن پیٹھ دکھانا، اور بے قصور، ایمان دار اور بھولی بھالی خواتین پر تہمت لگانا)۔

اب اس حدیث کی تشریح میں ان چند امور کی وضاحت کی جاتی ہے:

(۱) اس حدیث کے معنی (۲) کیا کبیرہ گناہ انہی امور پر منحصر ہیں (۳) جادو کی تعریف اور اس پر مرتب ہونے والے نتائج۔

اس حدیث کے معنی

یہ حدیث جن اہم مسائل پر مشتمل ہے وہ دین اسلام کے ناگزیر مسائل ہیں اور سب کو معلوم ہیں۔ چنانچہ ہر مسلمان جانتا ہے کہ اللہ کا شریک بنانا پروردگار عالم سے کفر (انکار) ہے جس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے ہر وہ شے مہیا فرمائی جو دنیا کی زندگی میں اسے درکار تھی۔ مثلاً کھانے پینے کی اشیاء، ہوا، سورج، چاند اور زمین و آسمان اور باقی دوسری اشیائے عالم جن کو اللہ تعالیٰ نے انسان ضعیف کے لیے پابند فرمایا حالانکہ انسان کو نہ اپنی حیات و موت کا اختیار ہے اور نہ اپنے نفع و نقصان کا۔ کون مسلمان ایسا ہے جس سے یہ حقیقت مخفی ہے کہ اللہ تعالیٰ جو اپنے بندوں کا آقا ہے اس کے ساتھ کسی کو شریک بنانا کفر صریح ہے اور اس ذات پاک سے کھلی عداوت ہے۔ پس مشرک وہی ہے جو احمق ہو کہ خود اپنی ہستی اور ماحول میں پھیلے ہوئے ان مظاہر قدرت سے بے خبر ہے جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور لاشریک ہونے کے دلائل ہیں۔ کون ایسا عقل والا ہے جو اپنے پروردگار کا انکار کرے جس نے انسان کو ایک ناچیز پانی سے پیدا کیا اور اسے پورا انسان بنادیا، یا اس کی مخلوقات میں سے کسی کو اس کی معبودیت میں شریک کرے؟ خواہ اس کی پرستش صدق دل

عملہ، (یعنی جو شخص ایمان سے ہٹ گیا اس کی نیکی ضائع ہوگئی) ان کے علاوہ اور بھی آیات ہیں جن سے اعمال کے ضائع

سے کرتا ہو یا نفاق سے یا کاری کے طور پر یا کسی دنیوی غرض سے کہ اگر وہ غرض پوری ہو جائے تو خوش ہے اور اگر دشواری پیش آئے تو منہ موڑ لے۔ غرض اس میں کوئی شک نہیں کہ جو شخص اللہ کے ساتھ کسی اور کی بندگی کرتا ہے اور ایک اندھے بہرے جانور کی مانند ہے جو ایسے شواہد کی طرف دھیان نہیں دیتا جنہیں معمولی سا فہم و شعور رکھنے والا انسان سمجھ سکتا ہے۔ اس کی خلاتی و رزاتی میں کسی اور کو شامل کرنا اس اللہ کی ہستی سے انکار کرنا ہے جس کا کوئی ثانی اس کی صفت خاصہ یعنی خلق و ایجاد میں نہیں ہے^(۱)

اور کون مسلمان یہ نہیں جانتا کہ قتل ناحق تمام جرائم میں سب سے بڑا جرم ہے جس کا اثر انسانی معاشرہ پر نہایت برا پڑتا ہے اس کی خرابی اور قابل مذمت ہونے کا پورا ثبوت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوتا ہے ”وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِدًا فَعِزَّاهُ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَاعْدَلَهُ عَذَابًا عَظِيمًا“ (یعنی جس نے کسی مسلمان کو عمدہ قتل کیا اس کی سزا دائمی جہنم ہے۔ اس پر اللہ کی لعنت ہے اور اس کے لیے عذاب سخت رکھا گیا ہے)۔ پھر وہ کون سا مسلمان ہے جس سے یہ امر پوشیدہ ہے کہ سود کھانا حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔ کیونکہ اس کا انجام حاجت مندوں کی خواری اور ان کا استحصال ہے۔ سود خوار اس طرح جمع کر کے عیش کرتا ہے اور لوگوں کا مال ہتھیا کر اپنے پاس اکٹھا کر لیتا ہے اور اسے فلاح

ہونے اور ثواب کے راگال جانے کا ثبوت ملتا ہے۔ پس اگر مرتد پھر مسلمان ہو جائے اور حج واجب ہو تو اس کا ادا کرنا لازم ہے کیونکہ وہ حج جو اس نے مرتد ہونے سے پہلے کیا تھا وہ ضائع ہو گیا لہذا اب پھر حج کرنا ہوگا۔

۱۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”فَاطْرُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ، جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَمِنَ الْأَنْعَامِ أَزْوَاجًا، يَذُرُكُمْ فِيهِ لِيَصْطَفِيَ لَكُمْ مِنْهُمْ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ“ (شوری: ۱۱) (یعنی اللہ آسمان و زمین کا بنانے والا ہے اس نے تم میں سے تمہارے جوڑے بنائے اور جانوروں میں بھی جوڑے بنائے اور اس کائنات میں تمہیں پھیلا دیا۔ کوئی اس کی نظیر نہیں ہے وہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے) اللہ صاحب قدرت و حکمت ہے جس نے آسمان و زمین پیدا کئے اور تمام اجرام و اجسام و آب و باد کو پیدا کیا اور ہماری نوع انسانی میں سے ہمارے جوڑے بنائے اور آٹھ قسم کے جانور: اونٹ، بیل، بھیڑ، بکری اور ان کی مادائیں بنائیں وہی ہے جو ماں کے پیٹ میں بچہ کی تخلیق فرماتا اور جس شکل میں چاہے ڈھال دیتا ہے۔ اس کی عظمت و کبریائی، اس کی بادشاہی، اس کے اسمائے حسنیٰ اور اس کی صفات عالیہ میں کوئی اس کی نظیر نہیں ہے۔ وہ اپنی مخلوقات میں سے کسی کے مشابہ نہیں ہے اور نہ کوئی شے اس کے مشابہ ہے۔ وہ اپنی ذات و صفات میں یکتا ہے نہ کوئی ہستی اس کی ہستی کی مانند ہے نہ کوئی صفت اس کی صفت کی مانند ہے صرف الفاظ میں مشابہت ہے۔ اس کی ذات قدیم اس سے بالاتر ہے کہ اسے کسی عارضی وصف سے متصف کیا جائے۔ پس چاہیے کہ اہل طبعیات اور طہرین جو راہ راست سے ہٹے ہوئے اور رب العالمین کے منکر ہیں اس ذات کی اہمیت سے عبرت و نصیحت حاصل کریں۔

معاشرہ اور انسان کے اصلاح حال میں صرف نہیں کرتا^(۱) پھر کون مسلمان یہ نہیں جانتا کہ یتیم کا مال کھانا، نہایت ہی ذلیل اور گھٹیا جرائم میں سے ہے۔ کہنے اور سنگدل اشخاص ہی یہ حرکت کرتے ہیں جن کے دل رحم اور انسانیت کے جذبہ سے عاری ہیں۔ یہ لوگ خون خوار جانوروں کی مانند بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ یہ امر بھی کسی مسلمان سے مخفی نہیں ہے کہ ہمارے دشمن جو وطن اور دین کی بے حرمتی پر آمادہ ہیں اور چاہتے ہیں کہ شرفائے قوم کو ذلیل کریں اور بے قصور کو اپنا غلام بنالیں ان کے ساتھ جنگ کرنے کا وقت آئے تو کسی کا پیٹھ دکھا جانا بدترین جرم اور سخت تباہی کا موجب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تمام باتیں گناہ کبیرہ تقاضائے انسانیت کے منافی اور شریفانہ زندگی سے بعید ہیں۔ کسی قوم میں جب یہ برائیاں راہ

۱۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”یا ایہا الدین آمنوا لاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تكون تجارة عن تراض منکم“ (النساء ۲۹) (یعنی مسلمانو تم ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر نہ کھاؤ۔ ہاں باہمی رضا مندی سے تجارت کر کے حاصل کیا ہوا مال روا ہے) واضح ہو کہ سود خوری ایسی شے ہے جس کے حرام ہونے پر تمام آسمانی مذاہب متفق ہیں، اس کے حرام ہونے کی بہت سی وجوہ ہیں۔ اس کی وجہ سے اسلامی معاشرہ، مفید اور منفعت بخش کاموں میں مشغول ہونے سے رہ جاتا ہے۔ کیونکہ مالدار شخص جب سود سے اپنے مال میں اضافہ کرنے اور نفع اندوزی میں پڑ جاتا ہے تو اسے بلا محنت کئے اسباب معاش بسہولت (بغیر کسی محنت کے) حاصل ہو جاتے ہیں۔ جس سے سستی بیکاری اور نکلے پن کی عادت پڑتی ہے اور حصول مال کی حرص پیدا ہو جاتی ہے (سود خور) دوسروں کے حقوق غصب کرنے میں رحم اور مہربانی کے جذبے سے عاری ہو جاتا ہے اور جس کے باعث افراد معاشرہ میں غریب اور امیر کا فرق بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔ پھر سود خوری سے باہمی بغض و عداوت اور حسد پیدا ہو جاتا ہے۔

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں ناروا طریقہ سے دوسروں کا مال کھانے اس کے ساتھ ساتھ قتل کرنے کا بھی ذکر کیا ہے۔ چنانچہ سود کی ممانعت کے معا بعد ارشاد ہے ”ولا تقتلوا انفسکم“ (یعنی اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو) مطلب یہ ہے کہ سود کے ذریعہ حصول مال میں، جان کو ہلاک کرنے اور خونریزی کی نوبت آ جاتی ہے پھر یہ بھی ہے کہ ”ربا“ (سود) نام ہے بغیر استحقاق کے مال حاصل کرنے کا اور یہ ظلم ہے جسے پر از حکمت شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس طرح (یعنی حق نہ ہو تو) حصول مال غیر شرعی (یا ناجائز ہے) حالانکہ ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون اور مال و متاع حرام ہے۔ سود خوری کا انجام تباہی و بربادی و ہلاکت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”یمنحی اللہ الربا ویربی الصدقات“ (یعنی اللہ تعالیٰ نے سود میں نقصان اور صدقہ میں نفع رکھا) ہے چنانچہ سود کھانے والوں اور اس سے توبہ نہ کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے عذاب رکھا ہے کہ دنیا میں خدا سے عداوت اور آخرت میں عذاب۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ”یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ و ذوروا ما بقی من الربا ان کنتم مؤمنین“ فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ ،

پاجائیں تو اس کا تباہ ہو جانا لازمی ہے۔

بے گناہ عورتوں پر تہمت لگانے اور اس کے ضرر رساں نتائج کا ذکر سابقاً حدود شرعیہ (یعنی اسلامی سزاؤں) کے بیان میں آچکا ہے۔

رہا جادو و سوا س کے نقصان دہ انجام کا ذکر آگے آرہا ہے:

نبی ﷺ نے جو امت پر سب سے زیادہ مہربان اور ”ما یسطق عن الہوی“ کے مصداق ہیں (یعنی فرمان الہی کے بغیر اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے) امت مسلمہ کو ان تباہ کن افعال کے ارتکاب کو سختی کے

وان تبتم فلکم رءوس اموالکم لا تظلمون ولا تظلمون“ (یعنی اے ایمان والوں اللہ کی نافرمانی سے ڈرو۔ اگر صاحب ایمان ہو تو سود جو لینا ہے اسے چھوڑ دو۔ اگر ایسا نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ساتھ اعلان جنگ سمجھو۔ ہاں اگر توبہ کر لو تو تم کو اپنا اس المال لینے کا حق ہے۔ بایں طور کہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم ہو) پس مسلمانوں کے لیے یہی مناسب ہے کہ حصول مال کے لیے شرعی وسائل سے کام لیں تاکہ جملہ معاملات معاشی و اقتصادی درست اور استوار ہوں اور یہ معاملات فقیروں اور محتاجوں کے ساتھ فریب، زیادتی اور عداوت سے پاک ہوں۔

واضح ہو کہ یتیم کا مال کھانا بھی سود کھانے اور مال حرام کا حریص ہونے سے زیادہ مذموم اور ضرر رساں ہے اور اس میں بہت زیادہ خرابیاں ہیں اسلامی شریعت نے اس سے منع فرمایا ہے اور اسے بہت بڑا عیب قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”آتوا الیتامیٰ اموالہم ولا تبدلو الخبیث بالطیب ولا تاکلوا اموالہم الی اموالکم انہ کان حوباً کبیراً“ (یعنی یتیموں کو ان کا مال دے دو اور اپنی پاک روزی کو ناپاک روزی میں تبدیل نہ کر دو یعنی یتیموں کے مال کو اپنے مال میں گڈمڈ کر کے استعمال میں نہ لاؤ، یہ گناہ کبیرہ ہے) نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”وابتلوا الیتامیٰ حتی اذا بلغوا النکاح، فان آنستم منهم رشداً فادفعوا الیہم اموالہم، ولا تاکلوها اسرافاً وبدواراً ان یکبروا، ومن کان غنیاً فلیستعفف، ومن کان فقیراً فلیاکل بالمعروف، فاذا دفعتم الیہم اموالہم فاشہدوا علیہم وکفی باللہ حسیباً“ (یعنی یتیموں کا جائزہ لیتے رہو یہاں تک کہ وہ شادی کے قابل ہو جائیں اور انہیں خوش اطوار پاؤ تو ان کا مال انہیں دے دو اور اس کو فضول خرچی اور فراخ دستی میں نہ لٹا دو کہ مبادا بڑے ہو کر تمہیں اس کا موقع نہ دیں۔ اگر کوئی غنی ہے تو یتیموں کے مال سے بچتا رہے ہاں اگر محتاج ہے تو مناسب طور سے اسے استعمال کر سکتا ہے اور جب یتیموں کا مال ان کے حوالے کرو تو اس کے لیے گواہ بنالو۔ یا رکھو اللہ محاسب کے لیے کافی ہے)۔

یاد رہے کہ شریعت نے یہ واجب قرار دیا ہے کہ سپرداری میں لینے والا یتیم کے مال کی حفاظت کرے بلکہ اس میں اضافہ کرنے کی کوشش کرے۔ اس مال میں سے کچھ بھی لینا روا نہیں ہے۔ ہاں ناگزیر حالات میں حسب ضرورت اس مال میں سے لے سکتا ہے لیکن فضول خرچی اور بلا ضرورت صرف میں نہ لائے۔ غرض تمام فقہاء کی متفقہ رائے یہ ہے کہ یتیم کے وصی (یا نگران حال) کو یتیم کا مال حلال نہیں ہے لہذا چاہیے کہ اسکے مال میں سے کچھ بھی نہ لے تاکہ انسانوں میں باہم

ساتھ منع فرمایا ہے جس کا نتیجہ دنیا اور آخرت دونوں جہانوں کی بربادی ہے ان جرائم سے انسان حیات دنیوی میں ذلت سے دوچار ہو جاتا ہے۔ اس کی برائیوں میں سے یہ بھی ہے کہ انسان نفسانی خواہشات میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ناقص طبع اشخاص ان سے لذت اندوز ہوتے ہیں پھر اس کے بعد (آخرت میں) ان

مہر و محبت کے روابط باقی رہیں۔ ایک شخص جس قدر دیانت داری سے کام لے گا اسی قدر اس کے ساتھ بھی دیانت برتی جائے گی جو شخص جیسا کرے گا ویسا ہی بھرے گا۔ ”ولبخش الذین لو ترکوا من خلفهم ذریۃ ضعیفا، خالفوا علیہم فلیتقوا اللہ ولیقولوا قولا سدیداً“ (یعنی چاہیے کہ لوگ خوف خدا کریں کہ اگر انہیں ناتواں بچے چھوڑ جانا ہو تو انہیں کس قدر فکر مندی ہو۔ غرض انہیں خدا خوفی سے کام لینا چاہیے کہ سیدھا طریقہ اختیار کریں یا انچ پیچ کی بات نہ کریں) اللہ تعالیٰ نے بوضاحت تمام ارشاد فرمایا ہے کہ یتیم کا مال ہڑپ کرنا، گویا آتش جہنم کا انگارا کھانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”ان الذین یا کلون اموال الیتامیٰ ظلماً، انما یا کلون فی بطونہم ناراً ویصلون سعیراً“ (یعنی جو لوگ یتیم کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں انہیں جلد ہی جہنم میں ڈالا جائے گا)۔

جنگ کے وقت پیٹھ دکھا جانا بھی (اسی طرح) کبیرہ گناہوں میں سے ہے اور نہایت ہی بری بات ہے۔ کیونکہ اس سے بزدلی (ایمان میں) کمزوری اور ذلت کا اظہار ہوتا ہے۔ حالانکہ اسلام مسلمان کو برتری، بہادری، ثابت قدمی اور معزز ہونے کی تعلیم دیتا ہے اور یہ بھی ہے کہ جنگ کے وقت دشمنوں کے مقابلہ سے گریز کرنا ملت اسلامیہ کو عزت و فوقیت اور شرف سے محروم کر دیتا ہے جس کے باعث دشمنان دین و اسلام کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے اور مسلمان قوم کی اخلاقی موت کا باعث ہے۔ مسلمان یا تو عزت اور بزرگی کے ساتھ زندہ رہنا چاہتا ہے یا پھر آزاد مردوں کی طرح شہادت کی موت مرتا ہے یعنی اللہ یا وطن (اسلام) کی راہ میں شہید ہو جاتا ہے جو ایک با عزت زندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”لا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتاً، بل احياء عند ربہم یرزقون“ (یعنی اللہ کی راہ میں جان دینے والوں کو مردہ نہ خیال کرو، بلکہ وہ زندہ ہیں اور ان کا رب ان کے لیے سامان رزق مہیا کرتا ہے) یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ دشمنوں سے مڈ بھیڑ ہو تو جہاں تک ان کے بس اور اختیار میں ہے وہ ڈٹے رہیں۔ لشکر کشی کے وقت راہ فرار اختیار کرنے سے انہیں منع فرمایا گیا ہے اور اسے گناہ کبیرہ قرار دیا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوتا ہے اور ایسے اشخاص کے اعمال راکھاں جاتے ہیں اور انہیں آتش جہنم اور بد انجامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”یا ایہا الذین آمنوا اذالقیتم الذین کفروا زحفاً، فلا تولوہم الادبار، ومن یولہم یومئذ دبرہ، الا متحرفاً لقتال، او متحیزاً الیٰ فئۃ فقد باء بغضب من اللہ وماواہ جہنم وبئس المصیر“ (یعنی اے ایمان والو جب تم دشمنوں کے مقابلہ میں لشکر کشی کرو تو پیٹھ دکھا کر نہ بھاگو اگر کسی نے جنگی حربے یا گھیراؤالنے کی غرض کے علاوہ پیٹھ دکھا دی تو اس نے اللہ تعالیٰ کا غضب سمیٹا اس کا ٹھکانا جہنم ہے جو برا ٹھکانا ہے) نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”یا ایہا الذین آمنوا، اذا لقیتم فئۃ فاثبتوا واذکرو اللہ کثیراً لعلکم تفلحون“ (یعنی اے ایمان والو جب فوج کا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور کثرت کے ساتھ اللہ کو یاد کرو، تاکہ تمہارا بھلا ہو) اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کے ساتھ جہاد کرنے والوں کو

صبر و ثبات سے کام لینے کا حکم دیا ہے کیونکہ اس وقت پیچھا دکھانا مسلمانوں کی صفوں میں کمزوری پیدا کرنا اور جنگ آزمائوں کی راہ میں روڑے اٹکانا اور خود اپنی جماعت میں انتشار پیدا کرنا ہے جس سے اللہ کی راہ میں رکاوٹ اور دشمنوں کو تقویت ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی معصیت ہے جو دنیا و آخرت کی رسوائی کے لیے کافی ہے۔ بناء بریں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ثابت قدم رہنے اور اللہ کی یاد کرنے کا حکم دیا ہے اور فرمایا کہ وہ فرار ہونے والوں کو سخت ترین قسم کا عذاب دے گا۔ اور اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کو عزت و اکرام سے سرفراز فرمائے گا۔

مسلمان بے قصور عورتوں پر تہمت دھرنا بھی ان کبیرہ گناہوں میں سے ہے جن کی ممانعت پر حکمت شریعت میں آئی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”ان الذین یرمون المحصنات الغافلات المومنات لعنوا فی الدنیا والاخرۃ ولہم عذاب عظیم“ (یعنی جو لوگ مسلمان، بے قصور اور پاکدامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں بلاشبہ ان پر دنیا و آخرت کی لعنت ہے اور انہیں سخت عذاب ہوگا)۔ پر از حکمت شریعت کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان کی آبرو کا تحفظ کیا جائے، ان کی شرافت محفوظ رہے اور بڑائی برقرار رہے اور عزت و شرافت کی نگہداشت کے لیے مضبوط باڑھ باندھ دی جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بہ تقاضائے حکم ایسے سرکش طبع لوگوں کی سرزنش کے لیے دستور العمل مقرر فرمادیا جو طیش میں آ کر لوگوں کی آبروریزی پر اتر آتے اور انہیں نیچا دکھانا چاہتے ہیں۔ ایک غیر متند مسلمان کے نزدیک سب سے زیادہ عزیز شے شرافت ہے۔ ایک مسلمان اپنی شرافت اور عزت کی خاطر جان تک دینے کو پسند کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس انسان کی عزت و آبرو نہ رہے اس کی زندگی کس کام کی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زنا کی تہمت لگانے والے پر حد لگانے کا حکم صادر فرمایا ہے کیونکہ یہ عیب کمینگی ہے جس سے دوسروں کی پردہ دری ہوتی اور برائیاں پھیلتی ہیں اور ہتک عزت ہوتی ہے اور اس حرکت سے پتہ چلتا ہے کہ مرتکب ایک بے غیرت انسان اور ذلیل ترین جانوروں کی خصلت کا مالک ہے۔ اور مضرت رساں برائیوں کا مجموعہ ہے یہ بھی ہے کہ اگر وہ الزام کسی عورت پر لگایا تو وہ اس عورت کی پوری قوم کے لیے باعث ننگ ہو جاتا ہے جس سے خون خرابے کی نوبت آ جاتی ہے اور پھر بھی وہ داغ نہیں دھلتا۔

واضح ہو کہ صاحب شریعت علیہ السلام نے کسی بے قصور مرد یا عورت پر تہمت لگانے والے کو تین سزائیں دی ہیں: اسی (۸۰) کوڑوں کی ضرب، ہمیشہ کے لیے اس کی شہادت کا ناقابل قبول ہونا اور اسے فاسق (بدکار) قرار دینا۔ اللہ تعالیٰ نے آیت شریفہ میں اس جرم کے مرتکب کی مذمت فرمائی ہے اور اس کے عظیم خطروں سے آگاہ فرمایا اور اس پر عذاب سخت کی اطلاع دی ہے۔ اس سے زیادہ تنبیہ اور کیا ہوگی ایسے شخص کو دین و دنیا دونوں جہاں کی لعنت کا سزاوار قرار دیا گیا ہے کہ وہ شخص اللہ کی رحمت سے بعید اور سخت سزا کا سزاوار ہوگا۔ قیامت کے روز اس کے اعضاء خود اس کے خلاف گواہی دیں گے۔ جو اس کی رسوائی کا موجب ہوگا۔ اس کا جرم قطعی طور پر ثابت ہو جائے گا اور قیامت کے روز ان گواہوں کی موجودگی میں اس جرم کے الزام سے بری ہونے کی کوئی سبیل نہ رہے گی۔ پھر اس کے ساتھ ہی ارشاد ہے کہ حق تعالیٰ انہیں پوری پوری سزا دے گا۔ اگر اسے علم نہیں ہے تو اب معلوم ہو جانا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ برحق ہے اور اس کی تہدید یقینی اور اس کا قول سچا ہے۔ حکماء نے (یہ نکتہ) بیان فرمایا ہے کہ تہمت لگانے والے کی تصدیق کے لیے چار اشخاص کی گواہی

کے لیے دائمی رسوائی اور المناک عذاب ہے۔

دوسرے سوال کا جواب

واضح ہو کہ حدیث بالا میں جو لفظ ”موبات“ آیا ہے۔ اس کے معنی ”مہلکات“ (یعنی ہلاک کرنے والے امور) ہیں جو بہر حال دنیا و آخرت دونوں جہاں کی ہلاکت کا موجب ہیں لیکن پیش نظر حدیث میں تمام موبات (ہلاکت آفرین گناہوں) کا ذکر نہیں ہے، ان کے علاوہ اور بھی ایسے گناہ ہیں جن کا ذکر دوسری احادیث صحیحہ میں آیا ہے ان کی تعداد علمائے نے اکیس (۲۱) بتائی ہے۔ ان میں سے سات کا بیان حدیث شریف میں آچکا ہے۔

آٹھواں گناہ کبیرہ

جھوٹی گواہی کا بیان

(ان سات کے علاوہ) آٹھواں گناہ جھوٹی گواہی ہے۔ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ یہ گناہ بدترین گناہوں میں سے ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ”کنا مع رسول اللہ ﷺ فقال الا انبئکم باکبر الکبائر؟ (ثلاثاً) الا شرک باللہ، وعقوق الوالدین، ألا وشهادة الزور، وقول الزور، وکان متکئاً فجلس، فما زال يتکررنا حتی قلنا: لیتہ سکت“ بروایت بخاری و مسلم وغیرہ (یعنی ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہ آپ نے تین بار فرمایا، آیا میں تمہیں بڑے بڑے گناہوں سے آگاہ کروں؟ اللہ کا شریک بنانا، والدین کی نافرمانی کرنا اور ہاں جھوٹی گواہی دینا اور غلط بیانی کرنا۔ حضورؐ جو تکیہ کا سہارا لیے ہوئے تھے، اٹھ بیٹھے اور اس بات کو اتنی بار کہا کہ ہم نے کہا کہ کاش زحمت تکرار نہ فرماتے) غرض جھوٹی گواہی بہت بڑا اخلاقی جرم ہے جو نظام معاشرت کے منافی اور زندگی کے ہر گوشے پر اثر انداز ہے اور یہ امر کسی پر مخفی نہیں ہے کہ یہ عام برائی ہے۔ انسان کو مکمل طور پر اس سے بچنا واجب ہے۔^(۱)

درکار ہوتی ہے۔ قیامت کے روز اس کے بیان کی تکذیب کے لیے اس کے پانچ اعضاء شہادت دیں گے۔ یعنی اس کی زبان، اس کے دو ہاتھ، اس کے دو پاؤں یہ اس کی مذلت اور رسوائی کا باعث ہوں گے۔ اور یہ سب بے قصور مسلمان عورتوں کو رسوا کرنے کی سزا ہوگی۔

۱۔ علماء نے بتایا ہے کہ جھوٹی گواہی کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس سے بچنے کا حکم دیا

ہے اور اسے شرک کے برابر بتایا ہے۔ نعوذ باللہ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”فاجتنبوا الرجس من الاوثان، واجتنبوا قول الزور“ (یعنی بت پرستی کی آلودگی سے بچو اور جھوٹا بیان دینے سے بچو) مطلب یہ ہے کہ گندے عمل جس سے مراد بت پرستی ہے اور جھوٹی گواہی سے کنارہ کش رہو۔ اللہ نے بتوں کی پوجا اور جھوٹی گواہی کا ایک ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”قل انما حرم ربی الفواحش ما ظهر منها وما بطن، والاثم والبیغی بغیر الحق، وان تشرکوا باللہ ما لم ینزل به سلطانا، وان تقولوا علی اللہ مالا تعلمون“ (یعنی اے پیغمبر یہ بتادو کہ میرے رب نے تمام امور قبیحہ کو حرام کر دیا ہے خواہ وہ ظاہر ہوں یا مخفی ہوں نیز گناہ اور ناحق سرکشی اور اللہ کے ساتھ شرک کرنا بھی جس کی کوئی دلیل نہیں آئی اور اللہ کے خلاف ایسی بات کہنا بھی گناہ ہے جو تم نہیں جانتے) جھوٹی گواہی اسی زمرہ میں ہے۔

امام احمدؒ نے ایمن بن خرم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے، آپ نے خطبہ دیا اور تمکین بار فرمایا ”ایہا الناس عدلت شہادۃ الزور اشراکا باللہ“ (یعنی لوگو جھوٹی گواہی دینا اللہ کا شریک بنانے کے برابر ہے) اس کے بعد یہ آیت پڑھی: ”اجتنبوا الرجس من الاوثان، واجتنبوا قول الزور“ (یعنی بت پرستی کے ناپاک عمل سے بچو اور جھوٹی بات بیان کرنے سے بچو) نیز امام احمدؒ نے بتایا ہے کہ محمد بن عبید نے بتایا کہ سفیان عصفری نے ان سے حدیث بیان کی جو انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حبیب بن نعمان اسدی سے اور انہوں نے خرم بن فاتک اسدی سے کہ رسول اللہ ﷺ نماز فجر پڑھ کر واپس تشریف لائے اور کھڑے ہو کر فرمایا ”عدلت شہادۃ الزور الاشراک باللہ عزوجل“ (یعنی جھوٹی شہادت اللہ کے ساتھ شریک بنانے کے برابر ہے) اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور حنفاء للہ غیر مشرکین بہ“ (یعنی بت پرستی کی ناپاکی سے بچو اور ایک سچے مسلمان کی طرح جھوٹی بات سے بچو کسی کو اللہ کا شریک نہ بناؤ) نیز سفیان ثوری نے عاصم بن ابی النخود سے انہوں نے وائل ابن ربیعہ سے، انہوں نے ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا ”تعدل الشہادۃ الزور الاشراک باللہ، ثم قرا هذه الآیۃ“ (یعنی جھوٹی گواہی شرک باللہ کے برابر ہے۔ اس کے بعد انہوں نے یہ آیت پڑھی)۔

صحیحین (بخاری و مسلم) میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”الا البشکم باکبر الکبائر؟ قلنا: ہلی یا رسول اللہ قال: الاشراک باللہ، وعقوق الوالدین، وکان متکئا فجلس، فقال: الا وقول الزور، وشہادۃ الزور، فما زال یکررها حتی قلنا لیتہ سکت“ (یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑا گناہ بتاؤں؟ ہم نے کہا ہاں یا رسول اللہ فرمایا اللہ کا شریک بنانا، والدین کی نافرمانی کرنا۔ آپ اس وقت تکیہ کا سہارا لیے ہوئے تھے، اٹھ بیٹھے، اور فرمایا ”اور ہاں دروغ گوئی اور جھوٹی شہادت، اور بار بار یہ کہتے رہے یہاں تک کہ ہم نے کہا کاش آپ سکوت فرمائیں) مطلب یہ ہے کہ یہ اصحاب حضورؐ کی زحمت اور اضطراب پر رنجیدہ خاطر ہوئے۔ اس سے ثابت ہوا کہ کبیرہ گناہوں کی دو قسمیں ہیں کوئی گناہ بہت بڑا ہے اور کوئی سب سے بڑا گناہ ہے۔ یہاں کبار میں بہت بڑا گناہ کہنے سے یہ لازم نہیں ہے کہ سب کی اہمیت یکساں ہو۔ دراصل ان تمام مذکورہ گناہوں میں

نواں گناہ کبیرہ

دیدہ و دانستہ جھوٹی قسم کھانے کا بیان

نواں گناہ یمین غموس ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی بات کے ہونے کی قسم کھائی جائے حالانکہ قسم کھانے والا جانتا ہے کہ یہ بات نہیں ہوئی، مثلاً یوں کہا کہ قسم ہے اللہ کی مجھ پر تمہارا کوئی قرضہ نہیں ہے (حالانکہ جانتا ہے کہ اس کے ذمہ قرض واجب الادا ہے۔ یا حلف اٹھا کر یہ کہا کہ فلاں شخص نے فلاں شخص کو نہیں مارا۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ اس نے مارا ہے۔ بخاری سے مروی ہے کہ ایک اعرابی (بدو) نبی ﷺ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا ”یا رسول اللہ ما الکبائر؟“ قال الاشراک باللہ۔ قال : ثم ماذا؟ قال : اليمين الغموس۔ قلت : ما اليمين الغموس؟ قال : یقطع مال امری مسلم“ (یعنی یا رسول صلی اللہ علیہ وسلم گناہ کبیرہ کیا ہوتے ہیں؟ فرمایا اللہ کے ساتھ شرک کرنا اس نے کہا اس کے بعد اور کیا؟ ارشاد ہوا ”یمین الغموس“ کہا ”یمین الغموس“ کیا ہے؟ فرمایا کسی مسلمان کو اس کے حق سے محروم کر دینا) مطلب یہ ہے کہ جھوٹی قسم کھا کر۔

اس امر میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ایسی قسم (جو حق سے محروم کر دے) گناہ کبیرہ ہے۔ بشرطیکہ اس سے کسی کی حق تلفی ہوتی ہو یا کسی کو بلا وجہ افیت پہنچے یا کسی کے ذمہ قرضہ تھوپ دیا جائے حالانکہ وہ مقرض نہ ہو وغیرہ۔

اگر اس قسم سے ایسی کوئی بات پیدا نہ ہو تو وہ گناہ صغیرہ ہے، گناہ کبیرہ نہیں ہے۔ بعض اصحاب کا کہنا ہے کہ یمین غموس بہر حال گناہ کبیرہ ہے کیونکہ جھوٹی قسم کھانے والا اللہ تعالیٰ کے نام کی توہین کرتا ہے جو مستوجب عذاب دردناک ہے تا آنکہ وہ سچے دل سے توبہ نہ کرے۔

واضح ہو کہ بیشتر علماء کے نزدیک توبہ کے سوا یمین غموس کا کوئی کفارہ نہیں ہے۔ شافعیہ کہتے ہیں

سب سے بڑا گناہ شرک باللہ ہے۔ رہا آنحضرت ﷺ کا تکیہ پر سے اٹھ کر بیٹھ جانا سو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضور نے اس گناہ کو بڑی اہمیت دی ہے جس سے عیاں ہے کہ یہ فعل سخت حرام اور نہایت قابل مذمت ہے۔ اس کو اہمیت دینے کا سبب یہ ہے کہ عام طور پر جھوٹی گواہی دینے کو امر آسان اور معمولی بات سمجھا جاتا ہے اور عداوت، کینہ اور حسد وغیرہ کی طرح بہت سے لوگ اس میں مبتلا ہیں۔ لہذا اسے اہمیت دینے کی ضرورت ہے۔ حدیث میں آیا ہے ”لا تنزل قدما شاهد الزور يوم القيامة حتى تسحب له النار“ (یعنی قیامت کے روز جھوٹی شہادت دینے والے پر سب سے پہلے ہی عذاب جہنم لاگو ہو جائے گا)۔ اور روایات میں آیا ہے کہ ”عدلت شهادة الزور الاشراک باللہ“ (یعنی جھوٹی شہادت شرک باللہ کے برابر ہے)۔

کہ اس کا کفارہ بھی وہی ہے جو دوسری قسموں کا ہے اور جب کوئی شخص کفارہ ادا کرے تو گناہ سے پاک ہو جائے گا۔ (۱)

دسواں گناہ کبیرہ

زنا کا بیان

واضح ہو کہ دسواں گناہ زنا (بدکاری) ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ”فاحشۃ“ (یعنی بے غیرتی یا گناہ عظیم) سے تعبیر فرمایا ہے ”ولا تقربوا الزنا انه كان فاحشۃ“ (یعنی زنا یا بدکاری کے قریب نہ پھٹکو یہ سخت گناہ یا بے غیرتی ہے) اس کی بدترین صورت یہ ہے کہ کوئی شخص پڑوسی کی عورت سے بدکاری کرے۔ کیونکہ اس امر قبیح میں دو ہر ا جرم ہے ایک تو یہ کہ بے خبر انسان کی آبروریزی ہوئی۔ دوسرے یہ کہ پڑوسی کی

۱۔ لفظ ”الایمان“ ”یمین“ کی جمع ہے، یمین کے بنیادی معنی از روئے لغت (دائیں) ہاتھ کے ہیں یعنی بائیں کے خلاف۔ اس لفظ کا اطلاق حلف (قسم) پر ہوتا ہے۔ اہل عرب کا دستور تھا کہ جب وہ حلف اٹھاتے (یعنی کسی بات پر قسم کھاتے) تھے تو باہم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر قسم کھاتے تھے۔ اصطلاح شرع میں اللہ تعالیٰ یا اس کے کسی صفاتی نام کے ساتھ کسی قول کو پختہ کرنے کا نام یمین ہے۔ صاحب شرع نے جھوٹی قسم کھانے سے منع فرمایا ہے اور اس فعل کو غضب الہی کا مستوجب قرار دیا ہے، اگر مرنے سے پہلے توبہ نہ کر لی جائے تو ایسا شخص جہنم میں پڑے گا یا پھر اس کا کفارہ ادا کرے۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”من حلف علی مال امری مسلم بغیر حق لقی اللہ وهو علیہ غضبان“ (یعنی جس شخص نے کسی مسلمان کے مال سے اس کی حق تلفی کے لیے جھوٹی قسم کھائی تو قیامت کے روز جب اللہ کے سامنے پیش ہوگا تو اس پر اللہ کا غضب ہوگا) اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اس کی تصدیق میں کتاب اللہ کی یہ آیت پڑھی: ”ان الدین یشترون بعہد اللہ وایمانہم ثمناً قليلاً، اولئک لا خلاق لہم فی الآخرة والا یکلمہم اللہ، ولا ینظر الیہم یوم القیامۃ ولا یزکیہم ولہم عذاب الیم“ رواہ البخاری والمسلم۔ (یعنی جو لوگ اللہ سے کیے ہوئے وعدے اور قسموں کو تھوڑی سی قیمت میں فروخت کر دیتے ہیں قیامت کے دن انہیں کچھ سود مند نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ انہیں شرف کلام سے نوازے گا اور نہ ان کی طرف نظر کرم فرمائے گا اور نہ انہیں پاکیزگی بخشے گا بلکہ انہیں دردناک عذاب ہوگا)۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”من اقتطع حق امری مسلم بيمينہ فقد اوجب اللہ له النار، وحرم علیہ الجنة قالوا: وان کان شیئاً یسیراً یا رسول اللہ؟ فقال: وان کان قضیباً من اراک“ بروایت مسلم (یعنی جس شخص نے جھوٹی قسم کھا کر مسلمان کو اس کے حق سے محروم کر دیا، اللہ تعالیٰ نے اس پر جہنم کو لازم کر دیا اور جنت اس پر حرام ہو گئی۔ عرض کیا گیا کہ کیا وہ شے معمولی سی ہے پھر بھی، فرمایا خواہ وہ درخت پیلو کی ایک شاخ ہو) اور عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”اکبر الکبائر

آبرو پر وہی ہاتھ ڈالے گا جو شقی القلب ہو اور اپنے رب کو بھول جائے اور ایک جانور کی مانند ہو جائے جو کسی کی نہیں سنتا اور نفسانی خواہش پوری کرنے کے سوا اور کچھ اس کے پیش نظر نہیں ہوتا۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ ”سالت رسول اللہ ﷺ ای الذنب اعظم عند اللہ؟ قال: ان تجعل لله ندا، وهو خلقک، قلت: ان ذلک لعظیم، ثم ای؟ قال: ان تقتل ولدک مخافة ان یسطعم معک، قلت: ثم ای؟ قال: ان تزانی حایلة جارك“ رواہ البخاری و مسلم وغیرہا۔ (یعنی وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ فرمایا کہ تم اللہ کے ساتھ اور کسی کو بھی حاجت روا جانو حالانکہ تمہیں پیدا کرنے والا وہی ہے۔ میں نے کہا بلاشبہ یہ تو گناہ عظیم ہے ہی اس کے بعد کون سا گناہ ہے؟ فرمایا کہ تم اپنی اولاد کو قتل کرو کہ مبادا وہ تمہارے رزق میں حصہ بٹالے۔ میں نے عرض کیا اس کے بعد کون سا گناہ ہے؟ فرمایا پڑوسی کی عورت کے ساتھ بدکاری)۔ پڑوسی کی حلیہ سے مراد پڑوسی کی بیوی ہے (۱)

الاشراک باللہ، وعقوق الوالدین، والیمین الغموس“ (یعنی کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑا گناہ اللہ کا شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا اور دیدہ و دانستہ جھوٹی قسم کھانا ہے)۔ اس کو غموس اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ گناہ مرتکب کو معصیت میں یا آگ میں غرق کر دیتا ہے۔

حضرت جبیر بن مطعم کی بابت روایت ہے کہ انہوں نے اپنی قسم کے فدیہ میں دس ہزار درہم دیے اور پھر فرمایا کہ ”ورب الکعبۃ لو حلفت حلفت صادقاً، وانما هوشی افتدیت به یمینی“ بروایت طبرانی (یعنی میں رب کعبہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر میں نے قسم کھائی تو سچی بات پر قسم کھاؤں گا اور یہ شے میں نے اپنی قسم کے فدیہ میں دی ہے)۔

۱۔ واضح ہو کہ زنا گناہوں میں سب سے زیادہ قبیح فعل ہے۔ چنانچہ تمام مذاہب کی رو سے ہر عہد اور ہر زمانہ میں اہل عقل کو اس فعل کے مذموم ہونے پر اتفاق رہا ہے کیونکہ اس میں انفرادی اور اجتماعی (ہر طرح کی) خرابی ہے یہاں تک کہ زنا کار کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ فرمادیا کہ اس کا مرتکب بوقت ارتکاب، اسلام سے خارج ہو جاتا ہے ”لا یزنی الزانی حین یزنی وهو مؤمن“ (یعنی بدکاری کا ارتکاب کرنے والا اس وقت ایمان دار نہیں رہتا) نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”جب آدمی زنا کرتا ہے تو ایمان اس سے نکل کر سائبان کی طرح ہو جاتا ہے پھر جب اس سے باز آتا ہے تو ایمان لوٹ آتا ہے“ اور نبی ﷺ سے مروی ہے کہ ”جس نے زنا کیا یا شراب پی اللہ تعالیٰ اس سے اس کا ایمان نکال لیتا ہے جیسے کہ کوئی شخص اپنی قمیص اپنے سر سے نکالے مزید مروی ہے کہ تین شخصوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز بات نہ کرے گا اور نہ ان کی مغفرت کرے گا اور نہ ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے گا۔ ان کے لیے درناک عذاب ہوگا۔ ایک زانی

بوڑھا، دوسرا جھوٹا بادشاہ، تیسرا متکبر عالم۔“ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”اربعة يبغضهم الله، البياع الحلاف، والفقير المختال، والشيخ الزاني، والا مام الجائر“ (یعنی ان چار پر اللہ کا غضب ہے: قسمیں کھا کر سودا بیچنے والا اور دھوکے سے فقیر بننے والا اور بوڑھا بدکاری کرنے والا اور سربراہ ہو کر ظلم کرنے والا)۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ قال: ان تجعل لله ندا وهو خلقك، قال قلت: ثم ای؟ قال ان تقتل ولدك مخافة ان يطعم معك، قال قلت: ثم ای؟ قال ان تزانی حلیلة جارک“ (یعنی فرمایا کہ اللہ کے ساتھ کسی اور کو کار ساز سمجھو۔ حالانکہ پیدا کرنے والا تمہارا وہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ پھر کون سا؟ فرمایا کہ تم اپنی اولاد کو قتل کرو کہ مبادا تمہارے کھانے میں وہ بھی شریک ہو جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا اس کے بعد کون سا گناہ؟ ارشاد ہوا کہ یہ کہ پڑوسی کی عورت کے ساتھ بدکاری کرنا) اس کی تصدیق میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ہے ”والذین لا یبدعون مع الله الهما آخر، ولا یقتلون النفس التي حرم الله الا بالحق ولا یزنون“ (یعنی وہ لوگ اللہ کی معبودیت میں کسی کو شریک نہیں کرتے اور جس کا قتل حرام ہے اسے ناحق قتل نہیں کرتے اور زنا نہیں کرتے)۔

ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے بتا دیا ہے کہ ہر بڑے گناہ میں ایک بہت بڑا گناہ ہوتا ہے، چنانچہ شرک کے گناہ میں سے سب بڑا شرک یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ ساتھ کسی اور کو بھی حاجت روا سمجھا جائے، جرم قتل میں سب سے بڑا قتل یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی اولاد کو قتل کر دے کہ مبادا اس کے کھانے پینے میں وہ بھی شریک ہو جائے اور زنا کے گناہوں میں سے بڑا گناہ یہ ہے کہ پڑوسی کی بیوی کے ساتھ زنا کیا جائے، اس کی برائی دگنی یہ ہے کہ اس میں دو گونہ حق تلفی (یعنی خاوند کا حق اور پڑوسی کا حق مارنا دہری زیادتی ہے) پس ایسی عورت کے ساتھ جو خاوند والی ہے، بدکاری کا گناہ بے خاوند کی عورت کے ساتھ کرنے سے زیادہ بڑا گناہ اور زیادہ سزا کا مستوجب ہے۔ کیونکہ اس میں خاوند کی آبروریزی اور اس کے ازدواجی حق میں رخنہ اندازی ہے اور ایک شخص کو دوسری نسل سے جوڑتا ہے وغیرہ۔ اگر عورت کسی پڑوسی کی ہے تو (بد کرداری کے گناہ کے ساتھ) ایک اور گناہ پڑوسی کے ساتھ بدسلوکی کا اضافہ ہے، اور آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد عائد ہوتا ہے ”لا یدخل الجنة من لا یامن بجاره بوائقه“ (یعنی جس کا ایذا رسانی سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو، ایسا شخص جنت میں نہیں جائے گا) (ظاہر ہے کہ) پڑوسی کی عورت کی آبروریزی سے بڑی ایذا دہی اور کیا ہو سکتی ہے؟ اگر وہ پڑوسی اس کا بھائی یا کوئی قریبی رشتہ دار ہے تو ایک اور گناہ نانا توڑنے کا بھی ہوگا جس سے گناہ دگنا ہو جائے گا اور یہ گناہ اور بھی دگنا ہو جائے گا اگر وہ پڑوسی، طاعت الہی (یاد دینی غرض سے) باہر گیا ہو، مثلاً نماز پڑھنے، علم حاصل کرنے یا جہاد کے لیے گھر سے باہر ہو تو گناہ کئی گنا ہو جائے گا پھر اگر وہ عورت رشتہ دار ہو تو یہ نانا توڑنے کا مزید گندہ فعل ہے، اور اگر وہ شخص شادی شدہ ہو کر ایسی حرکت کرے تو یہ گناہ سب سے بڑا گناہ ہوگا، اور عمر رسیدہ ہو کر تو اس فعل بد کی شدت سب سے زیادہ ہو جائے گی اور اس کے ساتھ اگر یہ گناہ حرمت والے مہینے یا حرمت والے شہر میں یا ایسے وقت میں جو اللہ کے نزدیک اہمیت رکھتا ہے، مثلاً نماز کا وقت ہے یا قبولیت دعا کی گھڑی ہے تو یہ گناہ کئی گنا ہو جائے گا۔ اللہ پناہ میں رکھے۔

گیارہواں گناہ کبیرہ

شراب نوشی کا بیان

واضح ہو کہ شراب پینا کبیرہ گناہوں میں ایک ایسا گناہ ہے جس کا اثر انسان کی صحت مند اور فطری زندگی پر بہت برا پڑتا ہے، بڑے بڑے صحابیوں میں سے بعض صحابی رضوان اللہ علیہم کی رائے میں یہ سب سے بڑا گناہ کبیرہ ہے، چنانچہ ایک روایت ہے: ”ان ابابکر و عمر، سالا عبد اللہ بن عمرو عن اعظم الکبائر فقال: ”شرب الخمر“ رواہ الطبرانی باسناد صحیح یعنی حضرت ابو بکرؓ اور عمر فاروقؓ نے حضرت عبد اللہ بن عمرو سے سب سے بڑے گناہ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ شراب نوشی اور مزید فرمایا ”اجتنبوا الخمر، فانها مفتاح کل شر“ (یعنی شراب سے بچو! تمام برائیاں اسی سے شروع ہوتی ہیں) (۱)

حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے ”قال رسول اللہ ﷺ لا صحابه مات قولون فی الزنا؟ قالوا حرام حرمہ اللہ ورسولہ فهو حرام الی یوم القیامۃ قال: فقال رسول اللہ لان یزنی الرجل بعشر نسوة ایسر علیہ من ان یزنی بامرأة جاره“ (یعنی رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابیوں سے دریافت کیا کہ زنا کے متعلق تم کیا کہتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا کہ یہ فعل حرام ہے، اسے اللہ اور اس کے رسول نے حرام فرمایا ہے، لہذا وہ تاقیامت حرام ہے راوی کہتے ہیں کہ اس پر اللہ کے رسول نے فرمایا کہ میرے نزدیک دس عورتوں سے بدکاری کرنا، کم درجہ کا گناہ ہے، بمقابلہ اس کے کہ پڑوسی کی عورت کے ساتھ زنا کیا جائے۔

۱۔ واضح ہو کہ ان تمام گناہوں میں جو پر از حکمت شریعت اسلامیہ میں حرام ہیں، شراب پینا سب سے بڑا گناہ ہے، کیونکہ اس سے، انفرادی، تہذیبی، جسمانی، اخلاقی اور اقتصادی خرابیاں جنم لیتی ہیں، یہاں تک کہ بعض اصحاب کہتے ہیں یہ فعل تمام برائیوں کی ماں ہے۔

حضرت سالم بن عبد اللہ نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد۔ (ایک بار) حضرت ابو بکرؓ، عمرؓ اور کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور یہ ذکر ہو رہا تھا کہ سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ لہذا ان لوگوں نے مجھے عبد اللہ بن عمروؓ کے پاس بھیجا کہ ان سے یہ بات دریافت کروں، عبد اللہ بن عمروؓ نے بتایا کہ سب سے بڑا گناہ شراب کا پینا ہے، میں نے یہی ان کے پاس بیان کر دیا، انہوں نے اس بات کو بڑا جانا اور سب اٹھ کر چل کھڑے ہوئے یہاں تک کہ وہ حضرت عبد اللہ بن عمروؓ کے گھر پر آئے انہوں نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک بادشاہ نے ایک شخص کو پکڑ لیا اور اسے کہا گیا کہ یا تو وہ شراب پیے، یا کسی کو قتل کر دے، یا بدکاری کرے، یا سور کا گوشت کھائے۔ اس نے شراب پینا پسند کیا اور جب اس نے شراب پی لی، تو جو کچھ یہودی اس سے کرانا چاہتے تھے، اس

نے پھر کسی بات سے انکار نہ کیا، اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ما من احد يشربها فتقبل له صلوة اربعين ليلة، ولا يموت وفي مثنته منه شي الا حرمت بها عليه الجنة، فان مات في اربعين ليلة مات مية جاهلية“ بروایت طبرانی باسناد صحیح و حاکم۔ (یعنی کوئی شخص ایسا نہیں جو شراب پیے اور پھر بھی اس کی نماز چالیس راتوں تک قبول کی جائے پس اگر مثانہ میں شراب کا کوئی اثر بھی باقی تھا اور وہ مر گیا تو جنت اس پر حرام ہوگی، اگر چالیس راتوں کے اندر مر گیا تو اس کی موت عہد جاہلیت کی موت ہوگی)۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے، حضور نے فرمایا ”اجتنبوا ام الخبائث“ (یعنی برائیوں کو جہنم دینے والی سے بچو) نیز روایت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ”لما حرمت الخمر مشى اصحاب رسول الله ﷺ بعضهم الى بعض، وقالوا: حرمت الخمر، وجعلت عدلاً للشرك“ بروایت طبرانی (یعنی جب شراب کے حرام ہونے کا حکم نازل ہوا تو رسول اللہ ﷺ کے صحابی ایک دوسرے کے پاس گئے اور انہوں نے بتایا کہ شراب حرام ہوگئی اور اسے شرک کے برابر قرار دیا گیا)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”من شرب الخمر خرج نور الايمان من جوفه“ رواه الطبرانی (یعنی جس نے شراب پی اس کے باطن سے ایمان کا نور نکل گیا)۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”من شرب الخمر فسکر لم تقبل له صلوة اربعين صباحاً، فان مات دخل النار، فان تاب تاب الله عليه فان عاد فشراب فسکر لم تقبل له صلوة اربعين صباحاً، فان مات دخل النار، فان تاب تاب الله عليه، فان عاد فشراب فسکر لم تقبل له صلوة اربعين صباحاً، فان مات دخل النار، فان تاب تاب الله عليه، فان عاد في الرابعة كان حقاً على الله ان ينسقيه من طينة الخبال يوم القيامة، قالوا يا رسول الله وما طينة الخبال؟ قال: عصارة اهل النار“ رواه ابن حبان (یعنی جس نے شراب پی اور نشہ میں آ گیا، چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہ ہوگی، اس دوران اگر وہ مر گیا تو جہنم میں جائے گا، ہاں اگر توبہ کر لے تو اس کی توبہ اللہ قبول فرمائے گا، اس کے بعد اگر اس نے پھر یہی حرکت کی یعنی شراب پی اور نشہ چڑھ گیا تو اس کی نماز چالیس روز تک قبول نہ ہوگی، اگر اس دوران مر گیا تو جہنم میں جائے گا، ہاں اگر توبہ کر لے تو اللہ اس کی توبہ قبول فرمائے گا، اگر چوتھی بار پھر یہی حرکت کی تو اللہ کو حق ہے کہ اسے قیامت کے دن طینۃ الخبال پینے کو دے، لوگوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ، طینۃ الخبال کیا ہے فرمایا اہل جہنم کا نچرا ہوا مادہ)۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”من لقي الله مدمن خمر،

لسقيده كعابد وثن“ (یعنی دائم الخمر اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح پیش ہوگا جیسے بت کا رپجاری) اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ ”ما ابالي شربت الخمر، او عبدت هذه السارية من دون الله“ (یعنی تم شراب پیو یا اللہ کے سوا اس جانور کی پوجا کرو میرے نزدیک دونوں میں کچھ فرق نہیں ہے)۔

بار ہواں اور تیر ہواں گناہ کبیرہ

نمیمہ (چغلی) اور پیشاب سے نہ بچنے کا بیان

واضح ہو کہ نمیمہ (چغل خوری) انسانی معاشرہ کو نقصان پہنچانے والے جرائم میں سے ہے کیونکہ چغل خور ہمیشہ باہمی الفت و محبت کی کاٹ میں رہتا ہے اور ایک دوسرے کو دشمن بنا دیتا ہے، بدکرداری کے ثبوت کے لئے یہ حرکت کافی ہے۔ چغلی کے گناہ کبیرہ ہونے کی صراحت بخاری کی اس حدیث میں آئی ہے کہ ”ان رسول اللہ مر بقبرین یعذبان، فقال: انهما یعذبان، وما یعذبان فی کبیر، بلی انہ کبیر، اما احدہما فکان یمشی بالنمیمۃ، واما الآخر فکان لا یستبری من البول“ (یعنی رسول اللہ ﷺ کا دو قبروں کے پاس سے گزر رہا جس میں عذاب ہو رہا تھا۔ حضور نے فرمایا۔ ان دونوں پر عذاب ہو رہا تھا اور عذاب گناہ کبیرہ کا ہے۔ بیشک یہ گناہ کبیرہ ہے۔ ان میں سے ایک چغل خور تھا اور دوسرا پیشاب سے نہیں بچتا تھا)۔ یہ دونوں (قبر والے) چغلی کرنے اور پیشاب سے بچنے کو نظر انداز کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ معمولی باتیں ہیں۔ حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ باتیں سب سے زیادہ نقصان دہ ہیں۔ کیونکہ اول الذکر سے انسانوں کی باہمی الفت میں فرق آ جاتا ہے اور ثانی الذکر سے عبادت میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔^(۱)

ابو ہریرہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اربع حق علی اللہ ان لا یدخلہم الجنة، ولا یدقیہم نعیمہا: مدمن الخمر، واکل الربا، واکل مال الیتیم بغير حق، والعاق لوالدیہ“ بروایت حاکم، وہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کی اسناد صحیح ہیں۔ (یعنی ان چار قسم کے لوگوں کے متعلق اللہ کو حق ہے کہ انہیں جنت میں داخل نہ ہونے دے اور نہ وہاں کی کوئی نعمت چکھنے دے۔ وہ چار یہ ہیں۔ ہمیشہ شراب پینے والا، سود کھانے والا، یتیم کا مال ناحق ہضم کرنے والا اور ماں باپ کی نافرمانی کرنے والا)۔

۱۔ معلوم ہونا چاہیے کہ نمیمہ (بمعنی چغلی) کا اطلاق اس بات پر ہوتا کہ ایک شخص کے بارے میں کوئی بات سن کر دوسرے کے پاس بیان کی جائے مثلاً یوں کہے کہ فلاں شخص تمہارے بارے میں ایسی ایسی بات کہتا تھا۔ چغل خوری اسی پر موقوف نہیں ہے بلکہ چغلی میں یہ بھی آتا ہے کہ ایسی بات کا اظہار کرے جس بات کا ظاہر ہونا برا (یا عیب) سمجھا جاتا ہو، خواہ بتانے والے کے نزدیک وہ عیب کی بات ہو یا جس کو بتایا گیا وہ اس کا (اظہار) اچھا نہ سمجھتا ہو یا کسی تیسرے شخص کے نزدیک برائی ہو۔ نیز طریقہ اظہار تقریر ہو یا تحریر یا اشارہ اور خواہ وہ قول ہو یا فعل اور قطع نظر اس کے کہ وہ بات عیب یا نقص کی ہو یا نہ ہو۔ غرض چاہیے یہ کہ ناپسندیدہ بات کسی کی مشاہدہ میں آئے تو اس کے بیان کرنے سے زبان بند رکھی جائے۔

چودھواں گناہ کبیرہ

اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا^(۱)

البتہ اگر اس کے بیان کرنے میں کسی مسلمان کا فائدہ ہو یا برائی کا سد باب ہوتا ہو تو مضائقہ نہیں۔

واضح ہو کہ چغل خور فاسق ہے اس کی گواہی تسلیم نہیں کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”یا ایہا الذین آمنوا ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا ان تصیروا قوماً بجھالہ“ (یعنی اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہیں کسی بات کی اطلاع دے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو مبادا بے خبری میں کسی قوم کو نقصان پہنچا دو) اللہ عزوجل نے چغل خور کی بات ماننے اور اسے سننے سے منع فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد ہے ”ولا تطع کل حلاف مہین، ہماز مشاء بنمیم، مناع للخیر معتد اثیم، عتل بعد ذلک ذنیم“ (یعنی ایسے کی بات نہ مان لیا کرو جو بہت قسمیں کھانے والا، عیب جوئی کرنے والا چغل خور ہے، نیک کام سے روکتا ہے، ظالم، گنہگار اور سرکش ہے، ساتھ ہی کمینہ بھی ہے) (القلم ۱-۱۳) چغلی کے ایک گناہ میں متعدد گناہ ہیں اور چغل خور جہنمی ہے۔ بہشت کی نعمتیں اس پر حرام ہیں کیونکہ اس میں کمینگی، بزدلی، کمزوری، حیلہ سازی، مکاری، چاپلوسی اور بدظنی ہوتی ہے۔ اس سے نیکیاں ضائع ہو جاتی ہیں اور اعمال صالحہ کا ثواب جاتا ہے۔ باہمی الفت جاتی رہتی ہے اور اخوت، میل جول اور یک جہتی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”لا یدخل الجنة نمام“ (یعنی چغل خور جنت میں نہیں جائے گا)۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا حضور نے فرمایا ”النمیمۃ الشمیمۃ والحمیمۃ فی النار“ (یعنی چغلی گالی گلوچ اور باہمی نفرت کرنے والے جہنمی ہیں) اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ”الا ان الکذب یسود الوجه والنمیمۃ من عذاب القبور“ (یعنی یاد رکھو کہ دروغ گوئی سے منہ کالا ہوتا ہے۔ اور چغل خوری عذاب قبر ہے) نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”الہمازون، واللمازون، والمشاءون بالنمیمۃ، الباغون للبراء العنت یحشر ہم اللہ فی وجوہ الکلاب“ بروایت ابو شیخ ابن حبان (یعنی عیب جوئی کرنے والے، چغل خور، عیب بیان کرنے والے اور نیکیوں سے باز رکھنے والے مستوجب لعنت ہیں اور قیامت کے روز کتوں کی صورت میں اٹھائے جائیں گے)۔

۱۔ واضح ہو کہ اللہ کی رحمت سے مایوسی اور بددلی گناہ کبیرہ ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے ”انہ لا یباس من روح اللہ الا القوم الکافرون“ (یعنی اللہ کی رحمت سے کوئی مایوس نہیں ہوتا بجز کافروں کی جماعت کے) اس آیت میں لفظ روح سے مراد (اللہ کی) رحمت اور کرم فرمائی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مسلمان پر اللہ تعالیٰ کا کرم ہی کرم ہے لہذا تنگی اور فراخی کے وقت اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ وہی شخص اس میں مایوس ہوتا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ (مقاصد) کو پورا کرنے کی قدرت ہی نہیں رکھتا یا اسے تمام باتوں کا علم نہیں ہے یا وہ کرم نہیں فرماتا بلکہ بخیل اور بے بس ہے۔ یہ تینوں باتیں موجبات کفر میں

پندرہواں گناہ کبیرہ

مکر الہی (عذاب ناگہانی) سے بے خوف ہونا^(۱)

سولہواں گناہ کبیرہ

حرم کے ممنوعہ علاقہ میں امر ممنوع کو حلال کر لینا^(۲)

سے ہیں اور ان ہی تین باتوں سے مایوسی اور بزدلی پیدا ہوتی ہے جو کفر ہیں اور کافروں سے سرزد ہوتی ہیں۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات سے بے خبر ہوتا ہے لیکن اللہ پر ایمان رکھنے اور اسے جاننے والا کسی حالت میں مایوس نہیں ہوتا، کیونکہ اس کی رحمت سب پر غالب ہے۔

۱۔ دوسرے کبیرہ گناہوں کی طرح اللہ تعالیٰ کے مکر (عذاب ناگہانی) سے بے پروا ہونا بھی گناہ کبیرہ ہے۔ لفظ ”مکر“ سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ عذاب ہے جو بے خبری میں نازل ہو جائے۔ چنانچہ اللہ نے بتا دیا ہے۔ کہ ناگہانی عذاب الہی کے نازل ہونے سے بے پروا ہونے والا ہی دنیا و آخرت دونوں جہان میں ناکام عاقبت ہوتا ہے کیونکہ وہ شخص دنیا کی مصیبت اور آخرت کا عذاب سخت اپنے ہاتھوں سمیٹتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”فامسوا مکر اللہ؟ فلا یا من مکر اللہ الا القوم الخاسرون“ (یعنی کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ کے ناگہانی عذاب سے بچ جائیں گے؟ یہی خسارہ پانے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے عذاب ناگہانی سے نہ بچ سکیں گے)۔ چنانچہ حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بندہ مومن طاعت الہی بجالاتا ہے تاہم (اللہ کی گرفت سے) ڈرتا، غمناک اور خائف رہتا ہے۔ (اس کے برعکس) بدکار شخص نافرمانی بھی کرتا ہے اور ٹڈر رہتا ہے۔ بمصداق ارشاد الہی ”والذین یؤتون ما آتوا وقلوبہم وجلة انہم الی ربہم راجعون“ یعنی اچھے لوگ جو حکم آتا ہے اسے بجالاتے ہیں ساتھ ہی ان کے دلوں میں آخر کار اللہ کے سامنے پیش ہونے کا خوف طاری رہتا ہے۔

۲۔ واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ علاقہ میں جو امور ممنوع ہیں ان کو حلال کر لینا بھی منجملہ گناہ کبیرہ کے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے علاقہ حرم کو امن کی جگہ قرار دیا ہے اور اس میں جنگ کرنا حرام فرمایا ہے۔ اللہ فرماتا ہے ”ومن دخلہ کان آمناً“ (یعنی جو اس علاقہ (حرم) میں داخل ہو گیا وہ محفوظ ہے) پس اگر کوئی خوف زدہ شخص وہاں آجائے تو ہر برائی سے محفوظ ہو جائے گا۔ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”اولم یروا اننا جعلنا حرمآ آمناً“ (یعنی کیا لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم نے حرم کو امن کی جگہ قرار دیا ہے؟) اور ارشاد ہے ”فلیعبدوا رب هذا البیت الذی اطعمہم من جوع وامنہم من خوف“ (یعنی چاہیے کہ اس گھر کے مالک کی عبادت کریں جس نے انہیں بھوک میں روزی عطا کی اور اندیشے سے محفوظ رکھا اور فتح مکہ کے روز آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”ان هذا البلد حرمہ اللہ یوم خلق السموات والارض، فہو حرام بحرمۃ اللہ الی یوم القیامۃ، وانہ لم یحل القتال فیہ، لا حد قبلی، ولم یحل لی الا فی ساعۃ من

ستر ہواں گناہ کبیرہ

ابن السبیل (غریب الوطن) کی مالی اعانت نہ کرنا (۱)

نہار ، فهو حرام بحرمۃ اللہ الی یوم القیامۃ ، ولا یقصد شوکہ ، ولا ینفر صیدہ ، ولا یلتقط لقطۃ الا من عرفہا ، ولا تنحتی خلالہا ، (یعنی اللہ تعالیٰ نے اس روز سے جبکہ زمین و آسمان کو پیدا فرمایا قیامت تک کے لیے اس شہر میں قتال کو حرام فرمایا اور مجھ سے پہلے کسی کو بھی اس کی اجازت نہیں اور مجھے بھی دن میں ایک گھڑی بھر کے علاوہ اجازت قتال نہیں ہوئی۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے قابل احترام بنا کر قیامت تک کے لیے یہاں پر قتال کرنا حرام کر دیا، اب نہ اس کے کانٹوں کو توڑا جائے نہ شکار کے جانور کو برا بیچنے کیا جائے اور نہ کسی گری پڑی شے کو کوئی اٹھائے۔ بجز اس کے جو اس کو جانتا ہے یعنی اسے علم ہے کہ یہ میری شے ہے، اور نہ شکار کی تاک میں چھپ کر بیٹھ جائے)۔

۱۔ حقیقت یہ ہے کہ بخشش اور سخاوت مسلمانوں کی صفات میں سے ہے کریم (یعنی کرم کرنے والا) اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سے ہے۔ نبی ﷺ بنی نوع انسان میں سب سے زیادہ سخی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مسلمانوں کو جو دو سخا کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری ہے ”وسارعو الی مغفرۃ من ربکم وجنۃ، عرضہا السموات والارض اعدت للمتقین الذین ینفقون فی السراء والضراء“ (یعنی لوگو اپنے پروردگار کی بخشش اور جنت کے حصول کی جو آسمان و زمین کے برابر وسیع ہے کوشش کرو۔ اس کا وہرہ ان لوگوں سے کیا گیا ہے جو خوشی اور ناخوشی دونوں حالتوں میں راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں)۔ نیز اللہ تعالیٰ نے جنتیوں کی صفات کو اس طرح بیان فرمایا ہے ”یطعمون الطعام علی حبہ مسکیناً ویتیماً واسیراً“ (یعنی وہ لوگ خوشنودی خالق کے لیے مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں) اور رسول اللہ ﷺ نے، حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد بیان فرمایا ہے ”یا ابن آدم انفق انفق علیک“ (یعنی اے اولاد آدم محتاجوں پر خرچ کر میں تجھ پر خرچ کروں گا) اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”قال جبریل: قال اللہ عزوجل ان هذا دین ارتضیہ لنفسی لا یصلحہ الا السخاء، وحسن الخلق فاکرموہ بہما ما استطعتم“ (یعنی یہ دین ہے جو میں نے خود پسند فرمایا۔ اس کی خوبی سخاوت اور خوش خلقی کے بغیر اجاگر نہیں ہو سکتی۔ پس جہاں تک بن پڑے ان باتوں سے اسے بہتر بناؤ) نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ما جعل اللہ عزوجل ولیاً لہ الا علی السخاء، وحسن الخلق“ (یعنی اللہ تعالیٰ نے کسی کو اپنا ولی نہیں بنایا بجز اس کے جس میں سخاوت اور خوش اخلاقی ہو) اور فرمایا ”ان اللہ جواد یحب الجواد، ویحب معالی الاخلاق، یکرہ سفاسفہا“ (یعنی اللہ سخی ہے اور سخی کو پسند فرماتا ہے اور اعلیٰ اخلاق کو پسند کرتا اور کنجوسی کو ناپسند کرتا ہے) اور ارشاد فرمایا ”طعام الجواد دواء وطعام البخیل داء“ (یعنی سخی کا کھانا دوا ہے اور کنجوس کا کھانا مرض ہے) آنحضرت ﷺ نے بخل سے منع فرمایا۔ اور بخیل کی مذمت فرمائی ہے۔ چنانچہ مسلم نے جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ حضور نے فرمایا ”اتقوا الظلم فان الظلم ظلمات یوم القیامۃ، واتقوا الشح، فان الشح اہلک من کان قبلکم حملہم علی ان سفکوا

اٹھارہواں گناہ کبیرہ

والدین کی نافرمانی کرنا

جو حدیث ہم نے جھوٹی گواہی دینے کے باب میں بیان کی ہے۔ یہ بات اس میں گزر چکی ہے کہ والدین کی نافرمانی اللہ کے ساتھ شرک کرنے کے بعد دوسرے درجہ پر سب سے بڑا کبیرہ گناہ ہے (۱)

دماءہم واستحلوا محارمہم‘ (یعنی ظلم سے بچو ظلم روز قیامت کا اندھیرا ہوگا نیز حرص سے بچو اس حرص نے اگلے لوگوں میں تباہی مچائی کہ باہمی خون ریزی کی اور اپنی محرمات کو حلال کر لیا) نیز حضورؐ نے ارشاد فرمایا ”ثلاث مہلکات شح مطاع، وھوی متبع، واعجاب المرء بنفسہ“ (یعنی تین امور ہلاک کرنے والے ہیں۔ حرص میں پڑے رہنا۔ خواہش نفس کی پیروی کرنا اور کسی شخص کا اپنے اوپر فخر کرنا) اور فرمایا کہ ”یہ دو باتیں مسلمان میں یک جا نہیں ہو سکتیں۔ یعنی کنبہی اور بد مزاجی“ اور فرمایا ”لا یدخل الجنة بخیل ولا جبار، ولا منان، ولا سی المملکۃ“ (یعنی جنت میں نہ بخیل جائے گا۔ نہ ظالم نہ احسان جتانے والا اور نہ بری خصلت والا) اور فرمایا ”السلھم انسی اعود بک من البخل“ (یعنی اے اللہ میں بخل سے تیری پناہ مانگتا ہوں)۔

واضح ہو کہ ابن السبیل (غریب الوطن جس کا ذکر اوپر آیا ہے) سے مراد وہ مسافر ہے جس کا زادراہ ختم ہو گیا ہو۔ اس کے ساتھ اتنی مالی اعانت کرنی چاہیے کہ وہ اپنے وطن پہنچ سکے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص طاعت الہی کے لیے سفر کا ارادہ کرے تو اسے اتنا دیا جائے کہ اس کے اخراجات آمد و رفت کے لیے ملتی ہو۔ اس میں وہ مہمان داخل ہے جو مسلمانوں میں فروکش ہوا ہو، اگر کوئی شخص باوجود مقررہ رکھنے مالی اعانت سے باز رہا تو اس نے کبیرہ گناہوں میں سے ایک گناہ کا ارتکاب کیا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ اسلام میں کون سی بات اچھی ہے۔ فرمایا کہ کھانا کھلاؤ اور سلام کرو خواہ اسے جانتے ہو یا نہ جانتے ہو۔

۱۔ والدین کی نافرمانی کے متعلق علماء نے یہ بیان کیا ہے کہ اگر والدین اولاد پر کسی کے مطالبہ حق کے لیے قسم کھائیں اور اولاد اسے ادا نہ کرے۔ یا وہ اپنی کوئی حاجت بیان کریں اور اسے پوری نہ کرے یا ان کی امانت میں خیانت کرے یا ان میں سے کوئی بھوکا ہو اور خود پیٹ بھر کر کھالے اور انہیں نہ کھلائے یا ماں باپ اس پر الزام لگائیں اور یہ مارے۔ یہ گناہ ان تمام گناہوں میں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ہے سب سے بڑا گناہ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنے بندوں کو اپنی عبادت کا حکم دیا ہے، عبادت کے ساتھ ہی والدین سے خوش سلوکی، بھلائی اور ان کی فرمانبرداری کا بھی حکم ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے ”واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئاً وبالوالدین احساناً“ (یعنی اللہ کی عبادت کرو اس کا شریک کسی کو نہ بناؤ اور والدین کے ساتھ حسن سلوک برتو) نیز ارشاد ہے ”وقضی ربک الا تعبدوا الا ایاہ وبالوالدین احساناً“ (یعنی تمہارے رب کا یہ فیصلہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسن

سلوک رکھو) پس جس طرح کہ شرک باللہ اور ترک عبادت الہی گناہ کبیرہ ہے اسی طرح وہ امور بھی جو اس کے ساتھ بیان ہوئے یعنی والدین کے ساتھ حسن سلوک فرض ہے اور ان کی نافرمانی ان گناہوں میں سب سے بڑا گناہ ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے بلکہ رسول اللہ ﷺ نے تمام گناہوں میں سب سے بڑا گناہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک بنانا فرمایا۔ ساتھ ہی والدین کی نافرمانی کا ذکر فرمایا اور دوسرے تمام گناہوں پر اس کا ذکر مقدم رکھا۔ چنانچہ ارشاد ہے ”الکبائر الاشراک باللہ، وعقوق الوالدین، وقتل النفس، واليمين الغموس“ بخاری بروایت صحیح (یعنی کبیرہ گناہ یہ ہیں: اللہ کا شریک بنانا، والدین کی نافرمانی کرنا، جان کا ہلاک کرنا اور جھوٹی قسم کھانا) نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”من الکبائر شتم الرجل والديه، قالوا: يا رسول الله وهل يشتم الرجل والديه؟ قال: نعم يسب ابا الرجل فيسب اياه، ويسب امه، فيسب امه“ (یعنی اپنے والدین کو گالی دینا گناہ کبیرہ ہے۔ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کوئی شخص اپنے والدین کو گالی دے گا؟ فرمایا، ہاں وہ یوں کہ ایک شخص کسی کے باپ کو گالی دے تو پلٹ کر وہ بھی اس کے باپ کو گالی دے گا اسی طرح کسی کی ماں کو گالی دی تو وہ بھی اس کی ماں کو گالی دے گا) یعنی یہ گو یا اپنے والدین کو گالی دینا۔ نیز رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ”ان الله حرم عليكم عقوق الامهات، ومنع، وهات، وواد البنات، وكره لكم قيل وقال، وكثرة السؤال، واضاعة المال“ (یعنی اللہ تعالیٰ نے ماں کی نافرمانی، حق تلفی، جھگڑنے اور بیٹیوں کو دفن کرنے کو تم پر حرام کر دیا اور قیل و قال کرنے، زیادہ پوچھ گچھ کرنے اور مال ضائع کرنے کو ناپسند فرمایا)۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”رضا الله في رضا الوالد، وسخط الله في سخط الوالد“ (یعنی اللہ کی خوشنودی، باپ کی خوشنودی میں اور اس کی ناخوشی باپ کی ناخوشی میں ہے)۔ نیز فرمایا ”الجنة تحت اقدام الامهات“ (یعنی جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے) بلکہ اللہ تعالیٰ نے ماں باپ کی یا کسی ایک کی نافرمانی کرنے والوں پر، جنت کو حرام کر دیا ہے پھر توبہ کرنے سے پہلے مر جائے یا والدین انتقال کر جائیں درآنحالیکہ وہ اس سے راضی نہ ہوں چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”لا يدخل الجنة عاق ولا منان، ولا مدمن خمر، ولا مؤمن بسحر“ (یعنی نافرمان اولاد احسان جتانے والا، دائم الخمر اور جادو پر یقین رکھنے والا جنت میں نہیں جائے گا) بلکہ نبی ﷺ نے بدو عا کی ہے کہ نافرمان اولاد اللہ کی رحمت سے دور رہے۔ چنانچہ کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ”احضروا المنبر“ (یعنی منبر لاؤ) منبر لے آئے۔ آپ نے اس کے ایک زینے پر چڑھ کر فرمایا ”آمین“ (یعنی ایسا ہی ہو) پھر دوسرے زینے پر چڑھے اور فرمایا ”آمین“ پھر تیسرے زینے پر چڑھے اور فرمایا ”آمین“ اس کے بعد جب آپ منبر سے نیچے آئے تو ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم نے آج دہان مبارک سے ایسی بات سنی جو اس سے پہلے کبھی نہ سنی تھی۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا ”ان جبریل عليه السلام عرض لي فقال: بعد من ادرك رمضان فلم يغفر له، قلت: آمين، فلما رقيت الثانية قال: بعد من ذكرت عنده، فلم يصل عليك، فقلت: آمين، فلما رقيت الثالثة قال: بعد من ادرك ابويه الكبر عنده او احدهما فلم يدخلا الجنة، قلت: آمين“

انیسواں گناہ کبیرہ

غلول (مال غنیمت کے چھپا لینے) کا بیان

واضح ہو کہ علماء نے لڑائی میں ہاتھ آئے ہوئے (مال غنیمت) میں سے کچھ چھپا لینا گناہ کبیرہ قرار دیا ہے۔ اس کو غلول کہتے ہیں۔ پس اگر کوئی شخص میدان جہاد میں دشمن سے کچھ مال لوٹے اور اسے اپنے ساتھیوں سے چھپا لے تو یہ بھی منجملہ گناہ کبیرہ کے ہے۔^(۱)

(یعنی اس وقت جبریل نے میرے سامنے بتایا کہ وہ شخص (رحمت الہی سے) دور ہو وہ جس نے ماہ رمضان پایا اور اس کی مغفرت نہ ہوئی میں نے کہا آمین پھر جب دوسرے زینے پر چڑھا تو انہوں نے کہا کہ وہ بھی بعید از رحمت ہو جس کے سامنے آپ کا ذکر ہوا اور اس نے درود نہ بھیجا، میں نے کہا آمین پھر جب میں تیسرے زینے پر چڑھا تو انہوں نے کہا کہ وہ بھی رحمت الہی سے بعید ہو جس کے سامنے اس کے والدین یا ان میں سے کوئی بڑھاپے کو پہنچے اور اسے جنت میں نہ لے گئے تو میں نے کہا آمین) حاکم نے اس حدیث کو روایت کیا اور بتایا کہ اس کی اسناد صحیح ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے سامنے کبیرہ گناہوں کا ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ ”الشُرک باللہ وعقوق الوالدین“ یعنی اللہ کا شرک اور والدین کی نافرمانی۔ یہ گناہ کبیرہ ہیں۔

۱۔ جنگ میں ہاتھ آئے ہوئے کچھ مال کا چھپا لینا ”غلول“ کہلاتا ہے۔ اور یہ بھی منجملہ گناہ کبیرہ کے ہے۔ روایت ہے کہ جنگ بدر کے روز ایک منہلی چادر (مال غنیمت میں سے) گم ہو گئی۔ خیال ہوا کہ شاید رسول اللہ ﷺ نے اسے لے لیا ہو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ”ما کان لنبی ان یغل، ومن یغل یات بما غل یوم القیامۃ“ (یعنی نبی کی شان کے شایاں نہیں کہ مال غنیمت سے کوئی چیز چھپا کر رکھ لے اور جو شخص بھی کوئی چیز چھپا کر لے گا قیامت کے دن وہ چیز اسے لانی پڑے گی)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ کسی نبی کے شایاں نہیں کہ (مال غنیمت میں) خیانت کرے اور کسی شے کو اپنے لیے مخصوص کر لے۔ اس کے بعد ہی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ”ثم توفی کل نفس ما کسبت وهم لا یظلمون“ (یعنی ہر شخص کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور کسی پر ظلم نہ ہوگا) غرض یہ شدید تنبیہ اور سخت دھمکی ہے۔

حدیث میں اس گناہ کبیرہ کی ممانعت آئی ہے۔ حضور نے فرمایا ہے ”لا عرفن احدکم یماتسی یوم القیامۃ یحمل شاة لها ثغاء، ینادی: یا محمد یا محمد، فاقول لا املک لک من اللہ شیئا قد بلغتک، و لا عرفن احدکم یماتسی یوم القیامۃ یحمل جملا نہ رغاء یقول: یا محمد یا محمد، فاقول لا املک لک من شیئا قد بلغتک، ولا عرفن احدکم یماتسی یوم القیامۃ، یحمل فرسالہ حممة، ینادی: یا محمد یا محمد فاقول: لا املک من اللہ شیئا قد بلغتک، ولا عرفن احدکم یماتسی یوم القیامۃ

يحمل قسما من آدم ينادى : يا محمد يا محمد فاقول : لا املك من الله شيئا قد بلغتكم (یعنی) قیامت کے روز میں تم میں سے اسے پہچان لوں گا جو ایک بکری لے کر آئے گا جو میاں ہوگی اور وہ شخص پکار رہا ہو یا محمد یا محمد تو میں اس سے کہوں گا کہ میں تیرے لیے اللہ سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اور یہ بھی بتا چکا ہوں۔ اور میں تم میں سے اسے پہچان لوں گا جو ایک اونٹ لے کر آئے گا اور وہ اونٹ بلبلارہا ہوگا اور وہ شخص پکار رہا ہوگا، یا محمد یا محمد میں کہوں گا کہ میں تمہارے لیے اللہ سے کچھ نہیں کہہ سکتا میں نے یہ بتا دیا ہے۔ اور میں تم میں سے اسے پہچان لوں گا جو قیامت کے روز ایک گھوڑا لے کر آئے گا اور وہ گھوڑا ہنہنارہا ہوگا اور وہ شخص چلا رہا ہوگا، یا محمد یا محمد میں کہوں گا کہ میں تمہارے لیے اللہ سے کچھ نہیں کہہ سکتا یہ میں نے بتا دیا ہے اور میں تم میں سے اس شخص کو پہچان لوں گا جو قیامت کے روز کسی قسم کی اچھوری (چمڑا) لے کر آئے گا اور چلائے گا یا محمد یا محمد میں کہوں گا کہ میں تمہارے لیے اللہ سے کچھ نہیں کہہ سکتا یہ میں تمہیں بتا چکا ہوں)۔

عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ غنیمت میں آئے ہوئے پشت شتر سے جب اون لیتے تھے تو فرماتے تھے ”مالی فیہ الا مثلاً مالا حدکم، ایاکم والغلول والغلول، فان الغلول خزی علی صاحبہ یوم القيامة، ادوا الخیط والمخیط، وما فوق ذلک، وجهدوا فی سبیل اللہ القریب والبعید فی الحضر والسفر، فان الجہاد باب من ابواب الجنة انه لينجی اللہ به من الهم والغم، و اقيموا حدود اللہ فی القریب والبعید، ولا تاخذکم فی اللہ لومة لائم“ (یعنی اس میں میرا حق بس اتنا ہی ہے جتنا تم میں سے کسی کا ہے۔ خبردار چھپ کر لینے سے بچو۔ یاد رکھو کہ غلول یا چھپا کر رکھ لینا۔ قیامت کے روز موجب رسوائی ہے دھاگہ اور سوئی سے لے کر زیادہ جو کچھ بھی ہو سب دے دیا کرو اور نزدیک و دور حضور میں براہ خدا جہاد کرتے رہو۔ جہاد، جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ تمہیں رنج و الم سے نجات دے گا۔ اللہ کی حدود کو نزدیک و دور ہر جگہ نافذ کرو اور ارشاد باری کے سامنے کسی کی مذمت کی پرواہ نہ کرو)۔

رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے کہ حضور نے فرمایا ”ردوا الخیطا والمخیط، فان الغلول عار، و نار، و شہار، علی اہلہ یوم القيامة“ (یعنی مال غنیمت کا دھاگہ اور سوئی تک دے دو۔ قیامت کے روز چھپا کر رکھنے والے کے لیے یہ فعل باعث شرم، دوزخ کی آگ اور باعث رسوائی ہوگا) نیز آنحضرت ﷺ سے روایت ہے کہ حضور نے فرمایا کہ ”ان الحجر یرمی فی جہنم فیہوی سبعین خریفاً ما یبلغ قعرھا ویؤتی بالغلول فیقذف معہ ثم یقال لمن غل بہ انت بہ فذلک قولہ ”ومن یغلل یات بما غل یوم القيامة“ (یعنی پتھر جہنم میں پھینکا جائے تو ستر موسم خریف گزر جانے پر بھی اس کی تہ تک وہ نہیں پہنچ سکتا۔ قیامت کے روز مال غلول اس میں پھینک دیا جائے گا اور مال غنیمت چھپا لینے والے سے کہا جائے گا کہ اس کو لے آ۔ قرآن میں جو آیا ہے کہ قیامت کے روز غلول کرنے والے (خائن) کو چھپایا ہو مال غنیمت لانے کے لیے کہا جائے گا اس کا یہی مطلب ہے)۔

حنفیہ مالکیہ اور شافعیہ کہتے ہیں مال غنیمت چھپا لینے والے کو یعنی جس کے سامان میں سے مال غنیمت برآمد ہو امیر (حاکم وقت) سزا دے گا۔

واضح ہو کہ بعض اصحاب نے سرقہ (چوری) کو گناہ کبیرہ میں شمار کیا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ سرقہ بہت بڑا جرم ہے گو صاحب شریعت علیہ السلام نے اس کے گناہ کبیرہ ہونے کی صراحت نہیں فرمائی تاہم یہ مذکور ہے کہ جرم سرقہ دنیا و آخرت کے بڑے بڑے گناہوں میں سب سے بڑا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ سرقہ کرنے والے کا ایمان جاتا رہتا ہے۔ چنانچہ سارق کے خارج از اسلام ہو جانے کی بابت ارشاد ہے ”لایسرق السارق حین یسرق و هو مؤمن“ (یعنی چوری کرنے والا مومن ہوتے ہوئے چوری نہیں کر سکتا) ایک اور روایت میں یہ بھی ہے ”فان سرق فقد خلع ربقة الایمان من عنقه“ (یعنی اگر کسی نے چوری کی تو اس نے ایمان کا پھندا اپنی گردن سے اتار دیا) شریعت نے اس کی سخت سزا رکھی ہے جو اس کی خرابیوں کے مطابق ہے جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ یہاں پر تو صرف ان گناہوں کی تعداد بتانا مقصود ہے جن کو حدیثوں میں گناہ کبیرہ بتایا گیا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تمام دینی جرائم صرف اسی قدر ہیں۔^(۱)

متنازعہ کہتے ہیں کہ مال غنیمت کو چھپالینے والے کی سزا یہ ہے کہ اس کا سامان نکال کر جو کچھ اس میں ہو سب جلا دیا جائے اور ان پر حد (سزائے شرعی) نافذ کی جائے جس کی مقدار مملوک (غلام یا لونڈی) کی سزا سے کم ہو اور مال غنیمت میں سے اس کا حصہ خارج کر دیا جائے گا چنانچہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”من وجدتم فی متاعه غلولا فاحرقوه..... قال: واحبسہ. قال: واضربوه“ (یعنی جس شخص کے سامان سے مال غنیمت برآمد ہو اس سامان کو جلا دو اس شخص کو قید میں ڈال دو اور فرمایا اسے سزائے ضرب دو۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ جنگ خیبر والے دن رسول اللہ ﷺ کے صحابیوں میں سے کچھ لوگ حاضر خدمت ہوئے اور انہوں نے بتایا کہ فلاں شخص شہید ہوا۔ اور فلاں شہید ہوا، یہاں تک کہ ایک اور شخص کا ذکر آیا انہوں نے کہا کہ وہ بھی شہید ہوا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”کلا انی رآیتم فی النار فی بردة غلہا، او عبائۃ“ (یعنی ہرگز نہیں۔ میں نے تو دیکھا کہ وہ دوزخ میں ہے اور اس کے اوپر وہ چادر یا چغہ ہے جو اس نے بدویان سے چھپا لیا تھا)۔

۱۔ کبیرہ گناہوں کی تعداد کے بارے میں، صحابہ اور تابعین کے درمیان اختلاف ہے۔ ان کی تعداد چار۔ سے لے کر سات، نو، گیارہ بلکہ اس سے بھی زیادہ بتائی گئی ہے چنانچہ عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ ان کی تعداد چار ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا کہنا ہے کہ کبیرہ گناہ سات ہیں۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے بتایا کہ نو ہیں اور عبداللہ بن عباسؓ کو جب ابن عمرؓ کا قول معلوم ہوا کہ گناہ کبیرہ سات ہیں تو وہ کہنے لگے کہ ان کی تعداد ستر ہے، کم سے کم سات ہے، اور ایک بار فرمایا کہ جن باتوں سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے وہ سب گناہ کبیرہ ہیں۔ نیز انہوں نے اور

ان کے ساتھ دوسرے صحابہؓ نے فرمایا کہ جس گناہ پر اللہ تعالیٰ نے جہنم کی سزا رکھی ہے وہ گناہ کبیرہ ہے۔

بزرگان سلف میں سے بعض نے کہا ہے کہ جن گناہوں پر دنیا میں سزائے حد (شرعی سزا) نافذ ہوتی ہے وہ گناہ کبیرہ ہیں، ان کے علاوہ صغیرہ گناہ ہیں جن کی حیثیت معمولی یا کم درجہ کے گناہ کی ہے اور یہ وہ ہیں جن پر حد نہیں لگتی اور نہ عذاب جہنم کی تنبیہ ہے، یہ قول حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

عبدالرزاق رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ کبیرہ گناہوں کی تعداد گیارہ ہے، تعداد کے بارے میں فی الجملہ جو کچھ کہا گیا ہے ان میں سب سے زیادہ تعداد یہ ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کی کوئی تعداد قطعی نہیں ہے، صحیح تعداد معلوم نہیں ہے جیسے لیلۃ القدر اور جمعہ کے دن کی (قبولیت و عداوتی) ساعت نہیں معلوم، اور نہ یہ متعین ہے کہ صلاۃ وسطی (یعنی نماز پنجگانہ میں درمیان کی نماز جس کے خاص طور پر خیال رکھنے کا حکم قرآن میں ہے) کوئی ہے، اس (کے مبہم رکھنے) میں مصلحت یہ ہے کہ لوگ (ہمہ وقت) خوف ورجا کی حالت میں رہیں اور قطعی طور پر (کوئی دن یا وقت متعین کر کے) ایک خیال پر نہ جم جائیں۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس (کے تعین کے) بارے میں اچھا استنباط فرمایا ہے، ان سے کبیرہ گناہوں (کی تعداد) کے بارے میں دریافت کیا گیا، انہوں نے کہا کہ سورۃ نساء کو شروع سے تیسویں آیت کے آغاز یعنی اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد تک پڑھو ”ان تجتنبوا کبائر ما تنہون عنہ نکفر عنکم سیاتکم“ (یعنی اگر تم ان کبیرہ گناہوں سے بچو جس سے تمہیں منع کیا گیا ہے تو ہم تمہارے گناہوں کا کفارہ ”یعنی تلافی گناہ کر دیں گے)۔ پس ابتدائے سورہ نساء سے اس مقام تک جن باتوں سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے وہ سب گناہ کبیرہ ہیں، یہ دلیل حضرت ابن عباسؓ کے اس استنباط کی مانند ہے جو انہوں نے لیلۃ القدر (شب قدر) کے بارے میں فرمایا (کہ وہ رمضان کی ستائیسویں رات ہے)۔

آپ سورۃ قدر کے لفظ (ہی) تک پہنچے، یہاں تک ستائیس (۲۷) الفاظ ہوتے ہیں (آپ نے یہ نتیجہ نکالا کہ ستائیسویں شب ہی لیلۃ القدر ہے) دونوں امور کے بارے میں حقیقت حال اللہ ہی جانتا ہے۔

ابوطالب مکی کہتے ہیں کہ میرے نزدیک ان تمام متفرق خیالات سے یک جائی طور پر کبیرہ گناہوں کی تعداد سترہ۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ ان منجملہ چار اعمال کا تعلق دل (عقیدہ) سے ہے یعنی شرک باللہ کرنا، اللہ کی نافرمانی پراڑ جانا، اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا اور خود کو اللہ کے ناگہانی عذاب سے محفوظ سمجھ لینا، اور چار گناہوں کا تعلق زبان سے ہے: جھوٹی شہادت دینا، بے گناہ پر تہمت لگانا، جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھانا، اور جادو کا عمل کرنا، تین گناہوں کا تعلق پیٹ سے ہے: یعنی شراب اور مسکرات کا پینا، بیجا طور پر یتیم کا مال کھا لینا، اور دانستہ سود کھانا، دو گناہ شرمگاہوں سے متعلق ہیں یعنی زنا اور لواطت جس میں قوم لوط مبتلا تھی، دو گناہ ہاتھ کے ہیں یعنی قتل اور چوری، ایک گناہ پیروں کا ہے: بدور ان جنگ بھاگ نکلنا، یہ دونوں پیروں کا گناہ ایک ہی گناہ ہے، ایک گناہ ایسا ہے جس کا تعلق پورے وجود انسان سے ہے یعنی والدین کی نافرمانی، یہ تمام گناہ موجب ہلاکت ہیں، جس نے ان سے پرہیز کیا وہ تمام خرابیوں سے بچ گیا اور فرائض خمسہ کے علاوہ جن پر اسلام کی بنیاد ہے مزید نوافل (عطیہ الہی) کا مستحق ہو گیا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”ان تجتنبوا کبائر ما تنہون عنہ نکفر عنکم سیاتکم“ (یعنی اگر تم ان کبیرہ گناہوں سے بچے تو ہم اسے تمہارے گناہوں کا کفارہ (موجب تلافی) بنا دیں گے)۔

بیسواں گناہ کبیرہ عہد نماز ترک کرنا^(۱)

۱۔ واضح ہو کہ پر از حکمت شریعت نے نماز کو باقاعدہ ادا کرنے۔ اس کا دھیان رکھنے اور اس کا اہتمام کرنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ان الصلوٰۃ کانت علی المؤمنین کتاباً موقوتاً (یعنی بلاشبہ نماز کو مقررہ اوقات میں ادا کرنے کا حکم ہے) نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ”الذین یقیمون الصلوٰۃ“ (یعنی متقی وہ ہیں جو باقاعدگی سے نماز ادا کرتے ہیں)۔

رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے ”اربع فرضھن اللہ فی الاسلام، فمن اتى بثلاث لم یغنین عنه شیا حتی یأتی بہن جمیعاً، الصلوٰۃ وزکوٰۃ، وصیام رمضان، وحج البیت“ بروایت احمد (یعنی اسلام میں اللہ تعالیٰ نے چار باتوں کو فرض قرار دیا ہے۔ اگر ان میں سے کسی نے تین باتیں پوری کر بھی لیں تو اسلام کا کچھ بھی حق ادا نہ ہوا جب تک کہ یہ چاروں باتیں پوری نہ کی جائیں۔ یعنی نماز، زکوٰۃ، روزہ، رمضان اور خانہ کعبہ کا حج)۔ اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”من ترک الصلوٰۃ متعمداً احبط اللہ عملہ، وبرئت منه ذمۃ اللہ حتی یراجع اللہ عزوجل توبۃ“ بروایت اصبہانی (یعنی جس نے عہد نماز کو ترک کر دیا اللہ تعالیٰ نے اس کا عمل ضائع کر دیا اور جب تک کہ توبہ کر کے وہ اللہ کی طرف رجوع نہ کرے، اللہ عزوجل اس کی نجات سے بری الذمہ ہوگا)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں ”من ترک الصلوٰۃ فقد کفر“ (یعنی جس نے ترک نماز کیا اس نے کفر کیا) حضرت ابن مسعود نے فرمایا ”من ترک الصلوٰۃ فلا دین له“ (یعنی جس نے نماز کو ترک کیا وہ لاندہب ہے) اور جابر بن عبد اللہ کا فرمان ہے من لم یصل فہو کافر (یعنی جس نے نماز نہ پڑھی وہ کافر ہے) اور نبی ﷺ کی حدیث صحیح ہے ”ان تارک الصلوٰۃ کافر“ (یعنی تارک صلاۃ کافر ہے) آنحضرت ﷺ کے عہد سے جملہ اہل علم کی یہی رائے ہے کہ بغیر کسی عذر کے عہد نماز نہ پڑھنے والا یہاں تک کہ نماز کا وقت نکل جائے کافر ہے۔ کیونکہ اس نے حکم خداوندی سے انکار کیا۔ نیز نبی ﷺ نے فرمایا ”بین العبد المؤمن و بین الکفر ترک الصلوٰۃ“ (یعنی بندہ مؤمن اور کفر کے درمیان صرف ترک صلوٰۃ کا فاصلہ ہے)

امام نووی فرماتے ہیں کہ اگر تارک صلاۃ اس کے واجب الادا ہونے سے منکر ہو تو، بالاتفاق جملہ مسلمانان، وہ ملت اسلامیہ سے خارج ہے۔ البتہ ابتدائے عہد اسلام ہو (جب کہ اس کی اہمیت سے وہ شخص بے خبر ہو) تو اور بات ہے۔ لیکن اگر سستی سے نماز ترک کی اگرچہ اس کا عقیدہ یہ ہو کہ وہ واجب ہے جیسا کہ اس زمانہ میں بہت سے لوگوں کی یہ حالت ہے۔ اس صورت میں علماء کی رائیں مختلف ہیں۔

گناہ کبیرہ

جادو کا بیان

سحر (یا جادو) جس کا ذکر حدیث میں آیا ہے، اس سے مراد بعض ایسے اقوال و افعال کا ارتکاب ہے جو دین کے خلاف اور شرعی طریقوں کے منافی ہوں۔

فقہاء نے اس کی تعریف یوں کی ہے کہ جادو میں ایسے اقوال ہوتے ہیں جس میں غیر اللہ کی عظمت بتائی جاتی ہے اور کائنات کی تقدیر کو اس کے ساتھ وابستہ کیا جاتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس لحاظ سے جادو کا عمل تمام کبیرہ گناہوں میں سب سے زیادہ برا ہے، بلکہ اس کے نتیجہ سے قطع نظر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جادو علانیہ ارتداد (دین سے پھر جانے) کی شکل اختیار کر لیتا ہے، کیونکہ جو شخص عظمت کو جو صرف اللہ

مالکیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ ایسے شخص کو کافر نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ اسے فسق (گناہ) کہیں گے۔ اسے توبہ کرنے کو کہا جائے۔ اگر توبہ کر لے تو خیر بصورت دیگر اسے 'حد' کے طور پر قتل کیا جائے۔ جیسے شادی شدہ زانی کو قتل کا حکم ہے۔ لیکن اسے تلوار سے قتل کیا جائے گا۔ سنگسار نہیں کیا جائے گا۔

حنفیہ اور مزنی جو اصحاب شافعیہ میں سے ہیں کہتے ہیں کہ نہ اسے کافر قرار دیا جائے اور نہ قتل کیا جائے۔ بلکہ اسے سزا دی جائے اور قید کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ نماز پڑھنے لگے۔ اس لیے کہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے "لا یسحل دم امری مسلم الا باحدی ثلاث" (یعنی کسی مسلمان کا خون حلال نہیں بجز ان تین باتوں میں سے کسی ایک کے) ان تین باتوں میں ترک نماز کا ذکر نہیں ہے اور وہ گناہگار مومن ہے۔

حنابلہ، عبد اللہ بن مبارک، اسحاق بن راہویہ اور شافعیہ میں سے بعض اصحاب کہتے ہیں نیز حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ بغیر کسی عذر کے عمدتاً تارک صلاۃ کو کافر کہا جائے گا اور اس کے واجب القتل ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ کے اس قول سے دلیل پیش کی گئی ہے "فان تاهوا و اقاموا الصلوۃ و اتوا الزکوۃ فخلوا سبیلہم" (یعنی اگر وہ توبہ کر لیں۔ نماز باقاعدہ ادا کرنے لگیں اور زکوۃ دیں تو انہیں رہا کر دو) اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے "امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ، ویقیموا الصلوۃ، ویؤتوا الزکوۃ، فاذا فعلوا ذلك عصموا منی دماءہم و اموالہم" (یعنی مجھے حکم ہے کہ میں ان لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ کہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، نماز باقاعدہ ادا کریں اور زکوۃ دیں اگر وہ سب کچھ کریں تو میری طرف سے ان کے جان و مال محفوظ ہوں گے) ان اصحاب نے آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کا کہ "بین العبد و بین الکفر ترک الصلوۃ" (یعنی بندہ اور کفر کے درمیان ترک نماز کا فرق ہے) یہ مطلب بتایا ہے کہ تارک نماز سزاے کفر کا مستحق ہے۔ یعنی مستوجب قتل ہے یا یہ کہ اس

ہے۔ اے محسوس ہے غیر اللہ سے منسوب کرے وہ کافر ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ بعض بدکردار اشخاص جو جادو کا عمل کرتے ہیں اس میں اللہ کو گالی دی جاتی ہے اور کسی کو نہاد ہم پلہ جان کر اس کو سجدہ کرتے ہیں۔ بعض جادوگر قرآن شریف کو اپنے پیروں کے نیچے رکھ لیتے ہیں۔ اور بعض فرشتوں کو گالی دیتے اور ان کی توہین کرتے ہیں پھر ان میں سے بعض اللہ کی ایسی صفت بیان کرتے ہیں جو اس کی شان کے شایاں نہیں ہے، یہ سب کچھ ارتداد (اسلام سے پھر جانے) کے برابر ہے لیکن اگر جادو کا عمل ان باتوں سے خالی ہو مثلاً خدا کا نام لیا جائے اور حروف کا استعمال اس طرح کیا جائے جو دین کے منافی نہ ہو تو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس جادو کا اثر کیا ہوتا ہے اگر اس سے کسی بے قصور کو ضرر یا کسی بے گناہ کے مال و جان کو نقصان پہنچا تو وہ عمل حرام ہے۔ (۱)

قاتل حلال ہے یا اس کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ ایسا کرنا کفر ہے اور ایسے شخص کا عمل کافروں کا عمل ہے، واللہ اعلم۔ مرنے کے بعد کافر کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جاتا ہے جو تارک نماز کے ساتھ کہ نہ اسے نہلایا جائے نہ کفن دیا جائے۔ نہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے اور نہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے اور اظہار حقارت کے لیے اس کی قبر کا نشان مٹا دیا جائے اس کی بیوی کو طلاق ہو جائے گی، نعوذ باللہ من ذلک۔

۱۔ مالکیہ کہتے ہیں کہ عمل سحر کفر اور ارتداد ہے، خواہ فعل جادو سیکھنے کے لیے ہو یا سکھانے کے لیے یا جادو کرنے کے لیے، کیونکہ جادو کے عمل میں ایسی باتیں ہوتی ہیں جس میں غیر اللہ کی بڑائی بیان کی جاتی ہے اور تقدیری امور کو اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اگر یہ باتیں اونچی آواز سے کہی جائیں اور عمل سحر کرنے والا اس سے توبہ نہ کرے تو اسے قتل کر دیا جائے اگر وہ باتیں اونچی آواز کے بغیر کہے تب بھی وہ زندیق ہے اور اسے قتل کر دیا جائے گا اور توبہ کے لیے نہیں کہا جائے گا، بعض اصحاب نے (معافی کے لیے) کسی حال میں توبہ کی شرط نہیں لگائی، خواہ اونچی آواز سے اس نے (کلمات سحر) کہے ہوں یا نہ کہے ہوں، زندیق کی بابت (معافی کا) جو حکم ہے وہ اس حالت میں ہے جبکہ وہ (اپنے ارتکاب زندقہ کی) اطلاع ہو جانے سے پہلے توبہ کر لے، اس حالت میں اس کی توبہ قبول کر لی جائے گی، اگر اطلاع ہو جانے کے بعد کی تو وہ توبہ قبول نہ ہوگی۔ شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ جادو (کا وجود) ایک حقیقت ہے اور اس کا اثر بھی ہوتا ہے چنانچہ کبھی وہ شخص مرجاتا ہے جس پر جادو کیا جائے، یا اس کی طبیعت اور عادت بدل جاتی ہے اگرچہ وہ ویسا نہ رہا ہو، نیز جادو کرنے والا ضرب و حرب کے بغیر دشمن پر غلبہ پالیتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جادوگر کوروحوں کے ذریعہ بعض ایسی باتوں کی اطلاع قبل از وقت ہو جاتی ہے جس (کے برے انجام) سے وہ خود کو بچا لیتا ہے (یا دوسروں کو بچا سکتا ہے)۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اگر جادو ایسے ایسے اقوال و افعال پر مشتمل ہے جو مذہب کے خلاف اور موجب کفر ہیں، تو اس کے نتائج سے قطع نظر وہ کفر ہے، اور اگر وہ اقوال و افعال حرام ہیں تو وہ عمل سحر حرام ہو گا، لیکن اگر وہ عمل جائز ہے تو اس جادو کے اثر کو دیکھنا ہو گا اگر اس کا نتیجہ حرام ہے تو وہ جادو بھی حرام ہو گا ورنہ نہیں۔ جادو کے بارے میں فقہاء کا فیصلہ یہی ہے، اور مختلف مسالک کا اس پر اتفاق کرنا بہت ممکن ہے، اس میں کوئی ابہام نہیں ہے۔

جادو کے بارے میں بہت سے علماء نے جو تحقیق کی ہے ان میں بعض نے فرمایا کہ جادو محض ایک خیالی شے ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، بیشتر مسالک اس کے خلاف گئے ہیں ان کے منجملہ شافعیوں میں۔ امامہ استر ابازی، حنفیوں میں سے ابو بکر رازی، ابن حزم اور ان کے علاوہ بہت سے علماء ہیں، اس تمام گروہ کی یہ قطعی رائے ہے کہ جادو، سہما (یا شعبدہ بازی) کی طرح محض خیالی شے ہے، اس کی بنیاد، قوت ارادی یا ایسے ہی مشاغل رکھنے والوں کی عملی (اور فکری) مہارت کا نام جادو ہے۔ تاہم جمہور علماء کا کہنا یہ ہے کہ وہ اس بارے میں غور کریں کہ فی الواقع یہ کیا ہے اس کی بابت صحیح رائے قائم ہونے پر ہی اس کے متعلق احکامات کا انحصار ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیا فی الواقع ایسے دلائل ہیں جن سے ثابت ہو کہ جادو کا اثر ہوتا ہے اور کیا اس کا وجود قرآن و حدیث سے ثابت ہے؟ (۱)

واضح ہو کہ وہ لوگ جن کی بابت مشہور ہے کہ وہ جادو میں یقین رکھتے تھے وہ مصر کے قدیم

علماء نے جادو کی مختلف تعریفیں کی ہیں: صاحب ارشاد المقاصد کہتے ہیں کہ جادو ایک علم ہے جس سے انسان کو ایسے عجیب و غریب امور ظاہر کرنے کی صلاحیت باطنی حاصل ہوتی ہے جس کا سبب معلوم نہیں ہوتا۔ ابن عربی نے اس کی تعریف یوں کی ہے کہ جادو کے کچھ منتر ہوتے ہیں جس میں غیر اللہ کی عظمت بیان کی جاتی ہے اور امور دنیا اور امور قدرت کو اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، بعض اصحاب نے یوں تعریف کی ہے کہ جادو وہ علم ہے جس سے انسان کی طبیعت میں تغیر لایا جاتا ہے اور اشیاء کی ماہیت بدلی جاسکتی ہے، اس بارے میں کوئی نزاع نہیں ہے کہ جادو کا عمل اور اس کی تعلیم حرام ہے، اس کی دو قسمیں ہیں: حقیقی اور غیر حقیقی جسے سہما (شعبدہ بازی) کہتے ہیں، فرعون کے جادو گردوں و قسم کے جادو میں ماہر تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”واسترھبوا ہم واجاءوا بسحر عظیم“ (یعنی ان جادو گردوں نے لوگوں کو ڈرا دیا اور بہت بڑا جادو دکھایا)۔

۱۔ فقہاء کا کہنا ہے کہ بلاشبہ جادو کی ایک حقیقت ہے اور جسموں کو اذیت رسانی کی تاثیر رکھتا ہے سو اس کے جو اس کا توڑ جانتا ہو، ان کا کہنا ہے کہ یہ ایک خیالی (نفسیاتی) امر ہے اور اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے کہ جادو کا علم حرام ہے اس کو روکا جھٹکا کفر ہے۔

حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ جادو کی تعلیم اور جادو کا عمل کرنے سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔ خواہ اس کے فعل حرام ہونے کا عقیدہ ہو یا نہ ہو۔ حاکم کو چاہیے کہ ایسے شخص کو قتل کر دے۔ جیسا کہ حضرت عمر بن الخطاب، عثمان بن عفان اور عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت ہے نیز جندب بن عبد اللہ، حبیب بن کعب، قیس بن سعد اور عمر بن عبد العزیز رضوان اللہ علیہم سے روایت ہے کہ ان اصحاب نے جادو گر کو توبہ کا موقع دیے بغیر قتل کر دیا۔ اس بارے میں ایک حدیث مرفوعہ بھی ہے۔ شیخ ابوبکر رازی نے کتاب احکام القرآن میں اس کا ذکر کیا ہے کہ ”حدثنا ابن قانع، حدثنا بشر بن موسى حدثنا ابن الاصفهاني، حدثنا ابو معاوية عن اسمعيل بن نسله، عن النبي ﷺ، ان الساحر ضرب به بالسيف“ (یعنی ابن قانع سے یہ حدیث بیان کی، جس سے جندب، ان النبی ﷺ قال ”حد الساحر ضربه بالسيف“ (یعنی ابن قانع سے یہ حدیث بیان کی، جس سے بشر بن موسیٰ نے اور انہوں نے ابن اصفہانی سے، انہوں نے ابو معاویہ سے انہوں نے اسمعیل بن مسلم سے، انہوں نے حسن سے اور انہوں نے جندب سے روایت کیا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جادو گر کی سزا اسے تلوار مار دینا ہے)“

اس سے یہ ہے کہ ساحر واجب القتل ہے اور ولید بن عتبہ کی یہ روایت مشہور ہے کہ کوفہ میں جندب نے ایک جادو گر کو قتل کیا

شافعیہ کہتے ہیں کہ جادو گر کا قتل اگر ضروری ہو جائے گا بجز اس صورت کے جبکہ وہ جادو کو امر مباح (فعل جائز) کہتا ہو۔

رہا کاہن (علم غیب کا مدعی یا جوتشی) سو اس کی بابت کہا گیا ہے کہ وہ بھی جادو ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کاہن عرف (نجوی) کو کہتے ہیں۔ اس سے مراد وہ شخص ہے جو اٹکل سے کوئی بات بتا دیتا ہو نیز کہتے ہیں کہ کاہن کے تابع جن ہوتے ہیں جو اسے (مخفی) خبریں بتا دیتے ہیں۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر کاہن کا یہ عقیدہ ہو کہ جو کچھ وہ چاہے شیاطین اسے پورا کر دیتے ہیں تو وہ کافر ہے۔ ہاں اگر یہ عقیدہ ہو کہ وہ اپنے عندیہ سے کام لے سکتا ہے تو کافر نہ ہوگا۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر کاہن ایسا عقیدہ رکھتا ہو جو مستلزم کفر ہے۔ مثلاً یہ کہ اسے ستاروں کا قرب حاصل ہے اور جو کچھ بھی وہ چاہے ستارے کر سکتے ہیں۔

حنابلہ کہتے ہیں کہ کاہن کے بارے میں بھی وہی حکم ہے جو ساحر کے بارے میں ہے لہذا وہ بھی قتل کر دیا جائے گا جیسا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”اقتلوا کل ساحر و کاہن“ (یعنی ہر ساحر اور کاہن کو قتل کر دو)۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ اگر وہ توبہ کر لے تو اسے قتل نہ کیا جائے اور واجب یہ ہے کہ جادو گر یا نجوی کے کافر ہونے اور نہ ہونے کے بارے میں شافعی کے قول سے نہ ہٹا جائے۔ لیکن اس کا قتل واجب ہے اور اگر یہ معلوم ہو کہ وہ شخص ہمیشہ جادو کا عمل کرتا رہتا ہے تو اسے توبہ کر لینے کے لیے نہ کہا جائے۔ اس کے اس عمل کی بناء پر نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ زمین پر فساد پھیلانے کا مجرم ہے درآنحالیکہ وہ اپنے اس عمل سحر کو موجب کفر نہیں جانتا۔ ان اصحاب کا کہنا ہے کہ جادو گر اور زندیق کی جولاندہب ہوتا ہے توبہ قبول نہ کی جائے۔

شریعت اسلام میں جادو کی مذمت آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”ولا یفلسح الساحر حیث اقی“ (یعنی جادو گر کو جہاں کہیں بھی ہو فلاح نہیں ہے) یعنی وہ جہاں کہیں بھی ہو اور جہاں بھی یہ عمل کرے (کبھی فلاح نہ ہوگی) نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”لا یفلسح الساحرون“ (یعنی ساحروں کی خیریت نہیں ہے) یعنی کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے اور نہ برے حال سے نجات پاسکتے ہیں۔

امام نووی رحمہ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ جادو حرام ہے بالاتفاق گناہ کبیرہ ہے۔ آنحضرت ﷺ نے جادو کو سات موبقات (تباہ کن اعمال) میں شمار فرمایا ہے۔ جادو میں بعض اعمال کفر ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو کفر تو نہیں لیکن گناہ کبیرہ ہیں۔ بہر حال جادو کے عمل میں اگر کوئی قول یا عمل کا فرانہ ہو تو جادو گر کافر ہے ورنہ نہیں۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ جادو گر کافر ہے جادو کرنے کی پاداش میں اسے قتل کیا جائے گا۔ اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی بلکہ زندیق کی طرح قطعی طور پر اسے قتل کر دیا جائے یہ قول قاضی عیاض کا ہے اور بقول امام مالک امام احمد اور صحابہؓ و تابعین کی ایک جماعت کا بھی یہی قول ہے۔ یہ حکم اس صورت میں ہے، جبکہ جادو کے عمل میں باطل اور شر شامل ہو۔ لیکن اگر کوئی شخص اس لیے جادو سیکھے کہ سحر زدہ سے جادو کا اثر دور کرے اور اس اذیت سے نجات دلائے یا محض ایک علم سے واقف ہونے کے لیے سیکھے اور خود اس پر عمل نہ کرتا ہو تو روا ہے۔ چنانچہ امام احمدؒ سے ایسے شخص کی بابت حکم شرعی دریافت کیا گیا جو (جادو کر کے) سحر زدہ کو جادو کے اثر سے نجات دلائے، تو فرمایا کہ اس میں مضائقہ نہیں ہے۔ یہ قول قابل اعتبار ہے۔ پس جادو کے بارے میں جو حکم ہے وہ نیت کے تابع ہے۔ اگر عمل سحر کا مقصد نیک ہے تو جائز ہے ورنہ حرام ہے۔ بشرطیکہ اس کے عمل میں کوئی مشرک نہ فعل نہ ہو ورنہ وہ شخص کافر ہو جائے گا اور ساحر کو قتل نہ کیا جائے جب تک کہ اس نے جادو سے کسی کو ہلاک نہ کیا ہو۔ یہ جرم اس پر اقرار ہی سے ثابت ہو سکتا ہے۔

اگر کوئی ذمی (اسلامی مملکت کا غیر مسلم باشندہ) اپنے جادو سے کسی مسلمان کو ضرر پہنچائے تو اس نے معاہدہ کو توڑا اور اس کا قتل حلال ہوگا۔ تاہم آنحضرت ﷺ نے لبید بن اعصم کو آپ پر جادو کرنے کے جرم میں قتل نہیں کیا۔ حالانکہ وہ ذمی تھا۔ کیونکہ حضورؐ نے اپنا انتقام کسی سے نہیں لیا۔ پھر اس لیے بھی کہ انہیں اندیشہ تھا کہ لبید بن اعصم کو قتل کرنے سے مدینہ میں مسلمانوں کے درمیان جھگڑا نہ ہو جائے کیونکہ وہ بنی زریق میں سے تھا اور وہ لوگ انصار کے خاص لوگوں میں سے تھے جو قبیلہ خرج میں مشہور تھے نیز یہ بھی تھا کہ عوام نے نئے اسلام لائے تھے۔

تفصیل بالا سے عیاں ہے کہ جادو برحق (امر مسلمہ) اور ایک امر واقعہ ہے۔ بہت سے لوگوں کو اس سے سابقہ پڑا اور پڑتا رہے گا۔ کوئی زمانہ اس میں کمی ہے۔ سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس سے سابقہ پڑ چکا ہے۔ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ کے کلام میں آیا ہے ”فَاِذَا حَبَالُہُمْ وَعَصِیہُمْ یَخِیْلُ الِیہِ مِنْ سَحَرِہُمْ اِنِّہَا تَسْعٰی، فَاَوْجَسَ فِی نَفْسِہِ خِیْفَۃٌ مِّنْ مَّوْسٰی، فَلَمَّا لَآسَخَفَ الْکَ اَنْتَ الْاَعْلٰی“ (یعنی ساحروں کے جادو سے ان کی رسیاں اور لاٹھیاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چلتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ حضرت موسیٰ کا دل سہم گیا، ہم نے کہا تم ڈرو نہیں بیشک تم ہی غالب رہو گے)۔ اس واقعہ سے حضرت موسیٰ کی عقل و فراست پر کوئی اثر نہیں پڑا نہ نازل ہونے والی وحی پر اور نہ ان احکام پر جو انہوں نے لوگوں کو پہنچائے

باشندے ہیں۔ ان ہی کی بابت قرآن حکیم میں آیا ہے کہ فرعون نے اپنے تمام ذی علم ساحروں کو طلب کر کے اکٹھا کیا اور جو کچھ ان سے ظاہر ہوا وہ سب خیالی بات تھی حقیقت نہ تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”یٰٰنَحِیْلُ اِلَیْهِ مِنْ سَحْرِہُمْ اِنِّہَا تَسْعٰی“ (یعنی ان کے جادو سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ چیزیں حرکت کر رہی ہیں) ان الفاظ سے بوضاحت ظاہر ہوتا ہے کہ فرعون کے جادوگر جو سب سے زیادہ ماہر تھے صرف خیالی (یا بناوٹی) اشیاء پیش کر سکے جو حقیقت میں کچھ نہ تھیں۔ اگر حقیقی اثر والا جادو ہوتا تو اس مشکل وقت میں وہ ساحر اصل جادو پیش کرتے اور یہ تو قطعاً بعید از عقل ہے کہ فرعون جو برسرِ عناد تھا اور اپنا سب سے بڑا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ صرف بناوٹی جادو سے کام لیتا جس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ جبکہ فرعون کے جادوگر اس کے علاوہ اور بڑے بڑے جادو جانتے تھے۔ آیت سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ فرعون کے ساحروں نے اپنا انتہائی زور لگا کر جو جادو دکھایا وہ محض خیالی (یا بناوٹی) تھا۔

یہ دلیل ان اصحاب کی ہے جو کہتے ہیں کہ جادو کا اثر محض ایک خیالی امر جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ رہا دوسرا فریق سو اس کی دلیل ہاروت و ماروت کا واقعہ ہے جو قرآن شریف میں آیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”وَمَا کَفَرَ سَلِیْمَانٌ وَلٰکِن الشَّیَاطِیْنِ کَفَرُوْا یَعْلَمُوْنَ النَّاسَ السَّحَرُ، وَمَا اَنْزَلَ عَلٰی الْمَلٰٓئِکِیْنَ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ وَمَا یَعْلَمٰنْ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰی یَقُوْلَا: اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَکْفُرْ“ (یعنی سلیمان نے کفر نہیں کیا بلکہ شیطانوں (جنوں) نے کفر کیا جو لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور وہ جو شہر بابل میں ہاروت و ماروت دو فرشتوں پر نازل ہوا ان میں سے کوئی اس عمل کی تعلیم نہیں دیتا تھا جب تک کہ پہلے یہ نہ جتا دیتا کہ ہم تمہارے لئے ایک آزمائش ہیں بہتر یہ ہے کہ کافر نہ ہو)۔

حقیقت یہ ہے کہ ان آیات کریمہ سے جادو کا ثبوت نہیں ملتا کیونکہ اس میں حقیقی جادو کا ذکر نہیں ہے بلکہ ایک قسم کے فتنے یا حیلے کا ذکر جس پر عمل کر کے بعض چغل خور میاں بیوی کے درمیان جدائی کر دیتے تھے۔ چنانچہ آیت میں ان کی کارستانی کا ذکر ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”فَیَتَعَلَّمُوْنَ مِنْہُمَا مَا یَفْرُقُوْنَ بَیْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِہٖ“ (یعنی وہ لوگ ان فرشتوں سے ایسی باتیں سیکھتے تھے جن کے ذریعے خاوند اور بیوی کے درمیان پھوٹ پڑ جائے) مطلب یہ ہے کہ ان اعمال سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ صرف میاں بیوی کے درمیان جدائی ہے اور یہ بات خارق عادت جادو کے بغیر بھی ہو سکتی ہے۔ ایسے بہت سے واقعات ہیں جو اس کی تائید کرتے ہیں۔ لوگ اکثر فتنے ایسے کھڑے کر دیتے ہیں جن سے زوجین

کے مابین پھوٹ پڑ جاتی ہے۔ پس آیت کریمہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جادو کی کوئی حقیقت ہے جس کا اثر ہوتا ہے۔ جادو کا حقیقی اثر ماننے والوں کے لئے بجز اس حدیث بخاری کے جو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے اور کوئی دلیل نہیں ہے کہ ”ان النبی ﷺ قد سحر، وانه کان یخیل الیہ ان یفعل الشیء ولم یفعل“ (۱) یعنی نبی ﷺ پر سحر کیا گیا کہ آپ خیال فرماتے کہ فلاں کام کیا گیا، حالانکہ وہ نہیں کیا۔ اور یہ حدیث صحیح ہے اس کے راویوں میں سے کسی نے اس پر تنقیح نہیں کی اور یہ ٹھیک نہیں کہ یہ کہہ دیا جائے کہ ایسی حدیثوں کا تعلق فروعی مسائل سے ہے۔ اعتقادی مسائل میں یہ جائز نہیں ہے۔ عقیدہ کی بنیاد

بلکہ یہ ایک انسانی عارضی کیفیت ہے جو نبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کو پیش آ جاتی ہے لہذا نبیاء کے معصوم و (محفوظ) ہونے کے منافی نہیں ہے۔

۱۔ امام بخاری رحمہ اللہ علیہ سے روایت ہے: وہ کہتے ہیں کہ محمد بن متقی نے مجھ سے حدیث بیان کی جنہیں یحییٰ بن ہشام نے حدیث بیان کی وہ کہتے ہیں کہ مجھے میرے باپ نے اور ان کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ ”ان النبی ﷺ سحر حتی کان یخیل الیہ انہ صنع شیئاً ولم یصنعه“ (یعنی نبی ﷺ پر جادو کیا گیا یہاں تک کہ انہیں خیال گزرتا تھا کہ انہوں نے فلاں کام کر لیا ہے حالانکہ وہ نہیں کیا ہوتا) ایک اور روایت میں امام بخاری سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ ابراہیم بن موسیٰ نے ہم سے حدیث بیان کی کہ انہیں عیسیٰ بن یونس نے ہشام سے۔ انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کی ہے وہ کہتی ہیں کہ ”سحر رسول اللہ ﷺ رجل من بنی ذریق یقال لہ: لبید الاعصم، حتی کان رسول اللہ ﷺ یخیل الیہ انہ کان یفعل الشیء وما فعلہ حتی اذا کان ذات یوم او ذات لیلة وهو عندی لکنہ دعا ودعاء ثم فان یا عائشہ اشعرت ان اللہ افشالی فیما استفتیتہ فیہ اتانی رسولان فقعد احدهما عند رأسی، والاخر عند رجلی، فقال احدهما لصاحبه ما وجع الرجل؟ فقال: متابوب، قال: من طبه؟ قال: لبید بن الاعصم، قال: فی ای شیء؟ قال فی مشط و مشاطة وجف طلع نخلة ذکر، قال: واین هو؟ قال فی بئر ذران، فأتاہا رسول اللہ ﷺ فی لاس من اصحابہ فجاء ثقال: یا عائشہ کان مائہا نقاعة الجناء و، وکان روئس نخلها رءوس الشیاطین، قلت: یا رسول اللہ افلا استخرجتہ؟ قال: قد عافانی اللہ فکرت ان اثیر علی الناس فیہ شراً، فامر بها فدفنت“ (یعنی قبیلہ ذریق کے ایک شخص نے جسے لبید الاعصم کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ پر جادو کیا جس سے یہ ہوا کہ حضور خیال فرماتے تھے کہ فلاں بات میں نے کر لی ہے، حالانکہ اسے نہیں کیا ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن یا ایک رات میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور بار بار دعائیں کیے جاتے تھے۔ پھر فرمایا۔ اے عائشہ پتہ بھی ہے مجھے اللہ تعالیٰ نے وہ بات بتادی جس کی بابت تم پوچھا کرتی تھیں: میرے پاس (خواب میں) دو آدمی آئے، ایک تو میرے سر کے پاس اور دوسرا میرے پاؤں کے پاس بیٹھ گیا۔ پھر ان میں سے ایک نے دوسرے سے پوچھا کہ ان صاحب

یقینی دلائل پر ہوتی ہے اور جو حدیثیں صحیح ہوں وہ احادیث آحاد ہیں۔ ان کے صحیح ہونے کا گمان غالب ہوتا ہے پس احادیث صحیحہ کے لئے ضروری ہے کہ ان کی اہمیت کو ثابت کیا جائے اور عقلی دلائل سے ان کی تائید ہو اور یہ بھی ضروری ہے کہ احادیث کو اصول دین کی روشنی میں دیکھا جائے اور اسے عقل سلیم کے تقاضوں سے ہم آہنگ رکھا جائے۔ بصورت دیگر یہ درست نہ ہوگا کہ اس کو عقائد دینیہ میں سے کسی عقیدہ کی دلیل قرار دیں۔

اب بخاری کی روایت کردہ اس حدیث میں کچھ ایسی بات ہے جس سے رسول اللہ ﷺ کی ذات پاک مبرا ہے۔ یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ کہنا کہ ”انہ کان یخیل الیہ، انہ یفعل شیء ولم یفعل۔“ (یعنی حضورؐ کا کردہ بات کی بابت خیال کر لیتے تھے کہ وہ کر چکے ہیں)۔ کیونکہ اگر اس حدیث کے ظاہری معنی لیے جائیں تو وہ حضورؐ کی شان رسالت کے منافی ہوگا۔ حالانکہ ان کے خیالات اور معلومات

کو کیا تکلیف ہے؟ اس نے کہا جادو کا اثر ہے۔ اس نے پوچھا جادو کس نے کیا؟ اس نے کہا البید بن اعصم نے۔ پھر اس نے پوچھا کس چیز سے؟ اس نے کہا، کنگھے میں الجھے ہوئے بالوں سے اور نخل ذکر (یعنی پھل نہ دینے والے درخت خرما) کے خشک شگوفہ سے۔ اس شخص نے پوچھا وہ شخص کہاں رہتا ہے دوسرے نے جواب دیا چاہ ذران میں۔ پھر آپ چند صحابیوں کے ساتھ وہاں گئے اور جب واپس آئے تو فرمایا اے عائشہؓ اس کا پانی گاڑھا اور سرخ رنگ ہو گیا تھا اور وہاں کے درختوں کی مہنگ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شیطانوں کی چوٹیاں۔ تب میں نے کہا یا رسول اللہؐ آپ نے انہیں نہیں نکلوایا؟ فرمایا کہ اللہ نے مجھے اس سے روک دیا۔ لہذا میں نے پسند نہ کیا کہ اس کا اثر لوگوں پر برپا پڑے۔ اس کے بعد آپ نے اسے دفن کر نیکاً حکم دیا۔ اور ان کی تیسری روایت میں ہے وہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن محمد نے مجھ سے حدیث بیان کی جو کہتے ہیں کہ میں نے ابن عیینہ سے سنا، وہ کہتے ہیں کہ پہلے ابن جریج نے ہم سے یہ حدیث بیان کی جو کہتے ہیں کہ آل عروہ نے، عروہ سے روایت کی ہے کہ میں نے اس کی بابت ہشام سے پوچھا تو انہوں نے حضرت عائشہؓ کی یہ روایت بیان کی، وہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر جادو کیا گیا جس کا یہ اثر ہوا کہ آنحضرت ﷺ یہ خیال فرماتے تھے کہ وہ اپنی بیویوں کے پاس جاتے تھے حالانکہ نہیں جاتے تھے۔ سفیان کہتے ہیں کہ جادو کا یہ اثر سب سے زیادہ سخت قسم کا ہے۔

اس قسم کی روایات وغیرہ سے معلوم ہوا کہ جادو کی ایک حقیقت ہے۔ وہ کسی پر کیا جاسکتا ہے اور اس کا اثر ہوتا ہے کیونکہ قرآن حکیم سے بصرہ ثابت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”ولکن الشیاطین کفروا یعلمون الناس السحر“ (یعنی البتہ شیطانوں نے کفر کیا، لوگوں کو جادو کرنا سکھاتے ہیں) اور فرمایا ”وما جئتم بہ السحر ان اللہ سیبطلہ“ (یعنی جو جادو بھی تم کرو گے اللہ اسے بے اثر کر دے گا) نیز فرمایا ”لا یفلح الساحرون“ (یعنی جادو کرنے والے نامراد رہیں گے) اور ارشاد ہے ”وانما صنعوا کید ساحر“ (یعنی انہوں نے جادو گر کا کام دکھایا) اور یہ کہ

ہر قسم کے نقص سے بری ہیں۔ پس ضروری ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس قول کے مفہوم کو عقل و بصیرت کے تقاضوں کے مطابق سمجھا جائے۔ پس سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ جملہ جو فرمایا اس کا مطلب یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ حضرت عائشہ کے پاس نہیں گئے اور یہ خیال کر لیتے تھے کہ جاچکے ہیں، چنانچہ تاخیر کے بعد جب جنسی تقاضا پورا کرنا چاہتے تو نہ کر سکتے تھے چونکہ اس واقعہ کا تعلق ان کی اپنی ذات کے ساتھ تھا اس لیے انہوں نے پاس حیا اس طرح بیان فرمایا (کہ بعض کام آپ نے نہیں کیا ہوتا اور سمجھ لیتے تھے کہ میں نے کر لیا) چنانچہ وہ روایت اس کی تائید کرتی ہے جو عبدالرزاق نے ابن مسیب سے اور انہوں نے عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ پر جس جادو کا ذکر ہے وہ صرف یہی ہے ورنہ

”ولا يفلع الساحر حيث اتي“ (یعنی جادو گر کہیں بھی ہو بامراد نہ ہوگا) اور اللہ تبارک تعالیٰ کا فرمانا ہے ”انه لكبير كم الذي علمكم السحر“ (یعنی یہ تم سب میں بڑا جادو گر ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا) پھر اللہ تعالیٰ کا فرمانا ہے ”انا آمننا بهر بنا ليغفر لنا خطايانا وما اكرهنا عليه“ (یعنی فرعون جادو گروں نے کہا کہ اے فرعون، ہم اپنے پروردگار پر ایمان لائے تاکہ وہ ہماری خطا سے درگزر فرمائے اور اس جادو کو بھی (معاف فرمائے) جس کے کرنے پر تو نے ہمیں مجبور کر دیا تھا)

علماء نے بتایا ہے کہ جادو کی متعدد صورتیں ہیں:

ایک وہ جادو جو فریب اور دھوکے پر مبنی ہوتا ہے، یہ محض نفسیاتی شے ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور یہ شعبہ بازوؤں کا کام ہے اس میں مشق اور مہارت درکار ہے اور نظر بچا کر پھرتی سے کام لیا جاتا ہے اس کے لیے طویل یکسوئی اور مشاقی کی ضرورت ہے، اس میں شعبہ باز نظر بندی سے کام لیتے ہیں، جو کچھ پیش کرتے ہیں اس سے لگا ہوں کو پھیر دیتے ہیں (یعنی دکھاتے کچھ ہیں نظر کچھ اور آتا ہے) اس کو سیما کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”فلما القوا سحروا اعين الناس استرهبوهم وجاءوا بسحر عظيم“ (یعنی جب جادو گروں نے جادو چلایا تو لوگوں کی نظر بندی کر دی، اور سب کو ڈرا دیا اور بڑا جادو دکھایا) نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”هاذا حب الهم وعصبيهم يخيل اليه من سحرهم انها تسعني“ (یعنی ان کے جادو سے یہ ہوا کہ ان کی ڈالی ہوئی رسیاں اور لٹھیاں، بھاگتی دوڑتی معلوم ہونے لگیں) اس قسم کا جادو اب بھی بالخصوص ہندوستان میں جاری ہے۔

دوسرا وہ کہ جادو جو افسون سے ہوتا ہے۔ یعنی (دھاگے کی) گرہوں پر یا مسور کی تصویر پر کچھ پڑھ کر دم کرتے ہیں، اس کے کئی طریقے ہیں کچھ تلاوت کر کے یا پڑھ کر یا لکھ کر یا شکلیں بنا کر دم کرتے ہیں اس کا مقصد ایذا ہی یا کوئی اور برائی کرنا ہوتا ہے، (اس کا ذکر) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”ومن شر النفاثات في العقد“ (یعنی میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں گرہوں پر پھونکنے والیوں یا جادو گرہوں کی شرارت سے) اس آیت میں نفاثات سے مراد جادو گرہیاں ہیں، یہ افسون منتر کبھی تو اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنی کے ذریعہ، یا اس کے مقرب فرشتوں کے نام لے کر ہوتا ہے اور کبھی کبھی حلف اور بڑی بڑی سوگندوں

اس جادو کا حضور کی باطنی (روحانی) قوتوں پر کوئی اثر نہ تھا۔ اس سے صرف یہ ہوا کہ انہیں اپنی بیوی عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس جانے میں رکاوٹ ہوئی اور اس طرح کا عمل اس وقت لوگوں میں عام تھا۔ ورنہ نبی کی فراست کسی بھی طرح کے اثر سے خواہ وہ وقتی طور پر ہو پاک ہے۔ فتح الباری (شرح صحیح بخاری) میں ہے کہ بعض علماء کہتے ہیں کہ جادو کا اثر صرف میاں بیوی کے درمیان جدائی کرانے یا اس قسم کی اور باتوں کے لیے مخصوص ہے۔ پس اگر حدیث مذکورہ بالا کو اس طرح سمجھا جائے تو اس میں کوئی حرج نہ ہوگا۔ حجاب بتاتے ہیں اور جس کی بناء پر صحت (حدیث) سے انکار کرتے ہیں۔ یہاں پر اس امر کے تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ جادو کسی وقت کوئی ایسا اثر بھی رکھتا ہو جس کو حقیقی قرار دیا جائے۔ علاوہ اس کے اس حدیث میں داخلی طور پر کسی قطعی امر کا ثبوت موجود نہیں ہے کیونکہ اس سے محض ظن (گمان غالب) ہو سکتا

پر مشتمل ہوتا ہے اور روحوں سے کام لینے کے لیے یہ افسون کیا جاتا ہے کہ جو کچھ وہ چاہتا ہے روحوں اسے مسحور پر پورا کریں، اور یہ منتر جو استعمال کیے جاتے ہیں کبھی قابل فہم ہوتے ہیں اور کبھی بے معنی ہوتے ہیں کہ لوگ نہیں سمجھتے، جیسے اجنبی زبان یا سریانی بولی کے الفاظ ہوتے ہیں، مثلاً جنات کے نام یا نامعلوم مخفی روحوں کے نام۔

تیسرا وہ جادو جو طلسمات (نقوش سحر) اور انگلیوں کے کتبوں کے ذریعہ ہوتا ہے، جس پر مخصوص نقوش عربی الفاظ سے مختلف ہوتے ہیں یا عربی ہی کے حروف مقطعات (الگ الگ حروف) ہیں جن میں کوئی باقاعدہ (تحریری اصول) کے مطابق ربط نہیں ہوتا، ان کا تعلق مخصوص اشیاء کے ناموں اور آسمانوں (فلکیات) سے منسوب ہوتا ہے، پھر اس (کے عمل) کا خاص وقت ہوتا ہے جو ان اعداد کے مناسب ہوتے ہیں جو ایک خاص شکل میں ترتیب دیے جاتے ہیں۔

چوتھا وہ جادو جو ستاروں اور سیاروں کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان ستاروں سیاروں کو ایک مخصوص اثر اور خاصیت سے نوازا ہے جس کے مطابق اس کے نتائج ظاہر ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "فنظر نظره فی النجوم فقال انی سقیم" (یعنی ابراہیم نے ستاروں پر نظر ڈالی اور کہا کہ میں بیمار ہوں) ابن زید کہتے ہیں کہ ان کا ایک خاص ستارہ تھا، جب وہ خاص جہت سے طلوع ہوتا تو حضرت ابراہیم بیمار ہو جاتے تھے، چنانچہ اس وقت انہوں نے دیکھا کہ وہ ستارہ اسی مخصوص حالت سے ظاہر ہوا تو فرمایا "انی سقیم" (یعنی میں بیمار ہوں) مطلب یہ ہے کہ اس مرض کا لاحق ہو جانا ناگزیر ہے چونکہ ان کی قوم کے لوگ نجومی تھے، انہوں نے سمجھ لیا اور ستاروں کی کیفیت سے معلوم ہو گیا کہ بلاشبہ وہ مریض ہونے والے ہیں "فتولوا عنه مدبرین" (یعنی تب وہ مڑ کر چلے گئے) تاکہ مرض متعدی نہ ہو جائے، کبھی اس قسم کے جادو کو فلکیات یعنی ملائکہ سے ربط اور آسمان کی گردش وغیرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

پانچویں قسم کا جادو یہ ہے کہ شیطانوں سے یک گونہ قرابت اور رابطہ قائم کر کے انہیں قابو میں لایا جائے اور ان سے اپنا کام لیا جائے یا خلق خدا کو اذیت اور نقصان پہنچایا جائے یا پھر ان سے قربت حاصل کر کے گزشتہ واقعات کا علم حاصل کیا جائے، جادو کی اور اقسام میں سے یہ جادو سب سے زیادہ سخت اور خطرناک ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ولکن الشیاطین

ہے۔ بدیں سبب جادو کے وجود سے انکار کرنے والوں کا کہنا ہے کہ ایسی صحیح حدیثیں، فروعی احکام فقہ کی دلیل تو ہو سکتی ہیں لیکن عقیدہ (مسئلہ ایمانیہ) کا ثبوت نہیں ہیں۔ پس یہ عقیدہ کہ جادو کا اثر حقیقی ہوتا ہے اس سے ثابت نہیں ہوتا جب تک کہ اس کا کوئی عقلی ثبوت موجود نہ ہو جس سے اس کی تائید واقعات سے ہوتی ہو سوا اس کے کہ دنیا میں ایسے (جادو کے) واقعات اکا دکا پائے جاتے ہیں۔ جنہیں غیر معتبر اشخاص بیان کرتے ہیں۔ اگر فی الواقع جادو کوئی امر حقیقی ہوتا تو اس کا ذکر قرآن حکیم کے اندر فرعون کے جادو گروں کے سلسلہ میں ضرور آیا ہوتا۔

کفر و اعلمون الناس السحر“ (یعنی مسلمانوں نے نہیں..... لیکن شیطانوں نے کفر کیا کہ لوگوں کو جادو سکھاتے ہیں) اور جادو گر جس قدر بڑا کافر اور خبیث ہوگا اور اللہ تعالیٰ اس کے رسول اور مسلمانوں کا دشمن ہوگا اسی قدر اس کا جادو زیادہ کارگر اور نافذ الاثر ہوگا، اس قسم کے جادو گر، جنات (شیاطین) کے پیرو اور ان کے بندے ہوتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”بل کانوا ان یعبدون الجن اکثر هم به مؤمنون“ (یعنی یہ لوگ جنات کی بندگی کرتے اور بیشتر ان پر ایمان لاتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”ولبس المولی ولبس العشیر“ (یعنی بلاشبہ ایسے لوگوں کے یہ آقا اور ساتھی برے ہیں) شیاطین اسی صورت میں ان کے قبضہ میں آتے اور ان کا کام نکالتے ہیں جبکہ جادو گر ان کا کہنا مانے اور شیاطین جو بدکردار اور کافر ہوتے ہیں وہ صاحب ایمان سے کفر و ضلالت ہی کا مطالبہ کرتے ہیں۔

علماء کا کہنا ہے کہ سحر زدہ پر جادو کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ ذہن کو بدل دیتا ہے اور عصبی امراض میں مبتلا کر دیتا ہے اور طرح طرح کے خیالات میں الجھا دیتا ہے، کبھی جادو سے قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور کئی گنا قوت بڑھ جاتی ہے اور قتل تک کی نوبت آ جاتی ہے اور جادو سے میاں بیوی کے درمیان تفرقہ ڈالا جاتا ہے جادو گر ازدواجی تعلقات میں خرابی ڈال دیتے ہیں اور ان کی زندگی کو جہنم بنا دیتے ہیں یہاں تک کہ طلاق اور تفریق کی نوبت آ جاتی ہے، دوسروں میں عداوت، بغض اور جدائی ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”فیتعلمون منها ما یفرقون به بین المرء و زوجته“ (یعنی ان سے لوگ ایسی باتیں سیکھتے ہیں جن کے کرنے سے میاں بیوی میں جدائی ہو جاتی ہے)۔

واضح ہو کہ جادو کا شر دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کی پناہ اور اس کی حفاظت میں آنے کی دعا مانگی جائے اور چاہیے کہ انسان اللہ کے حضور التجا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرے، حقوق اللہ کی ادائیگی کرے اور اس کے فضل کا امیدوار ہو۔ غرض جو شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے تحفظ کا ضامن ہوتا ہے اور اسے غیر اللہ کے حوالے نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”وان تصبروا وتتقوا لا یضرکم کیدهم شیئاً“ (یعنی اگر تم ثابت قدم رہو اور اللہ سے ڈرو تو ان کی چال بازی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی)۔

رسول اللہ ﷺ نے سیدنا عبداللہ بن عباسؓ سے ارشاد فرمایا ”احفظ اللہ بحفظک، احفظ اللہ تجده تجاهک“ (یعنی اللہ کو یاد رکھو وہ تیری حفاظت کرے گا اور تو اللہ کو یاد رکھو تجھ پر توجہ فرمائے گا) نیز قوت ایمان، صدق یقین، ثابت قدمی اور خدا پر پورا بھروسہ کرنے سے بھی جادو کا شر دور ہو جاتا ہے۔ یاد رہے کہ جادو خواہ کیسا ہی ہو کسی کو اذن الہی کے بغیر اس سے کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”وما ہم بضارین به من احد الا باذن اللہ“ (یعنی یہ لوگ کسی کو بھی اذن الہی کے بغیر کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے) وہ ہر شے پر قادر ہے، یعنی اگر اللہ سبحانہ تعالیٰ چاہے تو کسی کو جادو کے ضرر رساں اثر میں مبتلا کر دے یا کسی گناہ کی پاداش میں جادو کا عذاب اس پر ڈال دے اور چاہے تو ساحروں کے سحر کو بے اثر کر دے اور ان کے شر سے محفوظ اور چالبازی سے دور رکھے۔ غرض یہ ہے کہ جادو مضبوط ایمان رکھنے والوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا نہ ڈر سکتا ہے نہ پریشان کر سکتا ہے نہ غلبہ پا سکتا ہے، لیکن یہ مقصد صرف اللہ پر پورا بھروسہ کرنے اور ایمان پر اطمینان خاطر ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سب کچھ اللہ تبارک و تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے چنانچہ اس نے فرمایا ”ان یمسک اللہ بضر فلا کاشف له الا هو، وان یردک بخیر فلا راد لفضله“ (یعنی اگر اللہ تجھ کو کسی مشکل میں ڈال دے تو اسے اللہ کے سوا کوئی دور نہیں کر سکتا اور اگر وہ تیرے ساتھ بھلائی کرنا چاہے تو کوئی اس کے فضل سے محروم نہیں کر سکتا)۔ مومن کا قلب جادو گر اور اس کے عمل سے متاثر نہیں ہوتا، اس کا دل اللہ عز و جل، اس کی طاعت، اس کی عبادت اور اس کے ذکر و شغل کی کثرت میں لگا رہتا ہے۔ اللہ کی حفاظت اور اعانت اس کے شامل حال رہتی ہے۔ اللہ فرماتا ہے ”ان تنصرو اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم“ (یعنی اگر تم اللہ کے ہو کر رہو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور ثابت قدم رکھے گا) اور آنحضرت ﷺ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ارشاد فرمایا ”اعلم ان الامة لو اجتمعت علی ان ینفوک لم ینفوک الا بشی کتبہ اللہ لک۔ ولو اجتمعوا علی ان یضروک، لم یضروک الا بشی قد کتبہ اللہ علیک“ (یعنی یاد رہے کہ اگر پوری قوم اکٹھی ہو کر تجھے نفع پہنچانا چاہے تو صرف وہی نفع پہنچائے گی جو اللہ نے تیرے لیے لکھ دیا ہے اور اب اگر سب مل کر چاہیں کہ تجھے نقصان پہنچائیں تو اتنا ہی نقصان پہنچا سکیں گے جو لکھا جا چکا ہے)۔ الغرض اللہ کی توحید کے ساتھ یہ عقیدہ رکھنا ہی کہ تمام نفع اور نقصان اسی کے ہاتھ میں ہے وہی عطا کرنے والا وہی روک رکھنے والا ہے۔ ایک ایسا عظیم ترین حصارِ عافیت ہے، کہ جو شخص اس میں داخل ہو گیا وہ امن (وعافیت) میں آگیا، بزرگانِ سلف میں سے کسی کا قول ہے کہ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے ہر شے اس سے ڈرتی ہے اور جو شخص اللہ سے نہیں ڈرتا ہر شے اسے ڈراتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”ان اللہ یدفع عن الدین آمنوا، ان اللہ لا یحب کل خوان کفور“ (یعنی بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کی مشکلات کو دور کرتا رہتا ہے اور بے ایمان کافروں کو پسند نہیں کرتا)۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس عہد میں جادو گری اور جادو گردوں کا تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے، اور اب اس کا دعویٰ کرنے والا جھوٹا فریبی اور گمراہ کن ہے۔ قرعہ اندازی، حیلہ جوئی و ہیات اور دھوکہ بازی سے مال حاصل کرنے میں لگا ہوا ہے ایسے بہت سے واقعات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا دعویٰ جھوٹا ہے، انہیں صرف جادو کے نام اور رکی کرتبوں

سے زیادہ کچھ علم نہیں ہے۔ ”ذلک من فضل اللہ علینا وعلی الناس، ولکن اکثر الناس لا یشکرون“
 واضح ہو کہ بالعموم جادو کمزور طبیعت کے اشخاص، بچوں، مریضوں اور کچے مذہب والوں پر اثر کرتا ہے، اور انبیاء
 ورسل کو جو ایسے امور پیش آتے ہیں وہ آزمائش، آگاہی اور شریعت سازی (یعنی تفہیم احکام شریعت) کے لیے ہوتے ہیں
 اور آنحضرت ﷺ پر جادو ہونے کا جو واقعہ گزرا، اس کا کوئی اثر آنحضرت ﷺ کی عقل و فہم اور وحی پر جس کی تبلیغ آپ امت
 کو فرماتے تھے نہیں ہوا، ان احکام شریعت پر بھی اس کا اثر نہیں تھا جو آپ اپنی قوم کو دیتے تھے۔ ہاں اس کا ایک عارضی اثر
 جسم پر ہوا جیسے انبیاء پر دوسرے بشری عارضوں کا ہوتا ہے، یہ اثر حضور کے پاک از خطا ہونے کے منافی نہیں ہے۔ پھر یہ
 ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو اس کی اطلاع دے دی تھی۔ چنانچہ دو فرشتے آئے اور انہوں نے جادو کے موقف
 سے حضور کو آگاہ کیا اور جادو کرنے والے کا نام تک بتا دیا اور جادو گر جو چاہتا تھا وہ مقصد پورا نہ ہوا اور یہ ہو بھی کیسے سکتا تھا
 جبکہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب (قرآن حکیم) میں فرماتا ہے ”واللہ یعصم من الناس“ (یعنی اے نبی اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں
 کی شرارت سے محفوظ رکھے گا) اور یہ امور شریعت سازی کے لیے تھے، ورنہ اگر پروردگار چاہتا تو یہ جادو گر (سرے سے
 ہی) بے بس ہو جاتے یہ حالت اس لیے پیش آئی تا کہ معلوم ہو جائے کہ مومن اللہ کے نزدیک اس لیے محبوب ہے کہ وہ نیک
 عمل کرتا ہے اور نیکیوں میں لگا رہتا ہے لہذا اللہ تعالیٰ اسے دشمنوں کی چال بازیوں اور بدخواہوں کے شر سے محفوظ رکھتا ہے،
 بلاشبہ نیکیاں، برائیوں کے اثر سے بچاتی ہیں اور مشکلات کو دور کرتی ہیں۔ اور آنحضرت ﷺ تو قدرت حق کے سامنے ایک
 بندے کی طرح ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ انہیں ہر افتاد سے بچاتا اور ہر ضرر سے محفوظ رکھتا ہے۔ جیسا کہ ان سے پہلے بھی نبیوں کی
 آزمائش ہوئی۔ انہوں نے صبر کیا اور اللہ نے انہیں بدی سے بچایا (چنانچہ قرآن میں) ”وایوب اذا نادى ربه انى
 مسنى الضر وانت ارحم الراحمين فاستجبنا له فكشفنا ما به من ضر“ (اور ایک وقت ایوب نے اپنے
 پروردگار سے فریاد کی کہ یا الہی مجھ پر مشکل آپڑی ہے اور تو مہربانوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے تو ہم نے اس کی
 درخواست کو قبول کیا اور جس مصیبت میں مبتلا تھا وہ دور کر دی) اسی طرح قرآن میں ہے و نوحاً اذا نادى من قبل
 فاستجبنا له فنجينااه واهله من الكرب العظيم“ (یعنی اس سے پہلے نوح نے جب فریاد کی تو ہم نے اسے شرف
 قبولیت بخشا اور اسے اور اس کے گھر والوں کو سخت مصیبت سے نجات دی)۔

ہر چند کہ رسول اللہ ﷺ پر جادو کے اثر کی بابت سابقہ الذکر احادیث کا ذکر موجود ہے بعض بدعتیوں نے ان
 احادیث سے انکار کیا ہے، ان میں سے بعض نے یہ کہا کہ یہ اخبار احاد میں سے ہیں ان پر عمل نہ ہوگا، ان کا خیال یہ ہے کہ
 جادو سے متاثر ہونا منصب نبوت کے منافی ہے، اور اسے مشکوک بنا دیتا ہے لہذا وہ کہتے ہیں کہ اس طرح کی سب باتیں
 باطل ہیں، انبیاء کا جادو سے متاثر ہونا ان کے عائد کردہ احکام شرعیہ کو باطل کر دیتا ہے اور یہ شک ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کو محض
 یہ خیال گزرا ہو کہ انہوں نے حضرت جبریل کو دیکھا حالانکہ وہ جبریل نہ ہوں، یا یہ کہ ان پر وحی نازل ہوئی حالانکہ کوئی وحی
 نازل نہ ہوئی ہو ان اشخاص کی یہ تقریریں کئی طرح سے قابل رد ہیں۔

ایک یہ کہ معجزات اور قرآن و سنت نبوی ﷺ کی تصریحات سے جن کو اللہ نے ان پر نازل فرمایا، حضور کی صداقت

اور ان ارشادات کا محفوظ (بے شائبہ ریب) ہونا ثابت ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”ما ضل صاحبکم وما غوی، وما ينطق عن الهوى ان هو الا وحى يوحى“ (یعنی تمہارے یہ صاحب نہ تو گمراہ ہیں اور نہ فریب خوردہ ہیں یہ اپنی طرف سے لگا کر کچھ نہیں کہتے ان کا ارشاد سب وحی ہے جو ان پر نازل ہوئی) نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”والله يعصمک من الناس“ (یعنی اے پیغمبر ہم تم کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھیں گے) پھر ارشاد ہے ”وما آتاکم الرسول فخذوه وما نهاکم عنه فانتهوا“ اور فرمایا ”ولو لا فضل الله علیکم ورحمته لاهمت طائفه منهم ان یضلوک وما یضلون الا انفسهم، وما یضرونکم من شی“ (یعنی اگر اللہ کا فضل و کرم تم پر نہ ہوتا تو ان لوگوں کا ایک گروہ تمہیں غلط راہ پر ڈال دیتا، لیکن وہ تو خود ہی گمراہ ہیں، وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے)۔ غرض اس قسم کی آیتیں اور دوسری باتیں اس امر کا قطعی ثبوت ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے اپنے تمام اقوال و ارشادات برحق ہیں اور ان کی صداقت مسلمہ ہے اور اللہ نے انہیں غلطیوں سے بچایا ہے اور ان کی عقل خطا سے محفوظ ہے۔

دوسرے یہ کہ تمام راویان حدیث کا اس پر اتفاق ہے کہ اس جادو سے آنحضرت ﷺ کی عقل (و فراست) پر کوئی اثر نہیں پڑا، ہاں ان کے جسم اور بصارت پر ایسا ہی اثر ہوا جیسے دوسرے جسمانی امراض کا ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی جادو کا اثر ہوا کہ وہ جادو کو دیکھ کر اصل خیال کرنے لگے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”فساذا حبالہم وعصیہم یخیل الیہ من سحرہم انہا تسعی“ (یعنی ناگاہ انہیں ایسا معلوم ہوا کہ جادو گردوں کی ڈالی ہوئی رسیاں اور سوٹیاں دوڑنے لگیں)۔ غرض جادو ایک طرح کے جسمانی امراض میں سے تھا۔ اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر مرض کا لاحق ہونا ممکن ہے اور ایسے امراض جو موجب نفرت نہ ہوں انہیں لاحق ہو سکتے ہیں، کیونکہ یہ بشری عوارض (لوازم) میں سے ہیں اور اس سے ان کے مرتبہ عالی میں کوئی نقص نہیں ہوتا پھر یہ بھی ہے کہ دینی اور تبلیغی امور میں وہ معصوم (بے خطا) ہوتے ہیں اور وحی شریف محفوظ رہتی ہے۔

تیسرے یہ کہ تمام اصحاب روایت اس پر متفق ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اس مرض سحر کے دوران، نیکی، سچائی اور امر حق کے سوا اور کچھ نہیں فرمایا، یہاں تک کہ عادی امور (روزمرہ معمولات) میں بھی، آپ کے تصورات اور خیالات وہی ہوتے تھے جو بالعموم نفس پر طاری ہوتے ہیں، لیکن ہنوز وہ دل ہی میں ہوتے تھے کہ صحیح بات اور امر واقع کا انکشاف ہو جاتا اور تب بیان فرمادیتے تھے اور تمام عمر کبھی اس کے خلاف نہیں ہوا نہ اس مرض میں اور نہ کسی اور مرض میں..... ﷺ۔

چوتھے یہ کہ تمام احادیث جو اس بارے میں آئی ہیں۔ ان سب سے بالاتفاق یہ ظاہر ہے کہ جادو کا اثر صرف جسد مبارک پر ہوا، چنانچہ آپ کسی شے کی بابت خیال کرتے کہ یہ ایسی ہے لیکن اس کے بعد فوراً ہی اس شے کی اصلیت معلوم ہو جاتی تھی چنانچہ آپ خیال فرماتے کہ بیویوں کے پاس جا سکتے ہیں لیکن نہیں جا سکتے تھے اور عقل شریف پر زیادہ سے زیادہ وہی اثر ہوتا تھا جو مرض کے طویل ہونے کی صورت میں ہوتا ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ ابتداء آپ معاملہ اللہ کے سپرد کر دیتے، پھر علاج معالجہ کرتے اور جب تکلیف بڑھ جاتی اور مرض کا غلبہ ہو جاتا تو دعا کا سہارا لیتے تھے (چنانچہ اس معاملہ میں بھی ایسا ہی ہوا) جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے ”فدعا ثم دعا، ثم دعا“ (یعنی بار بار دعا پر دعا مانگتے

رہے) غرض حضرت کا تفویض (سپرد بخدا) کرنا پھر دوا اس کے بعد دعا کرنا اس امر کا ثبوت ہے کہ حضور کی عقل (یا ذہن و فراست) بہر حال قائم، محفوظ اور بے خطا تھی اور جادو کا اس پر کوئی اثر نہ تھا، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپؐ پر جادو کا اثر اتنا تھا کہ آپؐ کی بصارت میں فرق آگیا۔ غرض جادو کا اثر صرف جسم اور ظاہری اعضاء پر تھا۔ آنحضرت ﷺ کی سوجھ بوجھ پر نہ تھا۔

